سید العلماء علامہ السید علی نقی نقویؒ
کی مختلف موضوعات پر کی گئی تقاریر کا مجموعہ
معراجِ خطابت
مرتبہ
عابد عسکری
ناشر
معراج کمپنی
LG-3 سمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 0321-4971214

سید العلماء علامہ السید علی نقی نقوی رح

کی مختلف موضوعات پر کی گئی تقاریر کا مجموعہ

معراجِ خطابت

مرتبہ

عابد عسکری

ناشر

معراج کمپنی

LG-3 یوسف میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 0321-4971214

نام کتاب ---------------- معراجِ خطابت

بیانات ---------------- علامہ السید علی نقی نقویؒ

مرتب ---------------- عابد عسکری

گرافکس ---------------- قلب علی سیال

کمپوزنگ ---------------- فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سال اشاعت ---------------- 2013ء

ناشر ---------------- معراج کمپنی

قیمت ----------------

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 یوسف میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 0321-4971214

فہرست مضامین

جنابِ قنبر کے نام

یہ کتاب میں جنابِ قنبر کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں۔ کون قنبر؟ وہ قنبر جو علیؑ کا عاشق تھا، جو علیؑ کا محب تھا، غلام تھا۔ مگر خدمت اتنی زیادہ کی کہ علیؑ کو کہنا پڑا کہ قنبر! میں تم سے راضی ہوں۔ درِ علیؑ کی غلامی اس انداز سے کی کہ مولاؑ نے کہا کہ قنبر! تم میرے بیٹے ہو۔

یہ درست ہے کہ کچھ لوگوں نے علیؑ سے ٹوٹ کر پیار کیا لیکن جو پیار قنبر نے کیا، شاید ہی اتنا کوئی کر سکے۔ لوگ اپنے لئے جیتے ہیں لیکن قنبر علیؑ کیلئے جیتا تھا۔ دنیاوالوں کی مختلف خواہشیں ہوتی ہیں لیکن قنبر کی ایک خواہش تھی کہ ان کے مولا وآقا ان پر راضی رہیں۔ لوگ اپنے لئے دعائیں مانگتے ہیں لیکن جنابِ قنبر علیؑ اور حسنینؑ کی سلامتی کیلئے دعا کیا کرتے تھے۔ علیؑ کی حسرت رہی ہے کہ قنبر اپنے منہ سے انؑ سے کوئی چیز مانگے۔

لوگ علیؑ کے چہرۂ اقدس کو دیکھتے تھے لیکن قنبر کی نظریں علیؑ کے قدموں پر ہوا کرتی تھیں۔ ادھر لب ہائے امامت کھلتے، اُدھر "جی میرے آقا، جی میرے آقا، قنبر حاضر ہے" کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حالتِ امن ہو یا زمانہ جنگ ہو، زمانہ حکومت ہو یا دورِ گوشہ نشینی، قنبر علیؑ کے قدموں سے جدا نہ ہوا۔ اگر محبت وعقیدت کا کوئی وزن ہوتا تو قنبر کی علیؑ سے محبت کو کبھی تولا نہیں جاسکتا۔

علیؑ فرماتے تھے کہ قنبر کچھ کھاپی لو۔ عرض کرتے: مولاؑ! آپؑ نے کھایا ہے جو میں کھاؤں پیوں؟ علیؑ فرماتے تھے: قنبر سولو، تھوڑی دیر کیلئے آرام کرلو۔ تو کہتا: مولاؑ! آپؑ نے آرام کیا ہے جو میں آرام کروں۔ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ رب العالمین ہے۔ قنبر اللہ کی عبادت اس لئے کیا کرتا تھا کہ وہ علیؑ کا رب ہے۔

عام طور پر حالات کے مطابق لوگوں کے خیالات بدل جاتے ہیں لیکن قنبر کا خیال نہ بدلا۔ وقت بدلتا ہے تو سوچیں بھی بدل جاتی ہیں لیکن قنبر کی سوچ نہ بدل سکی۔ انسان کی زندگی میں کئی موسم آتے ہیں لیکن قنبر کی زندگی کا ایک ہی موسم تھا۔ میرے نزدیک قنبر نے مولائے کائنات کی اتنی خدمت کی کہ خدمت کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اتنی غلامی کی اور اس انداز میں کی کہ خدمت وغلامی کے ساغر چھلک اٹھے۔ علیؑ کو اس طرح چاہا کہ عقیدت کے نقشے مٹ گئے، محبت کی حدیں ختم ہوگئیں، خلوص کی خاصیتیں جواب دے گئیں۔

اب میں اپنے عقیدہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ جس طرح دنیا میں قنبر سایہ بن کر علیؑ کے ساتھ ساتھ رہتا، اسی طرح آخرت میں بھی قنبر علیؑ سے جدا نہ ہوا ہوگا۔ وہ فرشتوں اور رضوانِ جنت سے کہتا ہوگا کہ فرشتو! ہٹ جاؤ، علیؑ کی خدمت مجھے کرنے دو کہ میرا دل ابھی خدمتِ علیؑ کے ساتھ ہے۔ عام طور پر غلامی کی حد انسان کے جینے تک ہوتی ہے لیکن قنبر کی غلامی کی حد کوئی نہیں ہے۔ وہ دنیا میں بھی غلام علیؑ رہا اور آخرت میں بھی غلامِ علیؑ ہے۔ لوگ علیؑ کی باتیں سن کر خوش ہوتے تھے اور علیؑ قنبر کی باتیں سن کر خوش ہوتے تھے۔ عام طور پر لوگ ولایت کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں لیکن ولایت قنبر کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔ اس وقت کے نیک اور صالح لوگوں سے جب پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا مقصدِ حیات کیا ہے؟ تو وہ کہتے تھے آخرت، بہشت۔ مگر قنبر کا مقصد علیؑ اور بس علیؑ تھا۔

علیؑ وضو کرتے تو پانی قنبر لاتا۔ نماز پڑھتے تو مصلّٰی قنبر بچھاتا۔ میدان جنگ میں دشمن پر حملہ کرنے جاتے تو رکاب قنبر پکڑتا۔ جوتا اتار کر خطبہ دیتے تو قنبر اس جوتے کو آنکھوں اور سینے سے لگائے رکھتا۔ علیؑ غریبوں، فقیروں، ناداروں میں کوئی چیز تقسیم کرتے تو یہ فرائض بھی قنبر سرانجام دیتا تھا۔ علیؑ اپنے خانۂ اقدس پر تشریف لاتے تو قنبر دروازہ پر بیٹھ کر انتظار کرتا رہتا اور علیؑ گھر سے باہر تشریف لاتے تو ساتھ ساتھ رہتا۔ میرے نزدیک ہر مصور دنیا کی ہر چیز کو اپنی عکاسی کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور ہر نقاش مختلف اشیاء کو اپنی نقاشی میں لاسکتا ہے۔ لیکن قنبر کے اخلاص، قنبر کی محبت و عقیدت کی عکاسی و نقاشی نہیں کی جاسکتی۔

میں قنبر کے بارے میں کیا کہوں کہ انہوں نے کہنے کو کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ کیا لکھوں کہ کچھ رہ گیا ہو تو لکھوں۔ بے شک قنبر نے خدمتِ علیؑ کے حوالے سے ایسا عظیم کردار ادا کیا کہ الفاظ سے نطق چھن گیا، عبارات پر مہر سکوت ثبت ہوگئی، حروف کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ آخر کہنے والے کو کہنا پڑا کہ قنبر! تم جانو اور تمہارا آقا علیؑ جانے لکھنے والوں کو لکھنا پڑا کہ قنبر! تم جانو اور تمہارا مولاؑ جانے۔

جب اس دائمی اور لازوال محبت کے تمام دعویدار جاچکے تو علیؑ نے قنبر کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

قنبر! تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔

آخر میں علامہ اقبال کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

قطرۂ	آب	وضوئے	قنبرے
در بہا	برتر	زخون	قیصرے

یعنی "قنبر کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ قیصر، بادشاہِ روم کے ایک قیمتی موتی سے بلند تر ہے بلکہ قیصر کے خون سے کہیں افضل ہے۔"

دعا ہے کہ خداوند کریم ہمیں بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے حبداروں میں محشور فرمائے، آمین۔

میں ہوں آلِ محمدؐ کے در کا ادنیٰ سا غلام

عابد عسکری

عرضِ ناشر

کتابِ مستطاب ''معراجِ خطابت'' پیشِ خدمت ہے۔ یہ کتاب سید العلماء علامہ علی نقی نقوی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی مختلف تقاریر کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کی خاص بات یہ ہے کہ ممتاز دانشور عابد عسکری، فاضل قم نے اسے خاص اور نئے انداز میں مرتب فرمایا ہے۔ ہم بارگاہِ ایزدی میں قبلہ عسکری صاحب کی صحت وسلامتی اور ترقی کیلئے دعا گو ہیں۔

کتاب ہذا کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ علامہ علی نقی صاحب قبلہ کی چھیاسٹھ (66) تقاریر کا مجموعہ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہر تقریر سے پہلے موضوعات اور قبلہ علامہ ؒ کے چند اہم نکتوں کو درج کیا گیا ہے جس سے کتاب کے حسن اور دلآویزی میں مزید نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ سید العلماءؒ کی ذاتِ گرامی دنیا بھر کے علمی و دینی حلقوں، بالخصوص ہندوپاک میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں تو ان کو بیحد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ قبلہؒ جب مجالس پڑھنے کیلئے پاکستان آتے تھے تو ان کی تقاریر کو سننے کیلئے راستے اور سڑکیں بند ہو جاتی تھیں، تمام مکاتبِ فکر کے لوگ ان کی عالمانہ خطابت سے مستفیض ہوتے تھے۔

قبلہ علامہ نقن صاحب کے انتقال کے بعد ہماری علمی و مذہبی محافل بے رونق ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے منبر اداس ہیں۔ لیکن کیا کریں کہ ''جب احمدِ مرسل ہی نہ رہے تو پھر کون رہے گا''۔ اس تشنگی اور عقیدت کے پیشِ نظر ہم ان کے تقریری مجموعہ کو اس اُمید کے ساتھ شائع کر رہے ہیں کہ علامہ سید علی نقی نقویؒ کے چاہنے والے، عقیدت مند مومنین ان کے علمی خطابات سے مستفیض ہو سکیں۔

جو تقریریں موضوعاتی تھی، ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔ جو انفرادی تھیں، ان کو الگ، تاکہ قاری کو مطالعہ کرتے ہوئے کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کتاب کی چوتھی اہم بات یہ ہے کہ اس میں صرف موضوعی خطاب کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ قبلہؒ کے بیان کردہ مصائب کو ہم نے ''روایاتِ عزا'' میں مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب میں پانچ بزرگ علماء کے بیان کردہ مصائب درج ہیں اور اس کتاب میں صرف اور صرف فضائل اور دیگر عنوانات پر مشتمل تقاریر کی تدوین کی گئی ہے۔

حسن اتفاق سے عابد عسکری صاحب نے اس کتاب کا جو نام تجویز کیا ہے، وہ بھی ادارہ کے نام سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہمارے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم علامہ سید علی نقی نقویؒ کی تقاریر مرتب کر کے ایک کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ علامہ صاحب تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے علم و عمل کا بحرِ اوقیانوس موجزن ہو کر بہہ رہا ہے اور بہتا چلا جا رہا ہے۔ جملے سے جملہ، بات سے بات پیدا کرنا، نکتہ سے نکتہ نکالنا، موضوع کو پھیلانا اور پھر اس کا سمیٹنا، قبلہ نقن صاحبؒ کے لئے ہرگز مشکل نہ تھا۔

چونکہ آپ مجتہد تھے اور یونیورسٹی کے استاد تھے، اس لئے تقریر کرنا، لیکچر دینا اور علمی گفتگو کرنا ان کیلئے بیحد آسان تھا۔ آپ جب نتیجہ نکالتے اور نکتہ لگاتے تھے تو آپ کا تکیہ کلام تھا ''میں کہتا ہوں''۔ آپ جب یہ جملہ کہتے تھے تو پورے کا پورا مجمع داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ادھر علم و عرفان کی بارش ہوتی، ادھر داد و تحسین اور واہ واہ کے ساتھ مومنین نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت اور نعرۂ حیدری کی صدائیں بلند کر دیتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں میں ایک عجیب نوعیت کا جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کی زبان میں اتنی تاثیر اور اس قدر مٹھاس اور بیان میں اتنی سحر آفرینی تھی، جو شخص ایک مرتبہ آپ کی تقریر سنتا تو پھر وہ زندگی بھر قبلہ کا گرویدہ بن کر رہ جاتا۔ پھر قبلہ نقن صاحب، جس تقریر کو ایک مرتبہ بیان کرتے تھے، اس کو پھر نہ دُہراتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قبلہ پر مطالب کا الہام، مضامین کا القاء ہوتا ہے، لفظ اُترتے ہیں، استنباط علم کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کے حرف موتیوں کی شکل اور الفاظ پھولوں کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ کیا انداز بیان تھا اور کتنی بڑی علمی شخصیت تھی ان کی!

دعا ہے خداوند کریم آپ کے درجات عالیہ میں اضافہ فرمائے اور ہماری اس ناچیز سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

آمین۔

معراج کمپنی لاہور پاکستان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ
مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ
الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ
فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْنِ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ
"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"۔

1

رضائے الٰہی

ہجرت پیغمبرؐ تاریخ اسلامی میں اتنی اہم بات سمجھی جاتی ہے کہ سال کا آغاز اسی نسبت سے ہوتا ہے
حضرت ابوطالبؑ کی حیثیت پیغمبرؐ اسلام کیلئے ایک قلعہ کی سی تھی۔ اُن کے انتقال کے بعد آقائے نامدار کی حفاظت وخدمت کی تمام تر ذمہ داریاں حضرت علیؑ نے اپنے ذمہ لے لیں۔
حضرت علیؑ نے اپنا سر سجدۂ شکر میں رکھ دیا کہ خدا کا شکر ہے، اُس نے مجھے اپنے حبیب کا فدیہ بنایا۔
اپنے آخری رسولؐ کی حفاظت کیلئے اگر ان کے نفس کو وہی صورت دی جائے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے!
مولائے کائنات یہ کہہ کر بڑے اطمینان وایقان سے رسولؐ کے بستر پر سو گئے کہ میری جان جاتی ہے تو بے شک چلی جائے لیکن جنابِ رسالتمآبؐ کو کچھ نہ ہو۔

رضائے الٰہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ

ارشادِ حضرت احدیت ہے کہ دیکھو! انسانوں میں ایک ایسا بھی ہے جو اپنی جان کو رضائے پروردگار کی خاطر فروخت کر دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

یہ آیت جس موقع سے تعلق رکھتی ہے، وہ تمام شرکائے مجلس کے ذہن میں ہوگا۔ اب یہ بیع یعنی فروخت کرنا کیا کسی لفظی معاہدہ کے ساتھ ہوا؟ کیا کسی موقعِ خاص پر انہوں نے یہ کہا کہ میں نے بیچا؟ اور اللہ نے پھر کہا کہ میں نے خریدا۔ کبھی اس طرح کی بات چیت نہیں ہوئی تو آخر یہ جو خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ انسانوں میں ایک ایسا ہے جو اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے۔ تو یہ بیچنا کیا چیز ہے؟ یہ درحقیقت ان کے ایک عمل کی تعبیر ہے کہ انہوں نے جو ایک عمل انجام دیا، اسے خالق نے نفس کا بیچنا کہا۔ یعنی وہ عملی بیع تھی، کوئی لفظی بیع و شرح نہیں تھی۔ اس عملی بیع و شرح کی ابتداء اس وقت ہوئی کہ جب مشرکین نے یہ فیصلہ کیا کہ اس رات کو پیغمبرِ خدا کی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔

اس کے بعد خالق کا یہ حکم ہوا کہ پیغمبرِ خدا شہر چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ اسی کو ہجرت کہتے ہیں جو تاریخ اسلامی میں اتنی اہم بات سمجھی جاتی ہے کہ سال کا آغاز اسی نسبت سے ہوتا ہے۔ جب یہ واقعہ اتنا اہم ہے تو اس واقعہ میں جن شخصیات کا نمایاں کردار ہوا، اسے بھی فطرتاً نہیں بھولنا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ مصلحتاً بھول جائیں۔ ہجرت سے متعلق ایک غلط فہمی ہے اور وہ یہ ہے کہ رسولؐ خدا کی جان لینے کا منصوبہ بنا تو حکمِ الٰہی یہ ہوا کہ آپؐ ہجرت کیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطرۂ جان کی بناء پر رسولؐ کو چلے جانے کا حکم ہو گیا۔ یعنی ہجرت بر بنائے خطرۂ جان ہوئی ہے۔ لہٰذا جو بھی کسی خطرہ سے اپنے مرکز سے ہٹے، وہ مہاجر ہو گیا۔ مگر اب اس کا ایک نتیجہ جو ہوتا ہے، اس پر بھی غور کر لیجئے کہ اگر کوئی خطرۂ جان کی بناء پر میدانِ جنگ سے ہٹے تو اس کو بھی مہاجر کہہ دیجئے۔

لیکن نہیں، ہر خطرۂ جان سے جگہ چھوڑنے والے کو مہاجر نہیں کہنا چاہئے۔ حقیقت میں نوعیتِ ہجرت کے سمجھنے میں غلطی ہے۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ پیغامِ اسلام پھیلا تو یہ چرچا مدینہ تک پہنچا۔ مدینہ کے اصل باشندے تو اہلِ مکہ کے ہم مسلک تھے یعنی بت پرست تھے۔ وہاں آکر یہودی پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہوئے تھے اور سود کے کاروبار کے نتیجہ میں انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں جائیدادیں خرید لیں اور بڑی طاقت کے مالک بن گئے۔ کبھی کبھی ان دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا تھا۔ یہودی چونکہ ایک حد تک آسمانی کتابوں کا علم رکھتے تھے، اس لئے آخری رسولؐ کے آنے کی خبریں دے کر دھمکایا کرتے تھے کہ تم اب تو چاہے جتنا ہمیں ستالو، لیکن جب آخری رسولؐ آئے گا تو پھر وہ ساری دنیا سے بت پرستی کا خاتمہ کر دے گا اور تم یہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ہے۔

یہ یہود کے کردار کا تذکرہ ہے کہ پہلے یہ آئندہ فتح کی خوشخبری دیا کرتے تھے، ان کافروں پر جو وہاں تھے لیکن جب وہ رسولؐ آیا تو کافر مسلمان ہوگئے اور یہ سختی کے ساتھ کافر ہوگئے۔ تو یہودیوں کی زبان سے آخری رسول کی اطلاع اہلِ مدینہ تک پہنچتی رہتی تھی۔ باشندگانِ مدینہ کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں نزاع رہا کرتی تھی۔ جنگ ہونے والی تھی۔ ان میں سے ایک قبیلہ کے آدمی مکہ والوں سے مدد حاصل کرنے کیلئے مکہ آئے اور وہاں کے ایک بہت بڑے سردار کے پاس پہنچے۔ اُس نے یہ کہا کہ آجکل میں خود ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں، اس لئے تمہاری مدد سے مجبور ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مصیبت کیا ہے؟

اُس نے کہا کہ یہاں ایک آدمی نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے۔ یہ بات سن کر وہ لوگ نا اُمید ہوئے۔ سوچا کہ اب مکہ آگئے ہیں تو کعبہ جا کر طواف کرلیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ تم کعبہ جاؤ۔ کہنے لگے کہ اتنی دور سے آئے ہیں، جو اصل مقصد تھا، وہ بھی پورا نہیں ہوا اور ہم بغیر کعبہ کی زیارت کے چلے جائیں؟ آخر کیوں منع کرتے ہو؟

انہوں نے کہا کہ کعبے کے پاس وہ آدمی ہوتا ہے، وہاں وہ جو کہتا ہے کہ میرے اوپر اُترا ہے، اسے پڑھا کرتا ہے۔ اُسے سننا خطرناک ہے، لہٰذا ہماری رائے نہیں ہے کہ تم وہاں جاؤ۔ یعنی حق کی بات سننا ہمیشہ اہلِ باطل کو خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ جنہیں اپنے حق پر اعتماد ہوگا، وہ کبھی نہیں روکیں گے کہ وہاں نہ جاؤ۔ جنہیں احساس ہوگا اپنے عقائد کے کارخانہ شیشہ گری کا، وہ سنگِ تحقیق سے ڈریں گے۔ اس لئے انہیں اندیشہ ہوگا کہ کہیں اس میں ذوقِ تحقیق نہ پیدا ہو جائے۔

اُنہوں نے کہا: نہیں! ہم ضرور جائیں گے۔ وہ جو کچھ پڑھتا ہے، پڑھتا رہے، ہمیں کیا مطلب؟ جب یہ نہیں مانے تو انہوں نے کہا جاؤ گے تو ہم ذرا انتظام کردیں۔ تو وہ روئی لائے اور بڑی کوشش کے بعد روئی ان کے کانوں میں ٹھونسی۔ دبا دبا کر کانوں کو بند کیا اور کہا کہ اب جاؤ۔

اب میں کہتا ہوں کہ توفیقِ الٰہی ان کے شاملِ حال تھی اور پہلے سے کچھ نہ کچھ ذوقِ تحقیق ان کے ضمیر میں موجود تھا کہ یہاں سے تو وہ اس اہتمام کے ساتھ گئے لیکن راستے میں آپس میں ہر ایک نے کہا کہ یہ بہت بے عقلی کی بات ہے۔ یہ اس شہر کا نیا واقعہ ہے، اب اپنے شہر میں جائیں اور اس واقعہ کو نہ سنائیں۔ لہٰذا راستے میں انہوں نے وہ روئی کانوں سے نکالی۔ اب جو وہ کعبہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ حضرت کلامِ الٰہی پڑھ رہے ہیں۔ اُسی وقت ایسا اثر ہوا کہ جو خطرہ ان کے ناصحین کو تھا، وہی ہوا کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اب یہ دو آدمی جب واپس ہوئے تو مبلغِ اسلام ہو کر۔

ان کے اثر سے دوسرے لوگ متاثر ہوئے۔ کچھ نے قبول کیا، کچھ مشتاقِ تحقیق ہوئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دوسری مرتبہ وہاں سے سات آدمی آئے۔ یہ سات آدمی پیغمبرِ اسلام کی خدمت میں شرفیاب ہو کر گئے تو یہ ساتوں مبلغ ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے ہر گھر میں اسلام داخل ہوگیا۔ یعنی ہر گھر کے ایک دو آدمی مسلمان ہوگئے۔ اتنی کثرت سے وہاں مسلمان ہوگئے کہ تیسری دفعہ وہاں سے ستر آدمیوں کا وفد حضرت پیغمبرِ خدا کی خدمت میں آیا اور ان ستر آدمیوں نے اسلام قبول کرلیا اور اسی وقت حضورؐ کو مدینہ کی دعوت دی کہ آپؐ مدینہ تشریف لائیے، ہم آپ کی مدد کیلئے ہر طرح تیار ہیں۔

یہ دور وہ تھا کہ جناب ابوطالب کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور یہی وقت پیغمبرؐ خدا پر کٹھن تھا۔ متفقہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت ابوطالب کی حیثیت آپؐ کے لئے قلعہ کی سی تھی۔ وہ قلعہ نہ رہا تو پھر ہر طرح کی اذیتیں اور تکالیف آپ کو پہنچائی جارہی تھی۔

ان لوگوں کی پیشکش کا تذکرہ آپؐ نے اپنے خاندان کے افراد سے کیا کیونکہ جناب ابوطالبؑ کے اثر کی وجہ سے جو لوگ بظاہر اسلام میں داخل نہیں بھی ہوئے تھے، وہ بھی پیغمبرؐ خدا کے حامی و مددگار تھے۔ عباسؓ نے، جو حضرتؐ کے چچا تھے، کہا کہ وہ لوگ آئیں تو مجھے بلالینا، میں بھی اس گفتگو میں شریک ہوں گا۔

چنانچہ جب وہ لوگ دوبارہ آئے، جواب لینے کیلئے، تو جناب عباسؓ بھی موجود تھے۔ جناب عباسؓ نے اپنی خاندانی فصاحت سے کام لیتے ہوئے ان سے کہا کہ اگر دعوت دے رہے ہو تو پورے طور پر سمجھ لو، میں تمہیں یہ بات سمجھادوں کہ پورے عرب سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ تمام عرب تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ اگر پورے طور سے حمایت کرسکو تو لے جاؤ ورنہ جس طرح اب تک ہم نے حفاظت کی ہے، (انہوں نے ہم میں ابوطالبؑ کو بھی داخل کرلیا کیونکہ کردار ایک شخص کا ہوتا اور وہ پورے قبیلہ کیلئے باعثِ فخر ہوجاتا ہے)۔

توہم نے جس طرح اب تک ساتھ دیا ہے، اسی طرح آئندہ بھی مقابلہ کرتے رہیں گے۔ مدینہ کے وفد میں اس بیان سے جو جذبہ کا اضافہ ہوا، انہوں نے کہا کہ ہم آخری قطرۂ خون تک بہانے کیلئے تیار ہیں۔

اسی وقت ہجرت کا منصوبہ بن گیا مگر پیغمبرؐ خدا (معاذ اللہ) لیڈر نہیں تھے کہ قوم کو خطرہ میں چھوڑ جائیں اور خود نکل کر چلے جائیں۔ اس لئے آپؐ نے اصحاب کو بھیجنا شروع کردیا۔ دس دس بیس بیس اصحابیوں کے قافلے جانے لگے۔ صورت واقعہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہجرت کے موقع تک چند آدمی رہ گئے تھے جو نہیں گئے تھے یا وہ جو بالکل مجبور تھے مثلاً کسی کے دائرہ غلامی میں تھے اور ظلم کا شکنجہ اتنا سخت تھا کہ وہ جا ہی نہیں سکتے تھے، جیسا کہ جناب بلالؓ وغیرہ۔ تو یہ رہ گئے اور باقی تمام اصحاب جاچکے تھے۔

اب مشرکین نے دیکھا کہ یہ سب تو وہاں چلے جارہے ہیں اور عنقریب یہ بھی چلے جائیں گے۔ اگر انہیں ذات سے عداوت ہوتی تو اطمینان کا سانس لیتے کہ جسے ہم پسند نہیں کرتے، وہ ہمارے درمیان سے جارہا ہے مگر انہیں ذات سے عداوت نہ تھی، پیغام سے عداوت تھی۔ لہٰذا انہوں نے طے کرلیا کہ انہیں ہم وہاں تک نہ پہنچنے دیں گے۔ ان کے پیغام کیلئے جو زمین ہموار ہے، وہاں تک یہ نہ پہنچنے پائیں۔ تو بس ایک جملہ اس غلط فہمی کے دُور کرنے کیلئے کافی ہے کہ منصوبہ ہجرت خطرۂ جان سے نہیں پیدا ہوا بلکہ خطرۂ جان منصوبہ ہجرت سے پیدا ہوا۔

اب ہجرت کرکے جو جارہا ہے، وہ اپنی جان بچانے کیلئے نہیں جارہا ہے بلکہ خالق کے منصوبہ کو بچانے کیلئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہے اور جوانؑ کے بستر پر سوئے گا، وہ اپنے چچازاد بھائی کی جان بچانے کیلئے نہیں سویا ہے بلکہ مقصدِ خالق کی حفاظت کیلئے سویا ہے۔

انہوں نے منصوبہ بنایا، رات مقرر کردی گئی۔ اس کیلئے دارالندوۃ میں اجتماع ہوا۔ ہر شخص نے اپنی رائے پیش کی۔ کسی نے کہا

کہ ایک آدمی کا قتل کر دینا کونسا مشکل ہے، کوئی جا کر قتل کر دے۔ کسی نے کہا کہ نہیں! بنی ہاشم پھر انتقام لئے بغیر نہیں رہیں گے اور ایک مدت تک جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کسی نے کہا کہ قید کر دو۔ انہوں نے کہا کہ بنی ہاشم چھڑوا کر لے جائیں گے۔ آخر میں ایک جہاندیدہ، بظاہر بہت ہی سن رسیدہ تجربہ کار آدمی نے یہ بات کہی کہ کوئی ایک آدمی نہیں، ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی چن لو، وہ سب جا کر اجتماعی طور پر اس کام کو انجام دیں تاکہ تمام قبیلوں پر خون تقسیم ہو جائے۔ پھر بنی ہاشم کس کس کا مقابلہ کریں گے۔ یعنی یہ چیز کہ نمائندے مل کر جمع ہوں تو جو کام کیا جائے، اس کی ذمہ داری تقسیم ہو جائے۔ یہ شروع اُس وقت سے ہوا۔

رات معین ہو گئی۔ ان کے مقابلہ میں خالق نے منصوبہ بنایا اور میں نے جیسے یکساں الفاظ صرف کئے ہیں، بالکل وہی قرآن نے صرف کئے ہیں۔ انہوں نے ایک ترکیب کی اور ہم نے بھی ایک ترکیب کی۔ یعنی لطافت تو جبھی ہوتی ہے کہ اس طرح کام انجام دیا جائے کہ دوسرا سمجھے نہیں۔

تو خالق نے جو ترکیب کی، اس میں گویا انہیں بیوقوف بنانے کا پورا اہتمام کیا۔ خالق کی طرف کا پورا منصوبہ یہ کہ رسولِ خدا کو حکم ہوا کہ آپؐ تو چلے جایئے اور ایک خاص نام بتایا کہ اس شخص کو، جس پر آپ کا گمان ہو سکے، بستر پر لٹا جایئے۔ اور ہم ترکیب یہ بتا رہے ہیں تو یہ بھی بتا دیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بال بھی بیکانہ کر سکیں گے۔ جو ہمارا مقصد ہے کہ آپؐ مدینہ پہنچ سکیں، وہ پورا ہو گا۔

یہ کام آپؐ انجام دیجئے۔ اب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلایا اسے، جس کے لئے کہا گیا تھا اور ارشاد فرمایا کہ حکمِ الٰہی یہ ہوا ہے کہ میں چلا جاؤں اور اس رات تم کو اپنے بستر پر لٹا جاؤں۔ تو انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا کیا ہو گا؟ یہ پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تو محفوظ رہے گی؟ جو پوچھا تھا، اس کا جواب دے دیا کہ مجھ سے حفاظت کا وعدہ ہوا ہے یعنی خالق نے ذمہ داری لے لی ہے۔

بس اب یہ سننا تھا، دیکھئے علم نبوت اور علم امامت کو درمیان میں لائیں گے تو تاریخ کا کوئی واقعہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس یہ سننا تھا کہ انہوں نے اپنا سر سجدۂ شکر میں رکھ دیا کہ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے اپنے حبیب کا فدیہ بنایا۔

اسے جناب شاہ عبدالحق محدث دہلوی "مدارج النبوۃ" میں، جو فارسی زبان میں ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ یہ پہلا سجدۂ شکر ہے جو روئے زمین پر ہوا۔ سجدۂ شکر جزو سنت ہے یعنی اب شریعت میں سجدۂ شکر کا وجود ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ قرآن کی آیت سے سجدۂ شکر نہیں بنا ہے، قرآن ناطق کے عمل سے بنا ہے۔

شکر سجدۂ کیا کہ اللہ نے مجھے فدیہ قرار دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہی سجدۂ شکر جان کا بیچ دینا تھا۔ ان کا آج کا کردار شروع یہاں سے ہوا کہ جب سجدۂ شکر کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنی جان بیچ دی۔ چنانچہ انہوں نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ عمل میں لا کر دکھایا۔

چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس محاصرے سے پہلے پیغمبرِ خدا کو اپنے گھر سے برآمد ہونے پر مامور کر دیتا۔ جب محاصرہ مکمل ہو گیا تو حکم ہوا کہ اب آپؐ اس محاصرہ کے اندر سے چلے جایئے۔ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے درمیان سے تشریف لے گئے تو اب دنیا دیکھے کہ خدا کو جب کسی کی حفاظت کرنا ہوتی ہے تو

غیبت ہی سے کام لیتا ہے۔

ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ خدا کی قدرت کے لئے ایک گھڑی کی غیبت اور ایک ہزار برس کی غیبت میں کوئی فرق نہیں ہے پیغمبرؐ خدا ان کے محاصرہ کے مکمل ہونے کے بعد ان کے درمیان سے تشریف لے گئے اور انہوں نے نہیں دیکھا۔ حضرت علیؑ اسی وقت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر چادر رسولؐ اوڑھ کر لیٹ گئے۔ عرب کے مکانوں کی نیچی نیچی دیواریں، وہ دیکھ رہے تھے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور نظر آتا تھا کہ واقعی ہیں۔

لہٰذا اطمینان سے گھیرے رہے۔ اطمینان سے محاصرہ کیے رکھا۔ اب ایک پہلو پر غور کیجئے کہ حکم ہوا تھا بستر پر لیٹنے کا۔ سونے کا حکم نہیں تھا اور عقلی طور پر حکم لیٹنے کا ہی ہوسکتا ہے، سونے کا نہیں ہوسکتا۔ کام افعال اختیاری سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لیٹ رہنا انسان کا ارادی فعل ہے۔ سو جانا انسان کا ارادی فعل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ حکم ہو نہیں سکتا تھا کہ سو جاؤ۔ یہی حکم ہوسکتا تھا کہ لیٹ رہو۔ ارادی کام یہی تھا، اس کے بعد جاگنا اور سونا، یہ نفس کی کیفیت سے متعلق ہے۔ اگر نفس مضطرب ہے تو جاگتا رہے گا، اگر نفس مطمئن ہے تو سو جائے گا۔

ہر صاحب فہم غور کرے کہ علیؑ، علیؑ ہوتے ہوئے تو اتنے خطرہ میں نہ تھے جتنے رسول بن کر لیٹنے میں خطرہ تھا۔ ہم نے دنیا میں بھیس بدلے ہوئے دیکھے ہیں، عموماً بھیس وہ بدلتے ہیں جو خطرہ سے دور ہوں، مثلاً مرد عورتوں کا لباس پہن کر خطرہ سے نکلا کرتے ہیں۔ مگر یہ نیا بھیس بدلنا دیکھا کہ جس کے قتل کا منصوبہ ہو، اس کے بستر پر لیٹا جائے اور ان کی چادر اوڑھی جائے۔

اب ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلاؤں کہ خطرہ میں جو ذرا کمی تھی، اس کو اللہ نے اپنی قدرت سے پورا کر دیا۔ یعنی خطرہ کو بڑھا دیا کیونکہ متفق علیہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں حلیے بھی لکھے ہوئے ہیں کہ پیغمبرؐ خدا کا قد و قامت اور طرح کا تھا اور حضرت علی علیہ السلام کا قد و قامت اور طرح کا تھا۔ مگر عجب بات ہے کہ وہ جو گھیرے ہوئے تھے، وہ کوئی اغیار تو نہیں تھے، اسی قبیلہ کے لوگ جن کے درمیان ترپن (53) برس وہ رہ چکا جو گیا ہے اور تیئیس (23) برس یہ رہ چکا جو لیٹا ہے۔

شاعر کی زبان میں یوں کہوں کہ جو گھیرے ہوئے ہیں، وہ خوب اندازِ قد سے واقف ہیں مگر بیوقوف رات بھر سمجھتے رہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بستر پر ہیں اور اگر نہ سمجھتے تو اسی وقت تعاقب میں چلے کیوں نہ جاتے؟ اسی وقت سمجھ لیتے تو خدا کا منصوبہ شکست کھا جاتا۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ رات بھر نہیں سمجھے۔

اب کیوں نہیں سمجھے؟ آج کل تو سائنس کی دنیا ہے، کسی بات کو بے سمجھے نہیں مانا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ رات بھر ڈھونڈنے نہیں نکلے، صبح کو گئے۔ جب چادر ہٹائی تب سمجھے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں، علی ہیں۔ تو آخر یہ رات بھر کیوں نہیں سمجھے؟ سائنس کی دنیا غور کرے یا جو میں کہوں، اسے قبول کرے۔ میں کہتا ہوں کہ یا تو یہ بات ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ بستر پر لیٹو۔ تو لیٹنا ان کا کام تھا اور اللہ نے رات بھر کے لئے رسول بھی بنا دیا۔

قرآن مجید کہہ رہا ہے:

"قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ".

''ہمارا قول ہوا کہ اے آگ! سرد ہو جا اور سلامتی رہے ابراہیم پر۔''

کیا جتنی دیر میں میں نے یہ آیت پڑھی اور ترجمہ کیا، اتنی دیر میں اس نے یہ آیات پڑھیں؟ یہ تو جب ہوتا جب متکلم زبان و دہن سے بات کرتا ہوتا اور جب وہاں زبان و دہن سے کلام نہیں ہے۔ وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے، یہ قول بھی لفظی نہیں ہے کہ یہ الفاظ اس نے کہے جس میں اتنی دیر لگے، بلکہ یہ ایک اشارۂ قدرت اور اس کی لفظی تعبیر ہے۔

تو کیا اسی طرح کے ایک اشارہ میں وہ رات بھر کیلئے علیؑ کو رسول نہیں بنا سکتا؟ اور پھر قرآن کے ماننے والے کو میری اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے، نہ انکار کرنا چاہیے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کیلئے ایک دشمن کو عیسیٰؑ کی شکل دے دی جائے تو اپنے آخری رسولؐ کی حفاظت کیلئے اگر ان کے نفس کو وہی صورت دے دی جائے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟

یہ کوئی ایسی قابل انکار بات نہیں یا پھر میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے، سائنس والوں کی سمجھ میں آنے کی یہ بات بھی نہیں ہے، اگر یہ بات بھی نہیں ہے اور وہ بات بھی نہیں ہے تو پھر کیا بات ہے؟ سب اندھے ہو گئے تھے؟ کیا کوئی پہچان نہیں رہا تھا جبکہ دونوں کے قد و قامت سے خوب واقف! تو یا تو وہ بات ہے جو میں نے کہی یا پھر رسول کی چادر کی کرامت ہے کہ جب رسولؐ اوڑھیں تو انؐ کے جسم پر راست اور جب علیؑ اوڑھیں تو انؑ کے جسم پر راست اور جب پانچوں آ جائیں تو وہ پانچوں کیلئے کافی۔ میرا تصور یہ ہے کہ یہ چادر قد و قامت پر نہیں ناپی گئی تھی، یہ نور واحد پر بیونتی گئی تھی۔

بعد میں حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا کہ جیسی گہری نیند ہجرت کی رات سویا، ویسی گہری نیند کبھی نہیں سویا۔ ہمارے لئے تو ان کا ارشاد ''آمنا و صدقنا'' کہنے کیلئے کافی ہے لیکن دنیا بر بنائے واقعہ اس پر غور کرے کہ عرب کے نیچے نیچے مکان، وہ دیکھ رہے تھے کہ سامنے ہیں اور آپس میں باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ بھی تاریخ میں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ابھی حملہ کر دو، داخل ہو جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں، صبح تک انتظار کرو، جلدی کیا ہے؟ اب کوئی بھاگ کر تو نہیں جائیں گے؟ یہ سب چرچے آپس میں ہو رہے ہیں، نیزے بھی لٹک رہے ہیں، تلواریں بھی چمک رہی ہیں اور یہ سب آپس میں باتیں بھی کر رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی نفس غیر مطمئن ہوتا تو رات بھر یہ راز راز رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بار بار چادر الٹ کر دیکھتا کہ آ تو نہیں رہے ایہ رات بھر راز رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تو سو رہے تھے، انہیں تو مطلب ہی نہیں تھا کہ آ رہے ہیں یا نہیں آ رہے اور گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ سب آپس میں باتیں کیا کریں، یقیناً ہمارے لئے خلاف فطرت ہے یہ گہری نیند۔ ہمارے ہاں تو محلہ میں کھٹکا ہو جائے تو نیند اڑ جائے، چہ جائیکہ اپنے گرد کھنچا ہوا تلواروں اور نیزوں کا حصار ہو اور اس میں گہری نیند آئے۔

دوسری بات یہ کہ جسے رات کو سونے کی عادت نہ ہو، اسے کیونکر نیند آئے گی۔ انؑ کی رات تو محراب عبادت میں جاگ کر گزرتی تھی، تو یہ کبھی سوتے نہیں تھے۔ آج کیونکر نیند آ گئی۔ اس لئے بھی خلافِ فطرت۔ اس کے علاوہ نفسیاتی طور پر جو کسی عبادت کا ذوق رکھتا ہو اور اسے کسی وجہ سے، بہانہ لا سکے تو اسے قلق ہو جاتا ہے، اسے صدمہ ہوتا ہے، بے چینی ہوتی ہے۔ تو پھر ان کو کیوں ایسا اطمینان ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ بے چینی اسے ہوتی جس کی عبادت بر بنائے عادت ہوتی لیکن جس کی عادت بر بنائے احساسِ فرض ہو؟ تو

میں کہتا ہوں کہ گہری نیند سونے کا راز ہی یہی ہے یعنی یہ احساس کہ جس کی خاطر روز جاگتا تھا، اسی کی خاطر آج سو رہا ہوں۔ تو حضور والا! یہی راز ہے ان کے گہری نیند سونے کا اور دوسرا راز میرے موضوعِ بیان سے متعلق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نیند اُس کی اُڑے جو جان کو اپنی جان سمجھتا ہو اور جو جان کو فروخت کر چکا ہو، اُسے کیوں فکر ہو؟ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک بہت ہی عام محاورہ ہے۔ جو شخص بہت ہی غافل نیند سوئے، اسے کہتے ہیں گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ تو جو گھوڑے بیچ کر سوئے، وہ تو گہری نیند سوئے گا اور جو جان بیچ کر سوئے۔۔؟

دیکھئے اس وقت سجدۂ شکر کیا جب کہا گیا کہ بستر پر سوؤ۔ اب اللہ نے حفاظت کی اور ایک روایت کے مطابق جبرئیلؑ و میکائیلؑ بھیجے گئے کہ دیکھو، اس کی حفاظت کرو۔ میں کہتا ہوں کہ کیا یہ فرشتے جو بھیجے ہیں، وہ اس لئے کہ ان کی جان کو گزند نہ پہنچے؟ انہوں نے تو جان دے دی۔ اب یہ جو اس نے فرشتوں کو بھیجا ہے، یہ اپنے کام سے بھیجا ہے کہ ابھی اس جان سے اُسے کچھ کام لینے ہیں تو اپنے مقصد کیلئے ان کی حفاظت کا بھی سامان کیا۔ لیکن وہ ہم ہیں جنہیں جان کے بچنے کی خوشی ہو۔ یہ تو شاید جب زندہ و سلامت بستر سے اٹھتے تو کچھ ملول ہوتے، صدمہ ہوتا کہ میں نے جان دی تھی اور وہ جیسے قبول نہیں ہوئی۔ میرا مقصد پورا نہ ہوا۔ ذہنیتوں کے اختلاف سے اثر بدلتا ہے، کوئی اور ہوتا تو خوش ہوتا۔ انہیں ممکن ہے کہ صدمہ ہوتا تو خالق نے یہ آیت اُتاری کہ: "وَمِنَ النَّاسِ"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک یہ آیت اُتری ہو، ہوسکتا ہے کہ صدمہ رہا ہو۔ اس عالم الغیب نے انؑ کے نفس کی کیفیت دیکھ کر یہ آیت اُتاری کہ:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ"

"دیکھو! انسانوں میں ایک یہ بھی ہے جو ہماری مرضی کی خاطر جان کو فروخت کر دیتا ہے۔"

اس وقت یہ کہتا ہوں کہ قرآن کی یہ آیت دراصل جان کی رسید ہے کیونکہ بظاہر تو جان انہی کے جسم میں رہی۔ تو خالق نے یہ رسید قرآن میں اُتار دی کہ تم نے جان دی اور ہم نے پائی۔ اب ہمارے ہو کر زندہ رہو۔

اب اُنؑ کی پوری زندگی آیت کی تفسیر ہے۔ اب انہیں دوسروں کے عمل کو نہیں دیکھنا ہے۔ اُحد کا میدان ہے، ہوا کرے۔ جس کی جان اپنی ہو، وہ بچانے کی فکر کرے۔ جب یہ جانتے ہیں کہ میری جان میری نہیں ہے، کسی اور کی ہے، خدا کی ملکیت اب ان کی امانت ہے اور امین افراد کیلئے امانت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اب یہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا امانت دار سمجھ رہے ہیں کہ یہ میرے جسم میں میری جان اللہ کی امانت ہے۔ تو جب تک امانت رہے، انسان کو فکر ہوتی ہے۔ کسی کو شب ہجرت کی فکر ہوتی، انہیں عمر بھر کی فکر ہے۔ اس لئے بس ایک سجدۂ شکر مجھے صفحۂ تاریخ پر ملا۔ عمر بھر مجھے سجدۂ شکر نہیں ملا۔ یہ بڑا اہم دعویٰ میں نے کیا ہے کیونکہ روایات میں ڈھونڈنے سے غلط سے غلط بات مل جاتی ہے مگر بعض اوقات سچائی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ جھوٹ کو قدم رکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جس میں موقع پر دنیا سجدۂ شکر کرتی، ان کے ہاں مجھے نہیں ملتا۔

شب ہجرت حصار سے جب نکلے، تب سجدۂ شکر کرتے۔ کوئی ضعیف سے ضعیف روایت نہیں کہ سجدۂ شکر کیا ہو۔ بدر میں کیسا خطرناک موقع، ہزاروں کے مقابلہ میں تین سو تیرہ آدمی، بے سروسامانی ایسی کہ صرف تیرہ تلواریں۔ وہاں سے فاتحانہ شان سے واپس

ہوئے تو گھر آ کر سجدۂ شکر کیا ہوتا کہ ایسے خطرناک موقع سے زندہ واپس ہوا۔ مگر بدر کے اختتام پر سجدۂ شکر نہیں کیا۔

اُحد میں تنہا گئے، ستر زخم جسم پر آئے مگر زندہ سلامت واپس آئے، پھر سجدۂ شکر کیا ہوتا۔ اتنا خطرناک موقع اور پھر بھی زندہ واپس ہوا، اس وقت سجدہ شکر کرتے۔ ارے! سجدۂ شکر نہ کرتے، سیدۂ عالم سے کہتے کہ شکر کریں۔ مگر کوئی جھوٹی روایت بھی نہیں ملتی۔ نہ خود شکر کرتے ہیں اور نہ کسی اپنے سے کہتے ہیں کہ شکر کرو۔

خندق کا خطرناک موقع جہاں ایک سورما ایسا آیا جو ہزار کے مقابلے میں ایک تھا اور جنگ شروع ہونے سے پہلے لوگ سوچ میں پڑے ہوئے تھے کہ اس سے کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ یہ اس کے مقابلے میں باوجود یہ کہ زخمی ہوئے، اس کی تلوار سر مبارک پر پڑی۔

ایک یہ سورما جس کا وار علی علیہ السلام پر چل گیا اور اس نے زخمی کیا، اس سے ایک بڑی حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ علیؑ جنگ میں کبھی قوتِ امامت سے نہیں لڑے، ورنہ کبھی زخمی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ہمیشہ انسانی قوت اور انسانی فن سے لڑے۔ کبھی قوتِ امامت سے نہیں لڑے اور وہ ہزار کے مقابلے میں ہو، جتنا کسی کا ہاتھ طاقتور ہوگا، اتنی ہی اس کی ضرب بھی طاقتور ہوگی۔ پھر بھی تلوار جیسی بھی تھی، آپؑ فتح کر کے اور دشمن کو تہہ تیغ کر کے واپس ہوئے تو اب موقع تھا کہ سجدۂ شکر کرتے کہ اتنے بڑے غنیم کے مقابلہ میں فتح پائی۔ لیکن کسی تاریخ میں، کسی موقعہ پر مجھ کو نظر نہیں آتا کہ سجدۂ شکر کیا ہو۔ اگر کسی کی نظر سے گزرے تو مجھے بتا دے تاکہ میری معلومات میں اضافہ ہو اور میں اتنی قوت کے ساتھ پھر انکار نہ کروں۔ تو جناب! عمر بھر میں نہیں دیکھتا کہ کبھی سجدۂ شکر کیا ہو۔ خیبر سے واپس آ کر، حنین سے واپس آ کر اور پھر پیرانہ سالی میں جمل سے واپس آ کر صفین سے واپس آ کر، نہروان سے واپس آ کر، کبھی نہیں کیا، عمر بھر نہیں کیا سجدہ شکر، بلکہ احساس ہے ایک بار امامت کا۔ جب فتح کر کے واپس آتے ہیں، سجدۂ شکر نہیں کرتے کہ ابھی راستے میں ہوں، منزل ابھی دور ہے، لیکن ایک حملہ ہے جس میں روح سجدۂ شکر کرتی ہے، وہ کونسا؟ جب تلوار سر پر پڑی، تو اب کہا:

"فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ"

"خدا کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔"

بخدا! اس جملہ میں وہی ہے جو الحمد للہ میں ہے۔ اس جملہ میں وہی ہے جو سجدۂ شکر میں ہے۔ اب سمجھے کہ وقت آ گیا امانت کو مالک تک پہنچانے کا۔ اس کا سامان ہو گیا۔ سجدۂ شکر ان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کیسی ضربت تھی یہ؟ اس محل پر ہزار کے مقابل کا جو سورما تھا، اس کی تلوار پڑی تھی، اسی محل پر یہ تلوار پڑی ہے، یہ تلوار کیسی قیامت خیز تھی کہ فاتح خیبر کا یہ عالم ہو گیا کہ بیٹوں سے کہتے ہیں کہ گھر لے کر چلو، مجھے گھر لے کر چلو۔ ان الفاظ میں کتنی بے بسی ہے۔

اربابِ عزا! لے چلنے کا ایک تصور تو یہ ہوتا ہے کہ سہارہ دے کر لے چلے، اس کے بعد یہ کہ بغلوں میں ہاتھ دے کر لے چلے لیکن صورت لے چلنے کی یہ بتائی ہے کہ ایک چادر لائی جاتی ہے، اس میں لٹایا جاتا ہے یعنی کسی کا جنازہ ایک دفعہ اٹھا ہوگا، ان کا جنازہ دو دفعہ اٹھا۔ اس چادر میں گھر لائے جاتے ہیں۔ خود محسوس کر لیا تھا کہ اب میں جانبر نہیں ہو سکتا، اسی لئے اپنے الفاظ میں سجدۂ شکر کیا تھا۔ جبھی تو شکرانہ ادا کیا کہ الحمد للہ، میں کامیاب ہوا۔ یہ علی علیہ السلام کا انتہائے سفرِ زندگی پر سجدۂ شکر ہے۔

2

جو اُسوہِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے

قرآن میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ہے وہاں وہاں پیغمبرِ خدا کی اطاعت کا بھی حکم ہے۔

معیارِ سنت یہ ہے کہ جو کام ہم کر رہے ہیں کیا یہ قولِ رسولؐ، فعلِ رسولؐ یا تقریرِ رسولؐ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟

اللہ کا ارشاد ہے کہ ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ کسی سلسلہ میں کوئی اجتماع ہو وہاں چاہے جو ہو اس پر کبھی بدعت کی بحثیں نہیں ہوتیں لیکن یہ مجالس رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بارے میں ہوں تو یہ بحثیں شروع ہو جاتی ہیں۔

یاد رکھیں، ہم موت پر گریہ نہیں کرتے بلکہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے مصائب پر گریہ کرتے ہیں، جنابِ رسالت مابؐ بھی اپنے نواسوں کے آنے والے مصائب پر گریہ فرماتے تھے۔

جو اُسوہِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ"۔

ارشاد ہو رہا ہے تمام فرزندانِ اسلام کو مخاطب کر کے کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں عمل کا بہترین نمونہ ہے۔ ہم اطاعت کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی اور اتباع کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی۔ لیکن پیروی کے معنی درحقیقت نقشِ قدم پر چلنا اور افعال و اعمال کو نمونہ بنا کر عمل کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کا حکم ہے لیکن پیروی کا حکم، نقشِ قدم پر چلنے کا حکم، پیغمبر خدا کے سلسلہ میں ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ تمہارے لئے خدا اور رسول میں پیروی کا موقعہ ہے بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ:

"لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ"۔

"تمہارے لئے اس کے رسول میں"۔

ہمارے کانوں کو سننے کی عادت ہے خدا اور رسول، ہمیں ایک دھماکہ سے محسوس ہوتا ہے کہ خدا کا نام نہیں آیا اور بس رسول کا ہی نام آیا۔ تمہارے لئے خدا کے رسول میں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول میں۔ بس اللہ کے رسول میں۔

بات یہ ہے کہ بندے اللہ کی پیروی کیونکر کر سکتے ہیں، اس کیلئے ضرورت ہے کہ شاہراہِ عمل میں کسی انسان کے قدم ہوں مگر انسان ایسا ہو کہ اس کے قدموں سے جو نشان بنیں، وہ راہِ رضائے پروردگار ہوں۔

پیغمبر خدا کی اطاعت کا بھی حکم اور ان کی پیروی کا بھی حکم۔ اطاعت کا حکم کہاں، جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ہے، وہاں پیغمبر خدا کی اطاعت کا حکم ہے۔ ہر جگہ:

"اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ"

اور پیروی کے حکم میں اللہ کا نام ہے ہی نہیں۔ بس رسولِ خدا کو مرکز قرار دیا ہے۔ اس بناء پر مسلم نقطۂ نظر مشترک طور پر یہ ہو گیا کہ معیارِ سنت یہ ہے کہ قولِ رسول ہو یا عملِ رسول ہو یا تقریرِ رسول ہو۔

قول و عمل اُردو میں اتنے استعمال ہوتے ہیں کہ ہر اُردو دان آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قول کلام اور عمل کام لیکن تقریر مختلف ہے۔ تقریر ہم اُسے سمجھتے ہیں جو سٹیج پر ہوتی ہے یا منبر پر ہوتی ہے۔ تقریر جو لیکچر کے معنی میں ہے، وہ قول میں داخل ہے۔ یہ الگ سے کیونکر ہوئی کہ قولِ رسول عملِ رسول اور تقریرِ رسول! تقریر کے معنی یہ ہیں کہ کسی مسلمان نے رسول کے سامنے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور پیغمبر خدا نے اس سے منع نہیں فرمایا یا اس کی رد نہیں کی۔

اگر کوئی عمل کسی نے غلط کیا تھا تو حضرت کو بحیثیت رہنما یہ فرمانا چاہئے تھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو؟ اور اگر اُس نے کوئی بات غلط

کہی آپ کے سامنے تو آپ کو رَدّ فرمانا چاہئے تھا کہ یہ بات غلط ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ رسول نے اگر خاموشی اختیار فرمائی اور اس عمل سے منع نہیں کیا اور اس قول کی رَدّ نہیں فرمائی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اس عمل سے راضی ہیں۔

جس طرح قولِ رسول کا معیارِ سنت ہے، جس طرح عملِ رسول کا معیارِ سنت ہے، اسی طرح تقریرِ رسول بھی معیارِ سنت ہے۔ اب سنت کا مطلب یہ ہے کہ ناجائز نہیں ہے، اس کی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ جو بات رسولؐ نے کہی، وہ واجب بھی ہوسکتی ہے اور مستحب بھی ہوسکتی ہے، مثلاً وضو میں ناک میں پانی ڈالنا سنت ہے یا کلی کرنا سنت ہے۔ یہ سنت واجب کے مقابلے میں ہے۔ مستحب کو مسنون کہتے ہیں تو وہ بات جو رسولؐ نے ارشاد فرمائی یا عمل کیا وہ عمل واجب بھی ہوسکتا ہے، مستحب بھی ہوسکتا ہے اور کم از کم جائز ہو سکتا ہے، مباح ہوسکتا ہے۔

یعنی جائز کام ہیں۔ جو واجب یا مستحب نہ ہوں، وہ بھی حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمل میں لاتے تھے۔ پیاس لگی ہے تو پانی پئیں گے، بھوک لگی ہے تو کھانا کھائیں گے۔ قولِ رسولؐ، اگر حکم دیا ہے تو واجب ہوگا یا مستحب ہوگا اور اگر عمل ہے تو وہ عمل واجب بھی ہوسکتا ہے اور مستحب بھی ہوسکتا ہے، مباح یعنی جائز بھی ہوسکتا ہے، ناجائز نہیں ہوسکتا۔

عملِ رسولؐ سے جواز یقیناً ثابت ہوگا اور جواز ہی کی اقسام ہیں واجب، مستحب اور مباح۔ اسی طرح سے رسولؐ کی تقریر یعنی کسی نے کوئی کام کیا اور رسولؐ نے منع نہیں فرمایا، اس میں بھی یہی تینوں اقسام آئیں گی کہ بہرحال اس نے جو کیا وہ غلط نہیں تھا۔ جو اس نے کیا وہ ناجائز نہیں تھا، ورنہ رسول کا فرض تھا کہ وہ اس کو منع فرماتے اور فرماتے کہ یہ ناجائز ہے۔ جب حضرتؐ نے اس کو منع نہیں فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم مباح تو ہے ہی۔ ہوسکتا ہے کہ مستحب ہو، واجب ہو یا جائز ہو۔

اسی طرح اس نے کوئی بات کہی اور حضرتؐ نے اس کی رد نہیں فرمائی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ناجائز نہیں ہے، غلط نہیں ہے۔ اگر وہ بات غلط ہوتی اور باطل ہوتی تو پیغمبرِ خدا منع فرماتے۔ تو یہ چیزیں معیارِ سنت ہیں۔ قولِ رسولؐ، عملِ رسولؐ اور تقریرِ رسولؐ۔ جو چیز ان میں داخل نہ ہو اس کی بھی اقسام ہیں۔ سنت کے مقابلہ میں ہے بدعت۔ جو چیز سنت نہیں ہے وہ بدعت ہے یعنی جو بدعت ہو وہ سنت نہیں ہوسکتی۔ لیکن سنت اگر نہیں ہے تو بدعت ضرور ہے۔

اس کو میں نے بلاجھجک نہیں کہا۔ اس میں ذرا نقطہ نظر کا فرق ہے۔ اس میں ہمارا محاورہ یہ ہے کہ جو بات سنت میں داخل نہ ہو، یعنی نئی ہو، وہ اگر آدمی جزوِ دین سمجھ کر کرے تو وہ بدعت ہوگی۔ بدعت کی تعریف ہمارے نقطہ نظر سے یہ ہے:

"اِدْخَالُ مَا لَيْسَ فِي الدِّيْنِ وَاِخْرَاجُ مَا هُوَ فِي الدِّيْنِ مِنَ الدِّيْنِ"

''جو چیز دین میں داخل ہے، اسے خارج کرنا اور جو چیز دین میں داخل نہیں ہے اس کو دین میں داخل کرنا یہ معیارِ بدعت ہے۔''

تو دین کا جزو قرار دے کر اگر کوئی نئی بات کرے تو وہ بدعت ہوگی۔ لیکن اگر یونہی کیا تفریحاً عادتاً، جزوِ دین سمجھ کر نہیں کیا۔ تو بس اس کو یہ دیکھنا ہے کہ ممانعت تو نہیں ہے۔ اگر ممانعت ہے تو ناجائز اور اگر ممانعت نہیں اور جزوِ دین سمجھ کر نہیں کیا، یونہی تفریحاً کیا ہے تو

پھر جائز ہے۔ اگر کوئی فائدہ سمجھ میں نہیں آتا تو مہمل بات ہے مگر اسے بدعت کہنا درست نہیں ہے، جبکہ دین کا جزو سمجھ کر نہیں کیا جارہا۔

فرض کیجئے کہ ذرا اونچی جگہ سے چھلانگ لگائی تو اگر اسے جزو دین سمجھ کر کرتے تو بدعت ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ فضول کام ہوگا، خلاف عقل ہوگا، مہمل کام ہوگا۔ مگر اسے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ بدعت اس وقت ہے جب جزو دین سمجھ کر کیا جائے یعنی جو چیز دین میں شامل نہیں ہے، اسے دین میں شامل کیا جائے اور جو داخل ہے، اسے خارج کیا جائے۔ جیسے صبح کی نماز میں اضافہ کرے اور دو کی بجائے تین رکعت پڑھے۔ دل میں ذوقِ عبادت ہو، میں انگریزی الفاظ نہیں بولتا مگر یہاں کہتا ہوں کہ اس دن نماز کا موڈ ہو، دو رکعت کی بجائے تین رکعت نماز پڑھ دے، تو چونکہ عبادت ہمیشہ وہ ہوتی ہے جو رضائے الٰہی کے لئے قصدِ قربت کے ساتھ ہو، جب قصدِ قربت کے ساتھ اس نے یہ کام کیا یعنی اس نے جزو دین بنایا تو صبح کی سہ رکعتی نماز بدعت ہو جائے گی۔

اب کوئی صاحب تھکے ہوئے ہوں تو کہیں کہ آج ایک ہی رکعت پڑھوں گا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک رکعت کو انہوں نے خارج کر دیا، یہ بدعت ہے۔ لیکن نماز تو انہوں نے دو رکعت ہی پڑھی ہے، صبح کی نماز کی نیت سے، لیکن دل چاہا اور انہوں نے اس کے بعد دو چار دفعہ کھڑے ہو کر، بیٹھ کر رکوع و سجود کی مشق کر لی، یہ کیا؟

کہا کہ اس وقت دل چاہتا ہے کہ نماز کے اجزاء کو مزید ادا کروں اس وقت کچھ جسم کا تقاضا بھی ایسا ہے کہ اس قسم کا کام کروں۔ یہ رکوع و سجود نما عمل انہوں نے کر دیا۔ لیکن بہ نیت جزو نماز نہیں کیا تو یہ فضول بات ہوگی یا ورزش ہو جائے گی۔ چونکہ عبادت کی نیت سے یہ عمل نہیں کیا ہے، تو بدعت نہیں ہوگی۔ ہاں! اگر جزو نماز سمجھ کر کرے تو بدعت ہوگی۔ غالباً اکثریت کا معیار یہ ہے کہ اگر کوئی نئی بات ہے یعنی نہ قولِ رسولؐ میں ہے نہ عملِ رسولؐ میں ہے اور نہ تقریرِ رسولؐ میں ہے، تو وہ بدعت ہوگی۔ میں اس وقت اسی نقطہ نظر کے ماتحت یعنی قولِ رسولؐ، عملِ رسولؐ اور تقریرِ رسولؐ کو بنیاد بنا کر معیارِ سنت و بدعت کو موضوعِ گفتگو بناؤں گا۔

ایک بڑے حلقے کی طرف سے شرک کی آوازیں بہت بلند ہوتی ہیں۔ بدعت کی آوازیں بھی بہت بلند کی جاتی ہیں۔ اس بناء پر جو معیار ہے، بدعت اور سنت کا، اس پر چند ایسی باتوں کو جانچوں گا جن میں اکثر بدعت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان کو جانچوں گا کہ وہ سنت میں داخل ہیں یا بدعت میں۔

بدعت اور سنت کا معیار یہ ہوا کہ جو چیز قولِ رسولؐ، عملِ رسولؐ یا تقریرِ رسولؐ میں ہو، وہ سنت اور جو اس میں داخل نہ ہو، وہ بدعت۔ اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جو چیز قولِ رسولؐ، عملِ رسولؐ یا تقریرِ رسولؐ ہو تو سنت ہے، ورنہ بدعت۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کے لباس بھی بدعت اور ہماری غذائیں بھی بدعت اور ہمارے سفر سب بدعت۔ اس لئے کہ جو غذائیں اس وقت ہم کھاتے ہیں، یہ رسولؐ نے کبھی نہیں نوش فرمائیں، نہ انہوں نے ان کے کھانے کا حکم دیا، نہ کسی نے ان کے سامنے ان غذاؤں کو کھایا تھا کہ وہ خاموش رہتے اور تائید ثابت ہوتی، تو ہماری کوئی غذا ایسی نہیں ہے، تقریباً سارے ہندوستان کی۔ اگر یہ ہے تو ہماری غذائیں سب بدعت۔

جس طرح کے لباس ہم پہنتے ہیں، یہ لباس رسولؐ کے زمانہ میں کسی نے نہیں پہنے کہ تقریرِ رسولؐ ہوتی، خود رسولؐ نے یہ لباس

نہیں پہنا کہ عملِ رسولؐ ہوتا۔ آپؐ نے ان کے پہننے کا حکم بھی نہیں دیا۔ یہ چیزیں اس زمانہ میں ہوتی ہی نہیں تھیں تو ان کا حکم کیا دیتے! لہٰذا یہ قولِ رسولؐ نہ عملِ رسولؐ۔ تو ہمارے لباس سب بدعت۔

اور جناب! کسی اور سفر کا کیا ذکر، حج کا سفر جو فریضہ ادا ہوتا ہے، وہ اس وقت اونٹ کی پشت پر ہوتا تھا، گھوڑے پر ہوتا تھا، اب موٹروں پر، ہوائی جہازوں پر اور بحری جہازوں پر ہوتا ہے۔ اس وقت تک تو مرکب یا سواری بدعت تھی اور اب تو راہ بھی بدعت ہوگی کہ سفر ہوتا تھا زمین کے اوپر یا دور دراز کا ہو تو سمندر میں یا دریا میں یہی چیزیں اس وقت ہیں بحر و بر۔ خشکی یا تری، یہی دو سفر ہوتے تھے۔ ہوا کا سفر اس وقت کہاں ہوتا تھا؟ اب جو سفر کرتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اب حاجی صاحبان زمین پر پیر ہی نہیں رکھتے، پرواز کر کر کے پہنچتے ہیں۔ وہ حج جو عبادت ہے، کیا وہ بھی بدعت ہو جائے گا؟

وہاں جا کر دیکھئے تو صفا اور مروہ کے درمیان چھت ہو گئی، وہ کیا بدعت نہیں ہوئی؟ پہاڑیوں کو اڑا کر زینے بنا دیئے تو وہ بدعت نہیں ہوئی؟ اور جس جس طرح ہے، وہاں سعی ہوتی ہے، اظہار تشخص کیلئے سعی بجائے پیروں کے موٹروں پر ہوتی ہے، یہ بدعت نہیں ہوئی؟ تو اگر ہر نئی چیز بدعت ہے تو کونسی چیز بدعت نہیں ہے؟

اسی بناء پر جب اینڈرسن صاحب نے فوٹو کھینچنے کے موقع پر مجھ سے کہا کہ یہ بدعت تو نہیں ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں خود ہی بدعت ہوں۔ معلوم ہوا کہ اس معیار پر اگر دیکھئے کہ نئی بات یعنی جو اس وقت نہیں تھی، جو فعلِ رسولؐ، قولِ رسولؐ یا تقریرِ رسولؐ میں نہیں ہے تو زمین آسمان ہمارا بدعت ہوگا۔ پوری زندگی ہماری بدعت میں گھری ہوئی ہوگی اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

یہ نہیں ہے کہ یہ شکل ہو تو پھر کیا ہے، میں جو معیارِ سنت عرض کر رہا ہوں، اس پر ہر صاحبِ عقل مسلمان غور کرے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کام جو ہم کر رہے ہیں، اس شکل سے اس کام کیلئے قولِ رسولؐ ہے، فعلِ رسولؐ ہے یا تقریرِ رسولؐ ہے یا نہیں ہے؟ اگر اس کام کا رسولؐ نے حکم دیا ہے تو پھر اس شکل میں ہوتا تو سنت ہوتا۔ اس شکل میں ہے اور کام وہی ہے تو سنت ہے۔

عملِ رسولؐ: جو کام کیا تھا رسولؐ نے، اگر کام ہم وہی انجام دے رہے ہیں مگر پیغمبر خدا نے جس صورت سے انجام دیا تھا، ہم اس کام کو اس صورت سے انجام نہیں دے رہے ہیں تو یہ پھر بھی سنت ہوگا، اس لئے کہ کام وہی ہے۔ چاہے اس شکل میں ہوتا، چاہے اس شکل میں ہے۔ اسی طرح تقریرِ رسولؐ کسی دوسرے نے کام یہ انجام دیا اور رسول اللہ نے منع نہیں فرمایا تو اب وہی کام اگر ہم کر رہے ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ رسولؐ ہوتے تو ہمیں منع نہ کرتے۔ انہوں نے کام اُس وقت کے رواج کی صورت سے کیا تھا، ہم اس وقت کے رواج کی صورت سے کر رہے ہیں، مگر کام نہیں بدلا ہے، کام وہی ہے جو ہوا تھا۔

تو اگر صورت اور شکل بدل گئی ہے تو وہ سنت ہوگا۔ مثلاً تحصیلِ علم، یہ دیکھنا ہے کہ تحصیلِ علم خدا اور رسولؐ خدا کو مطلوب ہے یا نہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ تحصیلِ علم قرآن و حدیث دونوں کی رو سے ہر ایک کا کسی حد تک فریضہ ہے اور جو فریضہ نہیں بھی ہے، تو امر مستحسن ہے اور ترغیب دی گئی ہے اور تحریص کی گئی ہے۔ تو تحصیلِ علم خواہ تعلیمِ علم ہو، یہ بہر حال مطلوبِ خدا اور رسولؐ ہے۔

اب اُس وقت میں تعلیم چٹائی پر ہوتی تھی، اب وہ تعلیم میز اور کرسی پر ہوتی ہے۔ تو میز اور کرسی نہ ڈھونڈیئے بلکہ دیکھئے کہ

تعلیم ہے یا نہیں۔ اگر تعلیم دینی فریضہ ہے یا کم از کم مستحسن ہے تو وہ چٹائی پر ہوتی تو مستحسن اور کرسی میز پر ہو تو مستحسن۔ یہ نہیں ہے کہ میز کرسی پر تعلیم ہو رہی ہے تو نئی چیز ہو گی، لہٰذا یہ بدعت ہو گئی۔ نہیں! اگر وہ تعلیم فرشِ خاک پر بیٹھ کر عبادت تھی تو یہ تعلیم جو کرسی اور میز پر بیٹھ کر دیں، یہ بھی عبادت ہو گی۔ ورنہ تو جناب ہمارا دنیا بھر میں کوئی دار العلوم بدعت سے خالی نہ ہو گا۔ یہ امتحانات، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ کب ہوتے تھے؟ پیغمبرِ خدا کی جو درس مجلس تھی، اس میں کیا امتحانات ہوتے تھے؟ امتحانات ہونے کے بعد نمبر دیئے جاتے تھے؟ کیا رسولؐ کے زمانے میں فیصدی نمبر، ڈویژن اور درجے ہوتے تھے؟ کونسا ہمارا دار العلوم ہے جو کتنا ہی سنت کا درس دیتا ہو، جو ان طریقوں سے خالی ہو؟

معلوم ہوا کہ طریقے بہ اعتبار رواج بدلتے ہیں اور کام وہی ہے جو اس وقت ہوتا تھا۔ اگر وہ عبادت ہے تو یہ بھی عبادت ہے۔ یہ دیکھئے کہ جامع مسجد میں اب کام ہو رہا ہے، یہ نماز ہی ہے یا کچھ اور ہے؟ جامع مسجد میں جمعہ یا عید یا روز کی نماز ہو تو کیا اتنا بڑا مجمع کبھی رسولؐ کے زمانہ میں نمازِ جماعت میں ہوا تھا؟ تو صرف اس لئے کہ تعداد بدل گئی تو بدعت ہو جائے گا؟

حضور! اب دو آدمی ہوں اور نماز جماعت ہو تو جماعت ہے اور دو لاکھ آدمی ہوں، تب بھی جماعت ہے۔ مجمع کی تعداد سے سنت بدعت میں نہیں بدلتی۔ کم سے کم جس فقہ سے میں واقف ہوں، اس میں تو ایک امام اور ایک ماموم سے جماعت ہو سکتی ہے۔ اس میں جمع ہونے کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایک عدد ماموم ہو تو بھی اقتداء کر سکتا ہے اور وہ نماز جماعت ہو جائے گی۔ تعداد کے بدلنے سے عمل اگر نہیں بدلا، کام وہی ہے تو اگر دو آدمی کر رہے تھے تو عبادت اور اگر دس آدمی کر رہے ہوں، تب بھی عبادت بلکہ انہی حضرات نے ارشاد فرمایا کہ جتنا جماعت کا مجمع بڑھے، اتنا ہی فرد کی نماز کے ثواب میں اضافہ ہو گا۔ حالانکہ دوسرے جو آئے ہیں، وہ اُن کا عمل ہے لیکن اُن کی وجہ سے وہ ایک آدمی جو شروع میں آیا ہے، اس کے بھی ثواب میں اضافہ ہو گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ذرا ذرا سے جو احکام ہیں، ان میں بھی کتنی حکمتیں مضمر ہیں کہ جب یہ مسئلہ معلوم ہو گیا تو ہر آدمی اپنی خود غرضی کیلئے کوشش کرے گا کہ زیادہ لوگوں کو آمادہ کرے کہ وہ جماعت میں شریک ہوں۔ ان کی خیر خواہی میں نہیں بلکہ اپنی خود غرضی کیلئے کہ میرے ثواب میں اضافہ ہو جائے۔

اسی طرح میں ریل سے بمبئی گیا، وہاں سے میں جہاز میں بیٹھا اور جدہ اُترا۔ وہاں سے موٹر میں بیٹھا اور اس کے بعد مکہ گیا۔ تو اس طرح جو کام ہوا، وہ بھی حج تھا۔ حج کیلئے میں گیا تھا۔ نیت میری موٹر پر بیٹھنے کی نہیں تھی، نیت تو میری حج کی تھی اور وہ جو ہوا، اس کا نام حج ہی ہے۔

اس طرح سے اس نے بھی حج کیا، جو ہوائی جہاز سے اُڑ کر پہنچا ہے۔ وہ بھی کس لئے پہنچا ہے؟ حج کیلئے گیا ہے۔ ہوائی جہاز کی خاطر حج نہیں کیا ہے، حج کی خاطر سے ہوائی جہاز میں بیٹھا ہے۔ جس وقت اصل مقصد وہی رہا، کام وہی رہا، وہ چاہے بحری جہاز سے ہو، تو فریضہ ادا ہوا اور ہوائی جہاز سے گئے تو وہ فریضہ ادا ہوا۔

معلوم ہوا کہ وحدتِ عمل معتبر ہے، شکلِ خاص تو رواجوں سے بدلتی ہے، دور کے بدلنے سے بدلتی ہے۔ بس اب جن جن

چیزوں کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے، ان کو اس معیار پر پرکھ لینا چاہئے۔ فرض کیجئے کہ سیرت کا جلسہ ہے، نام بدلتا رہتا ہے، ایک وقت میں محفلِ میلاد کہلاتا تھا، اب سیرت کا جلسہ ہوتا ہے۔ نام کے بدلنے سے بھی بدعت نہیں ہوتی۔ کام وہی ہونا چاہئے، چاہے اس نام سے ہو، چاہے اس نام سے ہو۔ مجھے دوسرا نام زیادہ پسند ہے یعنی میلادِ اقدس۔ اس میں صرف ہماری خوشی کا پہلو ہے لیکن ہمارے لئے درس کا پہلو نہیں ہے۔ ہماری زندگی سے اس کا تعلق نہیں ہے لیکن جو جلسہ سیرت نام کا ہو گیا، یہ کردار سازی کا ایک رُخ رکھتا ہے، خواہ میلادِ مقدس ہو یا سیرت کا جلسہ ہو، روشنی کا اہتمام زیادہ ہو گیا تو یہ تصور ہو گیا کہ یہ بدعت ہے۔ اتنی روشنی؟

میں کہتا ہوں کہ ایک بلب ہوتا تو کیا سنت تھا؟ اور یہ دس ہو گئے ہیں، اس لئے بدعت ہو گیا؟ تو وہ ایک عدد بھی رسولؐ کے زمانہ میں دکھا دیجئے کہ کب تھا؟ تو روشنی کے کم ہونے یا زیادہ ہونے سے یا قمقمے لگ جانے سے یا جھنڈیاں لگ جانے سے یا سامانِ آرائش زیادہ استعمال کرنے سے اس سب کو آپ انوکھے پن کی وجہ سے کہیں کہ یہ بدعت ہے، یہ سب بدعت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سب کے بعد کام اس محفل کا کیا ہو گا؟ ذکرِ رسولؐ ہی تو ہو گا۔

اب یہ دیکھ لیجئے کہ ذکرِ رسولؐ خدا کو پسند ہے یا نہیں؟ اگر پتہ چل جائے کہ ذکرِ رسولؐ خدا کو پسند ہے تو ذکرِ رسولؐ اندھیرے میں ہوتا اور روشنی میں ہو گیا تو پسند ہو گا۔ اگر وہ فرشِ خاک پر ہوتا تو خدا کو پسند ہوتا اور قالینوں کے فرش پر ہو رہا ہے تو پسند ہو گا۔

تو پسند ہے جب چیز وہی جو خدا اور رسولؐ کو پسند ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں دیکھئے کہ ان کے ذکر کے لئے خدا کو کیا منظور ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

ایک پہلو پر توجہ دلا دوں کہ بہت جگہ قرآن مجید میں آتا ہے، میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا اور بہت جگہ آتا ہے کہ ہم نے یہ کیا۔ حالانکہ ہمیں شانِ وحدت "میں" میں زیادہ نظر آتی ہے۔ "ہم" میں سے تو جیسے بوئے شرکت نظر آتی ہے۔ یعنی میں ایسی بات اللہ کے لئے کہوں تو شرک کا پہلو پیدا ہو گا تو اللہ کیوں ہم کہہ رہا ہے؟ کیا کوئی اور اس کے شریک ہے؟ میں نے جو غور کیا تو "میں" اور "ہم" میں میں نے یہ فرق محسوس کیا کہ جہاں اظہارِ انفرادیت مطلوب ہوا، وہاں "میں" کہا ہے:

"اَنَا اَنَا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ"

"میں ایک خدا ہوں"

یہاں "ہم" کا محل نہیں تھا۔

"اَنَّمَا اَنَا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ"

"بے شک میں ایک خدا ہوں۔"

"اَنَا رَبُّكَ"

"میں تمہارا پروردگار ہوں۔"

جہاں اظہار انفرادیت منظور ہوا ہے، وہاں "میں" کہا ہے اور جہاں قوتِ عمل دکھانا ہے، وہاں ہم کہا ہے:

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ"

"ہم نے یہ قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

"اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ"

"ہم نے اس کو شبِ قدر میں اُتارا ہے۔"

یہ جو ہم ہوتا ہے، اس میں مخالف قوتوں کو چیلنج ہوتا ہے کہ ہم نے یہ کیا ہے، ہم نے یہ قرآن اُتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اب کوئی دنیا میں قرآن کو مٹا تو دے۔ ویسے ہی جہاں جہاں یہ "ہم" ہے۔

"اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ"

"ہم نے آپ کو کثرتِ نسل عطا کی ہے۔"

بنی اُمیہ اور بنی عباس کی طاقتیں اس نسل کو ختم تو کر دیں! اسی طرح یہ:

"رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"

"ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا کیا ہے۔"

اب لاکھ بدعت کے فتوے لگیں، کوئی نیچا تو کر دے۔

ذکر کی بلندی کیا ہے؟ جتنے نمایاں ہونے کے اسباب زیادہ ہوں، سب خالق کا مقصود ہیں۔ اب جو لوگ کہ روشنی کر رہے ہیں آرائش کر رہے ہیں، جو لوگ بڑے سے بڑا پنڈال بنا رہے ہیں، ان سب کو سمجھئے کہ وہ خالق کے مقصد کے آلۂ کار ہیں۔

جناب! یہ ہماری جماعت میں رواج ہے بھی نہیں بلکہ کسی اور کا رواج ہوگا۔ کوئی اعتراض کر رہا ہے، میں تو عقلی جائزہ لئے بغیر بدعت نہ کہوں گا۔ مثلاً میلاد شریف میں ایک محل پر ہو گیا کہ وہاں جب رسول کا ذکر آئے گا تو مجمع کھڑا ہو جائے گا۔

"قِيَامُ عِنْدَ ذِكْرِ نَبِيٍّ"

یہاں بڑے زور سے آواز آئے گی کہ بدعت ہے، بدعت ہے۔ میں نے دیکھا کہ سب کھڑے ہوئے۔ تو بعض حضرات نہیں کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ میرے ہاں رواج نہیں ہے مگر میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ کچھ حضرات تو اس معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قیام کیا ہے یہ تعظیم کی نیت سے ہے۔ یہ جو کھڑا ہوا تھا، اس نے کیا کام کیا؟ مظاہرۂ تعظیم کیا۔ کام یہ کیا اور طریقہ اس کا یہ اختیار کیا۔

کہ نام سن کر کھڑا ہو گیا۔ تو کام اس نے جو کیا، وہ رسولؐ خدا کی تعظیم ہے۔ قرآن میں یہ دیکھ لیجئے کہ تعظیم رسول اللہ کو پسند ہے یا

نہیں؟ اللہ نے رسولؐ کی تعظیم کا حکم دیا ہے یا نہیں، اگر رسولؐ کی تعظیم کا حکم دیا ہے تو جو شکل اختیار کی جائے، وہ تعظیم ہے۔

تو وہ واجب تو نہیں ہے لیکن جو اُس نے عمل کیا، اس کو بدعت نہ کہیے، اسے غلط نہ کہیے۔ اُس نے وہی کام کیا جو اللہ کو مدِ نظر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رسولؐ کی تعظیم دیکھئے کہ اللہ کو مدِ نظر ہے یا نہیں؟ تعظیم نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو سب کے ساتھ برتاؤ، وہی رسولؐ اللہ کے ساتھ۔ اب قرآن میں دیکھئے کہ کیا وہ چاہتا ہے کہ اس طرح ہو رسولؐ کے ساتھ جو دوسروں کے ساتھ ارشاد ہو رہا ہے:

"لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ"

"دیکھو خبردار! ہمارے رسولؐ کو اس طرح نہ پکارا کرو جیسا آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔"

آپ کہتے تھے کہ جو سب کے ساتھ برتاؤ، وہی رسولؐ کے ساتھ اور قرآن کہہ رہا ہے کہ ہرگز وہ برتاؤ نہ کرو رسولؐ کے ساتھ جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ اس طرح نہ پکارو جس طرح دوسروں کو پکارتے ہو۔

میں کہتا ہوں کہ ہم کو حکم دیا تو خود اُس نے بھی رسول ﷺ کو اس طرح نہیں پکارا جس طرح دوسروں کو پکارا۔ ارے! ہر کس و ناکس کو وہ پکارے ہی کیوں لگا؟ یہ پکارتا ہے انبیاء کو، مرسلین کو۔ ان کو پکارتا ہے۔ مگر جس رسول کو بھی پکارا ہے، ہمارے پیغمبر ﷺ کے علاوہ، بلا استثنیٰ نام لے کر پکارا:

"يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ"۔

"اے آدمؑ! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو۔"

"اے نوحؑ! اُترو سلامتی کے ساتھ"۔

نام لے کر پکارا۔

"يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا"۔

"اے ابراہیمؑ! تم نے خواب سچ کر دکھایا۔"

نام لے کر پکارا۔ اب اور آیات کیوں پڑھوں؟ میں نے کہا کہ بلا استثنیٰ ہر نبی و رسول کا نام لے کر پکار لیا۔ جب میں نے بلا استثنیٰ کہہ دیا تو اگر کسی کے پاس اس کے خلاف سند ہو تو وہ کوئی آیت پڑھے۔ مجھے سب آیات پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس نبی و رسول کو پکارا، نام لے کر پکارا اور ہمارے رسول ﷺ کو بلا استثنیٰ کبھی نام لے کر نہیں پکارا، کبھی عہدہ کو سرنامہ خطاب بنایا:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ"۔ "يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ"۔

جو عہدہ تھا، اس کو سرنامہ خطاب بنا لیا۔ کبھی اوصافِ کمال کو، طٰہٰ ہے، طیب و طاہر ہے، یٰسین ہے، سید و سردار، کبھی بتقاضائے محبوبیت جس وقت جو لباس ہوا، اس کو سرنامہ خطاب بنا لیا:

"يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ"۔

''اے چادر اوڑھے ہوئے۔''

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔''

''اے کملی میں لپٹے ہوئے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ اتنی محبوب ہے کہ محب کی نظر ان کے لباس پر بھی پڑ گئی۔

اس نے خود ان کی تعظیم کیلئے یہ انداز اختیار کیا تو دوسرا تعظیم کرے گا تو اُسے ناپسند کیونکر ہو سکتا ہے؟ قیام اگر کوئی کرتا ہے تو وہ وہی کام انجام دے رہا ہے جو اللہ کا پسند ہے۔ ہاں! یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ جگہ کی کیا خصوصیت ہے، جب بھی رسول ﷺ کا ذکر آئے تو کھڑے ہوں۔ یہ چند جگہ کیوں؟ اس کیلئے بعض چیزیں ہیں جو پرانے زمانہ میں نظر سے نہیں گزری تھیں۔ ذہن میں مثال نہیں آتی تھی۔

بینک میں ایک دن گئے، دیکھا کہ بینک کھلا ہوا ہے، سب لوگ ہیں مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں، کام کچھ نہیں کر رہے۔ ہم نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ بینک تو کھلا ہوا ہے، مگر کام نہیں ہو رہا؟ انہوں نے کہا کہ آج ہڑتال ہے۔ دوسرے دن گئے، دیکھا کام ہو رہا ہے، ہم نے کہا کہ ہڑتال ختم ہو گئی؟ انہوں نے کہا: جی! وہ بس کل کی علامتی ہڑتال تھی، اصل ہڑتال کل ہو گی۔

آج کہتے ہیں کہ آپ کو رسول ﷺ کی تعظیم کا حکم ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہر دفعہ کیوں نہیں کھڑے ہوتے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ ہمارا قیام اصل تعظیم نہیں بلکہ علامتی ہے، اپنے جذبہ کا اظہار ہے، وہ ہماری عملی کوتاہی ہے یا مجبوری ہے کہ ہر دفعہ نہیں کھڑے ہو سکتے۔

تو اب ایک دفعہ ہم نے جو عمل کیا ہے، اس سے آپ کو خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ آپ بدعت بدعت کی آوازیں بلند کر دیتے ہیں۔ جب اصل عمل تعظیم رسول ﷺ خدا کو پسند ہو تو وہ جس شکل میں ہو، جس صورت میں ہو، وہ قابلِ تائید سمجھا جائے گا، نہ کو قابلِ مخالفت۔ اس کو سنت ہی سمجھنا پڑے گا، نہ کہ بدعت۔

اس کے بعد میلادوں سے بڑھ کر سوال پہنچتا ہے کہ ہماری مجالس تک۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی سلسلہ میں کوئی اجتماع ہو، وہاں چاہے جو ہو، اس پر کبھی سنت بدعت کی بحثیں نہیں ہوتیں۔ جب یہ رسول ﷺ اور آلِ رسول ﷺ ہی کے بارے میں ہو تو یہ مباحث ہوتی ہیں۔ لغت کے اعتبار سے تو محفل، مجلس سب کے معنی اجتماع کے ہیں۔ اس لئے ریڈیو پر بھی مجلس ہی ہوتی ہے، محفل سماع بھی ہوتی ہے مگر ہمارے محاورے کے مطابق ذکر فضائل جب ہو تو اُسے محفل کہتے ہیں اور جب آخر میں ذکر مصائب ہو تو اسے مجلس کہتے ہیں، ورنہ لغت کے اعتبار سے ہر محفل مجلس ہے اور ہر مجلس محفل ہے۔ مگر طریقہ استعمال الفاظ میں یہ امتیاز ہو گیا ہے۔ محفل جو ہوتی ہے، اس میں کیا ہوتا ہے؟ کام دیکھئے کہ کیا ہو رہا ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ محفل میں بھی کچھ خاص ہستیوں کا ذکر ہوتا ہے، حالانکہ اب جو معیار ہے محفل یا مجلس کا، وہ کچھ خاص ہستیوں ہی سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ خدا سے لے کر قیامت تک ہر چیز کا بیان ہوتا ہے۔ اس ذکر کی بدولت ہو جاتا ہے۔ یہ دینیات کا بڑا مدرسہ بن گیا ہے، یہ محفلیں یا مجالس ایک مدرسہ ہیں۔ یہاں بہر حال سب کا ذکر ہوتا ہے لیکن کوئی شبہ نہیں کہ نقطہ مرکزی کچھ ہستیاں ہیں آلِ سول ﷺ کی۔ محفلوں میں بھی رسول ﷺ تا آلِ رسول ﷺ۔

کون کہتا ہے کہ ہم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس نہیں کرتے؟ تو رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے بیانِ فضائل اور بیانِ مصائب سے زیادہ تر مجلس تشکیل پاتی ہے۔ اب بس یہ دیکھ لیجئے کہ ان ہستیوں کا ذکر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلوب ہے یا نہیں۔ ذکر ان کا جس شکل میں اس وقت ہوتا تھا اور اس وقت ہوتا ہے، یہ نہ دیکھئے کہ ذکر ہے یا نہیں کیونکہ کونسا ہمارا کام ہے جو بالکل اسی شکل سے ہوتا ہو؟ یہ دیکھئے کہ ذکر فضائل و مصائب جو معیار محفل و مجلس ہے، وہ مطلوبِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے یا نہیں؟

ذکر رسولؐ کے لئے تو میں نے کہہ دیا، قرآن مجید کی آیت پیش کر دی۔ اب ذکر آلِ رسولؐ؟ آلِ رسولؐ جو ہستیاں ہیں، انہیں دیکھ لیجئے کہ رسولؐ نے ان کا ذکر کیا یا نہیں کیا؟ پیغمبر خدا نے طرح طرح سے ان کا تذکرہ فرمایا نہیں؟ احادیث متفق علیہ ہیں۔ ذکر رسولؐ ان حضرات کیلئے متفق علیہ ہے۔ بس نگاہ کا پھیر ہے۔ بعض ان کو یہ کہتے ہیں کہ اپنے بھائی کیلئے یہ فرمایا، اپنی بیٹی کے لئے یہ فرمایا، اپنے نواسوں کے لئے یوں اظہار محبت فرمایا۔

میں کہتا ہوں کہ باتیں تو بڑی معصوم ہیں، بالکل سچی ہیں۔ جو بیٹی ہے، وہ غیر تو نہیں ہو سکتی، جو بھائی ہے یا داماد ہے، وہ غیر تو نہیں ہو سکتا۔ جو نواسے ہیں، وہ ہیں تو نواسے ہی۔ مگر بس یہ ذرا نگاہ کا پھیر ہے کہ رسولؐ جو فضائل بیان فرماتے تھے، وہ کیا اس لئے کہ یہ بیٹی یا داماد یا نواسے ہیں؟ یا رسولؐ اس لئے بیان فرماتے تھے کہ وہ ہستیاں ایسی ہیں کہ جن کے فضائل کو بیان کرنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ یہ تقاضائے بشریت تھا یا تقاضائے رسالت تھا؟

ظاہر ہے احادیث تو بے شمار ہیں ان حضرات کے تذکرے میں، ان سب کو کہاں بیان کر سکتا ہوں۔ چند چیزوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں ہر صاحب کی کہ ذرا غور کریں کہ بحیثیت اپنے رشتے کے حضرتؐ یہ باتیں فرما بھی سکتے تھے یا نہیں؟ مسلمان تو رسولؐ کو اس درجہ پر جانتا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی، قصہ مختصر مگر میں تو بہت ہی گھٹا کر لفظ پیش کرتا ہوں کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذمہ دار فرد تو تھے، دیکھئے! اپنے چھوٹے بھائی کو یا جسے گود میں پالا ہو، بنظر محبت جان و روح کہہ سکتے ہیں، بنظر محبت لختِ جگر کہہ سکتے ہیں، بنظر محبت میوۂ دل کہہ سکتے ہیں مگر اپنے چچازاد بھائی کو شہر علم کا در کہتے ہیں۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کو محفوظ رکھتے ہوئے بتایئے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ چھوٹے بھائی کو اپنے گھر کی رونق کہہ دیں، وہ بالکل صحیح ہے مگر جنت کا سردار کہہ دیں اپنے بچوں کو یا انہیں کہہ دیں کہ یہ جنت و نار کے تقسیم کرنے والے ہیں یا بیٹی کو کہہ دیں کہ یہ جنت کی خاتون ہے!

صحیح بخاری میں نہایت اختصار کے ساتھ تین احادیث ہیں، ان میں سے ایک ہے:

"سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ"۔

کہ یہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ اس سے تمام مسلمانوں میں بلاتفریق محاورہ ہو گیا، خاتونؑ جنت۔ یہ پیغمبر خدا کی حدیث کا مفہوم ہے۔

"سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ"

اب ہر صاحبِ عقل مسلمان جو بشریت اور رسالت میں حدِ فاصل بھی قائم رکھتا ہو، مجھے اس سے سوال یہ کرنا ہے کہ جنت کے بارے میں جو کہا جائے گا، وہ بشر کے اعتبار سے کہا جائے گا یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعتبار سے؟

یعنی ان ہستیوں کے بارے میں کوئی بات جنت سے ادھر ٹھہرتی ہی نہیں۔ بیٹی ہے تو وہ سردارِ زنانِ جنت ہے، نواسے ہیں تو وہ سردارِ جوانانِ جنت ہیں اور جو داماد ہے، وہ:

"قَسِيْمُ النَّارِ وَالْجَنَّة"

ہے۔ کوئی بات جنت سے ادھر نہیں رُکتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بات رسولؐ بحیثیت بشر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ بحیثیت رسولؐ کہہ رہے ہیں۔

"سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّة"۔

بلاغتِ رسولؐ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہئے کہ یہ حالیہ عمر کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں۔ تو کیا جنت کے بچوں کا سردار کہنا چاہئے؟ بچوں کو جوانانِ جنت کا سردار کہہ رہے ہیں رسولؐ، ان کا سن دیکھ رہے ہیں کہ یہ بچے ہیں اور رسولؐ فرما رہے ہیں کہ جوانانِ جنت کے سردار۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں والی جوانی پیشِ نظر نہیں ہے، وہاں والی جوانی پیشِ نظر ہے۔

جناب! یہاں والی عمریں نہ دیکھئے کہ کون بچہ ہے، کون جوان ہے، کون بوڑھا ہے! وہاں رسولؐ نے کہہ دیا کہ سب جوان ہوں گے، بوڑھوں کا بوڑھے ہوتے ہوئے گزر ہی نہیں ہے۔ اب جناب جو جنتی ہے، اس کے سردار ہیں، چاہے اس وقت بچہ ہو، چاہے جوان ہو، چاہے بوڑھا ہو۔

اب جب ان کا ذکر پیغمبرؐ خدا برابر فرما رہے ہیں تو وہ ذکر جس جس طرح سے بھی ہو، عبادت ہی ہوگا، سنت ہوگا، بدعت نہیں ہو سکتا۔ یہ نہ دیکھئے کہ اُس وقت دس آدمیوں کے سامنے رسولؐ فرما رہے تھے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک ہزار آدمیوں کے سامنے ذکر ہو رہا ہے تو جب نمازِ جماعت میں شرکاء کی تعداد اسے بدعت نہیں بناتی تو محفلِ ذکر میں شرکت کرنے والوں کی کثرت اس ذکر کو کیونکر بدعت بنا دے گی؟

یہ تو ذکرِ فضائل تھا اور اب ذکرِ مصائب کے بارے میں سوال ہے کہ ذکرِ مصائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یا نہیں؟ جس وقت سے بچہ گود میں لا کر دیا گیا، اُسی وقت پیغمبرؐ خدا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کسی نے کہا: یا رسولؐ اللہ! یہ تو خوش ہونے کا موقعہ ہے، آپؐ رو رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تمہیں معلوم نہیں کہ اس پر کیا مصائب گزریں گے؟

مجھے معلوم ہے کہ گریہ کے مقابلہ میں کیا کیا سوال ہوتے ہیں۔ ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ زندۂ جاوید کو کیوں روتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ اس وقت دنیا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے کہ زندہ کو کیوں رو رہے ہو، ارے! وہ شہداء کی زندگی تو عالمِ معنی کی زندگی ہے۔ اس وقت تو حسینؑ جیتی جاگتی زندگی کے ساتھ، سانس لیتی ہوئی زندگی کے ساتھ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں موجود تھے اور پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گریہ فرما رہے تھے۔

اب تو دنیا کو سمجھنا چاہئے کہ فقط موت پر گریہ نہیں ہوتا ہے، مصائب پر بھی گریہ ہوتا ہے۔ اگر رسول ﷺ کو اُس زندگی میں رونے کا حق تھا تو ہمیں اس زندگی میں رونے کا حق ہے

یہ تو ایک مرتبہ ہے ولادت کے بعد۔ اس کے بعد بار بار مختلف مواقع پر اس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ ذکر ہو جاتا تو معلوم ہو جاتا۔ یہ بار بار کیا ہے؟ یہی کہی ہوئی باتوں کو دُہرانا، یہی مجالس کا موقف ہے۔ یہاں تک کہ اُم سلمہؓ سے روایت ہے اور وہ صحاح ستہ میں ہے۔ صحیح ترمذی میں روایت ہے جناب اُم سلمہؓ کی۔ یہ روایت اتنی مقبول ہے کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی، جو تحفہ اثناء عشریہ کے مصنف ہیں، ان سے پوچھا کہ روزِ عاشور آپ کا عمل کیا ہوتا ہے؟

فتاوی عزیزیہ میں مطبوعہ شکل میں موجود ہے، انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میرا عمل یہ ہے کہ عصر کے وقت میرے احباب اور معتقدین میرے ہاں جمع ہوتے ہیں اور الفاظ یہ ہیں کہ فقیر منبر پر جاتا ہے۔ یعنی میں منبر پر جاتا ہوں اور وہ احادیث جو فضائل حسنینؑ میں ہیں، وہ بیان کرتا ہوں جیسے خبر اُم سلمہؓ، اُسے بیان کرتا ہوں اور پھر حالاتِ شہادت بیان کرتا ہوں۔ پھر کچھ مرثیے جو جنات کے تھے، کچھ مرثیے جن کے پڑھنے والے نظر نہیں آتے تھے اور خواتین بنی ہاشم نے سنے ہیں، وہ مرثیے ان کتابوں میں درج ہیں، وہ مرثیے بھی پڑھتا ہوں۔ اس وقت لازماً فقیر پر بھی گریہ طاری ہوتا ہے۔ جو حاضرین ہیں، وہ سب بھی گریہ کرتے ہیں۔

یہ ہے خبر روایتِ اُم سلمہ کہ حضرت پیغمبرؐ خدا آئے اور ایک حجرے کی طرف تشریف لے جانے لگے اور یہ فرمایا: اُم سلمہؓ! وحی نازل ہونے والی ہے، میں جا رہا ہوں، کوئی میرے پاس نہ آئے۔ آپ تشریف لے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ جناب اُم سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ تھوڑی دیر میں حسینؑ آئے، چاروں طرف دیکھا اور پوچھا کہ جدِ بزرگوار کہاں ہیں؟

جنابِ اُم سلمہؓ نے جو واقعہ تھا، وہ بیان کیا کہ حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں اور فرما گئے ہیں کہ کوئی میرے پاس نہ آئے۔ اس کے بعد جو الفاظ میری سمجھ میں آتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا۔ تو حسینؑ نے یہ کہا کہ ہمیں منع فرمایا ہے؟

بہر حال کچھ ایسا کہا کہ پیغمبرؐ نے آواز سن لی، ارشاد فرمایا کہ حسینؑ کو آنے دو۔ حجرے میں داخل ہوئے، دروازہ بند کر لیا گیا۔ کچھ دیر میں جنابِ اُم سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے محسوس کیا کہ رسول ﷺ گریہ فرما رہے ہیں۔ ہر صاحبِ عقل غور کرے کہ رسولؐ حجرے کے اندر ہیں، اُم سلمہؓ حجرہ کے باہر ہیں۔ جو کمرہ سے باہر ہو، وہ صرف آنسوؤں کا گریہ محسوس نہیں کر سکتا۔ ماننا پڑے گا کہ صدائے گریہ تھی۔ اب جیسے انہیں تاب نہ رہی، وہ دروازے پر آئیں اور کہا: کیا میں حاضر ہو سکتی ہوں؟

حضرتؐ نے فرمایا: اب آ سکتی ہو، وحی اُتر چکی ہے۔

اُم سلمہؓ آئیں۔ یہ سب صحیح ترمذی میں ہے کہ دیکھا کہ شہزادہ پیغمبرؐ کے سینہ مبارک پر ہے اور ہاتھ میں رسولؐ کے کوئی چیز ہے اور آپؐ زار و قطار گریہ فرما رہے تھے۔ انہوں نے سبب پوچھا تو ارشاد فرمایا کہ میرا بچہ جو آیا اور میرے سینے سے لگا، میرے دل کو بڑا سکون ملا تو ایک ملک آیا۔ (اب یہ بعد میں پتہ چلے گا کہ ملک کیوں آیا)۔

تو ملک آیا اور کہا کہ کیا آپؐ اس بچے کو جانتے ہیں؟ میں بتاؤں کہ ملک کیوں آیا؟ میں کہتا ہوں کہ وقتِ ولادتِ حسینؑ سے

ذکر ہو چکا تھا، اطلاع دینے تو نہیں آیا، بس اگر پہلے ذکر نہ ہوا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ملک آیا ہے واقعہ کربلا کی اطلاع دینے۔ مگر جب وقتِ ولادت حسینؑ پر پیغمبرؐ خدا خود اس کی خبر دے چکے ہوں تو اب یہ ملک اطلاع دینے تو آیا نہیں۔

تو اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہ یہی ہے کہ یہ ملک مجلس حسینؑ برپا کرنے آیا ہے کیونکہ مجلس کی حقیقت یہی ہے کہ بیان کئے ہوئے واقعات دُہرائے جاتے ہیں، اُس واقعہ کی یاد تازہ کرنے کیلئے۔ یہ مجلس حسینؑ برپا کرنے آیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ مجلس کی تمہید ہے۔ جیسے ہمارے ہاں ذکر فضائل ہوتا ہے، پھر ربطِ مصائب ہوتا ہے۔ ویسے ہی یہ تمہید مجلس ہے۔

آپ اس بچے کو بہت چاہتے ہیں؟ پیغمبرؐ خدا فرماتے ہیں: خدا گواہ ہے کہ کتنا چاہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر نانا نواسے کو چاہتے ہیں تو اس میں خدا کو گواہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی فریضہ رسالت ہے کہ پیغمبرؐ اللہ کو گواہ کر کے کہہ رہے ہیں کہ اللہ جانتا ہے کہ میں کتنا چاہتا ہوں۔

اب تمہید ختم ہوئی، ربطِ مصائب۔ ملک کہتا ہے کہ یہی بیٹا جو ہے، یہی آپ کا فرزند۔ یہ آپؐ کے دین کی خاطر قربان ہوگا۔

3

پہلے نور اور پھر کتاب

حکمت الٰہیہ میں نور بغیر کتاب کے رہ سکتا ہے مگر کتاب بغیر نور کے نہیں رہ سکتی۔

جناب رسولؐ اکرم نے عملی طور پر ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ جب آفتاب رسالت غروب ہو تو ماہتاب امامت طلوع ہوتا ہے۔

آقائے نامدار نے فرمایا کہ اے مسلمانوں میں تمہارے درمیان اپنی دو گراں قدر امانتیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ان کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھنا ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے یعنی قرآن اور اہل بیتؑ لازم ملزوم ہیں جب تک ان دونوں سے تمسک نہ پکڑو گے اتنے تک خود کو ہدایت یافتہ نہ کہلوا سکو گے۔

مسلمانوں کی قسمت میں انتظار لکھا ہے ہم بحمد اللہ ایسی ہستی کے انتظار میں ہیں کہ جس کے آنے میں کوئی عقلی دشواری نہیں ہے۔

قرآن مجید پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ سننے اور پڑھنے والے اس پر عمل نہ کریں۔

پہلے نور اور پھر کتاب

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

"قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ"۔

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے کہ تمہارے پاس ایک نور آیا ہے اور ایک روشن کتاب۔ نہ یہ کوئی ہمارا مقولہ ہے، نہ یہ کوئی حدیث ہے بلکہ قرآن مجید کی آیت ہے۔ اس کے ترجمہ ہی سے ظاہر ہے۔ بغیر کسی ترجمے اور تشریح کے۔ شروع ہی سے ایک کے آنے کا اعلان نہیں ہے، دو کے آنے کا اعلان ہے۔ جسے کوئی بعد میں نعرہ لگاتا ہو، وہ دیکھے کہ یہ جو "وَ" ہے، یہ حرفِ عطف ہے۔ جب بیچ میں آتا ہے تو مغائرت کا پتہ دیتا ہے۔ جانے والے نے کہا کہ کل آپ میرے پاس آیئے گا اور آپ آیئے گا۔

دوسرے دن ایک آیا اور دوسرا نہیں آیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو دونوں کو بلایا تھا، آپ تو تنہا آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ میں آ گیا ہوں، میں ہی کافی ہوں۔ تو یہ ان کے خود کہنے سے کافی نہیں ہو جائے گا کیونکہ جس نے بلایا تھا، وعدہ لیا تھا، اُس نے ایک کو ناکافی سمجھا تھا اور یہ کہا تھا کہ دوسرا بھی ہو۔ کسی دوسرے کو کیا حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ ایک کافی ہے؟

ایک دوسرے پہلو پر غور کیجئے کہ حرفِ عطف میں ترتیب ضروری نہیں ہے کہ یہ پہلے ہو اور وہ بعد میں ہو۔ لیکن اکثر اسی ترتیب سے کہا جاتا ہے، جس ترتیب سے واقعہ ہو۔ تو اگرچہ حرفِ عطف ہے جس میں ترتیب ضروری نہیں ہے مگر یہ کہ قرآن مجید نے جو ترتیب رکھی ہے، اس میں پہلے نور ہے اور پھر کتاب ہے۔

اب اکثر مفسرین کی تشریح کے مطابق نور سے مراد پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ تو نور حضرتؐ کی ذات اور کتاب مبین سب کو معلوم ہے۔ تو پہلے قرآن مجید نے کہا نور اور اس کے بعد کتاب مبین۔ یہ ترتیب حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہے۔ یعنی پہلے نور آیا، پھر کتاب آئی۔ اگر وہ نور نہ آتا تو کتاب بھی نہ آتی۔ پہلے نور آ چکا، پھر کتاب آئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمتِ الٰہیہ میں نور بغیر کتاب رہ سکتا ہے مگر کتاب بغیر نور کے نہیں رہ سکتی۔

میں کہتا ہوں کہ نور محتاجِ کتاب نہیں ہوتا، کتاب محتاجِ نور ہوتی ہے۔ جب آپ مطالعہ نہیں کر رہے ہیں، کتاب الماری میں ہے، تب بھی نور ہے۔ اس نور سے آپ دوسرے کام لے رہے ہیں اور وہ نور دوسرا فائدہ پہنچا رہا ہے۔ اس کے بعد جب کتاب سامنے آئی تو نور تو بغیر کتاب کام کر رہا تھا، اب بحمد اللہ نور تھا۔ بجلی سے روشنی تھی تو آپ نے الماری سے کتاب نکال لی۔ اب جونہی کتاب آپ کے سامنے آئی بجلی غائب۔ یہ تو روز تجربہ ہوا کرتا ہے۔ روشنی اتنی دیر سے تھی، کتاب الماری میں تھی تو روشنی کام کر رہی تھی اور کتاب سامنے ہے، روشنی چلی گئی تو کتاب کچھ کام نہیں کرتی۔ کچھ پڑھ رہے تھے، تو میں کہتا ہوں کہ اب پڑھیے، آپ خاموش ہیں۔

صاحب! کتاب تو ہے کافی ہے، تو یہ ناقص نور؟ اس کے بغیر کتاب کافی نہیں ہوتی۔ وہ کامل نور اس کے مقابلے میں، آپ کہتے

ہیں کہ کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ اس منزل پر میں کہا کرتا ہوں کہ کتاب آپ کہہ لیجئے کہ کافی ہے۔ لیکن ایک دن مجھے بنا کر دکھایئے کہ کیونکر کافی ہے۔ آپ مسلمان ہیں تو نماز پڑھنا ضروری ہے، طولانی نماز نہ سہی، دو رکعت تو مختصر ترین نماز ہے۔ وہ دو رکعت کوئی مجھے صرف قرآن سے پڑھ کر دکھائے۔ کیونکر پڑھے گا؟ ڈھونڈے قرآن میں ترکیب نماز!

میں کہتا ہوں کہ دینیات کی جو سب سے چھوٹی کتاب ہو، اس میں بھی نماز کی ترکیب ضرور ہو گی۔ لیکن قرآن مجید جیسی کتاب اور اس میں نماز کا حکم تو بہت ہے، نماز کی ترکیب ایک جگہ بھی نہیں ہے۔ نسبتاً ذرا تفصیل سے ترکیب وضو ہے، ترکیب تیمم ہے لیکن یہ جس کیلئے ہے یعنی ترکیب نماز، وہ شروع سے لے کر آخر تک کہیں نظر نہیں آتی۔ اگر کہیں ہے تو مجھے بتایئے کہ کہاں ہے؟ ایک جگہ آ گیا:

"رَبَّكَ فَكَبِّرْ"۔

فرض کیجئے کہ آپ نوٹ بک لے کر بیٹھے، آپ نے تکبیر لکھ لی۔ ایک جگہ آ گیا۔

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ"۔

آپ نے فوراً قرات یعنی کچھ سورتوں کو پڑھنا نوٹ کر لیا۔ ایک جگہ آ گیا:

"وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ"۔

سجدہ کا نام آ گیا آپ نے فوراً وہ نوٹ کر لیا۔ ایک جگہ آ گیا:

"وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ"۔

"رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ"۔

آپ نے رکوع نوٹ کر لیا۔ ایک جگہ آ گیا:

"ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ"۔

"اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔"

آپ نے کپڑوں کا پاک کرنا لکھ لیا۔ سب سے پہلے تو میں ایک اصولی سوال آپ سے یہ کروں گا کہ یہ سب آپ نے دیکھ کر الگ الگ کی آیات، یہ اجزاء نوٹ کر لئے لیکن یہ آپ کو کس نے بتایا کہ یہ نماز کے اجزاء ہیں۔ ممکن ہے کہ رکوع مستقل عبادت ہوتا، سجدہ مستقل عبادت ہوتا، قیام مستقل عبادت ہوتا، تسبیح مستقل عبادت ہوتی۔ یہ کس نے کہا کہ یہ اس صلوٰۃ کے اجزاء ہیں اور پھر دوسری عبادت کہ اچھا صاحب! کسی طرح سمجھ لیجئے کہ صلوٰۃ کے اجزاء ہیں تو جناب یہ مفرد اجزاء آپ نے لکھے، یہ نسخہ کیونکر مرتب ہو گا؟ ان سب اجزاء میں جوڑ کیونکر لگے؟ اگر آپ کے سامنے کوئی مسلمان نمازی ہونے کا دعویدار آئے اور ایک عدد سجدہ کرے اور اس سجدہ کے بعد رکوع کرے اور رکوع کے بعد سیدھا کھڑے ہو کر تھوڑی دیر قیام کرے اور اس کے بعد ایک عدد تسبیح پڑھ دے اور کوئی سورۃ بھی پڑھ دے اور اسکے بعد جا کر کپڑے پاک کرے، تو جو قسم چاہے لے لیجئے کہ جو اجزاء قرآن میں تھے، وہ ان سب اجزاء کو عمل میں لے آیا مگر پھر بھی کسی

بھی مکتب خیال کا مسلمان بتائے کہ ایک عدد نماز ہوئی؟ قرآن کے سب اجزاء عمل میں آگئے مگر نماز نہیں ہوئی۔

تو معلوم ہوا کہ نماز قرآن میں دیکھ کر نہیں ہوئی ہے، نماز اس نور کی روشنی میں ہوئی ہے جو اعلان شروع ہی میں قرآن نے کیا تھا کہ دو آئے، ایک نور آیا اور ایک کتاب مبین آئی۔ نور کا پہلے ذکر ہوا اور کتاب مبین کا ذکر بعد میں ہوا۔ تو ازل سے یہی ترتیب ہوئی۔ صرف اب نہیں ہے، سلسلہ انبیاء آدمؑ سے شروع ہوا مگر کتابیں کب سے آنا شروع ہوئیں؟ سلسلہ انبیاء اس وقت شروع ہوا جب ابھی ہدایت حاصل کرنے والے نہیں تھے، وہ اُنہی کی اولاد ہوگی جو ان کی اُمت ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی آیا ہے اور اسے فیض حاصل کرنے والے، جن کی اسے ہدایت کرنا ہے، وہ ابھی نہیں آئے۔

اس سے دنیا محسوس کرے کہ جو ابوالبشر ہے، اسے پہلا معلّمِ بشر بنا دیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق ایک لحہ کیلئے بھی بشر کو بغیر معلم نہیں چھوڑنا چاہتا۔ پہلے معلم آجاتا ہے، اس کے بعد سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس معلم کی زبانی تعلیم سے پھر وہ انبیاء آتے ہیں جو صاحبِ شریعت وکتاب ہیں۔ تب کتابوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

ایک پہلو پر غور کیجئے کہ انبیاء کی فہرست کتنی؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور وہ انبیاء جنہیں کتابیں عطا ہوئیں وہ کتنے؟ دو چار۔ صحیفے بھی ملا لیجئے، صحیفہ ابراہیم کا قرآن میں ذکر ہے، اور وہ عہد نامہ قدیم وجدید اور جو دنیا کو ملا، اسے جمع کر دیا۔ تو اس کا مجموعہ بائبل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دو حصے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبل و بعد کے ہیں۔ ان سب کو ملا لیجئے تو ان کی تعداد کتنی؟ وہ بھی بہت کم اور انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ تو کتابیں اتنی سی اور انبیاء اتنے زیادہ؟ غور کیجئے تو یہی سمجھ میں آئے گا کہ ایک رسول مکتوبی تعلیم لے کر آتا تھا جس کا نام کتاب یا صحیفہ اور پھر ایک سلسلہ انبیاء کا ہوتا تھا، نمونہ عمل بن کر اسے سکھانے کا۔ درمیان میں ایک کثیر سلسلہ ہوتا تھا اور پھر ایک نبی آتا تھا کتابی تعلیم لے کر اور پھر ایک سلسلہ ہوتا تھا، اس کتاب پر عمل کرواتے تھے اور وہ بھی اُدھر ہی کے بھیجے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ نمونہ بن کر دکھاتے تھے اور اس کی تفصیلات بتاتے تھے۔

تو حضورؐ! ان کتابوں کے لئے جو منسوخ ہونے والی ہوں، قدرت کی طرف سے یہ انتظام ہوا اور وہ کتاب جو قیامت تک کیلئے رہنمائی کے واسطے بھیجی گئی ہے، اس کو لاوارث چھوڑ دیا جائے۔ چونکہ جو نور اس کے ساتھ آیا ہے، وہ نور شخصی طور پر جتنا نظر آرہا ہے، نظامِ قدرت یہ ہے وہ نور ہمیشہ سامنے نہیں رہے گا۔ یہ اُٹھالیا جائے گا۔ اس کے اُٹھالئے جانے کے بعد کتاب اکیلی ہوجائے گی۔ حالانکہ اس نے شروع سے دو بھیجے تھے، دو کے آنے کا اعلان کیا تھا مگر وہ ایک جو اس کے ساتھ آیا تھا، اسے نظامِ الٰہی کے ماتحت ہمارے سامنے بقا نہیں ہے۔ تو اب اس کے بعد کیا کتاب تنہا رہ جائے؟ اگر تنہا رکھنا ہوتا تو اس کو بھیجا ہی کیوں تھا اس کے ساتھ؟ پہلے ہی کتاب کسی درخت پر اکیلی اُتر آتی، کسی پہاڑ کے غار میں اُتر آتی۔ ایک منادی اس طرف آکر ندا کر دیتا کہ انسانو! تمہاری ہدایت کی کتاب اس درخت پر ہے، یا اس پہاڑ کے غار میں ہے، جا کر لے لو۔ جسے لینا ہوتا، جا کر لے لیتا، کافی تھا۔

مگر اُسے اس نے کافی نہ سمجھا۔ اس کے ساتھ اُس نور کو بھیجا۔ کتاب تو وہی ہے مگر جب پہلے کافی نہیں ہوئی تو اب کیونکر کافی ہو گی؟ لہٰذا ضرورت ہوئی کہ جیسے اب تک یہ کتاب اکیلی نہیں رہی، ویسے ہی اس کے بعد اکیلی نہ رہے۔ اس کے بعد بھی اس کے ساتھ کوئی

ہو اور کوئی وہ ہو جو اس کی طرف کا ہو۔ اس کے لئے رسول کی ضرورت ہوئی کہ اعلانِ عام فرمائیں۔

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَبَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاِنَّھُمَالَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَعَلَیَّ الْحَوْضَ"۔

صواعق محرقہ، جو ہماری رو میں سخت ترین کتاب ہے، میں اکثر اُسے یاد دلاتا رہتا ہوں۔ وہ بجلیاں ہمارے ہی جلانے کیلئے اتاری گئی ہیں مگر بجلیاں اُتارنا ان کا کام ہے نہیں، بجلیاں تو کسی اور کے قبضے میں ہیں۔ بہر حال بزعمِ خود بجلیاں گرائی ہیں، جلنا نہ جلنا ہمارا کام ہے۔ تو جناب! ہم گرتی ہوئی بجلیوں کی طرح اس سے جل نہیں رہے ہیں بلکہ چمکتی ہوئی بجلیوں کی طرح اُس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

جنابِ والا! اس میں حدیث ثقلین کے طریق درج کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نہیں فرمایا بلکہ مختلف مواقع پر الفاظ بدل بدل کر کبھی کسی تمہید کے ساتھ، کبھی بغیر تمہید، یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔

"اَیُّھَا النَّاسُ"۔

''میں بشر ہوں۔'' یعنی میں خدا نہیں ہوں جسے موت نہ آتی ہو۔ بہت قریب ہے وہ وقت کہ پکارا جائے اور میں لبیک کہوں۔ یعنی تمہارے درمیان سے ہٹا لیا جاؤں۔ اب:

"اَلَااِنِّیْ مُسْتَخْلِفٌ فِیْکُمَ الثَّقَلَیْنِ۔"

''آگاہ ہو کہ اپنے بعد ایک خلیفہ و جانشین تمہارے درمیان چھوڑنا چاہتا ہوں۔'' تمہارے اجماع و شوریٰ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔

"اَلَااِنِّیْ مُسْتَخْلِفٌ فِیْکُمَ الثَّقَلَیْنِ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ۔"

میں ایسی دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اصل میں خلیفہ خلف سے ہے اور خلف کے معنی پیچھے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جا رہا ہوں تو اپنے پیچھے ان دو چیزوں کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم جب تک ان سے تمسک رکھو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ کون کون؟

"کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَبَیْتِیْ"

''ایک کتاب اور ایک میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔''

یہاں تمہید وہی ہے اور جہاں یہ تمہید نہیں ہے، وہاں پس منظر وہی ہے۔ اعلان فرما رہے ہیں کہ:

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ"۔

''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔''

اعلان دو چیزوں کا ہے مگر دیکھنا ہے کہ اصل اعلان کس چیز کا ہے؟ دو چیزوں میں سے ایک تو قرآن ہے۔ تو قرآن اس وقت بھی ہے، رسولؐ خدا کے زمانہ میں بھی۔ مگر اس وقت قرآن کے ساتھ رسولؐ ہیں۔ اب قرآن تو ہے مگر رسولؐ دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں۔

تو آپ گویا فرما رہے ہیں: سنو اے اہلِ اسلام! اب تک تو قرآن کے ساتھ مَیں تھا لیکن اب مَیں جا رہا ہوں تو اب میرے بعد قرآن کے ساتھ یہ عترت اور اہلِ بیتؑ ہیں۔

ہر صاحب فہم سے میں یہ سوال کرتا ہوں کہ رسولؐ کی جگہ پر کون ہوا؟ قرآن تو اپنی جگہ پر ہے، پیغمبر خدا کی جگہ پر کون ہوا؟ اسے یوں سمجھئے کہ دو کرسیاں ہدایت کی بچھی ہوئی ہیں، ایک کرسی پر ہے قرآن اور ایک کرسی پر خود پیغمبرؐ اسلام۔ وہ کرسی جس پر قرآن ہے، وہ خالی نہیں ہو رہی ہے، قرآن اپنی جگہ پر ہے، جیسے اب تک تھا لیکن وہ کرسی جس پر پیغمبرؐ اسلام تشریف فرما تھے، وہ ہماری نگاہ ظاہر میں خالی ہو رہی ہے، منصب کے لحاظ سے کرسی خالی نہیں ہو رہی، وہ منصب پر ہیں مگر عملی طور پر جو ہمیں ہدایت فرماتے تھے، اس طرح سے تشریف فرما نہیں ہیں۔

رسولؐ فرما رہے ہیں کہ اب بھی اُسے خالی نہ سمجھنا، اب تک میں قرآن کے ساتھ تھا اور اب میرے بعد بلا فصل یعنی ایک لمحہ کیلئے بھی وہ خالی نہیں ہوگی، یعنی ادھر میں ہٹا اور دوسرا اس پر آ گیا۔ دوسروں کے اختیار میں ہوتا تو خالی رہتی، جب تک کہ لوگ فیصلہ کریں۔

اس کے ہاں تو دیر نہیں ہے، پہلے سے فیصلہ ہے، فیصلہ میں تاخیر نہیں ہے۔ لہٰذا ایک لمحہ کیلئے بھی وہ کرسی خالی نہیں ہونے والی۔ بتانا میرا کام ہے، کیونکہ ابھی تک وہ نور میں ہی ہوں، دوسرا نور نہیں آئے گا بتانے کیلئے، میں بتائے جاتا ہوں کہ میرے اس کرسی سے اُٹھ کر جانے کے بعد، جو مجھے مانتا ہے، وہ مانے کہ اس کرسی پر میرے بعد میرے اہلِ بیتؑ ہیں۔

آپ کا ایک بہت ہی مرکز نگاہ منظر آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ یہ حدیثِ ثقلین بعض روایات کے مطابق خطبہ غدیر کا بھی جزو ہے، اس دن بھی حضرتؐ نے حدیث ثقلین کا مضمون ارشاد فرمایا تھا۔ اس میں ایک بات رسولؐ نے کی تھی جو آج تک کبھی خطبہ کے موقع پر نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے ایک ہستی کو منبر پر اپنے پاس بٹھالیا تھا اور اب نفسیات کے تقاضے کون نہیں جانتا؟ علم النفس کی روشنی میں ہر شخص فطری احساس کی مدد سے دیکھ سکتا ہے کہ ایک نئی بات ہوئی ہے کہ پہلے تو کبھی خطبہ میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ سینکڑوں خطبے سنے ہیں لیکن آج جو خطبہ ارشاد فرمانے لگے ہیں اور نئے منبر پر گئے ہیں۔ اس وقت یہ لوگ نہیں تھے جو یہ کہتے کہ حضورؐ! یہ منبر بدعت ہے۔ بہر حال ایک نئی بات پیغمبرؐ نے کی تھی، ایک نئی قسم کا منبر بنایا تھا۔ اس پر ایک اور نئی بات کی کہ ہمیشہ تو تنہا منبر پر جاتے تھے، آج ایک ہستی کو اپنے پاس اس منبر پر بٹھالیا۔

ہر ایک شخص کے ذہن کے اندر شروع ہی سے تلاطم پیدا کئے ہوئے تھے کہ آج کوئی نہ کوئی خاص بات ہے، آج یہ آخر نہیں

کیوں بٹھایا ہے؟ یہ کیا بات ہے اور اس کی کی وجہ سے ایک نفسیاتی اثر ہے، لازماً، کہ لوگ خطبے کے الفاظ کم سن رہے تھے، ان کی صورت زیادہ دیکھ رہے تھے۔ مسلسل دو چار جملے سنے اور ان کی طرف نگاہ چلی گئی۔ ارے! یہ بھی بیٹھے ہوئے ہیں آج؟

ذہنی تفکرات پیدا ہو گئے، قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ ذہن کے اُچاٹ ہونے کی وجہ سے جب الفاظ سنائی ہی نہیں دے رہے تو دنیا بھول بھی جائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کچھ لوگ تو سوچ رہے ہیں کہ گویا میں طرفداری میں بھول جانے کا جواز پیدا کر رہا ہوں۔ مگر اب مجھے ہر ایک کے ساتھ ہمدردی ہے، ورنہ اتنے بڑے مجمع میں بات ہو اور لوگ بھول جائیں؟ یہ عجیب و غریب بات ہوتی ہے۔

غرض اس کی تعجب خیزی کو کم کرنے کیلئے میں نے یہ کہا کہ ایک حدیث یاد آ گئی کہ پیغمبر خدا کا ارشاد ہے:

"اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ۔"

''علیؑ کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے۔''

ایک بڑی بزرگ ہستی نے خاص موقع پر بیان کیا کہ ایک دفعہ بزرگوار بڑے غور سے حضرت علی علیہ السلام کے چہرہ کو دیکھ رہے تھے، محویت کا عالم تھا، نہ جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا؟ صاحبزادی محترمہ نے، انہیں کیا معلوم کہ اس وقت کیا کیا تصورات ہیں؟ میں تو کہوں گا کہ ان کے ساتھ ظلم کیا اور اس محویت کو اور ان تصورات کے سلسلہ کو توڑ دیا، بیدردی کے ساتھ، پوچھ لیا کہ آج آپ اتنے غور سے ان کا چہرہ کیوں دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ تم نے نہیں سنا کہ رسولؐ نے فرمایا ہے کہ علیؑ کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اس موقع پر الفاظ کم سنے جا رہے ہیں اور چہرہ پر نظر زیادہ کی جا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لاشعوری طور پر جبری حیثیت سے سارا مجمع عبادت کر رہا ہے۔ مسلسل عبادت ہوتی رہی، یہاں تک کہ خطبہ کی تمام منزلیں ان حضرت کے عالمِ محویت میں طے ہو گئیں۔

اسی دوران رسولؐ نے ایک سوال کر لیا اور مجمع نے گھبراہٹ میں ایک جواب بھی دے دیا۔ تمہید گویا ختم ہو گئی اور رسولؐ گویا آمدم برسرِ مطلب۔

وہ الفاظ جو گویا آپ کو حفظ ہیں اور آپ جس کے منتظر ہیں، وہ مجھے پیش نہیں کرنا ہیں۔ ان سے قبل کی ایک کڑی ہے جسے بیان کرنا ہے۔ جو جملے آپؐ نے ارشاد فرمانا تھے، اس سے پہلے جس مطلب کیلئے رسولؐ نے بٹھالیا تھا پہلے سے، خدا اور رسولؐ کی طرف سے منصوبہ سازی ہوئی تھی کہ ان کو اسی وقت کیلئے پاس بٹھایا تا کہ بلانا نہ پڑے۔ جو بات کہی تھی اس سے پہلے، انہیں دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور بلند کیا۔

جناب! یہ ذکرِ رسولؐ خدا کا ایک پہلو ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا دیکھے کہ جس نے درِ خیبر کو سنبھالا تھا، اسے آج رسولؐ خدا سنبھالے ہوئے ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں انؑ کو اُٹھا کر مجمع کے سامنے کر دیا کہ اُس وقت سے رفتہ رفتہ زیارت کر رہے ہو، اب پوری زیارت کر لو۔

اب ایک پہلو ہر بافہم آدمی غور کرے کہ ایک بچے کو آدمی ہاتھ میں اُٹھائے تو بچے کا قد چھوٹا، اُٹھانے والے کا بڑا۔ تو ظاہر ہے کہ کچھ جسم کا حصہ چھپے گا لیکن اب ایک پورے قد و قامت کے انسان کو کوئی منبر پر بیٹھے ہوئے اپنے سامنے لے لے تو میں تو آیت کی مناسبت سے یہی کہوں گا کہ اس وقت نور، حجاب نور میں ہو گیا ہے۔

اگر چہ اصل بات میں نے نہیں کہی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام جسم رسولؐ مخفی ہو گی اور اب سامنے منظر یہ ہے کہ رسولؐ خدا علی علیہ السلام کے جس کے عقب میں مخفی ہیں اور مجمع کو صرف علیؑ نظر آ رہا ہے ہیں۔ گویا رسولؐ نے یہ عملاً بتا دیا کہ جب آفتاب رسالت غروب ہو تو ماہتاب امامت طلوع ہوتا ہے اور یہ نور سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس وقت رسولؐ نے اس پورے سلسلہ کا نام لیا ہے۔

"اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَبَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ"

''دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور ایک میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ عِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ میری عترت، جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔

رسولؐ خدا نے دو الفاظ صرف کئے اور ''واؤ'' عطف بھی بیچ میں نہیں لائے عِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ نہیں کہا ہے، ورنہ لوگ اپنے مطلب کیلئے الفاظ کا بٹوارہ کر دیتے۔ چاہے غور کرنے سے غلط ثابت ہوتا۔ اگر الگ الگ ہوں تو تین ہو جائیں گے، دو نہیں رہیں گے اور رسولؐ نے دو کا اعلان کیا ہے۔ وہ تو نصاریٰ کے ہاں ہوتا ہے تین اکن ایک اور ایک تہائی ایک۔ یہ ہمارے ہاں تو پہاڑا ہو نہیں سکتا، جو دو ہیں، وہ دو ہیں اور جو تین ہیں، وہ تین ہیں۔ نہ ایک تین ہو سکتا ہے اور نہ دو تین ہو سکتے ہیں۔ تین الگ ہیں، دو الگ ہیں۔

میں بس ایک رُخ پیش کیا کرتا ہوں۔ تو جناب! یہ کہا کہ میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں، دو الفاظ صرف کیے ہیں کہ عترت کے معنی نہ سمجھو تو اہل بیت کا لفظ دیکھ لو اور اگر اہل بیتؑ کے مصداق تمہیں شک ہو تو عترت کو دیکھ لو۔ اب وہ آیہ تطہیر کی بحث اہل بیتؑ میں نہ لانا۔ اہل بیتؑ وہ ہیں جو عترت بھی ہیں۔ اہل بیتؑ اور عترت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، وہی عترت ہیں، وہی اہل بیتؑ ہیں اور

مَااِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ

''اگر ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے''۔

مجھے پنجابی زبان معلوم ہے، ''لا'' استعمال نہیں کیا ہے، دوسرا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں حدیث میں صرف کی ہے، مفہوم یہ ہے کہ کبھی نہیں۔ اس ''کبھی'' کی عمر کیا ہوتی ہے؟ اسے اس سے سمجھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا۔

''لَنْ تَرَانِیْ''۔ ''کبھی مجھے نہ دیکھو گے''

تو دنیا والوں نے اس کبھی کی عمر گھٹائی بھی تو قیامت تک رکھی۔ جنہیں بحمد للہ خدا کے دیدار کا انتظار ہے، وہ قیامت میں ہے۔ قیامت سے اِدھر تو اس لفظ کی عمر ختم نہیں ہوتی۔ وہ بھی میرے نزدیک گھٹانے پر ہے۔ میں دیدارِ خدا کا قیامت کے بعد بھی

تصور نہیں کرسکتا ہے۔ مگر اس قیامت کے انتظار سے مجھ خوشی ضرور ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قسمت میں انتظار لکھا ہے۔ اب کوئی ناممکن بات کا منتظر ہے، مجھے اس سے ہمدردی ہے اور ہم بحمد للہ ایسے کے انتظار میں ہیں جس کے آنے میں کوئی عقلی دُشواری نہیں ہے۔

''جب تک ان سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے''۔

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ''۔

وہی الفاظ کہ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ غور کیجئے کہ کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ کیا مطلب؟ ایک مفہوم مجھے معلوم ہے کہ یہ مقام ہدایت میں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ قرآن ایک طرف لے جائے اور اہل بیتؑ دوسری طرف لے جائیں، یا اہل بیتؑ ایک طرف لے جائیں اور قرآن دوسری طرف لے جائے۔ مقام ہدایت میں افتراق نہیں ہوسکتا، جدائی نہیں ہوسکتی۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا کو جو پسند ہو، وہ لے لے۔ دونوں سے نتیجہ نکالنا میرا کام ہے۔ یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ کوئی اسے پسند کرے، وہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ مقامِ ہدایت میں جدا نہیں ہوسکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہدایت کبھی ہدایت قرآن سے جدا نہیں ہوسکتی۔

اب ہر صاحب عقل سے ایک سوال ہے اور ایک اُصول ہے جس پر ہر صاحب عقل غور کرے کہ خطاکار اور بے خطا کا ساتھ اتفاقی ہوسکتا ہے، دائمی نہیں ہوسکتا اور یہاں کن دو کو رسولؐ کہہ رہے ہیں کہ کبھی ان دو میں فرق نہیں ہوسکتا؟ ان میں ایک ہے اللہ کی کتاب اور دوسری ہے رسولؐ کی عترت۔

اب مسلمانوں سے میرا یہ سوال ہے کہ کیا کتاب سے غلطی کا امکان ہے؟ جو مسلمان ہے، وہ تو یہی کہے گا کہ اس کتاب سے کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ تو اب جسے رسولؐ نے کہا ہے کہ کبھی جدا نہیں ہوں گے قرآن سے، تو اب بتاؤ کہ وہ بے خطا ہیں یا نہیں۔ جیسے قرآن بے خطا، ویسے یہ سب بھی خطا سے بری ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ جان کر خطا نہیں کرتے بلکہ بھولے سے بھی خطا نہیں کرتے۔ دھوکہ کھا کر بھی نہیں کرتے۔ ارے بھول کا نام نسیان ہوتا ہے، دھوکہ کھانے کا نام خطائے اجتہادی ہوتا ہے، تو جب قرآن میں کسی قسم کی غلطی نہیں ہے، نہ جان کر ہے اور نہ انجانے میں تو جو اس کے ساتھ ہیں، وہ بھی مثلِ قرآن اور غلطی سے مبرا ہیں۔ یہ دلیل عصمت ہے کہ جسے قرآن کے ساتھ کہا گیا ہے، اُس سے خطرۂ گمراہی نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرے معنی بالکل کھلے ہوئے ہیں کہ:

''لَنْ يَّفْتَرِقَا''۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک رہے اور ایک نہ رہے۔ قیامت تک کبھی نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ایک رہے اور ایک نہ رہے۔

اب مسلمانوں سے یہ سوال ہے کہ بتاؤ اس وقت قرآن ہے؟ کون کہے گا کہ نہیں ہے؟ سب کہیں گے کہ ہے۔ وہ جو قرآن کے ساتھی تھے، کیا اس سلسلہ کی بھی کوئی فرد ہے؟ اگر کہہ دیا کہ نہیں ہے تو میں کہتا ہوں کہ جدا ہو گئے اور ہمارے اور آپ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ ہرگز جدا نہیں ہوں گے۔ یہ رسولؐ وہ ہیں جنہیں کافر تک صادق کہتے تھے، اب مسلمان ہو کر آپ کو اختیار ہے۔

اگر آپ نے کہا کہ ہیں، تو حقیقت ہے، مگر یہ سن کر میں چپ نہیں رہوں گا۔ یہ نہیں ہے کہ میں خوش ہو جاؤں گا، میں آپ سے پوچھوں گا کہ ہیں تو آنکھوں سے دکھایئے کہ کہاں ہیں اُس معیار والے جو قرآن کی طرح غلطی سے بری ہوں؟ آنکھوں سے کھایئے کہ کہاں ہیں؟ اگر نہ دکھایئے تو آپ کو لفظ نہ معلوم ہو۔ میں بتاتا ہوں کہ پھر غائب مانئے، کیونکہ غائب؟ اب لفظ آپ کو مجھ سے ملا ہے تو معنی بھی بتانا میرا فرض ہے کہ غائب وہ نہیں ہے جو ہو ہی نہیں اور غائب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے ہو، یعنی غائب کی حقیقت ایک نفی اور ایک مثبت سے مل کر بنتی ہے۔

ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو، یہ ہیں معنی غائب کے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو، یہ ہیں غائب کے معنی۔ تو میں کہتا ہوں کہ آنکھوں کے سامنے نہ ہونا تو آنکھوں سے ثابت اور ہونا صادق کے کلام سے ثابت۔

بس جناب! جو پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا تھا، اس کے معنی کے لحاظ سے دو پہلو، ایک یہ کہ ہدایت کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ زمانہ ان سے خالی نہیں ہوتا۔ اور یہ نہیں کہ ایک کا وجود ہے اور دوسرے کا نہ رہے۔ میرے نزدیک دونوں مفہوم حق ہیں۔ چونکہ رسولؐ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر پہلو مراد ہوتا ہے۔ وہ پہلو بھی ہے اور یہ پہلو بھی ہے۔ مگر دنیا والوں نے کیا کیا ہے؟ دنیا والوں نے یہ کیا کہ بدسلوکیوں میں دونوں کو شریک رکھا۔ جو بدسلوکی ایک کے ساتھ ہوگی، وہ بدسلوکی یا اس سے بالاتر دوسرے کے ساتھ بھی ہوگی۔ اس لئے بدسلوکیوں کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ منزلِ مصائب میں بھی اہلِ بیت اور قرآن کا ساتھ رہتا ہے۔ جسے دنیا اپنے مقصد کیلئے کم خطرناک سمجھتی تھی، اُسے کم مصائب کا شکار کیا، جسے اپنے لئے زیادہ ضرر رساں سمجھتی تھی، اُس کو زیادہ مرکزِ مصائب بنایا۔

یہ نہیں ہے کہ قرآن پر مظالم نہ ہوئے ہوں، قرآن مصائب سے محفوظ رہا ہو۔ ایک اصل ظلم جو دونوں پر ہوا، جس میں سے ایک شاید آپ کے نزدیک بھی ہمت شکن ہو، میرے نزدیک ہمت شکن ہے۔ سب سے بڑا ظلم قرآن پر حقیقت میں یہ ہے کہ سننے والے اس پر عمل نہ کریں۔ قرآن کو اپنی رہنمائی کا ذریعہ سمجھنے والے عمل کی منزل میں قرآنی تعلیمات پر پورے نہ اُتریں۔ دوسرا پہلو بھی اس کا تلخ ہے کہ اگر یہ قرآن پر ظلم ہے تو یہ اہلِ بیتؑ پر بھی ظلم ہے کہ انہیں امامؑ ماننے والے ان کی پیروی نہ کریں۔ ان کے احکام کی اطاعت نہ کریں۔ حقیقی ظلم یہ ہے۔ یہ وہ ظلم ہے جو دونوں کے ساتھ ایک ساتھ ہے۔

4

فتح مبین

جنگ بدر میں میدان سادہ تھا اور جناب رسول خدا کے پاس کوئی نہ تھا جو تھے وہ شہید ہو گئے اور باقی میدان سے غائب ہو گئے تو یاد رکھیں اس وقت ایک ذات علی مرتضیٰ کی تھی بر سرپیکار تھی یہاں تک کہ اعلان فتح ہوا کہ اے رسولؐ! ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام نہ کسی کے اشارہ چشم و آبرو کو دیکھتے ہیں اور نہ چہروں کی بدلتی ہوئی رنگتوں کو دیکھتے ہیں آپ شرائط لکھوا رہے ہیں اور لکھنے والا ہے کہ لکھے جا رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں محمدؐ و علیؑ کے سوا کوئی نہ تھا جو دین اسلام کی ترجمانی و پاسداری کرتا۔

اب دنیا کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ اسلام جنگ کے میدان میں فتح مبین نہیں کہتا بلکہ امن کے میدان میں فتح کو فتح مبین کہتا ہے۔

مجھے کربلا میں صفین کی تصویر مجسم طور پر نظر آتی ہے وہاں بھی چھوٹے بڑے بہت سے قرآن تھے جو نیزوں پر بلند کئے تھے اور یہاں بھی چھوٹے بڑے قرآن ہیں جن کو نیزوں پر آویزاں کر کے کوفہ و شام کی طرف لے گئے۔

قرآن کو آج تلک ہے اُن پاروں کی تلاش
جو نہر علقمہ کے کنارے بکھر گئے

فتح مبین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
"اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا"۔

قرآن مجید میں مستقل سورہ ہے جس کا نام سورۂ فتح ہے اور اسی آیت کی مناسبت سے جو آغازِ سورۃ ہے، یہ سورۃ "اِنَّا فَتَحۡنَا" کے نام سے بھی مشہور و معروف ہے۔ بسم اللہ کے بعد یہ اس کی پہلی آیت کا پہلا جزو ہے، ارشاد ہو رہا ہے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ سے کہ یقیناً ہم نے تم کو ایک بہت ہی کھلی ہوئی اور نمایاں فتح عطا کی ہے۔ فتح اور شکست، یہ آپ کی اُردو زبان میں بھی مستعمل ہے اور اس کا اس سے زیادہ آسان اُردو ترجمہ بھی معلوم ہے، "جیت اور ہار"۔ جب ہم فتح کے الفاظ سنیں تو اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں فوراً جنگ آئے گی اور جب خالق نے کہا کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی تو فوراً ذہن میں یہ آئے گا کہ کوئی بہت بڑی جنگ تھی جس میں بہت نمایاں فتح حاصل ہوئی۔

اگر کتابوں پر نظر نہ ہو اور انسان قرآن کا مطالعہ نہ کئے ہوئے ہو اور یہ آیت سنے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی تو یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ بہت بڑی جنگ تھی جس کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی، جس کامیابی کو خالق نے عظیم کامیابی کہا۔

ہم اب مطالعہ شروع کر دیں گے غزواتِ رسولؐ کا کہ حضرتؐ نے کون کونسی جنگیں لڑیں اور ان چھوٹی جنگوں کو جن میں حضرتؐ کسی کو سردار بنا کر بھیج دیتے تھے، انہیں نظر انداز کر دیں گے کیونکہ وہ ایسی اہم نہیں تھیں۔ جبھی تو آپؐ خود تشریف نہیں لے گئے ۔انہیں اصطلاحاً سریہ کہتے ہیں جہاں کسی دوسرے کو سردار بنا کر بھیج دیتے تھے۔ غزوات وہی ہیں جن میں حضرتؐ خود تشریف لے گئے۔ بس ایک جنگ ہے جو اصطلاح کے مطابق سریہ کہی جانی چاہئے۔ مگر نہ معلوم کیوں محاورہ بن گیا کہ اُسے غزوۂ موتہ کہنے لگے۔

اب اس پر نظر ڈالیں گے اور جب آیت کے مفہوم کو صرف اپنی عقل سے چاہیں گے کہ آخر وہ کونسی جنگ ہو سکتی ہے کہ جس میں کامیابی کو خدا نے نمایاں کامیابی اور فتحِ مبین کہا ہو۔ تو ہمارا ذہن بہت سے پہلوؤں کو محسوس کرتا ہے کہ کن پہلوؤں سے وہ فتح ہو تو فتح مبین ہوگی۔

پہلی صورت یہ ہے کہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے فتح کی کوئی صورت ہی نہ ہو، ساز و سامان ہی اتنا نہ ہو کہ جنگ سر ہو سکے اور پھر اس کے باوجود نتیجہ میں فتح ہو تو بالکل برمحل ہوگا اگر وہاں خالق ارشاد فرمائے کہ ہم نے آپ کو فتحِ مبین عطا کی یعنی اسباب تو ایسے نہ تھے۔

اب اس معیار پر دیکھیں تو جنگِ بدر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ سب سے پہلی اور اہم لڑائی اسلام کی، جس کو جنگِ بدر کہتے ہیں، اسی بدر کی جو صورتِ حال ہے، اس کو پیش کر کے میں اس دنیا کو دعوت دیتا ہوں، جو کہتی ہے کہ اسلام کو تلوار سے پھیلایا گیا اور رسولؐ کی

لڑائیوں کو (معاذ اللہ) یہ سمجھتی ہے کہ یہ ان کی طرف سے جارحیت کا نتیجہ تھیں۔

میں کہا کرتا ہوں کہ تمام لڑائیوں کا سنگِ بنیاد جنگ بدر ہے تو اب جنگِ بدر کی صورتحال پر غور کیجئے، انصاف کے ساتھ، پھر آپ کی عقل یہ کہے کہ یہاں رسولؐ نے خود اقدام کیا ہوگا تو میں سمجھوں گا کہ ابتداء انہوں نے کی ہے۔ لیکن اب جنگِ بدر کی صورتِ حال جو ہے، وہ متفق علیہ تاریخ میں یہ نظر آتی ہے کہ اُدھر ایک ہزار کے قریب لشکر اور سازوسامان جنگ سے بالکل آراستہ و پیراستہ اور ادھر اُن کے مقابلہ میں کل جماعت تین سو تیرہ آدمی اور ان تین سو تیرہ میں صرف تیرہ تلواریں اور صرف دو عدد گھوڑے۔

تو میں صاحبِ عقل دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ جس کے پاس سامانِ جنگ یہ ہو، کیا وہ خود سے چڑھائی کرے گا؟ آپ اُسے رسولؐ نہ مانئے، صرف ایک صاحبِ عقل انسان سمجھ کر کہئے کہ یہ سازوسامانِ جنگ ہو تو کیا وہ ابتدائے جنگ کرے گا؟ یہ صورتِ حال تو خود بتاتی ہے کہ جنگ کر نہیں رہا ہے، بلکہ جنگ کرنا پڑ گئی ہے۔ اب نتیجہ کو نہ دیکھئے گا کہ کیا ہوا، اس صورتِ حال کو دیکھئے کہ جس کے پاس یہ جماعت ہو اور ایسے سازوسامان کے ساتھ ہو، جس کو کہنا چاہئے کہ کچھ بھی سامان نہیں اور وہ نکل کھڑا ہو مقابلہ کیلئے تو وہ مارنے نکلا ہے یا مرنے؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مقصد قربانی پیش کرنے کا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔

اب اس کے باوجود اگر فتح ہوئی تو کیا وہ جنگ اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ خالق کہے:

"اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔"

"ہم نے آپ کو یہ عظیم فتح عنایت کی۔"

اب تاریخ کو دیکھئے تو وہ بتائے گی کہ جتنی مکمل شکست بدر میں ہوئی ہے، اُس مخالف گروہ کو، ایسی شکست کسی جنگ میں نہیں ہوئی۔ یعنی جتنے بڑے سردار تھے، جتنے سرغنہ تھے، جتنے بڑے بڑے سورما تھے، سب اسی جنگ میں تہہ تیغ ہوئے۔

اب قرآن کہہ رہا ہے کہ فرشتے مدد کیلئے آئے تھے۔ خیر فرشتے آئے تھے تو کس نے فتح دی؟ میں کہتا ہوں کہ فرشتے تو بہر حال ضرور آئے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ کمزور دل والوں کی تسلی کیلئے آئے کہ گھبرانا نہیں، اگر کبھی ضرورت پڑے گی تو ہم فرشتے بھی بھیج دیا کرینگے۔ یہ تمہاری بشارت کیلئے، تمہیں خوشخبری دینے کیلئے فرشتے آئے ہیں۔ مگر دنیا والے خوش ہو گئے کہ مفت میں فتح مل گئی۔

اور حقیقی جو شجاع تھا؟ میں کہتا ہوں کہ وہ تو افسردہ ہو گیا کہ میرے ہوتے ہوئے فرشتے آئے؟ میں موجود تھا اور پھر فرشتے آئے؟ حالانکہ اس کی دلجوئی کا خالق نے بڑا اہتمام کیا کہ فرشتے بھی آئے تو اسی کی صورت میں آئے۔ جو کوئی بھی مجروح تھا، اس سے پوچھا جاتا تھا، تو اسی کا نام لیتا تھا، چاہے عداوت ان سے بڑھ جائے لیکن ان کی شجاعت کو بار محسوس نہ ہو۔

اور ماشاء اللہ صاحبانِ فہم اس جملے کو سمجھیں گے جو اب عرض کرنا ہے کہ صفتِ شجاعت کو اس ذات سے ایسی خصوصیت ہو گئی تھی کہ ملک لباسِ مجاز بھی پہنتا تھا تو شجاعت کیلئے۔ اس سے بہتر صورت اور کوئی نہ ملتی تھی۔

بہر حال اب جب فرشتے آئے تو اور زیادہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ یہ کہے کہ یہ کھلی ہوئی فتح ہم نے خلاف اُمید عطا کی۔ یہ ایک سبب ہو سکتا ہے فتح کے نمایاں ہونے کا۔ ایک اور معیار ہو سکتا ہے فتح کے عظیم ہونے کا کہ شکست ہو چکی ہو اور پھر ختم ہو جائے۔ ارے

ایسی شکست کہ صفِ میدان میں کوئی تھا ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب کوئی نہیں تھا تو نام لینے کی کیا ضرورت ہے کہ کون کون نہیں تھا؟ شخصیات تو گم ہو جاتی ہیں، جمہور کے کردار میں۔ تو اس لئے مجھے نام لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کون کون نہیں تھا۔ بس یہ ہے کہ صفحہ میدان سادہ تھا اور رسولؐ کے پاس کوئی نہ تھا۔ جو تھے، وہ شہید ہو گئے اور باقی میدان سے غائب ہو گئے۔

اب ایک کی تلوار ہے اور فتح ہوئی اور وہ ایک شخص وہی تھا جس کے دل پر اس روز مَیل آیا تھا تو خالق نے کہا آج کچھ بھی ہو جائے، آج فرشتے نہیں آئیں گے اور اسی ایک نے دکھا دیا کہ کوئی نہ رہے مگر میں جنگ سر کر کے دکھا دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری شجاعت جمہور کا سہارا نہیں لیتی، نہ میری شجاعت جمہور کے سہارے سے ہے، نہ امامت جمہور کی وجہ سے ہے۔

تو اب جناب اسی صورتِ حال کے باوجود ہر جنگ کو اگر تفصیل سے عرض کروں تو وقت کے اندر مجلس ختم نہ ہو۔ اسی لئے بس ہر جنگ کو چند جملوں میں عرض کروں گا۔ یہاں دیکھئے، کیا آئی:

"اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا۔"

کی آواز۔ اگر اس محل پر آئی ہو تو ہمارے لئے بالکل ذہن نشین ہے، ہماری سمجھ میں بالکل آتا ہے کہ خالق گویا ارشاد کر رہا ہے، مسلمانوں پر تازیانہ لگاتے ہوئے کہ تم نے شکست میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی، یہ ہم تھے جس نے تم کو یہ کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ ارے اب کسی کے ہاتھ سے ہو، تو وہ ہمارا ہی تو ہاتھ ہے۔ تو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ آیت اُتری۔

اس کے بعد جنگِ خندق ہے، جنگِ خندق میں وہ ایک سورما جس سے خود اپنی جماعت کے نمایاں افراد مجمع کو دہلا رہے تھے کہ اس سے بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ یہ تو اونٹ کے بچے کو سپر بنا لیتا ہے۔ بڑی اہمیت ہے کہ اونٹ کے بچے کو سپر بنایا۔ میں کہتا ہوں کہ جو حقیقی شجاع ہے، وہ اس کا عملاً جواب دے گا کہ ارے تمہیں اونٹ کے بچے سے بڑی اہمیت محسوس ہوئی، تو درِ خیبر کو سپر نہ بنا دوں؟

جب اس سورما کے مقابل میں اِدھر کا مردِ میدان گیا تو پہلے تو رسولؐ نے بھی جانے والے کی اہمیت کو نمایاں کیا اور اس کے مدِ مقابل کی بھی اہمیت کو نمایاں کیا:

"بَرَزَ الۡاِيۡمَانُ كُلُّهٗ اِلَى الۡكُفۡرِ كُلِّهٖ۔"

اس میں گویا اِدھر والے ہی کو بہت بڑا امتیاز عطا نہیں کیا بلکہ اُدھر والے کو بھی دنیائے کفر میں امتیاز عطا کیا ہے کہ پورا ایمان جا رہا ہے پورے کفر کے مقابلہ میں۔

یعنی اس ایک کو شکست ہو گئی تو پورے کفر کو ہمیشہ کیلئے شکست ہو گئی اور اس ایک نے فتح حاصل کی تو پورے ایمان کو ہمیشہ کے لئے فتح ہو گئی۔ اس سے بعد کے ارشادِ رسولؐ کا مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ اگر یہ فتح نہ ہوئی تو قیامت تک کی عبادتیں کہاں ہوتیں؟ یہی تو فتح ہونے کے بعد رسولؐ نے فرمایا کہ:

اسی طرح حنین میں بھی شکست کے بعد فتح ہوئی۔ بڑی لڑائی خیبر کے بعد حنین کی ہے۔ خیبر کے بعد اور کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ تو یہ جتنے واقعات ہیں، اس میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ہم کہہ دیں کہ آیت یہاں نازل ہوئی ہے تو عقل قبول کرلے گی اور ذہن

اِسے قبول کرلے گا۔ حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب جو واقف ہیں، وہ، اور جو ناواقف ہیں، وہ، انہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ سورۃ نہ بدر کے بعد نازل ہوئی، نہ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے، نہ خندق کے بعد نازل ہوئی ہے، نہ یہ جنگِ خیبر کے بعد نازل ہوئی ہے، نہ جنگِ حنین کے بعد نازل ہوئی ہے۔

یہ میں ایسے اجتماعات میں بھی پیش کرتا ہوں کہ جہاں غیر مسلم افراد کثرت سے ہوتے ہیں۔ حضور! یہ سورۃ صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہے جہاں جنگ ہوئی ہی نہیں تھی۔ جہاں پیغمبرؐ خدا ایسی شرائط کے ساتھ صلح کرکے واپس چلے گئے کہ ساتھ والے پرجوش مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ گھبرا گھبرا کر اتنے شدید سوال ہو رہے تھے کہ جو صحیح بخاری کے صفحات پر درج ہیں کہ کیا آپ نبی نہیں ہیں؟ کیا ہم مومن نہیں ہیں؟ پھر ہم یہ ذلت کیوں برداشت کریں اتنی ناراضگی تھی مسلمانوں کو، یہ دی ہوئی شرائط ہیں۔ بس اب یہاں پوری تاریخ میرے سامنے ہے۔ ایک بات تو ضرور کہوں گا یہاں کہ جنگ ہوتی تو لڑتا کوئی اور مگر اب صلح ہو رہی ہے صلح کے میدان میں بھی قدم نہیں رُکتے۔

اور جو ہر جنگ کا فاتح رہا ہے، اس کو کوئی بے چینی نہیں ہے۔ جس ہاتھ میں علم تھا، اُسی ہاتھ میں آج قلم ہے۔ نہ جب ہاتھ میں علم ہوتا تھا تو ہاتھ کو جنبش ہوتی تھی۔ نہ آج قلم ہاتھ میں ہے تو ہاتھ میں لرزہ ہے۔ یعنی ہر میدان میں ثابت قدم۔ اب صلح ہوگئی۔ سرکار والا! اس وقت لکھی جا رہی تھی شرائط۔ تو بعد میں رسولؐ سے کتنی باتیں ہوئیں؟ تو اس وقت آپس میں کتنی باتیں ہوئی ہوں گی؟ کتنی نکتہ چینیاں آپس میں ہو رہی ہوں گی۔ دیکھو! اسے بھی مان لیا، اُسے بھی مان لیا کوئی ایک دوسرے کو ٹہوکے دے رہا ہے اور پیغمبرؐ ہیں کہ ان کی طرف سے آنکھ بند کیے ہوئے ہیں۔ نہ ان کی باتوں کو سنتے ہیں، نہ ان کے اشارۂ چشم و ابرو کو دیکھتے ہیں، نہ ان کے چہروں کی بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھتے ہیں۔ آپ شرائط لکھوا رہے ہیں ارے لکھنے والا ہے کہ لکھے جا رہا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ میدان میں اُس وقت صرف دو ہیں۔

یعنی ان سب کا رنگ کچھ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں، نہ ان کی باتیں سن رہے ہیں، نہ ان کی طرف توجہ دے رہے ہیں، نہ ان کو کچھ سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ یہاں بہت مجمع ہے، مگر یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ کچھ نہیں۔ بس ایک جملہ، اور وہ یہ کہ رائے عامہ کی جیسی توہین حدیبیہ میں ہوئی ہے، ایسی تاریخ میں کبھی اور کہیں نہیں ہوئی۔

اب رسولؐ اللہ صلح نامہ کو مکمل کر کے دستخط کر چکے۔ اس کی باضابطہ تکمیل کر چکے۔ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہیں۔ اب وہ شرعی حیثیت سے اس کی پابندیوں کو ختم کرنے کیلئے، جو صورت شرع میں ہے، وہ اختیار فرما رہے ہیں کہ کچھ بال سر کے کاٹے جائیں یا یہ کہ افضل تو یہی ہے کہ پورے سر کو منڈوایا جائے، وہ جو منٰی میں ہوا کرتا ہے، صاف کریں گے۔

ہمارے ہاں کے نوجوان کتنی ہی محبت سے بال رکھتے ہوں، کتنے ہی اہتمام کے ساتھ ان کی آرائش ہوتی ہو مگر حج کریں گے تو وہاں جا کر فارغ البال ہونا پڑے گا۔

"ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ۔"

قیامت تک جتنی عبادتیں ہوں گی، ان سب سے افضل آج کی یہ ایک ضربت ہے۔

تو اب جب کفر کا اتنا طاقتور نمائندہ، اُس نے شکست کھائی تو اب اس جنگ کے نتیجہ کو اللہ ارشاد فرمائے:

"اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔"

ہم نے آپ کو نمایاں فتح عنایت کی جس سے ہمیشہ کیلئے کفر شکست کھا گیا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد مشرکین قریش کی کمر ٹوٹ گئی۔ جنگِ احزاب کے بعد انہوں نے معرکہ آرائی کی ہمت نہیں کی۔ پھر اور لڑائیاں جو ہوئی ہیں، وہ خیبر ہے، وہ یہود کے مقابلہ میں ہے۔

وہ جواب تک جنگ کر رہے تھے، وہ سب ہمیشہ کے لئے شکست کھا گئے۔ تو اب اسے اللہ کہے تو بالکل صحیح سمجھ میں آنے والی بات۔ اب اس کے بعد جنگِ خیبر۔ اب حضور خیبر میں بھی جب مسلسل شکستیں ہو رہی ہیں اور پھر فتح ہو تو وہ فتح مبین ہے یا نہیں اور رسول کی وہ حدیث جو متفق علیہ ہے، صحیحین میں بھی موجود ہے۔ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے تو پیغمبرؐ نے اس کے کردار کو فتح کہا ہے۔ وہ حدیث:

"لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا"۔

اس کے آخر میں کیا فرمایا ہے:

"يَفْتَحَ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ۔"

"ایسے کو علم دوں گا کہ وہ نہیں پلٹے گا جب تک کہ اس کے ہاتھوں میں فتح نہ ہو جائے۔ دیکھئے کتنا مطابق ہے آخری جزو "اِنَّا فَتَحْنَا" کے ساتھ "حَتّٰى يَفْتَحَ اللّٰه" یہاں تک کہ اللہ فتح دے دے اس کے ہاتھ پر۔

بس وہ پوری حدیث تو میں نے چھوڑ دی ہے، اس لئے کہ تبصرہ کرنا نہ پڑے۔ یہ جملہ تو ضرور تا پیش کرنا تھا کیونکہ فتح کا لفظ آیا ہے۔ تو یہاں پیغمبرِ خدا کی بارگاہ میں عرض کروں گا کہ حضورؐ! آپؐ نے کرار غیر فرار فرمادیا۔ یہ صفت ہے۔ آپ کا مشاہدہ ہے، دنیا کا مشاہدہ ہے اور حضور پھر اس میں:

"يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔"

یہ فرمادیا تو ظاہر ہے کہ آپ ترجمان ہے اللہ کے، آپ کو اس کی محبت کا حال بھی معلوم ہے، اسی کے دیئے ہوئے علم سے، لیکن یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ وہ نہیں پلٹے گا، تو پلٹنا، نہ پلٹنا، فعل غیر ہے۔ یہ تو آدمی کا اختیار ہے کہ پلٹے نہ پلٹے۔ تو دوسرے کے فعل کی ذمہ داری آپ کیوں لے رہے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ وہ نہیں پلٹے گا، جب تک خدا اس کے ہاتھ پر فتح عنایت نہ کردے۔ تو آپؐ دوسرے کے عمل کی ذمہ داری خود لے رہے ہیں۔ تو رسول فرمائیں گے کہ آدمی کسی دوسرے کے عمل کی ذمہ داری نہیں لے سکتا لیکن آدمی اپنے نفس کے عمل کی ذمہ داری بھی نہیں لے سکتا؟

تو حضور! اب آپ فرماتے ہیں، مجمع سے مخاطب ہو کر، کہ بس سر کے بال منڈواؤ یعنی احرام کو ختم کرو۔ حضرتؐ کے حکم پر مجمع

میں سے کوئی نہیں اُٹھ رہا ہے۔ پھر فرماتے ہیں، دوبارہ فرماتے ہیں اور کئی دفعہ فرمانے کے بعد، جی ہاں! مایوس ہو کے، حضرتؐ وہاں سے تشریف لے گئے اور آپؐ نے پرواہ نہیں کی، تشریف لے جا کر خود اپنے بالوں کو دور فرمایا۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو واپس چلے ہی جا رہے ہیں، ہم انؐ کے بغیر کہاں ٹھہریں گے تو اب بددلی سے جا کر تھوڑے تھوڑے بال، اس کو تقصیر کہتے ہیں فقہ کی اصطلاح میں، کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تھوڑے تھوڑے بال کٹوائے۔ دل تو چاہ نہیں رہا تھا، اس لئے تھوڑے تھوڑے بال قینچی سے کٹوا لئے، پابندی ختم کر دی۔

اب متفق علیہ کتابوں میں بات ہے کہ دوسرا دن ہوا، ظاہر ہے کہ سب کو حضرتؐ کی خدمت میں ہی تو رہنا تھا، لہٰذا وہ غم وغصہ بھی پرانا ہو گیا۔ اب سب آ کر رسولؐ کی خدمت میں بیٹھے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ رحمت نازل فرمائے اُن لوگوں پر جنہوں نے اپنے سر منڈوائے''۔

ایک طرف سے آواز آئی:

''وَالْمُقَصِّرِيْنَ''۔

یارسولؐ اللہ! اور جنہوں نے۔۔۔۔۔

اب کیا کیا جائے کہ اس کیلئے فقہ میں لفظ یہی ہے کہ جو تقصیر کرنے والے ثابت ہوئے، وہ تقصیر اور معنی میں ہے مگر ہے یہی لفظ۔ تو جنہوں نے تقصیر کی، انہیں بھی فرما دیجئے۔ اب بڑے صاحب الرائے جتنے بھی ہیں، سب کچھ ہیں مگر رسولؐ کو وسیلہ جانتے ہیں کہ بغیر ان کی دعا کے کچھ نہیں ہوگا۔ تو کہتے ہیں جنہوں نے تقصیر کی، انہیں بھی فرما دیجئے۔ رسولؐ نے دوبارہ پھر فرمایا اتنا ہی کہ:

''جنہوں نے سر منڈوایا، ان کے شاملِ حال اللہ کی رحمت ہو''۔

پھر دوسری طرف سے آواز آئی ''وَالْمُقَصِّرِيْنَ'' یعنی کیا خوب ہے معطوف الیہ۔ رسولؐ کے کلام میں معطوف یہ لوگ بڑھا رہے ہیں۔ حضورؐ یہ بھی کہ ''وَالْمُقَصِّرِيْنَ''، کہ جنہوں نے تقصیر کی۔ حضورؐ نے پھر اتنا ہی فرمایا کہ جنہوں نے رضا سے اپنے بال کٹوا دیئے۔ اب پھر آواز آئی تو حضورؐ نے بغیر دعائے رحمت کے دہرائے ہوئے دہرایا کہ ''وَالْمُقَصِّرِيْنَ''، اچھا تمہاری خاطر یہ بھی سہی کہ جو تقصیر کرنے والے ہیں، وہ ''وَالْمُقَصِّرِيْنَ'' اور وہ جنہوں نے تقصیر سے کام لیا۔ تو اب یہ عالم کہ مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ ہمارے لئے عزت ہے یا ذلت ہے۔

اب خالق یہ سورۃ نازل فرماتا ہے کہ:

''اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا''۔

''ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی''۔

تو پیغمبرؐ نے ناراض مجمع کے نمائندہ خاص کو بلا کر، جو ایسی ہی گفتگو کر رہے تھے، انہیں بلا کر فرمایا کہ دیکھو! یہ سورۃ

نازل ہوئی ہے:

"اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا۔"

"ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔" تو اب بولتے ہیں کہ اچھایوں بھی فتح ہوتی ہے؟ یعنی اب بھی دل کو یہ بات لگ نہیں رہی۔ اچھایوں بھی فتح ہوتی ہے؟ رسول فرماتے ہیں میں کیا کروں، اللہ یہ کہہ رہا ہے۔

دیکھئے! اسلام لانا کتنا مہنگا پڑا ہے کہ اب کیا کریں؟ اللہ کہہ رہا ہے۔ تو اب یہ ہے کہ جس کیلئے غیر مسلم مجمع میں یہ خلاصہ پیش کرتا ہوں کہ اب اس سے دنیا کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ اسلام جنگ کے میدان میں فتح کو فتحِ مبین نہیں کہتا۔ امن کے میدان میں فتح کو فتحِ مبین کہتا ہے۔

بہر حال اب دنیا کو اس سے ایک نتیجہ پر پہنچنا چاہئے کہ فتح ایک ہی طرح کی نہیں ہوتی۔ فتح یہی نہیں ہوتی کہ دشمن کی فوج کو منتشر کر دیا جائے۔ دشمن کو مادی حیثیت سے دبا دیا جائے۔ یہی فتح بس فتح نہیں۔ اگر قرآن کو ماننا ہے تو ماننا پڑے گا کہ فتح کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ اگر نانا نے صلح فرمائی مشرکین کے ساتھ اور اُسے قرآن مجید نے کہا کہ یہ فتحِ مبین ہم نے عطا کی۔ تو اگر نواسہ ظاہری مسلمانوں کے مقابلہ میں صلح کرے تو دنیا کو اسے شکست کہنے کا حق نہیں ہے۔ اُسے فتح کہنے کا ہمیں حق ہے، دنیا کو شکست کہنے کا حق نہیں ہے اور اگر ہم کہیں کہ کربلا میں حسینؑ نے بھی فتح حاصل کی تو دنیا کو اس پر مضطرب و پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ یوں بھی فتح ہو سکتی ہے۔

دیکھئے! فتح کے معنی کسی لغت میں مار ڈالنے کے نہیں ہیں اور شکست کے معنی مارے جانے کے نہیں ہے۔ فتح کا فارسی ترجمہ کامیابی کے معنی مقصد حاصل کرنا اور ناکامی کے معنی مقصد حاصل نہ کر سکنا۔

اب میں کہتا ہوں کہ ذرا ہر صاحب عقل غور کرے کہ اگر امام حسینؑ اور یزید میں جنگ یہ ہوتی کہ وہ قتل کرنا چاہتا تھا اور یہ قتل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، اپنے کو قتل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، یہ مقابلہ ہوتا تو میں بالکل متفق ہو جاؤں گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا کہ اُس نے شہید کر دیا اور یہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے کہ شہید ہو گئے۔ مگر یزید میں اور انؑ میں کب یہ جنگ تھی کہ وہ قتل کرے گا اور آپ قتل سے بچنا چاہیں گے؟ یزید اور آپؑ کے درمیان جنگ اس بات پر تھی کہ وہ بیعت لینا چاہتا تھا اور آپؑ بیعت سے انکار کر رہے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اب فتح و شکست کا معیار کیا ہوا؟ اگر یزید بیعت لے سکے تو فاتح اور اگر بیعت نہ لے سکے تو شکست خوردہ، ناکام، اب دوست اور دشمن ہر ایک کی تاریخ پڑھ لیجئے، چاہے کتنا ہی تعصب سے کام لیا ہو، کیا یزید بیعت لینے میں کامیاب ہوا؟ کیا یہ انکارِ بیعت میں ناکام ہوئے؟

حضور! اگر وہ کربلا میں بیعت لینے میں کامیاب ہو جاتا تو مصائب کربلا ہی میں ختم ہو جاتے اور بس یہ باب مصائب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں فتح کا جو معیار لوگوں کے سامنے ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ادھر بربادی کا پورا مرقع تھا اور اسی لئے انہیں احساسِ فتح تھا۔ اگر احساسِ فتح نہ ہوتا تو تکبیر کے نعرے کیوں بلند کرتے؟ ظاہر ہے کہ ہمیں بھی محبوب ہے تکبیر، مگر مسلمانوں نے تکبیر کو اتنا

ذلیل کیا ہے تاریخ میں کہ اس کے بعد اکثر مجھے تکبیر کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تو یہ تکبیر کے نعرے اپنی فتح پر تھے۔ اگر فتح کا احساس نہ ہوتا تو شادیانے کیوں بجائے جاتے، اگر فتح کا احساس نہ ہوتا تو بازاروں کی آئینہ بندی کیوں ہوتی؟ اگر فتح کا احساس نہ ہوتا تو دنیا کو دعوتِ عام کیوں دی جاتی؟

بعدِ شہادتِ امام حسینؑ بیبیوں کو براہِ راست مدینہ کیوں نہ بھیجا گیا؟ صرف اپنے اعلانِ فتح کی خاطر! گویا اہل حرم کا قافلہ نہ تھا، ان کے خیال ناقص ہیں، ان کی فتح کا جلوس تھا۔ مگر میں بافہم مجمع کو مخاطب کرونگا کہ یہ جلوس جیسے وہ اپنی فتح کا جلوس سمجھ کر اُٹھا رہے تھے اور جسے اپنی فتح کے مظاہرہ کیلئے نیزوں پر سر بلند کیے ہوئے تھے، میں کہتا ہوں کہ نتیجہ کے طور پر ثابت ہوا کہ یہ لاشعوری طور پر ان کے ہاتھوں حسینؑ کی فتح کا جلوس تھا۔

جب یہ جلوس بازاروں سے گزر رہا تھا، مجھے یہاں کربلا میں صفین کی تصویر مجسم طور پر نظر آتی ہے، وہاں بھی چھوٹے بڑے بہت سے قرآن تھے، جو نیزوں پر بلند گئے تھے اور آگے آگے ایک قرآنِ عظیم تھا جو دمشق کی مسجد سے لایا گیا تھا اور یقیناً سیاسی آلۂ کار بنانے کیلئے لایا گیا تھا ورنہ فطری طور پر اس کو وہاں سے ہٹانے ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک آدمی اس کو نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اس وقت بھی تصور یہ تھا کہ جتنا وزن و جسامت قرآن کا زیادہ ہو، اُتنی ہی اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوگی۔

تو جنابِ والا! بہت سے آدمیوں نے اُٹھا کر اُسے صفین میں بلند کیا تھا۔ تو مجھے تو وہی مرقع کربلا میں یعنی کربلا سے چل کوفہ کے راستے میں اور کوفہ سے شام کے راستے میں نظر آتا ہے کہ نیزوں پر، بہت سے چھوٹے بڑے قرآن ہیں اور آگے آگے ایک نیزۂ طویل پر قرآنِ اعظم ہے جس کو وہ بلند کیے ہوئے جا رہے ہیں۔

اب اب جس راستہ سے گزرتا ہے، کوٹھے تماشائیوں سے بھرے ہوئے بازاروں میں چاروں طرف دیکھنے کیلئے لوگ موجود، غیر معمولی اجتماع، مگر سرِ حسینؑ، میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ نوکِ نیزہ پر اس پورے مجمع سے جو کربلا سے کوفہ تک اور کوفے سے دمشق تک اور آباد سے آباد بازاروں میں پُر رونق سڑکوں پر تھا، تو سرِ حسینؑ اس مجمع کو مخاطب کر کے کہتا تھا کہ تماشہ دیکھو اور تم تماشہ دیکھنے کے لئے ہی بلائے گئے ہو۔ مگر گواہ رہنا کہ میں نے بیعت نہیں کی ہے۔ اگر میں نے بیعت کی ہوتی تو یہ میرا سر نیزہ پر کیوں ہوتا؟ یہ میرے دل کے ٹکڑے نیزوں پر کیوں ہوتے؟ یہ میری بہنیں، یہ میرے اہلِ حرم، اس طرح ان کی کیون تشہیر ہوتی؟ یہ میرا بیمار بیٹا، یہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں کیوں پہنتا؟ یہ پیروں میں بیڑیاں کیوں پہنتا؟ ہی اس کے گلے میں طوق کیوں ہوتا؟

5

اطاعتِ خداوندی

خدا کی قسم! یہ تو محمدؐ و آلِ محمد کی زبان کا اعتبار ہے کہ جسے اللہ کا کلام کہہ دیا اُسے قرآن مان لیا جس کو اپنا کلام کہا اس کو حدیث سمجھ لیا۔

ہمارے پیارے رسولؐ کی سیرت کے کتنے گوشے ہیں آپ پہلے ایک منبر پر تشریف لے جاتے آج ایک نیا منبر ہے جو ایک کھلے میدان میں رکھا گیا ہے پہلے منبر پر اکیلے تشریف لے جاتے تھے آج کسی کو منبر پر اپنے پاس بٹھالیا۔

اس وقت آپ نے فرمایا لوگو سنو اور غور سے سنو میں جس کا مولا ہوں علیؑ اُس اُس کے مولا ہیں۔

فریضہ رسالت دو چیزوں سے ادا ہوتا ہے اقوال سے یا افعال سے اقوال کے لئے اطاعت واجب، افعال کے لئے اتباع واجب ہے۔

یہ وقار خواتین کا تحفظ ہے جو ان کا عام لباس ہے اس لباس میں ان کا احرام صحیح ہے۔

اطاعت خداوندی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"۔

پیغمبرِ خدا سے ارشاد ہو رہا ہے کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

کل میں نے عرض کیا کہ پیغمبرِ خدا کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور اتباع کا بھی حکم ہے اور یہ عرض کیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ اب سوال یہ ہے کہ اطاعت اور اتباع کا حکم کیا بس پیغمبرِ خدا کے زمانہ کے مسلمانوں کیلئے تھا؟ انہی پر اطاعت کا فریضہ تھا اور انہی پر اتباع کا فریضہ عائد تھا؟ یہ تو اس وقت ہوتا جب پیغمبرِ خدا کی رسالت اسی دورِ حیات سے متعلق ہوتی۔ تو بے شک اطاعت کا حکم بھی اسی وقت کے لوگوں کیلئے ہوتا اور اتباع کا حکم بھی اُسی دور کے لوگوں کے لئے ہوتا۔ پھر ہم اور آپ بالکل آزاد تھے، نہ ہمارے لئے اطاعت، نہ اتباع۔ پھر جتنے احکامِ شریعت ہیں، ان سب سے آزادی، اس لئے کہ تمام احکام شرع یا اطاعت کے ماتحت ہیں یا اتباع کے ماتحت ہیں۔ جب اطاعت و اتباع اُسی دور کے لوگوں کیلئے ہے تو پھر ہمارے واسطے نہ کوئی واجب، نہ کوئی حرام۔ تمام احکام ہم سے برطرف۔

لیکن یہ تو ہر مسلمان بلا تفریق فرق، اس کے نزدیک یہ تصور غلط ہے۔ آپ کی رسالت اس دورِ حیات ہی سے متعلق نہ تھی اور جب اُسی دورِ حیات سے متعلق نہ تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمِ اطاعت بھی تا قیامت ہے اور حکمِ اتباع بھی تا قیامت ہے۔

کل تفصیل سے بیان ہوا اور اس کا حوالہ میں نے دیا کہ اطاعت ہوتی ہے اقوال کی اور اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ لہٰذا اقوالِ رسول کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہئے اور افعالِ رسول کو بھی تا قیامت محفوظ رہنا چاہئے کیونکہ اگر اقوال محفوظ نہ رہے تو اطاعت نہیں ہو سکتی اور اگر افعال محفوظ نہ رہے تو اتباع نہیں ہو سکتا۔

اب اقوال کیونکر محفوظ رہیں؟ وہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اقوال کی حفاظت کرتی ہیں کتابیں اور جب میں کہتا ہوں کہ کتابیں، تو سرفہرست ہے کتاب اللہ کوئی کہے کہ بات تو اقوالِ رسول کی تھی۔ یہ سرفہرست کتاب اللہ کیونکر ہو گئی؟

میں کہوں گا کہ میں نے بھولے سے نہیں کہا ہے، سمجھ بوجھ کر کہا ہے، میرا ابھی ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے مگر جسے ہم اور آپ اور ہر مسلمان کتاب اللہ کہتا ہے، سمجھتا ہے اور مانتا ہے، اس کو لوحِ محفوظ سے اُترتے ہم نے نہیں دیکھا۔ ہم نے تو قرآن کو بھی اسی زبان سے سنا جس زبان سے حدیثوں کو سنا۔ ارے! ہم نے تو کچھ بھی نہیں سنا۔ جس جس نے سنا، قرآن کو بھی اُسی زبان سے سنا جس زبان سے حدیثوں کو سنا۔ خدا کی قسم! یہ تو اُن کی زبان کا اعتبار ہے جسے اللہ کا کلام کہہ دیا، اُسے قرآن مان لیا، جس کو اپنا کلام کہا، اُس کو

حدیث سمجھ لیا۔

ورنہ ہم کیا جانتے کہ کون کلام اللہ اور کون اُن کا اپنا کلام۔ اب یہ سیرت سے متعلق بات ہے، میں کہتا ہوں، بخدا! یہ بھی امانتداری تھی ان کی کہ زبان پر ان کی کلام آرہا تھا اور کہہ رہے تھے کہ میرا نہیں ہے، اسی زبان پر قرآن آیا، اسی زبان پر حدیثیں آئیں۔ جسے انہوں نے کلام اللہ کے طور پر پیش کیا یہ کہہ کر کہ یہ کلام اللہ ہے، اسے ہم نے قرآن مانا، جسے اپنا کلام کہہ کر پیش کیا، اسے حدیث مانا۔

اسی لئے یہ ایک جملہ ہے، اسے چاہے محفوظ کر لیجئے اور بوقتِ فرصت اس پر غور کیجئے گا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جب تک ان کی زبان پر اعتبار نہ ہو، قرآن پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ تو قرآن مجید ہو یا کتبِ حدیث، یہ سب مجموعہ ہیں ان اقوال کا جو حضرتؐ کی زبان مبارک پر آئے۔ جو اقوال بحیثیت کلام اللہ آئے، انکا مجموعہ قرآن مجید، جو بحیثیت اپنے کلام کے آئے، اُن کا مجموعہ کتبِ احادیث ہیں۔

تو یہ کتب تو اقوال کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ افعالِ رسولؐ کیونکر محفوظ رہیں؟ روا روی میں کوئی شخص جواب دے گا کہ افعالِ رسول بھی راوی بیان کریں اور وہ کتابوں میں درج ہو جائیں، اس طرح افعالِ رسول بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ مگر ذرا سی باریک بات ہے، اربابِ فہم مجمع میں ہیں، انشاء اللہ کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ فعلِ رسولؐ راوی کی زبان پر آیا تو قول ہو گیا، فعل نہیں رہا۔ فعل تو اُسی وقت تک فعل ہے جب تک فاعل سے ہے اور جب اس کا بیان کسی سے ہوا تو وہ قول ہوا، فعل نہیں رہا۔ یوں تو کسی اور راوی کا کیا ذکر، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے اقوال بھی موجود ہیں، حضرت نوح، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، سب کے اقوال بھی ہیں، افعال بھی ہیں۔ قرآن مجید نے بیان کیے ہیں۔ تو کیا ان سب انبیاء کے افعال ہم تک پہنچے؟ افعال نہیں پہنچے، ان کا بیان ہے، جو بذریعہ قرآن ہم تک پہنچا ہے۔ اسی طرح اگر حضرتؐ کے افعال کو راویوں نے بیان کیا تو یہ اُن کا بیان ہے جو ہم تک پہنچا، افعالِ رسولؐ کہاں پہنچے ہیں؟

یاد رکھئے! کتاب فعل کو کبھی نہیں دکھاتی، فعل کو آئینہ دکھایا کرتا ہے۔ میرا ہاتھ جنبش کرے گا، آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں۔ میرا ہاتھ ساکن ہوگا، آئینے میں نظر آئے گا۔ بے شک آپ فعل کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان دنیا والے آئینوں میں ایک بڑی خرابی ہے اور وہ خرابی یہ ہے کہ اس میں عکس اُسی وقت تک نظر آتا ہے، جب تک اصل سامنے رہے۔ اِدھر اصل نظر سے اوجھل ہوا اور عکس بھی غائب ہوا۔ ہمیں ایسے آئینے نہیں چاہئیں، ہمیں ایسے آئینے چاہئیں کہ پیغمبر خدا تشریف لے جائیں اور افعالِ پیغمبر خدا ہمیں نظر آتے رہیں۔

ایک اور نقص اس آئینہ میں ہے کہ یہ آئینہ اسی عمل کو دکھائے گا جو وقوع میں آگیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے حرکت کی ہاتھ سے اور وہ آئینہ میں نظر آگئی۔ ہاتھ کو ساکن کیا، وہ سکون آئینہ میں نظر آگیا۔ جو کام وقوع میں آجائے، وہ نظر آئے گا مگر افعالِ رسولؐ بمقتضائے اسباب ہوتے تھے۔ جیسا سبب جس وقت ہوا، ویسا عمل وقوع میں آیا۔ جب تک وہ سبب پیدا نہ ہوگا، اُس وقت تک رسول کا وہ عمل نہ ہوگا ورنہ خلافِ عقل ہوگا، خلافِ حکمت ہوگا۔

مثال کے طور پر کوئی مسلمان پیغمبر خدا کے ساتھ ابتدائے بعثت سے ہجرت تک جو تیرہ برس کی مدت ہے، یعنی دورِ رسالت کا

آدھے سے زیادہ حصہ، کیونکہ 23 میں سے 13 آدھے سے زیادہ ہیں۔ 10 آدھے سے کم ہے۔ تو تیرہ برس پیغمبرِ خدا کے ساتھ رہتا اور کسی وقت جدا نہ ہوتا، ایسا خاص صحابی ہوتا کہ کسی وقت جدا نہ ہوتا اور وہ قسمیں کھا کر کہہ سکتا کہ میں ہر وقت رسولؐ کے ساتھ رہا، تیرہ برس مسلسل، کسی وقت میں نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا، آپ کی سیرتِ حیات میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔

اُس کا یہ بیان بالکل صحیح ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں سیرتِ رسولؐ کے دائرہ میں تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ اب اس میں سے کوئی نتیجہ نکالے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسولؐ مطلق عدم تشدد کے قائل ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے بعض رہنماؤں کا اصول ہے لیکن اب جب ہجرت کر کے آپؐ مدینہ تشریف لائے تو اب اس کے بعد ایک سال اسی میں شامل کیجئے، اب ہو گئے چودہ برس۔

2ھ میں دیکھئے، بدر دیکھئے، اُحد دیکھئے، خندق دیکھئے، خیبر دیکھئے تو تلوار نظر آئے گی ان کے ہاتھ میں۔ ظاہر نہ سہی مگر کسی ایسے ہاتھ میں جو انہی کا ہاتھ ہے۔ بہر حال اب تلوار ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سیرتِ رسولؐ کا ایک گوشہ تھا جو چودہ برس تک پردے میں رہا اور جب وہ اسباب ہوئے، تب وہ سیرت کا گوشہ سامنے آیا۔ یہ مسلمان جو سیرتِ نبویؐ مرتب کر رہا تھا، اس نے اب تک ایک سطر کا اضافہ کیا کہ ہاں ان کی سیرت میں تلوار اٹھانا بھی ہوتا ہے۔ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ جن سے جنگ ہو رہی ہے، کیا پیغمبرؐ ان سے کبھی صلح بھی فرمائیں گے؟

یاد رکھیے جتنا اُسے بظاہر جوشِ ایمانی زیادہ ہوگا اور جتنا ایمان کی شدت کا زعم زیادہ ہوگا، اُتنی شدت سے وہ انکار کرے گا۔ توبہ توبہ، بھلا رسولؐ اور مشرکین سے صلح فرمائیں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ارے! وقوع میں آجانے کے بعد جب، بہت سے مسلمانوں کے حلق سے یہ چیز نہ اُترتی ہو تو پہلے کیونکر تصور میں آسکتا تھا کہ یہ صلح بھی فرمائیں گے مشرکین کے ساتھ۔

لیکن اب آنے دیجئے 6ھ اور حدیبیہ کی منزل اور دیکھئے کہ پیغمبرِ خدا صلح کر کے واپس تشریف لے جاتے ہیں مکہ سے یا نہیں؟ اب اس نے کہا کہ ہاں صاحب! بے شک سیرتِ نبوی میں صلح کرنا بھی ہے۔ اب حساب لگایئے کہ تیرہ برس وہ قبل ہجرت اور 6ھ میں یہ واقعہ، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بعد بعثت 19 برس تک سیرت کا یہ گوشہ پردہ میں رہا اور سامنے نہیں آیا کیونکہ وہ اسباب نہیں ہوئے تھے جن اسباب سے سیرت کے عمل کا تعلق تھا۔

اب اسی مسلمان سے یہ پوچھئے یا اور مسلمانوں سے جو اس کے ساتھ ہوں کہ خیر صلح ہو گئی، اب اگر یہ لوگ عہد شکنی کریں اور شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کریں اور رسولؐ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہو تو ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اب پھر وہی بات کہ جتنا اپنے ایمان کا دعویٰ زیادہ ہوگا، اُتنی شدت کے ساتھ سزا تجویز کرے گا۔ اب جتنے الفاظ آپ کے نزدیک لغت میں زیادہ سخت ہوں۔

ارے! پرخچے اُڑا دیں گے، پرزے پرزے کر دیں گے ان کم بختوں کے۔ یہی سب وہ کہتا اور اُسے تقاضائے ایمان سمجھتا لیکن اب آنے دیجئے 8ھ میں فتح مکہ اور دیکھئے کہ رسولؐ کے سامنے وہی جماعت ہے اور پیغمبرِ خدا ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار فرماتے ہیں۔

تو سیرت کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں؟ اب اسی مسلمان سے پوچھئے کہ پیغمبرِ خدا اپنے مخالفین سے تلوار کے علاوہ کسی اور طریقے

سے بھی جنگ کرتے ہیں؟ تو وہ کہے گا کہ یہ تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ جنگ ہو اور تلوار کے بغیر ہو۔ لیکن آنے دیجئے 9ھ میں مباہلے کا میدان کہ جنگ بھی ہو رہی ہے اور تلوار کہیں نہیں ہے۔

اب معلوم ہوا کہ سیرت کا ایک باب آج سامنے آیا 9ھ اور 9ھ کے بعد 10ھ۔ اس مسلمان سے پوچھئے کہ اگر پیغمبرؐ خدا کو کوئی مجمع ایسا ملے کہ اتنا بڑا مجمع نہ اس سے پہلے رسولؐ کے سامنے ہوا ہو، نہ اس کے بعد کبھی ہوگا۔ اتنا بڑا مجمع ہو، ایک لاکھ کے قریب مسلمان رسولؐ کے سامنے ہوں تو اس موقع پر پیغمبرؐ خدا کیا فرمائیں گے؟

یہ کہے گا کہ وہی فرمائیں گے جو عمر بھر فرماتے رہے، نماز پڑھو، روزے رکھو، حج کرو، زکوٰۃ دو۔ جو ہمیشہ کہتے رہے، وہی وہاں بھی کہیں گے۔ مگر اب آنے دیجئے 10ھ میں، وہ بھی آخری مہینہ، ذی الحجہ کا مہینہ اور اس کی اٹھارہ تاریخ۔ اس میں رسولؐ کی سیرت کے کتنے گوشے ہیں؟ ہمیشہ دیکھتے تھے وہ منبر، آج نیا منبر دیکھا۔ ہمیشہ دیکھتے تھے مسجد میں آج کھلا میدان دیکھا۔ اس کے بعد رسول منبر پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد ایک نئی بات دیکھی کہ ہمیشہ منبر پر اکیلے جاتے تھے، آج کسی کو اپنے پاس بٹھالیا اور اب نفسیاتی طریقہ پر دیکھئے کہ یہ نئی بات جو ہو رہی ہے، تو اب مجمع جو ہے، وہ خطبے کے الفاظ کم سن رہا ہے اور یہ صورت زیادہ دیکھ رہا ہے۔

یہاں چند جملے ہیں، یہ یہاں کیسے؟ ذہنوں میں تصورات تہہ و بالا ہیں کہ کوئی خاص بات ہے۔ یعنی پورا جملہ ہوا میں جا رہا ہے۔ آخری جملہ کا انتظار ابھی سے ہے۔

تو جناب! یہ سب باتیں آج نئی نظر آرہی ہیں۔ اس کے بعد پورا خطبہ ہو جاتا ہے جو لوگوں نے غور سے نہیں سنا ہے۔ اسی لئے تمام مسلمانوں کی تاریخیں دیکھ لیجئے تو وہ پورا خطبہ کہیں ملتا بھی نہیں۔ سنا کس نے تھا غور سے؟

اب وہ وقت آیا جس کیلئے پاس بٹھایا تھا۔ تب پیغمبرؐ نے وہ تاریخی الفاظ فرمائے۔

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔"

''جس کا میں مولا ہوں، اُس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔''

ماشاءاللہ! صاحبانِ فہم بھی ہیں، تو جنابِ والا!

"فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"۔

عربی میں تعیین کیلئے اُن میں سے ہر لفظ کافی ہے۔ اشارہ کر دیا تو یقین فردِ واحد کا ہو گیا اور نام لے دیا تو تعیین شخصِ واحد کی ہو گئی۔ رسولؐ نے دو طریقے صرف کر دیئے۔ فہذا بھی، علی بھی۔ معنی یہ ہیں کہ اگر حاضر ہوں تو یہ دیکھو اور غائب ہوں تو نام سنو۔

پیغمبرؐ خدا کی سیرت کا نیا باب سامنے آیا یا نہیں؟ اس کے بعد مدینہ منورہ واپس ہوئے تو علیل ہو گئے۔ دو مہینے کے بعد وفات ہو گئی۔ تو اب پیغمبرؐ خدا کی سیرت کی وفات طیبہ کا جو سال آیا، وہ سیرت کا ایک نیا باب کھولتا ہوا آیا۔ اب جو کتابِ سیرت اپنے عمل سے مرتب کر رہا تھا، اس میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ شخصیت وفات کے ذریعہ سے ہمارے سامنے سے ہٹ گئی، چلی گئی اور

رسالت ہے تا قیامت۔

تاریخ کے طالب علم بھی یہاں ہوں گے۔ تاریخ کا مسلمہ اصول ہے کہ تاریخ رواں دواں رہتی ہے، وہ ایک نقطہ پر نہیں پڑتی۔ گونا گوں حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

تو حضور والا! کیا تاریخ کا یہ اصول یہاں ٹوٹ گیا؟ یعنی اب 11 ھ سے لے کر قیامت تک تاریخ کی سوئی ایک نقطہ پر منجمد ہوگئی کہ ابھی تک تو ہر سال نئے نئے حالات پیدا ہو رہے تھے اور اب کوئی نئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوگی؟

یہ خلافِ عقل بات ہے۔ یقیناً زندگی کے کتنے دوراہے ایسے ہوں گے کہ پیغمبر خدا کے اُس دورِ حیات میں پیش نہیں آئے تو اس دورِ حیات میں پیغمبرؐ کا عمل کیا ہوتا؟ وہ پردہ میں رہ گیا۔ لہٰذا اب ہمیں وہ آئینے نہیں چاہئیں جو وقوع میں آئے ہوئے افعالِ رسولؐ کو دکھائیں۔ ہمیں وہ آئینے چاہئیں جو ملکاتِ نفسِ پیغمبرِ خدا کو جذب کرلیں۔

ماشاء اللہ لاہور کی سرزمین ہے اور یہاں علمی ذوق بلند پایہ ہے۔ مگر پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کیلئے یہ الفاظ قابلِ فہم نہیں ہیں۔ ایک بات توجہ سے سن لیجئے۔ جو ہر وقت ہوتا ہے اور وہ طاقت جو فعل کو کرواتی ہے، اُسے ملکہ کہتے ہیں۔ یعنی پردۂ شب میں جس نے نفس سے اس فعل کو کروایا، یہ فعلِ سخاوت ہے اور خود سخاوت ملکہ ہے جس نے نفس سے اس فعل کو کروایا۔ بروقت وہ کام ہے جو منتظرِ سبب رہتا ہے اور ملکہ نفس کی وہ طاقت ہے جو قائم ہوتی ہے، راسخ ہوتی ہے اور بروقت اس عمل کو کرواتی ہے۔

تو اب یہ جملہ غالباً سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ ہمیں وہ آئینے نہیں چاہئیں جو افعالِ رسولؐ کو دکھائیں بلکہ ہمیں وہ آئینے چاہئیں جو ملکاتِ نفسِ رسولؐ کو جذب کرلیں۔ اُردو زبان میں اس کو میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں وہ آئینے نہیں چاہئیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ نے کیا کیا؟ ہمیں وہ آئینے چاہئیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ ہوتے تو کیا کرتے! وہ آئینے ہمارے لئے مفید نہیں ہیں جو یہ دکھائیں کہ رسولؐ نے کیا کیا کیا۔ ہمیں وہ آئینے درکار ہیں جو یہ دکھائیں کہ پیغمبرؐ ہوتے تو کیا کرتے! اس کیلئے خالق نے اپنے رسولؐ کو آئینے عطا فرمائے۔ اگر یہ آئینے دور دور کے ہوتے تو کسی وقت کا عکس لیتے اور کسی وقت کا عکس نہ لیتے۔ لہٰذا حکمتِ الٰہی اس کی متقاضی ہوئی کہ یہ آئینے رسولؐ کی گود میں رکھ دیئے جائیں تاکہ ملکاتِ نفسِ پیغمبرِ خدا کو جذب کرلیں۔

کیا کہنا ان آئینوں کا! جو ہر رکھے ہوئے اللہ کے، جلا دی ہوئی تربیتِ رسولؐ کی۔ گویا پیغمبرِ خدا کا کاشانہ آئینہ خانہ بنا ہوا تھا۔ بیچ میں پیغمبرؐ، چار طرف چار آئینے۔

حدیثیں جتنی پڑھوں گا، وہ متفق علیہ ہوں گی۔ ایک آئینہ قدِ آدم، تقریباً برابر کا۔ پیغمبرؐ نے اپنا عکس دیکھا، بالکل مکمل نظر آیا۔

"عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ"۔

"یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔"

"عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ"۔

خالق نے فرمایا: "اَنْفُسَنَا"

یہ تو ہمارا نفس ہے اور ابھی میں فعل اور ملکہ کا فرق بتا چکا۔ یاد رکھیے کہ افعال کا مرکز اعضاء ہوتے ہیں اور ملکہ کا مرکز نفس ہوتا ہے۔ جہاں ایک الفاظ کی منزل ہے، فعل جدا، فاعل جدا۔ اٹھانا ہاتھ کا کام، پیروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کہنا زبان کا کام، ہاتھوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چلنا پھرنا پیروں کا کام ہے، کانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سننا کانوں کا کام، زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ افعال کی منزل میں فعل الگ، فاعل الگ مگر نفس کی منزل میں سب افعال ایک۔

دیکھا آنکھوں نے، آپ نے کہا: میں نے دیکھا۔ اُٹھایا ہاتھوں نے، آپ نے کہا: میں نے اُٹھایا۔ راستہ طے کیا پیروں نے، آپ نے کہا: میں نے راستہ طے کیا۔ سنا کانوں نے، آپ نے کہا: میں نے سنا۔ سب افعال ایک کے ہو گئے۔ جب تک لسان اللہ کہا، زبان کی گفتگو اپنی ہوئی۔ جب تک اذن اللہ کہا، سماعت اپنی ہوئی۔ جب تک جنب اللہ کہا، پناہ دینا اپنا ہوا۔ لیکن جب نفس کہہ دیا تو افعال ان کے نہیں رہے، خدا کے ہو گئے۔

دوسرا آئینہ نسبتاً چھوٹا مگر اپنے شعبہ میں مکمل۔ پیغمبرؐ نے سند عطا فرمائی، مسلم الثبوت، صحیح بخاری ہے، بنظر اختصار، فاطمہؑ کے فضائل میں صرف تین عدد احادیث، اس میں سے ایک یہ ہے کہ:

"فَاطِمَةٌ بَضْعَةٌ مِنِّيْ"

"فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے۔"

میرا ایک جزو ہے۔ حضور والا! جزو کون ہوتا ہے؟ جزو وہ ہوتا ہے جسے نکال لیجیے تو چیز نامکمل ہو جائے۔ ملا دیجیے تو اس کی تکمیل ہو جائے۔ یہ سندِ خاص فاطمہؑ کیلئے ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کیلئے بھی نہیں ہے۔ حسنؑ و حسینؑ کیلئے بھی نہیں ہے۔ صرف حضرتِ فاطمہ زہراؑ کیلئے یہ الفاظ ہیں۔ "بضعۃ منی" میرا ایک جزو۔

میں کہتا ہوں، میرے گزشتہ بیان کی روشنی میں اس جزو کی حقیقت پر غور کیجیے کہ کیا رسالتِ پیغمبر صرف مردوں کیلئے ہے؟ وہ تو تمام نوعِ بشر کیلئے ہے۔ اس میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں۔ اور میں نے کہا کہ فریضہ رسالت دو چیزوں سے ادا ہوتا ہے، اقوال سے اور افعال سے۔ اقوال کیلئے اطاعت واجب اور افعال کیلئے اتباع واجب۔ اقوالِ رسول تو سب کیلئے ہو سکتے ہیں، مرد اور عورت دونوں کیلئے۔ افعال رسولؐ دونوں کیلئے نہیں ہو سکتے، چاہے موجودہ ترقی پسند زمانہ کتنا ہی کہے کہ ہر میدان میں مرد و عورت دوش بدوش مگر میں کیا کروں، اسلام میں تو نماز تک میں دوش بدوش نہیں، حالانکہ نماز کوئی معاشرتی چیز نہیں، وہ تو ما بین خدا و خود ایک عبادت ہے۔

مگر اس میں بھی مرد کی نماز اور طرح اور عورت کی نماز اور طرح۔ ہمارے ہاں دینیات کی کتاب مولوی فرمان علی صاحب مرحوم کی ایک وقت میں رائج تھی، بچوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ مردوں کیلئے کچھ نمازیں جہری، کچھ اخفات کے ساتھ۔ لیکن عورت کیلئے جو نمازیں جہری بھی ہیں، وہ بھی اخفات کے ساتھ یعنی آہستہ۔

اب ماشاء اللہ آپ صاحبانِ فہم و نظر ہیں، ذرا غور کیجیے کہ نماز میں بڑی ضرورت ہے رجوعِ قلب کی اور رجوعِ قلب کا انتہائی

درجہ ہے محویت۔ اس کا معیار اور کمال آپ نے سنا ہوگا کہ تیر کھینچ لیا جاتا ہے اور پتہ نہیں ہوتا۔ یہ محویت کا عالم، یہ استغراق کا عالم۔ اور یہ روح ہے نماز کی محراب میں اہلِ فہم سے، اہلِ عقل سے، صاحبانِ علم، نظر سے، سب سے پوچھتا ہوں کہ اگر آدمی میں ایسی محویت ہوئی کہ مرد اپنا مرد ہونا بھول گیا، عورت اپنا عورت ہونا بھول گئی تو احکام شریعت پر عمل ہی کیونکر ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ خالق کی نظر میں جتنی اہمیت نماز میں استغراق کو ہے، اُتنی ہی خصوصیت اس کی نگاہ میں ہے اپنی خصوصیتِ صنفی کے باقی رکھنے کی کہ مرد یاد رکھے کہ میں مرد ہوں اور عورت یاد رکھے کہ میں عورت ہوں۔

تو پھر کیا مشکل ہے کہ نماز میں یاد رکھے اور زندگی کے سب کاموں میں بھول جائے۔ اس کے بعد لباس نماز میں زمین آسمان کا فرق۔ مرد کیلئے اتنا لباس کہ جس کے بغیر نماز باطل ہوگی۔ بہت مختصر، بس اتنا کہ برہنہ نہ ہو اور عورت کیلئے سوا چہرے کے، گٹوں سے لے کر انگلیوں تک اور ہاتھوں کے باقی تمام اجزاء پوشیدہ ہوں۔ صحتِ نماز کیلئے ضروری۔

کتنی ہی ترقی یافتہ خاتون کیوں نہ ہو، لیکن اگر نماز پڑھتی ہو تو اس وقت یہی لباس اختیار کرنا ہوگا اور اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں اور صاحبانِ علم کیلئے بعد میں توضیح ہوگی۔ یہ نامحرم کی وجہ سے نہیں ہے۔ اپنے مکان میں، پردہ شب میں، گھر کے دروازے بند کر کے، سامنے پردے ڈال کر بھی نماز ہو تو اس سے زیادہ کوئی جزوِ جسم کا بے پردہ ہو تو نماز باطل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے خالق کا منشاء سمجھئے کہ جو خالق اپنی بارگاہ میں عورت کو بے پردہ دیکھنا نہ چاہتا ہو، وہ بھلا اسے کیسے پسند کرے گا کہ بوالہوس مردوں کے سامنے وہ بے پردہ پھرے۔ ترقی پسند لوگوں نے عورتوں کو یہ درس دیا ہے کہ دیکھو! اسلام نے عورتوں کو مصیبت میں ڈالا ہے، مردوں کو آزادی دی ہوئی ہے۔ حج پر جا کر دیکھئے کہ مردوں کیلئے مصیبت ہے یا عورتوں کیلئے۔ مرد ذرا سا بھی سایہ سر پر نہیں رکھ سکتے اور وہ اطمینان سے اپنے سر پر چادریں تانے ہوئے۔ مرد ایسا لباس خاص اختیار کریں کہ جس سے مردہ اور زندہ میں بہت کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ضرورت ہے کہ ایسا لباس ہو اور عورتوں کیلئے جو عام لباس ان کا ہے۔

یہ وقار خواتین کا تحفظ ہے جو ان کا عام لباس ہے، اُسی لباس میں ان کا احرام صحیح ہے۔ ان کیلئے یہ شرط نہیں ہے اور عام احکام میں ان کیلئے کتنی آزادیاں ہیں، ہمارے لئے کتنی مصیبت ہے۔ ہم ایک چھلا سونے کا نہیں پہن سکتے، وہ بقدر برداشت پہن سکتی ہیں۔ ہم خاص لباس بھی ریشم کا نہیں پہن سکتے، وہ سر سے پاؤں تک ریشمی لباس پہنیں، کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ کیا ہے؟ یہ حقیقت میں خالق کی طرف سے صرف احساس باقی رکھنا اور پھر ان کے وقار کا تحفظ ہے، ان کی عزت و ناموس کا تحفظ ہے۔ یہ تمام مقاصد ہیں، ورنہ اسے ہم کو مصیبت میں ڈالنا نہیں ہے اور نہ انہیں آرام پہنچانا ہے۔ یہ تو جب ہوتا ہے کہ جب ان کا کوئی رشتہ اُس سے زیادہ ہوتا، ہم سے کم ہوتا۔

خالق کے نہ تو بیٹا ہے، نہ بیٹی ہے۔ خواتین کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کروں گا کہ جس رسولؐ کی زبان سے یہ احکام پہنچے ہیں، اُسے اللہ نے بیٹا نہیں عطا کیا، بیٹی ہی عطا فرمائی ہے۔ ہم تو ان کے ہر حکم کو حکمِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ لیکن جو شخص رسالت کا منکر ہو، وہ بھی ان کے قانون میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ عورتوں کے لئے ناانصافی ہوئی ہوگی اور مردوں کو کچھ ان کے حق سے زیادہ دے دیا ہوگا۔

تو اب وہی بات آ گئی کہ جب احکام شریعت کے الگ الگ، حج کا طریقہ الگ الگ، نماز کا طریقہ الگ الگ اور جانے کتنی باتوں میں الگ الگ تو رسول کا عمل مردوں کیلئے تو نمونہ ہو سکتا ہے، عورتوں کیلئے نمونہ نہیں بن سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورتوں پر حجتِ خدا تمام ہی نہیں ہوتی اور مقصدِ رسالت ہے حجت تمام کرنا۔

قرآن کہہ رہا ہے:

"رُسُلاً مُّبَشِّرِينَ مُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ"۔

پیغمبر اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ خلقِ خدا کے پاس پیغمبروں کے آجانے کے بعد کوئی عذر نہ ہو، اپنی کوتاہی روزِ قیامت پیش کرنے کیلئے۔ تو اگر فقط رسولؐ کی ذات ہو تو عورتیں بارگاہِ خداوندی میں روزِ قیامت کہہ سکتی ہیں کہ بارالہا! ہم اگر ایمان و عمل میں ناقص رہے تو ہمارا قصور نہیں ہے، ہماری ہدایت ہی پوری نہیں ہوئی، اس لئے کہ مردوں کیلئے تو اقوال بھی رہے اور افعال بھی رہے اور ہمارے لئے تو بس اقوال ہی اقوال رہے۔ عمل کا کوئی بے داغ نمونہ ہمارے سامنے آیا ہی نہیں۔ تو جب حجت تمام نہیں ہوئی تو مقصدِ رسالت کی تکمیل نہیں ہوئی۔

اس لئے ضرورت تھی کہ پیغمبرؐ کے خزانہ رسالت میں کوئی گوہرِ بے بہا ایسا ہو کہ اس کا کردار عورتوں کیلئے ویسا ہی معصوم نمونہ عمل ہو جیسا خود رسول کا کردار مردوں کیلئے نمونہ عمل ہے۔ اس کیلئے خالق نے اپنے رسول کو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا جیسی بیٹی کرامت فرمائی۔ اس معنی سے پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ فاطمہؑ میرا ایک جزو ہے۔ یعنی اگر فاطمہؑ نہ ہوں تو میرے فرائض کی تکمیل نہیں ہوتی۔ فاطمہؑ میرے ساتھ مل جائیں تو میرے فرائضِ رسالت مکمل ہوتے ہیں، بغیر انؑ کے میرے مقصدِ رسالت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

اب معلوم ہوا کہ یہ فاطمہ تھیں جو حضرت پیغمبرِ خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ بیٹی ہونے کا تقاضا ہی نہیں ہے کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو، یہ عمل خود بتاتا ہے کہ فاطمہ صرف بیٹی ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔ تو یہ فاطمہؑ کی تعظیم نہیں ہے۔ اس منصب کی تعظیم ہے جو جنابِ فاطمہؑ کے سپرد ہے۔

اس سے ایک مشکل میری حل ہو جاتی ہے، اپنی کوتاہی معلومات کے اقرار کے ساتھ یہی عرض کروں گا کہ میری کوتاہ نظری ہے کہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی وسیع النظر ہو، اس کے سامنے کوئی مآخذ ہو جس کے فضائل بے شمار، جس کے فضائل کی کوئی انتہا نہیں۔ مگر مجھے حضرت علی علیہ السلام کیلئے نہیں ملتا کہ پیغمبرِ خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے ہوں۔ یہ مشکل نہیں ہے یا نہیں؟ اب جو حل اس کا میری سمجھ میں آتا ہے، میری سمجھ جو آیا، وہ یہ کہ فضائل کا بے شمار ہونا اور بات ہے مگر علیؑ کا جو منصب ہے، وہ بعدِ رسولؐ ہوگا، فاطمہؑ کا جو منصب ہے، وہ حیاتِ رسولؐ میں ہے۔

اب جناب دو آئینے ہو گئے۔ ایک آئینہ قدِ آدم، دوسرا آئینہ میں نے کہا کہ اپنے شعبہ میں مکمل۔ اب دو چھوٹے چھوٹے نگینے، مگر جناب آئینے میں ایک خصوصیت ہے، وہ تو اُس آئینے میں بھی ہے جسے میں بیکار کہہ چکا ہوں۔ جسے میں نے کہا کہ مجھے کوئی فائدہ نہیں مگر وہ خصوصیت اس آئینہ میں بھی ہے کہ آئینہ خواہ چھوٹا ہو مگر تصویر پوری دکھاتا ہے بلکہ آئینہ کے اگر ٹکڑے بھی ہو جائیں تو ہر ٹکڑا

آئینہ ہوگا۔

ان چھوٹے چھوٹے آئینوں کیلئے میں کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے ان میں جھک کر اپنا نقشہ دیکھا، تصویر مکمل نظر آئی۔ سند عطا فرما دی ایک۔ دونوں کو مشترک:

"اَبْنَایَ هٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"۔

''میرے یہ دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں۔''

یہ امام کہنے پر قرآن مجید کے ماننے والوں کو تو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ قرآن نے بتایا کہ گہوارہ کا بچہ کہہ رہا ہے:

"اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتَانِیَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا"۔

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

صیغہ ماضی ہے۔ تو اب جمہور ملت کی زبان میں بات کرتا ہوں کہ اگر اُمم سابقہ میں گہوارہ کا بچہ نبی ہو سکتا ہے تو افضل الامم میں چار یا پانچ برس کے بچے امام کیوں نہیں ہو سکتے؟

اس لئے امام کہنے میں اور سمجھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی مشکل در پیش نہیں آتی۔ لیکن ہاں! یہ آخر کا جملہ کہ یہ دونوں امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں۔ یہ سمجھ میں اُس وقت نہ آسکتا کیونکہ یہ تو انسان کے حالات ہیں، کبھی جاگتا ہے، کبھی سوتا ہے، کبھی اُٹھتا ہے، کبھی بیٹھتا ہے۔ اس کا امامت سے کیا تعلق ہے؟ مگر جب مستقبل نے حالات کے رُخ سے پردہ اُٹھایا اور اب وہ اس وقت کا مستقبل میرے لئے ماضی بن گیا تو سمجھ میں آیا کہ پیغمبر خدا اللہ کے دیئے ہوئے علم میں سے ماضی کے پردہ پر مستقبل کا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ پیغمبرؐ کا مقصد یہ تھا کہ میرے ان دونوں بچوں کا طرز عمل بظاہر متضاد ہوگا۔ ایک صلح کر کے بیٹھ جائے گا، ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا۔ کچھ لوگ اس کی صلح پر معترض ہوں گے، کچھ لوگ اس کی جنگ پر معترض ہوں گے۔ اس لئے پیغمبرؐ نے پہلے سے کہہ دیا کہ یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں۔

یعنی حسینؑ تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو اعتراض نہ کرنا اور حسنؑ صلح کر کے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا۔ وہ اُٹھنا بھی حکم خدا سے ہے اور یہ بیٹھنا بھی حکم خدا سے ہے۔ وہ بھی امامت کا ایک انداز ہے اور یہ بھی امامت کا ایک شیوہ ہے۔

پھر ایک سند خصوصی چھوٹے کو عطا فرمائی:

"حُسَیْنٌ مِّنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ"۔

''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔''

یہ خاص حضرت امام حسین علیہ السلام کیلئے ہے۔ صحاح ستہ میں ہے، ترمذی بھی صحاح میں ہے، اس کی حدیث ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اگر دوسرا جملہ نہ ہوتا تو پہلا بالکل صاف تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے، وہ نانا ہیں، یہ نواسے ہیں۔ نانا کا وجود

اسباب میں سے ہوتا ہے، نواسے کے وجود کیلئے۔

یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اب دوسرا جملہ کہ میں حسینؑ سے ہوں۔ پیغمبر محمد اکے کلام کی ایک خصوصیت ہے کہ

"اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمْ"۔

یعنی مختصر مختصر جملے ہوتے ہیں اور اس میں کتنے ہی پہلو ہوتے ہیں۔ اکثر جملے تو ایسے ہیں کہ جتنے اوصاف کمال ہے پیغمبرؐ کے، ایک جملے سے وہ سب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ کلام رسولؐ کی خصوصیت ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

ان دونوں جملوں میں آخر ربط کیا ہے؟ پہلے میں کچھ اور ہو اور دوسرے میں کچھ اور ہو تو وہ ایسے ہے جیسے شعر دولخت ہوتا ہے۔ ویسے بے جوڑ فقرے ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہو۔ اس وقت جو پہلو عرض کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شے کا وجود اور ایک ہوتی ہے شے کی بقا۔ پہلا جملہ جو ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے، وہ وجود کے لحاظ سے ہے، دوسرا جملہ جو ہے وہ بقا کے لحاظ سے ہے۔ یعنی حسینؑ کا وجود میرے وجود سے ہے اور میری بقا حسینؑ کی وجہ سے ہے۔

اب میں اُردو میں ایک جملے میں ترجمہ کر سکتا ہوں کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں یعنی اگر میں نہ ہوتا تو حسینؑ نہ ہوتا اور اگر حسینؑ نہ ہوتا تو میں نہ رہتا۔

6

معیار صداقت

وہ سانچہ جس کو صادق کہتے ہیں اس کے لحاظ سے جب رسولؐ خدا تعارف کرائیں گے تو فرمائیں گے کہ ہمارا پہلا بھی محمدؐ، اوسط بھی محمدؐ، آخری بھی محمدؐ بلکہ سب کے سب محمدؐ ہیں۔

ہم ایک صادق کو تو پہچان نہ سکے تو صادقین کی ایک جماعت کو کیوں کر پہچان سکتے ہیں اگر صداقت کی عملی تصویر دیکھنی ہے تو 9ھ کو میدان مباہلہ میں آ کر دیکھیں کہ جن کے میدان میں صرف آنے سے تمام عیسائی مباہلہ سے دستبردار ہو گئے۔

نماز وہ چیز ہے کہ امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ یزیدیوں سے کہہ دو کہ وہ اتنی دیر تک کے لئے جنگ روک لیں کہ ہم نماز ادا کر لیں۔

نماز تو وہ ہے کہ جس کے لئے امام حسینؑ نے تھوڑی دیر کے لئے جہاد کو ملتوی کر دیا تھا اگر آپ مومنین کا جلوس اتنی دیر کے لئے رک جائے تو یہ حقیقی یاد حسینؑ ہو گی۔

معیارِ صداقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ۔"

یہ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ میرے پیش رو پروفیسر مشکور حسین یاد صاحب نے جو کلام سنایا، اس میں پہلے شعر میں سچ ہی سچ تھا اور میری آیت جسے میں سرنامہ کلام قرار دے رہا ہوں، وہ بھی سچ ہی سے متعلق ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ "اے صاحبانِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔"

بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ہماری زبان پر آ کر اپنی بلندی کھو دیتے ہیں، اس لئے کہ ہم الفاظ اپنی زبان سے بولتے ہیں مگر ذہن میں ان کے معنی پر نظر نہیں رکھتے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ہماری زبانوں پر بہت چڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی مثال میں پیش کر سکتا ہوں، دو تین الفاظ۔ آپ سے کسی نے مجلس کا وعدہ لیا یا کسی دعوت کا وعدہ لیا۔ آپ نے کہہ دیا کہ حتی الامکان ضرور آؤں گا۔ کیا معنی؟ یعنی جہاں تک ممکن ہے، ضرور آؤں گا۔ مگر وقت گزر گیا اور آپ تشریف نہیں لے گئے۔ انہوں نے بعد میں، جب ملاقات ہوئی، پوچھا کہ آپ اس دن آئے نہیں؟ آپ نے کہا: بھئی کیا بتاؤں، ایک دوست آ گئے تھے، ان سے باتوں میں ایسا مصروف ہوا کہ موقع آنے کا نہیں بنا۔

اب غور کیجئے کہ کیا ان دوست کے آنے کے بعد ممکن نہ رہا تھا؟ کہا تو یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو گا۔ تو ان کے دوست کے آنے سے ناممکن تو نہیں ہو گیا تھا۔ ایسے ہی ہونے کو حتی الامکان کہا تھا اور نہیں آئے۔ انہوں نے کہا: بھئی کیا بات تھی کہ نہیں آئے؟ آپ نے کہا کہ بھئی سر میں درد ایسا ہونے لگا کہ پھر طبیعت نہیں چاہی آنے کو۔

پھر وہی بات! کیا سر کے درد سے ممکن نہیں رہا تھا؟ اب جیسا معیارِ زندگی ہو، فرض کیجئے کہ بڑے آدمی ہیں ماشاء اللہ، آپ کے ہاں اتنے معیار کے بڑے آدمی تو بہت ہیں کہ وہ جب نہیں آئے، آپ نے کہا کیوں نہیں آئے؟ انہوں نے کہا: کیا بتاؤں، ڈرائیور چلا گیا تھا۔ تو ڈرائیور نہیں رہا تو ممکن نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حتی الامکان کہا تھا لیکن حتی الامکان کے معنی ذہن میں نہیں تھے۔ الفاظ زبان پر تھے۔

دوسری مثال، کوئی شعر پسند آیا، کہا بے مثل شعر ہے۔ کوئی تقریر پسند آئی کہا کہ بے مثل تقریر ہے۔ جتنی دفعہ زندگی میں آپ نے بے مثل کہا ہے، اسے ذرا شمار کیجئے، اسے ایک نوٹ بک پر لکھتے جائیے کہ کن کن چیزوں کو آپ نے بے مثل کہا ہے۔ وہ کتنی ہوں گی؟ مگر یاد رکھئے کہ جو بے مثل ہو، وہ ایک کے سوا نہیں ہو سکتا۔

تو لفظِ بے مثل زبان پر ہے لیکن اس کے معنی ذہن میں ہی نہیں۔ کسی دفعہ سردی ذرا زیادہ ہوئی، آپ نے کہا کہ لاہور میں بے

حد سردی ہے۔ اب اس کے بعد چلے گئے کو مری پر، آپ نے کہا کہ وہاں بے حد سردی تھی۔ آپ نے کہا: کیا کشمیر میں اتنی سردی تھی جتنی روس میں ہوتی ہے؟ وہ جس نے فاتحوں کو شکست دی تھی؟ آپ نے کہا: اس کا کیا ذکر، وہاں تو بے حد سردی ہوتی ہے۔ آپ نے پہلے تو اپنے ہاں کی سردی کو بے حد کہا تھا، وہاں اس سے زیادہ تھی، آپ نے اسے بے حد کہا۔

یاد رکھئے کہ جب تک حد نہ ہو، اُس سے زیادہ ہو نہیں سکتی۔ تو بے حد کہتے ہیں لیکن معنی بے حد کے ذہن میں کہاں ہیں؟ بس ویسے ہی یہ کہ کسی آدمی نے دو تین دفعہ کوئی اطلاع دی، وہ صحیح نکلی، آپ نے کہا: سچا آدمی ہے لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ وہ وعدہ کرتا ہے، وہ بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں؟

تو یہ اطلاع کے دو تین دفعہ ٹھیک نکلنے سے آپ کو صادق الخبر کہنے کا حق تھا، صادق القول کہنے کا حق نہیں تھا کیونکہ قول میں وعدہ بھی داخل ہے۔ فرض کیجئے کہ وعدہ کو بھی دیکھ لیا لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے کردار میں ظاہر اور باطن یکساں ہیں یا نہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو عبادت میں نیت نہ کرتا ہو "قربۃ الی اللہ" یعنی اللہ سے قریب ہونے کیلئے۔ بغیر اس کے نماز ہوگی؟ نہیں۔ روزہ ہوگا؟ نہیں۔ تو ہر ایک یہ نیت کرتا ہے، وضو کرتا ہے "قربۃً الی اللہ"۔ نماز پڑھتا ہوں قربۃً الی اللہ۔

لیکن کیا واقعی ہر ایک کی نماز قربۃً الی اللہ ہے؟ میں اپنے جیسے آدمیوں کیلئے تو ایک معیار بتا سکتا ہوں کہ یہ دیکھئے کہ جیسی نماز مجمع میں ہوتی ہے، ویسی ہی تنہائی میں ہوتی ہے یا کچھ فرق پڑ جاتا ہے؟ اگر میں نے تنہائی میں نماز پڑھی تو بس بقدر ضرورت قرأت کی اور اگر مجمع میں پڑھی تو زیادہ اہتمام اور احتیاط کے ساتھ پڑھی۔ اگر تنہائی ہوئی تو بس جو شرع کے احکام ہیں، اُن کے مطابق نماز پڑھ لی۔ لیکن مجمع میں ہوئی تو خضوع خشوع کچھ زیادہ نظر آنے لگا۔

بس پتہ چل گیا کہ پوری نماز تو قربۃً الی اللہ نہیں ہے، کچھ حق کے لئے ہے، کچھ خلق کے لئے ہے۔ تو جب ظاہر و باطن ایک جیسے نہیں تو فعل میں سچائی کہاں رہی؟ اب مشکل یہ ہے کہ باطن جو ہے، وہ ہمارے حدودِ مشاہدہ سے باہر ہے، ظاہر کو باطن سے مطابق کیونکر کریں؟ ظاہر آنکھوں کے سامنے، باطن نظر سے اوجھل، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم عمل کی سچائی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ارے کچھ قرائن سے محسوس کیا کہ آدمی بے لوث ظاہر اور باطن میں یکساں رہتا ہے۔ لیکن اس کے تصورات، خیالات، اعتقادات ہم کیا جانیں کہ ذہن میں اس کے کیا کیا غلط باتیں ہیں؟

تو آدمی میں تو قول بھی ہے، عمل بھی ہے، اعتقاد بھی ہے۔ جب اس سب کو ہم جانچ نہیں سکتے تو ہم کسی آدمی کو صادق کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ تو اس وقت ہے جب ہم کسی کو صادق کہیں اور اگر عالم الغیب کسی کو صادق کہے تو ماننا پڑے گا کہ اپنے علم الغیب کے آئینہ میں اس نے اس کے قول و عمل و اعتقاد یعنی گفتار و کردار و پندار، سب کو جانچ کر، سب کو سامنے رکھ کر یہ سند دی ہے کہ یہ صادق ہے۔ یعنی نہ اُس کے اقوال میں کوئی بات مرضیِ خدا کے خلاف ہے، نہ اُس کے عمل میں کوئی کام ہے جو واقعیت سے جدا ہو، نہ اُس کے تصورات و خیالات میں کوئی چیز ہے جو نقطۂ حقیقت سے الگ ہو۔

جب ایسا ہو تو وہ اُسے کہے گا "صادق" اب اگر ایک کو وہ کہے صادق تو وہ ایک ایسا ہوگا اور اگر کسی ایک جماعت کو وہ کہے

صادقین تو وہ پوری جماعت، چاہے وہ پانچ ہوں، چاہے بارہ ہوں، چودہ ہوں۔ مجھے اس منزل میں اس سے زیادہ عدد یاد نہیں ہے۔

تو وہ جتنے بھی ہوں، وہ سب ایسے ہوں گے کہ نہ اُن کے قول میں کوئی کلام غلط، نہ اُن کے کردار کی دنیا میں کوئی عمل غلط، نہ اُن کے تصور و خیال میں کوئی اُن کا خیال غلط۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ، اب میں نے انتہائی عدد تو چودہ کہا تھا، اسی کو سمجھئے کہ وہ انسان چودہ ہوں گے مگر ہر قول اور عمل اور کردار اُن کا اللہ کی طرف سے سچائی کی سند پائے ہوئے ہوگا۔

اب ایک پہلو پر صاحبانِ فہم غور کریں کہ اگر دو آدمیوں میں اختلاف ہو، ایک کچھ کہتا ہو، ایک کچھ۔ ایک کی کچھ رائے ہو، ایک کی کچھ۔ تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں صحیح ہوں۔ اور یہ چودہ وہ ہیں جنہیں اللہ صادقین کہہ رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ ان میں اختلاف قول ہوتا ہے، نہ اختلاف عمل ہوتا ہے۔ شکلِ عمل کا اختلاف ہوتا ہے۔ حقیقتِ عمل کا اختلاف نہیں ہوتا اور نہ ان کی رائے اور خیال میں اختلاف ہوتا ہے۔

اب اسے یوں کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخصیات چودہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آنکھیں چودہ کی ہیں مگر نظر ایک ہے۔ ہاتھ چودہ ہیں مگر کام ایک ہے۔ قدم چودہ ہیں مگر اقدام ایک ہے۔ دل چودہ کا ہے مگر ارادہ ایک ہے۔

اسی لئے جب پیغمبرِ خدا اپنی ذات کو شامل کر کے ان چودہ کا تعارف کروائیں گے تو حالانکہ نام سب کے الگ الگ ہیں، اگر الگ الگ نہ ہوتے تو چودہ کیسے ہوتے؟ تو نام الگ الگ ہیں اور سب کی کنیت بھی الگ الگ ہے، جس صفت کے اظہار کا جس کو موقع ملنے والا تھا، اس کے لحاظ سے لقب بھی الگ الگ ہیں، کس کو علم کے اندرونی رازوں کے اظہار کا زیادہ موقع ملا تو اس کا لقب باقر ہوگیا، کسی کی سچائی کا غیروں کو بھی تجربہ ہوا تو اُس کا لقب صادق ہوگیا۔ کسی کو غصہ کو ضبط ہی عمر بھر کرنا پڑا تو اُس کا لقب کاظم ہوگیا۔ اس طرح سے نام بھی الگ الگ، سب کی کنیت بھی اکثر الگ الگ۔ لقب بھی الگ الگ مگر کردار کا وہ سانچہ جس کو صادق کہتے ہیں، اس کے لحاظ سے جب رسولِ خدا تعارف کروائیں گے تو فرمائیں گے:

"اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَ کُلُّنَا مُحَمَّدٌ۔"

مگر میں نے عرض کیا کہ ایک صادق کو ہم نہیں پہچان سکتے تو ایک جماعت صادقین کی، انہیں ہم کیونکر پہچان سکتے ہیں؟ یہ تو کہیں اور سے مجھے معلوم ہوگیا ہے جو میں نے ناموں کی طرف بھی اشارے کر دیئے، میں نے نسبتوں کی طرف بھی اشارے کر دیئے، القاب کی طرف بھی اشارے کر دیئے۔ مگر ہماری نگاہ میں دم کہاں تھا کہ ہم چودہ کو یا اُس پوری جماعت کو، جتنے بھی ہوں، پہچان سکیں۔ تو جس نے کہا کہ صادقین کے ساتھ رہو، سچوں کے ساتھ رہو، اُسی کو بتانا بھی چاہئے تھا کہ صادقین کون ہیں؟ کیونکہ کہہ رہا ہے ہم سے کہ صادقین کے ساتھ رہو۔

اپنی جگہ تعریف کرنا، وہ اور بات تھی مگر ہمیں حکم دے رہا ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو۔ صادقین کو ہم پہچان نہیں سکتے۔ وہ بتاتا نہیں تو اس کے بعد تو آیت تلاوت کیلئے رہ جائے گی، عمل تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وہاں پیغامِ عمل دیا جارہا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

تو اب خداوند کریم کو لازم ہے، بنظر حکمت، کہ جب حکم دیا ہے تو بتائے بھی کہ صادقین کون ہیں؟ رسولؐ پر بربنائے فرضِ رسالت ضروری ہے کہ جب یہ آیت پہنچا رہے ہیں تو یہ بھی بتا دیں کہ صادقین کون ہیں؟

میں کہتا ہوں کہ پیغمبرِ خدا کے سامنے جو مسلمان تھے، وہ (معاذ اللہ) کیا ذہن نہیں رکھتے تھے؟ یعنی جس بات کو ہم سمجھ سکیں، اتنا وہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ تو صاحب! وہ پورا مجمع صحابہ اور اس وقت کے تمام مسلمان اور اُس کی مدینہ کی مردم شماری کے معنی میں صحابہ، اُس دور میں چاہے میں سب مسلمان کہوں، چاہے سب صحابہ کہوں، ایک ہی معنی ہیں۔

تو جناب! وہ تمام اتنے مسلمان، وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کہا ہم سے جا رہا ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو تو بتانا بھی چاہئے کہ وہ سچے کون ہیں؟ اگر نہیں پوچھا اور کوئی کہے کہ پوچھا تو بارِ ثبوت اُسکے ذمہ ہے۔ وہ مجھے بتائے کہ کب پوچھا؟ اگر نہیں پوچھا تو سمجھ لیجئے کہ بتایا تھا۔ وہ دنیا نے بعد میں بھلا دیا کہ کون تھے سچے؟ فطری طور پر بھلانا تو ہو بھی نہیں سکتا۔ مصلحتاً بھلایا ہوگا۔ ورنہ لازماً بتانا چاہئے کہ کون ہیں؟ اب اگر کچھ مجھے معلوم ہو اور میں بتاؤں کہ کب بتایا تو یا تو اُسے دنیا مان لے یا وہ کوئی اور موقعہ پیش کرے کہ اس وقت بتایا۔

تو اب حضور والا! میرے نزدیک بتانے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ بہت ہی صاف صاف جس کو کند ذہن لوگ بھی سمجھ لیں، جس کو دھندلی نگاہ والے بھی سمجھ لیں، جس کو جو نہ سمجھنا چاہیں، وہ بھی سمجھ لیں۔ وہ سیدھا طریقہ تو یہ ہے کہ کہیں لا کر ان افراد کو دکھا دیا جائے کہ یہ ہیں صادقین۔ ارے کم سے کم اس وقت جتنے ہیں موجود، ان کو دکھا دیا جائے۔ پھر مرجانے والا بعد والے کا تعارف کرواتا رہے گا۔ سلسلہ قائم رہے گا۔

تو یہ ایک طریقہ ہے صادقین کے سمجھانے کا۔ دوسرا طریقہ ذہنی کاوش کا ہے۔ اگر معاملہ اہم ہے تو اگر کاوش کی ضرورت ہو تو ہر ایک کو کاوش سے گھبرانا بھی نہیں چاہئے۔ وہ اس طرح کہ ان کے سب اقوال کو ملا کر نتیجہ نکالا جائے کہ صادقین کون ہو سکتے ہیں! پہلا طریقہ کہ صورتیں ملا کر دکھا دی جائیں کہ یہ ہیں صادقین۔

تو وہ منزل آئی جہاں صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ صادقین کون ہیں۔ وہ ہے 9ھ میں مباہلہ کا میدان۔ میدان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ایک مخالف گروہ سے جنگ تھی۔ وہ جنگ تلواروں سے نہ تھی، روحانی جنگ تھی اور وہ کس کے مقابلہ میں؟ جو اپنی روحانیت کے بڑے دعویدار ہیں اور جو تلوار پر معترض ہیں۔

سیاست ستم کی ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے ہی پیغمبرِ اسلام کی تصویر کھینچی ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن۔ یعنی تلوار کے ذریعہ سے قرآن پھیلانا۔ اس جزو کو شاید عرض کر چکا ہوں کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہی اس تصویر کو کھینچ رہے ہیں جن سے پیغمبرِ خدا کی کوئی جنگ نہیں۔

اب میں کہتا ہوں کہ اگر ان کی تلوار ہی سے پیغام پہنچانا تھا تو تمہارے مقابلہ میں تلوار کیوں نہ کھینچی؟ یعنی نصاریٰ کی جماعت عیسائیوں کی جماعت۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے مقابلہ میں تلوار کیوں نہ کھینچی؟ میں اس میں تمہاری معقولیت کی داد دوں گا، تنگ نظر نہیں ہوں۔ مخالف کی بھی کوئی بات اچھی ہو تو اُسے ضرور کہنے کیلئے تیار ہوں کہ یہ تمہاری معقولیت تھی کہ تم فوج نہیں لائے۔ تم سمجھے کہ

دین کا معاملہ ہے، تو جو میدان دین کے شہسوار ہوں، انہیں لایا جائے، تارک الدنیا راہب، مذہب کے علماء۔ وہ جناب ستر آدمی یعنی تمام ملک سے جو چوٹی کے لوگ تھے، سب کو اکٹھا کرلیا اور انہیں لے آئے۔

وہ واقعہ تو ابھی عرض کروں گا لیکن یہاں جو بات شروع کی تھی، اُسے ختم کروں کہ تم فوج نہیں لائے تو تم سے جنگ نہیں ہوئی تو اب تو میں نے تمہاری معقولیت کی داد دی۔ تم بھی میرے ساتھ انصاف کرو کہ اب تمہیں قائل ہونا چاہئے کہ تلوار ان کے مقابلہ میں اٹھتی ہے جو تلوار لے کر آئیں اور جو تلوار لے کر نہ آئیں، اُن کے مقابلہ میں تلوار نہیں اٹھتی۔

تو بہر حال یہ یمن میں مرکز تھا نصاریٰ کا۔ ابرہہ بھی تو وہیں سے آیا تھا کعبہ کو ڈھانے۔ وہ بھی عیسائی جماعت ہی تھی۔ تو ان تک یہ خبریں پہنچیں کہ پیغام آیا ہے اور معلوم ہوا کہ لوگ برابر پروانوں کی طرح گر رہے ہیں اور قبول کر رہے ہیں اس پیغام کو۔ تو انہوں نے مذہب کی تحقیق کی خاطر اُن لوگوں کو بھیجا کہ تم جا کر معلوم کرو کہ ان کا پیغام کیا ہے اور ماشاء اللہ قانون دان حضرات بھی کثرت کے ساتھ مجمع میں ہوں گے کہ یہ سب لوگ صرف تحقیق کیلئے نہیں آئے تھے بلکہ نمائندہ جماعت تھی صاحبِ اختیار۔

اگر صرف تحقیق کیلئے آتے تو جا کر صرف رپورٹ دے دینا چاہئے تھی، ان کو کوئی معاہدہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر صورتِ واقعہ صاف ظاہر ہے کہ وہ معاہدہ کر کے واپس گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بالکل با اختیار نمائندے تھے کہ جیسا موقع ہو، جیسا تم سمجھنا، ویسا عمل کرنے کا تم کو اختیار ہے۔ اس وقت کی تمام عیسائی دنیا گویا اس کی پابند ہوگی۔

تو جناب! وہ آئے پیغمبرِ خدا مجمع صحابہ میں تشریف فرما، یہ لوگ سنتے جا رہے تھے کہ اقتدار ہے ملک عرب میں۔ تصور یہ تھا کہ ایک حکمران کے پاس جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان بے چاروں کا کیا قصور کہ ایک تاجدارِ حجاز کے پاس جا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا فخریہ محاورہ بھی ہے "تاجدارِ مدینہ"۔ یعنی تاج سے محبت اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ رسولؐ کی تعریف بھی تاج کے بغیر نہیں ہوتی۔ تو وہاں آئے تو بادشاہوں کے دربار کے لائق جو لباس ہو، ویسے کے لباس بنوائے اور سونے کے پٹکے، کمروں پر کسنے کیلئے یہ سب لباس پہن کر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

پیغمبر کا رخ اس طرف تھا، وہ جدھر تھے، وہ ابھی سامنے تھے کہ آپؐ نے رُخ موڑ لیا۔ پہلے سمجھے ہوں گے کہ اتفاق کی بات ہے۔ تو اِدھر آئے تو حضرتؐ نے رُخ اُدھر کرلیا۔ اب جب غلط فہمی کا کوئی امکان نہ رہا تو واپس گئے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہ ہم نے تو ان کے اخلاق کی بڑی تعریف سنی تھی، ہمیں تو یہ اُمید کبھی نہ تھی کہ اس طرح کا سلوک ہمارے ساتھ ہوگا۔

غور کیجئے ذرا کہ وہ خبریں اتنے تواتر کے ساتھ ہیں کہ خود اپنا مشاہدہ اس کے مقابلہ میں نہیں ٹک رہا تھا، ورنہ بس رائے قائم کر لیتے کہ خبریں غلط تھیں جا کر کہہ دیتے کہ اور کیا بحث کریں، یہی بات غلط نکلی، ان کے تو اخلاق ایسے ہیں مگر وہ خبریں اتنی طاقتور تھیں کہ مشاہدہ جم نہیں رہا تھا ان کے سامنے۔

لہٰذا ذہن میں تھا کہ کوئی معمہ ہے، کوئی سبب ہے اور اگر سبب ہے تو کس سے پوچھیں؟ اتفاق سے ایک بزرگوار سامنے نظر آئے، ان سے پوچھا کہ جناب سنا تھا کہ آپ کے رسولؐ کے اخلاق اتنے بلند ہیں؟ کہا: اس میں کیا شک ہے؟ بے شک ان کے اخلاق تو ویسے ہی

ہیں۔ انہوں نے کہا: جناب! ہم پر تو یہ گزری۔ انہوں نے کہا: بھئی اخلاق تو ویسے ہی ہیں، تم پر کیا گزری۔ اسے میں کیا بتاؤں؟ یعنی دائرہ حیرت میں اضافہ ہوگیا۔

اب وہ بھی اس مجمع کے ساتھ ساتھ۔ اب دوسرے بزرگوار مل گئے۔ انہوں نے کہا کہ ان سے پوچھو۔ یہ بہت ذہن ہیں، نکتہ رس ہیں۔ اسی ردیف اور قافیہ میں ان سے گفتگو ہوئی۔ اخلاق کیسے بے نظیر، کیا کہنا، وہ ہیں ہی ایسے صاحب اخلاق۔ انہوں نے کہا کہ جناب ہم نے تو یہ دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ اخلاق تو ان کے ویسے ہی ہیں، اب یہ تمہارا مقدر، تمہارا نصیب۔ اب میں اسے کیا کہہ سکتا ہوں؟ اب میں کیا بتاؤں، کیا ہوا تمہارے ساتھ؟

اب اتنے آدمی ہیں، اتنے آدمیوں کے اجماع کو غلط بھی تو نہیں کہا جاسکتا کہ تم سب جھوٹے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ غرض جہاں بات تھی، وہی رہی۔ اب جستجو کرنے والی جماعت کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ آخر میں وہ مل گیا جس کیلئے جیسے قدرت کی طرف سے فیصلہ یہ تھا کہ دنیا ٹھوکریں کھا کر آیا کرے۔ اب وہی جو ذرا مرکز تحقیق بنائے گئے تھے، انہوں نے کہا کہ ان سے پوچھو، یہ بچپن سے انؑ کے ساتھ رہے ہیں۔

اب دیکھئے کہ بچپن کا وزن یہاں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ تو بتاویں گے، ان سے پوچھو۔ انہوں نے شروع میں وہی بات کی۔ انہوں نے کہا: ایسے اخلاق؟ انہوں نے کہا: بے شک ایسے ہی اخلاق ہیں اب دوسری طرف اس سے متضاد جو مشاہدہ تھا ان کا کہ ہمارے ساتھ تو یہ ہوا۔ تو آپ نے سر سے پاؤں تک دیکھا لباس وغیرہ کو۔ آپؑ نے فرمایا: یہی کپڑے پہن کر گئے تھے؟ انہوں نے بڑے زور سے کہا: جی ہاں، یہ تو۔ مطلب یہ تھا کہ ہم نے آداب دربار کے خلاف نہیں کیا، یہی کپڑے پہن کر تو گئے تھے۔

آپؑ نے فرمایا کہ تم تو تارک الدنیا لوگ ہو۔ اب میں باصلاحیت لوگوں کو فلسفہ عملِ رسولؐ کی طرف متوجہ کروں کہ یاد رکھئے کہ یہ اگر قیصر و کسریٰ کے نمائندے ہوتے تو اور ان کا لباس ہمیشہ کا یہ لباس ہوتا تو اسی لباس میں مظاہرۂ اخلاق ہوتا۔ لیکن ان کا تو اصل میں یہ لباس نہیں تھا۔ یہ تو اس دربار کے تقاضوں کو غلط طور پر محسوس کر کے انہوں نے یہاں کیلئے یہ لباس تیار کروایا تھا۔ تو اگر اس لباس میں مظاہرۂ اخلاق ہوتا تو ان کی غلط فہمی دور نہ ہوتی۔ یہ پتہ نہ چلتا کہ یہاں لباس کی عزت ہوتی ہے یا انسان کی عزت ہے؟

یاد رکھیئے کہ اخلاق بے اخلاقی بن جاتے ہیں جب فرائض سے ٹکرا جائیں۔ تو جب انہوں نے یہ کہا کہ "جی، یہی لباس"۔ تو آپؑ نے فرمایا کہ تم تو تارک الدنیا ہو، تم تو زاہد ہو، تم تو گرجوں میں رہتے ہو، تم تو جنگلوں میں جا کر زندگی گزارتے ہو۔ یہ تم نے کیا سوانگ بنایا ہے؟ ارے! جو اپنا اصلی لباس ہے، وہ پہنو، پھر جاؤ اور دیکھو تو کیا ہوتا ہے؟

اوّل تو میں کہتا ہوں کہ بات اتنی دل کو لگتی ہوئی تھی کہ انکے ذہن نے قبول کرلیا ہوگا کہ یہی بات ہوسکتی ہے، پھر اگر نہ سمجھے ہوں تو گویا دل میں یہ آسکتا ہے کہ انہوں نے ایک نسخہ تو بتایا، اب اسے آزما کر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ گئے اور وہ سب اُتار کر پھینکا اور اب وہی ٹاٹ کے کپڑے پہن کر دوسرے دن پھر خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو اب جو آئے تو ابھی ذرا دور ہی تھے کہ رسولؐ خدا تعظیم کو کھڑے ہوگئے اور اپنے پاس بٹھایا۔ اب یہی سمجھ لیجئے کہ پاس بٹھانے سے مظاہرۂ

اخلاق ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ایمان متعدی ہو کر چلا جائے۔

آپ صاحبان کیوں آئے ہیں، کیا مقصد ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم کو وہاں کی جماعتِ نصاریٰ نے بھیجا ہے تا کہ آپؐ کے دین کے متعلق ہم معلومات کریں۔

پورا سورۂ آلِ عمران اس سلسلہ میں اُترا ہے اور اب حقائق دین جو بیان کئے جا رہے ہیں، ان کے دل سے ذہن میں داخل ہو رہے ہیں اور حلق سے اُتر رہے ہیں۔ بالکل قرین قیاس، ان کا ذہن قبول کر رہا ہے۔ آخر بات یہ آگئی، یہ سب تو ٹھیک ہے، حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں آپ کیا تصورر کھتے ہیں؟

شروع میں عیسائیت میں تمام حلال وحرام، پوری شریعت، تمام احکام تھے۔ لیکن ایک صاحب پال تھے، انہوں نے عیسائیت کا دارومدار عظمتِ عیسیٰؑ کے انتہائی تصور پر مبنی کر دیا۔ اب حلال رہا، نہ حرام۔ بس حضرت عیسیٰؑ کو جتنا بڑھاؤ گے، اتنے سچے عیسائی ہوگے۔ یہ پال نے بنیاد بنائی صرف عظمت عیسیٰؑ کے تصور کی۔ اب جو جتنے اونچے درجہ تک انہیں پہنچائے، اُتنا اونچا وہ عیسائی ہے۔ لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ جناب عیسیٰؑ؟

اُدھر سے تعریفیں ہوئی، آیات اُتریں کہ وہ بلند مرتبہ رسول تھے، ان کے معجزات تھے، اُنؑ کے معجزات کا تذکرہ کیا گیا۔ وہ سب انہوں نے سنا مگر اس سب کے بعد بھی انہوں نے کہا: ہاں! نبی تھے، رسول تھے، یہ بتایئے صاف صاف کہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا نہیں؟

اب ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی تھا کہ خدا کا بیٹا کہنے سے تو مجبور ہیں، اسے تو صحیح نہیں مانتے۔ بس انہوں نے کہا: یہ بتایئے کہ اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو کس کے بیٹے ہیں؟

اب بائبل بھی دیکھیے، ہوسکتا ہے مجمع میں کچھ افراد ہوں، ہمارے ہاں مناظرہ کا جو انداز ہے، صرف لاجواب کرنے کا، تو اگر لاجواب کرنے کا انداز ہوتا رسول کا تو کچھ اور جواب دیتے۔ عیسائیوں نے یوسف نجار کے سلسلہ سے بائبل میں نسب حضرت آدمؑ تک پہنچایا ہے۔ مگر علمبردارانِ حق اور صحیح رہنمایانِ حق کا یہ عمل نہیں ہے کہ غلط بات کو غلط بات سے توڑو۔ جو نقطۂ حقیقت ہے، اسے پیش کرو۔

میں کہتا ہوں کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ بائبل میں باپ کا نام موجود ہے تو دریافت کیا کر رہے ہو؟ کل وہاں انہوں نے سوال کیا اور اُن کا یہ سوال یوں بھی غلط تھا کہ ان کے ہاں بائبل میں نام موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ عقلی طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجیے، معاذ اللہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں کوئی گستاخی کرنا کفر ہے۔ ظاہر ہے کہ میں حضرت عیسیٰؑ کو اولوالعزم پیغمبر مانتا ہوں تو اُن کی شان میں گستاخی کا تصور کہاں ہوسکتا ہے؟ مگر ان کے اس سوال کی نامعقولیت میں آپ کو بتاتا ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کے بیٹے نہیں ہیں تو بتایئے کس کے بیٹے ہیں؟ یعنی جس کے باپ کا پتہ نہ ہو، اُسے خدا کا بیٹا سمجھ لیں۔ تو غرض یہ کہ نامعقول سوال تھا۔ مگر یہاں تو ان تک حقائق کو پہنچانا تھا۔ لہٰذا قرآن کی آیت اُتری:

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنۡ

فَيَكُونُ۔"

"عیسیٰ کی مثال مثلِ آدمؑ ہے، ان کو مٹی سے پیدا کیا اور حکمِ الٰہی ہوا، ہوجا، وہ ہوگئے۔"

یعنی یہ تو خدا کی قدرت ہے۔ اُس نے آدمؑ کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا۔ یہاں ایک فریق تو ہے، ماں موجود ہے، باپ نہیں ہے۔ اس کو تم خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ اب یہ الفاظ پھر میرے ہیں، تو پھر آدمؑ کے ہاں تو نہ ماں ہے، نہ باپ۔ توان کو دُہرا بیٹا کہو۔ مگر انہیں بے چارے کو کوئی خدا کا بیٹا نہیں کہتا۔ تو یہ اللہ کی قدرت ہے، جسے جس طرح چاہتا ہے، خلق فرماتا ہے۔

تو اس سے وہ خدا کے بیٹے نہیں ہوجائیں گے۔ اب دنیائے استدلال میں ان کے پاس بحث کی گنجائش نہیں تھی مگر مانتے اب بھی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ماننے والے کو خدا اور رسول بھی نہیں منوا سکتے۔ خدا کو جبر نہیں کرنا کہ زبردستی دل کو بدل دے۔ اب وہ نہیں مانتا تو کیا کیا جائے۔ وہ کچھ نہ کچھ کہے جاتے ہیں، قرآن نے کیا کہا؟ تیور بدلے بالکل۔ انداز آیت دیکھئے۔ خالق کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے۔

"فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ۔"

اگر اتنے دلائل کے بعد بھی نہیں مانتے تو کہئے، اب تیور یہ بتاتے ہیں کہ آجاؤ میدان میں، اب ہم نہیں باقی یا تم نہیں۔ ہے تو یہی کہ یا ہم نہیں یا تم نہیں۔ مگر تلوار سے نہیں، اب کہئے کہ آؤ۔

"نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝"

ہم اپنے بیٹوں کو لائیں، تم اپنے بیٹوں کو لاؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو لائیں، تم اپنی بیٹیوں کو لاؤ، ہم اپنے نفس کو لائیں، تم اپنے نفوس کو لاؤ اور پھر اللہ سے لو لگائیں۔

اب اسے میں بعد میں عرض کروں گا۔ میں کہوں گا کہ اتنے علمی دلائل کے بعد پھر بھی نہ مانے تو یہ علمی دلائل کیا ہیں؟ قرآن کی آیات ہیں۔ اس کے بعد بھی نہ مانے تو پھر ان کو لایئے۔ میں کہتا ہوں کہ اب اگر مگر کا سوال نہیں، قرآن اور تاریخ کی حقیقت ہے کہ جب قرآن کافی نہیں ہوتا تو یہ لائے جاتے ہیں۔

اب آیئے: ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو تم بلاؤ اپنے بیٹوں کو۔ بلائیں، یعنی ہم اور تم بلائیں۔ یعنی ہم ان کو بلائیں، تم اُن کو بلاؤ۔ یہ اختصار کے ساتھ یوں کہا ہے: اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو یعنی "ہم" میں دونوں فریق داخل ہیں۔

تو ہم انہیں بلائیں اور تم انہیں بلاؤ۔ ہم اپنے نفوس کو، تم اپنے نفوس کو۔

"ثُمَّ نَبْتَهِلْ"

ابتہال کے معنی ہیں اللہ سے رجوع کرنا۔ جب مقابلہ کا مفہوم ہو تو اسی سے لفظ مباہلہ ہوا ہے۔ ابتہال کے معنی ہیں رجوع الی

اللہ اور مباہلے کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں رجوع الی اللہ میں مقابلہ۔

مناظرہ، جیسے نظر میں مقابلہ، مباحثہ، بحث میں مقابلہ، ویسے ہی مشاعرہ، شعر میں مقابلہ۔ مباہلہ، رجوع الی اللہ میں مقابلہ، اللہ کی طرف لو لگانے۔ اب ایک پہلو کی طرف متوجہ کروں گا کہ یہاں ہر جگہ دو طرفہ بات تھی۔ ہم اپنے بیٹوں کو، تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو، تم اپنی عورتوں کو۔ ہم اپنے نفوس کو، تم اپنے نفوس کو۔ دونوں طرف۔

اب تاریخ بتاتی ہے، صورتِ واقعہ بتاتی ہے کہ وہ لوگ تو مذہب کی تحقیق کو آئے تھے، وہ عورتوں اور بچوں کو کہاں لائے تھے؟ میں تو کہتا ہوں کہ توازنِ کلام کیلئے، جیسے اپنے بیٹے، تمہارے بیٹے، مگر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کاغذ پر حروف کے آنے سے اصل معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہا جائے تو پس منظر سامنے ہوتا ہے، لب ولہجہ سامنے آتا ہے۔ تو حاضر الوقت اصحاب کا فہم جتنا معتبر ہے، اُتنا بعد والوں کا۔ یا جو اُس وقت موجود نہ ہوں، اُن کی سمجھ اتنی معتبر نہیں ہے۔

اب دیکھئے کہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ توازنِ کلام ہے، پورا یہاں سے وہاں تک، لیکن اگر واقعی مقصود یہ ہوتا کہ وہ بھی لائیں اپنی عورتوں کو، وہ بھی لائیں اپنے بچوں کو، تو دوسرے دن جب وہ گئے، وہی جو آئے ہوئے تھے، وہی دوسرے دن مباہلے کیلئے آ گئے۔ تو ادھر سے آئینی اعتراض ہونا چاہئے تھا کہ ہم نے تو کہا تھا کہ اپنے بچوں کو، عورتوں کو اور نفوس کو لے کر آنا۔ تم تو وہی آ گئے جو کل تھے؟ اچھا پھر وہ سمجھدار تھے۔ اگر وہ یہ سمجھتے تو ان کو مہلت مانگنا چاہئے تھی کہ اچھا پھر دو ہفتوں کی ہم کو مہلت دیجئے کہ ہم جا کر اپنی عورتوں، بچوں اور نفوس کو بھی لائیں۔

مگر دونوں باتوں سے تاریخ کا صفحہ خالی ہے۔ نہ اُنہوں نے مہلت مانگی، نہ انہوں نے دوسرے دن اعتراض کیا۔ تو یہ کیا معمہ ہے؟ میری سمجھ میں یہ آ رہا ہے کہ یہ توازنِ کلام حقیقت میں نظریہ روحانیتِ مسیحی پر ایک ضرب تھی۔ وہ تھے عیسائی علماء اور راہب، تارک الدنیا، ان کا تصور یہ ہے کہ بیوی بچے روحانیت کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے شادی بھی نہیں کی ہوگی۔ یہی ان کے ہاں معیار روحانیت ہے۔ ان کی اولاد نہیں ہے تو وہ عورتوں اور بچوں کو کہاں سے لاتے؟

تو جو میں سمجھا ہوں، وہ بھی سمجھ گئے کہ یہ تو ہمارے نظریہ روحانیت پر ایک ضرب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسے تم سفر روحانیت میں معتبر سمجھتے ہو، وہ ہمارے لئے سفر روحانیت کا جزو ہے کہ ہمارا روحانیت کا سفر بغیر اس کے مکمل نہیں ہوتا اور وہی فقہ اسلامی کہہ رہی ہے کہ غیر شادی شدہ کی نماز میں اتنی فضیلت نہیں ہے کہ جتنی شادی شدہ کی نماز میں فضیلت ہے۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تو ہم پر ایک چوٹ ہوگئی اور بس جیسے وہ تلملا کر رہ گئے۔ مگر ان کے ساتھ وہ تھے ہی کب جو انہیں جا کر لاتے؟

لہٰذا نہ انہوں نے مہلت مانگی، نہ لے کر آئے اور چلے آئے دوسرے دن بھی۔ ادھر سے بھی کوئی مقصود تو نہیں تھا کہ وہ لائیں مگر انہوں نے کہا تھا تو ان کو تو نبھانا ہے۔ اب انہیں تو لے جانا ہے۔ یہ سفر روحانیت کا جزو ہے، بشرطیکہ اس لائق ہو۔ بدر میں یہ لوگ نہیں لائے گئے تھے، اُحد میں نہیں لائے گئے تھے، خندق وخیبر میں نہیں لائے گئے تھے۔ وہ سپاہی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بس ایک سپاہی بالکل نہیں بدلا، وہ ان جہادوں میں بھی ہوتا تھا، اس جہاد میں بھی ہے۔ اُن جہادوں میں ہوتا تھا ''شاو لافتی'' ہو کر، اس جہاد میں ہے

''امام الاولیاء'' ہو کر۔

ان لڑائیوں میں یہ افراد نہیں لائے گئے تھے یعنی عورتیں اور بچے۔ اس جہاد میں یہ لازمی جزو تھے۔ یہاں ''انفسنا'' کا لفظ بعد میں ہے، پہلے ''ابناء ناو نساء نا'' کا لفظ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ اس سفر میں بنیادی اجزاء ہیں۔ بغیر ان کے یہ سفر مکمل نہیں ہو سکتا۔ تو وہ تو نصاریٰ تھے، وہ کیا سمجھتے؟ وہ اپنے اوپر ضرب سمجھ گئے اور ان کے عمل سے سمجھے کہ ہاں، ان کے ہاں یہ روحانیت کے سفر کے لازمی اجزاء ہیں۔ مگر بہت سے بڑے بڑے، بالکل بڑے بڑے جلیل المرتبہ لوگ ہیں جو نہیں سمجھے اس کو، جب حسینؑ سے کہہ رہے ہیں کہ آپؑ جا رہے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جا رہے ہیں؟

اور آج تک دنیا ان کے مشوروں کو بہت وقعت سے پیش کرتی ہیں کہ دیکھئے فلاں بزرگوار نے یہ کہا تھا اور انہوں نے عمل نہ کیا، معاذ اللہ، بڑے ضدی تھے۔ میں کہتا ہوں کہ فرائض میں جو لازمی تقاضے ہوں، ان میں دوسروں کے مشوروں پر عمل نہ کرنا، بڑے بڑے صاحبانِ رائے کی رائے پر عمل نہ کرنا، یہ اگر ضد ہی ہوتا تو خود رسولؐ تھے کہ حدیبیہ میں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اصحاب الرائے کی بے چینی دیکھ رہے تھے اور پھر بھی جو طے کر لیا، وہی کر کے رہے۔

دنیا کہہ رہی ہے کہ آپؑ جاتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جاتے ہیں؟ اب امام حسینؑ اس وقت فلسفہ کہاں تک سمجھاتے، اس لئے کبھی کہہ دیا کہ میں نے رسولؐ کو خواب میں دیکھا ہے ان کے ساتھ، اور ظاہر ہے کہ جو صحیح بات ہوگی، وہ رسولؐ نے بھی فرمائی ہوگی۔ کبھی کہا کہ ان کو کس کے سپرد کر کے جاؤں؟

لیکن اب میں کہتا ہوں، اس مباہلہ کی روشنی میں، ان کے سامنے مقصدِ حسین نہیں تھا، اگر ان کے سامنے مقصدِ حسینؑ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ انہیں کیوں لئے جاتے ہیں۔ رسولؐ بدر و اُحد و خندق و خیبر میں نہیں لے گئے اور مباہلہ میں لے گئے۔ حکمِ خدا سے لے گئے۔ اس سے ہماری سمجھ میں آ گیا کہ حق کی راہ میں بھی جو مادی فتح حاصل کرنا ہو، یعنی فوج کو شکست دینا، اس میں عورتوں اور بچوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں کسی ذہنیت کو قتل کرنا ہو، وہاں عورتوں اور بچوں کی ضرورت ہوتی ہے اور واقعات آپ کے سامنے ہیں۔

یہ سفر عورتوں اور بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تو بدر و اُحد و خندق و خیبر وغیرہ میں نہیں لائے۔ کربلا کے جہاد میں اگر مادی فتح حاصل کرنا ہوتی تو عباسؑ کو ضرورت تھی۔ علی اکبرؑ کی ضرورت تھی، علی اصغرؑ کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن مولاؑ کے عمل سے سمجھئے کہ کربلا کے میدان میں ویسی جنگ نہیں لڑنا تھی۔ مختصر کر کے عرض کروں کہ حسینؑ کو یزید کو شکست نہیں دینا تھی۔ تختِ سلطنتِ یزید کو نہیں اُلٹنا تھا، ذہنیت یزیدی کو اُلٹنا تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی جنگ کی تیاری کی۔ کون کہتا ہے کہ جنگ کی تیاری نہیں کی۔ مگر جیسی جنگ لڑنا تھی، اس لئے ویسی ہی تیاری کی۔ ذہنیت اسلامی اس وقت کیسی ہو گئی تھی، اُسے تاریخ میں دیکھئے کہ کیا عالم ہو گیا تھا؟ یہ کیوں تھا؟ اسلام کے خلاف کوئی کام غیر مسلم محاذ سے ہو تو ہم جلدی چونکیں گے اور جب کسی اسلامی طاقت کی طرف سے ہو تو پھر مسلمان محسوس نہیں کریں گے۔ چونکہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا اور بنامِ اسلام ایک فرمانروا کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔

تو مسلمان بیدار نہیں ہو رہے تھے۔ حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ کربلا میں یہ دکھا دوں کہ اس اسلام کی نقاب کے پیچھے کیسے آدمی چھپے

ہوئے ہیں۔ یہ اسلام کا برقع جو ہے، اُسے ان کے کردار سے نوچ کر دنیا کو دکھادوں۔ اس لئے وہ کسوٹیاں لیں جو اسلام اور انسانیت کے پرکھنے کی ہیں۔ حسینؑ کے بہتر (72) عوام نہیں تھے، ان میں حفاظِ قرآن تھے، ان میں تہجد گزار تھے۔ حبیب ابن مظاہر تھے جن کیلئے روایت ہے کہ ایک سجدہ میں قرآن ختم کرتے تھے۔ ان میں جناب بریر ہمدانی تھے جو سید القراء کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ قرأ کے معنی اُس وقت تھے حفاظِ قرآن۔ سید القرأ یعنی حافظانِ قرآن کے سردار۔ یہ اُن کا لقب تھا، کوفے کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتے تھے، قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ غلام ترکی جو تھا، وہ بھی حافظِ قرآن تھا۔ کوئی محدث تھا، کوئی حافظ قرآن تھا، کئی صحابہ رسولؐ تھے۔ انس بن حارث صحابیِ رسولؐ تھے، مسلم ابن عوسجہ کے بارے میں بھی روایت ہے کہ صحابی رسولؐ تھے۔

توان کو اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ جب یہ میدان میں آجائیں گے تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ اسلام پر کیا وقت پڑ گیا ہے کہ ایسے ایسے لوگ تلواریں لے کر میدان میں آگئے ہیں۔ پھر خاندانِ رسول کا پورا سرمایہ۔

تاریخ روا روی میں کہہ دیتی ہے کہ اٹھارہ بنی ہاشم، ورنہ بنی ہاشم کہاں تھے؟ سب ابوطالبؑ کی اولاد تھے۔ دکھادوں کیسے انسان ہیں؟ دکھادوں کیسے مسلمان ہیں؟ یاد رکھنا چاہئے کہ انسانوں کی طبیعت بھی مختلف ہوتی ہے۔ کسی کو جوان پر رحم آتا ہے، کسی کو بچے پر رحم آتا ہے، کسی کا دل عورت پر کڑھ جاتا ہے، ترس آجاتا ہے۔ حسینؑ اپنے ساتھ انسانیت کے پرکھنے کا ہر ذریعہ لائے تھے۔ قیامت تک کے مسلمانوں کو دکھادیا ہے کہ دیکھو! یہ کیسے مسلمان ہیں!

ظہر کی نماز کا وقت ہے، ابوثمامہ آتے ہیں، کہتے ہیں: مولاؑ! تمنا ہے کہ یہ نماز آپؑ کے ساتھ باجماعت ادا ہوجائے۔ میں نے نوجوانوں کے اس اقدام کی کراچی میں تعریف کی ہے جنہوں نے نمازِ باجماعت کی روایت کو جلوسِ عزا میں رائج کیا ہے۔ کچھ لوگ جو قدیم تصورات رکھتے ہیں، ان میں سے ایک نے مجھ سے کراچی میں کہا کہ حسینؑ بڑے یا نماز؟ فوراً ذہن میں میرے یہ تصور آیا کہ یہ اس کے ذہن کی بات نہیں ہے۔ بہت سی باتیں منبر سے غلط طور پر پہنچی ہیں۔

تو خیر انہوں نے جب یہ سوال کیا تو میں نے ان سے کہا کہ وہ حسینؑ تو نہیں ہیں، آپ کا جلوس ہے اور نماز تو وہ ہے جس کیلئے حسینؑ کا جہاد ملتوی ہوسکتا ہے۔ تو آپ کا جلوس اگر اتنی دیر کیلئے رُک جائے تو یہ حقیقی یادِ حسینؑ ہوگی۔ تو اب آپ دیکھئے کہ حسینؑ کے جہاد کی فضیلت کتنی بھی ہو مگر نماز وہ چیز ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ان سے کہو کہ اتنی دیر تک کیلئے جنگ روک لیں کہ ہم نماز ادا کرلیں۔

میں کہتا ہوں کہ مجھ ایسا جاہل جانتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں ہر وقت پر ایک ترتیب نماز ہے۔ نماز ادا کرنے کیلئے التوائے جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگِ مغلوبہ میں بھی نماز ادا ہوسکتی ہے۔ کبھی اشاروں سے ہوسکتی ہے، کبھی دوسری صورتوں سے بھی۔ میں کہتا ہوں، معاذ اللہ، کیا حسینؑ اس فقہی مسئلے سے واقف نہیں تھے؟

مگر یاد رکھئے کہ اگر یہود سے مقابلہ ہوتا تو التوائے جنگ کی ضرورت نہ ہوتی، اگر نصاریٰ سے مقابلہ ہوتا تو منکرین خدا سے مقابلہ ہوتا، التوائے جنگ کی درخواست نہ کی جاتی۔ چونکہ بدنصیبی سے نام نہاد مسلمانوں سے مقابلہ تھا، اس لئے یہ التوائے جنگ کی درخواست نہ تھی، یہ اُن کے اسلامی ضمیر کو جانچ کر دنیا کو دکھانا تھا کہ دیکھو! ایسے مسلمان ہیں کہ نماز کیلئے جنگ نہیں روکتے۔

7

اخلاق، قانون اور دین

قانون کو صرف بیرونی زندگی سے مطلب ہے اندرونی زندگی سے دلچسپی نہیں ہے بالفاظِ دیگر اس کو لوگوں کے افعال سے مطلب ہے ان کے اوصاف سے غرض نہیں ہے۔

اگر نگاہ نے غلط چیز کو یا قوت سمجھ کر لے لیا ہے تو یا قوت کو کوسنے نہ دیجئے بلکہ اپنی نگاہ کو کوسنے دیجئے کہ اس نے دھوکہ کھایا اس طرح دین کے نام پر اگر آپ غلط نتائج کو اختیار کریں تو اصلی دین پر حرف نہیں آئے گا۔

جو شریعت کا فیصلہ ہو حقیقت میں عقل کا فیصلہ بھی وہی ہے اور جو عقل کا فیصلہ ہو حقیقت میں شرع کا فیصلہ بھی وہی ہے۔

اگر خدا کے نزدیک صرف کتاب کافی ہوتی تو قرآن میں رسول سے میرا اتباع کرو، کہلوانے کے بجائے قرآن پڑھتے رہو کا حکم ہوتا۔

بارہ کا عدد کسی طرح پورا نہیں ہوتا بغیر اس سلسلے کے ماننے کے جو حضرت علیؑ سے لے کر حضرت مہدیؑ تک منتہی ہوتا ہے۔

اخلاق، قانون اور دین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ"۔

ایمان دین کے ساتھ وابستہ ہے اور خلق کی اصلاح کیلئے تین چیزیں سامنے آئی ہیں: اخلاق، قانون اور دین۔ اخلاق اور قانون میں کچھ خوبیاں اور کچھ مفادات مضمر ہیں اور ان کا مقصد یہی ہے کہ خلق خدا بھلائیوں کے قریب آئے اور برائیوں سے دور ہو۔ مگر ہر ایک میں کچھ خامیاں اور کچھ نقائص ہیں، مثلاً! یہ کہ اخلاق کے اصول اپنے امکان بھر تو صحیح بنائے جاتے ہیں لیکن چونکہ عقل انسانی کمال کی منزل پر نہیں ہے، اس لئے اس کے بنائے ہوئے اصول اچھائیوں اور برائیوں کے تمام پہلوؤں پر کس طرح حاوی ہو سکتے ہیں!

دوسری بات یہ کہ اخلاق کے اصول جن لوگوں نے بنائے ہیں، وہ خود ہوا و ہوس سے بری نہیں ہیں۔ خود ان کے پیش نظر کچھ مفادات ہو سکتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے نادانستہ غلطیوں کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق میں ایک کمی یہ ہے کہ اس میں قوت محرکہ نہیں ہے، یعنی بس ایک علم ہے کہ یہ خوبی ہے، یہ برائی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو سر کو اس کے سامنے جھکائے اور اس کے ماننے اور عمل میں لانے پر آمادہ کرے۔

پھر اخلاق کے معلمین خود اپنے اصول کا نمونہ بن کر پیش نہیں ہو سکتے، یعنی وہ خود اس منزل پر نہیں ہیں کہ جو اصول انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔

قانون کو لیجئے، اس میں بھی قوت محرکہ کی کمی نظر آتی ہے۔ اس نے سزائیں مقرر کر کے اور ان چیزوں سے، جن سے بچانا مقصود تھا، ان کو بتا کر ایک کام کیا۔ لیکن وہ سب باتیں قائم رہیں۔ پھر قانون بھی تو خود محدود عقل والے آدمی بنا رہے ہیں، اسی لئے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ اسی وجہ سے قانون پر برابر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے، ہر دفعہ قانون کو از سر نو مرتب کیا جاتا ہے تاکہ جو نقائص پہلے رہ گئے تھے، وہ دوسری دفعہ دور ہو سکیں۔

یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ تو جو بات اخلاق میں تھی، وہ قانون میں بھی موجود ہے۔ قانون کے بنانے والے بھی سب نیک نیت نہیں ہوتے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان کے بھی کچھ مفادات مضمر ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قانون بنا دیا گیا کہ تمام افراد میں سے کچھ، یعنی نیچی ذات والوں کو اونچا کام کرنے کا حق نہیں ہے، اس طرح مستقل طور پر پیام بلندی ایک طبقہ کیلئے ہو گیا۔ کسی ملک والوں نے رنگت کے لحاظ سے تقسیم کر دی کہ ایک رنگ والوں کو وہ حق نہیں ہے جو دوسرے رنگ والوں کو ہے۔

تو اس طرح قانون کے ذریعہ اپنا مفاد پورا کیا گیا۔ تیسرا نقص قانون میں یہ ہے کہ اس کا واقعاً ہر فرد کو اچھا بنانے کا مقصد نہیں ہے بلکہ قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک فرد کو دوسرے کو دھوکہ نہ دے، اگر دھوکہ دے گا تو وہ جرم ہو جائے گا۔

اسی طرح اپنی جگہ کیسی ہی ہوس نا کی غلط طور پر ہو، قانون کو اس سے بحث نہیں ہے لیکن اگر جبر شامل ہو گیا تو وہ سزا کے قابل ہوگا۔ اسی طرح اُسے افراد کے سدھارنے سے مطلب نہیں ہے۔ وہ تو افراد کو بُرا کہتا ہے، یعنی یہ کہ افراد اچھے نہیں ہیں، تو وہ اب قانون کے دباؤ سے اچھے ہوں گے، جب تک قانون کی گرفت مضبوط ہوگی۔ ادھر قانون کا شکنجہ ڈھیلا ہوا، اُدھر افراد بے راہ روی کرنے لگے۔ اس لئے کہ قانون کو صرف بیرونی زندگی سے مطلب ہے، اندرونی زندگی سے دلچسپی نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کو لوگوں کے افعال سے مطلب ہے، ان کے اوصاف سے غرض نہیں ہے۔

تو یہ بہت بڑی کمی قانون میں موجود ہے اور قانون انسان کو اس وقت تک پابند کر سکتا ہے جب تک مخبروں کا اندیشہ ہے یا جب تک سراغ رسانوں کا ڈر ہے۔ لیکن جب اطمینان ہو جائے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو اس وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرے۔

قانون میں یہ سب نقائص ہیں اور پھر وہی بات ہے کہ قانون کے ساتھ نمونے نہیں ہیں یعنی قانون ساز افراد خود ایسا نمونہ بن کر پیش نہیں ہو سکتے۔

دین جو آیا، اُس نے اس کمی کو پورا کیا۔ جو جو خوبیاں تھیں، وہ سب لیں۔ جو جو مفادات تھے، ان سب کا تحفظ کیا۔ جو نقائص تھے، ان سب کو دور کیا۔ دین سے میرا مطلب دین صحیح ہے۔ بنامِ دین کوئی چیز ہو تو اس سے مجھے مطلب نہیں ہے۔

یاد رکھئے! جو کچھ فائدہ کسی شے سے وابستہ ہوتا ہے، وہ دراصل اس کی حقیقت سے متعلق ہوتا ہے، اس کی مصنوعی نقل سے متعلق نہیں ہوتا۔ پانی پیاس بجھاتا ہے، کاغذ پر پانی کا لکھا ہوا نام پیاس نہیں بجھا سکتا۔ اسی طرح سے دنیا والے کہتے ہیں: ارے آپ کہتے ہیں کہ دین امن کا ذمہ دار ہے لیکن دین کی وجہ سے جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں، جتنی خونریزیاں ہوئی ہیں، وہ شاید کسی اور وجہ سے نہ ہوئی ہوں۔

تو میں کہتا ہوں کہ نقل اس چیز کی بنائی جاتی ہے جو قیمت رکھتی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ سراب بہت سے پیاسوں کو اپنی چمک دمک سے دھوکہ دیتا ہے۔ اب اگر سراب نے آپ کو زحمت و مشقت میں ڈال دیا تو اس کی وجہ سے پانی تو فنا کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مصنوعی چیزیں بنائی جاتی ہیں مگر مصنوعی چیز وہی بنائی جاتی ہے جو قیمتی ہو۔ اگر آپ نے بہت دفعہ نقلی پتھر خریدنے سے گھاٹا اُٹھایا ہو تو اس کی وجہ سے اصلی پتھر دنیا سے فنا کر دینے کے قابل نہیں ہو جائیں گے۔

ایک جانی ہوئی چیز بیان کروں کہ جھوٹ جب تک سچ بن کر پیش نہ ہو تو تب تک جھوٹ نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے سچائی تو فنا کرنے کے قابل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر بنامِ دین فسادات ہوئے ہیں، اگر بے راہ رویاں ہوئی ہیں اور بنامِ دین تفرقے پڑے ہیں تو اس وجہ سے اصلِ دین فنا کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اگر نگاہ نے غلط چیز کو یاقوت سمجھ کر لے لیا ہے تو یاقوت کو کوسنے نہ دیجئے بلکہ اپنی نگاہ کو کوسنے دیجئے کہ اس نے دھوکہ کھایا۔

اسی طرح اگر بنامِ دین اگر آپ غلط نتائج کو اختیار کریں اور مشاہدہ کریں اور خود بھی اس میں پڑ جائیں تو اصلِ دین پر تو حرف نہیں آئے گا۔ اگر آپ کو دھوکہ ہوا ہے تو کوشش کیجئے کہ نگاہِ امتیاز میں قوت پیدا ہو۔ اسی طرح اگر غلط دین کے نعرہ سے آپ بھی گمراہی

میں پڑے ہیں تو اپنی بصیرت کو قوت دیجئے تا کہ صحیح دین اور غلط دین میں امتیاز ہو سکے۔

اسی لئے تحقیق واجب ہے اور سنی سنائی باتوں پر عمل درست نہیں ہے بلکہ خود دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ سچی بات ہے یا جھوٹی بات ہے۔ یہ راستہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ تو اگر تحقیق نظر سچے راستے کو بتائے تو پھر آپ کا فریضہ یہ ہوگا کہ جس کو آپ سچا سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کیجئے۔ لیکن جس کو آپ سچا سمجھتے ہیں، اس میں دیکھئے کہ وہ خطرہ تو نہیں ہیں۔

حقیقت میں آپ یوں کہئے کہ دنیا والے، جو دین کے خلاف بات کرتے ہیں کہ ایک دین ہوتا تو اختیار بھی کر لیتے ہیں، دین تو اتنے زیادہ ہیں تو کوئی اس جھگڑے میں کیوں پڑے۔

تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ کو یہ اُصول ہو کہ جب دورا پا آئے تو گھر واپس آجایا کریں۔ تو پھر ٹھیک ہے، آپ کا یہی طریقہ ہے۔ آپ سٹیشن پر گئے اور دیکھا کہ دو پلیٹ فارموں پر دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ کہنے لگے کہ ایک گاڑی ہوتی تو اس میں بیٹھ بھی جاتے۔ اب دو گاڑیاں ہیں تو کون اس جھگڑے میں پڑے۔ لہٰذا واپس چلے جائیں۔ تو پھر ہر شعبۂ زندگی میں پابند ہو جائیں۔

بچہ بیمار ہو تو کہئے کہ شہر میں ایک ڈاکٹر ہوتا تو خیر علاج کر بھی لیتے، اب اتنے ڈاکٹر ہیں، کوئی کسی کو اچھا کہتا ہے، کوئی کسی کو اچھا کہتا ہے تو بچہ بلا سے مرجائے، میں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ تو پھر اب کسی چیز میں تخصیص نہیں رہ جائے گی۔ لباس سب ایک پہنتے ہوتے تو خیر کچھ پہن لیتے لیکن جب لباس اتنی قسم کے ہوں تو کون اس جھگڑے میں پڑے۔ لہٰذا لباسِ فطرت ہی بہتر ہے۔ ترقی یافتہ دور میں کچھ جماعتیں ایسی ہیں، اس بناء پر آپ اس اصول کے پابند ہو جائیے۔ لیکن لباس سے فارغ ہو جانا تو آسان ہے، ایک اور مصیبت بھی تو ہے کہ سب یکساں غذا کب کھاتے ہیں؟ ایک کوئی غذا پسند کرتا ہے، دوسرا کوئی اور غذا پسند کرتا ہے۔

تو پھر آپ کہئے کہ ہم اس جھگڑے میں کیوں پڑیں، پھر نظری اختلافات موجود ہیں۔ صرف عملی اختلافات ہی نہیں ہیں، کوئی ایک غذا کو صحیح سمجھتا ہے، کوئی اس غذا کو غلط سمجھتا ہے۔ کچھ سبزی خور ہیں، کچھ غیر سبزی خور ہیں۔ غذاؤں میں مذہبوں کا اختلاف ہے، نظریات کا اختلاف ہے۔ تو اب کہئے کہ ان جھگڑوں میں کون پڑے؟ لہٰذا کچھ نہ کھائیں گے، صرف ہوا ہی کھائیں گے۔ مگر اس اصول کو اپنا کر پھر زندہ رہ کر دکھایئے تو میں جانوں!!

لاکھ قسم کی غذائیں ہوں، آپ خود غور کیجئے کہ آپ کیلئے کونسی غذا مناسب ہے، کونسی آپ کیلئے خوشگوار ہے اور کونسی ناگوار ہے۔ آپ اُس غذا کو اختیار کیجئے کہ جو آپ کیلئے خوشگوار ہو۔ وہ جو پلیٹ فارم پر گاڑیاں کھڑی ہیں، تو جو واقفِ راہ ہوں اور جو اُس سٹیشن سے باخبر ہوں، اُن لوگوں سے پوچھئے کہ ہماری منزل کو لے جانے والی گاڑی کونسی ہے!

یاد رکھئے! آپ نے پوچھا اور کسی نے اتفاق سے غلط بتادیا تو پھر آپ موردِ الزام نہیں ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے جو امکانی طور پر ممکن تحقیق تھی، وہ کرلی۔ لیکن اگر آپ نے دریافت کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور واپس آگئے تو آپ گمراہ بھی ہوئے اور موردِ الزام بھی۔

بس یونہی سمجھ لیجئے کہ راہِ تحقیق میں قدم زنی کیجئے، اپنے امکان بھر۔ تن آسانی کا محاورہ ہے، ذہن انسانی کا نہیں ہے کہ

میں کیا کروں۔ ذہنی کاہلی سے کام نہ لیجئے کہ بس تحقیق کا شگون پورا کر دیجئے۔

جی نہیں! واقعی امکانی جد و جہد کیجئے۔ راہِ حق میں قدم زنی کیجئے۔ تو آپ راہِ تحقیق میں منزل تک پہنچے بغیر دنیا سے اُٹھ گئے تو میرے نزدیک خدا عادل ہے۔ اگر اس کے علم میں آپ نے تحقیق میں امکانی کوتاہی نہیں کی تو پھر وہ آپ کو گمراہی کی سزا نہیں دے گا۔ لیکن آپ کو فریضہ تو ادا ہو جائے گا۔ پھر آپ موردِ الزام عقلاء نہیں ہوں گے۔ ارے عقلاء تو بہت سے مواقع پر عقل سے کام نہیں لیتے، آپ موردِ الزام عقل نہیں ہونگے اور دنیا کے علاوہ آخرت جس کے ہاتھ میں ہے، وہ بھی آپ کو سزا نہیں دے گا کیونکہ جس حد تک آپ پہنچ سکتے تھے، اس حد تک تو آپ نے کوشش کی۔ اب اس کے بعد راہِ طلب میں دنیا سے اگر اٹھ گئے تو یہ نادانستہ آپ کے امکان سے باہر ایک نتیجہ جو ہے کہ آپ منزل تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر یہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ تھک کر بیٹھ رہے تو منزل پر نہ پہنچنا یقینی ہے۔ لیکن اگر تحقیق کرتے کرتے اُٹھ گئے تو امکان تو تھا منزل پر پہنچنے کا۔

اس لئے اُصول یہی ہے کہ علاج کیا اور طبیب صحیح دوا نہ دے سکا تو یہ آپ کی عملی کوتاہی نہیں ہے، لہٰذا آپ موردِ الزام نہ ہوں گے۔ لیکن اگر دوا نہ کی اور مریض مر گیا تو آپ موردِ الزام ہوں گے۔ بہر حال راہِ حق تک پہنچنے کیلئے انسان کے واسطے ایک رہنما خود ذاتی طور پر عقل کو قرار دیا کہ عقل سے کام لو۔ اس کے بعد باہر سے سہارہ معلمین نے دیا کیونکہ جو باتیں عقل نہیں سمجھ سکتی تھی، ان میں ان معلمین کا کام بتانا تھا اور جو باتیں عقل سمجھ سکتی تھی مگر روایاتِ قدیمہ کے بوجھ کی وجہ سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں اور آباؤ اجداد کی تقلید کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا تھا تو وہاں ان معلمین نے یہ کام کیا کہ عقل کے فیصلے کی دبی ہوئی چنگاری کو اوحام کے خاکستر سے نکال کر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اسے حضرت امیر المومنین علیؑ نے انبیاء و مرسلین کے فرائض اور اُن کے کارنامہ کو بیان کرتے ہوئے اپنے بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

"لِيُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ"

یعنی خالق نے ان کو بھیجا تا کہ عقل کے دفینے، جن کے اوپر توہمات و تقلیدات کا انبار ہے، اس انبار کو ہٹا کر ان دفینوں کو ابھار کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ اس لئے حقیقی عقل اور ان کی تعلیم کا کبھی کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت میں ناقص عقول ہیں جن کی وجہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یعنی یہ عقل میں آتا نہیں ہے، یہ نہیں کہ اختلاف عقل ہے، یہ عقل میں نہ آنا اس شخص کی کوتاہی کی وجہ سے ہے جس کی عقل کامل درجہ پر نہیں ہے۔ اس بناء پر عقل میں نہیں آتا۔ ورنہ جو حقیقی رہنما تھے، ان کا ہر فیصلہ صحیح ہے اور اگر عقل خالص عقل ہو تو وہی کہے گی:

"كُلَّمَا حَكَمَ بِهِ الْعَقْلُ حَكَمَ بِهِ الشَّرْعُ وَكُلَّمَا حَكَمَ بِهِ الشَّرْعُ حَكَمَ بِهِ الْعَقْلُ"۔

"جو شریعت کا فیصلہ ہو، حقیقت میں عقل کا فیصلہ بھی وہی ہے اور جو عقل کا فیصلہ ہو، حقیقت میں شرع کا فیصلہ بھی وہی ہے۔"

مگر اس کیلئے رہنما بھی وہی ہونے چاہئیں تھے جو خالق کی طرف سے کامل عقل لے کر آئیں اور جن میں غلطی کا امکان نہ ہو۔
اب وہ ایک نقص جو اخلاق میں بھی تھا یعنی ان کے ساتھ ایسے افراد نہیں ہیں جو خود مثال یا نمونہ بن سکیں۔ دین کے ساتھ وہ اشخاص وافراد وابستہ کئے گئے جو خود نمونہ بن سکیں۔ لفظی تعلیم بعد میں آئی اور معلم پہلے بھیجا گیا۔ یعنی جو معلم ہے، وہ جب چالیس برس کی عمر کا ہے، تب مامور ہوتا ہے قرآن کو پہنچانے پر۔ یعنی چالیس برس تک معلم موجود ہے، صاحبِ کتاب، حاملِ کتاب۔ مگر کتاب خلقِ خدا تک نہیں پہنچتی ہے۔ وہ معلم کون ہے؟ بحمد للہ! بلاتفریق فرقہ، تمام مسلمان اس کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی وہ ہمارے رسول، ختمی مرتبت، محمد مصطفیٰؐ۔

اور تاریخ کی بدیہی بات ہے کہ آنحضرتؐ چالیس برس کی عمر میں مبعوث برسالت ہوئے اور مبعوث برسالت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اُترنا شروع ہوا اور سب سے پہلے سورۂ اقراء نازل ہوا۔ یہی سورۂ بعثت کا اقرار ہے دنیا والے سب بعثت کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ سورۂ اقراء اُترا۔ میرے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو منصبِ رسالت اُس دن ملا۔ بہرحال دعوائے رسالت پر سرکارؐ نبوت اُسی دن مامور ہوئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ چالیس برس تک رہنما موجود ہے مگر کتاب موجود نہیں ہے۔ رہنما چالیس برس پہلے آیا ہے اور کتاب چالیس برس بعد میں۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کو رہنما بغیر کتاب ہونا گوارہ ہے، مگر کتاب کا بغیر رہنما ہونا گوارہ نہیں ہے۔
اب میں کہتا ہوں کہ سنتِ الٰہیہ کی رو سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ناطق رہنما کا وجود اگر ہے، اس کی پیروی اگر ہے، اس کا نقشِ قدم اگر ہے، خلقِ خدا کے مرکزِ اتباع بنانے کیلئے، تو اسے از روئے عملِ الٰہی کہا جاسکتا ہے کہ کافی ہے مگر اس کو چھوڑ کر کتاب کو کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ کافی ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ کتاب کو کافی کہنا خود کتابِ خدا کے خلاف ہے کیونکہ ارشادِ خداوندی ہے:

"هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ۔"

''وہ وہی ذات ہے جس نے اُم قریٰ کے رہنے والوں میں ایک رسول مبعوث کیا تا کہ وہ اس کی آیات پڑھے۔''

اگر یہ کافی ہوتا تو رسالت کے فرائض اسی آیت پر ختم ہو جاتے مگر یہ نا کافی تھا، تبھی تو اور کام بتائے کہ:

"يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔"

''جو ان کے نفوس کی اصلاح بھی کرتا ہے اور انہیں کتاب کی تعلیم بھی دیتا ہے اور انہیں حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔''

اس دور میں جبکہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، کہا گیا ہے کہ ماخذِ دین کیلئے ہمیں کتاب کافی ہے اور سنتِ رسولؐ کی ضرورت نہیں ہے، بس کتاب ہونی چاہئے۔
یہ جو مسلمان کہتے ہیں کتاب وسنت، تو کتاب ٹھیک ہے مگر سنت کو مرکزِ دین بتانا، یہ غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کتاب کافی

ہوتی تو "یتلوا علیھم ایتہ" کافی تھا۔اس کے بعد "یزکیھم" ہے،معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کی حدود میں سے نہیں ہے بلکہ ان کے عمل سے ہے۔اب جو کتاب کی تعلیم ہے،وہ الفاظِ قرآن،جن کی تلاوت ہو رہی ہے،وہ تو ہے کتاب۔اس کے آگے جو ہے،وہ سنت ہے،کتاب نہیں ہے اور حکمت کی تعلیم جن الفاظ میں دیں گے،وہ کتاب نہیں،سنت ہے۔

میں کہتا ہوں کہ "یتلوا علیھم" تو کتاب ہے اور اس کے آگے جو ہے،وہ سنت ہے۔تو اب کہئے کہ تلاوت قرآن پہلا کام ہے،تزکیہ دوسرا کام ہے۔کتاب کی تعلیم تیسرا کام ہے اور حکمت کی تعلیم چوتھا کام ہے۔تو اگر کتاب کو لے لیا اور سنت کو چھوڑ دیا تو چوتھائی دین ملا۔تین حصے دین کے ہاتھ سے نکل گئے۔تو یہ تو اس کے فرائض سپرد کرنے سے ظاہر ہے کہ کتاب کافی نہیں ہے اور پھر کتاب خود کہہ رہی ہے:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"

"اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو،اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

اگر خدا کے نزدیک کتاب کافی ہوتی تو قرآن میں رسولؐ سے "میرا اتباع کرو" کہلوانے کی بجائے "قرآن پڑھتے رہو" کا حکم ہوتا۔مگر قرآن کہہ رہا ہے کہ "اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے نقش قدم پر چلو (یعنی رسولؐ کے نقش قدم پر)۔

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ وہاں قرآن کی بات ہے اور یہاں نقش قدم کی بات ہے تو کسی کے جذبہ عقیدت کو ٹھیس لگے گی۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا بار معلوم ہوگا مگر چونکہ از روئے قرآن حقیقت ہے،تو کیا عرض کروں کہ جو ان کے نقش قدم میں ہے،وہ قرآن میں نہیں ہے۔قرآن میں ہے مگر اسی طرح کہ وہی سمجھ سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ہمیں قرآن میں وہ نظر نہیں آئے گا جو ان کے نقش قدم میں ہے۔اگر قرآن کو حفظ کر لیں اور عمر بھر وظیفہ کے طور پر پڑھتے رہیں:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔"

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو بے سوچے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ؟ سمجھ کر پڑھئے اس کا ترجمہ۔اُردو میں کہئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے نقش قدم پر چلو۔اس کو دہرایئے۔آپ عربی نہیں سمجھتے تو اردو میں دُہرایئے۔کسی اور زبان میں جو آپ جانتے ہوں۔پشتو میں،سندھی میں یا پنجابی میں دُہرایئے۔کسی زبان میں اس کا ترجمہ یاد کر لیجئے۔لاکھ دفعہ عمر میں۔جتنی وہ وفا کرے،اُتنی دفعہ دہراتے رہیے مگر نقش قدم کو ایک مرتبہ بھی نہ دیکھئے تو بتایئے کہ آیت یا اس کا ترجمہ منزل تک پہنچا دے گا؟ لیکن اگر قرآن کے حکم کو ایک دفعہ سن کر نقش قدم پر نظر جما دی تو پھر محویت کے عالم میں چاہے ان الفاظ کو بھول جائیں،مگر نقش قدم منزل تک پہنچا دے گا۔

اب رسولؐ جب دنیا میں موجود ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں اور قرآن سنا رہے ہیں اور آیت سنا رہے ہیں،اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی رہنمائی انہی کے سبب سے مل رہی ہے کہ تم ان کے نقش قدم پر چلو۔اس دوران میں بے شک اس (قرآن) نے اپنا کام کر لیا کہ رہنما کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا۔اس کا کام ہے منزل تک پہنچنے کا سامان کر دینا۔ایک رہنما کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا کہ اس کے

نقش قدم پر چلو۔اب یہ اس وقت دو ہیں۔ایک رہنما قرآن ہے اور ایک خود رسولؐ۔

میں کہتا ہوں کہ جسے بعد میں نعرہ لگانا ہو، وہ آخروقت کیوں لگائے؟ پہلے ہی نعرہ لگادے کہ ہمارے لئے کتاب کافی ہے۔اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمیں رسولؐ کی ضرورت نہیں ہے۔اب سمجھ کر نعرہ لگائے، اسلام کو سنبھالتے ہوئے۔اس وقت قرآن کو کافی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں رسولؐ کی ضرورت نہیں ہے۔تو اب واقعی مسلمان چاہے صرف اسلام کو روشنی میں بحث کریں اور وہ ان کے ناموسِ رسالت کی حفاظت کے ماتحت ہے کہ اس وقت قرآن کافی ہے یا نہیں۔مگر اسلام کے زیر سایہ جو اختلافات ہیں، اُصول ہیں۔اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ مباحث رسولؐ کے بعد پیدا ہوئی ہیں۔

اب یہاں رسالت ہی کی بات آگئی تو سب مسلمان مل کر یہ بحث کریں گے کہ قرآن کافی ہے یا نہیں۔لیکن قرآن نے رسولؐ کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا۔اب اگر رسولؐ نے دنیا سے جاتے وقت اور رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہاتھ پکڑا دیئے تو اب یہ کہنا کہ قرآن کافی ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔میں کہتا ہوں کہ اگر کافی تھا تو اتنے دن کیوں کافی نہ ہوا؟ اگر کافی تھا تو قرآن تو وہی ہے، رسولؐ کی ضرورت نہیں تھی۔

تو میں کہتا ہوں کہ اس وقت بھی قرآن اکیلا نہیں ہے، دو ہیں۔ایک قرآن اور ایک خود رسولؐ ہیں۔

اب دنیا سے اُٹھتے وقت رسولؐ فرمارہے ہیں:

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْن"

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور ایک میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔"

میں کہتا ہوں کہ دنیا ذرا غور کرے، عقل کی آنکھوں سے، کہ پیغمبر خدا کا اصل اعلان کیا ہے اور کس کیلئے ہے؟ تو کہا جائے گا کہ دو چیزوں کے متعلق کہہ رہے ہیں، ایک قرآن اور ایک اہلِ بیتؑ۔دو چیزوں کو فرمارہے ہیں۔دو چیزوں کے متعلق اعلان ہے۔پھر غور کر کے دیکھئے کہ اصل اعلان کیا ہے؟ کہنے لگیں گے کہ آپ کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ دیکھو! اب تک تو قرآن کے ساتھ میں ہوں لیکن جب میں دنیا سے اٹھ جاؤں، تب بھی قرآن کو اکیلا نہ سمجھنا۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ہدایت کی دو کرسیاں بچھی ہوئی ہیں، ایک پر قرآن ہے اور ایک پر خود رسولؐ ہیں۔وہ کرسی جس پر قرآن ہے، وہ خالی نہیں ہورہی ہے، وہ کرسی جس پر رسولؐ ہیں، وہ بظاہر میں وفات کے وقت سے خالی ہورہی ہے۔تو رسولؐ فرمارہے ہیں کہ میرے بعد یہ دو ہیں، یعنی اب بھی اس کرسی کو خالی نہ سمجھنا۔اب تک میں اس کرسی پر تھا اور اب میرے بعد میرے اہل بیتؑ ہیں۔

اب دنیا سے میرا سوال یہ ہے کہ غور کیجئے کہ قرآن تو اپنی جگہ پر ہے۔اب رسولؐ کی جگہ کون ہوا؟ رسولؐ فرمارہے ہیں کہ اب تک میں تھا یعنی قرآن اب بھی کافی نہ تھا اور میرے بعد میرے اہلِ بیت ہیں۔اب یہ کہنا کہ قرآن کافی ہے، جیسے قرآن تھا اور میں تھا، اب قرآن ہے ار میرے اہل بیت ہیں۔اب یہ اور بات ہے کہ کوئی جملہ بعض لحاظ سے درست ہوتا ہے، بعض لحاظ سے غلط ہوتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ میں بھی کسی وقت کسی لحاظ سے نعرہ لگا سکتا ہوں کہ قرآن کافی ہے مگر ہر چیز کا کافی ہونا اس کی جنس میں ہوتا ہے۔

میں اگر صبح کو بوقت ناشتہ یہ کہوں کہ ایک پیالی چائے کافی ہے اور کسی نے دوسری پیالی بڑھائی، میں نے کہا کافی ہے۔اب

دوپہر کا وقت آیا، کھانا بھی غائب۔ بھائی وہ کس لئے؟ کہا کہ آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ کافی ہے۔ سونے کا وقت آیا تو بستر بھی نہ ہو۔ کہیں کہ آپ نے فرمایا تھا کہ کافی ہے۔ کافی نہ ہوا، مصیبت ہو گیا۔ بے شک چائے کافی تھی مگر اس کے معنی یہ تھے کہ چائے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ معنی تھے کہ اب کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور یہ معنی بھی نہیں تھے کہ اب اوڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

تو اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ قرآن کافی ہے یعنی اب توریت کی ضرورت نہیں ہے، انجیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی آپ کی بنائی ہوئی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات کہ ناطق رہنما کی ضرورت نہیں ہے، مثالِ عمل کی ضرورت نہیں ہے، یہ نہ اُس وقت کافی تھا، نہ اس وقت کافی ہے۔ اب پیغمبرِ خدا فرما رہے ہیں کہ میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں یعنی ابھی تک تو فرد ہے۔ فرد ایک ہوتی ہے۔ بس جتنی عمر بھی اللہ کی طرف سے ہو، اتنی عمر پوری ہو جائے گی تو وہ تمہارے سامنے سے اُٹھ جائے گا۔ مگر میرے بعد ایک سلسلہ ہے۔ اہلِ بیتؑ کسی ایک آدمی کا نام نہیں، عترت کسی ایک فرد کا نام نہیں۔ یہ ایک سلسلہ ہے۔ اہلِ بیتؑ میں ہر فرد کو اس معیار پر ہونا چاہئے کہ جو قرآن کا ساتھی بن سکے اور اس کے بعد یہ فرما دیا:

"لَنْ يَّفْتَرِقَا"۔

"ان میں کبھی تفرقہ نہیں ہوگا۔"

اور یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کسی طرف لے جائے اور اہلِ بیتؑ دوسری طرف لے جائیں۔ مقامِ رہنمائی میں تفریق نہیں ہو سکتی اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ قرآن رہے اور اس سلسلہ کی کوئی فرد نہ رہے۔ جب تک قرآن ہے، اس وقت تک ان افراد کا سلسلہ موجود رہے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سلسلہ سے متعارف کروانا فریضہ رسالت تھا، اس لئے کہ اگر ان کی رسالت فقط اپنی زندگی بھر کیلئے ہوتی تو دنیا کو لاوارث چھوڑ کر چلے جاتے اور یہ خیال فرما لیتے کہ میرا کام اپنی زندگی بھر ہدایت کرنا تھا، وہ میں کر چکا، اب مجھے کیا مطلب! مگر یہ اُس وقت ہوتا جب پیغمبرِ خدا کی رسالت بس اُس زندگی بھر کیلئے ہوتی۔ لیکن یہ تو ہر نقطہ نظر کا مسلمان ماننے پر مجبور ہے کہ رسولؐ کی رسالت اس عمر سے وابستہ نہیں تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عمرِ رسولؐ سے وابستہ نہیں تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عمرِ رسولؐ ہے، بحیثیت بشر اور ایک عمرِ رسولؐ ہے، بحیثیت رسولؐ۔ وہ عمر جو بحیثیت بشر ہے، وہ تو صرف تریسٹھ برس اور بعثت کے بعد صرف تیئس برس۔

ایک عمرِ رسولؐ بحیثیت رسولؐ ہے، وہ ہے تا قیامِ قیامت اور یہ میں نے محدود محاورے کے ماتحت کہا کہ تا قیامِ قیامت، ورنہ کون کہتا ہے کہ قیامت کے آنے سے آپ کی رسالت ختم ہو جائے گی۔ اگر قیامت کے آنے سے رسالت ختم ہو جائے تو پھر شفاعت کس اعتبار سے ہے۔ تو جس کی لامحدود رسالت ہو، اُس کا کام بس اس زندگی سے وابستہ نہیں ہے جو اس دارِ دنیا میں لوگوں کے سامنے ہے۔ اس کا کام تا قیامِ قیامت ہے۔ اس جہت سے کہ جن کا کام ہدایت حاصل کرنا ہے، قیامِ قیامت تک حاصل کر سکتے ہیں۔

تو جب ہدایت قیامت تک ہے تو ان کو قیامت کا انتظام کر کے جانا ہے۔ بالفرض اگر یہ جانا بھی چاہیں تو مسلمانوں کو دامن پکڑ کر پوچھنے کا حق ہے کہ اپنے بعد کا انتظام بھی تو بتا جائیے کہ آپؐ کے بعد کیا ہوگا!

اب کوئی ضعیف روایت بھی نہ بتائے کہ یہی دلیل ہے کہ رسالت مآبؐ نے بتایا۔ اب بتایئے کہ کیا بتایا؟ یا جو میں بتا...

مان لیجئے۔ بلا فصل جو تھا، اُس کا نام لے کر بتایا اور کبھی بعد کا جو سلسلہ تھا، قیامت تک جانے والا، ان کے نام لے لے کر بتایا۔ اس سلسلہ کی جو پہلی کڑی تھی اور آپ کے بعد بلا فاصلہ ہونے والی تھی، اس کا تعارف عمر بھر کروایا۔ مگر چونکہ جانتے تھے کہ دنیا اسے بھول جائے گی اور بھولنے پر مصرر ہے گی، لہٰذا اتمام حجت کیلئے ان کے متعلق طرح طرح سے عمر بھر بتایا اور اتمام حجت اس بڑے اجتماع میں بھی کیا کہ جس سے بڑا مجمع رسولؐ کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ایک متفقہ تاریخی حقیقت ہے کہ غدیر خم میں اتنے بڑے مجمع میں، پیغمبرؐ نے خطبہ پڑھا، اتنے بڑے اجتماع کے سامنے رسولؐ اس سے قبل اپنی زندگی میں بھی نہیں گئے تھے۔ تو میں کہتا ہوں مسلمانو! سیرت النبیؐ کے ایک واقعہ کی حیثیت سے اس خطبہ کو یاد رکھو۔۔ اس موقع پر قدرت نے اسباب اس طرح فراہم کردیئے کہ بھولنے والا بھولنا بھی چاہے تو نہ بھول سکے بلکہ انتہائی بھول جس پر غالب ہو، وہ بھی نہ بھول سکے کیونکہ بہت سی غیر معمولی باتیں اس دن پیش آئیں، مثلاً جانے والے آگے بڑھ گئے اور جو رہ گئے تھے، وہ پیچھے رہے۔ ایسے موقع پر رواں سفر کو روکنا ہی یاد رکھنے کی بات ہے۔ جو آگے بڑھ گئے تھے، ان کو پیچھے بلانا، یہ اُن کے یاد رکھنے کی بات ہے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے، انہیں تیز رفتاری سے بلانا، یہ اُن کے یاد رکھنے کی بات ہے۔ جس موقع پر یہ خطبہ دیا گیا، دُھند لکا نہیں تھا، آفتاب نیم روز میں یہ اجتماع بہم پہنچا تا کہ کسی جانب سے کمزوریٔ نظر کی شکایت نہ ہونے پائے۔

پھر ایک غیر معمولی بات کہ نئے قسم کا منبر بھی یاد رہے اور اس کے بعد یہ واقعہ کہ ہمیشہ منبر پر تنہا جاتے تھے مگر آج ایک فرد کو منبر کے قریب زینے پر بٹھالیا ہے۔ خطبہ وہ چند جملے ہی نہیں ہیں، کافی طولانی ہے، تمہید کے ساتھ ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ دنیا اتنے غور سے خطبہ نہیں سن رہی تھی جتنے غور سے بار بار یہ دیکھ رہی ہے کہ آج یہ کیوں بیٹھے ہیں؟ آج کوئی خاص بات ہے۔ یہ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ نفسیاتی طور پر ان کا چہرہ زیادہ دیکھ رہے ہیں اور خطبہ کی طرف لازماً توجہ کم ہے۔ یعنی جس نیت سے بھی سہی، عبادت بہت خلوص سے ہو رہی ہے۔ جب وہ وقت آیا کہ جس مقصد سے بٹھا رکھا تھا اور وہ جملے رسولؐ فرمائیں گے، تو کیا ہوا؟ اب رسولؐ نے امیر المومنینؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا۔ بچپن میں ہاتھوں پر بلند کیا ہی کرتے تھے مگر میں کہتا ہوں کہ دنیا رسولؐ کی قوت کو دیکھے کہ جو خیبر کے در کو سنبھال چکا ہو، آج اُس کو رسولؐ سنبھالے ہوئے ہیں۔ پیغمبر خدا نے ان کو اٹھا کر مجمع کے سامنے پیش کیا۔

ذرا نگاہِ صادق سے دیکھئے۔ کوئی بچہ ہو، اُس کا قد و قامت مختصر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کے اتنے ہی حصہ جسم کو چھپائے گا لیکن پوری عمر کے انسان کو کوئی بلند کرے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود پورا حجاب میں آگیا۔ میں کہتا ہوں کہ نور حجاب نور میں ہوگیا۔ میں کہتا ہوں کہ رسولؐ خدا کا جو کچھ کہنے کا مقصد ہے، بغیر لفظوں کو استعمال کئے، رسولؐ اس کو عملاً دکھا رہے ہیں۔ خود پیچھے ہیں اور ایک آگے ہے۔ مطلب یہ ہے جب میں نہ ہوں تو یہ ہے۔

اب خالق یہ ارشاد فرما رہا ہے:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ".

"آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا۔"

اس اعلان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رسولؐ نے تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی کی تھی۔ نہیں! رسولؐ کو جو پیغام پہنچانے تھے، وہ انہوں نے سب پہنچا دیئے تھے مگر مقصدِ خالق یہ ہے کہ یہ جو تم نے تبلیغ کی ہے، گویا قیامت تک کا انتظام کر دیا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر تریسٹھ برس دنیا کے لحاظ سے ہیں ہی کیا؟ تو اگر یہ نہ کرتے تو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اب دنیا اس جملہ پر غور کرے اور فیصلہ خود کرے کہ جو تبلیغ ایسی ہو کہ بغیر اس کے پہنچائے ہوئے تمام احکامِ خدا پہنچا دینے کے باوجود کارِ رسالتؐ نہ پہنچانے کے برابر متصور ہو سکتا ہو تو پھر بغیر اس کے مانے ہوئے ہمارا ایمان کیا رہے گا؟ اور یہ تو اس کڑی کا تعارف تھا جو اس اہتمام سے ہوا، اس کے بعد یہ بھی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ:

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْن"

یعنی "تم میں ایک سلسلہ اپنے خلفاء کا چھوڑے جا رہا ہوں"۔

اور دوسری جگہ تعداد بھی بتا دی کہ بارہ ہوں گے۔ دنیا والوں نے جس جس طبقہ کو مانا، اس میں گنتی بڑی مشکل ہو گئی۔ کسی صحیح معیار کے مطابق صحیح افراد مقرر ہو گئے تو تعداد چار سے آگے نہ بڑھی اور بغیر کسی صفات کے لحاظ سے مقرر کیا تو نہ جانے کتنے درجن ہوئے۔ بارہ کا عدد کسی طرح پورا نہ ہوا۔ بغیر اس سلسلے کے ماننے کے جو حضرت علیؑ سے لے کر حضرت مہدیؑ تک ختم ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو حضرات امامت کو اُن معنوں میں نہیں مانتے، جن معنوں میں اہلِ بیتؑ کے صحیح ماننے والے عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بھی اب ان بارہ کو مان رہے ہیں اور ان کے متعلق مستقل تصانیف لکھ رہے ہیں۔ لکھنے والوں کے اعتقاد کو آپ اُن کی کتابوں کے ناموں سے سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی اُن کے حالات میں کتاب لکھتا ہے، انہی بارہ اماموںؑ کے حالات پر مشتمل جنہیں ہم امام مانتے ہیں۔ تو اس کا نام رکھتا ہے: "اَلْفُصُوْلُ الْمُهِمَّةُ فِیْ مَعْرِفَةِ الْاَئِمَّة"۔ یعنی "آئمہ کی معرفت میں اہم باب۔"

یہ کتاب انہی آئمہ کے بارے میں ہے جن کو رسولؐ نے اپنے بارہ خلفاء کہہ کر متعارف کروایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کی زبان کو چھوڑ کر یہاں بات کر لی ہے۔ یہ کتاب علامہ ابن سداد مالکی نے تحریر فرمائی ہے۔ کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کی کتاب "مطالب السول فی مناقب آلِ رسولؐ" بھی انہی ہستیوں کے حالات میں ہے۔ اسی انداز میں محمد طارق بخاری نے "کفایت الطالب" یعنی متلاشی کیلئے کافی ہو جانے والی کتاب انہی ہستیوں کے تعارف میں تحریر فرمائی ہے اور فرنگی محل لکھنؤ میں ایک دینی مرکز ہے، وہاں کے ایک عالم محمد مبین نے ایک کتاب فارسی میں "وسیلۃ النجات" "آخرت میں نجات کا ذریعہ" کے نام سے تحریر کی ہے جس سے لکھنے والے کے ضمیر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع میں چھپی تھی۔ اس میں بھی انہی آئمہ اثناء عشر کے حالات درج ہیں جو رسولؐ کے نائب بزبانِ رسولؐ ہیں۔ حافظ محب الدین فرنگی محل لکھنؤ نے بھی ایک کتاب "ذخائرِ عقبیٰ" کے نام سے تحریر کی ہے، "آخرت میں کام آنے والے ذخیرے"۔ اسی قبیل کی ایک کتاب "صواعق محرقہ" ہے جو علامہ ابن حجر مکی نے تحریر فرمائی ہے۔ انہوں نے اس میں آئمہ اہلِ بیتؑ کے حالات درج کئے ہیں۔

رسولؐ نے کہا تھا کہ میرے بعد بارہ امام ہوں گے۔ میں دنیا سے کہتا ہوں کہ کسی خاندان میں اتنے کمالات دیر تک نہیں رہتے

مگر ایک صادق ہے جس نے اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بارہ تک کا تعارف کروایا کہ میرے بعد بارہ ایسے ہوں گے۔ اب گیارہ تو آنکھوں کے سامنے آئے اور دنیا نے دیکھا۔ مطالعہ کی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ چاہے عہدہ مانیں یا نہ مانیں، منصب مانیں یا نہ مانیں، لیکن جو ہے، چاہے اپنے وقت میں علیؑ ابن الحسینؑ ہوں، چاہے محمدؑ ابن علیؑ ہوں، چاہے جعفرؑ ابن محمدؑ ہوں، پورے سلسلہ کے متعلق ہر دور میں جو حالات لکھے گا، اوصاف سب متفق علیہ ہیں۔ وہ کہے گا کہ اپنے دور میں ان سے بڑھ کر کوئی عابد نہ تھا۔ اپنے دور میں اُن سے بڑھ کر کوئی واعظ نہ تھا۔ اپنے دور میں ان سے بڑھ کر کوئی سخی نہ تھا، جواد کوئی نہ تھا۔ ان کے علم کے واقعات لکھے گئے، عبادت کے واقعات درج ہوئے۔ ان کے صبر کے واقعات قلمبند ہوئے۔ عہدے کا نام لے یا نہ لے مگر کردار جو ہے، اوصاف جو ہیں، ہر ایک کے مان رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گیارہ تو دنیا کے سامنے آئے، برائے خدا انصاف کرو کہ جس سچے کی سچائی گیارہ تک آنکھوں کے سامنے آ چکی ہے، اب ایک کے لئے اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالتے ہو۔ مگر دنیا والوں نے کوشش شروع کر دی کہ ہم اس سلسلہ کو رہنے ہی نہیں دیں گے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک قرآن اور ایک میری عترت اہل بیؑ۔ یہ قیامت تک جدا نہ ہوں گے۔ دنیا نے کہا کہ رہنے دینا یا نہ رہنے دینا یہ ہمارا کام ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ رہیں گے، ہم نہیں رہنے دیں گے تو کیسے رہیں گے۔ اس لئے جو آیا، اس کو مٹانے کی کوشش کی۔ جو آیا اس کی زندگی کا خاتمہ ظلم وستم کے حربہ سے کیا۔ کربلا میں کونسا دقیقہ اُٹھا رکھا تھا کہ یہ سلسلہ باقی نہ رہے۔ کربلا میں اس سلسلہ کی جس کڑی کو باقی رکھنا تھا۔ اس کی حفاظت کا انتظام قدرت نے یہ کیا کہ کربلا کے حالات کو اس سے پردہ میں کر دیا۔ یہاں سب کچھ ہو رہا ہے مگر وہ غش میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بیماری کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انؑ کو بیہوش کر سکے۔ مگر یہ حکمت الٰہی ہے اور مصلحتِ باری ہے کہ حالات ان کے سامنے رہیں اور وہ اس فریضہ کو ادا نہ کریں جس کو علی اکبرؑ نے ادا کیا۔ یہ ان کی بلندیٔ کردار کے خلاف تھا۔ اس لئے دن بھر اصحاب تک چلے گئے، امام زین العابدین علیہ السلام بیہوش رہے۔ صرف آپؑ کے غلام ترکی نے آپؑ کو جگا کر اذنِ جہاد طلب کیا، پھر بیہوش ہو گئے۔ یہاں تک کہ امام حسینؑ رخصت آخر کے وقت آئے تو ہوش میں لا کر وصیت کی یا ان کے استغاثے کے وقت ہوش میں آئے مگر پھر بیہوش ہو گئے۔ خیموں میں کہرام برپا رہا مگر ان کو خبر نہ ہوئی کہ کہرام ہے۔

8

نماز اور زکوٰۃ

ایمان کے راستے کا دکھانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور ایمان کو دل میں جبری طور سے ڈال دینا، یہ اس کا کام نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سے مطالبہ رکھتا ہے کہ دن میں اتنا وقت تم میرے اس کام میں صرف کرو جس کا نام نماز ہے اور ہم اس پر عمل نہیں کرتے اس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی دیر ہم اپنی جان اور اپنے اوقات حیات پر تصرف غاصبانہ کر رہے ہیں۔
خداوند عالم نے فرمایا گیارہ مہینے شوق سے کھانے پینے کی چیزیں کھاؤ لیکن دیکھو ایک مہینے میں اور وہ بھی رات کو نہیں، دن کو ہماری طرف سے یہ پابندی ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کرو۔
اگر انسان نے شوق شہادت میں کوئی اپنی طرف سے ایسا کام لیا جو اس کے خیال میں اس کے تقاضائے شہادت کو پیدا کرے تو یاد رکھئے کہ پھر وہ ہلاکت ہوگی تو شہادت نہیں ہوگی۔
نماز جو ہم پڑھتے ہیں اس میں بھی کچھ اپنے اوقات کچھ اپنی مصروفیتوں اور کچھ اپنے مشاغل کی قربانی ہے روزے میں کتنی خواہشوں کی قربانی ہے اس طرح زکوٰۃ میں کچھ قربانی ہے اور حج میں بھی ہر قسم کی قربانی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ".

ارشاد ہو رہا ہے کہ یقیناً اللہ نے خرید لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس عوض میں کہ ان کیلئے جنت ہے کہ وہ جنگ کرتے ہیں، اللہ کی راہ میں، تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں اور یہ اللہ پر لازمی طور سے وعدہ ہے، توریت، انجیل اور قرآن، سب کتابوں میں اور اللہ زیادہ وعدہ پورا کرنے والا اور کون ہے۔

اعلان ہو رہا ہے خریداری کا۔ کس چیز کی خریداری؟ نفوس اور اموال کی خریداری۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال کو بھی ذلیل نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ جس طرح جان کا خریدار وہ ہے، اسی طرح مال کا بھی خریدار وہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ جان بھی اس قابل ہو کہ وہ خریدار ہو اور مال بھی اس لائق ہو کہ وہ خریدار ہو۔ کوئی زاہد تارک الدنیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جو کہے کہ مجھے مال کی ضرورت ہی نہیں ہے، پیسے کی ضرورت ہی نہیں ہے اب ایک تو یہ کہ یہ کہنا صدقِ دل سے بھی ہے یا نہیں یعنی مال مل سکتا ہے اور پھر کہے کہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایک بات ہے۔ بہر حال اگر صدقِ دل سے بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ ازروئے قرآن مجید یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے کہ مال کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر خالق کی نگاہ میں انسان کی مثالی زندگی یہی ہوتی کہ مال اس کے پاس ہو ہی نہیں تو قرآن مجید میں ہر جگہ "يُقِيْمُوْنَ الزَّكٰوةَ" نہ ہوتا۔ حالانکہ ہم قرآن مجید میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں جہاں، جس جس انداز میں صلوٰۃ کا ذکر ہے، زیادہ تر اسی انداز میں اس کے ساتھ، اگر "اَقَامُوا الصَّلٰوةَ" مدح کے طور پر ہے فعل کے ساتھ تو اس کے ساتھ "وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ" ہے۔ یا "مُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ" ہے تو اس کے ساتھ "مُعْطُوْنَ الزَّكٰوةَ" ہے۔

تو جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر، وہاں وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ ماشاء اللہ یہاں کا تو حال معلوم نہیں مگر ہندوستان میں تو میں اپنی معلومات کی بناء پر کہتا ہوں کہ نماز تو ہر آدمی پر واجب ہے لیکن زکوٰۃ جن پر واجب ہے، ان کو میں پوری مردم شماری کے لحاظ سے تناسب قائم کروں تو میں کوئی فیصد نہ نکال سکوں۔ فی ہزار نکالوں کوئی عدد۔ تو اگر معاشرہ ایسا ہو کہ ہزار میں دس کے پاس اتنا ہو کہ اس کیلئے شرائطِ زکوٰۃ حاصل ہوں تو بلاغتِ قرآن کے خلاف ہے کہ ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا نام لے۔

اگر فرض کیجئے کہ سو جگہ صلوٰۃ کا ذکر ہوتا ہے دو ایک جگہ زکوٰۃ کا ذکر ہو جاتا کیونکہ یہ ہر ایک کی ضرورت کی چیز ہے۔ شاذ و نادر کوئی ایک ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہو۔ تو ان کیلئے ایک دو جگہ حکم آ جاتا لیکن یہ کہ ہر جگہ، جہاں صلوٰۃ کا ذکر، وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی نظر میں، یعنی اسلام جس معاشرہ کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا، وہ کوئی قلاش معاشرہ نہیں تھا، وہ مفلوک الحال معاشرہ نہیں تھا۔ وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں ہر شخص پر جس طرح صلوٰۃ واجب ہے، اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے۔ یہاں تک کہ جن کی

ہمارے نزدیک ترکِ دنیا کی سب سے بڑی مثال ہے، یعنی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام، ان کے بارے میں "وسائل الشیعہ"، جو حدیث کی ایک معتبر کتاب ہے ہماری کتابوں میں سے، اجازات جو علماء کے ہوتے ہیں، ان میں جن کتب حدیث کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کی بھی ہم نے اجازت دی احادیث کی روایت کی، ان میں متقدمین کی کتابیں ہیں، کافی اور تہذیب۔ "من لایحضر اور استبصار"۔ اسی طرح بعد کے علماء کی جو کتابیں ہیں، ان میں وسائل الشیعہ بھی شیخ حر عاملیؒ کی ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے احادیثِ امامیہ جمع کی ہیں۔

تو وسائل الشیعہ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی قوت بازو کی کمائی سے چار سو غلام راہِ خدا میں آزاد کئے۔ اب اس زمانہ میں کتنی ہی کم قیمت فرض کیجئے غلام کی لیکن پھر بھی چار سو غلاموں کیلئے ظاہر ہے کہ زرِ خطیر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کہہ دیا گیا کہ جتنے بھی غلام خرید کئے گئے، وہ اپنی ذاتی محنت کے پیسے سے خرید کر آزاد کئے۔

تو معلوم یہ ہوا کہ مال پیشِ خدا اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا، برابر سے دونوں چیزوں کو، کہ جان کا بھی وہ خریدار اور مال کا بھی وہ خریدار۔ لیکن اب ایک خاص چیز سوچنے اور سمجھنے کی جو اس آیت میں مجھے محسوس ہوئی ہے کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ خریداری کا درجہ فروخت کے بعد ہے اور فروخت کرنا بندوں کا کام ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہونا چاہئے تھا کہ تم فروخت کرو۔ جب ہم فروخت کرتے تو وہ ارشاد فرماتا کہ ہم نے خریدا۔ پھر وہ اگر حکم دیتا کہ فروخت کرو تو فروخت کرنا یا نہ کرنا ہمارے اختیار سے وابستہ ہوتا۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ نماز پڑھو، کیا سب نماز پڑھتے ہیں؟ کہا تو اُسنے سب سے ہے کہ روزہ رکھو، کیا سب روزہ رکھتے ہیں؟ اس کی طرف کا حکم سب کیلئے ہے کہ ایمان لاؤ، کیا سب نے ایمان اختیار کیا ہے؟ اس کا حکم ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو، کیا سب اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے احکام اس کی طرف سے ہیں، وہ تمام احکام ایسے ہیں کہ کچھ اس کی تعمیل کرتے ہیں اور کچھ اس کی تعمیل نہیں کرتے بلکہ تعمیل کرنے والے کم ہوتے ہیں اور تعمیل نہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس نے اطاعتِ جبری نہیں چاہی تھی۔ اگر جبری اطاعت کروانا ہوتی تو قرآن مجید میں جو یہ کہہ دیا ہے:

"لَوْ شَاءَ"

"اگر وہ چاہتا تو"

"لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔"

"جتنے بھی روئے زمین پر ہیں، سب ہی ایمان لے آتے"۔

اگر وہ چاہتا، تو کیا وہ چاہتا نہیں ہے؟ چاہتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ بندہ ارادۃً ایمان لائے۔ یہ نہیں چاہتا کہ وہ جبر سے کام لے۔ جبری طور سے، یعنی خود مومن بنادے۔ ایمان کے راستے کا دکھانا اس کا کام ہے اور ایمان کو دل میں ڈال دینا، جبری طور سے، یہ

اُس کا کام ہے اور ایمان کو دل میں ڈال دینا، جبری طور سے، یہ اُس کا کام نہیں ہے۔ یہ تو بہت ہی معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جبر و اختیار کا علم کلام میں، اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس وقت تو میں ایک جملہ کہتا ہوں کہ فرد نا فرمان کا وجود خود دلیل اختیار ہے۔

تو اگر وہ جس نے نماز کا حکم دیا، روزہ کا حکم دیا، اسی طرح حکم دیتا کہ تم فروخت کرو اپنے جان و مال کو تو پھر ہمارے بس میں ہوتا کہ فروخت کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم فروخت کرتے، تب وہ قیمت میں جنت ملتی۔ مگر یہ تو مجھے عجیب بات معلوم ہو رہی ہے کہ ہم سے نہیں کہتا کہ فروخت کرو اور خریداری کا اعلان کیے دیتا ہے۔ جو بعد کی منزل ہوتی ہے، اس کا اعلان اور جو قبل کی منزل ہے، اس کا ذکر ہی نہیں۔ تو اب یہ کچھ انوکھی بات ہوئی کہ اللہ نے خرید لیا۔

اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں تو مسئلہ حل ہو جائے کہ کن سے خریدا؟ یہ تو نہیں کہا کہ لوگوں سے خریدا۔ ''ناس'' کا لفظ یہاں نہیں ہے۔

"إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔"

''اللہ نے خرید کیا مؤمنین سے ان کے جان و مال کو''۔

اس بناء پر کہ ان کیلئے جنت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے، اسی وقت ہم نے اپنے جان و مال کو فروخت کر دیا۔ بس ادھر ہم نے اقرار ایمان کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ اقرار کر لیا کہ اب ہمارا مال ہمارا نہیں ہے، ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ یہ جان بھی اُس کی ہے اور یہ مال بھی اُس کا ہے۔

حقیقت میں جتنی پابندیاں ہیں احکامِ شریعت کی، وہ تمام پابندیاں اب اس بیع کے تقاضے پر ہیں۔ ہم نے اپنی جان کو فروخت کر دیا، اب وہ ہم سے مطالبہ رکھتا ہے کہ دن میں اتنا وقت تم میرے اس کام میں صرف کرو جس کا نام نماز ہے اور ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی دیر ہم اپنی جان اور اپنے اوقات حیات پر تصرف غاصبانہ کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا گیارہ مہینے شوق سے کھانے پینے کی چیزیں کھاؤ لیکن دیکھو! ایک مہینے میں، اور وہ بھی رات کو نہیں، دن کو ہماری طرف سے پابندی ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کرو۔ اب یہاں ظاہر ہے کہ جو چیز ہم نے کھائی ہے، وہ مال سے خریدی ہے تو وہ مال بھی ملک غیر تھا، اس لئے یہ تصرف ناجائز ہوا اور دن بھر جو کام ہم نے روزے کے تقاضے کے خلاف کیے اور روزہ نہیں رکھا تو وہی بات ہوگئی کہ ہم نے تصرف غاصبانہ کیا۔ جتنے بھی احکام شرع ہیں، وہ اسی کے تحت آتے ہیں۔ اسی طرح جو محرمات ہیں، جو ناجائز چیزیں ہیں، ہمارا اچھے کپڑے پہننا خالق کا ناپسند نہیں ہے۔ وہ کوئی دوسرا دین ہوگا جس میں لٹا پٹا رہنا خالق کے تقرب کا باعث ہوتا ہے، یہاں تو ایک مقدار میں لباس جزو صحتِ نماز بن گیا۔

اب نہ جانے کن چور دروازوں سے مسلمانوں میں بھی یہ تصورات داخل ہو گئے ہیں کہ برہنہ رہنا مقتضائے ولایت خدا ہو گیا۔ یہاں تو نماز صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ اتنا لباس نہ ہو کہ جس کے بعد آدمی برہنہ نہ کہلائے۔ یہ تو مرد کیلئے لباس ہے، عورت کی نماز تو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہاتھوں اور چہرے کے سوا سب اعضاء چھپے ہوئے نہ ہوں۔

تو معلوم ہوا کہ ہمارا لباس پہننا خالق کو ناپسند نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہنو تو بوسیدہ اور خراب پہنو۔ جی نہیں! کہا گیا کہ جب نماز کیلئے آؤ تو جو بہتر سے بہتر لباس تمہارے پاس ہو، وہ پہن کر آؤ۔ اُسے ہماری پریشان حالی منظور ہوتی تو عطر لگا کر نماز پڑھنے کا ثواب کیوں ہوتا؟ آجکل بال پریشان رکھنا اور گویا ہر وقت مصیبت زدہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا گویا ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے اور وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کی جاء نمازوں میں کنگھا موجود ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محاسن میں شانہ کرنا شامل ہے یعنی آراستہ ہو کر بارگاہِ الٰہی میں آئے، پریشان حالی کفرانِ نعمتِ الٰہی ہے۔

ہاں! کسی بلند مقصد کی خاطر انسان پیوند والا لباس پہنے تو صحیح ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ بے شک پیوند دار لباس پہنتے تھے۔ آپؑ نے اس کا فلسفہ نہج البلاغہ میں خود بتایا ہے۔ آپؑ کے اصحاب میں سے ایک، عاصم ابن زیاد حارثیؒ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے بھائی نے گھر کے کپڑے پہننے چھوڑ دیئے ہیں، گھر میں پکا ہوا کھانا چھوڑ دیا ہے، ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے ہیں اور روکھا سوکھا کھانا کھا لیتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں آؤں گا اور اُسے سمجھاؤں گا، نصیحت کروں گا۔

آپ خوش نہیں ہوئے کہ اس نے بڑا اچھا کیا۔ حضرت تشریف لائے اور بڑے سخت انداز میں کہا: اے شخص! یہ کیا زندگی اختیار کی ہے؟ کیا تیرے گھر میں پکنے والی غذا مالِ حرام سے ہوتی ہے؟ کیا تیرا پہننے کا لباس مالِ ناجائز ہے؟ پھر یہ کس طرح کی زندگی تو نے اختیار کر لی؟ پھر خود ہی فرمایا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ خدا نے خود ہی لذائذ اور طیبات کو حلال قرار دیا ہے اور پھر خود ہی ان پر سزا بھی دے گا۔ یہ عدلِ الٰہی کے خلاف ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟

اتنے سخت الفاظ میں کہا کہ اُسے تابِ مقاومت نہ رہی۔ فوراً کہا: "سَمْعًا وطاعةً"۔

جو آپؑ ارشاد فرما رہے ہیں، اُس پر عمل کروں گا۔ جو کھانا کھاتا تھا، وہی کھاؤں گا، جو کپڑا پہنتا تھا، وہی پہنوں گا۔

دیکھئے! مقتضائے اطاعت یہی ہے کہ حکم کی تعمیل تو کیجئے، پھر اگر اس کی مصلحت کو سمجھنا بھی ہے تو اُسے سمجھتے رہیئے۔ مگر اطاعت کو اس سمجھنے پر موقوف نہ رکھیئے۔ اس نے فوراً اقرارِ اطاعت کیا اور حضرتؑ کا غیظ و غضب کا انداز بدل گیا۔ مگر اصحابِ رسولؐ اور اصحابِ آئمہؑ طالبِ علم بھی تو تھے اور طالبِ علم کو حق ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، وہ پوچھ لے۔ پس جب اقرارِ اطاعت کر لیا تو اس نے دبی زبان سے کہا:

"حضور! میں نے اقرار تو کر لیا مگر یہ حضرتؑ کا لباس جو ہے؟"

دیکھئے! کتنی بڑی خلش آپؑ کے ذہن کی بھی اُس نے دُور کروا دی۔ آپؑ جو اس روکھی سوکھی غذا اور پرانے لباس میں نظر آتے ہیں، یہ کیا ہے؟ بظاہر پھر حضرتؑ کی تیوریوں پر بل آگئے۔ فرماتے ہیں:

"اے شخص! میری تیری برابری نہیں ہے"۔

اب ایک بات کہوں گا کہ حضرتؑ نے کیا معیار مقرر فرمایا؟ میں کہتا ہوں یہی جملہ کہ ہماری تمہاری برابری نہیں ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں جایئے اور بڑے بڑے عہدیداروں سے اور بڑے بڑے مسندِ اقتدار پر بیٹھنے والوں سے پوچھئے کہ سرکار والا! یہ

آپ کے پاس اتنی کوٹھیاں اور ہمارے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے؟ وہ یہاں کہیں گے کہ کیا ہماری تمہاری برابری ہے؟

کسی سے یہ کہئے کہ آپ کے پاس اتنی موٹریں ہیں اور ہمارے پاس سائیکل تک نہیں ہے۔ وہ کہیں گے کیا ہماری تمہاری برابری ہے؟ محلِ استعمال اس جملے کا دنیا میں یہ ہے۔ مگر امیر المومنینؑ کے ارشاد فرما رہے ہیں؟ ارے جنہیں اقتدار حاصل ہو جائے، ان سے اللہ کا عہد و پیمان یہ ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی اپنی رعایا میں سے کمزور ترین فرد کے برابر رکھیں۔ آپؑ نے اپنے انفرادی عمل کا جو فلسفہ بتایا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیگر معصومینؑ نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا، حالانکہ وہ سب نورِ واحد تھے، ایک سلسلہ کی کڑی تھے مگر ہر دفعہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا کردار اس محل پر کیوں پیش ہوتا ہے؟

اب اس ارشاد کی روشنی میں میرا ذہن گیا اپنے حدودِ مطالعہ کی طرف کہ یہ سادگی کے جتنے واقعات ہیں، سب کوفہ کے ہیں۔ یعنی اس دور کے نہیں ہیں جب گوشہ نشین تھے۔ یہ زندگی جو جزو تاریخ بنی ہے، یہ اُس دَور کی ہے جب آپؑ کرسیٔ اقتدار پر متمکن تھے۔ آپؑ کے سامنے دو نمونے موجود ہیں کہ ایک سائل آیا مسجد میں اور اُس نے سوال کیا۔ حضرتؑ نے بھوسی بھرا ہوا جو کا آٹا، جو آپؑ نوش فرما رہے تھے، وہی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے کہا: "اے بندۂ خدا! یہ تو میرے حلق سے نہیں اُترے گا۔"

آپؑ نے فرمایا: یہ مجھ کو دے دو، میں ہی اس کو کھاؤں گا۔ میرے پاس تو یہی ہے اور اگر اچھی غذا کی تلاش ہے تو حسن مجتبیٰ کے دروازے پر جاؤ، وہاں مہمانوں کیلئے غذائے لذیذ موجود ہوگی۔"

وہ وہاں گیا اور فوراً اُس کیلئے کھانا آ گیا۔ وہاں کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے وہ پر تکلف کھانا تھا۔ اس نے کھانا اس طرح کھایا کہ ایک نوالہ کھاتا ہے اور ایک رکھتا جاتا ہے۔ حضرتؑ نے توجہ کی اور کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر تمہارے ساتھ اہل و عیال ہیں تو یہاں کوئی ممانعت نہیں ہے، تم لیتے جانا۔ اُس نے کہا کہ میں اکیلا آیا ہوں مگر مسجد میں ایک سائل کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ایک محتاج کو دیکھ آیا ہوں، میں نے سوال کیا تو وہ سخی تو ایسا تھا کہ جو اس کے پاس تھا، وہ اُس نے اٹھا کر مجھے دے دیا مگر میں نے دیکھا تو بھوسی بھرا ہوا آٹا ہے جسے میں کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میں اُس کیلئے لئے جا رہا ہوں۔

اس فقیر کیلئے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ ارے وہ فقیر نہیں ہیں، وہ تو مالکِ دین و دنیا ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک ہی وقت میں دونوں نمونے موجود ہیں۔ اگر (معاذ اللہ) یہ ترکِ اولیٰ بھی ہوتا تو امیر المومنینؑ کے علم و رضا کے ساتھ امام حسن علیہ السلام کے ہاں وہ غذائیں تیار کیوں ہوتیں اور آپؑ سائل کو وہاں کیوں بھیجتے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکمِ شرعی بحدِ احتساب نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا انفرادی عمل تھا، آپؑ کے مؤقف کے لحاظ سے۔

اسی لئے یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے کہ کہہ دیں کہ اتباع کرنا چاہئے، اتباع کرنا چاہئے۔ کسی ایک معصوم کا نام لے دیا کہ اتباع کرنا چاہئے۔ مثلاً کوئی ہنگامہ ہوا، کہا کہ امام حسین علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے اور ایسی کوئی منزل آئی تو کہا کہ حضرت علیؑ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔

یاد رکھئے! آنکھیں بند کر کے اتباع بھی نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ چودہ سیرتیں ہیں کس محل پر کس معصوم کی سیرت کا اتباع

ضروری ہے، اس کیلئے بھی یہ نظر حقیقت شناس ہونی چاہئے جس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے کہ کس محل پر کس کی سیرت پر عمل ضروری ہے کیونکہ سیرتیں سب صحیح ہیں مگر ہر ایک ہر ایک محل کے لحاظ سے صحیح ہے۔ ہر ایک کے موقف کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ کسی ایک کو لے لینا اور ہر جگہ اسی کا حوالہ دے دینا، یہ کُل کو جزو میں محدود کرنا ہے۔ غرض یہ کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا اچھا پہننا اللہ کو ناپسند نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ خالص ریشم نہ ہو، آرائش کرو مگر سونا نہ پہنو، وہ بھی مردوں کیلئے۔ عورتوں کیلئے یہ حکم نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارا اچھا کھانا اُسے ناپسند نہیں ہے۔ اُس نے کہا ہے:

"اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ "

"تمہارے لیے سب طیبات حلال ہیں۔"

یہ اور بات ہے کہ کسی کو حرام ہی میں مزہ ملے۔ ورنہ جو حلال غذائیں ہیں، ان میں ذائقے کی کمی نہیں ہے۔ اس میں لذیذ سے لذیذ تر غذائیں کھانے کا آپ کو حق ہے اور کوئی الزام نہیں، مکروہ نہیں ہوگا۔ سوائے چند خاص چیزوں کے کہ جنہیں کہہ دیا کہ مکروہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ لذیذ کھانا مکروہ ہے۔ یہ کسی عالم نے نہیں کہا ہوگا۔ پس ہمارا اچھا کھانا اُسے ناپسند نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ پابندیاں ہیں۔ گوشت حلال ہے مگر ذبیحہ کا ہونا چاہئے، تب جائز ہوگا۔ یہ سب کیا ہے؟ سب چیزیں پسندیدہ ہیں۔ اللہ کو ناگوار نہیں ہیں مگر اس میں پابندیاں ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ تمہیں مطلق العنان ہونے کا احساس نہ ہو کہ جان ہماری ہے، مال ہمارا ہے۔ جو چاہیں کھائیں، جو چاہیں پئیں۔ ہر وقت ایک بالادست صاحب اقتدار کا احساس ہونا چاہئے۔ اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے وہ مشکل کام انجام دیا کہ دنیا میں جو ہمیشہ جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں سمجھی گئیں۔ ہمیشہ جسمانی ترقی کو روحانی ترقی کے خلاف سمجھا گیا۔ روحانی ترقی ہے تو پھر جسم کے تقاضے محفوظ نہیں رہیں گے۔ اسی کا ایک رُخ ہو گیا دنیا اور دین، کہ دنیا و دین ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا دنیا کو لو یا آخرت کو لے لو۔ یا دنیا کو لو یا دین کو لو۔ یہ تصور عام تھا لیکن اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے دین و دنیا کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ کسی اور مذہب میں بغرض محال ایک عیسائی کو لیجئے، اگر وہ ڈاکٹر ہے تو چھ دن تک ڈاکٹر ہے، ساتویں دن جب وہ گرجا جائے گا، تب معلوم ہوگا کہ عیسائی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے میں عیسائیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کام سے اس کے مذہب کا کوئی سوال نہیں۔ ہاں! جب وہ عبادت کیلئے جائے گا تو اس وقت مذہب کا سوال ہوگا۔ تو اس وقت مذہب کا سوال ہوگا۔ اسی طرح ان کی عبادت بس گرجا میں جا کر ہوگی، اپنے گھر میں نہیں ہو سکتی، نہ روز ہو سکتی ہے۔ جب گرجا پہنچیں گے تو وہاں عبادت کریں گے۔ وہاں پھر خدا کو یاد کریں گے۔ اسلامی نظام نے یہ کام کیا کہ خدا کو یاد کیا نہیں جاتا، بلکہ خدا کو یاد رکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم ڈاکٹر ہو تو بھی مسلمان ڈاکٹر ہو۔ اگر تم تاجر ہو تو تم کو مسلمان تاجر ہونا ہے۔ اگر تم کسی اور شعبہ کو اختیار کیے ہوئے ہو، تو بھی تم کو مسلمان ہونا ہے۔

لہٰذا ہر شعبہ حیات میں یادِ الٰہی کارفرما ہوگئی۔ دیکھئے! روزمرہ کی زندگی میں کہ آپ بزاز کی دکان پر گئے اور اس سے کہا کہ اچھے سے اچھا کپڑا دکھاؤ۔ نئے ڈیزائن دکھاؤ، نئی وضع دکھاؤ۔ اس سے مطلب نہیں کہ خوشنما ہے یا بدنما ہے۔ اس نے نئی وضع دکھانا شروع کی۔

اب تک جتنا کام ہو رہا ہے، یہ مادی ضرورت کیلئے یعنی تن آسانی کی خاطر۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن ادھر ایک کپڑا آیا اور اگر آپ پابندِ شرع ہیں اور آپ نے پوچھا کہ یہ خالص ریشم تو نہیں ہے؟ بس پتہ چل گیا کہ انسان اپنی تن پوشی کی راہ میں خالق کو نہیں بھولا ہے۔

اسی طرح بازار گئے، طرح طرح کی لذیذ غذائیں نظر آئیں۔ پوچھا کہ یہ ذبیحہ ہے؟ پتہ چل گیا کہ شکم پُری کی خاطر اللہ کو فراموش نہیں کیا جا رہا۔ یہ تو روزمرہ کی بات ہے۔ اب ایک شعبہ ہے، جس کا مجھے تجربہ تو نہیں ہے مگر اندازہ تو ہے ہی کہ کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ہوتا ہے۔ شکار پر گئے، شکار ملا، کتنی دوڑ دھوپ اور تگ ودو کے بعد۔ فوراً گئے، جا کر دیکھا کہ ارے یہ تو مر گیا۔ تو ادھر کہا کہ ارے یہ تو مر گیا، اس کے معنی یہ ہیں ضرورتِ مادی کے اس تگ ودو کے عالم میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔

اور جناب! اب وہ نا قابلِ بیان مرحلہ، میرا تجربہ نہیں ہے اور یہ مقامِ منبر کا تقاضا بھی نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ایسی نفسانی خواہش جس کی تکمیل میں انسان اور حیوان میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کیلئے تمام شرائط حاصل اور تمام موانع ختم اور اس کے ساتھ تراضیِ طرفین حاصل، دونوں بالکل آمادہ لیکن فوراً احساس ہوتا ہے کہ جب تک خاص الفاظ زبان پر جاری نہ کریں، اس وقت تک ایک پردہ درمیان میں ہے۔ جب ایجاب وقبول کے صیغے جاری ہوں گے، تب جا کر یہ ہمارے لئے حلال ہے۔

بس معلوم ہو گیا کہ طوفانی خواہشات کے اس تموج میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔ یہی وہ راز ہے جس کو وہ لوگ نہیں سمجھتے جنہوں نے شریعتِ محمدیؐ میں حلال طریقہ کو حرام کر دیا اور جو یہ کہتے ہیں کہ اس میں اور ناجائز تعلقات میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی خواہش نفس کا پورا کرنا ہوتا ہے، یہ بھی خواہش نفس کا پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کو بہت ہولناک طریقہ پر پیش کرتے ہیں کہ جس سے سننے والا قائل ہو جائے اور واقعہ آدمی سوچنے لگتا ہے کہ یہ تو ہماری طرف بڑی کمزوری ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اس فلسفہ کی ناسمجھی پر مبنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ناجائز تعلقات بھی تو کبھی دائمی رہتے ہیں۔ عمر بھر ناجائز تعلقات رہے، کیا ایسا نہیں ہوتا؟ تو جو فرق دائمی ناجائز تعلقات میں اور عقدِ دائمی میں ہے، وہی فرق عارضی ناجائز تعلقات اور عقدِ عارضی میں ہے۔ اس کے وقتی ہونے سے خصوصیت نہیں پیدا ہوتی۔ فرق باضابطہ اور بے ضابطہ ہونے کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو مطلق العنان نہ سمجھو۔ یہ سمجھو کہ ہماری جان اصل میں کسی اور کی ہے اور ہمارا مال اصل میں کسی اور کا ہے۔

جس وقت ایمان اختیار کیا، اُسی وقت اقرار ہو گیا کہ اب ہمارا مال نہیں ہے اور ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ اسی میں درحقیقت اسلامی سیاست بھی مضمر ہے۔ جس وقت ایمان لے آئے، اس وقت اقرار ہو گیا کہ اس کے مقابلہ میں نہ ہماری جان ہماری، نہ ہمارا مال ہمارا۔ تو اس کے اقتدار کے مقابلہ میں نہ شوریٰ کا حق رہا، نہ اجماع کا حق رہا۔ اس لئے کہ شوریٰ میں چھ سات آدمی جمع ہوئے، وہ سب کیا ہیں؟ ایمان لائے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں تو ان کے شوریٰ کو معتبر نہیں سمجھتا، خواہ پانچ چھ ہوں۔

اب عدد بھی یاد ہے کیونکہ تاریخ میں یہی آیا ہے۔ پس خواہ پانچ ہو یا چھ ہوں، ہزار دو ہزار ہوں، دس ہزار ہوں۔ جتنی مردم شماری اس وقت کی کوئی سمجھے، اس کا نام اجماع ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب ایمان رکھنے والے بحمد اللہ، بہ اقرار خود سب مومن ہیں ورنہ مسلم ہی نہیں ہیں کیونکہ بغیر اقرارِ ایمان کوئی مسلمان بھی نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان ہے تو مدعیِ ایمان ضرور ہے۔ جب مدعیِ ایمان ہے یعنی

جماعت ہے مؤمنین کی۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے تھے،اسی وقت اللہ کے مقابلہ میں بے اختیار ہو گئے تھے۔بے اختیار با اختیار۔با اختیار کیا ہے؟ ثبوتِ اختیار۔بے اختیار کیا ہے؟ نفی اختیار۔تو اب وہ دس ہزار ہوں یا دس لاکھ ہوں،دس کروڑ ہوں، دس ارب ہوں،وہ سب بے اختیار،بے اختیار۔تو بے اختیاروں کے مجمع سے با اختیار کیونکر نکلے گا؟اس کو معمولی ریاضی کے طالب علم حساب پڑھنے والے بچے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تختہ کاغذ کا ہو،اس پر جتنے زیرو بن سکتے ہیں،بنا دیجئے۔تو کیا ان سب سے کسی عدد کی تشکیل ہو گئی،کوئی عدد بنے گا؟نہیں،ہرگز نہیں۔

تو جناب!اپنی جان اپنی نہیں،اپنا مال اپنا نہیں۔یہی فلسفہ قربانی ہے۔اپنا نہیں،اُس کا ہے تو اُس کی راہ میں خرچ ہونا چاہئے۔اس لئے حقیقت میں ہر حکمِ شرع ایک حد تک قربانی کا مطالبہ ہے۔نماز جو ہم پڑھتے ہیں،اس میں بھی کچھ اپنے اوقات،کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ اپنے مشاغل کی قربانی ہے۔روزے میں کتنی خواہشوں کی قربانی ہے۔اسی طرح زکوٰۃ میں کچھ مالی قربانی ہے اور حج میں تو ہر قسم کی قربانی ہے۔مالی قربانی الگ،رکھ رکھاؤ اور وقار کی قربانی الگ۔اپنی وضع قطع اور اپنے لباس کی قربانی الگ۔

معاف کریں آجکل کے نوجوان!بال بڑھانے پر کچھ لوگ بڑے ریاض کرتے ہیں،بڑی محنت کرتے ہیں۔طرح طرح سے بناتے ہیں۔حج کیا تو منیٰ میں جا کر فارغ البال ہونا پڑے گا۔یہ سب چھوٹی چھوٹی قربانیاں ہیں جن کا پوری زندگی مطالبہ ہے اور اگر انسان اسے پورا کر رہا ہے تو وہ حقیقت میں قربانیاں پیش کر رہا ہے۔اگر محل شہادت نہیں آیا تو یہی قربانیاں اس کو پیش خدا بلند سے بلند مرتبے حاصل کروانے کیلئے کافی ہیں کیونکہ شہادت تو وابستہ ہے ایسے کچھ حالات سے جو سینکڑوں برس پیدا نہیں ہوتے اور اگر انسان نے شوقِ شہادت میں کوئی اپنی طرف سے ایسا کام کیا جو اُس کے خیال میں اس کے تقاضائے شہادت کو پیدا کرے تو یاد رکھئے کہ پھر وہ ہلاکت ہوگی،شہادت نہیں ہوگی۔بڑا نازک مرحلہ ہے۔شوقِ شہادت میں اگر کوئی غلط قدم اُٹھ گیا تو شہادت کی منزل دور ہو گئی،ہلاکتِ ابدی رہ گئی۔جان جب حقیقت میں اس کی دی ہوئی ہے تو جتنی قربانی جس وقت وہ چاہ رہا ہے،اتنی ہی کرو۔اگر اس سے زیادہ قربانی کرو گے تو وہ تو اپنے جی کی خاطر ہوگی۔یعنی شوقِ شہادت میں قربانی پیش کر رہے ہیں تو وہ آپ کے شوق کی راہ میں قربانی ہوئی،وہ اللہ کی خاطر تو نہیں ہوئی۔تو شوقِ شہادت کو غلط قدم نہ اٹھوائے ورنہ پھر شہادت کی منزل بہت دور ہو جائے گی۔

مجھے یہ بات اس لئے کہنے کی ضرورت ہوئی کہ جب تک کوئی ہوا چلتی ہے،تو لوگ اندھا دھند قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ایک لفظ چلا شوقِ شہادت کا۔ہر جگہ اگر یہ ہوا چلنے لگی تو نہ جانے کتنے غلط قدم اٹھ جائیں گے۔وہ بڑا خطرناک ہوگا۔اس کی وجہ سے ہلاکتِ ابدی ہو سکتی ہے۔لہٰذا بہت سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔شہادت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں ہے۔یاد رکھئے کہ خونریزی سے بہت لوگوں کو نفرت ہو گئی ہے۔ارے خونریزی؟میں کہتا ہوں کہ اگر معرکہ جہاد میں آنا ہے تو ہر آدمی کو قاتل ہونے کیلئے آنا چاہئے۔اگر شوقِ شہادت میں کوئی کمی رہ گئی،قاتل ہونے کی کوشش میں،تو پھر وہ ہلاکت ہوگی،شہادت نہیں ہوگی۔ہم زیادہ سے زیادہ افراد کو تہہ تیغ کریں گے اور اگر ہم نے کوئی کمی کر دی کہ بہت اچھا ہے کہ شہید ہو جائیں اور بہت برا ہوگا کہ شہید نہیں ہوں گے۔یہ بڑی سخت منزل ہے،اسی لئے ہر منزل پر ضرورت ہے زندہ رہنما کی:

9

علم غیب

اللہ تعالیٰ غیب کا علم رکھنے والا ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتے سوائے کسی رسول کے جسے وہ منتخب کرے (القرآن)۔

وہ مسلمان جو غیب کے ماننے سے کتراتا ہے اسے پہلے تو قیامت کا انکار کرنا چاہیے کیونکہ قیامت غیب کی بجائے شہود میں آجائے تو قیامت ہی نہ رہے۔

اگر یہ مان لیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے بھی انہیں علم غیب نہیں ہے تو یہ نبوت کی نفی ہوگئی پھر نبی کہنا غلط ہے۔

بڑی دردمندی سے مسلمانوں کے ایک طبقے سے کہتا ہوں کہ جس بچے کے کہنے سے اتنی باتیں غیب کی مان لیں اب ایک غیب کی وجہ سے ایمان اپنے کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہو؟

امتحان کربلا فقط امام حسینؑ کا امتحان نہ تھا وہ سب کا امتحان تھا، لہٰذا جیسے خالق نے رسولؐ کو اطلاع دے دی، رسولؐ نے بھی تمام متعلقہ افراد کو ایک ایک کر کے مطلع کر دیا۔

علمِ غیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ"۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ غیب کا علم رکھنے والا ہے۔ وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے کسی رسول کے جسے وہ منتخب کرے۔ مسلمانوں کے بہت سے حلقوں میں ان باتوں پر مباحث ہوتی ہے اور آپس میں بہت ردوقدح ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رسول علم غیب رکھتے ہیں یا نہیں۔

جب اس قسم کا مسئلہ آتا ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ کوئی اسلام اور غیر اسلام کے درمیان کی بحث ہو تو اس میں تو قرآن مجید فیصلہ کن نہیں ہو سکتا لیکن جو مسلمانوں کے درمیان بحث ہو، اس میں قرآن مجید فیصلہ کن ہے اور اس نے اگر اس سلسلہ میں بات کہہ دی ہے تو سبھی کیلئے سرِتسلیم خم کر دینا ضروری ہے۔ اب اس مسئلہ میں اگر قرآن مجید نے کچھ نہ کہا ہوتا تو پھر ہم سنت کی طرف رجوع کرتے، اسلئے کہ ہمارے نزدیک تنہا قرآن کافی نہیں ہے۔ لیکن اگر قرآن مجید نے فیصلہ کر دیا ہے تو وہ فیصلہ بہرحال قطعی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حدیث کیلئے بھی اُصول ہے کہ جو مخالفِ قرآن ہو، وہ حدیث قابلِ قبول نہیں۔ قرآن کے مقابل میں حدیث نہیں ہے، قرآن کے ساتھ حدیث ہے۔ خود پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ اگر تمہیں کوئی بات میری طرف سے پہنچے اور وہ خلافِ قرآن ہو تو اُسے دیوار پر مار دو۔

"فَاِنِّیۡ لَمَا قُلۡتُہٗ"

میں نے وہ نہیں کہی ہے۔ کلامِ خدا اور کلامِ رسولؐ میں تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ آیئے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو مطلق علم غیب کی نفی غیر اللہ سے قرآن میں موجود ہے۔

"لَا یَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ اِلَّا ھُوَ"۔

''سوائے اُس کے علم غیب نہیں رکھتا۔''

اس مضمون کی آیات یقیناً ہیں اور بعض جگہ تو نام لے لے کر کہا گیا ہے کہ یہ باتیں ہیں کہ جن کا علم بس اللہ کو ہے اور کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ اس قسم کی آیات ہیں جو مطلق طور سے کہہ رہی ہیں کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہے۔ غیر اللہ سے علم غیب کی نفی ہے مگر یہ اصول ہے کہ جب کسی متکلم کا کلام ہو اور چند دفعہ وہ بلا قید کہے لیکن ایک دفعہ قید لگا دے، کوئی استثنیٰ کر دے تو وہ ایک جگہ کی قید اور ایک جگہ کی شرط کے ہر دفعہ کے عموم و اطلاق میں تخصیص کر دے گی۔ ایک دفعہ اس نے استثنیٰ کر دیا تو اس کے معنی ہوں گے کہ اس نے شرح کر دی اپنے تمام اُن الفاظ کی جو اس نے مطلق طور پر کہے تھے۔

اور ظاہر ہے کہ خود متکلم سے زیادہ کس کو اپنے کلام کی شرح کا حق ہے۔ تو اب وہ دس آیات صحیح جن میں مطلق طور پر نفی کی ہے

لیکن اگر اُس نے ایک مقام پر استثنیٰ کر دیا تو سمجھئے کہ یہ استثنیٰ ہر آیت میں ہے۔ اب یہ آیت جس کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے، کسی کو یاد نہ ہو تو قرآن میں دیکھ لے یا کسی حافظِ قرآن سے پوچھ لے کہ یہ آیت قرآن میں ہے یا نہیں۔ بہرحال میں آسانی کیلئے بتائے دیتا ہوں کہ سورۂ جن میں یہ آیت ہے۔ اگر جن کے نام سے ڈرے تو آخر میں سورۂ جن کے بل جائے گی۔

اب یہ آیت دیکھئے کہ کیا کہہ رہی ہے اعلم الغیب پر بات ختم ہو جاتی تو ہم سمجھتے کہ اللہ کی صفتِ خاص کے طور پر کہا گیا ہے کہ وہ عالم الغیب ہے تو وہی تصور قائم رہتا۔ کوئی دوسرا علمِ غیب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے بعد تتمہ آیا کہ:

"فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا"۔

"وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا، کسی کو قابو نہیں دیتا۔"

"لَا يُظْهِرُ" کے بہت سے بامحاورہ معنی ہیں کہ وہ اپنے نصیب پر کسی کو قابو نہیں دیتا۔ ظَهَرَ کے معنی غلبہ حاصل کرنے کے ہیں تو اپنے غیب پر کسی کو قابو نہیں دیتا۔ اب بات مکمل ہو جاتی تو پھر وہ عموم و اطلاق جو سب جگہ ہے، برقرار رہتا مگر یہاں متکلم خاموش نہیں ہوا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے غیب پر کسی کو قابو نہیں دیتا بلکہ "اِلَّا" آ گیا اور اس "اِلَّا" سے ہم اسی وقت سے واقف ہیں جس سے کلمہ پڑھا ہے۔ اگر لا الٰہ پر بات ختم ہو جاتی تو خدا کی نفی ہوتی، وہ دہریوں کا کلمہ ہوتا لیکن جب "اِلَّا" آ گیا تو وہ کلمہ توحید بن گیا۔

"مَآ اَرْسَلْنٰكَ"۔

"ہم نے آپ کو نہیں بھیجا۔"

اتنے پر بات ختم ہو جاتی تو رسالت کی نفی ہو جاتی۔ جب "اِلَّا" آ گیا تو ثبوتِ رسالت ہو گیا۔ ہمہ گیر طور پر:

"لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا"

پر بات ختم ہو جاتی تو معنی ہوتے کہ کوئی اجر نہیں لیکن پھر آ گیا:

"اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"۔

تو معلوم ہوا کہ اجر ہے اور وہ قربیٰ کی محبت ہے۔ تو اسی طرح سے:

"لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدً"۔

"وہ کسی کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا"۔

اس پر بات ختم ہو جاتی تو بے شک مطلق نفی علم غیب کی ہو جاتی۔ پھر کسی کو عالم الغیب کہنا صحیح نہ ہوتا۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ کہا: "اِلَّا" مگر۔ تو ابھی بعد کی بات سنئے، تب ہی پتہ چلے گا کہ اس نے غیب کی خبر کس کو دی ہے۔ کسی نہ کسی کو تو اس نے اپنے غیب پر مطلع کیا ہے۔ اب دیکھا کہ کس کو:

"اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ"
''مگر جسے وہ چنے، جسے وہ منتخب کرے۔''

''مِن'' دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ مِن بیانیہ بھی ہو سکتا ہے، تب معنی یہ ہوں گے کہ جس کو اُس نے چنا ہو اور کون ہوتا وہ جس کو چنا ہو، 'مِنْ رَّسُوْلٍ' یعنی وہ منتخب کسے کرتا ہے؟ کسی رسول کو۔ تو مطلق رسول میں علم غیب کا وجود ثابت ہوگا، اگر مِن بیانیہ ہو۔ اگر مِن تبعیضیہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض کا اظہار ہوتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سوائے اس کے رسولوں میں سے جسے وہ منتخب کرے۔ رسولوں میں سے جسے وہ چنے۔ تو پتہ یہ چلے گا کہ ہر رسول کو بھی علم غیب نہیں ہوتا۔ رسولوں میں سے بھی جسے وہ چنے، جسے وہ منتخب کرے، اُسے علم غیب ہوتا ہے۔ اگر مِن بیانیہ ہے تو استثنیٰ کے پردہ میں شگاف ہوا اور اگر مِن تبعیضیہ ہے تو سب رسول عالم الغیب ثابت نہ ہوئے مگر کوئی نہ کوئی جو رسولوں میں بھی منتخب ہو، وہ تو ہوا۔ یہاں کل بحث عام رسول نہیں، اس رسول کی بات ہے کہ جو منتخب ہوا ہو۔

اگر یہ کہا جاتا کہ:

"اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی"۔
''سوا اس کے جسے وہ چنے''۔

تو میں ذرا دور سے اس کی تشریح کرتا۔ میں کہتا کہ اس صورت میں عوام کے مقابلہ میں انبیاء زیادہ حقدار ہیں کہ انہیں چنے یعنی اگر کسی کو وہ چنے گا تو وہ عام اُمتی نہیں ہوں گے بلکہ انبیاء ہوں گے اور اگر انبیاء میں بھی سب کو نہیں چنے گا تو رسول ہوں گے کیونکہ ہمارے نزدیک رسول نبی سے اونچا درجہ ہے اور اگر رسولوں میں بھی سب کو نہ چنے تو اولوالعزم ہوں گے اور اگر اولوالعزم میں بھی سب کو نہ چنے تو افضل الانبیاء ہوں گے اور یہ بھی نہ ہوں تو الفاظ قرآنی کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔

اب اس وقت تو میں ذرا دور سے چلتا۔ پھر آخر میں جا کر خاتم الانبیاء معین ہوتے۔ یعنی کوئی ہو یا نہ ہو، یہ تو ہیں کیونکہ یہ نہیں تو پھر کون ہے اور جبکہ وہاں ''مِنْ رَّسُوْلٍ'' بھی موجود ہے۔ "اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ" اگر بیانیہ ہے تو سب مرسلین۔ مگر اب ایک حقیقت عرض کر دوں کہ ابھی میں نے کہا کہ نبی سے رسول کا درجہ اونچا ہے لیکن قرآنی محاورات میں کچھ اور ہے۔ ہمارے علم کلام کی اصطلاح ہے، ایک درجے کو ہم نبی کہتے ہیں اور ایک درجہ کو ہم رسول کہتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے مطابق گویا نبی ورسول مترادف ہیں۔ نبی کو رسول کہا جاتا ہے اور رسول کو نبی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے دیکھئے۔ وہ انبیاء جو ہمارے نزدیک رسولوں میں داخل نہیں ہیں، جو تعریف ہمارے نزدیک رسول کی ہے، اس معیار پر نہیں ہیں۔ ان کیلئے بھی خالق نے رسول کا لفظ استعمال کیا ہے، مثلاً حضرت اسماعیل ہمارے محاورہ کے مطابق رسول نہیں ہیں مگر خالق نے کہا ہے:

"کَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا"۔

رسول تھے، نبی تھے تو گویا رسول اور نبی مترادف الفاظ ہیں۔ جیسے ایک ہی لفظ ہم معنی ہوتا ہے جب الگ استعمال

کیا جائے اور کبھی ملا کے، مثلاً جد و جہد کے معنی بھی کوشش کے ہیں اور جہد کے معنی بھی کوشش کے ہیں لیکن یہ دونوں الفاظ مل کر بھی کوشش کے معنی میں طاقت پیدا کر دیتے ہیں۔ جد و جہد، سعی و عمل۔ اسی طرح سے یہ "رَسُوْلاً نَّبِیًّا"۔ یہ نہیں کہ رسول میں نبی کی قید لگائی اور نبی میں رسول کی قید لگائی بلکہ وہی رسول ہوتا ہے، وہی نبی ہوتا ہے۔ رسول اور نبی گویا ایک ہی عہدہ کا نام ہے۔ تو قرآن مجید کی اصطلاح میں یہ فرق نہیں ہے اور اسی وجہ سے ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو ہمارے نزدیک بلند درجہ پر ہے، اس کو پست درجہ کے نام سے یاد کرنا اُس کی توہین ہے۔

چیف جسٹس کو اگر جج صاحب کہہ دیں تو اس کی توہین۔ جج صاحب کو اگر منصف صاحب کہہ دیں تو ان کی توہین۔ تو جو رسول تو کیا، افضل المرسلین ہو، اس کو خالق نے "یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ" کہہ کر بار بار کیوں پکارا ہے، اگر وہ فرق نبی و رسول کا پیش نظر ہو۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ قرآنی استعمالات میں نبی و رسول کے درجوں کا فرق نہیں ہے۔ اس لئے "رسول"، کوئی نبی جس کو منتخب کیا ہو رسول۔ تو یہ رسول وہ نہیں ہے جو ہر نبی نہیں ہوتا یعنی کوئی پیغمبر۔

اگر تبعیضیہ ہے تو پیغمبروں میں سے بھی کوئی پیغمبر جس کو وہ منتخب کرے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں میرے نزدیک تبعیضیہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں؟ نبی کے لفظ کے کیا معنی ہیں؟ خود نبی کے لفظ کے معنی ہیں "خبر دینے والا"۔ یہ نبی جو خبر دینے کیلئے ہی بھیجا جاتا تھا، وہ خبر کیا مشاہدات کی دیتا تھا یعنی وہ یہ اطلاع دینے کیلئے آیا تھا کہ اس وقت دن ہے، یہ اطلاع دینے کیلئے آیا تھا کہ اس وقت رات ہے۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے۔ جو چیزیں آپ آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں، کیا نبی ان کی اطلاع دینے کیلئے آتا تھا؟ نبی آتا ہی تھا غیب کی خبریں دینے کیلئے۔ تو جس چیز کو وہ خبر ہی نہ دے سکے تو خدا اس کی خبر دینے کا منصب اُسے کیونکر دے سکتا ہے؟ خود وہ جانتا نہیں تو کسی کو کیا خبر دے گا۔ معلوم ہوتا ہے خبر بعد میں دیتا تھا، علم اس کو پہلے عطا ہوتا تھا۔

اب یہ تو مطلق نبی۔ پھر ہمارے نبی اور ہمارے رسول، ان کے تو القاب ہیں بشیر نذیر۔ چاہے علم غیب کی تائید کرنے والے ہوں تو وہ حضرتؑ کے یہ لقب زبان پر لانے کیلئے مجبور ہیں۔ چاہے علم غیب کے منکر ہوں تو بھی مجبور ہیں کیونکہ دونوں لقب قرآن میں ہیں، انکار کیونکر کریں گے۔ اگر حافظِ قرآن ہیں تو یہ الفاظ یاد کیوں نہ ہوں گے اور پھر آپ کے القاب میں ان کا ذکر کیونکر نہ کریں گے۔

حضور والا! ان کے تو القاب ہیں بشیر و نذیر۔ یہ حقیقت میں نبوت کے دونوں شعبے ہیں۔ ان کو الگ الگ کر کے قرآن نے دو القاب بنا دیئے ہیں، بشیراً و نذیراً۔

بشیر کیا؟ اچھی خبریں سنانے والا۔ نذیر کیا؟ بری خبریں سنانے والا۔ ثواب کی اطلاعات دینا بشیر کے ماتحت، عذاب کی خبر دینا نذیر کے ماتحت۔ تو بتایئے کہ وہ ثواب کیا مشاہدات میں سے ہے اور وہ عذاب بھی کیا مشاہدات میں سے ہے؟ تو بشیر و نذیر وہ ہو نہیں سکتا جسے غیب کی خبریں معلوم نہ ہوں۔

اور پھر بشارت و انذار جس دن سے متعلق ہے، وہ دن ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ اس دارِ دنیا میں تو نہ وہ ثواب ہے، نہ عذاب ہے۔ وہ سب دارِ آخرت میں ہے اور دارِ آخرت پورا پردہ غیب میں ہے۔ وہ مسلمان جو غیب کے ماننے سے کتراتا ہے، اُسے پہلے تو

قیامت کا انکار کرنا چاہئے کیونکہ قیامت غیب کی بجائے شہود میں آجائے تو قیامت ہی نہ ہو جائے۔

حضور! خدا کو ماننا، تو خدا کیا عالم مشاہدہ میں ہے؟ تو وہ غیب الغیوب ہے۔ خدا کے بعد رسالت، تو رسالت کو کیا آنکھوں سے دیکھ کر مانا کوئی؟ کہے گا، جی ہاں! رسول تو آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ سامنے کیا ہے؟ سامنے تو حضورؐ کا چہرۂ مبارک ہے، سامنے تو حضورؐ کا قد و قامت ہے۔ رسالت سامنے کہاں ہے؟

اور اب میں کہتا ہوں کہ ایمان اس چہرۂ مبارک پر نہیں لانا، اس زلف مبارک پر نہیں لانا، دندان مبارک پر نہیں لانا ہے۔ ایمان لانا ہے رسالت پر اور رسالت پردۂ غیب میں ہے۔ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جب بھیجنے والے کو نہیں دیکھا تو بھیجا کیا دیکھیں گے؟

بیچ میں اگر کوئی نہیں رکتا تو قیامت پر تو رکے گا۔ توحید کے بعد رسالت، رسالت کے بعد قیامت۔ تو قیامت کو ماننا ایک لفظِ قیامت کو ماننا نہیں ہے۔ ارے قیامت کو ماننا قیامت ہے۔ یعنی کیا کیا ماننا ہے؟ پل صراط ماننا ہے، میزان ماننا ہے، حشر و نشر کے تمام لوازم ماننا ہیں۔ آج کے پیاسے کوثر کو مانتے ہیں، اس کا بھی انتظار ہے۔

اور جناب والا! اس کے بعد جنت کو ماننا ہے اور نار کو ماننا ہے۔ حور کو ماننا ہے، قصور کو ماننا ہے۔ یہ سب باتیں لفظِ قیامت میں مضمر ہیں۔ تو میں تو بڑی دردمندی سے مسلمانوں کے ایک طبقے سے کہتا ہوں کہ جس سچے کے کہنے سے اتنی باتیں غیب کی مان لیں، اب ایک غیب کی وجہ سے اپنے ایمان کو خطرہ میں کیوں ڈالتے ہیں۔

ایک بات عرض کردوں کہ بحث یہ ہے کہ رسول عالم الغیب ہیں یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں جو نقطہ حقیقت از روئے قرآن ہے، وہ یہ ہے کہ عالم الغیب بحسابِ ذات تو صرف اللہ ہے۔ ذات کے لحاظ سے صرف وہ ہے لیکن اس کے دیئے ہوئے علم سے۔ وہ بھی جس کو جتنے جتنے دائرے میں علم غیب دے دے۔ اگر اس دائرہ میں چھوٹے اور بڑے کا فرق نہ ہوتا تو پیغمبر سب ایک درجہ کے کیوں نہ ہوتے۔ جب قرآن مجید صراحت کر رہا ہے:

"تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔"

''یہ پیغمبر ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔''

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی افضل ہے، کوئی غیر افضل ہے، انبیاء میں مرسلین۔ میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے سب مرسلین کو ایک درجہ پر نہیں رکھا تو ان میں وہ کہہ رہا ہے کہ باعتبار فضیلت فرق ہے تو کسی رسول کے آس پاس کے طبقے کو یکساں رکھنا، یہ کونسی عقل و منطق کے مطابق بات ہے؟ پیغمبر مختلف درجے رکھتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے حدودِ علم بھی مختلف ہیں۔ جتنا جس کو اور جس شعبے کا جتنا علم اس نے جس کو دے دیا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی حیثیت سے افضل ہو لیکن کسی خاص شعبہ کا علم اس نے کسی اور کو دے دیا تو اس کو بر بنائے ہمارے ہاتھ میں ہے، جس شعبہ کا جس کو چاہے دے دیں۔ دیکھو! خضرؑ کو ہم معلم بنادیں گے اور موسیٰؑ طالب علم ہوں گے اور وہ بھی ایسے کہ استاد ان سے مطمئن نہیں ہوگا۔ گویا وہ اس کو شاگرد بنانے کے قابل بھی نہیں پائے گا۔ اس لئے جدا کر دے گا۔ تو یہ بتادیا کہ کس رسول کا علم

اس کا اپنا نہیں ہے، جتنا ہم دے دیں۔ جب ایسا ہے تو میں نے کہا کہ انبیاء کے درجے مختلف ہیں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو افضل المرسلین ہیں، ان کو تمام انبیاء کے برابر نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر علم دیا ہوگا۔

آنکھ بند کر کے عالم الغیب کہہ دینا بھی درست نہیں اور آنکھ بند کر کے علم غیب کی نفی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اس تشریح وتفصیل کے ساتھ ماننا چاہئے کہ عالم الغیب نہیں ہیں۔ یعنی بہ اعتبار ذات بس ایک خدا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ علم سے کیا مخصوص ہے؟ موجود کب یہ بذاتِ خود ہیں۔ خود وجود جب غیر کا عطیہ ہے تو علم کیونکر غیر کا عطیہ نہ ہوگا؟

اگر یہ مان لیا کہ اللہ کی عطا سے بھی انہیں علم غیب نہیں ہے تو یہ نبوت کی نفی ہوگئی۔ پھر نبی کہنا غلط ہے، بشیر ونذیر کہنا غلط ہے۔ پھر یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اس کے بعد واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ اگر علم نہیں ہے تو اطلاع کیونکر دی آئندہ کے واقعات کی؟ اور خبر دینا آئندہ کے واقعات کا مسلم ہے۔ یہ اتنے کثرت سے ہیں کہ انہیں ایک مجلس میں عرض بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دو چار کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ اس کیلئے میرے نزدیک کسی روایت میں بڑی طاقت، اس کی صحت میں یہ ہے کہ اسباب متقاضی ہوں اس کے انکار کے اور بھی کوئی انکار نہ کر سکے۔ یہ اس حدیث کی انتہائی قوت کی دلیل ہے۔ مستند متفق علیہ تاریخ کے نمونے ہیں جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے پیغمبر خدا کی خدمت میں اُمہات المومنین حاضر ہیں۔ پیغمبر خدا رسالت سے خالی تو کسی وقت نہیں ہوتے تھے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ کسی وقت محض بشر ہوتے ہوں اور کسی وقت رسول ہو جاتے ہوں۔ اس تفریق کا میں قائل نہیں ہوں مگر یہ کہ آپ بہر حال رسول ہوتے ہوئے اکثر مزاح کی باتیں بھی فرماتے تھے۔ عام آدمیوں کی طرح گفتگو بھی فرماتے تھے۔ بیبیاں جمع ہیں، کچھ اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ پس منظر کیا تھا؟ اس کو راوی نے بیان کیا۔ بظاہر کسی ایک نے مستقبل کے درخشاں اور روشن ہونے کا اظہار کیا ہوگا۔ کوئی ایسی بات ہوئی کہ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

''ابھی چپ رہنا چاہئے، ابھی کچھ نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ تم میں سے ایک وہ ہے جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔ حوأب میں خود وہ کیفیت موجود ہے جو کتوں کے بھونکنے میں ہوتی ہے۔ اس منزل کا نام یہی ہے۔ تو حوأب کے کتے بھونکیں گے۔ اگر نام لیا دیا ہوتا تو جس کا نام لیا ہوتا، اس کو اخفاء کی فکر ہوتی کہ اس کا اظہار نہ کیا جائے اور دوسروں سے بھی یہی کہتیں کہ اس کو کہنا نہیں۔ اب جن جن سے بڑے روابط ہوتے، سب چھپا لیتے۔ مگر بلاغت متقاضی تھی نام نہ لینے کی۔ میں کہتا ہوں کہ تواتر میں طاقت پیدا کرنا تھی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری ہو۔ اس لئے ہر ایک اُسے بیان کر رہا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کے ذریعے طاقت پیدا ہوگئی آپس میں ایک دوسرے کو چڑانے کیلئے۔ ارے تم ہی وہ ہوں گی۔ اُس نے کہا: جی نہیں، آپ ہی ہوں گی۔ اب جس کے بارے میں ہے، وہ بھی بیان کر رہا ہے اور جس کے بارے میں نہیں ہے، وہ بھی بیان کر رہا ہے۔ بیان کرتے ہوئے خطرہ ہر ایک محسوس کر رہا ہے مگر اس خطرہ کو کالعدم سمجھتے ہوں گے کہ انشاء اللہ ہم نہیں ہوں گے۔ اسی لئے آپس میں اس کا چرچا ہو رہا ہے، یہاں تک کہ گھر کے اندر کی بات باہر تک پہنچی اور زبان زد عام ہوگئی کہ حضرتؐ نے اپنی ازواج میں سے

کسی کیلئے یہ کہا ہے اور یہ ارشاد ہوا ہے۔ تواتر اس خبر کا پیدا ہو رہا ہے، یہاں تک کہ وہ خبر گردش کرتی ہوئی برسوں کی دہائیاں طے کر گئی۔

وفاتِ رسولؐ 11ھ کے شروع میں ہو گئی۔ اب منزل آ گئی 34 ہے یا 35ھ کی۔ گویا ایک ربع صدی، چوتھائی صدی گزر گئی اور بلا خیالِ مزاحمت کے تواتر خبر کا بڑھتا گیا۔ کسی کو مزاحمت سے دلچسپی نہ تھی۔ کون سمجھتا کہ ہم پر یہ زد ہے۔ خبر کا تواتر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اب وہ منزل آ گئی کہ خاتونِ مکرمہ علم جہاد بلند کر کے قدم فرمائے میدان جہاد ہوئیں اور چلیں تو کتوں سے کون کہتا کہ خلاف مصلحت ہے۔ وہ منزل آ گئی درمیان میں اور کتے بھونکنے لگے۔ اب فوراً ان کے ذہن میں رسولؐ کی حدیث آئی اور گھبرا کر پوچھا کہ اس منزل کا نام کیا ہے؟

تو شاید جس سے پوچھا تھا، وہ بیچارہ اس حدیث سے بے خبر تھا۔ اُس نے کہہ دیا کہ حَواب۔ بس سب کتوں کی آوازیں دب گئیں اور اس کی آواز غالب آ گئی۔ یا یوں کہوں کہ بیچارہ ان سب کتوں کے مقصد کا آلۂ کار بن گیا کہ اس نے بتا دیا کہ اس کا نام حَواب ہے۔ اب خاتونِ مکرمہ نے عمداً مظاہرہ تقویٰ و پرہیزگاری کیا۔ پوری فوج سے کہا کہ واپس چلو۔ اب ساتھ والے لیڈرانِ کرام جو تھے، وہ سب انہی کے بھروسہ پر تو چل رہے تھے۔ ان کو آلۂ کار بنایا تھا۔ اب یہ واپس چلی جائیں تو ان کے پاس مسلمانوں کو جذب کرنے کا حربہ کیا رہ جائے گا۔ لہٰذا سب پریشان کہ یہ کیا ہوا؟ پوچھا: آپ واپس کیوں جا رہی ہیں؟ کہا: یہ پیغمبرؐ کی ایک حدیث ہے کہ ایک وہ ہو گی جس کیلئے حواب کے کتے بھونکیں گے اور معلوم ہوا کہ اس منزل کا نام حَوَاب ہے۔ لہٰذا اب میں نہیں جاؤں گی۔

رسولؐ نے فرما دیا تھا کہ وہ، جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے، وہ باطل کی راہ میں قدم زن ہو گی۔ مگر بس ان میں سے جو تیز طرار تھا، وہ گیا اور چند آدمیوں کو مہیا کیا، بخیالِ خود عادل گواہ مہیا کر کے سامنے لے آیا۔ ان سب نے گواہی دی کہ یہ غلط کہتا ہے اور اس کا نام حَواب نہیں ہے۔ یہ تو ایک منزل ہے اور کتے تو کتے ہیں۔ بس تحفظ کیلئے ایک پردہ ہو گیا ان لوگوں کے کہنے سے۔ چاہے دل کہہ رہا ہوں کہ حَواب یہی ہے لیکن تحفظِ تقویٰ کیلئے ایک ذریعہ تو ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر حواب نہیں ہے تو پھر کتوں کی کیا بات ہے؟

آپ نے دیکھا کہ اس وقت جو مشاہدہ ہے، وہ جب رسولؐ نے فرمایا تھا، اس وقت غیب تھا۔ تو غیب کی خبر دی اور خبر ایسی تھی جو ایسے ماحول میں نکلی جو متقاضی تھا اس کو چھپانے کا مگر وہ نمایاں ہو گئی۔ اس لئے حدیث جزو تاریخ بن گئی۔ بس ایک حدیث اور اس کا تواتر اس سے بھی زیادہ تھا۔ یہ میں نے اس لئے کہ شام کی خلقت کی تربیت کی گئی تھی حقائق دینیہ سے بے خبر رکھنے پر۔ کوشش کی گئی تھی کہ دینی حقائق سے یہ لوگ باخبر نہ ہونے پائیں، یہاں تک کہ شبلی، جن کو ہندوستان کا سب سے بڑا مورخ کہا جاتا ہے، انہوں نے تصریح کی ہے مسعودی کیلئے کہ عالم اسلام میں اس سے بڑا مؤرخ پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ انہوں نے ان کو سند دی کہ عالم اسلام میں اس سے بڑا مؤرخ پیدا نہیں ہوا۔ اس مسعودی نے کہا ہے کہ وہاں ایک رسم تھی کہ بعد نماز جمعہ لوگ امیر المومنین علیہ السلام کا نام لے کر گستاخی کرتے تھے اور لوگ اس میں کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ منبر پر جانے والا امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ ایک دن ایک شخص جو باہر سے آیا تھا، وہ شریک ہوا۔ اُس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ آدمی کون تھا جس کا نام لے کر یہ سب کچھ کہا جاتا ہے۔ یہ دو دفعہ کے واقعات ہیں۔ ایک دفعہ اُس نے کہہ دیا کہ میرے نزدیک عرب کے ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو تھا جس نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔

غرض وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ شخصیت کون تھی۔ بس ایک رسم تھی جو جاری تھی۔ ایک واقعہ تو یہ تھا اور ایک واقعہ یہ ہے کہ کسی سے پوچھا کہ یہ کون تھے؟ تو اُس نے ایک عجیب طرح کا رشتہ رسولؐ سے بتایا اور حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کا نام بھی آیا۔ مثلاً زوجہ کو ماں بنا دیا اور بھائی کو بیٹا بنا دیا۔ اس طرح کی گڑبڑ رشتوں میں کر کے اس نے تعارف کروایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسولؐ سے قرابتیں نہیں معلوم تھیں اور بعض کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ یہ کون شخص ہے؟ جہاں دینی حقائق سے اس قدر بے خبر رکھا گیا ہو اور پھر کوئی حدیثِ رسولؐ ایسی ہو کہ ایسے لوگوں میں بھی اس کا چرچا رہا ہو، یہ اس کے زورِ تواتر کا ثبوت ہے۔ وہ کونسی حدیث ہے کہ مسجدِ نبویؐ بن رہی تھی اور وہاں کوئی مزدور الگ نہیں تھا۔ صحابہ اینٹیں لا رہے تھے، رسولؐ خود بھی شریک تھے اور وہاں ہر ایک دو دو اینٹیں لا رہا تھا۔ جنابِ عمار چار چار اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ دین کی راہ میں ایک امتیازی عمل تھا تو پیغمبرِ خدا کی نظرِ خاص ان پر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

"یَا عَمَّارُ تَقْتُلُكَ فِئَةُ الْبَاغِيَه"۔

''ارے کیا کہنا عمارؓ کا، اسے تو باغی گروہ قتل کرے گا۔''

اہلِ بیتؑ سے متعلق حدیث ہوتی تو بہت سے لوگ چھپانے کی کوشش کرتے۔ چونکہ جنابِ عمارؓ ایک فرد تھے صحابہ کرام میں سے، لہٰذا کسی کو اس کے چھپانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کی زد کس پر پڑے گی۔ لہٰذا حدیث کا تواتر اس قدر ہوا۔ اِدھر عمار نظر آئے، اُدھر کسی حاضر الوقت شخص نے یہ حدیث پڑھ دی۔ اب کتنی دفعہ زبانوں پر آئی۔ کتنی مرتبہ مختلف مجمعوں میں پڑھی گئی کہ نتیجہ یہ ہوا کہ خبر کا رتواتر عراق کی حدود سے نکل کر شام کی حدود میں پہنچ گیا اور شام کے خواص سے گزر کر عوام تک پہنچ گیا اور وہی عوام فوج ہیں جو صفین میں آئے ہیں۔

ایسے بے خبر ام جو اونٹ اور اونٹنی میں تمیز نہیں کر سکتے، ان پر ناز ہے امیر شام کو کہ بھلا ان کا مقابلہ کوئی کر سکتا ہے؟ ایسے جاہل ہیں یعنی ان کی جہالت آلہ کار ہے۔ ایسے ہی افراد ہیں جن کیلئے علم خطرناک ہوتا ہے۔ حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتی ہے۔

تو جناب! ان کے ان عوام تک، جو اتنے جاہل ہیں، ان تک بھی حدیث کا چرچا پہنچا کہ عمارؓ کے بارے میں یہ فرمایا ہے اور جنگِ صفین میں وہ عمارؓ حضرت علی علیہ السلام کی فوج کے سردار ہو کر اس عمر میں جبکہ 80 برس کے ہیں، میدانِ جہاد میں آ گئے۔ اس فوجِ شام کے مقابلہ میں اور وہ اس فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت سے وہاں کے عوام میں تہلکہ مچ گیا کہ غضب ہو گیا، عمارؓ ہمارے ہاتھوں قتل ہو گئے اور رسولؐ کی یہ حدیث ہے۔ وہ عوام جو مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ سے ناواقف تھے، وہ عوام جو تمام احادیثِ اہلِ بیتؑ سے ناواقف تھے، اس حدیث سے، جو فضیلتِ عمارؓ میں ہے، اس سے واقف تھے۔ وہ سب جانتے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم تو غلط راستے پر ہیں کیونکہ حدیث اتنے پر ختم نہیں ہوتی۔ حضورؐ نے خود عمار سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ عمارؓ! تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔

"تَدْعُهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُوْنَكَ اِلَى النَّارِ"۔

''تم انہیں جنت کی طرف دعوت دیتے ہو گے اور وہ تمہیں دوزخ کی طرف دعوت دے رہے ہوں گے۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارؓ جس کے ہاتھ سے قتل ہوں گے، وہ سب دوزخ والے ہوں گے، اور جن کی طرف سے یہ قتل نہیں ہوئے، وہ جنت والے ہوں گے۔ تو حدیث بالکل صاف تھی۔ عوام کو سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہ تھی۔ تو جماعت میں تہلکہ مچ گیا اور سب کہنے لگے کہ ہاں! اب تو ہماری یہ جنگ غلط ہے اور ہمیں نہیں لڑنا چاہئے۔ یہاں تک کہ وزیر باتدبیر پریشان ہو کر امیر شام کے پاس آئے کہ غضب ہو گیا، تہلکہ ہے ہماری فوج میں کہ سب کہہ رہے ہیں کہ عمارؓ ہمارے ہاتھ سے قتل ہو گئے۔

بس اس کیلئے ذہانت چاہئے تھی کہ فوراً انہوں نے جواب دیا کہ تم جا کر سمجھاتے نہیں ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں کیا سمجھاؤں؟ حدیث تو صاف ہے اور واقعہ ہے کہ ہمارے ہاتھ سے قتل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم جا کر سمجھاؤ کہ اگر علیؑ نہ لاتے تو وہ قتل کیوں ہوتے؟ لہٰذا اصل میں تو قاتل وہ ہیں جو ان کو میدانِ جنگ میں لائے۔ ہم قاتل نہیں ہیں۔

جناب! انہوں نے سمجھایا اور یہ ان کا بھولپن تھا کہ سب سمجھ گئے۔ اب یہ لیڈر کا فن ہے۔ جو بات غلط سمجھتا ہو، اُسے بھی صحیح سمجھا دے ورنہ مجمع بیوقوف کیونکر بنے؟ لہٰذا سب سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سب یہی کہہ رہے ہیں کہ بھلا ایسے میدان میں، ایسے محترم صحابیِ رسولؐ کو لانا چاہئے تھا؟ ان کو لا کر قتل کروا دیا۔ ہر فرد قرار دادِ جرم میں اس بات کو پیش کر رہا ہے۔ یہ ہوا چل گئی اور یہ پروپیگنڈے کا طاقتور فن ہے۔ تو جناب! ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔ پانسہ پلٹ گیا۔ یہ روداد امیر المومنین علیہ السلام تک پہنچی کہ عمار کے قتل ہونے سے ادھر اضطراب پیدا ہوا تھا اور یوں ان کو اطمینان دلایا گیا اور وہ میدان میں ٹھہر گئے۔

بس ایک جملہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! اس معنی سے تو حمزہ کے قاتل رسولؐ اللہ ہوں گے۔ دیکھا آپ نے، یہ عمار کے قتل کرنے کی خبر جو حضرتؐ نے دی، یہ کوئی مشاہدہ سے متعلق خبر تھی؟ یہ غیب کی خبر تھی اور اس غیب کی خبر کو کتنا تواتر حاصل ہوا؟ اور ایسے محل پر یہ تواتر عالم ظہور میں آیا کہ جب اس کے اخفاء کے تقاضے شدید تھے۔ لیکن حدیث کا انکار پھر بھی نہ ہو سکا، صرف معنی کو بدلا گیا۔

جو سلوک قرآن کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور اب ایک اور خبر۔ مستند احادیث، جو بھی متفق علیہ کہ 61ھ کی خبر پیغمبر محمدا نے اس وقت دی جب شہزادے کی ولادت ہوئی اور آپ کی گود میں لا کر دیا گیا۔ رسولؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پوچھا کہ رونے کا سبب کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم کو نہیں خبر کہ اس پر کیا مصائب گزریں گے۔ وہ سب مصائب پردۂ غیب میں ہیں۔ اس کے بعد بار بار اس کی یاد تازہ کی گئی اور یہ تو مجمل خبر ہے کہ یہ مصائب گزریں گے۔ لیکن مصائب کی تفصیلات خالق کی طرف سے بتائی گئی ہیں۔ اس کیلئے روایات موجود ہیں کہ پیغمبر خدا کی پاس حسینؑ آتے ہیں۔ امیر المومنینؑ تشریف فرما ہیں۔ رسولؐ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے جسم سے پیراہن ہٹا دو۔ کرتہ ہٹا دیا گیا۔ حسینؑ بے نقاب ہوئے اور حضرتؐ نے جا بجا بوسے لینا شروع کیے۔ امیر المومنینؑ پوچھتے ہیں: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرماتے ہیں:

"اُقَبِّلُ مَوَاضِعَ السُّیُوْفِ وَاَبْکِیْ"۔

"جہاں جہاں تلواریں پڑیں گے، وہاں بوسے لے رہا ہوں۔"

کیسا مرقع کھینچ دیا ہے خبرِ غیب کا! اتنی تفصیلات خالق کی طرف سے بتادی گئی ہیں۔ بس اب یہ عام کتابوں میں نہیں ہے، ہمارے ہاں کتب مقاتل میں کہ یہ اطلاع صرف رسولؐ کو نہیں دی گئی بلکہ پیغمبرِ خدا نے جتنے افراد ہیں خمسہ نجبا کے، سب کو اطلاع دی۔ پنجتنِ پاک کو اطلاع دی کیونکہ امتحانِ کربلا فقط حسینؑ کا امتحان تھا۔ وہ سب کا امتحان تھا۔ لہٰذا جیسے خالق نے رسولؐ کو اطلاع دے دی، ویسے رسولؐ نے تمام متعلق افراد کو اطلاع دی۔ صرف علیؑ کو بلا کر اطلاع ہی نہیں دی بلکہ رضا بھی حاصل کی۔

جیسے خالق کی طرف سے ابراہیمؑ نے صرف اسماعیل کو اطلاع ہی نہیں دی بلکہ ان کی رضا بھی حاصل کی۔ فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ صرف اطلاع دیتے تو وہ خاموش رہتے، سن لیتے۔ نہیں! خود مختارانہ طور پر ان سے رضا حاصل کی:

"اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی"۔

''میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں، تمہاری کیا رائے ہے؟''

اب انہوں نے منظوری دی۔ اگر ابراہیمؑ صرف اطلاع دیتے تو قربانی فقط کارنامہ ابراہیمؑ ہوتی۔ جب اسماعیلؑ سے رضا لے لی تو قربانی دونوں کا کارنامہ بن گئی۔ باپ کا بھی، بیٹے کا بھی۔

10

حُجّتِ خدا

اصل مقصدِ جو خالق کا ہے وہ حجت خدا سے وابستہ ہے وہ حجت خدا کبھی نبوت کبھی رسالت کبھی امامت کے نام سے تمام ہوتی ہے۔

نبی کا جانشین اگر نبوت میں ہوتا تو نبی ہوتا رسول کا جانشین اگر رسالت میں ہوتا تو رسولؐ ہوتا مگر چونکہ نبوت کی جگہ ختم ہوگئی، رسالت کی جگہ ختم ہوگئی لہٰذا اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا نبوت و رسالت میں مگر امامت کا منصب وہ قیامت رہنے والا ہے لہٰذا جو جانشین ہوگا وہ امام کہلائے گا۔

ایک غریب کے لئے اس کا جھونپڑا اتنا ہی مسرت کا باعث ہوتا ہے جتنا ایک امیر کے لئے اس کا عالیشان محل۔

واقعہ کربلا کے بعد کوئی ظالم سوچ نہیں سکتا کہ یہ ہوتا تو یہ نہ سہہ سکتے میں کہتا ہوں کہ کیا رہ گیا جو اور کرتے اور کیا باقی رہا جسے یہ نہ سہہ سکتے۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

(اقبالؒ)

حُجّتِ خدا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ"

ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں بشارت دینے والے یعنی غیب کی خبریں پہنچانے والے، انذار کرنے والے یعنی عذاب کی خبریں دینے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔

چونکہ موضوعِ بیان میرا قرار دیا گیا ہے حجتِ خدا، تو اس لئے اس آیت کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا۔ حجت کے معنی لغت میں غلبے کے ہیں، غالب آنا اور دلیل کو حجت کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ ذہنی حیثیت سے غالب آنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی دوسرے آدمی کو اپنے نظریے میں شکست ماننا پڑتی ہے۔ اس لئے دلیل کو حجت کہتے ہیں۔ یہ منطق میں بھی اصطلاح ہے اور عرفِ عام میں عربی کے بھی یہ الفاظ اسی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور اسی لئے دلیل میں جو مقابلہ ہو، اُسے محاجہ کہتے ہیں۔

اب خالق پیغمبروں کے بھیجنے کا سبب یہ بتا رہا ہے کہ ہم نے یہ رسول کیوں بھیجے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کیلئے کوئی حجت نہ رہے۔ کیا مطلب؟ یعنی وہ اپنی کوتاہیوں کا، اپنی بداعمالیوں کا خدا کے سامنے یہ عذر نہ پیش کر سکیں ہمارا کوئی رہنما ہی نہ تھا۔ ہمیں کسی نے راستہ ہی نہیں بتایا۔ ہمارے لئے کوئی گمراہی سے بچانے والا نہیں تھا۔ تو اگر ہم نہ بھیجتے مرسلین کو تو خلقِ خدا کی حجت ہمارے مقابلہ میں تمام ہوتی کیونکہ مرسلین کو ہم نے بھیجا تو خلقِ خدا کی حجت تمام نہیں ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ ہماری حجت خلقِ خدا پر تمام ہو گئی کہ ہمیں سزا کیوں دی جا رہی ہیں؟ اب خالق کی طرف سے اُن کے سامنے یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ ہم نے تمہاری طرف رہنما بھیجے۔ ہم نے تمہاری طرف راستہ بتانے والے بھیجے کہ یہ تم نے عمل نہ کیا تو تم مستوجبِ سزا ہو۔

تو اس کی طرف کے رہنما جو پیغمبر تھے، وہ اس لئے آئے تھے کہ اللہ کی حجت خلق کے مقابلہ میں تمام ہو اور چونکہ وہ شے جو ذریعہ ہوتی ہے، دلیل میں غلبہ حاصل کرنے کا، اُس کو حجت کہتے ہیں، لہٰذا اس ہستی کو جس کی بدولت اللہ کی حجت تمام ہو، حجتِ خدا کہنے لگے۔

مگر یہاں ذرا سوچنے اور سمجھنے کی ایک بات ہے کہ خالق کہہ رہا ہے کہ پیغمبر اس لئے بھیجے کہ اللہ کی حجت تمام ہو۔ یعنی بغیر اس کے بھیجے ہوئے خلق کی حجت اللہ کے مقابلہ میں تمام ہوتی۔ مگر یہ خلق کی حجت کا تمام ہونا جس کو قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر مرسلین نہ بھیجتے تو ان کے پاس حجت ہوتی۔ یہ کس بنیاد پر ہے؟ اگر عدل کے قائل نہ ہوں؟ عدل کا مطلب یہ ہے کہ خالق ظلم نہیں کرتا۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ

اللہ کوئی نامناسب کام نہیں کرتا۔ تب تو خلق کی حجت اللہ کے مقابلہ میں بغیر مرسلین کے بھیجے ہوئے پوری ہو جائے گی لیکن وہ جماعت جو عدل کی منکر ہے، وہ تو کہتی ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ جب قادرِ مطلق تو جو چاہے کرے، جو وہ کرے، اس پر کسی کو سوال کا حق نہیں ہے کیوں کیا؟ جو بات وہ کرے، اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ چونکہ اُس نے کی ہے، لہٰذا ٹھیک ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو قہر وغلبہ کا اصول ہے، یعنی جس کی لاٹھی، اس کی بھینس۔ وہ لے جا کر الٰہیات میں مطابق کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ قادر مطلق ہے، اُس کے ہاں یہ سوال ہی کیا ہے کہ یہ صحیح ہے، یہ غیر صحیح۔ اس کی بناء پر خلقِ خدا کیا حجت کر سکتی تھی؟ خلقِ خدا کہے کہ تو نے انبیاء نہیں بھیجے، پھر بھی ہمیں سزا دے رہا ہے؟ وہ جواب میں کہے کہ میں مالک ہوں، جو چاہے کروں۔ میں قادرِ مطلق ہوں، جو چاہے کروں۔ لیکن خالق کہہ رہا ہے کہ اگر انبیاء بھیجتے تو ان کی حجت تمام ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق ایسا نہیں ہے کہ جو غلط کام کرے۔ خالق ایسا نہیں ہونا چاہئے جو ظلم کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ بتائے بغیر سزا دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہی عدلیہ نہیں ہیں، خالق بھی اُصولِ عدل کا حامل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبروں کو بھیجنے سے جو خالق نے اپنا مقصد بتایا، یہ کیا لفظِ پیغمبر سے تعلق رکھتا ہے؟ حضور! پیغمبر کے لفظ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق رہنمائی سے ہے۔ لہٰذا جو اس کی طرف سے رہنما ہو، وہ خواہ کسی نام سے ہو، وہ حجتِ خدا ہو گا۔

آدمؑ نبی تھے، تو اپنے دور میں حجتِ خدا تھے۔ جنابِ نوحؑ نبی سے آگے رسول تھے۔ رسالت جناب آدمؑ سے نہیں شروع ہوئی، جنابِ نوحؑ سے شروع ہوئی۔ وہ رسول تھے، اپنے دور میں حجتِ خدا۔ لقب بدل گیا حجتِ خدا ہونا باعتبار مقصدِ الٰہی، مشترک رہا۔ آدمؑ جو فقط نبی تھے، وہ بھی حجتِ خدا۔ نوحؑ جو نبی کے ساتھ ساتھ رسول بھی، وہ بھی حجت خدا۔ اس کے بعد جب نقطہ رسالت اور آگے بڑھا اور رسالت کے ساتھ امامت آئی، اب حضرت ابراہیمؑ ہوئے تو وہ بھی حجتِ خدا۔ اب جناب رسالت ختم ہو جائے، امام رہ جائے تو وہ بھی حجتِ خدا۔

میں یہاں کہہ دوں کہ وہ جتنے نعرے آپ لگاتے ہیں، وہ آپ ہی لگا رہے ہیں، ان میں خدا شریک نہیں ہے۔ مگر یہ نعرۂ صلوٰۃ جو ہوتا ہے، اس میں اللہ بھی شریک ہوتا ہے۔ تو جنابِ والا! اب نبی، رسول، امام، ان الفاظ کے اختلاف سے نہیں ہوتا۔ اصل مقصد جو خالق کا ہے، وہ حجتِ خدا سے وابستہ ہے۔ وہ حجتِ خدا کبھی نبوت کے نام سے تمام ہوتی ہے، کبھی رسالت کے نام سے تمام ہوتی ہے اور کبھی امامت کے نام سے تمام ہوتی ہے۔ نبوت ختم ہونے والی چیز، رسالت ختم ہونے والی چیز۔ جو لغوی معنی ہیں، وہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا۔ جب تک ایک بھی خبر ایسی رہ گئی ہو، جو نہ دی گئی ہو، اس وقت تک نبی کی ضرورت اور جب سب خبریں پہنچا دی گئی ہوں، تو نبی کی ضرورت ختم ہو گئی۔

رسول کے معنی پیغام پہنچانے والا۔ جب تک ایک بھی پیغام رہے جو نہ پہنچایا گیا ہو، اس وقت تک رسول کی ضرورت اور جب وہ آخری پیغام پہنچا دیا جائے جس کے بعد اللہ کہے کہ دین مکمل ہو گیا تو رسالت کا کام ختم۔ لہٰذا اس کے بعد کوئی رسول نہیں۔ لیکن امامت کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا۔ جب تک راستہ قائم ہے، راستہ چلنے والے موجود ہیں۔ تب تک امام کی بھی ضرورت ہے۔ جب تک جادہ قائم ہے۔ وہ باقی ہے۔ تب تک رہبر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ عہدہ ختم نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ نبوت ملی تو حضرت ابراہیمؑ نے

دستِ سوال نہیں پھیلایا، رسالت ملی تو دستِ سوال نہیں پھیلایا۔ جانتے تھے کہ ایک نقطہ پر ختم ہو جائیں گی۔ جب امامت ملی تو فوراً کہہ دیا:

"وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ"۔

اب ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں کہ نبوت شروع ہوئی حضرت آدمؑ سے۔ رسالت شروع ہوئی حضرت نوحؑ سے۔ امامت شروع ہوئی حضرت ابراہیمؑ سے۔ تو کیا حضرت ابراہیمؑ سے امامت شروع ہوئی اور یہیں ختم ہو گئی؟ شروع جو ہوتا ہے نقطہ، وہاں پر ختم تو نہیں ہوتا اور اب اسی سے آپ منصب کی بلندی دیکھئے کہ نبوت کا آغاز آدمؑ سے ہوا جہاں ترکِ اولیٰ کا امکان ہوا تو ارتقاء ہوتا چلا اور رسالت شروع ہوئی نوحؑ سے۔ وہ آگے بڑھی تو امامت کا استحقاق پیدا ہوا۔ اب امامت شروع ہوئی ہے اس سے جو نبی بھی ہے اور خلیل حق بھی ہے۔ اب اس سے امامت شروع ہوئی ہے اور جب امامت دی گئی تو خالق نے کہا کہ امتحان ہم نے لیا:

"فَاَتَمَّهُنَّ"۔

اس کا مکمل جواب طالب علموں کی زبان سے 100/100 نمبر۔ امتحان کے پرچے میں کون ممتحن 100 سے 10 دے دیتا ہے؟ ریاضی میں دے دیتے ہیں اور کہیں کچھ نہ کچھ ضرور کم کر لیتے ہیں مگر خالق کہہ رہا ہے: "فَاَتَمَّهُنَّ"۔ خالق جو کہہ رہا ہے اس میں مبالغہ تصور ہے؟ جو نقطہ حقیقت ہے، "مثقال ذرۃ" کا جاننے والا۔ ذرہ بھر کمی ہو، وہ تمامیت کی سند کیوں دے گا۔ اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ پورا پورا یعنی ذرہ بھر بھی کم نہیں۔ معلوم ہوا کہ نبوت میں ترکِ اولیٰ کی گنجائش، رسالت تک ترکِ اولیٰ کی گنجائش اور امامت جہاں سے شروع ہوئی، وہاں سے سو فیصد کامیابی، ترکِ اولیٰ کی بھی گنجائش نہیں۔

اب، جو ذات حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ہو اور کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر بہت سے مسلمان بحمد للہ اس ہستی کو جانتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ہے اور میں کہتا ہوں کہ وہ اُن کے القاب سے ظاہر ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، بڑی رفعت ہے، بڑی بلندی ہے۔ اللہ کا دوست۔ دیکھئے اور القاب جتنے ہیں انبیاء کے، ان میں خالق اور مخلوق کا فرق نمایاں ہے، مثلاً حضرت آدم صفی اللہ، یعنی اللہ کے چنے ہوئے۔ وہ چننے والا، ان کی بلندی یہ کہ ان کو اس نے چنا۔ حضرت نوحؑ نجی اللہ، اللہ کے نجات دیئے ہوئے۔ تو وہ نجات دینے والا اور یہ نجات پانے والے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ، اس سے ہمکلام ہونے والا۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا شرف یہ کہ اُس سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ لیکن خلیل اللہ، خلیل اللہ کے معنی اللہ کے دوست۔

یاد رکھئے کہ دوست کا رشتہ برابر کا ہے۔ یہ اُس کا دوست ہی ہے۔ تو اب بندے کی اس سے بڑھ کر بلندی کیا ہوگی کہ اللہ مقامِ لفظ میں سہی مگر اسے اپنے برابر کی سطح دے دے۔ یہ اس کا دوست، وہ اس کا دوست تو اب یہ رفعت حضرت ابراہیمؑ کی نمایاں ہے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ سے بالاتر ذات وہ حبیب اللہ۔ کوئی کہے کیا ہوا، درجہ تو اونچا تو نہیں ہوا۔ لفظ بدل گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اُردو زبان کی کوتاہی ہے۔ ہمارے ہاں خلیل اللہ کا ترجمہ بھی اللہ کا دوست اور حبیب اللہ کا ترجمہ بھی اللہ کا دوست۔ مگر خلیل میں مضمر ہے طالب ہونا اور حبیب میں مضمر ہے مطلوب ہونا۔ یعنی خلیل وہ ہے جو دوسرے کو چاہے اور حبیب وہ ہے جسے دوسرا چاہے۔

دوست جب ایسے ہوں، ایک ہو طالب، ایک ہو مطلوب تو بڑا فرق ہو جاتا ہے دونوں دوستوں میں۔ برتاؤ میں بھی فرق ہو جاتا ہے اس سے۔ دوستی کے تقاضوں سے کون واقف نہیں۔ کوئی ایسا ہو، آپ اُس سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہوں تو اس سے برتاؤ اور ہوگا اور کوئی وہ ہو جو آپ سے محبت بڑھانا چاہتا ہو۔ اس سے برتاؤ اور ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ نے ماشاء اللہ کوئی مکان تعمیر کیا ہے۔ ایک غریب کیلئے اس کا جھونپڑا اُتنا ہی مسرت کا باعث ہوتا ہے جتنا ایک امیر کیلئے اس کا عالیشان محل۔ بہرحال حسب حیثیت جیسا چاہے، ایک مکان بنوایا۔ کوئی ایسا ملا کہ جس سے آپ محبت بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ نے کہا کہ میں نے مکان بنوایا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آپ بھی دیکھیں۔ یہ آپ نے مکان بنوایا ہے اور دل چاہتا ہے کہ وہ دیکھ لیں اور وہ کہتے ہیں کہ مجھے فرصت نہیں ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جس وقت کہیں، میں سواری بھیج دوں گا، سواری پر آجایئے گا۔ یہ ہوگا برتاؤ اس سے جس سے آپ تعلقات محبت کو بڑھانے کے طلبگار ہوں اور کوئی ایسا ہے جو آپ سے محبت کے تقاضے کو بڑھانا چاہتا ہے۔ خواہ کسی وجہ سے۔ خواہ الیکشن کا موقع قریب آنے والا ہے۔ اس کی بناء پر آپ سے وہ محبت بڑھانا چاہتا ہے۔

تو مکان آپ نے بنوایا ہے۔ اب وہ کہے گا کہ سنا ہے کہ ماشاء اللہ آپ نے ایک مکان تعمیر کروایا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی دیکھیں۔ لیجئے! اب اُن کا دل چاہنے لگا اور اب آپ کہتے ہیں کہ میں تو مکان پر کم رہتا ہوں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ جس وقت کہئے، اُس وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ نے بددلی سے کہہ دیا اچھا صاحب! فلاں وقت آجایئے گا۔ اب وہ آئے تو جیسے آپ بھول گئے۔ کہا: کیسے آئے؟ کہنے لگے: آپ کا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مکان کھول دیا۔ فرض کیجئے، کئی طبقے ہیں اور انہوں نے ادھر اُدھر سے دیکھا۔ آپ نے کہا: بس دیکھ لیا آپ نے؟ تشریف لے چلئے۔ یہ وہ دوست ہے، جو طلبگار ہے اور وہ پہلا دوست جو مطلوب تھا۔ آپ نے کہا تھا وقت پر سواری بھیجدوں گا۔ اب وقتِ معین پر سواری موجود، نمائندہ موجود۔ وہ ہیں کہ جیسے سوئے ہوئے ہیں۔ کوئی طالب ہو تو بھلا سوتا ہوگا؟ ٹہلتا ہوگا، کروٹیں بدلتا ہوگا۔ مگر وہاں آرام کی نیند ہے۔ اب جگایا جاتا ہے۔ کہا: کیوں اور کیسے؟ کہا بلایا ہے، سواری بھیجی ہے۔ کہا: اچھا صاحب! سواری بھیج دی ہے تو خیر چلتے ہیں۔

اب چلتے ہیں تو بہت سے طبقے ہیں۔ یہ ہر منزل پر رُک کے جاتے ہیں۔ وہاں کہا جاتا ہے، بڑھیے، اور بڑھیے، اور بڑھیے۔ آزادی کے ساتھ صاف الفاظ میں عرض کردی، اس لئے کہ آپس میں بات کا ذکر تھا کہ میرا دوست ہے، آپ کا دوست ہے، کوئی طلبگار ہے، کوئی مطلوب ہے۔ لیکن اب خالق اور انبیاء و مرسلین کی منازل میں میں کچھ اپنی جانب سے عرض کردوں گا۔ وہ کسی کی کیا مجال لیکن میں کیا کروں، جب قرآن برتاؤ بتا رہا ہے دونوں دوستوں کے ساتھ۔ وہ دوست کہ جو طلبگار ہے، طالب ہے، وہ قرآن کہہ رہا ہے، اس کی روداد سنئے کہ عرض کررہے ہیں بارگاہِ الٰہی میں:

"اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى"۔

"پروردگار! مجھے دکھلا کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے"۔

یاد رکھئے کہ گر ہم تصور بھی کریں کہ ایمانِ حضرت ابراہیمؑ میں ذرہ برابر خامی تھی تو کفر ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ غور کیجئے۔ الفاظ

ابراہیم کب کسی بے اطمینانی کی یا شک کی خبر دے رہے ہیں؟ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دکھلا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ کیفیت اسی شے کی پوچھی جاتی ہے جس کا وقوع مانا ہوا ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ دکھلا کہ زندہ کرتا ہے بھی یا نہیں۔ کہتے ہیں کہ کیونکر زندہ کرتا ہے؟ معلوم ہوا کہ زندہ کرنا تسلیم۔

میں مانتا ہوں کہ تو زندہ کرتا ہے، مگر دیکھنا مقصود ہے کہ کیونکر زندہ کرتا ہے اور تمنا کیا ہے؟ مطلق ''اَرِنی'' نہیں کہا ہے جس کے معنی اللہ کا دیدار ہے۔ اس لئے کسی طور کو یہاں سرمہ نہیں بنانا ہے۔ مجھے دکھلا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ بس ایک لفظ تو یہیں سے یاد رکھئے۔ ایک آیت الٰہی کے دیکھنے کی تمنا ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانی قدرت۔ تو مردوں کو زندہ کرنا کیا ہے؟ اللہ کے کرشمہ قدرت کا ایک ظہور ہے۔ تو ایک آیتِ الٰہی کے دیکھنے کی تمنا ہے۔ یہ خالق سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے دکھا کہ مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے اور اِدھر سے فرمائش کی تکمیل ہوگی۔ مگر بیچ میں سوال کرلیا جاتا ہے:

''قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ''۔

معنی سمجھ میں نہیں آئیں گے اگر دوستی کے رشتے کو نکال دیجئے بیچ میں سے۔ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ادھر انہوں نے یہ فرمائش کی اور اُدھر محبوب نے تبسم زیر لب کے ساتھ کہا: کیا ایمان میں کوئی کسر ہے ابھی؟ لیجئے! اب یہ عبودیت ہے کہ ایمان میں کمی کے تصور سے لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ گھبرا کر کہتے ہیں: ''بلٰی''، کیوں نہیں۔ یعنی ایمان کیوں نہیں ہے، ایمان تو ہے ہی۔ اب جو ترجمہ میں کروں، اُس کے نتیجہ کا میں ذمہ دار ہوں۔ ''بلٰی''، کیوں نہیں، ایمان تو یقینی ہے۔

''وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ''۔

''لیکن کیا کروں، دل بیقرار کو قرار آجائے''۔

بس مشاہدے کو دل چاہتا ہے کہ تیرا ایک کارنامہ دیکھوں آنکھ سے۔ تو وہ مشکل تو تھا نہیں قدرتِ الٰہی کیلئے۔ کوئی نارو التجا نہ تھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ شاید مجمع میں شاعر بھی ہوں گے۔ شاعروں کے کلام پر نظر بھی ہوگی کہ یہ تو صرف دوستی کے تقاضے کے بیچ میں ایک سخن گسترانہ گفتگو ہوگئی تھی اور ذرا آتش اشتیاق کو تیز کر دیا گیا۔ اب خلیل کی فرمائش کی تعمیل ہوتی ہے۔ دوست کی التجا کو یوں پورا کیا جاتا ہے، وہ کیونکر:

''قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؁''۔

''ارے دیکھنا چاہتے ہو مردے کیونکر زندہ ہوتے ہیں تو مشکل کیا ہے، چار طائر لے لو، ان کے ٹکڑے کر دو۔ ان کو مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر پکارنا، وہ سب تمہاری آواز پر آجائیں گے۔ پس سمجھ لو کہ ہم بھی مردوں کو یونہی زندہ کر دیتے ہیں۔ جاؤ جواب ہوگیا، سمجھ لو کہ اللہ قادر ہے اور حکیم ہے۔''

لیجئے! یہ ہے اس خلیل سے دوست کے ساتھ برتاؤ جو طالب ہے اور اب جو حبیب ہے، اس کے ساتھ برتاؤ:
مخاطب کیا گیا ہے۔ اب ان کے بعد کوئی نہیں مخاطب ہوگا۔ مگر یہ ہیں نبی اور رسول بلکہ اس کے ساتھ امام بھی ہیں۔

اب مختلف حالات میں کچھ ہنگامی جگہیں، کچھ ہنگامی پوسٹیں مقرر ہوتی ہیں، مثلاً خدانخواستہ اگر جنگ ہو جائے تو زمانہ جنگ میں کچھ خاص ایسے محکمے قائم ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں نہیں ہوتے۔ یا ہمارے ہاں ایمرجنسی لاگو ہوئی تھی، وہاں کی زبان میں بات کر رہا ہوں، ایمرجنسی لاگو ہوئی تھی تو اس موقعہ کے اوپر بہت سے ظاہر ہے کہ محکمے ایسے بھی تھے جو اب ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد نہیں رہے۔ کیوں نہیں رہے؟ اس لئے کہ کام ختم ہو گیا۔ جب کام ختم ہو گیا تو اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا۔

ارے پوسٹ ہی نہیں رہی تو جانشین کا کیا سوال؟ آپ کے ہاں فوجی حکومت ہے تو فوجی حکومت کے تقاضوں سے کچھ محکمے ہوں گے جو شاید جمہوریت قائم ہونے کے بعد باقی نہ رہیں۔ کیوں قائم نہ رہے؟ کیا اس لئے کہ آدمی اس لائق نہیں رہے؟ نہیں، آدمی وہی ہیں جو اس وقت تھے لیکن کام ختم ہو گیا۔ اس لئے وہاں پوسٹ پر کوئی نہیں ہوگا۔ بس یونہی نبی، میں نے کہا کہ کام ہے ختم ہونے والا۔ جب تک ایک خبر بھی باقی ہے، نبی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا نبی کا عہدہ ختم ہو گیا تو نبوت میں کوئی جانشین نہیں ہوگا اور جانشین نبوت میں ہوتا تو نبی ہی کہلاتا۔ اس لئے کہ جب صاحب جائیں تو ایک دن کیلئے بھی اس کرسی پر کوئی نائب بیٹھے تو وہ صاحب ہی کہلائے گا۔

وائس چانسلر جائیں اور پرو وائس چانسلر قائم مقام کے طور پر کام کریں تو اب ان کو پرو وائس چانسلر نہیں کیا کہا جائے گا، پرو وائس چانسلر لکھنا ان کی توہین ہوگا۔ تو جو قائم مقام ہو، اس کا لقب وہی ہوگا جو اس کا ہے جس کا وہ قائم مقام ہے۔ تو نبی کا جانشین اگر نبوت میں ہوتا تو نبی ہوتا۔ رسالت کی جگہ ختم ہو گئی، لہٰذا اب کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا نبوت میں۔ کوئی جانشین نہیں رکھا جائے گا۔ رسالت میں مگر وہ امامت کا منصب تا قیامت رہنے والا ہے۔ لہٰذا اب جو جانشین ہوگا، وہ امام کہلائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ موضوع جو رکھا گیا ہے، حجتِ خدا، وہ لفظ میں نے کہا کہ آدم سے لے کر ہر ایک پر منطبق ہے مگر ذہن میں موضوع رکھنے والوں کے وہ اپناہ دور ہوگا، لہٰذا میں سلسلہ بیان کو قاعدے کے مطابق اس نقطے تک لے گیا، امامت کی منزل تک۔ اب اس کے بعد بحمد اللہ ایک منزل اور ہے۔ لہٰذا وہ اصل مقصد جو ہے، وہ کل آپ کے سامنے پیش ہوگا۔ یہیں چونکہ مجلس ہے، تقریر تو ہے نہیں کہ اتنی بات پر ختم ہو جائے تو جناب میرے لئے کوئی فضائل سے مصائب کی منزل دور نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ سب دست و گریباں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نبوت سے بالاتر رسالت اور رسالت سے بالاتر امامت۔ نبوت میں ہمارے سامنے قرآن کی نظیر ہے کہ گہوارے کا بچہ کہتا ہے:

"اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا"۔

میں اللہ کا بندہ ہوں، حضرت عیسیٰؑ کی آواز گہوارے سے، میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور مجھے اس نے نبی بنایا ہے۔ بنائے گا نہیں، ماضی، مجھے اس نے نبی بنایا ہے۔ تو حضور! اگر گہوارے کا بچہ کہے کہ مجھے نبی بنایا ہے تو اب سمجھ لیجئے کہ اللہ کے بنائے ہوئے عہدوں میں عمر کی قید نہیں ہوتی۔ اب اگر چار یا پانچ برس کے بچوں کیلئے رسول فرما دیں۔

"اِبْنَایَ هٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"۔

"یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں اور چاہے بیٹھے ہوں۔"

تو قرآن کے کسی ماننے والے کو تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ چار پانچ برس کے بچے امام کیسے ہوں گے! اب تمام اُمت کی زبان میں بات کروں کہ اگر گزشتہ اُمت میں گہوارے کا بچہ نبی ہو سکتا ہے تو خیر الامم میں چار پانچ برس کے بچے امام کیوں نہیں ہو سکتے؟

تو امام کہنے میں کوئی حیرت نہیں۔ مگر اس وقت میں یہ حدیث سنتا تو ایک جملے کی معنی میری سمجھ میں نہ آتے، بات ختم ہو جاتی ہے کہ میرے دونوں بچے امام ہیں۔ جملہ مکمل ہو گیا۔ یہ اس میں کیا اضافہ کہ چاہے کھڑے ہوں، یہ انسان کے حالات ہیں، کبھی کھڑا ہوتا ہے، کبھی بیٹھتا ہے، کبھی جاگتا ہے، کبھی سوتا ہے، اس کو امامت میں کیا دخل؟ مگر جب مستقبل نے پردہ ہٹایا، ماضی بن گیا تو میری اب سمجھ میں آتا ہے کہ رسولؐ نے جب فرمایا تو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے ماضی کے نقشے میں مستقبل کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔ آپؐ دیکھ رہے تھے کہ میرے ان دونوں بچوں کا طرزِ عمل ظاہری نگاہوں میں مختلف ہوگا۔ ایک صلح کر کے بیٹھ جائے گا، ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا۔ کچھ لوگ اس کی صلح پر معترض ہوں گے، کچھ لوگ اس کی جنگ پر معترض ہوں گے۔ اس لئے رسولؐ نے فرما دیا کہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں، چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں، یعنی حسن صلح کر کے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا، حسین تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو اعتراض نہ کرنا۔ تو اُٹھنا بھی خدا کے حکم سے ہے، یہ بیٹھنا بھی خدا کے حکم سے ہے۔ وہ بھی امامت کا ایک انداز ہے، یہ بھی امامت کا ایک شیوہ ہے۔

پروپیگنڈے سے دنیا واقف ہے۔ حکومت کا ایک پروپیگنڈہ تھا، حکومت کا ایک پروپیگنڈہ تھا، بنی اُمیہ کی طرف سے کہ دونوں بھائیوں کے مزاج میں پہلے سے بہت اختلاف تھا۔ وہ بھائی صلح پسند تھے کہ باپ کو بھی جنگِ صفین سے روکتے تھے کہ خونریزی نہ کیجئے اور یہ ایسے جنگ پسند تھے کہ بھائی کی صلح کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ یہ کرتب ہوتے ہیں سیاست کے کہ بھائیوں میں اختلاف دکھایا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے۔ وہ دنیا جو کہتی ہے کہ امام حسن علیہ السلام صلح پسند تھے اور امام حسین علیہ السلام جنگ پسند تھے تو کیا حضرت امام حسینؑ نے صلح کی کوشش نہیں کی تھی؟ یہ تو مخالف فریق کا طرزِ عمل ہے کہ اُس نے ان کی شرائط سب مسترد کر دیں۔ وہاں صورتحال یہ ہے کہ اُدھر سے سادہ کاغذ آ گیا تھا کہ جو شرائط چاہیں، لکھ دیں، ہمیں منظور ہیں۔ یہاں شرائط پیش کر رہے اور اُدھر سے مسترد ہو رہی ہیں۔ اب جیسے 2 اور 2 کا مجموعہ 4 ہے، سمجھدار بچے سے میں پوچھتا ہوں کہ اگر شرائط اُدھر سے منظور ہو جاتیں تو کربلا کی تاریخ صلح پر ختم ہوتی یا جنگ پر؟ تو اب کسی کو کیا حق ہے کہ اُن کو شہزادۂ امن کہے اور ان کو شہزادۂ جنگ کہا جائے؟

نہیں! دونوں شہزادۂ امن ہیں، فرق کا احساس ہے۔ دونوں شہزادۂ جنگ ہیں۔ وقت کے تقاضے دیکھئے اور دیکھئے کہ رسولؐ نے تو حدیبیہ میں صلح کی تھی۔ اس وقت پورا موضوع نہیں عرض کرتا ہے۔ دی ہوئی شرائط پر کہ جو وہ کہہ رہے تھے، وہ مان رہا تھا اور انہوں نے جو صلح کی ہے، وہ کیسی شاندار! پہلی شرط یہ ہے کہ امیرِ شام کو کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ ماشاء اللہ! مجمع میں قانون دان حضرات بھی ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شرط رکھ کر ایک طرف حسن مجتبیٰ نے یہ بات صاف کر دی کہ ہماری نزاع حکومت شام کے خاندانی ہے، نہ قبائلی۔ ہماری نزاع اصولی ہے۔ لہٰذا اگر کبھی جنگ بھی ہو جائے تو اسے خاندانی جنگ نہ کہنا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے یہ شرط رکھی اور گویا اقرار لے لیا کہ ابھی تک جو ہو رہا ہے، وہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ اب سینکڑوں وکیل کتابیں لکھتے رہیں صفائی

میں کہ اُن کی خلافت مثلِ خلافتِ راشدہ تھی۔

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے خود مان لیا کہ اب تک جو ہو رہا ہے، وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ کوئی کہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے مانا؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ جو شرائط لکھئے، وہ مجھے منظور ہیں اور یہ مانا کہ اس کا ثبوت یہ کہ صلح ہو گئی۔ اگر مانا نہ ہوتا تو صلح نہ ہوتی۔ تو اب انہوں نے تو ایسی شاندار صلح کی اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے کیا موقف تھا؟ حضرت امام حسینؑ کے سامنے یہ موقف تھا کہ یزید طالب بیعت ہے۔ بیعت اطاعت کا غیر مشروط اقرار ہے۔ تو اب تمام عالم اسلام میں ان کی شخصیت بہت مانی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں اس ملک میں تو بہت ہی اہمیت رکھتی ہے شخصیت ڈاکٹر اقبال کی، تو ڈاکٹر اقبال کی زبان میں:

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا میں آئے تو تھے ہجرت کے تین چار سال گزرنے کے بعد۔ لیکن آدم کے وقتِ اول سے لے کر حسینؑ اور یزید کے درمیان جنگ قائم تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کا یہ مطلب ہے کہ اقبال کی زبان میں ہر دور کا حق پرست رمزی طور پر حسین ہے اور ہر دور کا باطل پرست رمزی طور پر یزید ہے۔ تو اب اس اصطلاحِ اقبال کو سامنے رکھ کر جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر غور کیجئے کہ میں کہتا ہوں کہ ان سے پہلے کسی دور کے حسینؑ نے کسی یزید کی بیعت نہیں کی۔ موسیٰ ؑ نے فرعون کا کہا مان لیا ہوتا تو جلا وطن کیوں ہوتے۔ ابراہیمؑ نے نمرود کا کہا مان لیا ہوتا تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے اور ہمارے رسولؐ نے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کا کہا مان لیا ہوتا تو 13 برس جسم مبارک پر پتھر کیوں کھاتے؟ تو پھر کہوں گا کہ کسی دور کے حسینؑ نے کسی دور کے یزید کی بیعت نہیں کی۔

تو ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں۔ اب میں یہاں کہتا ہوں کہ آج کا موسیٰ ؑ، آج کا ابراہیمؑ، آج کا محمد مصطفیٰؐ، اپنے وقت کے فرعون ونمرود وابوجہل کی بیعت کیوں کرے گا؟ تو میں کہتا ہوں کہ امام حسینؑ نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ انہوں نے وہی کیا جو اُنؑ کے بزرگ، انؑ کے اسلاف ہمیشہ کرتے آئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ایک اور بات کہتا ہوں کہ واقعہ کربلا کی مثال نہ اولین میں ہے اور نہ آخرین میں۔ تو کوئی کہے گا کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ ابھی تو یہ کہا کہ کوئی نیا کام نہیں کیا۔ کیا وہی جو ان کے اسلاف نے کیا اور اب کہا جا رہا ہے کہ اس کی مثال نہ اولین میں ہے، نہ آخرین میں۔

میں کہتا ہوں کہ بالکل میں نے دونوں باتیں سمجھ کر کہی ہیں۔ انہوں نے وہی جو ہمیشہ اُنؑ کے آباؤ اجداد نے کیا، اسلاف نے کیا تھا مگر ہوا ان کے ساتھ جو، وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کو یوں عرض کرتا ہوں کہ ہمیشہ ظلم کے دل میں کچھ حسرت رہ گئی اور صابر کے متعلق کچھ غلط فہمی دنیا کو باقی رہ گئی۔ ظلم کے دل میں حسرت یہ کہ اتنا ہم نے کیا، اتنا اور کرتے تو انہیں راہِ حق سے ہٹا دیتے۔ یہ تو ظلم کی حسرت رہ گئی۔ صابر کے متعلق یہ غلط فہمی رہ گئی کہ ہم نے اتنا کیا تو برداشت کر گئے، اگر اتنا اور کرتے تو پھر آدمی تھے، بشر تھے، پھر برداشت نہ کر سکتے۔ یہ حجت حسینؑ نے کربلا میں ختم کر دی۔ اب ظالم سوچ نہیں سکتا کہ ہم یہ کرتے اور صابر کے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی کہ یہ ہوتا تو یہ نہ سہہ سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا رہ گیا جو اور کرتے اور کیا باقی رہا جسے یہ نہ سہہ سکتے؟

11

حُجّتِ خدا

نبوت ورسالت کی جانشین کے کوئی معنی نہیں ہاں امامت ہے کہ جو برقرار ہے لہٰذا امامت میں جو جانشین ہوگا وہ امام کہلائے گا اور یہ سلسلہ قیامت تک قائم ودائم رہے گا۔

دریائے محمدؐ وآل محمدؐ میں اپنے دین کی کشتی کو ڈال دیجئے پھر جتنا ظرف میں صلاحیت ہوگی مل جائے گا۔

ارشاد خداوندی ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے جو غیب پر ایمان لائیں، یاد رکھیے غیب پر ایمان لائے بغیر دین کی بنیاد قائم ہی نہیں ہوسکتی۔

میں کہتا ہوں دنیا اپنے گریباں میں منہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھتی گیارہ کے ساتھ کیا کیا جو کہتے ہو بارہواں کیوں غائب ہوا۔

غیب وہ نہیں ہے جو ہو ہی نہ، غیب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے ہو غیب ایک ثبوت اور ایک نفی سے مل کر بنتا ہے یعنی ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔

حُجّتِ خدا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ"۔

چھٹے پارے کی آیت ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغمبر ہم نے بھیجے ہیں مبشر اور منذر یعنی خوشخبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے، اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ اگر یہ نہ بھیجے جاتے تو لوگوں کو پاس حجت ہوتی۔ اب یہ بھیج دیئے گئے تو اب اللہ کے پاس حجت ہوگئی اور اس لئے ان ہستیوں کو حجتِ خدا کہتے ہیں۔ حجتِ خدا وہ ہے جو خالق کی طرف سے رہبری کیلئے مقرر ہو۔ پہلے اس کا نام نبی ہوا، وہ حجتِ خدا بنام نبی رہا۔ پھر اس کا نام رسول ہوا، حجتِ خدا بنام رسول رہا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے اس کا نام ان کے ساتھ تبدیل ہوا یعنی نبی بھی تھا، رسول بھی تھا اور اب امام ہوا۔

یہیں یہ جز وکل میں نے عرض کیا تھا کہ نبی ہوئے ہیں۔ ایسے جو کسی ایک قوم کے لیے نبی ہیں۔ رسول ہوئے ہیں ایسے جن کی رسالت محدود ہے، کسی ایک دائرے میں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ السلام کے لیے، حالانکہ وہ اولوالعزم رسول ہیں مگر تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے دائرے میں تھی۔ بنی اسرائیل کے لیے وہ رسول تھے۔ اس دائرے کے باہر ان کی رسالت نہیں تھی اور اسی لئے حضرت خضر ان کے دائرہ رسالت سے باہر تھے۔ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ تو نبی جنات کے لئے ہوئے ہیں۔ رسول وہ کسی ایک قسم کے لئے، کسی ایک قبیلہ کے لئے ہوئے ہیں۔ امامت جہاں سے شروع ہوئی تو:

"اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا"۔

"میں تمہیں تمام انسانوں کا امام بناتا ہوں"۔

اب انسان کسی بھی خطہ ارض پر ہوں، کسی بھی زمین پر ہوں بلکہ کسی بھی جہاں میں انسان بستے ہوں تو ان سب کے لئے امام اور جب امامت آگے بڑھ کر خاتم المرسلین تک پہنچی تو اب "لِلنَّاس" کے لفظ میں ارتقاء ہوا۔ وہاں تھا "لِلنَّاس" کیا کہا: "رَحۡمَۃً لِّلۡعَالَمِیۡنَ"۔ یہ رحمت ہیں تمام عالمین کے لئے۔ اب یہ عالمین کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اسے اس سے سمجھ لیجئے کہ اپنی ربوبیت کی حدود جب بتائے تو یہی کہا:

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ"۔

"حمد ہے اللہ کے لئے جو تمام عالمین کا رب ہے"۔

اور ان کو کہا:

"وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ"۔

اس کا مطلب ہے جہاں تک خدا کی خدائی، وہاں تک ان کی بحیثیت رسول رہبری۔ اب حضرت ابراہیمؑ سے تو آغاز ہوا تھا۔ وہاں پر اس نقطے میں امامت ''للناس'' تھی تو ان کے براہِ راست جو نائب ہوئے، وہ نائب بھی ''للناس'' ہوئے، صرف انسانوں کے لئے ہوئے اور جب امامت بڑھ کر لعالمین کے دائرہ تک پہنچ گئی تو اب جو نائب ہوں گے، وہ سب عالمین کے لئے ہوں گے۔

اب میں نے کل عرض کیا، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ نبوت ختم ہوجانے والی شے ہے، اس لئے نبوت میں جانشین کوئی نہیں ہوگا۔ رسالت ختم ہوجانے والی چیز ہے، لہٰذا رسالت میں کوئی جانشین نہیں ہوگا۔ اب معلوم نہیں کہ دنیا کس کے جانشین کی تلاش میں ہے۔ رسول کا جانشین ڈھونڈ رہی ہے یا نبی کا جانشین ڈھونڈ رہی ہے؟ تو جلسہ ختم ہوگئی، کیا اس کا الیکشن ہوتا ہے؟

تو نبوت کی جانشینی کے کوئی معنی نہیں، رسالت کی جانشینی کے کوئی معنی نہیں۔ ہاں! امامت ہے کہ جو برقرار ہے، لہٰذا امامت میں جو جانشین ہوگا، وہ امام کہلائے گا۔ اب تمام مسلمان متفق ہیں کہ ہمارے رسولؐ آئے تو سب کے بعد۔ لیکن ہر نبی، ہر رسول اپنے دور میں ان کی اطلاع دیتا رہا۔ آدمؑ سے لے کر ہمارے رسولؐ کے قبل تک ہر ایک ادھر کا رہنما آخری رسول کے آنے کی اطلاع دیتا رہا خبر دیتا رہا اور خبر ہی نہیں دیتا رہا بلکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی اُمتوں سے عہد و پیمان لیتے رہے کہ اس آخری رسولؐ کو مانو گے۔ اس آخری رسولؐ کو تم تسلیم کرو گے۔ تو یہ ہے کہ ہر نبی اس آخری رسولؐ کی خبر دیتا رہا، تو اب پیغمبرِ خدا کے بعد وحی کا دروازہ بند ہے۔ لہٰذا جو کچھ اس کے پیغام ہوں، وہ انہیں پہچانا ہیں۔ لہٰذا اب ان کو اپنے بعد تک کا سب کا تعارف کروا دینا چاہئے کہ میرے بعد کون لوگ ہوں گے۔

اب یہاں علم الغیب کی بحث نہیں آسکتی، اس لئے کہ گزشتہ دور کے انبیاء علم الغیب اگر نہیں رکھتے تھے تو آخری رسولؐ کی خبر کیوں دے رہے تھے؟ تو ان سے افضل جو ذات ہے، وہ اگر قیامت تک کے رہنماؤں کی اطلاع دے دے!

آدمؑ واقف ہو سکتے ہیں محمد مصطفیؐ کے نام سے، نوحؑ ان کے نام سے واقف ہو سکتے ہیں، عیسیٰؑ واقف ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں موجود ہے:۔

"وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ط"۔

انہوں نے کہا بشارت دیتا ہوں ایک ایسے رسول کی جس کا نام احمدؐ ہوگا۔

اسی قرآن میں احمد کے ساتھ غلط کا لفظ نہیں ہے کہ احمدی ہے۔ تو عیسیٰ نام جانتے تھے۔ تو جو فخر عیسیٰ ہو، جو حضرت ابراہیم کا فخر ہو، کوئی کہے کہ یہ تو آلِ ابراہیمؑ میں سے ہیں تو ابراہیم کا فخر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ میں کہتا ہوں کہ ابراہیمؑ بھی تو اولادِ آدمؑ میں سے ہیں۔ اگر وہ ابراہیمؑ، آدمؑ کی اولاد کا فخر ہو گئے تو یہ آلِ ابراہیم کا فخر ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

تو جو اُن سے افضل و برتر ہے، وہ اگر بعد کے افراد کا نام بتادے، سب کا نام بہ نام تصریح کردے تو اس میں کسی کو، قرآن کے ماننے والے کو، ارے اپنے رسولؐ کی رسالت کو ماننے والے کو، چونکہ ان کی خبر تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے دی تھی، اگر ان سب کو مان لیا تو اگر یہ اپنے بعد والے افراد کے نام بتادیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آدمؑ سے لے کر ان کے پہلے تک کے جتنے تھے، وہ محمدِ اول کا نام بتاتے رہے اور جو پہلا محمدؐ آیا، وہ اپنے آخری ہمنام کی اطلاع دیتا ہوا آیا، اب یہ حدیث، بغیر نام کی گنتی والی تو

بالکل متفق علیہ صحاح ستہ میں بھی ہے اور غیر صحاح ستہ کتنی مستند کتابوں میں بھی ہے کہ پیغمبرِ خدا نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد بارہ سردار ہوں گے۔ کہیں بارہ سردار، کہیں بارہ جانشین۔ اثناء عشر خلیفہ، میرے بعد بارہ جانشین، یہ بھی الفاظ ہیں۔

ایک عیسائی نے صحاح وسنن کے تمام کی فہرست مرتب کی ہے یورپ میں۔ اس میں اثناء عشر کے لفظ کے تحت اُس نے ان تمام حدیثوں کے حوالے درج کر دیئے ہیں جس میں کہیں بارہ سردار، کہیں بارہ خلیفہ لکھا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ کہ حضرتؐ نے اطلاع دی۔ اب اس کے بعد کہیں ہے:

"كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْش".

''وہ سب قریش میں سے ہوں گے''۔

اور میری نظر سے گزرا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"كُلُّهُمْ مِنْ وُلْدِ فَاطِمَة".

'' وہ سب فاطمہؑ کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے ''۔

بہر حال وہ بارہ جانشین تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور اب کوئی زیادہ مطالعہ کرے تو اسے بائبل میں بھی بارہ سردار ملیں گے اولادِ اسماعیل میں سے۔ قرآن کہہ رہا ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل میں بارہ اسباط تھے اور ان کی بائبل بتارہی ہے کہ اسماعیل کی اولاد میں بارہ سردار ہوں گے۔ اب اسماعیل کی اولاد وہ بنی اسرائیل سے الگ ہے۔ وہ تو ہمارے رسولؐ سے شروع ہوئی ہے۔ اسماعیلؑ کی اولاد کے وہ افراد جن سے دنیا متعارف ہے، وہ تو ہمارے رسولؐ سے شروع ہوتے ہیں۔ تو وہاں ہے بارہ سردار، بائبل میں بھی ہے بارہ سردار اس کی اولاد میں سے یعنی اسماعیلؑ کی اولاد میں سے مقرر کروں گا۔

اب ہمارے رسولؐ فرمارہے ہیں کہ بارہ سردار ہوں گے یا بارہ جانشین میرے ہوں گے۔ جمہور نے جو فہرستیں مقرر کی ہیں یعنی مسلمانوں کی اکثریت، اسے ہم جمہور کہتے ہیں تو اس نے جو فہرستیں مرتب کیں تو ایک حد بندی کی راشدین کی، تو وہ چار سے آگے نہ بڑھے۔ راشد، غیر راشد کو ملالیا تو درجنوں ہوگئے۔ غرض اکثریت کو بارہ سرداروں کے خواب کی تعبیر نہ ملی۔ بارہ کسی طرح نہیں ہوتے یا چار ہی ہوتے ہیں اور یا بہت ہوجاتے ہیں۔ بارہ تو ایک درجن ہوتا ہے۔ میں نے تو کہا کہ بہت درجن۔ تو اب یہ بارہ کہاں سے ملیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہی ہاتھ سے چلی گئی ہے تو وہ سلسلہ کہاں سے ملے؟

اب بحمد للہ ہم کو معلوم ہے یعنی دنیا کو، اب میں کہتا ہوں کہ احسان ماننا چاہئے اس جماعت کا جو کوئی سے بارہ پیش کر سکے۔ رسولؐ کی سچائی کے ثبوت کے لئے۔

بحمد للہ وہ افراد جنہیں ہم جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں بقدرِ امکان جتنا کہ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے، ورنہ دنیا خدا کو کب پہچانتی ہے؟ پھر بھی خدا کو مانتی ہے۔ رسولؐ کو ان کے حقیقی مرتبے کے ساتھ کون پہچانتا ہے؟ پھر بھی مانتا ہے تو اگر مکمل پہچاننا شرطِ ایمان ہو تو کوئی خدا پر ہی ایمان نہیں رکھتا، اس لئے کہ مکمل معرفت خدا کی کس کو ہے؟ ہم اور آپ کیا ہیں؟ جس نے ہم کو ایمان کی بھیک دی، وہ کہتا

ہوا دنیا سے گیا:

"مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"۔

''ہم نے تجھے جو معرفت کا حق ہے نہیں پہچانا''

توحق معرفت الگ ہوتا ہے اور معرفت بقدرِ امکان الگ ہوتی ہے۔ اس کو میں کبھی کبھی سیرت کے جلسوں میں، مشترک سیرت کے جلسوں میں، جو بین الاسلامی ہوں، کہا کرتا ہوں کہ پیغمبر خداؐ کو حقیقی مراتب کے ساتھ پہچاننا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر سوئی سمندر کے اندر ڈال دیں تو سمندر سوئی کے ناکے میں سمائے گا نہیں، لیکن بقدرِ ظرف تو یہ لے ہی لے گی۔ ویسے ہی دریائے معرفتِ محمدؐ میں اپنے ذہن کی کشتی کو ڈال دیجئے، پھر جتنا ظرف میں صلاحیت ہوگی، آجائے گا۔ تو اب وہ جملہ، چونکہ وہ لفظ میری زبان سے نکل گئے تھے کہ جنہیں ہم جانتے اور پہچانتے ہیں، یہ ''پہچانتے ہیں'' بڑی تعلّی کا جملہ تھا، اس لئے مجھے اتنا کہنا پڑا، تو بقدرِ ظرف جتنا جانتے اور پہچانتے ہیں۔ تو ان میں سے حضور گیارہ افراد تو دنیا کی آنکھوں کے سامنے رہے اور بحمد للہ! ہماری ہی کتابوں میں ان کے حالات نہیں ہیں بلکہ دنیا کی کتابوں میں علماء کی کتابوں میں، ہر دور کے، ان کے حالات موجود ہیں اور ان کی محض کتابیں تو مستقل اُن کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔

یہ چیزیں دُہرائی جانا چاہئیں۔ اتحاد بین المسلمین کے لئے فائدہ مند ہیں کہ علمائے اہلِ سنت نے جو کتابیں آئمہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں لکھی ہیں، ان کے ناموں سے لکھنے والے کا عقیدہ نمایاں ہوتا ہے، جو میرے قریب ہیں، انہی سے شروع کروں۔ یہاں ماشاء اللہ لکھنؤ کے بہت حضرات ہوں گے۔ فرنگی محل سے کون واقف نہیں؟ وہ علماء کا مرکز رہا ہے تو ہمارے فرنگی محل کے قدیم عالم مولانا محمد مبین، جن کی کتاب شرح سُلّم منطق کے کورس میں بھی ایک وقت پڑھائی جاتی تھی۔ اب بھی مطالعہ تو ضرور کرتے ہیں جو ذوق مطالعہ رکھتے ہیں، شرح سُلّم مختصر طور پر تو ملا مبین ہی کہلاتی تھی، وہ ملا مبین ہوگئی۔ جیسے ملا حسن، ویسے ملا مبین، تو وہ ملا مبین فرنگی محلی، وہ فارسی زبان میں کتاب لکھتے ہیں جسے منشی نول کشور نے اپنے مجمع میں چھاپ دیا تھا یعنی مطبع بالکل غیر جانبدار ہے۔

وہ کتاب چھپی تھی، وہ اب بھی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ اس کا نام دیکھئے، انہی آئمہ کے حالات میں ہیں اور نام اس کا کیا ہے؟ ''وسیلۃ النجات''۔ نجات کا وسیلہ۔ اب دنیا چیخے، یہ نام ہی خود شرک ہے مگر وہ اسے شرک سمجھتے تو یہ نام کیوں رکھتے ''وسیلۃ النجات'' نجات کا وسیلہ۔ یہ حنفی عالم ہیں، ہمارے فرنگی محل کے علماء ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب لکھی، انہی حضرات کے حالات میں علامہ عبدالقادر شافعی یمن کے عالم، انہوں نے کتاب لکھی ''ذخیرۃ المال فی مناقب الآل''۔ اس کا بھی نام مآل، یعنی انجام کار کا ذخیرہ۔ مطلب ہی ہوا جو وسیلۃ النجات کا مطلب تھا۔ وہی اس کا مطلب ہوا کہ مآل کے لئے انجام دینے کے لئے یہ ذخیرہ ہے۔

مزید سب کتابیں جو ہیں وہ دنیا کے لئے ہیں، یہ آخرت کے لئے ہے۔ جناب کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کتاب لکھتے ہیں'' مطالب السئول فی مناقب آل رسولؐ ''اور حافظ محب الدین طبری، حافظ یہ قرآن کے یاد رکھنے والے کا نام نہیں جو زبانی یاد کریں۔ یہ علم حدیث کی اصطلاح تھی کہ جو ایک لاکھ حدیثیں مع متن و سند یاد رکھتا تھا، اس کو حافظ کہتے تھے۔ تو یہ حافظ محب الدین علمائے اسلام میں 14 سو برس میں علمائے اہل سنت میں آٹھ، دس ہیں صرف، جن کو حافظ کہا جاتا ہے، حافظ ابن حجر، حافظ جلال الدین سیوطی، بس چند آدمی ہیں

جو حافظ کہے جاتے ہیں۔ تو وہ لکھتے ہیں۔ جناب حافظ محب الدین طبری، ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ، یعنی عقیدہ بھی ظاہر، آیہ مودت کی تفسیر بھی نام سے ظاہر، ذخائر العقبیٰ، عقبیٰ کے لئے ذخیرہ فی مناقب ذوی القربیٰ۔

تو یہ تمام علماء ہر دور میں کتابیں لکھتے رہے تو ان کے حالات میں دیکھ لے جو کوئی، جہاں ضمنی آئے ہیں، وہ اور بے شمار، یہ تو اتنی کتابیں وہ میں نے کہیں جو مستقل اسی میں لکھی گئیں، ورنہ علامہ ابن حجر مکی نے جو کتاب شیعوں کی رد میں لکھی ''صواعق محرقہ ''، اس میں بھی ان حضرات کے حالات، صواعق محرقہ میں بھی اور اسی طرح سے اور علماء انہوں نے جو اپنی کتابوں کے درمیان لکھے ہیں، ابن خلکان نے وفایات الاعیان میں حالات لکھے ہیں۔ تو جو عرض کر رہا ہوں، وہ یہ کہ جو کوئی کسی ایک کتاب میں، خواہ ان کے حالات میں لکھی گئی ہو، خواہ ضمناً حالات آئے ہوں تو ہر امام کے حالات دیکھئے تو لکھنے والے متفق ہیں کہ ان کے دور میں ان سے بڑھ کر کوئی عابد نہ تھا۔ اپنے دور میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا۔ اپنے دور میں ان سے زیادہ کوئی زاہد نہیں تھا۔ یعنی جتنی صفات ہوتی ہیں نبوت کی، وہ تمام صفت ہر دور میں ہر امام کے اندر موجود ہیں۔ جتنی صفات ہیں، کمالات رسالت کی، ان میں سے ہر ایک میں کہہ رہے ہیں کہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عالم، اپنے زمانہ میں سب سے بڑے زاہد، اپنے زمانہ میں سب سے بڑے متقی، اپنے زمانے میں سب سے بڑے عابد۔ ان تمام صفات پر دنیا متفق ہے گیارہ اماموں تک۔ وہ تو آنکھوں کے سامنے رہے، حالانکہ میں فطرتِ انسانی کو گواہ کرتا ہوں کہ جتنے تاریخ کے عالم ہوں، اسے دیکھ لیجئے کہ ایک نسل میں پانچ درجے تک کمالات یکساں نہیں آتے۔

بیٹا نمایاں ہوا، پوتا اس سے کم ہوا۔ پھر پڑپوتا بڑھ گیا، پھر اس کے بعد کمی ہوگی۔ یہ یکساں کمالات پانچ پشتوں تک نہیں آتے، چہ جائیکہ آنکھوں کے سامنے گیارہ تک۔ رسولؐ کی سچائی ثابت ہوگئی کہ ہر دور کا وہ انسان جو ایک جماعت، جسے امام کہہ رہی ہے، وہ انہی صفات کا حامل ہے جو امام میں ہونا چاہئے۔ ہر ایک ان صفات پر متفق، گیارہ تک آنکھوں کے سامنے۔

بس میں کہتا ہوں کہ گیارہ تک آنکھوں کے سامنے آگئے، اب صرف ایک فرد کے لئے اس سچے کی سچائی کو مشکوک کرو گے؟ مگر جتنی منطق اس فلسفے کی مباحث ہیں، وہ سب آخری فرد میں آجائیں گی۔ وہی حقیقت میں موضوع رکھنے والوں کی مراد ہے حجتِ خدا سے۔

سب مباحث وہیں پر آجائیں گی، حالانکہ وہ تو سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ مجھے یہاں نام لے دینا چاہئے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس کی جو بات ہو، وہ اس کا حوالہ دے کر بیان کی جائے کہ ایک عالم آئے تھے، نجف اشرف سے 30,25 برس بلکہ زیادہ ہوئے ہوں گے، جب ڈاکٹر اقبال زندہ تھے، وہ شیخ اسد اللہ زنجانی لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد کے مہمان ہوئے تھے، اس وقت تک آپ کا پاکستان نہیں بنا تھا، وہ وہیں تھے، قیصر باغ میں ان کے مہمان ہوئے تھے اور وہ یہاں لاہور بھی آئے تھے۔ ان کے عصمتِ انبیاء کے موضوع پر تبادلۂ خیالات ہوئے اور وہ مطمئن ہوئے۔ چنانچہ ان کی کتاب نجف اشرف میں چھپی ہے۔ اس میں اس گفتگو کا حال ہے جو ڈاکٹر اقبال سے ہوئی تھی۔ تو ان کا یہ جملہ ہے کہ یہ ایک مناظرے کا اصول ہے کہ اصل مسئلہ امامت پر تو بحث نہیں کرتے اور آجاتے ہیں بارھویں امام پر کہ صاحب! سمجھا دیجئے ہم کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہر چیز کا اصول یہ ہے کہ جو بنیاد ہو اس کی وہاں سے ماننے، خدا کو آپ نہیں مانتے اور رسولؐ پر بحث کیجئے۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں رسولؐ ہی کا کوئی قائل نہیں ہے، ایمان پر بحث کیجئے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔

وہ پورا سلسلہ چھوڑ کا آپ آخری فرد پر بحث کر رہے ہیں۔ تو یہ بحث بے اصول ہے۔ تو جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا:

''شمیا زدہ را قبول بکنید، دوازدھم از شما نمی خواہیم''۔

''آپ ان گیارہ ہی کو مان لیجیے بارہویں کو معاف کر دیں گے ہم نہ مانتے''۔

تو حقیقت یہ کہ یہ اصول جب مان لے گا کہ جس کی وجہ سے گیارہ امام ہیں، تو وہ لازماً کشاں کشاں مان لے گا اس بارہویں کو۔ مگر پورے سلسلے کو چھوڑ کر جب اس نقطے پر آ کر گفتگو کریں گے تو بات الجھ جائے گی۔

تو حضور! گیارہ فرد آنکھوں کے سامنے رہے۔ اب اس فرد کے بارے میں گفتگو ہے، کیوں گفتگو ہے؟ اس لئے کہ غائب ہے، آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ میں کہتا ہوں کہ پورے قرآن کے حافظ نہ بنئے، سورہ بقرہ کو ہی یاد کر لیجئے۔ ارے پوری سورہ بقرہ بہت مشکل ہے۔ آپ اس کی ابتدائی آیت یاد کر لیجئے۔ کیا کہا جا رہا ہے:۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ"۔

''یہ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لائیں''۔

کون پرہیزگار؟ پرہیزگار وہ ہوتے ہیں جو غیب پر ایمان لائیں۔ معلوم ہوتا ہے، کتنا ہی افعال و اعمال پر پرہیزگار رہ نہ رکھئے، جب تک غیب پر ایمان نہیں ہوگا، قرآن بھی دامن چھڑا لے گا۔ کوئی منطقی اعتراض نہیں، کوئی عقلی اعتراض نہیں۔ بس یہ کہ آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، کیونکر مانیں؟ میں کہتا ہوں کہ آپ نے اصول دین میں سے کونسی چیز آنکھوں سے دیکھ کر مانی ہے؟

یاد رکھئے! جب تک غیب پر ایمان نہ لائے، دین کا کوئی ستون قائم نہیں ہو سکتا۔ دین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہو سکتی۔ ایمان لائیے، سب سے پہلے اللہ کو مانا، میرے نزدیک تو آنکھ سے دیکھ لیتے تو اللہ ہی نہ ہوتا اور پھر کسی کو خود نہ دیکھا ہو، کسی نے تو دیکھا ہوگا۔ یہاں وہ ذات ہے جس کو کسی اس کی طرف دعوت دینے والے نے دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے دیکھا ہے۔ کسی کو بیداری میں نہ دیکھا ہو خواب میں تو دیکھا ہو مگر اس کو میں کہتا ہوں کہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ایک عقلی اصول عرض کرتا ہوں کہ خواب میں بھی وہی چیز دیکھی جا سکتی ہے جو بیداری میں بھی دیکھی جا سکے۔ خوشبو خواب میں بھی سونگھی جائے گی، دیکھی نہیں جائے گی۔ آواز خواب میں بھی سنی جائے گی دیکھی نہیں جائے گی۔ نرمی سختی خواب میں بھی چھونے سے معلوم ہوگی، دیکھی نہیں جائے گی۔ نوعیت حادثہ نہیں بدلتی، صرف عالم حادثہ بدل جاتا ہے۔ سونگھنے کی چیز خواب میں بھی سونگھی ہی جاتی ہے اور سننے کی چیز خواب میں بھی سنی ہی جاتی ہے۔ اور جو نہ سننے کی چیز ہو، نہ دیکھنے کی چیز ہو، وہ خواب میں کیونکر دکھائی دے گا؟

میں کہتا ہوں کہ اگر دیکھا ہو تو کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ مجھے معلوم ہیں ایسے دعویدار جنوں نے دیکھا، کہا کہ ہم نے خواب میں دیکھا۔ خواب میں دیکھنے کے دعویدار مجھے معلوم ہیں۔ کتاب میں میں نے پڑھا ہے، وہی ہمارے اور وہ اب بھی ہمارے ملک کے رہے۔ ہمارے ملک میں جو نبی پیدا ہوئے، بٹوارے کے بعد بھی وہ ہماری قسمت میں ہو گئے۔

تو جناب! وہ ہمارے ملکی نبی، ان کی کتاب میں مَیں نے خود پڑھا ہے کہ میں نے اللہ سبحانہ کو خواب میں دیکھا، تو خواب میں جو دیکھا تو دوات وقلم وکاغذ بھیج دیا۔ خیر اللہ سبحانہ، کے سامنے دوات، قلم بڑھا دیا۔ یہی بہت بڑی بات ہے مگر اپنے مطلب کی بات لکھوانا تھی، اس لئے بڑھا دیا، اگر خطرہ ہوتا کہ ہمارے خلاف لکھیں گے تو کبھی نہ بڑھاتے۔ دوات وقلم آگے بڑھا دیا کہ جو دعویٰ کرتا تھا۔ اس کا پروانہ لکھ دیجئے، نبوت کا پروانہ۔ تحریک کرکے لکھوا رہے ہیں، یہ لکھ دیجئے۔ انہوں نے بلا تکلف قلم اٹھایا۔

اب بیچ بیچ میں تبصرے کے جو الفاظ ہوں گے۔ وہ میرے ہوں گے۔ مضمون ان کا ہے کہ بعض اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ قلم میں روشنائی زیادہ آجاتی ہے تو کیا کرتے ہیں؟ جھٹکتے ہیں۔ فاؤنٹین پین والے بھی بعض اوقات جھٹکتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ نب کو روشنائی میں ڈبویا تو ایسے بے انکل پن سے کہ روشنائی زیادہ آگئی۔ اس کے بعد جھٹکا تو ایسی بدتمیزی سے کہ چھینٹے پڑے۔ آنکھ کھل گئی۔ اب نتیجہ جو ہے وہ میرے الفاظ میں سنئے کہ پروانہ تو نہ تھا، دامن پر دھبے موجود تھے۔ اب وہ کرتہ موجود تھا جس پر نشان ہیں روشنائی کے اور ہر سال وہاں زیارت ہوتی تھی اس کی، اُس ملک میں، اب یہاں پھر ہونے لگی ہوگی جو اس کے پہلے مرکز تھا۔ تو ہر سال زیارت ہوتی تھی اسے دھبوں کی جو نہیں معلوم کس نے ڈالے ہیں؟

تو حضور! پھر وہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے کہا کہ خواب میں عقلاً ناممکن ہے اسے دیکھنا تو ایسا غیب اور اسے مان رہے ہیں۔ جب تک نہ مانیں مسلمان ہی نہ ہوں گے۔ اس کے بعد لوگ کہیں گے کہ اصل بیچ میں سے چھوڑ دی۔ نہیں، جسے سب مانتے ہیں، اس فہرست کو کہہ رہا ہوں کہ رسولؐ خدا سے جب آگے بڑھے تو رسالت، تو رسالت کو آنکھ سے دیکھ کر مانا ہے۔ ارے ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ جب دیکھا، جس نے دیکھا، واقعی رسالت کو آنکھ سے دیکھ کر مانا۔ ارے صاحب! سامنے تو چہرہ مبارک ہے، سامنے تو گیسوئے مبارک ہیں، سامنے تو دندانِ مبارک ہیں۔ مشاہدات تو یہ ہیں مگر ایمان کیا اس گیسو پر لاتا ہے؟ ایمان اس چہرے پر لاتا ہے؟ ایمان اس دندانِ مقدس پر لاتا ہے؟ ایمان لاتا ہے رسالت پر۔ رسالت کے معنی ہیں بھیجنا۔ جب بھیجنے والے کو نہیں دیکھا تو بھیجنا کہاں دیکھیں گے۔

تو رسالت وہ جزوِ ایمان ہے۔ وہ غیب کی چیز ہے، جبرئیلؑ امین کو آتے نہیں دیکھا، لوحِ محفوظ سے قرآن کو اُترتے نہیں دیکھا۔ وہ سب غیب کی باتیں ہیں۔ اس کے بعد آخر میں پہنچ جایئے۔ تین مشترک اصل ہیں کہ توحید کے بعد رسالت، رسالت کے بعد قیامت، قیامت کو آنکھ سے دیکھ کر مانا؟ دیکھ لیتے تو قیامت ہو ہی نہ جاتی؟ تو قیامت کو بغیر دیکھے مانا اور قیامت کے ساتھ غیب کا کارخانہ مانا، صراط کو مانا، میزان کو مانا، نامۂ اعمال کو مانا، جنت کو مانا، دوزخ کو مانا، ایک دنیا مانی غیب کی۔ ہر مسلمان نے مانی۔

اب میں کہتا ہوں کہ جس کے کہنے پر اتنے غیب مان لئے، ایک غیب کی خاطر اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالتے ہو؟ اب اس کے بعد ان کے ارشادات اور قرآن کی آیات لے لیجئے۔ تو یہ حضور قرآن کیا کہہ رہا ہے؟

"كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"۔

"صادقین کے ساتھ رہو"۔

مکمل صادق سوائے معصوم کے کوئی نہیں ہوسکتا۔ تو کہا جا رہا ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو کہ ایک صادق کبھی ہوا تھا، اب تم

ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے اقوال پر عمل کیا کرو۔ تو میں کہتا ہوں کہ صادقین کی کیا ضرورت ہے، ایک صادق تو تھا ہی جسے مشرکین بھی صادق کہتے ہیں۔ تو یہ صادقین کی کیا ضرورت ہے؟ جب اسی رسولؐ کی زبانی کہا گیا کہ صادقین کے ساتھ رہو تو معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ ایک سلسلہ ہے جو اسی معیار کے صادقین کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ افراد باقی ہیں، جن سے کہا جا رہا ہے، وہ پوری اُمتِ مسلمہ ہے، جب تک مسلمان امت کا وجود ہے، تب تک صادقین کا بھی وجود رہے گا۔

اب اس پر ابھی مزید تبصرہ کروں گا۔ یہ قرآن نے کہا، اس کا بھی تقاضا یہ کہ قیامت تک رہیں گے۔ رسولؐ نے فرمایا:

"اِنِّی تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ"۔

''میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں''۔

اللہ کی کتاب، دوسری میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ متفق علیہ حدیث ہے:

"مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا"۔

''جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے''۔

"لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِیْ"۔

''میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے''۔

"وَاِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا"۔

''اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے''۔

اب مسلمانوں سے سوال ہے کہ اس وقت قرآن ہے، کون کہے گا کہ نہیں ہے۔ قرآن ہے۔ میں کہوں گا جو قرآن کے ساتھ تھے، ان میں سے کوئی ہے؟ اگر کہے نہیں ہے تو ہمارے آپ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ رہے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جدا نہیں ہوں گے۔ جدا ہو گئے۔ اور اب میں کوئی سخت جملہ کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ بس میں یہ کہتا ہوں کہ یہ رسولؐ وہ ہے جسے مشرک بھی صادق کہہ رہے تھے۔ اب مسلمان ہو کر آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہے، کہیے۔ الحمد للہ پورا بیان ہو گا۔ یہ تو اپنے ہاتھ کی بات ہے۔ یہی موضوع پانچ دن میں بیان ہو سکتا تھا، یہی ایک دن میں بیان ہو گیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ قرآن نے بھی کہا کہ قیامت تک صادقین کا سلسلہ رہے گا۔ انہوں نے بھی کہا کہ کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ اگر کہے کہ نہیں ہیں تو جدا ہو گئے، رسولؐ کی سچائی ختم ہو گئی بلکہ قرآن کی صداقت ختم ہو گئی۔ اگر کہے کہ ہیں تو میں کہوں گا کہ آنکھ سے دکھایئے کہ کہاں ہیں؟ اگر آنکھ سے نہ دکھا سکے تو غائب مانتے۔

چونکہ ماشاء اللہ صاحب فہم ہیں، جو کچھ عرض کر رہا ہوں، آپ کے لئے جملے کافی ہیں، مختصر یہ کہ غیب وہ نہیں ہے۔ کہ جو ہی نہ، غیب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے ہو۔ غیب ایک ثبوت اور ایک نفی سے مل کر بنتا ہے۔ یعنی ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہونا تو سچے خدا اور رسولؐ، ان کے کہنے سے ثابت اور سامنے نہ ہونا آنکھوں سے ثابت۔

اب غیب کا کون جز و محتاج ثبوت رہا؟ بس اب دنیا یہ کہتی ہے کہ اب غیب، ہاں خیر! غیب کو تو مانتے ہیں، بغیر غیب کو مانے تو یہ تو خدا کو مان سکتے ہیں۔ یہ سب باتیں بالکل ٹھیک ہیں مگر آدمی بشر اتنے دنوں تک زندہ رہے، یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کسی کو ہم نے اتنے دن زندہ رہتے نہیں دیکھا۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں بے شک کسی کو میں نے بھی زندہ رہتے نہیں دیکھا مگر مجھے دنیا سے کیا کام؟ جس سلسلہ کے بارے میں میری گفتگو ہے، اس میں سے کسی ایک کو مرتے نہیں دیکھا۔ کوئی ایک تو اپنی موت سے دنیا سے گیا ہوتا۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی مرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خارجی حربے اپنا کام کرتے تھے۔ یا زہر یا تلوار۔ اب میرے الفاظ صاحبان علم محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقاضائے بقا ہر ایک کی ذات میں تھا، یہ مانع خارجی تھا جو اس مقتضی کو اثر کرنے سے روکتا تھا۔ بس جسے اللہ کو باقی رکھنا ہے، اس کے سلسلہ میں کوئی کام اسے نہیں کرنا۔ فقط حربوں کی زد سے الگ رکھنا ہے۔

اب دنیا کہتی ہے کہ غائب ہونے سے بڑی مصیبت ہوگئی۔ مصیبت نہ ہوتی تو ہم کیوں روتے؟ ہم کیوں بار بار فریادیں کرتے، استغاثے کرتے، عریضے کیوں بھیجتے؟ کوئی ہمیں پسند ہے غیبت؟ مگر کیا کریں جن کے باعث یہ غیبت ہوئی وہ کہہ رہے ہیں کہ کیوں غیبت ہوئی؟ میں کہتا ہوں کہ دنیا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھتی؟ گیارہ کے ساتھ کیا کیا؟ جو کہتے ہو کہ بارھواں کیوں غائب ہوا؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ جیسے خالق اور مخلوق میں جنگ ہوگئی تھی، وہ کہہ رہا تھا کہ صادقین کے ساتھ رہو، یعنی قیامت تک سچے رہیں گے۔ دنیا والوں نے کہا کہ رہنے دینا تو ہمارا کام ہے۔ ہم رہنے ہی نہیں دیں گے تو کیونکر رہیں گے؟ اب جو الفاظ کہتا ہوں، انہیں محفوظ رکھیے۔ جب تک خزانہ حکمتِ باری میں صادقین کا ذخیرہ رہا، اس نے حربوں کو کام کرنے دیا، اچھا یہ نہیں، ابھی دوسرا ہمارے پاس ہے۔ چاہے کسی عمر کا ہو، اس سے مطلب نہیں کیونکہ صادقین میں عمر کو کوئی قید نہیں۔ یہ مباہلے ہی میں رسولؐ نے دکھا دیا۔

اسے تم نے نہیں رہنے دیا؟ کوئی بات نہیں۔ ابھی یہ ہمارے پاس۔ اچھا! اسے بھی نہیں رہنے دیا؟ اچھا نہ سہی۔ اور ہے۔ مگر اب جب مقصدِ الٰہی کا ایک فرد میں انحصار ہو گیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اور مخلوق کی جنگ۔ اس کا آخری نتیجہ فتح و شکست کا ایک فرد کی بقا و فنا میں ہو گیا کہ اگر یہ رہتا ہے تو خدا کی بات پوری اور اگر یہ بھی ختم ہو جاتا ہے تو دنیا کامیاب اور اللہ ناکام (نعوذ باللہ)۔

اب دنیا یہ بتائے کہ کیا قادر مطلق عاجز بندوں کے مقابلہ میں اپنی شکست مان لیتا؟ اب دنیا کو ختم کرنا ہوگا تو بھیج دے گا، یہ طے کر کے کہ یہ نہیں تو اب کچھ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا نے کربلا میں کوئی کمی اٹھا رکھی تھی اس سلسلہ کو ختم کرنے کی؟ وہ تو خالق نے اپنے مقصد کے تحفظ کے لئے وہاں بھی غیبت سے کام لیا، ذرا باریک بات ہے مگر ماشاء اللہ آپ توجہ سے سن رہے ہیں۔ وہاں بھی غیبت سے کام لیا۔ غیبت کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم انہیں دیکھ نہیں رہے۔ اس نے غیبت یوں طاری کی کہ دن بھر انہیں غش میں رکھا کیونکہ اگر غش میں نہ ہوں تو باپؑ کی نصرت واجب ہو جائے۔ اگر نصرت نہ کریں تو کردارِ امامت کے خلاف ہو۔ پھر علی اکبرؑ سے ان کی منزل پیچھے رہ جائے۔ امام کیسا جو اپنا فرض نہ ادا کرے۔ ورنہ میرا ایمان ہے کہ ان حضرات کو غش بیہوش نہیں کر سکتا، مرض بیہوش نہیں کر سکتا۔ یہ مشیتِ ربانی ہے، مصلحتِ کردگار ہے کہ دن بھر بیہوش رہے اور اس کا ثبوت میں بر بنائے واقعات عرض کروں گا کہ دن بھر بیہوش رہے۔ جب تک فریضہ جہاد ادا ہو رہا تھا، تب تک بیہوش رہے۔

12

جہاد

اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کے نفوس واموال کو خریدا ہے اس کے بدلے میں ان کے لئے جنت ہے، اللہ کی راہ میں وہ جان لیوا مقابلہ کرتے ہیں (القرآن)۔

تلوار جب خطاکاروں کے ہاتھ میں آتی ہے تو جرم ہو جاتی ہے جب معصوم کے ہاتھ میں آتی ہے تو؟

اگر کوفہ ودمشق کے اوپر فوجی حیثیت سے قبضہ کرنا ہوتا تو عباسؑ کی ضرورت تھی زینبؑ کی ضرورت نہیں تھی علی اکبرؑ کی ضرورت بھی علی اصغرؑ کی نہ تھی مولاؑ کو تو یزید کو ختم نہ کرنا تھا یزیدیت کو ختم کرنا تھا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ فوراً فتح وظفر عطا ہی کردے، ہمیں فرض ادا کرنا ہے نتیجے تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں جیسی اس کی مصلحت ہوگی ویسا وہ کرے گا۔

کوئی فاتح اپنے سر سے فتح کا سہرا اتار کر دوسرے کے سر نہیں باندھتا مگر یزید کہتا تھا کہ ابن زیاد نے امام حسینؑ کو قتل کیا ہے اور ابن زیاد کہتا تھا کہ یہ سب کچھ یزید ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔

جہاد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ"۔

جہاد کے لفظ میں اصل مفہوم قرآن تلوار نہیں ہے۔ اسی وجہ سے بعض صاحبانِ علم اور اہل قلم نے جدید دور کے زمانے کے مقتضیات کو دیکھتے ہوئے یہ آواز بلند کی۔ ہمارے ملک میں، جہاں آزادی وطن کو بغیر تلوار کے حاصل کیا گیا تو کہا گیا کہ اسلام تو اسی طرح کی جنگ کا حامی ہے مگر یہ کہنا کہ اسلام میں تلوار نہیں ہے، یہ اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ قرآن مجید میں جہاد کا حکم زیادہ تر جہاد کے لفظ کے لئے نہیں قتال کے لفظ کے لئے آیا ہے۔ جہاد کا لفظ کم ملے گا، قتال کا لفظ زیادہ ملے گا۔ اب قتال میں وہ بحث نہیں چلتی۔ قتال میں اصل ق، ت اور ل ہیں جس کے معنی ہیں جان لینا۔

قتل، قتال کیا ہوا؟ قتل میں مقابلہ۔ اب جب اس کے معنی میں قتل شامل ہو گیا تو اس کے معنی کیا ہو گئے؟ جان لینے اور جان دینے کا مقابلہ۔ اصل میں حکم قتال جو ہے، اس میں نہ جان کا لینا اختیاری ہے، نہ جان کا دینا۔ جب مقابلہ ہو گیا تو اب کس کا وار کس پر چل جاتا ہے، یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنے اختیار میں بس میدان میں جمے رہنا ہے، غازی یا شہید ہونا اپنے اختیار میں نہیں۔ اگر اس کا وار چل گیا تو شہید ہو گئے، اپنا وار چل گیا تو غازی ہو گئے۔ لہٰذا یہ غازی ہونے کا حکم ہو سکتا ہے، نہ شہید ہونے کا حکم ہو سکتا ہے۔ بس میدان میں آؤ تو ثابت قدم رہو۔ اب غازی ہو یا شہید، تیسری قسم پھر میدان میں آنے کے بعد نہیں ہے۔ قرآن مجید میں دیکھئے، دونوں اقسام ہیں، اس کے علاوہ نہیں:

"اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ"۔

"اللہ نے مومنین سے ان کے نفوس و اموال کو خرید اہے۔ اس کے بدلہ میں ان کے لئے جنت ہے"۔

"یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ"۔

"اللہ کی راہ میں وہ جان لیوا ہیں اور قتل بھی ہو جاتے ہیں"۔

"کبھی قتل کرتے ہیں، کبھی قتل ہو جاتے ہیں کہ اب اس کے بعد کوئی اور قسم قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ اس بناء پر میدان میں آنے کے بعد تکلیف شرعی تو بس یہ ہے کہ ثبات قدم رہے۔ اس کے بعد غازی ہوتے ہو یا شہید ہوتے ہو، تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ تو اب قتال میں وہ بحث نہیں ہے۔ لہٰذا انکار کرنا، یہ غلط ہے۔ ہاں ایہ دیکھئے کہ اسلام میں کن صورتوں میں قتال کی اجازت دی گئی ہے یا قتل کا حکم دیا گیا ہے۔ ترتیب کچھ بھی ہو، اس وقت قرآن مجید کی، اس لئے کہ یہ متفق علیہ بات ہے کہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے۔ سب کے نزدیک پہلا سورہ اقراء تھا، وہ اب کہاں ہے؟ اور آخری سورہ جو سب کے نزدیک مائدہ تھا، وہ اب کہاں پر ہے؟ [illegible] لئے جب

ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے تو ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کونسی آیت پہلے ہے اور کونسی آیت اس وقت بعد میں ہے۔ مگر ایک آیت ہے جس کا مضمون بول رہا ہے کہ یہ سلسلہ جہاد میں سب سے پہلی آیت ہے، وہ کونسی؟ وہ آیت یہ ہے:

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ"

- "اجازت دی جاتی ہے انہیں"

بس یہی صاحبانِ فہم غور کریں کہ اگر کہا جاتا کہ حکم دیا جاتا ہے انہیں، تو یہ معنی ہوتے کہ اس کے پہلے حکم ہوا تھا۔ ممکن ہے اجازت ہو۔ لیکن جب یہ کہا جارہا ہے کہ اب اجازت دی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ممانعت تھی۔ اجازت، ممانعت کے مقابل میں ہوتی ہے۔ تو اب یہ اجازت جن شرائط کے ساتھ مشروط ہو، وہ شرطا اگر نہیں ہے تو ممانعت کا حکم سابق بحال۔ اس لئے جہاد کے سلسلہ میں کہتا ہوں، یہ بنیادی آیت ہے "اُذِنَ"، عدم اذن کے معنی ممانعت کے ہیں تو جائز ہی نہیں۔

تو اب یہ دیکھئے کہ اب یہ اجازت کن شرائط کے ساتھ ہے۔ کہا جارہا ہے، اجازت دی جاتی ہے ان کی۔ ذرا سی عربی گرائمر پڑھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہوتا:

"یُقَاتِلُوْنَ"۔

"تَ" کسرہ کے ساتھ، تو معنی ہوتے کہ انہیں اجازت دی جارہی ہے جو جنگ کر رہے ہیں مگر کسی بھی دور کے قرآن مجید میں دیکھ لیجئے "یُقَاتِلُوْنَ" نہیں ہے۔ اب ذرا ت کو اٹھایا:

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ"۔

اجازت انہیں دی جارہی ہے جس سے جنگ کی جارہی ہے تو کیا مطلب ہوا کہ حملہ آور ہونے کی اجازت نہیں۔ کہا جارہا ہے کہ انہیں اجازت دی گئی ہے جس سے جنگ کی جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کرنے کا فعل دوسرے کی طرف سے شروع ہوا۔ تو اب حملہ آور ہوا دوسرا۔ اب انہیں، جن پر حملہ کیا جارہا ہے کہ اب اجازت دی جارہی ہے:

"بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا"؟؟

کیوں؟ اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا جن سے جنگ کی جارہی ہے، انہیں اجازت دی جارہی ہے، اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا اور اب جب اُدھر سے اقدامِ جنگ ہوگیا، حملہ ہوگیا تو اب تمہیں اجازت ہے۔ یہ اجازت ایک ایسا لفظ ہے جس میں وجوب بھی داخل ہے، استحباب بھی داخل ہے، اجازہ بھی دخل ہے۔ بس صرف ممانعت اس کے مقابل میں ہے کہ اجازت خواہ وہ وجوبی ہو، خواہ استحبابی ہو، اس وقت میں ہے جب ابتداء اُدھر سے ہوجائے اور وہ اس لئے ہے کہ ظلم ہے۔ اگر اُس طرف سے ابتداء ہوجائے تو پھر یہ نہ سوچو کہ ہمارے پاس تعداد کتنی ہے؟ ہمارے پاس اسلحہ کتنا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ"۔

"اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے"۔

یہ حدیث نہیں ہے جس میں ضعیف وقوی کا سوال ہو۔ حدیث نہیں ہے جس میں یہ سوال ہو کہ مصنف کون تھا جس نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں درج کیا۔ قرآن کی آیت ہے جو کم ازم کم مسلمانوں کے درمیان تو متفق علیہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش الفاظ اور اس کے تحت لفظی ترجمے میں تو ہے ہی نہیں۔ ہاں! تشریحات اگر الگ سے کی جائیں تو میں تو کہتا ہوں کہ تشریح کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ خوف لفظ کا ترجمہ اگر کوئی صحیح کرے تو یہی ہوگا جو میں کر رہا ہوں کہ ان کو اجازت دی جا رہی ہے جن سے جنگ کی جا رہی ہے، اس لئے کہ ان کو اجازت دی جا رہی ہے جن سے جنگ کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں یعنی غیر کا اقدام کرنا خود ظلم ہے کیونکہ ظلم کا مرتکب دوسرا ہے۔ اس لئے اب اس مظلوم کو اجازت دی جا رہی ہے اور اب یہ مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ اور کوئی مددگار نہ ہو، اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ بنیادی آیت ہے، اس میں یہ قید لگا دی گئی ہے۔ ظلم ادھر سے ہے اور "یقاتلون"، جنگ ادھر سے ہے۔

تو میں کہتا ہوں کہ یہ اصول قائم ہو گیا اس پہلی ہی آیت سے کہ ابتدائے جنگ جائز نہیں۔ اپنی طرف سے آغاز جنگ کرنا درست نہیں ہے اور بین الاقوامی مجمعوں میں جو مشترک اجتماعات ہوں، میں اس پر زور دیتا ہوں، اس وقت تو ضمناً عرض کر رہا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام ممالک اس ایک قرآنی تعلیم پر عمل کر لیں کہ ہم ابتدائے جنگ نہ کریں گے تو جنگ ہو ہی نہیں۔ اجتماع ہوتے ہیں، مستقل مجالس قائم کی جاتی ہیں۔ مگر اس سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جلی حروف میں یہ لکھ دیا جائے کہ مجھے اجازت ہے کہ ابتدائے جنگ نہ کرنا۔ دنیا طے کرے صدقِ دل سے، سیاسی طور پر نہیں، واقعی یہ طے کرے کہ ہم ابتدائے جنگ نہیں کریں گے تو پھر جنگ غیر ممکن ہوگی۔ پھر جنگ وقوع میں آ ہی نہیں سکتی، تو یہ قرآن کی ایک آیت ہے اور اسلام کا ایک اصول ہے۔ قیام امن عالم کا ذمہ دار ہے۔

اور اب پیغمبرؐ اسلام کی سیرت، تو دنیا اسی معیار پر دیکھ لے۔ چالیس برس مکہ کی زندگی، مظالم تو اس وقت بھی ہو رہے تھے مگر جنگ جس کا نام ہے، اس کی ابتداء ادھر سے نہیں ہوئی تھی۔ تو ظلم برداشت کئے گئے مگر تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ بس یہاں ایک پہلو پر توجہ دلاؤں کہ بعثت کے بعد تیرہ برس مکہ کی زندگی، دس برس مدینے کی زندگی، تو اس تیرہ برس میں جسم مبارک پر پتھر برسائے جا رہے ہیں، اس تیرہ برس میں سر مبارک پر خس وخاشاک پھینکا جا رہا ہے۔ سیرت رسولؐ کے وہ بدیہات ہیں جو ہر ایک کو معلوم ہیں۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں، ہر مسلمان سے، ہر مکتبِ خیال کے مسلمان سے کہ اس تیرہ برس میں جو ہو رہا ہے، وہ ٹھیک ہے، تو اگر کبھی پچیس برس تک تلوار نہ کھینچی جائے تو یہ نہ سمجھو کہ سب ٹھیک ہے۔

معلوم ہوا کہ مظلوم ہونا اور چیز ہے، ابتدائے جنگ ہونا اور چیز ہے، جب ابتدائے جنگ ہو دوسرے کی طرف سے، تب جنگ کی اجازت ہے اور اس کے بعد 13 برس کے بعد ہجرت ہوئی۔ کوئی کہے کہ اس 13 برس میں اس لئے تلوار نہیں کھینچی کہ مددگار نہیں تھے، حالانکہ میں کہتا ہوں کہ جو اس کے بعد دیکھے ہوئے ہو، وہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ اس لئے تلوار نہیں کھینچی کہ مددگار کوئی نہ تھا۔

ارے کوئی نہ ہو، وہ ایک موجود تھا، جس نے بعد میں اکیلے جنگ کر کے دکھا دی، لہٰذا کسی کو یہ پوچھنے کا کیا حق ہے کہ چونکہ

مددگار نہیں تھے، اس لئے تلوار نہیں کھینچی۔ اچھا مان لیجئے لیکن اب ہجرت ہوگئی۔ اب تو تاریخ کی زبان میں بھی انصار مل گئے۔ تو اس جماعت کا نام ہی انصار، اب تو انصار فراہم ہو گئے۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینہ آنے کے بعد بھی تلوار نہیں کھینچی۔ کوئی کہے کہ ہاں! تلوار ابھی کیسے کھینچے؟ جنگ کی تیاری بھی تو ضروری ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ حضور! ٹھیک ہے، مگر مدینہ آنے کے بعد جنگ کی تیاری ہی شروع کر دیتے۔ حالانکہ تعمیری کام کتنے ہو گئے، دو دو مسجدیں بڑی بن گئیں، مسجد مدینہ اور مسجد قباء۔ یہ دونوں پہلے ہی سال تعمیر ہو گئیں اور مہاجرین کے قیام کے لئے مکانات بن گئے، حالانکہ اس وقت کی حکومتوں کے لئے جب ذرائع اتنے زیادہ ہیں، بحالیات کا مسئلہ طویل المیعاد منصوبوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ مگر وہاں وہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہی ثابت نہیں ہوا۔ ایک سال کے اندر مہاجرین کے قیام کے لئے جگہیں فراہم ہو گئیں۔ ہر ایک کے لئے مکان بن گیا۔ احکام دیوانی و فوجداری نافذ ہونے لگے۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ سال اول میں حکم شریعت نافذ ہوا۔ یہ سال دوئم میں نافذ ہوا اور بزم دنیا کا سب سے اہم یعنی پیغمبر خدا کی وہ عزیز اور معزز بیٹی جس کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔

میں نے دو الفاظ استعمال کئے۔ عزیز تو ہر ایک کو اپنی بیٹی ہوتی ہے۔ لیکن وہ فقط عزیز بیٹی نہ تھی، معزز بیٹی تھی۔ ہر ایک کو بیٹی عزیز، مگر کوئی باپ بیٹی کی تعظیم کو کھڑا تو نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ وہ فقط عزیز بیٹی نہیں ہے، معزز بیٹی ہے۔ تو ایسی بیٹی اور اس کی شادی ہو گئی۔ تعمیری کام اتنے ہو گئے مگر جنگ کی تیاری کتنی ہوئی؟ وہ تو اس وقت سامنے آئے گی جب اگر جنگ ہو جائے۔ تو سب کے نزدیک پہلی جنگ جو ہے، بدر ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر جنگ کی تیاری ہوئی ہوتی تو ایک سال گزرنے کے بعد دوسرے سال ہجری میں بدر کی لڑائی ہوئی ہے، وہ جنگ کی تیاری ہمارے سامنے آئی تو متفق علیہ تاریخ گواہ ہے کہ جنگ بدر میں سامان کیا ہے؟ تین سو تیرہ سپاہی۔

اب جنگ ہوگئی۔ اس لئے سپاہی کہہ لیجئے۔ اس 313 میں 13 عدد تلواریں۔ یعنی بس اکائیاں جو ہیں، وہ مسلح ہیں اور سینکڑے جتنے ہیں، وہ سب غیر مسلح۔ وہ نہتے۔ کسی نے خرما کے درخت کی شاخ لے لی۔ کسی نے کوئی لکڑی لے لی۔ جو نہتا آدمی ہوتا ہے، جو ملتا ہے، وہ ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اب 300 آدمی ایسے ہیں اور 13 تلواروں والے ہیں اور پوری فوج میں دو عدد گھوڑے ہیں۔

عرب میں جنگ کی سواری گھوڑ ہے اور زمانہ صلح کی سواری شتر ہے۔ اونٹ زمانہ جنگ کی سواری نہیں ہے پوری جماعت میں صرف دو اونٹ۔ میں کہتا ہوں کہ کسی مذہب وملت کا آدمی ہو، اگر صاحب عقل ہے تو میں اس سے پوچھوں گا کہ جو اس سامان کے ساتھ کئی ہزار فوج کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ وہ مارنے کو نکلا ہے یا مرنے کو نکلا ہے؟ تو اس بحث کا صاحب عقل فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس کے پاس یہ سامان ہو، وہ کیا خود سے جنگ شروع کرے گا؟ یہ سامان خود بتا رہا ہے کہ جنگ کر نہیں رہے ہیں، جنگ کرنا پڑ گئی ہے۔

اس کے بعد اب نتیجہ دیکھئے کہ فتح ہوئی۔ اس جماعت کو فتح ہوئی تو خالق نے کہا کہ ہم نے فرشتے بھیجے۔ اب جو غیب پر یقین نہیں رکھتا، وہ خود بتائے کہ کیونکر فتح ہوئی؟ فرشتوں کی فوجیں آئیں، انہوں نے جنگ میں شرکت کی۔ جو نہ مانے تو خدا کو نہیں مانتے، فرشتوں کو کیا مانیں گے؟

تو حضور والا! وہ بتائیں کیونکر فتح ہوئی؟ ہاں! ماشاء اللہ، صاحب فہم مجمع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس پہلی جنگ میں

قرآن بھی کہہ رہا:

"لِيَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ".

"تاکہ تمہارے دلوں کو اطمینان رہے"۔

یعنی مسلمانوں کے دلوں کو ڈھارس پیدا کرنے کے لئے فرشتے بھیجے گئے تاکہ اپنی قلتِ تعداد سے گھبرائیں نہیں۔ خدا چاہے تو فرشتے بھیج دے گا تمہارے مدد کے لئے۔ تمہیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اپنی کمی سے نہ گھبرانا۔ دیکھو! فرشتے آگئے ہیں۔ یہ دلوں کو ڈھارس دینے کے لئے۔ یقیناً بہت سے دلوں کو ڈھارس ہوگئی ہوگی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جو حقیقی شجاع تھا، جو حقیقی مجاہدِ اسلام تھا، اُس کے دل پر جیسے ایک بار پڑ گیا کہ میرے ہوتے ہوئے اور فرشتے آگئے۔ قرآن مجید میں تو یہ نہیں ہے مگر روایات ہیں کہ قدرت نے ان کے دل کے بار کو ہلکا کرنے کے لئے خود بڑا انتظام کیا کہ فرشتے بھی جو آئے، وہ انہی کی شکل میں آئے۔ یعنی مسلمانوں کو بتایا گیا کہ فرشتے آئے تھے۔ اور کافر جو گیا، اس نے ایک ہی کا نام لیا، وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ اسی ایک نے ہمارے سب سورماؤں کو تہہ خاک کر دیا۔ اب چاہے عداوت وعناد اس سے ان کا اور بڑھا ہو مگر خالق کو تو اپنے مقصد کا تحفظ کرنا ہے کسی کا عناد بڑھے، اپنی ہی بگاڑے گا۔ اللہ کا کیا نقصان کرے گا؟

تو جنابِ والا! جو ہے وہ سمجھتا ہے قاتل انہی کو۔ حقیقت میں آدھے لوگوں کے تو قاتل ہیں اور آدھے لوگوں میں مسلمان اور فرشتے سب مل کر شریک ہیں۔ بہرحال اُن کے علم میں تو سب یہی ہے اور یہ تو جانتے تھے کہ قرآن نے کہہ دیا ہے۔ رسولؐ نے بتا دیا ہے کہ فرشتے آئے تو بجائے خوش ہونے کے ان کو ذرا ملال ہوگیا کہ میرے ہوتے ہوئے اور فرشتے آئے۔ اگرچہ فرشتے انہی کی صورت میں آئے۔ یہاں بس ایک جملہ ہے، ماشاءاللہ صاحبانِ نظر ہیں، یعنی حقیقی شجاعت کو اس ذات سے اختصاص ایسا پیدا ہوا ہے کہ فرشتہ بھی لباسِ مجاز پہنتا ہے تو انہی کا پہنتا ہے۔ ان کی طبیعت یقیناً مضمحل ہے کہ میرے ہوتے ہوئے یہ فرشتے آئے کیوں؟ لہٰذا خالق نے بھی اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ کمزور دل والے مسلمانوں کے اطمینان کے لئے ہم نے فرشتے بھیجے تھے۔

اچھا اب تمہیں ملال ہے تو اب نہیں بھیجیں گے، چاہے میدان سادہ ہو جائے مگر اب فرشتے نہیں آئیں گے اور یہ ایک اکیلا میدان سر کر کے دکھائے گا۔ فرشتہ آئے گا بھی تو بعد میں تعریف کرتا ہوا۔ حوالہ دے دوں، شاہ عبدالحق دہلوی یہقیِ ہند، ان کی فارسی زبان میں کتاب ہے "مدارج النبوۃ" اور ہمارے لکھنؤ میں منشی نول کشور نے چھاپ دی ہے، مطبع بالکل غیر جانبدار ہے، تو جناب! اس مدارج النبوۃ میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ جب صفحۂ میدان سادہ ہوگیا، بہت سے لوگ متوقع ہوں گے کہ میں اب تفصیلات بیان کروں گا، مجھے کبھی کردار کے تاریک مرقعوں کو پیش کرنے میں کوئی لطف نہیں آیا۔ ایک ہی کے بیان سے مجھے فرصت نہیں ہے کہ جب صفحہ میدان سادہ ہوگیا۔ اب مضمون ہے، مدارج النبوۃ کا، وہ محدث دہلوی کا بیان کروں گا کہ وہ ایک آواز بھی آگئی کہ:

"قُتِلَ مُحَمَّدٌ".

حضرت کا نام لے کر کسی نے کہہ دیا کہ شہید ہوگئے۔ کچھ لوگ جو نتیجہ کے انتظار میں کہیں دور دور ٹھہرے ہوئے تھے، وہ اس

آواز کو سن کر رخصت ہو گئے کہ وہ رہے ہی نہیں تو ٹھہر کر کیا کریں گے؟ میں کہتا ہوں کہ ایک ہی دوا ہوتی ہے، ایک ہی چیز ہوتی ہے مزاج کے بدلنے سے اثر بدلتا ہے۔ یہ آواز جو آئی، لوگ کہتے ہیں شیطان کی آواز تھی۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے ایسی آواز بلند کی، وہ شیطان ہے۔ تو وہ اس نے آواز بلند کی، تو بہت سوں پر یہ اثر ہوا کہ جب پیغمبر اسلام نہیں رہے تو رُک کر کیا کریں گے؟ آواز علی علیہ السلام کے کان میں آئی۔ انؑ پر یہ اثر ہوا کہ جب وہ نہ رہے تو جی کر کیا کریں گے؟ چنانچہ نیام توڑ کر پھینک دیا کہ اب میں تلوار کو نیام میں نہیں رکھوں گا۔ اس کے بعد ایسا بھرپور حملہ کیا کہ اس پوری فوج کے قدم اکھڑ گئے اور اتنی دور بھگایا کہ فرصت سے اب تلاش کا موقع ملا۔

دیکھئے! یاد رکھئے، کوئی تاریخی واقعہ ذہن نشین نہیں ہو سکتا جب تک علم رسالت اور علم امامت کو الگ نہ کیجئے۔ یعنی عام زندگی اسبابِ ظاہری کے علم پر مبنی تھی۔ گو علم رسالت اور علم امامت الگ ہوتا ہے، ورنہ تلاش کی کیا ضرورت تھی؟ اب انہوں نے تلاش کرنا شروع کیا کہ اگر شہید ہو گئے ہیں تو کشتوں میں لاش ہو گی۔ سب کشتے دیکھے، مقتولین کو دیکھا، کہیں نہیں ملے۔ مجروحین جو تھے ابھی جاں بلب، انہیں دیکھا۔ ان میں بھی نہیں ملے۔ اب جو خود بعد میں فرمایا کہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ پھر وہی صورت ہو سکتی ہے کہ اللہ نے آسمان پر اٹھا لیا ہو جیسے عیسیٰؑ کو کیونکہ نظیر بھی موجود بھی۔ جیسے عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا، ویسے ہی اٹھا لیا ہو یا ابھی میری تلاش غیر مکمل ہو۔ کہیں موجود ہوں اور مجھے نظر نہ آئے ہوں۔

ماشاء اللہ بافہم مجمع ہے، توجہ سے سن رہا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہی دو تصور کیوں ذہن میں آئے؟ تیسرا تصور کیوں نہ سامنے آیا جب کہ نمونہ بھی جماعت کے کردار کا سامنے تھا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ علیؑ کا ایمان ہے حیاتِ رسولؐ پر۔ لہٰذا پھر ایک بار تلاش کیا۔ اب جو تلاش کیا تو ایک گڑھے کے اندر حضرتؐ زخمی حالت میں نظر آئے۔ سنبھال کر اٹھایا۔ دیکھئے! کتنی دور بھگایا ہے کہ سب کام اطمینان سے ہو رہے ہیں۔ باہر لائے، سپر میں پانی لائے، چہرہ مبارک دھلوایا۔ چونکہ سر کا خون بہہ رہا تھا، خود کی کڑیاں ٹوٹ کو سر مبارک میں در آئی تھیں تو چہرہ مبارک پانی سے صاف کیا اور اب پیغمبر اسلام کی نظر پڑی۔

ذرا نفسیاتی طور پر دیکھئے، یہ شاہ عبدالحق لکھ رہے ہیں اور دوسرے مصنفین نے بھی لکھا ہے، مگر چونکہ فارسی زبان میں اکثر زیادہ آسان ہے پڑھنا، اس لئے میں نے حوالہ دیا ہے کہ اب جو آپ کے چہرے پر نظر پڑی تو اکثریت کے کردار سے اتنا غصہ ہے کہ علیؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

"یا علیؑ! تم بھی نہ چلے گئے جیسے اور سب ادھر ادھر ہو گئے؟ تم بھی نہ چلے گئے؟"

یہ غصہ ہے جانے والوں پر جو اپنے اوپر اتار رہے ہیں۔ تم بھی نہ چلے گئے؟ اور اب یہ شخصیت مزاج دانِ رسالت تھی کہ ایک جملے میں رسولؐ کا غصہ دور کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیوں نہ چلے گئے؟ تو انہوں نے کہا:

"اَکُفۡرٌ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ"۔

"کیا ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا؟"

محدث دہلوی کے بیان کردہ الفاظ ہیں، میں کہتا ہوں کہ انہوں نے کہا:

"أَكُفْرٌ بَعْدَ الإِيْمَانِ".

انہوں نے کہا: کیوں نہ چلے گئے؟ یہ کہتے ہیں کہ کیا ایمان لانے کے بعد کفر کر دیتا؟ کافر ہو جاتا؟ علیؑ کا یہ کہنا اور پیغمبرؐ کا تائیدی سکوت کرنا۔ اب میں کہتا ہوں کہ ایمان و کفر میں حدِ فاصل ہو گیا آج کا اقرار و فرار۔

اب بھاگی ہوئی فوج کے دستے متفرق طور پر واپس آنا شروع ہوئے۔ اب ادھر سے ایک گروہ آرہا ہے۔ اُدھر سے ایک گروہ آرہا ہے اور کہاں تو یہ کہہ دیا تھا کہ تم بھی نہ چلے گئے؟ اور یہ جو آنا شروع ہوئے تو کہا: دیکھو! اب یہ ادھر سے آرہے ہیں۔ دیکھو! اب یہ ادھر سے آرہے ہیں اور اب علیؑ نے تلوار لے کر چاروں طرف گردش کر کے ان متفرق جماعتوں سے لڑنا شروع کیا۔

میں تو کہتا ہوں کہ اس وقت وہ مجاز حقیقت بنا ہوا ہے کہ شمع کے گرد ایک پروانہ ہے جو طواف کر رہا ہے دفاع کے لئے۔ اب حضرت جبرئیلؑ بھی آگئے ہیں۔ میں کہوں گا کہ اب آئے ہو جب وارہ نیارہ ہو گیا۔ وہ کہیں گے کہ میں پہلے تو مصلحتاً اس لئے نہیں آیا تھا کہ معرکہ سر ہو جائے تب آؤں اور میں کہتا ہوں کہ وہ بھی آئے ہیں۔ ذرا رسولؐ کا دل بہلانے، تو دل بہلانے کا طریقہ بھی انہیں معلوم ہے کہ یہ جنگ کر رہے ہیں اور وہ تعریفیں کر رہے ہیں اور وہ کیا تعریف:

"إِنَّ هٰذَا لَهِيَ الْمُوَاسَاةُ".

یا رسولؐ اللہ! ہمدردی تو اس کا نام ہے، غمگساری، غمخواری تو اس کا نام ہے اور کہاں خود ان سے؟ کہ تم بھی نہ چلے گئے؟ اور اب جبرئیلؑ تعریف کر رہے ہیں تو رسولؐ فرماتے ہیں:

"كَيْفَ لَا هُوَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ".

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں''۔

اور جناب جبرئیلؑ امین فوراً بول اٹھتے ہیں:

"وَاَنَا مِنْكُمَا"

''اور میں آپ دونوں سے ہوں''۔

اب میں کیا کروں، مجھے فرشتوں سے بات کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لئے مجھے وہ الفاظ ہی نہیں آتے جن سے میں مخاطب کروں۔ میں تو اپنی اردو زبان میں کہوں گا جناب جبرئیلؑ سے کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں کہ جب دو کی بات ہو تو کہتے ہیں کہ میں تم دونوں سے ہوں اور جب پانچوں آجائیں تو آپ کہیں کہ میں چھٹا کیوں نہ ہو جاؤں؟ مگر اس میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ انسان وہ ہیں کہ انہوں نے ملائکہ میں شریک ہونے کی تمنا بھی نہیں کی، ملائکہ نے ان میں شریک ہونے کی تمنا کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان کو ملک کہنا ان کی توہین ہے۔ ان کی بلندی یہی ہے کہ یہ ملک نہیں ہیں، مخدوم ملک ہیں۔ اکثر کتابوں میں کچھ اختلافات بھی ہے، جو مطالعہ کرنے والے کی نظر سے گزرے گا کہ اسی موقعہ پر مابین زمین و آسمان فرشتے نے صدا دی:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"۔

کوئی جوان نہیں سوائے علیؑ کے، میں کہتا ہوں کہ ملک بیچارہ نحو کا طالب علم تو ہے نہیں، اسے کوئی ترکیب نہیں معلوم۔ جو ترکیب "لاالٰہ الااللہ" کی اُس نے سنی، بس ایک نحو کی ترکیب اسے آتی ہے:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"۔

جناب! اب ملک چاہے کوئی ہو، جبرئیلؑ امین ہوں یا کوئی اور ہوں، جنابِ والا تو اس جماعت میں سے ہیں جنہوں نے عطائے منصب میں خونریزی کا الزام عائد کیا تھا کہ ان کو منصب ملے گا خونریزی کریں گے۔ تو حضور کو تو خونریزی سے نفرت ہے۔ یہ آج آپ؟ تلوار کا تو کام ہی ہے خون بہانا۔ ارے سپر کی تعریف کرتے کہ اس کا کام ہے وار روکنا اور تلوار کا تو کام ہی ہے خون بہانا۔ تو یہ آپ جیسے امن پسند۔ یہ آپ آج تلوار کی تعریف کیوں کر رہے ہیں؟ تو وہ کہے گا: خاموش! تلوار جب خطا کاروں کے ہاتھ میں آتی ہے تو مجرم ہوجاتی ہے، جب معصوم کے ہاتھ میں آتی ہے تو!

تو اس کے بعد پوری تاریخ اسلام کہاں تک پڑھوں؟ تین حصے تاریخ اسلام کے یہاں امامیہ مشن پاکستان نے بھی شائع کر دیئے ہیں، وہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہر جنگ کے اسباب کیا تھے اور کن صورتوں سے وہ ہوئی؟ وہ ہر ایک مطالعہ کر سکتا ہے۔ وہ جو اصول قرآن نے بتایا تھا کہ ابتدائے جنگ نہیں ہونا چاہئے، جغرافیہ تو کسی نہ کسی حد تک آہی جاتا ہے، جہاں جہاں اسلام کی لڑائیاں ہوئی ہیں، اسے پیمائش کر کے دیکھ لو، وہ مکہ سے قریب ہیں، مدینہ سے دور ہیں یا مدینہ کے قریب ہیں اور مکہ سے دور ہیں۔ اگر مکہ سے قریب کوئی لڑائی ہوئی ہو تو میں مان لوں گا کہ ہمارے رسولؐ چڑھائی کر کے گئے اور آپؐ نے حملہ کیا اور اگر ہر لڑائی مدینہ کے قریب ہوئی اور مکہ سے دور ہوئی ہو تو پھر آپ میرے ساتھ مان لیجئے کہ انہوں نے حملہ کیا اور رسولؐ نے حفاظتِ خود اختیاری کے لئے مدافعانہ جنگ کی۔

میں کہتا ہوں کہ فقط اپنی جان کی حفاظت کے لئے نہیں، ایک اخلاقی اصول کی حفاظت کے لئے کہ جب حملہ ہو گیا تو اب اگر باہر نہ نکلتے تو پناہ دینے والوں کے گھر خطرے میں پڑ جاتے جنہوں نے آپ کو پناہ دی تھی۔ تو جب خطرہ قریب آنے لگا تو آپؐ باہر نکل آئے کہ جب تک میں اور میرے ساتھ والے زندہ ہیں، تب تک مجھے پناہ دینے والوں کے گھر خطرے میں نہیں پڑ سکتے۔ تو جتنی جنگیں ہوئیں، میں کہتا ہوں کہ یہ دنیا کی ستم ظریفی ہے کہ اس نے تصویر کھینچی کہ ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن، تو میں اس تصویر کو دیکھ کر بس یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر قرآن تلوار سے پھیلا تو وہ تلوار کہاں سے آئی جس سے اسلام پھیلا ہے کہ تلوار اٹھانا تو خود ایک طاقت چاہتا ہے، مددگار چاہتا ہے؟ تو وہ جماعت جس کے ساتھ لے کر تلوار اٹھائی، وہ تو یقیناً تلوار کا نتیجہ نہ تھی۔ اس سے ماننا پڑے گا کہ اس نیام میں فولادی شمشیر کے علاوہ کوئی اور بھی تلوار ہے اور وہ تلوارِ حقانیت ہے۔ وہ تلوارِ اخلاق ہے۔ یہ تلوار مجبوری سے اٹھائی گئی اور اس تلوار سے آپ کا اصل مقصد بھی پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تلوار تو آدمی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اپنی مردم شماری میں اضافہ کیا کرے گی؟ ان کو تو وہ تلوار چاہئے تھی کہ کافر ہے اور کفر کٹ جائے، مومن ہو جائے۔

لہٰذا یہ تلوار مجبوراً اٹھائی گئی اور ہاں! غلط فہمی نہ ہو، یہ تصویر، ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن، ہمارے قریب کے

ملک کے غیر مسلم گروہ نے نہیں کھینچی ہے، یہ وہی ساتھ سمندر پار کی دنیا جو کبھی کبھی ہماری بہت ہمدرد بن جاتی ہے، یہ تصویر اسی کی کھینچی ہوئی ہے۔ جو تمدن اور تہذیب کا گہوارہ ہے، وہیں یہ تصویر کھینچی گئی ہے۔ تو وہ چونکہ عیسائی مذہب کے پیرو کار ہیں، تو میں ان سے کہتا ہوں اس سوال کے جواب میں، اس تصویر کے مقابلہ میں کہ تم ہماری تاریخ نہ دیکھو، اپنی ہی قومی تحریک دیکھ لو کہ اگر تلوار سے اسلام پھیلایا ہوتا تو تمہارے مقابلہ میں تلوار کیوں نہ کھینچی؟ بالکل بدیہی سوال، تمہارے مقابلہ میں تلوار کیوں نہ کھینچی؟

ہاں! میں اس کو تمہاری ہی معقولیت کی تعریف کہوں گا کہ تم فوج لے کر نہیں آئے۔ تم سمجھے کہ دین کا معاملہ ہے، لہٰذا جو مذہب کے واقف ہو سکتے ہیں، تحقیق کے لئے ان کا وفد بھیجیں۔ یہ تمہاری معقولیت تھی۔ تو پھر تلوار تو نہیں نکلی مگر اب تم کیوں غیر منصف ہو گئے ہو؟ اب تم انصاف سے مان لو کہ تلوار ان کے مقابلہ میں نکلتی تھی جو تلوار لے کر آئیں اور جو تلوار لے کر نہ آئیں، ان کے مقابلہ میں تلوار نیام سے نہیں نکلتی تھی۔ تم میدانِ روحانیت کے مرد تھے، تو تم سے مقابلہ ویسا کیا گیا۔ اسی مقابلے کا نام مباہلہ ہے۔ اب مباہلے میں تلوار کہیں نہیں ہے اور اسی لئے سپاہی بدلے ہوئے ہیں۔ وہاں تلوار والی جنگ تھی، اس کے سپاہی اور ہیں اور اب یہ بغیر تلوار والی جنگ تھی، روحانیت کے میدان کی جنگ، تو اب اس میں حسنؑ و حسینؑ جیسے سپاہی تھے جو لائے گئے تھے۔ آج وہ بدلے گئے۔ خاتونِ معظمہ نہیں لائی گئی تھیں۔ مگر اس جنگ میں وہ بھی لائی گئیں۔ ہاں! ایک سپاہی نہیں بدلا جو اس جنگ میں بھی ہوتا تھا، اس جنگ میں بھی ہے۔ اس جنگ میں ہوتا تھا شاہِ لافتیٰ ہو کر اور اس جنگ میں آیا ہے امام الاولیاء ہو کر۔

اس جگہ ایک اور نکتے پر غور کیجئے کہ آخر ان جنگوں میں کبھی کیوں انہیں لیا گیا؟ یہ آج جنگ میں کیوں لائے ہیں؟ اس سے ایک اصول قائم ہوتا ہے کہ حقانیت کی راہ میں جو جنگ فوجی فتح کے لئے ہو، اس میں عورتوں، بچوں کا کام نہیں ہوتا مگر جو جنگ کسی ذہنیت کے انقلاب کے لئے ہو، وہ جنگ مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ یہ افراد بھی ساتھ نہ ہوں۔ اسی سے نواسے کا کردار سامنے آجاتا ہے۔ حسینؑ کو بھی اگر یزید کا تختِ سلطنت اُلٹنا ہوتا، اگر کوفہ و دمشق کے اوپر فوجی حیثیت سے قبضہ کرنا ہوتا تو عباسؑ کی ضرورت تھی، زینبؑ کی ضرورت نہ تھی۔ علی اکبرؑ کی ضرورت تھی، علی اصغرؑ کی ضرورت نہ تھی۔ مگر مولاؑ کو تو یزید کو ختم نہ کرنا تھا، یزیدیت کو ختم کرنا تھا۔ ان کو ذہنیت اسلامی میں انقلاب پیدا کرنا تھا، اس لئے انہیں ساتھ لیا۔ جہاد بصورتِ قتال ایک قسم ہے جہاد کی، تو وہ میں نے عرض کیا کہ مشروط ہے کہ ابتدائے جنگ اُدھر سے ہو۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے یہ قتال ہی کیا، اس لئے کہ اس آئین میں دشمن کے سامنے خود سپردگی، یہ جزوِ آئین نہیں ہے۔ اپنا سینہ بڑھا دینا کہ نیزہ مار لو، اپنا سر جھکا دینا کہ تلوار مار دو۔ یہ شریعتِ اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ یہاں دفاعی جہاد حق ہے اور بعض اوقات فرض۔ اس بناء پر جنگ کی اور دنیا کہتی ہے کہ جنگ کے لئے تعداد چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن نے اس جنگ کے لئے کسی تعداد کی قید نہیں رکھی، ضمانت نہیں دی کہ دنیا مدد کرے گی، دنیاوی طور پر۔ یہ کہہ دیا کہ اللہ نصرت پر قادر ہے۔ جب اس کی حکمت ہوگی تو فوراً نصرت کرے گا۔ جب اس کی حکمت ہوگی، نتائج کے لحاظ سے نصرت کرے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ فوراً وہ فتح و ظفر اس طرح کی عطا کر دے۔ نتائج تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ جیسی اس کی مصلحت ہوگی، ویسا وہ عطا کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ مادی حیثیت سے شکست

ہو۔ مگر یاد رکھئے کہ وہ وقتی تصور ہو گا شکست کا۔ کربلا کی جنگ میں ادھر کے دماغ نے وقتی طور پر سمجھا کہ فتح ہو گئی ان کو اور جب ان کو فتح ہو گئی تو انہیں مکمل شکست۔ مگر یہ تصور بہت کم دن قائم رہا۔ اس کا ثبوت بر بنائے واقعات پیش کروں گا۔ وقتی فتح کا تصور ہوا، اس لئے باجے فتح کے بجائے گئے۔ اب یہ باب مصائب ہے کیونکہ اس وقت میں ایک طرح سے مغرب سے پہلے تو میں حتمی طور پر پابند ہوں کہ اتنی دیر میں مجلس ختم ہو کہ لوگ جا کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں، وہاں تک پہنچ سکیں۔ پھر چونکہ ہر نقطۂ نظر کے مسلمان کو دعوت دی جاتی ہے، اس لئے میں ہر نقطۂ نظر کے وقت کا لحاظ رکھتا ہوں۔ جس کے نزدیک وقت جلدی آتا ہے، وہ بھی وقت پر پہنچ سکے، جس کے نزدیک وقت کچھ دیر میں آتا ہے، وہ بھی وقت پر پہنچ جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پابندی ہماری مجالس میں ہونا چاہئے۔ تو حضورِ والا! اب زیادہ وقت نہیں ہے، آفتاب کی کرنیں سنہری ہو چکی ہیں اور مصائب میں زیادہ بیان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اب میں مصائب پر آچکا ہوں، اس لئے زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماشاءاللہ! آپ کے اس دور میں زمانہ عزا میں، آپ تشنہ رہتے ہیں آنسو بہانے کو۔ آپ کے لئے تھوڑا بیان کافی ہوگا۔ تو حضور والا! حضرت امام حسین علیہ السلام نے بے شک ان کی نگاہ میں بڑی شکست کھائی۔ شکست اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ اسی کے لئے انہوں نے فتح کے باجے بجوائے۔ اسی کے لئے گویا اپنی فتح کے جلوس نکالے۔ اسی کی وجہ سے شہروں کی آئینہ بندی کروائی مگر یہ تصور بتاتا ہے کہ بہت عارضی تھا۔ پس چند ثبوت اس کے یاد رکھئے کہ کوئی فاتح اپنے سر سے فتح کا سہرا اتار کر دوسرے کے سر نہیں باندھتا مگر کوئی سبب گزرا کہ یزید کہنے لگا کہ جو کچھ کیا، وہ ابن زیاد نے کیا۔ میں ہوتا تو یہ نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں کہ احساس شکست ہو گیا۔ اور عرض کروں کہ دنیا میں کوئی فاتح ایسا نہیں جو پشیمان ہو۔ جو شکست کھاتا ہے۔ وہ پشیمان ہوتا ہے۔

13

مودة فی القربیٰ

علامہ محمد ابن طلحہ سافعی بقول، مسلمانوں نے پیغمبرؐ خداؐ سے سوال کیا کہ آپؐ کے قربتدار کون ہیں؟ آنحضورؐ نے فرمایا علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دونوں بچے۔

(مطالب السئول)۔

''فاطمہؑ زنانِ جنت کی سردار ہیں'' سے جناب رسالتمآبؐ کی مراد یہ ہے کہ میری بیٹی اتنی باعظمت ہے کہ قیامت تک کی کسی عورت کو بھی جنت میں جانا ہو تو وہ فاطمہؑ کے پیچھے چل کر جا سکتی ہے، آگے چل کر نہیں جا سکتی۔

آنحضورؐ جب کسی غزوہ پر جاتے تھے تو سب سے آخر میں جناب فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہوتے تھے جب آتے تو سب سے پہلے فاطمہ زہراؑ سے ملاقات فرماتے تھے۔

اگر آنحضورؐ نواسہ ہونے کی بناء پر اپنے سجدہ کو طول دیتے تو خلاف شان سجود ہو جاتا لیکن رسول نگاہ فرض شناس کی ترازو میں مرضیِ الٰہی کے معیار پر تول رہے ہیں ایک پلڑے میں نماز کو اور ایک پلڑے میں حسینؑ کو۔

میں کہتا ہوں کہ جیسی نماز کربلا میں پڑھی گئی تاریخ عالم میں ویسی نماز کبھی اور کہیں پر نہ پڑھی گئی۔

مودۃ فی القربیٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"۔

کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ اپنی خدمات کا نہیں مانگتا، سوائے صاحبانِ قرابت کی مودت کے۔ گزشتہ دو تقاریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل کی بلندی وابستہ ہے شخصیت کی بلندی سے۔ اسلام میں شخصیت کی بلندی عمل ہی کی بلندی سے تو ہوتی ہے۔ یہ ایک جزو تھا۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ تمام کائنات میں انبیاء افضل ہیں اور تمام سلسلہ انبیاء میں ہمارے رسولؐ بلند درجہ رکھتے ہیں اور سب سے افضل ہیں۔

ایک عام سوال جس کا بظاہر موضوع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ وہ نیک عمل زیادہ بلند ہے جس کے ساتھ کوئی معاوضہ شریک ہو یا وہ عمل خیر جس کے ساتھ کسی معاوضہ کا سوال نہ ہو۔ ہر شخص اس کا جواب یہی دے گا کہ وہ عمل بالاتر ہے جس کے ساتھ کوئی معاوضہ شریک نہ ہو اور وہ عمل خیر اتنا اونچا نہیں ہے جس کے ساتھ کسی معاوضہ کا تصور ہو، معاوضہ ضروری نہیں کہ روپیہ پیسہ ہی ہو۔ انسان کو فائدہ پیش نظر ہو تو وہ بھی معاوضہ ہے۔ لیکن اگر عمل خیر کے ساتھ نہ کوئی فائدہ ہے، نہ کوئی معاوضہ ہے، صرف عمل خیر ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ نیک عمل ہے۔ تو اس میں بلاشبہ بلندی زیادہ ہوگی۔

مثال کے طور پر پردہ شب میں سائل آیا آپ کے پاس، جو کچھ اس وقت تھا۔ وہ اسے دے دیا۔ مقدار تو کم ہے لیکن عمل بے لوث ہے۔ یہ معلوم ہے کہ یہ اخباروں میں شائع نہیں ہوگا اور اس بات کے بظاہر اسباب نہیں ہیں کہ یہ کسی وقت مجھے صلہ دے۔ اس کو شہرت نہیں ملے گی۔ اس کا چرچا بھی لوگوں تک نہیں پہنچے گا۔ جو کچھ دیا ہے، بے غرضی کے ساتھ دیا ہے۔ یہ مقدار قلیل ہوگی مگر عمل بلند ہوا۔ دوسری طرف فرض کیجئے کہ حکومت نے چندہ کا مطالبہ کیا ہے۔ بڑے کارِ خیر اور نیک مقصد کے لئے ہے۔ اس کے لئے اجتماع ہوا ہے۔ اس اجتماع میں ایسے ایسے لوگ بلائے گئے ہیں جن کا اس مقصد کے لئے مدد دینا واقع ہو۔ بلاشبہ وہ لوگ جو دیں گے۔ وہ بہت ہوگا بلکہ شاید پوچھ پوچھ کر دیا جائے کہ کس نے کتنا دیا؟ اس لئے اس سے زیادہ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر معلوم ہے کہ فہرست عطایا کی اخباروں میں شائع ہوگی۔ حکومت کے ریکارڈ میں بھی محفوظ رہے گی۔ غرض یہ کہ جو اس وقت دیا ہے، نہ جانے کس کس وقت کام آئے گا۔ تو یہ مقدار تو زیادہ وہ ہوگی لیکن اس کے ساتھ بہت سے معاوضوں کا تصور ہے۔ اس میں ہر ضمیر محسوس کرتا ہے کہ اتنی بلندی نہیں ہوگی۔ اس سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ عمل کی بلندی یا پستی مقدار عمل سے وابستہ نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ضربت کو اگر ترجیح دے دی جائے، کسی وقت ثقلین کی عبادت پر، تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔

بس ہر ایک نے اس کا جواب یہی دیا کہ جس میں معاوضہ شریک ہو، وہ عمل خیر اتنا اونچا نہیں ہوتا جتنا وہ کہ جس میں معاوضہ کا

تصور نہ ہو۔ کل کے پورے بیان کو اس کڑی کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھئے کہ ہمارے سامنے قرآن مجید میں تمام انبیاء کی آوازیں ہیں۔ روایات نے نہیں پہنچائیں، اس قرآن مجید نے پہنچائی ہیں۔ قرآن مجید میں تذکرہ ہے ہر نبی کا۔ ہر ایک یہ کہہ رہا ہے:

"قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا"۔

میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔

اور بس اس کے بعد خاموش ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اجر نہیں، کوئی معاوضہ نہیں۔ ایسے ایسے انبیاء جو اولوالعزم نہیں ہیں، صاحب شریعت و کتاب نہیں ہیں بلکہ نبی ہیں۔ رسول ہونا ان کا ثابت نہیں مگر قرآن مجید میں ان سب کی صدائیں ہیں کہ:

"لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا"۔

"میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا"۔

جناب نوحؑ یہی کہتے ہیں اور جناب شعیبؑ یہی کہتے ہیں۔ جو نبی ہے، وہ یہی کہہ رہا ہے، اس کو تلاش کر لیجئے سورہ قصص میں بھی یہی ہے، سورہ انبیاء میں بھی ہے، سورہ ھود میں بھی ہے۔ جو نبی ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا اور اس کے بعد چپ ہو جاتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے اور ہمارے نبیؐ جو افضل المرسلین ہیں وہ شروع تو یونہی کرتے ہیں کہ:

"لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ"۔

وہی الفاظ ہیں کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا، میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ جب ہم نے یہ الفاظ سنے تو ہم کو کوئی تعجب نہیں ہوا کہ جو ہر نبی نے کہا، جو ہر رسول نے کہا، وہی یہ بھی فرمائیں گے اور وہی فرمانا چاہئے ان کو کیونکہ قرآن مجید میں کہا ہے کہ کہہ دیجئے۔ میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا تو نہیں ہوں یعنی جو سب کی تعلیم رہی ہے، وہی میری تعلیم ہے۔ اس لئے جو سب کا پیغام ہے، وہی میرا پیغام ہے۔

تو جس طرح ان کا پیغام تھا، اسی طرح کا ان کا بھی پیغام ہے۔ لہٰذا ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ جو سب فرما چکے ہیں، اسی طرح یہ بھی فرما رہے ہیں، ان کو اسی طرح سے فرمانا چاہئے لیکن اب بظاہر حیرت کی بات ہو جاتی ہے کہ ہر نبی "اجراً" کہہ کر چپ ہو گیا تھا اور یہ تو افضل المرسلین ہیں اور جب افضل المرسلین ہیں تو ان کا کردار بھی سب سے بالاتر ہونا چاہئے۔ ان کا عمل بھی سب سے اونچا ہونا چاہئے۔ یہ "اجرا" کہہ کر خاموش نہیں ہوتے۔ فن قرات و تجوید میں یعنی قرآن مجید کی قرات کے جو اصول ہیں، کہ وقف کا معیار سانس ہے، اگر متکلم نے سانس لے لی تو وقف ہے اور اگر متکلم نے سانس نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ کلام جاری ہے۔ ہر پیغمبر "اجراً" کہہ کر سانس لے لیتا ہے، اس لئے بات مکمل ہو جاتی تھی اور یہ ہمارے پیغمبر جو افضل المرسلین ہیں، یہ "اجرا" کہہ کر سانس نہیں لیتے بلکہ فوراً ایک "الّا" کہہ دیتے ہیں۔

پس ادھر "الّا" کہا اور ہماری سمجھ میں آیا کہ کچھ نہ کچھ تو ہے۔ ابھی چاہے بعد کی بات ہم نہ سنیں کہ کیا ہے مگر صرف "الّا" کا لفظ سننے سے ہماری سمجھ میں یہ آ گیا کہ کچھ عجب ہے کیونکہ اس "الّا" سے ہمارا سابقہ بہت دور سے پڑا ہے۔ جس وقت کلمہ پڑھا،

اسی وقت اگر ” اِلَّا “ کہہ کر چپ ہو جاتے تو دہریوں کا کلمہ ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا ہے ہی نہیں لیکن جب بات پوری نہیں ہوئی، اس کے بعد الا اللہ آ گیا تو پتہ چلا کہ خدا ہے، کون ہے؟ اللہ ہے۔ اور آگے بڑھئے:

"وَمَا أَرْسَلْنٰكَ"۔

اگر اتنے پر ہی بات ختم ہو جاتی تو رسالت کی نفی ہو جاتی کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہی نہیں۔ مگر جب اس کے بعد:

"إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ"۔

”مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے “۔

تو معلوم ہوا کہ بھیجا بھی ہے اور ہمہ گیر رحمت بنا کر۔ ” اِلَّا “ کی خاصیت معلوم ہو گئی کہ یہ جب کسی عام بات کے بعد آتا ہے تو اس کے عموم میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ نفی کے بعد آئے گا تو ثبوت پیدا کر دے گا۔ زمین نفی و ثبات میں انقلاب برپا کر دے گا۔ جو چیز نفی تھی، وہ اثبات بن جائے گی۔ وہاں تھا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ پہلے نفی، ” اِلَّا “ نے آ کر ثبوت فراہم کر دیا۔ وہاں ” وَمَا أَرْسَلْنٰكَ “، نفی کر دی ” اِلَّا “ نے آ کر کہ بھیجا ہے اور تمام عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اسی طرح ” لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا “ وہ نفی کہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا، بات یہاں ختم ہو جاتی، تو بے شک اجر کی نفی تھی لیکن جب اس کے ساتھ ” الا “ آ گیا، ” اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى “، اس کے معنی یہ ہیں کہ نفی قائم نہیں رہی، کچھ اجر ہے۔ اجر کا ثبوت ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ ایک ساخت ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کلمہ توحید۔ وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، بالکل وہی ترکیب ہے۔ یہ کلمہ رسالت ہے اور ” لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى “، یہ کلمہ ولایت ہے۔

اب بعد میں جو کچھ کہا ہے، وہ نہ بھی سنتے تو ” اِلَّا “ کا لفظ بتاتا ہے کہ آگے اثبات ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ’اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى“۔ صاحبان قرابت کے معنی اپنے قرابت دار۔ ہم جو معنی سمجھتے ہیں، اسی کے مطابق ترجمہ میں کہتے ہیں کہ میں تم سے کچھ اجر نہیں چاہتا سوائے اپنے قرابتدار۔ ہم جو معنی سمجھتے ہیں، اسی کے مطابق ترجمہ میں کہتے ہیں کہ میں تم سے کچھ اجر نہیں چاہتا سوائے اپنے قرابت داروں کی محبت کے۔

مسلمانوں میں ایک طبقہ نے یہ غور کیا کہ یہ بات شانِ رسالتؐ کے خلاف ہے کہ آپؐ اپنے قرابت داروں کی محبت کو معاوضہ قرار دیں اپنی خدمات کا۔ ” اِلَّا “ کو بیچ سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ مودت کے معنی لغت میں جو ہیں یعنی محبت، اس کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا پورا زور کلامِ قربیٰ پر صرف ہو گیا۔ چونکہ خیر خواہ مسلمان شانِ پیغمبر کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں، انہیں خدا سے زیادہ پیغمبرِ خدا کی شان کو محفوظ رکھنے کی فکر ہے، لہٰذا پوری طاقت قربیٰ کے مفہوم پر صرف ہو گئی کہ کسی طرح یہ اپنے عزیز نہ رہیں۔ لہٰذا کچھ اور ہو جائے۔

علمائے کرام دُور دُور کی کوڑیاں لانے لگے۔ کچھ نے کہا کہ یہ مشرکین عرب سے کہا گیا ہے یعنی اب مسلمان مخاطب نہیں ہیں۔ یہ ایک احتیاطی طریقہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو سوچنا نہیں ہے کہ ہم سے کچھ کہا جا رہا ہے۔ مشرکین مکہ مخالفین اسلام مخاطب ہے اور ان سے

کہا جارہا ہے کہ میں تم سے کچھ معاوضہ تو چاہتا ہی نہیں۔ مگر بھئی مجھ میں اور تم میں جو عزیز داری ہے، جو قرابت داری ہے، اس کا پاس اور لحاظ تو کرو۔ یہ علمائے کرام کے نزدیک شانِ رسولؐ کے مطابق بات ہے کہ وہ ابوجہل کو اپنی قرابت کا واسطہ دیں، ابولہب کو اپنی قرابت کا واسطہ دیں کہ بھئی میری قرابت کا لحاظ تو کرو۔ جو پیغام میں پہنچا رہا ہوں، اس کو اتنی بیدردی سے رد نہ کرو۔ میرے ساتھ جو رویہ اختیار کئے ہوئے ہو، یہ رویہ اختیار نہ کرو۔ گویا مشرکین کو اپنی قرابت کا واسطہ دیا جارہا ہے۔ علمائے اسلام یہ مفہوم قرار دے رہے ہیں۔ اصولی حیثیت سے، باقہم مجمع سے میرا سوال ہے، معاذ اللہ، رسول کا مطلب یہ ہو یعنی رسولؐ اپنی قرابت کا واسطہ دے کر انہیں دعوتِ اسلام دیں تو پھر ابوجہل کو کیوں حق نہیں ہے کہ وہ اپنی قرابت داری کا واسطہ دے کر یہ نہ کہے کہ ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہئے۔ جب اصول کی بات نہیں رہی، حقانیت کی بات نہیں رہی، قرابت داری کے لحاظ نہ کریں ارو ہم آپ کی قرابت داری کا پاس کریں؟ آپ تو بیدردی سے ہمارے معبودوں کو نشانہ بنائیں اور ہم آپؐ کے ساتھ قرابت داری کا لحاظ سے رعایت برتیں۔

معاذ اللہ، رسولؐ ایسی بے اصول بات مشرکین مکہ سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے خود بتایا ہے کہ حق کے معاملہ میں قرابت داری کوئی چیز نہیں۔ ان کو حق کہہ کر پیش کرنا ہے یا قرابت داری کے واسطے سے، بنظر ترحم ان سے منوانا ہے۔

غور فرمایئے! اصل مرکز سے ہٹانے کیلئے کتنی معقول اور غیر معقول کوششیں کرنا ضروری سمجھی جارہی ہیں کہ جو اصل مقصد ہے، وہ حاصل نہ ہو۔ یہ ایک رُخ تھا جسے کچھ لوگوں کے ضمیر نے قبول نہیں کیا۔ دوسرا پہلو یہ پیش کیا گیا کہ بے شک قرابت دار کہے گئے ہیں اور مشرکین سے خطاب نہیں ہے، مسلمانوں سے ہی ہے، مسلمانوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ میں تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگتا، سوائے اس کے کہ تم اپنے قرابت داروں سے محبت کرو۔ بس مقصد حاصل ہوگیا۔ بجائے رسولؐ کے، وہ ہمارے قرابت دار ہوگئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سب کے بعد بھی وہ ''اِلَّا'' اپنی جگہ سے نہیں ہٹا یعنی رہا۔ تو کچھ نہ کچھ اب یہ کہ تم اپنے قرابت داروں سے محبت رکھو، دوستی رکھو۔ آیئے اس کو قرآن کے معیار پر جانچیں تو قرآن کریم کی ایک مہم یہ تھی کہ حق کی راہ میں قرابت داری کی محبت کو دلوں سے کھرچ کر دُور کرے۔

ارشادِ الٰہی ہے کہ کسی جماعت کو، جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہے، تم نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے سے محبت کرے جو اللہ اور رسول کے خلاف ہے۔ چاہے وہ باپ دادا ہوں، چاہے وہ بیٹے ہوں، چاہے وہ شریکِ حیات ہوں، بھائی ہوں، قبیلے کے لوگ ہوں، کوئی بھی لوگ ہوں۔ یہ وہ ہیں جو صاحبانِ ایمان ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے باپ دادا کو، اپنے بھائیوں کو، اپنی اولاد کو اور ان اموال کو جنہیں تم جمع کرتے ہو، ان سب کو تم خدا، رسولؐ اور ان کی راہ میں خدمات انجام دینے سے زیادہ عزیز رکھتے ہو تو پھر عذابِ الٰہی کے منتظر رہو۔

قرآن مجید، جس کی یہ مہم ہو اور اس وقت اسلام کی راہ میں یہی محبتیں رکاوٹ تھیں، ان کا استدلال قرآن کے خلاف یہی تھا، اسلام کے خلاف یہی تھا، پیغمبرِ اسلام کے خلاف یہی تھا کہ ہم نے باپ دادا کو اسی راستے پر دیکھا ہے اور ہم اسی راستے پر چلے جائیں گے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ ایک بھائی اگر حالتِ کفر میں ہے اور دوسرے بھائی کی سمجھ میں اگر اسلام آ بھی گیا ہے تو بھی وہ اس راستے

پر نہیں آتا کہ بھائی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اگر شریکِ حیات مسلمان ہونا چاہتا ہے اور زوجہ حالتِ کفر میں ہے تو اس کی محبت اس کے سدِ راہ ہوتی ہے۔

قرآن کی مہم یہ تھی کہ مسلمانوں کو حق کے معاملہ میں ان تعلقاتِ قرابت کو دل سے نکالنا ہے۔ تو کیا وہ یہ کہتا ہے کہ میں اپنی خدمات کا معاوضہ یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے قرابت داروں سے محبت کرو؟ اب ایک اور اصولی بات ہے کہ ان میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس کی تائید میں کوئی قولِ رسولؐ ہو، حدیثِ رسولؐ ہو۔ لیکن جو بحمد اللہ ہم سمجھتے ہیں، اس کی تائید میں متفقہ طور پر حدیثِ رسولؐ موجود ہے۔ مسلمانوں نے پوچھا کہ یا رسولؐ اللہ! وہ قربیٰ کون ہیں؟

علامہ محمد ابن طلحہ شافعی نے مطالب السئول میں لکھا ہے اور تفسیر کی کتابوں میں بھی ہے مسلمانوں نے پیغمبر خدا سے سوال کیا کہ یہ آپؐ کے قرابت دار کون ہیں؟ رسولؐ نے فرمایا:

"عَلِيٌّ وَفَاطِمَةٌ وَابْنَاهُمَا"۔

''علیؑ و فاطمہؑ کے دونوں بچے''۔

جب خود رسولؐ اکرم نے اس کی تفسیر کر دی تو اب مسلمانوں کے خلاف سوچنے کا کیا حق ہے؟ مگر جو باتیں میں نے پیش کی تھیں، وہ تو اپنی جگہ پر رہیں کہ افضل المرسلین ہیں اور پھر ان کا کردار سب سے اونچا ہونا چاہئے۔ ہر نبی کہتا رہا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر ہمارے رسولؐ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر، اور ''مگر'' کے بعد اپنے قرابت دار اور قرابت داروں کے بعد ان کی محبت۔ تو کیا میں سمجھوں کہ اور تمام انبیاء کا عمل بے لوث تھا اور انؐ کے عمل میں (معاذ اللہ) غرض شریک ہو گئی۔ تو ان کا کردار اتنا اونچا نہ رہا۔ اگر کردار اونچا نہ رہا تو اس کے معنی ہیں کہ ان کی شخصیت دوسرے انبیاء سے اونچی نہ رہی۔ ہمارے سارے مسلمات بدل گئے۔ یہ مشکل کیوں پیش آ رہی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ سب مشکل ایک لفظ کے نظر انداز کر دینے سے پیش آ رہی ہے۔ یاد رکھئے کہ ہر نبی نے خود اُمت سے خطاب کیا تھا، خود آئے اور کہا کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا۔ صالح آئے اور کہا کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا۔ نوحؑ آئے اور انہوں نے یہی کہا کہ کوئی اجر نہیں چاہتا۔ خالق نے بس قول کو نقل کر دیا۔ ہمارے پیغمبر بھی اگر منبر پر تشریف لے جاتے اور اپنی طرف سے کوئی خطبہ پڑھتے اور مسلمانوں کو پیغام اپنی جانب سے دیتے تو یہ بھی اتنا ہی کہتے جتنا ہر نبی نے کہا۔ یہ بھی کہتے کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا۔ مگر یہ کب آئے منبر پر؟ کب انہوں نے کوئی خطبہ پڑھا؟ کب انہوں نے قوم کو مخاطب کیا؟

وہ تو جس کے رسولؐ ہیں، اُس نے کہا: ''قُلْ''۔ اُس نے ارشاد کیا کہ ''قُلْ''۔ کہئے اور یہ کہئے۔ الفاظ بھی اس کے سکھائے ہوئے، الفاظ بھی اس کے بتائے ہوئے اور اب اگر یہ اس کے رسولؐ ہیں تو اس میں تصرف جائز ہی نہیں۔ انہیں اس میں نہ کمی جائز نہ زیادتی جائز۔ جب اس نے کہا کہ یہ کہئے کہ:

"لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"۔

کوئی اجر نہیں چاہتا اور اسی لئے تو قرآن کے ساتھ رسولؐ کی ضرورت تھی کہ اگر قرآن اس طرح اترتا مکتوبی شکل میں لکھا ہوا تو بیچ میں سانس لینا نہ لینا پڑھنے والے کا کام ہوتا۔ پھر خدا بھی اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے خدا نے قرآن کو بھیجا اور ایک سانس لینے والے انسان کو ساتھ بھیجا۔ اب جس طرح وہ قرآن کی صحت کا ذمہ دار ہے، اسی طرح اس کے پڑھنے کے طریقہ کا بھی ذمہ دار ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کہئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، سوائے اپنے قرابت داروں کی محبت کے۔

اب آپ کو برا معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اپنے قرابت داروں کو کیسے کہہ رہے ہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ رسولؐ کب کہہ رہے ہیں اپنے قرابت داروں کو؟ یہ کب کہہ رہے ہیں اپنے قرابت داروں کیلئے؟ وہ کہلوا رہا ہے۔ اب رسولؐ سے قرابت داری نہ ڈھونڈیئے، اُس سے رشتہ ڈھونڈیئے۔

رشتہ کو قرابت کہتے ہیں۔ اللہ سے قرابت ڈھونڈیئے۔ قرابت کے لفظ سے کسی کو وحشت نہ ہو، جیسی اُس سے قرابت ہو سکتی ہے۔ آپ نماز میں کہیں "قُرْبَةً اِلَى اللهِ" تو صحیح اور میں قرابت کہہ دوں تو غلط؟

اب اس سے سمجھئے کہ یہ ہستیاں فقط رسولؐ سے رشتہ نہیں رکھتیں، یہ اللہ سے بھی رشتے رکھتی ہیں۔ تو اب جہاں جہاں "قُل" ہے:

"قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ"۔

"کہو کہ اللہ ایک ہے"۔

تو اب اللہ کو ایک کہنا ان کا فرض ہوا یا نہیں؟

"قُلْ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَيْكُمْ"۔

"کہیئے کہ میں اللہ کا رسول ہوں"۔

تو یہ کہنا ان کا فرض ہوا یا نہیں؟ وہ کہتا ہے کہ کہئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، سوائے قرابت داروں کی محبت کے تو اب یہ کہنا ان کا فریضہ ہے یا نہیں؟ اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ ہمارے لکھنؤ والے تکلف سے کام لیتے تو میں کہتا ہوں کہ اگر اس تکلف سے کام لینا ہوتا تو جب اُس نے کہا تھا کہ کہئے کہ میں رسولؐ ہوں تو کہتے کہ پروردگار! اپنے منہ سے کیا کہوں کہ میں رسولؐ ہوں۔ قرابت دار تو اصل میں اپنی وجہ سے قرابت دار ہوتے ہیں۔ اصل محبت تو ذات سے ہوتی ہے۔ جب کہا جاتا کہ آپ اپنی رسالت کی تبلیغ کیجئے تو کہتے کہ اپنے منہ سے کیا کہوں کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ اس لکھنؤ کے تکلف کا تقاضا تو یہ تھا کہ کوئی پوچھتا کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں؟ تو رسولؐ فرماتے کہ میں کس قابل ہوں، یہ تو آپ کی محبت ہے۔

یاد رکھئے کہ خدا کی طرف کے عہدوں میں تکلف روا نہیں ہے۔ نبی اور امامت کا کیا ذکر ہے، کسی مجتہد سے پوچھا جائے کہ آپ مجتہد ہیں؟ تو اگر واقعی مجتہد ہیں تو ان کو کہنے کا حق نہیں ہے کہ مجتہد نہیں ہوں۔ یہ حقیقت خلافِ شانِ رسالت ہے کہ رسولؐ بارگاہِ الٰہی میں یہ

کہیں کہ پروردگار! میں اپنے منہ سے کیا کہوں کہ میں رسولؐ ہوں۔ یہ اگر تکلف کرتے تو کیا واقعی رسولؐ ہوتے؟

ارشادِ الٰہی ہوتا کہ ماشاء اللہ! رسول آپ ہیں تو کیا آپ کی رسالت کی تبلیغ کیلئے کوئی اور رسول آئے گا؟ جب آپ رسول ہیں تو میری وحدانیت کا منوانا بھی آپ کا کام ہے اور اپنی رسالت کو منوانا بھی آپ ہی کا کام۔ تو جب اپنی ذات کے بارے میں ان کے لئے تکلف روا نہیں تھا تو قرابت داروں کے بارے میں تکلف کیونکر ہو سکتا تھا کہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں کہ پروردگار! یہ میں کیونکر کہوں؟ اپنی بیٹی کیلئے کہوں، اپنے داماد کیلئے کہوں، اپنے نواسوں کیلئے کہوں؟

اپنے لئے کہہ سکتے تھے، اپنی بیٹی کیلئے کہہ سکتے تھے۔ ہاں! جیسے واقعی رسولؐ ہیں، ویسے ہی آپ کی بیٹی بھی اُس کے ہاں کوئی درجہ رکھتی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ کہئے اور اگر آپ کا داماد اور آپؐ کے نواسے اس کی طرف سے کسی منصب کے حامل ہیں تو جیسے اپنی رسالت کی تبلیغ کرنا آپؐ کا فرض تھا، ویسے ہی انکی امامت کی تبلیغ کرنا بھی آپ کا فرض ہے۔

ذرا نازک بات ہے کہ میں کہتا ہوں کہ جب اُس نے کہا کہ:

"قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"۔

''کہئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے قرابت داروں کی محبت کے''۔

واقعی یہ قرابت داروں کی محبت ان کی ان خدمات میں ہوگی جن کا اجر یہ اسی سے لیں گے۔ اُس نے جب کہا:

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"۔

تو یہ اُس کی توحید کا پیغام ہو گیا۔ اُس نے کہا:

"قُلْ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ"۔

''میں تمہاری طرف اللہ کا رسولؐ ہوں''۔

تو ان کی رسالت کا پیغام ہو گیا۔ وہاں خلقِ خدا کو توحید کا قائل ہونا پڑا، یہاں رسالت کا قائل ہونا پڑا۔ اس کے بعد جب اُس نے کہا:

"قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"۔

''کہئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا''۔

دیکھئے! ''قُل'' یا کہئے کہ ساتھ جو بات آ رہی ہے وہ اصولِ دین میں داخل ہے تو کہئے:

"هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"۔

توحید اصولِ دین میں۔ کہئے کہ:

"اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ"۔

تو رسالت جزوِ دین اور اب جب وہ کہہ رہا ہے:

"لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا"۔

تو جن ہستیوں کیلئے وہ کہہ رہا ہے، اُن کی ولایت بھی جزوِ دین ہوگی۔ وہ جو سلسلہ ہے، اس کی پہلی کڑی جو ہوگی، اس کا نام لے کر رسولؐ اس کی ولایت کا اعلان فرمائیں گے اور مراد وہ پورا نظام ہوگا جس کی یہ پہلی کڑی ہے۔ گویا پہلی کڑی کو ہاتھ میں دے دیتا ہے خدا ورسولؐ کہ اب اس حلقہ تک پہنچ جاؤ گے تو پھر آگے بڑھتے چلے جانا۔ پورا سلسلہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

تو یاد رکھیے کہ اس نے کہا:

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"۔

انہوں نے تبلیغ کی، اللہ احد۔ ہم نے کہا:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

خدا نے کہا:

"قُلْ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ"۔

"کہیے کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسولؐ ہوں"۔

انہوں نے اس کی تعمیل میں کہا:

"اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ"۔

"میں اللہ کا رسولؐ ہوں"۔

ہم نے فوراً کہا:

"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔

اس نے کہا:

"قُلْ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی"۔

انہوں نے اس کی تعمیل کی کہ:

"لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی"۔

ہم نے کہا:

"عَلِیٌّ وَلِیُّ اللہ"۔

پس جب خدانے کہا کہ کہئے، تو اب ان سے قرابت نہیں ہے، اُس سے رشتہ ہے۔ اسی طرح جو ہم نے رشتہ ملایا: لاالہ الا اللہ، یہ بھی اللہ کی طرف رُخ۔ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ" کا مرکز بھی اللہ اور "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللہ" کہہ کر ہم رسولؐ سے کوئی رشتہ نہیں بتارہے ہیں۔

رسول، رسول ہیں مگر عبداللہ کے بیٹے بھی ہیں، عبدالمطلب کے پوتے بھی ہیں، ہاشم کے پڑپوتے بھی ہیں۔ مگر کیا ہم جو کلمہ پڑھتے ہیں، وہ اس لئے کہ ہاشم کے پڑپوتے ہیں یا عبدالمطلب کے پوتے ہیں یا عبداللہ کے بیٹے ہیں؟ کلمہ جو پڑھتے ہیں وہ اس لئے کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ وہ الگ سے معلوم ہے کہ کس کے پوتے ہیں، کس کے بیٹے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہستیاں بھی بہت اونچی ہیں جن کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی بہت بلند ہیں جن کے پوتے ہیں۔ وہ بھی بہت بلند ہیں مگر ہمارا کلمہ پڑھنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کے بیٹے اور ان کے پوتے ہیں۔ ویسے ہی جس جس کو مانتے ہیں، وہ اس لئے نہیں مانتے کہ رسولؐ کی بیٹی ہیں، وہ رسولؐ کے داماد ہیں، رسولؐ کے نواسے ہیں۔ نہیں! ہم تو اس لئے مانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے جو منصب ہے، یہ اُس پر فائز ہیں۔ ان کی حیثیت دو طرح کی ہوگی، ایک رشتہ جو رسولؐ سے ہے اور ایک رشتہ جو خدا سے ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ رسولؐ فضائل اس لئے بیان کرتے تھے کہ وہ بھائی ہیں اور یہ بیٹی ہیں اور یہ نواسے ہیں۔ فضائل سب تسلیم، پیغمبر خدا کی سب احادیث تسلیم، لیکن اس کی اہمیت کم کرنے کیلئے کہتے ہیں کہ اپنے بھائی کو بہت چاہتے تھے، اپنی بیٹی کو بہت چاہتے تھے، اپنے نواسوں کو بہت چاہتے تھے۔ اس طرح وہ فضیلت کی ساری حدیثیں گویا محبت پر مبنی قرار دے دی گئیں کہ یہ سب اپنے عزیزوں کی محبت تھی۔ فضائل اس لئے بیان کرتے تھے کہ بیٹی تھیں۔ تو ہم چاہے مانیں یا نہ مانیں، دنیا کے نزدیک تو بیٹیاں اور بھی تھیں۔

ان لوگوں سے میں کہتا ہوں کہ اگر پیغمبر خدا فضائل بیٹی ہونے کی بنا پر بیان کرتے تھے تو ان بیچاری بیٹیوں نے کیا قصور کیا تھا کہ ان کیلئے کچھ بیان نہیں فرماتے؟ جناب والا! صحیح بخاری، جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، اس باب میں ہے، بابِ مناقب فاطمہؑ، مگر بنظر اختصار، بنظر احتیاط، بنظر مصالحت، کتنی نظروں سے، صرف تین احادیث ہیں یعنی پورے بڑے صفحے پر صرف تین عدد حدیثیں ہیں۔ مگر وہ تین عدد بھی کیسی کیسی کہ فرماتے ہیں:

"سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ"۔

"یہ میری بیٹی زنانِ اہل جنت کی سردار ہے"۔

بہشت کی عورتوں کی سردار ہے، بہشت کوئی بنی ہاشم کی خاندانی جاگیر نہیں ہے۔ بہشت وہ ہے جو ایمان و عمل کی جزا کیلئے خلق کی گئی ہے، مہیا کی گئی ہے۔ تو اب بیٹی کو جو فرمارہے ہیں کہ اہلِ جنت کی عورتوں کی سردار ہے۔ ایک مکتبِ خیال رسولؐ کے اقوال و افعال کی بھی تقسیم کرتا ہے۔ بشریت اور رسالت میں کہ کچھ باتیں بحیثیت بشر فرماتے تھے، کچھ باتیں بحیثیت رسول فرماتے تھے۔ جو بحیثیت بشر فرمائیں، وہ تو عام آدمیوں کی طرح ہیں، ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جو باتیں بحیثیت رسول فرمائیں، ان کی دینی اہمیت ہے۔ اس

مکتب خیال کے لحاظ سے، اسی مکتب والوں سے پوچھوں گا کہ بہشت کے بارے میں جو بات ہے، وہ بشر کی حیثیت سے ہے یا رسولؐ کی حیثیت سے ہے؟

اہل جنت کی خبر ہو ہی نہیں سکتی۔ بھیجے گئے ہیں جنت کی اطلاع دینے کیلئے تو جنت کے بارے میں جو فرمائیں، وہ تو بحیثیت رسولؐ ہے، چاہے کئی ہزار باتیں بحیثیت بشر ہوں مگر جنت کے سلسلہ میں جو بات ہوگی، وہ تو بحیثیت بشر ہو ہی نہیں سکتی۔ بحیثیت رسولؐ ہی ہوگی۔ تو اب بیٹی کو جو فرما رہے ہیں کہ زنانِ اہلِ جنت کی سردار ہیں اور جنت خلق ہوئی ایمان وعمل کی جزا کیلئے تو ارشادِ رسولؐ کے معنی یہ ماننا پڑیں گے کہ جو معیار ہے جنت میں جانے کا، وہ میری بیٹی میں اتنی بلندی پر ہے کہ قیامت تک کی کسی عورت کو بھی جنت میں جانا ہو تو وہ فاطمہؑ کے پیچھے چل کر جا سکتی ہے، آگے چل کر نہیں جا سکتی۔

اب نواسوں کے بارے میں جو احادیث ہیں، صحیح ترمذی کی حدیث کہ پیغمبرؐ خدا فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَیْ شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ"۔

یعنی ان افراد کے بارے میں کوئی حدیث جنت سے ادھر تو رکتی ہے ہی نہیں۔ ماں سردارِ زنانِ جنت اور نواسوں کیلئے فرمارہے ہیں کہ سردارِ جوانانِ بہشت۔

یاد رکھئے کہ اگر بچوں کی حالیہ عمر پیش نظر ہوتی تو بچوں کا سردار کہتے۔ جوانوں کا سردار کہنا خلافِ بلاغت تھا۔ یہ کب جوان ہیں جو ان کی مدح میں کہا جائے کہ سردارِ جوانانِ جناں؟ بعد میں جوان ہوں گے تو کہا جائے گا۔ اس وقت جوان کہاں ہیں؟ بہت دور ہے جوانی! اگر ارشادِ رسولؐ میں اس وقت کی عمر معتبر ہو تو سردارِ اطفالِ جنت کہیں، جنت کے بچوں کا سردار فرمائیں۔ لیکن جب یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ سردارِ جوانانِ اہلِ جناں، تو ماننا ہوگا کہ یہاں والی عمر سامنے نہیں ہے، بہشت والی عمر، بہشت والا دورِ حیات سامنے ہے۔ خود ہی فرما چکے ہیں کہ بہشت میں ہر ایک جوان ہی جائے گا تو آپ نے اہلِ جنت کے جوانوں کے سردار بتایا ہے تو جنات! جو کوئی بھی بہشت والا ہے، چاہے جوان ہو، چاہے بوڑھا ہو، اگر جنت میں جانا ہے تو ان کی سرداری ماننا پڑے گی۔

صرف متکلم مستثنیٰ ہوتا ہے اور پھر ایک ہستی جسے خود رسولؐ نے، ایک تمہ ہے اس کا:

"اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَیْ شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَبُوْهُمَا خَیْرٌ مِّنْهُمَا"۔

"یہ میرے دونوں بچے جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے بابا ان سے بہتر ہیں"۔

یوں کہئے کہ سرداروں کے سردار۔ اب یہ ہستیاں ہیں جن میں سے ایک ذوجہتین ہے یعنی دو رُخ رکھتا ہے۔ ایک رُخ رسولؐ سے قرابت کا اور ایک رُخ اللہ سے قرابت کا۔ اس لئے پیغمبرؐ کے افعال بھی دو طرح کے ہو گئے، کچھ اپنی قرابت سے اور کچھ اللہ کے رشتہ سے۔ بیٹی کو گلے لگانا اپنی قرابت کی بناء پر درست ہے۔ جب کسی غزوہ پر جاتے تھے، سب سے آخر میں جناب فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہوتے تھے۔ جب آتے تھے تو سب سے پہلے فاطمہ زہراؑ سے ملاقات فرماتے تھے۔ یہ بیٹی ہونے کی وجہ سے تھا۔

مگر حضور اتعظیم کو کھڑے ہونا، یہ تو اپنی بیٹی ہونے کا تقاضا ہی نہیں ہے۔ یہ عمل خود بتاتا ہے کہ فاطمہ صرف بیٹی نہیں ہیں، کچھ اور بھی ہیں۔ چونکہ میں جنابِ فاطمہ کی فضیلت کی ایک حدیث جو صحیح بخاری میں ہے، بیان کر چکا اور آپؑ کے ساتھ برتاؤ ہے، وہ بھی عرض کر چکا، میں نے عرض کیا کہ جب آپ سمجھتے ہیں کہ اور بھی بیٹیاں ہیں تو اتنی نہیں، اس سے کم درجہ کی کوئی حدیث؟ مگر ان بیچاریوں کے بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

میرے نزدیک تو دینی اہمیت اس چیز کی کوئی ہے ہی نہیں کہ اور بیٹیاں تھیں یا نہیں تھیں۔ یہ علم انساب کا مسئلہ ہے، علم تاریخ کا مسئلہ ہے۔ حضور اور بیٹیاں ہوں یا نہ ہوں مگر نساء کے اندر تو ایک ہی تھیں۔ نصاریٰ نجران کے مقابلہ میں مباہلہ کی منزل میں ایک ہی تھیں۔ سردار زنانِ جنت ایک ہی تھیں۔ تو ہوا کریں بیٹیاں۔ جب خدا اور رسولؐ نے انہیں اہمیت نہیں دی تو ہم انہیں کیوں اہمیت دیں؟

رہی دوسری شخصیت تو معلوم ہے مجھے کہ انساب کے لحاظ سے ان کے دو رشتے ہیں۔ نسبی رشتہ بھی ہے، سببی رشتہ بھی ہے۔ نسبی رشتہ چچازاد بھائی، تو حضور مسلمہ تاریخ کی بات ہے کہ اور بھی چچازاد بھائی تھے۔ خود ان کے سگے بھائی ہیں۔ وہ کیا رشتہ میں فرق رکھتے تھے؟ تین اور تھے، علیؑ تو عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تاریخ کی حقیقت ہے کہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے طالب، طالب سے چھوٹے جعفر اور جعفر سے چھوٹے عقیل، عقیل سے چھوٹے آپؑ اور ہر ایک میں دس دس برس کا فرق۔ طالب سے دس برس چھوٹے جعفر، جعفر سے دس برس چھوٹے عقیل، عقیل سے دس برس چھوٹے جنابِ امیرؑ۔ حضرت علیؑ رسولؐ سے تیس برس چھوٹے تھے۔ یہ دس برس کے تھے تو بعثت ہوئی، رسول کی گود میں پلے تھے، اسی گود میں اسلام آیا تو ان میں اور اسلام میں وہ ربط ہوا جو ایک مربی کی آغوش میں پلنے والے دو بچوں کا ہوتا ہے یعنی اسلام نے آنکھ کھول کر ان کی صورت دیکھی۔

پس چچازاد بھائی تو اور بھی تھے مگر ان میں سے کسی اور کے بارے میں احادیث کیوں نہیں ہیں؟ ان کے بارے میں احادیث ہیں، لیکن ہر ایک اپنی منزل میں ہے۔ طالب، طالب ہیں۔ جعفر، جعفر ہیں۔ عقیل، عقیل ہیں اور علیؑ، علیؑ ہیں۔ جو دوسرا رشتہ داماد کا ہے، ظاہر ہے کہ بیٹیاں ہیں تو داماد بھی ہوں گے۔ جو کسی بیٹی کو نہیں مانتا، وہ داماد کو بھی نہیں مانتا۔ جس کے نزدیک اور بیٹیاں، اُس کے نزدیک داماد بھی اور ہیں۔ جب داماد کئی ہیں تو اوروں کی فضیلت کی تعریفیں بھی ہونی چاہئیں لیکن نہیں ہیں۔

اچھا! جب بیٹی ہو گئی، داماد ہو گئے تو پھر نواسوں کی کیا کمی ہے؟ لیکن وہی جو بیٹی کے سلسلہ میں کہہ چکا کہ وہ سب ہوا کریں۔ سردار جوانانِ بہشت تو یہی دو نواسے ہیں۔ یہ نواسے ہونے کا تقاضا نہیں ہے، ورنہ پھر کسی اور نواسے کیلئے کچھ اور ہوتا۔ یہیں سے علیؑ کی نماز کے بارے میں گفتگو ہو جائے، علیؑ نے انگلی سے اشارہ کر دیا، وہاں بحثیں اٹھائی جاتی ہیں کہ رجوع قلب کے خلاف ہے۔ یعنی نماز ہے، خدا کی فکر ان کو ہے۔ جس کی نماز ہے، وہ تاجِ ولایت اسی سر پر رکھے دیتا ہے۔ ان کو فکر ہے نماز کی۔ انگلی سے اشارہ کیا۔ اس پر بہت مباحث ہیں کہ یہ خلاف رجوع قلب تو نہیں ہے اور پیغمبرؐ نے جو سجدہ کو طول دیا، وہاں کسی صاحب نے بحث نہیں اٹھائی۔ ظاہر ہے کہ خبر ہوئی کہ کون پشت پر آیا، تبھی تو سجدہ کو طول دیا۔

میں کہتا ہوں کہ کردارِ رسولؐ کی بلندی کے لئے یہی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اگر اپنا نواسہ ہونے کی بناء پر طول ہوتا تو خلاف شان

سجود ہوتا لیکن رسولؐ نگاہِ فرض شناس کی ترازو میں مرضیِ الٰہی کے معیار پر تول رہے ہیں، ایک پلڑے میں نماز کو، نہیں! عام رفتار نماز کو اور ایک پلڑے میں حسینؑ۔ اور حسینؑ کا وزن رسولؐ نے مرضیِ الٰہی کی ترازو پر تولا تو عام رفتار نماز پر ان کی خاطرداری کو، مرضیِ الٰہی کے معیار پر قابلِ ترجیح سمجھا۔ چونکہ ترازو کہا ہے، اس لئے ایک لفظ استعمال کروں گا، میں کہوں گا کہ یہ مقاصدِ الٰہی کے ماتحت حسینؑ کا وزن تھا کہ رسول کا سر نہیں اٹھ سکا۔ پیغمبرِ خدا کے پیشِ نظر تھا کہ یہ میری ایک وقت کی نماز اور اس کا سجدہ ہے اور یہ بچہ وہ ہے جس کی بدولت قیامت تک نماز قائم رہے گی۔ میں کہتا ہوں کہ حسینؑ نے کربلا میں اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ میرے ساتھ میرے نانا نے جو بچپن میں کیا تھا، اُس کا میں حقدار تھا۔ جیسے تہہ خنجر یہ اُن کے پیشِ نظر تھا کہ نانا نے میری خاطر سجدہ جو طول دیا تھا تو یہی، جو یہی سجدہ ہو اور گلے پر خنجر ہو؟

اور یہ جو میں نے کہا کہ ان کی بدولت قیامت تک نماز قائم ہوئی، یہ میں نہیں کہہ رہا، ہم جو آئمہ کی سکھائی ہوئی زیارت پڑھتے ہیں:

"اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ"۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ نے نماز کو قائم رکھا۔"

میں کہتا ہوں کہ نماز بھی جیسی کربلا میں پڑھی گئی، تاریخِ عالم میں نہیں پڑھی گئی۔ پیغمبرؐ نے ان کیلئے سجدہ کو طول دیا۔ کوئی بتائے کہ نماز کے کسی عمل کو کب تک طول ہوتا ہے؟ ہر عمل کو طول ہوتا ہے جب تک دوسرا عمل نہیں ہوتا۔ رکوع ہوا اور قیام نہیں ہوا تو قیام کے وقت تک رکوع قائم رہا۔ قیام تھا اور پھر سجدہ میں نہیں گئے تو اس وقت تک قیام کو طول ہوا۔ یعنی طول ہوتا ہے جب تک اس کے مقابل دوسرا عمل وجود میں نہ آئے۔ رسولؐ نے جتنا طول دیا ہو وہ تو ہم کو معلوم ہے۔ اس کی پیمائش ہم کر سکتے ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ ستر مرتبہ ذکر سجود کی نوبت آئی۔ اتنی دیر طول ہوا لیکن حسینؑ نے سجدہ جو کتنا طول دیا؟ میں نے کہا کہ کوئی عمل اتنا طول پاتا ہے جب تک کہ اس کے خلاف عمل نہ ہو۔ بخدا! انہوں نے تو سر سجدہ میں رکھ دیا، پھر سر کو اٹھایا نہیں۔ اب اس سجدہ کی عمر میں کہاں بتا سکتا ہوں۔

میں حسینؑ کے عزاداروں کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ خنجر یاد ہے اور سجدہ یاد نہیں؟ حالانکہ خنجر شمر کا تھا اور سجدہ حسینؑ کا ہے!

14

مودة فی القربیٰ

امام شافعی کے بقول: اے اہل بیتؑ رسولؐ! آپؑ کی فضیلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔

اگر حوادث زمانہ ہمیں محتاج کردے تو ہمیں گھبرانا نہیں چاہئے کہ ہمارے پاس ولائے علیؑ کا خزانہ موجود ہے۔

خدا کی قسم یہ وہ بارگاہیں ہیں جہاں پروانوں کی کثرت ہمیں ناگوار نہیں ہوسکتی۔

اہل بیتؑ اطہار کی ایک حیثیت جناب رسولؐ خدا کے قربتداروں کی تھی اور دوسری حیثیت یہ تھی کہ یہ اللہ کی طرف راستہ دکھانے والے ہیں۔

جب اسلام پر مصیبت پڑی اور اس کو سب سے قربانی کی ضرورت پڑی تب بھی اس کو منتخب کیا گیا اس عظیم ترین قربانی کے لئے جسے کاندھے پر چڑھاتے، جسے سینے پر سلاتے تھے۔

میں حالات کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ جتنی نواسوں کی ناز برداریاں تھیں وہ سب اسی لئے تھیں کہ یہ اسلام کے کام آئیں گے جس کی تبلیغ میرا فریضہ ہے۔

مودة فی القربیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"۔

خالق کریم اپنے پیغمبر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے کہ کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ اپنی خدمت کا نہیں مانگتا سوائے صاحبانِ قرابت کی محبت کے۔ میں نے عرض کیا کہ جب یہ "اِلَّا" درمیان میں آگیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی طرف سے حکم آیا ہے کہ آپ ایک اجر کا مطالبہ کریں اور وہ اجر ہے صاحبانِ قرابت۔ کچھ لوگوں نے گرامر کی چھان بین سے ایک صورت نکالی کہ "اِلَّا" کا لفظ دو قسم کا ہوتا ہے۔ "اِلَّا" استثنیٰ کیلئے ہوتا ہے اور استثنیٰ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک استثنائے متصل اور ایک استثنائے منقطع۔

استثنائے متصل تو یہی ہوتا ہے کہ ایک عام مفہوم ہے، کوئی چیز اس میں داخل تھی اور "اِلَّا" کے ذریعہ اُسے خارج کر دیا گیا، باہر نکال دیا گیا۔ کوئی الٰہ نہیں۔ اللہ بھی داخل ہے اور "اِلَّا" نے اللہ کو اس نفی کے دائرہ سے خارج کر دیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ہے۔ یہ ثبوت ہو گیا:

"وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ"۔

ہم نے نہیں بھیجا ہی نہیں۔ اس میں بالکل ہی نفی تھی۔ "اِلَّا" نے بتایا کہ نہیں "رحمۃ اللعالمین" بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ مثالیں ہیں استثنائے متصل کی۔ استثنائے منقطع میں چیز داخل ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایک علیحدہ چیز ہوتی ہے۔ بعد میں اس کا ذکر کر دیا جاتا ہے، "اِلَّا" کے بعد۔ اس "اِلَّا" کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس دائرے میں کسی چیز کی کمی کی جائے اور اس کے اندر سے کسی چیز کو خارج کیا جائے۔ یہ "اِلَّا" جو ہے، اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے، ہاں یہ بات ہے، اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا، ہاں! قرابت کا لحاظ کرو۔ یہ "ہاں" کہہ کر ایک بات کہہ دی گئی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ اجر ہے۔ اس کوشش کا ماحصل یہ ہوا کہ اجر کے ثبوت والی بات باقی نہ رہی۔ اس کی مثالیں بھی دوں گا کہ "ہاں" کے بعد جو بات کہی جائے، وہ پہلے جزو سے بالکل غیر متعلق تو نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ تو اس کا ربط ہوگا۔ مثال کے طور پر:

"جَآءَ مِنَ الْقَوْمِ اِلَّا حِمَارٌ"۔

"پوری قوم میرے ہاں آئی، ہاں! گھوڑے گدھے نہیں تھے"۔

کسی رئیس نے پورے شہر کی دعوت کی۔ دوسرے دن کسی سے اس کا حال اُس نے بیان کیا کہ تو یہ کہا کہ تمام قوم میرے ہاں آئی۔ ہاں! گھوڑے گدھے نہیں آئے یعنی گھوڑے گدھے قوم میں داخل ہی نہیں ہیں۔ تو ایسی چیز کو کہا جو چیز پہلے جزو میں داخل تھی ہی

نہیں۔ یہ تھی مثال استثنائے منقطع کی۔ دیکھئے! تمام قوم آئی۔ آنے ہی کے ذکر میں ہے گھوڑے گدھے نہیں آئے۔ یعنی جو بات پہلے تھی کہ آئے، وہی گھوڑے گدھوں کیلئے ہے، نہیں آئے۔ اس سے دراصل زور پہلے کلام میں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی قوم تو پوری آئی لیکن گھوڑے گدھوں کو اگر سمجھ لو کہ قوم میں ہیں تو وہ بے شک نہیں آئے۔ رہا ذکر آنے کا، اُس آنے کی بات میں طاقت پیدا کرنے کیلئے ایک ایسی چیز کا نام لے دیا جس کا شمار کوئی بھی قوم میں نہیں کرے گا۔ مگر وہ بات رہے گی۔

اسی سے متعلق ''ہاں'' کہہ کر کوئی ایسی چیز نہیں کہی جاسکتی جس کا پہلے سے کوئی جوڑ نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ کوئی یہ کہے کہ تمام قوم میرے ہاں آئی مگر میں کبھی بمبئی نہیں گیا ہوں۔ کوئی صحیح طور پر کلام کرنے والا کیا اسے صحیح سمجھے گا؟ نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ آخر کا جزو پہلے جزو سے غیر متعلق ہو گیا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کہے کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے مگر فلاں شہر کے لوگ بڑے شاعر ہیں۔ اب بتائیے کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے، اس کا دوسرے شہر کے لوگوں کے اچھا شاعر ہونے سے کیا واسطہ ہے؟ یہ بات تو اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہنسی آگئی۔ ایسی چیز جو عام کلام میں بے جوڑ اور نامناسب ہو، کیا (معاذ اللہ) کلامِ الٰہی میں اس کی مثال ہو سکتی ہے؟ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اب اجر ہی کے متعلق کوئی بات کہی جائے، تو اس کا جزو ہوگا اور میں کچھ اجر نہیں چاہتا، ہاں! اپنے قرابت داروں کا خیال رکھو۔ اگر اس کا اجر سے کوئی تعلق ہے تو پہلے کلام سے اس کا رابطہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بس کسی بات کے نہ ماننے کی کوشش ہے۔ چاہے انکار بنے یا نہ بنے۔ کچھ نہ کچھ وجہ انکار بنانا ہی ہے۔ اب آئیے قرآن مجید سے پوچھوں کہ پیغمبرؐ نے اجر مانگا ہے یا نہیں؟ اس توجیہ کا خلاصہ تو یہ تھا کہ اجر مانگا ہی نہیں۔ اب اگر قرآن کہے کہ اجر مانگا ہے تو پھر تو آپ مانئے کہ یہ ''اِلَّا'' ویسا ہی ہے جو ''اِلَّا اللہ'' میں ہے، جو ''وَمَا اَرْسَلْنٰكَ'' کے ساتھ ہے۔ پھر یہ وہی ''اِلَّا'' ہے، کوئی دوسرا نہیں ہے۔ قرآن کی آیات پڑھتا ہوں، دیکھئے کہ اجر مانگا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگوں کے ذہن میں اعتراضات تھے کہ یہ ان کا اجر مانگنا خلاف شان ہے، اس کا جواب قرآن مجید نے دوسری آیت میں دیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ کب مانگ رہے ہیں، خدا کہہ رہا ہے کہ مانگو۔ دوسری آیت جس میں اس اعتراض کا جواب ہے۔ وہ حافظانِ قرآن کو تو یاد ہونی چاہئے۔ خیر! اب میرے کہنے سے یاد کر لیں۔ یہ بھی خالق نے رسولؐ کی زبانی کہلوایا ہے: وہ کیا ہے کہ:

"مَا سَئَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ".

''ارے'' میں نے جو اجر مانگا ہے، وہ تمہارے لئے ہی ہے''۔

کوئی ناظرہ خواں ہو، وہ تلاش کر کے دیکھ لے کہ قرآن میں یہ آیت ہے یا نہیں۔ جو حافظِ قرآن ہے، وہ یاد کر کے دیکھ لے کہ قرآن میں یہ آیت ہے یا نہیں۔

"مَا سَئَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ".

''جو میں نے اجر مانگا ہے، وہ تمہارے ہی لئے ہے''۔

تو معلوم ہوا کہ اجر کچھ مانگا ہے ورنہ یہ کہنے کے کیا معنی تھے؟ اب جو کچھ مانگا ہے، وہ کس آیت میں مانگا ہے؟ یا تو دوسری کوئی آیت پڑھے یا ''قُلْ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا'' کو مان لے۔ اس آیت سے اس آیت کو ملا کر نتیجہ نکالئے۔ یہ اس آیت نے کیا کہا؟ وہ آیت کہہ رہی ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے صاحبانِ قرابت کی محبت کے اور یہ آیت کیا کہہ رہی ہے؟ جو میں نے اجر مانگا ہے، وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ یعنی نہ اپنے فائدہ کیلئے، نہ صاحبانِ قرابت کے فائدہ کیلئے، نہ اس سے میرا فائدہ ہے یعنی تم محبت کرو تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم محبت نہ کرو تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اس کی مثال دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ رسولؐ اور ذوی القربیٰ کی بات ہے۔ مگر میں اللہ تعالیٰ کی منزل سے چل کر اترتا ہوں، یہاں تک کہ منزل ارتقاء سے اتر کر ان کی منزل تک آتا ہوں۔ ارے کبھی ادھر والا اُدھر جاتا ہے، کبھی ستارہ اُدھر ٹوٹ کر ادھر آتا ہے۔

قرآن مجید کہہ رہا ہے:

''فَذَكِّرْ اِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔''

یاددہانی کرتے رہئے۔ وہ یاددہانی اہلِ ایمان کے فائدہ کا باعث ہے۔ اب جس جس چیز کی یاددہانی رسولؐ نے کی ہے، وہ ان کے فائدہ کیلئے نہیں ہے جن کی یاددلائی جارہی ہے، اہلِ ایمان کے فائدے کیلئے ہے۔ تو سب سے مقدم یاداللہ کی۔ انہوں نے اللہ کی یاد طرح طرح سے دلوائی۔ یادِ الٰہی کو جزوِ حیات بنادیا۔ حضور! اسلام میں یادِ الٰہی جزوِ زندگی ہے۔ دوسرے مذاہب میں اللہ خاص اوقات میں یاد کیا جاتا ہے اور اسلام میں اللہ کو یاد رکھا جاتا ہے۔ تو اللہ کے یاد کرنے سے کیا اللہ کا فائدہ ہے؟ کوئی بندہ اللہ کا تصور کرے کہ میرے یاد کرنے سے اس کا فائدہ ہے، بے نیاز مطلق ذات۔ دنیا مل کر سر کو سجدے میں رکھ دے تو اس کے جاہ و جلال میں ذرہ بھر اضافہ نہیں ہوگا اور تمام دنیا مل کر منکر ہو جائے تو اس کے جلال و جبروت میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔ اس کو یاد کرنا ہے تو اس کے فائدے کیلئے نہیں، بندوں کے فائدے کیلئے ہے۔

دوسری یاد رسولؐ کے ذریعے خالق نے دنیا کیلئے فرض قرار دی، وہ خود رسولؐ کی یاد ہے اور اس رسولؐ کی یاد کیلئے رسولؐ کا ذکر جزوِ اذان بھی، جزوِ اقامت بھی۔ جناب! اذان و اقامت نماز کا لازمی جزو نہیں ہیں۔ بڑی تاکید ہے مگر جزوِ نماز نہیں ہے۔ مگر خود نماز میں، درود میں کسی کو اختلاف ہو، حالانکہ امام شافعی نے جو ان چار اماموں میں سے ہیں جن میں سے ہر ایک کی پیروی معیارِ نجات مانی گئی ہے، تو وہ امام شافعی فرما رہے ہیں، اہلِ بیتِ رسولؐ سے خطاب کر کے:

''كَفَاكُمْ مِنْ عَظِيْمِ الْقَدْرِ اَنَّكُمْ مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلٰوةَ لَهٗ۔''

''اے اہلِ بیتِ رسولؐ! آپ کی فضیلت کے لئے یہ کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے، اس کی نماز ہی نہیں ہے۔''

مگر خیر! پھر بھی کوئی مکتبِ خیال ایسا ہو جو درود کو ضروری نہ سمجھے تو دیکھئے کہ یہ درود سے پہلے جو تشہد ہے، اس تشہد میں جس طرح:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

کہنا ضروری،

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ"

اسی طرح

"اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیؐ اس کے بندۂ خالص اور رسولؐ ہیں''۔

تو اب ہر دعویدار ایمان مسلمان سے کہوں اور بغیر دعویٰ ایمان کے اسلام ہوتا ہی نہیں تو جو مسلمان ہے، وہ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا یہ تصور اسلام میں گنجائش رکھتا ہے کہ رسولؐ نے اپنے نام کو جزو نماز بنا دیا۔ یاد رکھئے! اگر یہ تصور ہو گیا تو اسلام گیا۔ کسی فرقہ کا ذکر نہیں، اس کی کسی فرقہ اسلامی میں قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ ماننا پڑے گا کہ رسولؐ کی یاد کو خدا نے جزو نماز بنایا۔ تو کیا اس سے رسولؐ کو فائدہ پہنچانا تھا؟ اگر نماز سے اللہ کو فائدہ نہیں تو نماز کے کسی جزو سے رسولؐ کو فائدہ پہنچانا مدِ نظر نہیں ہے۔ جس طرح نماز سے نمازی کو فائدہ ہے، اسی طرح تشہد پڑھے گا تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس کا نمازیوں میں شمار ہوگا۔ رسولؐ کو فائدہ نہیں ہوگا۔ جس طرح خدا کی یاد سے خدا کا کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح قرابت داروں کی محبت سے ان قرابت داروں کو کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایک آیت میں پڑھی:

"مَا سَئَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ"۔

''جو میں نے اجر مانگا ہے، وہ تمہارے ہی لئے ہے۔''

یہ ''لام'' عربی میں نفع کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی اہل بیتؑ کے نفع کیلئے نہیں ہے۔ ذوی القربیٰ کے نفع کیلئے نہیں ہے، تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ مگر ابھی یہ غور طلب ہے کہ یہ فائدہ کونسا ہے؟ اہل بیت رسولؐ کو دوست رکھو گے تو تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اب اہلِ بیت رسولؐ کو دوست رکھنے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟ کیا بہت دولت مند ہو جائیں گے؟ تو صاحب مشاہدہ تو یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کے دوست زیادہ تر پریشان حال رہے۔ یہ کوئی بے تکی کی بات نہیں ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ہمارے دوستوں میں محسوب ہونا چاہے اُسے فقیری لباس پہننے کیلئے تیار ہو جانا چاہئے۔ وہ خدا کی نعمت سے دولت مند ہو بھی جائے مگر محبتِ الٰہی کی بناء پر تیار رہنا چاہئے کہ اگر حوادثِ زمانہ مجھے محتاج بھی کر دیں، تب بھی میرے پاس ولائے علیؑ کا خزانہ ہونا چاہئے۔

اس سے مجھے یاد آ گیا، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں دوستانِ اہلِ بیتؑ میں سے ایک شخص نے ایک دن گویا ایک طرح کا شکوہ کیا۔ ہر شخص تو پہلے سے اتنا بلند نظر نہیں ہوتا، یہی حضرات رفتہ رفتہ لوگوں کو بلند نظر بناتے تھے۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے اللہ سے شکوہ کر دیا تو اس نے امام کی بارگاہ میں ایک طرح کا شکوہ کیا کہ حضور! جتنے آپؑ کے دوست ہیں، سب فقر و فاقے میں مبتلا ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: اچھا! تم بھی فقر و فاقہ میں مبتلا ہو؟ عرض ہو؟ عرض کیا: کیا بتاؤں، کیا حال ہے؟ خود اپنے اوپر گزر رہی تھی، جبھی تو یہ احساس ہوا

تھا۔آپؑ نے فرمایا: میں تو سمجھتا ہوں کہ بڑے دولت مند ہو۔

اُس نے کہا: حضورؑ! میں آپ بیتی عرض کرر ہا ہوں اور دوسروں کا حال بھی مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے۔آپؑ نے فرمایا: نہیں، تم سوچ نہیں رہے ہو، تم سے بڑھ کر کون دولت مند ہوگا؟ اُسے پھر اسی طرح حیرت ہوئی۔آپؑ نے فرمایا کہ سچ بتاؤ کہ جو بڑے سے بڑا دولت مند ہے، وہ پوری دولت دے اور یہ کہے کہ ولائے اہلِ بیتؑ چھوڑ دو تو تم چھوڑنے کیلئے تیار ہو جاؤ گے؟

اُس نے کہا: حضورؑ! کتنی بھی دولت ہو، اُسے ٹھکرا دوں گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ولائے آلِ محمد کو چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا: پھر تم سے بڑھ کر کون دولت مند ہے؟

خالق نے اپنے نبیؐ سے کہہ دیا کہ جو اجر مانگا ہے، وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ تمہارے ہی فائدے کیلئے ہے۔ تو فائدہ کیا؟ انہیں بہت دولت ملے گی؟ تو میں نے کہا کہ انہیں اس کے خلاف کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ مل جائے دولت تو اللہ کی نعمت ہے، لیکن دولت اس ولا کے مقابلہ میں کوئی چیز نہ سمجھے۔

عرب کے شاعر نے کہا ہے اور وہ حدیث سے بھی ثابت ہے:

"مَا اَحْسَنَ دِیْنٌ وَالدُّنْیَا اِذَا اجْتَمَعَا"۔

کیا کہنا کہ دین و دنیا کسی کے پاس اکٹھے ہو جائیں۔ اسلام دین رہبانیت تو ہے نہیں کہ یہاں دین اس وقت تک نہ ملے جس وقت تک دنیا کو بالکل چھوڑ ہی نہ دو۔ یہ تو رہبانیت کے دین کا نظام ہو سکتا ہے، اسلام کا نظام یہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو ہے نہیں کہ محبت اہل بیتؑ سے دولت بہت ملتی ہو، عزت بہت ملتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اکثریت کی نگاہ میں تو گر جائے گا جب ان کے خلاف راستہ اختیار کرے گا۔ تو اہلِ دنیا کے ہاں عزت کہاں ملے گی؟ شہرت بہت ہو۔ ہاں! اُن کے نزدیک تو ہم گویا بدنامی کا مرکز ہیں۔ تو اگر بدنامی والی شہرت ہو تو ہو سکتی ہے لیکن جب دنیا اس نعمت کی قدر نہیں جانتی تو وہ اپنے درمیان شہرت نیک کیوں دینے لگی؟ تو گویا مبہم بات ہے کہ ہمارے فائدے کیلئے ہے۔ تو آخر وہ فائدہ کیا ہے جو اس سے ہمیں حاصل ہو سکتا ہے؟

دوسری جگہ یہ فائدہ قرآن نے بتایا ہے۔ سب آیات ایک دوسرے کی تشریح کر رہی ہیں۔ وہاں کہا کہ سوائے مودة فی القربیٰ کے کچھ نہیں چاہتا، دوسری جگہ بتایا کہ جو اجر میں نے مانگا ہے، وہ تمہارے لئے ہے، تیسری آیت میں تشریح ہوتی ہے کہ ہمارے لئے ہو کیا ہے تو ارشاد ہو رہا ہے:

"لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا"۔

اسی طرح کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔

"اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا"۔

''سوائے اس کے کہ کوئی اپنے پروردگار کی طرف راستہ ڈھونڈنا چاہے''۔

اب سب کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوا کہ اللہ کا راستہ اسی وقت ملے گا جب ذوی القربیٰ سے مودت ہو گی۔

اس لئے یہ تمام بحثیں برائے بحث ہیں ورنہ ضمیر اسلامی میں یہ راسخ ہے کہ یہ ذوی القربیٰ ہیں اور انہی کی محبت اجر رسالت ہے اور آیہ مودۃ سے یہی مراد ہے اور اس کا ثبوت وہ کتابیں ہیں جو علمائے اہلِ سنت نے خاص اسی موضوع پر، اسی آیت کو سامنے رکھ کر کتابوں کے نام رکھے ہیں۔ میں ان کتابوں کے نام لیتا ہوں اور حقیقت میں تاریک مرقعوں ہی کو سامنے رکھنا ضروری نہیں۔ ایسے مرقعوں کو سامنے رکھنا بھی اتحاد بین المسلمین کیلئے ضروری ہے کہ قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام محمد ابن سلیمان بلخی قندوزی نویں صدی ہجری کے عالم ہیں اور قسطنطنیہ میں کتاب لکھتے ہیں اور اس کا نام کیا رکھتے ہیں: ''ینابیع المودۃ''، مودۃ کے سرچشمے۔''

یہ مودۃ کا لفظ ان کے ذہن میں کہاں سے آیا؟ آیہ مودۃ سے۔ چنانچہ انہی ذوی القربیٰ کے مناقب میں کتاب ہے اور اس کا نام یہی ہے ''ینابیع المودۃ''۔ کہاں سے نام آیا؟ اگر یہ آیہ مودۃ کے یہی معنی ان کے ذہن میں نہ ہوتے اور جناب سید علی ہمدانی کشمیر میں مسلمانوں کی جتنی مردم شماری ہے، یہ سب سید علی ہمدانی کی مرہونِ منت ہے۔ یہ جو اکثریت مسلمانوں کی کشمیر میں ہے یہ سید علی ہمدانی کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ ان کی کتاب ہے کیا اس کا نام بالکل قرآن سے لیا گیا: ''کتاب مودۃ فی القربیٰ'' المودۃ فی القربیٰ والی کتاب۔ اور اس میں انہی حضرات کے فضائل و مناقب ہیں۔ جدید دور میں مجھے معلوم نہیں کہ اس کی کوئی شرح لکھی گئی ہے یا نہیں۔

علامہ حائری کے والد بزرگوار مولانا ابوالقاسمؒ نے اس کا ترجمہ اور شرح فارسی میں کی تھی جو میری نظر سے گزری ہے۔ علامہ حائری قمی کہلاتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار ابوالقاسم قمی نے اس کا ترجمہ اور شرح فارسی میں لاہور میں کی تھی۔ ان کتابوں کے ناموں میں تو لفظ ہی مودۃ کا رکھا گیا ہے۔ اب جو نتیجہ ہے، مودۃ کا، اس کیلئے کتابوں کے نام سنئے۔ کتابوں کے نام سے آپ لکھنے والوں کے اعتقاد کو بھی محسوس کیجئے۔ ہمارے ہاں فرنگی محل مرکزِ علم رہا ہے۔ وہاں کے عالم ملا محمد مبین کی کتاب منطق کی شرح سلم ایک وقت میں منطق میں داخل کورس رہی ہے۔ وہ ملا محمد مبین فرنگی محل کے تین سو صفحات کی کتاب لکھتے ہیں۔ اس کا نام ہے ''وسیلۃ النجات''۔ مناقب پنجتنؑ پاک میں ہے۔ یقیناً ان کے سامنے یہ آیت ہے:

''اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا''۔

''بس ان سے محبت کرو تا کہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ملے''۔

وسیلۃ النجات، نجات کا ذریعہ، نجات کا وسیلہ، اور حافظ محب الدین طبری اور یہ حافظِ قرآن کے معنوں میں نہیں تھا بلکہ یہ علم حدیث کی اصطلاح تھی جس کو تیس ہزار احادیث بمع متن و سند یاد ہوں، وہ حافظ کہلاتا تھا۔ تو متاخرین میں حافظ محب الدین طبری اور ان کے بعد حافظ جلال الدین سیوطی۔ بس سیوطی کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نام کے ساتھ حافظ آتا ہو۔ یہ حافظ محب الدین طبری کی کتاب کیا ہے، اس کا نام بھی دیکھئے اور پھر اس کے موضوع پر جو اظہار کیا ہے، اس میں آیہ مودۃ کو جھلکتا ہوا دیکھئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ۔

علامہ عبدالقادر عدیلی شافعی جو یمن کے عالم تھے، ان کی کتاب ہے ''ذخیرۃ المآل فی مناقب الآل''۔ مال یعنی انجام۔

انجام کا ذخیرہ انجام کا ذخیرہ اسی گھر پر ملتا ہے۔ وہ اِدھر اُدھر کہیں نہیں ملتا۔ ذخیرۃ المآل فی مناقب الآل۔ علامہ عبدالقادر عدیل شافعی کی کتاب ہے۔ ان ناموں سے آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والے کا اعتقاد کیا ہے اور لکھنے والا آیۂ مودۃ کی کس تفسیر کا قائل ہے اور وہ ذوی القربیٰ کو کیا سمجھتا ہے؟

یہ چند نام جو ذہن میں آ گئے، وہ پیش کر دیئے اور بھی یقیناً بکثرت کتابیں ہیں۔ اس سے مجھے بہت ہی کیف حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت کتابیں اس رُخ سے ہوتی تھیں کہ صرف تم ہی محب اہلِ بیت نہیں ہو، ہم بھی محب اہلِ بیتؑ ہیں۔ دیکھو! بارہ اماموں کے مناقب ہم کو کتنے یاد ہیں۔ خدا کی قسم! یہ وہ بارگاہیں ہیں جہاں پروانوں کی کثرت ہمیں ناگوار نہیں ہو سکتی۔

یہاں تک کہ ہماری شدید ترین مخالفت میں لکھی جانے والی کتاب، سب سے زیادہ کثیر الاشاعت کتاب، ہمارے فرقہ کی رد میں ہے، "تحفۂ اثناء عشریہ"۔ عام لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ جماعتِ اثناء عشریہ کو بطور طنز ایک تحفہ دیا گیا ہے۔ ذہن میں تو یہی آتا ہے کہ تم پر طنز ہے کہ ایک تحفہ ہمیں دے رہے ہیں لیکن جو اس کتاب کو پڑھے تو اُسے دیباچے ہی سے پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے دیباچے میں لکھا ہے۔ یہ اس کے ترجمے میں دیکھ لیجئے، اگر یہ بات ترجمے میں موجود ہے تو صحیح ترجمہ ہے نہیں تو تصرف ہوا ہے۔ انہوں نے دیباچے میں لکھا ہے:

میں نے اس کتاب کا نام تحفۂ اثناء عشریہ، آئمہ اثناء عشر کی تعداد کے مطابق تبرک کیلئے لکھا ہے۔ اسی لئے اس پوری کتاب میں بارہ باب لکھوں گا اور ہر باب میں بارہ فصلیں ہوں گی۔ شروع سے لے کر آخر تک بارہ اماموں کو یاد رکھوں گا۔ تو مخالفِ اہلِ بیت بھی جب کتابیں لکھتے تھے تو ان کا انداز یہی ہوتا تھا کہ اہلِ بیتؑ کے دامن کو نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ دعویٰ اسی کا تھا کہ ہم بھی محب اہلِ بیتؑ ہیں۔

پس ان آیات کے پڑھنے کے بعد آیۂ مودۃ کا مفہوم بالکل صاف ہو گیا۔ ایک بات جو کل بھی عرض کر رہا تھا، وہ یہ کہ جب قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمہارے ہی لئے ہے اور تمہارے لئے اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے تو کیا اب رسول کا فرض نہیں ہے ان ذرائع نجات کو بتانا؟ رسولؐ کا کام ہے اللہ کی طرف دعوت دینا۔ تو جن ہستیوں کے ذریعہ اللہ کا راستہ ملے، رسولؐ کا بحیثیت رسول فرض ہے کہ ان کا وضاحت سے تعارف کروائیں اور اسی لئے دو آئمہ اہلِ سنت کا متفق علیہ ارشاد ہے، ایک امام احمد بن حنبل، یہ بھی آئمہ اربعہ میں سے ہیں جیسے امام شافعی ایک ہیں، ویسے ہی امام احمد بن حنبل۔ دوسرے حافظ ابن معین۔ ان دونوں کا متفق علیہ ارشاد ہے جسے علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں درج کیا ہے:

"لَمْ یَرِدْ فِیْ حَقِّ اَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ مِنَ الْفَضَائِلِ الصِّحَاحِ مَاوَرَدَ فِیْ عَلِیِّ ؑ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ؑ۔"

"صحابہ میں سے کسی کے بارے میں اس قدر معتبر اور مستند احادیث وارد نہیں ہوئیں جتنی حضرت علیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں"۔

مگر عجب ستم ظریفی ہے کہ اسی کثرتِ فضائل کو بعض حضرات نے اس کے کمزور ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ عجیب منطق ہے۔ چونکہ بہت زیادہ فضائل ہیں، اس لئے اس کی اصلیت نہیں۔ بابائے اُردو جناب عبدالحق نے ایک کتاب لکھی ہے: ''چند ہم عصر''۔ یعنی اپنے دور کے عظیم لوگوں میں سے چند لوگوں کو منتخب کر کے ان کے حالاتِ زندگی تحریر کئے ہیں۔ ہمارے ہاں سرکاری امتحانات کے کورس میں اُردو کے شعبہ میں داخل ہے۔ ان شخصیات میں سے ایک شخصیت سید علی بلگرامی کی ہے۔ یہ واحد شیعہ شخصیت ہے جن کے حالات میں وہ تحریر کرتے ہیں۔ یہ راوی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے یا نہیں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہم تو بات کو دیکھتے ہیں، کہنے والا کوئی ہو، اُنہوں نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ تھے لیکن بڑے انصاف پسند تھے۔ یہیں سے آپ تیور محسوس کریں۔ شیعہ تھے مگر بڑے انصاف پسند تھے وہ کہتے کہ پنجتنؑ کے بارے میں اتنی احادیث ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رسولؐ اللہ کو کوئی اور کام نہ تھا، سوائے اس کے کہ ہر وقت بیٹی کی تعریف، نواسوں کی تعریف، داماد کی تعریف۔ بس ہر وقت جیسے یہی کام تھا۔ پنجتنؑ میں رسولؐ اللہ بھی شامل ہیں۔ دراصل بات باقی چاروں کے بارے میں ہورہی ہے۔ تو جیسے رسولؐ اللہ کا یہی کام تھا اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دو چار حدیثیں ہوتیں تو ہم مان لیتے۔ اتنی کثرت سے احادیث ہیں کہ ذہن قبول ہی نہیں کرتا۔

بعض اوقات انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اظہار خیال پر شرمندہ ہو جائے۔ چاہے کوئی شرمندہ ہو، میں تو شرمندہ نہیں ہوں گا، خواہ بلگرامی فرماتے، خواہ جنہوں نے لکھا ہے، وہ کہتے۔ میں یہ نہ دیکھتا کہ کس جماعت کا آدمی ہیں۔ آپ کے ہاں غلط بات ہے تو بہر حال غلط بات ہے، کوئی بھی کہنے والا ہوتا، میں شرمندہ نہ ہوتا۔

جناب والا! یہ جو آپ کہہ رہے ہیں، یہ ایسا ہے جیسے کوئی بہت دفعہ پیغمبرِ خدا کے پاس گیا ہو اور بعد میں آ کر وہ کہے کہ ان کو تو کوئی کام ہی نہیں، بس ہر وقت قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ جب بھی ان کے پاس گیا، قرآن پڑھتے دیکھا۔ انہیں تو اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ بتایئے کہ شرمندہ ہو جانا چاہئے۔ کوئی یوں کہتا تو میں کہتا کہ جناب اسی قرآن کے پہنچانے کیلئے آئے ہیں یہ اس دنیا میں۔ تو ہر وقت قرآن نہ پڑھیں تو کیا توریت پڑھیں؟ کیا انجیل پڑھیں؟ زبور پڑھیں؟ سرکاری تصنیف کردہ کوئی کتاب پڑھیں؟ جس قرآن کو پہنچانے کیلئے آئے ہیں، وہی کام کر رہے ہے۔ میں قائل نہیں ہوا اور شرمندہ نہیں ہوا۔

ویسے ہی میں کہتا ہوں کہ یہ آپ کا سوال ایسا ہی ہے کہ ہر وقت قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ اسی کتاب کے پڑھنے کیلئے تو یہ بھیجے گئے ہیں تو اب ہر وقت اپنی اولاد ہی کی باتیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ تو قرآن کی جو تعلیم ہے، اُس کے ان سے زیادہ حسین مرقعے اگر اور کوئی ہوتے تو انہیں پیش کیا کرتے۔ آجکل تو فن تعلیم بھی ایک علم ہو گیا ہے۔ باقاعدہ سکول ہیں، کالج ہیں جہاں معلم بنائے جاتے ہیں۔ تعلیم دینا سکھایا جاتا ہے۔ اس میں ایک تازہ تحقیق ہے، ایک تصور ہے کہ تعلیم کے دو طریقے ہیں، ایک براہِ راست تعلیم اور ایک بغیر راہِ راست تعلیم۔ اور فیصلہ یہ دیا ہے کہ براہِ راست تعلیم اتنی کارگر ثابت نہیں ہوتی جتنی بالواسطہ۔ میں نے لفظ بدل دیا ہے۔ پرانے زمانہ کا طریقہ تھا کہ حروف تختی پر لکھے اور انہیں یاد کروانا شروع کر دیا۔ یہ ہے براہِ راست تعلیم اور بالواسطہ تعلیم یا بغیر راہِ راست تعلیم یہ ہے کہ وہ پھل دکھایئے جن میں وہ حروف آتے ہیں، وہ کھلونے دکھایئے جن میں وہ حرف آتے ہیں، وہ تصاویر دکھایئے جن میں وہ حرف آیا کرتے

ہیں۔ یہ بالواسطہ تعلیم۔ بچہ سمجھے گا کہ ہم بس تصویریں دیکھ رہے ہیں یا کھلونے دیکھ رہے ہیں اور جب اس کام نام یاد ہوگا تو وہ حرف یاد ہو جائے گا جو اس کے نام میں ہے۔

تو جب اس کو نام یاد ہو گئے تو اتنے حرف اس کو یاد ہو گئے۔ جو تعلیم کا مقصد تھا، وہ تفریح کے ذریعے پورا ہو جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں کہ زیادہ کارگر ہے۔ بچے کیلئے ذہن نشین کرنا بہت آسان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا کو یہ حال آج معلوم ہوا اور خدا اور رسولؐ کو دونوں طریقے پہلے سے معلوم تھے۔ قرآن پڑھا جاتا تھا۔ وہ براہ راست تعلیم تھی اور جو صورتیں دکھائی جاتی تھیں، وہ بالواسطہ تعلیم تھی۔

ان ہستیوں کی ایک حیثیت رسولؐ کے قرابت داروں کی تھی اور دوسری حیثیت یہ تھی کہ یہ اللہ کی طرف راستہ دکھانے والے ہیں اور یہ تعلیمات اسلام کا مرقع تھے۔ اس لئے اللہ کو مقصود تھا ان کے فضائل کا بیان ہونا اور مقصود تھا ان کی محبت کی تبلیغ کرنا۔

اب رسولؐ کے ایک افعال قرابت کی محبت کی وجہ سے ہیں اور رسولؐ کے ایک افعال اُس رشتہ کی وجہ سے ہیں جو ان کا اللہ کے ساتھ ہے۔ ہمیں یہ دونوں حیثیتیں رسولؐ کے افعال میں نظر آتی ہیں۔ شواہد کل پیش کئے تھے۔ دنیا والے بے شک کہتے پھریں، جس کیلئے تاویلیں ڈھونڈی جاتی ہیں اور آیتوں کے معنی میں علم آزمائی کی جاتی ہے، یہ اس وقت بھی کہا جاتا تھا کہ پیغمبر خدا ان ہی چند آدمیوں کو بہت زیادہ نمایاں کرتے ہیں، خصوصاً اس ایک ذات کو ہر جگہ میدان میں بھیج دیتے ہیں۔ ہر بات میں وہی پیش پیش، ہر چیز میں وہی آگے آگے، کسی اور کو بڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ بیچارے خدمتِ دین کیلئے تڑپ تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ نصرتِ اسلام کیلئے بیتاب ہوتے ہیں اور انہیں موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ ہمارا ایمان آیاتِ قرآنی کی پشت پناہی پر ہے کہ افعالِ رسولؐ سب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوتے ہیں۔ مگر یہ دنیا کی زبان بندی کیلئے کسی وقت اللہ کی مصلحت ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ کے عمل کو اپنے عمل سے الگ کر کے دکھائے۔

چونکہ رسولؐ پر یہ الزام تھا کہ یہ آگے بڑھاتے ہیں تو اللہ کی مصلحت اپنے رسولؐ کو اس الزام سے بری کرنے کیلئے اکثر یہ ہوئی ہے کہ رسولؐ کو خاص ہدایت نہ کی جائے اور خود ان کی طرف سے کام ہو اور پھر میری طرف سے اس کے متعلق میری ہدایت آئے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ یہ رسولؐ کا ذاتی عمل نہیں ہے کہ آگے بڑھاتے ہیں۔ ورنہ ہر صاحبِ فہم غور کرے کہ اللہ بعد میں تو وحی بھیج سکتا تھا کہ سورۂ برات کی آیات کس کو دے کر بھیجئے، کس کے سپرد کیجئے۔ یہ پہلے ہی نہیں کہہ سکتا تھا؟ ماننا پڑے گا کہ خالق کی حکمت تھی کہ پیغمبر خدا کسی اور کو بھیج دیں اور پھر میں واپس بلواؤں ورنہ (معاذ اللہ) خالق بے خبر رہا کہ وہاں یہ بھیجیں گے تو قبل سے جبرئیلؑ کیوں نہ آگئے؟ قبل سے جبرئیلؑ آجاتے تو رسولؐ کے عمل کا پتہ نہ چلتا کہ یہ خود دخل نہیں کرتے۔ اگر اُدھر سے رکاوٹ نہ ہو تو یہ کسی کو بھی آگے بڑھانے کیلئے تیار ہیں۔

لہٰذا جدھر سے شکوہ زیادہ ہو سکتا تھا، اُسے پیغمبرؐ نے بھیج دیا کہ مجھے کوئی ہدایت اس کے بارے میں نہیں ہوئی ہے۔ بے ضرر بات ہے جا کر آیات پڑھ دینا۔ مگر کیا کیا جائے کہ جبرئیلؑ امین اُترے، متفق علیہ حدیث امام نسائی بھی صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ہیں، ان کی مستقل کتاب ہے "خصائص علویہ"، اُس میں اس کو کئی طرق سے وارد کیا ہے کہ جبرئیلؑ امین آئے اور رسولؐ سے فرمایا:

"لَا یُبَلِّغُهَا اِلَّا اَنْتَ اَوْ جُزْءٌ مِّنْكَ"۔

"یہ آپؐ نے کسی اور کو کیوں بھیج دیا؟ سوائے آپؐ کے یا کوئی ایسا جو آپؐ کا جزو ہو، اور کوئی اسے نہیں پہنچا سکتا"۔

اب مجبوراً پیغمبرِ خدا کھلواتے ہیں اور واپس بلواتے ہیں اور آیتیں اس کے سپرد کرتے ہیں جو ان کا جزو ہے۔ جنابِ والا! ابھی تک تو دنیا رسولؐ سے رشتہ دیکھ رہی تھی اور میں نے اللہ سے قربت اور ایک طرح کا رشتہ دکھلایا۔ اب میں کہتا ہوں کہ دنیا کوئی رشتہ در خیبر سے بھی ڈھونڈے کہ اس نے بھی قسم کھائی تھی کہ جب تک یہ نہیں آئیں گے، فتح نہیں ہوں گا۔ خدا کی قسم! اگر کسی غیر کا معاملہ ہوتا تو پیغمبرؐ خدا تبلیغ میں اتنی دیر نہ کرتے کہ آیت کو تیور بدل کر آنا پڑے کہ بس اب تبلیغ کر دیجئے، یہ نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں۔

مجمع میں کون ایسا ہوگا جس کے قرابت دار نہ ہوں اور وہ قرابت داری کے تقاضوں کو نہ جانتا ہو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب رسولؐ کے قرابت دار تھے۔ قرابت داری کا تقاضا کیا ہوتا ہے؟ مالِ غنیمت میں حصہ زیادہ دیا کرتے تھے، تو میں مانتا کہ اپنی قرابت داری سامنے ہے۔ یہ قرابت داری کا اچھا تقاضا ہے کہ ہر دفعہ موت کے منہ میں انہیں بھیج دیا جائے۔

جب اسلام پر مصیبت پڑی اور اس کو سب سے بڑی قربانی کی ضرورت پڑی، تب بھی اسی کو منتخب کیا گیا۔ اس عظیم ترین قربانی کیلئے، جسے کاندھے پر چڑھاتے تھے، جسے سینے پر سلاتے تھے۔ میں حالات کو دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ جتنی ان کی ناز برداریاں تھیں، وہ سب اسی لئے تھیں کہ یہ اس اسلام کے کام آئیں گے جس اسلام کی تبلیغ میرا فریضہ ہے۔

15

نورِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہ وقت کیسا ہوگا جب ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان گواہوں کا گواہ بنا کر لائیں گے۔
(القرآن)

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

(اقبال)

کربلا میں فدیہ اس لئے نہیں آیا کہ علم الٰہی میں اس سے آگے قربانی کی کوئی منزل نہ تھی۔ وہ خلیل کی قربانی ہے اور یہ حبیب کی قربانی ہے۔

اللہ کے نظام حکمت میں ایک ایسی اونچی قربانی کو وجود میں آنا تھا اور وہ کربلا والوں کی قربانی کے روپ میں عملی طور پر آئی تا کہ نوع انسانی کے لئے لازوال مثال قربانی ہو۔

نہ جانے ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کس بنیاد پر بارگاہ الٰہی میں شکوہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ خلیل کے فرزند کے لئے تو فدیہ آ گیا اور حبیب کے فرزند کے لئے فدیہ نہ آیا، لیکن میرے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتادیا ہے کہ میں محمدؐ وآل محمدؐ سے سب سے زیادہ پیار اس لئے کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے دین کی خاطر جو قربانیاں پیش کی ہیں ویسی قربانیاں کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

نورِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾"۔

27 ویں پارے کی آیت ہے۔ سورۂ نجم میں ارشاد ہورہا ہے کہ انسان کیلئے نتیجہ خیز وہی کوشش ہے جو وہ انجام دے اور جو اس کی سعی اور کوشش ہوگی، وہی دیکھی جائے گی۔ جتنی کوئی ذات بلند ہوتی ہے، اُتنا ہی اُس کا کردار بلند ہوتا ہے بلکہ اسلام میں تو بلندی ذات، بلندئ کردار ہی سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ حضرت پیغمبر محمدا کو جب مشرکین عرب نے یہ کہہ کر آپ کی وقعت کو اپنے خیال میں کم کرنا چاہا اور اپنی غلط ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ آخر یہ قرآن مکہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُترا؟ بڑے آدمی سے کیا مطلب؟ یعنی کسی امیر کبیر کروڑپتی، ارب پتی پر یہ قرآن اُترا ہوتا، اور نہ جانے کن چور دروازوں سے ہوتا ہوا یہ محاورہ ہم تک بھی پہنچ گیا کہ دولت مندوں کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔ یہ محاورہ ان کا تھا کہ آخر یہ ان مکہ یا مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُترا؟ مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ کوئی نبی بنانا ہی تھا تو مکے اور طائف، یہ دونوں بڑے شہر تھے، مدینہ ایک چھوٹا شہر تھا۔ ان دونوں شہروں کے کسی دولت مند آدمی کو بناتا۔ اس پر اُترتا تو ہمیں ماننا آسان ہوجاتا کیونکہ ہماری فطرت ہے امیروں کے سامنے سر جھکانا۔

اُس نے اپنا رسولؐ بنانے کیلئے منتخب بھی کیا تو ایک یتیم کو جس کے باپ کا انتقال اس کے دادا کے سامنے ہوگیا۔ تو وہ اپنی خاندانی وراثت سے بھی محروم ہوگیا۔ تو ایسے کو خدا نے منتخب کیا قرآن کی منزل کیلئے کہ قرآن اس پر اُتارا جائے۔ اس کے مقابلہ میں خالق کو کہنا تھا کہ رسول آپ عظیم ہیں کیونکہ کافروں نے لفظ استعمال کیا تھا عظیم۔ بڑا۔ مگر اپنے رسول کو سند عطا کی تو یہ کہہ کر عطا نہیں کہ آپ عظیم ہیں کیونکہ پھر وہ ذہنیت ختم نہ ہوتی کہ امیر آدمی عظیم ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے رسول کو بھی سند دی گئی تو یہ کہہ کر:

"اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیۡمٍ"۔

"آپ عظیم اخلاق پر ہیں"۔

آپ عظیم اوصاف پر ہیں، اس لئے عظیم ہیں۔

آپ کی عظمت کے اظہار کیلئے بس اتنا کافی ہے کہ خلق خدا میں بڑے درجہ کی ہستیاں انبیاء میں سب سے بالاتر ہمارے رسولؐ، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ افضل المرسلین ہیں، تمام انبیاء میں افضل ہیں تو یہ افضل کا لفظ کہنے سے آپ کی پوری عظمت کا تصور نہیں ہوتا۔ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جیسے ایک کام کے بہت سے کرنے والے ہوں، کوئی اچھے طریقے سے کرتا ہے۔ یہ حکیموں میں سب سے بہتر ہیں، وہ ڈاکٹروں میں سب سے بہتر ہیں، وہ وکیلوں میں سب سے بہتر کے خاص القاب ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اکثر صفت مشترک ہوتی ہے مگر لقب جس کا ہوجائے، اس سے خاص ہوجاتا ہے۔ ہر جج

منصب ہوتا ہے، ہر منصف جج ہوتا ہے مگر جس کا نام منصف ہے، وہ منصف۔ جسکا نام جج ہے، وہ جج۔ منصف کو جج کہہ دیجئے تو غلط ، جج کو منصف کہہ دیجئے تو غلط۔

تو وصف عام ہے مگر لقب خاص ہے۔ ایسے ہی انبیاء میں حضرت آدم صفی اللہ۔ صفی اللہ کے معنی اللہ کا چنا ہوا تو کونسا نبی ہوتا ہے جو اللہ کا چنا ہوا نہ ہو۔ کونسا رسول ہوتا ہے جو اللہ کا چنا ہوا نہ ہو؟ کوئی مکتب وخیال اسکا قائل نہیں ہے کہ کوئی نبی کسی اور طرح سے منتخب ہو جاتا ہو۔

کسی اور طرح سے رسول منتخب ہو جاتا ہو۔ یہاں تو سب ہی مانتے ہیں کہ اللہ جب تک یہ چنے، اس وقت تک نبی نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اصل نبی اور رسول بغیر اس کے منتخب کئے ہوئے نہیں ہوتا تو جو اس کا جانشین ہو، وہ بھی بغیر اس کے مقرر کئے ہوئے نہیں ہوگا کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ اصل کا اختیار کسی کو ہو اور جانشین کا اختیار کسی اور کو ہو۔ مثلاً اگر جج صاحب دو دن کے لئے بھی چھٹی کرلیں تو اوپر سے آرڈر آجائے گا کہ ان دو دنوں کیلئے کون جانشین ہوگا۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ جن جن کے مقدے ہیں، وہ پنچایت کر کے جانشین بنالیں۔ سرجن صاحب ایک دن کیلئے بھی چھٹی جائیں تو وہیں سے ان کا جانشین ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سول سرجن صاحب چلے جائیں غیر متعلق ہو کر کہ مجھ سے مطلب نہیں اور مریض اجماع کر کے کسی کو سول سرجن بنالیں۔

تو بندۂ پرور! جب یہ نہیں ہوسکتا تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ نبی اور رسول تو اللہ مقرر کرے اور ان کا جانشین بندے مقرر کریں؟ غرض یہ کہ بغیر اس کے چنے ہوئے نبی اور رسول کوئی نہیں ہوسکتا۔ تو صفت عام ہے۔ تمام انبیاء اللہ کے چنے ہوئے ہیں۔ مگر ظاہری سلسلہ میں سب سے پہلے قرعہ انتخاب جس کیلئے پڑا، جس کو پہلے چنا گیا، سلسلہ کا سرا، اُس کو لقب دے دیا گیا صفی اللہ۔ اس لئے اب وہ لقب اسی کا ہو گیا۔ اب کوئی اس سے افضل بھی ہے تو اُسے صفی اللہ بطور لقب نہیں کہیں گے۔ وصف کے طور پر کہیں، یہ الگ بات ہے لیکن لقب جس کا ہے، اُسی کا ہے۔

حضرت نوحؑ، نجی اللہ۔ نجی اللہ کے معنی میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ نجویٰ سے مشتق ہے جس سے لفظ مناجات ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ سے صیغہ راز میں، تخلیہ میں باتیں کرنے والا۔ تو بہت سے نبی ہیں جن سے اللہ نے باتیں کی ہیں۔ اقسام کلام قرآن مجید میں آئے ہیں۔ وحی جو نازل ہوئی ہے، وہ اللہ کا کلام ہے ایک قسم کا۔ تو ہر نبی اللہ سے باتیں کرنے والا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ نجات سے ہے۔ تو نجی اللہ یعنی اللہ کا نجات دیا ہوا۔

تو میں کہتا ہوں کہ (معاذ اللہ) کون نبی ہے جو اللہ کا نجات دیا ہوا نہ ہو؟ ارے نبی کا کیا ذکر؟ ہر مومن بقدر ایمان وعمل نجات یافتہ ہے۔ تو صفت عام ہے۔ لیکن جس ذات کو نمایاں طور سے کشتی نجات عطا کر کے طوفانِ عذاب دی گئی ہے، اس کا لقب ہو گیا نجی اللہ۔ یہ مخصوص ہو گیا جنابِ نوحؑ سے۔

جنابِ موسیٰؑ، کلیم اللہ۔ اللہ سے کلام کرنے والے۔ تو وہی نجی اللہ جو میں کہہ چکا کہ اقسام کلام مختلف ہیں۔ ہر نبی کسی نہ کسی طرح سے موردِ کلامِ الٰہی ہوتا ہے۔ مگر نمایاں طور سے طور کی بلندی پر جا کر جو کلام کرتے تھے، ان کا لقب ہو گیا کلیم اللہ۔ ان سے خاص ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ کا لقب روح اللہ۔ اس سے دنیائے عیسائیت غلط نتیجہ نکالتی ہے کہ اس میں جو بلندی ہے، کسی میں نہیں ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ صفت تو عام ہے، پہلے جب نبوت کی ابتداء ہوئی، اسی وقت کہا گیا کہ جب پتلا بن جائے:

"وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ"۔

"اور اس میں اپنی روح کا کچھ حصہ پھونک دوں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جہاں نبوت ہے، وہاں روحِ الٰہی ہے۔ یہ تو نسبت ہے جیسے بیت اللہ، عرش اللہ۔ ایسے ہی یہ شرف ہے اس روحِ خاص کو۔ اس کو اپنی طرف نسبت دے دی۔ ورنہ (معاذ اللہ) وہ کوئی مرکب ہے کہ جیسے میری روح میرے جسم میں ہے، ویسے ہی وہ کوئی روح ہے تو پھر جسم بھی ہوگا۔ جب جسم سے وہ بری ہے، تو روح سے بھی بری ہے۔ نہ وہاں الگ سے جسم ہے، نہ روح ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو وہ ذات ہے کہ جسم و روح سے اس کی ترکیب ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ صرف نسبت ہے اور میں نے عرض کیا کہ صفت عام ہے یعنی پہلے نبی حضرت آدم آئے، وہی روحِ الٰہی کے حامل ہو کر آئے۔ مگر لقب کی حیثیت سے ایک کو کہہ دیا گیا جسے نمایاں طور سے اپنی درخواست کی، میں نے التجا کی، میں نے منت و زاری کی۔ مگر خالق اپنے دوست کا کردار بیان کر رہا ہے تو ان الفاظ میں کہ ہم سے لڑنے لگے۔ مگر یہ لڑائی اس کو کتنی پسند آئی کہ فوراً کہا کہ لڑنے لگے اور فوراً تعریف کرنے لگا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"يُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ"۔

"قومِ لوط کے بارے میں ہم سے لڑنے لگے"۔

"اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ"۔

"تم کیا سمجھو ابراہیمؑ بڑا ہی قوتِ برداشت والا بندہ تھا"۔

یہ الفاظ میں اس دوستی کو نبھایا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہوا خلیل اللہ۔ اتنی بلندی حاصل ہوئی۔ اس لقب میں بڑی رفعت ہے۔ بہر حال صفت مشترک ہے۔ ہر نبی یقیناً اللہ کا دوست ہے صفت کے لحاظ سے۔ جب اللہ سے محبت رکھتا ہے تو دوست ہی ہے۔ لیکن وہی کہ صفت ہونا اور بات ہے، لقب ہونا اور بات ہے۔ اب ہمارے ہمارے پیغمبرانؐ کا لقب ہے حبیب اللہ۔

یہاں اکثر احباب کے ذہن میں آسکتا ہے کہ لفظ بدل گیا، بات تو وہی رہی۔ وہ خلیل اللہ، اس کے معنی اللہ کے دوست، یہ حبیب اللہ، اس کے بھی معنی اللہ کے دوست۔ تو لفظ کے اعتبار سے درجہ اونچا تو نہیں ہوا۔ مگر حقیقت میں یہ بات اُردو زبان کی کوتاہی کے سبب ہے کہ ہم خلیل کا ترجمہ بھی دوست کریں گے اور حبیب کا ترجمہ بھی دوست کریں گے۔ لیکن عربی زبان کے لحاظ سے خلیل اور حبیب کے معنی میں فرق ہے۔ بے شک دونوں دوست ہیں لیکن خلیل کے معنی میں مضمر ہے طالب ہونا اور حبیب کے معنی میں مضمر ہے مطلوب ہونا۔

ہیں دونوں دوست مگر خلیل وہ دوست ہے جو دوسرے کو چاہتا ہو اور حبیب وہ دوست ہے جسے دوسرا چاہتا ہو۔ عربی میں لفظوں

میں فرق ہے۔ خلیل کے معنی ہیں محب خدا اور حبیب اللہ کے معنی ہیں محبوب خدا۔

اب اہلِ دل محسوس کریں کہ زمین محبت کس آسمان پر پہنچ گئی؟ ہمارے دو قسم کے دوست ہوں، ایک طالب ہو اور ایک مطلوب۔ دوست تو دونوں ہیں مگر برتاؤ میں بڑا فرق ہو جائے گا۔ طالب اور مطلوب۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہمارے بانی مجلس نے بحمد اللہ اس عزاخانے کی ابتداء کر دی ہے اور انشاء اللہ اگلے سال تک اس کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔ کوئی صاحب ایسے ہوں جو ان سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہوں تو جب ان سے ملاقات ہو تو وہ کہیں گے کہ سنا ہے کہ ماشاء اللہ آپ نے امام بارگاہ کی بنیاد رکھی اور کام شروع ہو گیا۔ آپ کہیں گے جی ہاں۔ وہ کہیں گے کہ جی چاہتا ہے کہ ہم بھی دیکھیں۔ لیجئے تعمیر انہوں نے کی ہے، جی ان کا چاہنے لگا۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ مجھ سے تعلقات بڑھانے کے طلبگار ہیں تو انہوں نے کہا: نہیں، نہیں۔ جس وقت فرمایئے، میں اُسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ جیسے بڑی غرض ہے ان کو۔ انہوں نے کہا: اچھا صاحب! آیئے گا تو جو کچھ بنایا ہے، دکھلا دیں گے۔ لیجئے وہ وقتِ معین پر موجود کہ کہیں دیر ہونا تاخیر کا بہانہ نہ بن جائے۔ عین وقت پر موجود۔ اور یہ جیسے بھولے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا: کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کہا تھا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ عزاخانہ جو آپ بنا رہے ہیں۔ اچھا ہاں! ٹھیک ہے، آیئے۔ دروازہ سے لائے، اِدھر اُدھر دکھایا اور پھر کہا: تشریف لے چلئے۔

یہ ہو گا وہ دوست جو ان سے تعلقات بڑھانا چاہتا ہو اور اگر کوئی دوست ایسا ہے جس سے یہ تعلقات بڑھانا چاہتے ہوں، کسی وجہ سے۔ تو وہ جب ملے گا تو یہ اُس سے کہیں گے کہ میں نے ایک عزاخانہ شروع کیا ہے، آپ بھی دیکھ لیں۔ لیجئے، اب ان کا دل چاہنے لگا۔ اب انہوں نے کہا: جی مجھے تو فرصت بہت ہی کم ہوتی ہے انہوں نے کہا: نہیں، نہیں۔ جس وقت کہئے گا، میں سواری بھیج دوں گا۔ انہوں نے کہا: سواری بھیج دیجئے گا تو آ جائیں گے۔ لیجئے، وقتِ معین پر نمائندۂ خاص، مرکب خاص لئے ہوئے حاضر ہے۔ اب وہ ہیں کہ جیسے سوئے ہوئے سے ہیں۔ محبت کے تقاضے کون صاحبِ دل نہیں جانتا؟ اگر طلبگار ہو تو سوئے گا؟ کروٹیں بدلے گا، ٹہلے گا، بھلا سوئے گا؟ لیکن قدرت کا ایک نمونہ بنایا کہ بغیر باپ کے توسط کے اُسے خلق فرمایا تو اُسے کہہ دیا روح اللہ۔

تو یہ بھی ایک نسبت ہے۔ مگر تمام سلسلہ انبیاء میں ایک ذات ایسی تھی کہ اُسے لقب دیا گیا "اللہ کا دوست"۔ اس میں بڑی بلندی ہے کیونکہ جتنے اور القاب ہیں، ان میں خود الفاظ سے عبد اور معبود کا فرق نمایاں ہے۔ صفی اللہ یعنی اللہ چننے والا اور ان کی بلندی یہ ہے کہ یہ چنے ہوئے ہیں۔ نجی اللہ، نجات دیا ہوا۔ اللہ نجات دینے والا، یہ ہیں نجات پانے والے۔ کلیم اللہ، یعنی کلیم اللہ، یعنی وہ مرکز ہے کلام کا اور ان کا شرف یہ ہے کہ یہ اُس سے ہم کلام ہیں۔ تو لفظوں سے اس کی بلندی اور اس کا امتیاز نمایاں ہے۔ روح اللہ یعنی اس کی طرف نسبت رکھنے والی ایک روح ہے تو مرکز نسبت کی رفعت خود نسبت سے نمایاں ہوئی۔

مگر خلیل اللہ، اللہ کا دوست۔ وہ جو خالق اور مخلوق کا فرق ہے، مجھے معلوم ہے۔ جو عبد اور معبود کا فرق ہے، مجھے معلوم ہے۔ مگر الفاظ کا جہاں تک تقاضا ہے تو دوست۔ یہ برابر کا رشتہ ہے یعنی یہ اُس کا دوست اور وہ اس کا دوست۔ یہ طرفین سے رشتہ ہوتا ہے۔ یک طرفہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اب اس سے بڑھ کر بلندی کیا ہو گی کہ خالق مقام تعبیر میں برابر کی سطح دے دے۔ بعض قرآن مجید کی آیتیں ہیں کہ

ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک خلیل کے رشتہ کو سامنے نہ رکھا جائے۔

قومِ لوط پر عذاب نازل کرنے کیلئے فرشتے آئے اور انہوں نے پہلے حضرتِ اسحاق ؑ کی ان کو بشارت دی۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ تفصیل سے ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے لیکن پھر انہوں نے پوچھا کہ اصل مقصد تمہارا کیا ہے؟ کیوں آئے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم قومِ لوط پر عذاب نازل کرنے کیلئے آئے ہیں۔ یہ کردار حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شروع ہوا کہ خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ کبھی بد دعا نہیں کی اور اب جو معلوم ہوا کہ عذاب نازل ہونے والا ہے تو بارگاہِ الٰہی میں التجا کرنے لگے کہ پروردگار! ابھی اور مہلت دے دے یعنی اور انبیاء ایسے ہیں کہ جو عذاب آنے سے خوش ہوتے تھے۔ یہ کردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا کہ ان کو غصہ نہیں آتا، رنج ہوا ہے۔ اتنے بندگانِ خدا عذاب کے راستے پر جا رہے ہیں، دوزخ کے راستے پر جا رہے ہیں۔ پیغمبرؐ خدا میں یہی صفتِ معراج کمال تک پہنچی کہ خالق نے مختلف انداز سے ان کو تسلی دی۔ کہیں جیسے محبت آمیز غصہ ہوتا ہے۔ آپ ان لوگوں کے پیچھے جان دے دیجئے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ ایمان نہیں لائیں گے، خود ہی دوزخ میں جائیں گے۔ یہ آپ ان کے غم میں کیوں گرفتار ہیں؟

اس طرح پیغمبرِ خدا کو مخاطب کیا ہے۔ وہ لوگ آپ کو پتھر مارتے تھے۔ کردار ایسا اختیار کرتے تھے کہ جس پر سابق اُمتوں پر عذاب نازل ہو چکا ہے، تو انہیں جیسے اندیشہ ہوتا تھا، ڈر ہوتا تھا کہ کہیں ان کم بختوں پر عذاب نہ آ جائے۔ قبل اس کے کہ عذاب آئے، یہ بارگاہِ الٰہی میں کہتے تھے:

"رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ اِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ"۔

"پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرما، یہ میرے مرتبہ کو جانتے نہیں ہیں"۔

جیسے ان کی طرف سے عذر خواہی کر رہے ہیں۔ تو یہی انداز تھا ان کا ہمدردیٔ خلق کا۔ یہی حضرت ابراہیمؑ میں صفت تھی۔ ان میں ابتداء تھی، ان پر انتہا ہوئی۔ تو ان کا عالم یہ کہ جب فرشتوں نے اطلاع دی کہ عذاب آئے گا تو جو ولادتِ فرزند کی خوشی، وہ ختم ہو گئی۔ فکر ہو گئی ان بندگانِ الٰہی کی کہ ان پر عذاب آئے گا، وہ تباہ ہو جائیں گے۔ تو بارگاہِ الٰہی میں التجا کرنا شروع کی۔ اب ظاہر ہے کہ بندے کیلئے کیا لفظ ہو سکتا ہے کہ اُس نے التجا کی، اُس نے درخواست کی۔ مگر خالق نے کیا الفاظ ارشاد فرمائے؟ اس کے معنی سمجھ نہیں آ سکتے جب تک دوستی کا رشتہ سامنے نہ رکھیں قرآن مجید کی آیت ہے، ارشاد ہو رہا ہے:

"يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ"۔

ہم نے تو یہ بشارت دی، اور ابراہیمؑ ہم سے قومِ لوط کے بارے میں لڑنے لگے۔ حضرت ابراہیمؑ اسے کہتے تو یونہی کہتے کہ "پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا اپنے بندے کو"۔

حضور! یہ واقعۂ معراج کا تذکرہ ہے۔ معراج کے ماننے کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ کوئی صاحب ہوں، ترقی پسند ہوں، یا نہ

ہوں، کسی درسگاہ یا یونیورسٹی کے طالب علم ہوں یا کسی دیندار مدرسہ کے نمائندہ ہوں، ان سے میں پوچھوں گا کہ آخر آپ کو معراج کے ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ حضور! ضرورت یہی ہے تا کہ قرآن میں ہے اور چونکہ مسلمان ہیں، قرآن کو ماننا ہے، لہٰذا مجبوراً معراج کو ماننا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ مجبوری یہ ہے کہ چونکہ قرآن میں ہے، لہٰذا مان رہے ہیں۔ تو جو قرآن میں ہو، وہ مانئے۔ بندہ بحالتِ حیات اگر فقط روح کا نام ہوتا ہوتو معراج روحانی مانئے اور اگر بندہ مجموعہ جسم و روح کا نام ہوتو پھر معراج جسمانی مانئے۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ پاک ہے وہ پروردگار:

"سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ"۔

"پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت"۔

خواب ہوتا تو رات کہنے کی ضرورت نہیں تھی، خواب تو رات کو دیکھا ہی جاتا ہے، کہاں سے؟

"مسجد حرام سے لے گیا، انتہائی نقطہ عروج تک"۔

"الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ"۔

"جس کے گرد و پیش میں برکت ہی برکت ہے"۔

خالق نے بتادیا کہ لے گیا۔ کس وقت لے گیا؟ وہ بھی بتادیا کہ رات کو لے گیا۔ کہاں سے لے گیا؟ وہ بھی بتادیا کہ مسجد الحرام سے لے گیا۔ کہاں لے گیا؟ یہ بھی بتادیا کہ:

"اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ"۔

عبد کی ترقی کا انتہائی نقطہ جو تم تصور میں لاسکو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بارالٰہا! یہ بتادیا کہ کس وقت لے گیا، یہ بتادیا کہ کہاں سے لے گیا، یہ بتادیا کہ کہاں لے گیا۔ مطلب نہیں پورا ہوگا جب تک تو یہ نہ بتادے کہ کیوں لے گیا؟ تو خالق نے بتایا:

"بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ"۔

"اُس انتہائی نقطہ عروج تک لے گیا جس کے گرد برکت ہی برکت ہے"، تا کہ:

"لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا"۔ "تا کہ اپنی نشانیاں دکھلائیں"۔

وہاں ایک آیت کے دیکھنے کی درخواست کی تھی جو اُس طرح پوری ہوئی اور یہاں بلاطلب آیات کے دکھانے کیلئے بلایا گیا ہے، لے جایا گیا ہے۔

اور جناب والا! بس ایک جملہ کہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم لے گئے، اس لئے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں۔ میں تو یہ محسوس

کرتا ہوں کہ جیسے ازل سے ضاع منتظر تھا کہ کوئی دیدہ ور آئے۔

آپ نے دیکھا کہ وہ خلیلؑ کی شان ہے۔ایک صفت خلیلِ حق میں بڑی نمایاں طور پر سامنے آئی۔وہ ایک امتحانِ خاص۔یہ دنیا کے مرکزوں سے دوستی ہوتی ہوگی کہ جب دوستی ہوگئی تو مراعات بہت مل گئیں۔مگر یہ خالق کے ہاں کی دوستی، بڑی کٹھن منزل۔یہ اب دوست ہے ہمارا تو اس کا امتحان ایسا ہوگا کہ ویسا شروع سے اب تک کسی کا نہیں ہوا۔اس سے پہلے جتنے انبیاء تھے،ان کا امتحان فقط ذات کے بارے وہ سوئے ہوئے ہیں۔نیند بے چین کی گئی اور اٹھائے گئے، چلئے چلئے۔اچھا سواری آ گئی؟ روانہ ہوئے۔فرض کیجئے کہ عمارت بن چکی ہے اور اس کے اوپر ایک اور منزل ہے، وہ ہیں کہ ہر جگہ رُک کے جاتے ہیں۔

یہ میں نے اپنے اور آپ کے دوستوں کی مثال دی تو آزادی سے الفاظ استعمال کر لئے، میری کیا مجال کہ انبیاء و مرسلین کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ عرض کر سکوں۔مگر کیا کروں کہ جب قرآن مجید میں دونوں کے ساتھ برتاؤ بیان ہو رہا ہے۔جو خلیلؑ سے برتاؤ ہے، وہ بھی قرآن میں ہے اور جو حبیبؐ سے برتاؤ ہے، وہ بھی قرآن میں ہے۔وہ خلیل ہیں، بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں:

"رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ."

''اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟''

میں کہتا ہوں کہ خود الفاظ ابراہیمؑ بتاتے ہیں کہ حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے۔یہ نہیں کہتے کہ مجھے دکھا کہ زندہ کرتا بھی ہے یا نہیں۔یہ پوچھ رہے ہیں، کہہ رہے ہیں، درخواست کر رہے ہیں کہ مجھ کو دکھا کہ کیونکر زندہ کرتا ہے؟ کیفیت اسی شے کی پوچھی جاتی ہے جس کا وقوع تسلیم شدہ ہو۔یقیناً مان رہے ہیں کہ زندہ کرتا ہے مُردوں کو۔پوچھتے ہیں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیونکر زندہ کرتا ہے۔انہوں نے مطلق ''ارنی'' نہیں کہا ہے۔یہ خلیل ہیں، بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ارنی نہیں کہا جس کے معنی ہوں جلوۂ ذات کے دیکھنے کے۔اسی لئے کسی طور کو سرمہ نہیں بنایا گیا۔ناممکن کا سوال نہ کیا تھا۔جلوۂ ذات کے دیکھنے کی تمنا نہیں کی تھی۔درخواست کی تھی کہ مجھے دکھا کہ مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے۔ایسا سوال تھا جو خدا کیلئے کوئی مشکل نہ تھا۔معاذ اللہ، اللہ کو دیکھنے کی تمنا نہیں کی تھی۔اس کی ایک آیت کو آیت کہتے ہیں، نشانی قدرت کو۔لفظ آیت کو یاد رکھئے گا کہ ایک آیت۔مردوں کو زندہ رکھنا ایک آیتِ الٰہی ہے۔اُس کی قدرت کی نشانی ہے۔ایک آیت کے دیکھنے کی تمنا کی تھی مگر دوست ہیں اور طلبگار دوست ہیں۔لہٰذا فرمائش کی تعمیل ضرور ہوگی۔لیکن درمیان میں تھوڑا سا یوں کہوں کہ آتش شوق کو تیز کرنے کیلئے غالب کی زبان میں کہا کہ بس سخت گسترانہ گفتگو ہوگئی کہ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے دکھا کہ مُردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے، خالق ارشاد فرماتا ہے:

"أَفَلَا تُؤْمِنُ"

''کیوں؟ ابھی ایمان نہیں ہے کیا؟''

ابھی ایمان میں کچھ کسر ہے؟ لیجئے، گئے تھے ایک آیت الٰہی کے دیکھنے کی تمنا میں، پیش کرنا پڑ رہی ہے استحکام ایمان کی

صفائی! اُس نے کہا کہ کیا ایمان نہیں ہے؟ تو جیسے عظمتِ الٰہی سے بندہ کانپ گیا، تھرا گیا اور گھبرا کر کہنے لگا: ''بلا'' کیوں نہیں۔

"وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ"

کیوں نہیں؟ ایمان تو ضرور ہے لیکن چاہتا ہوں کہ دلِ بیقرار کو قرار آ جائے''۔

شوق ہے بس دیکھنے کا تیری ایک آیت کو۔ لیجئے، مشکل تو یہ عمل تھا ہی نہیں۔ خدا کیلئے کیا مشکل تھا۔ خالق فرمائش کی تعمیل کرتا ہے۔ جو درخواست تھی، اس کو پورا کرتا ہے، تو کیونکر:

"قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ"۔

''تمہاری آواز پر وہ مکمل طائر ہو کر آ جائیں گے، بس سمجھ لینا کہ ہم بھی یونہی زندہ کرتے ہیں۔''

یہ خلیلِ حق سے برتاؤ کرتے ہیں کیونکہ دوست ہے اور طلبگار ہے۔ اور جو حبیبؐ ہے، وہ فرشِ خاک پر آرام کی نیند سو رہا ہے اور مرکبِ خاص کیلئے نمائندۂ خاص موجود۔ اس کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے:

"سُبْحَانَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ"۔

میں ہوا۔ یہ دوست ہے تو اس کا امتحان دوہرا ہے۔ ذات کے بارے میں بھی امتحان ہے اور اولاد کے بارے میں امتحان ہے۔ ذات کے بارے میں امتحان آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اور اس میں آپ کا پھینکا جانا اور اولاد کے بارے میں امتحان۔ اس کا قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے۔ اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ آگ کے امتحان کا ایک ایک آیت میں ذکر ہے۔ دو تین جگہ اس آگ کا ذکر ہے۔ بہت مجمل طور پر ایک ایک آیت میں، لیکن اولاد کے سلسلہ کے امتحان کا تو مسلسل روداد کی شکل میں خالق کریم نے بیان کیا ہے۔

"فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ"۔

''ہم نے انہیں مبارکباد سنائی ایک بڑے متحمل بیٹے کی''۔

"فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْىَ"۔

جو وہ بیٹا اس قابل ہوا کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کے کام کر سکتا۔ سعی کے معنی دوڑنے کے ہیں۔ تو دوڑ دھوپ کر کے باپ کے ساتھ اُس کی مدد کر سکتا۔ یہ اختصارِ قرآنی ہے کہ خواب دیکھا اور کئی دفعہ دیکھا۔ اُسے نہیں بیان کیا بلکہ بیٹے کو بلا کر یہ کہا۔ یہ کہ تو سمجھو کہ دیکھا تھا۔ نہیں تو دو دفعہ واقعہ بیان کرنا پڑتا کہ وہ کہتا کہ انہوں نے خواب دیکھا، پھر اس کو باپ کی زبان میں بیان کرتا۔ تو ان کا بیان دو دفعہ ہو جاتا۔ تو پہلے کیوں بتایا جائے، اسی سے سمجھ لو کہ کیا ہوا تھا؟

"قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ"۔

میں خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں۔ ایک دفعہ دیکھا ہوتا تو ''رائٹ'' کہتے کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا۔ چونکہ مسلسل تین دفعہ تین راتوں کو دیکھا تھا، اس لئے کہا کہ ''اِنِّیْۤ اَرٰی''۔ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ ''اِنِّیْۤ اَذْبَحُكَ''، کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ غور کرو تمہاری کیا رائے ہے؟

خواب آپ نے دیکھا تھا، بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی بیٹے سے۔ لیکن بیٹے سے اگر بیان نہ کرتے تو قربانی فقط کارنامہ ابراہیمؑ ہوتی، کارنامہ اسماعیلؑ نہ ہوتی۔ جب بیٹے سے بیان کر رہے ہیں، خود مختارانہ طور پر کہ تم بتاؤ کہ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب قربانی دونوں کا عملِ ارادی ہو جائے گی۔ باپ کا بھی، بیٹے کا بھی۔ فرماتے ہیں کہ تم بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟

اب حضرت اسماعیلؑ جواب دیتے ہیں:

"قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾"۔

''اے بابا! جو حکمِ الٰہی ہو رہا ہے''۔

انہوں نے کہا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں، وہی مضارع کا صیغہ انہوں نے بھی استعمال کیا کہ جو حکمِ الٰہی ہو رہا ہے، یعنی جو پہلے دن آپ نے دیکھا، وہ بھی حکمِ الٰہی تھا، جو دوسرے دن دیکھا، وہ بھی حکمِ الٰہی تھا اور جو تیسرے دن دیکھا تھا، وہ بھی حکمِ الٰہی تھا۔

''جو حکمِ الٰہی ہو رہا ہے، اُس کی تعمیل کیجئے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے''۔

ہر شخص غور کرے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جواب اطمینانِ نفس کا پتہ دیتا ہے۔ گھبراہٹ کی بات اور طرح کی ہوتی ہے اور کلام کا جو ٹھہراؤ ہے، یہ سکونِ نفس کا ترجمان ہے۔ جو حکم ہو رہا ہے، اُس کی تعمیل کیجئے۔ اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پایئے گا۔ اس سے بڑی جلالتِ اسماعیلؑ نمایاں ہوتی ہے۔ استقلال اسماعیل نمایاں ہوتا ہے۔ مگر جو حقیقت ہے، وہ کیا کروں کہ اتنے اطمینان و استقلال کے بعد بھی، اسماعیلؑ اسے مصیبت سمجھتے ہیں، جبھی صبر کے لفظ کا اطلاق کیا ہے کہ اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پایئے گا۔

اور ایک اور پہلو، اور وہ پہلو یہ ہے کہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد بھی منفرد صابر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ صابرین میں سے پایئے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جماعتِ صابرین سامنے ہے کہ ان میں ملحق ہو جانا اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے بعد بھی صبر کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اب جو ان سے بالاتر افراد ہوں، ان میں ہمیں نمونہ ملتا ہے کہ جب پیغمبرؐ پوچھتے ہیں کہ تم صبر کیسے کرو گے؟ تو علیؑ جواب دیتے ہیں کہ وہ صبر کا موقع نہیں ہوگا، وہ تو شکر کا موقع ہوگا۔

غرض یہ کہ اطمینانِ نفس کا مظہر یہ جواب انہوں نے دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائش کی تعمیل کی اور ذبح کا سامان ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ فدیہ آ گیا۔ یہاں مجھے عام لوگوں کی ایک بات سے اختلاف ہے۔ اس کا بیان کرنا ضرور ہے۔ عام طور پر یہ کہا

جاتا ہے کہ اللہ نے اپنا حکم برطرف کر دیا یعنی منسوخ کر دیا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ پہلے تو یہ کہ ہر صاحب فہم محسوس کرے کہ حکم ہمیشہ اختیاری کاموں کا ہوتا ہے۔ ذبح کرنے میں جتنے اختیاری کام ہیں، وہ تو سب حضرت ابراہیمؑ نے کر لئے۔ اختیاری کام کیا ہوتے ہیں؟ جسے ذبح کرنا ہے، اُسے سامنے لٹانا، دھار والی چیز جس سے رگ ہائے گردن قطع ہوں، وہ ہاتھ میں لینا اور پھر ہاتھ کو جنبش دینا کہ جس سے رگ ہائے گلو قطع ہو جائیں۔ یہ اختیاری کام ہیں، ان میں سے کونسا کام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے نہ کیا ہو؟

ذرا غور کیجئے، کیا بیٹے کو نہیں لٹایا؟ کسی اور کو چھری کے نیچے لٹایا؟ بیٹے ہی کو تو لٹایا چھری کے نیچے۔ دوسری بات یہ کہ کیا چھری ہاتھ میں نہیں لی؟ کوئی اور چیز لی؟ تو ظاہر ہے کہ چھری ہی لی۔ بس آخری بات یہ طلب ہے کہ وہ جنبش ہاتھ کو دی یا نہیں جس رگ ہائے گردن قطع ہوتی ہیں؟ اس کا سمجھنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ جنبش نہ دی ہوتی تو وہ گوسفند کیونکر ذبح ہوتا جو فدیہ میں آیا تھا؟ اس لئے کہ وہ بیٹے کی نیت سے تحریک تھی ہاتھ کی جس سے گوسفند ذبح ہوا۔ فعل ارادی تو کوئی رہا ہی نہیں۔ تو کونسی چیز باقی رہ گئی جس کی وجہ سے حکم ملا۔

تو دیکھئے کہ خواب کیا دیکھا تھا؟ خواب اگر دیکھا ہوتا کہ ذبح کر چکا ہوں تو کوئی بات رہ گئی۔ خواب یہی تو دیکھا تھا کہ ذبح کر رہا ہوں تو جو دیکھا تھا، اس میں کیا کمی رہ گئی جو حکم برطرف ہوا؟ پھر قرآن سے پوچھئے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے پکارا۔ پکار کر کہا کہ بس! ہم اپنا حکم ہٹائے لیتے ہیں۔ نہیں، یہ نہیں کہا، اس نے کہا:

"يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا".

"اے ابراہیمؑ! تم نے خواب سچ کر دکھایا"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حکم ملا، اُس کی تعمیل تم نے کر دی۔ حکم کے برطرف ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بعد کلام الٰہی آگے بڑھا

"إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ".

"ہم حسن عمل کرنے والوں کو یونہی جزا دیتے ہیں"۔

یعنی بغیر امتحان کے ہماری طرف سے جزا نہیں ملتی ہے۔ اس کے بعد:

"إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ".

"یقیناً یہ بہت کھلی ہوئی نمایاں عظیم آزمائش تھی۔"

یہ خالق نے آزمائش کی نزاکت کو بتایا ہے کہ بڑی عظیم آزمائش تھی جس میں تم کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد یہ جملہ ہے:

"وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ"

"ہم نے اس کا فدیہ دے دیا"۔

ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے ذبح عظیم کے ساتھ اس کا فدیہ دے دیا۔ یعنی اس کا نتیجہ دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ ذبح عظیم کو اس کا فدیہ قرار دے دیا۔ ایک طرف ہر نقطہ نظر کے مفسرین کو یہ پریشانی محسوس ہوئی کہ جو فدیہ آیا تھا، ہمیں معلوم ہے کہ دنبہ تھا جو ذبح ہونے والا تھا۔ وہ نبی زادہ تھا، تو نبی زادے کے مقابلہ میں اللہ اس کو عظیم کہے۔ بڑی پریشانی ہے یہاں دنیا کے مفسرین کو کہ وہ دنبہ کیونکر عظیم ہے؟ اس کی عظمت کیلئے بڑے انتظام کیے گئے کہ وہ دنبہ بہشت کا تھا اور بہشت میں مدتوں سے سبزہ زار میں چر رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے ایک لفظ استعمال کیا ہے ''عظیم الجثہ'' یہ شاہ ولی اللہ جیسے محدث کا خیال ہے، عظیم الجثہ۔ مفسرین کیا کریں؟ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ میرا ایک سوال ہے کہ وہ اتنا بڑا تھا، اتنا عظیم الجثہ تھا، بہشت کا تھا اور بہشت میں چر رہا تھا۔ اس سب کے بعد وہ گوسفند ہی رہا تھا یا کچھ اور ہو گیا تھا؟

حضور! اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی وہ گوسفند ہی رہتا ہے۔ گوسفند کو نبی زادے کے مقابلہ میں عظیم کہا گیا۔ یہ کیسے؟ اب تفسیر اہل بیت آئی اور اس نے اس مشکل کو دور کر دیا۔ وہ تفسیر یہ آئی کہ ذبح عظیم سے مراد حضرت امام حسین علیہ السلام ہیں اور ضمیر اسلامی کیلئے یہ تفسیر اتنی قابل قبول تھی کہ ڈاکٹر اقبال نے بھی کہہ دیا:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

وہ مشکل تو باقی نہیں رہی۔ بے شک یہ قربانی اس لائق ہے کہ اللہ اسے ذبح عظیم کہے۔ مگر میرے دل میں ایک دوسری خلش پیدا ہو گئی کہ حبیب خدا کا فرزند اور خلیل کا فدیہ بن جائے، وہاں دنبہ کا عظیم ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا، یہاں حسینؑ کا فدیہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ ایک بلند ہستی حبیبؐ کے فرزند اور وہ خلیل کے فرزند کا فدیہ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ غلطی یا مشکل صرف ایک حرف کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ''بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ'' میں جو ''بہ'' ہے، اس ''بہ'' کا ترجمہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ ذبح عظیم کو ہم نے فدیہ بنا دیا۔ ذبح عظیم کے ساتھ فدیہ بنا دیا۔ عربی کے قاعدے سے ''بہ'' کو صلہ کیلئے لیتے ہیں۔ اس سے یہ دشواری پیدا ہوئی۔

میں کہتا ہوں یہ غلط ہے۔ ''بہ'' صلہ کا نہیں، یہ ''بہ'' سبب کا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ہم نے فدیہ بھیج دیا۔ فدیہ نہیں بتا رہا ہے کہ وہ کیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ گوسفند ہے۔ ''فَدَیۡنٰہُ'' ہم نے فدیہ بھیج دیا۔ جملہ مکمل ہو گیا۔ پوچھ لیجئے کیا تھا فدیہ؟ گوسفند تھا۔ فدیہ بھیج دیا۔

اب خالق کہتا ہے کہ ہم سے پوچھو کہ کیوں فدیہ بھیج دیا؟ کس لئے یہ فدیہ بھیج دیا؟ تو یاد رکھو، بتاتے ہیں کہ بہ ذبح عظیم، عظیم قربانی کی وجہ سے ہم نے یہ فدیہ بھیج دیا۔ ایک عظیم قربانی کے سبب سے۔ یعنی ہمارے نظامِ حکمت میں ایک اس سے اونچی قربانی تھی جس کو وجود میں آنا چاہئے تاکہ نوع انسانی کیلئے لازوال مثال قربانی ہو۔ اگر آج یہ قربانی ہو جاتی تو وہ بلند قربانی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ تو اسی کی نسل میں ہونے والی تھی۔ لہٰذا قربانی ہم نے قربانی کی وجہ سے روکی۔ نبی زادہ کو بچانے کیلئے نہیں بلکہ بلند تر مثال قربانی کے آنے کیلئے زمین ہموار رکھنے کیلئے تاکہ وہ بلند تر قربانی آ سکے۔ ورنہ پھر وہ قربانی نہ ہو سکتی۔

گویا مثالِ قربانی ایک عبوری دور کے نقطہ پر ختم ہو جاتی۔ معراج قربانی سامنے نہ آتی۔ اس لئے اس کو ہم نے تہیہ کی منزل تک لا کر دنیا کے سامنے نمونہ پیش کر دیا۔ ہمارا خلیل تو قربانی کیلئے تیار ہے، اس کے کردار میں کوئی کمی نہیں ہے مگر ہمارا مطلب ابھی پورا نہیں ہوتا اس قربانی سے۔ لہٰذا ہم نے اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے فدیہ بھیج دیا تا کہ وہ عظیم قربانی وجود میں آ سکے۔ میں کہتا ہوں کہ اب ہمارے نفس میں ایک اور خلش تھی، اگرچہ ہم اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ اقبال کی طرح شکوہ کر دیں بارگاہِ الٰہی میں مگر دل کے اندر ایک بے چینی تھی اور وہ بے چینی یہ تھی کہ بار الٰہا! خلیلؑ کے فرزند کے لئے فدیہ آ گیا اور حبیبؐ کے فرزند کیلئے فدیہ نہ آیا۔ مگر بخدا! اس تفسیر کے سمجھ میں آ جانے سے یہ اتنا بڑا شکوہ بھی دور ہو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ وہاں فدیہ آ گیا، اس لئے کہ علم الٰہی میں اس سے بلند تر قربانی موجود تھی اور کربلا میں فدیہ نہ آیا، اس لئے کہ علم واجب میں اس سے آگے قربانی کی کوئی منزل نہ تھی۔ وہ خلیلؑ کی قربانی ہے اور یہ حبیب کی قربانی ہے۔

16

عمل سے زندگی بنتی ہے

انسان اچھے سے اچھے نتیجے کا متمنی رہتا ہے مگر جدوجہد سے گھبراتا ہے قرآن مجید نے ہر طالب مقصد کے لئے یہ اعلان فرمایا کہ کوئی بھی جو کسی مقصد کا طلبگار ہو تو وہ سعی اور کوشش انجام دے جو اس مقصد تک پہنچانے والی ہے۔

جناب رسولؐ اکرم کا ارشادِ گرامی ہے کہ یاد رکھو اگر کوئی شخص محنت مزدوری کرنے اس لئے جارہا ہے کہ اپنے بال بچوں اور اپنا پیٹ پالے تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔

اگر پیغمبر اسلام کسی کو چادر میں بیٹھا کر کہیں "اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُبَیْتِی" پروردگا یہ میرے اہل بیتؑ ہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ فقط رشتے نہیں رکھتے ہیں مگر اس معیار پر ہیں کہ آپ ان کو اپنا اہل کہہ رہے ہیں۔

کربلا میں جا کر دیکھئے کہ جتنا دعویٰ محبت کا زیادہ تھا اتنی ہی عبادتِ الٰہی کی فکر زیادہ تھی اتنا ہی اطاعت الٰہی کا خیال زیادہ تھا بلکہ محبت کی پہچان ہی اطاعت سے ہوتی ہے۔

اب کون عالم ہے جو یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ ان کی نماز افضل کہ جنھوں نے مولا کے پیچھے نماز پڑھی یا ان کی نماز کہ جنھوں نے مولا کو نماز پڑھوائی؟

عمل سے زندگی بنتی ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى"۔

27ویں پارے کی آیت ہے۔ سورۂ نجم میں ارشاد ہو رہا ہے کہ انسان کیلئے نتیجہ خیز وہی کوشش ہے جو وہ انجام دے اور جو اس کی سعی اور کوشش ہوگی، وہی دیکھی جائے گی اور اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔

انسان اچھے سے اچھے نتائج کا متمنی رہتا ہے مگر جدوجہد سے گھبراتا ہے۔ قرآن مجید نے ہر طالب مقصد کیلئے یہ اعلان فرمایا کہ کوئی بھی، جو کسی مقصد کا طلبگار ہو تو وہ سعی اور کوشش انجام دے جو اس مقصد تک پہنچانے والی ہے۔ ہر طالب مقصد اس آیت کو حروف زریں سے لکھ کر آویزاں کر سکتا ہے کیونکہ اس میں مقصد کے صحیح اور غلط ہونے کا سوال نہیں ہے۔ یہ الگ سے سمجھنا چاہئے کہ مقصد کونسا صحیح ہے اور کونسا غلط ہے۔ جو بھی کسی مقصد کا طلبگار ہو، وہ اس آیت سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی طالب علم ہے، چاہتا ہے کہ امتحان میں میرے اچھے نمبر آئیں، اس کو اپنے کمرے میں آویزاں کر لینا چاہئے کہ اگر اچھے نمبر لانا ہیں تو سعی کرو، کوشش کرو۔ کوئی تاجر ہے، اُسے اپنی تجارت گاہ میں یہ آیت آویزاں کر لینی چاہئے کہ:

"لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى"۔

انسان کیلئے وہ سعی و کوشش کارآمد ہے جو وہ انجام دے اور کوئی طالب نجات آخرت ہے تو وہ اپنی عبادت گاہ میں اس آیت کو سرنامہ بنالے۔ تو دنیا کے ہر شعبے میں یہی آیت رہنمائی کرنے والی ہے۔ لیکن انسان عموماً ایسے تصورات قائم کرتا ہے کہ نتیجہ بہتر سے بہتر حاصل ہو اور کوشش بہت تھوڑی کرنی پڑے یا نہ کرنی پڑے۔

چنانچہ ایک طبقہ ایسا بھی رہا ہے کہ جس نے دنیا میں اسی اصول کو اپنایا کہ سعی و کوشش سے بچنا چاہئے۔ اس کیلئے بہت سے تصورات قائم کر لئے۔ مثلاً جو زاہد ہو، پرہیزگار ہو، اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ کسب معاش کرے۔ کسب معاش کرنا گویا دنیاداری ہے۔ یہ طبقہ ابتدائے اسلام میں رہا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام دوپہر کے وقت بازار کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اور پسینہ حضرتؑ کی پیشانی سے رواں تھا۔ ایک شخص جو بظاہر خود کو زاہدانِ زمانہ میں شمار کروانا چاہتا تھا، اس نے راستے میں آپ کا رخ بازار کی طرف دیکھ کر کہا کہ آپؑ یہ مشقت اٹھا کر طلب دنیا کیلئے جاتے ہیں، آپؑ کو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اس عالم میں آپؑ کو موت آجائے اور دنیا سے اس صورت میں جائیں۔ یہ وہ زاہدانِ زمانہ تھے جو زیر سایہ سلطنت پرورش پا رہے تھے۔

تو حضرتؑ رک گئے اور اس سے ارشاد فرمایا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ارشاد فرمایا کہ اے شخص! اگر میں اس حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو میں اللہ کو گواہ کروں گا کہ میں اس کی ایک عبادت سے اٹھا ہوں۔

یہ گویا مژدہ ہے ان لوگوں کیلئے جو جائز ذرائع سے محنت مشقت کرتے ہیں۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری طرح مفت خوری کا عادی ہو کر خلقِ خدا پر بار بنوں؟

پیغمبرِ خدا کے دَور میں بھی یہ تصور کچھ ذہنوں میں تھا۔ حضرت نمازِ صبح کے بعد تشریف فرما تھے کہ سامنے سے ایک جوان بیلچہ کاندھے پر رکھے ہوئے جاتا ہو نظر آیا۔ اصحاب میں سے بعض حضرات بولے کہ کاش! اس کی جوانی راہِ خدا میں صرف ہوتی۔ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے یہ کیونکر سمجھا کہ اس کی جوانی راہِ خدا میں صرف نہیں ہو رہی ہے؟ اس کے بعد اصول ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو! اگر وہ محنت مزدوری کرنے اس لئے جا رہا ہے کہ اپنے بال بچوں کا اور اپنا پیٹ پالے:

"فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ"۔

تو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ گزر بسر تو ہو جاتی ہے لیکن وہ اس لئے جا رہا ہے کہ اپنے اہل و عیال کیلئے وسعتِ رزق کا سامان کرے یعنی ذرا زیادہ آرام سے ان کی زندگی گزرنے لگے تو بھی وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ اگر وہ اس لئے جا رہا ہے کہ طلبِ مال کر کے اُمورِ خیر میں صرف کرے اور کارہائے خیر میں دوسروں کی مدد کرے اور غریبوں اور محتاجوں کی اس سے پرورش کرے تو بھی وہ اللہ کی راہ میں ہے۔

ہاں! اگر اس لئے وہ دولت کمانا چاہتا ہے کہ غریبوں پر اپنی فوقیت قائم کرے:

"فَهُوَ سَبِيْلُ الشَّيْطَانِ"۔

تو پھر وہ شیطان کی راہ میں ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس چیز کو پیغمبرِ خدا نے فرمایا ہے کہ شیطان کے راستے میں ہے یعنی دولت کما کر دوسروں پر اپنی فوقیت جتانا، تو اگر غور کیا جائے اور دینی حقائق کو اپنے سامنے رکھا جائے تو اگر کوئی نمازیں بھی دوسروں پر اپنی فوقیت جتانے کیلئے پڑھے تو وہ نمازیں بھی فی سبیل اللہ نہیں ہونگی۔ پس یہ تصور ایک طبقے نے قائم کیا کہ طلبِ دنیا یا کسبِ معاش میں جدوجہد نہ کرنی پڑے، آرام سے زندگی گزرتی رہے اور آخرت کے بارے میں بہت سے ایسے تصورات قائم کر لئے کہ سعی و عمل نہ کرنا پڑے، جدوجہد نہ کرنی پڑے اور مفت میں جنت حاصل ہو جائے، اس لئے تمام مسلمانوں نے اپنا نام رکھ لیا، اپنا لقب رکھ لیا "اُمتِ مرحومہ"۔ یعنی اُمتِ محمدؐ کا لقب اُمتِ مرحومہ۔ گویا اس اُمت کے رجسٹر میں نام آیا اور رحمتِ خدا کا استحقاق حاصل ہو گیا۔

اب اس سے مطلب نہیں کہ وہ فرد ہے کیا؟ ہے تو اس اُمت کا جزو جو رحمتِ خدا کی حقدار ہے کیونکہ میں بحمد اللہ اُمتِ مرحومہ میں داخل ہونے کا حقدار تو ہوں کیونکہ مسلمان ہوں۔ میں سوال کروں گا کہ آخر اس اُمت میں کیا خصوصیت ہے کہ پوری کی پوری اُمت مرحوم ہو گئی۔ یہ تمام اُمت، اُمتِ مرحومہ کس طرح ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہو گا کہ چونکہ رحمۃ للعالمین سے تمسک ہے یعنی تعلق ہے، اس لئے رحمتِ خدا ان کی بدولت اس اُمت میں شاملِ حال ہوئی۔ لیکن ایک مختصر سوال ہے کہ جب ان کی بدولت رحمتِ خدا ہمارے شاملِ حال ہے تو یہ رحمتِ خدا اُسی وقت شاملِ حال ہو گی تا جب ہمارا اور ان کا راستہ ایک ہو۔ جدھر ان کی سمتِ سفر ہے، اُسی طرف ہمارا رُخ بھی ہو۔ تب اُمید ہے کہ جو رحمتِ خدا کا بادل ان پر برسے گا، اس کی بارش کے کچھ قطرے ہمارے دامن تک بھی آ جائیں۔ لیکن اگر

خدانخواستہ راستہ الگ الگ ہوا؟ رسول کا راستہ یہ ہوا اور جو اپنے آپ کو ان کی اُمت میں کہہ رہے ہیں، اُن کا راستہ دوسرا ہوا تو اب سوال یہ ہے کہ رحمتِ خدا آئے گی تو اُدھر جائے گی یا ادھر آئے گی۔

یہاں پر ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم ان کے پیچھے پیچھے کیونکر ہو سکتے ہیں؟ کہاں وہ، کہاں ہم۔ یعنی ہم ان جیسے کہاں ہو سکتے ہیں؟ تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم ان جیسے نہیں ہو سکتے۔ بس ایک جملہ کہوں گا کہ جدھر وہ جا رہے ہوں، اُسی طرف ہم بھی جا رہے ہیں۔ اس کیلئے ایک اصول عرض کرتا ہوں کہ سمتِ سفر صحیح ہو، چاہے رفتار سست ہو۔ تو کبھی منزل تک پہنچنے کی اُمید ہے لیکن اگر سمت ہی بدل گئی تو جتنا چلیں گے، اُتنا ہی منزل سے دور ہوں گے۔ منزل سے قریب نہیں آئیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ کی سمتِ سفر، آپ کی توجہ وہی ہو جو رسول کا مسلک ہے۔ ذرا صاف الفاظ میں کہہ دوں کہ اگر وہ صادق تھے تو ویسے صادق نہ سہی، مگر ایسے تو نہ ہوں کہ جھوٹ پر فخر ہو۔ جھوٹ کو عقلمندی تو نہ سمجھیں اور سمجھ لیجئے کہ یہ زمانہ وہی ہے یا نہیں کہ یہ لوگ سچوں کو بیوقوف کہتے ہیں۔ وہ آدمی تو احمق ہے، ہر بات میں سچائی۔ اب ذرا غور کیجئے۔ بے سمجھے کہا ہو تو فتویٰ نہ لگ سکے لیکن یہ کہ غور کیلئے، حقیقت کے لحاظ سے کہ آپ نے سچائی کو بیوقوفی کہا۔ تو جو صادق تھا، اس تک یہ گستاخی گئی یا نہیں؟ اور اس گستاخی کا رُخ اس کی طرف ہونے کے بعد کیا اسلام باقی رہا؟ اس طرح سے وہ امین تھا اور آپ محفلوں میں فخریہ بیان کریں کہ فلاں شخص کو میں نے کیسا چکمہ دیا ہے، اس کو کیسی چوٹ دی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سمتِ سفر دوسری ہو گئی، نقطہ نگاہ دوسرا ہو گیا۔

اس کے بعد کہاں ہو سکتا ہے کہ اس منزل تک پہنچے۔ اس کے بعد ایک سوال ہے کہ اُمت ایک رشتہ ہی تو ہے نا۔ ہم رسولؐ سے اپنا رشتہ جتا رہے ہیں کہ ہم اُن کی اُمت ہیں۔ تو ہمیں اپنی اُمت سمجھیں۔ ہمیں تو قرآن میں رسولؐ کی زبانی ایک اعلان نظر آتا ہے۔

"مَنِ اتَّبَعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ"۔

"جو میری پیروی کرے، وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے"۔

یعنی جو پیروی نہ کرے، اس کا تعلق ہی نہیں۔ تعلق ہی نہیں ہے تو اُمت ہونا کیسا؟ اور پھر پیغمبرِ خدا کی متفق علیہ

حدیث:

"سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ فِرْقَةً كُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةً"۔

"میری اُمت کے"، آدمیوں کے نہیں، انسانوں کے نہیں، "میری اُمت کے"، تو نسبت تو اُمت کی سب کیلئے ہوگی۔ اپنی طرف اضافت تو بحیثیتِ اُمت سب کو دے دی۔ مگر نتیجہ کیا؟ "میری اُمت کے 73 فرقے ہوں گے، سوائے ایک کے سب آتش جہنم میں جائیں گے۔ تو بتائیے، اب انہوں نے یہاں تو اُمت کہہ بھی دیا تو یہ دوسری منزل ہو گئی۔ پہلی تو یہ ہے کہ رسول بھی اپنی اُمت کہیں اور اس کے بعد کی یہ منزل ہے کہ رسولؐ اپنی اُمت میں کہیں اور اللہ بھی اپنی اُمت میں سمجھے۔

کوئی کہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسولؐ اپنی اُمت کہیں؟ تو میں نے کہہ دیا کہ وہ 73 فرقوں کو اپنی اُمت کہہ رہے ہیں اور یہ کہ

رسولؐ اپنی اُمت کہہ رہے ہیں اور خدا نہیں مانتا۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت نوحؑ بھی تو رسول تھے اور اولوالعزم رسول تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ:

"اِنَّهٗ مِنۡ اَهۡلِىۡ"۔

"میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے"۔

دو نسبتیں تھیں، ایک میرا بیٹا اور ایک میرا اہل۔ پہلی نسبت کی تو نفی نہیں کی گئی کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ اس نسبت کو برقرار رکھا گیا مگر دوسری نسبت کی نفی کر دی:

"اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ"۔

چونکہ اس کے اعمال غیر صالح ہیں، معلوم ہوا کہ اعمال وہ ہیں جو بیٹے کو اہل سے خارج کر دیتے ہیں تو اُمت ہونے کا کیا سوال ہے۔ مگر اب یہاں ایک متفق علیہ حدیث کی طرف آپ کا ذہن منتقل کروں۔ حدیث کساء ہمارے ہاں تفصیل سے ہے۔ دوسروں کے ہاں تفصیل سے نہیں ہے۔ لیکن جتنا میں پیش کروں گا، اس وقت وہ متفق علیہ ہے۔ اصل روایت کساء متفق علیہ ہے۔ صحاح و سنن میں بھی موجود ہے، اُسے پیش کروں گا کہ جس رسولؐ نے حضرت نوحؑ کے اس سوال و جواب کو بیان کیا کہ بیٹے کیلئے کہہ دیا گیا کہ یہ آپ کے اہل سے نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ عمل گیر صالح ہے۔ اب یہ رسولؐ اگر کسی کو چادر میں لے کر کہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّ هٰؤُلَاۤءِ اَهۡلُبَيۡتِىۡ"۔

"پروردگار! یہ میرے اہلؑ ہیں"۔

تو معلوم ہوگا کہ یہ فقط رشتے نہیں رکھتے ہیں مگر اس معیار پر ہیں کہ یہ ان کو اپنا اہل کر رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت نوحؑ کہہ رہے ہیں اور خالق کہہ رہا ہے کہ نہیں، تمہارے اہل سے نہیں۔ میں نے دلیل تو قرآن مجید سے پیش کر دی مگر کوئی مسلمان اور عقیدت مندی کا زیادہ اظہار کرنے والا یہ کہے گا کہ حضرت نوحؑ کے ہاں یہ ہو سکتا ہے مگر ہمارے رسولؐ کہیں کہ میری اُمت اور پھر اللہ اُسے نہ مانے، یہ نہیں ہو سکتا۔

ایک تو یہ کہ میں نے 73 فرقوں والی حدیث پڑھ دی کہ ہمارے رسولؐ کہہ رہے ہیں کہ میری اُمت، اور پھر نتیجہ خود ہی بیان فرمایا مگر یہاں عقلی طور پر میں واضح کروں کہ حضرت نوحؑ کے ہاں یہ کیوں ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میرے اہل سے، اور خالق نے کہہ دیا کہ نہیں۔ آخر وہ رسول ہیں، اولوالعزم ہیں، صاحب شریعت ہیں، تو ان کے ہاں کیوں ہوا؟ تب سمجھ میں آ جائے گا کہ ہمارے رسولؐ کے ہاں بھی ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسول احکام کو ظاہر پر مرتب کرنے کا موصور ہے۔ اگر ظاہر پر مرتب کرنے پر مامور نہ ہوتے تو رسول، تو اسلام میں منافقین کی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

تو پیغمبر مامور ہیں اس پر کہ وہ احکام کا ظاہر پر مرتب کریں، لہٰذا وہ جس حیثیت سے مامور ہیں، اُس حیثیت سے اپنی طرف

نسبت دے دیتے ہیں۔ میری اُمت کہہ دیتے ہیں۔ وہ میرے اہل کہہ رہے تھے اور خالق نے نجات کو اپنے علم سے وابستہ رکھا ہے۔ وہ باطنی نیتوں پر جزا دیتا ہے۔ وہ غیب کی باتوں پر نجاتِ آخرت کی بنیاد رکھتا ہے۔ تو رسول اپنے منصب کے لحاظ سے اپنی طرف نسبت دیتا ہے اور وہ اپنے منصب عدل کے لحاظ سے نتیجہ مرتب کرتا ہے۔

حضرت پیغمبرِ خدا کی ایک حدیث، بہت حوصلہ شکن حدیث ہے، لیکن ایسی حدیث ہے کہ صحیح بخاری میں تیرہ جگہ اس حدیث کا مضمون درج ہے۔ وہ حدیث حوضِ متواترات میں سے ہے۔ صرف صحیح بخاری میں تیرہ جگہ ہے۔ اس کے علاوہ صحیح مسلم اور دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے۔ مختلف کتابوں میں مختلف راویوں نے مختلف انداز سے بیان کی ہے۔ جو مشہور الفاظ ہیں، وہ پیش خدمت ہیں۔ میں بلا تبصرہ صرف الفاظ کا ترجمہ پیش کروں گا۔ جس کا دل چاہے صحیح بخاری میں دیکھ لے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"سَیَرِدُوْا عَلَی النَّاسُ مِنْ اُمَّتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ"۔

''میرے پاس قیامت کے دن میری اُمت کے کچھ افراد لائے جائیں گے''۔

نسبت دیکھئے، اُمت کی ہو گئی۔ ابھی آگے چل کر یہ نسبت اور اعزاز کے درجے کو حاصل کرے گی کہ میری اُمت کے کچھ افراد جو حوضِ کوثر پر میرے پاس لائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ حوضِ کوثر پر وہی آتے ہیں، جو پیاسے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تشنہ لبی کے عالم میں سیراب ہونے کیلئے آرہے ہوں گے۔ کوثر کی طرف کچھ افرادِ اُمت میں سے آنا چاہیں گے۔ 'ورد' کے معنی ہیں چشمے پر آنا۔ وہی لفظ ہے "سَیَرِدُوْا"۔ وارد ہوں گے کچھ لوگ کوثر پر میری اُمت میں سے۔

"فَیُحَالُوْا بَیْنِیْ وَبَیْنَھُمْ"۔

''تو میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا''۔

اب فرشتے پر جمالیں گے، نہیں آنے دیں گے یا بیچ میں دیواریں کھڑی ہو جائیں گی، پردے پڑ جائیں گے۔ سب کی گنجائش ہے۔ یعنی یہ کہ مجھ تک پہنچنے نہیں دیا جائے گا۔

"یُحَالُوْا بَیْنِیْ وَبَیْنَھُمْ"۔

''میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا''۔

ان کو مجھ تک نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔

"فَاَقُوْلُ یَارَبِّ اَصْحَابِیْ اَصْحَابِیْ ثَلَاثًا"۔

''میں تین مرتبہ کہوں گا، یہ تو میرے اصحاب ہیں، اصحاب ہیں۔''

دیکھئے! رسولؐ بالکل بخل نہیں کر رہے ہے۔ یہ فرمارہے ہیں کہ میرے اصحاب ہیں، میرے اصحاب ہیں۔ اور ایک دفعہ نہیں، تین تین دفعہ فرمارہے ہیں کہ میرے اصحاب ہیں۔

"فَيُقَالُ لَاعِلْمَ لَكَ بِمَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ اِنَّهُمْ رَجَعُوْا اِلٰى اَعْقَابِهِمُ الْقَهْقَرٰى"۔

ارشاد ہوگا، ارے آپ تو مامور تھے ظاہر پر عمل کرنے کے، آپ کو شخصی طور پر کیا خبر کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا گل کھلائے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی باتیں کیں۔ نئے گل کھلائے۔ یہ تو پچھلے پیروں اپنے پرانے مسلکوں پر پلٹ گئے۔ یہ الفاظ جو میں نے کہے، کسی بھی مکتبِ فکر کے آدمی سے، عربی دان سے اس کا ترجمہ کروا کے کہئے کہ آپ کچھ تشریح نہ کیجئے۔ صرف ترجمہ ان الفاظ کا لکھ دیجئے تو دیکھئے کہ یہی حدیث بالکل فیصلہ کن ہے یا نہیں!

دیکھئے! رسول اپنی طرف نسبت دے رہے ہیں اور پھر خالق نفی کئے دے رہا ہے۔ تو ہمارا اپنے کو اُمت مرحومہ قرار دینا، جب تک کہ وہ معیار نہ ہو اور اس حدیث سے معیار یہ ہوا کہ پیغمبرؐ کے بعد اس راستے پر آخر تک قائم رہیں۔ پھر حضرت نوحؑ کے سلسلہ میں معیار بتایا کہ نیک اعمال ہوں اس کے، تب وہ صحیح طور سے اُمتِ رسول کہلایا جاسکتا ہے۔ یہ تو پوری اُمت نے اپنا لقب قرار دیا تھا، اُمتِ مرحومہ۔ ان میں سے ایک گروہ، جو بحمد للہ ہم ہیں، ہم نے اپنا لقب قرار دے لیا فرقہ ناجیہ۔ کیا معنی؟ وہ فرقہ جو نجات کا حقدار ہے۔

اسی طرح جس اُمت کے رجسٹر میں نام آیا اور رحمتِ خدا مل گئی، ویسے اس فرقہ میں شمار ہوا اور بس نجات ہوگئی۔ مگر میں نے اُمتِ مرحومہ میں جرح کی کہ آخر کیا خصوصیت ہے ہم میں کہ ہم اُمتِ مرحومہ ہوگئے تو کیا فرقہ ناجیہ کو یونہی چھوڑ دوں گا؟ یہ تو انصاف کے خلاف ہے۔ لہٰذا غور طلب ہے فرقہ ناجیہ میں۔ یہ ہر فرد سے سوال ہے کہ آخر کیا خصوصیت ہے کہ آپ فرقہ ناجیہ ہوں؟ جس طرح کہ اُمت مرحومہ کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے میں نے ایک دلیل پیش کی تھی کہ چونکہ رحمۃ اللعالمین سے تمسک ہے، اس لئے اُمتِ مرحومہ ہیں۔ اسی طرح فرقہ ناجیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے مجھے یہ حق ہے کہ میں اس کا ثبوت پیش کروں۔ یہ فرقہ کیوں فرقہ ناجیہ کہلاتا ہے؟ ابھی میں حدیث پڑھ چکا جو متفق علیہ ہے کہ میری اُمت کے 73 فرقے ہوں گے۔ ایک جنتی ہوگا۔ ہر ایک دعویدار ہے کہ وہ جنتی ہے۔ اصل حدیث سب کے ہاں متفق ہے۔ 73 فرقے ہوں گے۔ بعض میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں 71 ہوئے، حضرت عیسیٰؑ کے ہاں 72 ہوئے اور میرے ہاں 73 ہوگئے، گویا ترقی ہو رہی ہے۔

73 فرقے ہوگئے۔ یہ سب کے ہاں مسلم ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ عقلی طور پر کہ جس رسولؐ نے یہ بتایا کہ میری اُمت کے 73 فرقے ہوں گے اور ایک نجات کا حقدار، اسی رسولؐ کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ اُس ایک کی پہچان کیا ہے؟ ورنہ ایک آپ کے دوست جارہے ہوں کہیں، آپ منزل سے واقف ہیں، انہیں یہ بتا دیتے ہیں کہ ایک چوراہا آئے گا، اور یہ نہ بتائیں کہ جو صحیح راہ ہے، اس کی پہچان کیا ہے؟ تو آپ کے بتانے سے فائدہ کیا ہوگا؟ ایک چوراہے کو بتا کر صحیح راستے کی نشان نہ بتانا، سوائے پریشانی کے کچھ بھی نہیں ہے۔ ویسے ہی ہفتہ دوسرا رہا، 73 راہیں ہوں گی۔ ان میں سے ایک ہے جو نجات کی طرف جاتی ہے اور باقی سب دوزخ کی طرف جاتی ہیں۔ یعنی جنت بیچاری کا ایک راستہ اور دوزخ کے اتنے راستے۔ جس راستے سے جاؤ گے، وہاں پہنچو گے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ کثرت کدھر ہوگی اور قلت کدھر ہوگی!

یہ تو حدیث سے ہمیں پتہ چلا کہ اُمت ہونا کافی نہیں ہے، اُمت کا ایک فرقہ ہونے کی ضرورت ہے۔ فرقے کا لفظ تو اس حدیث سے آیا۔ رسول کا فرض ہے کہ وہ بتائیں کہ کسی کو ابھی تک نہیں ملا ہے تو تلاش کرے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر رسولؐ نہ بتاتے تو مسلمانوں کو دامن تھام کر پوچھنے کا حق تھا کہ آپؐ نے یہ کہہ تو دیا، خدارا! بتاتے تو جائیے کہ اس فرقہ کی پہچان کیا ہے؟ اگر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہ بتائے کہ مسلمانوں نے کبھی رسولؐ سے پوچھا؟ تو سمجھ لیجئے کہ رسولؐ نے بتایا۔ اگر رسولؐ نہ بتاتے تو لوگ پوچھتے کیوں نہیں؟ یہ نہ پوچھنا دلیل ہے کہ بتایا ہے۔ اور اب جو میں بتاؤں، جو مجھے معلوم ہے، وہ دنیا تسلیم کرے یا خود بتائے کہ کیا بتایا؟

مجھے معلوم ہے رسولؐ نے جو پہچان بتائی۔ وہ بھی متفق علیہ۔ علامہ ابن حجر مکی کی کتاب ''صواعق محرقہ'' کے حوالے تو آپ اتنے سنتے ہیں کہ گویا وہ ہماری موافقت کی کتاب ہے، حالانکہ وہ سخت ترین رد ہے ہمارے خلاف۔ ہماری رد میں ہے صواعق محرقہ۔ وہ لوگ جو نرم الفاظ کی دعوت دیتے ہیں، وہ دیکھیں کہ اس کتاب کا نام کتنا سخت ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گرنے والی بجلیاں جو جلا دیں اور کسے جلائیں؟ وہ ہم ہیں۔ اسی کتاب میں ہمارے مطلب کی باتیں ہیں۔ اس میں ایک طریق سے نہیں، کئی طریق سے یہ حدیث ہے۔ اور بھی بہت سی کتابوں میں ہے لیکن چونکہ یہ کتاب ہمارے خلاف سخت ترین ہے، اس لئے میں نے اس کا نام لے دیا ہے۔

پیغمبر خدا نے اس فرقہ ناجیہ کی پہچان بتائی ہے:

"مَثَلُ اَهْلِبَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَهَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰی"۔

''میرے اہل بیتؑ کی مثال نوحؑ کی کشتی کی سی ہے، جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی''۔

مطلب تو میرا اس سے ہی نکل آیا کہ فرقے کا لفظ وہاں سے آیا، ناجیہ کا یہاں سے آیا۔ جو فرقہ اہل بیتؑ کی کشتی پر سوار ہو، بلاشبہ اسے فرقہ ناجیہ کہے جانے کا حق ہے۔ یہ ان دونوں حدیثوں سے مل کر فرقہ ناجیہ ثابت ہو گیا۔ لیکن ابھی یہ حدیث پوری تو نہیں ہوئی کہ

"مَنْ رَکِبَهَا نَجٰی"۔

''جو اس پر سوار ہوا، اس نے نجات پائی''۔

"وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا"۔

''مجبوراً میں ترجمہ کرتا ہوں، ''جو اس سے تخلف کرے''۔

کوئی کہے گا یہ کیا ترجمہ ہوا؟ وہ ''تَخَلَّفَ'' اور یہ ''تخلّف''۔ تو یہ ترجمہ عربی کا عربی ہی سے ہو گیا۔ مگر اب یہ مجبوری ہے کہ باوجود اس کے کہ اہلِ زبان ہونے کا دعویدار ہوں مگر اُردو میں مجھے لفظ معلوم نہیں ہے کہ میں اس کا کیا ترجمہ کروں کہ جو اس سے تخلف کرے، اس کا ترجمہ میں ایک لفظ میں کیا کروں؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ذرا تشریح کروں تو پھر سوچئے گا آپ بھی کہ کیا لفظ ہو سکتا ہے۔

"مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا"۔

"جو اس سے تخلف کرے"۔

کیا مطلب، تخلف کرے؟ یعنی یا تو کشتی پر بیٹھے ہی نہیں شروع ہی سے، یا بیٹھ کر کہیں اُتر جائے۔ نتیجہ سب کا ایک ہے۔ شروع ہی سے نہ بیٹھے یا اپنا دوسرا جہاز بنالے۔

"رَکِبَھَا" میں دونوں جزو ہیں، سوار ہو اور سوار رہے اور تخلف کے معنی یہ ہیں کہ سوار ہی نہیں اور سوار ہو کر کسی منزل پر اُتر جائے۔ غرض نتیجہ اسی سے وابستہ ہے جو سوار ہو اور آخر تک سوار رہے تو پھر اس کیلئے نجات ہے اور جو تخلف کرے یعنی سواری ہی نہ ہو یا بیچ میں اُتر جائے، وہ ڈوبا اور گیا۔

حدیث ہے متفق علیہ۔ عبقات الانوار کی ایک پوری جلد، سات سو صفحات کی، حدیثِ سفینہ میں ہے، اتنی کثرت سے صحابی نے، تابعین نے، تبع تابعین نے اور ہر صدی کے علماء نے اس کو نقل کیا ہے۔ انکار تو اس حدیث کا ہو ہی نہیں سکتا۔ علماء کو بہر حال قلمی جہاد کرنا ہے، چاہے جس راہ میں ہو، وہ جہاد ہمیشہ حق کی راہ میں نہیں ہوتا۔ جہاد تو جد و جہد سے ہے۔ جس راہ میں وہ جد و جہد ہو، وہ جہاد ہے۔

بہت ہی باریک بینی سے ایک پہلو سامنے لایا گیا کہ بے شک پیغمبر محمدا نے اہلِ بیتؑ کو کہا ہے کہ کشتی ہیں۔ مگر کشتی ستاروں کے سہارے سے چلتی ہے اور ایک معزز طبقے کو حضرتؐ نے ستاروں کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا بس ٹھیک ہے، کشتی بھی ہو اور ستارے بھی ہوں، تب نجات ہے۔

مگر جناب! یہ تو رسولؐ کا کلام ہے، آپ بے سوچے سمجھے تو (معاذ اللہ) کوئی بات ارشاد نہیں فرما سکتے تھے۔ غور کیجئے کہ پیغمبرؐ نے ہر کشتی کو نہیں کہا ہے۔ یہ کہا ہے کہ نوحؑ کی کشتی دن کو چلی تھی یا رات کو؟ اگر ثابت ہو جائے کہ رات کو چلی تھی تو ستاروں کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اگر دن کو چلی ہو تو دن کو ستارے کہیں نظر آتے ہیں!

اچھا فرض کیجئے کہ رات کو چلی تو قرآن سے پوچھئے کہ نوحؑ کی کشتی چلی ہے تو کیا عالم تھا؟ آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جب بارش ہو رہی تھی، چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ ستارے تو خود ہی غائب تھے۔ تو وہ کشتی ستاروں کے سہارے کیونکر چلتی۔ آیئے قرآن سے پوچھیں کہ وہ کشتی کس کے سہارے چل رہی تھی؟ قرآن نے کشتی کے بننے کا حال بھی بتایا ہے اور کشتی کے چلنے کا حال بھی بتایا ہے۔ بننے کے لئے کہا ہے، حضرت نوحؑ سے خطاب کر کے جو خالق کہہ رہا ہے:

اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

"دیکھو! کشتی بناؤ ہماری آنکھوں کے اشارے پر اور ہماری وحی کے مطابق"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو نجات کی کشتی ہوتی ہے، وہ پیغمبر اپنی رائے سے بھی نہیں بناتا اور اب کشتی کے چلنے کا حال، وہ بھی انہیں الفاظ میں ہیں:

"تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا"۔

"وہ کشتی ہماری نگاہوں کے اشارے پر چلتی تھی"۔

توکوئی دنیا کی کشتی ستاروں کے سہارے پر چلتی ہو مگر نوحؑ والی کشتی ستاروں کے سہارے پر نہیں چل رہی تھی۔ایک پہلو اور دیکھئے کہ وہاں تو خطاب رسول سے تھا کہ ہماری نگاہوں کے اشارے پر کشتی بناؤ اور اب یہ کشتی کیلئے ہے کہ ہماری نگاہوں کے اشارے پر چل رہی تھی۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول، اللہ کی نگاہوں کے اشارے دیکھتا ہے، اُسی طرح کشتی بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے اشارے دیکھتی ہے۔

بحمد للہ! یہ تو پہلی منزل طے ہوگئی یعنی سند فرقہ ناجیہ کی مل کہ کیوں ہم اپنے کو فرقہ ناجیہ کہتے ہیں۔ایک حدیث سے لفظ فرقہ آیا، دوسری حدیث سے لفظ ناجیہ آیا۔اب ہر ایک ماننے کیلئے مجبور ہے کہ جو جماعت کشتی میں بیٹھی ہے، وہ نجات پائے گی۔یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں حسد ورشک سے کام لیا جائے۔ہم بہت خوش ہیں کہ سب آ کر بیٹھ جائیں ہمارے ساتھ۔ہمیں دنیا کے ڈوبنے سے کوئی دلچسپی ہے؟

مگر اب دوسرا پہلو۔یہ تو طے ہوگیا کہ جو کشتی اہلِ بیتؑ میں بیٹھا، وہ نجات کا حقدار۔مگر غور طلب بات یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کی کشتی پر سوار ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہاں کوئی کشتی ویسی تو ہے نہیں اور اس پر بیٹھنا اس طرح کا تو ہے نہیں جس طرح کشتی پر بیٹھنا ہوتا ہے۔یہ کوئی چیز ہے جس کو بطور استعارہ کشتی پر بیٹھنا کہا گیا ہے۔اب وہ کیا چیز ہے جسے کہا گیا ہے کشتی پر بیٹھنا۔استعارے کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے اور تشبیہ میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک مشبہ اور مشبہ بہ۔ایک وہ چیز جس کو تشبیہ دیجائے اور ایک وہ چیز جس سے تشبیہ دی جائے اور ایک کوئی مشترک پہلو ہوتا ہے جو اس میں بھی ہو اور اُس میں بھی۔اس کو وجہِ شبہ کہتے ہیں۔

نکلاؤ کارتاہو اضیغم کچھارسے

تشبیہ دی گئی ہے ایک انسان کو شیر سے۔اس میں شیر ہے مشبہ بہ اور انسان مشبہ ہے۔کس بات میں تشبیہ ہے، وہ شجاعت بہادری یہ ہے۔وجہ شبہ تو کوئی چیز ہے جسے کہا گیا ہے کشتی پر بیٹھنے میں ہو، وہی بات کہیں ہو تو وہ چیز ہوگئی کشتی پر بیٹھنا۔بطور استعارہ، کشتی پر بیٹھنا کیا ہوتا ہے؟ جاتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں اور کیا ہوتا ہے۔یہ پوچھ کیا رہے ہیں؟ کیا ہوتا ہے؟ میں کہوں گا کہ یہ بھی میں جانتا ہوں، جاتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو کیا (معاذ اللہ) یہاں بھی جا کر بیٹھ جائے گا۔کوئی خاص بات ہے کشتی پر بیٹھنے میں۔وہ بات تلاش کرنا ہے۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

چلئے میں ایک سوال کرتا ہوں کہ کشتی دریا میں اور آپ ساحل پر کھڑے ہیں۔بڑی عمدہ رفتار ہے، یاد رکھئے کہ اگر واقعی کشتی اچھی ہے تو مدح کرنا قابلِ تعریف ہے کہ آپ سچی بات کہہ رہے ہیں اور اگر دنیا اس اچھائی کو ماننے کیلئے تیار نہ ہو تو یہ جہاد بھی ہوسکتا ہے۔لیکن جو میں عرض کر رہا ہوں، وہ بتائیے کہ یہ ساحل پر کھڑے کھڑے تعریفیں کرنا کیا کشتی میں بیٹھنا ہے؟ ہر ایک کے ضمیر نے گواہی دے دی۔کہ یہ کشتی میں بیٹھنا نہیں ہے۔اچھا اور آگے بڑھیے۔وہیں ساحل سے کھڑے کھڑے آپ نے کہا کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں۔ہمیں اس کشتی سے بہت محبت ہے۔میں آپ کو مبارکباد دوں گا کہ یہ محبت قدر حسن کی دلیل ہے۔لیکن اب جو جملہ کہہ رہا ہوں، اس

پر غور کیجئے گا، فرصت کے لمحات میں، یہ محبت کرنا کوئی آپ کا کارنامہ نہیں ہے، یہ اُس کے حسن کا تقاضا ہے۔ محبت نہ کرتے تو ظلم تھا۔ اب یہ محبت بالکل اچھی چیز ہے مگر وہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ ساحل پر کھڑے کھڑے محبت کا دعویٰ کرنا کیا حقیقی معنوں میں محبت ہے؟ کیا یہ کشتی پر بیٹھنا ہے؟ نہیں۔ اس سے بھی نازک تر منزل اور ہے کہ آپ ساحل پر کھڑے ہیں، کشتی دریا میں ہے، بادِ مخالف کے تھپیڑوں میں گھری ہوئی ڈوبنے کے قریب ہے اور آپ یونہی ساحل پر کھڑے کھڑے آنسو بہانے لگیں: ہائے افسوس! ایسی کشتی تباہ ہو رہی ہے۔ ہائے افسوس! ایسی کشتی ڈوب رہی ہے۔

اب چاہے جتنا غم کیجئے لیکن ساحل پر کھڑے کھڑے کیا یہ غم کشتی پر بیٹھنا تو ہے۔ قابل قدر ہیں یہ آنسو، دردِ دل کی دلیل ہیں۔ جب دنیا اَمس رہی ہو تو یہ رونا بھی جہاد ہے اپنی جگہ پر۔ یہ سب کچھ سہی مگر یہ کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کشتی پر بیٹھنا یہ ہوتا ہے کہ جب کشتی جا کر بیٹھ گئے تو نہ اپنی ذاتی حرکت کچھ رہی، نہ اپنا ذاتی سکون کچھ رہا۔ کشتی چلی تو ہم چلے، کشتی رُکی تو ہم رُکے۔ یہ مطلب ہے اہل بیتؑ کی کشتی میں بیٹھنے کا کہ اپنے حرکت و سکون و تابع اہلِ بیتؑ بنا دو۔

اب اگر واقعی کشتی پر بیٹھے رہے تو نجات تو ایک عام لفظ ہے، میں کہتا ہوں جہاں کشتی پہنچے گی، وہاں یہ بھی پہنچے گا۔ یہی کہا گیا ہے اپنے خاص پیرووں کیلئے:

"فِي دَرَجَتِنَا يَوْمَ الْقِيَامَة".

"وہ قیامت کے دن ہمارے درجہ میں ہوں گے۔"

پانی پیاس بجھاتا ہے، پانی کا نام نہیں۔ غذا بھوک کو دور کرتی ہے، غذا کا نام نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ توسل، وابستگی نجات کی ضامن ہے۔ مگر بس وابستگی۔ واقعی ہے محبتِ اہلِ بیتؑ، بتایئے۔ دوستدارِ اہلِ بیتؑ، پیروِ اہل بیت محبِ اہل بیتؑ ہم زیادہ ہیں یا سلمان فارسیؓ۔ ہم ان کے پیرو زیادہ یا ابوذر غفاریؓ۔ ہم واقعی ان کے شیعہ ہیں یا عمار یاسرؓ۔ ہم ان کے بڑے وفادار یا حبیب ابن مظاہرؓ یا مسلم ابن عوسجہؓ۔ خدا کی قسم! ہم راہِ محبت میں ان کے غبارِ قدم تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ دیکھئے کہ جتنا دعویٰ محبتِ اہلِ بیتؑ کا زیادہ تھا، اُتنا ہی اطاعتِ خدا میں زیادہ تھا یا کم تھا؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جتنا دعویٰ محبت کا زیادہ تھا، اتنی ہی عبادتِ الٰہی کی فکر زیادہ تھی۔ اتنا ہی اطاعتِ الٰہی کا خیال زیادہ تھا۔ بلکہ محبت کی پہچان ہی اطاعت سے ہوتی ہے۔

ایک صحابی حاضر ہوئے، امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ آپؑ اپنے حقوق کی طلب کیلئے کھڑے نہیں ہوتے؟ اگر آپ کھڑے ہو جائیں تو صرف خراسان اور اطرافِ خراسان میں ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت کیلئے بلند ہو سکتی ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: اچھا! ہمارے اتنے دوست ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ تم بھی تو ان میں سے ہی ہو نا؟ کہا: جی بے شک۔ ان میں سے ہوں۔ آپؑ نے فرمایا: جاؤ تنور میں آگ روشن کرو۔ لیجئے! تنور میں آگ روشن ہو گئی۔ آپؑ نے فرمایا: ابو سہیل خراسانی! ذرا اس تنور میں تو چھلانگ لگا دو۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ کہنے لگا: حضورؑ! میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ کو اتنا غصہ آئے گا، اتنے آپؑ ناراض ہوں گے۔ اب آئندہ سے ایسی بات نہیں کروں گا۔ آپؑ نے کہا: جانے دو۔ تنور میں آگ روشن رہی۔ آپؑ ان

سے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ہارون مکی آئے۔ مکہ معظمہ سے حج کرکے آئے تھے اور یہ وہ حضرات تھے جو حج کی تکمیل سمجھتے تھے کہ ان ڈیوڑھیوں پر حاضر ہوں۔ لہٰذا کئی مہینے کی مسافت طے کرنے کے بعد آرام کرنے کی بجائے سیدھے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؑ، ابو سہیل خراسانی سے گفتگو فرما رہے تھے۔ انہوں نے سلام عرض کیا، آپؑ نے جواب دے کر بغیر کسی تمہید کے فرمایا کہ ہارون! دیکھو، تنور میں آگ روشن ہے، جا کر اس میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے سبب نہیں پوچھا۔ کہہ سکتے تھے کہ ذرا موقع دیجئے، آپ سے گفتگو کا شرف حاصل کرلوں۔ نہیں، اِدھر امامؑ نے حکم دیا، اُدھر انہوں نے اپنا رُخ بدلا اور تنور میں داخل ہو گئے۔ یہ دل ہی دل میں کہہ رہے ہیں کہ بیکار میں نے اتنا غصہ دلا دیا کہ ایک شخص کی جان گئی۔ حضرتؑ باتوں میں مصروف رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرتؑ نے فرمایا کہ آؤ چلو، دیکھیں کہ ہارون کا کیا حال ہے؟ مجبوراً پیچھے پیچھے چپکے چپکے چلے۔ دل میں یہ کہ وہاں کیا رکھا ہے جو جا کر دیکھیں۔ جا کر دیکھا کہ آگ سرد ہو چکی ہے، وہ بیٹھے ہوئے تسبیح الٰہی میں مصروف ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: میرے ایسے کتنے دوست ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ایسا تو ایک بھی نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا کہ محبت کا معیار اطاعت قرار پائی۔ ہم روزمرہ کے احکام میں اطاعت نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ بحمد للہ محبت کی معراج پر فائز ہیں۔ اب کربلا والوں کو دیکھئے کہ ادھر جہاد ہو رہا ہے، اُدھر سورج پر نظر ہے۔ کوشش یہ ہے کہ مولاؑ کہنے نہ پائیں کہ ہم اپنا نذرانہ عبادت پیش کریں اور صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ ظہر کے وقت کی شناخت سب سے زیادہ مشکل ہے۔ خط نصف النہار پر کوئی لکیر کھنچی ہو، جو آنکھ سے نظر آئے، ایک خط موہوم ہے جس سے آسمان کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک مشرق اور ایک مغرب۔ جب تک آفتاب ادھر ہے، اس وقت تک زوال نہیں ہوا۔ جب آفتاب اُدھر ہو گیا تو زوال ہو گیا۔ پہچان کا اتنا نازک ذریعہ اور دیکھئے کہ ادھر زوال ہوا اور خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ دشمن بہت قریب آگیا ہے۔ تمنا یہ ہے کہ نماز آپؑ کے ساتھ باجماعت ادا ہو جائے۔ امامؑ دعائیں دینے لگتے ہیں، جس طرح کوئی اُستاد کی توقع سے زیادہ صحیح جواب دے دے۔ فرماتے ہیں: تم نے ایسے وقت پر نماز کو یاد کیا، اللہ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے:

"نَعَمْ هٰذَا اَوَّلُ وَقْتِهَا"۔

"ہاں! یہ اس کا اول وقت ہے"۔

آپ دیکھتے ہیں کہ غیر معصوم کی نگاہ کی عصمت یہ ہے، انؑ کی ڈیوڑھی پر رہنے کا فیض کہ یہ جوہر امتیاز کا پیدا ہو گیا ہے کہ معصوم اور غیر معصوم میں فرق نہیں رہا ہے۔ بس اب یہ فرماتے ہیں کہ ان سے کہو کہ اتنی دیر کیلئے یہ جنگ روک لیں کہ ہم نماز ادا کرلیں۔ میں جانتا ہوں کہ نماز کیلئے جنگ روکنے کی ضرورت نہیں ہے، ہر حال میں نماز ہو سکتی ہے۔ جنگِ مغلوبہ میں بھی نماز ہو سکتی ہے، اشاروں سے ہو جاتی ہے۔ مگر میرا دل یہ کہتا ہے کہ اگر یہود سے مقابلہ ہوتا تو التوائے جنگ کی درخواست نہ کی جاتی۔ اگر نصاریٰ سے مقابلہ ہوتا تو التوائے جنگ کی درخواست نہ کی جاتی۔ مگر چونکہ بد قسمت مسلمانوں سے مقابلہ تھا، اس لئے یہ التوائے جنگ کی درخواست نہ تھی، یہ ان کے ضمیر اسلامی کو بیدار کرنے کی امکانی کوشش تھی۔ جب مہلت نہیں دی گئی تو امامؑ نے دکھا دیا کہ ہم نماز پڑھنے میں تمہاری مہلت کے

محتاج نہیں ہیں۔ تو کہی جو نماز ہو اور با جماعت ہو مگر کس طرح کہ دو ساتھی سعید بن عبداللہ اور زہیر ابن قین، ان کو سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ جو تیر آتا ہے، اُسے اپنے اوپر روکو۔ لیجئے! ادھر نماز ہو رہی ہے، اُدھر تیر کھائے جا رہے ہیں۔ کسی کو حق نہیں ہے یہ سمجھنے کا کہ ان دونوں نے یہ نماز نہیں پڑھی۔ سب عالم مسائل تھے، سب فقیہ تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تیر کھانے کو جھکے تو رکوع نہیں کر لیا؟ کون کہہ سکتا ہے کھڑے ہوئے تو قیام نہیں ہو گیا؟ جب گر پڑے تو اشاروں سے سجدے نہیں ہو گئے؟ لیکن بہر حال اس جماعت میں تو شریک نہیں ہوئے۔ اور اب کون عالم ہے جو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان کی نماز افضل کہ جنہوں نے مولاؑ کے پیچھے نماز پڑھی یا ان کی نماز افضل جنہوں نے مولاؑ کو نماز پڑھائی۔

صورتِ واقعہ بتاتی ہے کہ اثنائے نماز میں اتنے تیر کھائے کہ اب کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہی مگر یہ قوتِ ارادی تھی کہ طے کر کے کھڑے ہوئے تھے کہ مولاؑ نماز پڑھ لیں۔ جب تک امامؑ نے سلام نہیں پھیرا، سعید زمین پر نہیں گرے۔ اِدھر امامؑ نے سلام پھیرا، اُدھر سعید زخموں سے چور زمین پر گر پڑے۔ مڑ کر پوچھا:

"اَوَفَيْتُ يَابْنَ رَسُوْلِ اللهِ"۔

"کیوں مولاؑ! میں نے حقِ وفا ادا کر دیا؟

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"نَعَمْ وَفَيْتَ جَزَاكَ اللهُ خَيْرًا"۔

"ہاں! تم نے وفا کر دی، اللہ جزائے خیر عطا فرمائے"۔

حضور! یہ تو ظہر کی نماز تھی۔ میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ عصر کا حال بیان کر سکوں۔ امامؑ نے وقتِ فضیلت پر عصر کی نماز بھی پڑھی ہے۔ میں اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا کہوں گا کہ اب جماعت نہیں تھی۔ جماعت تو گرم زمین پر سر کٹائے پڑی تھی۔ یہ نماز امامؑ نے جماعت کے بغیر فرادیٰ ادا کی۔ بس یہ نہیں بتا سکتا کہ رکوع کس عالم میں ہوا، قیام کس عالم میں، کس انداز سے ہوا؟ قعود کس شان سے ہوا؟

17

کامیابی ہوتو ایسی ہو

سوچئے تو سہی کہ کون ایسا اہم غزوہ اور بڑی جنگ ہے کہ جس کی فتح کو خالق نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی ہے۔

اس معیار پر سب سے پہلی جنگ، جنگ بدر قرار پائی جنگ بدر میں اسباب جنگ کیا موجود تھے تعداد لشکر 313 عدد اور مقابلہ تقریباً ایک ہزار کا تین سو تیرہ میں اسلحہ جنگ، صرف تیرہ عدد تلوار یں۔

جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا میں کل اس کو علم دوں گا کہ جو نہیں پلٹے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھ پر فتح نہ دے دے۔

میں بارگاہ رسالت میں ایک سوال عرض کروں گا کہ پلٹنا اور نہ پلٹنا دوسرے کا کام ہے یہ آپ دوسرے کے کام کے ذمہ دار کیوں ہو گئے؟ تو روایات کی رو سے مجھے جواب یہ ملا کہ خاموش رہ بے شک دوسرے کے فعل کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا مگر کیا میں اپنے نفس کے فعل کا بھی ذمہ دار نہیں ہو سکتا؟

جب رسولؐ کو اس طرح کی صلح کا فتح مبین ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو وہ حسن مجتبیٰ کی صلح کو کیا سمجھ سکتے ہیں کہ حسنؑ مجتبیٰ نے اس صلح کے ساتھ کیسی فتح حاصل کی!

کامیابی ہو تو ایسی ہو

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ①

26ویں پارے میں سورۂ مبارکہ جس کا نام اسی پہلی آیت کی وجہ سے سورۂ فتح رکھا گیا ہے۔ اس میں بسم اللہ کے بعد پہلی آیت کا پہلا جزو ہے۔ یقیناً ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ جب ہم فتح وشکست کا نام سنیں تو ذہن فوراً جنگ کی طرف جاتا ہے کیونکہ پیغمبر خدا کو مخاطب کر کے یہ ارشاد ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم غزوات پیغمبرؐ پر غور کرنے لگیں گے کہ کونسا ایسا اہم غزوہ اور بڑی جنگ ہے جس کی فتح کو خالق نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ اب جنگوں کو دیکھیں گے اور ہر ایک جنگ کی صورت حال پر غور کریں گے تو کئی جنگیں ایسی ملیں گی جن کی فتح کو ہم نمایاں فتح سمجھیں۔ یعنی بہت سی جنگوں میں ایسے اسباب مل جائیں گے جن کی وجہ سے وہ فتح نمایاں طور پر قابل ذکر ہو۔

وہ حیثیت جس کے سبب سے فتح کو بہت نمایاں کہا جا سکتا ہے اور جس کو خالق اپنے احسانِ خاص کے طور پر بیان فرمائے، وہ یہ ہے کہ اسبابِ فتح کوئی نہ ہوں۔ اسبابِ فتح وابستہ ہوتے ہیں سامانِ جنگ سے اور جب سامانِ جنگ کوئی نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسبابِ فتح کوئی نہیں۔ اب اسبابِ فتح کے نہ ہوتے ہوئے پھر بھی نتیجہ میں فتح ہو جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ محل ہو سکتا ہے کہ خالق یہ ارشاد فرمائے کہ ہم نے آپ کو یہ نمایاں فتح عنایت کی۔ یعنی ظاہری اسباب سے تو کوئی فتح کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی، ہمارا فضل وکرم تھا اور ہماری تائید تھی کہ ہم نے فتح عطا کر دی۔ اس معیار پر سب سے پہلی جنگ یعنی جنگِ بدر قرار پائی ہے۔ جنگِ بدر میں اسبابِ جنگ کیا موجود تھے؟ لشکر کی تعداد 313 عدد اور مقابلہ تقریباً ایک ہزار کا۔ تین سو تیرہ میں اسلحہ جنگ صرف تیرہ عدد تلواریں۔

اس کو یوں عرض کروں کہ صرف اکائیاں مسلح اور سینکڑے جتنے ہیں، وہ سب غیر مسلح۔ جو نہتے کا ہتھیار ہو سکتا ہے، کسی کے ہاتھ میں شاخِ خرما ہے، کسی کے ہاتھ میں لکڑی ہے۔ جو جس کے ہاتھ آ گیا۔ صرف تیرہ آدمی ہیں جن کے پاس تلواریں ہیں اور پوری فوج میں صرف دو گھوڑے ہیں۔ عرب میں میدانِ جنگ کی سواری گھوڑا تھا۔ زمانہ امن کی سواری اونٹ تھا۔ گھوڑے پوری فوج میں صرف دو تھے۔ یہ کوئی سامانِ جنگ ہوتا ہے؟ وہ تو جنگ ہوئی اور نتیجہ میں فتح ہو گئی۔ اس لئے اسے فوج اسلام کہہ لیجئے۔ ورنہ ایسی کوئی فوج ہوتی ہے؟ ہماری تو مجالس میں 313 سے زیادہ آدمی ہوتے ہیں۔ تو کیا اس تعداد اور اس کے زیادہ ہونے سے فوج ہو جاتی ہے؟ اسلامی جماعت کہہ لیجئے۔ ایک جماعت ہے مسلمانوں کی۔ اس کو فوج کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ جس کے پاس یہ تعداد ہو، دوسری طرف سے مسلح ہزار آدمی ہوں، کیا فتح کی اُمید ہو سکتی ہے؟ اب اس کے بعد بھی فتح ہو تو وہ یقیناً اس کی حقدار ہو گی کہ خالق یہ ارشاد فرمائے کہ ہم نے کھلی ہوئی فتح عنایت کی ہے۔ اب وہ جس کے ہاتھ سے ہو۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اس جنگ میں فرشتے بھی بھیجے گئے تھے اور فرشتے صرف تسلی

کیلئے نہیں آئے تھے، جنگ کرنے کیلئے آئے تھے۔ انہوں نے جنگ کی۔ وہ خونریزی سے بچنے والے اور انہوں نے خونریزی کی۔ ماشاء اللہ رفتہ رفتہ لوگوں کا ذہن منتقل ہوا۔ اس کو خالق ارشاد فرمائے:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ①

بالکل صحیح ہے۔ اس کے بعد اُحد کی لڑائی ہوئی۔ ایک دوسری حیثیت فتح کی یہ ہے کہ جہاں لڑائی بگڑ چکی ہو، شکست ہو چکی ہو اور اس کے بعد نتیجہ میں فتح ہو جائے تو کیا وہ اس کی مستحق نہیں ہے کہ اسے خالق کہے کہ ہم نے یہ فتح عنایت کی اور اس محل پر خالق اگر یہ کہے کہ ہم نے فتح عنایت کی تو اس میں مسلمانوں کے کردار پر ایک طنز بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے تو شکست کھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ ہم نے فتح عطا کی۔ مزید آگے بڑھیے۔ جو ترتیب تاریخی حقیقت ہے۔ کتنی بڑی لڑائی لیکن اس میں کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں ہے۔ صرف دو پہلوانوں کی۔ کل ایمان اور کل کفر کی یہ انفرادی جنگ۔ دو افراد کی جنگ ہے جس کو آپ جنگِ خندق کہتے ہیں۔

آپ اسے اس حیثیت سے دیکھئے کہ وہ سورما جسے خالق نے کل کفر کہہ دیا، جب اُسے شکست ہوگی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مکمل شکست ہوگئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وہ دنیائے کفر جس سے یہ سب لڑائیاں ہو رہی تھیں، اس دنیائے کفر سے اس جنگ کے بعد کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ یعنی مکہ کے مشرکین مکمل شکست کھا گئے اور اس میدان میں۔ اس لئے کہ یہ ان کی آخری کوشش تھی کہ ہم اکیلے تو ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جتنے ہمارے ہم خیال ہیں، مخالفتِ اسلام میں، سب کو اپنے ساتھ لے کر مقابلہ کریں۔ اسی لئے اس جنگ کا نام ہے جنگِ احزاب۔ احزاب حزب کی جمع ہے۔ حزب کے معنی پارٹی کے ہیں۔ اس لئے آجکل کی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا ''آل پارٹیز جنگ''۔

اس مقابلہ کو سمجھنا چاہئے کہ یہ مکمل فتح و شکست کا سوال تھا یعنی آج ان کی یا مکمل فتح ہے یا مکمل شکست ہے اور واقعی یہ کافروں کی مکمل شکست ثابت ہوئی۔ تو اس موقع پر اگر خالق ارشاد فرمائے کہ:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ①

''یقیناً ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی''۔

یہ مُتمم فتح ہے۔ مزید آگے چلئے۔ اس کے بعد خیبر ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ کو پیغمبرؐ نے خود فتح کہا ہے۔ ارشاد پیغمبرؐ میں خود فتح کا لفظ موجود ہے۔ حدیثِ رایت پر غور کیجئے۔ مسلسل شکست کے بعد۔ ایک دن، دو دن، تین دن۔ وہ جو مسلسل شکستیں ہوتی رہیں، ان مسلسل شکستوں کے بعد جو کامیابی ہو، فتح مبین کہے جانے کے لئے وہی کافی ہے۔ اسی لئے پیغمبرؐ نے حدیث میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ جب یہ مسلسل شکستیں ہوئیں تو پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا:

''لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا''۔

صحاح ستہ کی حدیث اور صحاح میں سب سے زیادہ صحیح، صحیح بخاری۔ تو اتنے ہی الفاظ کہوں گا جتنے صحیح بخاری میں ہیں۔ چاہے

آپ کو حفظ ہوں اس سے زیادہ الفاظ۔ وہ الفاظ جو صحیح بخاری میں ہیں، نہ جانے کتنے روایت، درایت اور مصلحت کے چھاجوں میں چھن کر آئی ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے:

"لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ وَيَفْتَحِ اللهُ عَلٰى يَدَيْهِ"۔

"کل میں اُسے علَم دوں گا، عموماً زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے بعد کے الفاظ پر لیکن مجھے "تاریخ خمیس دیار بکری" میں ایک حقیقت ملی جو میں نے تاریخ اسلام میں لکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس جنگ میں جو ہمیشہ جنگ کرنے والی ہستی تھی، اُسے خالق نے اپنے انتظام سے جنگ میں شرکت سے معذور بنا دیا۔ وہ آشوبِ چشم۔ اور جو ہستی جنگ کی ذمہ دار فرد تھی، یعنی پیغمبرِ خدا کو حدودِ خیبر میں پہنچتے ہی دردِ شقیقہ کی تکلیف اتنی سخت پیدا ہوئی کہ حضرتؐ کئی دن تک خیمے سے باہر تشریف نہیں لائے۔ یہ انتظامِ قدرت ہے۔

میں ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ مرض اور صحت خدا کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں ہے؟ مرض اور صحت کا عطا کرنے والا تو خدا ہے۔ جب تک اپنے ہاتھوں کچھ اسباب نہ ہوں۔ سورۂ نجم میں ہے کہ وہ مجھے بیمار کر ڈالتا ہے اور مجھے ہمت دیتا ہے۔ اور رسولؐ کے غیب کے علم میں تو بحث ہے، اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب میں تو کوئی بحث نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مرض اور صحت اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ جب اُس نے بیمار کر ڈالا تو کیا نہیں جانتا تھا کہ پھر ہمیں اسے صحت دینا پڑے گی۔ کون اس کا تصور کر سکتا ہے کہ بیمار کر ڈالنا کسی مصلحت سے تھا۔ رسولؐ پر عام طور سے لوگ یہ اعتراض کرتے تھے کہ ہر جگہ ایک ہی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ صحت مند ہوتے ہوئے یہ میدانِ جنگ میں نہ جائیں، یہ اُن کی بلندیٔ کردار کے خلاف ہے۔ ان کی فرض شناسی کے خلاف ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ وہ بیمار کر ڈالے تاکہ ان کی بلندیٔ کردار پر حرف نہ آئے۔ تو اس لئے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ انہیں بیمار کر ڈالے۔ میدان خالی چھوڑ دے تاکہ طالع آزماؤں کو قسمت آزمائی کا موقعہ ملے۔

لیکن باوجود اس کے، اور تاریخوں میں، طبری میں، ابن اثیر میں، ابوالفداء میں، یہ روایت میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ اس لئے عام طور پر لکھنے والوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ صرف ایک تاریخ خمیس میں، وہ بھی اہلِ سنت کی معتبر تاریخوں میں سے ہے۔ وقیع تاریخ ہے۔ تاریخ دیار بکری بھی کہلاتی ہے۔ صرف اس تاریخ میں یہ واقعہ ہے مگر میرا ضمیر اسے قبول کرتا ہے۔ باوجود اس تاریخ کے منفرد ہونے کے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت دیگر تاریخ دانوں سے مخفی رہی یا انہوں نے مخفی رکھی۔ اس میں راز مضمر ہے، جس مصلحت سے ان کو بیمار کر ڈالا، اس مصلحت سے ان کو دردِ شقیقہ میں ایسا مبتلا کیا کہ گھر سے باہر نہ آئیں۔ ورنہ یہ علَم ایسوں کو دیں جس کا وہ نتیجہ ہو اور ذمہ دارِ شکست یہ بنیں۔ اُسے اپنے نبیؐ کے دامنِ کردار کو بھی بچانا ہے اور اپنے ولی کے دامنِ کردار کو بھی بچانا ہے۔

لہٰذا پیغمبرِ خدا ابھی پورے طور پر قیام بھی نہ کر پائے تھے کہ حضرتؐ ایسی تکلیف میں مبتلا ہوئے کہ اپنے خیمے سے برآمد نہیں

ہوئے۔ یعنی میدان بالکل خالی ہوگیا۔ اب معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ تین دن کے بعد تخفیف ہوئی۔ جب نتائج سامنے آئے تو اتنی تخفیف ہوئی کہ حضرتؑ چوتھے دن برآمد ہوئے۔ تفصیل معلوم کی تو معلوم ہوا کہ اس دوران تو ماشاءاللہ جہاد ہونے لگے۔ دیکھیے بغیر اذنِ معصوم جہاد ہوا۔ تو یہ انجام ہوا، ماشاءاللہ جہاد ہوا اور یہ نتائج نکلے۔ رسولؐ کو کتنا صدمہ ہوا یعنی شکست تو آپؐ کے نام ہوگئی۔ جماعت کی شکست، سربراہ کی شکست۔ جیسے بعد میں فوجیں گئیں اور فتح کا سہرا بھیجنے والے کے سر بندھا۔

جنابِ والا! یہ دامنِ اسلام پر گردِ شکست پڑی، پرچمِ اسلام پر غبارِ شکست آیا تو رسولؐ کو کتنا صدمہ ہوا۔ تب آپؐ نے یہ فرمایا۔ میں آخر کے الفاظ پر زور نہیں دیتا۔ میں کہتا ہوں کہ رسولؐ فرماتے ہیں:

"لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا"۔

"میں کل اُس کو علم دونگا"۔ یعنی اب تک تو دیا ہی نہیں تھا۔

بخاری کے الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور اُس کا رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں اور یفتح اللہ۔ دوسری حدیث میں ہے:

"لَا یَرْجِعُ حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ"۔

"وہ نہیں پلٹے گا جب تک اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح نہ دیدے"۔

بس یہاں بارگاہِ رسالتؐ میں ایک سوال عرض کروں گا کہ پلٹنا اور نہ پلٹنا دوسرے کا کام ہے۔ یہ آپ دوسرے کے کام کے ذمہ دار کیوں ہوگئے؟ سوال حقیقت میں محل کے لحاظ سے غلط ہے۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ دوسرے کے فعل کا آدمی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ یہ آپ کیسے فرما رہے ہیں کہ وہ نہیں پلٹے گا؟ اب رسولؐ کے جواب کی میرا دل روایت کررہا ہے کہ جیسے میں نے پوچھا اور پیغمبرؐ نے جواب دیا:

"خاموش رہ، بے شک دوسرے کے فعل کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا مگر کیا میں اپنے نفس کے فعل کا بھی ذمہ دار نہیں ہوسکتا؟"

پیغمبرؐ نے فرمایا: وہ نہیں پلٹے گا، جب تک فتح نہ کرے۔ وہی ہوا۔ اس کے فتح ہونے میں کیا شک ہے۔ اور خالق اسے فرمائے کہ ہم نے اور پیغمبرؐ نے بھی تو اسی کو فاتح قرار دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ"۔

"اللہ اس کے ہاتھ پر فتح عنایت کریگا"۔

اللہ اگر کہے کہ ہم نے یہ فتح آپ کو دی ہے تو کیا غلط ہے؟ معلوم ہوا کہ ہر جنگ ایسی ہے کہ اگر اس کو یہ کہا جائے کہ یہاں یہ آیت اُتری تو بالکل چسپاں ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ مگر اب سے کیا کہا جائے کہ یہ آیت نہ جنگِ بدر کے بعد اُتری ہے، نہ یہ جنگِ خندق کے بعد اُتری ہے، نہ یہ جنگِ خیبر کے بعد اُتری ہے۔ یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد اُتری ہے جسے دنیا شکست سمجھ رہی تھی۔ دنیا سے کیا مطلب

یعنی صاحب الرائے آپس کے لوگ۔ وہ اسے انتہائی شکست سمجھ رہے تھے تو اس وقت یہ آیت اُتری:

"اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا"۔

''ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی''۔

اور اس لئے یہ حقیقت ہے جو مستند علمائے اسلام نے لکھی ہے کہ جب یہ سورۃ اُتری تو پیغمبرِ خدا نے جب پہلی ہی آیت یہ تلاوت کی تو جو لوگ اس وقت بڑھ چڑھ کر آ آ کر پیغمبرؐ سے تعجب سے سوال کر رہے تھے، جو صحاح میں درج ہیں تو انہی کو بلا کر رسولؐ نے یہ آیت سنائی۔ انہوں نے حیرت سے کہا: اچھا! یوں بھی فتح ہوتی ہے؟

پیغمبرؐ نے فرمایا: میں کیا کروں، وہ کہہ رہا ہے۔ اسے مشترک مجمعوں میں، وہاں کے مشترک مجمعوں میں یہ کہتا ہوں کہ اب دنیا اسے سمجھے کہ قرآن میدانِ جنگ کی فتح کو فتحِ مبین کہتا۔ میدانِ امن کی فتح کو فتحِ مبین کہتا ہے۔

ایسی شرائط پر مصالحت جسے سب سمجھ رہے تھے کہ پیغمبرِ خدا نے دب کر صلح کر لی۔ اس کے نتیجہ میں خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ہم نے کھلی ہوئی فتح عنایت کی جو مسلمانوں کو بعد میں صرف قرآن کے دباؤ سے مجبوراً ماننا ہے، ورنہ سمجھ میں تو پہلے نہیں آیا تو ایک دم کیسے آجائے گا؟ لیکن چونکہ رسولؐ فرما رہے ہیں کہ خدا نے کہا ہے تو عقیدۂ رسالت بھی ہے اور قرآن پر ایمان بھی۔ بغیر اس کے اسلام ہو نہیں سکتا۔ ماننا تو ہے، چاہے جانیں یا نہ جانیں، کبھی جانتے ہیں، مانتے نہیں۔ کبھی مانتے ہیں، جانتے نہیں۔

جب رسولؐ کی اس طرح کی صلح کا فتحِ مبین ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا تو وہ حسنِ مجتبیٰ کی صلح کو کیا سمجھ سکتے ہیں کہ حسنِ مجتبیٰ نے اس طرح کی صلح کے ساتھ کیسی فتح حاصل کی۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ صرف ایک شرط پر تبصرہ کرنا ہے انہوں نے صلح کی ہے، الفاظ صلح کو اگر کوئی دیکھے تو سمجھے گا کہ کیسی شاندار فتح ہے!

پہلی شرط یہ ہے کہ امیر شام کو کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ اہلِ علم غور کریں کہ صلح نامہ ایک طرف کی دستاویز نہیں ہوتی، دونوں اطراف کی ہوتی ہے۔ یعنی کاتب صلح نامہ دونوں فریق ہوتے ہیں۔ تو اب جو الفاظ انہوں نے درج کیے ہیں اور جن کو امیر شام نے مانا ہے، کوئی پوچھے کہ اس کی کیا دلیل کہ مانا؟ میں کہوں گا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ صلح ہو گئی۔

اس نے یہ الفاظ مانے اور ایک پہلو قانون دان حضرات کے غور کرنے کا کہ صلح نامہ میں دو چیزیں درج ہوتی ہیں جو بنائے مخاصمت سے تعلق رکھتی ہوں۔ پہلی شرط رکھ کر انہوں نے ہمیشہ کیلئے یہ طے کر دیا کہ ہماری نزاع حکومت شام سے نہ ذاتی ہے، نہ خاندانی۔ اب اگر جنگ بھی ہو جائے تو اسے خاندانی نہ کہنا۔ اس شرط سے امام حسن علیہ السلام نے اس کو نمایاں کر دیا اور منوا لیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بات بھی جو لازماً اس سے نکلتی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو ہو رہا ہے، کتاب وسنت کے خلاف ہے ورنہ حکومتِ شام کو انکار کر دینا چاہئے تھا کہ کیا اب تک ہم کتاب وسنت پر عمل نہیں کرتے رہے ہیں؟ ان کا اس شرط کو برقرار رکھنا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اب تک جو ہو رہا ہے، وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ اب چاہے کتنی ہی کتابیں لکھی جائیں اس کے ثبوت میں کہ وہ سب کتاب وسنت کے مطابق تھا لیکن خود صاحبِ معاملہ مان رہا ہے تو دنیا کو کیا حق ہے اس کے خلاف تصور کرنے کا!!

انہوں نے صلح ایسی شرائط پر کی ہے اور اس کے بعد دنیا کہے کہ شکست ہوگئی اور پھر دنیا کی سمجھ میں جب اس صلح کی فتح نہ آتی ہو تو بھلا کربلا میں اس کی سمجھ میں کیونکر آسکتا ہے؟ اس لئے ہمارے افراد یہ الفاظ اکثر استعمال کرتے ہیں کہ کربلا میں ظاہری طور پر شکست لیکن نتیجہ میں فتح تھی۔ ظاہری شکست۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بروقت تو شکست جیسے ہمیں تسلیم مگر یہ ظاہری شکست نتیجہ میں فتح تھی۔ ایک دنیا ہے جو بعد کے نتیجہ کو بھی تسلیم نہیں کرتی۔ مگر مجھے تو ظاہری طور پر بھی شکست ہونے سے انکار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فتح کے معنی کسی لغت میں قتل کردینا نہیں ہیں اور شکست کے معنی کسی لغت میں قتل ہوجانا نہیں ہیں۔ فتح کے معنی ہیں کامیاب ہونا اور شکست کے معنی ہیں ناکام ہونا۔

یہ ''کام'' فارسی لفظ ہے۔ ہماری زبان میں کام کار کے معنی میں ہے لیکن فارسی میں کام کے معنی ہیں مقصد۔ کامران کامیاب۔ اس کے معنی مقصد کو حاصل کرنے والا۔ تو کامیابی یعنی مقصد کو حاصل کرلینا اور ناکامی یعنی مقصد کو حاصل نہ کرسکنا۔

اب کامیابی اور ناکامی کے سمجھنے کیلئے ضرورت ہوگی کہ یہ دیکھا جائے کہ یزید کا مقصد کیا تھا اور حسینؑ کا مقصد تھا؟ اسے بھی سمیٹ کر کہوں گا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حسینؑ اور یزید میں اگر یہ جنگ ہوتی تو یزید ان کو مار ڈالنا چاہتا تھا اور یہ محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ تو بے شک وہ کامیاب ہوا کہ اُس نے مار ڈالا اور یہ ناکام ہوئے، اس لئے کہ قتل ہوگئے۔ لیکن یہ جنگ کب تھی کہ وہ جان لینا چاہتا تھا اور یہ جان بچانا چاہتے تھے۔ اصل جنگ تو یہ تھی کہ وہ بیعت لینا چاہتا تھا اور یہ بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب اگر یزید بیعت لے لے تو کامیاب۔ بس انتہائی اختصار کے ساتھ۔ نتیجہ تک پہنچ کر میں نے ہر مخاطب کو اس نقطہ پر پہنچادیا جس سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا۔ یعنی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یزید بیعت نہیں لینا چاہتا تھا اور یہ بیعت سے بچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ بیعت لے سکا۔ ان میں سے کونسی بات ہے جو انتہائی دھاندلی کرنے والا بھی کہہ سکے۔ ان میں سے ہر بات ایسی بدیہی تاریخی حقیقت ہے جیسے دو اور دو کا مجموعہ چار۔ جس سے پوچھا جائے، یہی جواب دے گا۔ کسی بھی مکتب خیال کا آدمی ہو، یہی جواب دے گا۔ تو میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ لیکن ذرا سا آگے بڑھاؤں گا کہ اسے بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ بیعت کیوں لینا چاہتا تھا اور یہ بیعت سے کیوں بچنا چاہتے تھے؟

یہیں ایک اور سوال کا جواب ہے کہ دنیا کہتی رہی اور اس وقت بڑے زور شور سے کہہ رہی ہے کہ بڑے ضدی تھے کہ یہ سب کچھ ہوگیا اور ان کا انکار قائم رہا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ انہیں بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا؟ اسے کیوں نہیں پوچھتے کہ یزید کو بیعت پر اتنا اصرار کیوں تھا؟ تمام ملک عرب مان رہا تھا، تمام عالم اسلام مان رہا تھا۔ موچی دروازہ میں حسینؑ ڈے کی بات یاد آگئی۔ ہر طبقے کے علمائے اسلام موجود تھے، مشائخ موجود تھے اور ہر طبقے کے نمائندے تھے۔ وہاں میں یہ جزو عرض کیا تھا کہ آجکل کے مسلمانوں کو تعجب ہوگا کہ یزید کو اس وقت تمام عالم اسلام مان رہا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ بدیہی ثبوت یہ ہے کہ اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ نے کیسے بتایا ہوتا کہ کن کن نے نہیں مانا۔ یہ شمار کرکے تاریخ کا بتادینا اس کا ثبوت ہے کہ سب مان رہے تھے۔ تو جس کی حکومت کو سب مان رہے ہوں، اس کی حکومت کو دس بیس آدمی نہ مانیں، وہ بھی ایسے جو عبادت گزار ہوں، سب زندہ دار ہوں، گوشوں میں رہتے ہوں، وہ اگر نہ مانیں تو یزید کی سلطنت کا کیا بگڑتا تھا جو اس کی پوری طاقت صرف ہوگئی ان سے بیعت کی طلب میں۔

تو حقیقت میں یزید جانتا تھا کہ حسینؑ ایک عام فردِ عرب نہیں ہیں۔ یہ اس اسلام کے نمائندہ ہیں جس کے نام پر میں حکومت کررہا ہوں۔ میرے افعال کھلم کھلا اسلامی نظام کے خلاف ہیں۔ ابھی ہوا چلی ہوئی ہے، کیا جانئے اقتدار کا شکنجہ کب ڈھیلا ہو اور حسنؑ مسلمانوں کے مرکزِ توجہ بن جائیں۔ جب تک حسینؑ نے بیعت نہیں کی ہے، اس وقت تک سلطنت کی راہ میں شریعت کا محاذ قائم ہے اور جس دن حسینؑ بیعت کرلیں تو ہمیشہ کیلئے سلطنت کی راہ سے شریعت ہٹ جائے گی۔ اس لئے پوری طاقت صرف ہو رہی تھی حسینؑ سے بیعت لینے پر۔ میں مجمع سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یزید حسینؑ کو سمجھتا تھا کہ یہ کون ہیں اور حسینؑ اپنے آپ کو نہیں سمجھتے تھے کہ میں کون ہوں۔

حقیقت میں حسینؑ اور یزید کی جنگ نہیں ہے، یہ شریعت اور سلطنت کی جنگ ہے۔ اب اگر اس کے بعد شریعت نے سرجھکادیا ہو سلطنت کے سامنے ہمیشہ کیلئے تو یزید کو فتح ہوئی اور اگر اس وقت بھی، اور امید ہے کہ ہزار سال بعد بھی شریعت بہرحال قائم رہے گی اور یہ انقلاب، ہوسکتا ہے کہ حکومتیں شریعت کے سامنے سرجھکادیں، مگر انشاء اللہ یہ انقلاب نہیں ہوسکتا کہ شریعت سلطنتوں کے سامنے سرجھکادے۔ کسی فرد کا سرجھکانا اور بات ہے۔ ہر فرد تو مکمل طور پر نمائندہ شریعت نہیں ہے۔ وہ تو ہماری اصطلاح میں معصوم ہستیاں ہوسکتی ہیں کہ جو واقعی ذمہ دارانہ طور پر نمائندۂ شریعت ہیں۔ تو یہ درحقیقت شریعت اور سلطنت کی جنگ تھی۔

حسینؑ ذرے کی ایک اور بات یاد آ گئی۔ ضرورت ہوئی کہ تمام علمائے اسلام کو میں گواہ کروں اور کہوں کہ ان میں سے جس سے چاہے پوچھ لیں کہ یزید سے پہلے ہر تختِ حکومتِ اسلام پر بیٹھنے والے کا عمل جمہور کیلئے جزوِ شریعت بنتا رہا لیکن یزید کے بعد سے کسی حکمران کا عمل جزوِ شریعت نہیں بن سکا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ نے صرف اس یزید کے مقابلہ میں فتح نہیں کی کہ جو ایک خاص باپ اور ایک خاص دادا کا پوتا تھا اور ایک خاص حکومت کے تخت پر بیٹھا تھا بلکہ حسینؑ نے قیامت تک کے ہر یزید کے مقابلہ میں فتح حاصل کی ہے۔

18

صبر و استقامت

جب ہماری اشکباری کا موسم آتا ہے اس وقت کچھ لوگ سیلاب اشک پر بند باندھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ رونا نہیں چاہیئے کہ مسلمان کو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیئے۔

ابراہیمؑ حالتِ احتضار میں ہیں آنحضورؐ کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور آپ رو رہے ہیں کسی پوچھنے والے نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اور رو رہے ہیں فرمایا دیکھو دل تو رنجیدہ ہوتا ہے اور آنکھ اشکبار ہوتی ہی ہے لیکن ہماری زبان سے ایسا کوئی کلمہ نہیں نکل سکتا جو رضائے رب کے خلاف ہو۔

وہ حقیقت جس کے موسیٰؑ حامل تھے وہ شبیریت رہی اور وہ چیز جس کا فرعون حامی تھا وہ یزیدیت تھی یعنی یہ نام شخصی نہیں ہیں بلکہ یہ نام گویا صفت کے ہیں۔

آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک صابر کے کردار میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا لیکن حضرت امام حسینؑ صرف واحد ہستی ہیں کہ جن کو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ کا وارث قرار دیا گیا۔ گویا آپؑ نے ان جیسا صبر بھی کیا اور ایسا صبر بھی کیا جو پہلے کوئی نہ کر سکا اور نہ ہی کوئی کر سکے گا۔

پیغمبرؐ اسلام نے تیرہ برس تک جسم مبارک پر پتھر کھائے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مخالف جماعت کا طرز عمل ہے کہ وہ کافر تھے مگر ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے، تیر نہیں تھے اور کسی وقت مسلمان ہوں اور ان کے ہاتھوں میں تیر ہوں تو صابر کا کردار ایک ہی رہا۔

صبر واستقامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾

ارشادِ حضرتِ اقدس ہے کہ کتنے ہی کم تعداد کے گروہ ہیں جو بڑی تعداد کے گروہ پر غالب آجاتے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کوئی سانحہ ہوگیا تو کہا گیا کہ صبر کرنا چاہئے۔ کبھی کسی نے کام میں جلدی کی تو کہہ دیا کہ تم بڑے بے صبرے ہو۔ مختلف انداز سے صبر کا لفظ زبان پر آیا کرتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی کثرت سے جو لفظ زبانوں پر آتا ہے، اس کے اصل معنی بہت سے حضرات کے ذہنوں سے دور ہیں۔ اس لئے صبر کے مفہوم کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک نئی روشنی کے دلدادہ ترقی پسند گروہ، جو کہ زیادہ تر اقدام پسند ہوتے ہیں، ان کی زبانوں پر یہ ہے کہ صبر بزدلی کی تعلیم ہے اور چونکہ یہ ترقی پسند افراد مذہب سے زیادہ تر دور رہتے ہیں اور ہر چیز میں دنیاوی سیاست کو شریک کرتے ہیں، ہر چیز کو اسی معیار پر پرکھتے ہیں، اس لئے ان کا نظریہ یہ ہے کہ صبر کی تعلیم اہلِ مذہب نے کمزوروں کی قوتِ مقاومت کو سلب کرنے کیلئے دی ہے تاکہ طاقتور لوگوں کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہوں۔

اس کیلئے صبر کی دعوت دی گئی ہے کہ حربہ ہو، اُسے چپکے سے برداشت کرلو۔ جو زیادتی ہو، اُسے سہہ لو۔ صبر کرو، صبر کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان ظالموں کے مقابلہ میں نہ کھڑے ہو۔ پس اس گروہ نے صبر کے معنی یہ قرار دیئے کہ چپکے سے ہر حربہ کو برداشت کرلینا۔ یہ تو ترقی یافتہ جدید روشنی کے زیرِ سایہ تصور پروان چڑھا اور اب قدیم روشنی والے علماء کا ایک مکتبِ خیال، اس نے صبر کے ایک دوسرے معنی اپنے مذاق کے مطابق قرار دے لئے ہیں، مثلاً صبر یہ ہے کہ احساسِ غم ہی نہ ہو۔ کوئی بھی غم پڑے۔ اس کا آدمی پر کوئی بھی اثر نہ ہو۔ یہ صبر کا معیار ہے۔ کچھ نے یہ صبر کرلیا کہ ہر غم کا احساس تو ہو مگر آنکھ سے آنسو نہ نکلے۔ جتنے بھی مصائب ہوں، تم پتھر بنے کھڑے رہو۔ ادھر آنکھ سے آنسو نکلا اور انہوں نے کہا کہ تم صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہو۔ یعنی اوّل تا آخر صبر یہی ہے کہ آدمی روئے نہیں، آنسو نہ بہائے۔

اس لئے صبر کے زیرِ سایہ یہ نعرے اس زمانہ میں بہت بڑھ جاتے ہیں جب اشکباری کا موسم آتا ہے۔ اس وقت ان کو اس سیلابِ اشک پر بند باندھنے کی بہت زیادہ ضرورت ہوجاتی ہے۔ یہ تعلیم بہت زور شور سے جاری ہوجاتی ہے کہ یہ مناسب چیز نہیں ہے۔ مسلمان کو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مسلمان کو صبر کرنا چاہئے۔ میرے سامنے وہ جدید محاذ بھی ہے اور یہ قدیم محاذ بھی ہے۔ دونوں سے میرا یہ خطاب ہے کہ صبر کا لفظ اب آپ کی اُردو زبان کا جزو ہے لیکن یہ لفظ آپ نے سیکھا کہاں سے ہے؟

یاد رکھئے کہ آپ مذہب سے کتنے ہی باغی کیوں نہ ہوں لیکن یہ لفظ آپ نے مذہب سے ہی یاد کیا ہے۔ اسی سے آپ مذہب

والوں کو کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے کمزوروں کی قوتِ مقاومت کو سلب کرنے کیلئے یہ تلقین کی ہے۔ گویا ظالموں کو باطمینان ظلم کرنے کا موقع دیا ہے۔ تو یہ لفظ جب آپ نے مذہب والوں سے سیکھا ہے تو کم از کم اسلامی مذہب کی سب سے بڑی دستاویز تو قرآن ہے۔ قرآن نے صبر کو جس جس معنی میں استعمال کیا ہو، اُسے دیکھئے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیجئے کہ یہ تصورات صحیح ہیں یا غلط۔ خواہ وہ جدید تصورات ہوں یا قدیم۔ قرآن کو کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیجئے اور درمیان میں حدیث بھی ضمناً پڑھ دونگا۔ اصل بنیاد قرآن ہے۔ تو جو قرآن کو کافی سمجھتا ہے، اُسے تو سر جھکا ہی دینا چاہئے۔

میں جب قرآن مجید میں صبر کے موارد دیکھوں گا تو نہ وہ جدید تصور صحیح دکھائی دیا ہے، نہ وہ قدیم تصور درست قرار پاتا ہے۔ وہ دونوں قرآن کی کسوٹی پر ناقص قرار پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے صبر کے معنی سمجھے ہی نہیں۔ دیکھئے قرآن مجید کو اور جو آیت میں نے سرنامہ کلام قرار دی ہے، وہ اسی سے متعلق ہے کہ اس صبر کا مطالبہ میدانِ جنگ میں کیا گیا۔ بہت سے چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آجاتے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ صبر کوئی ایسی چیز ہے جو بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا دینے کی دعوت دے رہا ہے کہ تمہاری کتنی ہی کم تعداد ہو لیکن اس سے نا اُمید نہ ہو اور جو دوسری جماعت تمہارے مدمقابل ہے، اس کی کثرتِ تعداد اور اس کی طاقت کو دیکھ کر مرعوب نہ ہو۔

تو اب کیا میدانِ جنگ کا صبر یہ ہے کہ جب تلوار کا وار ہو چپکے سے سر جھکا دو؟ نیزہ آئے تو خاموشی سے سینہ بڑھا دو؟ آخر یہ جو قدیم افراد نے صبر کی تفسیر کی یا نئی روشنی والوں نے وہ منطق یہاں کہاں ملتی ہے؟ یہاں تو کہا کہ اکثر چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ قرآن مجید کی ایک آیت دیکھئے کہ اس میں دعوت دی جارہی ہے کہ دس گنا مقابلہ سے نہ گھبراؤ۔ ارشاد ہو رہا ہے رسولؐ سے:

"اِرْغَبِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ"۔

"اہل ایمان کو قتال کی ترغیب و تحریص کیجئے۔"

قتال پر آمادہ کیجئے۔ حضور! جہاد تو جدوجہد سے ہے۔ اس میں گنجائش ہیں کہ بغیر تلوار کے ہو لیکن قتال جس چیز کا نام ہے، اس کے تو معنی ہی جان لیوا مقابلہ کے ہیں۔ جس میں قتل میں مقابلہ ہو تو کون کسے زیادہ قتل کرتا ہے؟ تو قتال میں گنجائش نہیں ہے کہ اسے کسی اور قسم کے مقابلہ پر محمول کیا جائے۔ تو اب کہا جارہا ہے کہ مومنین کو قتال کی دعوت دیجئے یعنی خونریز جنگ کی، خونریز مقابلہ کی۔ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟ کہ مومنین کو بتایئے کہ:

"اَنْ يَكُوْنُوْا مِنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ"۔

"اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو انہیں دو سو پر غالب آنا چاہئے"۔

"وَاِنْ يَكُوْنُوْا مِنْكُمْ مِّئَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا بِاِذْنِ اللّٰهِ"۔

"اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو ایک ہزار پر غالب آنا چاہئے"۔

اور تتمہ وہ کہ:

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

"اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

معلوم ہوا کہ جوہر صبر ہے کہ دس گنا مقابلے کی طاقت دے رہا ہے۔

قرآن مجید میں اس کے بعد بلا فاصلہ دوسری آیت ہے۔ مگر مضمونِ آیت سے ظاہر ہوگا کہ یہ بلا فاصلہ اُتری نہیں ہے۔ اسی سے ثابت ہو جائے گا کہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے۔ جہاں ذرا جوڑ ملتا ہوا دیکھا، خواہ واقعی جوڑ ہو یا اپنے حسب مصلحت ہو، وہاں پر آیت رکھ دی۔ اس سے بحث نہیں کہ جب نازل ہوئی تھی تو بیچ میں کتنی مدت گزری تھی، کتنا فاصلہ تھا اور کیا اس درمیان کی مدت میں اگر کئی سال کی ہے تو کوئی اور آیت اُتری ہی نہیں۔ اب مضمونِ آیت دیکھئے کہ یہ مطالبہ ہوا اور اس کے بعد یہ آیت ہے کہ اب یہ ثابت ہو گیا:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ

"اب اللہ سے تخفیف کئے دیتا ہے"۔

یہ دورِ رسولؐ کے مسلمانوں سے خطاب ہے اور ان مسلمانوں کا جو معزز لقب ہے، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ ان سے خطاب ہو رہا ہے کہ "الان"۔ تو یہ اب ہے۔ کیا آیت کے فوراً بعد ابھی حکم دیا اور پتہ چل گیا کہ تم اس پر پورے نہیں اترے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ آیت اُتری، اس کے بعد کوئی معرکہ ہوا جس میں مسلمان پورے نہیں اُترے، اس معیار پر، تب یہ آیت اُتری:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ

"اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے"۔ یعنی ہلکا کرتا ہے اور:

وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ

"پتہ چل گیا کہ تم میں کمزوری ہے"۔

اب یہ کمزوری کونسی ہے؟ مادی حیثیت سے کمزوری تو یہ اسی سے ظاہر تھی کہ یہ دس ہیں اور وہ سو ہیں۔ یہ بیس ہیں، وہ دو سو۔ یہ سو ہیں تو وہ ایک ہزار ہیں۔ اب یہ کمزوری جو ہے، وہ ایمان کی کمزوری ہے۔ آپ ہر دَور میں سب کو معراج پر ہی پہنچا دیجئے۔ یہ آپ ذمہ دار ہیں۔ مگر قرآن بتا رہا ہے کہ اس وقت وہ مطالبہ کیوں ہوا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنے استحکامِ ایمان کا زعم بہت تھا۔ تو وہ یت اُتری تاکہ خود اپنے کردار کے آئینے میں دیکھ لیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ پھر دوسری آیت اُتری کہ:

"فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ".

"تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں ایک ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آئیں"۔

دو گنا مقابلہ تو ضرور ہونا چاہئے۔ پھر ایک آیت کے تتمہ میں یہ ہے:

بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ

"اس لئے کہ وہ جماعت ایسی ہے کہ کثرت میں زیادہ سہی مگر عقل ایمانی نہیں رکھتی"۔

یعنی تمہاری قلتِ تعداد کے توازن کو تمہاری بصیرتِ ایمانی کے ساتھ پورا ہونا چاہئے۔

اب جو یہ پہلے مطالبہ ہوا کہ تم دس گنا پر غالب آؤ، دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ دو گنے پر غالب آ کر دکھاؤ، اس لئے کہ وہ اس بصیرت ایمانی سے محروم ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ آخر کچھ تو مسلم اور غیر مسلم کا فرق ہو۔ اگر برابر کا مقابلہ ہوا تو تمہارا امتیاز کیا ثابت ہوگا؟ کم از کم دو گنے مقابلے سے تو نہ گھبراؤ۔

میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ اب میں ان جدید اور قدیم دونوں نظریات کو اس کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔ جدید کیلئے تو یہ عرض کر چکا کہ کیا یہ معنی ہیں کہ چپکے سے سب حربے سہہ لو تو پھر غالب آ جاؤ گے؟ حضور! قرآن سمجھنے کیلئے عقل کو خیر باد کہنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ قرآن تو عقل والوں کیلئے ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ غور کرو۔ تو اب یہ میدانِ جنگ میں جو غلبہ حاصل کریں گے تو کیا سب حربوں کو چپکے سے برداشت کر کے کریں گے؟ وہ تصور کیسے صحیح رہا کہ صبر بزدلی کی تعلیم دیتا ہے؟ صبر تو اتنی بڑی بہادری کی تلقین ہے کہ دس ہزار پر غالب آنے کی ہمت رکھو۔

وہ دوسرے مکتبِ خیال کے علمائے کرام جو تعریفیں کر رہے تھے اور جسے عوام نے حفظ کر لیا کہ یہ ہے کہ روؤ نہیں۔ بس ادھر آنسو نکلا اور انہوں نے کہا کہ صبر کا دامن چھوٹا۔ میں کہتا ہوں کہ کیا یہاں میدانِ جنگ میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ روؤ نہیں؟ چاہے میان سے ہنستے ہوئے چلے جاؤ۔ نہ وہ معنی یہاں بنتے ہیں، نہ یہ معنی یہاں بنتے ہیں۔ اس کے بعد اسی صبر کا مطالبہ ہوتا ہے، ان مصائب میں جو بقضائے الٰہی ہوتے ہیں کہ کسی کا عزیز جدا ہو گیا۔ بیٹے نے باپ کو داغ جدائی دے دیا۔ باپ کا سایہ بیٹے کے سر سے اُٹھ گیا۔ بھائی، بھائی سے جدا ہو گیا۔ وہاں ہر ایک ہی کہتا ہے کہ صبر کرو۔ وہ بھی اپنی طرف سے نہیں کہتا، قرآن مجید نے وہاں بھی یہی کہا ہے:

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

"ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو ان کا قول یہ ہو کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف ہمیں جانا ہے"۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اس آیت کے زیر سایہ یہ بھی اسلامی تہذیب ہو گئی کہ جب مصیبت پڑے، یہ الفاظ زبان پر بھی جاری

کردو۔ اسی آیت کی تلاوت کردو۔ یہ درحقیقت اس کی اصل تعمیل نہیں ہے۔ یہ رمز ہے اس جذبہ کا ورنہ اصل، اسی لئے میں نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ جب مصیبت آئے تو یہ کہیں۔ میں نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جب مصیبت آئے تو ان کا قول یہ ہو۔ قول کے معنی ہیں نقطہ نظر۔ یہ لفظی قول نہیں ہے۔ یہ تصور ہے، خیال ہے، عقیدہ ہے، یقین ہے کہ ہم اللہ کے ہیں۔ یعنی بھائی اُٹھ جائے تو ذہن میں اس کے یہ ہو کہ ہم اللہ کے ہیں بیٹا چلا گیا تو سمجھے کہ ہم اللہ کے ہیں۔ یہاں ''ہم'' کے معنی یہ ہیں کہ میں بھی اسی کا ہوں، جو گیا وہ بھی اُسی کا تھا۔ میں بھی اسی کی ملک ہوں، وہ بھی اس کی ملک ہے۔ یہ تصور ذہن میں ہو، یہ عقیدہ ذہن میں ہو، تب اللہ سے شکوہ نہیں ہوگا۔ تب تقدیر الٰہی پر اعتراض نہیں ہوگا۔ اور اصل معیار صبر یہاں یہی ہے ان مصائب میں۔

جو وہ حضرات کہتے ہیں کہ چپکے سہہ لینا، تو بتایئے کہ ان مصائب میں چپکے سے سہے گا؟ نہیں، تو اور کیا کرے گا؟ یا جنگ کیجئے گا۔ کتنے ہی بڑے باغی ہوں، اس کے سامنے تو سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ عزیز داغ جدائی دے رہا ہے، تو کیا یہ جائیں گے اس سے جنگ کرنے؟ سر نہ جھکائیں گے تو کیا کریں گے! سلطنتِ الٰہی کے کتنے ہی بڑے باغی کیوں نہ ہوں، لیکن بہرحال اس کے مقابلہ میں بغاوتوں کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ بغاوت پر آج ایک طبقہ کو بہت ناز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں تو اُس وقت مانوں گا کہ آپ بہت بڑے باغی ہیں کہ جب وہ آپ کو بھیجے تو آپ آئیں نہیں اور جب وہ بلائے تو جائیں نہیں۔

حالانکہ کتنے ہی ترقی یافتہ ذہن کے باغی ہوں لیکن جب اس نے بھیجا، تب آئے تھے۔ خیر کہہ لیں کہ اُس وقت تک شعور بغاوت نہیں ہوا تھا لیکن اب تو ماشاء اللہ پر و بال نکل آئے ہیں۔ پر پرواز پیدا ہو گئے ہیں۔ اب جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔ مگر جب اُس نے بھیجا۔ تب آئے اور جب وہ بلائے گا، تب چلے جائیں گے۔ جب آئے تھے تو کم از کم روئے تو تھے، جب جائیں گے، تب تو سانس بھی نہیں لیں گے، چپکے سے چلے جائیں گے۔ یہ ہے اس انسانِ ضعیف البنیان کا دعوائے بغاوت۔

تو یہاں اگر سہے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟ تو وہ تصور یہاں پر بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ چپکے سے سہہ لو اور مقابلہ نہ کرو۔ یہاں مقابلے کا سوال کیا؟ پھر علماء سے پوچھئے کہ مفسرین نے صبر کیلئے کہا ہے کہ یہ اتنا جامع لفظ ہے، جتنے احکام شریعہ ہیں، وہ سب صبر میں داخل ہیں۔ پوری شریعت صبر میں داخل ہے۔ اس لئے کہ صبر کی دو اقسام ہیں: ایک صبر علی المتروک اور ایک صبر علی المحبوب۔ ناگوار طبع بات پر صبر اور گوارا ہے طبع یعنی محبوب نفس چیز سے صبر۔ اس کے وجود پر صبر، اُس کی جدائی پر صبر۔ واجبات کی جتنی پابندی ہے۔ وہ سب صبر علی المکروہ میں داخل ہے، کیوں؟ اسلئے کہ خود پابندی نفس انسانی پر شاق ہے۔ نفس انسانی پر بار ہے۔ اسی لئے احکامِ شریعہ کو تکلیف کہتے ہیں کہ وہ اوامر و نواہی کی پابندی باعثِ تکلیفِ طبع ہے، خود نفس انسانی پر۔

عام نفس کا ذکر ہے، اُن ہستیوں کا ذکر نہیں ہے جو بے نفس ہو گئیں اور اپنی رضا کو رضائے الٰہی کا پابند بنا لیا۔ ان کی تو نہ خوشی کچھ رہی اور نہ ناخوشی کچھ رہی۔ لیکن عام افراد انسانی کیلئے یہ پابندی خود ناگواری کا باعث ہے۔ کچھ افراد تفریح کے عادی ہوں، فرض کیجئے آپ ایک سڑک پر تفریح کیلئے جایا کرتے تھے اور واقعی ہوا خوری سے تفریح ہوا کرتی تھی۔ لیکن جس دن سے وہاں کوئی کام ہو جائے گا، اُس کی وجہ سے اب جانا ضروری ہو گیا تو اُسی دن سے تفریح ختم ہو جائے گی اور وہ جانا بارِ خاطر ہو جائے گا۔ یہ انسان کا نفسیاتی تقاضا ہے

کہ پابندی بار ہے۔ تو اب اگر انسان نے واجبات کی پابندی کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمِ الٰہی کی وجہ سے ایک ناگوارِ طبع چیز یعنی پابندی کو برداشت کیا۔ پھر یہ کہ بعض اوقات پابندی واقعی باعثِ تکلیف ہوتی ہے۔ حضور! گرمی میں دوپہر کا وضو تو ٹھیک ہے انسان کیلئے، باعثِ آرام ہے، جو گرمی لگ رہی تھی، اس میں وضو کرنے سے ذرا سکون ہو جائے گا۔ لیکن سردی میں اور نمازِ صبح کا وضو، وہ کون ہے جس کیلئے باعث تکلیف نہ ہو۔

اب حکمِ الٰہی کے دباؤ سے کسی نے اس کو برداشت کیا تو بلاشبہ یہ امر صبر میں داخل ہے۔ صلیبی لڑائیاں جو ہو رہی تھیں، ان میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک فوج کے سالار نے شام میں ایک عیسائی کیمپ قائم کیا تھا اور وہ خیمے کے در پر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ایک عرب آیا۔ سامنے نہر بہہ رہی تھی اور نہر کے اوپر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ عرب آیا اور اس نے اس برف کو اپنے ہاتھ سے توڑا اور نیچے سے جو پانی برآمد ہوا، اس نے اُس سے وضو کیا اور سبزے پر کھڑے ہو کر نمازِ صبح ادا کی۔ تو اس عیسائی فوجی نے اپنی فوج والوں سے کہا کہ دیکھو! جس قوم میں ایسی بات ہو، اُسے دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

جو جملے اس نے کہے ہیں، وہ بڑے دُور رس ہیں کہ میں تمہارا سالار تمہاری آنکھوں کے سامنے موجود ہوں۔ میں اس وقت تم میں سے کسی سے کہوں کہ وہاں چلے جاؤ، تم سردی کا عذر کرو گے اور ان کا سردار جس نے حکم دیا تھا، وہ کئی صدیاں ہوئیں، اس دنیا سے چلا گیا اور یہ اُس کے حکم کی تعمیل اس وقت کر رہے ہیں۔ تو بتاؤ ان سے بڑھ کر قوتِ عمل کس میں ہوگی؟ آجکل کے مسلمان نوجوان دیکھیں، جو یہ کہتے ہیں کہ نماز، روزہ سے کیا ہوتا ہے! دیکھئے جو حقیقت رس ہیں، وہ اس نماز میں کیا طاقت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے دو جملوں پر آپ کو اور توجہ دلاؤں گا کہ میں تمہارا سالار، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوں اور میں تمہیں حکم دے رہا ہوں، تم مشکل سے تعمیل کرو گے اور ان کا سالار سامنے نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایمان بالغیب کی طاقت کا اندازہ لگایا۔ یہ تو میں نے وضو کی مثال پیش کی۔ اس کے بعد روزہ، وہ جاڑوں کا روزہ تو خیر، وہاں گرمی کا وضو خیر تھا، یہاں جاڑے کا روزہ خیر۔ مگر گرمی کا، مئی اور جون کا روزہ جس میں دن کی طوالت بھی زیادہ ہوتی ہے اور پھر گرمی کی تپش۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آدمی روزہ رکھتا ہے۔ روزے رکھنے والے جو واقعی ہیں، وہ کیا گرمی اور جاڑے میں کوئی فرق کرتے ہیں؟ جس طرح جاڑے میں رکھتے ہیں، اُسی طرح گرمی میں بھی رکھتے ہیں۔ بے شک اس میں مشقت ہے، اس میں بڑی ناگواری ہے۔ اصل ذوقِ شاعری کے کچھ مذہب ہوتے ہیں کہ شاعر چاہے کسی مذہب کا ہو، مگر جب شعر کہے گا تو اسی مذہب کے کہے گا۔

مثال کے طور پر خود شراب سے کتنا ہی پرہیز کرتا ہو، مگر شاعر ہو کر اسے شراب کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے شعر نہیں ہوگا۔ ''بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کے بغیر''۔ ہمیں معلوم ہے کہ زندگی میں کبھی شراب کی طرف رُخ نہیں کیا لیکن شراب کی تعریف کرنے میں انہیں کیسا مزہ آتا ہے! اسی طرح خود واقعی کتنے ہی زاہد و متقی ہوں لیکن شعر میں آ کر زاہدوں پر چوٹ ضرور کریں گے۔ پرہیزگاروں پر چوٹ ضرور کریں گے۔ چاہے مطلب کچھ بھی ہو لیکن اب مسلک شاعری ہے، وضع شاعرانہ ہے۔ اشعار سے کسی کے مذہب کا پتہ نہیں چل سکتا۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا کہ زمانۂ خلفائے عباسیہ میں ایک شخص نے شعر میں اپنے جنسی تعلقات کا ذکر کیا۔ اُسے پکڑ کر دربارِ خلافت میں پیش کر دیا گیا کہ اس نے خود اقرار کیا اس جرم کا جس کی سزا سنگسار ہونا ہے۔ اُس سے پوچھا: بتاؤ یہ الزام تم پر ہے۔ اُس نے کہا کہ میں اپنی صفائی میں بس قرآن کو پیش کر سکتا ہوں۔ سب حیران ہوئے کہ قرآن میں اس کی صفائی کہاں سے آئے گی؟ اُس نے کہا کہ قرآن کی یہ آیت یاد کر لیجئے کہ شعراء کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ:

"يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ"۔

"وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں ہیں"۔

اس کی صفائی بہت کارگر ہوئی اور وہ چھوٹ گیا۔ قرآن نے اُسے چھڑوا دیا۔ اسی طرح ایک شاعر نے طنز کیا ہے ان پر جو شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ارے تم نے پی ہی نہیں؟ یعنی تو جو اتنا پرہیز گار بنا ہوا ہے تو ذائقہ ہی سے واقف نہیں ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ اس میں کیا کیف ہوتا ہے؟ تو نے تو پی ہی نہیں۔

چبھتا ہوا جملہ ہے۔ میں شکر کرتا ہوں کہ مجمع میں سے زیادہ تر ایسے ہیں کہ واقعی کبھی ان کا دل نہیں چاہا ہوگا۔ ایسے ماحول کو اللہ کی نعمت سمجھنا چاہئے کہ کتنا ہی ان لوگوں کے ساتھ رہے، تعریف سنی لیکن پینے کو خیال نہیں آیا کہ ہم بھی ذرا! اس ذائقہ سے روشناس ہوں۔ لیکن اب میں اس شاعر کو بلاؤں گا ماہِ رمضان میں کہ اب جو پابندی کر رہے ہیں، اب ان سے کہو کہ تم نے پانی پیا ہی نہیں، تم نے کھانا کھایا نہیں، روزے کا یہی سب سے بڑا امتحان ہے کہ جن چیزوں کے ذوق کا خوگر ہے انسان انہی سے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں بچتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں اسی روزہ کیلئے صبر کا لفظ ہے۔ اکثر علماء و مفسرین کے ارشاد کے مطابق:

"وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ"۔

"مدد حاصل کرو نماز اور صبر کے ذریعہ سے"۔

تو بظاہر صبر اور نماز دو غیر متعلق چیزیں ہیں۔ بعض علماء کے مطابق صبر سے مراد صوم ہے۔ روزہ کا نام بھی صبر ہے۔ پھر گرمی کا روزہ جو ہے، امیر المومنینؑ کے ایک ارشاد سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

"اَلصَّوْمُ فِى الْحَرِّ جِهَادٌ"۔

ایک اور جگہ:

"اَلصَّوْمُ فِى السَّيْفِ جِهَادٌ فِى الشِّتَاءِ غَنِيْمَةٌ بَارِدَةٌ"۔

فرماتے ہیں "گرمی کا روزہ جہاد ہے کہ علیؑ جیسا مجاہد اس کو جہاد تسلیم کر رہا ہے کہ گرمی کا روزہ جہاد ہے اور جاڑے کا روزہ؟ وہ تو غنیمت باردہ ہے"۔

وہ برودت بھی ہے کہ موسم ہی برودت کا ہے اور اس کے ساتھ بغیر لڑے بھڑے کا مالِ غنیمت ہے یعنی زحمت کوئی نہیں۔ دن

چھوٹا ہے، دھوپ بھی زیادہ نہیں ہے۔ سحر سے افطار تک اتنا فاصلہ ہے جتنا گرمی میں دو کھانوں کے درمیان فاصلہ ہے یا ذرا زیادہ ہے۔ بغیر لڑے بھڑے کا مال غنیمت ہے کہ فریضہ ادا ہو گیا، چاہے زحمت کتنی ہی کم ہو۔ جو روزہ نہیں رکھتے، وہ جاڑے میں بھی نہیں رکھتے۔ یہ ہے صبر علی المکروہ۔ اور محرمات سے پرہیز جو ہے، ناجائز کاموں سے، وہ صبر علی المحبوب میں داخل ہے یعنی پسندِ طبع چیز کی جدائی پر صبر۔ جیسے وہاں پابندی ناگوارِ طبع، ویسے ہی یہاں جس چیز سے منع کیا جائے، اس چیز کو جی چاہنے لگتا ہے:

"اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَامُنِعَ"۔

کسی چیز کو کبھی دل نہ چاہتا ہو مگر جس دن سے ڈاکٹر صاحب پرہیز بتا دیں گے، اس دن سے اسی چیز کو دل چاہنے لگے گا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اگر انسان نے اس کی پابندی کی تو یہ بے شک صبر ہے۔ تو پوری شریعت بے شک صبر میں داخل ہے۔ وہ تعریف اس پر منطبق کیجئے کہ چپکے سے ہر حربہ کو سہہ لو۔ یہ تعبیر منطبق کیجئے کہ روؤ نہیں۔

معلوم ہوا کہ دنیا صبر صبر چلا رہی ہے اور صبر کے معنی معلوم ہی نہیں ہیں۔ میں نے کئی مواقع پیش کئے کہ میدانِ جنگ میں بھی صبر ہے اور قضائے الٰہی میں جو مصائب ہیں، ان میں بھی صبر ہے اور احکام شریعہ کی پابندی بھی صبر ہے۔ اب علمی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صبر کا لفظ مشترک ہے۔ ایک معنی اس کے وہ ہیں، ایک معنی یہ ہیں۔ اس کو ہر جگہ الگ معنی سے کہا جاتا ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، صبر کا وہ مفہوم یہ ہے کہ کوئی سخت سے سخت ناگواری اور شدت تمہیں فرض کے جادے سے نہ ہٹائے۔ اب فرض کیا ہے؟ اسے الگ سے سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ جہاں جو فرض ہو، اس پر عمل کرے، مثلاً قضائے الٰہی سے جو مصائب ہوں، وہاں فریضہ یہ ہے کہ قضائے الٰہی پر اعتراض نہ ہو، تقدیر الٰہی سے اظہار ناراضگی نہ ہو۔ ضرورت یہ سمجھنے کی ہے کہ جو ہوا ہے، اس پر رونے کا حق ہے۔

بھائی اگر چھوٹ گیا تو بھائی پر رونے کا حق ہے۔ باپ کا سایہ اُٹھ گیا تو سعادت مند بیٹے کو رونے کا حق ہے۔ بیٹا داغِ جدائی دے گیا تو جو فطرت کا تقاضا ہے، یعنی بات کو رونے کا حق ہے۔ مگر جب رو رہا ہے، اس وقت بھی یہ سمجھ رہا ہے کہ جو ہوا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ بس یہ ایمان کا مطالبہ ہے، مجملاً یہ سمجھنا چاہئے، یہ اصول سامنے رکھ کر کہ جس کے ہاتھ میں تقدیر کا قلم ہے، وہ میرا دشمن نہیں ہے اور جاہل نہیں ہے۔ چونکہ دشمن نہیں ہے، اس لئے جان کر برائی نہیں کرے گا اور چونکہ جاہل نہیں ہے، اس لئے بے جانے برائی نہیں کرے گا۔

دو ہی اقسام ہیں برائی کرنے والوں کی۔ یہ اگر پیش نظر رہے تو "رِضًا بِقَضَائِهٖ تَسْلِيْمًا لِاَمْرِهٖ" کی حقیقت یہی ہے اور رونے کا حق ہے۔ وہ حضرات جو کہہ رہے ہیں کہ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ روئیں نہیں، یہ غلط فہمی زمانہ رسولؐ میں بھی موجود تھی اور رسولؐ نے اس کو رد کر دیا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ چودہ سو برس کی مسافت طے کر کے وہ تصور آیا ہے جسے رسولؐ نے غلط کہا ہے۔ وہ تصور نہ آیا جس کی رسولؐ اصلاح کی تھی۔ جس وقت ابراہیم فرزند رسولؐ کا وقت احتضار تھا، ان کا سر پیغمبر رسولؐ کے زانو پر تھا اور حضرت کی چشم ہائے مبارک سے آنسو رواں تھے جو ان کے رخساروں پر ٹپک رہے تھے۔ تو مذکورہ تصور کے مورثانِ اعلیٰ وہاں تھے۔ رسولؐ کے پاس بیٹھ کر اس حالت

میں ان کی انسانیت متقاضی ہوئی کہ پیغمبرؐ کے عمل پر تعجب خیز اور اعتراض کے ساتھ سوال کریں۔

میں کہتا ہوں کہ اس عالم میں ایسے اعتراض کی انسانیت متقاضی ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر مجسم خلق عظیم کے پاس رہنے والے وہ افراد ایسا غیر انسانی عمل کر رہے ہیں کہ عین اس وقت جب ابراہیم حالت احتضار میں ہیں، (آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو) کہنے لگے۔

اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَتَبْکِیْ۔ یارسول اللہ! آپؐ رو رہے ہیں؟

کیا مطلب ہوا؟ یعنی گویا رونا آپ کی شان کے خلاف ہوا۔ صحابہ کا فرض یہ تھا کہ ہر وقت رسولؐ کو شان یاد دلاتے رہیں، ان کو خدا نے ان کی شان کے سنبھالنے کیلئے رکھا تھا۔ تو یارسول اللہ! آپ گریہ فرماتے ہیں؟ تو پیغمبر خدا نے جو اس کا جواب دیا، اس کا ابھی عقلی تجزیہ کروں گا، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْقَلْبَ لَیَحْزُنُ وَاِنَّ الْعَیْنَ لَتَدْمَعُ وَلٰکِنْ لَا تَقُوْلُ اِلَّا مَا یُرْضِیْ

'دیکھو! دل تو رنجیدہ ہوتا ہے اور آنکھ اشکبار ہوتی ہی ہے لیکن ہماری زبان سے ایسا کوئی کلمہ نہیں نکل سکتا جو رضائے رب کے خلاف ہو۔''

تو اب یہ تصور ہوا۔ اب عجیب بات ہے کہ ہماری وراثت میں غلط تصور آئے اور صحیح تصور نہ آئے۔ اس کا کیا مقصد ہے کہ دل تو رنجیدہ ہوتا ہی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ صبر کا وہ تصور کہ احساس غم ہی نہ ہو، آج کل ڈاکٹروں نے ایسی دوائیں ایجاد کر دی ہیں کہ بیہوشی سنگھانے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ وہ حصہ بے حس ہو جائے، کتنا ہی نشتر بھونکا جائے، کتنی ہی سوئی چبھوئی جائے اس میں کچھ اثر ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ عمل کر لیا ہے کہ مریض نے آپریشن کے درمیان اُف نہیں کی۔ کچھ بھی نہیں کہا۔ تو جناب! یہ اُف نہ کرنا کوئی کارنامہ ہے؟ ارے جب جسم کا وہ حصہ بے حس ہو گیا ہے تو اب جتنا چیرا پھاڑا گیا، تو وہ کچھ نہیں بولا۔ تو یہ کونسی قابل تعریف صفت ہے۔

جناب والا! اگر دل اور دماغ ایسے ہی ماؤف ہو گئے ہیں کہ خوشی اور غم کا احساس ہی نہیں ہوتا تو یہ صبر کا کارنامہ کب ہوا؟ اس کے بعد یہ تصور کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلیں۔ احساس غم ہو یا نہ ہو، آنکھ سے آنسو نہ نکلیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دل اور آنکھ میں تعلق کس نے رکھا ہے دل کو رنج ہوتا ہے تو ہاتھ تو نہیں پسیجتا۔ پیر میں تو کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ یہ آنکھ ہی سے آنسو کیوں نکلتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ جو دل اور آنکھ کا خالق ہے، اس نے کوئی درمیان میں رابطہ رکھا ہے کہ جب دل پر اثر ہوگا، تو آنکھ سے آنسو نکلیں گے۔ اب اگر دل اور آنکھ دونوں مزاج معتدل پر رہیں تو یہ اثر ضرور نمودار ہوگا۔ وہ کیفیت ہے، کوئی عمل نہیں ہے جس پر کوئی فتویٰ دیا جا سکے۔ اس سے کوئی شدید حالت ہٹا نہ سکے، یہ ہے معیار صبر

ان مصائب میں جو بقضائے الٰہی ہوتے ہیں، اپنے بس کی بات جو ہے، وہ یہ ہے کہ ایمان کے تقاضے کے خلاف کوئی عمل نہ ہو۔ خیال بھی ذہن میں نہ آئے۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ میدان جنگ میں ثبات قدم۔ اصل اختیاری کام یہی ہے۔ نہ غازی ہونا اپنے بس کی بات، نہ شہید ہونا اپنے اختیار کی بات۔ اپنے اختیار میں ثابت قدم رہنا ہے۔ بس وہاں جس صبر کا مطالبہ ہے، وہ ثابت قدمی ہے۔

احکام شریعہ میں جو صبر ہے، وہ اس کی پابندی ہے۔ چاہے کتنی نا گواری ہو، جو صبر کا تقاضا ہے، وہ انجام دو۔

دیکھئے! ایک ہی معنی ہیں جو سب جگہ بنتے ہیں یا نہیں؟ ضرورت اس کی نہیں ہے کہ الگ الگ معنی قرار دیں۔ جہاں صلح کر کے بیٹھ جانا فرض کا تقاضا ہو، وہاں کھڑا ہو جانا بے صبری ہوگا۔ جہاں کھڑا ہو جانا فرض کا تقاضا ہو، وہاں لوگ لاکھ مشورے اس کے خلاف دیں، فلاں صاحب نے مشورہ دیا، فلاں صاحب نے مشورہ دیا، اتنے خیر خواہ تھے اور فلاں صاحب نے مشورہ دیا اور انہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔

حضرت امام حسینؑ نے اس پر عمل نہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (معاذ اللہ) بڑے ضدی تھے۔ بہت ضد تھی مزاج میں۔ میں کہتا ہوں یہ نقطہ نظر کے ساتھ الفاظ بدلتے ہیں۔ جسے آپ ضد کہتے ہیں، وہی ثباتِ قدم ہے۔ جس کے مطلب کے ساتھ وہ ثباتِ قدم ہوتا ہے، وہ اسے ضد قرار دیتا ہے۔ اب چونکہ آپ اسی ثباتِ قدم کو ضد کہہ رہے ہیں تو میں اس لفظ کو اپنالوں گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسی کا نام ضد ہے تو کون نبی ہے جو ضدی نہ تھا؟ کون رسول ہے جو ضدی نہ تھا۔ چونکہ راہِ حق میں ثباتِ قدم کبھی پھولوں کی سیج نہیں ہے، ہر نبی کو مصائب برداشت کرنا پڑے ہیں۔ ہر پیغمبر کو مشکلات برداشت کرنا پڑی ہیں۔ مشکلات سے گھبرا کر اور مصائب سے دل برداشتہ ہو کر اگر ہٹ جایا جائے تو پھر حق ہم تک کیونکر پہنچتا؟

اب اس لفظ کو استعمال کر کے کہتا ہوں کہ یہ امانتِ حق جو ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے، یہ ان کی ضدوں کا صدقہ ہے۔ پیغمبر خدا نے کیا مشکلات برداشت نہیں کیں؟ تیرہ برس تک جسم مبارک پر پتھر کھائے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مخالف جماعت کا طرز عمل ہے کہ وہ کافر تھے مگر ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے، تیر نہیں تھے۔ کسی وقت مسلمان ہوں اور ان کے ہاتھوں میں تیر ہوں تو صابر کا کردار ایک ہی ہے۔ رسولؐ کے مقابلہ میں پتھر تھے، وہ اُسے برداشت کر رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں تیر تھے، یہ اُسے برداشت کر رہے تھے۔ صابر کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک سب کا معیار یہی ہے اور یہی وہ میراث ہے جس کے لحاظ سے معصومؑ نے فرمایا:

"اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَاوَارِثَ آدَمَ صِفْوَةِ اللهِ. اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَاوَارِثَ نُوْحٍ نَجِیِّ اللهِ. اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَاوَارِثَ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلِ اللهِ"

سب کے وارث کہے جارہے ہیں۔ یہ کیا وارثتِ نسبی ہے، خاندانی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر وراثت نسبی ہوتی تو اس فہرست میں موسیٰؑ کا نام نہ آتا کیونکہ وہ ان کے شجرہ میں نہیں ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ یہ وارثت نسبی نہیں ہے، یہ وراثت منصبی ہے۔ حفاظت حق کا بار جو آدمؑ کے کاندھوں پر تھا، وہ دوش بدوش منتقل ہوتا ہوا آپؐ کے کندھے تک آیا اور آپ کو وہ کردار اختیار کرنا ہے۔ رسولؐ سے کہا گیا:

"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ"۔

"پیغمبرؐ! اسی طرح صبر کیجئے جس طرح آپ سے پہلے صاحبانِ عزم پیغمبروں نے صبر کیا"۔

تو یہ صبر کا کردار جسے دنیا ضد کہہ رہی ہے، یہ تمام انبیاء و مرسلین کی وارثت ہے۔ اب میں الفاظ بدلتا ہوں، اقبال کی زبان میں کہ انہوں نے کہا:

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

حقیقت میں ضرورتِ شاعری کے ماتحت اس میں دو نام آ گئے، اُدھر اور اِدھر کے۔ دورِ قدیم سے موسیٰؑ آ گئے اور پھر دورِ جدید میں شبیرؑ آ گئے۔ اُدھر دورِ قدیم میں فرعون آ سکا اور اِدھر دورِ جدید میں یزید (ملعون) آ سکا۔ وہاں انہوں نے دو دو نام لئے مگر بعد میں کیا کہا؟

زندہ حق از قوتِ شبیریؑ است
باطل آخر داغِ حسرتِ میری است

یہاں موسیٰؑ کا نام نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقیقت، جس کے موسیٰؑ حامل تھے، وہ بھی شبیریت تھی اور وہ حقیقت جس کا فرعون حامی تھا، وہ بھی یزیدیت تھی۔ یعنی یہ نام شخصی نہیں ہیں بلکہ یہ نام گویا صفت کے ہیں کہ ان صفات کا آدمی جس درجہ کا ہو، وہ شبیرؑ ہوتا ہے اور اس صفت کا آدمی جس درجہ کا ہو، وہ یزید ہوتا ہے۔

19

آیہ تطہیر

"اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ" اس کا اکثر لوگ یہ معنی کرتے ہیں کہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کر یعنی ہمیں سیدھا راستہ دکھا تو میں ان سے ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر تمہارا یہ معنی صحیح ہے تو رسول خدا کیا پڑھتے تھے۔

جن کی تطہیر اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ سلطنتوں کی کوششیں ختم ہو گئیں اور ان کے دامن پہ کوئی داغ نہیں لگا سکا۔

فرمانِ معصومؑ ہے کہ جو شخص ہمارے بارے میں ایک بیت کہے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کو ایک بیت عطا فرمائے گا۔

جناب جبرئیل امین کو کیوں شوق ہے کہ پانچویں کا میں چھٹا ہو جاؤں میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ ہستیاں وہ ہیں کہ انہوں نے فرشتہ ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی مگر یہ اتنے اونچے ہیں کہ فرشتے ان میں شامل ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔

مباہلہ کا میدان ہو یا کربلا کا، ان میں بچوں کی شان دیکھئے کہ ان کی شرکت بزرگوں کی عصمت کی تشریح بن گئی۔

آیۂ تطہیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾

عام دستور یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ پڑھنے کے بعد ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن میں اس دستور کے خلاف عمل کرنا چاہتا ہوں کہ تشریح شروع کردوں گا اور ترجمہ نہیں کروں گا۔

مجالس کے فیض سے ان مؤمنین کو بھی جو عربی داں نہیں ہیں، یہ بات معلوم ہوگی کہ "اِنَّمَا" جو شروع میں ہے، یہ کلمہ حصر ہے۔ کلمہ حصر کے معنی یہی ہیں کہ "اِنَّمَا" نہ ہو تو انحصار ظاہر نہیں ہوتا اور "اِنَّمَا" کے ذریعہ سے انحصار ثابت ہوتا ہے۔ لیکن "اِنَّمَا" کے بعد اگر دو لفظی جملہ ہو اور دو لفظوں سے کم کا جملہ ہوتا نہیں۔ صرف دو لفظی جملہ اگر ہو تو یہ "اِنَّمَا" جس سے متعلق ہے، اس کا سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ بس ایک مبتداء اور ایک خبر بالکل آسان ہے۔ مثلاً

"اِنَّمَا اِلٰہٌ وَّاحِدٌ"

الٰہ مبتداء، واحد خبر۔ شروع میں جو "اِنَّمَا" ہے، اس کے معنی بالکل صاف ہیں کہ اللہ بس ایک ہی ہے۔ ایک کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دو چار دس نہیں ہیں بلکہ ایک ہے۔ معلوم ہوگیا کہ اللہ کے لفظ کا انحصار وحدت میں کیا گیا ہے جو بس ایک ہے۔ یہاں تو آسان ہوگیا سمجھنا کہ یہ اللہ کیا ہے، انحصار کس چیز میں ہے کیونکہ دو ہی الفاظ ہیں۔ لیکن جہاں الفاظ زیادہ ہوں، وہاں یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس انحصار کا تعلق کس سے ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کی اُردو تھی، اس وقت کے استاد "اِنَّمَا" کا ترجمہ کرواتے تھے "جز ایں نیست"۔ پرانے اُستادوں سے جنہوں نے صرف ونحو پڑھی ہو، انہوں نے "جز ایں نیست" بہت سنا ہوگا کیونکہ اس وقت اُردو داں حضرات فارسی سے واقف ہوتے تھے، بولتے تھے اردو اور لکھتے تھے فارسی۔

اس وقت شرفاء فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ فارسی اُس وقت عام فہم زبان تھی۔ "جز ایں نیست" ہر ایک جانتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت ترجمہ میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ اس لئے جیسے ہی "انما" شروع میں آگیا، ویسے ہی ایک "جز ایں نیست" ترجمے میں شروع میں آگیا۔ اب "انما" جس سے متعلق ہے، اسی سے یہ "جز ایں نیست" متعلق ہے۔ لیکن ہماری اُردو "جز ایں نیست" والی نہیں رہی ہے۔ اب ہم "انما" کے مقصد و مفہوم کو لفظ "ہی" سے ظاہر کرتے ہیں۔ خدا ایک ہی ہے۔ "ہی" نے "انما" کا مفہوم ظاہر کیا۔ اب ہمارے لئے ترجمہ بہت مشکل ہے۔ اسی لئے میں نے ترجمہ نہیں کیا کہ جب تک یہ سمجھ میں نہ آئے کہ "انما" کس سے متعلق ہے، اس وقت تک یہ "انما" کس سے متعلق ہے، اس وقت تک یہ "ہی" کہاں پر لایا جائے۔ یہاں اس ایک جملے میں:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ

"وَ" کے ذریعے دوسرا جملہ اس سے جڑا ہوا ہے ورنہ اصل جملہ یہاں تک آیا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ

یعنی یہاں تک تو جیسے متکلم نے سانس ہی نہیں لیا، حالانکہ سانس اس کے بعد بھی نہیں لیا ہے ورنہ وقف ہو جاتا۔ وقف کا نہ ہونا دلیل ہے سانس نہ لینے کی مگر پھر بھی وہاں سانس لیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے تو بالکل ایک ہی جملہ ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ

اس "إِنَّمَا" کا تعلق کس سے ہے؟ اس میں جتنے پہلو ہیں، وہ میں عرض کرتا ہوں اور اس کے لحاظ سے ترجمہ بدلتا جائے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ صرف قرآن سے تو ترجمہ تک نہیں ہو سکتا۔

جو جو پہلو میں عرض کرتا ہوں۔ "يُرِيدُ" فعل ہے اس کا فاعل ہے اللہ۔ میں نے عرض کیا کہ ہر پہلو سے ترجمہ بدلے گا۔ مگر یہ عرض کر دوں کہ جتنے بھی پہلو ہوں گے، سب فضیلتِ اہلِ بیتؑ کو نمایاں کرتے ہوئے ہوں گے۔ کوئی ایسا نہیں ہوگا جس سے کوئی غیر فائدہ اٹھا سکے۔ اگر کسی غیر کی دراندازی کا موقع ہوتا تو اللہ کا "إِنَّمَا" کا حصار کمزور ثابت ہو جاتا۔ "يُرِيدُ" فعل ہے اور اس کا فاعل اللہ ہے۔ پہلا تعلق یہ ہے کہ "إِنَّمَا" کا تعلق "يُرِيدُ" کے ساتھ ہے۔ تب یہ معنی ہوں گے کہ کسی اور کا نہیں، اللہ ہی کا یہ ارادہ ہے اور چونکہ ارادہ کی قوت بہ اعتبار قوت مرید ہوتی ہے، جیسی ارادہ کرنے والے کی طاقت ہوگی، اتنی ہی اس کے ارادہ کی طاقت ہوگی تو کسی اور کا نہیں، اللہ کا ارادہ ہے۔

یہ پہلا احتمال ہے۔ اس کے بعد "يُرِيدُ اللَّهُ" یہ اللہ فاعل ہو گیا۔ "لِيُذْهِبَ عَنكُمُ" یہ اب مفعول ہے ارادہ کا۔ وہ "لام" کے ساتھ آیا ہے مگر مطلب اس کا مفعول کا ہوتا ہے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے دُور کرے۔ اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ تم سے دُور کرے۔ ابھی میں نے "دور کرے" ترجمہ کیا ہے۔ بعد میں آئے گا کہ دُور کرے یا دور رکھے، اس کے معنی ہیں۔

اللہ کا ارادہ ہے کہ دُور کرے یا دور رکھے، یہ بعد میں فیصلہ ہوگا۔ فاعل وہ ہے، یہ مفعول ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ "إِنَّمَا" کا تعلق مفعول ارادہ سے ہو۔ تب یہ معنی ہوں گے کہ اللہ کا ارادہ بس یہی ہے۔ وہاں کھسک کر "ہی" یہاں آیا۔ اللہ کا ارادہ بس یہی ہے اور چونکہ بغیر ارادۂ خدا کوئی چیز نہیں ہوتی تو جب ارادہ اللہ کا بس یہی ہے تو اس کے سوا کیا ہوگا؟ یہ دوسرا احتمال ہے۔ تیسرا احتمال یہ ہے، اس کیلئے پھر تھوڑی سی گرامر پڑھنے کی ضرورت ہے کہ اب مفعول ارادہ بھی ایک فعل ہے۔ "لِيُذْهِبَ" "دُور کرے یا دُور رکھے۔ یہ بھی ایک فعل ہے۔ اس کا فاعل اللہ ہے۔ جو "يُرِيدُ" کا فاعل تھا، وہی "يُذْهِبَ" کا فاعل ہے۔ اس کے بعد اس کا تعلق ہے "عَنكُمُ" "تم سے۔ تم سے اور پھر دوسرا مفعول ہے "الرِّجْسَ" یعنی کیا دُور رکھے نجاست، گناہ، آلائش۔ جو ترجمہ چاہے کر لیجئے رجس کا۔ جو جسے پسند ہو، جو بھی ترجمہ کیجئے۔ تو ہو سکتا ہے تیسرا احتمال کہ تعلق "إِنَّمَا" کا مفعول "يُذْهِبَ" سے ہو۔ یعنی اللہ کا ارادہ یہ ہے۔ ابھی کہیں "ہی" نہیں آیا۔

اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ بس تم سے ہر گناہ کو، بس ہر آلائش کو۔ یعنی اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ فضائل تمہارے دروازے پر خیمہ زن ہوں اور برائیاں جتنی ہوں، وہ سب دور ہوں۔

اور اب چوتھا احتمال یہ ہے کہ "عَنْکُمْ" کا جو مجرور ہے، "کُمْ" اور جس کی تشریح ہے "اَهْلَ الْبَيْتِ" یعنی وہی اہلِ بیتؑ کہ جن سے کہا گیا "کُمْ"۔ وہ اہلِ بیتؑ ہیں۔ جو اہلِ بیتؑ ہیں، وہ "کُمْ" ہیں۔ یہ "کُمْ" اور کتنا قریب ہے۔ "کُمْ" کا ترجمہ یعنی تم۔ شاید کچھ لوگ "کُمْ" کا تلفظ تم کرتے ہوں۔ خصوصاً بچے "کُمْ" کا ترجمہ تم اور وہ کون؟ اہلِ بیتؑ۔ اے اہلِ بیتؑ! یہ پکار کر جنہیں کہا، انہی کو "کُمْ" کہا گیا کہ تم سے اب "اِنَّمَا" کا تعلق اس "کُمْ" سے ہو۔ جو اہلِ بیتؑ ہیں۔ تو معنی کیا ہوں گے؟ معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ہر گناہ کو، ہر نجاست کو دور رکھے بس تم سے اے اہلِ بیتؑ۔ تب دلیل ہوگی انحصارِ عصمت کی ان اہلِ بیتؑ میں۔

جنابِ والا! فرض کیجئے کہ تفسیر چھپ رہی ہے میری اور اس میں ترجمہ بھی لازمی ہے تو کچھ نہ کچھ تو ترجمہ وہاں میں کروں ہی گا، ان میں سے کسی ایک کو لے کر۔ لیکن جب اصل میں تشریح مدِ نظر ہو اور اتنے پہلو ہوں تو ترجمہ آدمی کرے تو کیا کرے!

اس "اِنَّمَا" میں اتنے پہلو ہیں اور یہ گرامر سے متعلق بات۔ اور تعجب ہے کہ بڑے بڑے علمائے اسلام جنہوں نے تفسیریں لکھیں ہیں اور قواعد لغت اور گرامر کی بحثیں ہوتی ہیں۔ قرآن کے الفاظ کی تحقیقات سے متعلق لفظی بحثیں ہوتی ہیں۔ تو کشاف زمخشری، اس کی ساخت ہی یہی ہے کہ اس میں ترکیب نحوی اور قواعد لغت اور گرامر کی بحثیں ہوتی ہیں۔ قرآن کے الفاظ کی تحقیقات سے متعلق لفظی بحثیں ہوتی ہیں۔ تو کشاف زمخشری کے حواشی ہیں اور اس کی شرحیں ہیں مگر یہ بحث ان میں سے کسی نے نہ لکھی۔ اس "اِنَّمَا" کو چھوڑ گئے۔ اس لئے کہ کوئی بات تو اپنے مطلب کی ہے نہیں۔ زورِ علم کہاں پر صرف ہوا؟ "يُذْهِبَ" کے معنوں میں۔ وہی جو میں نے اشارتاً اختلافِ ترجمہ کو کہا۔ بس ترجمہ انہوں نے یہ کیا کہ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے اے اہلِ بیتؑ! برائی کو، گناہ کو، نجاست کو دور کرے۔ "يُذْهِبَ" کے معنی دُور کرے۔ "ذَهَبَ" کے معنی دور گیا اور "اَذْهَبَ" لے گیا۔ یعنی دور کیا۔ تو "يُذْهِبَ" کے معنی دور کرے۔ تو معلوم ہوا کچھ تو ہے جس کا اللہ کا ارادہ ہے کہ وہ کرے۔ تو کچھ ہونا تو ثابت ہو گیا۔ معلوم ہو گیا کہ دلچسپی کچھ ہونے سے ہے۔ کچھ تو ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ کیا ہر جگہ اس قسم کے الفاظ کے یہی معنی ہوتے ہیں؟ وہی "يُذْهِبَ" ہے، جب یہاں معنی ہوں گے کہ دُور کرے تو پھر "يُطَهِّرَ" جب آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے کہ پاک کرے۔ یہ بالکل لازم و ملزوم ہے۔ جب "يُذْهِبَ" کے معنی ہوں گے کہ دور کرے تو "يُطَهِّرَ" کے معنی ہوں گے کہ پاک کرے۔ بے شک جیسے "يُذْهِبَ" کے وہ معنی، ایسے ہی "يُطَهِّرَ" کے یہ معنی اور اگر "يُذْهِبَ" میں ہم نے کہا کہ یہ معنی ہیں کہ دُور رکھے تو "يُطَهِّرَ" کے معنی ہوں گے کہ پاک رکھے۔

تو کتنا زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے، دور کرے اور دور رکھے اور پاک کرے اور پاک رکھے۔ ان کے مطلب کی بات یہ ہے کہ یہ معنی ہیں کہ دور کرے۔ تو کہتے ہیں کہ لغت میں یہی معنی ہیں کہ پاک کرے۔ میں کہتا ہوں کہ جب لغت میں یہی معنی ہیں تو جو جو مثالیں میں پیش کروں، ان سب میں یہی معنی کہتے جایئے۔

"وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ"۔

سورۂ رحمٰن میں، کیا ترجمہ کروں؟ ان حضرات سے پوچھتا ہوں۔ آسمان کو اللہ نے اونچا کیا یعنی جیسے آپ کا شامیانہ پہلے زمین پر بچھایا جاتا ہے، پھر بانسوں سے اسے اونچا کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بیچارہ نیچا تھا تو اللہ نے اکیلے یا فرشتوں کی مدد سے۔ اتنے بڑے آسمان کو کیا اکیلا اونچا کرتا؟ سب فرشتے پکار لئے گئے ہوں گے۔ ان سب نے مل کر اونچا کیا۔ یہ معنی ہے یہاں؟ کوئی نہیں کہے گا۔ وہ بھی نہیں کہیں گے کہ یہ معنی ہیں۔ تو پھر کیا معنی ہیں؟ معنی یہ ہیں کہ آسمان کو پیدا ہی اونچا کیا۔ تو جب یہ نظیر قرآنی موجود ہے تو آپ کیوں نہیں کہتے کہ "یُطَهِّرَکُمْ" کے معنی کہ پاک ہی پیدا کیا۔ کہیں گے وہ "رَفَعَ" ہے، یہ "یُطَهِّرَ" ہے۔ یہ باب تفعیل ہے۔ آئیے باب تفعیل کی مثال آپ کی روزمرہ کی۔ ہمارے ہاں چھوٹے کو خط لکھا جاتا ہے: "سَلَّمَكَ اللهُ، سَلَّمَهٗ" بھی وہی۔ طَهَّرَ جو ہے، وہی سَلَّمَهٗ ہے۔ یُطَهِّرَکُمْ، ویسے ہی "سَلَّمَکُمْ"۔ "سَلَّمَکُمُ اللهُ"۔

حضور! عربی کے لحاظ سے، لغت کے لحاظ سے چھوٹے کی قید نہیں ہے مگر کسی بڑے کو ذرا خط لکھ کر دیکھ لیجئے کہ "سَلَّمَکُمُ اللهُ" تو وہ آپ کو انتہائی گستاخ و بے ادب کہہ دیں گے کہ لیجئے صاحبزادے نے ہم کو "سَلَّمَکُمُ اللهُ" لکھا۔ ہمارے ہاں مخصوص چھوٹوں کے ساتھ وہ گیا ہے۔ عراق وغیرہ میں اکابر علماء کے نام کے ساتھ "دَامَ ظِلُّه" کی طرح "سَلَّمَهُ اللهُ" لکھا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں رواج یہ ہے۔ چلو چھوٹے ہی کو سہی "سَلَّمَکُمُ اللهُ"۔ آپ کے نزدیک سالم کرے تو پھر یہ اسی کو لکھا جائے جو بیمار ہو اور اگر بیمار نہ ہو اور سَلَّمَکُمُ اللهُ" لکھ دیجئے تو وہ برا مانے۔ لوگوں سے کہے کہ یہ ہمارے برائی چاہتے ہیں کہ ہم اچھے خاصے ہیں اور ہمیں لکھ رہے ہیں، سَلَّمَکُمُ اللهُ"، سالم بنائے اللہ۔ سالم کرے، جیسے ہم بیمار ہیں۔ یہ ایک طرح کا شگونِ بد ہو جائے۔ تو پھر ہر ایک کہے گا کہ سَلَّمَکُمْ" کیوں لکھا جاتا ہے۔ بالکل اُردو با محاورہ ترجمہ اس کا، سلامت رکھے۔ تو آپ کے "سَلَّمَکُمْ" کے معنی "سلامت رکھے" ہو گئے اور اللہ کے "یُطَهِّرَکُمْ" کے "پاک رکھے" نہ ہوں۔

ایک مثال روزمرہ کے نمازی لوگ زبان پر کم از کم دس مرتبہ نماز میں جاری کرتے ہیں۔ نمازِ پنجگانہ سے کم عدد تو کم از کم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو کم سے کم درجہ ہے امتیاز کا۔ باغی سلطنتِ الٰہی اور غیر باغی میں حکومتِ الٰہی سے وفاداری کا مظاہرہ ہے کہ یہ باغی نہیں ہے، وفادار بندہ ہے، ورنہ اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

جناب! کم سے کم پانچ نمازیں پڑھنی ہیں۔ ہر شب و روز میں ہر مسلمان کو اور ہر نماز میں دو دفعہ سورۂ الحمد۔ ہر رکعت میں ضرور ایک دفعہ ہے اور دو رکعت سے کم کوئی نماز نہیں ہے۔ لہٰذا دس مرتبہ ضرور۔ دوسرا سورہ بدل بدل کر پڑھ سکتا ہے مگر سورۂ الحمد کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس کا ہر جملہ کم از کم دس مرتبہ زبان پر آتا ہے۔ آپ بارگاہِ الٰہی میں کیا کہتے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾

کیا معنی؟ "ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کر"۔ تو یہ جملہ وہی کہے جو گمراہ ہو یعنی نماز وہی پڑھے جو اپنے آپ کو گمراہ سمجھتا ہو۔ صرف وہی نماز پڑھے۔ ایک تو کسی کا ضمیر اسے گوارہ نہیں کرے گا اور کوئی نمازی اسے پسند نہیں کرے گا کہ گویا ہم اقرارِ گمراہی

کرتے ہیں۔ ہر دفعہ جب مصلے پر آتے ہیں، ہر نماز میں دو دفعہ اور دو نمازیں پڑھیں تو ایک وقت میں چار دفعہ اقرار گمراہی کر لیا۔ تو کوئی نمازی اس کو قبول نہیں کرے گا اور اگر کوئی کہے کہ جی ہاں بے شک، بے شک اللہ کی بارگاہ میں یہی کہتے ہیں کہ ہمیں راستہ دکھا یعنی لاسید ھے راستے پر۔ تو میں سوال کروں گا کہ رسول کیا پڑھتے تھے؟

مثال تو ہر ایک صاف ہے مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب! یہ تو آپ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ وہ "رَفَعَ" یا "اِهْدِنَا" یا "سَلَّمَكُم" صحیح ہو گیا۔ یہ بات تو "يُطَهِّرَكُم" کی ہے۔ میں بھی میدانِ گفتگو سے فرار نہیں کرتا۔ کسی اور میدان کا ذکر ہی کیا؟ میں کہتا ہوں کہ آیئے، قرآن ہے، روایت نہیں ہے، حدیث نہیں ہے۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ:

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔

"طَهِّرَا" وہی "يُطَهِّرَكُم" والا لفظ ہے۔ "طَهِّرَا" تثنیہ کا صیغہ ہے۔ دو مخاطب ہیں، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ۔ بتایئے کیا ترجمہ کروں؟ پاک کرو میرے گھر کو۔ تھی کوئی نجاست کعبے میں جہاں معمار اور مزدور بھی معصوم منتخب کئے گئے ہوں؟ وہاں کوئی نجاست تھی؟ ارے بت بھی بہت مدت کے بعد رکھے گئے ہیں۔ اس وقت نہیں تھے۔ نجاست تو کوئی نہیں تھی۔ تو پھر ان سے کہا گیا: "طَهِّرَا بَيْتِيَ" میرے گھر کو، کیا ترجمہ کیجئے گا، میں کہتا ہوں یہ بھی آیۂ تطہیر ہے، وہ بھی آیۂ تطہیر ہے۔ یہ تطہیر ہے بیت کیلئے، وہ تطہیر ہے اہل بیتؑ کیلئے۔

میں کہتا ہوں کہ بس ایک نگاہ پر ٹھہراؤ ہے، فیصلہ دل کا۔ بس "طَهِّرَا" کا آپ ترجمہ کر دیجئے "يطهر" کا میں ترجمہ کر دیتا ہوں۔ وہاں کوئی نجاست تو تھی نہیں تو کیا معنی "طَهِّرَا بَيْتِيَ"۔ دیکھو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ! میرے گھر کو پاک رکھنا۔ جب یہاں یہ ترجمہ ہے تو اس آیۂ تطہیر میں آپ یہ ترجمہ کیوں نہیں کرتے کہ ارادۂ الٰہی یہ ہے کہ تم سے ہر گناہ کو دور رکھے اور پاک رکھے۔ یہ بیت کیلئے آیۂ تطہیر ہے، وہ اہلِ بیتؑ کیلئے آیۂ تطہیر ہے۔ جو معنی یہاں ہیں، وہی معنی وہاں۔ بس فرق اتنا ہے کہ بیت کی تطہیر کا کام رسولوں کے سپرد کر دیا اور اہل بیتؑ کی تطہیر اپنے ذمہ رکھی۔

یہ تطہیر پیغمبروں کے ہاتھ سے اور وہ تطہیر اپنے ہاتھ سے۔ اسی لحاظ سے نتیجہ مختلف ہو گیا۔ بیت کی تطہیر پیغمبروں کے سپرد کر دی گئی تھی تو دنیا بتوں کی نجاست لانے پر قادر ہوئی اور جس کی تطہیر اپنے ذمہ رکھی تھی، سلطنتوں کی کوششیں ختم ہو گئیں اور ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں لگا سکے۔ یہاں یہ بحث ختم ہو گئی تو پورا نقطہ بحث بن گیا اہل البیت۔ یہاں کوئی زحمت دنیا کو پیش نہیں آئی کیونکہ بیت کے لغت میں دیکھ لے، فارسی میں خانہ، اُردو میں گھر۔ اہل کا لفظ بالکل ظاہر ہے، فارسی میں تو ترجمہ کی ضرورت ہی نہیں۔ وہی اہل لگا دیا خانہ کے ساتھ، بالکل سیدھا۔ اہل کی اضافت خانہ کی طرف ہو گئی۔ تو جو لفظ ہوا، وہ سب جانتے ہیں۔ اردو کے لحاظ سے اہل کے معنی "والا"۔ تو "گھر والی" یہ شرفا نہ بولتے ہوں مگر بہت بڑا طبقہ ہے جو رشتہ والی کو "گھر والی" کہتے ہیں۔ لہٰذا تفسیر کب مشکل رہ گئی؟ معلوم ہے کہ اہل خانہ کون ہیں؟ گھر والی کون ہے؟ وہ بھی سہی جو آپ کہتے ہیں لیکن یہ بھی ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی ہیں تو وہ بھی سہی، کیوں ہو؟ ان میں سے کوئی بھی جو اس لفظ کے تحت ترجمہ ہے، اس

میں نہیں آتا۔ آپ ترجمہ یہ کر رہے ہیں کہ وہ افراد ہیں چادر کے نیچے تو انہیں آپ نکال تو سکتے نہیں مگر میں کہتا ہوں کہ بڑی علامت کسی بات کے غلط ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ خود اس کا کہنے والا اس پر قائم نہ رہ سکے۔ میں کہتا ہوں کہ مذہب میں اتنی بڑی بحث جو آپ نے کر ڈالی کہ دور کرے اور پاک کرے۔ اس کے ثبوت میں کچھ ہے۔ تو یہاں شوق کیوں ہے اپنے منظورِ نظر کو مصداق بنانے کا؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحث کر رہے تھے اور دل میں یہ تھا کہ ہے تو بڑی فضیلت۔ لہٰذا اب اس بحث کو بھول گئے اور یہاں کوشش صرف ہوگئی، کچھ خاص افراد کو جو منظورِ نظر ہیں، لغت کی مدد سے اس لفظ کے تحت لانے کی۔

اہل البیت دو الفاظ نہیں ہیں۔ اہل اور بیت، یہ حقیقت میں تین الفاظ ہیں۔ ایک ہے اہل اور ایک ہے بیت اور ایک یہ بیچ میں ''الف لام'' جو ہے، یہ مستقل لفظ ہے۔ تو اہل کے معنی لغت میں آپ کو مل جائیں گے۔ بیت کے معنی لغت میں مل جائیں گے۔ مگر اس ''اَل'' کے معنی لغت میں نہیں ملیں گے۔ میں نظیر پیش کر کے عرض کروں گا کہ ''الف لام'' کے معنی ہوتے ہیں، ''الف لام'' فردِ واحد کی طرف اشارہ کیلئے ہوتا ہے۔ کبھی استغراق ہوتا ہے سب کے معنی میں۔ الحمد، سب تعریفیں۔ مگر اب اس کا مطلب سب نہیں ہے۔ سب گھر والے، کیا مطلب؟ تو اس صورت میں یہ اشارے کیلئے ہوتا ہے فردِ خاص کی طرف۔

اب آپ کو جانی پہچانی مثال دے دوں۔ یوم کے معنی کوئی سا دن لیکن ''الیوم'' کیا معنی؟ آج۔ یہ آج کے معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ اس لئے کہ یہ ''اَل'' کہتا ہے، یہ سا دن۔ اشارۂ خاص دن کی طرف، حاضر کی طرف۔ یہ سا دن فارسی میں بالکل لفظی ترجمہ اس کا امروز ہے یعنی ایں روز، یہ دن۔ ہمارے ہاں یہ دن نہیں ہے، اسی کا نام ہے آج۔ یہ آج کے معنی ''الف لام'' سے پیدا ہوئے۔ یعنی روزِ حاضر۔ یہ دن جو آج ہے، اب ''اَل'' کے معنی واضح ہو گئے کہ اشارہ کیلئے ہوتا ہے فردِ حاضر کی طرف۔ اب اہل البیت کے معنی نہ اہلِ خانہ ہیں نہ گھر والی ہے، نہ گھر والا ہے۔ اہل البیت کے معنی ہیں اس گھر والے۔ اشارہ۔ لغت میں اس کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔

اشارہ کا تعلق دیکھنے سے ہے کہ کس کی طرف اشارہ ہے۔ میں کہوں گا یہ صاحب میرے پاس کل تشریف لائے تھے۔ تو اب یہ صاحب جو کوئی نہ دیکھے کہ یہ اشارہ کس طرف کیا ہے اور کاغذ پر الفاظ آئیں تو وہ کچھ نہیں سمجھے گا کون صاحب۔ جو دیکھ رہا ہوں گا کہ کدھر اشارہ کیا، وہ سمجھے گا کہ کس کو کہا تھا۔ اشارہ کی مدد سے اسم اشارہ کے معنی معین ہوتے ہیں۔ یہ سا دن، تو البیت، یہ سا گھر۔ جب تک اشارہ نہ دیکھیں، سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اور اشارے کا ایک خاصہ ہے۔ اشارہ کا خاصہ یہ ہے کہ جہاں تک نظر سے حائل کوئی چیز نہ ہو، وہاں تک سمتِ اشارہ میں وسعت ہوتی ہے۔

میں کہوں گا یہ تو اشارہ اس دیوار تک پہنچ جائے گا، میں کہتا ہوں یہ تو اشارہ اس تخت کی طرف آتا ہے۔ یہ تخت نہ ہو اور اس طرح اشارہ کروں تو اشارہ زمین تک جائے گا اور کہوں یہ تو یہ اشارہ چھت تک جائے گا اور چھت نہ ہو تو فلک الافلاک جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ مقدار پیمانہ مسافت کا کوئی نہیں ہے۔ جہاں تک حائل نظر کے سامنے کوئی نہ ہو، وہاں سمتِ اشارہ میں وسعت ہوتی ہے۔ پیغمبرِ خدا جب ہوتے تھے تو کسی گھر میں ہوتے تھے۔ کسی آدمی کا گھر نہ سہی، خانۂ خدا سہی۔ کسی گھر میں ہوتے تھے۔ اگر آیت اُترتی تو جس گھر میں اُترتی، اس کی چار دیواری میں منتشر ہو جاتی۔ لہٰذا پیغمبرِ خدا جب آیت اُترنے والی تھی تو آپؐ نے گھر کے اندر گھر بنایا اور ایک بڑی

حقیقت ہے جس کو ایک جملے میں کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ خدا کو قرآن کی آیت کا علم نازل ہونے کے بعد نہیں ہوتا تھا کہ کیا آیت اُترے گی بلکہ نازل ہونے سے پہلے ہوتا تھا کہ کونسی آیت اُترے گی۔ معلوم ہے کہ خالق کی آیت کیا اُترے گی اور اس میں حصار کھنچا ہے تو وہ حصار لفظ میں کھینچے گا، میں عمل میں حصار کھینچ دوں۔

تو گھر میں گھر بنایا اور قاصد کے بھیجے ہوئے کسی لاسلکی سے یا کسی جذب مرکزی سے بیت کے اجزا سمٹ سمٹ کر آنے لگے۔

میں نے دو پہلو کہے، قدرتی لاسلکی بھی، جذب مرکزی کہا اور تیسرا پہلو کہوں جو رسولؐ کے بارے میں میں کہہ چکا کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ جتنے افراد ہیں، ان سب کو معلوم ہے کہ کونسی آیت اُترنے والی ہے۔ آیت اُتر رہی ہے اور پس منظر سب مہیا کر رہے ہیں۔ میں نے یہ ایک دفعہ مسجد میں موعظہ میں بیان کیا تو ایک عربی دان صاحب علم نے بیچ میں کہہ دیا کہ چادر اوڑھنے میں بیت کہاں سے بن گیا۔ چادر کو آپ کہہ رہے ہیں کہ گھر کے اندر گھر بنایا۔ چادر کے اندر رسولؐ ہیں، بیت کہاں سے ہو گیا؟ چونکہ وہ عربی کے طالب علم تھے، میں نے پہلے تو ابوالعلیٰ معری کا شعر ہی پڑھا۔ بہت بڑا شاعر ہے عرب کا۔ اس کا دیوان ایک وقت میں لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب کے نصاب میں داخل تھا، اس کا شعر میں نے پڑھا:

اَلْحُسْنُ يَظْهَرُ فِي شَيْئَيْنِ رَوْنَقُهُ
بَيْتٌ مِنَ الشِّعْرِ وَبَيْتٌ مِنَ الشَّعْرِ

یہ شعر ہے ابوالعلیٰ معری کا۔ ترجمہ کر دوں، حالانکہ کرنے میں وہ بات نہیں ہوتی۔ صرف قرآن ہی نہیں، کسی بھی عربی کلام کا ترجمہ اُردو میں وہ بات پیدا نہیں کرے گا۔ میر تقی میر اور غالب کے شعروں کا دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ منہ چڑاتا ہے، ترجمہ نہیں ہے۔ بہر حال ترجمہ بقدر امکان یہ ہے کہ شاعر کہہ رہا ہے کہ حسن کا جلوہ دو قسم کے بیتوں میں نمایاں ہے، ایک شعر والی بیت۔ دو مصرعوں کا مجموعہ عربی میں بیت کہلاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

"مَنْ قَالَ بَيْتًا فِيْنَا بَنَى اللهُ بَيْتًا لَهُ فِي الْجَنَّةِ"۔

''جو ایک بیت ہمارے بارے میں نظم کرے تو اللہ جنگ میں اس کو ایک بیت بنا دے گا''۔

تو ''بَيْتٌ مِنَ الشِّعْرِ ''حسن کا جلوہ دو بیتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک شعر والی بیت یعنی وہ شعر جس میں حسن کا ذکر ہو تو پھر جلوہ حسن نمایاں ہوتا ہے۔ آجکل دیہاتوں کے حسن کے بیان کی ترقی ہمارے ادب میں بھی بہت ہو گئی ہے۔ اب محل والیوں کا نہیں بلکہ دیہات والیوں کا حسن مرکز مدح بن گیا ہے۔ عرب کا مزاج بھی یہی تھا۔ تو حسن کا جلوہ دو چیزوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ ایک شعر والا بیت اور ایک بالوں سے بنے ہوئے کپڑوں کا بیت ہے جو عرب میں چادریں کھینچ کر بنائے جاتے تھے۔ اپنے قیام کیلئے مکانات۔ معلوم ہوا کہ چادروں سے جو بیت بنے، وہ بھی کلامِ عرب میں بیت ہوتا ہے۔

''بَيْتٌ مِنَ الشِّعْرِ ''اور ''بَيْتٌ مِنَ الشَّعْرِ ''، یہ تو کلام عرب سے مثال پیش کی۔ اب اس کے بعد میں نے کہا کہ قرآن اور واقعہ دونوں کو ملا کر دیکھئے کہ یہ بیت ہے یا نہیں۔ واقعہ تو بحمد اللہ مجالس کے فیض سے سب کو معلوم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن کی تعلیم

ہے کہ جب بیوت میں داخل ہو، گھروں میں تو پہلے سلام کرو اور اجازت لو۔ یہ تعلیم اسلامی ہے۔ اس پر فرشتوں نے ہمیشہ عمل کیا، یہاں تک کہ ملک الموت بوقتِ وفاتِ رسولؐ آئے تو دروازہ پر کھڑے رہے، جب تک فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے اجازت نہیں دی، تب تک دروازہ کے اندر قدم نہیں رکھا۔ یہ رسولؐ کے مصائب میں آپ سنا کرتے ہوں گے۔ دروازے پر ٹھہرے ملک الموت اور آج جبرئیلؑ جب چادر کے پاس آئے، تب سلام کیا، اجازت مانگی۔

تو بس میں کہتا ہوں کہ کبھی بیت وہ ہوتا ہے، آج تو بیت یہی ہے۔ حالانکہ وہاں سے اجازت لے کر آئے تھے اور قرآن کہہ رہا ہے:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۝

''فرشتے بات کرنے میں اللہ پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عامل ہیں۔''

اجازت مانگی، یقیناً مقصد شناسِ قدرت ہیں اور اللہ نے ان کے دل میں ڈالا کہ وہ اجازت طلب کریں اور اللہ نے بھی بلا تکلف اجازت دے دی۔ اجازت لے کر آئے تھے کہ چادر میں داخل ہوں تا کہ پانچویں کا میں چھٹا ہو جاؤں:

لِاَكُوْنَ مَعَهُمْ سَادِسًا.

''چادر کے اندر میں بھی داخل ہوں تا کہ چھٹا ہو جاؤں''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جناب جبرئیل امین کو کیوں شوق ہے کہ پانچویں کا میں چھٹا ہو جاؤں؟ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ انسان وہ ہیں کہ انہوں نے فرشتہ ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی مگر یہ اتنے اونچے ہیں کہ ہر فرشتے ان میں شامل ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔

وہاں سے اجازت لے کر آئے تھے مگر اس دنیا میں آ کر ان کی عملداری میں داخل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان کے نظامِ شریعت پر عمل کرنے کیلئے ان سے اجازت لے کر آئے تھے مگر اس دنیا پر اکتفا نہیں کرتے جو خدا سے لے لی تھی۔ اب جو یہاں صاحب مکان ہے، اب جو صاحب بیت ہے، اُسے سلام کر رہے ہیں۔ کھڑے ہو کر اور اس سے اجازت لے رہے ہیں کہ میں بھی داخل ہو جاؤں؟ ان کی اجازت سے داخل ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اس سے اجازت لے کر کیوں آئے اور ان سے اجازت طلب کر کے کیوں داخل ہوئے؟ یہ بھی مقصدِ الٰہی کی تکمیل تھی۔ ''انما'' کی تفسیر کرنا تھی۔ فرشتہ بھی اگر چادر کے باہر کھڑے ہو کر آیت پڑھتا تو پھر اشارہ چار دیواری میں منتشر ہو جاتا۔ لہٰذا فرشتہ بھی چادر کے اندر داخل ہوتا ہے اور چادر کے اندر داخل ہو کر کہتا ہے کہ خالق نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ

''اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے اے اس گھر والو!

اب جدھر سے اشارہ باہر نکلنا چاہے گا، چادر کا حصار روکے گا۔ یہاں اس بحث کو پھر تازہ کرتا ہوں۔ وہ پاک کرے یا پاک رکھے۔ میں کہتا ہوں کہ اب چادر کے اندر جو افراد ہیں، انہیں دیکھ کر بتاؤ کہ پاک کرے یا پاک رکھے۔ معنی ہیں۔ اور مسلمان

سے کہوں گا کہ یہ غور سے دیکھ لینا کہ اس میں رسولؐ اللہ بھی ہیں۔ دنیا بتائے، مسلمان بتائیں۔ محمدؐ کو رسولؐ اللہ ماننے والے بتائیں کہ اب پاک کرنے کے معنی ہیں یا پاک رکھے۔ جو معنی وہاں رسولؐ کے لئے سمجھو، وہی معنی میں ان افراد کیلئے چاہتا ہوں۔ ان کو میں رسولؐ سے بڑھانا نہیں چاہتا۔

میں نے مسلمانوں سے بلاتفریق فرقہ، عقیدۂ اسلامی کا دباؤ ڈال کر گویا جواب حاصل کیا مگر اس بحث میں میری ہمت ہے کہ اگر غیر مسلم افراد ہوں تو ان سے بھی میں بحث کا تصفیہ کروالوں گا کہ دور کرے معنی ہیں یا دور رکھے معنی ہیں۔ کوئی کہے قرآن کی آیت ہے، غیر مسلم سے کیا مطلب؟

میں کہتا ہوں کہ الفاظ کی بحث میں مسلم اور غیر مسلم کا سوال نہیں۔ وقت ناموں کے الفاظ ہوتے ہیں۔ غیر مسلم جج بھی فیصلہ کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ واقف کا وہ ہم مذہب ہو۔ میں اس کے سامنے اپنا کیس پیش کروں گا کہ رسولؐ نے یا خدا نے، جس نے بھی، ان لوگوں سے یہ الفاظ عربی کے کہے ہیں، اب آپ فیصلہ کیجئے کہ اس کے معنی ''دُور کرے'' ہیں یا ''دور رکھے'' ہیں۔ غیر مسلم سے اس کا فیصلہ کرواسکتا ہوں۔ وہ کیونکر؟ وہ یوں کہ اس سے کہوں گا کہ آیئے، دیکھئے یہ افراد ہیں، ان میں اگر سب بالغ ہوں، تب تو معنی ہو سکتے ہیں کہ دُور کرے اور اگر ان میں بچے بھی ہوں اور ایک ہی لفظ سب کیلئے کہا گیا ہو، یہ نہیں کہ بڑوں سے ایک دفعہ لفظ کہا اور بچوں سے ایک دفعہ کہا۔ ایک لفظ سب کو مخاطب کر کے، بس ایک دفعہ کہا ہے۔ آپ ہندو ہوں، عیسائی ہوں، فیصلہ کیجئے کہ کہنے والا جو ذمہ دار فرد ہو، یہ کہے ان سب کو مخاطب کر کے تو کیا معنی ہوں گے؟ ''دُور کرے'' یا ''دُور رکھے''۔ اب تو مجبور ہیں ماننے پر جبکہ ان میں بچے بھی ہیں جو کسی مذہب کی زبان میں گنہگار نہیں ہیں۔ جو سب کے نزدیک معصوم ہیں۔ اب ان سے کہا جا رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ دُور رکھے۔

تو بس میں کہتا ہوں کہ اب ان بچوں کی شان دیکھی ہے جن کی شرکت بزرگوں کی عصمت کی تشریح کرے۔

20

فلسفہ جہاد

ارشاد خداوندی ہے کہ بہت ممکن ہے کہ تھوڑی سی جماعت ہو اور وہ کثیر جماعت پر غالب آجائے اللہ کے حکم سے اور اصل یہ ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(القرآن)۔

پروردگار ہم پر اپنی طرف سے صبر عطا فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کی قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر (القرآن)۔

لوگ کہتے ہیں کہ بہتر (72) کو فوج کیوں کہا جاتا ہے کہیں بہتر (72) کی فوج ہوتی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ مولا اگر ان کو فوج نہ سمجھتے تو ترتیب لشکر کیوں دیتے؟

میں نے کافی غور کیا اور تاریخ کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں کہ مجھے وہ جماعت مل جائے کہ جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کی ہے تو خدا گواہ ہے وہ جماعت کربلا والوں کی ہے کہ جو خصوصیت اس جماعت میں ہے وہ کسی میں بھی نہیں ہے۔

ہر جنگ، ہر لڑائی میں خوف وخطرہ ضرور پایا جاتا ہے لیکن کربلا والوں کی لڑائی کوئی عجیب لڑائی ہے یہاں صبر واستقامت، شجاعت اور ایمان وایقان کے وہ مظاہر ہو رہے ہیں کہ پوری کائنات دم بخود ہو کر رہ گئی۔

فلسفہ جہاد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَہٗ رِبِّیُّوۡنَ کَثِیۡرٌ ۚ فَمَا وَہَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَکَانُوۡا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

چوتھے پارے کی آیت ہے، ارشاد ہو رہا ہے کہ کچھ نبی ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر اللہ والوں نے جنگ کی (جن کی معیت میں) وہ سست نہیں ہوئے ان نتائج سے جو اللہ کی راہ میں انہیں پیش آئے اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ انہوں نے سر جھکایا اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

قرآن مجید ایک مرقع جماعت کے اوصاف پیش کر رہا ہے جو نبی کی معیت میں راہ خدا میں جہاد کر رہے ہیں۔ ان کا پہلا وصف یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جو انہیں مصائب درپیش ہوئے، اس سے ان میں سستی پیدا نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فریق مخالف کے مقابلہ میں ان کی طاقت کم تھی۔ تعداد میں ان سے کم ہوں گے اور سامان جنگ میں ان سے کم ہوں گے، تبھی تو ان کے مقابلہ میں مصائب پیش آئے اور ان مصائب کی وجہ سے ان میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ اس راہ میں مصائب کا پیش آنا دلیل ہے مادی حیثیت سے ان کے کمزور ہونے کی۔

مادی حیثیت سے یہ طاقتور نہیں تھے ورنہ یہ ہوتا کہ یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے بڑے شدومد کے ساتھ حملہ کیا اور مخالف کے پرخچے اُڑا دیے۔ مگر قرآن یہ نہیں کہہ رہا، یہ کہہ رہا ہے کہ جو مصائب درپیش ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں طاقت اتنی نہیں تھی کہ یہ مادی حیثیت سے ان کا مقابلہ کر سکتے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ "مَا ضَعُفُوۡا" میں نے اس کا ترجمہ نہیں کیا کہ وہ کمزور نہیں ہوئے۔ اگر کمزور نہ ہوتے تو مصائب کیوں پیش آتے۔ میں نے ترجمہ یہ کیا کہ کمزوری نہیں دکھائی انہوں نے۔ کمزوری دکھانا کردار سے متعلق ہے۔ کمزور ہونا کیفیت ہے۔ پہلا لفظ کمزوری کا ثبوت دے چکا ہے کہ مصائب انہیں بہت پیش آئے تو دوسرے جملے کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ اس کے بعد "مَا اسۡتَکَانُوۡا"، انہوں نے سر نہیں جھکایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مطالبہ تھا سامنے اور اس مطالبہ کو انہوں نے قبول نہیں کیا اور نہ قبل کے جملوں کے بعد یہ "وَمَا اسۡتَکَانُوۡا"، انہوں نے عاجزی نہیں دکھائی، سر نہیں جھکایا۔

س پورے کردار کو سمیٹ کر ایک لفظ جو ادا کیا ہے، وہ صبر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کے معنی از روئے قرآن یہ ہوئے کہ جو پہلے بیان ہوا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ:

یُحِبُّ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

"اللہ دوست رکھتا ہے ایسے صبر کرنے والوں کو"۔

معلوم ہوتا ہے کہ صبر ایک اجمالی لفظ ہے جس کے تحت میں یہ کردار مضمر ہے جس کا قبل میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید کی آیت ہے اور اس کی سچائی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ نبی ہیں اور ان کے ساتھ یہ جماعت ہے۔ تو مجھے کہیں تاریخ کے صفحات پر وہ جماعت نظر بھی تو آئے کہ وہ جماعت جس کے کردار کا یہ ذکر ہو رہا ہے، یہ جماعت آخر کس معرکہ میں تھی؟ کس جنگ میں یہ جماعت سامنے آئی؟ تاریخ میں اس کا تلاش کرنا بیکار ہے کیونکہ یہ وہ دور ہے جس میں تاریخ نگاری رائج نہیں ہوئی تھی۔ ہماری تو قدیم سے قدیم تاریخ بھی دورِ اسلام کی ہے۔ قبل اسلام کے حالات اشعار میں، قصائد میں موجود ہیں۔ جو عرب متعلق ہیں اور جسے انہوں نے نظم کیا ہے۔ اس لئے مقولہ ہے:

"اَلشِّعْرُ دِيْوَانُ الْعَرَبُ".

شعر گویا عرب کا تمام کیفیات، حالات اور جذبات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کے سوا وہ صاحب تالیف نہیں تھے، صاحب تصنیف نہیں تھے۔ تو اس وقت کے حالات ہم تک کیسے پہنچیں؟ بس وہ دورِ جاہلیت کے اشعارِ عرب ہیں۔ ان سے ماقبل اسلام کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس بناء پر تاریخ میں تلاش کرنے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صحیح طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید نے مجمل طور پر اس جماعت کا تذکرہ کیا ہے تو پھر قرآن ہی میں تلاش کریں۔ شروع سے آخر تک۔ شاید یہ جماعت مل جائے۔ میں نے تلاش کیا۔ قرآن کا کام واقعہ نگاری تو ہے نہیں۔ قرآن مجید واقعات کو ضمنی مقصد سے پیش کرتا ہے کہ ان سے جو سبق حاصل ہوتے ہیں، دنیا وہ سبق محفوظ کرے۔ دلچسپی کی خاطر تو واقعات بیان کرنا قرآن کو ہیں نہیں۔ درس ہے، نتیجہ ہے جو امت کے لئے کارآمد ہے۔ پس میں نے تلاش کیا کہ جہاں کہیں کوئی جنگ قرآن مجید نے بیان کی ہوگی، اس جنگ کے ذیل میں ہوگا کیونکہ "قُتِلَ" وہاں تھا کہ انہوں نے قتال کیا۔

قتال کا مطلب خونریز جنگ کا ہوتا ہے، لہٰذا جہاں کہیں کسی خونریز جنگ کا تذکرہ قرآن مجید میں ہوگا، وہیں یہ جماعت مجھے ملے گی۔ میں نے قرآن میں تلاش کیا تو دوسرے ہی پارہ میں ایک جنگ کا ذکر مجھے مل گیا جس کی پہلی ہی سطر میں نبی کا لفظ ملا۔ مجھے بہت اُمید ہوئی کہ وہاں یہی کہا گیا تھا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ

کوئی نبی ہے۔ یہ نبی کی جنگ ہمیں مل رہی ہے تو وہ جماعت بھی یہیں ملے گی۔ اسے پڑھنا شروع کیا اور اس واقعہ میں ہمارے لئے بصیرتوں کا اتنا سرمایہ ہے کہ تقریباً متوسط سائز کے قرآن میں دو صفحوں میں وہ واقعہ درج ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

"کیا تم نے نہیں دیکھا،

ترجمہ میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض لوگ جو خطاب ہو، واحد کا، اُس کا مخاطب پیغمبرِ خدا کو قرار دے لیتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں:

''اے محمدؐ''۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ جو آیت کا مضمون ہو، اس کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ مخاطب خود رسولؐ ہیں یا نہیں۔ بعض جگہ تو مخاطب رسولؐ ہیں جیسے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

وہ سوا رسولؐ کے کون ہے جس سے یہ کہا جائے۔ اسی طرح اور بہت سی آیات ہیں:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ

اور جگہ بلکہ زیادہ جگہ جو یہ واحد کا خطاب ہے، اس سے خاص رسول مخاطب نہیں ہیں آجکل کے طرز تحریر میں بھی رائج ہے۔ لکھنے والا لکھتا ہے: کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ یہ کسی خاص آدمی سے متعلق نہیں ہے۔ جو اس کلام کو پڑھے، وہ مخاطب ہے۔ ہر ناظر یا دیکھنے والا، اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا مخاطب ہے۔ اسی طرح سے:

"اَلَمْ تَرَ".

قرآن میں آیا ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؕ①

کیا تم نے نہیں دیکھا۔ ہر جگہ اس سے رسول کو مخاطب سمجھنا درست نہیں ہے اور بعض جگہ اس کا مضمون بالکل شانِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ رسول قطعاً مخاطب نہیں ہیں بلکہ عام مخاطب ہے کہ جو بھی چشم بینا و گوشِ شنوا رکھتا ہے ہو، اس سے خطاب ہے۔ اس لئے میں نے یہ علامت قرار دی ہے اپنے نقطہ نظر کی کہ جہاں مخاطب رسولؐ ہیں، وہاں اپنے معیار تہذیب کے لحاظ سے ہیں۔ ترجمہ آپ کے ساتھ کرتا ہوں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

''کہئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے قدم پر چلو''۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ

''کہئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے صاحبانِ قرابت کی محبت کے''۔

یہ جہاں میں نے ترجمہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مخاطب رسول کو سمجھ رہا ہوں اور ایسی آیات جہاں میرے نزدیک یہ نہیں ہیں، وہاں تم کے ساتھ ترجمہ کرتا ہوں جیسے میں نے ابھی یہ ترجمہ کیا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا اس جماعت کو؟

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؕ①

''کیا تم نے دیکھا اس کو جو قیامت تک کی تکذیب کرتا ہے''۔

آخرت کا انکار کرتا ہے۔ جہاں میں ترجمہ تم کے ساتھ کرتا ہوں، وہی جیسے "جزایں نیست" میں مَیں نے کہا تھا قبل کی اردو اور تھی۔ وہاں تم اور آپ نہیں تھا۔ ہر ایک کا ترجمہ "تو" کے ساتھ تھا۔ کیا تو نے نہیں دیکھا؟ مگر اب ہماری اُردو پرانی نہیں رہی۔ ہم ہر ایک کیلئے تو نہیں کہتے۔ جہاں رسول مخاطب ہیں، وہاں آپ کے ساتھ ترجمہ مناسب ہے اور جہاں دوسرے مخاطب ہیں، وہاں تم کے ساتھ ترجمہ کروں گا۔ اگر کوئی اور نبی ہو تو میں پھر بھی تم کے ساتھ ترجمہ کردوں مگر جس کو اُس نے حبیب کا درجہ دیا ہو، میرے نزدیک تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے آپ سے مخاطب کیا جائے۔

غرض یہاں ترجمہ یہ ہوگا "اَلَمْ تَرَ"، "کیا تم نے نہیں دیکھا"۔ بنی اسرائیل کے عمائد کے گروہ میں "مَلَا" کہتے ہیں، ممتاز آدمیوں کی جماعت۔

"اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ"۔

"بنی اسرائیل کے عمائد اور بڑے لوگ، ان کو نہیں دیکھا کہ جب وہ آئے،

"اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ"۔

اپنے نبی سے جو اس وقت تھا یہ کہا۔ الفاظ بہت اُمید افزا ہیں کہ وہ جماعت یہاں ملے گی۔ انہوں نے یہ کہا:

ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ

ہمارے لئے ایک سردار مقرر کردیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اُمید بڑھی کہ اتنا ذوق جہاد رکھنے والے لوگ ہیں کہ خود اپنے رسول سے تقاضا کررہے ہیں، خواہش کررہے ہیں۔ اتنا ان کا دل بیتاب ہے راہِ خدا میں جنگ کرنے کیلئے تو ضرور وہی جماعت ہوگی۔ مگر اب نتیجہ جو ہے، عملی طور پر، وہ بہت مایوس کرے گا لیکن یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ چونکہ اس نبی کے دَور کے لوگ تھے اور اس کے گردوپیش کے آدمی تھے، تو وہ اتنا مانتے تھے کہ اللہ کی راہ میں جنگ بغیر اُدھر کے سردار کے نہیں ہوسکتی۔ فقط جنگ کرنا ہوتی تو نبی سے آکر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ خود ہی کانفرنس کرتے، خود ہی شوریٰ سے اجماع سے کسی کو اپنا سردار مقرر کرلیتے۔ لیکن جیسے بے بسی ہے، مجبوری ہے، کیونکہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنا ہے، تو بیچارے سب آکر نبی سے کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ایک ایسا سردار مقرر کیجئے، مقرر کردیجئے یعنی اللہ سے مقرر کروادیجئے۔ اللہ سے آپ کہ دیجئے کہ مقرر کردے۔ بعد میں بتادیجئے گا کہ اللہ نے مقرر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ "مقرر کیجئے" کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ مقرر کیجئے۔

اس سے ایک اور عملی نتیجہ ہمارے لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی سردار کو مقرر کرنا اللہ کا کام تھا جس کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ جبھی تو رسولؑ نے یہ کہا کہ اللہ نے مقرر کیا۔ مطلب ان کا یہی تھا مگر اس مطلب کے حاصل کرنے کیلئے نبی سے کہا کہ آپ مقرر کردیجئے۔ اسی طرح اگر دل میں یہ ہے کہ اللہ روزی دینے والا ہے لیکن ہم اس کے کسی مقرب سے کہیں کہ آپ ہمیں روزی دے دیجئے تو یہ شرک نہیں ہوگا۔

شرط یہی ہے کہ دل و دماغ میں یہ ہو کہ اصل عطا کرنے والا اللہ ہے تو پھر اگر دل و دماغ میں یہ ہے، عقیدہ و ایمان یہی ہے تو الفاظ سے شرک نہیں ہوگا۔

ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ

''ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے''۔

اس کیلئے سردار مقرر کر دیجئے۔ انداز قرآن مجید کی اور آیات میں بھی یہی ہے۔ خود ہمارے رسولؐ کے ذریعہ سے بھی جو پیغام پہنچائے گئے ہیں کہ جو بات ہونے والی ہو، علم الٰہی میں اس کو رسولؐ کی زبان سے بطور خطرہ پیش کیا جاتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو، یہ ''کہیں ایسا نہ ہو'' کا انداز نتیجہ سے یہ ثابت کرتا تھا کہ یہ ہونے والا ہے اور اس کیلئے ایک نظیر قرآن کی پیش کر دوں۔

قرآن میں کہا گیا ہے، اس اُمت کو مخاطب کر کے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہمارے رسولؐ کی وفات ہو جائے یا قتل ہو جائیں تو تم پچھلے پیروں لوٹ جاؤ۔ میں نے کہا کہ سنت کلام الٰہی یہ ہے کہ جو بات ہونی ہوتی ہے، اس کو قبل میں رسول یوں کہا کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ یہ خطرہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خطرہ کا اظہار اتمام حجت ہوتا ہے کہ اب تو ہوشیار رہیں کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے یہ کہا تو نبی نے کیا کہا:

قَالَ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا‌ ؕ

نبی نے کہا کہ ابھی گویا یہ میری طرف سے تبصرہ ہے کہ شکر خدا کرو کہ ابھی جنگ کا فریضہ ادھر سے عائد نہیں ہوا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تم درخواست کر رہے ہو۔ غرض کر رہے ہو اور پھر اُدھر سے فریضہ عائد ہو جائے جنگ کا تو تم جنگ نہ کرو۔

جوش کے عالم میں آدمی نتائج پر کہاں غور کرتا ہے! خود اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ کہا تو ان کی آتش عزم میں برافروختگی پیدا ہوگئی اور ان کے جوش میں اور زیادہ طوفانی کیفیت پیدا ہوگئیں۔ انہوں نے جو یہ کہا کہ:

هَلۡ عَسَيۡتُمۡ

''کہیں ایسا نہ ہو کہ''

اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ

''جنگ کا فریضہ عائد ہو تو تم''۔

اَلَّا تُقَاتِلُوۡا‌ ؕ

''جنگ نہ کرو''۔

تو وہ کہنے لگے:

قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ط
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ط

''ہمیں کیا ہو جائے گا کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم گھر اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکلے ہوں گے''۔

یعنی اسی مقصد سے روانہ ہوں گے تو یہ وہی کیونکر سکتا ہے کہ ہم جنگ نہ کریں یعنی اس خطرہ کو سننے کے بعد انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہرگز یہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہی نہیں ہے، ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اب باوجودیکہ تفصیل پھر بیان کرے گا قرآن، لیکن آپ کی زحمتِ انتظار کو کم کرنے کیلئے خالق سمیٹ کر نتیجہ کا اعلان کئے دیتا ہے:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ط

جب جنگ کا فریضہ عائد ہوا تو سن لو ابھی سے، تفصیل بعد کو سنا ابھی سے نتیجہ سن لو کہ جب فریضہ عائد ہوتو ''تَوَلَّوْا'' جتنے تھے، سب نے پیٹھ پھرائی، ''اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ'' سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے۔ قلیل خود بھی کم ہے اور قلیلا میں ترمیم تقلیل آئی ہے کہ کم اور بہت ہی کم۔ سب کے سب نے پیٹھ پھرائی، سوائے بہت کم کے۔ اور بہت ہی کم کے سوا ان میں سے۔ اب مسلمان یہیں بتادیں کہ حق ان کم کے ساتھ تھا یا زیادہ کے ساتھ تھا؟

''تَوَلَّوْا'' سب نے پیٹھ پھرائی، ''اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ'' سوائے بہت تھوڑے آدمیوں کے،

وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ

''اور اللہ ظالموں کو پہلے سے جانتا تھا''۔

یعنی میدانِ جنگ سے فرار کرنے والوں کو اللہ نے ظالمین کا لقب دیا اور بلا تبصرہ قرآن کی ایک آیت یاد کر لیجئے:

''لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ''۔

''میرا عہد ظالموں کو کبھی نہیں پہنچتا''۔

آیت اتنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی تو روداد پوری مکمل جیسے ہم نے سن لی ہوتی کہ خود مطالبہ کیا اور متنبہ بھی کر دیا گیا۔ خطرہ کا اظہار کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جتنے تھے، سب روگرداں ہو جائیں۔ ہم کو بصیرت اتنے میں بھی حاصل ہو جاتی مگر نہیں، زحمتِ انتظار کو ختم کرنے کیلئے یہ نتیجہ سنا دیا گیا۔ لیکن ابھی واقعہ بیان کرتا ہے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے لئے سردار مقرر کر دیجئے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط

ان کے نبی نے یہ کہا کہ سنو! تم نے خود درخواست کی ہے تو تمہاری دعا قبول کی جاتی ہے، تمہاری عرضداشت منظور کی جاتی ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو سردار مقرر کیا ہے۔

بس جناب! خود ہی تو کہا تھا کہ مقرر کروا دیجئے اور اب جو نامزدگی ہوئی تو بُرا ماننے لگے یعنی اگر کہہ دیا جاتا ہے کہ تم اپنی پسند کا سردار مقرر کر لو تو خوش ہو جاتے۔ نہیں اُدھر سے نامزدگی ہو گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ

تمہارے لئے طالوت کو سردار اس نے مقرر کر دیا۔ تو اب کہنے لگے:

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا

اس کو ہم پر سرداری کا حق کہاں سے ہو گیا؟

وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

اور ہم اس سے زیادہ سرداری کے حقدار ہیں۔"

دیکھئے! عہدہ کی جاذبیت کیا کرواتی ہے۔ اب ماضی کو نہ دیکھئے۔ جب تک عہدہ کا سوال بیچ میں نہ آیا، کیسے اطاعت گزار ثابت ہو رہے تھے، کیسے سعادت مند نظر آ رہے تھے۔ "اَنّٰى يَكُوْنُ"۔ "اَنّٰى" کے معنی "مِنْ اَيْنَ" کے ہوتے ہیں۔ کہاں سے اس کیلئے سرداری ہو گئی اور:

وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

اور ہم اس سے زیادہ سرداری کے حقدار ہیں۔

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ

ارے اس کے پاس پیسہ تو ہے ہی نہیں، مفلس آدمی ہے اور وہ سردار بنے گا ہمارا؟

یہ مفلسی کا سوال تو پیغمبر خدا کے مقابلہ میں اٹھایا جاتا تھا۔ وہ بھی قرآن میں ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝

آخر یہ قرآن مکہ اور مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُترا۔ یہ بڑے آدمی کا محاورہ اتنی مسافت طے کر کے نہ جانے کن کن راستوں سے ہم تک بھی پہنچ گیا کہ ہم دولت مندوں کو بڑا آدمی کہتے ہیں۔ یہی ہماری زبان کا جزو ہے۔ یہ ان کی زبان تھی کہ انہوں نے کہا کہ یہ مکہ اور مدینہ کے کسی لکھ پتی، کروڑ پتی پر کیوں نہ اُترا۔ اگر اس پر اُترتا تو ہمیں ماننا آسان ہو جاتا کیونکہ ہماری طبیعت میں دولت مندوں کے سامنے ہی جھکنا ہے۔ یہ اس نے منتخب بھی کیا وہاں کہا گیا:

وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ

اسے پیسے میں وسعت تو دی ہی نہیں گئی ہے۔ دولت تو اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ تو اب پیغمبرؑ نے جواب دیا۔ تین

ٹکڑے ہیں:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ

یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ نے اس کو منتخب کیا ہے۔ کہاں سے حق ہوا؟ اللہ کی طرف سے ہوا۔ اللہ نے اسے منتخب کیا ہے۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہی نے تو کہا تھا کہ اللہ سے منتخب کروا دیجئے۔ اس نے منتخب کیا۔ اب یہ جو ہے کہ پیسہ نہیں ہے، اس کے مقابل میں کہا جا رہا ہے کہ اللہ نے بلاوجہ منتخب کیا ہے:

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ

اللہ نے اس کو علم اور جسمانی طاقت یعنی شجاعت میں فوقیت دی ہے۔ یعنی پیسہ نہ دیکھو، علم کی دولت دیکھو، شجاعت دیکھو۔ اب کسی کے مقابلہ میں دنیا کہے کہ پیسہ نہیں تھا، کسی کے مقابل میں کہے کہ زر کم ہے، اس سے کچھ نہیں بنے گا، علم کو دیکھئے اور شجاعت کو دیکھئے کہ کتنی ہے۔

اور ابھی تو شخصی حکم تھا کہ اس کو منتخب کیا اور اس کی وجہ بتائی کہ کیوں منتخب کیا! رسول کا اعلان:

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

یہ اختیار اللہ کو ہے کہ وہ اپنی طرف سے اقتدار کو جسے چاہتا ہے، عطا کرتا ہے۔ اس میں دوسروں کی رائے کا دخل نہیں ہوا کرتا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور اللہ قادر بھی ہے اور علیم بھی ہے۔

یعنی بلاوجہ انتخاب نہیں کیا کرتا۔ کچھ ہوتی ہیں وجوہ اختیار جس کی بناء پر وہ انتخاب کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد مزید اطمینان کیلئے کہا جاتا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ

دیکھو! اس کی، اللہ کی طرف سے سرداری کی نشانی یہ ہے۔ قرآن کی زبان میں معجزے کو آیت کہا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، میں تمہیں بتاتا ہوں ایک معجزہ، وہ دلیل ہوگا اس کی کہ اس کو اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی سرداری کی اُدھر کی طرف سے علامت اور پہچان یہ ہے کہ تابوت سکینہ آئے گا۔ تابوت سکینہ میں الواح توریت تھے اور تبرکات انبیاء تھے۔ یہ سب جب بیت المقدس پر بت پرستوں کا حملہ ہوا تو لوٹ لیا گیا تھا۔ چنانچہ ریت بھی غائب ہو چکی تھی۔ مدتوں پتہ ہی نہیں چلا کہ توریت کیا ہوئی؟ اس لئے کہ

پورا صندوق ہی لے جایا گیا تھا اور کئی سو برس وہ غائب رہا۔ پتہ نہیں چلا کہ اس کا کیا ہوا؟ انہوں نے معجزہ یہ بتایا، ثبوت انتخاب الٰہی یہ بتایا کہ وہ تابوت یا صندوق جو تمہارا گم شدہ ہے، وہ تمہارے پاس آجائے گا اور اس میں سکون کا سرمایہ ہوگا تمہارے پروردگار کی طرف سے اور جتنا بچا کھچا سرمایہ ہے، آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کا۔ تبرکات جتنے رہ گئے ہیں، وہ تابوت کے اندر تم تک پہنچ جائیں گے اور اُسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ کوئی آدمی کا ذریعہ نہیں ہوگا۔

اتنا نمایاں معجزہ ہے۔ اس سے علمائے اسلام کے درمیان کی، علم کلام کی ایک بحث طے ہو جاتی ہے کہ پتہ چلتا ہے کہ معجزہ انبیاء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جو اُدھر کا عہدہ ہو، اس کیلئے معجزہ ہوتا ہے۔

ملائکہ اُسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ کوئی آدمی نظر نہ آئے تو مان لیں گے کہ ملائکہ آرہے ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ واقعی ملائکہ انہیں نظر آئے تھے یعنی وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ عام انسان نہیں ہیں جو لا رہے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ

اس میں تمہارے لئے نشانی ہے۔ ایک نمایاں معجزہ ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اگر تم صاحبانِ ایمان ہو۔ یعنی اب ان کا ایمان اس کے تسلیم کرنے اور صبر کا کردار برقرار رکھنے سے وابستہ ہے۔ اتنا معجزہ بھی دیکھ لیا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی ہے کہ ایسے ایسے بیانات رسولؐ سے دنیا نے سنے اور ایسے ایسے رسولؐ کے ثبوت حقانیت دیکھے اور پھر بھی راہِ راست سے منحرف ہوئے۔ جب قرآن مجید کی روشنی میں دیکھا کہ ہوا ہے ایسا تو پھر حیرت باقی نہیں رہتی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ

جب طالوت افواج کو لے چلے۔ ماشاء اللہ مجاہدین کی کثرت وہ ہے فوج نہیں ہے۔ قرآن کی زبان میں افواج ہے۔ بلند ایک فوج کو کہتے ہیں اور یہاں جنود ہے۔ جب طالوت لشکروں کو لئے ہوئے، فوجوں کو لئے ہوئے روانہ ہوئے تو پہلے ایک آزمائش کا اعلان کر دیا کہ ایک تمہارا امتحان ہونا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک نہر سامنے بہہ رہی ہوگی۔ امتحان یہ ہے کہ اس کے پانی کو پینا نہیں۔ گویا تمہارا امتحان عطش ہوگا۔ باوجود نہر کے سامنے ہونے کے:

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ

جو اس میں سے پی لے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ جو اس میں سے پی لے گا، کچھ بھی تو مجھ سے اس کا کوئی ربط نہ ہوگا۔

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ

جو بالکل نہیں پئے گا، وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہوگا۔ قرآن کا جملہ میں پڑھوں گا اور مستقبل کے کردار کا مرقع آپ کی نظروں کے

سامنے پھر جائے تو میں کیا کروں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پتے نہیں، سوا اس کے کہ چلو میں پانی لے کر پھینک دے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ

سب نے پانی پی لیا، سوائے کم بہت ہی کم لوگوں کے۔ انہی سے پتہ چل گیا مستقبل کے نتیجہ کا جو پہلے اعلان ہو چکا:

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ

جب وہاں سے آگے بڑھے وہ، یعنی طالوت اور جواُن کے ساتھ اہلِ ایمان تھے تو ان سب نے کہا:

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ

مقابل کا نام جالوت تھا۔ اسی کے وزن پر ادھر والے کا نام طالوت ہو گیا تھا۔ پس انہوں نے کہا کہ ہم میں طاقت نہیں ہے جالوت اور اس کے ساتھ والوں سے مقابلہ کرنے کی۔

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ

ان لوگوں نے جنہیں کچھ گمان تھا کہ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری جماعت کو تو تصور ہی نہیں تھا کہ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ ان لوگوں نے جن کو گمان تھا کہ وہ اللہ سے ملاقات کریں گے، وہ جو اللہ کو منہ دکھانے کا ذرا تصور رکھتے تھے، انہوں نے یہ کہا:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

ارے بھئی ہمت کیوں ہارتے ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تھوڑی سی جماعت ہو اور وہ کثیر جماعت پر غالب آجائے اللہ کے حکم سے اور اصل ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ

جب جالوت اور اس کا لشکر نکلے تو اب جماعت نے جو ثابت قدم تھی اور کہہ رہی تھی کہ کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں پر غالب آسکتے ہیں، انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیئے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

پروردگارا! ہم پر اپنی طرف سے صبر انڈیل دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کی قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔ اس چھوٹی سی جماعت کے ثباتِ قدم کا نتیجہ یہ تھا کہ:

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ڐ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

اللہ کے حکم سے ان کو شکست دے دی۔ حضرت داؤدؑ جالوت کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے۔

اب نتیجہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے کہ مجھے نبی تو مل گیا، وہ جماعت نہیں ملی۔ اب میں نے خیال کیا کہ یہ نبی تو ایسے تھے کہ ان کا نام تک ہمیں نہیں معلوم۔ نبی تھے اور رسول ہونا بھی اس معنی سے نہیں ثابت۔ اگر کوئی رسول ہو، اولوالعزم ہو تو وہاں وہ جماعت بھی دستیاب ہو گی۔ میں نے مزید ورق گردانی کی تو بہت زیادہ ورق نہیں الٹنے پڑے۔ اب مجھے حضرت موسیٰؑ مل گئے۔ میں نے کہا کہ یہ تو کلیم اللہ ہیں، اولوالعزم ہیں، صاحبِ شریعت و کتاب ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ کی جماعت تو اس معیار پر ضرور ہو گی کیونکہ جتنا بڑا رسول ہو، ویسے ہی گویا اس کے ساتھ والے ہوتے ہیں۔

یہ حضرت موسیٰؑ ہیں۔ ان کا کیا کہنا تو ان کے ساتھ کی جماعت کا کیا کہنا۔ لیکن اب قرآن مجید کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اُسے بھی قرآن نے تفصیل سے پیش کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جن کے اچھے اوصاف ہوں، ان کا ذکر کرنے سے فائدہ ہے لیکن کوئی کیسا تھا، اس کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ ایسے تاریک مرقعوں کو قرآن زیادہ پھیلا کر بیان کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے اس میں درس زیادہ ہے کہ آدمی ایسوں سے بچنے کی کوشش کرے۔

ہمارے قبلے بیت المقدس پر اس وقت بھی دوسروں کا قبضہ تھا۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ موسیٰؑ نے اپنے ساتھ والوں سے کہا:

ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ

دیکھئے! یہاں ان کی ہمت ڈھارس اور اطمینان بلند کرنے کے سامان کیے گئے ہیں کہ انہیں پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ آخر میں قلم تقدیر جاری ہو چکا ہے۔ آخر میں وہ زمین تمہارے قبضہ میں آئے گی۔ بس تمہارا کام یہ ہے کہ داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس میں۔

الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ

جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے۔

فیصلہ تقدیر کا اعلان کر دیا۔ اگر علم غیب نہ ہوتا تو اعلان کیونکر کرتے؟ فیصلہ تقدیر کا۔ مگر شرط یہ ہے:

لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ

دیکھو! پچھلے پاؤں پلٹنا نہیں، فرار نہ کرنا۔ اگر فرار ہوئے تو اللہ کو وعدہ یاد دلا کر شکوہ نہ کرنا کہ تو نے یہ وعدہ کیا تھا، یہ بجلی ہمارے خرمن پر کیوں گری؟ تو پچھلے پاؤں پلٹ نہ جانا، فرار نہ کرنا۔ مطلب وہی ہے۔

فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢١﴾

ورنہ پھر گھاٹا ہو گا، ورنہ پھر خسارہ ہو گا، خرمن پر بجلیاں گریں گی۔ یہ اعلان کر دیا کہ جاؤ، داخل ہو جاؤ۔ مگر یہ چلے تو کیا ہوا؟ حضرت موسیٰؑ سردار ہیں اور ان کے ہمت بڑھانے سے آگے بڑھے ہیں بیت المقدس کے بارے میں پتہ کرنے کیلئے۔ وہاں پہنچے تو وہاں کے قدآور آدمی نظر آئے تو کہنے لگے کہ جناب! یہ تو بہت ہی قدآور لوگ ہیں۔ ہمیں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

"وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا".

انہوں نے کہا تھا کہ داخل ہو جاؤ۔ پھر وعدہ کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں فتح دے دے گا۔ مگر وہ کہتے ہیں "لَنْ نَّدْخُلَهَا" ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے۔ "حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا"، جب تک وہ نکل نہ جائیں۔

سبحان اللہ! جہاد کرنے لگے ہیں، یہ عجیب داخل خارج ہے کہ وہ خارج ہو جائیں تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ یعنی مال غنیمت لوٹنے میں ہم آگے بڑھ جائیں گے۔

"فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ".

اگر وہ نکل جائیں گے تو یقین مانئے کہ ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ بڑا کارنامہ کریں گے۔ وہاں تو پھر بھی قرآن نے کچھ پردہ رکھا تھا کہ "اِلَّا قَلِيْلًا"۔ سوائے تھوڑے سے، بہت ہی کم سہی لیکن خیال ہوتا ہے کہ جب افواج تھیں تو کم بیس ہو سکتے ہیں، تیس ہو سکتے ہیں، پچاس ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی کم اور بہت کم ہوئے لیکن یہاں تو قرآن نے شمار کر کے بتا دیا ہے کہ:

"قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ".

صرف دو عدد آدمیوں نے جو اللہ کا خوف رکھتے تھے، یعنی پوری جماعت اللہ کا خوف نہیں رکھتی تھی۔

"قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ".

کہا دو آدمیوں نے، جو اللہ کا خوف رکھتے تھے۔

"اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا".

جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ قرآن کی تفسیر نہیں کر رہا ہوں کہ تفسیر بالرائے ہو مگر ایک آیت سے دوسری آیت یاد آ جائے تو کیا کروں کہ قرآن نے ان دو کو کہا ہے کہ جن پر نعمت اپنی خاص اُتاری تھی۔

اب ہم دعا کرتے ہیں سورہ حمد میں:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

راستہ ان کا جن پر تو نے اپنی نعمت اُتاری ہے۔ تو ہم تو ثابت قدم لوگوں کو سمجھتے ہیں کہ ان پر اللہ کی نعمت ہے۔ انہی کے ساتھ ہونے کی دعا کرتے ہیں۔

دو آدمیوں نے، جو اللہ کا خوف رکھتے تھے، اور جن پر ہماری نعمتِ خاص ہوئی تھی، انہوں نے کہا کہ تم آگے تو بڑھو۔

اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ

دروازہ کے اندر تو داخل ہو۔

فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ

ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارا ہی ہوگا یعنی نبی کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ دو آدمی تھے صرف جو یہ کہہ رہے تھے:

فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾

اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم مومن ہو۔ مگر ان بیچارے دو کی صدا، صدا بصحرا ہو گئی اور انہوں نے وہی کہا، جو پہلے کہا تھا اور بڑے دل شکن انداز میں یعنی گستاخی کی پیغمبر کے ساتھ اور خدا کے ساتھ۔ انہوں نے کہا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى إِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ أَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا

پورے عزم بالجزم کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ ہم ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس میں ہیں، اس وقت تک ہم داخل نہیں ہوں گے۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ

نبی سے رسول کہہ رہے ہیں کہ آپ جائیے اور آپ کا پروردگار چلا جائے یعنی نہ وہ ان کو رسول مان رہے ہیں، نہ اسکو پروردگار مان رہے ہیں۔ بس وہ انبی کا، حضرت موسیٰ کا پروردگار ہے۔ آپ اور آپ کا پروردگار دونوں چلے جائیے۔ ''فَقَاتِلَا'' ۔بس آپ دونوں جنگ کر لیجئے، آپ قتال کر لیجئے۔ ہم یہیں پر ''قَاعِدُوْنَ'' ہم یہیں پر بیٹھے ہوں گے۔ یہ دل شکن طرز تخاطب وہ تھا کہ رسول کا دل ٹوٹ گیا اور بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیے اور خدا سے یہ کہا:

قَالَ رَبِّ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِيْ وَأَخِيْ

اے پروردگار! تو دیکھ رہا ہے انہیں مجھے قابو نہیں ہے۔ سوا اپنے نفس کے اور اپنے بھائی کے۔

معلوم ہوا کہ جب دنیا پلٹ گئی تب بھی بھائی ساتھ رہا۔

مجھے نہیں قابو کسی پر بھی سوا اپنے بھائی کے۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٥﴾

بس تو ہی اب فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور اس فاسق گروہ کے درمیان۔ شروع میں اللہ نے خالفین کا لقب دیا تھا اور اب دوسرا تحفہ ملا، رسول کی زبانی فاسقین کا اور اگر خالق ایسے لوگوں کو فاسقین کہہ رہا ہے، کوئی پوری جماعت کو عدول کہہ دے کہ سب عادل ہیں تو وہ اپنے فیصلے کا ذمہ دار ہے۔ میں نے پھر تلاش کر ڈالا، نہ کہیں جنگ کا مجھے ذکر ملا کسی نبی کے بیان میں اور جب جنگ کا ذکر نہیں ملا تو وہ جماعت مجھے کہاں ملتی؟ تو کیا کروں کہ الفاظ قرآنی تو تشنہ تصدیق عمل رہے۔ اس نے ایک اوصاف کا مرقع پیش کیا۔

نبی مجھے ملا مگر جماعت نہیں ملتی۔ تو وہ جماعت کونسی ہے جس کے اوصاف یہاں بیان کئے۔ مایوس ہوا۔ جس دور کی تاریخ ہے ہی نہیں، اس کی تلاش کیسے کروں؟ جہاں سے تاریخ ملی، اسے تلاش کیا تو قرآن میں جماعت نہیں ملی۔ تاریخ میں مل گئی۔ اب وہاں جماعت نظر آرہی ہے تو نبی نظر نہیں آتا۔ اب اگر قرآن کو ماننا ہے اور ان اوصاف کے مصداق اکمل کو مشاہدہ کے طور پر ایک جماعت میں آپ دیکھ رہے ہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ چاہے نبی سامنے نظر نہ آرہا ہو، مگر جماعت وہ یہی ہے جو نبیوں کی ساتھی ہے۔ وہ نبی نہیں ہیں مگر جس کے ساتھ ہے، وہ نمائندہ قوم انبیاء کا ہے۔

ہر متن قرآن کی شرح مجھے مل جائے گی۔ جب اس جماعت کے کردار کو دیکھو گا۔ اس نے کہا تھا جو مصائب آئیں راہ خدا میں، اس کی وجہ سے عمل میں سستی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ مصائب تو تعداد میں ایسے ہیں، بے سروسامانی ہے۔ سب ایک طرف۔ پانی بند ہو گیا مگر ان کی قوت عمل میں کوئی سستی پیدا نہیں ہوئی۔ جو اللہ کی راہ میں ان کو مصیبت پیش آ گئی، اس سے ان میں سستی پیدا نہیں ہوئی اور ''مَا ضَعُفُوْا''، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہتر 72 کو فوج کیوں کہا جاتا ہے۔ کہیں بہتر (72) کی فوج ہوتی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ مولاؑ اگر ان کو فوج نہ سمجھتے تو ترتیب لشکر کیوں کرتے؟

21

یقین کی آخری منزل

ہر میدان میں پیغمبرؐ اسلام کو ہر غزوہ میں بلا مزاحمت فتح ہی ہوتی چلی جائے تو سب مجاہدین برابر کے بہادر ہیں جو حقیقی بہادر ہے اس کا تعارف تو نہیں ہو سکتا لہٰذا ضرورت ہے کہ کوئی کٹھن وقت آئے اور کوئی سخت حالات کا جھونکا چلے کہ جس سے پتہ چل سکے کہ اصلی صابر اور بہادر کون ہے۔

ایک مشاورتی اجتماع ہوتا ہے اور اس میں طے ہو جاتا ہے کہ اس مقرر کردہ رات کو پیغمبرؐ اسلام کی شمع زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو بارگاہ رسالت میں بلوایا گیا اور جو صورت واقعہ تھی وہ بیان کی گئی کہ خالق کی طرف یہ اطلاع آئی ہے کہ میرے قتل کے ارادہ سے میرے مکان کا محاصرہ ہوگا اور خالق کی ہدایت پر میں چلا جاؤں اور تمہیں میری جگہ پر میرے بستر پر سونا پڑے گا۔

ارے لیٹو، چادر رسول اوڑھو، بستر رسول پر لیٹو، رسول نما ہو کر لیٹو۔

مثل مشہور ہے کہ جب گہری نیند کسی کو آئے تو کہتے ہیں کہ گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں میں کہتا ہوں جو گھوڑے بیچ کر سوئے وہ تو گہری نیند سوئے گا اور جو جان بیچ کر سوئے؟

یقین کی آخری منزل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿٭ۖ﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿ۚ۲۸﴾ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ﴿ۙ۲۹﴾ وَ ادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴿۳۰﴾

سورۂ فجر کی آخری آیت ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اے اطمینان سے بھرے ہوئے نفس! پلٹ آ اپنے پروردگار کی طرف، اس حالت میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ تو داخل ہو جا میرے بندگانِ خاص میں اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

اطمینان کے مقابل چیز ہے اضطراب۔ ہم چونکہ جوہر اطمینان سے ناشناس ہیں، اس لئے اطمینان کے تقاضوں کو ہم اتنا واضح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ اضطراب ہم کو درپیش ہوا کرتے ہیں، اس لئے اضطراب کے تقاضوں کو ہم زیادہ واضح طور پر بیان کر سکتے ہیں اور چونکہ اطمینان اس کے مقابل چیز ہے، لہٰذا اضطراب کے تقاضوں کے تصور سے ہم اس کے مقابل کے اطمینان کے تقاضوں کو محسوس کر سکتے ہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ پرسکون حالات ہوں تو اضطراب کا سوال نہیں ہوتا۔ آرام ہے، آسائش ہے، کوئی خطرہ نہیں ہے، مصیبت درپیش نہیں ہے۔ کوئی اندیشہ فردا نہیں ہے۔ تو امتیاز ہی نہیں ہو سکتا کہ کون مضطرب ہے اور کون مطمئن۔ اس لئے کہ سبب اضطراب کوئی نہیں ہے۔ تو سب ہی مطمئن ہیں۔ جس طرح سے کہ صبر اور عدم صبر۔ صابر او غیر صابر کا امتیاز نہیں ہو سکتا جب تک کہ مصیبت نہ آئے۔ جب مصیبت آئے ہی نہیں تو ہر ایک کو صبر کا دعویٰ کرنے کا حق ہے۔ ہر ایک کہے کہ میں بھی میدانِ صبر میں کوئی پیچھے رہنے والا نہیں ہوں۔ لیکن جب مصیبت آئے اور پھر آدمی صبر کرنے والا ثابت ہو اور پھر کوئی بے صبرا ثابت ہو، تب امتیاز ہو گا صابر اور غیر صابر میں۔

اسی طرح ہر میدان میں پیغمبرؐ اسلام کو، ہر غزوے میں بلا مزاحمت فتح ہی ہوتی چلی جائے تو سب مجاہدین برابر کے بہادر ہیں۔ جو حقیقی بہادر ہے، اس کا تعارف تو نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ کوئی کٹھن وقت آئے۔ ضرورت ہے کہ کوئی سخت حالات کا جھونکا ایسا چلے کہ جس میں فرض کیجئے سو میں سے پچاس کے قدم اکھڑ جائیں تو ان سو میں امتیاز ہو جائے گا۔ سو میں جو صابر ثابت ہوئے ہیں، سو میں سے پچاس۔ اس طرح امتیاز ہو جائے گا کہ کون ثابت قدم اور کون غیر ثابت قدم۔

اب فرض کیجئے کہ علم الٰہی میں ان پچاس میں سے چند ہیں جو ثابت قدم ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ وقت زیادہ کٹھن ہوتا کہ ان میں جو ممتاز ہیں، وہ آنکھوں کے سامنے آ جائیں اور اب بھی اگر دس بیس میں مشترک ہے ثبات قدم تو ان میں جو ممتاز ہے، وہ ابھی پردے میں ہے۔ لہٰذا کچھ اور سختی وقت میں اضافہ ہو، تب ان میں سے بھی بہت سوں کے قدم اُکھڑ جائیں۔ یہاں تک کہ صفحہ میدان سادہ ہو جائے اور بس ایک فرد رہ جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ فرد فرید ہے۔ پھر ملک کو بھی کلمہ پڑھنا پڑے گا:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیْ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"۔

اسی طرح اضطراب اور اطمینان میں فرق کیسے ہو سکتا ہے! اگر بالکل متوازی حالات رہیں اور بالکل ہی خوشگوار ماحول ہو اور کوئی وجہِ اضطراب نہ ہو تو اطمینان کا سوال ہی نہیں۔ اطمینان تو اُسی وقت نمایاں ہو سکتا ہے جب اسبابِ اضطراب ہوں اور کوئی مضطرب نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اندھا ہونا صرف بصارت نہ ہونے کا نام ہے تو یہ دیوار کیوں اندھی نہیں کہلواتی۔ دیوار میں بھی تو بصارت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اندھا ہونا صرف بصارت نہ ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ ایسا جس میں بصارت ہو، ہونا چاہئے اور پھر بصارت نہ ہو، تب وہ اندھا ہے۔

ویسے ہی اگر پرسکون حالات ہیں، اس وقت تو سب ہی ٹھہرے ہوئے ہیں، سکون ہیں۔ سب ہی کے دل قرار کے ساتھ ہیں۔ کسی کا دل پریشان نہیں ہے۔ اس وقت کہاں پتہ چلے گا کہ کون مطمئن ہے۔ نہیں! جس وقت میں کہ ایسے حالات ہوں کہ جن کی وجہ سے اضطراب ہونا چاہئے اور پھر کسی میں اضطراب نہ ہو تو پتہ چلے گا کہ وہ مطمئن ہے۔

اب اضطراب کے تقاضے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں۔ اسی سے سمجھئے گا کہ جو مطمئن ہوگا، اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ ایک پریشانی کی منزل آئی یعنی مشکلات درپیش ہوئیں اور انسان نے سوچنا شروع کیا کہ یہ جو مشکلات درپیش ہوئیں تو کیا کرنا چاہئے؟ اگر ایک دو دن میں، ہفتہ دو ہفتہ میں کچھ سمجھ میں آ گیا تو خیر اور اگر سمجھ میں نہ آیا تو کچھ ہمدرد جن کی عقل اور سوچ پر بھی بھروسہ ہے، ان کو جمع کیا، ان کے سامنے اپنی مشکل پیش کی اور ان سے کہا کہ آپ افراد میرے ہمدرد بھی ہیں اور صاحبانِ عقل و ہوش بھی ہیں، آپ بتائیے کہ اس مشکل کا کیا حل ہے؟ کیا صورتِ عمل اختیار کی جائے؟

یہ دوسری منزل ہے جو اضطراب کی صورت میں طے کی جائے گی۔ اب فرض کیجئے کہ انہوں نے کوئی رائے دی اور وہ مشکل ابھی حل نہیں ہوئی ہے تو نیند اُڑی ہوئی ہے، سو نہیں سکتے۔ رات جاگ کر بسر ہو رہی ہے۔ یہ تیسری علامتِ اضطراب ہے۔ وہ سوچ میں وقت گزارنا پہلی علامتِ اضطراب تھی۔ دوسری علامتِ اضطراب کچھ لوگوں کو بلا کر مشورہ کرنا کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ تیسری منزل ہے کہ جب مصیبت آ گئی تو راتوں کو نیند اُڑ گئی۔ اب ایک ایک سے اپنی مصیبت بیان کر رہے ہیں۔ شاید کہیں سے کوئی روشنی کی کرن آ جائے اور کوئی کسی طرح کی مدد دے سکے۔ یہ اضطراب ہر ایک محسوس کر سکتا ہے۔ اب اگر ماحول ایسا ہے کہ جس میں اضطراب ہونا چاہئے اور چونکہ ہماری طبیعت میں اضطراب ہے، تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ محلِ اضطراب ہے اور پھر کوئی مطمئن نظر آئے، مطمئن نظر آئے یعنی یہ باتیں نہ کرے۔ اسے سوچنے کیلئے مہلت کی ضرورت نہ ہو بلکہ بغیر زحمتِ تفکر کے راہِ عمل متعین ہو، معلوم ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن ایک جادے پر مطمئن ہے۔ تزلزل اُسے ہو جسے احساسِ فرض میں تردد ہو اور جسے ایک فرض ادا کرنا ہے، اُسے پھر تردد میں وقت گزارنا کیسا؟

تو وہ کوئی وقت تردد میں نہیں گزارے گا کہ کیا کریں۔ معلوم ہے کہ یہ کرنا چاہئے۔ تو اب وقت کی ضرورت کیا ہے؟ اس فکر میں کہ کیا کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہوا، معلوم ہوا کہ یہ مطمئن نہ تھا۔ اچھا صاحب! دوسری منزل کہ خود سمجھ میں نہیں آیا تو ہمدردوں سے مشورہ لیا۔ دیکھا کہ نہیں، یہ شخص تو دوسروں سے مشورہ بھی لیتا کیونکہ مشورہ وہ لے جسے اپنے زاویہ نظر کی حقانیت میں شک ہو اور جب اسے معلوم

ہے کہ مجھے کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے تو وہ دوسروں سے مشورہ کیوں لے؟ اور اگر کچھ لوگ بنظر ہمدردی یا مظاہرہ ہمدردی کیلئے رضا کارانہ طور پر از خود آ کر مشورے دیں تو وہ ان مشوروں پر عمل بھی نہ کرے۔ چاہے دنیا مدتوں تک کہتی پھرے کہ بڑا ضدی آدمی تھا کہ بس جو طے کر لیا، وہ کیا۔ حالانکہ فلاں نے یہ مشورہ دیا تھا، فلاں نے یہ مشورہ دیا۔ ایسے ایسے صاحبانِ عقل اور ہمدرد، انہوں نے یہ مشورے دیئے اور انہوں نے عمل نہ کیا تو حضور! وہ ان مشوروں پر عمل اُس وقت کرتا جب اُسے اپنے موقف کی حقانیت پر شک ہوتا۔

مشورے دیا کریں لوگ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ احساسِ اضطراب کر رہے ہیں جو مشورے دے رہے ہیں اور جو مشورہ نہیں لے رہا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اطمینان سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو اضطراب ہے ہی نہیں کہ وہ مشورہ لے اور یہ مشورے دے رہے ہیں۔ تو بر بنائے تخیل اضطراب دے رہے ہیں۔ تو وہ ان مشوروں پر عمل کیوں کرے؟

اب ظاہر ہے کہ مشورے نہیں لئے اس نے تو اس سے متعلق کیا ہر ایک شخص دوسرے سے شکوہ نہیں کرے گا؟ ایک دوسرے سے دکھڑا نہیں روئے گا؟ ایک دوسرے سے اس مصیبت کا تذکرہ نہیں کرے گا کہ یہ مصیبت آئی ہے اور وہ دیکھو کتنی مشکل مجھے پیش آ گئی ہے۔ اب یہ کردار وہ ہو گا جس کو ہم نے اضطراب کے تقاضوں کی بناء پر پہلے سمجھ لیا تھا۔ اب ہم یہ سمجھے کہ یہ اطمینان کے تقاضے ہیں۔ بس اب جبکہ آپ کے سامنے اضطراب کے تقاضے پیش کر چکا اور اس کے مقابل اطمینان کے تقاضے تو دو مواقع پیش کرتا ہوں۔ ایک موقع کو سمجھ لیجئے فضائل اور ایک موقع تمہید ہو گا مصائب کی۔

پہلا موقع تو یہ ہے کہ ایک مشاوراتی اجتماع ہوتا ہے اور اس میں طے ہو جاتا ہے کہ اس مقرر کردہ رات کو پیغمبر خدا کی شمع زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب مجلس مشاورت تھی تو طرح طرح کی آراء دی گئیں۔ کسی نے یہ کہا کہ مشکل ہی کیا ہے، قتل کر دیا جائے۔ تو کسی دوسرے صاحب فکر نے کہا کہ بنی ہاشم کی تلوار معلوم ہے؟ مدتوں خون کا بدلہ لینے میں سلسلہ جدال وقتال جاری رہے گا۔ لہٰذا گویا یہ رائے مسترد کر دی گئی۔ اس نے کہا کہ چلو قتل نہ کرو کہ بدلہ لینے کیلئے سلسلہ جنگ شروع ہو جائے گا۔ قید کر دیا جائے، بند کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ بنی ہاشم چھڑوا کر لے جائیں گے، یعنی بنی ہاشم سے لوگ پہلے سے متاثر تھے تو پھر کیا کیا جائے؟ ایک بہت ہی لال بجھکڑ قسم کا آدمی کوئی تھا، جسے اس وقت تک لوگ پہچانتے بھی نہیں تھے، وہ کھڑا ہوا، تاریخوں میں یہ ہے کہ وہ ایک نجدی بوڑھا تھا۔ ایک شیخ نجد تھا۔ مؤرخین چونکہ اسلام کے مؤرخین ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شیطان اس لباس میں آیا تھا۔ یعنی شیطان کو بھی حلیہ یہی پسند تھا۔ بہر حال شیطان آیا ہو یا واقعی وہ شیخ نجد ہو، اُس نے جو رائے پیش کی، وہ پاس ہوئی۔

دو مواقع تاریخ میں ایسے ملتے ہیں جسے لوگ شیطان کے سر منڈھتے ہیں۔ ایک تو یہ جس نے یہ رائے دی، کہتے ہیں کہ شیطان تھا جو اس شکل میں آیا تھا اور ایک اُحد میں جس نے آواز بلند کی تھی کہ رسول قتل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ شیطان نے یہ آواز بلند کی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ جو ویسا کام کرے یا ایسی غلط آواز بلند کرے، وہ شیطان ہوا۔ بہر حال شیخ نجدی نے یا انسان یا شیطان نے یہ رائے پیش کی کہ کیوں کہتے ہو کہ بنی ہاشم بدلہ لیں گے۔ میں ترکیب بتاتا ہوں۔ مخالف تو بہت سے ہیں نا۔ سبھی مخالف ہیں سوائے بنی ہاشم کے۔ ہر قبیلہ کا ایک نمائندہ چنو اور ایک ایک آدمی جب ہر قبیلہ کا لو گے تو خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا۔ تو بنی ہاشم کس کس سے مقابلہ

کریں گے؟ یعنی اُس نے یہ اصول سب سے پہلے پیش کیا کہ بہت سے نمائندے مل کر اگر کوئی جرم کریں تو پھر وہ جرم ہلکا ہو جاتا ہے۔ جرم، جرم ہی نہیں رہتا۔ یہ رائے پاس ہوگئی۔ کیا کہنا، واہ واہ۔ سب کچھ طے ہوگیا۔

قرآن مجید نے اُسے "کید" سے تعبیر کیا ہے کہ انہوں نے اپنا منصوبہ بنایا۔ وہ سب اسی جماعت کے لوگ تھے، یہاں کا مخبر تو کوئی نہیں تھا۔ وہ رات قریب آگئی اور ان لوگوں نے پورا بندوبست کیا تھا کہ وہ راز باہر نہ جائے۔ مگر قدرت کی لاسلکی اور لاسلکی نہیں، تو جو اسی کی طرف کا قاصد ہے یعنی ملک آیا پیغمبر خدا کے پاس اور ان کا پورا منصوبہ آپ کو بتایا کہ آج رات کو آپ کی زندگی کا خاتمہ کرنے کیلئے تمام لوگ آئیں گے اور گھر کو گھیر لیں گے۔ اس کے بعد اس منصوبہ کا توڑ جس کو بلاغتِ قرآنی نے اسی لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ترکیب کی اور ہم نے اپنی ترکیب کی۔ جو لفظ ادھر صرف کیا گیا، وہی اپنی طرف صرف کیا ہے کہ انہوں نے:

"مَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا"۔

انہوں نے ایک ترکیب کی اور ہم نے اپنی ترکیب کی۔ تو جو کسی چیز کا توڑ ہو، وہ اسی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اصول بلاغت ہے۔ اب خالق نے کیا ترکیب کی اور ترکیب کا لفظ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک خفیہ شکل ہو کہ جس کو دوسرا محسوس نہ کرسکے۔ اسی کو "کید" یا مکر سے قرآن میں تعبیر کیا جاتا ہے۔

خالق نے کیا ترکیب کی؟ ارشاد ہوا کہ اب ہم آپ کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ آپ چلے جایئے اور یہ ہمارا ذمہ ہے کہ آپ کے جانے کی ان کو خبر نہیں ہوگی۔ یہ بات ہمارے ذمہ ہے، آپ چلے جایئے۔ مگر اپنے بستر پر علیؑ کو سلا جایئے۔ متفق علیہ ہے، ہر جگہ قول مل جاتا ہے کہ وہ نہیں وہ۔ مگر یہاں دنیائے تاریخ سنسان ہے۔ یہاں بس ایک ہی نام ہے۔ جو فرشتے نے نام لیا، وہی ہر مورخ نام لے گا کہ علیؑ کو اپنے بستر پر سلا جایئے۔ ترکیب قدرت کی طرف کی یہ ہے کہ رات بھر وہ سمجھتے رہیں کہ رسولؐ بستر پر ہیں اور اب اس نے ایک ذات کو منتخب کیا کہ ذات ایسی ہو جس پر رسولؐ ہونے کا دھوکہ ہو سکتا ہو۔

جنابِ والا! یہ تو پیغام خدا کی طرف سے پیغمبر خدا تک پہنچا۔ ان کو اگر خود عمل کرنا ہوتا تو کسی سے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس ہدایت کا جزو ایک دوسری شخصیت سے متعلق ہے۔ لہٰذا، دوسری شخصیت کو بلانا لازمی تھا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ بلائے گئے اور جو صورتِ واقعہ تھی، وہ بیان کی گئی کہ خالق کی طرف سے یہ اطلاع آئی ہے کہ گھیرا جائے گا یعنی مکان کا محاصرہ ہوگا، میرے قتل کے ارادہ سے، اور خالق کی ہدایت پر میں چلا جاؤں گا اور تمہیں اپنے بستر پر لٹا جاؤں گا۔ اب ہر دل و دماغ رکھنے والا آدمی غور کرے کہ یہ منزل تقاضائے اضطراب ہے یا نہیں؟ یہ صورتِ حال ایک عام انسان کیلئے اضطراب پیدا کرنے والی ہے یا نہیں؟ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ بڑا سخت محلِ اضطراب ہے۔

اب ایک لفظ میں اس محلِ اضطراب کو واضح کردوں کہ علیؑ عام حالت والے علیؑ ہوتے تو اتنے سخت خطرہ میں نہیں تھے جتنے رسولؐ بن کر لیٹنے میں خطرہ میں ہیں۔

ہم نے دنیا میں بھیس بدلتے ہوئے دیکھے ہیں مگر عموماً وہ بھیس بدلا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو۔ یہ نیا بھیس بدلنا دیکھا کہ جس

کے قتل کا منصوبہ ہے، اس کی چادر اوڑھی جائے۔ یہی کہہ دیتے کہ بستر پر لیٹ رہو مگر کھلے بندوں کہ ہر ایک دیکھ سکے کہ کون ہے؟ ارے لیٹو اور چادر رسولؐ اوڑھو اور بستر رسولؐ پر لیٹو۔ رسول نما ہو کر لیٹو۔

تو کتنا صبر آزما ہے۔ پھر یہ صبر آزما تو عام لفظ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اطمینان آزما محل ہے۔ اب اضطراب کے تقاضے تو عرض کر چکا۔ اتنی اہم اور خطرناک منزل۔ مجھے ملے کسی غلط سے غلط تاریخ میں۔ کسی دمشق کے کارخانے کی صحیح ڈھلی ہوئی۔ اگر چہ دعویٰ ذرا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہر غلط سے غلط بات خرمن احادیث میں مل جاتی ہے اور بنام صحاح ملتی ہے۔ مگر بعض جگہ سچائی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ جھوٹ کو قدم رکھنے کا موقع نہیں ملتا۔

تو صاحب! کوئی غلط سے غلط روایت نہیں ملتی کہ انہوں نے یہ سن کر کہا ہو کہ مجھے کچھ مہلت دیجیے سوچنے کیلئے۔ انکار نہ کرتے مگر کچھ مدت تو مانگتے، کچھ مہلت تو طلب کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوچنے کیلئے ہی سہی، مہلت طلب نہ کی۔ پھر اگر مہلت مل بھی جاتی تو پہلے خود سوچتے، پھر اس کے بعد یہ کوئی یک و تنہا اپنے گھر کے آدمی نہیں تھے، تین بھائی ان سے بڑے تھے اور ان سب میں دس برس کا فاصلہ۔ آپ سے دس برس بڑے عقیل۔ عقیل سے دس برس بڑے جعفر اور جعفر سے دس برس بڑے طالب، جن کے نام پر کنیت ہوئی ابوطالب۔ وہ سب میں بڑے۔ اب آپ عمر کا حساب کیجئے کہ یہ جب چوتھے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ طالب تو پیغمبر خدا کے ہم عصر تھے۔ یعنی بوقتِ بعثت حضور کی عمر چالیس برس اور طالب کی عمر بھی چالیس برس ہوسکتی ہے۔ ان سے چھوٹے جعفر رسولؐ سے دس برس چھوٹے، ان سے چھوٹے عقیل، رسول سے بیس برس چھوٹے، ان سے چھوٹے علیؑ، رسولؐ سے تیس برس چھوٹے۔

تیس برس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ جب پیغمبر خدا کی ولادت ہوئی، جناب آمنہ بنت وہب آپ کی والدہ ہیں تو جناب فاطمہ بنت اسد موجود تھیں۔ عموماً ایسے مواقع پر خاندان کی بزرگ جو خواتین ہیں، وہ آ جاتی ہیں۔ ولادت کے بعد جناب ابوطالب کے پاس گئیں تو انہوں نے کہا کہ آمنہ کہ ہاں ایسا بیٹا پیدا ہوا۔ جو شروع سے شکل وشمائل سے اندازہ ہوتا تھا، وہ بتایا کہ آمنہ کے ہاں ایسا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں کافی کلینی کی روایت ہے جو عرض کر رہا ہوں کہ جناب ابوطالب نے فرمایا: تیس برس اور صبر کرو تو ایسے ہی بچے کی میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں۔ اسی لئے آجکل کی متمدن دنیا میں لوگ اولاد کی تعداد کو محدود بنانا چاہتے ہیں۔ ہر ملک میں تمدن کی نشانی یہ ہے کہ اولاد کی تعداد کو محدود بنایا جائے۔ ہمارے ہاں ایک وقت میں دیواروں پر لکھا ہوتا تھا کہ ایک گھر میں تین بچے اچھے۔ اس کے بعد وہ مٹ گیا اور یہ نکلا کہ ہم دو ہمارے دو۔ بہت خوبصورت جملہ ہے، ہم دو ہمارے دو۔

میں نے کہا کہ بس! اس کے بعد منزل توحید ہے۔ یہ ہو گیا کہ تین سے بات چلی اور دو تک پہنچی۔ اس کے بعد ایک کی نوبت نہیں آئی کیونکہ ایک تک تو دنیا بہت دیر میں پہنچتی ہے۔ اب میں حقیقت تاریخی کی بناء پر عرض کرتا ہوں کہ یہ چوتھے فرزند ماں باپ کے، اور جو یہ ہیں، وہ کوئی قبل والا نہیں ہے۔ سب سے چھوٹے ہیں مگر فرد اکمل یہی، یعنی حاصلِ حیات ابوطالب وہی ہیں جو اپنے ماں باپ کی چوتھی اولاد ہیں۔ تو دنیا اگر اس نظامِ تمدن پر چلتی ہوتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا فرد اکمل کے فیض سے محروم رہ جاتی۔ یہ مشاہدہ سب سے بڑی دلیل ہے اس فلسفے کے بطلان کی۔ یعنی اس فلسفے نے یہ طے کیا ہے کہ قبل والے افراد کارآمد ہیں اور بعد والے بیکار ہیں۔ جب

ہمارے سامنے یہ ہے کہ اصل کام کا وہی آخری فرد ہے جس کو آنے سے آپ نے روک دیا، اپنے منصوبہ کی بناء پر تو ہم اس کی حقانیت پر کیونکر ایمان لائیں۔

غرض یہ کہ اتنے بھائی، سب سے بڑے طالب، ان سے چھوٹے عقیل۔ تو کسی اور سے رائے نہ لیتے، اپنے بھائیوں سے تو جمع کر کے رائے لیتے کہ یہ پیغام مجھے ملا ہے، آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ مگر یہ وہ کرتا جو مضطرب نفس رکھتا ہو۔ اس سے ہم واقف ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے۔ مگر یہاں ایک لمحے کی مہلت طلب نہیں کی جاتی۔ جب مہلت طلب نہیں کی جاتی تو نہ خود سوچنے کا سوال اور نہ رائے اور مشورہ کا سوال۔ بس جواب دینے سے پہلے ایک سوال کئے دیتے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ میرے بستر پر سو رہنے سے حضورؐ کی زندگی تو محفوظ رہے گی؟ پیغمبر خدا فرماتے ہیں کہ ہاں! خدا نے مجھ سے حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے یہ سوال کیا؟ مجھے تو اس حقیقت کے اظہار کیلئے یہی الفاظ ملتے ہیں کہ بس اپنی جان کی قیمت پوچھ رہے ہیں۔ پیغمبر خدا نے جب فرمادیا کہ ہاں! مجھ سے حفاظت کا وعدہ ہوا ہے۔ انہوں نے نہ اپنے لئے پوچھا تھا، نہ انہوں نے ان کیلئے بتایا۔ انہوں نے ان کیلئے پوچھا تھا کہ آپ کی زندگی تو محفوظ رہے گی؟ اور انہوں نے اپنے لئے فرمادیا کہ مجھ سے حفاظت کا وعدہ ہوا ہے۔ بس یہ سنتا تھا کہ سر سجدۂ خالق میں رکھ دیا۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، مدارج النبوۃ فارسی زبان میں ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ دنیا میں یہ سب سے پہلا سجدۂ شکر ہے جو اس موقع پر حضرت علیؑ نے کیا تھا اور شریعت اسلام میں سجدۂ شکر جزو مسنون ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ عمل ہیں جو بلند افراد کے کردار سے جزو شریعت ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلا سجدۂ شکر انہوں نے کیا۔ محدث دہلوی لکھ رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ شریعت میں جزو مسنون ہے۔ تو دو پہلو اس کے پیش کئے دیتا ہوں۔ یا تو یہ کہ لوح محفوظ میں یہ پہلے سے شریعت کا جزو تھا اور مانئے کہ علیؑ قبل از نزول قرآن دیکھ رہے تھے اور یا یہ مانئے کہ دیگر احکام قرآن صامت کے حکم سے ہیں اور یہ حکم قرآن ناطق کے حکم سے ہے۔

بہرکیف علیؑ کے کردار میں اضطراب کا پہلو نظر نہیں آیا، نہ سوچنے کیلئے وقت کی مہلت مانگی، نہ عزیزوں اور ہمدردوں سے مشورہ کیا۔ باپ بے شک اس وقت نہیں تھے لیکن تین بھائی بڑے اور ایک ان میں سے باپ کے برابر عمر رکھتے ہیں۔ وہ موجود تھے لیکن کسی سے رائے نہیں لی گئی۔ معلوم ہوا کہ نفس مطمئن ہے۔

اب بستر پر لیٹ گئے۔ ذرا غور کیجئے کہ بستر پر لیٹے تو اضطراب کا تقاضا یہ ہے کہ نیند اڑ جائے۔ ہمارے نزدیک اضطراب کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں نیند کے اڑنے کے۔ جسے رات کو کبھی سونے کی عادت نہ ہو، کوئی کسی عبادت کا ذوق رکھتا ہو اور وہ مجبوری سے اُسے انجام نہ دے سکے تو اُسے قلق ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، بے چینی ہوتی ہے جس کی وجہ سے نہ سو سکے۔ فرض کیجئے کہ اس وقت کوئی صاحب مجلس میں آنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور بروقت کوئی رکاوٹ ایسی پیدا ہو جائے کہ وہ نہ آسکیں تو یہ بستر پر بار بار یاد آئے گا کہ دیکھو! میں مجلس میں جانا چاہتا تھا مگر نہیں جاسکا۔

ان کی پوری رات محرابِ عبادت میں گزرتی تھی، جاگ کر بسر ہوتی تھی۔ رات کو سونا کہاں تھا اور پھر ذوقِ عبادت ان کا۔ رات بھر ان کو تصور رہنا چاہئے تھا کہ اب میں نماز پڑھتا ہوتا، اب میں تہجد پڑھتا ہوتا۔ اب میں فلاں عبادت کرتا ہوتا۔ آج فرض کے شکنجے کی زنجیریں ڈال کر مجھے لٹا دیا گیا۔ تو انہیں نفسیاتی طور پر قلق ایسا ہونا چاہئے تھا کہ نیند اڑے گی۔ اس قلق اور اضطراب کو وہ محسوس کرے گا جس کی عبادت بربنائے عادت ہو اور جو حقیقتِ عبادت سے واقف ہو۔ اُسے قلق نہیں ہوگا کہ جس کے کہنے سے روز عبادت کرتا تھا، اُسی کے کہنے سے تو آج لیٹا ہوں۔

لیکن حکم لیٹنے کا تھا، سونے کا نہیں تھا۔ رسولؐ نے فرمایا تھا کہ حکم خدا یہ ہے تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ حکم لیٹنے کا تھا، سونے کا نہیں تھا اور عقلاً ہو بھی نہیں سکتا، اس لئے کہ تکالیف شرعیہ اور احکام افعالِ اختیاری سے متعلق ہوتے ہیں۔ آدمی کے اختیار میں لیٹنا ہے، سونا نہیں ہے۔ تو عقلاً حکم لیٹنے کا ہی ہوسکتا ہے، سونے کا نہیں ہوسکتا، سونے کا نہیں ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سونا نہ سونا نفس کی کیفیت سے متعلق ہے۔ اگر نفس مضطرب ہوتا تو جاگ کے رات کٹتی بلکہ شاید رو کر کٹتی مگر یہ نفسِ مطمئن ہے۔

بہر حال اطمینان سے سوتے رہے اور بربنائے روایت بھی میں کہتا ہوں کہ ہمارے لئے تو ان کا کہہ دینا کافی ہے اور اصولِ عقلی کے اعتبار سے ایسی بات جو خود انسان کے بیان سے معلوم ہوسکے، اس میں اس کا بیان معتبر ہے۔ وہاں گواہیاں بھی نہیں ہوتیں۔ گواہ لیٹنا دیکھ سکتے ہیں، سونا نہیں دیکھ سکتے۔ تو جو چیز خود آدمی ہی کے بیان سے ظاہر ہو، اس میں اس کا بیان مستند ہے۔ اس میں گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تو ہمارے لئے ان کا کہہ دینا کافی ہے کہ میں شبِ ہجرت جیسی گہری نیند سویا، کبھی نہیں سویا، کبھی نہیں سویا۔ مگر بربنائے واقعہ ہر صاحبِ فہم کو میں دعوت دیتا ہوں کہ ذرا سا غور کرے کہ یہ سو رہے تھے یا نہیں؟

حضور! عرب کی نیچی نیچی دیواریں، لٹکتے ہوئے نیزے، کھنچی ہوئی تلواریں، آپس میں چہ چے ہو رہے ہیں کہ ابھی حملہ کردیں یا انتظار کریں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابولہب بھی تھا محاصرین میں۔ اُس نے یہ کہا کہ یہ بھاگ نہیں سکتے صبح ہونے دو، صبح کو حملہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیواریں اتنی نیچی تھیں کہ ان کے آنے میں وہ سدِ راہ نہیں تھیں۔ صبح کو جب چاہا، آگئے چھلانگیں لگا کر۔ کسی نے جاکر دروازہ تو نہیں کھولا تھا۔ تو چہ چے ہو رہے ہیں کہ جائیں یا نہ جائیں۔ رات گزر رہی ہے۔ اب ہر صاحبِ عقل غور کرے کہ اگر نفس مضطرب ہوتا تو رات بھی راز راز ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ بار بار چادر اُلٹ کر دیکھتا کہ آ تو نہیں رہے، آ تو نہیں رہے، یہ رات بھر راز رہنا بتاتا ہے کہ تو سو رہے تھے۔ ان کو اس سے مطلب نہیں تھا کہ آ رہے ہیں یا نہیں آ رہے۔

میں ایک عام مثل دہراتا ہوں، یہ سنجیدہ آدمی نہیں بولتے ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ میں شاید بالائے منبر اس مثل کو استعمال نہ کروں مگر مجھے یہاں مطلب اسی سے ہے۔ چونکہ مثل کے اندر ایک حقیقت مضمر ہوتی ہے، اس لئے پست سہی مگر میرے کام کی وہی ہے۔ میں گہری نیند کا فلسفہ بتانا چاہتا ہوں جو انہوں نے فرمایا۔ جیسی گہری نیند سویا، حضور! مثل مشہور ہے کہ جب گہری نیند کسی کو آئے تو کہتے ہیں کہ گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو گھوڑے بیچ کر سوئے، وہ تو گہری نیند سوئے گا اور جو جان بیچ کر سوئے؟

معلوم ہوا کہ انؑ کے کردار نے بتایا کہ یہ ہے نفسِ مطمئن۔ اب یہ باپ کا اطمینان نفس ہے اور بیٹے کی منزل آئی اور اس کے

سامنے مرحلہ یہ درپیش ہے کہ یزید طلبگار بیعت ہے۔ بیعت نہ کرنے کے نتائج ہر صاحب عقل کے سامنے ہیں۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ بیعت نہ کرنے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ اب یہ مشکل منزل ہے یا نہیں؟

تو جو اضطراب کے تقاضے وہاں بتلا چکا ہوں، وہی یہاں بھی ہیں کہ پیغام ملا تو کوئی روایت نہیں بتاتی کہ انہوں نے ہمدردوں کو جمع کیا ہو۔ بنی ہاشم جن سے ہم کربلا میں متعارف ہیں۔ اسی وقت تو ان کے علاوہ بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔ جناب محمد حنفیہ ہیں، جناب عبداللہ ابن عباس ہیں جو انتہائی مدبر ہیں۔ بہت ہی صاحب ہوش وخرد اور ہوشیار مانے جاتے تھے۔ لوگ ان کو بلاتے تھے اور مشورہ لیتے تھے۔ مگر کوئی روایت نہیں بتاتی کہ ان لوگوں کو بلا کر ان سے مشورہ لیا ہو کہ کیا کرنا چاہئے۔ ارے جبکہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بیعت یزید میرے لئے ناروا ہے تو پھر مشورہ کیوں لیتے؟

لوگوں نے آ آ کر بنظر ہمدردی مشورے دیئے، کچھ نمائشی ہمدرد، کچھ حقیقی ہمدرد۔ مگر مصلحتِ امام سے بے خبر۔ جناب عبداللہ ابن عمر نے بھی مشورہ دیا اور عبداللہ ابن مطیع، جو جناب مختار کے نکلنے کے وقت کوفے کے گورنر تھے، ان سب نے مشورہ دیا۔ آج ان مشوروں کو پیش کیا جاتا ہے اور انہوں نے کسی مشورے پر عمل نہیں کیا۔ کچھ لوگ جو چاہتے ہیں کہ الزام ہم عائد نہ کریں، وہ تقدیر کے سپرد کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ممتاز اہل قلم لکھتے ہیں کہ وہ تو مشیت کا فیصلہ تھا یعنی صحیح تو یہی لوگ کہتے تھے کہ مگر کیا کیا جائے کہ تقدیر میں یہی تھا۔ مشیت اسی کی متقاضی تھی۔ کچھ لوگ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ بڑی ضد تھی اور بڑی کد تھی۔ اتنے ہمدردوں کا مشورہ تھا اور اس کا نہ مانا مگر میں اب پوری ذمہ داری کے ساتھ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہوں کہ جتنے مشورے آپ لوگ پیش کررہے ہیں، ان سب مشوروں کو لائیے اور میرے سامنے پڑھئے کہ کیا کیا مشورہ کس کس نے دیا۔ تو جتنے مشورے تھے، وہ یہ کہ یہاں سے جارہے ہیں آپ تو عراق نہ جائیے، طائف چلے جائیے، یمن چلے جائیے اور کسی دوسری جگہ چلے جائیے۔ جبل طے، طے کے پہاڑوں پر مشورہ دیا گیا کہ جائیے۔ بڑے مشہور قلعے ہیں، آپؑ کی حفاظت ہمارا قبیلہ کرے گا۔ یہ مشورے کہ آپؑ جاتے ہیں تو بچوں اور عورتوں کو کیوں لئے جاتے ہیں؟ یہ ہیں مشورے ان لوگوں کے مگر کسی مشورہ دینے والے نے یہ نہیں کہا کہ یزید کی بیعت کرلیجئے۔

یہ پورے مطالعہ کی ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ کسی کا یہ مشورہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہتا کہ آپؑ یزید کی بیعت کرلیجئے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یزید کی بیعت تو دھندلی نگاہ والوں کو بھی ان کیلئے ناروا معلوم ہورہی ہے۔ اب آجکل دنیا کہہ رہی ہے کہ بیعت کیوں نہ کرلی؟ یہ سب کچھ ہو گیا اور بیعت نہیں کریں گے۔ انکار بیعت میں اتنی شدت؟ یہ تو ضد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر صحیح راستے پر قائم ہونا ضد ہے تو کونسا نبی ہے جو ضدی نہ ہو۔ کونسا رسول ہے جو ضدی نہ ہو۔ خدا کی قسم! صدائے حق کا ہم اور آپ تک پہنچنا ان کی ضدوں کا صدقہ ہے۔

پھر ذرا انصاف کیجئے آپ، اس رُخ پر سوال کرتے ہیں کہ ان کو بیعت سے اتنا انکار کیوں ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسے کیوں نہیں سوچتے کہ یزید کو بیعت پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ جبکہ تمام عالم اسلام نے بیعت کرلی تو اگر یہ بیعت نہ کریں تو یزید کا کیا بگڑتا؟ جبکہ اصول جمہوریت یہ ہے کہ کثرت رائے سے ہر بات طے ہو۔ تو اقلیت کی رائے ناقابل اعتبار ہے۔ اس سے اصل مقصد کو کوئی نقصان

نہیں پہنچتا۔ کچھ لوگ نہیں مانتے، نہ مانیں۔ یہ پوری طاقت کیوں صرف کی گئی کہ ان سے بیعت لی جائے؟ یہ آخر یزید کو اتنا اصرار کیوں ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ سے بیعت بحیثیت ایک فردِ عرب کے نہیں تھی، بحیثیت ایک نمائندہ خاندانِ بنی ہاشم کے نہ تھی بلکہ حسینؑ سے بیعت اس شریعت کا نمائندہ ہونے کے لحاظ سے تھی۔ یزید جانتا تھا کہ جب تک حسینؑ نے بیعت نہ کی، اس وقت تک شہنشاہیت کے سامنے شریعت کا محاذ قائم ہے اور جس دن یہ بیعت کریں گے، اس دن شریعت کا محاذ ہمیشہ کیلئے سیاست کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اس لئے حسینؑ سے بیعت کیلئے پورا اصرار تھا۔

تو ایک جملہ آپ کیلئے کافی ہے، میں کہتا ہوں کہ یزید حسینؑ کو پہچانتا تھا کہ یہ کون ہیں اور حسینؑ خود اپنے آپ کو نہ پہچانتے کہ میں کون ہوں؟ یہ جانتے تھے کہ اس وقت میرے حسنؑ مجتبیٰ ہوتے تو مجھ سے نہ کہا جاتا۔ جو کچھ کہنا تھا، انؑ سے کہا جاتا۔ اگر ہمارے پدرؑ بزرگوار ہوتے تو جو کچھ مقابلہ کرنا تھا، انؑ سے کیا جاتا۔ ہم سے براہِ راست کوئی مطلب نہ ہوتا۔ مزید آگے بڑھیے کہ اگر ہمارے نانا رسولؐ اللہ ہوتے تو جو کچھ سندِ جوازِ حکومت کی مانگنا ہوتی، وہ انؐ سے مانگی جاتی، ہم سے نہ مانگی جاتی۔ مگر چونکہ میرے نانا نہیں ہیں اور میں ہوں، اس لئے مجھ سے بیعت طلب کی جارہی ہے۔ میرے بیعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے بھائی ہوتے تو بیعت کر لیتے، میرے والد ہوتے اور وہ ہتھیار ڈال دیتے، میرے نانا ہوتے اور وہ مہرِ تصدیق ثبت کر دیتے۔

میں کہتا ہوں کہ اب فقط انؑ کی بات نہیں ہورہی ہے، اب انؑ کا بیعت کرنا ان سب کا بیعت کرنا تھا اور ان کا بیعت سے انکار ان سب کا انکارِ بیعت ہے اور جب رسولؐ تک بات پہنچ گئی تو میں کہتا ہوں کہ ان کا بیعت کر لینا شریعتِ الٰہی کا سر جھکا دینا ہے۔

22

اطاعت رسول

جب خالق نے اپنا نائب رسول کو کائنات میں مقرر کر دیا ہے تو دنیا کو کیا حق ہے کہ رسول کا قدم بیچ میں سے نکال کر براہ راست اللہ سے رابطہ قائم کرے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہراہ حیات میں کسی انسان کے نقش قدم سامنے ہوں مگر انسان ایسا ہو کہ جو راہ اس کے نقش قدم سے بنے وہ راہ رضائے پروردگار ہو۔

جو ایمان بالغیب نہ رکھتا ہو اسے بس انہی کے احکام ماننے چاہئیں کیوں کہ اللہ کو احکام دیتے ہوئے نہیں دیکھا اس لئے ایمان بالغیب کے دین کی بسم اللہ بھی نہیں ہو سکتی۔

ان کا قول کوئی مرضیِ الہٰی سے الگ نہیں ہوتا ہے کوئی قول چاہے جوانی میں ہو چاہے بزم میں ہو، رزم میں ہو چاہے صحت میں ہو چاہے مرض میں۔

آپ عظیم خلق کے درجہ پر فائز ہیں اور کردار ان کا ایسا تھا کہ اپنی محبت کا معیار ان کے نقش قدم کو قرار دیا۔

اطاعت رسولؐ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۱﴾

ارشاد حضرت اقدسِ الٰہی ہے، اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان بلند سے بلند اعزاز کا متمنی رہتا ہے اور اس کیلئے اونچے سے اونچا دعویٰ کرنے پر امادہ رہتا ہے۔ اگر یہ دعویٰ کسی جوہر ذاتی سے متعلق ہے تو پھر بھی دشواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً اگر کوئی جاہل عالم ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وقت پر مصرعہ طرح دے کر نظم کرنے کی فرمائش نہ ہو جائے۔ مگر جب اعزاز کسی رشتہ نسبت اور اضافت سے حاصل ہو رہا ہو جیسے کسی کا بیٹا، کسی کا عزیز، کسی کا دوست۔ یہ "کا" جہاں بیچ میں آیا، وہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ ذات کے اندر کچھ نہیں ہے، رشتہ پر فخر ہے۔ جب رشتہ سے اعزاز مل رہا ہو تو آسانی ہو جاتی ہے۔ پھر اگر یہ رشتہ کسی ایسی ذات سے قائم کیا جارہا ہو جس کے متعلق یہ ڈر ہو کہ کوئی اس سے جاکر پوچھ نہ لے کہ یہ آپ سے اپنا رشتہ بتا رہے ہیں، یہ صحیح ہے یا نہیں۔ وہ کہہ دے کہ نہیں، یہ میرا رشتہ دار نہیں ہے تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ لیکن اگر رشتہ کسی ایسی ذات سے قائم کیا جارہا ہو جس کے متعلق اطمینان ہے کہ کوئی اس تک پہنچنے والا نہیں اور عام معنی میں اس تک چلا جائے تو پھر واپس آنے والا نہیں۔ اب بہت آسانی محسوس ہوتی ہے۔

پھر جب اعزاز رشتے سے ہے تو جتنا مرکز رشتہ کا اونچا ہوگا، اتنا اعزاز میں اضافہ ہوگا۔ ایک مقامی حاکم کے دوست کی اتنی عزت نہ ہوگی جتنی ضلع کے حاکم کے دوست کی عزت ہوگی۔ ضلع کے حاکم کے دوست کی اتنی عزت نہ ہوگی جتنی ملک کے حاکم کے دوست کی ہوگی۔ چہ جائیکہ رب الارباب، سلطان السلاطین، احکم الحاکمین، خالق کائنات کے دوستوں میں کوئی داخل ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اللہ کے بندوں کی نظر میں اور عزت کیا ہو سکتی ہے اگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہر مدعی کا دعویٰ صحیح نہیں ہوتا۔ جب خدا تک ہونے کا غلط دعویٰ کر دیا گیا تو خدا کا دوست ہونے کا دعویٰ کونسا مشکل ہے؟ اس لئے ضرورت ہے سچے اور جھوٹے کے پرکھنے کی کوئی کسوٹی ہو۔ صادق اور کاذب کا کوئی معیار ہو جس کی بناء پر دیکھا جائے کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اس مقصد کے لئے خالق نے اپنے پیغمبرؐ کی زبانی قرآن مجید میں یہ کسوٹی پیش کی۔ اس معیار کا اعلان کر دیا کہ ہماری محبت کے دعویدار بہت ہیں۔ ان کے سامنے یہ معیار پیش کر دیجئے کہ اگر یہ اللہ کی محبت رکھتے ہیں تو آپ کی پیروی کریں۔ اگر آپ کی پیروی کریں گے تو ان کا محبت کا دعویٰ سچا سمجھا جائے گا ورنہ وہ دعویٰ غلط ہوگا۔

اب اس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت کا مقصد اس اعلان کی غرض سچے اور جھوٹے کے پرکھنے کا ایک معیار پیش کرنا ہے۔
لیکن خیال یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ وہ سبب یہ کہ کسی اقتدارِ اعلیٰ سے رابطہ قائم کرنا بغیر درمیانی ذرائع کے بے ضابطہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی درخواست آپ کو مرکزی حکومت کے پاس بھیجنا ہو، پہلے وہ آپ کے ضلع کے حاکم کے پاس جائے گی۔ آپ کے شہر کے حاکم کے پاس جائے گی۔ اس کے ذریعہ سے جب آگے بڑھے تو وہ باضابطہ ہوگی اور اگر بالا بالا رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو وہ اقدام بے ضابطہ ہوگا۔ جب خالق نے اپنا نائب رسول کو کائنات میں مقرر کر دیا ہے تو دنیا کو کیا حق ہے کہ رسول کا قدم بیچ میں سے نکال کر براہِ راست اللہ سے رابطہ قائم کرے۔

مگر میں نے عرض کیا کہ یہ بھی سبب ہو سکتا ہے۔ یہی سبب نہیں ہے، اس لئے کہ اگر یہی سبب ہو تو دیکھئے کہ دعویٰ کس چیز کا تھا؟
دعویٰ تھا اللہ کی محبت کا، مطالبہ ہو جاتا محبتِ رسول کا۔ اس کی عربی مجھے معلوم ہے، یہ کہا جاتا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو مجھ سے محبت کرو۔''

جس چیز کا دعویٰ اللہ کیلئے تھا، اُسی چیز کا مطالبہ اللہ کیلئے کر لیا جاتا تو وہ مقصد پورا ہو جاتا لیکن یہاں اللہ کی نسبت دعویٰ کچھ اور۔ اور پیغمبر کی نسبت مطالبہ کچھ اور۔ دعویٰ ان کا اللہ سے محبت کا، مطالبہ رسولؐ کی محبت کا نہیں۔ ہاں! غلط فہمی نہ ہو، محبتِ رسول بھی اپنی جگہ دینی فریضہ ہے مگر اس آیت میں محبتِ خدا کے دعویداروں سے مطالبہ محبتِ رسول کا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اتباعِ رسول کا کیا گیا ہے۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ محبت ہے دل کے اندر کی چیز۔ دل شگافتہ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا کہ محبت ہے یا نہیں۔ تو جو اتنے نڈر ہیں کہ اللہ سے محبت کا بے بنیاد دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ رسولؐ کی محبت کا دعویٰ کرنے میں کیوں قدم پیچھے ہٹاتے۔ لہٰذا جو کسوٹی کا مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے محبت کے دعویداروں سے مطالبہ ہوا اتباعِ رسول کا۔

اب اتباع دل کے اندر کی چیز نہیں ہے کہ جو آنکھوں سے دیکھی نہ جاسکے۔ یہ تو قدم کی رفتار بتائے گی کہ اتباع ہے یا نہیں؟ اس کیلئے ضرورت تھی رسول کا قدم درمیان میں لانے کی۔ عقلاً اب رسولؐ کے بیچ میں لائے بغیر کام ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ محبت دل کا جھکاؤ ہے۔ یہ غیر مادی مرکز یعنی اللہ کی نسبت بھی ہو سکتا ہے، اللہ کی محبت ہو سکتی ہے کیونکہ محبت دل کا مائل ہونا ہے۔ دل کا جھکاؤ ہے لیکن اتباع کیا ہے؟ اتباع ہے پیچھے پیچھے چلنا۔ اتباع ہے نقشِ قدم پر چلنا۔ یہ براہِ راست اس سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ ممکن واجب کی پیروی کیونکر کرے۔ حادث قدم کی پیروی کیونکر کرے محتاج غنی کی پیروی کیونکر کرے۔ اس کیلئے ضرورت ہے کہ شاہراہِ حیات میں کسی انسان کے نقشِ قدم سامنے ہوں۔ مگر انسان ایسا ہو کہ جو راہ اُس کے نقشِ قدم سے بنے، وہ راہِ رضائے پروردگار ہو۔

جب ایسا انسان ہو، تب اس کی پیروی معیارِ محبتِ الٰہی ہو سکتی ہے اور اسی بناء پر کوئی حافظِ قرآن اپنے حافظہ کی بناء پر دل ہی دل میں اور ناظرہ خواں ورق گردانی کر کے قرآن میں شروع سے آخر تک تلاش کرے۔ دیکھے کہ اللہ کی اطاعت کا تو حکم ہے مگر اللہ کے اتباع کا کہیں حکم نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے ہم اُردو میں اطاعت کے معنی بھی کہہ دیتے ہیں پیروی اور اتباع کے معنی بھی کہہ دیتے ہیں

پیروی۔ مگر عربی زبان کے لحاظ سے اطاعت اور اتباع کے معنی میں فرق ہے۔ جب کسی شخصیت کیلئے کہا جائے کہ اسکی اطاعت تو معنی اور ہیں اور جب کسی ذات کیلئے کہا جائے اتباع، تو اس کے معنی اور ہیں۔

اطاعت ہوتی ہے اقوال کی، اتباع ہوتا ہے افعال کا۔ اطاعت کے معنی ہیں احکام پر چلنا اور اتباع کے معنی ہیں نقش قدم پر چلنا، پیچھے پیچھے چلنا۔ تو اطاعت تو اللہ کی بھی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو احکام پیغمبر خدا کی زبان مبارک پر آئے، وہ احکام بحیثیت مرکز اللہ کے احکام ہیں اور بحیثیت ترجمان انؐ کے احکام ہیں۔ غیب کے آئینہ میں وہ اللہ کے احکام ہیں، شہود کے منظر پر وہ انؐ کے احکام ہیں۔ جو ایمان بالغیب نہ رکھتا ہو، اُسے بس انہی کے احکام ماننے چاہئیں کیونکہ اللہ کو احکام دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس لئے بغیر ایمان بالغیب کے دین کی بسم اللہ بھی نہیں ہو سکتی۔

وہ احکام اللہ کے احکام ہیں کیونکہ اصل اسی کے احکام ہیں، ان کی زبان سے وہ احکام جاری ہوئے ہیں۔ اس بناء پر ہم ان کو انکے احکام سمجھتے ہیں، ان کے احکام کہتے ہیں۔ تو اطاعت تو اللہ کی بھی ہے مگر اتباع میں نے کہا ہے کہ پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ وہ ہمیں کہاں ملے گا کہ وہ آگے آگے چلے اور ہم پیچھے پیچھے چلیں؟ اتباع کے معنی نقش قدم پر چلنا۔ وہ کس راستے پر جائے گا کہ اس کے نقش قدم ہمیں نظر آئیں؟

لہٰذا اللہ کی اطاعت کا حکم ہے۔ اتباع کا حکم شخصیت کیلئے ہوگا اور اس کے معنی ہوں گے پیچھے پیچھے چلنا۔ یوں ملت کی طرف اضافت ہے اتباع کی کہ ملتِ ابراہیمؑ کا اتباع کرو۔ اللہ کی طرف کی ہدایت کا اتباع کرو مگر براہ راست اللہ کا نام کہیں نہیں لیا گیا کہ اللہ کا اتباع کرو کیونکہ اتباع کے معنی ہیں پیچھے چلنا۔ شخصیت کے اتباع کے معنی ہیں نقش قدم پر چلنا۔ یہ براہ راست اللہ سے متعلق نہیں ہو سکتا مگر رسولؐ کی اطاعت کا بھی حکم اور اتباع کی منزل میں تو اللہ کا نام ہی نہیں۔ وہاں تو براہ راست ان کی زبان سے کہلوایا جا رہا ہے کہ آپ کہئے کہ میرا اتباع کرو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

"تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں پیروی کا بہترین موقع ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ ہم جو عادی رہے ہیں خدا رسولؐ، خدا اور رسولؐ، یعنی ہر جگہ خدا کے بعد ہم رسول کا نام سننے کے عادی رہے ہیں تو جب آیت کا یہ ترجمہ ملتا ہے کہ تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے تو ہمیں ایک دھچکا سا محسوس ہوتا ہے۔ ہم عادی رہے اس سلسلہ سے چلنے کے۔ خدا اور رسولؐ، خدا اور رسولؐ۔ اور یہاں خدا کا نام نہیں، یہاں کہا جا رہا ہے کہ تمہارے اللہ کے رسولؐ میں۔ یہ نہیں کہ خدا میں۔ نہیں، اللہ کے رسولؐ میں تمہارے لئے پیروی کی بہترین مثال ہے تو یہاں اللہ کا نام آیا ہی نہیں۔ اتباع کی منزل میں تو اللہ کا ذکر نہیں ہے، وہاں تنہا رسول کا ذکر ہے۔

اب جو الفاظ کہوں، وہ بڑے ہولناک ہیں۔ شرک بے شک ڈرنے کی چیز ہے مگر لفظ ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ حقیقت شرک ڈرنے کی چیز ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں، اُسے قرآنی معیار پر جانچ لیجئے کہ صحیح ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مقام اطاعت میں خدا نے ہر جگہ

ان کو اپنے ساتھ شریک رکھا اور اتباع کی منزل میں ان لاشریک رکھا۔ ان کی اطاعت کا بھی حکم دیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اقوال کی صحت کی ضمانت ہے اور جب بلا شرط، بلا قید، بلا استثنیٰ ان کے اتباع کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے افعال کی صحت کی ضمانت دی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی قول مرضیِ الٰہی سے الگ نہیں ہوتا۔ چاہے کوئی قول ہو، جوانی میں ہو، چاہے بڑھاپے میں، چاہے بزم میں ہو چاہے رزم میں ہو، چاہے صحت میں ہو چاہے مرض میں۔

اطاعت کا حکم بلا قید نہ ہوتا اگر کوئی قول اس دائرہ سے الگ ہوتا۔ تو جب اطاعت کا حکم مطلق ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قول ان کا مرضیِ الٰہی کا آئینہ بردار اور جب اتباع کا حکم دیا تو ان کا ہر عمل مرضیِ الٰہی کے مطابق۔ ہر عمل، چاہے رضا میں ہو چاہے غضب میں، چاہے رزم میں ہو چاہے بزم میں۔ جس کو پاس بلائیں وہ بھی اللہ کے حکم سے، جس کو اٹھائیں وہ بھی اللہ کے حکم سے۔

ہر قول مرضیِ الٰہی کے مطابق ہے۔ ہر عمل مرضیِ الٰہی کا آئینہ بردار۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی عمل وقتی طور پر کسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اختیار فرمائیں۔ اس میں مصلحت الٰہی مضمر ہوتی ہے کہ یوں کریں اور میں یوں کہوں۔ یہ کوئی حکمتِ ربانی ہوتی ہے۔ چونکہ دنیا کہتی تھی کہ ہر جگہ اپنے بھائی کو آگے بڑھا دیتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ کبھی یہ کسی اور کو بھی بڑھائیں اور اللہ کہے کہ کیوں بڑھایا؟

جناب والا! مطلق اطاعت کا حکم اقوال کی صحت کی دلیل اور مطلق اتباع کا حکم افعال کی صحت کی دلیل۔ اس کیلئے ان کے قول کو اپنا قول قرار دیا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى ﴿٤﴾

''ہمارا رسول خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا، وہ تو وہی کہتا ہے جو اس پر وحی ہوتی ہے''۔

اور ان کے عمل کو اپنا عمل قرار دیا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

''وہ آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے، وہ اللہ نے پھینکے''۔

اور ہاتھ کہ جو عمل کا ذریعہ ہوتا ہے، اسے بھی اپنا ہاتھ قرار دیا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ ۭ

''یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، یہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ

''یہ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے''۔

پھر وہی مطالبہ کہ دیکھو کچھ، اور مانو کچھ۔ آنکھوں سے دیکھو کہ رسول کا ہاتھ ہے اور غیب پر ایمان لا کر مانو کہ اللہ کا ہاتھ ہے۔

تو قول کو اپنا قول کہا، عمل کو اپنا عمل کہا۔ ہاتھ کو، جو عمل کا ذریعہ ہے، اس کو اپنا ہاتھ کہا۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہر مکتبہ

فکر کیلئے یہ لمحہ فکر ہے کہ جس کا قول اللہ کا قول ہے، جس کا عمل اللہ کا عمل ہے، جس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اگر (معاذ اللہ) اس سے غلطی ہو تو کس کی غلطی ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے رسولؐ کے معصوم ہونے کا سوال نہیں ہے، بلکہ بندوں کے سامنے اللہ کے بے خطا ہونے کا سوال ہے۔

اسے روزمرہ کی مثال سے پیش کرتا ہوں۔ وہی تعلیمی دائرے کی مثال ہے کہ جب بچہ پڑھنے کیلئے بیٹھتا ہے یعنی اس کی بسم اللہ ہوتی ہے تو تختی لکھ کر دی جاتی ہے۔ مثلاً "اب پ"۔ کسی خوشنویس سے لکھوائی جاتی ہے تاکہ بچہ ویسا لکھے۔ وہ ایسا لکھ کر مشق کرتا ہے۔ اسی تختی کو سرمشق کہتے ہیں۔ شروع میں بچہ ویسا نہیں لکھنے لگے گا مگر جو تختی اسے لکھ کر دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ وہ تختی اگر غلط ہو، چاہے جان کر غلطی نہ ہو، بھولے سے غلطی ہو، جیسی بھی غلطی ہو، تو جتنا ملا کر لکھنے کی کوشش کرے گا، اتنی غلطیوں کی تکمیل ہوتی جائے گی اور صحت سے دور ہوتا جائے گا۔ خطا اس تختی کی نہیں ہوگی، اس اُستاد کی ہوگی جس نے غلط تختی پیش کی۔

میں کہتا ہوں کہ اتباع کرو رسول کا۔ یہ اللہ کا مطالبہ ہے۔ خود رسولؐ نے تو منبر پر جا کر نہیں کہا ہے کہ میرا اتباع کرو۔ اللہ نے ان سے کہلوایا ہے کہ آپ کہئے۔ تو اللہ کا حکم ہے کہ ان کا اتباع کرو۔ اتباع کے معنی کیا ہیں؟ یہی کہ اپنے عمل کو ان کے عمل کا نمونہ بنانے کی کوشش کرو۔ تو میں نے مانا کہ خلقِ خدا تو گنہگار ہے، خلقِ خدا تو کبھی غلطیوں سے بری نہیں ہوگی۔ کچھ نہ کچھ غلطیاں دھوکے سے سہی، بھولے سے سہی، کچھ تو خلائق میں رہیں گی۔ مگر جو اس کی طرف سے تختی پیش کی گئی ہے، نمونہ جو پیش کیا گیا ہے، اُسے اپنی جگہ صحیح ہونا چاہئے ورنہ ذمہ داری اس پر نہیں ہوگی، جو نمونہ بنایا گیا ہے، اُس پر ہوگی جس نے نمونہ پیش کیا ہے۔ جناب! بڑا عجب تعلیم ہے کہ یہ بشر ہیں اور بشر تو بہرحال بھولتا بھی ہے اور بشر دھوکہ بھی کھاتا ہے۔ اسی دھوکہ کو خطائے اجتہادی کہتے ہیں۔ اب بشر ہیں تو خیر، جان کر گناہ نہیں کریں گے۔ لیکن یہ کہ یہ بھولے سے نہ کریں اور دھوکے سے بھی نہ کریں۔ یہ بات تو بشریت کے خلاف ہے، لہٰذا جب بشر ہیں تو اتنا ہم مانتے ہیں کہ گناہ نہیں کریں گے یعنی جان بوجھ کر خلافِ حکمِ خدا نہیں کریں گے۔ لیکن بھولے سے، چوکے سے۔ بھول کے معنی ہیں نسیان اور چوک کے معنی ہیں خطائے اجتہادی۔ تو بھولے سے چوکے سے جو غلطیاں ہوں گی، اس سے کیسے بری ہوں گے؟ کیا بشر نہیں ہیں؟ یہ سب تو بشریت کے لوازم ہیں۔ میں بشریت پر ایمان رکھتا ہوں اور بشریت کو میں جزو دین سمجھتا ہوں۔ بشر ماننا از روئے قرآن ضروری ہے۔ جب قرآن پر ایمان ہے تو بشر ہونے پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

تو بشر ہونے پر تو میرا ایمان ہے مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کہتے ہیں کہ بشر ہیں، اس لئے سہو و نسیان ضرور ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ بشر نے اپنے کو نمونہ نہیں بنایا ہے، خدا نے ان کو نمونہ بنایا ہے۔

جناب! ایک پہلو پر غور کیجئے کہ ہم یہ آیت پڑھیں، کہئے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اور اس آیت کو خوب حفظ کر لیں۔ جتنی دفعہ پڑھنے میں حفظ ہو، حفظ کر لیں اور عمر بھر وظیفہ پڑھتے رہیں۔ ہر نماز کے بعد اس کو پڑھا کریں۔ اس کا ترجمہ بھی یاد کر لیں کہ کہئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرے نقشِ قدم پر چلو۔ کہئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے

ہوتو میرے نقش قدم پر چلو۔ لیکن نقش قدم کو ایک مرتبہ بھی نہ دیکھیں تو بتایئے کہ یہ آیت ہمیں منزل تک پہنچا دے گی؟ لاکھ دفعہ ہم اس آیت کو پڑھ لیں اور لاکھ مرتبہ اس کا ترجمہ ہر زبان میں سن لیں، تب بھی وہ تو حوالہ دے رہی ہے ایک نقش قدم کا اور اس نقش قدم کو ہم دیکھتے ہی نہیں اور بس قرآن کو کافی سمجھ رہے ہیں۔

ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے بڑے المناک طریقہ سے کہا کہ حضور! یہاں جوانوں اور نوجوانوں میں یہ تصور بہت بڑھ گیا ہے کہ صرف قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وحی چونکہ قرآن میں منحصر ہے، تو حکم الٰہی اور کہاں سے آسکتا ہے؟ میرے نزدیک تو یہ تذکرۂ ماضی ہے، بہت پرانی بات ہے۔ لوگ تو اس وقت سے شکار ہو گئے ہیں اس غلط تصور کا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ یہ پھیل رہا ہے۔ ایک بات تو ہے اور بڑی پرانی بات ہے۔ جو ایک نعرے کی صورت میں صدا لگائی گئی تھی اور اس کے بعد اب لوگوں نے اس کو پروان چڑھا دیا ہے۔ اب اس پر ایک نظریے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ ورنہ کہنے والا خود اس نعرے کے مفہوم کا قائل نہیں تھا۔ اگر قائل ہوتا تو بنت رسولؐ کو محروم کرنے کیلئے حدیث کا سہارا نہ لیتا۔ حدیث کچھ ہے ہی نہیں تو قرآن کی آیتوں کے مقابلہ میں کیوں لائی جا رہی ہے؟ ہمارے نزدیک تو وہ حدیث ہر صورت میں غلط ہے۔ ہم حدیثوں کو معتبر جانتے بھی ہیں تو قرآن کے مقابلہ میں نہیں جانتے۔ جو باتیں قرآن میں درج نہیں ہیں، ان میں حدیث کو معتبر جانتے ہیں اور جو باتیں قرآن میں صاف ہیں، ان کے مخالف حدیثوں کے بارے میں تو ہمارے معصومینؑ نے کہا ہے کہ دیوار پر مار دو۔

ہم ایسی حدیث کو نہیں مانیں گے جو قرآن کے خلاف ہو۔ جہاں جہاں قرآن کچھ نہیں بتا رہا ہے، وہاں ہم کہتے ہیں کہ حدیث رہنما ہے۔ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو، اُسے ہم نہیں مانتے۔ مگر جو لوگ حدیث کے منکر ہوں اور وہ قرآن کے مقابلہ میں حدیث کا سہارا لیں اور پھر کہیں کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ تو بتایئے یہ قول و عمل کا تضاد ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ اسی ایک آیت کو لے لیجئے کہ کہا جا رہا ہے کہ اگر اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو، واقعی محبت رکھتے ہو تو رسول سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے نقش قدم پر چلو۔

تو یاد رکھئے کہ قرآن کہہ رہا ہے ان کے نقش قدم پر چلو۔ اب وہ نقش قدم قرآن کے کاغذ پر بنا ہوا تو نہیں ہے۔ قرآن کو گلے میں ہر وقت حمائل رکھئے تو نقش قدم تو نہیں ملے گا۔ نقش قدم تو پھر سنت ہی میں ملے گا۔ وہ نقش قدم تو حدیثوں ہی میں ملے گا۔ وہ نقش قدم قرآن کے اندر نہیں ملے گا۔

اب قرآن کو کافی سمجھنا خود قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن اگر اپنے کو کافی سمجھتا تو ان کے نقش قدم کی طرف نگاہوں کو کیوں موڑتا؟ وہ کہتا ہی کیوں کہ اس نقش قدم کو دیکھو۔ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں کافی نہیں ہوں۔ دیکھو بغیر اس نقش قدم کے صحیح راستے پر نہیں پہنچو گے۔ ہم ہیں کہ رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ قرآن کافی ہے۔ تو ہم کیسے قرآن پر ایمان رکھے ہوئے ہیں؟ ہم تو خود قرآن کے منکر ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلو۔ یہ نقش قدم تو قرآن میں نہیں ملے گا۔ وہ جدھر جا رہے ہیں، دیکھئے کہ کدھر جا رہے ہیں؟ تبھی نقش قدم ملے گا اور نقش قدم تو مجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سمتِ سفر کو دیکھو۔ ان کے رُخ کو دیکھو کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کے

منہاجِ عمل کو دیکھو۔ وہ منہاجِ عمل تمہارے سامنے ہے تو اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ یہ ہے نقشِ قدم پر چلنا۔

تو وہ قرآن کے اندر کہاں ملے گا؟ وہ یا ان کے اقوال میں ملے گا یا ان کے افعال میں ملے گا۔ وہ قرآن میں کہیں نہیں ملے گا۔ تو قرآن کو کافی سمجھنا خود قرآن کا دامن چھوڑنا ہے۔

حضور والا! اس تصور کا مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ قرآن بس جو کچھ ہے، وہ ہے اور حدیثیں کچھ نہیں ہیں یہ میں مانتا ہوں کہ جو حدیثیں غلط ہیں، انہیں دیوار پر پھینکو۔ جو قرآن کے خلاف ہوں اور جو ضروریاتِ دین کے خلاف ہوں، ان سب حدیثوں کو رد کر دینا چاہئے۔ لیکن یہ کہ بالکل حدیثوں کا انکار کر دیا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر خدا بس قرآن ہی پڑھا کرتے اور کسی وقت کچھ نہ کہتے؟ چونکہ جو کچھ کہیں گے، وہ بیکار ہوگا۔ دن رات ان کو صرف قرآن پڑھنا چاہئے تھا۔ خود تو کچھ ارشاد کرنا چاہئے ہی نہیں تھا۔

ایک اور عجیب خیال مجھے یاد آ گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ افعالِ رسولؐ بھی معتبر ہیں مگر وہ افعال اور اقوال رسولؐ جو بحیثیتِ رسولؐ ہوں، اور جو بحیثیتِ بشر ہوں، وہ نہیں۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ بیٹی کے بارے میں کچھ کہیں تو بشریت کا رشتہ آ جائے، بھائی کے بارے میں کچھ کہیں تو بشریت کا رشتہ آ جائے۔ بس بحیثیت رسولؐ کچھ کہیں تو آمنّا صدقنا۔ ہم سر پر رکھنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن بحیثیت بشر جو کچھ کہیں، وہ نہیں۔ ہم تو ان کے اقوال دیکھ رہے ہیں، ان کے افعال دیکھ رہے ہیں۔ اقوال ان کی زبان سے سن رہے ہیں اور افعال ان کے دیکھ رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ کچھ افعال واقوال ان کے بحیثیتِ رسولؐ ہوتے ہیں، کچھ بحیثیت بشر ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ پھر ان کے ساتھ ایک اور رسول ہونا چاہئے جو ہمیں بتاتا رہے کہ یہ اقوال بحیثیتِ رسول ہیں اور یہ اقوال بحیثیتِ بشر ہیں۔ یہ افعال بحیثیتِ رسول ہیں اور یہ افعال بحیثیت بشر ہیں۔ ارے صاحب! یہ اجتہاد ہم کیونکر کریں گے کہ ان کے کونسے اقوال بحیثیتِ رسولؐ ہیں اور کونسے اقوال بحیثیت بشر ہیں۔ چونکہ ہر وقت ان کی بشریت کے ساتھ رسالت ہے، یہ نہیں ہوتا کہ کسی وقت رسالت ہو اور کسی وقت بشریت ہو۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے ان کے آدھے سراپائے وجود میں رسالت ہو اور آدھے میں بشریت ہو۔ میں بشریت اور رسالت میں ان کی زندگی کا بٹوارہ کر ہی نہیں سکتا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیونکر بٹوارہ کروں۔ ارے رسالت سے کم جو در جے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ایک مسلمان میں تفریق نہیں کر سکتا کہ کہاں تک یہ مسلمان ہے اور کہاں سے یہ فقط انسان ہے۔ اگر وہ مسلم ہے تو وہ انسان ایسا ہے کہ مسلمان ہے۔ انسانیت کے اندر اسلام تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اسلام پھر الگ رہے اور انسانیت الگ رہے۔ وہ انسان ہی ہوتا ہے جو مسلمان ہوتا ہے۔ اس کے ہر فعل کو بمعیار اسلام ہونا چاہئے اگر وہ مسلمان ہے۔

تو جنابِ والا! رسولؐ میں بٹوارہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کہیں پر تو وہ فقط بشر ہیں اور کہیں پر سے وہ رسولؐ ہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ جب وہ رسولؐ ہیں تو ہر عمل ان کا بمعیار رسالت ہے۔ یہ تو عام رسول کیلئے میں کہوں گا کہ ہر عمل بمعیار رسالت اور جب وہ خاتم النبیینؐ ہیں تو ان کے اعمال بدرجۂ اتم بمعیار رسالت ہونے چاہئیں۔

لہٰذا بشریت اور رسالت کا تفرقہ بے معنی ہے۔ اس کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔ بس اب کلیہ یہی کہ قرآن نے کہا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلو تو ہم ان کے نقش قدم پر چلیں، تبھی جا کر راہ ہدایت پا سکتے ہیں، بغیر اس کے نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید شروع سے

آخر تک دیکھتے جایئے، نماز کا حکم موجود اور ترکیب نماز غائب۔ جو چیز ہماری دینیات کی پہلی کتاب تک میں ضرور لکھی ہوگی، ترکیب نماز، وہ شروع سے آخر تک کہیں بھی نہیں ہے۔ کیا (معاذ اللہ) متکلم بھول گیا، یاد ہی نہیں رہا کہ نماز کا تو ہم اتنا حکم دے رہے ہیں اور نماز کی ترکیب تو ہم نے بتائی ہی نہیں۔ متکلم وہ ہے جس کے ہاں بھول کا امکان نہیں۔ اچھا! صرف نماز میں (معاذ اللہ) بھول جاتا لیکن "وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" موجود، "يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ" موجود مگر زکوۃ کی کتنی مقدار ہوتی ہے، شرائط زکوۃ کیا ہیں، کس صورت میں زکوۃ دی جائے؟ وہ کچھ نہیں۔ تو (معاذ اللہ) پھر بھول گیا۔ زکوۃ کا حکم دیا اور ترکیب زکوۃ، شرائط زکوۃ، مقدار زکوۃ بتائے ہی نہیں۔

اور حضور! حج کا حکم دیا لیکن مناسک حج کی تعلیم غائب۔ اصل حکم شرع موجود اور تفصیل غائب۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی بھولنے والا آدمی بھی ہوتا تو اتنی پابندی سے نہ بھولتا۔ ہر جگہ اجمال یاد رہتا ہے اور تفصیل ہر جگہ بھول جاتا ہے؟ یہ تو کوئی بھولنے والا بھی نہیں کر سکتا۔ تو جب بھول نہیں ہے تو معلوم ہوگا کہ ارادتاً ہے۔ جب ارادتاً ہے تو اس کا کوئی مقصد ہے۔ ہر جگہ مجمل حکم موجود اور تفصیل ندارد۔

اب یہاں ادیبوں اور شاعروں کی زبان یاد آ رہی ہے کہ شروع سے آخر تک قرآن میں ہر بات میں یہی کہ مجمل حکم ہے اور تفصیل حکم نہیں ہے اور بھول کا امکان نہیں اور جس میں امکان ہو، اس میں بھی اسطرح پابندی سے امکان نہیں۔ تو جب بھول نہیں تو معلوم ہوگا کہ فعل ارادی ہے۔ ارادتاً یہ رکھا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن اس صورت میں نازل ہوا کہ کافی نہ ہو۔ کافی بنا کر تو اس وقت بھیجتا جب اس کے ساتھ کسی کو نہ بھیجا ہوتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ ساتھ والے کے محتاج رہو۔ قرآن کو لے کر الگ نہ ہو جاؤ۔

عمر بھر یہ آیت یاد رکھی:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

کہئے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اور عمر بھر اس نقش قدم کو نہ دیکھئے تو یہ آیت منزل تک نہیں پہنچا سکتی اور اگر اس آیت کے حکم کی بناء پر ہم نے ان کے نقش قدم پر نظر جما دی، قرآن کے حکم سے کہ اگر مجھ سے محبت رکھتے ہو تو ان کے نقش قدم پر چلو۔ ہم نے نگاہ جما دی ان کے نقش قدم پر۔ پھر اگر عالم محویت میں ہم آیت قرآن کو بھول بھی جائیں، تب بھی ان کے نقش قدم منزل کا پتہ دیں گے۔

جناب والا! اس نقش قدم میں ضمانت ہے منزل تک پہنچانے کی۔ جبھی قرآن گویا اس نقش قدم کی طرف نگاہ موڑ کر سبکدوش ہو گیا۔ اس نے گویا ہمارا ہاتھ پکڑا دیا کہ رہنما کے ہاتھ میں کہ اس کے ساتھ جاؤ، یہ تمہیں منزل تک پہنچا دے گا۔ اسی لئے تو اس نے سند عطا کی:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

"یقیناً آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں"۔

قدم قدم پر اُردو کی کوتاہی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو حکم ہوا کہ ان کے نقش قدم پر چلو، یہ تمہیں منزل تک پہنچا دیں گے۔

ذرا دیکھئے کہ وہ نقش قدم ہماری رہبری کس طرح کرتا ہے؟ یعنی اگر الفاظ قرآن ہمیں یاد نہ بھی ہوں اور اس نقش قدم کو ہم اپنے سامنے رکھیں تو وہ نقش قدم ہمیں ضرور منزل تک پہنچا دے گا، بشرطیکہ اس نقش قدم پر نظر جمائے رہیں۔ عالم محویت میں گھبرا کر اس نقش قدم سے غافل نہ ہو جائیں۔ اس نشانِ قدم کو برابر دیکھتے رہیں، تب وہ ہمیں منزل تک پہنچائے گا۔

میں نے کہا تھا کہ اُردو زبان کی کوتاہی۔ اخلاق کا لفظ ہماری زبانوں پر آ کر اپنی بلندی کھو چکا ہے۔ ہم جب کہتے ہیں اخلاق تو اس کے معنی ہیں ملنساری سے پیش آنا۔ بہت ظاہری آؤ بھگت کرنا۔ بہت ہی لچھے دار باتیں کرنا۔ جو شخص بچھا جائے ہمارے آگے اور اسی قسم کی حرکتیں کرے تو اس کے بارے میں ہم کہہ دیتے ہیں کہ بڑا وسیع الاخلاق ہے، بڑا بلند اخلاق ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے اس اخلاق میں سچائی کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھا۔

اس لئے اگر کوئی کام ہے کسی سے۔ جیسے الیکشن کے موقع پر ووٹ حاصل کرنے کی غرض بہت شدید ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کسی صاحب کیلئے آپ کھڑے ہوئے ہیں، کام کر رہے ہیں یا خدانخواستہ خود کھڑے ہوئے ہیں۔ میں اپنے نظریے کے مطابق خدانخواستہ کہہ رہا ہوں ورنہ ماشاء اللہ کہئے تو کہہ دوں کہ خود کھڑے ہوئے ہیں۔ معلوم ہے کہ کس صاحب کے تصورات آپ کے خلاف ہیں مگر بر بنائے اخلاق اب ان کے ہاں جانا بھی ضروری ہے۔ جانتے ہوئے کہ یہ میرے موافق نہیں، وہ آپ کو دیکھتے ہی سروقد تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ابھی آپ بات کہنے نہیں پائے کہ انہوں نے کہا کہ بڑی زحمت کی آپ نے۔ اگر کوئی کام تھا تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔ میں فوراً حاضر ہو جاتا۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟ اس کے بعد جب انہوں نے بات شروع کی تو ابھی مکمل ہونے کا کیا ذکر، بیچ میں ہی آپ کی بات کاٹ کر کہا: اجی! میں کیسا؟ جتنے میری جیب میں ہیں، سب لوگ حاضر ہیں۔ جتنے آدمی میرے قبضے میں ہیں، وہ سب حاضر ہیں۔

یہ سب انہوں نے باتیں کر دیں اور اس کے بعد جب آپ رخصت ہونے لگے تو اپنے ہی گھر کے دروازے تک نہیں آئے بلکہ آپ کے گھر کے دروازے تک بھی آپ کو پہنچا دیا۔ دوسرے ہی دن سے آپ حسن اخلاق کی باتیں کرنے لگے۔ کیا کہنا! وہاں میں گیا تھا، ایسے اخلاق سے پیش آئے۔ ایسے صاحب ذوق لوگ کہاں ہوتے ہیں!

یاد رکھئے کہ حسن اخلاق کی سند تو آپ نے نقد دے دی۔ اب چاہے وہ ووٹ کسی اور کو دیں، یہاں تک کہ جب وہ ووٹ کسی اور کو دیں گے تو آپ شکایت یہی کریں گے کہ پیش تو بڑے اخلاق سے آئے تھے مگر ووٹ نہیں دیا۔ یعنی حسن اخلاق اب بھی محفوظ رہا اور اگر کہیں گے آپ اور اس نے ذرا بیداردی سے یہ کہہ دیا کہ جناب! آپ نے بہت دیر کی، میں دوسرے شخص سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اب مجبور ہوں یا یہ کہ بہت سنگدلی سے یہ کہہ دیا کہ جناب! میں آپ کے اُمیدوار کو اس لائق نہیں سمجھتا، میں دوسرے کو اس کا زیادہ اہل سمجھتا ہوں تو اگر یہ اُس نے کہہ دیا تو آپ اسی وقت آ کر کہیں گے کہ میں وہاں گیا تھا، ایسی بداخلاقی سے پیش آیا کہ مجھے کبھی تصور نہیں تھا کہ اتنا بداخلاق آدمی ہو گا۔

ذرا دیکھئے کہ پہلا شخص آپ کے نزدیک بلند اخلاق ہو گیا، اس لئے کہ اُس نے جھوٹ بولا۔ اس لئے کہ اُس نے آپ کو دھوکے میں رکھا اور دوسرا شخص آپ کے نزدیک اس لئے بداخلاق ہو گیا کہ اُس نے سچائی سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کر دیا اور آپ کو اُس نے

کسی تاریکی میں نہیں رکھا۔ تو جب ہمارا معیار اخلاق یہ ہو جائے تو بتایئے، ہم اللہ کی اس سند کی قدر ہی کیا کر سکتے ہیں جو اُس نے اپنے رسولؐ سے کہا کہ آپؐ بلند اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں۔

مگر یاد رکھئے کہ یہ ہمارے الفاظ کی کوتاہی ہے، ہمارے محاوروں کی غلطی ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے اخلاق کا دائرہ ہر کردار انسانی پر محیط ہے۔ کسی بھی شعبہ حیات سے متعلق ہو، اگر مصلحتاً طبیعت پر دباؤ ڈال کر کیا گیا ہو تو وہ فعل ہے، خلق نہیں ہے۔ لیکن اگر طبیعت کی آمادگی سے خود فطرت کی تحریک سے وہ کام انجام پائے تو وہ طاقت جو تحریک عمل کرواتی ہے، اس کا نام خلق ہے۔

مثال کے طور پر کسی مقصد کیلئے کسی حاکم نے جلسہ کیا ہے، چندے کی فراہمی کے لئے بہت نیک مقصد ہے۔ مگر پس منظر یہ ہے کہ حاکم نے تحریک کی ہے۔ وہاں جو لوگ جائیں گے، ان کی مقدار تو بہت ہوگی۔ پوچھ پوچھ کر کہ کس کس نے کتنا کتنا دیا، اس میں اضافہ کر کے جا کر دیں گے۔ یہ رقم کا دینا کام تو ہے سخاوت کا لیکن واقعی یہ شخص سخی نہیں ہے کیونکہ ان سب مصالح کی بناء پر کہ نام ہمارا سرفہرست آئے گا۔ بعد میں نہ جانے کیا کیا مفید نتائج اس چندے سے ہمارے لئے پیدا ہو جائیں گے۔ اس سب کی بناء پر کیا ہے۔ کام سخاوت کا کیا ہے مگر آدمی سخی نہیں ہے۔ فعل سخاوت ہے، خلق سخاوت نہیں ہے۔

اس کی بجائے پردۂ شب میں ایک آدمی آیا، سائل آیا اور جو کچھ آپ کے پاس رکھا تھا، وہ آپ نے اُسے اس وقت دے دیا۔ معلوم ہے کہ یہ اخبار میں نہیں آئے گا۔ معلوم ہے کہ یہ کبھی اس کا صلہ نہیں دے گا۔ تو یہ مقدار تو قلیل ہوگی مگر یہ کہ حقیقت میں وہ سخاوت ہوگی یعنی واقعی آپ کی طبیعت میں غرباء پروری اور فائدہ رسانی داخل ہے۔ جبھی تو اس وقت یہ کام ہوا۔ اگر سخی نہ ہوتے تو یہ کام نہ ہوتا۔ یاد رکھئے کہ وہ چیز جو کام کرواتی ہے، اس کا نام سخاوت ہے۔ اب چاہے کسی بھی شعبہ حیات سے متعلق ہو۔ ایک سچے کی سچائی بھی خلق ہے۔ اخلاق کے دائرہ میں انفرادی باتیں بھی داخل ہیں۔ ایک امین کی امانت داری بھی خلق ہے۔ ایک شوہر کا زوجہ سے حسن سلوک بھی خلق ہے۔ ایک باپ کا اپنی اولاد سے مناسب برتاؤ بھی خلق ہے۔ ایک محلے والے کا دوسرے لوگوں، ہمسایوں سے نیک برتاؤ بھی خلق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انفرادی زندگی، منزلی زندگی اور اجتماعی زندگی میں سے اخلاق کا دائرہ کسی ایک میں محدود نہیں ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہے اور خالق نے اپنے رسولؐ کو سند دی کہ آپؐ عظیم خلق کے درجہ پر فائز ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شعبہ حیات میں ان کو کمال سیرت کی سند دے دی، کمال کردار کی سند دے دی۔ اب چند جملوں میں پوری زندگی کو سمیٹ کر پورے اخلاق کی دنیا کو حتی الامکان سمیٹ کر پیش کر دوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جگہ پر آپ سے بڑھ کر کوئی آدمی نہیں۔ اپنی اولاد کیلئے آپ سے بڑھ کر کوئی باپ نہیں۔ اپنے شریک حیات کیلئے آپ سے بڑھ کر کوئی شوہر بھی نہیں۔ اپنے ہمسایوں کیلئے آپ سے بڑھ کر کوئی ہمسایہ بھی نہیں۔ اپنے محکوموں کا آپ سے بڑھ کر کوئی حاکم بھی نہیں اور اپنے اللہ کا آپ سے بہتر کوئی بندہ بھی نہیں۔

اخلاق کی دنیا اتنی وسیع ہے، ان کی سیرت اتنی بلند تھی کہ ارشاد ہوا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤

''آپ عظیم خلق کے درجہ پر فائز ہیں''۔

اور ان کا کردار ایسا تھا کہ اپنی محبت کا معیار ان کے نقش قدم کو قرار دیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

''اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے نقش قدم پر چلو''۔

اب یہ کہ میرے نقش قدم پر چلو۔ یہ بھی کسی شعبہ حیات سے مخصوص نہیں ہے۔ گھر کی زندگی میں بھی میرے نقش قدم پر چلو، باہر کی زندگی میں بھی میرے نقش قدم پر چلو۔ بزم میں بھی میرے نقش قدم پر چلو، رزم میں بھی میرے نقش قدم پر چلو۔ میری پیروی کرو، تب تمہیں اللہ کی محبت حاصل ہو سکتی ہے۔

جناب! جب میں خلق کی دنیا کی وسعت کو بتا چکا تو ذرا غور فرمایئے جیسے قرآن کی آیت کے ایک لفظ کی قدر اب ہوئی:

عَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝

اس کا ترجمہ اگر یوں کر دیں کہ آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں تو وہی اردو والا اخلاق ذہن میں آئے گا۔ جب میں نے خلق کی تشریح کی تو آپ نے محسوس کیا کہ خلق میں اتنی وسعت ہے کہ ہر شعبہ حیات اس میں داخل ہے۔ اسی طرح امام حسینؑ کا ایک جملہ، وہ بھی آپ سنا کرتے ہیں، اس کی بلندی پر نظر نہیں جاتی، ہمارا سب کا ایمان بارہ اماموںؑ پر ہے، چودہ معصومینؑ پر ہے، یہ تعداد ہمارا جزو ایمان ہے۔ بارہ امامؑ ہیں، چودہ معصومؑ ہیں۔ اس کے علاوہ اور ہستیوں کو ہم کہتے ہیں غیر معصوم، غیر معصوم، غیر معصوم۔ مگر یاد رکھئے کہ جو میں سمجھا ہوں، بارہ امامؑ ہیں اور چودہ معصومؑ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چودہ وہ ہیں جن کا عقلاً معصوم ہونا ضروری ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ انہیں خالق کی طرف سے وہ منصب عطا ہوا ہے کہ وہ منصب بغیر عصمت ہوتا نہیں۔ اس لئے ضرور یہ معصوم ہیں۔ اگر میں کسی دوسرے کو ہمت نہیں کرتا کبھی۔

بڑی شخصیات ہیں جو ہمارے سامنے آتی ہیں دینی حیثیت سے۔ مثلاً حضرت زینب کبریٰ۔ مجھے جرأت نہیں ہوتی غیر معصوم کہنے کی۔ مثلاً حضرت ابوالفضل العباسؑ ہیں، مجھے جرأت نہیں ہوتی غیر معصوم کہنے کی۔ میں بے باکی سے نہیں کہتا کہ وہ اگرچہ معصوم نہ تھے، میں نفی کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اسی طرح شہزادہ علی اکبرؑ، میں کھل کر نہیں کہوں گا۔ بات آئے گی تو یہ کہوں گا کہ اگرچہ فہرستِ معصومینؑ میں یہ نہیں ہیں۔ اس طرح کہوں گا مگر یہ کہ کھل کر نفی کروں کہ غیر معصوم تھے، میری ہمت نہیں ہوتی۔ کیا معنی؟ کبھی خلاف عصمت کوئی فعل ان سے دیکھا؟ جو میں کھل کر کہوں کہ غیر معصوم۔ دلیل عقلی۔ عہدہ نہیں ملا ہے، لہٰذا ہم عقلاً ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن غیر معصوم ہونا ضروری سمجھیں۔ یہ لازمی نہیں ہے۔

جناب! میں اس جملے کی آپ سے قدر کرواتا ہوں اور اس سے نتیجہ آپ نکالئے۔ کسی موقع پر کسی کے جانے کے وقت کسی کو گواہ نہیں کیا امام حسینؑ نے۔ مگر جب جوان بیٹا علی اکبرؑ جانے لگا تو ہاتھ دیئے بارگاہ الٰہی میں:

"اَللّٰھُمَّ اَشْھَدُ عَلٰی ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ قَدْبَرَزَاِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَہُ النَّاسِ بِنَبِیِّكَ خُلُقًا وَخَلْقًا وَمَنْطِقًا۔"

پروردگار! گواہ رہنا کہ اب وہ جارہا ہے کہ جو، یہ نہیں کہتے کہ جو جوان میری پیری کا سہارا ہے، یہ نہیں کہتے کہ جو میری آنکھوں کا نور ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ جو گھر بھر کی رونق ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ میرا اکڑیل جوان ہے۔ کہہ رہے ہیں، "پروردگار! اب وہ جارہا ہے "اَشْبَہُ النَّاس" کیا معنی؟ شبیہ ترین خلق۔ کیا معنی؟ تمام دنیا میں کسی دوسرے خاص سے افضل نہیں، تمام لوگوں میں، روئے زمین پر، اس وقت سب سے زیادہ مشابہ، کس سے مشابہ؟ آخر میں آئے گا "بِنَبِیِّكَ" سب سے زیادہ مشابہ تیرے رسولؐ سے۔ اس کے بعد ابھی الفاظ ختم نہیں ہوئے۔ "اَشْبَہُ النَّاسِ خَلْقًا"، جو سب سے زیادہ مشابہ ہے صورت میں۔

اسی سے ہم کہتے ہیں کہ شبیہ پیغمبرؐ۔ یعنی صورت کی طرف ذہن جاتا ہے۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی، "اَشْبَہُ النَّاسِ خَلْقًا وَخُلُقًا"، شبیہ ترین خلق رسولؐ کے ساتھ صورت میں اور سیرت میں، خلقت میں اور اخلاق میں۔ کہہ دیں کہ یہ حدیث معتبر نہیں۔ کہہ دیں کہ یہ الفاظ ثابت نہیں۔ وہ سب کچھ ہے مگر یہ الفاظ اگر مان لئے جائیں کہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مشابہ، فقط صورت میں نہیں بلکہ اخلاق میں۔ بس اب ایک عقلی سوال یہ ہے کہ غیر معصوم، معصوم سے اخلاق و سیرت میں مشابہ ترین ہو سکتا ہے؟ بس اب قدر کیجیے علی اکبرؑ کی کہ ایسا بیٹا حسینؑ سے جدا ہو رہا ہے، اور پھر کیا کہا:

"كُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰی نَبِیِّكَ نَظَرْنَا اِلٰی وَجْھِهٖ"۔

"پروردگار! جب ہم مشتاقِ زیارت تیرے رسولؐ کے ہوتے تھے تو اپنے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے"۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اصول بھی ہمیں مولاؑ نے سکھایا کہ کسی زیارت کے مشتاق ہو اور اس تک نہ پہنچ سکو تو شبیہ کو دیکھ کر تسلی کر لو۔ تو حسینؑ کو اللہ نے رسولؐ کی ایک جیتی جاگتی شبیہ عطا کی تھی۔ یہ منزل علی اکبرؑ ہے۔

23

تہذیب اسلامی

جس طرح جان کا خریدار وہ اسی طرح مال کا خریدار بھی وہ ہے شرط یہ ہے کہ جان بھی اس قابل ہو کہ وہ خریداری کر سکے۔

حضرت امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ جنہیں اقتدار حاصل ہو جائے ان سے اللہ کا عہد و پیمان یہ ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی اپنی رعایا میں سے کمزور ترین سے بھی کم رکھیں۔

چودہ سیرتیں، وہ سب محمدؐ ہیں اس لئے جس محل پر جس معصوم کی سیرت کا اتباع ضروری ہے اس کے لئے بھی وہ حقیقت شناس ہونی چاہئے جس کا اصلاحی نام اجتہاد ہے کہ کس محل پر کس کی سیرت پر عمل ضروری ہے۔

اپنے آپ کو مطلق العنان نہ سمجھو، یہ سمجھو کہ اصل میں ہماری جان کسی اور کی ہے اصل میں ہمارا مال کسی اور کا ہے اور جس وقت یہ ایمان اختیار کیا اسی وقت اس کا اقرار ہو گیا ہمارا مال ہمارا نہیں ہے اب ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ تو اپنی جان اپنی نہیں اس کی ہے اپنا مال اپنا نہیں اس کا ہے بس یہی فلسفہ قربانی ہے۔

تہذیب اسلامی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰیۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط

ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ نے خرید لیا مؤمنین سے ان کے جان و مال کو، اس کے عوض میں ان کیلئے جنت ہے۔ وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہو بھی جاتے ہیں اور یہ اللہ پر لازمی طور پر وعدہ ہے، توریت، انجیل اور قرآن سب کتابوں میں اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔

اعلان ہوا خریداری کا۔ کس چیز کی خریداری؟ نفوس اور اموال کی خریداری۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال کو بھی ذلیل نگاہ سے نہیں دیکھنے کے۔ جس طرح جان کا خریدار وہ ہے، اسی طرح مال کا خریدار بھی وہ ہے۔ شرط یہ ہے کہ جان بھی اس قابل ہو کہ وہ خریداری کر سکے۔

کوئی ظاہردار اس دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے جو کہے کہ ارے مجھے تو مال کی ضرورت نہیں، پیسے کی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کہنا کہ صدق دل سے بھی ہو۔ یعنی ملتا ہو اور پھر کہے کہ ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر ایک بات ہے اور جب نہیں ہے اور کہہ دیا کہ ضرورت نہیں ہے تو اسکی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ لیکن بہر حال اگر سچائی کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ مال کی ضرورت نہیں ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے کہ مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر خالق کی زندگی میں مثالی زندگی انسان کی یہ ہوتی کہ مال اس کے پاس ہو ہی نہیں تو ہر جگہ قرآن مجید میں "یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ" کے ساتھ "یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ" نہ ہوتا، حالانکہ ہم قرآن مجید میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں جہاں جس جس انداز میں صلوٰۃ کا ذکر ہے، زیادہ تر اسی انداز میں زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اگر مدح کے طور پر ہے کہ "اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ" تو اسی کے ساتھ ہے "اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ"۔ اگر "اَلْمُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ" ہے، اس کے ساتھ ہے "مُعْطُوْنَ الزَّکٰوۃَ" ہے۔

تو جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر، وہاں وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اب خیر ماشاء اللہ، یہاں کے بارے میں تو خیر معلوم نہیں مگر ہندوستان میں تو بالکل اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر کہتا ہوں کہ نماز تو ہر آدمی پر واجب ہے لیکن زکوٰۃ جن پر واجب ہے، ان کو میں پوری مردم شماری کے لحاظ سے تناسب قائم کروں تو ممکن ہے کہ فیصد میں کوئی نہ نکال سکوں۔ فی ہزار نکالوں، تو اگر معاشرہ ایسا ہوا کہ فی ہزار میں ایک پر۔ اس کے پاس اتنا ہوا کہ اس کیلئے شرائط عائد ہوں تو بلا شبہ قرآن کے خلاف ہے کہ ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا نام لے۔ اگر سو جگہ فرض

کیجئے صلوٰۃ کا ذکر ہوتا تو دو ایک جگہ زکوٰۃ کا ذکر ہو جاتا کیونکہ یہ ہر ایک کی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ شاذونادر کوئی ہو کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ تو ان کیلئے دو ایک جگہ حکم آجاتا لیکن یہ کہ ہر جگہ جہاں صلوٰۃ کا ذکر، وہاں زکوٰۃ کا ذکر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی نظر میں یعنی اسلام جس معاشرہ کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا، وہاں کوئی قلاش معاشرہ نہیں تھا۔ وہ کوئی مفلوک الحال معاشرہ نہیں تھا۔ وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں ہر شخص پر جس طرح صلوٰۃ واجب ہے، اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے۔ یہاں تک کہ جن کی ہستی ہمارے لئے بہت بڑی مثال ہے ترکِ دنیا کی یعنی حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام، ان کے بارے میں وسائل الشیعہ میں، ایک معتبر حدیث کی کتاب ہے ہماری کتابوں میں، اجازے جو علماء کے ہوتے ہیں، ان میں جن کتب احادیث کا نام لیا جاتا ہے کہ جن احادیث کی ہم نے روایت کی۔ جس طرح حقد میں کی کتابیں ہیں، کافی، تہذیب، من لایحضرہ الفقیہ، استبصار۔ اسی طرح بعد کے علماء کی جو کتابیں ہیں، ان میں وسائل الشیعہ بھی ہے۔

تو وسائل الشیعہ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنی قوت بازو کی کمائی سے چار سو غلام راہ خدا میں آزاد کیے۔ اب اس زمانہ میں کتنی ہی کم قیمت فرض کیجئے غلام کی لیکن پھر بھی چار سو غلاموں کیلئے ظاہر ہے کہ زرِ خطیر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کہہ دیا گیا کہ جتنے بھی غلام خرید گئے کیے، وہ اپنی ذاتی محنت کے پیسے سے خرید کر آزاد کئے۔

تو معلوم یہ ہوا کہ مال پیش خدا اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا، برابر سے دونوں چیزوں کو، کہ جان کا بھی وہ خریدار اور مال کا بھی وہ خریدار۔ لیکن اب ایک خاص چیز سوچنے اور سمجھنے کی جو اس آیت میں مجھے محسوس ہوئی ہے کہ اس پر تبصرہ ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ خریداری کا درجہ فروخت کے بعد ہے اور فروخت کرنا بندوں کا کام ہے۔ قرآن مجید میں حکم ہونا چاہئے تھا کہ تم فروخت کرو۔ جب ہم فروخت کرتے تو وہ ارشاد فرماتا کہ ہم نے خریدا۔ پھر وہ اگر حکم دیتا کہ فروخت کرو تو فروخت کرنا یا نہ کرنا ہمارے اختیار سے وابستہ ہوتا۔ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ نماز پڑھو، کیا سب نماز پڑھتے ہیں؟ کہا تو اس نے سب سے ہے کہ روزہ رکھو، کیا سب روزہ رکھتے ہیں؟ اس کی طرف کا حکم سب کیلئے ہے کہ ایمان لاؤ، کیا سب نے ایمان اختیار کیا ہے؟ اس کا حکم ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو، کیا سب اللہ کی اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے احکام اس کی طرف سے ہیں، وہ تمام احکام ایسے ہیں کہ کچھ اس کی تعمیل کرتے ہیں اور کچھ اس کی تعمیل نہیں کرتے ہیں بلکہ تعمیل کرنے والے کم ہوتے ہیں اور تعمیل نہ کرنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس نے اطاعت جبری نہیں چاہی تھی۔ اگر جبری اطاعت کروانا ہوتی تو قرآن مجید میں جو یہ کہہ دیا ہے:

وَلَوْ شَآءَ

”اگر وہ چاہتا تھا تو“۔

لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا

”جتنے بھی روئے زمین پر ہیں، سب ہی ایمان لے آتے“۔

اگر وہ چاہتا تو کیا چاہتا نہیں ہے؟ چاہتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ بندہ ارادۃً ایمان لائے۔ یہ نہیں چاہتا کہ وہ جبر سے کام لے۔ جبری طور سے، یعنی خود مومن بنادے۔ ایمان کے راستے کا دکھانا اس کا کام ہے اور ایمان کو دل میں ڈال دینا، جبری طور سے، یہ اُس کا کام نہیں ہے۔ یہ تو بہت ہی معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جبر و اختیار کا علمِ کلام میں، اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اس وقت تو میں ایک جملہ کہتا ہوں کہ فرد نا فرمان کا وجود خود دلیلِ اختیار ہے۔

تو اگر وہ جس نے نماز کا حکم دیا، روزہ کا حکم دیا، اسی طرح حکم دیتا کہ تم فروخت کرو اپنے جان و مال کو تو پھر ہمارے بس میں ہوتا کہ فروخت کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم فروخت کرتے، تب وہ قیمت کا اعلان کرتا کہ تم نے اپنا جان و مال فروخت کیا، اب میں بتاتا ہوں کہ اس کی قیمت جنت ہے تا کہ تمہارا جان و مال اس کے قبضہ میں جائے اور اس کی جنت وقت آنے پر ہمارے قبضہ میں آئے۔ اگر ہم فروخت نہ کرتے تو ہماری جان ہمارے پاس، اُس کی جنت اُس کے پاس۔ ہم جا کر جنت کا دعویٰ نہ کرتے کیونکہ ہم نے وہ معاملہ ہی نہیں کیا جس کی قیمت میں جنت ملتی۔ مگر یہ تو مجھے عجیب بات معلوم ہو رہی ہے کہ ہم سے نہیں کہتا کہ فروخت کرو اور خریداری کا اعلان کئے دیتا ہے۔ جو بعد کی منزل ہوتی ہے، اس کا اعلان اور جو قبل کی منزل ہے، اس کا ذکر ہی نہیں۔ تو اب یہ کچھ انوکھی بات ہوئی کہ اللہ نے خرید لیا۔

اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں تو مسئلہ حل ہو جائے کہ کن سے خریدا؟ یہ تو نہیں کہا کہ لوگوں سے خریدا۔ ''ناس'' کا لفظ یہاں نہیں ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ"

''اللہ نے خرید کیا مومنین سے ان کے جان و مال کو''۔

اس بناء پر کہ ان کیلئے جنت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے، اسی وقت ہم نے اپنے جان و مال کو فروخت کر دیا۔ بس ادھر ہم نے اقرارِ ایمان کیا اور یہ کہا کہ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ اقرار کر لیا کہ اب ہمارا مال ہمارا نہیں ہے، ہماری جان ہماری نہیں ہے، یہ جان بھی اس کی ہے اور یہ مال بھی اُس کا ہے۔

حقیقت میں جتنی پابندیاں ہیں احکامِ شریعت کی، وہ تمام پابندیاں اب اس بیع کے تقاضے پر ہیں۔ ہم نے اپنی جان کو فروخت کر دیا، اب وہ ہم سے مطالبہ رکھتا ہے کہ دن میں اتنا وقت تم میرے اس کام میں صرف کرو جس کا نام نماز ہے اور ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے معنی ہی ہیں کہ اتنی دیر ہم اپنی جان اور اپنے اوقاتِ حیات پر تصرف غاصبانہ کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا گیارہ مہینے شوق سے کھانے پینے کی چیزیں کھاؤ لیکن دیکھو! ایک مہینے میں، اور وہ بھی رات کو نہیں، دن کو ہماری طرف سے یہ پابندی ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کرو۔ اب یہاں ظاہر ہے کہ جو چیز ہم نے کھائی ہے، وہ مال سے خریدی ہے تو وہ مال بھی ملک غیر تھا، اس لئے یہ تصرف ناجائز ہوا اور دن بھر جو کام ہم نے روزے کے تقاضے کے خلاف کئے اور روزہ نہیں رکھا تو وہی بات ہوگئی کہ ہم نے تصرف غاصبانہ کیا۔ جتنے بھی احکامِ شرع ہیں، وہ اسی کے تحت آتے ہیں۔ اسی طرح جو محرمات ہیں، جو ناجائز چیزیں ہیں، ہمارا اچھے کپڑے پہننا خالق کا ناپسند نہیں ہے۔ وہ کوئی دوسرا دین ہوگا جس میں لٹا پٹا رہنا خالق کے تقرب کا باعث ہوتا ہے، یہاں تو ایک مقدار میں لباس جزوِ صحتِ نماز بن گیا۔

اب نہ جانے کن چور دروازوں سے مسلمانوں میں بھی یہ تصورات داخل ہو گئے ہیں کہ برہنہ رہنا مقتضائے ولایت خدا ہو گیا۔ یہاں تو نماز صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ اتنا لباس نہ ہو کہ جس کے بعد آدمی برہنہ نہ کہلائے۔ یہ تو مرد کیلئے لباس ہے، عورت کی نماز تو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہاتھوں اور چہرے کے سوا سب اعضاء چھپے ہوئے نہ ہوں۔

تو معلوم ہوا کہ ہمارا لباس پہننا خالق کو ناپسند نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لباس پہنو تو بوسیدہ اور خراب پہنو۔ جی نہیں! کہا گیا کہ جب نماز کیلئے آؤ تو جو بہتر سے بہتر لباس تمہارے پاس ہو، وہ پہن کر آؤ۔ اُسے ہماری پریشان حالی منظور ہوتی تو عطر لگا کر نماز پڑھنے کا ثواب کیوں ہوتا؟ آجکل بال پریشان رکھنا اور گویا ہر وقت مصیبت زدہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا گویا ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے اور وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کی جا نمازوں میں کنگھا موجود ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محاسن میں شانہ کرنا شامل ہے یعنی آراستہ ہو کر بارگاہِ الٰہی میں آئے، پریشان حالی کفرانِ نعمت الٰہی ہے۔

ہاں! کسی بلند مقصد کی خاطر انسان پیوند والا لباس پہنے تو صحیح ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ بے شک پیوند دار لباس پہنتے تھے۔ آپؑ نے اس کا فلسفہ نہج البلاغہ میں خود بتایا ہے۔ آپؑ کے اصحاب میں سے ایک نے، عاصم ابن زیادہ حارثی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے بھائی نے گھر کے کپڑے پہننے چھوڑ دیے ہیں، گھر میں پکا ہوا کھانا چھوڑ دیا ہے، ٹاٹ کے کپڑے پہن لیے ہیں اور روکھا سوکھا کھانا کھا لیتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں آؤں گا اور اُسے سمجھاؤں گا، نصیحت کروں گا۔

آپؑ خوش نہیں ہوئے کہ اس نے بڑا اچھا کیا۔ حضرتؑ تشریف لائے اور بڑے سخت انداز میں کہا: اے شخص! یہ کیا زندگی اختیار کی ہے؟ کیا تیرے گھر میں پکنے والی غذا مالِ حرام سے ہوتی ہے؟ کیا تیرا پہننے کا لباس مالِ ناجائز سے ہے؟ پھر یہ کس طرح کی زندگی تو نے اختیار کر لی؟ پھر خود ہی فرمایا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ خدا نے خود ہی لذائذ اور طیبات کو حلال قرار دیا ہے اور پھر خود ہی ان پر سزا بھی دے گا۔ یہ عدلِ الٰہی کے خلاف ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟

اتنے سخت الفاظ میں کہا کہ اُس تاب مقاومت نہ رہی۔ فوراً کہا: "سَمْعًا وَطَاعَةً"۔

جو آپؑ ارشاد فرما رہے ہیں، اس پر عمل کروں گا۔ جو کھانا کھاتا تھا، وہی کھاؤں گا، کپڑا پہنتا تھا، وہی پہنوں گا۔

دیکھئے! مقتضائے اطاعت یہی ہے کہ حکم کی تعمیل تو کیجئے، پھر اگر اس کی مصلحت کو سمجھنا بھی ہے تو اُسے سمجھتے رہیے۔ مگر اطاعت کو اس سمجھنے پر موقوف نہ رکھئے۔ اس نے فوراً اقرارِ اطاعت کیا اور حضرتؑ کا غیظ و غضب کا انداز بدل گیا۔ مگر اصحابِ رسولؐ اور اصحابِ آئمہؑ طالب علم بھی تو تھے اور طالب علم کو حق ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، وہ پوچھ لے۔ پس جب اقرارِ اطاعت کر لیا تو اُس نے دبی زبان سے کہا

"حضورؑ! میں نے اقرار تو کر لیا مگر یہ حضرتؑ کا لباس جو ہے؟" دیکھئے! کتنی بڑی خلش آپؑ کے ذہن کی بھی اُس نے دُور کروا دی۔ یہ آپ جو اس روکھی سوکھی غذا اور پرانے لباس میں نظر آتے ہیں، یہ کیا ہے؟ بظاہر پھر حضرتؑ کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ فرماتے ہیں: "اے شخص! میری تیری برابری نہیں ہے۔"

اب ایک بات کہوں گا کہ حضرتؑ نے کیا معیار مقرر فرمایا؟ میں کہتا ہوں یہی جملہ کہ ہماری تمہاری برابری نہیں ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں جائیے اور بڑے بڑے عہدیداروں سے اور بڑے بڑے مسند اقتدار پر بیٹھنے والوں سے پوچھئے کہ سرکار والا! یہ آپ کے پاس اتنی کوٹھیاں اور ہمارے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے؟ وہ یہاں کہیں گے کہ کیا ہماری تمہاری برابری ہے؟

کسی سے یہ کہئے کہ آپ کے پاس اتنی موٹریں ہیں اور ہمارے پاس سائیکل تک نہیں ہے۔ وہ کہیں گے کیا ہماری تمہاری برابری ہے؟ محلِ استعمال اس جملے کا دنیا میں یہ ہے۔ مگر امیر المومنینؑ کے ارشاد فرما رہے ہیں؟ ارے جنہیں اقتدار حاصل ہو جائے، ان سے اللہ کا عہد و پیمان یہ ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی اپنی رعایا میں سے کمزور ترین فرد کے برابر رکھیں۔ آپؑ نے اپنے انفرادی عمل کا جو فلسفہ بتایا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ دیگر معصومینؑ نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا، حالانکہ وہ سب نورِ واحد تھے، ایک سلسلہ کی کڑی تھے مگر ہر دفعہ امیر المومنینؑ کا کردار اس محل پر کیوں پیش ہوتا ہے؟

اب اس ارشاد کی روشنی میں میرا ذہن گیا اپنے حدودِ مطالعہ کی طرف کہ یہ سادگی کے جتنے واقعات ہیں، سب کوفہ کے ہیں۔ یعنی اس دَور کے نہیں ہیں جب گوشہ نشین تھے۔ یہ زندگی جو جزوِ تاریخ بنی ہے، یہ اس دَور کی ہے جب آپ کرسیِ اقتدار پر متمکن تھے۔ آپؑ کے سامنے دو نمونے موجود ہیں کہ ایک سائل آیا مسجد میں اور اُس نے سوال کیا۔ حضرتؑ نے بھوسی بھرا ہوا جو کا آٹا، جو آپؑ نوش فرما رہے تھے، وہی اس کی طرف بڑھا دیا اُس نے کہا: ''اے بندۂ خدا! یہ تو میرے حلق سے نہیں اُترے گا۔''

آپؑ نے فرمایا: یہ مجھ کو دے دو، میں ہی اس کو کھاؤں گا۔ میرے پاس تو یہی ہے اور اگر اچھی غذا کی تلاش ہے تو حسنِ مجتبیٰ کے دروازے پر جاؤ، وہاں مہمانوں کیلئے غذائے لذیز موجود ہوگی۔''

تو آپ سنا کرتے ہیں لیکن چونکہ ذکرِ علی ابن ابی طالبؑ میرے لئے اور آپ کیلئے بھی باعثِ ثواب ہے، لہٰذا بیان کرتا ہوں کہ وہ وہاں گیا اور فوراً اس کیلئے کھانا آ گیا۔ وہاں کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے وہ پر تکلف کھانا تھا۔ اس نے کھانا اس طرح کھایا کہ ایک نوالہ کھاتا ہے اور ایک رکھتا جاتا ہے۔ حضرتؑ نے توجہ کی اور کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اگر تمہارے ساتھ اہل و عیال ہیں تو یہاں کوئی ممانعت نہیں ہے، تم لیتے جانا۔ اُس نے کہا کہ میں اکیلا آیا ہوں مگر مسجد میں ایک سائل کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ایک محتاج کو دیکھ آیا ہوں۔ میں نے سوال کیا تو وہ تخی تو ایسا تھا کہ جو اُس کے پاس تھا، وہ اُس نے اٹھا کر مجھے دے دیا مگر میں نے دیکھا تو بھوسی بھرا ہوا آٹا ہے جسے میں کھا ہی نہیں سکتا تھا یہ میں اُس کیلئے لئے جا رہا ہوں۔

اس فقیر کیلئے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ ارے وہ فقیر نہیں ہیں۔ وہ تو مالکِ دین و دنیا ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار حضرت علیؑ ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک ہی وقت میں دونوں نمونے موجود ہیں۔ اگر (معاذ اللہ) یہ ترکِ اولیٰ بھی ہوتا تو امیر المومنینؑ کے علم و رضا کے ساتھ امام حسنؑ کے ہاں وہ غذائیں تیار کیوں ہوتیں اور آپؑ سائل کو وہاں کیوں بھیجتے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حکمِ شرعی، بحدِ احتساب نہیں تھا بلکہ یہ آپؑ کا انفرادی عمل تھا، آپؑ کے موقف کے لحاظ سے۔

اسی لئے یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے کہ کہہ دیں کہ اتباع کرنا چاہئے، اتباع کرنا چاہئے۔ کسی ایک معصوم کا نام

لے دیا کہ اتباع کرنا چاہئے۔ مثلاً کوئی ہنگامہ ہوا، کہا کہ امام حسنؑ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

یادر کھئے! آنکھیں بند کر کے اتباع بھی نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ چودہ سیرتیں ہیں۔ وہ سب محمدؐ تھے۔ اس لئے جس محل پر جس معصوم کی سیرت کا اتباع ضروری ہے، اس کیلئے بھی وہ نظر حقیقت شناس ہونی چاہئے جس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے کہ کس محل پر کس معصوم کی سیرت پر عمل ضروری ہے کیونکہ سیرتیں سب صحیح ہیں مگر ہر ایک ہر ایک محل کے لحاظ سے صحیح ہے۔ ہر ایک کے موقف کے لحاظ سے ٹھیک ہے۔ کسی ایک کو لے لینا اور ہر جگہ اسی کا حوالہ دے دینا، یہ کُل کو جزو میں محدود کرنا ہے۔

غرض یہ کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا اچھا پہننا اللہ کو ناپسند نہیں ہے مگر پھر بھی کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ خالص ریشم نہ ہو، آرائش کرو مگر سونا نہ پہنو، وہ بھی مردوں کیلئے۔ عورتوں کیلئے یہ حکم نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارا اچھا کھانا اُسے ناپسند نہیں ہے۔ اُس نے کہا ہے:

''تمہارے لئے سب طیبات حلال ہیں''۔

یہ اور بات کہ کسی کو حرام ہی میں مزہ ملے۔ ورنہ جو حلال غذائیں ہیں، ان میں ذائقے کی کمی نہیں ہے۔ اس میں لذیذ تر غذائیں کھانے کا آپ کو حق ہے اور کوئی الزام نہیں، مکروہ نہیں ہوگا۔ سوائے چند خاص چیزوں کے کہ جنہیں کہہ دیا کہ مکروہ ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ لذیذ کھانا مکروہ ہے۔ یہ کسی عالم نے نہیں کہا ہوگا۔ پس ہمارا اچھا کھانا اُسے ناپسند نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ پابندیاں ہیں۔ گوشت حلال ہے مگر ذبیحہ کا ہونا چاہئے، تب جائز ہوگا۔ یہ سب کیا ہے؟ سب چیزیں پسندیدہ ہیں۔ اللہ کو ناگوار نہیں ہیں مگر اس میں پابندیاں ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ تمہیں مطلق العنان ہونے کا احساس نہ ہو کہ جان ہماری ہے، مال ہمارا ہے۔ جو چاہیں کھائیں، جو چاہیں پئیں۔

ہر وقت ایک بالادست صاحب اقتدار کا احساس ہونا چاہئے۔ اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے وہ مشکل کام انجام دیا کہ دنیا میں جو ہمیشہ متضاد چیزیں سمجھی گئیں، ان کو اکٹھا کر دیا یعنی ہمیشہ جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں سمجھی گئیں۔ ہمیشہ جسمانی ترقی کو روحانی ترقی کے خلاف سمجھا گیا۔ روحانی ترقی ہے تو پھر جسم کے تقاضے محفوظ نہیں رہیں گے۔ اسی کا ایک رُخ ہو گیا دنیا اور دین، کہ دنیا و دین ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یا دنیا کو لو یا آخرت کو لے لو۔ یا دنیا کو لو یا دین کو لو۔ یہ تصور عام تھا لیکن اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام شریعت کے لحاظ سے اس کو بدلا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ جب دو چیزیں الگ الگ ہو گئیں تو کچھ کے ماہر اور ہوئے اور کچھ کے ماہر اور ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ علوم دنیا کے ماہر بالکل الگ ہوں گے اور علوم دین کے ماہر بالکل الگ ہوں گے۔ پھر حکومتیں بھی الگ الگ ہو گئیں۔ دنیاوی حکومت کے سربراہ اور ہوں گے، دینی حکومت کے سربراہ اور ہوں گے۔ عیسائیت میں رہبانیت تھی۔ لہٰذا وہاں کا وہ مقولہ بالکل صحیح کہ جو قیصر کا حق ہے، وہ قیصر کو دیتے ہیں، جو پوپ کا حق ہے، وہ پوپ کو دیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں۔ تو ہر ایک کے تقاضے الگ الگ ہوئے۔ اسلام نے دین و دنیا کو بالکل سمو کر ایک ایسا مزاج معتدل پیدا کیا جس کی وجہ سے معیار دین بالکل بدل گیا۔

دنیا میں ہر جگہ پیشہ کوئی اور، اور مذہب کوئی اور یعنی ایک عیسائی ڈاکٹر ہے تو چھ دن تک ڈاکٹر ہے، ساتویں دن جب وہ گر

جاجائے گا، تب معلوم ہوگا کہ عیسائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے میں عیسائیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایک تاجر جب دوکان پر ہے تو اس وقت اس کے مذہب کا کوئی سوال نہیں۔ ہاں! جب وہ عبادت کیلئے جائے گا تو اس وقت مذہب کا سوال ہوگا۔

اسی طرح ان کی عبادت بس گرجا میں جا کر ہوگی، اپنے گھر میں نہیں ہوسکتی، نہ روز ہوسکتی ہے۔ جب گرجا پہنچیں گے تو وہاں عبادت کریں گے۔ وہاں پھر خدا کو یاد کریں گے۔ اسلامی نظام نے یہ کام کیا کہ خدا کو یاد کیا نہیں جاتا، بلکہ خدا کو یاد رکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم ڈاکٹر ہو تو بھی مسلمان ڈاکٹر ہو۔ اگر تم تاجر ہو تو تم کو مسلمان تاجر ہونا ہے۔ اگر تم کسی اور شعبہ کو اختیار کئے ہوئے ہو تو بھی تم کو مسلمان ہونا ہے۔

لہٰذا شعبہ حیات میں یادِ الٰہی کارفرما ہوگئی۔ دیکھئے! روزمرہ کی زندگی میں کہ آپ بزاز کی دکان پر گئے اور اس سے کہا کہ اچھے سے اچھا کپڑا دکھاؤ۔ نئے ڈیزائن دکھاؤ، نئی وضع دکھاؤ۔ اس سے مطلب نہیں کہ خوشنما ہے یا بدنما ہے۔ اس نے نئی وضع دکھانا شروع کی۔ اب تک جتنا کام ہورہا ہے، یہ مادی ضرورت کیلئے یعنی تن آسانی کی خاطر۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن ادھر ایک کپڑا آیا اور اگر آپ پابندِ شرع ہیں اور آپ نے پوچھا کہ یہ خالص ریشم تو نہیں ہے؟ بس پتہ چل گیا کہ انسان اپنی تن پوشی کی راہ میں خالق کو نہیں بھولا ہے۔ اسی طرح بازار گئے، طرح طرح کی لذیذ غذائیں نظر آئیں۔ پوچھا کہ یہ ذبیحہ ہے؟ پتہ چل گیا کہ شکم پُری کی خاطر اللہ کو فراموش نہیں کیا جارہا۔ یہ تو روزمرہ کی بات ہے۔ اب ایک شعبہ ہے، جس کا مجھے تجربہ تو نہیں ہے مگر اندازہ تو ہے ہی کہ کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ہوتا ہے۔ شکار پر گئے، شکار ملا، کتنی دوڑ دھوپ اور تگ و دو کے بعد۔ فوراً گئے، جا کر دیکھا کہ ارے یہ تو مر گیا۔ تو ادھر کہا کہ ارے یہ تو مر گیا، اس کے معنی یہ ہیں ضرورتِ مادی کے اس تگ و دَو کے عالم میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔

اور جناب! اب وہ ناقابلِ بیان مرحلہ، میرا تجربہ نہیں ہے اور یہ مقامِ منبر کا تقاضا بھی نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ایسی نفسانی خواہش جس کی تکمیل میں انسان اور حیوان میں، بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کیلئے تمام شرائط حاصل اور تمام موانع ختم اور اس کے ساتھ تراضی طرفین حاصل، دونوں بالکل آمادہ لیکن فوراً احساس ہوتا ہے کہ جب تک خاص الفاظ زبان پر جاری نہ کریں، اس وقت تک ایک پردہ درمیان میں ہے۔ جب ایجاب و قبول کے صیغے جاری ہوں گے، تب جا کر یہ ہمارے لئے حلال ہے۔

بس معلوم ہوگیا کہ طوفانی خواہشات کے اس تموج میں بھی بندہ خدا کو نہیں بھولا۔ میں کہتا ہوں کہ ناجائز تعلقات بھی تو کبھی دائمی رہتے ہیں۔ عمر بھر ناجائز تعلقات رہے، کیا ایسا نہیں ہوتا؟ تو جو فرق دائمی ناجائز تعلقات میں اور عقدِ دائمی میں ہے، وہی فرق عارضی ناجائز تعلقات اور عقدِ عارضی میں ہے۔ اس کے وقتی ہونے سے خصوصیت نہیں پیدا ہوتی۔ فرق باضابطہ اور بے ضابطہ ہونے کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو مطلق العنان نہ سمجھو۔ یہ سمجھو کہ ہماری جان اصل میں کسی اور کی ہے اور ہمارا مال بھی کسی اور کا ہے۔

جس وقت ایمان اختیار کیا، اُسی وقت اقرار ہوگیا کہ اب ہمارا مال نہیں ہے اور ہماری جان ہماری نہیں ہے۔ اسی میں درحقیقت اسلامی سیاست بھی مضمر ہے۔ جس وقت ایمان لے آئے، اس وقت اقرار ہوگیا کہ اس کے مقابلہ میں نہ ہماری جان ہماری، نہ ہمارا مال ہمارا۔ تو اس کے اقتدار کے مقابلہ میں نہ شوریٰ کا حق رہا، نہ اجماع کا حق رہا۔ اس لئے کہ شوریٰ میں چھ سات

آدمی جمع ہوئے، وہ سب کیا ہیں؟ ایمان لائے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں تو ان کے شوریٰ کو معتبر نہیں سمجھتا، خواہ پانچ چھ ہوں۔

اب عدد بھی یاد ہے کیونکہ تاریخ میں یہی آیا ہے۔ پس خواہ پانچ ہو یا چھ ہوں، سو دو سو ہوں، ہزار دو ہزار ہوں، دس ہزار ہوں۔ جتنی مردم شماری اس وقت کی کوئی سمجھے، اس کا نام اجماع ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب ایمان رکھنے والے بحمد للہ، بہ اقرار خود سب مومن ہیں ورنہ مسلم ہی نہیں ہیں کیونکہ بغیر اقرار ایمان کوئی مسلمان بھی نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان ہے تو مدعی ایمان ضرور ہے۔ جب مدعی ایمان ہے یعنی جماعت ہے مؤمنین کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت ایمان لائے تھے، اسی وقت اللہ کے مقابلہ میں بے اختیار ہو گئے تھے۔ بے اختیار با اختیار۔

با اختیار کیا ہے؟ ثبوت اختیار۔ بے اختیار کیا ہے؟ نفی اختیار۔ تو اب وہ دس ہزار ہوں یا دس لاکھ ہوں، دس کروڑ ہوں، دس ارب ہوں، وہ سب بے اختیار، بے اختیار۔ تو بے اختیاروں کے مجمع سے با اختیار کیونکر نکلے گا؟ اس کو معمولی ریاضی کے طالب علم حساب پڑھنے والے بچے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تختہ کاغذ کا ہو، اس پر جتنے زیرو بن سکتے ہیں، بنا دیجئے تو جو عدد بنے گا، وہ صفر ہی ہوگا۔

تو جناب! اپنی جان اپنی نہیں، اپنا مال اپنا نہیں۔ یہی فلسفہ قربانی ہے۔ اپنا نہیں، اس کا ہے تو اس کی راہ میں خرچ ہونا چاہئے۔ اس لیے حقیقت میں ہر حکم شرع ایک حد تک قربانی کا مطالبہ ہے۔ نماز جو ہم پڑھتے ہیں۔ اس میں بھی کچھ اپنے اوقات، کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ اپنے مشاغل کی قربانی ہے۔ روزے میں کتنی خواہشوں کی قربانی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ میں کچھ مالی قربانی ہے اور حج میں تو ہر قسم کی قربانی ہے۔ مالی قربانی الگ، رکھ رکھاؤ اور وقار کی قربانی الگ۔ اپنی وضع قطع اور اپنے لباس کی قربانی الگ۔

معاف کریں آجکل کے نوجوان! بال بڑھانے پر کچھ لوگ بڑے ریاض کرتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں۔ طرح طرح سے بناتے ہیں۔ حج کیا تو منیٰ میں جا کر فارغ البال ہونا پڑے گا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی قربانیاں ہیں جن کا پوری زندگی مطالبہ ہے اور اگر انسان اسے پورا کر رہا ہے تو وہ حقیقت میں قربانیاں پیش کر رہا ہے۔ اگر محل شہادت نہیں آیا تو یہی قربانیاں اس کو پیش خدا بلند سے بلند مرتبے حاصل کروانے کیلئے کافی ہیں کیونکہ شہادت تو وابستہ ہے ایسے کچھ حالات سے جو سینکڑوں برس پیدا نہیں ہوتے اور اگر انسان نے شوق شہادت میں کوئی اپنی طرف سے ایسا کام کیا جو اس کے خیال میں اس کے تقاضائے شہادت کو پیدا کرے تو یاد رکھئے گا کہ پھر وہ ہلاکت ہوگی، شہادت نہیں ہوگی۔

بڑا نازک مرحلہ ہے۔ شوق شہادت میں اگر کوئی غلط قدم اُٹھ گیا تو شہادت کی منزل دور ہو گئی، ہلاکتِ ابدی رہ گئی۔ جان جب حقیقت میں اس کی دی ہوئی ہے تو جتنی قربانی جس وقت وہ چاہ رہا ہے، اتنی ہی کرو۔ اگر اس سے زیادہ قربانی کرو گے تو وہ تو اپنے جی کی خاطر ہوگی۔ یعنی شوق شہادت میں قربانی پیش کر رہے ہیں تو وہ تو آپ کے شوق کی راہ میں قربانی ہوئی، وہ اللہ کی خاطر تو نہیں ہوئی۔ تو شوق شہادت کوئی غلط قدم نہ اٹھوائے ورنہ پھر شہادت کی منزل بہت دور ہو جائے گی۔

مجھے یہ بات اس لئے کہنے کی ضرورت ہوئی کہ جب تک کوئی ہوا چلتی ہے تو لوگ اندھا دھند قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ایک لفظ چلا شوق شہادت کا۔ ہر جگہ اگر یہ ہوا چلنے لگی تو نہ جانے کتنے غلط قدم اٹھ جائیں گے۔ وہ بڑا خطرناک ہوگا۔ اس کی وجہ سے ہلاکتِ ابدی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا بہت سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ شہادت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ خونریزی سے بہت لوگوں کو نفرت ہوگئی ہے۔ ارے خونریزی؟ میں کہتا ہوں کہ اگر معرکہ جہاد میں آتا ہے تو ہر آدمی کو قاتل ہونے کیلئے آنا چاہئے۔ اگر شوق شہادت میں کوئی کمی رہ گئی، قاتل ہونے کی کوشش میں، تو پھر وہ ہلاکت ہوگی، شہادت نہیں ہوگی۔ ہم زیادہ سے زیادہ افراد کو تہ تیغ کریں گے اور اگر ہم نے کوئی کمی کردی کہ بہت اچھا ہے کہ شہید ہو جائیں اور بہت برا ہوگا کہ شہید نہیں ہوں گے۔ یہ بڑی سخت منزل ہے، اسی لئے ہر منزل پر ضرورت ہے زندہ رہنما کی۔

24

حقوق العباد

اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب سے اہل بیتؑ اطہار کے عمل کی ترتیب کو دیکھ رہا تھا، لہٰذا اس نے لوحِ محفوظ میں جو ان کے عمل میں ہوگا اسی ترتیب سے الفاظ فرما دیئے۔

جس طرح خالق کی عطا مومن وکافر نہیں دیکھتی اسی طرح یہ اس کے نمائندہ ہیں جن کی عطا مومن وکافر نہیں دیکھتی۔

جناب جبرئیل امین بسم اللہ سمیت اور آیتیں مدحیہ لئے ہوئے اترے اور وہ سورہ پڑھ کر پیغمبر خدا نے تمام اہل بیتؑ کو سنایا کہ لو تم لوگ بیان کرو یا نہ کرو خالق نے تمہاری ساری روداد سنا دی اب بتایئے جن کا ذکر خدا رسول سے کرے ان کا ذکر اگر ہم کریں تو عبادت نہ ہو۔

بابِ فضائل میں تین دن 'ھَلْ اَتیٰ' والے اور باب مصائب میں تین دن کربلا والے۔

دنیا کی بہت سی شہزادیوں کے نام ہمیں یاد نہیں ہیں مگر خانہ سیدہ کی اس کنیز کا نام لوح دل پر نقش ہے اور اگر خود فضہ سے پوچھا جاتا کہ آپ کو تاجدار ہونا پسند ہے یا یہاں کی کنیز ہونا تو وہ اس طرح کنیزی کو ترجیح دیتیں۔

حقوق العباد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا ①

اس آیت کے پہلے الفاظ کی مناسبت سے اس کا نام ھَلۡ اَتٰی ہوگیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اس سورۃ کا پس منظر یہ ہے کہ شہزادے حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ بیمار ہوئے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ ہے ان میں سے ہر ہستی ایسی تھی کہ اگر صرف وہ بارگاہِ الٰہی میں دعا کر دیتی تو خداوند عالم ان کی دعا کو قبول فرماتا اور حصولِ مقصد کیلئے ان کی دعا کافی ہوتی۔ مگر ہمیں ایک اجازت کا ذریعہ سکھانے کیلئے یہ سب کچھ ہے۔ پیغمبر ُخدا کے ارشاد کے مطابق بعض روایات میں یہی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ تم تین روزے نذر کرو۔ اس کو عرفِ عام میں منت ماننا کہتے ہیں۔ یہ نذر کرو کہ خداوند عالم حسنینؑ کو صحت عطا فرمائے گا تو ہم تین روزے رکھیں گے۔

خداوند عالم نے صحت عطا فرمائی۔ ہم اکثر منتیں مان لیتے ہیں اور نذریں کر لیتے ہیں لیکن اس وقت نذر کر لینے میں تو اپنی ضرورت ہوتی ہے۔ وفائے نذر میں پھر تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ طرح طرح کے حیلے حوالوں سے یہ بات ہو جائے تو اس نذر کو پورا کریں گے اور وہ بات ہو جائے تو اس نذر کو پورا کریں گے۔ لیکن یہ آلِ رسولؐ ہیں۔ بالکل نمایاں چیز جو ہمارے ذہنوں میں تاخیر کی متقاضی ہے، وہ یہ کہ ابھی تو صحت ہوئی ہے، صحت کے بعد ایک قوت آنے کی منزل ہوتی ہے کہ مریض میں طاقت آجائے۔ مگر وہاں چونکہ نذر صحت کی تھی، طاقت آنے کی تو شرط نہیں تھی۔ لہٰذا ابھی میں عرض کروں گا کہ بچے کتنے ناتوان ہیں، کمزور ہیں لیکن وفائے نذر کی فکر ہوگئی۔

اب ایک پہلو پر اہلِ نظر غور کریں کہ شہزادوںؑ کی صحت کیلئے نذر کی تھی ماں باپ نے۔ خود شہزادوںؑ نے تو نذر نہیں کی تھی مگر یہ ان کا ذوقِ عبادت ہے کہ نذر کرنے والی صرف دو ہستیاں تھیں اور وفائے نذر میں خود وہ شہزادے بھی شریک ہو گئے جن کی صحت کیلئے نذر مانی گئی تھی۔ اب اس گھر میں رہنے کا صدقہ ہے کہ وفائے نذر میں گھر کی کنیز بھی شریک ہوگئی یعنی جنابِ فضہ جو اس گھر کی کنیز خاص ہیں۔

اس زمانہ میں اس قسم کے رشتہ کا نام کنیز ہی ہوتا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی بہت سی ملکاؤں کے نام ہمیں یاد نہیں ہیں مگر خانۂ سیدہؑ کی اس کنیز کا نام لوحِ دل پر نقش ہے اور اگر خود فضہ سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہیں تاجدار ہونا پسند ہے یا یہاں کی کنیز ہونا تو وہ بھی اس کی کنیزی کو ترجیح دیتیں۔

تو اب تین روزے رکھنے میں حضرت امیر المومنینؑ نے وفائے نذر کیلئے گویا بس اتنی آسانی اختیار فرمائی کہ معلوم تھا کہ تین روزے رکھنے ہیں اور تین دن افطار ہوگا۔ لہٰذا اب روز کہاں انتظام کرتا پھروں گا۔ ایک دم سے تین روزوں کے افطار کا سامان پانچ آدمیوں کا کر لیا جائے۔ اب اس کیلئے آلِ رسولؐ کی وہ زندگی کہ جس طرح سے یہاں انتظام ہوتا تھا، اسی طرح امیر المومنینؑ نے انتظام

فرمایا۔ایک یہودی کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے صوف بہ اُجرت حاصل فرمایا کہ اس کو درست کیا جائے گا اور اس کے معاوضہ میں اتنا اناج جو تین دن تک پانچ روزہ داروں کیلئے کافی ہو، وہ حاصلکیا گیا۔ وہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سپرد ہو گیا۔ وہ اناج بھی اور وہ صوف بھی۔

میں کہتا ہوں کہ ان ہستیوں کے جو روزمرہ کے کام ہیں، انہی سے ہمارے لئے وہ نظامِ حیات مرتب ہوتا ہے جو درحقیقت نظامِ اسلام کا جزو ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ اسلام نے پردہ بھی رکھ کر ایک طبقہ کو بیکار بنا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا دیکھے کہ بیکار کوئی طبقہ نہیں ہوتا، صرف نظامِ عمل میں تقسیم عمل ہے اور وہ یہاں بھی نمایاں ہے کہ گھر کے باہر کا جتنا کام تھا، وہ حضرت علیؑ نے کیا اور گھر کے اندر کا جتنا کام تھا، وہ حضرت فاطمہؑ زہرا کریں گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غذا جو دہن تک پہنچے گی، اس میں فقط امیر المومنینؑ کی کارگزاری شریک ہے اور اس میں حضرتِ خاتونِ جنت کی کارگزاری شریک نہیں ہے۔ یہی نظامِ عمل ہے کہ مرد مرد رہتے ہوئے کارآمد ہو اور عورت عورت رہتے ہوئے کارآمد ہو۔

حضورِ والا! یہ تو ہر ایک کی سمجھ میں آئے گا اور وہ تائید کرے گا کہ مرد کیلئے یہ کمال نہیں ہے کہ اس میں مردانگی پیدا ہو جائے بلکہ مرد مرد رہتے ہوئے ترقی کرے اور عورت عورت رہتے ہوئے ترقی کرے۔ اس کے لحاظ سے جو مناسب ہو، وہ کام کرے اور جو اس کے مناسبِ حال ہو، یہ وہ کام انجام دے۔ اناج اور صوف یہ دونوں چیزیں رکھ لی گئیں۔ حضرت فاطمہؑ نے صوف کے تین حصے کئے اور اناج کے بھی تین حصے کئے۔ ایک حصہ صوف کا دن بھر میں درست فرمایا اور ایک حصہ اناج کا درست کیا اور غذا بننے کی حد تک جو منزلیں ہیں وہ سب سیدہؑ نے طے فرمائیں۔ اس کے بعد افطار، وہی روٹیاں جو اس اناج کی تھیں اور اس کے ساتھ کوئی چیز رکھ دی گئی سامنے۔ اب افطار کرنا چاہتے ہیں کہ دروازے پر سے آواز آئی:

"اَنَا مِسْکِیْنٌ مِنْ مَسَاکِیْنِ الْمَدِیْنَہ"۔

"میں ایک مسکین ہوں مدینہ کے مساکین میں سے"۔

بس یہ آواز آنا تھی کہ روزہ داروں نے ہاتھ روکے۔ امیر المومنینؑ نے اپنی روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، سیدہؑ عالم نے اپنی روٹی اٹھائی، حسنینؑ نے اپنی روٹیاں بڑھائیں اور فضہ جب روزہ کی منزل میں مالکوں سے پیچھے نہیں رہی تھیں تو انفاق کی منزل میں کیوں پیچھے رہتیں۔ لہٰذا فضہ نے بھی اپنی روٹی بڑھائی۔

کوئی ضروری نہیں کہ امیر المومنینؑ نے ہر ایک سے کہا ہو کہ تم بھی اپنی روٹی دے دو۔ اس لئے کہ سائل ایک تھا۔ اس کے سوال کو پورا کرنے کیلئے ایک آدمی کی غذا کافی تھی مگر یہ تو ماشاء اللہ علمی درسگاہ ہے۔ شعراء بھی ممکن ہے کہیں بیٹھے ہوں۔ شاعری میں جناب ایک ہوتا ہے "توارد" یعنی وہی مصرع کسی ایک نے کہا اور وہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں بھی آ گیا۔ اگر واقعی یہی ہو کہ اس کو اس کا علم نہیں تھا تو کہتے ہیں یہ "توارد" ہو گیا۔ یعنی ایک ہی مصرع اتفاق سے دونوں کے ذہن میں آیا۔ اس نے بھی وہی کہا، اُس نے بھی وہی کہا۔ تو وہ تو ہوتا ہے شاعری میں توارد۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ ان سب کی نیتیں یکساں تھیں، ان سب کی فطرت ایک ہی تھی، ان سب کا ذوقِ عبادت

ایک ہی تھا تو یہ "توارد" عمل ہے۔ یہاں ضرورت ایک کو دوسرے کے تحریک کرنے کی نہیں ہے کہ یہ ان سے کہیں کہ تم اپنی روٹی انہیں دے دو اور وہ ان سے کہیں کہ تم اپنی روٹی اسے دے دو۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس کی ضرورت تو ایک ہی روٹی سے پوری ہو جاتی مگر ایک ساتھ ہر ایک انفاق پر تیار ہے۔

تو اب سوال یہ کہنے کا نہیں ہے کہ ایسا کرو، اب تو مانع خیر ہونے کا سوال ہے کہ کوئی دوسرے کو روکے کہ نہیں تم نہ دو، ضرورت کیا ہے؟ تو ان میں سے کوئی مانع خیر ہونے والا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ایک روٹی کے سائل کو پانچ روٹیاں چلی گئیں۔ پانچ آدمیوں کی غذا چلی گئی۔ روزہ پانی سے افطار کر لیا گیا۔

اب دوسرا دن ہوا۔ یہاں ایک پہلو پر توجہ فرمایئے کہ ابھی اناج رکھا ہوا ہے۔ کیا سیدۂ عالم اپنے بچوں کی بھوک کو دیکھتے ہوئے (معاذ اللہ) محنت سے جی چراتیں اس وقت؟ ظاہر ہے کہ رات اتنی طولانی ہوتی ہے کہ سحر کے وقت تک دوسرا حصہ غذا کا تیار ہو سکتا تھا لیکن یاد رکھئے کہ یہ حقوق الناس کی اہمیت ہے۔ چونکہ وہ اُجرت عمل میں نہیں لائے ہیں، یعنی جتنا عمل ہوا ہے، اتنے ہی ملکیت میں آئے ہیں۔ باقی اناج گھر میں رکھا ہوا ہے۔ مگر اپنی ملک نہیں ہے۔ لہٰذا کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو اس وقت اپنے پیٹ بھرنے کیلئے استعمال کیا جائے۔ لہٰذا روزے پر روزہ ہو گیا۔ اب دوسرا روزہ جب ہوا تو وہی منزلیں عمل کی طے ہوئیں اور پھر افطار کا وقت سامان آیا اور عین افطار کے وقت دروازے پر سے آواز آئی۔

اَنَا يَتِيْمٌ مِنْ يَتَامَى الْمَدِيْنَه۔

"میں مدینہ کے یتیموں میں سے ایک یتیم ہوں"۔

اندازہ فرمایئے کہ آلِ محمدؐ یتیم کی آواز سنیں اور انہیں قرار آئے! لہٰذا جو پہلے دن ہوا تھا، وہی آج دوسرے دن ہوا اور وہ روٹیاں اس یتیم کو دے دی گئیں۔ پھر پانی سے افطار ہوا۔ اب تیسرا دن ہوا۔ یہاں اندازہ فرمالیجئے کہ ہر دن جو دوسرا آیا ہے، اس میں بھوک کا ایک درجہ اونچا ہو رہا ہے۔ یعنی پہلے دن جتنی غذا کی خواہش تھی، اس سے دوسرے دن زیادہ خواہش غذا ہے اور اب یہ جو تیسرا دن ہے تو اس سے بھی زیادہ غذا ہے جو انتہائی نقطہ ہے غذا کی خواہش کا۔ مگر آج جب افطار کا وقت آتا ہے تو دروازہ پر سے آواز آتی ہے:

"اَنَا اَسِيْرٌ مِنْ اُسَارَى الْمَدِيْنَه"۔

"میں مدینہ کے اسیروں میں سے ایک اسیر ہوں"۔

قرآن مجید نے اسی ترتیب کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ⑧

"کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت میں"۔

اب مفسرین میں اختلاف ہے کہ اللہ کی محبت میں یا طعام کی محبت میں۔ یعنی یہ ضمیر طعام کی طرف راجع ہے کہ باوجود خواہش

طعام کے، باوجود یکہ بھوکے ہیں، پھر بھی کھلاتے ہیں۔ کس کو؟ پہلے دن چونکہ مسکین آیا تھا، تو پہلے لفظ مسکین، دوسرے دن یتیم آیا تھا تو دوسرے نمبر پر لفظ یتیم اور تیسرے دن اسیر آیا تھا تو تیسرے نمبر پر اسیر۔

یہاں ایک پہلو پر غور کریجئے۔ ادب کی ایک اصطلاح ہے اور معنی و بیان ہمارے طلبہ کو بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں ایک صفت ہے لف ونشر مرتب یعنی چند چیزیں ایک ساتھ بیان ہوں اور اس کے بعد اس کے متعلق جو چیزیں ہوں، دوسری جگہ وہ اسی ترتیب سے بیان ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ان معصومینؑ کے عمل اور قرآن مجید کے الفاظ میں لف ونشر مرتب ہے۔ لف ہے ان کے عمل میں، نشر ہے قرآن کے الفاظ میں۔

ماننا پڑے گا کہ خدا نے یا تو اپنے علم وخوبی کے آئینہ میں ان کے کردار کی تصویر دیکھتے ہوئے قرآن کے الفاظ رکھے یا ماننا پڑے گا کہ تنزیل سے پہلے یہ الفاظ قرآن کو دیکھ رہے تھے۔

مگر زیادہ صحیح یہی پہلی توجیہ ہے کہ آنا تو دوسروں کا کام ہے۔ پہلے دن مسکین آیا، دوسرے دن یتیم آیا اور تیسرے دن اسیر آیا۔ تو اس لئے یہی صحیح ہے کہ اللہ اپنے علم غیب سے ان کے عمل کی ترتیب کو دیکھ رہا تھا، لہٰذا اُس نے لوحِ محفوظ میں جو ان کا عمل ہوگا، اسی ترتیب سے الفاظ درج فرما دیئے۔

اب ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا ہے کہ مسکین کے معنی تو معلوم ہیں، عرفی معنی تو مطلق غریب ہونے کے ہیں۔ ایک فقہی اصطلاح ہے مسکین اور فقیر کی۔ اس میں کیا فرق ہے؟ یہ سب فقہ کی باتیں ہیں جو ہمارے طلبہ پڑھتے ہوں گے۔ تو اُسے اس وقت پیش کرنا نہیں ہے لیکن عام طور پر غریب آدمی کو مسکین کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ جس معنی سے بھی مسکین ہو، پہلے دن مسکین تھا، دوسرے یتیم۔ یتیم کے معنی بھی سب عام طور پر جانتے ہیں۔ تیسرے دن کون ہے؟ اسیر ہے۔ اسیر کسے کہتے ہیں؟ عام تصور یہ ہے کہ قیدی۔ لیکن کسی جرم کی سزا میں قید کیا جائے تو اسے اصطلاحِ قرآن میں اور عربی میں اسیر نہیں کہتے۔ اسیر کہتے ہیں جنگ کے قیدی کو۔ جنگ میں جو قید ہو، اس کو اسیر کہا جاتا ہے۔

اب ایک اور پہلو کی طرف توجہ فرمائیے۔ ایک تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیغمبرِ خدا کے زمانہ میں جیل خانہ نہیں تھا ورنہ جو جیل خانے میں ہو، وہ کہاں آئے گا۔ تو اس زمانہ میں جیل خانہ نہیں تھا۔ اسیر ہے یعنی جنگی قیدی ہے۔ اسیر جنگ جو ہوتا تھا، اس کو بھی بند کر کے نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ وہ کچھ حدود کے اندر مقید ہوتا تھا۔ اب ان حدود کے اندر چاہے تو محنت مزدوری کر کے کسب معاش کرے، چاہے تو کسی سے سوال کر کے پیٹ بھرے۔ بہر حال اگر وہ بند کر کے رکھا جاتا تو غذا کی ذمہ داری اس بند کرنے والے پر تھی۔ چونکہ آزاد رکھا جاتا تھا، حدودِ خاص کے اندر۔ تو وہ اپنا اپنا ذوق تھا۔ آج بھی ہے۔ کچھ محنت کر کے کھاتے ہیں، کچھ سوال کر کے کھاتے ہیں۔ تو ایسا ہی اس وقت بھی تھا۔

اب جو خاص پہلو ہے توجہ دلانے کا، وہ یہ کہ زمانہ رسولؐ میں جنگ کا قیدی کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ جب اسیر ہے تو کوئی غیر مسلم ہے۔ تو جناب! وہاں تو میں اتفاق کہہ سکا کہ یتیم کے معاملہ میں، لب ولہجہ سے میں نے اتفاق کہا کہ آلِ محمدؐ یتیم کی آواز

سنیں اور انہیں قرار آئے۔ مگر آج تیسرا روزہ ہے اور معراج ہے خواہش غذا کی۔ دو دن تھا امتحان حق ایمانی کا اور آج ہے امتحان حق انسانی کا۔ یہ چیزیں غیر مسلم دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہیں کہ یہ ہے اسلام کی فراخ حوصلگی اور یہ ہے رہنمایانِ دین کی فیاضی۔ جس طرح خالق کی عطا مؤمن و کافر نہیں دیکھتی، اسی طرح یہ اس کے نمائندے ہیں جن کی عطا مومن و کافر نہیں دیکھتی۔

اب ایک چیز پر غور، الفاظ قرآنی پر غور کرنے سے جو چیز سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ اصل نذر تھی روزہ رکھنے کی۔ کھانا کھلانے کی نذر نہ تھی۔ اس کے معنی ہیں وفائے نذر تو ہوگئی روزوں سے۔ یہ فاضل عمل ہے جو اس صورت سے ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ آپ حضرات صاحبانِ عمل ہیں اور یہ مرکز تدریس ہے۔ یہاں ان باتوں کی طرف زیادہ توجہ کیوں نہ ہو! ارشاد ہوتا ہے:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝

''یہ لوگ نذر پوری کرتے ہیں اور اندیشۂ آخرت رکھتے ہیں''۔

اگر کھانا کھلانا متعلق نذر ہوتا تو پھر بیچ میں واؤ نہ آتا۔ یوں کہا جاتا کہ:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ

تب یہ اطعام یہاں ہوتا اسی وفائے نذر کا کہ وہ نذر پوری کرتے ہیں اور کس طرح کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں۔ مگر چونکہ نذر کے پورا کرنے میں تو روزے ہوگئے۔ اب یہ مزید اطاعت تھی خالق کی۔ لہٰذا بیچ میں واؤ آئی یعنی وفائے نذر ایک عمل ہے اور اطعامِ طعام، یہ دوسرا عمل ہے۔ اب اس کے بعد ایک نتیجہ نکلے گا تھوڑی دیر کے بعد اور تھوڑی دور پر۔ اس کو ابھی سے ذہن نشین رکھئے گا کہ وفائے نذر روزوں کے ساتھ ہے اور یہ کھانا کھلانا جو ہے، یہ بغیر نذر ہے۔ یہ مزید طاعت و عبادت ہے جو اس صورت سے انجام پائی۔

اب اس کے بعد خالق نے جزائیں بیان کرنا شروع کیں اور جتنی نعمات جنت ہیں، سب کو سمیٹ کر۔ قرآن مجید میں یہ سب نعمتیں متفرق طور پر مذکور ہیں۔ کہیں حوریں ہیں، کہیں قصور ہیں، کہیں چشمے ہیں۔ لیکن یہاں سب ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں جتنی نعمات جنت ہیں، سب اکٹھی کردی گئی ہیں۔ لیکن باریک بین نگاہوں نے جو دیکھا تو اس سورۃ میں سب نعمتیں جمع ہیں مگر حور کا ذکر نہیں ہے۔ تو اب فکر ہوئی کہ یہ کیا بات ہے کہ جنت کی تمام نعمتوں کا ذکر ہے مگر یہاں اس سورۃ میں حور کا ذکر نہیں ہے۔ تو سمجھ میں یہ آیا کہ چونکہ صاحبانِ کردار میں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی تھیں، اس لئے حور کا تذکرہ خلاف بلاغت تھا۔

جہاں سے جزائیں شروع ہوئیں، وہاں سے ایک نقطہ ہے:

"جَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا"۔

''اللہ نے انہیں جزائیں عطا کیا اس کی کہ انہوں نے صبر کیا''۔

اب اس کے بعد سب نعمات جنت کی فہرست ہے۔ ایسے چشمے، ایسے قصر، ایسے لباس، ایسے زیور۔ سب تفصیلات ہیں۔ کس چیز کی یہ جزا ہے؟ ''بِمَا صَبَرُوا''۔ اب اصطلاحِ قرآن دیکھی تو پتہ چلا کہ صبر روزہ کا نام ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ

''اے صاحبانِ ایمان! صبر وصلوٰۃ سے سہارا حاصل کرو۔''

توصلوٰۃ کے تناسب سے وہ صبر جو میدانِ جنگ کا ہے، وہ تو کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پتہ چلا کہ صبر صوم کا نام ہے۔ تو اب جوارشاد ہوا کہ:

جَزٰاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا

اللہ نے یہ سب جزا ان کے صبر کے بدلہ میں دی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جنت نعمتیں تو روزوں کی جزا میں صرف ہو گئیں، وہ تمام نعمتیں ختم ہو گئیں صرف روزہ کی جزا میں مگر کردار تو ابھی ان کا فاضل ہے۔ اس کے بعد بھی سب نعمتیں بیان کر کے یہ مناسبت ہے ابتدائے خطاب میں جَزٰاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا۔ جزا سے جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ پورا ہوا۔

اب اس سلسلہ کے بعد کیا کہا جا رہا ہے۔

''اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً''۔

ابھی تک تو غائب کے انداز میں بات ہو رہی تھی، یہ وہ انداز ہے جو سورۃ الحمد میں ہے کہ پہلے اللہ کا ذکر بطور غیبت:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ کی بارگاہ سے بندہ غیر حاضر ہے۔ اس کی تعریف کر رہا ہے، اس کے اوصاف بیان کر رہا ہے لیکن اوصاف بیان کرتے کرتے گویا اس کے تقریب کا درجہ اتنا اونچا ہو گیا، گویا معبود کا جلوہ بالکل سامنے نظر آ رہا ہے اور یہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو گیا۔ تو کہتا ہے:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں''۔

اب اس غیبت نے حضور کی شکل اختیار کر لی۔ بالکل اسی طرح یہاں یہ اُدھر سے ہے کہ ابھی تک تو ان بندوں کا بطور غیبت ذکر ہو رہا تھا، سب الفاظ غائب کے تھے۔

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ

جمع مذکر غائب کا صیغہ اور ''جَزٰاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا'' جمع مذکر غائب کا صیغہ۔ اب تذکرۂ جزا میں بندہ کا تقریب نظر قدرت میں ایسا سمایا کہ آپ نے اسے مخاطب بنا لیا۔

ابھی تک تو ان کا ذکر ایسے ہو رہا تھا جیسے کسی اور سے کیا جا رہا ہے۔ مگر اب خود انہیں مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے۔ "اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ"، "لَھُمْ" نہیں ہے۔ ان کیلئے نہیں، اے آلِ رسولؐ۔ یہاں مخاطب فقط رسول نہیں ہیں بلکہ سب ہیں۔ تو اب جو وحی آئی ہے، یہ ایک ذات پر نہیں ہے۔

اب خالق خود ان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

"اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ"۔

اے آلِ محمدؐ یہ تمہارے لئے۔ یاد رکھیے کہ آیۂ تطہیر میں منزل آیۂ تطہیر جو ہستیاں ہیں، ان میں پیغمبر محمدؐ بھی شامل ہیں۔ لیکن "ھل اتیٰ" کی منزل میں پیغمبر محمدؐ شامل نہیں ہیں۔

ماشاءاللہ عربی دان حضرات کیلئے تو کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آپ حضرات کیلئے توضیح کی ضرورت ہے کہ اس جملے کے دو انداز ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ "اِنَّ ھٰذَا جَزَآءُ کُمْ" "یہ تمہاری جزا ہے"۔ ان الفاظ کے معنی یہ ہوتے کہ جزا پوری مل گئی۔ ارے تم نے یہ کیا تھا، لو یہ تمہاری جزا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جزا کا حق ادا ہو گیا۔ لیکن متکلم قرآنی الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ تمہاری جزا ہے۔ عربی میں تنوین ہوتی ہے تقلیل کیلئے۔ "رِضْوَانٌ مِنَ اللہ" یعنی اللہ کی ذرا سی مرضی بڑی سے بری چیز ہے۔ یہ ذرا سی کس چیز کے معنی ہوئے؟ یہ "رضوانٌ" میں جو دو پیش ہیں، اس تنوین سے یہ صورت پیدا ہوئی کہ تھوڑی سی مرضی بھی۔

اب ذرا دیکھئے کہ وہی تنوین ہے "اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً"۔ اے آلِ رسولؐ! یہ تو تمہاری تھوڑی سی جزا ہوئی۔

کیا عادل خالق بندہ کے پلے کو گراں رہنے دے اور اس کے عوض میں کچھ عطا نہ کرے۔ مگر سرمایہ جزا تو ختم ہو گیا۔ اب اور کچھ کہاں سے آئے؟ تو عادل نے توازن قائم کیا:

کَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا

تمہاری کوشش قابلِ شکر گزاری ہے۔

بابِ فضائل میں یہ تین دن ھَلْ اَتٰی والے اور بابِ مصائب میں تین دن کربلا والے۔ وہ بھی بس تین دن ہی تھے کیونکہ تین روزے ختم ہو گئے۔ اب چوتھا دن ہوا تو اب روزہ تو نہیں ہے لیکن غذا ابھی تو ابھی نہیں ہے۔ پھر امیر المومنینؑ انتظام فرمائیں گے۔ تب غذا ہو گی۔ تو یہ چوتھا دن بھی شامل ہے۔ یہ روایت بین الفریقین مسلم ہے۔ یہاں تک امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں بھی یہ پورا واقعہ درج کیا ہے۔ تفسیر میں درج تو کر دیا ہے لیکن لوگوں نے اس کو اصل منزل سے ہٹانے کیلئے اوپر مکیہ لکھ دیا ہے۔ اٹھا کر دیکھئے قرآن مجید، کہیں کے بھی چھپے ہوئے ہوں، تو اس کی پیشانی پر سورۂ دھر کے نیچے مکیہ لکھا ہوا ہے تاکہ جو اصل منزل ہے، اُس سے دور ہو جائے۔ تلاش کرنے سے مل جاتے ہیں ایسے قرآن جن میں مدنیہ لکھا ہوا ہے۔ مگر عام طور پر مکیہ لکھ دیا گیا ہے تاکہ ذہن شانِ نزول کی طرف جائے ہی نہیں۔ مفسرین مجبور ہیں کہ اس کے ضمن میں شانِ نزول کا تذکرہ کریں۔

بہر حال اب چوتھا دن ہے۔ روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باوجودیکہ پیغمبرؐ خدا روز بیت الشرف میں تشریف لاتے تھے، فاطمہ زہراؑ کے، مگر جیسے یہ بھی قدرت کا انتظام ہے کہ اس تین دن میں، میں کہتا ہوں کہ جب یہ حضرات راہِ عمل میں تھے، پیغمبرؐ خدا تشریف نہیں لائے۔ چوتھے روز حضور تشریف فرما ہوئے۔ اب حفظِ آداب ہے اس گھرانے کا کہ جونہی رسول تشریف لائے تو سب تعظیم کیلئے کھڑے ہوئے۔ تو یہاں میں نے حوالہ دیا تھا کہ بچے کتنے ناتواں ہیں، یہ بعد میں پتہ چلے گا۔ تو اب سب کھڑے ہوئے ہیں تعظیم کو۔ حسنؑ اور حسینؑ بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں راوی نے ان کی کیفیت بیان کی ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ جو کھڑے ہوئے تو ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، تھرتھرا رہے تھے۔

پیغمبرؐ خدا نے بچوں کی جو یہ کیفیت دیکھی، میں کہتا ہوں کہ راوی کی نظر جو پہلے پیروں پر پڑی تو پیغمبرؐ خدا کی نظر بھی پہلے پیروں ہی پر پڑی ہوگی۔ اس کے بعد سب کے چہرے دیکھے ہوں گے تو اس کے بعد خاص تغیر محسوس ہوا ہوگا۔ فرمایا: یہ کیا عالم ہے؟ امیر المومنینؑ نے عرض کیا کہ خدا اور رسولؐ زیادہ واقف ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ وہ اپنی روداد عمل خود سناتے؟ کہا کہ خدا اور رسولؐ زیادہ واقف ہیں۔ اتنی دیر میں جبرئیلؑ امین۔ بسم اللہ سمیت 31 آیاتِ مدحیہ لئے ہوئے اُترے اور وہ سورۃ پڑھ کر پیغمبرؐ خدا نے تمام اہل بیتؑ کو سنایا کہ تم لوگ بیان کرو یا نہ کرو، خالق نے تمہاری ساری روداد سنا دی ہے۔

اب بتایئے جن کا ذکر خدا رسولؐ سے کرے، ان کا ذکر اگر ہم کریں تو عبادت نہ ہوگی؟

25

امامت

نبوت ملی لے لی کوئی سوال نہیں کیا رسالت عطا ہوئی لے لی کوئی سوال نہیں کیا خلت کا اعزاز قبول کرلیا کوئی سوال نہیں کیا خلت کا اعزاز ملا قبول کرلیا کوئی سوال نہیں کیا مگر جب امامت ملی تو فوراً ربط لگا دیا وہ کہہ رہا ہے میں تمہیں انسانوں کا امام بناتا ہوں وہ کہتے ہیں ''وَمِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ'' اور میرے نسل میں سے، میری اولاد میں سے؟

نبوت ملی بلا امتحان، رسالت ملی بلا امتحان، بلند ظرف لوگ، ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ کوئی کچھ عطا کرے تو یہ مزید مانگنے لگیں، لیکن جناب! امامت یونہی نہیں ملی امتحان لے کر، نتیجہ امتحان کے ساتھ ساتھ عہدہ دیا گیا۔

اللہ کے دیئے ہوئے علم سے جناب ابراہیمؑ جانتے تھے کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہونے والی ہیا سے مانگ کر کیا کروں لیکن امامت کے لئے جانتے تھے کہ تا قیامت رہے گی۔

اب رسول کے پاس اللہ کی گویا تین پوسٹیں ہیں نبوت کا کام، ایک رسالت کا کام، ایک امامت کا کام۔ اب دو پوسٹیں باقی نہیں رہیں اس لئے ان میں اس کا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا لیکن تیرا کام کیوں کہ قیامت تک برقرار ہے اسی میں جانشینی ہوگی لہٰذا اب جو اس جگہ پر آئے گا امام ہوگا۔

ابوسفیان نے جناب عباسؓ سے کہا کہ آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت عظیم ہوگئی تو جناب عباسؓ نے ابوسفیان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا یہ سلطنت نہیں ہے نبوت ہے۔

امامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ

پہلے ہی پارے کے آخری حصہ میں اور موجودہ ترتیب کے لحاظ سے سورۃ الحمد کے بعد پہلے ہی سورہ یعنی سورۂ بقرہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ موقع آیا جب ابراہیم کا ان کے رب نے امتحان لیا۔ کچھ باتوں کے ساتھ۔ تو انہوں نے ان کو بالکل پورا پورا حل کر دیا۔ تو ارشاد ہوا کہ میں تمہیں عام انسانوں کا امام قرار دیتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا: اور میری اولاد سے۔ تو ارشاد ہوا کہ میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

بس یہ تو ترجمہ ہو گیا۔ اب یہ لفظ، بہت سے الفاظ ہیں جو استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے کسی قانونی اصطلاح میں کچھ اور معنی ہوتے ہیں اور لغت میں اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ مگر ایسے ہی ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں کہ لغت کے معنی محفوظ بھی رہتے ہیں مگر پھر اصطلاح میں اس میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، کچھ قیدیں لگ جاتی ہیں، خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ اصل معنی جو ہیں، وہ محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً یہاں بھی غالباً وہی ہے۔ ہمارے ہاں تو عدالت کی کرسی میں ایک عہدہ ہوتا ہے منصف کا اور ایک عہدہ ہوتا ہے جج کا۔ منصف سے جج کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ منصف کا درجہ نیچے ہے اور جج کا درجہ اوپر۔ یہ تو اصطلاح میں ہے لیکن لغت میں جج کے معنی ہیں، منصف۔ منصف وہی ہے جو جج ہے۔

لغت کے اعتبار سے جج کو منصف کہنا درست ہے اور منصف کو جج کہنا درست ہے۔ مگر عدالت کی زبان میں اگر کسی سرکاری کاغذ میں آپ جج صاحب کو مخاطب کیجئے منصف کہہ کر وہ شاید توہین کا دعویٰ کر دیں اور منصف کو جج کہہ کر خطاب کیجئے تو خیر وہ تو اپنی جگہ چاہے آپ خوش ہوں مگر غلط تو سمجھیں گے۔ تو اصطلاحی مفہوم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں اور لغوی مفہوم کے تقاضے اور ہوتے ہیں۔ امام کا لفظ جب ہم لغت میں دیکھتے ہیں تو اس کے معنی پیشوا کے ہیں جو کسی راہ میں کچھ افراد کا مقتدیٰ ہو، وہ امام کہلائے گا۔ لغت میں امام کے معنی یہ ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کے معنی میں استعمال موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہم جس کے، معاذ اللہ کہہ کر اس کے اصطلاحی معنی کو اگر سامنے رکھیں تو معاذ اللہ کہیں گے اور قرآن ان کیلئے بھی لفظِ امام صرف کر رہا ہے۔ جو دوزخ کی طرف لے جائیں گے:

وَجَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّدۡعُوۡنَ اِلَی النَّارِ ۚ

ایسے بھی امام ہیں جو دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ یعنی جو گروہ ان کے پیچھے ہے، تو جدھر وہ جا رہے ہیں، اُن کا مقتدیٰ اسی کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے۔ اسی کے پیچھے وہ جا رہے ہیں تو وہ ان کا امام ہے اور ایک سلسلہ ہے آیت قرآنی کا کہ وہ ہے تو تعریف۔

قرآن مجید نے مدح کے انداز میں پیش کیا ہے مگر وہ بھی تعریفیں اس طرح کی ہیں کہ کوئی ذہن یا ذوق سلیم اس کو قبول نہیں کرسکتا کہ وہ معصومینؑ کی تعریف ہے۔ وہ سورۂ فرقان کی آیات ہیں۔ انیسویں پارہ میں:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝

اللہ کے وہ بندے قابل تعریف ہیں جو زمین پر آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہیں کہ کسی کو ایذا ہمارے قدم سے نہ پہنچے۔ یعنی متکبرانہ چال بھی نہ ہو اور جاہل لوگ بھی جب ان سے اپنے انداز میں یعنی سخت کلامی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو ان کے جواب میں سلام کر لیتے ہیں۔

یعنی سخت کلامی کا بھی جواب سخت کلامی سے نہیں دیتے۔ خیر یہاں تک کوئی کہہ دے ہو سکتا ہے کہ معصومینؑ کی مدح میں کہا گیا ہو مگر اب اسی میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جو ذہن کسی طرح قبول نہیں کرتا۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ

وہ بندے اس کے ایسے ہیں کہ جو اللہ کے سوا کسی کو اس کا شریک نہیں کرتے اور کسی بے گناہ نفس کو قتل نہیں کرتے اور جنسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ تو اب یہ تعریف کیا معصومینؑ کی ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سچے مسلمان جو اللہ کی نگاہ میں ہوں، انہی کی تعریف ہے کہ ایسے کردار ہیں کہ منہیات سے بچتے ہیں اور وہ ان کے اوصاف ہیں کہ تواضع رکھتے ہیں۔ اب اسی سلسلہ میں یہ آتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝

وہ یہ کہتے ہیں کہ بارگاہِ الٰہی میں ان کی تمنا یہ ہے، خدا سے التجا یہ کرتے ہیں کہ پروردگار! ہماری جو بیویاں ہیں یعنی شریکِ زندگی اور ہماری جو نسل ہے، اس میں ایسے افراد قرار دے جو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوں اور ہمیں پرہیز گاروں کیلئے امام بنا۔ اب یہ گویا سچے مسلمانوں کے کردار میں کہا جا رہا ہے کہ:

وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝

یہ دعا کیا عہدہ کی کرتے ہیں جو پیش خدا چند افراد کیلئے مقرر ہے؟ نہیں۔ یعنی ہمیں کردار کی اس بلندی پر پہنچا کر لوگ ہمیں دیکھ کر مثال بنائیں اور ہمارے پیچھے پیچھے چل کر متقی اور پرہیزگار بنیں۔ چنانچہ میں بھی کبھی قنوت میں یہ دعا پڑھ لیتا ہوں۔ قرآن نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرنے کی مدح کی ہے۔ چنانچہ میں قنوت کیلئے اسے بھی ایک بہترین دعا سمجھتا ہوں۔ تو اب یہ لغوی معنی سے ہے ہم ایسے

نقطۂ عمل پر ہوں کہ بہت سے لوگ ہمارے پیچھے چل کر متقی بنیں۔ بہت سے لوگ ہماری پیروی کر کے ہم کو اپنا امام یعنی نمونۂ عمل بنا کر وہ ہمارے نقش قدم پر چلیں۔ بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا ہر سچے مؤمن کو کرنی چاہئے۔

تو یہ امام کا جو لفظ ہے، وہ لغت کے معنی کے لحاظ سے اور جس طرح وہ آپ کے قانون کے الفاظ ہیں، کیا وہ بھی لغوی مفہوم میں، لغت کے مفہوم میں صرف نہیں ہوتے۔ اب تو بحمد اللہ پاکستان بننے کے بعد یہاں مناظروں کا رواج نہیں رہا لیکن آپ میں سے بعض حضرات اس دور کے آدمی ہوں گے جب زور شور سے یہاں مناظرے ہوتے تھے۔ تو مناظروں میں جج مقرر نہیں ہوتے تھے؟ تو وہ کیا سب ویسے جج ہوتے تھے جو عدالت میں جا کر کرسی پر بیٹھ جائیں؟ وہ صاحب تو لغت کے معنی کے لحاظ سے جج کہے جاتے تھے۔ اب کوئی اعتراض کرے کہ جناب! جج تو وہ ہوتے ہیں جو کرسی پر ہوں۔ تو یہ وہاں جا کر بیٹھیں جہاں اور جج ہیں۔

صاحب! قانون کی بات اور ہوتی ہے، لغت کی بات اور ہوتی ہے۔ تو قانون کے لحاظ سے جو درجہ مقرر رہے تو اس میں ایک درجہ والے لفظ کا استعمال دوسرے درجہ والے کیلئے غلط ہو جائے گا۔ جیسے میں نے کہا کہ منصف کو جج کہنا اور جج کو منصف کہنا۔ تو یہ تو میں نے تمہید میں ضمناً ایک بات بیان کر دی کیونکہ بعض اوقات لغوی معنی میں کوئی لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے لوگوں کو غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اب جو عرض کرنا ہے، وہ یہ کہ اصطلاحی حیثیت سے ہم جب قرآن مجید اور احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اللہ کی جانب سے تین عہدوں کے نام معلوم ہیں۔ سب سے پہلا عہدہ نبوت، لغت میں نبی کے معنی خبر دینے والا اور اب وہ عام معنی ہے خبر۔ اس مفہوم میں قیدیں بڑھ گئیں کہ اُدھر کی خبریں، غیب کی خبریں، جنت و نار کی خبریں دینے والا۔ اُدھر سے جو آئے تو وہ نبی۔ تو یہ عہدہ ہمارے سامنے شروع ہوا حضرت آدمؑ سے۔ ہمارے سامنے شروع ہوا۔ عالم باطن کا ذکر نہیں۔ تو حضرت نوحؑ تک جتنے بھی تھے بیچ میں، زمین حجت خدا سے خالی تو نہیں رہتی۔ درمیان میں ایک سلسلہ تھا جس کے پورے نام ہمیں اکثر معلوم نہیں ہیں اور معلوم بھی ہوں تو یاد کہاں ہوں گے!

تو وہ ہزاروں برس کی مدت میں نہ جانے کتنے تھے؟ وہ ماورائے تاریخ اتنے تھے کہ اس کی مدت بھی معلوم نہیں۔ تو وہ جناب! بیچ میں جتنے ہوتے رہے، بس وہ نبی تھے، اس کے آگے کچھ نہیں۔ ابھی تک گویا قانونِ الٰہی میں یہ عہدہ قائم ہوا تھا۔ اب اس کے بعد حضرت نوحؑ تشریف لائے تو یہ سب سے پہلے رسول ہوئے۔ نبوت شروع ہوئی تھی حضرت آدمؑ سے اور اب رسالت شروع ہوئی حضرت نوحؑ سے۔ ان کی عمر چونکہ تمام انبیاء و مرسلین میں سب سے زیادہ ہوئی ہے، اس لئے ان کو شیخ المرسلین کہتے ہیں۔ لقب ہے ان کا۔ وہ بربنائے افضلیت نہیں، بربنائے طول عمر ہے اور وہ بھی طول عمر ہماری آنکھوں کے سامنے۔ ورنہ حضرت عیسیٰ کی عمر ان سے بڑھ چکی ہے۔ پھر بھی شیخ المرسلین وہی ہیں۔ تو نبی کے لغوی معنی خبر دینے والا اور رسول کے معنی پیغامبر، پیغام پہنچانے والا۔ اب وہی جو میں نے کہا کہ منصف جج اور ہر جج منصف۔ تو وہ نبی تھے بیچارے تو کیا وہ پیغام پہنچاتے ہی نہیں تھے۔ لغت کے اعتبار سے ان کو بھی رسول کہہ دیا جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر ادھر قانون کی طرف سے عہدہ ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ وہاں نبی کا لفظ تھا اور اب ہمارے ہاں تاریخ کے اعتبار سے صاحب شریعت رسول وہ ہوتا ہے، جو صاحب شریعت ہو۔

تو اس وقت نوعِ انسانی محدود تھی اور شروع میں تو بس اولادِ جنابِ آدمؑ، جو براہِ راست تھی یا ایک پشت اور گزری ہو، بس وہی۔ نوعِ بشر کا رقبہ۔ تو اس لئے ان کی ضروریات بھی مختصر تھیں۔ کچھ ابتدائی تعلیمات، تہذیب کو آگے بڑھانے کیلئے جو نقش بنیاد بن سکتے ہیں، وہ کچھ دے دیئے گئے تھے۔ تو اس لئے ان تعلیمات کو شریعت نہیں کہتے تھے۔ یقیناً کچھ اصولِ زندگی تو لے کر آئے تھے لیکن وہ اتنے مختصر و محدود تھے کہ اسے کوئی شریعت کا نام نہیں ملا ہے۔

شریعت جو لے کر آئے ہیں، وہ حضرت نوحؑ لے کر آئے ہیں۔ اس لئے جس طرح وہ پہلے نبی، اس طرح حضرت نوحؑ پہلے رسول۔ اب رسالت چلتی رہی۔ مگر چلنے کے معنی یہ نہیں کہ ایسے افراد ہوا کریں جو اس منصب کے حامل ہوں۔ یعنی اب ابتدائے رسالت ہوگئی۔ اس کے بعد جو لوگ آئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ فقط نبی ہوں کیونکہ دو عہدے ہو گئے ہیں، ایک نبی اور ایک رسول۔ اب جب تک شریعت نہیں بدلے گی، اس وقت تک رسول کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اس وقت تک انبیاء ہی ہوتے رہیں گے۔ تو بہرحال اب یہ عہدے چلے۔

گویا ایک نبوت، ایک رسالت۔ اب حضرت نوحؑ کے بعد، جو ایک قدآور شخصیت آئی، وہ حضرت ابراہیمؑ کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ دو عہدوں کے مالک ہیں۔ نبی بھی ہیں اور رسول بھی ہیں۔ نبوت اور رسالت دونوں عہدوں کے یہ مالک ہیں۔ مگر نبوت ملی تھی تو کوئی امتحان نہیں لیا گیا تھا۔ رسالت ملی تھی تو کوئی امتحان نہیں ہوا تھا۔ بس اللہ نے اپنے علم کی بنیاد پر نامزد کر دیا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ مگر اب یہ نبی ہیں اور رسول ہیں اور فقط رسول نہیں ہیں اب وہ عہدہ نہیں ہے، اب وہ اعزاز ہے کہ خلیل بھی تو ہیں، خلیل اللہ ہیں۔ اللہ کے دوست ہیں۔ اتنا بڑا اعزاز ہے ان کا۔ عہدے تو وہی دو ہیں۔ نبی اور رسول۔ مگر اب یہ نبی ہوتے ہوئے، رسول ہوتے ہوئے، اب بلائے جاتے ہیں امتحان میں۔ امتحان میں بلائے جاتے ہیں جیسے بچوں کا امتحان ہوتا ہے، ویسے ہی سرکاری عہدوں میں بھی تو امتحان ہوتا ہے۔ تو اس امتحان کا جو نام آپ رکھتے ہوں، وہ نام آپ انگریزی میں رکھ لیں۔ تو اس امتحان کیلئے جو صلاحیت کا رو در کار ہوتی ہے، کسی عہدہ پر مقرر کرنے کیلئے جو امتحان ہوتا ہے، اب اس امتحان میں بلائے گئے۔ اللہ کیلئے لکھ کر پرچہ امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ زبانی ہو، کچھ ہو، القا کے ساتھ ہو، ملک کی زبانی ہو۔

اب تفصیلات تو قرآن میں نہیں ہیں، کہاں سے بیان کروں؟ بہرحال امتحان کسی طرح اب لیا جا رہا ہے۔ اب آپ کے ہاں جو امتحان ہوتا ہے، اس میں کامیابی کے نمبر کہیں 33 فیصد، کہیں پچاس فیصد ہوتے ہیں۔ تو وہ ادنیٰ درجہ کی کامیابی تو اسی میں ہو جائے گی۔ تو اس کے بعد جناب پچاس فیصد ہوئے۔ غرض ایسا تو بہت کم ہوتا ہے کہ ایک عدد بھی ممتحن کم نہ کرے۔ بس معلوم ہوا کہ وہ ریاضی وغیرہ میں کبھی کبھی سو میں سے سو آ جاتے ہیں کیونکہ اس میں اگر بالکل صحیح لکھا ہے تو نمبروں میں کمی نہیں ہوتی اور اگر غلط لکھا ہے تو کچھ بھی حق نہیں ہے۔

یہاں فرض کیجئے کہ دو سوال غلط ہیں۔ تو اس کے لحاظ سے نمبر کم کر دے ورنہ اگر لڑکا صحیح لکھے تو اس میں گنجائش ہی نہیں ہے نمبر کم کرنے کی۔ چاہے ممتحن کا دل بھی چاہتا ہو کیونکہ ممتحن کو شوق ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کم کروں۔ تو جناب! کچھ تو کم ہو ہی جاتا ہے۔ مگر یہ کہ

یہاں خالق اعلان کر رہا ہے، جس کے ہاں مبالغہ کا سوال نہیں، وہ کہہ رہا ہے، "فَاَتَمَّهُنَّ"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب در بند۔ سو میں سے کامیابی۔ یعنی اا ایک نمبر بھی کمی نہیں۔

تو میں کہتا ہوں کہ یہ نبی ہیں، رسول ہیں، تو آخر اس امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ یہ صرف اس عہدہ کی بلندی کو دکھانے کیلئے کہ دیکھو ہر نبی اس کا مستحق نہیں ہے۔ رسول بھی اس کا مستحق نہیں ہے۔ رسولوں میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ کون مستحق ہے؟

پھر ماشاءاللہ مجالس کے فیض سے عوام بھی ہمارے بہت سے دینی حقائق سے تو باخبر ہیں ہی۔ ہم بحمد للہ تمام انبیاء کو معصوم مانتے ہیں بلا استثنیٰ۔ تو ہمارے لئے عجیب مصیبت ہوگئی ہے کہ جناب! حدیث میں، تفسیر میں، کہیں بھی دنیا کوئی حرف آدم پر لا رہی ہو تو ہم وکالت کریں۔ حضرت نوحؑ پر کوئی الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو تو ہم بیچ میں آئیں۔ ہم تمام انبیاء کی وکالت کے ذمہ دار ہیں۔

تو یہ بہر حال ہمارا متفق علیہ فیصلہ ہے کہ انبیاء سے گناہ نہیں ہوتے۔ مگر پھر بھی جن جن چیزوں سے دنیا گناہ کرتی ہے، وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی جاتی ہیں اور جیسے دنیا کو گناہگار ثابت کرنے سے دلچسپی ہے۔ تو وہ تو ملتے نہیں کہنے کو۔ ہم ہی سے کہا جاتا ہے کہ دیکھئے! انہوں نے یہ کہا، انہوں نے یہ کہا۔ ان سب کی طرف سے جواب ہمارے ذمہ ہے کہ ہم دیں۔ تو اب جہاں اکثر باتیں ہوتی ہیں، وہاں ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ وہ گناہ نہیں تھا، ترکِ اولیٰ تھا۔ یہ آپ نے برابر سنا ہوگا کہ ترکِ اولیٰ تھا۔ تو ترکِ اولیٰ کے معنی دیکھئے۔ ترکِ اولیٰ کے معنی تو یہ ہیں کہ یقیناً کچھ کمی تو ہوئی ورنہ ترکِ اولیٰ ہی کیوں ہوتا؟ یعنی وہ جو منزل اولیٰ تھی، اس سے کچھ کمی رہ گئی۔ یہی معنی ترکِ اولیٰ کے ہیں۔ وہ کمی ایسی نہیں ہے جو گناہ کی فہرست میں داخل ہو۔ مگر کچھ تو کمی ہے۔

تو جناب! ہر نبی کے ہاں ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے۔ مگر اب حضرت ابراہیمؑ کو خالق سند دے رہا ہے کہ "فَاَتَمَّهُنَّ"۔ خالق جس کا کام ہی حق ہے۔ اسکی زبان پر حق کے سوا کسی اور چیز کا بیان کہاں آسکتا ہے! وہ کہہ رہا ہے "فَاَتَمَّهُنَّ"۔ تمام و کمال۔ تو ذرا بھی کمی ہوتو وہ کیونکر کہے تمام وہ تو کمال؟ یعنی وہ تو انبیاء کیلئے ذرا سی کمی ہو تو سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو گناہگاروں کیلئے استعمال ہوتے ہیں، وہ ترکِ اولیٰ پر الفاظ فرمادیا کرتا ہے جس میں ہم پر پھر مصیبت پڑتی ہے کہ ہم ثابت کرتے ہیں کہ وہ گناہ نہیں تھا۔ پھر ان کی بلندی کے لحاظ سے خالق نے یہ سخت الفاظ استعمال کئے ہیں کہ تم اتنے بلند مرتبہ ہو کر، تم نے یہ کیوں کیا؟ کوئی دوسرا کرتا تو یہ کیا جاتا؟ اس وقت وہ موضوع نہیں ہے۔ جن جن چیزوں کو دنیا خلافِ عصمت پیش کرتی ہے، میں اس کو دلیلِ عصمت میں لاتا ہوں کہ اگر معصوم نہ ہوتے تو اس بات پر روکا نہ جاتا، اس بات پر تنبیہ نہ کی جاتی۔ یہ چیز دلیل ہیں ان سب کے معصوم ہونے کی۔ مگر بہر حال تنبیہ ہوتی ہے۔ تو کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔ جیسے واجب ترک نہیں ہوا مگر مستحب ترک ہوگیا۔ حرام کا عمل نہیں ہوا مگر مکروہ کا عمل ہوا۔ تو کمی ہوئی اس قدر کہ ترکِ اولیٰ کا عنوان قائم ہوا۔ مگر جہاں قرآن کہے "فَاَتَمَّهُنَّ"، پورا پورا پرچہ اس نے حل کر دیا۔ جو بات صحیح صحیح ہونا چاہیے تھی، وہ ہوگئی۔

تو آپ بتائیے کہ کس کمی کی گنجائش رہ گئی؟ جب کمی کی گنجائش نہ رہی تو اس سے اولیٰ کیا ہوگا جو ترکِ اولیٰ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت تک ترکِ اولیٰ ہوگا، رسالت تک ترکِ اولیٰ ہوگا مگر جہاں امامت آجائے گی۔۔۔۔؟

غرض اتنا شاندار امتحان کا نتیجہ اور جب اس میں کامیابی ہوگئی تو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اچھا! اب تم کامیاب ہوگئے۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ط

میں تم کو تمام انسانوں کیلئے، "ناس" اسم جمع ہے اور اس پر الف لام استغراق ہے۔ میں تم کو تمام انسانوں کیلئے امام بناتا ہوں۔ نبوت اور رسالت میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ محدود ہوتی رہی ہیں۔ ارے ایسے نبی تھے جو ایک قریئے کے نبی ہیں۔ انہی کے دور میں جناب لوطؑ تھے۔ وہ بس ایک بستی تھی، وہاں کے نبی تھے اور ایسے ہی بہت سے انبیاء۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کیلئے تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت عام نہیں تھی۔ صرف بنی اسرائیل کیلئے تھی۔ قرآن مجید میں بھی ہے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ

بنی اسرائیل کیلئے رسول بنا کر بھیجا۔

بائبل میں بھی ہے کہ اسرائیل کی بھیڑوں کو چرانے کیلئے آیا ہوں۔ تو ہدایت خلق کیلئے تعبیر مجازی ہے۔ بائبل کی زبان میں بھیڑوں کا چرانا۔ یعنی خلق خدا کا صحیح راستے پر لے چلنا۔ تو اسرائیل کیلئے۔ دعویٰ تھا ان کا یہی بائبل میں ہے اور قرآن بھی یہی کہہ رہا ہے۔ اس کے بعد شواہد اسکے بہت ہیں۔ اس وقت پیش نہیں کرتے۔ تو بہر حال تحقیق یہ ہے کہ ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل کیلئے تھی۔ باوجودیکہ رسول ہیں، فقط نبی نہیں ہیں۔ جناب موسیٰؑ بھی رسول ہیں اور اولوالعزم رسول ہیں۔ جناب عیسیٰؑ بھی رسول ہیں اور اولوالعزم رسول ہیں۔ مگر رقبہ رسالت محدود ہے بنی اسرائیل کے اندر۔ اوروں کے لئے نہیں ہے اور شریعت ان کی انہی کیلئے تھی، دوسروں کیلئے نہیں تھی۔

لیکن اب دیکھئے کہ امامت جہاں سے شروع ہوئی ہے، وہیں سے للناس، لامحدود۔ تمام نوع انسانی کیلئے۔ بلاتفریق ملک، بلاتفریق صوبہ، بلاتفریق زبان، بلاتفریق رنگ، بلاتفریق نسل۔ تمام انسانوں کیلئے۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ط

تمام لوگوں کیلئے امام بناتا ہوں۔ اعلان ہوا، نبوت ملی، لے لی۔ کوئی سوال نہیں کیا، رسالت عطا ہوئی۔ لے لی، کوئی سوال نہیں کیا۔ خلت کا اعزاز قبول کرلیا، کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر جب امامت ملی تو فوراً ربط لگادیا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں انسانوں کا امام بناتا ہوں، وہ کہتے ہیں:

"وَمِنْ ذُرِّيَّتِي"

اور میری نسل میں سے بھی تو، اور میری اولاد میں سے بھی تو۔ یہ کیا بات؟ جناب! آپ کو منصب ملا ہے۔ آپ یہ ربط کیوں لگا رہے ہیں؟ اور میری اولاد میں سے بھی تو۔ پہلے ایک سطحی پہلو عرض کروں گا۔ حضور! نبوت تو ملی تھی بلاامتحان، رسالت ملی تھی بلاامتحان۔ بلند ظرف لوگ، ان کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ کوئی کچھ عطا کرے تو مزید مانگنے لگیں۔ لیکن جناب امامت یونہی نہیں ملی ہے۔ امتحان لے کر، نتیجہ امتحان کے ساتھ ساتھ عہدہ دیا گیا ہے۔

تو میں کہتا ہوں کہ طالب علم کا دل بڑھا ہوا ہے۔ تو ادھر اعلان ہوتا ہے کہ تم کو ہم نے امام بنایا۔ تو جناب! یہ تو ہوا امتحان کا نتیجہ۔ اب انعام کامیابی بھی تو۔ اب آپ ماشاء اللہ اس پہلو پر بہت لطف اندوز ہو گئے۔ اب دوسرا پہلو عرض کرتا ہوں کہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے جانتے تھے کہ نبوت ختم ہونے والی ہے، رسالت ختم ہونے والی ہے، اسے مانگ کر کیا کروں؟ لیکن امامت کیلئے جانتے تھے کہ تا قیامت رہے گی۔

تو جناب والا! اب سوال کر لیا۔ میری اولاد میں سے بھی۔ اب خالق نے کیا جواب دیا؟ نہ بظاہر ہاں اور نہ بظاہر نہیں۔ جیسے ایک پورا جملہ الگ انہوں نے کہا:

"وَمِنْ ذُرِّيَّتِي"۔

اور میری اولاد میں سے بھی۔ اب کچھ نہیں کہا جاتا کہ ہاں، ہم تمہاری اولاد میں عطا کرتے ہیں یہ منصب یا نہیں عطا کرتے۔ نہیں، ظاہر میں کچھ نہیں کہا:

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ

میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یہ کلیہ۔ اور اب یہیں بتا دوں کہ ظالم ہم سمجھتے ہیں۔ جو تھپڑ مار دے کسی کو بلا وجہ، وہ ظالم ہے۔ جو قتل کرے، وہ ظالم مگر قرآنی اصطلاح دیکھئے کہ:

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے قدم بڑھائیں، وہ ظالم ہیں۔

یہ ہے اس کا معیار۔ اس کی زبان پر جب لفظ ظالم ہو تو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ:

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ

میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ تو جناب! اب مفسرین حیران ہیں کہ یہ اقرار ہے یا انکار ہے؟ یہ دعا کی قبولیت ہے یا دعا کو رد کرنا ہے۔ تو بہت سے لوگوں کے مطلب کی بات تو یہی تھی کہ اسے رد شدہ مانیں۔ یعنی یہ کہ نہیں، میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ اب وہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہے نہیں مطلب کا، یہ بھی ہمارے مطلب کا۔ جہاں ظالموں کو بھی مستحق منصب مان لیا جائے، تو ان کے مطلب کا پھر بھی نہیں ہے۔ مگر خیر! یہ تصور نہیں، یہ انکار نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ نے کب کہا تھا کہ میری کل اولاد کو۔ ارے ان کے الفاظ میں بھی ترک اولیٰ نہیں ہو سکتا تھا ورنہ خالق ''اَتَمَّهُنَّ'' کیوں کہتا؟ انہوں نے کُل اولاد کیلئے مطالبہ کیا ہی کب؟ انہوں نے پہلے ہی محتاط الفاظ کہے تھے، ''وَمِنْ ذُرِّيَّتِي''۔ میری اولاد میں سے بھی۔

یہ وراثت کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں، استحقاق پیش نظر ہے، اہلیت پیش نظر ہے۔ سب اولاد نہیں، میری کچھ اولاد میں سے بھی۔ یعنی جو تیری نظر میں اس کے مستحق ہوں، اس کے اہل ہوں، تو پہلے ہی انہوں نے ''مِنْ'' کہہ دیا تھا۔ تو اب یہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا تو

انہوں نے ظالموں کیلئے کب مانگا تھا؟ وہ تو پہلے ہی کہہ رہے ہیں ان میں سے ان کیلئے جو تیری نظر میں اہل ہوں۔ تو میں ہرگز اس کو انکار نہیں مان سکتا۔ جب انکار نہیں ہے تو اقرار ہے اور جب اقرار ہے تو اس کا مطلب؟ میں اپنے لہجے میں کہتا ہوں کہ انہوں نے جو کہا ”اور میری اولاد میں سے بھی“ تو جیسے خالق کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ہاں ہاں! ضرور اور کیا، یہ عہدہ ظالموں تک پہنچ جائے گا۔ یعنی وہی جو میری نظر میں ہیں، تمہاری ذریت ہی سے تو ہیں۔ ان کو اگر چھوڑ دوں تو کیا ظالموں کو دے دوں؟

اب ماشاء اللہ اربابِ نظر ہیں اور نکتہ رس حضرات ہیں، جناب! ایک پوری مجلس جتنے وقت میں ہوتی ہے، عام طور پر، اتنے میں تو میں نے صرف آیت کے اجزا کی تشریح کی ہے۔ الفاظِ آیت کو ذرا تبصرہ کے ساتھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ تو اب ظاہر ہے کہ آیت کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ کہنا، اس مختصر وقت میں کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اب جو عرض کرتا ہے، وہ دیکھئے۔ جہاں سے میں نے بات شروع کی کہ آدمؑ سے نبوت چلی۔ نوحؑ تک نبوت ہی نبوت۔

نوحؑ سے رسالت چلی تو اس کے بعد جو تیسرا عہدہ امتحان ے کرملا، وہ ہے امامت۔ تو اب ابراہیمؑ جو ہیں، وہ نبی بھی ہیں، رسول بھی ہیں اور امام بھی ہیں۔ اب ان میں تینوں عہدے اکٹھے ہوگئے۔ تو اب جوان سے افضل ہستی آئے، وہ کیا صرف نبی ہوگی؟ پھر وہ افضل کہاں ہوئی؟ تو کیا فقط رسول ہوگی؟ یعنی نبی اور رسول؟ پھر وہ افضل کیونکر ہوگی؟ تو پھر ماننا پڑے گا قرآن اور عقل دونوں کی مدد سے کہ اب جو ہستی آئے گی، وہ تین منصبوں کی حامل ہوگی۔ بغیر اس کے وہ حضرت ابراہیمؑ سے افضل نہیں ہوسکتی۔ وہ ہستی اگر فقط نبی ورسول ہو تو حضرت ابراہیمؑ سے کم ہوگئی۔ لازماً اُسے بھی امام ہونا ہے۔ اب کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو، تمام فرزندانِ اسلام مانتے ہیں کہ محمدؐ افضل المرسلین ہیں۔ کسی مسلمان سے اگر پوچھئے، کسی فرقہ کا بھی ہو، تو کہے گا کہ ہاں، افضل المرسلینؐ۔

تو جب افضل المرسلین ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہ نبی بھی ہیں، رسول بھی ہیں اور امام بھی ہیں۔ یہ تینوں عہدے ان میں جمع ہیں۔ اب درمیان میں جو میں نے منزلیں طے کرکے گفتگو کی تو میں یہاں تک پہنچا۔ تو اس میں جہاں بھی کہیں جھول ہو، کمزوری ہو، وہ بعد میں مجھے بتادے، میں اس پر غور کروں گا۔

تو یہ نبی بھی، رسول بھی اور امام بھی۔ اور اب جناب! بعض سوال ایسے ہیں جو ذہن میں کبھی نہیں آتے۔ کسی کی توجہ دلانے پر خیال آجاتا ہے اور پھر جواب کیلئے سوچنا بھی پڑتا ہے۔ تو حیدرآباد دکن میں، جو ہندوستان کے حضرات ہیں، وہ جانتے ہیں، کہ آخری نظام جو تھے جنکے بعد ریاست چلی گئی، یعنی آصف جاہ کے تابع عثمان علی خان۔ وہ بڑے ذوقِ علم رکھنے والے آدمی تھے اور جو علما وہاں جاتے تھے، وہ ان سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ تو وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان سے کچھ علمی سوال کرتے تھے اپنے اطمینان کیلئے۔ اس کے ساتھ اب وہ عند اللہ کیا ہوں مگر بہر حال تھے وہ اہلِ سنت کے سلسلہ کے۔ اہلِ سنت نے انہیں ہمیشہ اپنے میں سے کہا۔ وہ اپنے کو تفضیلی کہتے تھے کہ میں تفضیلی ہوں۔ یعنی حضرت علیؑ کو افضل مانتا ہوں تمام دوسرے حضرات سے۔ تو وہ تفضیلی کی حد تک تو اعلان کرتے تھے اور اس کے آگے جب پوچھا گیا کہ تو کہا کہ اپنے آبائی مذہب پر ہوں اور بس۔

اپنی والدہ کو کہتے تھے کہ وہ بحمد للہ شیعہ اثناء عشری تھیں۔ بحمد للہ کے ساتھ کہتے تھے۔ ان کے نام پر انہوں نے وہاں عزاخانہ

زہرا قائم کیا ہے۔ان مرحومہ کا نام زہرا بیگم تھا۔تو مجھ سے پہلی ملاقات میں انہوں نے کہا کہ میری والدہ شیعہ تھیں۔انہوں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے؟میں نے کہا کہ ہاں،معلوم ہے۔اس پر میں نے جملہ کہا، سننے کے بعد کہ آپ کا تو مادری مذہب شیعہ ہے۔تو ان کے ہاں دوسرے دن میرا بیان ہونے والا تھا۔انہوں نے ایک ملاقات کا پیغام بھیج دیا۔تو وہ سوچ کر میں نے رکھا ہے اور واقعی وہ سوال مجھ سے کسی نے نہیں کیا تھا۔یہ پیش نظر رکھئے گا کہ وہ تفضیلی ہیں۔یعنی حضرت علیؑ کی فضیلت میں وہ کی کسی صورت میں گوارہ نہیں کر سکتے۔

انکے سلام کا مصرعہ ہے،علیؑ کی معنوی پیغمبری سمجھا تو میں سمجھا۔وہ سمجھے ہیں، میں نہیں سمجھا ہوں۔اب جو شخص یہ کہتا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے سوال کے جواب میں ایسی بات نہیں کہی جا سکتی جو اس کے تصور کو جھٹکا لگائے۔

اب دیکھئے کہ کتنا مشکل سوال انہوں نے کر دیا۔انہوں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ پیغمبر پر رسالت کیوں ختم ہوگئی؟کوئی آدمی اس منصب کا اہل نہ ہو تو ختم ہو جائے لیکن جب ایک ذات اس منصب کی اہل موجود ہے تو یہ رسالت آخر ختم کیوں ہوگئی؟اب یہ دونوں باتیں ہیں کہ ختم رسالت مسلم ہے ان کے نزدیک۔یہ نہیں ہے کہ اس کے منکر ہیں۔مگر حضرت علیؑ کی اہلیت ان کے نزدیک باعتبار فضائل مسلم ہے۔تو اب یہ گویا ان کیلئے ایک معمہ ہے۔ان کے ذہن پر یہ خیال اتنا غالب تھا کہ بار بار اس کو وہ دُہراتے ہیں۔خیر!جب تک وہ اپنے خیال سے محظوظ ہوتے رہے، میں خاموش رہا۔جب ان کا سلسلہ ختم ہوا تو میں کہا نے کہ عہدہ اس لئے نہیں ختم کیا جاتا کہ کوئی آدمی اس کے لائق نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اور سبب ہو سکتا ہے کہ وہ ضرورت ختم ہو جائے۔میں نے کہا کہ جنگ کی ضرورت سے بہت سے عہدے اور بہت سے دفتر کھولے جاتے ہیں۔بہت سے آدمی اس پر مقرر کئے جاتے ہیں۔جب جنگ ختم ہو جاتی ہے تو وہ دفتر توڑ دیا جاتا ہے،عہدہ ختم کر دیا ہے۔تو کیا اس لئے کہ کوئی آدمی اس عہدے کے قابل نہیں رہا؟ممکن ہے وہی آدمی موجود ہو جو تھا۔مگر پھر بھی عہدہ ختم۔کیوں؟

وہ کام ضرورت کے تحت تھا،ضرورت ختم ہوگئی، کام ختم ہو گیا تو آدمی لائق موجود بھی ہے تو کوئی اور کام اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔تو نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا۔جب تک ایک بھی خبر باقی ہے، جو نہ دی گئی ہو، نبی کی ضرورت باقی ہے۔رسول کے معنی ہیں پیغام پہنچانے والا۔جب تک ایک بھی پیغام باقی ہے، اس وقت تک رسول کی ضرورت باقی ہے۔جب پیغام سب پہنچا دیئے گئے ہوں، کوئی پیغام باقی نہ رہا ہو تو پھر اس جگہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔چاہے آدمی موجود ہو، جو اس عہدے کے لائق ہو۔

انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ بس!کل اسی موضوع پر بیان ہو جائے۔دوسرے دن جو اس بات میں مزید اضافے کئے گئے، وہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ نبی کے معنی خبر دینے والا، رسول کے معنی پیغام پہنچانے والا اور امام کے معنی آگے آگے چلنے والا۔نبی کی ضرورت اُس وقت تک رہے گی جب تک ایک بھی خبر ہے جو نہ پہنچائی گئی ہو۔جب ہر خبر پہنچائی جا چکی ہے تو نبی کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔نبوت ختم ہو جائے گی۔رسول کا مطلب ہے پیغام پہنچانے والا۔جب تک ایک بھی پیغام باقی ہے جو نہ پہنچایا گیا ہو، چاہے اس کیلئے غدیر کے اجماع کا انتظار ہو، جب تک ایک بھی پیغام ہو جو نہ پہنچایا گیا ہو، اس وقت تک رسول کی ضرورت ہے۔اس کے بعد رسالت ختم۔لیکن امام کے معنی ہیں آگے آگے چلنے والا۔جب تک راستہ قائم رہے اور رہرو باقی رہیں، اس وقت تک امام کی ضرورت ہے۔

اب قانونی بات یہی ہے کہ جانشین کے معنی کیا ہیں؟ اس کام کو انجام دینے والا۔ تو جو سرکاری طور پر جانشین کسی کام کیلئے ہو، اس کا لقب وہی ہوگا جو اس کے پیشرو کا ہے جس کا یہ جانشین ہے۔

جج کی کرسی پر ایک دن کیلئے بھی بطور قائم مقام جو آئے، وہ جج ہی کہلائے گا۔ کسی اور نام سے اس دن خطاب کریجئے تو توہین کا دعویٰ کر دے گا۔ مثلاً اس کا پرانا عہدہ، منصب کا کہہ دیجئے۔ اب آج کے دن جو وہ جج ہے، وہ عدالت کی توہین ہے۔ تو جو جس عہدہ کا جانشین ہوگا، اسے وہی نام ملے گا جو اس صاحب عہدہ کا ہے۔ اب رسول کے پاس اللہ کی گویا تین پوسٹیں ہیں۔ ایک نبوت کا کام، ایک رسالت کا کام، ایک امامت کا کام۔ اب جو جانشین ہوگا، وہ کس عہدہ میں جانشین ہوگا؟ اگر نبوت میں جانشین ہو تو نبی کہنا چاہئے۔ اگر رسالت میں جانشین ہو تو رسول کہنا چاہئے۔ اس کے خلاف کوئی لفظ بھی غلط ہوگا۔

مگر یہ دونوں کام تو ختم ہو گئے، یہ جگہیں ختم کر دی گئیں۔ وہ پوسٹیں باقی نہیں رہیں۔ تو اب نہ اُس میں کوئی جانشین ہو سکتا ہے، نہ اس میں کوئی جانشین ہو سکتا ہے۔ تیسرا کام چونکہ قیامت تک برقرار ہے، اسی میں جانشینی ہوگی۔ لہٰذا اب جو اس جگہ پر آئے گا، امام ہوگا۔ مجھے منفی پہلوؤں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی، مثبت پہلو ہی پیش کرتا ہوں۔ اصل میں بنیادی فرق وہیں سے شروع ہوا جہاں سے رسولؐ کو دنیا کا ایک بادشاہ بھی تصور کر لیا۔ مگر مجھے کہیں ان کا عہدۂ بادشاہ نظر نہیں آتا۔ متفق علیہ تاریخی بات ہے کہ فتح مکہ پر رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان جب مسلمانوں میں شامل ہو گیا، ابھی تک پہلے کا ذکر تھا، تو میں نے ہو گیا کہا، اب جو بات ہوگی تو انہوں نے کہا، کہوں گا۔ اب ذرا احترام ہو جائے گا۔ آ گیا تو رسولؐ نے فرمایا عباس سے کہ اسے پہاڑی پر لے جا کر فوج اسلام کا تزک و احتشام دکھلا دو۔

وہاں اس دن اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کے دستے آئے تھے۔ ہر ایک تاریخ میں مکمل طور پر اس کا ذکر ہے۔ جو دستہ آتا ہے تو وہ اس سے اتنا متاثر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو دیکھ کر فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ رسول کا دستہ ہے؟ ارے نہیں، ابھی کہاں؟ یہ تو فلاں انصار میں سے ایک ہیں۔ بہت سے گروہوں کے گزر جانے کے بعد حضرتؐ خاص بنی ہاشم کے حلقے میں تشریف لائے۔ تو انہوں نے جناب عباس سے کہا:

"لَقَدْ اَصْبَحَ مُلْكُ ابْنِ اَخِيْكَ عَظِيْمًا"

تمہارے بھتیجے کی سلطنت تو بہت عظیم ہو گئی۔ حالانکہ یاد رکھئے گا کہ جناب عباس اپنی تمام تر دینی بلندیوں کے باوجود تاریخی اعتبار سے اسلام میں نو وارد ہیں۔ مگر یہ بات اس وقت تک ہے۔ مسلمان کے ذہن نشین ہے یہ۔ نہ جانے کس دور میں مسلمان بھولے ہیں اس کو۔ جونہی انہوں نے یہ کہا: ارے تمہارے بھتیجے کی سلطنت بہت عظیم ہو گئی۔ تو جناب عباس نے ابوسفیان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ یہ سلطنت نہیں ہے، نبوت ہے۔

غرض یہ کہ اب یہ سلسلہ جو ہوگا، تو ان میں سے ہر فرد امام ہوگا۔ تو اب نبوت میں جو اس سے کمتر درجہ کی چیز تھی، اس میں عمر کی قید نہ ہوگی۔ گہوارے کا بچہ کہتا ہے کہ اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ بنائے گا نہیں۔ اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ تو

اس سے بالاتر درجہ امامت کا ہے۔ اس میں عمر کی کیا قید؟ اس دن کہہ چکا کہ پیغمبرؐ نے اپنے دونوں نواسوں کیلئے فرمایا:

"اِبْنَایَ ھٰذَانِ اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا"۔

یہ میرے دونوں بیٹے امام ہیں چاہے کھڑے ہوں، چاہے بیٹھے ہوں۔

اور اب چونکہ یہ اس سلسلہ کے افراد تھے، جنہیں خلاق نے صاحب منصب کیا تھا اور اب رسول اس دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں تو ان کا آئینی فریضہ ہے کہ ان ہستیوں کا تعارف کروا کے جائیں جو اب اس سلسلہ کے حامل افراد ہوں گے۔ اب جن جن احادیث کو دنیا محبت پر ڈھالتی ہے اور رشتے ڈھونڈتی ہے، حدیثیں سب تسلیم، فضیلتوں کے ہم منکر نہیں ہیں۔ مگر بہت چاہتے تھے، بہت محبت کرتے تھے یعنی دونوں بچے جز و ملا کر ذہن کو غلط راستے پر لے جایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فضیلت مان رہے ہیں تو یہ بھی سچی بات اور یہ کہ بڑی محبت تھی، یہ بھی سچی بات۔ یہ کوئی رہبانیت کا دین نہیں ہے کہ بیٹی سے محبت کرنا کوئی بری بات ہو، بچوں کو چاہنا کوئی بری بات ہو۔

اسی دین کے پیغمبر ہیں تو بیٹی سے محبت ضرور ہونی چاہئے۔ اپنے نواسوں سے محبت ہونی چاہئے۔ مگر فضیلت کی حدیثوں کو ڈھالنا اس محبت پر یعنی رابطہ قائم کرنا ان میں اور اس قرابت میں۔ یہ دونوں جزووں کا غلط استعمال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیثوں کی نوعیت تو دیکھئے بیٹی کو کہہ رہے ہیں کہ میرا پارۂ جگر ہے، لختِ دل ہے۔ یہ سب باتیں محبت کی بناء پر ٹھیک تھیں لیکن مسلم صحاح ستہ کی حدیث، صحیحین کی حدیث اور صحیح بخاری کی حدیث کہ "سَیِّدَۃُ النِّسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ" یہ اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ تو جنت کیا اپنے خاندان کی کوئی چیز ہے؟ جنت وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور حسن عمل کی جزا کیلئے پیدا کیا ہے۔ تو صرف اپنی بیٹی ہونے کی وجہ سے یہ کہنے کا کیا حق ہے؟

عقلی طور پر، اصولی طور پر کہ یہ اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ مکتبِ خیال تو برابر مجھے یاد آتا رہتا ہے کہ محمدؐ رسالت اور بشریت میں تقسیم ہیں اور ان کی کچھ باتیں بحیثیتِ رسولؐ ہیں اور کچھ باتیں بحیثیتِ بشر ہیں۔ لیکن نقطہ نظر کے بڑے سے بڑے آدمی سے میں یہ پوچھنے کیلئے تیار ہوں کہ جنت کے بارے میں جو بات ہوگی، وہ بحیثیت بشر ہوگی یا بحیثیت رسول ہوگی؟

یہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ مطلب کیا؟ مطلب یہ کہ جنت میں جانے کا جو معیار ہے، وہ میری بیٹی میں اتنے کمال کے نقطہ پر ہے کہ قیامت تک کوئی مسلمان خاتون اگر جنت میں جانا چاہے تو اس کے پیچھے ہی چل کر جا سکتی ہے۔ اس سے آگے چل کر نہیں جا سکتی۔ ہمارے ہاں کی کونسی خاتون ہے جو کنیز سیدہؑ کہنے کو اپنا حق نہ سمجھتی ہو۔ تو اگر سیدہؑ کی کنیز ہے تو سیدہؑ کے شعار کو وہ ذلت سمجھ سکتی ہے؟ سیدہؑ کے راستے سے ہٹنے کو وہ عزت سمجھ سکتی ہے؟

دیکھئے! سیدہؑ عالم کا معیار حجاب کیا ہے؟ پردہ داری کا معیار کیا ہے؟ اپنے باپؐ کے خطبے میں کبھی برقع و چادر میں نہاں ہو کر بھی باپؐ کے خطبے میں تشریف نہیں لائیں۔ حالانکہ جو حضرات ماشاء اللہ فریضہ حج سے سبکدوش ہوئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ خانہ سیدہؑ عالم اور مسجد نبویؐ کے درمیان نہ کوئی کوچہ ہے اور نہ کوئی بازار ہے۔ وہ تو آج تک بھی مسجد سے باہر نکلے کر نہیں جا سکا۔ یاد رہے کہ جب تک

میں نے دیکھا کہ خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا ہے۔ کوئی زیارت کیلئے اندر نہیں جاسکتا۔ یہ سب کچھ ہے مگر یہ کہ اس کو باہر کر دیا گیا ہے۔ یہ میرے دور تک کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

تو جناب! مسجد نبوی کے اندر ہے بلکہ ایک عجیب چیز میں نے محسوس کی کہ بہت سے دروازے ہیں اس کے۔ ان کے بہت سے نام ہیں۔ ایک دروازہ جس میں گزر کر خانہ فاطمہ زہرا سامنے نظر آتا ہے، اس دروازہ کا نام باب جبرئیلؑ ہے۔ جنت البقیع سے آگے بڑھیے اور پھر حرم میں داخل ہو جایئے تو پھر وہ باب جبرئیلؑ ہوگا۔ اس میں داخل ہو جایئے تو خانہ فاطمہ زہرا ملے گا۔ اس کے بعد آگے بڑھے تو روضۂ رسولؐ ملے گا۔ میرے ذہن نے جغرافیائی ترتیب سامنے رکھ کر ایک رائے قائم کی کہ آخر اس کا نام باب جبرئیلؑ کیوں ہے؟ تو سوائے اس کے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اور لوگ دوسرے دروازوں سے آتے ہوں گے لیکن جبرئیلؑ جب آتے تھے تو پہلے سیدۂ عالم کے گھر پر سلام کرتے تھے، پھر رسولؐ کی خدمت میں آتے تھے ورنہ دروازے کا نام آخر یہ کیوں ہوا؟

تو اب نہ کوئی کوچہ ہے اور نہ کوئی بازار ہے لیکن اس کے باوجود بھی باپؐ کے خطبے میں کبھی نہیں آئیں۔ یہ نہیں ہے کہ دل نہ چاہتا ہوگا، دل تو ایسا چاہتا تھا کہ جب بڑا بیٹا جاتا تھا حسنؑ مجتبیٰ، تو اکثر پوچھ لیتی تھیں کہ تمہارے جدِ بزرگوار نے آج کیا بیان کیا اور حسنؑ مجتبیٰ اپنے جدِ امجد کے خطبے کا پورا مضمون ماں کو سنا دیا کرتے تھے۔

آپ کا سنا ہوا ہے وہ واقعہ، اس وقت پورا واقعہ پیش نہیں کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس طرح سے ایک سوال کا جواب بھی قیامت تک کیلئے اپنی کنیزوں کو دے دیا۔ لوگ جو کہتے ہیں کہ پردہ مانع تعلیم ہے تو انہوں نے بتایا کہ نہیں، مانع تعلیم نہیں ہے۔ اگر چاہیں تو اپنے محرم افراد کے ذریعہ سے وہ بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ وہ ہوا چلتی ہے جس میں معقولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو یہ باپؐ کے خطبہ میں نہیں جاتی تھیں اور بے شک حکمِ الٰہی سے مباہلہ میں گئیں۔

اس دن عرض کر چکا ہوں، مباہلے کے میدان میں بڑے اہتمام پردہ داری سے گئیں۔ آگے آگے رسولؐ، پیچھے پیچھے علی ابن ابی طالبؑ اور بیچ میں برقع و چادر میں نہاں ہو کر۔ مگر پھر بھی فاطمہ زہرا سے ناانصافی ہے، اگر یہ اقرار نہ کیا جائے کہ جو ان کا معیارِ حجاب تھا، اس کے لحاظ سے آج انہوں نے حکمِ الٰہی کی تکمیل میں ایک قربانی دی۔ میں کہتا ہوں کہ اس طرح زینبؑ کیلئے راستہ صاف ہو گیا۔ بیٹی! یہ وقت کی بات ہے کہ میرے لئے اتنی ہی ضرورت تھی لیکن کبھی دینِ خدا کو ضرورت ہو تو کسی حال میں کہیں جانے میں عذر نہ کرنا۔

26

اولی الامر کون؟

میں کہتا ہوں اللہ اور رسول کے بیچ میں "اَطِیْعُوا" آیا مگر رسول اور اولی الامر کے بیچ میں اللہ کا لفظ بھی گوارا نہیں تھا۔

جب ان کی اطاعت ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی اطاعت ہوگئی یعنی مرضی الٰہی میں تمہاری نگاہ سند نہیں ہے رسول کے اقوال سند ہیں۔

اب ایک پوری سیرت کی کتاب میں سمیٹ کر چند لفظوں میں بیان کروں خالق نے ان سب کو سمیٹ کر ایک سند دی کہ اے پیغمبر آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں یہ خدائے اکبر دنیائے سیرت میں ان کے کردار کو عظیم کہہ رہا ہے۔

اولی الامر کے معنی میں نے کہے تھے صاحبان امر ہم ہر دور کے اس فرد کو صاحب الامر کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اسے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ گیارہ کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا کیا جواب پوچھ رہے ہیں کہ بارہویں کو غائب کیوں کیا۔

اولی الامر کون؟

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ

اس آیت کو جو عنوانِ کلام ہے، میرا موضوعِ کلام قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اے صاحبانِ ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور ان حقدارانِ حکمرانی کی جو تم ہی میں سے ہیں۔ تمام اہلِ ایمان سے خطاب ہے تین اطاعتوں کا مگر قابلِ غور یہ بات ہے کہ اطاعت کے حکم تین ہیں اور لفظ "اَطِیۡعُوۡا" بس دو دفعہ ہے۔ یعنی سمجھ میں آتا ہے کہ یا یہ ہوتا کہ ایک "اَطِیۡعُوۡا" ہوتا اور اس کے تحت وہ تمام ہستیاں جن کی اطاعت فرض ہے، درج ہو جاتیں کیونکہ حرفِ عطف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک حکم میں کئی کو شریک کر دے۔ آپ کسی سے کہیں کہ کل فلاں وقت آپ اور وہ اور وہ میرے ہاں آئیں۔ تو اب بس۔ میرے ہاں آئیں۔ ایک دفعہ کہنا کافی ہے اور جو آئیں، ان کا نام ایک ساتھ حرفِ عطف کے ساتھ کہ آپ اور وہ اور وہ یہاں آئیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے۔ ایک طریقہ بات پر زور دینے کا وہ ہے کہ جن جن کا نام لینا ہے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حکم بھی دہرا دیا جائے۔

تو اب غور کیجئے کہ جن کی اطاعت کا پیغام دیا جا رہا ہے، وہ ہیں تین۔ اللہ، رسول اور اولی الامر۔ اور "اَطِیۡعُوۡا" تین لفظوں کے ساتھ نہیں آتا۔ ورنہ ہوتا:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہوں"۔

یا ہر ایک کے ساتھ "اَطِیۡعُوۡا" ہوتا۔ ایک یعنی تینوں کے ساتھ تین "اَطِیۡعُوۡا" ہوتے۔ مگر قرآن مجید اس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے، اُس طریقہ کو بھی چھوڑتا ہے۔ نہ یہ کرتا ہے کہ ایک "اَطِیۡعُوۡا" کہے کہ اطاعت کرو اور سب کا نام لے کر دے اور نہ یہ کرتا ہے کہ تینوں کے ساتھ "اَطِیۡعُوۡا" کہے بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے کہ اللہ کے ساتھ تو ایک "اَطِیۡعُوۡا" الگ اور رسول اور اولی الامر کے ساتھ ایک "اَطِیۡعُوۡا" الگ۔ اس میں کوئی حکمتِ کلام ہونا چاہئے۔ بلاغتِ کلامِ الٰہی ایک ایسا اسلوب اختیار کرے جو نہ اُس پر منطبق ہو، نہ اس پر منطبق ہو۔ نہ تکرارِ فعل بہ اعتبارِ معمول ہو نہ ایک فعل میں تمام افراد شریک ہوں۔ بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے کہ ہستیاں تین اور اطاعتیں دو۔

تو اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تو اصل حاکم کے اعتبار سے ہے اور اس کی حکمرانی ذاتی اور اکیلی ہے۔ اس حکمرانی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ذاتی حیثیت سے حکم کا مرکز صرف اُس کی ذات ہے۔ لہٰذا پہلا "اَطِیۡعُوۡا" جو آیا اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کا نام نہیں لیا گیا۔ اب اس کے بعد جو اطاعت ہو گی، وہ نائب حاکم کے اعتبار سے

ہوگی۔ اب جب نائب حاکم کی حیثیت سے اطاعت کروائی گئی تو اگر رسول اور اولی الامر کی اطاعت میں کوئی فرق ہوتا تو جیسے اللہ کیلئے "اَطِیْعُوا" الگ آیا، ویسے ہی رسولؐ کے لئے "اَطِیْعُوا" الگ آتا اور اولی الامر کیلئے "اَطِیْعُوا" الگ ہوتا۔ مگر نہیں۔ ایک "اَطِیْعُوا" میں رسول اور اولی الامر دونوں۔

اب یہ ذرا علمی مسئلہ ہے کہ حضور! اگر الفاظ تین ہوں تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک لفظ سے کچھ معنی مراد ہوں، دوسرے لفظ سے دوسرے معنی مراد ہوں، تیسرے لفظ سے کوئی تیسرے معنی مراد ہوں۔ متکلم نے تین مرتبہ لفظ صرف کیا اور ہر لفظ میں اس نے ایک معنی مراد لئے جو قرینہ کلام سے سمجھ میں آگئے۔ لیکن جب لفظ ایک ہو تو اس میں دو معنی نہیں ہوسکتے۔ تو ایک لفظ "اَطِیْعُوا" ہے جو رسول اور اولی الامر سے متعلق ہے۔ اب جس معنی میں رسولؐ کی اطاعت ہوتی، اسی معنی میں اولی الامر کی اطاعت ہوگی۔ جن قیدوں کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت ہوگی، انہی قیدوں کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت ہوگی۔ نہ مفہوم میں فرق ہوسکتا ہے اور نہ حدود و قیود میں فرق ہوسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ اور رسولؐ کے بیچ میں "اَطِیْعُوا" آیا مگر رسول اور اولی الامر کے بیچ میں اللہ کو لفظ بھی گوارا نہیں تھا۔

تو اصل اطاعت اللہ کی ہے اور رسولؐ کی اطاعت اس اعتبار سے کہ اُس کے احکام ان کی زبان سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں ایک آیت ملتی ہے کہ ارشاد ہوا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ؕ

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ تمہیں دو کام نہیں کرنے ہیں، ایک کام ہے جس کے دو نام ہیں۔ وہی ایک نظام ہے، اس کی پابندی اطاعت خدا بھی ہے اور اطاعتِ رسول بھی ہے۔ میرے ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بس یہی کہنا ہے کہ یہ دو الگ الگ کام نہیں ہیں، ایک ہی کام کے دو نام ہیں تو یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ 'مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ فَقَدْ اَطَاعَ الرَّسُوْلَ'۔ جس نے اللہ کی اطاعت کی، اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ یہ ادھر سے کیوں کہا کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یہ نہیں کہا اُس نے۔ کیوں نہیں کہا؟

یاد رکھئے، بڑا فرق ہوجاتا نتیجہ میں اگر یہ کہا جاتا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی، اُس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ تو اللہ کی اطاعت کو انسان اپنے نقطۂ نگاہ سے متعین کرتا کہ کس طرح ہم اللہ کی اطاعت کریں۔ اُسے اپنی رائے سے، جس میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں، یا اپنے اجتہاد سے یا اپنے ذہن سے یہ طے کرتا کہ اس راستے پر اللہ راضی ہوتا ہے۔ جب سمجھ لیتا کہ اللہ کی اطاعت ہوئی تو پھر قرآن کی آیت کو لاتا کہ بس رسولؐ کی بھی اطاعت ہوگئی۔

مگر قرآن نے یہ کہا ہی نہیں کہ جو خدا کی اطاعت کرے، اُس نے رسول کی اطاعت کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے تمہیں ان کے احکام دیکھنے ہیں، پہلے تمہیں ان کے فرامین پر نظر کرنا ہے، جب ان کی اطاعت ہوجائے تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی اطاعت ہوگئی۔ یعنی مرضی

الٰہی میں تمہاری نگاہ سند نہیں ہے، رسولؐ کے اقوال سند ہیں۔

اب یہ دو اطاعتیں ہیں الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے۔ ایک اطاعتِ خدا، ایک اطاعتِ رسولؐ و اولی الامر۔ تو اب مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ اللہ کی اطاعت میں کوئی قید، کوئی شرط، کچھ ہے کہ اللہ کی اطاعت کن باتوں میں ضروری ہے؟ کن باتوں میں اللہ کی اطاعت ضروری نہیں؟ تو یقیناً مسلمان کیسا، ہر اللہ کا بندہ یہ کہے گا کہ نہیں، اللہ کی اطاعت میں کوئی شرط، کوئی قید نہیں ہے۔ یعنی جو اسکا حکم ہو، کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق، اس کی اطاعت ضروری ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ دوسری شخصیت رسول کی ہے۔ تو اب ماشاء اللہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے، میں فرزندانِ اسلام سے پوچھتا ہوں کہ رسولؐ کی اطاعت میں کوئی قید ہے؟ قرآن کے الفاظ میں تو جیسے "أَطِيعُوا اللهَ" مطلق ہے، ویسے ہی "أَطِيعُوا الرَّسُولَ" مطلق ہے۔ الفاظ میں کوئی قید نہیں ہے۔ رسولؐ کی اطاعت میں کوئی قید ہے کہ کچھ احکام کی اطاعت ضروری ہو اور کچھ احکام کی ضروری نہ ہو؟ چونکہ فرزندانِ اسلام کا مجمع ہے، اس لئے ہر طرف سے آواز آئے گی: بے شک بے شک، رسولؐ کی اطاعت مطلق طور پر فرض ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں فرض ہے۔ اب سب طرف سے آوازیں آگئیں۔ ایک گوشے سے آواز آئی، مگر مجھے حیات ہوئی کہ رسولؐ کے بارے میں یہ کہاں سے آگیا اور وہ بھی مسلمانوں کے مجمع میں سے؟

تو اب میں نے ذرا غور سے سنا کہ کیا ہے؟ تو سنائی یہ دیا کہ بے شک رسولؐ کے احکام پر بھی مطلق عمل واجب ہے مگر رسولؐ کے وہ احکام جو بحیثیت رسولؐ ہوں۔ مگر جو احکام بحیثیت بشر کے ہوں، ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ میں سیاست کی دنیا کا آدمی تو نہیں ہوں لیکن ایک سنی سنائی بات یاد رہ گئی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ملک کے بٹوارے کا اتنا شوق ہے کہ اب رسولؐ کی زندگی کا بٹوارہ بھی ہونے لگا۔

یاد رکھئے کہ کسی چیز کی رد کرنا اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ معنی سمجھ میں آئیں۔ یہ بات کہ بحیثیت رسول جو احکام ہوں، ان کی اطاعت فرض ہے اور بحیثیت بشر جو احکام ہوں، ان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ رسولؐ کی زندگی منقسم ہے کہیں تک؟ آپ فقط بشر ہیں اور کہیں سے آپ رسول بھی ہیں۔ تو میں اس کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھتا۔ اس کی رد کا کیا سوال ہے؟ میں کہتا ہوں کہ رسالت سے بہت کم جو درجے ہوں، میں اس میں اس کا تصور نہیں کرتا۔ ارے صاحب! سب سے کم تر درجہ مسلم کا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ تو اگر کوئی مسلمان ہے تو اس کے ہاں میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کہاں تک وہ فقط آدمی ہو اور کہاں سے مسلمان ہو؟

میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہے تو ہر شعبۂ حیات میں مسلمان ہے۔ کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں ہے جس میں مسلمان نہ ہو۔ یہ دوسرے مذاہب میں ہو سکتا ہے جہاں کچھ وظائف سے مذہب کا تعلق ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ہو سکتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن گرجا چلے گئے تو بس معلوم ہوا کہ عیسائی ہیں اور بس کے بعد چھ دن ڈاکٹر ہیں، وکیل ہیں، جو کچھ اور ہیں، وہ ہیں۔ اس میں عیسائیت کا دخل نہیں ہے۔ لیکن اسلام ایسا نہیں ہے۔ یعنی میں مختصر جملہ اس کیلئے یہ کہوں گا کہ اسلام میں دین جزوِ حیات نہیں ہے، کل حیات ہے۔ جو کوئی مسلمان ہے، وہ منزل زندگی میں بھی مسلمان ہے، محلہ کی زندگی میں بھی مسلمان ہے، باہر کی زندگی میں بھی مسلمان ہے۔ ہر معیار سے مسلمان

ہے۔ ڈاکٹر ہو، وکیل ہو، تاجر ہو، کچھ بھی ہو، جو بھی ہو اس میں سوال یہ ہے کہ مسلمان ڈاکٹر ہے یا نہیں، مسلمان وکیل ہے یا نہیں؟ کوئی کہے کہ صاحب ابھی تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ڈاکٹر ہونے میں مسلمان ہونے کا کیا دخل ہے؟

تو میں عرض کرتا ہوں کہ ایک مریض ایسا آیا کہ جس کی شکایت معمولی ہے، کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جائے تو نسخہ لکھ دے گا، ٹھیک ہو جائے گا۔ غیر اہم بیماری ہے۔ تو اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت کوئی غیر معمولی فیس مانگنے کا موقع نہیں۔ بس جتنی رسمی فیس ہے، وہ مل جائے تو مل جائے۔ لیکن اگر کوئی پیچیدہ مرض آ گیا جس کے متعلق اپنی مہارتِ فن سے سمجھ لیا کہ سوائے میرے کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی مہارتِ فن کی پوری قیمت وصول کرنے کا موقع ہے۔ سمجھتے ہیں کہ ابھی تو شکار ملا ہے، یہ تو پیشے کا تقاضا ہے۔ مگر اسلام کا تقاضا کیا ہے کہ اگر سمجھتے تھے کہ کوئی اور بھی علاج کر سکتا ہے تو علاج کرنا تم پر واجب نہیں تھا۔ لیکن جب تم نے خود سمجھ لیا کہ اس کی زندگی تمہارے علاج پر موقوف ہے تو اب اس کا علاج تم پر واجب عینی ہے۔ اگر تم مول تول میں لگے رہے اور وہ مر گیا تو تم قاتلِ نفس قرار پاؤ گے۔

تو اب دیکھا آپ نے کتنا مشکل ہے مسلمان ڈاکٹر ہونا۔ اور مسلمان وکیل؟ جناب اگر مقدمہ ایسا ہے صاف صاف دستاویز کے لحاظ سے حقیقت ثابت ہے تو سمجھتے ہیں کہ یہ ہر ایک وکیل کرے گا، لہٰذا بس جو رسمی فیس ہے، وہ لے لو۔ لیکن اب وکیلوں کی زبان میں کہوں گا کہ اگر ایسا مقدمہ آیا جو بالکل بے جان ہے، بے جان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بالکل غلط ہے تو اب وکالت کے پیشے کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی تو مقدمہ ایسا ہے کہ جس میں زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے۔ لیکن مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ جب سمجھ لیا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اسی وقت چھوڑ دے کہ ہم کسی جھوٹے مقدمے کی پیروی نہیں کرتے۔ دیکھا آپ نے کہ کون وکیل ہے اور کون مسلمان وکیل ہے؟

اور جناب تاجر! اگر آپ فاضلاتِ حیات کے تاجر ہیں، یعنی جو چیزیں نظامِ زندگی کا جزو نہیں ہیں۔ فرنیچر بیچتے ہیں، سامانِ آرائش بیچتے ہیں، یہ چیزیں آج کی تہذیب کے کتنے ہی لوازم میں سے ہوں مگر ضروریاتِ حیات میں سے نہیں ہیں۔ تو اس میں آپ جتنی چاہے نفع اندوزی کر لیجئے۔ کوئی حکومت جتنا چاہے، کنٹرول کرے، مگر ہمارے نزدیک حکومت کا کوئی کنٹرول، کوئی شدید پابندی نہ ہوگی اس پر۔ اس لئے کہ مالک کو اختیار ہے اپنی چیز جتنے میں چاہے بیچے، ہاں جھوٹ نہ بولے۔ یہ نہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدی تھی، نہیں۔ کہے کہ میری چیز ہے، میں اتنے میں بیچوں گا۔

جتنی زیادہ سے زیادہ چاہے قیمت مقرر کر دے، تب تو حق ہے، لیکن اگر ضروریاتِ زندگی کا تاجر ہے، غلہ کا تاجر ہے۔ غلے سے بقائے حیات ہے۔ اگر غلہ بازار میں فراواں ہے، کثرت سے ہے تو پیشہ کہتا ہے کہ یہاں زیادہ نفع اندوزی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم زیادہ مانگیں گے تو وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ مگر کسی کی ہے، بازار میں قحط کا زمانہ ہے۔ اس نے اپنی ترکیبوں سے سٹاک کافی رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے لوگوں کے پاس وہ نہیں ہے۔ ضروریات کے طلبگاروں کو اس کے پاس آنا لازمی ہے۔

اب یہاں اسلام کہہ رہا ہے "اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ"، جو تین دن تک اضافہ قیمت کی اُمید میں غلہ روکے، وہ محلِ لعنت ہے اور

اب یہاں ایک پہلو سیرتِ معصومین کا میرے سامنے آگیا ہے۔ یاد رکھئے احتکار کا مسئلہ تجارت میں ہے۔ وہاں یہ ہے کہ نفع اندوزی کی خاطر اُسے روکو نہیں، لیکن کوئی انسان اپنی ذاتی ضروریات کیلئے، آسانی کیلئے زیادہ غلہ رکھے، اپنے اہل وعیال کی سہولت کیلئے تو یہ قانونِ شریعت سے ممنوع نہیں ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ آلِ رسولؐ وہ تھے جو اپنا معیار شریعت کی پابندیوں سے اور بالاتر رکھتے تھے۔ آگے رکھتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں قحط پڑا۔ قحط کے ایسے آثار نمودار ہوئے کہ لوگ اب نانِ شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے اور بہت مشکل سے اناج ملے گا۔ حضرتؑ نے اپنے توشہ خانے کے منتظم کو بلا کر دریافت فرمایا کہ ہمارے توشہ خانے میں مہمانوں کیلئے کتنا غلہ موجود ہے؟ وہ سمجھا کہ حضرتؑ کچھ پریشان ہیں تو اس نے بڑے اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ حضورؑ! ہمارے پاس تو اتنا ہے کہ یہ فصل ہم آسانی سے کاٹ لے جائیں گے۔ یہ حضرتؑ کے گویا اطمینان دلانے کیلئے کہا۔ آپؑ نے کہا: بس! اچھا ہے معلوم ہو گیا۔ کل یہ غلہ بازار میں لے جانا اور یہ سب فروخت کر دینا۔

اس کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ بالکل گویا اصولِ معاشیات کے خلاف ہدایات۔ اس نے کہا: مولاؑ! پھر ہم بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ زحمت میں ہو جائیں گے۔ آپؑ نے فرمایا: یہی تو میں چاہتا ہوں کہ اس سب کو فروخت کر دو۔ جس حال میں سب مسلمان ہیں۔ اسی حال میں ہم بھی ہو جائیں گے۔

دیکھا آپ نے، قرآن اور اس کے ساتھ لفظی تعلیمات کہاں تک رہتے ہیں اور قرآنِ ناطق کا کردار کتنی بلندی پر جاتا ہے۔ میں تاجروں کو چھوڑتا نہیں، اس کا تصور کر کے کہ بانیانِ مجلس ماشاءاللہ تاجر ہیں مگر ایک صاحب نے تحریک بھی کر دی۔ وہ بلا تحریک بھی ہوتا مگر جب ان تک پہنچا ہوں تو اپنے کو کیوں چھوڑوں؟ جبکہ بہر حال اس دَور میں کون مولوی ہے اور کون مسلمان مولوی ہے۔ اگر ہمارے سامنے مسئلہ پیش کر دیا، دیکھ کر فوراً ہمارا ذہن گیا کہ کون کون بڑے آدمی اس سے خفا ہو جائیں گے؟ کن لوگوں کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ کن لوگوں کے مفادات کو اس سے نقصان پہنچے گا؟ یا وہ محسوس کریں گے نقصان۔ اگر یہ سب تصور میں آگئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مولوی ہیں مگر مسلم مولوی نہیں ہیں۔ اگر استثنیٰ ہو اور ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ رضائے حق کس چیز میں ہے اور یہ پیش نظر رکھیں کہ اصل حکم الٰہی کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب مسلم ہوں گے۔

اب یہ آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مسلمان میں یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ کس حد تک وہ فقط آدمی ہے اور کس حد تک وہ مسلمان ہے۔ اب مسلمان کے آگے درجہ ہے ہمارے نزدیک عدالت کا۔ جس کے پیچھے نماز پڑھنے کی شرط ہے، ہر مسلمان کے پیچھے ہمارے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ عادل کے پیچھے نماز ہوتی ہے تو عادل کے لئے میں یہ تصور نہیں کر سکتا۔ کہ کہاں تک وہ آدمی ہو اور کہاں سے عادل ہو؟ اگر عادل ہے تو گھر میں بھی عادل ہے، محلے میں بھی عادل ہے، ملک میں بھی عادل ہے۔ اس میں یہ تفریق نہیں ہو سکتی۔ جب ان چیزوں میں میں یہ تصور نہیں کر سکتا جو کمتر درجہ کی ہیں تو رسالت میں کیونکر تصور کروں کہ کہاں تک یہ فقط بشر ہیں اور کہاں سے رسولؐ ہیں؟

اب ایک اور پہلو کی طرف عقلی حیثیت سے توجہ دلاؤں کہ اگر یہ دین وہ ہوتا کہ جو دین دنیا کے شعبوں سے الگ ہو تو اس کے

پیغمبر میں بھی یہ تفریق ہو سکتی۔ لیکن جب یہ دین وہ ہے جس سے کوئی شعبہ حیات باہر نہیں تو پیغمبرِ خدا میں یہ تفریق کیونکر ہو سکتی ہے کہ آپ کہیں پر بشر ہوں اور کہیں سے رسولؐ ہوں۔

اب ایک پوری سیرت کی کتاب میں سمیٹ کر چند الفاظ بیان کروں۔ خالق نے اس سب کو سمیٹ کر ایک سند دی:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝

اے پیغمبرؐ! آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں"۔

یہ خدائے اکبر و خدائے اعظم دنیائے سیرت میں انؐ کے کردار کو عظیم کہہ رہا ہے تو آپ خلقِ عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔ کسی شعبۂ حیات میں ان کی سیرت کو اس نے مستثنیٰ نہیں کیا۔ تو اب اس کو میں پھیلا کر چند الفاظ میں بیان کروں۔ پھیلاؤں گا ایسا کہ ساری زندگی پر حاوی۔ مگر اختصار ایسا ہوگا کہ چند لفظوں میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جو خالق نے کہا کہ آپ یقیناً خُلقِ عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اولاد کیلئے آپ سے بہتر باپ کوئی نہیں، اپنی شریکِ حیات کیلئے آپ سے بہتر شوہر نہیں کوئی، اپنے پڑوسیوں کیلئے آپ سے بہتر پڑوسی کوئی نہیں، اپنے محکوموں کیلئے آپ سے بہتر حاکم نہیں اور اپنے خدا کا آپ سے بہتر بندہ بھی کوئی نہیں ہے۔

اب اس دعوے کے کھو کھلے پن کو بہت سادہ لفظوں میں آپ کے سامنے پیش کروں کہ احکام تو ہم آپ کی زبان سے سب سنتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ کچھ احکام بحیثیت بشر ہوتے ہیں، کچھ احکام بحیثیت رسولؐ۔ تو ان کے ساتھ ساتھ کوئی رسول ہونا چاہئے جو بتا تا رہے کہ کون سا حکم بطورِ بشریت ہے اور کونسا حکم بطورِ رسالت ہے؟ تو پھر آپ کی زندگی رہنما ہی نہیں ہوگی۔ پھر حکم کو ٹالا جاسکے گا یہ کہہ کر کہ یہ بشریت کا تقاضا تھا۔

دیکھئے! اجنلفتوں کو نبھانے کیلئے کتنے چور دروازے اختیار کیے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ وہ "مگر" جو تھا، وہ مردہ مگر تھا کوئی۔ اس مگر میں کوئی زندگی نہیں تھی۔ تو جس طرح اللہ کی اطاعت غیر مشروط، اسی طرح رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط۔ اب بغیر دوسرا "اَطِیْعُوا" لائے ہوئے اسی پہلے "اَطِیْعُوا" کے تحت بلا فصل رسولؐ کے ساتھ اولی الامر ہے۔ اب یہاں اولی الامر میں، بس ایک لفظ میں لوگ اُلجھتے ہیں، اولی الامر۔ یہ اولی جمع ہے ذی کی۔ ذی کے معنی صاحب کے ہوتے ہیں۔ ذی علم یعنی صاحبِ علم تو اولی الامر یعنی صاحبانِ امر۔ یہ معنی ہوئے اولی الامر کے۔ تو اب کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ کون لوگ برسرِ امر ہیں اور امر نافذ کر رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ صاحبِ امر۔ یہ معنی ہوئے اولی الامر کے۔ تو اب کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ کون برسرِ امر ہیں اور امر نافذ کر رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ صاحبِ خانہ، صاحبِ خانہ وہی صاحب کا لفظ ہے۔ صاحبِ خانہ وہ ہوتا ہے جو مالکِ خانہ ہو یا وہ ہوتا ہے جو غاصبِ خانہ ہو۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہمارے ملک میں قانون تھا اور غالباً اب بھی ہے کہ بارہ برس کے قبضے میں ڈگری مل جاتی تھی، وہ مالک مان لیا جاتا تھا۔ مگر جو نظامِ الٰہی ہے، وہی ہی نظامِ مصطفیٰؐ ہے۔ تو اس نظامِ الٰہی میں بارہ برس کیا، چودہ برس گزر جائیں، ناجائز قبضے کو حقِ ملکیت نہیں ملتا۔ اسی لئے اولی الامر کے معنی ہیں حقدارانِ امر۔

یہ نہ دیکھئے کہ کون حکم چلا رہا ہے، یہ دیکھئے کہ حکم چلانا کس کا حق ہے۔ جس کا حق ہو، وہ ہے اولی الامر۔ دوسرے الفاظ میں جس

سے لوگ اُلجھتے ہیں، فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، وہ لفظ "مِنکُمْ" ہے کہ اولی الامر جو تم ہی میں سے ہیں، تو خیال کرتے ہیں کہ ہم میں سے ہیں تو ہمارے بھائی بند ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ "مِنکُمْ" تو یہاں سے مخصوص نہیں۔ رسول کو بھی کہا گیا ہے:

"بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِنْھُمْ"۔

اس نے اُمیین میں رسول بھیجا، انہی میں سے۔ تو رسول کو بھی کہا گیا "مِنْھُمْ" اولی الامر کو بھی کہا گیا "مِنکُمْ"۔ تم ہی میں سے۔ تو رسول بھی ان ہی میں سے تھا مگر ان کا مقرر کیا ہوا نہیں تھا۔ ویسے ہی بالکل اولی الامر بھی تم ہی میں سے ہیں مگر تمہارے مقرر کئے ہوئے۔ اور ہم نے اولی الامر کے جو معنی ہیں، اسی کے مطابق اپنا محاورہ قرار دیا ہے۔ اولی الامر کے معنی میں نے کیا کہے تھے؟ صاحبانِ امر۔ ہم ہر دور کے اس فرد کو صاحب الامر کہتے ہیں۔

اب جنابِ والا! میں نے یہ سوال شروع میں اٹھایا تھا کہ یا ایک "اَطِیْعُوا" ہوتا اور تینوں کی اطاعت کا حکم ہو جاتا ایک لفظ سے اور یا تینوں کی اطاعت کروانا تھی تو تین الفاظ ہوتے۔ مگر قرآن مجید نے وہ طریقہ اختیار کیا، نہ یہ طریقہ اختیار کیا۔ اللہ کو تو اکیلے کہا "اَطِیْعُوا" کے ساتھ۔ یعنی اس معنی میں جو اللہ کی اطاعت ہے، کوئی شریک نہیں ہے اور اس کے بعد اب ایک "اَطِیْعُوا" میں رسول اور اولی الامر۔ جس طرح رسولؐ کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام، اسی طرح اولی الامر کی اطاعت کا براہِ راست اس کی طرف سے پیغام۔ اس لئے دنیا کو بڑی دشواری پیش آئی۔ اس عہدہ کا نام رکھنے میں۔ وہ دشواری تاریخ میں درج ہے کہ وہاں امامت کا تصور نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد نظام خلافت چلا۔ تو اب خلیفہ کے معنی جانشین۔ تو اب کس کا جانشین؟ رسول کا۔

تو حضور! وہ پہلی دفعہ تو بات نبھ گئی۔ اب ایک اضافت دے دی کہ خلیفہ رسول اللہ۔ رسولؐ خدا کا جانشین۔ اب ایک کڑی جب تک رہی، تب تک تو آسان رہا۔ اب دوسری کڑی بیچ میں آئی اس کے بعد۔ وہ یقیناً دوررس آدمی تھے۔ ان کے ذہن میں بھی دشواری آئی۔ پہلے دن ہی سوچ لیا ہوتا۔ مگر جب اپنی نوبت آئی تو دشواری پیدا ہوئی کہ وہ تو رسولؐ اللہ کے جانشین۔ اب دوسرا کیا ہوگا؟ رسولؐ خدا کے جانشین کا جانشین۔ ایک "کا" کے بعد ایک اور "کا"۔

اب خیر دوسری منزل میں نبھا لیا جاتا۔ مگر وہ سلسلہ بھی تو رہے گا۔ لہٰذا اب اس کے بعد کیا ہوگا؟ اب جتنے آدمی ہوں، اتنے، "کا"۔ دن بھر "کا"۔ "کا" کہئے اور آخر میں جانشین۔ کہہ دیجئے تو یہ دشواری محسوس ہوئی۔ اب مجلس شوریٰ مرتب ہوئی۔ ایسی ہی مشکلات میں مجلس شوریٰ مرتب ہوئی ہے۔ مگر اب یہ معاملہ ایسا تھا کہ اُس شخص کو اس محفل میں نہیں لایا گیا جس سے سمجھتے تھے کہ بنیادی ا[illegible]لاف ہے ورنہ ہر مجلس شوریٰ میں اہم معاملات میں اُس سے رائے لی جاتی تھی۔ اس میں بھی بلاتے۔ مگر یہاں کوئی روایت نہیں بتاتی کہ بلایا۔ اور جو بھائی بند تھے، جو اس نظام کو مان رہے تھے، ان کو بلایا اور کہا کہ بھئی یہ مشکل ہوئی کہ وہ تو رسولؐ خدا کے خلیفہ۔ اب میں آیا۔ تو میں کہاں جاؤں؟ رسولؐ اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب اس کے بعد جو آئے، اسے کیا کہا جائے؟ تین دفعہ "کا" آئے، تب جا کر اس کا نام لیا جائے۔ تو کسی آدمی نے رائے دی کہ صاحبؑ! اس جھگڑے ہی میں نہ پڑیئے بلکہ ہم مؤمنین ہیں، آپ ہمارے امیر ہیں۔ اتنی مصیبت کے بعد بھی لقب آیا بھی تو غیر کا جو مل چکا تھا بارگاہِ رسالتؐ سے کسی کو۔

بہر حال اس مشکل سے نجات مل گئی۔ لیکن ہماری نظر میں کوئی مشکل نہیں۔ ارے ہمارے ہاں اتنے درجن نہ سہی، بارہ تو ہیں ہی۔ الحمدللہ! اب ان بارہ میں ہمیں کوئی دشواری نہیں کہ بارہ دفعہ ''کا'' کہیں، تب جا کر عہدہ کا پتہ چلے۔ ہمیں یہ دشواری نہیں کیونکہ یہ تو شخصیت کی طرف نسبت رکھی۔ رسولؐ کی طرف۔ اس لئے یہ دشواری پیش آئی اور ہمارے اصول کے ماتحت علیؑ بھی خلیفۃ اللہ، حسنؑ بھی خلیفۃ اللہ، حسینؑ بھی خلیفۃ اللہ، جتنے بھی ہیں سب خلیفۃ اللہ۔

وہ بات اس کے ساتھ آ گئی کہ اللہ کے نام کے ساتھ تو اکیلا ایک لفظ ''اطیعوا'' کا آیا، اس لئے کہ ذاتی حق حکومت اسی کا۔ اس کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں اور اب اس کے بعد رسول اور اولی الامر۔ سب کی نوعیت ایک یعنی وہ بھی نائب حاکم، یہ بھی اپنے دور میں نائب حاکم۔ نائب خدا ہونے کی حیثیت ان سب میں مشترک ہے اور یاد رکھئے کہ یہی فرق ہے۔ ہمارے آئمہ نائب خدا ہیں اور خدا ہیں اور علماء نائب امام کہلاتے ہیں، نائب خدا نہیں کہلاتے۔

تو اب حدود میں کوئی فرق ہو سکتا ہے؟ جس دائرے میں خدا کی اطاعت، اُسی دائرے میں رسولؐ کی اطاعت، اسی دائرے میں اولی الامر میں سے ہر فرد کی اپنے اپنے دور میں اطاعت۔ اور وہ یکے بعد دیگرے اطاعتیں ہوں گی۔ جتنے ورق الٹتے جائیں گے، اتنی ہی ہستیاں سامنے آتی جائیں گی اور ہر امام اپنے دور کا صاحب الامر۔ رسولؐ سب سے پہلے اپنے دور میں صاحب الامر تھے۔ انؐ کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؑ صاحب الامر تھے اور اسی طرح وہ پورا سلسلہ اولی الامر کا ہے جو سب پر حاوی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سب کی اطاعتیں رسولؐ کی اطاعت سے جدا نہیں ہیں۔ اب اللہ کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت اور وہ بھی غیر مشروط اور یہ بھی غیر مشروط۔

میں نے کہا کہ عقلی طور پر یہ نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ مانا جائے کہ ان کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا ورنہ اگر احکام میں ٹکراؤ ہو جائے تو اس موقع پر آدمی یا اُس کے اطاعت کرے یا ان کی اطاعت کرے۔ اور وہ مطلق کہہ رہا ہے کہ میری اطاعت کرو، وہ مطلق کہہ رہا ہے کہ ان کی اطاعت کرو۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جو میرا حکم، وہی ان کا حکم ان کا حکم کبھی میرے حکم سے الگ نہیں ہو گا اور اب اگر ایک ذات تک بات رہتی تو اس کیلئے یہ بات ہوتی اور اگر اس کے ساتھ ایک سلسلہ ہے جو اولی الامر کا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔

یاد رکھئے! اسی کو ہماری زبان میں معصوم کہتے ہیں۔ کسی کا حکم کبھی اللہ کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زبانیں چودہ کی ہیں لیکن بات ایک ہے۔ جو ان کی زبان سے بات سنی گئی، وہ ایسی ہے جیسے اللہ کی زبان سے بات سنی جائے۔ چودہ کی زبانیں ہیں مگر حکم ایک ہے اور قرآن مجید میں رسولؐ کے اتباع کا بھی حکم ہے کہ ان کی پیروی کرو اور اتباع کے معنی نقش قدم پر چلنا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب مطلق طور پر اطاعت کا حکم دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اعمال کی صحت کی ضمانت ہوئی۔ چونکہ ہماری اُردو زبان ذرا کوتاہ ہے، تو ہم اطاعت کے بھی معنی کہہ دیتے ہیں پیروی اور اتباع کے معنی بھی کہہ دیتے ہیں پیروی۔ مگر عربی زبان کے لحاظ سے اتباع اور اطاعت کے معنی میں فرق ہے۔ اطاعت ہوتی ہے احکام کی اور اتباع ہوتا ہے اعمال کا۔ تو جب خالق نے کہا:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ تو اس کے معنی ہیں رسولؐ کے احکام کی صحت کی ضمانت ہوئی اور جب کہا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

کہیئے کہ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ تو اس کے معنی ہیں کہ ان افعال کی صحت کی ضمانت دی اور اسی لئے ان کے قول کو اپنا قول قرار دیا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝

ہمارا رسول خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا۔ یہ تو وہی کہتا ہے جو اس پر وحی ہوتی ہے۔ ان کے کام کو بھی اپنا کام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

"وہ سنگریزے آپ نے نہیں پھینکے، اللہ نے پھینکے۔ اور ہاتھ جو کام کا ذریعہ ہوتا ہے، اُسے بھی اپنا ہاتھ قرار دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، یہ آیت سے بیعت نہیں کر رہے، یہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔ اب میں ہر نقطۂ نگاہ کے مسلمان کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہوں۔ ذرا غور کیجئے۔ سب قرآن کی آیات میں نے پڑھی ہیں کہ جس کا قول اللہ کا قول ہو، جس کا عمل اللہ کا عمل ہو، جس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو اگر (معاذ اللہ) اس سے غلطی ہو تو کس کی غلطی ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے سامنے رسولؐ کے معصوم ہونے کا سوال نہیں بلکہ بندوں کے سامنے اللہ کے بے خطا ہونے کا سوال ہے۔ اگر خالق نے ان کے نام کے ساتھ ایک اور افراد کا سلسلہ بیان کیا۔ "اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" تو پھر ماننا پڑے گا کہ کچھ ہستیاں اور ایسی ہیں کہ جن کے احکام کبھی احکامِ الٰہی سے نہیں ٹکراتے۔ جب ہی تو مطلق طور پر ان کی اطاعت کا حکم دیا، اب اللہ کے احکام معلوم ہونے کا ذریعہ کتابِ الٰہی اور رسولؐ کے احکام اور اولی الامر کے احکام، اگر یہ سب کتابِ الٰہی میں درج ہوتے تو اللہ الگ سے ان کا نام ہی کیوں لیتا؟

میں کہتا ہوں کہ جس وقت خالق نے حکم دیا:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی۔

تو جسے بعد میں نعرہ لگانا تھا، وہ اسی وقت کہہ دیتا، تیرا حکم کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ احکامِ الٰہی کچھ خود اس کے کلام میں ہیں۔ اس کیلئے "اَطِیْعُوا اللّٰہَ" کافی تھا۔ لیکن اس کے احکامات کچھ رسولؐ کے ارشادات ہیں۔ اسی کے احکام کچھ ہر دور کے اولی الامر کے ارشادات ہیں۔ لہٰذا ان سب کو جب تک نہ مانے، اس وقت تک دین کامل نہیں ہو سکتا۔ اب ایک آیت آپ کو یاد دلاؤں جس کے معنی سمجھنے میں دنیا

کو اختلاف ہوتا ہے۔ شک ہوتا ہے۔ بہت الجھتی ہے کہ رسولؐ نے عمر بھر تبلیغ فرمائی اور کتنی زحمتیں اٹھائیں۔

"مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَا اُوْذِیْتُ"۔

''کسی نبی کو اتنی ایذائیں نہیں پہنچیں، جتنی مجھ کو پہنچائی گئیں''۔

عمر بھر تبلیغ فرمائی۔ اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہوسکتا۔ لیکن اب آخر میں کوئی بات آتی ہے، کیا ہے وہ بات؟ اس سے بحث نہیں۔ کچھ تو ہے کہ کہا گیا۔ اس کو پہنچایئے، نہیں تو؟ اگر یہ نہیں پہنچایا گیا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا۔

میں کہتا ہوں جس نے اتنی زحمتیں اٹھائی ہوں تبلیغ رسالت میں اور اب اس کے آخری عمر کے حصہ میں، جب تین مہینے کے بعد وہ اس دنیا سے اٹھ جائے گا، اب ایک امر پر انحصار قرار دیا جائے کہ یہ پہنچایئے ورنہ کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ تو اسی سے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ ضرورت کے تحت تفسیر قرآن ہی ڈھونڈنا چاہئے کہ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے کہا گیا کہ اگر یہ آپؐ نے نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہیں پہنچایا۔

اب میں عقلی طور پر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ یاد رکھئے ان کی عمر بحیثیت بشر، اب یہاں بشر میں خود میں سے کہتا ہوں۔ یقیناً رسولؐ کے ساتھ بشر بھی تھے۔ اس کا انکار انکار قرآن ہے۔ تو بحیثیتِ بشر رسولؐ کی عمر کل جمع تریسٹھ برس۔ جس میں سے چالیس برس قبل بعثت اور کل جمع تیئس برس بعد بعثت۔ آپ کی رسالت؟ رسالت کی عمر کیا ہے؟ تا قیامت

میں کہتا ہوں کہ تا قیامت کہنا ہی ہمارے حدودِ تعبیر کی کوتاہی ہے۔ اگر قیامت تک ہی رسالت ہے تو شفاعت کس اعتبار سے؟ تو لامحدود رسالت یعنی جب تک خدا کی خدائی، تب تک ان کی رسالت۔ مگر ہمیں اطاعت کرنا ہے قیامت تک کیونکہ اس کے بعد دار تکلیف نہیں ہے۔ اس کے بعد جزا و سزا کی منزل ہے۔ تو ہمیں اطاعت کی پابندی قیامت تک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کی طرف سے یہ قیامت تک کی عملی رہبری کی ذمہ داری لے کر آئے ہیں۔ تو اب ایک عام بات ہے کہ کسی کے ذمہ دس برس کا کام ہو اور پانچ برس کرے تو اس نے کچھ تو کیا۔ اگر دس برس کا کام کسی کے ذمہ ہے اور وہ ایک منٹ کرے تو کیا کیا؟ یعنی مقامِ قلت میں درجہ نسبت کا ایسا آتا ہے جو حکم عدم میں ہے۔ تو اب میں کہتا ہوں کہ رسولؐ کی اطاعت وقتِ وفات تک۔ آپ کی کارگزاری تیئس برس اور رسالت کی عمر تا قیامت۔

کوئی حساب دان مجھے بتائے کہ تیئس برس کی نسبت عمر دنیا سے جو قیامت تک ہے، کتنی ہے؟ چوتھائی ہے۔ دسواں حصہ ہے، کوئی ہے نسبت؟ کوئی بھی تو نسبت نہیں ہے۔ تو یہی خالق نے کہا ہے کہ اے رسولؐ! آپ نے زندگی بھر تو زحمت اٹھائی اور تبلیغ رسالت فرمائی لیکن اب اپنے بعد کا انتظام کر جایئے اور اگر یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ کم سے کم اس وقت پہلی کڑی جو ہے، اس کا اعلانِ عام آپ کر جایئے۔

ہر دنیا سے جانے والا اپنے بعد آنے والے کا تعارف کرواتا رہے گا۔ اور یوں اور حدیثوں میں تو حضرتؐ نے نام بنام بتا دیا قیامت تک کیلئے لیکن اس وقت پہلی کڑی کا تعارف ہو جائے تو کام قیامت تک چلتا رہے گا۔ بس یہ نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ اب ہر نقطۂ نظر کا

مسلمان میرے ایک جملے پر غور کرے کہ جس چیز کی تبلیغ کے بغیر خالق کہے کہ آپ کی رسالت کچھ نہیں، اس کو مانے بغیر ہمارا ایمان کیا رہے گا؟

پھر رسولؐ نے متفق علیہ حدیث پورے سلسلہ کا ایک مجمل تعارف بھی کروایا:

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ"۔

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسرے میرے اہلِ بیتؑ۔ جب تک ان سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے"۔

دونوں کون؟ قرآن اور اہلِ بیتؑ۔ یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ روزِ قیامت حوضِ کوثر پر پہنچیں۔ بس اب میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ رسولؐ نے فرمایا: یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ اب کسی بھی نقطۂ نظر کا مسلمان ہو، وہ بتائے کہ آج قرآن ہے؟ تو کون ہے جو کہے کہ نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں، وہ جسے رسولؐ نے کہا تھا کہ کبھی جدا نہیں ہوں گے، ان میں سے کوئی فرد ہے؟ اگر کہہ دیا کہ نہیں ہے تو جدا ہو گئے۔ تو ہمارے اور آپ کے رسولؐ نے کہا تھا کہ جدا نہیں ہوں گے۔ اب میں ایک جملہ کہوں کہ یہ وہ رسولؐ ہے جسے مشرک بھی صادق کہتے تھے، اب مسلمان ہو کر آپ کو اختیار ہے۔

اگر کہے کہ ہے اور رسولؐ کی سچائی کی بناء پر کہنا پڑے گا کہ ہے تو مجھے آنکھوں سے دکھایئے کہ کہاں ہے اور اگر آنکھوں سے نہ دکھا سکے تو غائب مانئے کیونکہ غائب وہ نہیں ہے جو ہو ہی نہیں۔ غائب وہ نہیں ہے جو آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ غائب کی حقیقت ایک ثبوت اور ایک نفی سے مبنی ہے۔ موجود ہو اور آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو ہونا نصِ رسولؐ صادق سے ثابت۔ سامنے نہ ہونا آنکھوں سے ثابت۔

اب غیب کا کونسا جزو محتاجِ ثبوت رہا؟ دنیا کہتی ہے کہ آخر غائب ہوئے ہی کیوں؟ میں کہتا ہوں کہ اسے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ گیارہ کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا جواب پوچھ رہے ہیں کہ بارہویں کو غائب کیوں کیا؟ گیارہ آپ کے سامنے رہے لیکن کوئی بھی تو اپنی موت دنیا سے نہ گیا۔ آپ نے کوشش کی کہ وہ سلسلہ ہی نہ رہے اور بس۔ کیا کربلا میں کوئی کمی رہ گئی تھی اس سلسلہ کو قطع کرنے کی۔ اس سلسلہ کو قطع کرنے کی کوئی کسر دنیا نے نہ اٹھا رکھی۔ وہ تو سیدِ سجادؑ پر خالق نے غشی کو طاری کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غشی نہیں تھی، ایک پردۂ غیب تھا جو ان کی حفاظت کیلئے ان پر ڈالا گیا ورنہ یہ غش میں نہ ہوں اور پھر حسینؑ کی مدد نہ کریں تو ان کا کردار علی اکبرؑ کے کردار سے پیچھے رہ جائے گا۔ لہٰذا خالق نے غش کو ان پر طاری کر دیا۔ اپنی حکمتِ بلند کی بناء پر ورنہ میرا ایمان ہے کہ مرض ان کو کبھی بیہوش نہیں کر سکتا۔ نہ ہی مرض ہوش و حواس سلب کر سکتا ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی تھی بقائے امامت کیلئے۔

27

مقصد بعثت

اللہ تعالیٰ نے قرآن بنا کر رسولؐ پر بھیج دیا اب اس سے زیادہ عصمت کیا ہوگی کہ دل کی نیت ہو اور خدائی الفاظ ہوں۔

مسلم کے معنی اپنے کو سپرد کر دینے، سر جھکانے والا ایسا کہ جس کے ساتھ معصیت کا گزر ہو وہ اپنے کو سپرد کر دینے والا جہاں خدا کے مقابلے میں اپنا اختیار صرف ہی نہ کیا جائے۔ میرے لئے خلیلؑ کی دعا کا سمجھنا آسان ہو گیا کہ لوح محفوظ میں ان کے یہی اوصاف تھے خالق کے دیئے ہوئے علم سے ان کو معلوم تھا کہ یہ رسول ان اوصاف کا مالک آنے والا ہے تو جو فیصلہ قدرت تھا اسی کو اپنی التجا بنا کر اپنی سعادت مندی کے لئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔ پوچھا جاتا ہے کہ چادر تطہیر کے نیچے کون تشریف فرما ہیں تو جواب آتا ہے کہ وہ فاطمہؑ ہیں، ان کے والد گرامیؐ ہیں ان کے سرتاجؑ اور انؑ کے دو بیٹے ہیں۔

جس طرح حضرت خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی اسی طرح مریمؑ کے بعد فاطمہ زہراؑ کی ضرورت تھی۔

مقصدِ بعثت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾

• اٹھائیسویں پارہ میں سورۂ جمعہ کی آیت ہے جسے مؤمنین نمازِ جمعہ میں سنتے ہوں گے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ ہے جس نے امیین میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے۔ جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

یہ مضمون موجودہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے تین مقامات پر مذکور ہے۔ تھوڑا سا الفاظ کا فرق ہے۔ مضمون ایک ہے۔ سب سے پہلے، پہلے پارہ کے آخری حصہ میں سورۂ بقرہ ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے خانۂ کعبہ کی دیواروں کو اونچا کرنے کا ذکر ہے۔ اس موقع کا مرقع جو قرآن مجید میں موجود ہے، وہاں ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ

''وہ موقع یاد رکھنے کا ہے جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے''۔

ضمناً اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ امتدادِ زمانہ سے اس کی دیواریں منہدم ہو گئی تھیں اور نشانات نمایاں نہیں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں اس پر مامور ہوئے تو جس وقت وہ دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔

عجیب اندازِ کلام ہے قدرت کا۔ ترجمہ میں عموماً یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے مگر قرآن مجید میں مجھے ایسا کوئی لفظ نہیں نظر نہیں آیا جس سے ہم یہ سمجھیں کہ وہ کہہ رہے تھے۔ کہنے کیلئے عربی لفظ ہے قول۔ اگر قول کے ساتھ ماضی کا لفظ آتا ہو تو ''قَالَا''۔ ان دونوں نے اس وقت یہ کہا مضارع آتا تو یہ ہوتا ''يَقُوْلَانِ''۔ وہ دونوں یہ کہہ رہے تھے۔ عربی کے لحاظ سے ایک اور صورت تھی کہ حال کے طور پر اسم فاعل لایا جاتا تو ہوتا ''قَائِلِيْنَ''۔ اس حالت میں ان کا قول یہ تھا مگر نہ اس میں ''قَالَا'' ہے، نہ ''يَقُوْلُوْنَ'' ہے، نہ ''قَائِلِيْنَ'' ہے۔ ان میں سے کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔

پس اگر وہ کہتے تو جو مقولہ ہوتا، وہ قرآن مجید نے شروع کر دیا۔ ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا''۔ ''اے ہمارے مالک! اسے ہم سے قبول فرما''۔ یہ بیچ میں کہاں کہا کہ وہ کہہ رہے تھے۔ فارسی میں گفتند آتا ہے تو اس کیلئے کوئی لفظ نہیں۔ اردو میں ''کہہ رہے تھے، کہتے ہیں''۔ تو اس کیلئے کوئی لفظ قرآن مجید میں نہیں۔ تو اس لئے یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ یہ کہہ رہے تھے یا ان سے دل کی صدا تھی جسے قرآن نے لفظوں میں پیش کر دیا۔ مجھے آپ کی جانی پہچانی ہوئی آیتوں میں اور ان کی شانِ نزول میں اس کی نظیر ملتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سورۂ ھَلْ

آئی میں جن ہستیوں سے اس واقعہ کا تعلق ہے، ان کا کردار پیش کیا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝٨

وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت میں۔

اب مفسرین میں اختلاف ہے "علیٰ حبّہٖ" ۔اس کی محبت میں۔کوئی کہتا ہے کہ اس سے پہلے طعام کا ذکر ہے۔اللہ کا تو نام بھی نہیں ہے۔طعام کی محبت میں۔یعنی بھوکے ہیں خواہش طعام پھر بھی یہ دیتے ہیں۔ارے صاحب! قرآن مجید سامنے ہے۔آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ کس کی محبت میں؟ قرآن کو تو کافی سمجھتے ہیں۔تو کافی کہہ دینا آسان ہے اور فہمِ قرآن کے وقت کافی بنانا مشکل ہے۔

غرض چاہے معنی کچھ بھی ہوں، فضیلت کا پہلو تو بہرحال ہے۔خواہ محبتِ الٰہی میں، خواہ خواہش طعام کے باوجود کھانا کھلاتے ہیں۔مسکین کو، یتیم کو اور اسیر کو۔یعنی جس ترتیب سے کھانا کھلایا تھا، اُسی ترتیب سے الفاظ بھی آئے ہیں۔پہلے دن مسکین آیا تھا، دوسرے دن یتیم آیا تھا، تیسرے دن اسیر آیا تھا۔اسی ترتیب سے یہاں الفاظ موجود ہیں۔اس وقت مفصل بیان تو یہاں پیش نہیں کرنا تھا مگر خدا یہ کردار پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا"۔

پھر مجبوراً ترجمے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے۔قرآن میں کہاں ہے "کہہ رہے تھے"۔اس میں تو ہے کہ انہوں نے کھانا کھلایا اور اس کے بعد ہم تم سے جزا چاہتے ہیں۔نہ شکریہ۔تو یہ لفظ کہاں سے آیا کہ وہ کہہ رہے تھے۔اب وہاں تو بربنائے واقعہ میں سمجھتا ہوں کہ کہہ نہیں رہے تھے، اس لئے کہ "کُم" ہے۔صیغہ جمع۔وہی ترجمہ میں نے کیا کہ لوگوں کو بس اللہ کی خاطر کھلاتے ہیں، نہ تم سے جزا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔اُن سب سے یہ کہہ رہے ہیں۔تو وہ سب ایک ساتھ کب آئے تھے کہ ان سے یہ کہا جاتا؟ وہاں تو ایک دن مسکین آیا، دوسرے دن یتیم آیا، تیسرے دن اسیر آیا تھا۔وہ اجتماعی شکل میں کس دن آئے تھے جو ان سے یہ الفاظ کہے جاتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان سے نہیں کہا تھا۔زبان سے کہنے میں وہ کردار کی بلندی بھی نہیں ہے۔زبان سے نہیں کہا تھا۔ہر دن جو دل کی آواز تھی، جو اس کی نیت تھی، اس نیت کو اس خالق نے جو عالم الغیب ہے، جو عالم الضمائر ہے، اُس نے قرآن بنا کر رسولؐ پر بھیج دیا۔اب اس سے زیادہ وہ عصمت کیا ہوگی کہ دل کی نیت ہو اور خدا کے الفاظ ہوں۔

تو بس اب میں نے نظیر بھی قرآن سے پیش کر دی۔یہی صورت وہاں ہے کہ ان کا ایک عمل درج کیا کہ وہ خانۂ کعبہ کی دیواروں کو اونچا کر رہے تھے۔اب اس وقت ان کے دل کے جو جو بھی تصورات تھے، خالق نے مسلسل کئی آیتوں میں ان کا تذکرہ کر دیا اور دل کی بات کو سننے والا فقط وہی ہے۔تو اس نے ان کے دل کی صدا کو یہ بیان کیا کہ:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ

"اے ہمارے مالک! اے ہمارے پروردگار! ہم سے اس عمل کو قبول فرما"۔

إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾

"یقیناً تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے"۔

کیا کہنا بلاغتِ قرآنی کا کہ اس نے آیت کے آخر میں تتمہ جو رکھا، اس میں بھی دونوں رُخ ہیں۔ تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ یعنی زبان سے کہا جائے گا تو تو سنے گا اور دل کی صدا ہو تو جان لے گا۔ تو یہ سلسلہ شروع ہو رہا ہے واقعہ کا:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾

اس کے بعد اسی سلسلہ میں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

"اے ہمارے مالک! ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے"۔

اب اس عملِ خیر کی قبولیت کی دعا کے ساتھ اور اس کردار کی بلندی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں جو دعا کر رہے تھے کہ ہمیں مسلم قرار دے۔ نبی ہوتے ہوئے، رسول ہوتے ہوئے۔ یہ دعا جو بارگاہِ الٰہی میں کر رہے ہیں، کیا ہم جیسے مسلمان ہونے کی؟ جیسے ہم مسلمان ہیں؟ جیسا معیارِ نظر اونچا ہوتا ہے، ویسا ہی الفاظ کا معیار اونچا ہوتا ہے۔ ہم جب مسلمان کہتے ہیں کہ تو اس کا معیار یہ ہے جو سب جانتے ہیں اور جو خلیلِ حق کہہ رہے تھے، ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلم کا وہ معیار ہے۔ مسلم کے معنی اپنے سپرد کر دینے والا، سر جھکانے والا۔ تو وہ سر جھکانے والا جس کے ساتھ معصیت کا گزر نہ ہو، وہ اپنے کو سپرد کرنے دینے والا، جہاں خدا کے مقابلہ میں اپنا اختیار صرف ہی نہ کیا جائے، یہ معیار مسلم کا جو ہے، اس کے دوسرے معنی ہیں معصوم ہونا۔ اور پھر عصمت کا وہ مرتبہ۔ نبوت اور رسالت کے بعد جس کی دعا کی جائے، اس کا مطلب یہ ہے یہ وہ درجہ ہے اطاعت کا جس کے ساتھ ترکِ اولیٰ کا بھی گزر نہ ہو۔

اب اس کے ساتھ الفاظِ قرآنی بڑھتے ہیں۔ یہ کوئی حدیث نہیں ہے جس میں ضعیف و قوی کا سوال پیدا ہو۔ قرآن کی آیات ہیں کہ ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً

اور ہماری نسل سے بھی ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو رکھنا جو تیری بارگاہ میں مسلم ہو۔ جو لفظ مسلم اپنے لئے ہے وہی ان افراد کیلئے ہے جو ذریت میں سے ہوں۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۠

"ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ رکھنا جو تیری بارگاہ میں مسلم ہو۔

وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا

اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے ہماری آنکھوں کے سامنے سکھادے۔

وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ

"اور اپنی نظر توجہ ہماری طرف رکھنا"۔

إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

"تو بڑی نظر رکھنے والا اور بڑا رحم و کرم شاملِ حال کرنے والا ہے"۔

اب اس سلسلہ میں ارشاد ہو رہا ہے یعنی ابراہیمؑ کی زبانی عرض ہو رہا ہے کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ

میں نے کہا تھا یہی مضمون تین جگہ ہے۔ اس میں سے پہلی جگہ یہ ہے۔ اس کے بعد تین جگہ ہے یعنی مجموعی طور پر چار جگہ ہے۔ تو "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ"۔ اے ہمارے مالک! ان میں بھیجنا "رَسُولًا مِّنْهُمْ" ایک رسول انہی میں سے۔ کن میں اور کن میں سے؟ اس سے قبل دنیا کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے قبل اس اُمتِ مسلمہ کا ذکر ہے۔ وہ گروہ جو اس معیار کا مسلم ہو۔ جیسے یہ خود ہیں۔ اس گروہ کا ذکر ہے اور کہا جا رہا ہے انہی میں۔ انہی میں سے۔ تو ہمارے رسول سے پہلے اور ابراہیمؑ تک درمیان میں جتنے ہیں سب کو ماننا پڑے گا اس معیار کا مسلم!

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

ایک رسول بھیجنا انہی میں سے۔

آگے وہی مضمون ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ

اب وہ تو اللہ سے کہہ رہے ہیں، اس لئے اضافت اس کی طرف واحد حاضر کے صیغے سے کہ جو تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاک و صاف کرے۔

إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

بے شک تو بڑا غلبہ والا، بڑی حکمت والا"۔

اب ایک پہلو پر غور کیجئے کہ سب سے پہلے یہ الفاظ جناب ابراہیمؑ کی زبان پر آئے، بصورتِ دعا۔ ہم عام طور پر دعا قبول ہونے کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو نتیجہ ہوا، وہ ہماری دعا سے ہوا۔ یہی معنی قبولیتِ دعا کے ہیں کہ ہم نے دعا کی، اللہ نے قبول کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دعا نہ کرتے تو یہ نہ ہوتا۔ اولاد کی دعا کی، دعا سے اولاد ہوئی۔ تو اگر نہ کرتے دعا تو نہ ہوتی۔ رزق کی وسعت۔ دعا نہ

کرتے تو اسی طرح سے تنگ دستی میں جتلا رہتے۔ یہی معنی قبولیتِ دعا کے ہمارے ذہن میں ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ کیا یہاں یہ صورت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے گویا اپنے نفس سے یہ اوصاف تجویز کیے کہ ایک ایسا رسول آنا چاہیے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا کی، التجا کی۔ خدا نے وہ دعا قبول کی۔ پھر انہی اوصاف کا رسول بھیجا جو اوصاف انہوں نے تجویز کئے تھے۔ اب اس رسول کے ہر جگہ وہ اوصاف آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تین جگہ اور یہ تو پہلی جگہ ہے۔ وہی اوصاف حضرت ابراہیمؑ نے گویا تصنیف کیے۔ انہوں نے تجویز کئے کہ ان اوصاف والا رسول ہونا چاہیے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی دعا کی تو ان کی دعا سے اس رسول کے بھیجنے کا فیصلہ ہوگیا۔

کیا یہ ہے؟ مگر میں اس کا کیا کروں کہ:

"كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ"۔

میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ کا پتلا آب و گِل کے درمیان تھا۔ اس وقت بھی نبی تھا۔ نبی نہیں ہوا تھا یعنی آغازِ نبوت اب بھی نہیں معلوم۔ تو اب جس کے سر پر تاجِ نبوت اس وقت پہنایا جا چکا ہو، اب کیونکر مانوں کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے اس رسول کے آنے کا فیصلہ ہوا۔ تو پھر اس کی نوعیت کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک آپ کا عمل ہے۔ پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ یہ جو درود کے نعرے آپ لوگ لگاتے ہیں۔ نعرہ درود کے معنی بھی تو ایک دعا کے ہیں۔ یہ بھی بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں۔ پروردگار! اپنی رحمت شاملِ حال فرما ان حضرات کے۔ تو اسے سمجھئے کہ کیا ہماری دعا سے رحمت شاملِ حال ہوگی؟ شاید کوئی مؤمن بھی اس تصور کو جائز نہ سمجھے کہ ہماری دعاؤں سے رحمتِ خدا ان کی طرف جائے گی۔ تو پھر ہماری دعاؤں کے معنی کیا ہیں؟ اور پھر ہمیں حکم کیوں ہوا؟ تو اب جو نوعیت میں عرض کروں، اس پر غور کیجئے کہ صحیح ہے یا نہیں کہ ہمیشہ دعا اس لئے نہیں کی جاتی کہ یہ نتیجہ اس سے حاصل ہو بلکہ ایک مخلص وفادار، سمجھدار بندہ، مزاج شناس مالک کا وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے کونسی بات زیادہ پسند ہے۔ تو جو چیز اُسے پسند ہے، تو اُسے وہ اپنی تمنا بنا کر اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس کی وجہ سے اس پر رحمت ہو بلکہ اس لئے کہ اپنی وفاداری کا ثبوت ہو۔

تو بس اب میرے لئے خلیل کی دعا کا سمجھنا آسان ہوگیا کہ لوحِ محفوظ میں ان کے یہی اوصاف تھے۔ خالق کے دیئے ہوئے علم سے ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ رسول ان اوصاف کا مالک آنے والا ہے۔ تو جو فیصلہ قدرت تھا، اسی کو اپنی التجا بنا کر اپنی سعادت مندی کیلئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔

بس اب یہ پہلا موقع ہے جس موقع پر یہ اوصاف ہمارے کانوں تک پہنچے ورنہ میں نے عرض کیا کہ یہ الفاظ لوحِ محفوظ میں موجود تھے۔ دوسرا موقع تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوسرے پارہ کی ابتداء میں شروع ہوا ہے۔ قبلہ کی تبدیلی کے ذکر سے۔ یہی سلسلہ دو صفحات تک چلا گیا ہے۔ اس میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ کی نعمت تھی اور:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۝

یہ ایک احسان تھا جیسے ہم نے بھیجا ایک رسول تم میں، تم میں سے۔ یہاں وہ خود کہہ رہا ہے، وہاں خلیل اس سے کہہ رہے ہیں۔ وہاں "الیتک" تھا کہ تیری آیتیں پڑھتا ہے۔ اب یہاں وہ خود کہہ رہا ہے کہ وہ ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہارے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

وہی اوصاف جو دعائے خلیل میں تھے، وہی باتیں خالق کے اس ارشاد میں ہیں۔ یہ دونوں جگہیں تو بہت قریب قریب تھیں۔ اب ذرا سا دور چوتھے پارے میں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

یقیناً احسان ہے اللہ کا مومنوں پر جس نے ان میں سے رسول بھیجا جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور تزکیہ نفوس کرتا ہے۔

یہ تیسری جگہ ہے اور چوتھی جگہ بہت دور اٹھائیسویں پارہ میں جا کر۔ بالکل یہی مضمون آیا ہے۔ مگر میں نے جسے سرنامہ کلام قرار دیا ہے۔ وہ سورۂ جمعہ والی آیت ہے۔ اس مضمون کا وہ محل خاص ندرت رکھتا ہے۔ یاد کر لیجئے پہلی دفعہ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی ہے، اس دعا میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ تمنا پیش کی ہے۔ دوسری جگہ تبدیلی قبلہ کے سلسلہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ہمارا ایک احسان یہ تھا کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا۔ تیسری جگہ شروع ہی سے اپنا احسان قرار دے کر بیان کیا کہ دیکھو! ہمارا یہ احسان ہے کہ ہم نے یہ نبی بھیجا۔ اور یہاں عجیب شان ہے یعنی یہ سورہ شروع ہو رہا ہے اوصافِ خدا سے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾

اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون اللہ؟ وہ اللہ جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے۔ کون اللہ؟ جو حکمت کا سرچشمہ ہے۔ کون اللہ؟ جو تمام عیوب و نقائص سے بری ہے۔ کون اللہ؟ جو عزت کا مالک ہے۔ کون اللہ؟ جو قدوس ہے۔ کون اللہ؟ جو عزیز ہے۔ کون اللہ؟ جو حکیم ہے۔

اللہ کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں اور پانچواں وصف بیان ہو رہا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

وہ وہی ہے جس نے امیین میں ایک رسول بھیجا۔ انہی میں سے جو ان کے سامنے تلاوت آیات کرتا ہے اور ان کے نفوس کی

اصلاح کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔اگر چہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اب یہاں ندرت کیا ہے؟ خصوصیت کیا ہے؟ اہمیت کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ رسول کا تعارف کروایا جارہا ہے کہ اللہ ایسا ہے جس نے اس شان کا رسول بھیجا۔اب کیا اس بندہ کی شان بیان ہو سکتی ہے جس کی شان دکھا کر اللہ اپنی شان کا اندازہ کروائے کہ اس رسول کی شان دیکھو اور پھر سمجھو کہ ہماری شان کیا ہے۔

بے شک وہ خالق ہے، یہ مخلوق۔ بے شک وہ خدا ہے، یہ بندہ۔ لیکن بندہ اس شان کا تو ہو کہ جسے دکھا کر اللہ اپنی عظمت کا تعارف کروائے۔ یہ چھوٹے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ بڑا اُسے دکھا کر اس کی طرف نسبت دے کر اپنا تعارف کروائے۔فرض کیجئے کہ کسی شاگرد کو دکھا کر یہ کہا جائے کہ یہ شاگرد ایسا ہے جس کے دو اُستاد ہیں۔اس سے اس شاگرد کا امتیاز نمایاں ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کے اُستاد کا تعارف ہو سکتا ہے۔کوئی بیٹا ایسا ہو کہ اس بیٹے کو دکھا کر کہا جائے کہ دیکھو یہ اُن کے بیٹے ہیں۔تو باپ کے تعارف کیلئے بیٹے کا نام لیا جائے۔تو یہ خاص بلندی کا پتہ دیتا ہے۔تو یہ بندے کی معراج ہے کہ بندہ کو دکھا کر خالق کی اپنی عظمت کا تعارف کروایا جائے۔

مجھے انہی خاص بندوں میں اس کی مثال نظر آتی ہے۔اب میں دکھاتا ہوں کہ چھوٹے کی طرف بڑے کی نسبت کس طرح ہوتی ہے اور وہ بھی کسی خطا کار کی زبان سے نہیں، کسی مخلوق کی زبان سے نہیں، خالق کی زبان سے۔جب ملک نے پوچھا کہ چادر میں کون ہے؟ تو رسول جس کو دکھا کر اس نے اپنا پتہ دیا تھا، اب اس رسول کو مرکز بنا کر تعارف نہیں کرواتا کہ دیکھو ہمارا رسولؐ ہے اور اس کی بیٹی ہے، اس کے نواسے ہیں اور اس کا داماد یا چچازاد بھائی ہے۔نہیں۔اسے مرکز قرار دے کر تعارف نہیں کروایا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے:

"هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوهَا"۔

''ارے وہ کون ہے؟ وہ فاطمہ ہے، اس کا باپؐ ہے، اس کا شوہر ہے، اس کے بیٹے ہیں۔

تو خالق نے وہی نسبتیں قائم کر کے تعارف کروایا سب افراد کا۔ڈاکٹر اقبال نے جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کیلئے کہا ہے:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

حضرت مریم ایک نسبت سے صاحب عزت ہیں اور حضرت فاطمہ تین نسبتوں سے یعنی کسی کی بیٹی، کوئی کی شریک حیات، کن کی ماں۔حضرت مریم طبقہ خواتین کیلئے معصوم ذات تھیں اور قرآن مجید میں بلاشبہ ان کیلئے بھی آیہ تطہیر ہے۔ملائکہ نے صدا دی:

"اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ.... عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ"۔

اللہ نے آپ کو چنا ہے اور چنا قرآن میں کسی منصب کیلئے ہوتا ہے۔اس منصب کا نام ہمیں معلوم نہ ہو۔جو نام معلوم ہیں، نبی، رسول، امام۔ان میں سے کسی منصب کا نام ہم نہیں بتا سکتے۔لیکن بہرحال اگر کوئی منصب نہیں ہے تو چنا کس لئے ہے؟ تو اللہ نے تمہیں چنا ہے اور پاک و پاکیزہ رکھا ہے۔لوگوں نے پاک کیا ہے؟ ترجمہ کیا ہے؟ کیونکہ آیہ تطہیر میں کچھ نکالنا ہے، لہٰذا ترجمہ یہ کیا آیہ تطہیر کا:

اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تمہیں پاک کرے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ ظاہر ہو کہ کچھ تھا جس سے پاک کیا۔ آیۂ تطہیر موضوع کلام نہیں مگر پھر بھی نظیر پیش کروں کہ یہی کعبہ کیلئے ہے جس کی تعمیر کا ذکر تھا۔ خالق نے انہی خلیل اور ذبیح کو، انہی ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو مخاطب کر کے ارشاد کیا:

"طَهِّرَا بَيْتِيَ"۔

وہی تطہیر کا لفظ ہے۔ کیا ترجمہ کروں کہ میرے گھر کو پاک کرنا۔ تو کیا اس میں کوئی نجاست پہلے سے تھی؟ ارے جہاں معمار اور مزدور بھی معصوم ہوں، اس گھر میں نجاست؟ توبہ توبہ معاذ اللہ۔ ہاں بیت اور اہل بیت میں فرق اتنا ہے کہ بیت کی تطہیر پیغمبروں سے متعلق کردی اور اہل بیت کی تطہیر اپنے سے متعلق کی۔

وہ پیغمبروں سے متعلق اور یہ خود اپنے سے متعلق۔ اور اسی سے میں کہتا ہوں کہ نتیجہ میں فرق ہو گیا۔ پیغمبروں کے ذمہ جن کی تطہیر کی تھی، وہ نجاست آ سکی۔ قرآن نے کہا ہے کہ بت عین نجاست ہیں تو وہاں نجاست آ سکی۔ لیکن جن کی تطہیر اپنے ذمہ لی تھی، سلطنتوں کی طاقت ختم ہو گئی لیکن ان کے دامن کردار پر کوئی داغ نہیں لگایا جا سکا۔

بلاشبہ حضرت مریمؑ صاحب منصب ہیں، کسی نہ کسی منصب کی حامل ضرور ہیں اور وہ منصب کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے اپنے طبقہ کی عملی رہنمائی کیونکہ عملی رہنمائی طبقہ خواتین کی انبیاء مرسلین نہیں کر سکتے۔ عملی نمونہ تو اسی طبقہ کی کوئی کامل خاتون بن سکتی ہے۔ اس کیلئے ہمیں دور اوّل میں حضرت مریمؑ نظر آئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک خاص منصب رہنمائی پر فائز قرار دی گئیں۔ مگر اب جو حقیقت میں پیش کر رہا ہوں، اس پر ہر صاحب فہم غور کرے۔ وہ یہ ہے کہ عورت کی زندگی کے تین دور ہیں۔ ایک دَور بیٹی ہونے کا، دوسرا بیوی ہونے کا، تیسرا ماں ہونے کا۔ اب میں یہاں محسوس کرتا ہوں کہ پہلا دور یعنی بیٹی ہونے والا دور تمہید زندگی ہے اور تیسرا دور یعنی ماں والا دور یہ نتیجہ زندگی ہے۔ اصل زندگی طبقہ خواتین کی وہی ہے بیچ والی جو شریک حیات کے ساتھ متعلق ہے۔ اصل زندگی وہی ہے۔ وہ تمہید ہے، یہ نتیجہ ہے اور اصل زندگی یہ ہے۔ یہی خانہ حضرت مریمؑ کے ہاں خالی ہے۔ وہ بے شک ایک ماں اور باپ کی بیٹی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ جیسے بیٹے کی ماں ہیں۔ تیسرا خانہ زندگی کا ہے لیکن وہ جو درمیان کا خانہ ہے جو اصل زندگی ہے، وہ نہیں ہے۔ تو وہ نمونہ عمل نوع انسانی کیلئے قیامت تک کیونکر ہو سکتی ہیں؟ جس طرح حضرت عیسیٰؑ، چونکہ انفرادی زندگی رہی، تنہا زندگی، لہٰذا ان کی نوعیت حیات اس بات کا ثبوت ہے کہ خاتم الانبیاء نہیں ہو سکتے۔ خاتم الانبیاء وہی ہو سکتا ہے جو نوع انسانی کو اجتماعی اور انفرادی دونوں زندگیوں کیلئے سبق دے سکے، درس دے سکے۔

حضرت عیسیٰؑ نوع انسانی کیلئے مثال نہیں بن سکتے تو وہ عبوری دور میں آ جائیں۔ ایک نمونہ بھی پیش کر دیں۔ جیسے بچوں کی تعلیم میں بہت سے جملے سکھائے جاتے ہیں۔ عمر بھر انہیں وہی نہیں پڑھنا ہے۔ آجکل اُردو ادب کے طالب علموں کو میر تقی میر کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے، سودا کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے والے دور کی اُردو بھی سکھائی جاتی ہے۔ حالانکہ انہیں نہ وہ اُردو بولنی ہے، نہ لکھنی ہے مگر ان کو نمونہ بتانے کیلئے، چونکہ ارتقاء کے درجوں میں ایک کڑی وہ بھی ہے، لہٰذا اُسے سکھایا جاتا ہے۔ ویسے ہی سلسلہ انبیاء میں ایک

قسم کا روحانیت کا نمونہ پیش کرنے کیلئے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کو مثال بنا کر پیش کر دیا۔ لیکن خود وہ نوعیتِ زندگی بتاتی ہے کہ یہ مختتم طور پر نمونہ عمل نہیں ہے۔ ورنہ رہنمائی تو کیا ہو، نوعِ انسانی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد حضرت خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی۔ بس میں کہتا ہوں کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی۔ بس میں کہتا ہوں کہ جس طرح حضرت خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی، اسی طرح مریمؑ کے بعد فاطمہ زہراؑ کی ضرورت تھی۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی خدمت میں ایک چیز عرض ہے کہ بے شک حضرت مریمؑ کے بعد آپؑ کی ضرورت تھی اور جتنے شعبے ہیں، ان سب کو آپ نے مکمل طور پر بنا کر پیش کر دیا۔ باپؐ کے ساتھ شریک کارِ رسالت ہو کر مباہلے میں آئیں، شوہرؑ کے ساتھ شریکِ حیات، شریکِ زندگی رہیں۔ ہر حیثیت سے ان کے بعد جو بچے تربیت کر کے آپؑ نے پیش کیے، وہ بقائے اسلام کا سبب بنے۔

بے شک آپؑ کے کارناموں کی کوئی نظیر ہی نہیں، کوئی مثال ہی نہیں۔ مگر مخدومۂ عالم، خاتونِ جنت، سیدۃ النساء، آپ کو اللہ نے کوئی بھائی نہیں عنایت کیا تھا۔ اس لئے آپ کی سیرت کا نقص کوئی نہیں ہے مگر کیا کیا جائے کہ آپؑ کو موقع اس رشتہ کے دکھانے کا نہیں ملا۔ ایک بہن کو بھائی کا ساتھ کس طرح دینا چاہیے؟ جس طرح اسے سیدۃ النساء العالمین مریم کے بعد آپ کی ضرورت تھی۔ اسی طرح آپؑ کے بعد آپؑ کی بیٹی زینبؑ کی ضرورت تھی۔

بخدا! زینب کبریٰ نے بھائی کے ساتھ اتحادِ عمل کی وہ مثال پیش کی کہ کربلا کے جہاد کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصہ عصرِ عاشور تک اور ایک حصہ عصرِ عاشور کے بعد۔ مقصد کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ مگر ایک امتیاز ہے۔ اس کو اس طرح پیش کروں گا، کبھی اس چیز کو ممکن ہے کہ سابق مصائب میں پیش کر چکا ہوں کہ دس محرم تک جو تھا وہ حسینؑ کا عشرہ تھا اور عصرِ عاشورہ کے بعد سے اب تک، یہ سب زینبؑ کا عشرہ ہے۔ اے اہلِ عزا! اُس عشرہ کے دنوں کی تعداد میں بتا سکتا ہوں۔ اس کا نام ہی عشرہ ہے لیکن زینبؑ کے عشرہ کی گنتی ہی میں نہیں بتا سکتا اور وہ تاریخ میں نہیں بتا سکتا جس تاریخ کو یہ عشرہ ختم ہوتا ہے کیونکہ تاریخ تو اس وقت بتاؤں جب رہائی اُسی سال ہوئی ہو اور اگر رہائی دوسرے سال ہوئی ہے؟ بخدا! یہ مجبوری ہے کہ بس آٹھ ربیع الاول تک انتہا سے زیادہ سوگ رکھ کے عزا کو ختم کر دیتے ہیں ورنہ جب دوسرے سال رہائی ہوئی ہے تو اب کونسا دن ہے جب یہ سوگ ختم ہو؟

28

معرفتِ امامؑ

عام آدمی کیا سمجھ سکتا ہے کہ نبی کیا ہے اور انبیاء کیا سمجھ سکتے ہیں کہ خاتم الانبیاء کیا ہیں۔

بس مکلف ہم اسی کے ہیں کہ اپنی کشتیِ ذہن کو ان کے کمالات کے سمندر میں ڈال دیں جتنی ظرف میں وسعت ہوگی، اتنا ہی وہ معرفت حاصل کرے گا۔

نبض کی رفتار بتاتی ہے کہ کتنا بخار ہے تو آپ کسی چیز کو دیکھ کر نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کے آثار دیکھتے ہیں اور ان کے آثار کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ تو ہم کب کہتے ہیں کہ خدا کو بے دیکھے مانو، اس کے بھی آثار کو دیکھو اور مانو۔

خدا کیلئے، بتائیے کہ اگر کتاب کو کافی سمجھتے ہیں تو جتنا کتاب میں ہے، اُسے تو مانئے۔

کوئی مثال ایسی ہونی چاہئے تھی کہ دنیا لاکھ ترقی کر جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جا کر ہو آئے اور دروازے کی زنجیر ہلتی رہی۔

معرفتِ امامؑ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

وہ وہ ہے جس نے پیغمبر بھیجا، انہی میں سے جو اُن کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو سدھارتا ہے اور نہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے قرآن میں تین جگہ ہے مگر یہاں اس کی شان عجیب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا تعارف کروایا جارہا ہے کہ وہ وہ ہے جس نے ایسا رسول بھیجا۔ اب اس رسولؐ کی عظمت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اُس کی معرفت حاصل کرنا انسان کیلئے کیونکر ممکن ہے۔ اس کیلئے میں ایک عام اصول آپ کے سامنے پیش کردوں، اسے فرصت کے لمحات میں دیکھئے گا کہ صحیح ہے یا نہیں کہ منزلِ کمال پر پہنچ کر نقص کو سمجھنا آسان ہے مگر منزلِ نقص سے کمال کو دیکھنا اور سمجھنا، یہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی روز مرہ کی دو مثالیں میں آپ کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔ ایک یہ کہ بوڑھا سمجھتا ہے کہ جوانی کیا تھی اور جوان جانتا ہے کہ بچپنا کیا تھا۔ مگر بچہ سمجھ سکے گا کہ شباب کیا ہوتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ دوسری مثال جو زیادہ روزمرہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ جب جاگتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سور ہے تھے لیکن سوتے میں یہ تصور کرنا کہ جاگیں گے تو کیا ہوگا، یہ ناممکن ہے۔ سوتے میں آدمی خواب دیکھتا ہے تو اسی کو بیداری سمجھتا ہے۔ لیکن خواب کے عالم میں بیداری کا تصور نہیں ہوسکتا۔ بیدار ہونے کے بعد خواب کا تصور ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ایک غیر معصوم کیا سمجھ سکتا ہے کہ معصوم کیا ہوتا ہے؟

یہ تو میں نے عام الفاظ میں کہے ہیں، غیر معصوم اور معصوم۔ اب آگے یہ عام آدمی کیا سمجھ سکتا ہے کہ نبی کیا ہے اور انبیاء کیا سمجھ سکتے ہیں کہ خاتم الانبیاء کیا ہے؟

تو اب کیا کوئی مجھ سے سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ جب ان کو پہچانا ہی نہیں جاسکتا، انکی معرفت ہی نہیں ہوسکتی تو پھر آپ منبر پر آکر یہ کوشش کیا کرتے ہیں اور غور وفکر کس لئے ہوتا ہے؟ اب اس کے ماوراء دینی دلیل عرض کردوں کہ مذکورہ بات کا خلاصہ یہ تھا کہ بالاتر ہستیوں کی معرفت ممکن ہی نہیں۔ مگر یہ دینی حقیقت ہے کہ معرفتِ خدا واجب ہے۔ ہر بندہ کا فرض ہے کہ معرفتِ خدا حاصل کرے۔ تو جب خدا کی معرفت حاصل کرے گا، حکم ہمیں ہے، تو معرفتِ رسول اور معرفتِ امام کا حکم کیوں نہ ہوگا؟ یہ تو مشہور حدیث ہے:

مَنۡ مَاتَ وَلَمۡ یَعۡرِفُ اِمَامَ زَمَانِهٖ فَقَدۡ مَاتَ مِیۡتَةً جَاهِلِیَّةً۔

''جو مر گیا اور اُس نے اپنے زمانہ کے امام کی معرفت حاصل نہ کی، وہ جاہلیت کی موت مرا''۔

تو اب معرفت ممکن چیز ہے، تبھی تو اس کا حکم ہوا۔ ناممکن چیز کا تو حکم نہیں ہوا کرتا۔ اب یہ دونوں باتیں متضاد ہو گئیں۔ ابھی تو یہ تھا کہ معرفت ممکن ہی نہیں ہے، ابھی یہ ہو گیا کہ معرفت ممکن ہے اور واجب ہے۔ تو اب یہ دونوں باتیں کیونکر سمجھ میں آئیں؟ اس کیلئے کوئی منطقی اور فلسفیانہ تقریر کرنا مقصود نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک سوئی کو سمندر کے اندر ڈال دیجئے تو سمندر سوئی کے ناکے میں سما نہیں جائے گا۔ مگر جتنا اس کا ظرف ہے، اُتنا تو سمندر اس کے اندر آ ہی جائے گا۔ بس مکلّف ہم اسی کے ہیں کہ اپنی ذہن کی کشتی کو ان کمالات کے سمندر میں ڈال دیں، جتنی ظرف میں وسعت ہوگی، اتنا ہی وہ معرفت حاصل کرے گا۔

اسی لئے ان باتوں پر بحث کرنا اور لڑنا بیکار ہے، اس لئے کہ سب اگر یکساں معرفت رکھتے تو ایمان کے درجے کیوں ہوتے؟ حضرت پیغمبر خدا نے اپنے اصحاب خاص میں ایمان کے درجوں کو مقرر کر کے ہمیں بتایا۔ اب کچھ افراد تو قابل ذکر ہی نہ تھے۔ جہاں سے کہ قابل ذکر سمجھے، وہاں سے ہمیں درجے بتائے کہ ایمان کے دس درجے ہیں۔ ان میں سے آٹھویں درجہ پر مقدادؓ، نویں درجہ پر ابوذرؓ اور دسویں درجہ پر حضرت سلمانؓ فائز ہیں۔ تو کیا یہ درجات ایمان درجاتِ معرفت سے الگ ہیں؟ وہ ایک ہی ہے کہ جب تک معرفت کامل نہ ہوگی، ایمان کیسے کامل ہوگا؟ تو جب رسولؐ نے اس میں درجے مقرر کر دیئے تو وہ تو آپس میں نہیں لڑتے تھے۔ تو اس طرح جو زیادہ سمجھا ہے، اُسے مبارک ہو، جو کم سمجھا ہے، اُسے بھی مبارک ہو اس میں لڑنے کی ضرورت نہیں۔

مگر اب یہ تین ہستیوں کا ذکر آ گیا تو ایک حقیقت کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤں کہ زبان ہے پیغمبر خدا کی۔ جب اس پر یہ تین نام آئے ہیں تو یہ تین خاص نام ہیں کہ ہمیشہ ساتھ آئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ (مجالس کے فیض سے) جب مقدادؓ کا نام آئے گا تو فوراً ابوذرؓ ذہن میں آئیگے اور فوراً سلمانؓ ذہن میں آئیں گے۔ یعنی یہ شخصیات لازم وملزوم ہو گئی ہیں۔ ایک سے دوسرے کا تصور ہونے لگا۔ تو جو حدیثیں ہیں پیغمبر کی، یہ تین نام ان میں آتے ہیں۔ اب ایک حدیث متفق علیہ، جتنی حالاتِ صحابہ کی کتابیں ہیں، جو عام طور سے متداول کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے قدیم علامہ عبدالبر کی استیعاب ہے جو بنو اُمیہ کے دارالسلطنت قرطبہ کے عالم تھے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر کی اصابہ ہے اور بھی بہت سی کتابیں ہیں، ان میں متفق علیہ ایک حدیث ہے اور وہ یہ کہ:

"اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ اِلٰی ثَلٰثٍ سَلْمَانَ وَاَبِیْ ذَرٍ وَمِقْدَادَ"۔

یعنی ایک مسلمان مشتاق جنت ہوتے ہے، پیغمبر خدا فرما رہے ہیں کہ تین ہستیاں وہ ہیں کہ جنت جن کی مشتاق ہے۔

اب ماشاء اللہ آپ صاحبانِ فکر و نظر ہیں اور صاحبانِ فہم ہیں کہ جنت وابستہ ہوتی ہے آخری انجام سے۔ جب پیغمبرؐ نے جنت کی بات کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے آخری نفس حیات تک جائزہ لے کر سند عطا کی ہے۔ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت تین افراد کی مشتاق ہے۔ وہی تین: سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ۔ تو بس یہ بات تو ضمناً آ گئی ہے۔ اس کو پھیلانا نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے ایک ترازو دے دی ہے مسلمانوں کے ہاتھوں میں حق و باطل کے امتیاز کی کہ دیکھو! میرے بعد کوئی دور ایسا آ جائے تو یہ دیکھو کہ یہ تینوں کدھر ہیں؟

اب سب سے بڑی ذات اللہ کی اور میں نے کہا کہ اللہ کی معرفت واجب مگر اللہ کی معرفت کیلئے قرآن مجید نے خود کیا طریقہ

اختیار کیا ہے؟ اُس نے بقراط اور ارسطو کی دلیلیں نہیں پیش کی ہیں، فلسفے کے دور و تسلسل میں قرآن نہیں پڑا ہے، اُس نے یہ کہا ہے کہ اگر اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے آثار عملی کو دیکھو۔ اس کی صنعتوں کو دیکھو، اس کی کاریگریوں کو دیکھو یعنی آثار کو دیکھ کر اس کا پتہ لگاؤ۔

میں کہتا ہوں کہ آج جو علم و فنون ہیں اور دنیا جن کی دعویدار ہے کہ ہم کسی بات کو بے دیکھے نہیں مانتے تو میں کہتا ہوں کہ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی آپ ہر چیز کو دیکھ کر مانتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب آئے تو انہوں نے تھرمامیٹر لگا کر کہا کہ اتنے ڈگری بخار ہے۔ کیا بخار تھرمامیٹر میں آ گیا ہے اور دکھائی دیا ہے؟

تو حضور والا! اس کا اثر آپ کو معلوم ہے کہ اتنے ڈگری بخار ہو تو پارہ یہاں تک پہنچتا ہے۔ وہ تلازم آپ کو معلوم ہے تو اس لئے اثر کو دیکھ کر مؤثر کو سمجھتے ہیں۔ حکیم صاحب نبض کو دیکھتے ہیں تو کیا اس کا بخار سٹ کر نبض میں آ جاتا ہے اور نبض کو بھی دیکھتے نہیں ہیں، ہاتھ کلائی پر رکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں نبض کی رفتار کو۔ انہیں اپنے فن کے لحاظ سے وہ تعلق معلوم ہے جو بخار کو نبض کی رفتار بتاتی ہے کہ کتنا بخار ہے؟ تو آپ کسی چیز کو دیکھ کر نہیں سمجھتے، ہر ایک کے آثار دیکھتے ہیں اور ان آثار سے کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ تو ہم کب کہتے ہیں کہ خدا کو بے دیکھے مانو، اس کے بھی آثار دیکھو اور مانو۔

تو اس کی معرفت کا ذریعہ یہی ہے کہ اس کے کام دیکھئے اور کاموں کے ذریعے سمجھئے کہ وہ ذات کیسی ہو گی جس نے ایسے کام انجام دیئے۔ قرآن مجید نے اپنے پیغمبرؐ کے اوصاف بیان کرنے کیلئے کہ یہ رسول کیسا ہے؟ اس آیت میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ کام بیان کئے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کے ذمہ ہیں اور اس کے بعد انسانی ذہن پر بار ڈالا ہے کہ اب سوچو کہ ان کاموں کے کرنے کیلئے کیسا چاہئے؟ جب اُس نے یہ کام ان کے سپرد کئے ہیں تو اب اس ذات کا اندازہ کرو جس کے سپرد اللہ نے یہ کام کیے ہیں۔ اس آیت قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان کاموں کی تفصیل درج ہے۔ جو خالق کی جانب سے خاتم الانبیاءؐ کے سپرد ہیں۔ تو ان میں سے پہلا کام تلاوت آیات ہے۔ اس کے کتاب کی تلاوت کرنا۔ آیت الٰہی کی تلاوت کرنا۔ دوسرا کام نفوس کو پاک و پاکیزہ بنانا۔ نفوس کی اصلاح کرنا۔ یہ دوسرا کام۔ تیسرا کام جو ہے، اس میں دو کام ہیں۔ الفاظ ایک ہیں معنی دو ہیں۔ ایک کتاب کی تعلیم دینا، دوسرے حکمت کی تعلیم دینا۔ تو ایک کام ہوا، کتاب کی تعلیم اور ایک کام حکمت کی تعلیم۔ یہ چار کام اس نے اپنے رسولؐ کے ذمے کئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ان کاموں ہی سے ایک بحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن کافی ہوتا تو فریضہ رسول صرف "يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" پر ختم ہو جاتا۔ جب تلاوت آیات کر دی تو وہ کتاب پہنچ گئی ہے۔ اب وہ کتاب کافی ہے تو رسول کا اس کے آگے کام ہونا بھی نہیں چاہئے۔ مگر یہاں بات اور آگے بڑھے گی۔ یہ تو گویا ابجد ہے تعلیم رسولؐ کے نفاذ کی۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

"یہ اس کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں"۔

اس کے بعد یہ ہے:

یُزَکِّیْہِمْ

''ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بھی بناتے ہیں''۔

یہ دوسرا کام ہوا۔ تیسرا کام ان کا یہ ہوا کہ تعلیم دیتے ہیں کتاب کی۔ اب کیا یہ کوئی اور کتاب ہے؟ وہی تو کتاب ہے جس کی آیات یہ سناتے تھے۔ اور جس وقت سنا رہے تھے، وہ سب اہلِ زبان تھے، عربی دان تھے۔ خود عرب۔ اس کے باوجود تلاوتِ کتاب کرتے ہیں۔ اس کی آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل زبان جو عرب تھے، وہ بھی بغیر رسولؐ کی تعلیم کے قرآن کو نہیں سمجھتے تھے۔

آجکل کے حضرات ترجمے دیکھ کر سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا، سمجھ گئے، علم قرآن حاصل ہو گیا۔ ابھی دو منٹ کی بات ہے، ایک صاحب تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ میں تفسیر قرآن لکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ عربی سے واقف ہیں؟ کہا: جی نہیں۔ عربی سے واقف نہیں۔ تو میں نے کہا کہ وہ قرآن کی تفسیر نہیں ہوگی، ترجموں کی تفسیر ہوگی۔

جو اہل زبان تھے، وہ بھی رسولؐ کی تعلیم کے بغیر نہیں سمجھتے تھے، کتاب کی تعلیم رسولؐ نے دے دی لیکن پھر بھی کچھ باقی رہ گیا۔ جس کیلئے تعلیم کتاب کے بعد چوتھی کلاس تعلیم حکمت کی قائم ہوئی۔ یہ حکمت وہ فلسفہ نہیں ہے جس کے ارسطو وغیرہ عالم تھے۔ یہ حکمت وہ ہے جو اسرار کتاب ہیں۔ جو رموزِ کتاب ہیں۔ آخر چار درجے کیوں قرار دیئے گئے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ طالب علموں کی صلاحیت کے لحاظ سے ہے۔ ایک کلاس عام ہے، وہ تلاوتِ کتاب کی ہے۔ اس میں تو مومن و کافر کی بھی تفریق نہیں۔ پیغمبرِ خدا کعبے میں جا کر جتنے لوگ گرد و پیش ہیں، انہیں قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔ تو اس میں تو دیکھا نہیں جاتا کہ کون سن رہا ہے اور اگر سنائیں نہیں تو حجت کیونکر قائم ہو؟ پھر کافر پر کفر کا الزام کیونکر آئے؟ پھر اُسے سزائے کفر کیوں ملے؟ اب جب آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا تو اس سے کچھ نے اثر لیا۔ کچھ نے اثر نہ لیا۔ جنہوں نے کچھ بھی اثر نہ لیا، وہ کافر کے کافر رہے۔ تو اب جب انہوں نے اسلام قبول ہی نہیں کیا تو فرائض رسولؐ ان کی نسبت ختم ہو گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مدرسہ ہدایت رسولؐ سے ان کا نام خارج کر دیا گیا۔ لیکن جنہوں نے اثر قبول کیا، یعنی مسلمان ہو گئے، اب وہ دوسری کلاس میں داخل کئے گئے جو تزکیہ نفوس کی کلاس ہے۔ اب ان کے نفوس کی اصلاح کی جائے گی۔ عبادات کے احکام تزکیہ نفس کیلئے ہیں۔ اسی لئے عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے تو کہا جا رہا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

نماز مومنین پر فرض ہے جو بہ اعتبارِ اوقات مقرر ہے۔ روزہ کا حکم دیا جاتا ہے:

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ

''اے صاحبانِ ایمان! تم پر روزہ فرض ہے۔''

اب ہر جگہ انہیں پکارا جا رہا ہے جو پہلی کلاس پاس کر چکے ہیں اور وہ، وہ ہیں جو ''ایھا الذین امنوا'' میں کم سے کم بقلم خود

شامل ہیں۔ اب ان کیلئے یہ فریضہ ہوگیا۔ ان کو احکام دیجئے، ان کے نفوس کے تزکیہ کیلئے جو سامان ہیں، ذرائع ہیں، وہ انہیں بتایئے اور سکھایئے۔

تو فریضۂ رسالت ان کیلئے آگے بڑھا۔ "یُزَکِّیھِمْ" کہ یہ ان کا تزکیہ نفس بھی کریں۔ ان کے نفوس کی اصلاح بھی کریں۔ جب پہلی کلاس میں ہر ایک نے دیکھ لیا کہ ہر ایک نے اثر قبول نہیں کیا۔ ارے اگر ہدایت پیغمبرؐ میں ایسی کیمیاوی تاثیر ہوتی کہ جبری طور پر تبدیلی ہیئت کر دے، ماہیت بدل دے تو فوراً سب مومن کیوں نہ ہو جاتے؟ معلوم ہوا کہ جیسے ہدایت الٰہی میں جبر کار فرما نہیں ہے، ورنہ کافر کا وجود نہ ہوتا، اسی طرح ہدایت پیغمبرؐ میں وہ کیمیاوی اثر نہیں دیا گیا ہے کہ ایک دم سننے والا بدل جائے۔ جبھی تو سننے کے بعد کچھ مسلمان ہوئے، کچھ نہیں ہوئے۔

تو جب پہلے فیض میں، پہلے درجہ تعلیمی میں، پہلی کلاس میں ہم نے دیکھ لیا کہ کچھ نے اثر قبول کیا، کچھ نے نہیں کیا تو دوسرے درجہ میں یہ کیسے ہوگا کہ جب مسلمان ہو گئے تو سب برابر ہو گئے؟ اب اس کلاس میں بھی کچھ پر پورا اثر ہوگا، کچھ پر ناقص اثر ہوگا، کچھ پر بالکل نہ ہوگا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پیغمبرؐ کے جلسے میں شریک ہوتے ہیں، نماز کے بعد حضرتؐ کی تقریر سنتے ہیں۔ اگر مسلمان نہ ہوتے تو پھر رسولؐ کا خطبہ کیوں سنتے؟ مگر جونہی وہاں سے اٹھتے ہیں تو، قرآن کہہ رہا ہے، کوئی روایت نہیں بیان کر رہا ہوں، کہ فوراً آپس میں کہتے ہیں؟ یہ ابھی کیا کہا تھا؟ "ماذا قال"۔ یہ ابھی کیا کہا تھا؟ ارے خود سن رہے تھے، دوسرے سے کیوں پوچھ رہے ہو کہ ابھی کیا کہا تھا؟

معلوم ہوتا ہے کہ اُچاٹ ذہن کا طالب علم ہے جو کلاس میں بیٹھتا ہے مگر ذہن کہیں اور ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کردار بیان کر رہا ہے۔ اس معزز گروہ کا جو پیغمبرؐ کے آس پاس ہے اور حضرت کا خطبہ سن رہا ہے اور اسی وقت پوچھ رہا ہے کہ ابھی کیا کہا تھا؟ یعنی ابھی سنا تھا، ابھی بھول گئے کہ کیا کہا تھا۔ سمجھے ہی نہیں کہ کیا کہا تھا؟

تو اب بتایئے ان پر اثر ہوگا؟ تو اب جب اثر نہ ہوا تو فریضہ رسولؐ ان کی نسبت ختم ہوگیا۔ اب وہ تیسری کلاس میں، جو علم الکتاب کی ہے، اس میں داخل نہیں کئے جائیں گے۔ اب یہ الفاظ یاد کرلیں۔ کتاب کے معنی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ علم الکتاب کی کلاس میں یہ داخل نہیں کئے گئے کیونکہ اس کی پہلی کلاس ہی میں فیل ہو گئے۔ اب وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی اور انہوں نے علم الکتاب سے فیض حاصل کرلیا، وہ اس لائق ہوں گے، چنے ہوئے حضرات جنہیں رموز کتاب بتائے جائیں، انہیں اسرار کتاب بتائے جائیں۔ وہ چوتھا درجہ ہے حکمت کا۔ اس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ؕ

جسے حکمت عطا ہوگئی، اُسے بہت بڑی خیر عطا ہوگئی۔

اب مجھے ایک اور مکتب خیال یاد آگیا جو کہتا ہے کہ پیغمبرؐ خدا کی حیثیت، میں تو معاذ اللہ کہہ کر ہی کہوں گا، کہ آپ کی حیثیت معاذ اللہ ایک چٹھی رساں کی سی تھی۔ ارے خدا کی کتاب ان کے نزدیک چٹھی کی سی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات اس وقت صحیح ہوتی اگر فریضۂ رسولؐ "يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ" پر ختم ہو جاتا۔ تلاوت آیات کردی، چٹھی پہنچادی۔ اب جا کر اطمینان سے گھر بیٹھیں۔ مگر ان کا

کام تو ختم نہیں ہوا۔ قرآن نے کہا: "یُزَکِّیْهِمْ"۔ یہ ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ تو کیا چٹھی رساں کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے گھر جا کر پوچھے کون ان میں سے سچ بولتے ہیں، کون جھوٹ بولتے ہیں؟ کون امین ہیں؟ کون خائن ہیں؟ کون نمازی ہیں؟ کون غیر نمازی ہیں؟ کیا چھٹی رساں کا یہ کام بھی ہے؟

اس کے بعد یہی نہیں بلکہ علم الکتاب کے بھی بتانے کے ذمہ دار یہ ہیں۔ چٹھی رساں تو بعض اوقات اس زبان کو بھی نہیں جانتا جس میں لکھا ہوا خط اس نے لا کر دیا ہے۔ تو کیا چٹھی رساں کو روک کر آپ کہیے گا کہ ارے بھئی! یہ خط پڑھتے بھی تو جاؤ۔ وہ کہے گا کہ میرا کام چٹھی پہنچانا تھا، میرا کام اس خط کو پڑھنا نہیں تھا۔ مگر خالق کہہ رہا ہے:

"یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ"۔

ارے یہ کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ علم الکتاب بھی ان کے ذریعہ سے ملے گا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس چٹھی رساں سے پوچھئے کہ اصل مطلب لکھنے والے کا کیا ہے؟ اس کے راز بھی بتائیے، اس کے رموز بھی بتائیے تو برائے خدا بتائیے کہ اگر کتاب کو کافی سمجھتے ہیں تو جتنا کتاب میں ہے، اُسے تو مانئے۔

لیجئے! اب ایک اور بات یاد آ گئی، وہ ایک ہی بات ہے، اُسے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی دوسرے نعرے کی صورت میں کہہ دیا، کبھی کسی فلسفے کی صورت میں کہہ دیا کہ ماخذ دین فقط کتاب ہے، سنت نہیں۔ ہے وہی بات کہ کتاب کافی ہے۔ یہ وہی نعرہ ہے جو پروان چڑھ رہا ہے مختلف صورتوں میں کہ ماخذ دین بس کتاب ہے سنت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی ایک آیت سے اس کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تلاوت آیات کرتے ہیں۔ لیجئے جناب! کتاب تو پہنچ گئی۔ اب "یُزَکِّیْهِمْ" یہ تزکیہ نفس کرتے ہیں۔ اب وہ الفاظ جن سے تزکیہ نفس ہوتا ہے، وہ کب جزوِ کتاب ہیں، وہ آپ ہی کے اقوال سے ہوں گے اور آپ ہی کے افعال سے ہوں گے جو سب جزوِ سنت ہیں اور اس کے بعد اتنا ہی نہیں، "یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ"، یہ کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ تو اب تعلیم کیلئے جو تشریحات یہ کرتے ہیں وہ جزوِ کتاب ہوتے تو تلاوت میں پہنچ نہ جاتے۔ معلوم ہوا کہ وہ سب ان کے ارشادات ہی ہیں جن کے ذریعہ سے کتاب کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد حکمت کی تعلیم بھی یہ دیتے ہیں۔

اب جن الفاظ کی مدد سے حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، وہ بھی جزوِ سنت ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب تو ایک چوتھائی دین کی حامل ہوئی۔ جس نے کتاب کو لے کر سنت کو چھوڑ دیا، اُس نے ایک چوتھائی دین اختیار کیا، تین چوتھائی دین چھوڑ دیا۔

تو غرض یہ چار کام ہیں جو پیغمبرِ خدا کے ذمہ ہیں جن کی تفصیل میں نے بتائی۔ اب یہ معلم کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ اس نے ہر درجہ کیلئے ان لوگوں کو منتخب کیا جن پر اثر ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب پیغمبرِ خدا کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے۔

یاد رکھئے کہ کتاب بے زبان ہے۔ وہ اس سوجھ بوجھ کو نہیں رکھ سکتی۔ پہلا کام جو پیغمبرِ خدا کے سپرد کیا گیا، وہ دیکھئے کہ کتنا اہم ہے! تلاوتِ آیات، یہ بظاہر ہمارے نزدیک بہت آسان ہے۔ قرآن اُٹھاتے ہیں اور پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ تلاوت کہتے کسے ہیں؟ الفاظ جو نازل شدہ ہیں، انہی کو پڑھے، تب تلاوت ہوگی۔ میں ترجمہ پڑھ کر سناؤں تو کیا وہ تلاوت ہوگا؟ یہ عیسائیوں کا تصور ہے کہ

ہر زبان والی بائبل ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ تصور نہیں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے، یہ سب ترجمے ہیں۔ تو یہ ترجمہ سنانا ہوگا، تلاوت نہیں ہوگی۔ کیوں؟ اس سے کہ زبان بدل گئی۔ وہ عربی تھی، یہ اُردو ہوگئی۔

اچھا! زبان بھی وہی رہے لیکن الفاظ بدل جائیں، تب بھی آپ کہیں گے کہ یہ تلاوت نہیں ہوئی۔ اب یہ نیت پر ہے یا وہ تشریح ہوگی یا تحریف ہوگی۔ الفاظ بالکل وہی رہیں، ترتیب بدل جائے!

"فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَىٰ"۔

اب ماشاء اللہ صاحبان علم موجود ہیں کہ عربی قواعد میں فعل کے بعد پہلا درجہ فاعل کا ہے، پھر مفعول کا درجہ ہوتا ہے۔ اب کوئی اُستاد طالب علم کو بتانے کیلئے یوں کہے:

"فَأَوْجَسَ مُوسَىٰ خِيفَةً فِي نَفْسِهِ"۔

کوئی لفظ گھٹا ہے نہ بڑھا ہے۔ بالکل وہی الفاظ ہیں جو آیت میں تھے۔ صرف موسیٰ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ تو اس طرح بات تو وہی ہے لیکن یہ پیغام بھیجنے والے کا کلام نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک صاحب کو کسی نے کوئی پیغام پہنچانے کیلئے دیا۔ اب وہاں تک جاتے جاتے بیچارے ایک لفظ بھول گئے مگر مطلب سمجھ لیا تھا، اس لئے فوراً ذہن میں اس کی جگہ دوسرا لفظ سوچ لیا اور جا کر کہہ دیا کہ یہ پیغام دیا ہے۔ اب اگر پیغام دینے والے کو پتہ نہیں چلا تو خیر مگر اب یہ واپس آئے اور انہوں نے کہا کہ کیا کہا تھا؟ اب انہیں اپنے الفاظ یاد تھے، کہا: میں نے یہ کہا ہے۔ کہا: میں نے یہ تو نہیں کہا تھا؟ میں نے تو یوں کہا تھا۔ تو وہ تصدیق نہیں کریں گے کہ میرا کلام پہنچایا۔

اب یہ دیکھئے کہ یہ رسول نہیں فرما رہے ہیں کہ میں تلاوت کرتا ہوں، آیات خدا کی، بلکہ جس کا کلام ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ پھر ماشاء اللہ صاحبان علم موجود ہیں۔ ماضی کا صیغہ نہیں ہے جو ایک واقعہ خاص کا پتہ دے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تلاوت کردی، بلکہ مضارع ہے جو استمرار کا پتہ دیتا ہے۔ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ یعنی ان کا طریقہ یہی ہے، ان کی شان یہی ہے، ان کا شیوہ یہی ہے کہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس میں ماضی بھی داخل ہے، اس میں حال بھی داخل ہے اور مستقبل بھی داخل ہے۔ سب زمانے داخل ہیں۔ وہ تصدیق کر رہا ہے کہ یہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، نہ اس میں کمی ہوتی ہے، نہ زیادتی ہوتی ہے۔ نہ اُدھر کا لفظ ادھر ہوتا ہے اور نہ ادھر کا لفظ اُدھر ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی دلیل عقلی نہ ہوتی اور کوئی دلیل نقلی بھی نہ ہوتی تو آیت کا یہ جزو رسولؐ کے سہو و نسیان سے بری ہونے کیلئے کافی تھا۔ اس ایک جزو "يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ" میں کتنی رفعت ہے، کتنی بلندی ہے اور اس کے بعد "يُزَكِّيهِمْ"۔ ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ کوئی صفت دوسرے تک نہیں پہنچائی جا سکتی جب تک کوئی اس صفت کا خود حامل نہ ہو۔ خالق کہہ رہا ہے کہ یہ دوسروں کے نفوس کو طاہر کرتے ہیں، پاک کرتے ہیں تو یہ تنہا "يُزَكِّيهِمْ" خود ایک آیت تطہیر ہے۔

یہ اس کی تصدیق ہے کہ ان کا نفس پاک ہے، اس کے معیار پر پاک ہے۔ یہاں جناب! "پاک کرے گا" نہیں ہے، کہ کوئی

سمجھے کہ کچھ ہے، جب تک پاک کیا۔ ''پاک کرے گا'' نہیں ہے، پاک ہے اور اس کے بعد ''یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ''، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، ایک کام اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، دوسرا کام۔ اور یہ کام جب تک کیلئے ہے کہ جب تک ان کی رسالت ہے۔ کتاب کی تعلیم بھی، حکمت کی تعلیم بھی۔ تو اب یہ معلم ہیں نوع انسانی کے، کب تک؟ جب تک رسالت ہے اور رسالتِ پیغمبر کب تک؟ قیامت تک۔ میں کہتا ہوں کہ قیامت تک کہنا بھی ہمارے حدودِ تعبیر کی کوتاہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ قیامت کے آنے سے انکی رسالت ختم ہے؟ اگر قیامت کے آنے سے ان کی رسالت ختم ہے تو شفاعت کس اعتبار سے۔۔۔۔۔؟

تو رسالت میں تو میرے نزدیک قیامت کی قید لگانا درست نہیں ہے۔ رسالت تو لامحدود ہے۔ مگر ہاں! تعلیم۔ اسے کہہ لیجئے کہ قیامت تک ان کے ذمہ ہے کیونکہ جب تعلیم حاصل کرنے والے نہیں رہے تو کلاس کن کیلئے۔ لہٰذا کتاب وحکمت کی تعلیم تا قیامت۔

صاحب علم حضرات کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ معلم کسی کلاس کا کیسا ہونا چاہئے؟ اب اس کی ذرا تشریح کروں گا کہ اگر کوئی معلم ایسا ہے کہ چھ مہینے تک تو بچوں کو اس سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہو اور چھ مہینے کے بعد بچے اس کے برابر آجاتے ہوں اور دو مہینے کے بعد اس سے زیادہ سمجھنے لگتے ہوں تو کیا یہ معلم ہو؟ سب سمجھ گئے کہ نہیں، اس لائق نہیں ہو سکتا۔ اب اگر کسی معلم سے پانچ برس تک کی تعلیم متعلق ہے، تو یہ اگر ایسا ہے کہ سال بھر کے بعد طالب علم برابر آجاتا ہو، پھر آگے بڑھ جاتا ہو، کیا وہ معلم اس لائق ہے؟ اب پانچ سے دس سے بیس برس کی بات کریں۔ ایک اصول کیا قائم ہوا؟ کہ جتنے بھی زمانے کیلئے کوئی شخص معلم ہو، جتنی ممکن ترقی طالب علموں کے دماغوں کی، اتنے زمانہ میں ہو سکتی ہو، معلم کو اُس سے بالاتر ہونا چاہئے۔ جب وہ معلم بنایا گیا، اُسی وقت ورنہ وہ مستحق نہیں ہے کہ معلم بنایا جائے۔ اب جسے خالق نے قیامت تک کیلئے معلم بنایا ہو، تو بر بنائے اصولِ تعلیمی، قائل ہونا پڑے گا کہ عالم الغیب خدا کے علم میں جتنی امکانی ترقی نوعِ بشر کی قیامت تک ہے، اُس سے یہ معلم اونچا ہوگا، جب اس نے معلم بنایا ہے۔

اب انسان روزِ قیامت تک کتنی ترقی کر سکتا ہے ہے؟ وہ ہم اور آپ اس وقت سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ارے جس لائن میں ترقی کر رہا ہے، ہے تو ذہن کی ترقی، چاہے مصرف غلط ہو۔ ترقی کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ تو انسان کتنی ترقی کر سکتا ہے؟ اس کی رفتار یہ ہے کہ اس کو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ دس برس بعد کیا ہوگا اور بیس برس بعد کیا ہوگا؟ جب کہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ تیس برس پہلے کہا جاتا تھا کہ یہاں بیٹھ کر تم دہلی کی آواز سنو گے اور کوئی نہیں مانتا تھا۔ آج تو راستہ چلتے دنیا بھر کی آوازیں آرہی ہیں۔

ارے کسی وقت تو چائے خانوں، ہوٹلوں میں جانے کی ضرورت تھی، اب تو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور جہاں ہیں، وہاں دنیا بھر کی آوازیں سن رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کہتے تھے کہ صرف آواز سن رہے ہوں۔ جہاں کی بات سنو گے، وہاں کی تصویر بھی دیکھ لو گے۔ اسے اگر دس بیس برس پہلے کہا جاتا تو کوئی تسلیم نہ کرتا۔ کہنے والے کو دیوانہ کہا جاتا۔ لیکن اب۔؟ پہلے تو ذرا کمیاب تھا، بعض گھروں میں تھا۔ اب تو ہر گھر میں یہ بھی ہو گیا کہ یہاں سے بیٹھ کر پورا منظر دیکھئے، چاہئے دیکھنے کو ہو، چاہئے دیکھنے کا نہ ہو۔ وہ الگ بات ہے۔ تو یہ بات ابھی دس بیس برس پہلے سمجھ میں نہ آتی۔ تو اب جب رفتار ترقی یہ ہے تو دس برس بعد کیا ہوگا، بیس برس بعد کیا ہوگا اور سو برس بعد کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مجھے تو آسانی اس میں محسوس ہوئی کہ یہ ترقیاں جو ہو رہی ہیں اور بہت سی ہو چکی ہیں، یہ کن لائنوں

پر ہو رہی ہیں؟ کس چیز میں یہ ترقیاں ہو رہی ہیں؟ تو میری تو سمجھ میں یہ آیا کہ یہ تمام ترقیاں دو چیزوں میں ہو رہی ہیں: ایک سرعتِ رفتار، ایک شدتِ اختصار۔ مہینوں کی مسافت ہفتوں میں طے ہونے لگی، پھر ہفتوں کی مسافت دنوں میں۔ اس کے بعد دنوں کی مسافت منٹوں میں طے ہونے لگی۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ثانیوں اور دقیقوں میں طے نہ ہوگی۔ بہت سے کام جو ایک جماعت مل کر ایک عرصہ میں کرتی، وہ ابھی تھوڑی دیر میں مشینوں کی مدد سے ہو جاتے ہیں۔

تو تمام ترقیاں ان دو چیزوں میں: ایک سرعتِ رفتار، دوسری شدتِ اختصار۔ تو جو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس کے واقعاتِ حیات میں کوئی مثال ایسی ہونی چاہیے تھی کہ دنیا لاکھ ترقی کر جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے۔ اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جا کر ہو آئے اور زنجیر ہلتی رہے۔

یاد رکھئے کہ جب وہ دنیا میں تشریف لائے تھے تو اس وقت انسان کی سمتِ سفر چار تھیں: مشرق، مغرب، شمال اور جنوب۔ اگر اسی وقت کے معلم ہوتے تو اسی دنیا میں گھما پھرا کر پہنچا دیئے جاتے۔ مگر بھیجنے والے کو معلوم تھا کہ انسان کی سمتِ سفر بدلے گی۔ یہ چاند تک پہنچے گا اور ستاروں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں پہنچے گا۔ جب چاند تک پہنچ گیا تو ستاروں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ تو اب سمتِ سفر ادھر ہوگئی۔ تو جسے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس کیلئے لازم ہے کہ اُسے اتنی دور تک پہنچا دیا جائے کہ اب لاکھ انسان اونچا ہو جائے، پھر بھی پیچھے رہے، آگے نہ جا سکے۔

میں تو کہتا ہوں کہ ابھی انسان چاند تک گیا ہے، جسے ہمارے ریاضی والے کہتے ہیں کہ فلک الدنیا پر ہے۔ فلک الدنیا یعنی سب سے نیچے کا آسمان جو بس ہمارے اوپر ہے۔ وہاں تک ابھی انسان کی پرواز ہوئی ہے مگر اس کے آگے اب یہ چاہے جہاں جائے، ستارہ مریخ تک جائے، زہرا تک جائے، عطارد تک جائے، اب میں کہتا ہوں کہ ستارہ زحل تک پہنچ جائے۔ ستارہ زحل سب سے اونچا ہے ان میں۔ وہاں تک بھی پہنچ جائے تو میں کہوں گا کہ ہمارے رسول کا روندا ہوا راستہ ہے۔

ایک بڑی بحث ہے، اس کا تجزیہ اسی سے ہو جاتا ہے، اتنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ عقلی ضرورت جو معراج کی ہے۔ اب غور کر لیجئے کہ یہ چاند تک گئے ہیں، یہ اگر روحانی طور پر گئے ہوں تو معراج روحانی مان کر بات بن جائے گی اور اگر یہ سب جسم سمیت گئے ہوں تو اپنے رسول کو ان سے پیچھے نہ سمجھئے۔ یہ منزل تھی ان کی جو افضل المرسلین قرار دیئے گئے، خاتم النبیین قرار دیئے گئے اور ان کا مرتبہ تمام رسولوں میں برتر ہو۔ عام طور تو ذہن میں آتا ہوگا کہ یہاں سے بابِ مصائب بہت دور ہے لیکن فضائل و مصائب اتنے دست و گریباں ہیں کہ مجھے منتقل ہونے میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی۔

یہی وہ حقیقت ہے کہ جس پر شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب ''سر الشہادتین'' کی پوری بنیاد قائم ہے۔ اہل علم حضرات واقف ہوں گے کہ خاندانِ ولی اللہ کو ایک خاص عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ یہ ان کی اولاد ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ سب سے منفرد تھے۔ ان کے تعارف کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ صاحب تحفہ اثنا عشریہ ہیں یعنی اس کتاب کے مصنف جس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن چھپ چکے ہیں، ان کی ایک کتاب ''سر الشہادتین'' جتنے شہادت نامے اس وقت ہیں، چاہے یہاں ہوں، چاہے وہاں ہوں، سب کا ماخذ، سب

کی بنیاد اسی پر قائم ہوتی ہے۔ اسی کے ترجمے ہوئے: "ذکر الشہادتین"، "تقریر الشہادتین"، "تحریر الشہادتین" مختلف زبانوں میں۔ تو سرالشہادتین کی بنیاد اسی چیز پر ہے یعنی بنیاد فضیلتِ رسولؐ پر ہے۔ سرالشہادتین کا ترجمہ ہے "دو شہادتوں کا راز"۔ ابھی تو شاید سمجھ میں نہ آئے کہ دو شہادتوں کا راز اور اس کی بنیاد فضیلتِ پیغمبرِ خدا پر ہے۔ مگر پوری کتاب کی داغ بیل اسی بنیاد پر ہے کہ ہمارے پیغمبر تمام پیغمبروں سے افضل ہیں۔ کوئی فضیلت کسی رسول یا نبی کو نہیں ملی مگر یہ کہ اس کی مثل یا اس سے بہتر فضیلت ہمارے رسولؐ کو حاصل ہوئی ہے۔ بالکل خلاصہ عرض کر رہا ہوں۔ ان خصائل میں جو پیغمبرِ خدا کو حاصل ہوئے، ایک فضیلتِ شہادت بھی ہے یعنی بہت سے انبیاء ایسے ہیں جو راہِ خدا میں شہید ہوئے ہیں، جناب زکریا، جناب یحیٰی، ہماری مجالس میں ذکر ہوتا رہتا ہے، ہماری مجالس بھی بہت بڑا مدرسہ ہیں دینیات کا۔ ہمارے پیغمبرؐ پر اگر کسی دشمن کا حربہ کارگر ہو جاتا اور وہ نمایاں طور پر شہید ہو جاتے تو شاہ عبدالعزیز کا خیال یہ ہے کہ لوگ خوفزدہ ہو جاتے اور اسلام کی ترقی میں رکاوٹ ہو جاتی۔ جیسے ان کے تحت الشعور میں یہ بات ہے کہ جو گردوپیش کے لوگ ہیں، ان میں ابھی خامی ہے۔ بہر حال وہ حقیقت ان کے ذہن میں ہے۔

میں کیا کروں کہ ان کا بیان ہے کہ پھر اسلام کی ترقی رک جاتی۔ یعنی بہت سے لوگ جو توقعات لئے بیٹھے ہیں، خوشگوار اُمیدوں میں ہیں، ان کو مایوسی ہو جاتی، اسلام کی ترقی رُک جاتی۔ حکمتِ ربانی اس کی متقاضی نہیں تھی کہ براہِ راست ان پر دشمن کا ظاہر بظاہر کوئی حربہ کارگر ہو۔ لیکن اگر یہ فضیلت فضائلِ رسولؐ میں شامل نہ ہوتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا درجہ دوسرے انبیاء سے گھٹ جاتا۔ لہٰذا منظورِ قدرت ہوا کہ براہِ راست تو حضرتؐ پر کسی کی تلوار کا وار نہ لگے، کسی کا نیزہ کام نہ کرے مگر یہ فضیلت آپؐ کے فضائل میں شامل بھی ہو جائے۔ اس کیلئے خالق نے پیغمبرِ خدا کو دو نواسے عطا فرمائے اور شروع سے یہ اہتمام کیا کہ ان کی خصوصیت پیغمبرِ خدا سے نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے۔ جو بھی شخص ہے، وہ اپنے باپ کی اولاد کہلائے گا، نسبت اسی کی طرف ہوگی۔ فرزند اپنے باپ کا ہوگا۔ یہ ہیں نواسے لیکن خدا نے ان کو اُن کا بیٹا قرار دیا۔ یہ ان کی خصوصیت رکھی کہ فرزندِ رسولؐ ہیں۔

اس کے علاوہ ہر ایک غذا شیرِ مادر سے ہوتی ہے لیکن انکی غذا رسولؐ کے لعابِ دہن سے ہوئی تا کہ اجزائے جسمِ رسولؐ ان کے جسم میں شامل ہو جائیں۔ یہ اہتمام خالق نے کیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب حضرتؐ نے یہ سب اس مقصد کی تکمیل کیلئے کیا تو ہم بھی جب مجالس کریں تو اسے بدعت نہ کہئے۔ یہ سب اہتمام ہوا اور اس کے بعد آخری بات یہ کہ شہادت کی دو اقسام ہیں: ایک شہادتِ سری اور ایک شہادتِ جہری۔ شہادتِ سری یعنی خفیہ شہادت۔ وہ زہر سے ہوتی ہے اور شہادتِ جہری یعنی کھلم کھلا۔ یہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں اقسام کی شہادتیں دونوں نواسوں میں تقسیم ہو گئیں۔ شہادتِ سری حسنِ مجتبیٰؑ کے حصہ میں آئی اور تلوار والی شہادت حسینؑ کے حصہ میں آئی۔ اسی طرح فضیلتِ شہادت دونوں نواسوں کے ذریعہ سے فضائلِ رسولؐ میں شامل ہو گئی۔

یہ ان کی کتاب کا خلاصہ میں نے عرض کیا۔ اب نتیجہ نکالنا میرا کام ہے۔ خود تشریف فرما ہوتے تو ان کی کتاب کا خلاصہ ان کو سنا کر تصدیق کرواتا۔ اب آپ دیکھئے کہ جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ صاف ہے یا نہیں ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ شہادتِ حسنؑ بھی شہادتِ رسولؐ ہے اور شہادتِ حسینؑ بھی شہادتِ رسولؐ ہے۔ بس اب بہت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ جب آپؐ نے یہ کہہ دیا تو اب اتنا بتا دیجئے کہ حسنؑ کا

قاتل کس کا قاتل؟ اور حسینؑ کا قاتل کس کا قاتل؟ پھر اس قاتل کے بارے میں کچھ کہنے سننے میں اختلاف نہ رکھئے اور جو رسولؐ کے قاتل کو کہنا جائز ہو، وہ حسینؑ کے قاتل کو کہنا جائز سمجھے اور جو رسولؐ کے قاتل کیلئے کہنا جائز ہو، وہی حسنؑ کے قاتل کیلئے کہنا جائز سمجھے۔

ایک اعتراض جو مجالس پر ہوتا ہے اور تمام منطق وفلسفہ اور شریعت وقرآن وحدیث کے حربے صرف کئے جاتے ہیں۔ سوچ سوچ کر ہماری عزاداری پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔ یعنی روتے ہم ہیں اور تکلیف دوسروں کی آنکھوں کو ہوتی ہیں۔ سینوں پر ماتم ہم کرتے ہیں اور درد دوسروں کے سینوں میں ہوتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ تم وفات رسول کا غم اتنا کیوں نہیں کرتے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض اس وقت تک ہے جب کہو کہ وفات رسولؐ اور شہادت حسینؑ۔ لیکن شاہ صاحب کے ارشاد کی روشنی میں سال میں دو تاریخیں ہیں: ایک وفات رسولؐ کی، ایک شہادت رسولؐ کی۔ اب یہ آپ فیصلہ کیجئے کہ وفات کی یادگار منائیں یا شہادت کی۔ وفات کی یاد میں ہمارے لئے کوئی عملی نمونہ نہیں ہے مگر شہادت کی یاد میں جو اختیاری اقدامات ہیں، وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں۔

تو اب بتایئے حیات اسلام کیلئے کون زیادہ مفید ہے؟ ہم سے کیا پوچھنا، اسے آسمان سے پوچھنا چاہئے کہ وفات رسولؐ پر کیوں خون کی بارش نہیں ہوئی اور شہادت حسینؑ پر کیوں خون کی بارش ہوئی؟ اب اسے دیکھ لیجئے علامہ ابن حجر مکی کی کتاب صواعق محرقہ میں، جو ہماری رد میں نہایت سخت طریقہ سے لکھی گئی ہے، مطالب السؤل میں دیکھ لیجئے، علامہ کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی اس کے مصنف ہیں، تذکرہ خواص الامۃ علامہ سبط ابن جوزی کی تصنیف میں دیکھئے کہ شہادت حسینؑ پر چالیس دن تک جو کپڑا زیر آسمان پھیلایا جاتا تھا، اس پر خون کے نشان نظر آتے تھے۔ ہمارے شعراء مبالغہ کے طور پر کہتے ہیں "خون کے آنسو"۔ حقیقت میں کائنات نے چالیس دن تک خون کے آنسو بہائے۔ اس کے معنی ہیں کہ عاشور کے دن ہی اس نے یوم غم نہیں منایا بلکہ اربعین کی تاریخ بھی اس نے مقرر کردی۔ بیس صفر تک چالیس دن پورے ہوتے ہیں جس میں کائنات سوگوار رہی ہے۔

کوئی کہے کہ راویوں نے بعد میں بیان کیا کہ خون کی بارش ہوئی مگر جناب! سب سے قدیم تاریخ کربلا کی طبری ہے، طبری نے بڑی تفصیل کے ساتھ واقعہ کربلا بیان کیا ہے۔

29

جانشینِ پیغمبر

ہوشیار تو لیتے نہیں کچھ اس سے سبق
بیہوش کو قرآن کی ہوا دیتے ہیں

(نجم آفندی)

کسی نے جناب رسالت مآبؐ سے پوچھا کہ آپؐ نے علیؑ کا نام تو لیا ہی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اس شخص کو دیکھو کہ کتنا عجیب ہے کہ میرے نفس کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

اب بلاغتِ پیغمبرؐ یہ ہے، علم معنی کتاب وہ ظاہری چیز ہے تو اس کیلئے "شہر" کہا "اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْم" "میں علم کا شہر ہوں اور حکمت جو اندرونی اسرار کا نام ہے، اس کیلئے گھر کہا کہ میں حکمت کا گھر ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے اور گھر میں جانا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے۔

گویا رسول یوں فرمارہے ہیں کہ "ایھا الناس"، ابھی تک تو میں تھا اور قرآن، کل جب میں نہ ہوں تو پھر میرے اہل بیتؑ ہیں اور قرآن۔ اب بتایئے رسولؐ کی جگہ کون ہوا؟

یہ خالق کا نظام اور اس کا ارادۂ خاص تھا کہ اب جس ہستی کو باقی رکھنا ہے، اُسے روزِ عاشور دن بھر غشی میں رکھا۔

جانشینِ پیغمبر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ ٭ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿۲﴾

وہ وہ ہے جس نے امّیّین میں پیغمبر بھیجا، انہی میں سے جو ان کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں اور تین مرتبہ اس سے پہلے اللہ نے وہ کام بتائے ہیں جو اپنے پیغمبرؐ کے ذمہ رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس آیت کے مضمون کو پیش نظر رکھئے تو جانشینی کا مسئلہ دشوار نہ رہے کیونکہ جانشینی کے معنی، جسمانی حیثیت سے جہاں کوئی رہتا ہو یا جس جگہ پر بیٹھتا ہو، اس مکان میں کوئی رہے اور اس جگہ پر کوئی بیٹھ جائے تو اس کے معنی جانشین کے ہیں۔ مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دو حصوں میں بٹوارہ ہو جانے کی وجہ سے دونوں طرف کی آبادیوں میں داخل خارج ہو گیا۔ جو داخل تھے، وہ خارج ہو گئے اور جو خارج تھے، وہ داخل ہو گئے۔

ایک مکان میں کوئی ڈاکٹر صاحب رہتے تھے، اب اس مکان میں ایک شاعر صاحب متمکن ہو گئے۔ تو یہ شاعر صاحب ڈاکٹر صاحب کے جانشین ہو گئے۔ جس کا دل چاہے، وہ جا کر دیکھ لے کہ ہیں اُسی جگہ پر۔ اگر جانشین کے معنی اس جگہ پر بیٹھنے والا ہو تو بالکل اسی جگہ پر یہ فروکش ہیں۔ ممکن ہے کہ انہی کی کرسی پر بیٹھتے ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ وہ سب مریض جو ڈاکٹر صاحب سے علاج کرواتے تھے، اب ان شاعر صاحب کے پاس آجائیں کہ صاحب! آپ جانشین ہیں۔ تو ان مریضوں نے جگہ پر بیٹھ جانے کی وجہ سے شاعر کو ڈاکٹر کا جانشین نہیں سمجھا۔

فرض کیجئے وہاں پہلے عالم دین رہتے تھے۔ لوگ مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ جب مکان خالی ہوا تو اس میں آکر کوئی ڈاکٹر صاحب مقیم ہو گئے۔ تو جو لوگ دینی مسائل پوچھنے آتے تھے، اب وہ ان ڈاکٹر صاحب کو ان عالم دین کا جانشین نہیں سمجھیں گے، حالانکہ بیٹھے اسی جگہ پر ہیں۔ اب اس سے سمجھ میں آیا کہ یہ مکان والی جگہ جہاں جسم متمکن ہوتا ہے، یہ جانشینی کے معاملہ میں معتبر نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے اس فرد کی کہ وہ کام جو پہلا شخص انجام دیتا تھا، وہی کام یہ اس کی نیابت میں انجام دے۔ تب یہ اس کا جانشین ہوگا۔ چاہے جانشین ہوگا۔ چاہے جگہ بدل بھی جائے۔ مریض اس مکان کو جسمانی حیثیت نہیں دیکھیں گے، اس عمل اور اس کام کو دیکھیں گے جو وہ انجام دیتا ہے۔

میں مثال کے طور پر کہا ہے کہ ڈاکٹر کی جگہ اگر شاعر آگئے۔ اب میں کہتا ہوں کہ پہلے وہاں ڈاکٹر رہتے تھے، اتفاق سے اب

وہاں حکیم صاحب آگئے تو یہ حکیم صاحب بھی ان ڈاکٹر صاحب کے جانشین نہیں سمجھے جائیں گے، حالانکہ ایک ہی کام دونوں انجام دے رہے ہیں۔ مگر نہیں، جو اُن ڈاکٹر صاحب کے مریض تھے، وہ ان حکیم صاحب کے پاس نہیں آئیں گے۔ معلوم ہوا کہ فقط اتحادِ عمل ضروری نہیں ہے بلکہ طریق عمل کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی عالم دین کی جگہ کوئی بڑھئی آجائے۔ ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی لوہار آکر بیٹھ جائے۔ ظاہری طور پر بالکل جنس عمل الگ الگ ہو۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے، چونکہ جگہ کسی کو نہیں نکالتی۔ اب اگر یہ ہے تو آیت نبوت جانشینی کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے کافی ہے۔ جس نے رسولؐ بنایا ہے، وہ ان کاموں کی فہرست پیش کر رہا ہے۔ اسے دستاویز منصب سمجھنا چاہئے، منشور عہدہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے عہدہ سپرد کیا ہے تو کاموں کی فہرست بھی بتادی ہے کہ یہ یہ کام ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کام اپنی جگہ بہت اہم ہوں، ضروری ہوں مگر وہ کام اگر اس فہرست میں نہ ہوں تو وہ بحیثیت رسولؐ فرائض میں بنیادی حیثیت سے نہیں سمجھنے چاہئیں۔

مثال کے طور پر انتظام ملک بہت ضروری چیز ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ خدا نے رسولؐ کے کاموں میں اس کا اندراج نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ فتح ممالک بڑی اہم بات ہو مگر اس کا کیا کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے رسالت کے کاموں میں فتح ممالک کا ذکر نہیں کیا۔ تو کوئی فاتح ممالک ہو، فاتح ہونے کی حیثیت سے بہت بڑا آدمی ہو مگر جب وہ یہ کام انجام نہ دے رہا ہو جو رسولؐ انجام دیتے تھے، تو کس طرح رسول کا جانشین ہو جائے گا؟ اور ایک کام نہیں بلکہ بہت سے کام انجام دیتا ہو جو اپنی جگہ ممکن ہے کہ بہت وقیع ہوں لیکن وہ ان کاموں کی فہرست میں نہیں ہیں جو رسولؐ کے ذمہ ہیں تو ان کاموں کی وجہ سے وہ کسی فاتح کا جانشین ہوسکتا ہے، کسی منتظم ملک کا جانشین ہوسکتا ہے، لیکن رسول کا جانشین نہیں ہوسکتا۔ اب اگر یہ کام جو پیغمبرؐ کے ذمہ ہیں، اگر پیغمبرؐ نے ان میں سے ہر ایک کام کسی کے سپرد کیا کہ یہ کام یہ انجام دے گا، یہ کام یہ انجام دے گا، چاہے وہ لفظ جانشین نہ بھی کہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان کاموں کا سپرد کردینا، یہی جانشین بنادیتا ہے۔

اب اگر پیغمبرؐ نے ہر کام کیلئے نامزد کردیا، مثلاً تلاوتِ کتاب جس کے معنی ہیں قرآن، ایک شخص کے سپرد کردیا اور تزکیہ نفوس کا کام سپرد کردیا۔ کتاب کی تعلیم کیلئے کسی کو مقرر کیا، حکمت کی تعلیم کیلئے بتادیا کہ یہ شخص ہے جتنے کام رسولؐ کے ذمہ تھے، وہ تو رسولؐ نے سب دے دیئے۔ ارے، بہت سوں کو دیئے تو بانٹ دیئے۔ ایک کو دیئے تو سب کام اس کے سپرد ہوگئے۔ تو ہر کام جو رسولؐ کے ذمہ تھا، وہ تو انہوں نے خود نامزد کر کے کسی کو دے دیا۔ اب کوئی پانچواں کام رہ گیا ہو تو دنیا اس کیلئے الیکشن کرے۔

تلاوت کا تعلق کتاب سے اور کتاب توریت، زبور اور انجیل تو نہیں، قرآن ہے۔ اسی کی تلاوت ہے متفق علیہ۔ اسناد دیکھ لیجئے کہ رسولؐ فرما رہے ہیں کہ:

"عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ"۔

"علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ"۔

کیا مطلب ہوا؟ یعنی انہیں چھوڑ کر قرآن نہیں ملے گا جسے کافی سمجھتے ہو، وہی بغیر ان کے نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ پہلا کام

سپرد کردیا۔ دوسرا کام تزکیہ نفوس۔ تزکیہ کا تعلق نفس سے ہے۔ جہاں تزکیہ کا لفظ ہے، اس کے ساتھ نفس آتا ہے۔ اسی لئے ترجمہ میں نفوس کا سدھارنا شامل کرتے ہیں۔ اب ذرا نفس کی حقیقت پر غور کیجئے۔ جتنے افعال ہیں، اعضاء وجوارح کی نسبت سے فعل الگ ہے اور فاعل الگ ہے، مثلاً اٹھانا ہاتھ کا کام ہے، پاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سننا کان کا کام ہے، ہاتھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فعل الگ، فاعل الگ۔ لیکن جہاں نفس کی منزل آئی، سب کام ایک ہو گئے۔ سب کام ایک ہو گئے۔ راستہ طے کیا پیروں نے، آپ نے کہا میں نے طے کیا۔ دیکھا آنکھوں نے، آپ نے کہا میں نے دیکھا۔ کہا زبان نے، آپ نے کہا میں نے کہا۔ اٹھایا ہاتھ نے، آپ نے کہا میں نے اٹھایا۔

تو دیکھا آپ نے، اب یہ نہیں ہے کہ آنکھ نے دیکھا، میں نے نہیں دیکھا، ہاتھ نے اٹھایا، میں نے نہیں اٹھایا۔ نفس کی منزل میں وہ سب ایک کا ہو گیا۔ تو ایک تو نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ اعضاء کی کثرت کو وہ وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ جو کام کرنے والے بہت تھے، اب وہ سمٹ کر ایک میں جمع ہو گئے۔ یعنی وہ سب افعال ایک کے ہو گئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اعضاء سے جو کام ہوتا ہے، وہ کسی وقت خاص طور پر ہوتا ہے، اس سے پہلے وقوع میں نہیں آتا، مثلاً سائل آیا، آپ کے پاس جو کچھ تھا، وہ اٹھا کر دے دیا۔ تو یہ دینے کا کام اس وقت ہوا جب سائل آیا، یا مثلاً کسی مسئلہ کا جواب دینا اس وقت ہوگا جب کوئی مسئلہ دریافت کرنے آئے گا۔ اسی طرح دیکھنے کا کام اُسی وقت ہوگا جب کوئی منظر نظر کے سامنے ہوگا۔ پس افعال اس وقت ہوتے ہیں جب کسی خاص وقت پر اس کا سبب مہیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ طاقت جو ان کاموں کو کرواتی ہے، جس کو ملکہ کہتے ہیں، وہ نفس میں قائم ہوتی ہے۔ دیا سائل کو اُس وقت جب سائل آیا مگر سخی اُس وقت بھی تھے جب سائل نہیں آیا تھا۔ اگر سخی نہیں ہوتے تو یہ کام ہوتا ہی نہیں۔ ایک کنجوس کے پاس بھی تو ہاتھ ہوتے ہیں۔ مگر ہاتھ میں وہ نفس کی طاقت نہیں ہے جو بروقت اس کام کو انجام دلواتی ہے۔

شجاعت کا ملکہ نفس میں ہے۔ اثر اس کا ہاتھ سے نمایاں ہوتا ہے۔ جو علم کی مدد سے کسی مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے، وہ اس وقت پیش کرتا ہے جب کوئی پوچھنے والا آتا ہے۔ لیکن وہ علم جس سے جواب دیتا ہے، وہ پوچھنے والے کے آنے سے پہلے بھی موجود تھا۔ اگر علم نہ ہوتا تو پوچھنے والے کے آنے پر جواب نہ دے سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ اعضاء کے افعال سبب کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن نفس کے جو ملکات ہیں، وہ قائم رہتے ہیں، چاہے سبب وقوع میں آئے، چاہے نہ آئے۔ ملکہ نفس میں جو موجود رہتا ہے۔ وہی ہر وقت اس عمل کو کرواتا ہے۔

اب یہ دو خصوصیات آپ نے نفس کی سمجھ لیں۔ ایک کثرت سمٹ کر وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے، دوسرے نفس میں ملکہ ہوتا ہے۔ جو باعث ہوتا ہے افعال کے صدور کا۔ تو اب فرض کیجئے کہ سائل نہیں بھی آیا اور سائل آیا ہی نہیں عمر بھر تو عطا کا کام تو نہیں ہوا، لیکن سخاوت نفس میں موجود ہے۔ اگر سائل آتا تو ضرور دیتا۔ سخاوت نفس میں موجود ہے، چاہے بروئے کار آنے کا موقع ملے، چاہے نہ ملے۔ یعنی موقعہ کا ملنا یا نہ ملنا اتفاق روزگار سے تعلق رکھتا ہے اور ملکہ کا قیام نفس میں مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ چاہے سبب وقوع میں آئے، چاہے نہ آئے۔ اسی طرح سے اگر مسئلہ پوچھنے کوئی آیا ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس دور میں بہت ہو گیا ہے کیونکہ لوگ علماء کا مصرف سمجھنے لگے استخارہ دکھوانا، جنازہ پڑھوانا، نکاح پڑھوانا۔ جو اصل کام ہے عالم کا یعنی مسائل کا حل کرنا۔ وہ اس دور میں بحمد اللہ سب ہی

عالم ہو گئے ہیں۔ کسی کو مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث میں ہے تین چیزیں بروزِ قیامت فریاد کریں گی: ایک وہ قرآن جو کسی گھر میں رہا ہو اور اس کی تلاوت نہ ہوئی ہو۔ وہ قرآن بروزِ قیامت شکوہ کرے گا، حالانکہ قرآن سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ جو مسافر جانے لگتا ہے تو قرآن کے نیچے سے گزار دیتے ہیں جیسے قرآن اس لئے اُترا تھا۔ کوئی بیمار ہو تو قرآن کی ہوا دیتے ہیں۔ کام لے لیا قرآن سے، ثبوت مل گیا کہ مسلمان ہیں۔ اب مجھے یہاں جناب نجم آفندی کا شعر یاد آ گیا۔

ہوشیار تو لیتے نہیں کچھ اس سے سبق
بیہوش کو قرآں کی ہوا دیتے ہیں

تو یہ مصرف قرآن ہے۔ حدیث میں ہے کہ قرآن شکوہ کرے گا کہ اس گھر میں تھا، تلاوت نہیں ہوئی۔ وہ مسجد شکوہ کرے گی جو محلہ میں ہے اور مؤمنین اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ مسجد خالی رہتی ہے۔ وہ عالم شکوہ کرے گا جو کسی شہر میں تھا اور لوگ اُسے دینی مسائل دریافت نہیں کرتے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ مجازی عالم ہیں جو اس وقت ہیں، حقیقی عالم جو تھے، اصل شکوہ ان کا ہوگا کہ زمانے نے ہم سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو یہ مسئلہ کوئی پوچھے نہ پوچھے، وہ ملکہ جس سے وہ جواب دیتا مسئلہ کا، اس کا انحصار پوچھنے والے کے آنے یا نہ آنے پر نہیں ہے۔ وہ نفس میں قائم رہتا ہے۔ لوگ نہیں پوچھتے، یہ ان کا قصور ہے، کہنے والا کہے گا "سلونی"۔

اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ طاقت بروئے کار نہیں آئی تو کام تو وجود میں نہیں آیا کیونکہ اس کا محرک نہیں تھا لیکن طاقت نفس میں موجود ہے۔ وہ ملکہ سبب وقوع کا محتاج نہیں ہے۔ ملکہ سبب کا منتظر نہیں رہتا۔ وقوع میں آنا سبب کا منتظر رہتا ہے۔ اب خدا اور رسولؑ نے جس کو اپنا نفس کہہ دیا۔۔۔۔۔۔

کسی نے پیغمبرِ خدا سے پوچھا کہ سب سے زیادہ آپ کو محبوب کون ہے؟ مردوں میں فلاں شخص، عورتوں میں فلاں۔ تو سننے والے کو آپ پر کافی تعجب ہوا۔ آپؐ نے کہیں پر علیؑ کا نام نہیں لیا۔ اب وہ حدیث اسی نوعیت کی ہے کہ میرے نہ پڑھنے سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اس کے تمام فقرات کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب اس میں یہ جزو ہے تو اس کی کتنی قیمت ہے کہ اُس نے پوچھا کہ آپؐ نے علیؑ کا نام تو لیا ہی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اس شخص کو دیکھو کتنا عجیب ہے کہ میرے نفس کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا ہے؟

اب تو یہ خیر حدیث تھی جس کی صحت کا ذمہ دار ہوں لیکن اگر کوئی صحیح نہیں مانتا تو چلو صحیح نہ سہی مگر قرآن کی آیت کا کوئی کیا کرے گا؟ پہلے قرآن مجید کی ایک ایسی آیت پڑھوں جو اتنے زیادہ سامعین کے ذہن میں نہیں ہوگی۔ "قَاتِل"۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جاہد کہنا چاہئے تھا کہ جہاد کیجئے۔ اور بڑی گنجائش تھی اس کی۔ اس لئے کہ رسولؑ کی پوری زندگی جہاد۔ جہاد کیلئے کوئی خاص شکل نہیں ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات سے مقابلہ، وہ بھی جہاد بلکہ اُسے جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ کوئی قلم سے نصرتِ دین کر رہا ہے، وہ بھی جہاد۔ تو جہاد میں بڑی وسعت ہے۔ یعنی بنفسِ نفیس رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد فرما رہا ہے کہ "قَاتِل"۔ اب قتال وہ نہیں ہے جو قلم سے ہوتا ہو، قتال کے معنی ہی ہیں قتل والا مقابلہ۔ وہ ہوتا ہی تلوار وغیرہ سے ہے۔ قتال میں وہ سب بحثیں نہیں آتی ہیں۔ تو "قَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" اللہ کی راہ میں آپ قتال کیجئے۔

"لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ"۔

اور آپ پر یہ پابندی عائد کر رہے ہیں۔ آپ کے نفس پر۔ آپ پر جو ذمہ داری ہے، وہ اپنے نفس کی ہے۔ آپ مکلف نہیں ہیں، سوائے اپنے نفس کے۔ کوئی تشریح نہیں، صرف ترجمہ ہے کہ آپ مکلف نہیں ہیں سوائے اپنے نفس کے۔

ہاں! دوسرے اہل ایمان کو آپ ترغیب دیتے رہئے کہ جنگ کریں۔ لیکن ان کے عمل کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ پر پابندی اپنے نفس کی ہے۔ اب میں دنیائے تاریخ کو دعوت دوں گا کہ وہ آئے غزوات اسلامی میں اور بتائے کہ پیغمبرؐ نے جہاد کہاں کیا؟ بنفس نفیس۔ بدر میں جہاد کیا؟ اُحد میں، خندق میں، خیبر میں، کہیں؟ دنیا بتائے کہ پیغمبرؐ نے بذاتِ خود جہاد کہاں کیا؟

اب میں تمام دنیا کو دعوت دوں گا کہ وہ ہمت کر کے یہ کہے کہ پیغمبرؐ نے حکمِ خدا پر عمل نہیں کیا یا اگر جرأت ہو تو ان الفاظ کو قرآن سے قلم زد کرے۔ قرآن سے نکالے۔ اب میں کہتا ہوں، پرانے زمانہ میں کسی نے ہمت کی ہے۔ اب تو کسی مسلمان میں ہمت نہیں ہے۔ کوئی چارۂ کار سوائے اس کے نہیں ہے کہ یا تو پیغمبر خدا کی شان میں یہ گستاخی کرے کہ انہوں نے (معاذ اللہ) حکمِ الٰہی کو نا قابل عمل سمجھا یا قرآن میں سے ان الفاظ کو نکالے کہ یہ الفاظ قرآن میں ہیں ہی نہیں۔ یا پھر کوئی چارۂ کار نہیں کہ جو ہر میدان میں لڑتا ہوا نظر آئے، اسے رسول کا نفس مان لے۔

دوسری آیت جانی پہچانی ہوئی آیہ مباہلہ۔

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ۔

اب الفاظ قرآن کے یہی اور جو افراد رسولؐ اپنے ساتھ لائے ہیں، وہی وہی جو بحمد اللہ آپ کو معلوم ہیں۔ یعنی اپنے پورے مطالعہ کی پشت پناہی پر میں عرض کر رہا ہوں کہ جتنی آیتیں قرآن مجید میں ہیں جو ہمیں معلوم ہیں کہ آپ کی شان میں اور اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں، تقریباً ہر جگہ مفسرین نے کوئی اور قول نقل کر دیا ہے، کوئی اور نام لے دیا ہے۔ چاہے اُس نام سے کوئی دلچسپی نہ ہو، مگر یہ کیا کم ہے کہ یہ نہ رہے، کوئی اور ہو جائے، یہ منزل مباہلہ ہے کہ یہاں کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اور نام پیش کرے۔

تو جس طرح الفاظ قرآنی معین، اسی طرح وہ افراد جنہیں پیغمبرؐ خدا اپنے ساتھ لائے، وہ بھی معین۔ اس میں بھی کوئی ضعیف سے ضعیف قول کسی دوسری شخصیت کے بارے میں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خالق کا یہ انتظام تھا، اس لئے کہ خود قرآن سے تمہاری سمجھ میں آجائے، چاہے کہیں کافی نہ ہو، یہاں کافی ہو جائے۔ جس ترتیب سے پیغمبرؐ خدا کے ساتھ افراد ہیں، اسی ترتیب سے الفاظ قرآنی۔

اب ایک ہی بات ہے، چاہے دنیا سمجھے کہ رسول کا ارادتاً یہ عمل تھا کہ جس ترتیب سے الفاظ قرآن ہوں، اسی ترتیب سے میں افراد کو لے جاؤں یا رسولؐ کے علم غیب میں علماء کو اختلاف ہو تو ہوا کرے۔ اللہ سبحانہ کے علم غیب میں کوئی اختلاف نہیں ہے تو میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ اللہ کو معلوم تھا کہ رسول کس ترتیب سے افراد مباہلہ کو لائیں گے۔ وہ جس ترتیب سے لانے والے تھے، اُسی ترتیب سے اللہ نے الفاظ اترے تا کہ جس لفظ کے معنی نہ سمجھو، رسول کے ساتھ کے فرد کو دیکھ لو۔

ایک صفت ہے فن بدیع کی لف ونشر مرتب۔ یعنی لف ونشر ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں، ایک مرتب اور دوسری غیر مرتب۔

تو لف ونشر کیا ہے کہ چند چیزیں ایک ساتھ بیان ہوں اور جو اُن کے متعلق چیز ہو، وہ ایک ساتھ بیان ہو۔ اگر سلسلہ وہی ہے ترتیب کے ساتھ، تو وہ لف ونشر مرتب ہے اور اگر ترتیب بدل گئی ہے تو لف ونشر غیر مرتب۔ مگر وہ ایک ہی متکلم کے کلام میں ہوتا ہے۔ لف وہ چند چیزیں جو پہلے بیان کی گئیں اور بعد میں جو ان کے متعلق آتے ہیں، وہ نشر کہلاتے ہیں تو لف ونشر ایک ہی کلام میں ہوتا ہے مگر یہاں خدا اور رسولؐ میں ایسی وحدت ہے کہ اللہ کے کلام میں لف ہے اور رسولؐ کے کلام میں نشر ہے۔ یعنی وہی ترتیب اور وہ دونوں مل کر لف ونشر مرتب ہوئے۔

اسی سلسلہ میں اللہ کے کلام کے الفاظ، اسی سلسلہ سے رسولؐ کے ساتھ افراد۔ وہاں سب سے پہلے "اَبْنَاءَنَا" ہے تو یہاں سب سے پہلے حسنؑ وحسینؑ رسولؐ کے ساتھ آگے آگے ہیں۔ وہاں اس کے بعد ہے "نِسَائَنَا"، یہاں حضرت خاتونِ جنت فاطمہؑ کے عقب میں ہیں۔ وہاں سب سے آخر میں ہے "اَنْفُسَنَا" تو یہاں لڑائیوں میں جو سب سے آگے ہوتا تھا، وہ یہاں سب سے پیچھے۔ وہاں "اَنْفُسَنَا" سب سے آخر میں ہے تو یہاں سب سے عقب میں حضرت امیر المومنینؑ سب سے آخر میں ہیں۔ افراد تو بدل نہیں سکتے تھے، نہ الفاظ تبدیل کئے جاسکتے تھے۔ قرآن کے الفاظ بھی معین، رسولؐ کے ساتھ کے افراد بھی معین۔

وہ علماء جن کو ایسی آیتوں میں زورِ علم صرف کرنے سے دلچسپی ہے، تو اب وہ "ابناءنا" کا کیا کریں؟ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں۔ تو اب وہ ان میں سے کسی کو بیٹا بنائیں تو وہاں علم کا بس کچھ نہیں چلا۔ اس کے بعد "نسائنا"۔ اب یہ عورت کے بنا دیں؟ وہاں بھی کچھ امکان نہیں ہے تو پوری طاقت علم کی "اَنْفُسَنَا" پر صرف ہوگئی۔ اب زورِ علم نے کیا کام دکھایا کہ کہا کہ: ارے خود رسول بھی تو ہیں۔ اب اور تلاش کی کیا ضرورت ہے؟ بس رسول خود۔ گویا فیصلہ ہوگیا۔ مطلب نکل آیا۔ مگر پہلے عربی دان طبقہ تو کیا، اُردو دان طبقہ فیصلہ کردے کہ کہا جارہا ہے ہم بلائیں۔ تو کیا آدمی خود اپنے کو بلاتا ہے؟ اور بلاتا بھی تو سب سے آخر میں۔ پہلے بیٹوں کو بلائے، پھر نسائنا کو بلائے، پھر بیچارہ اپنے کو بلائے۔ تو کلامِ الٰہی کی منزل سے ہٹ کر کہاں پہنچ جائے گا اپنی خود غرضیوں کی وجہ سے؟

پھر اس کے بعد ایک سوال ان لوگوں سے کہ میں نے کہا کہ شخصیات تو مقرر ہیں، ان میں نہ تو کوئی بڑھایا جاسکتا ہے، نہ گھٹایا جاسکتا ہے۔ اب آپ نے الفاظ کا بٹوارہ کردیا۔ اَبْنَائَنَا تو ہوگئے مجبوراً حسنؑ وحسینؑ۔ اس میں آپ کچھ نہیں کرسکے۔ نسائَنَا ہوگئیں حضرت فاطمہؑ۔ اس میں آپ کا کوئی بس نہیں چلا۔ اب اَنْفُسَنَا کو آپ نے کہہ دیا خود رسول اللہ۔ تو میرا بس ایک سوال ہے کہ پھر علیؑ کس لفظ کی بناء پر آئے ہیں؟

تو بہرحال یہ حقیقت شبہ سے بالاتر ہے کہ اَنْفُسَنَا سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔ اب وہ دو آیات ہوگئیں اور حدیث بھی ہوگئی۔ تو ان سب سے پتہ چلا کہ ان کو نفس کہا۔ نفس کی خصوصیات عرض کی تھیں۔ تو انہیں دیکھئے۔ جب تک اپنا ہاتھ کہا، ہاتھ کے کام اپنے بنے۔ جب تک اپنی زبان کہا، اس وقت تک اقوال اپنے بنے۔ جب تک اپنا کان کہا، اس وقت سامع اپنا بنا۔ جب تک اپنی آنکھ کہا، نگاہ اپنی بنی لیکن جب نفس کہہ دیا تو جتنے افعال ان کے ہیں، جتنے اقوال ان کے ہیں، وہ سب اقوال وافعال خدا اور رسولؐ کے اقوال وافعال ہوگئے۔ ان کا ہر کام اب اللہ کا کام ہوگیا۔ اب اسی ایک حدیث کے اور مفہوم اسی پر مبنی ہیں۔ وہ متفق علیہ حدیث ایسی کہ وہ صحاح ستہ اور صحاح ستہ

میں سب سے مستند صحیح بخاری اور اس میں موجود کہ:

"یَا عَلِیُّ حَرْبُکَ حَرْبِیْ سِلْمُکَ سِلْمِیْ"

اب لفظی ترجمہ پہلے کردوں کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یا علیؑ! تمہاری جنگ میری جنگ۔ اور وہ ترجمہ غلط ہے، تمہاری صلح، تمہارا عدم جنگ میرا عدم جنگ۔ اب میں نے کہا مجبوراً یہاں لفظی ترجمہ کرنا پڑا۔ تشریح نہیں ہوسکتی کیونکہ حرب و سلم دونوں ہیں۔ مصدر اور مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے، کبھی مفعول کی طرف۔ اس کی ہمارے ہاں بھی مثال ہے، مثلاً مارنا مصدر اور مار حاصل مصدر۔ ہمارے ہاں اس کے دو استعمال ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ اپنے دوست کے ہاں گئے، وہ اپنے بچے کو مار رہے تھے اور ایسی بیدردی سے مار رہے تھے کہ آپ سے رُکا نہیں گیا۔ آپ فوراً صاحب سلامت کر کے واپس چلے آئے۔ دوسرے دن وہ ملے، انہوں نے کہا کہ بھئی آپ آئے اور فوراً واپس چلے گئے، ٹھہرے بھی نہیں۔ آپ نے کہا کہ تمہاری مار سے مجھے ایسی اذیت ہوئی کہ مجھ سے ٹھہرا نہیں گیا۔ کیا مطلب؟ تمہاری مار سے یعنی تم جو مار رہے تھے، تو یہ اضافت ہے فاعل کی طرف، مارنے والے کی طرف۔

اگر خدانخواستہ دوست نہیں، آپ کے کوئی شناسا۔ راستہ میں کسی نے انہیں زدوکوب کیا، آپ نے سنا تو بہت افسوس ہوا۔ وہ آپ سے ملے تو آپ نے کہا کہ تمہاری مار کا واقعہ میں نے سنا، بڑی تکلیف ہوئی۔ اب یہ تمہاری مار کے معنی کیا ہیں؟ یعنی تم پر جو مار پڑی۔ وہ اضافت فاعل کے جملوں کی۔ اب رسولؐ کے الفاظ کیا ہیں؟ "حربک" تمہاری جنگ۔ اور جنگ مصدر ہے۔ تو دو ہی صورتیں ہیں، یا اضافت فاعل کی طرف یا مفعول کی طرف ہے۔ اب فاعل کی طرف اضافت ہے یہ معنی ہوں گے کہ یا علیؑ! تمہاری جنگ یعنی جس جس سے تم جنگ کرو تو ایسا ہے جیسے میں نے جنگ کی۔ جس جس سے جنگ کرو، اُسے دنیا منظور کرے۔ یا اضافت مفعول کی طرف ہوگی تو معنی ہوں گے کہ جو تم سے جنگ کرے، وہ ایسا ہے جیسے مجھ سے جنگ کی۔ یا اُسے پسند کردیا، اسے پسند کرو۔

ایک اصول پر قائم ہوجاؤ۔ پھر شخصیات نہ دیکھنا کہ کون کون لڑ رہا ہے۔ رسولؐ نے کوئی نئی حدیث نہیں فرمائی۔ حقیقت میں بالکل وہی ہے جو اس قرآن مجید کی آیت کا تقاضا ہے۔ قرآن مجید کی آیت کے معنی بنتے ہی نہیں جب تک یہ نہ سمجھیں کہ ان کی جنگ رسولؐ کی جنگ۔ جبھی تو اس نے کہا تھا کہ تم خود جنگ کرو۔ تمہارے نفس کو تکلیف دی جاتی ہے اور اب علیؑ نے جنگ کی ہر جگہ۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ نفس رسولؐ ہیں کہ ان کے جنگ کرنے سے رسولؐ کو سبکدوشی ہوئی یعنی فریضۂ الٰہی جو رسولؐ کا تھا، اس کی تکمیل ان کے ہاتھ سے ہوئی۔ تو وہی تو ہوا کہ ان کی جنگ رسولؐ کی جنگ۔ وہی رسولؐ فرما رہے ہیں کہ تمہاری جنگ میری جنگ۔ بس اس کی قید نہیں ہے کہ میری زندگی میں یا میرے بعد۔

اب وہ خصوصیت جو نفس کی تھی کہ میں نے کہا کہ اعضاء کی منزل میں افعال الگ الگ ہوتے ہیں اور نفس کی منزل میں وہ سب سمٹ کر ایک ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کو اپنا نفس کہہ دیا تو ہر بات جو ان کی ہو، وہ رسولؐ کی بات ہے۔ کام ان کا رسولؐ کا عمل۔ تو یہ نتیجہ نفس ہونے کا اور اس کے بعد اب دوسری چیز، وہ یہ ہے کہ ہاتھ اور اعضاء سے جو کام ہوں، وہ سب کے سب مختلف ہوتے ہیں اور نفس کی جو طاقت ہو، وہ قائم رہتی ہے۔ تو اب اگر زبان کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جو تم نے کہا، وہ میرا قول ہے۔ جب تک اپنی آنکھ کہا تو اس کا

مطلب ہے کہ جو تمہاری آنکھ نے دیکھا، وہ میری آنکھ نے دیکھا۔ اسی طرح ہر کام۔ لیکن جب نفس کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو جو کام میں نے نہ بھی کئے ہوں اور تم انجام دو تو تم میرے نفس ہو۔ تو وہ تمہارے سب کام جو نہیں بھی ہوئے، خواہ تم نے نہیں کئے یا میں نے نہیں کئے، نہ ان میں عمل میں لانے کی شرط، وہ سب میرے ہیں اور ملکے راسخ ہوتے ہیں، منتظر سبب نہیں ہوتے۔ یعنی شجاعت یہی نہیں ہے کہ میدان میں تلوار اٹھائیں، تب شجاع۔ جی نہیں۔ جو شجاعت خیبر میں ہے، وہی پچیس برس کی خاموشی میں ہے۔ اس وقت قتل کر رہے تھے، وہ کام اب نہیں ہو رہا کہ قتل کریں کسی مفادِ اسلامی سے لیکن شجاعت میں فرق نہیں ہے۔ کوئی حیرت سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسے شجاع ہیں تو خاموش کیوں ہیں؟ شجاعت عمل کا نام نہیں ہے۔ شجاعت نفس کی طاقت کا نام ہے۔ عمل میں آنا بہ اعتبار مصالح ہوتا ہے اور ملکہ نفس کی طاقت ہوتی ہے جو نفس میں راسخ ہوتی ہے۔

تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ملکات منتظر سبب نہیں ہوتے۔ چاہے کوئی سوال کرے یا نہ کرے، علم ہے۔ چاہے لڑنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لڑنا مناسب ہو یا نامناسب۔ شجاعت جس کا نام ہے، وہ نفس میں راسخ ہے۔ اب اسکے بعد ایک اور نتیجہ نکلا کہ جب تک کہا تھا زبان اور ہاتھ، تو وقوع میں آئی ہوئی باتیں سب رسولؐ کی ہوئیں۔ اب جن شخصیات کو نفس کہہ دیا ہو، تو ملکات نفس رسولؐ میں آ گئے۔ یعنی اب ان میں یہ ہی نہیں دیکھنا کہ رسولؐ نے کیا کیا؟ اب ہم ان کے عمل سے دیکھ سکتے ہیں کہ رسولؐ ہوتے تو کیا کرتے؟

اب 50ھ میں جو صلح کرے تو سمجھ لیجئے کہ رسولؐ ہوتے تو صلح کر لیتے۔ 61ھ میں جو تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ رسولؐ ہوتے تو تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے۔ افعال تو بتقاضائے مصالح و اسباب ہوتے ہیں۔ نفس کا ملکہ ہر حال میں ایک رہتا ہے۔ اب جسے نفس بنایا، تو تزکیہ نفس کا تعلق نفس سے ہے اور کوئی صفت دوسرے میں نہیں پہنچائی جا سکتی، جب تک خود اپنے میں نہ ہو۔

کل یہ عرض کیا ہے کہ نفوس کے تزکیہ کا ان سے متعلق کرنا بھی ایک طرح کی آیہ تطہیر ہے۔ یعنی ان کا نفس اتنا پاکیزہ ہے کہ یہ دوسروں کو اس پاکیزگی کا فیض پہنچا سکتے ہیں اور دوسروں کے نفوس کو پاک کرنا ان کے ذمہ ہے۔ تو اب جسے رسولؐ نے اپنا نفس کہہ دیا ہو، تو ماننا پڑے گا کہ جو پاکیزگی پیغمبرؐ کے نفس میں تھی، وہی پاکیزگی اب اس نفس میں ہے۔ تو اب تزکیہ نفوس کا کام جو پیغمبرؐ انجام دے رہے تھے، وہ نفس کہنے سے ان سے متعلق ہو گیا۔ چونکہ یہ نفس رسولؐ ہیں اور تزکیہ کا تعلق نفوس سے ہوتا ہے، لہٰذا اب یہی نفس وہ ہو سکتا ہے جو رسولؐ کی جانب سے تزکیہ نفوس کا ذمہ دار ہو۔

اس کے بعد ''يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ''، میں نے کہا تھا کہ یہ ہے تو ایک جملہ لیکن دراصل دو کام ہیں۔ ایک کتاب کی تعلیم اور ایک حکمت کی تعلیم اب میرے پیش نظر دو احادیث ہیں اور دونوں متفق علیہ۔ پہلی حدیث تو بہت معروف ہے کہ اس نے علم الکتاب کا ان کو مرکز بنایا تھا۔ تو رسولؐ نے فرمایا کہ:

''اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا''۔

''میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ ہیں''۔

اور تتمہ یہ ہے کہ:

"مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَأْتِ مِنْ بَابِهَا"۔

جو علم چاہے، وہ دروازہ پر آئے یعنی اسے چھوڑ کر علم الکتاب نہیں ملے گا۔ تو یہ حدیث تو بہت مشہور و معروف وہ چوتھا جزو جو تھا حکمت کی تعلیم کا، اس کے لئے پیغمبر خدا نے ارشاد فرمایا:

"اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا"۔

"میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں"۔

کیا کہنا بلاغتِ رسول کا! خود فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے ضاد کے حرف کے ساتھ کلام کیا ہے، ان میں فصیح ترین میں ہوں۔ ضاد کا تلفظ عرب سے مخصوص ہے۔ تو یہ افصح العرب ہیں، انکا ارشاد ہے۔ اب ہر ایک غور کرے کہ کیا بلاغت اس میں مضمر ہے۔ ظاہری مفہوم جو ہو، وہ معنی ہوتے ہیں۔ حکمت میں نے عرض کیا اسرار و رموز کتاب ہیں، وہ تہہ کے اندر ہیں۔ شہر بیرونی چیز ہے اور گھر اندرونی چیز ہے۔ یعنی جو شہر تک پہنچ گیا ہے، ضروری نہیں ہے کہ وہ گھر تک پہنچ گیا ہے۔ مگر جو گھر تک پہنچا تو شہر میں پہلے پہنچ چکا ہے۔ اگر شہر میں نہ پہنچتا تو گھر تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب بلاغتِ پیغمبرؐ یہ ہے کہ علم معنی کتاب، وہ ظاہری چیز ہے تو اس کیلئے شہر کہا: "اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا"، میں علم کا شہر ہوں۔ اور حکمت جو اندرونی اسرار کا نام ہے، اس کیلئے گھر کہا کہ میں حکمت کا گھر ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر شہر میں داخل ہونا چاہتے ہو تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے اور گھر میں جانا چاہتے ہو، تب بھی بغیر علیؑ کے نہیں آسکتے۔

تو جو جو کام رسولؐ کے ذمہ تھے، وہ آپؐ نے ایک فرد کے سپرد کر دیئے۔ قرآن اس کے سپرد کیا، تزکیہ نفوس اس کے سپرد کیا، علم الکتاب اس کے سپرد کیا۔ علم الحکمت اس کے سپرد کیا۔ اب کوئی پانچواں کام آپ بتائیے، اس کی وجہ سے جانشین سمجھ لیں۔

اب میں نے حقیقت میں جتنی احادیث پیش کیں، وہ ہیں تو ایک ذات کے بارے میں لیکن دراصل ایک ذات کے ذریعہ سے رسولؐ ایک پورے نظام کی زمامِ کار علیؑ کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں کہ بس جو فکر و نظر کے چوراہے ہوں، جانشینی کے باب میں، اس میں بس علیؑ تک پہنچ جاؤ تو سب تک پہنچ جاؤ گے۔ اس لئے پورے سلسلہ کیلئے بھی ایک حدیث ارشاد فرمائی جو اس حقیقت کی مظہر ہے، وہ متفق علیہ حدیث:

"اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ"۔

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے، قیامت تک کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ ہر صاحب فکر غور کرے، ہر صاحب فہم سوچے کہ پیغمبرؐ نے یہ اعلان جو فرمایا ہے۔ میں کہوں گا کہ یہ میں بھی مانتا ہوں کہ یہ دو چیزوں کا اعلان ہے مگر یہ اصل اعلان کس چیز کا ہے؟ دو چیزوں میں سے ایک تو کتاب اللہ ہے یعنی قرآن۔

میں کہتا ہوں کہ کیا یہ قرآن رسولؐ کی زندگی میں واجب العمل نہیں ہے؟ وہ اسے بعد کے لئے کہاں چھوڑ رہے ہیں؟ وہ تو اس وقت بھی ہے مگر اس وقت قرآن کے ساتھ خود رسولؐ ہیں۔ یعنی اس وقت بھی دو چیزیں ہیں۔ ایک قرآن اور ایک خود رسولؐ۔ اب قرآن دنیا سے نہیں اٹھ رہا ہے مگر پیغمبرؐ اپنی ظاہری زندگی کے ساتھ، اپنی حیاتِ عنصری کے ساتھ دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں۔

تو اب پیغمبرؐ نے جو اعلان کیا ہے، وہ قرآن کا کیا اعلان ہے؟ اب قرآن کے ساتھ جس کیلئے کہا ہے، اصل اعلان اس کیلئے ہے۔ گویا رسولؐ یوں فرما رہے ہیں کہ "اَیُّهَا النَّاس"، ابھی تک تو میں تھا اور قرآن۔ کل جب میں نہ ہوں تو پھر میرے اہلِ بیتؑ ہیں اور قرآن۔ اب بتائیے رسولؐ کی جگہ پر کون ہوا؟

قرآن کا ساتھی بدل رہا ہے۔ گویا رسولؐ فرما رہے ہیں کہ جیسے اس وقت قرآن اکیلا نہیں ہے، اس کے ساتھ میں ہوں۔ اسی طرح میرے بعد بھی قرآن کو اکیلا نہ سمجھنا۔ میرے اہلِ بیتؑ قرآن کے ساتھ ہوں گے۔ اب دنیا نے سمجھ لیا کہ ان دو کو چھوڑا ہے اور ذمہ داری لی ہے قیامت تک کی۔ اس لئے جیسے دنیا کو کد ہوگئی کہ اس دوسرے کو ہم رہنے ہی نہیں دیں گے۔ آپؐ نے کہا کہ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے، جب تک یہ ہے، وہ بھی رہے گا۔ رہنے دینا یا نہ دینا ہمارا کام ہے۔ ہم رہنے ہی نہیں دیں گے۔ اس لئے جو آیا، اُسے راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ دنیا کہتی ہے کہ ہم نے کسی کو اتنی مدت زندہ رہتے نہیں دیکھا۔

میں کہتا ہوں کہ آپ نے کیا، میں نے بھی نہیں دیکھا مگر مجھے دنیا سے مطلب نہیں، جس سلسلہ میں میری گفتگو ہے، اسی سلسلہ کے کسی فرد کو میں نے مرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خارجی حملوں نے کام کیا۔ زہر یا تلوار، کسی ایک کو بھی تو میں نے ان میں سے اپنی موت سے دنیا سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دنیا کو کد ہے کہ ہم نہیں رہنے دیں گے۔ گویا واجب اور ممکن میں مقابل ہے۔ واجب کی طرف سے ضمانت کہ یہ رہیں گے۔ رسولؐ اسی کے ترجمان تو ہیں اور ممکن بندوں کی یہ کوشش کہ ہم رہنے نہیں دیں گے۔ تو جب تک اس کے مقصد کا انحصار نہ ہو جائے، وہ حربوں کو کارگر ہونے کب دے گا؟ اسے نہیں رہنے دیا، ابھی میرے پاس اور ہے۔ اسے نہیں رہنے دیا، ابھی ہمارے پاس اور ہے، اس لئے کہ اور ہے، اس میں سن و سال کی قید نہیں۔ جب گہوارہ کا بچہ یہ اعلان کر سکتا ہے کہ میں نبی ہوں تو دین کا کوئی رہنما!

اس کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن جب اللہ کے مقرر کردہ نظام بقا و فنا کا انحصار کسی ایک فرد کی فنا و بقا پر ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی بقا و فنا میں خدا کی فتح و شکست کا سوال ہے کہ اگر یہ ہے تو خدا کی بات پوری ہوئی اور اگر یہ نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا (معاذ اللہ) شکست کھا گیا۔ جب ایسا موقع ہوگیا تو پھر اللہ نے اپنے انتظام سے اس کی حفاظت کی۔ اب اس کی طرف سے مقرر کردہ نظام میں جو فرد یہاں پر ہے، اس فرد کی حفاظت کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لہٰذا پوری طاقت صرف ہوگئی تھی کربلا میں کہ کربلا میں وہ نظام درہم برہم کر دیا جائے لیکن خدا کو جسے رکھنا تھا، اُس کیلئے حفاظت کا سامان اپنی طرف سے کیا۔

میرا ایمان ہے کہ مرض کی مجال نہیں تھی کہ کبھی ان ہستیوں کو بے ہوش کر سکے۔ یہ خالق کا نظام اور اُس کا ارادۂ خاص تھا کہ اب جس ہستی کو باقی رکھا ہے، اسے دن بھر غشی میں رکھا۔ یہ عام صحت کے عالم میں ہوں اور نصرتِ امامؑ نہ کریں، یہ انؑ کے کردار کی بلندی

کے خلاف ہے۔ پھر ان کا معیار عصمت ختم ہو جاتا اور اگر یہ باقی نہ رہی تو خالق کی طرف کا مقرر کردہ نظام، جو جس جگہ کی کڑی ہے، وہ کڑی اُسی جگہ پر رہے۔ تب اس کا نظام محفوظ ہو۔ صادق کی بات ہے کہ بارہ ہوں گے۔ اب اگر پانچواں دو چار برس کا ہے بھی، تو اس پانچویں کے ہونے سے جو اس سلسلہ کا مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہوگا۔ اس جگہ جو کڑی ہے، اس کو رہنا چاہیے ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ صادق کی خبر غلط ہوگئی۔ بارہ کی بجائے گیارہ ہوگئے۔ لہٰذا اسے اس فرد کو رکھنا ہے، جسے صاحب منصب بنایا ہے۔

30

وسیلہ

پیغمبر اکرم کسی مسلمان کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ دیکھو! اصول دین یہ ہیں، انہیں یاد کرو اور فروع دین یہ ہیں، انہیں یاد کرو بلکہ آپ فرماتے تھے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاؤ اور نماز پڑھو یعنی ایک پیغام صلوٰۃ۔

جب تک حالات پرسکون ہیں، تب تک شاخیں نظر آ رہی ہیں اور ادھر کوئی وقت کے خطرہ کا تیز جھکڑ چلا تو بس تمام شیرازہ بکھر جائے گا۔ کوئی شاخ کہیں ہوگی، کوئی کہیں ہوگی۔

ارسطو نے جو منطق ایجاد کی ہے، اس کا دوسرا نام علم المیزان یعنی ترازو کا علم ہے۔ کونسی ترازو ہے یہاں؟ یہاں الفاظ نہیں ہیں بلکہ حقائق کو تولنا ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔

علیؑ نے نبیؐ کی رسالت کا وزن محسوس کیا اور نبیؐ نے علیؑ کی ایک ضرب کا وزن ایسا محسوس کیا کہ تول کر بتا دیا۔

جب اعمال تولے جا رہے ہیں تو اعمال تولنے کیلئے نہ وہ ٹال کر ترازو کام دے گی، نہ عطار کے ہاں کا کانٹا کام دے گا، نہ وہ شعرائے کرام کے بحروں کے ناپنے کے اوزان کام دیں گے، نہ ارسطو کی صغریٰ کبریٰ کام دے گی۔

یہاں ایسے انسان کامل چاہئیں جن کا عمل ترازو بن سکے۔

وسیلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَةَ

ارشادِ حضرت احدیت ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ "اَلَیْہِ" ضمیر ہے "اس کی طرف"۔ وہ کون ہے؟ اللہ۔ اس کی جانب وسیلہ تلاش کرو۔ طلبگار ہو۔ وسیلہ کون شے ہوتی ہے؟ جو کسی کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہو۔ اس کام کا وسیلہ یہ ہے یعنی یہ کام اس ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ اس شہر کا وسیلہ وہ سواری ہے جو اس شہر تک پہنچا سکے۔ کوئی پوچھے کہ وہاں پہنچنے کا کیا وسیلہ ہے؟ تو آپ بتایئے گا کہ وہاں تک یہ سواری جاسکتی ہے۔ یہ پہنچادے گی۔ تو جو شے جس قسم کی ہو، اُس کا وسیلہ اسی قسم کا ہوسکتا ہے۔ پھر وہ وسیلہ کس کا ہوگا؟ یہ اُس شے سے جو چیز متعلق ہو اس کے حصول کا وسیلہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی منزل ہے تو چونکہ وہ ایک ظرف مکان ہے، ایک جگہ ہے تو وسیلہ اس کا کوئی جسمانی ہوگا جو اپنی جنبش اور حرکت کے ساتھ آپ کو اس جگہ تک پہنچادے۔ کسی غذا کو پوچھئے کہ اس غذا کا وسیلہ کیا ہے تو غذا سے متعلق کھانا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ کھانے کیلئے یہ کیونکر مل سکتی ہے۔ کوئی کام انجام پاتا ہے، یہاں کیا ہے خدا کی طرف وسیلہ۔ تو خدا نہ ظرف مکان میں مقید ہے، نہ ظرف زمان میں مقید ہے۔ تو وسیلہ اس کا اب کوئی مرکب نہیں ہوسکتا۔ سواری جو اس تک پہنچا سکے۔

وہ تو اس وقت ہو جب وہ کسی محل میں، کسی مکان میں ہو تو پھر مسافت طے کرنے کیلئے سواری درکار ہوگی کہ وہ اس تک پہنچا سکے۔ کعبہ تک پہنچنے کا ذریعہ تو سواریاں ہوں گی مگر خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سواریاں نہیں ہوں گی۔ ہزار دفعہ ممکن ہے کہ کعبے پہنچ جائے۔ مگر خدا تک ایک دفعہ بھی نہ پہنچ سکے۔

اسی طرح سے فرض کیجئے غذا کا وسیلہ جو ہوگا، اس کا مقصد کھانا ہوگا۔ تو اس کی طرف پہنچنے کیلئے نہ کوئی سواری ہوسکتی ہے جو لے جائے، پھر اللہ تک پہنچ کر ہمارا کام اس کی ذات سے کوئی متعلق ہوسکتا ہے۔ نہ وہ اوڑھنے کی چیز ہے، نہ بچھانے کی چیز ہے۔ کوئی ہمارا مقصد اس سے وابستہ نہیں ہے کہ وہ مقصد ہمارا اس طرح سے حاصل ہو۔ تو اب اللہ کی طرف وسیلہ، یعنی اللہ سے متعلق کوئی چیز ماننا پڑے گی جس کا یہ وسیلہ ہو۔ مثلاً رضائے الٰہی کا وسیلہ، خود اس کی ذات کی طرف کیونکر رسائی ہوگی؟ تو اس کی طرف وسیلہ کا مطلب ہوا اُس کی رضا کا وسیلہ۔ اس کے راضی رکھنے اور اپنے سے خوشنود بنانے کا وسیلہ کیا ہے؟ اگر ہم کہیں کہ اس کے قرب کا وسیلہ تو وہ جب کسی مسافت پر نہیں ہے تو اس کا قرب کیسا؟ وہاں ہمیں قربۃً الی اللہ کی تشریح کرنا پڑے گی کہ قربۃً الی اللہ کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ اللہ کی طرف نزدیک ہونے۔ یعنی کیا ایک نماز سے پہلے ہم دس میل دور تھے اور نماز کے بعد ایک میل اُدھر چلے جائیں گے۔ یا وہ اپنے محل سے معاذ اللہ) ایک میل اِدھر آ جائے گا؟

تو قربۃً الی اللہ کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح کی ضرورت ہوگی۔ اب قرب الٰہی کے وسیلہ کا کیا مطلب؟ وہ بھی نتیجہ کے طور پر وہی

کہ رضائے الٰہی کا ذریعہ۔ اسی کو کہیں گے اس کی طرف کا وسیلہ۔ معلوم ہوا کہ بغیر وسیلہ کے اس کی رضا نہیں ملے گی۔ اگر اس کی تعبیر قرب سے کی جائے تو بغیر اس کے کہ وسیلہ کے قرب کے نہیں ملے گا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کی طرف وسیلہ اختیار کرو۔ تو جب ہم غور کرتے ہیں تو اصل وسیلہ تو وہ ہے جس کو اُس نے اپنی طرف سے اپنی رضا کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ ایمان وعمل ہے۔

ایمان وعملِ صالح کے بارے میں اُس نے کہا کہ جو ایسا کرتے ہیں، میں اُن سے راضی ہوتا ہوں۔ میں انہیں اجر وثواب دیتا ہوں۔ جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو کہیں ہمیں تنہا ایمان پر جنّ کا وعدہ نہیں ملتا۔ ہر جگہ ایمان اور عملِ صالح۔ کبھی حرفِ عطف کے طور پر کہ:

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

"جو ایمان لائے اور جنھوں نے عملِ صالح کیا"۔

اسی عملِ صالح کی تعبیریں مختلف ہیں۔ کہیں "اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا"، ایمان لائیں اور پرہیز گار رہیں، کہیں "اٰمَنُوْا وَاَحْسَنُوْا"، ایمان لائیں۔ اس "اَحْسَنُوْا" پر ہمارے اُردو دان طبقے کو بڑی دشواری ہوتی ہے اور وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض الفاظ اُردو میں معنی بدل کر آ گئے ہیں۔ عربی میں اس کے کچھ اور معنی ہیں۔ لیکن اُردو میں لفظ وہی ہے اور اس کے معنی کچھ اور ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ احسان کا لفظ ایسا ہے کہ ہم جب لفظِ احسان کہتے ہیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو عربی میں لفظ احسان کا ہے۔ اس لئے جب ہم عربی میں لفظِ احسان دیکھتے ہیں تو ہم اسے اپنے مفہوم پر ڈھالتے ہیں۔ ہمارے ہاں احسان ایک بارِ منت کا ثبوت دیتا ہے۔ یعنی کسی کے ساتھ بلا استحقاق کوئی سلوک کیا جائے تو اُسے ہم کہیں گے احسان۔ مثلاً کسی صاحب پر آپ کا قرضہ ہو اور وہ قرضہ جو آپ کا مطالبہ تھا، وہ لا کر آپ کو دے دیں۔ آپ کہیں گے کہ آجکل مجھ کو بڑی ضرورت تھی، آپ نے بڑا احسان کیا۔ وہ کہیں گے کہ احسان کیسا، وہ تو آپ کا مطالبہ تھا میرے ذمہ۔

تو انہوں نے یہ کیوں کہا کہ احسان کیسا؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ احسان وہ ہے جو بلا حق ہو۔ جو قرض کا ادا کرنا ہو، وہ احسان نہیں ہوتا۔ لیکن اب ہم ذاکرین سے ایک حدیث سنا کرتے ہیں، اس کا ترجمہ بھی وہ لفظِ احسان سے کر دیتے ہیں، تو ہم غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں:

"مَنْ بَكٰى عَلَى الْحُسَيْنِ اَحْسَنَ بِالنَّبِيِّ وَفَاطِمَةَ"۔

میں تو اس ترجمے کو (معاذ اللہ) کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس نے گریہ کیا، اُس نے (معاذ اللہ) رسولؐ اور فاطمہؑ پر احسان کیا۔

کیا میرے کہنے کے بعد آپ کا ضمیر گوارہ کرتا ہے کہ احسان کریں گے؟ ہم گریہ کریں عمر بھر اور اس سے بڑھ کر خون کے آنسو روئیں تو ان کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ہم یہ تصور کریں کہ ہم احسان کریں گے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ

تمہارے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ عبادت تو اس کے سوا کسی اور کی نہ کرو مگر ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔

اب احسان کے لفظ سے وہی معنی پیدا ہو گئے کہ ان ماں باپ کے ساتھ جو کریں گے، وہ ہمارا احسان ہوگا۔ حقیقت میں یہ ہماری اُردو زبان کے لفظ کی کوتاہی ہے۔ عربی زبان کے معنی میں احسان کے معنی ہیں حسن عمل۔ یعنی جو فرض ہے، وہ ادا کرنا احسان ہے۔

اس لئے جو لفظ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے معنی ہیں، وہی لفظ "اَحْسَنُوْا" کے معنی ہیں۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ"۔

اللہ نہیں ضائع کرتا اجر حسن عمل رکھنے والوں کا۔

لوگ ایسے جملے وہاں صرف کرتے ہیں جیسے چندہ کہیں مانگا جا رہا ہو تو وہاں صرف کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

درحقیقت ان کے ذہن میں وہی اردو والا احسان ہوتا ہے۔ تو عربی میں احسان کے معنی ہیں حسن عمل سے کام لینا۔ تو کہیں پر "اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا"، کہیں پر "اٰمَنُوْا وَاَحْسَنُوْا" کہیں پر بطور قید کہ:

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔

"جو ایمان لائے اور حسن عمل کیا"۔

کہیں پر عمل صالح کے ساتھ ایمان کی قید، کہیں پر ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ جو بھی:

"مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى"۔

مرد یا عورت ایمان لائے گا۔

"وَهُوَ مُحْسِنٌ"

درآں حالیکہ حسن عمل کرے گا۔

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى"۔

جو عمل صالح کرے مرد یا عورت، درآں حالیکہ وہ مؤمن ہو۔

تو یہاں اصل سرنامہ اجر عمل صالح اور ایمان بطور قید اور کہیں پر یوں کہ:

"بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ"۔

جو مسلمان ہو سر جھکائے ہوئے اللہ کے سامنے۔

اپنے کوسپرد خدا کئے ہوئے ہو، دین اسلام اختیار کیے ہوئے ہو" وَهُوَ مُحْسِن "، درآں حالیکہ وہ حسن عمل رکھتا ہو۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ساتھ حسن عمل۔ لیکن اب تلاش کر ڈالئے" كَفَرُوْا " کے ساتھ "عَمِلُوا السَّيِّئَات" نہیں ہے۔ اُدھر یہ نہیں کہا گیا کہ جو کفر کرے اور بداعمال ہو، پھر وہ دوزخ میں جائے گا۔ جہاں وعید ہے وہاں کفر کے ساتھ اعمال کا ذکر نہیں ہے۔ جہاں وعدہ ہے یعنی اجر کا اعلان ہے، وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ کفر کے ساتھ تو اعمال پر نظر ہی نہیں ہوتی۔ جب ایمان ہو تو عمل کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ عمل صالح ہے یا نہیں۔

اب ایک اور حقیقت قرآنی ہے جسے آپ قرآن مجید کا شروع سے آخر تک مطالعہ کر کے اور قرآن مجید کی آیات دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔ ایک رسالہ میرا ہے، اس میں سو آیتیں تقریباً اس سلسلہ کی درج ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں جو اجر کا اعلان ہوا ہے، وہ ہمیشہ عمل پر ہوا ہے، ایمان پر نہیں۔ جو ہم اعمال کریں گے، اس کا اجر ملے گا۔ یہ نہیں ہے کہ ایمان کا اجر ملے گا۔ جو اعمال کئے ہیں، اُس کا اجر ہوگا۔ ایمان شرط ہے، حصول اجر ہے، اصل اجر ہے اعمال کا۔

اگر ہم نے شرط پوری کی اور اعمال نہ کئے تو ایسا ہے جیسے وضو کر لیا اور نماز نہیں پڑھی۔ یہ جو اصطلاح ہے اصول دین اور فروع دین کی، یہ درحقیقت اسی واقعیت کا اظہار ہے۔ لوگ اس فروع دین کے لفظ سے بھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ارے نماز وغیرہ تو فروعی چیزیں ہیں۔ گویا فروعی کر کے اس کی اہمیت کو کم کرتے ہیں حالانکہ پیغمبر خدا کے پاس جو کوئی مسلمان ہونے کیلئے آتا تھا تو آپ اسے یہ دو الفاظ میں بتاتے بھی نہیں تھے کہ یہ اصول دین ہیں، یہ فروع دین ہیں۔ یہ ہم بچوں کو سکھاتے ہیں کہ یہ اصول دین ہیں، یہ فروع دین ہیں۔ پیغمبر خدا کسی مسلمان کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ دیکھو! اصول دین یہ ہیں، انہیں یاد کرو اور فروع دین یہ ہیں، انہیں یاد کرو بلکہ آپ فرماتے تھے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لاؤ اور نماز پڑھو یعنی ایک دم پیغام توحید اور پیغام صلوٰۃ۔

اس وقت اس کو یہ فرق سمجھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ یہ حقیقت میں علماء کی قائم کی ہوئی اصطلاح ہے اصول دین اور فروع دین۔ نہ قرآن میں یہ امتیاز ہے، نہ احادیث میں۔ یہ ایک حقیقت کے اظہار کیلئے ہے جس کو نظر انداز کر کے لوگ اہم اور غیر اہم کے فرق میں اس کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ اہم ہیں اصول دین اور یہ بیچارے فروع دین ہیں۔ یہ بیچارے پن کیلئے فروع دین کی اصطلاح نہیں تھی۔ یہ حقیقت کے اظہار کیلئے تھی۔ وہ اس لئے تھی کہ اصول دین کے معنی دین کی جڑیں اور فروع دین کے معنی دین کی شاخیں۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ اصول یعنی جڑیں نظروں کو دکھائی نہیں دیتیں، وہ اندر اندر پھیلتی ہیں۔ جو نظر آتی ہیں، وہ شاخیں ہوتی ہیں اور وہ وابستہ ہوتی ہیں ان جڑوں سے اور ان جڑوں کے ذریعہ سے ان تک خونِ حیات پہنچتا ہے۔ وہ سبب ہوتی ہیں اور شاخیں اثر ہوتی ہیں اور وہ سبب جو ہے، وہ اندر اندر ہوتا ہے اور وہ شاخیں باہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح عقائد حق جو معیار ایمان ہیں، وہ دل و دماغ کی تہوں کے اندر پھیلے ہیں اور ان کے آثار ہیں جو اعمال کی صورت میں اعضاء و جوارح سے نمودار ہوتے ہیں۔

تو جڑیں اگر مضبوط ہیں اور زندہ ہیں تو پھر ممکن ہی نہیں ہے کہ شاخیں نہ ہوں۔ وہ ان کا لازمی نتیجہ ہیں اور اگر شاخیں پژمردہ

ہیں اور خشک ہیں یا موجود ہی نہیں ہیں تو سمجھ لیجئے کہ جڑ مردہ ہے۔ جڑ میں زندگی نہیں ہے۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ شاخوں کو پانی میں ڈبونے سے کام نہیں چلے گا، جڑوں میں پانی دینے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح سے اگر اعمالِ صالح مفقود ہیں یا ان کی طرف نظرِ تغافل ہے یا وہ کمزور نظر آتے ہیں تو سمجھنا پڑے گا کہ اصول مستحکم نہیں ہیں۔ دل ودماغ کے اندر وہ تصورات گویا سنے سنائے بس زبان پر ہیں۔ ذہن کے اندر وہ تصوراتِ حقیقی واضح نہیں ہیں۔ اگر واضح اور راسخ ہوتے تو ممکن ہی نہیں تھا کہ شاخیں برآمد نہ ہوں۔ شاخیں نظر نہ آئیں۔

اب جنابِ والا! اگر جڑ مردہ ہے اور اس میں زندگی نہیں ہے تو شاخیں پژمردہ ہوں گی، افسردہ ہوں گی تو پھر ثمر کیا ملے گا؟ ثمر تو شاخوں ہی کے ذریعے سے ملتا ہے اور ان شاخوں کے ذریعہ سے ملتا ہے جو اصل سے وابستہ ہوں اگر اصل خشک ہے تو شاخوں سے ثمر نہیں ملتا۔ فائدہ وقتی نمائشی شاخوں سے بھی حاصل ہو جائے گا۔ رونقِ چمن ہوگی، دیدہ زیبی ہوگی۔ ممکن ہے کہ اگر گھنی شاخیں ہوں تو سایہ بھی ہو جائے، کچھ چھاؤں آرام کا باعث بن جائے مگر ثمر نہیں ملے گا۔ ثمر انہی شاخوں سے ملے گا جو زندہ اصل سے متصل ہوں اور ایک اور خاصہ ہوگا نمائشی شاخوں کا کہ کسی تیز ہوا کے جھکڑ کو برداشت نہیں کر سکیں گی۔ بس جب تک حالات پرسکون ہیں، تب تک شاخیں نظر آ رہی ہیں اور ادھر کوئی وقت کے خطرہ کا تیز جھکڑ چلا تو بس تمام شیرازہ بکھر جائے گا۔ کوئی شاخ کہیں ہوگی، کوئی کہیں ہوگی۔

اگر جڑ ہے، کسی حالت میں، خواہ مردہ ہو، خواہ خشک ہو مگر شاخیں نہیں ہیں تو ثمر پھر بھی نہیں ملے گا۔ مگر اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس جڑ میں زندگی پیدا ہو جائے تو پھر شاخیں نکل آئیں۔ اس لئے مایوسی انہی کو ہوگی جن کی جڑیں نہ ہوں۔ یہی قرآن نے کہا ہے:

"لَا يَيْئَسُ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ اِلَّا الْكَافِرُوْنَ"۔

اللہ کی رحمت سے انہی کو مایوس ہونا چاہئے جو مانتے ہی نہیں ہیں، کافرین ہیں جو حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ جن کی اصل ہے ہی نہیں۔ اصل مایوس انہی کو ہونا چاہئے اور جہاں جڑ ہے، چاہے کچھ بھی ہو، مردہ ہو، بے جان ہو، انہیں بالکل بے آس نہیں ہونا چاہئے۔ انہیں اُمید ہونی چاہئے کہ کسی صورت سے ممکن ہے کہ اس کی تلافی ہو جائے اور اللہ کریم ہے۔ اس نے اسی اُمید کو طاقت دینے کیلئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ معصومؑ نے ارشاد فرمایا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ پوری اصل بات ایک دم سے کہہ دی جائے تو اس کی طرف نظرِ تغافل ہو جاتی ہے، اس لئے حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حقیقت کو جرعہ جرعہ، ایک ایک گھونٹ کر کے پہنچایا جائے۔ تو شروع میں اگر ذہن اُچاٹ بھی ہو جائے سننے والے کا تو دوسرے جملے میں شاید ذہن متوجہ ہو جائے۔ تیسرے جملے میں اور متوجہ ہو جائے۔ اس طرح اصل حقیقت بالکل رائیگاں نہ ہو۔ اس لئے اب معصوم کا کلام ہے، فرماتے ہیں:

"مَنْ تَابَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَنَةٍ قُبِلَتْ تَوْبَتُهٗ"۔

جو اپنی موت سے ایک سال پہلے توبہ کرے، اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، ایک سال سے شروع کیا۔ اب فرماتے ہیں:

"مَنۡ تَابَ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بِشَهۡرٍ قُبِلَتۡ تَوۡبَتُهٗ".

ارے سال بہت ہوتا ہے، جو اپنی موت سے ایک مہینہ پہلے توبہ کرے، اُس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اَلَا اِنَّ الشَّهۡرَ كَثِيۡرٌ مَنۡ تَابَ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بِاُسۡبُوۡعٍ قُبِلَتۡ تَوۡبَتُهٗ".

ارے ایک مہینہ بھی زیادہ ہے، جو اپنی موت سے ایک ہفتہ پہلے توبہ کرے، اس کی توبہ بھی قبول ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا:

"اَلَا اِنَّ اُسۡبُوۡعٍ كَثِيۡرٌ".

ارے ہفتہ بھی بہت ہوتا ہے۔

"مَنۡ تَابَ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بِيَوۡمٍ قُبِلَتۡ تَوۡبَتُهٗ".

جو اپنی موت سے ایک دن پہلے توبہ کرے۔

دیکھئے پہنچ گئی دن تک یہ بات۔ اب فرماتے ہیں:

"اَلَا اِنَّ الۡيَوۡمَ كَثِيۡرٌ".

ارے ایک دن بھی بہت ہے۔

"مَنۡ تَابَ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بِسَاعَةٍ قُبِلَتۡ تَوۡبَتُهٗ".

جو اپنی موت سے ایک ساعت پہلے توبہ کرے،، اس کی توبہ بھی قبول ہو جاتی ہے۔

اب ہمارے سامنے تو انتہا ہو گئی کیونکہ صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ ساعت گھنٹے کے معنی میں نہیں ہے، تھوڑی سی مدت ہے۔ قلیل مدت زمانی کو ساعت کہتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں کہ وہ ساعت بھی بہت ہے۔ بس جب موت بالکل قریب ہو، اس سے پہلے توبہ کرلے تو توبہ قبول ہے۔ اتنی وسعت اس کریم نے توبہ کے بارے میں دی ہے۔ مگر پھر بھی سرمایہ اطمینان نہیں مل سکا۔ اس لئے کہ وہ آخری وقت نہیں بتایا کہ کب آئے گا۔ یہی حکمت تھی موت کے وقت کو پردے میں رکھنے کی اور اس کا کوئی معیار نہ ہونے کی کہ بوڑھے کو موت آئے گی یا جوان کو یا بچے کو۔ اگر کوئی معیار ہوتا تو جوانی اطمینان سے گزارتے کہ بڑھاپا دور ہے۔ لہٰذا کھل کر جتنی چاہیں، بداعمالیاں کرلیں کیونکہ وہ تو اصول ہے کہ بوڑھے کو موت آئے گی۔ جو بچے ہوتے، وہ کہتے ہیں کہ ابھی ہمیں بہت منزلیں طے کرنا ہیں،، ابھی اول بلوغ ہے اور اول بلوغ میں بھی بچہ ہی کہلاتا ہے۔

چاہے بچش خدا بچہ نہ رہے لیکن وہ بھی خود کو بچہ سمجھتا ہے اور دوسرے بھی اُسے بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ وہ بیچارہ روزہ رکھنا چاہتا ہے، تو

بزرگ منع کرتے ہیں کہ ابھی تم بچے ہو، روزہ رکھ کر کیا کرو گے؟ یعنی اس کو اپنے ہاتھوں جنت سے محروم کرتے ہیں۔ درحقیقت جب معیار مقرر نہیں ہے، تو یہی کیفیت ہوگی۔ اگر معیار مقرر رہوتا تو پروان سکون ہوتا ان کیلئے جن کی منزل دور ہے۔ لہٰذا نہ وقت مقرر، نہ عمر مقرر۔ اس لئے کہ ہر وقت اُمید بھی رہے، نا اُمیدی بھی۔ سکون ورجا دونوں رہیں تا کہ قوت عمل زندہ رہے اور اصلاحِ عمل کا جذبہ قائم رہے۔ اس بناء پر جبکہ آخری وقت مقرر نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نفس آخری نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی وہ سانس آخری نہیں ہے۔ خصوصاً اب اس زمانہ میں واقعات اس طرح کے بہت ہونے لگے۔ پہلے تو کبھی کبھی اچانک موت کی خبر سننے میں آتی تھی اور اب تو میں کہتا ہوں کہ رائج الوقت طریقہ موت یہی ہے۔

ایک صاحب ہمارے ہاں سے ایک شادی میں جارہے تھے۔ متعلقین کو انہوں نے گاڑی میں سوار کیا اور خود اس طرح کھڑے ہوئے کہ ایک پیر پائیدان کے اوپر ہے اور ایک نیچے کہ گاڑی چلنے لگے تو سوار ہو جائیں۔ لوگ انہیں رخصت کر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم سے پیغام پہنچ گیا۔ ٹکٹ کہاں کا لیا تھا اور کہاں پہنچ گئے۔ ساتھ والے جو تھے، وہ بھی اُتر پڑے اور ان کی لاش لے کر گھر گئے۔

یہ میں نے ایک مثال عرض کی جو مرنے کی وجہ سے رونے کی ہے اور عبرت کی وجہ سے ہنسی آتی ہے کہ واقعی ٹکٹ کہاں کا لیا اور چلے کہاں گئے!

ایک دوسرا واقعہ، ہمارے ہاں ایک کمشنر تھے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے مگر نام لینے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ غیبت کا کوئی پہلو ہو، لہٰذا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ امرتسر کے بارڈر پر سامان دکھایا، وہ پاس ہو گیا اور وہ بجائے اس سرحد کے دوسری سرحد کو پار کر گئے۔ ان کے ہمراہ ان کی بیوی تھیں، وہ لاش لے کر واپس گئیں۔ تو جب یہ مثالیں آنکھوں کے سامنے ہوں تو کون کہہ سکتا ہے کہ جو سانس آرہا ہے، وہ آخری سانس نہیں ہے۔ تو باوجود انتہائی وسعت کے توبہ کے وقت میں پھر بھی کمی ہے۔ لاعلمی کی وجہ سے۔

تو اگر اصل نہیں ہے تو ثمر کی اُمید نہیں ہوسکتی اور اگر اصل موجود ہے تو ایمان ہے کہ کسی وقت پر اس کا اثر نمودار ہو جائے اور اس کے لئے وسعت پیدا کر دی جائے اور پھر وہی اُمید کو تازہ رکھنے کیلئے اس نے اپنی جانب سے اعلانات کئے۔ نا اُمید نہ ہونے کیلئے کیونکہ نا اُمیدی قوت عمل کو سلب کرتی ہے۔ جب طے ہے کہ دوزخ میں جانا ہے تو کیوں نہ نفسانی خواہشات پوری کر لیں۔ یہ بھی اصلاحِ عمل کیلئے خطرہ ہے۔ اس لئے شفاعت کے اعلانات ہیں۔ اس لئے اپنے فضل و کرم کے اعلانات ہیں۔ اس لئے یہ اعلانات ہیں کہ سوائے کفر و شرک کے ہر چیز ایسی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ بخش دے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

اس سے کمتر کو بخش دیتا ہے۔ اُمید میں وسعت پیدا کی اور "لِمَنْ يَّشَآءُ" کہہ کر جس کو چاہتا ہے، خوف کا دھڑکا لگایا اور کیا اس کا چاہنا بلاوجہ ہوگا؟ نہیں، ہم جانتے ہیں حَكِيْمٌ عَلَى الْاِطْلَاقِ ہے۔ لہٰذا وہ بھی گویا حسن عمل میں حالات دیکھتا ہے۔ عمل کا ماحول اور پس منظر دیکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عمل قلیل ہو اور اس کا اجر عظیم ہو۔ اسی طرح سے بد اعمالی میں بھی۔ اسکے حالات دیکھتے ہیں، اس کی

کیفیات دیکھتی ہیں، اس کے نتائج دیکھتے ہیں۔ اس سب کو دیکھ کر اس نے اجر وثواب کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ سزا کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو کاغذ پر نہیں آسکتی تھی۔ کاغذ پر قانونی طور پر نیکیوں کے نام لکھے جاسکتے تھے اور برائیوں کے نام لکھے جاسکتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ فرشتے بھی نامۂ اعمال میں صرف کاموں کے نام لکھ سکتے ہیں، کاموں کے وزن کو نہیں لکھ سکتے۔ اس کے اظہار کا ذریعہ ہے جس کی تعبیر میزان سے کی گئی ہے کہ قیامت میں اعمال کا وزن ہوگا۔ ارے قانونی طور پر جرائم کے وزن کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے پس منظر، آثار ونتائج کو دیکھنے سے متعلق یہ وزن ہے۔

ہم تو الفاظ سنتے ہیں۔ ان الفاظ سے بے دیکھے حقائق سمجھ میں نہیں آتے۔ آخرت کی چیزیں جو ہیں، وہ بس سچے کہنے والوں کی وجہ سے ہم نے ان کے الفاظ یاد کر لیے ہیں کہ صراط ہوگا، میزان ہوگی۔ لیکن ان کی حقیقت کیا کسی کی سمجھ میں آتی ہے؟ میزان کے معنی ترازو، تو ہم ترازو جو دیکھتے ہیں، اس میں دو پلڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ قیامت میں بھی ایسی ہی ڈنڈیاں ہوں گی اور ایسی ہی ترازو ہوگی اور وہ پلڑے میں رکھے جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ترازو کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہر شے کی ترازو اس کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

حضور! اجسام کی ترازوئیں سب یکساں نہیں، ذرا لکڑی کی ٹال پر جا کر ترازو کو دیکھئے، اس کا قد وقامت ملاحظہ فرمائیے اور کسی عطار کی دوکان پر جا کر، جس پر وہ بہت قیمتی دواؤں کو تولتا ہے، اس ترازو کو دیکھئے اور جوہری کی دوکان پر جا کر دیکھئے۔ وہاں بھی ایک میزان ہے۔ مگر اس موتی کو لے جا کر ٹال کے ترازو پر رکھ دیجئے تو وزن معلوم بھی نہیں ہوگا اور اگر موتی تولنے والے کانٹے پر لکڑیوں کا ڈھیر رکھ دیجئے تو بیچارہ دب کر رہ جائے گا، ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ وہ بھی وزن نہیں بتا سکے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اجسام میں بھی سب یکساں نہیں۔ جو جسم کثیف ہے، اس کی ترازو اور ہے اور جو جسم لطیف ہے، اس کی ترازو اور ہے۔ یہ محاورہ تو ہر شاعر کو معلوم ہوگا کہ مصرع موزوں نہیں ہے یا یہ شعر موزوں ہے۔ موزوں کے معنی تول میں صحیح کے ہیں۔ جو صحیح ہے، وہ موزوں، جو صحیح نہیں ہے، وہ ناموزوں۔ تولنے کو کہتے ہیں وزن۔ وزن کے معنی تولنا۔ کیا ہوتا ہے؟ کوئی ان کے پاس ترازو رکھی ہوتی ہے کہ کاغذ پر شعر کو لکھ کر اس پر رکھ دیتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ وزن اس کا ہے یا نہیں ہے۔

کیوں؟ میزان کے معنی تو ہیں ترازو۔ یہ اپنے پاس ترازو کیوں نہیں رکھتے اور پھر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ موزوں ہے اور یہ ناموزوں ہے۔ بات یہ ہے کہ شعر از قبیل اجسام نہیں ہے۔ شعر از قبیل الفاظ ہے اور چونکہ وہ الفاظ کی جنس کی چیز ہے، لہٰذا کچھ الفاظ مقرر کیے ہیں۔ شعر ان الفاظ کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ جتنی بحریں ہیں عربی کی، مجھے پندرہ معلوم ہیں، فارسی والوں نے اور بڑھائی ہیں اور اُردو والوں نے فارسی والوں کا تتبع کیا ہے۔ اُردو والوں نے اس میں کوئی ایجاد نہیں کی ہے۔ بالکل فارسی والوں کی بحروں کو لے لیا ہے۔

تو جناب! مجھے عربی کی بحریں یاد ہیں۔ ایک وقت میں پندرہ تھیں اور ایک نے اس میں اضافہ کیا تو سولہ ہوگئیں۔ طویل بسیط وافر کامل۔ اب میں اپنے حفظ کا امتحان نہیں دے رہا ہوں۔ بحر میں کتنے وزن ہوتے ہیں؟ یہ سب ایک مستقل فن ہے علم عروض۔ اس کی ایک بحر ہے جس کا وزن ان الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں:

"مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ"۔

لطیفہ گوئی میرا اشعار نہیں ہے مگر کبھی کبھی یاد آ جاتا ہے کوئی لطیفہ۔ ہمارے ہاں لکھنؤ میں کسی نے مصرعہ طرح یہی کہہ دیا:

"مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ"۔

ایک صاحب نے اس پر مصرعہ لگایا کہ کسی صاحب کا طوطا اڑ گیا ہے، پڑھتا پھرتا ہے "مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ مَفَاعِیلُ"۔

اسی طرح ایک بحر ہے:

"فَاعِلاتُ فَاعِلاتُ فَاعِلاتُ"۔

چونکہ شعر از جنس الفاظ ہے، لہٰذا اس کی ترازو لوہے کی ہوتی ہے، نہ پیتل کی ہوتی ہے بلکہ از قبیل الفاظ ہوتی ہے۔ اس پر تول کر دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی حرف گھٹتا ہے یا بڑھتا ہے تو وہ شعر ناموزوں۔ وزن سے خارج اور اگر بالکل مطابق ہے، جہاں متحرک حرف ہونا چاہئے، وہاں متحرک ہے، جہاں ساکن ہونا چاہئے، وہاں ساکن ہے تو وہ شعر موزوں ہے۔ منطق کو بھی علم میزان کہتے ہیں۔ ارسطو نے جو منطق ایجاد کی ہے، اس کا دوسرا نام ہے علم لامیزان یعنی ترازو کا علم۔ کونسی ترازو ہے یہاں؟ یہاں الفاظ نہیں ہیں بلکہ حقائق کو تولنا ہے کہ کون صحیح ہے، کون غلط۔ یہاں معنی ہیں جن کو تولنا ہے کہ یہ صحیح ہے، یہ غلط تو اس کی ترازو از قبیل الفاظ نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی ترازو از قبیل مطالب و معنی ہوگی۔ اس کیلئے ارسطو نے قیاسات کی ترازو ایجاد کی۔ اشکال اربعہ وغیرہ کی ترازو۔ صغریٰ و کبریٰ مرتب کر کے اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ ہوتا ہے یا نہیں۔

ارسطو کی منطق کی چار شکلیں ہیں۔ شکل اول، شکل دوم، شکل سوم اور شکل چہارم۔ سب سے زیادہ حقیقت سے قریب شکل اول ہے اور باقی جتنی شکلیں ہیں، پیچیدہ ہیں۔ تو آپ نے دیکھا کہ اجسام کی ترازو ان کی قسم سے، وہ بھی جیسا جسم ہو، اس کے تناسب سے ترازو اور الفاظ کی ترازو شعر میں از قبیل الفاظ اور معنی کی ترازو از قبیل معنی۔ تو اصول یہ ثابت ہوا کہ جیسی جنس ہو، ویسی اس کی ترازو۔ ایسی ہی ایک چیز کی طرف آپ کے ذہن کو منتقل کر دوں کہ نبوت کا وزن کون محسوس کرے گا؟ نبی کا جسم وزن نہیں ہے، نبوت کا وزن ہے تو نبوت کا وزن کون محسوس کر سکتا ہے؟ یوں جس کا دل چاہے، رسول کو اٹھا لے۔ یہ اٹھانا خود دلیل ہے کہ وہ وزن محسوس نہیں کر رہا۔ نبوت کا وزن وہی محسوس کرے گا جو ہم جنس نبوت کوئی وزن رکھتا ہو۔

کعبہ گواہ ہے کہ نبوت کا وزن کس نے محسوس کیا؟ آپ کے ذہن کو بہت دور منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ انہوں نے ان کی رسالت کا وزن محسوس کیا۔ اس وزن کا احساس اتنا تھا کہ اُسے برداشت نہ کر سکے اور قدم تھرتھرانے لگے۔ بظاہر یہ قدم کا تھرتھرانا عاجزی ہے مگر کمالِ معرفت کی دلیل ہے۔ شعور کی دلیل ہے۔ انہوں نے ان کی رسالت کا وزن محسوس کیا اور انہوں نے ان کی ایک ضرب

کا وزن ایسا محسوس کیا کہ تول کر بتا دیا۔

تو جناب! قیامت میں جو میزان نصب ہوگی، اس میزان پر کیا چیز تولی جائے گی؟ سب کو معلوم ہے کہ اعمال تولے جائیں گے اور میں نے کہا کہ ہر شے کی میزان ہم جنس شے ہوتی ہے۔ جسم کی میزان از قبیل اجسام، الفاظ کی میزان از قبیل الفاظ، معنی کی میزان از قبیل معنی۔ تو جب اعمال تولے جارہے ہیں تو اعمال تولنے کیلئے نہ وہ ٹال کی ترازو کام دے گی، نہ عطار کے ہاں کا کانٹا کام دے گا، نہ وہ شعرائے کرام کے بحروں کے ناپنے کے اوزان کام دیں گے، نہ ارسطو کی صغریٰ کبریٰ کام دے گی۔ یہاں کچھ انسان کامل چاہئیں جن کا عمل ترازو بن سکے۔

یہ حقیقت ہے جسے ہمیں زیارت کے ایک جملے میں سکھایا گیا ہے:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَامَوَازِيْنَ الْاَعْمَالِ"۔

"اے اعمال کی میزانو! آپ پر ہمارا سلام ہو"۔

یہ اعمال جو تولے جارہے ہیں، دراصل یہ دیکھا جارہا ہے کہ ان مثالی اعمال سے کون کتنا قریب ہے؟ جتنا ان کے قریب ہے، وہ میزان میں گراں ہے اور جتنا ان سے دور ہے، اتنا میزان میں سبک ہے۔ وہ میزان میں ناقص ہے۔ عمل تولے جارہے ہیں تو اگر ہم بداعمال ہوئے تو ترازو میں کیا چیز آئے گی؟ اعمال ہی نہیں تو کیا دیکھا جائے گا؟ شروع سے لے کر آخر تک اگ سب کچھ مخالف ہی ہے، سچے کی اُمت میں ہیں اور جھوٹ پر فخر ہے۔ امین کی اُمت میں ہیں اور بے ایمانی کو عقلمندی سمجھتے ہیں۔ ایمانداروں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔

تو بتائیے کہ اگر امین اور صادق کو (معاذ اللہ) آپ نے کم عقل سمجھ لیا تو اپنے قول میں ان مشرکین کے ہم نوا ہوئے جو انہیں عقل سے محروم سمجھتے تھے یا مومنین کی صف میں داخل ہوئے؟

اگر ہم ان کے گروہ میں شامل ہیں جن کی شیعیت کو ہم سرمایۂ نجات سمجھتے ہیں تو شیعہ کے معنی ہیں کسی کی ٹولی، کسی کا گروہ، تو پھر وہی بات کہ سچوں کا گروہ جھوٹے نہیں ہوسکتے۔ نمازیوں کے گروہ میں بے نمازی نہیں ہوسکتے۔ یہ تھوڑی دیر کا امام جو جماعت کا ہے، اس کی بھی جب نیتِ اقتداء کی تو متابعت واجب۔ رکوع اپنی جگہ عبادت لیکن امام سے پہلے جو گیا تو نماز باطل۔ سجدہ اپنی جگہ عبادت لیکن امام سے پہلے ہوگیا تو نماز باطل۔ یہ نہیں کہ جماعت کا ثواب اس میں سے منہا کر لیا جائے، جی نہیں۔ اصل عمل گیا، اصل برباد ہوا۔ اس وقتی امام کی اطاعت اور اتباع تو صحتِ عمل کیلئے فرض ہے اور جو دین و دنیا کے امام ہوں، جو امامِ مطلق ہوں، ان کے نام کو حفظ کر کے اور کسی کو سنا کر ہم یہ سمجھیں کہ کام ہوگیا، متابعت کی ضرورت ہی نہ وہ، پیروی کی ضرورت ہی نہ ہو۔ پھر تو حقیقت میں "وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" کا اصل مفہوم اگر دیکھا جائے تو وسیلہ سے مراد لینا اپنا ایمان اور اپنا عمل ہے۔

نا اُمید ہونے کیلئے ذرائع کا اعلان کیا گیا ہے۔ مغفرتِ الٰہی ہے "يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ"۔ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔ جس کو چاہے گا۔ یہ چاہنا بلاوجہ نہیں ہے۔ خود میں وہ صلاحیت رکھیں کہ وہ چاہے۔

اسی طرح وہ شفاعت کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ شفاعت ہے اور شفیع بھی ایک نہیں ہے، جتنے افراد ہیں، کوئی مانے نہ مانے۔

میں تو مانتا ہوں کہ وہ سب شفاعت کرنے والے ہیں۔ ان کا کیا ذکر، ہر مومن کو بقدرِ ایمان حق شفاعت حاصل ہے۔ ہر وہ مومن جو اس لائق ہے کہ شفاعت کر سکے، وہ شفاعت کرے گا۔ یہ شفاعت اس لئے ہے کہ ناامید نہ ہوں۔ اس میں بھی مراتب عمل ہیں۔ کوئی غلطی ایسی ہوتی ہے کہ ممتحن کہتا ہے کہ چلو نمبر دے دو۔ اس کی نظر میں قابل اعتراض ہے مگر نمبر نہیں کاٹتا۔ باوجودیکہ کمی کا احساس اُسے ہے۔ یہ تو ہے یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ جس کو چاہتا ہے، معاف کر دیتا ہے۔ پھر دوسرا درجہ ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ نمبر تو ہم ضرور کاٹیں گے لیکن اگر کوشش ہوگی تو بڑھا دیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی مراتب کمزوری عمل ہیں کہ کسی کو بغیر شفاعت خود ہی معاف کر دیا، کسی کو گویا ذرا الجھاوے میں ڈال کر شفاعت کروا دی اور شفاعت کرنے والے بھی شفاعت چشم و ابرو دیکھ کر کرتے ہیں۔ وہ مرضی دیکھ کر شفاعت کرنے والے ہیں۔ بغیر اس کی شفاعت کے اذن کے شفاعت بھی نہیں کرتے۔ حکمت یہ ہے کہ میں خود تو نہ معاف کروں، ان کے کہنے سے معاف کر دوں۔ اس طرح جس کو معاف کیا جا رہا ہے، اس کی بداعمالی کا ایک یہ درجہ ہے۔ بس اپنے اعمال کم از کم اتنے ہونے چاہئیں کہ شفاعت کرنے والوں سے کہتے ہوئے شرم نہ آئے اور شفاعت کرنے والوں سے التجا کی گنجائش ہو اور شفاعت کرنے والے بھی مناسب محسوس کریں کہ ہاں، اس کی شفاعت کر دی جائے اور اللہ کی رضا بھی ان کو شفاعت کرنے کیلئے حاصل ہو۔

لہٰذا ناامید کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ جتنے وقت پر بھی اصلاحِ عمل کر سکے، کرے۔

31

وسیلہ اور شفاعت

گلشن زہراؑ کی ہر شے سببِ حسرت ہے
ہاتھ ملوانے کو دنیا میں حنا بھی آئی
دردِ عصیاں جو تھا عارض تو دوا بھی آئی
قبر میں ساتھ میرے خاکِ شفا بھی آئی

اگر وہ ہستیاں کسی دوسرے کی مغفرت کیلئے دعا مانگیں تو اسی کا نام شفاعت ہے۔

جب اللہ نے ان کو اپنے مطلب کا وسیلہ بنایا تو ہم انہیں اپنے مطلب کا وسیلہ کیوں نہ بنائیں!

ہماری تاریخ آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں کے دو مناظر کو کبھی نہیں بھولے گی، ایک وہ شعلے جو جناب سیدہؑ کے گھر سے اٹھے تھے، دوسرے گیارہ محرم کی رات کو جن میں آلِ محمدؐ کے خیمے اور سیدزادیوں کی چادریں جل گئیں۔

انہوں نے کوفہ کے بازار میں نیزے پر بھی اپنے نانا کے ارشاد کی سچائی کو ثابت کر دیا کہ دیکھو! ہم سے قرآن کبھی جدا نہیں ہوتا۔ سر اور گردن الگ الگ ہو گئے لیکن ہم سے قرآن الگ نہیں ہوا۔

وسیلہ اور شفاعت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ

اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ تلاش کرو۔ کل اس پہلو کو عرض کیا کہ اس کی بارگاہ میں وسیلہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ اس وسیلہ کے بارے میں جو اکثریت ہے یا جو اقلیت ہے، مسلمانوں کا کوئی بھی مکتبِ خیال ہے، اسے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اس وسیلہ کے لفظ سے ایک چیز ہے جس کا نام ہے توسل۔ اس توسل کے معنی ہوتے ہیں، مثلاً پیغمبر خدا بلا تفریق فرقہ تمام مسلمانوں کیلئے متبرک ہیں اور پھر آلِ طاہرینؑ ہمارے لئے۔ ایک طبقہ مسلمانوں ہی کا جو پیغمبر خداؐ سے توسل کا قائل ہے، وہ خصوصیت کے ساتھ اس تصور کو نہ رکھتا ہو جو ہمارے آئمہ طاہرین کے بارے میں ہے مگر وہ دوسرے الفاظ میں اولیا، اور مقربین بارگاہِ الٰہی سے توسل کا قائل ہے۔ اس عنوان کے تحت وہ ہمارے ساتھ آئمہ طاہرین کے بارے میں بھی توسل کا قائل ہو جائے گا۔ اس منصب کے لحاظ سے نہیں جس کے ہم قائل ہیں لیکن اس عام عنوان کے تحت کہ مقربین بارگاہِ الٰہی ایسی ہستیاں ہیں کہ اصطلاحی حیثیت سے کوئی اس عہدہ کا قائل ہو یا نہ ہو لیکن مقربِ الٰہی ہونے میں کسی کو شک نہیں۔

اس لئے پیغمبر خدا سے توسل کا قائل ہوگا، وہ لازماً اس نقطہ پر بھی ہمارے ساتھ شریک ہوگا کہ ایک طبقہ جس کا اصل مرکز نجد میں تھا اور اس کے بعد اس کی حدود بڑھ کر پورے حجاز پر چھائیں اور بالواسطہ تمام دنیا پر دولت کی بنیاد پر اس کے اثرات پہنچ رہے ہیں، وہ اس کا مخالف ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ توسل کرنا ان معنی سے کہ دعا میں رسولؐ کو واسطہ قرار دینا اور طلبِ حاجت میں ان کی بارگاہ میں جا کر یہ سمجھنا کہ (روضہ پر) پہنچنے سے اور دعا کرنے سے ہماری حاجت پوری ہوگی، یہ سب وہ کہتے ہیں کہ شرک ہے اور وہ ایسا شرک نہیں جو خفی ہو۔ ایک بلند معنی کے لحاظ سے ریاکاری بھی شرک کہلاتی ہے۔ مگر وہ شرکِ خفی ہے۔ یہ شرک ان کے نزدیک ایسا شرکِ جلی ہے کہ اپنی جماعت کے سوا تمام دنیا کو واجب القتل سمجھتے ہیں۔ چاہے بتقاضائے سیاست ان کی آواز میں دھیما پن پیدا ہوا ہو لیکن اصل مسلک ان کا یہی ہے کہ ان کی جان بھی مباح یعنی جان کا بھی احترام کوئی نہیں اور تمام مسلمانانِ عالم کا جان و مال محترم نہیں ہے۔

ان کا قتل کرنا بھی جائز، مال لوٹنا بھی جائز۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں کو کنیز بنانا بھی جائز۔ یعنی جو مشرکین کے احکام ہیں وہی تمام دنیا کے مسلمانوں کے احکام ان کے نزدیک ہیں۔ اس بناء پر کہ وہ توسل کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔ توسل ان کے نزدیک ویسا ہی شرک ہے جیسا مشرکین مکہ لات و منات کی پرستش کرتے تھے۔ چونکہ ان حضرات کے روضے توسل کا مرکز ہیں، اس لئے سب روضوں کو وہ اصنام سمجھتے ہیں، بت سمجھتے ہیں اور ان کی زبان میں روضۂ رسولؐ سب سے بڑا بت ہے۔ صنمِ اکبر۔ مگر اتنے طویل عرصہ میں تقیہ سے کام لے کر اس کو باقی رکھا ہے۔ آج اس چیز کا بیان ہے جسے وہ شرک قرار دیتے ہیں اور اسے ہم عبادتِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ اسی توسل کے تحت

حقیقت میں مسئلہ شفاعت بھی ہے۔ بلا واسطہ اللہ سب کام کر دیتا ہے تو آخر کسی کو اُسے شفیع قرار دینے کی ضرورت کیا ہے؟

چنانچہ ایک رجحان یہ ہے کہ شفاعت کا تصور غلط ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید کی آیتیں پیش کی جاتی ہیں کہ:

لَيْسَ لَهُمْ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيعٌ

ان کیلئے نہ کوئی ولی ہے نہ کوئی شفیع ہے۔

اور پھر روزِ قیامت کے ذکر میں قرآن مجید میں ہے کہ اس دن نہ تو فدیہ ہوگا، نہ شفاعت ہوگی۔ ایک وقت میں ایک صاحب نے کتاب لکھی تھی۔ ان کا نقطہ نظر انکارِ شفاعت تھا۔ انہوں نے پورے قرآن سے چودہ آیتیں لکھی تھیں، نفی شفاعت میں ایسی:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

کہیں پر

لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ

ہے۔ اس طرح چودہ آیتیں انہوں نے مسلسل لکھی تھیں۔ اس کی رد میں امامیہ مشن لکھنؤ سے رسالہ شائع ہوا تو اس میں میں نے بالکل صحیح حساب کے ساتھ 28 آیتیں ثبوتِ شفاعت میں پیش کیں۔ علم غیب کے بارے میں ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر دس جگہ ہے کہ ایسا نہیں ہے اور ایک جگہ قرآن نے کہہ دیا کہ ایسا نہیں ہے سوا۔ تو ادھر ایک عدد سوا آیا، ایک آیت میں ادھر، یہ سوا ان سب آیتوں میں لگ جائے گا کیونکہ اس نے بتا دیا کہ وہ حکمِ عام نہیں ہے۔ اس میں خصوصیت ہے۔ تو جب یہ خصوصیت ہے تو جہاں جہاں وہ عام حکم ہے، وہ اس خاص پر محمول ہوگا کیونکہ خاص صریح ہوتا ہے اپنے مفہوم میں اور عام تو ایک اپنے الفاظ کی لپیٹ میں لیتا ہے۔ خاص جب حکم آ جائے خصوصیت کے ساتھ تو وہ ہر عام میں تخصیص پیدا کر دے گا۔ جہاں جہاں شفاعت کی نفی ہے، (اُن چودہ آیتوں کا انکار نہیں) مگر اٹھائیس آیتوں میں "اِلَّا" موجود ہے۔ کوئی قید موجود ہے تو وہ "اِلَّا" اور وہ قید جا کر ان سب آیتوں کو مقید بنا دے گی۔ تو وہ اٹھائیس آیتیں ثبوتِ شفاعت کی دلیل بن جائیں گی۔

اب قرآن مجید میں دیکھ لیجئے کہ کس کس طرح شفاعت کا اثبات ہوا ہے۔ کہیں ایک جماعت کے بارے میں کہا گیا ہے:

لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى

وہ لوگ شفاعت نہیں کریں گے۔ وہ سے مراد بعض فرشتوں کو قرار دیتے ہیں۔ بعض ان افرادِ انسانی کو شفیع قرار دیتے ہیں جو پیشِ خدا شفاعت کا حق رکھتے ہیں۔ تو وہاں یہ جملہ ہے:

لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى

وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کی جو اللہ کو پسند ہو۔ تو اب شفاعت نہ کرنے کے ساتھ "اِلَّا" آ گیا تو معلوم ہوا کہ کچھ ایسے ہیں جن کی شفاعت اللہ کو پسند ہوگی۔

ایک جگہ قرآن مجید میں ہے، میں قسمیں بیان کر رہا ہوں، نمونہ کے طور پر ایک ایک آیت ایسی ہے جس میں قید ہے، پیش کرتا ہوں۔ یہاں دیکھئے کہ یہاں آیا:

لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی

"اِلَّا" آیا تو اس نے نفی میں انقلاب پیدا کر کے اس کو ثبوت بنایا۔ اس کے علاوہ آپ دوسری جگہ دیکھئے وہاں کوئی شفیع نہیں۔

"مَا مِنْ شَفِیْعٍ"

کوئی شفیع نہیں ہے۔ ابھی تک نفی ہے۔

"اِلَّا بِاِذْنِہٖ"

مگر اس کی اجازت سے۔ تو اب جب "اِلَّا بِاِذْنِہٖ" آ گیا تو کلی نفی شفاعت کہاں ہوا؟ "اِلَّا بِاِذْنِہٖ" ثبوت شفاعت کی دلیل بن گیا۔ ایک جگہ ہے کہ "مَا مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ"۔ اس کے ہاں کوئی مددگار نہیں ہے اور کوئی شفاعت کرنے والا ایسا نہیں ہے جس کی وہ اطاعت کرے۔ یعنی کوئی حکم شفاعت کرے، ایسی کوئی بالادست طاقت نہیں ہے جو اس کو گویا مجبور کر سکے، ایسا کوئی شفیع نہیں ہے۔

اس کو ایک مفسر نے بڑے بلیغ انداز میں دو الفاظ میں کہا ہے کہ ایسے شفیع نہیں ہیں جن کی وہ اطاعت کرے، ایسے شفیع ہیں جن کی دعا کو وہ قبول کرے۔ کہیں یہ کہہ دیا کہ شفاعت وہاں فائدہ نہیں دے گی مگر یہ کہ "اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ" جس کیلئے اس کا اذن ہو۔

تو اب جب اٹھائیس آیتیں اس قسم کی آ گئیں کہ جس میں کہیں "اِلَّا" کہہ کر استثنیٰ کیا گیا ہے اور کہیں شفیع میں قید لگا کر اس کے دائرے کو محدود بنایا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نفی شفاعت کو نہیں، ثبوتِ شفاعت کو بتاتا ہے۔

اب جو تصورات نفی شفاعت میں ہیں، ہوتا یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن میں ایک بات طے کرتا ہے کہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔ پھر وہ آیتیں تلاش کرتا ہے کہ اس کی تائید میں آیتیں کونسی ہیں۔ اس لئے ایسے شخص کو چودہ آیتیں نظر آئیں، اٹھائیس آیتیں نظر نہیں آئیں کیونکہ اس نے تو اپنی جگہ یہ طے کیا تھا کہ ہمیں نفی شفاعت کرنی ہے۔ اس لئے وہ آیتیں مطلب کی نہ تھیں جن میں ثبوتِ شفاعت کا پتہ چلتا تھا۔ یہ آیتیں مطلب کی تھیں۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ ایسے لوگوں کو قرآن کا تابع نہیں ہوتا ہے بلکہ قرآن کو اپنا تابع بناتا ہے۔ کسی غرض کے تحت مطالعہ قرآن ہے، اس لئے نہیں ہے کہ قرآن سے حقیقت سمجھیں۔ یہی عموماً ہوا کرتا ہے کہ ہر ایک مناظر اپنے مطلب کی آیتیں سوچ کر پیش کرتا ہے، اس لئے کہ مطلب تو اس کے ذہن میں قرآن کو دیکھے بغیر طے شدہ ہے۔ ہمیں ایک جماعت کو عادل سمجھنا ہے تو اب اس کیلئے تلاش ہے دلائل کی۔ بات تو ہم اپنی جگہ طے کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے کسی کی فضیلت کا انکار کرنا ہے تو وہ انکار تو جذباتی طور پر ہے۔ لیکن قرآن سے سند کوئی پیش کرنا ہے۔ یا یہ کہ طے تو یہ ہے کہ ہم کسی خاص حقدار کو وراثت نہیں دیں گے، اب اس کیلئے تلاش سے بھی آیت نہیں ملتی تو حدیث کا سہارا لیا جاتا ہے، چاہے خلافِ قرآن ہو۔

تو اب اصل دلائل نفی شفاعت کے قرآن میں نہیں ہیں بلکہ ذہن میں ان کے پاس کچھ باتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ شفاعت کا انکار کررہے ہیں۔ تو دیکھا جائے کہ اصل باتیں کیا ہیں تو یہ کہ اگر وہ قابل معافی ہے تو خدا معاف کرہی دے گا۔ بے معنی چیز ہے، ایک صورت میں بے ضرورت ہے، ایک صورت میں بیکار ہے۔ اگر وہ قابل مغفرت ہے تو وہ بے ضرورت ہے اور اگر قابل مغفرت نہیں ہے تو بیکار ہے۔ لہٰذا شفاعت کیوں ہے؟ یہ دلیل بظاہر تو عقلی حیثیت سے بہت مضبوط نظر آتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ شفاعت سے کہاں مخصوص ہے؟ یہ تو ہر دعا کی قبولیت میں ہے کیونکہ وہ کام ہونا ہے تو دعا بے ضرورت ہے، اگر نہیں ہونا ہے تو دعا بیکار ہے۔ لہٰذا دعا کیوں؟ مگر دعا کا منکر کوئی نہیں، اس لئے کہ قرآن حکم دے رہا ہے کہ:

فَادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ط

مجھ سے دعا مانگو۔ تو میں کہتا ہوں کہ شفاعت درحقیقت ایک قسم کی دعا ہے۔ جب وہ اصل دعا کے منکر نہیں ہیں تو شفاعت کے کیونکر منکر ہوتے ہیں؟ جو مطلق دعا کی صحت کا پہلو ہوسکتا ہے، وہی شفاعت کا پہلو ہوسکتا ہے۔ مگر کوئی کہے کہ یہ تو ہم پر مسئلے کا دباؤ ڈال کر منوالیا۔ اچھا! ہم کہتے ہیں کہ وہ دعا ہی کیوں؟ مطلق دعا کیوں؟ قرآن میں کیوں ہے؟ تو یہ حقیقت میں مسئلہ تقدیر سے متعلق چیز ہے اور تقدیر بڑی گہری بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مطلق فیصلہ ہو ہونے کا تو بے شک دعا بیکار اور بے ضرورت اور اگر مطلق فیصلہ ہو، نہ ہونے کا تو دعا بیکار۔ وہی بات اس صورت میں بے ضرورت اور اس صورت میں بیکار۔ وہاں طے شدہ کہ یہ بات ہوگی، دعا کریں یا نہ کریں تو دعا بے ضرورت اور یہاں طے شدہ ہے کہ نہیں ہوگا تو دعا بیکار۔ لیکن جب اس فاعل حکیم نے دعا کا حکم دیا ہے تو یہ کیوں نہ سمجھئے کہ کچھ مقدرات کو اس نے مشروط کیا ہے، ہماری دعا سے۔ یعنی فیصلہ ازل یہ ہے کہ اگر دعا کرے گا تو اس طرح ہوگا اور اگر دعا نہیں کریگا تو یہ کام نہیں ہوگا۔ اب اگر ہم نے دعا نہ کی تو اس محرومی کے ذمہ دار ہم ہوئے اور پھر غور کیجئے تو وہ دعا سے مخصوص نہیں، وہ تصور جو ہے کہ ایک صورت میں بے ضرورت اور ایک صورت میں بیکار، وہ جتنی تدابیر آپ کرتے ہیں، ان سب میں ہے۔ ہر شخص اپنے مقصد کیلئے تدابیر کرتا ہے۔ تو اگر وہ ہونے والی بات ہے تو آپ کی تدابیر بے ضرورت اور اگر ہونے والی بات نہیں ہے تو آپ کی تدبیر بیکار۔

جو بات دعا کی تھی، وہ آپ کی تدبیر میں بھی ہے اور پھر علاج، ڈاکٹروں کو، حکیموں کو سب کو نظرانداز کردیجئے، اس لئے کہ اچھا ہونے والا ہے تو دوا بے ضرورت، اچھا ہونے والا نہیں ہے تو دوا بیکار۔ اب بحمدللہ وہ چیز ہمارے ہندوستان میں ختم ہوگی، جب سے میں عراق سے آیا ہوں تو اس وقت پورے جاہ و جلال کے ساتھ ہمارے ملک میں اور خصوصاً یوپی میں بہت زیادہ تھا کہ لوگ کسب معاش میں یعنی تجارت وغیرہ کو ذلت سمجھتے تھے۔ شرفاء فاقے کرتے تھے مگر یہ کہ محنت مزدوری یا تجارت نہیں کرتے تھے۔ بھلا میر صاحب ہو کر دوکان کریں؟ یہ بہت شدت کے ساتھ تھا۔

چنانچہ وہاں سے آکر میرے جو بیانات ہوئے، وہ تین دن مدرسۃ الواعظین میں تجارت اور اسلام کے موضوع پر ہوئے تھے اور وہ امامیہ مشن سے چھپے بھی تھے۔ "تجارت اور اسلام"۔ تو وہ گویا افراد ملت میں ایک نئی چیز سمجھی گئی۔ تو اس میں میں نے ذکر کیا تھا، اس میں دلائل جو تھے، ترک تجارت اور ترک ذرائع معاش کے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کسی سے کہا ارے بھئی: ... علم میں ہو تو کچھ

کرو؟ انہوں نے کہا: ہمارے مقدر میں فاقے لکھے ہیں تو پھر کیا کریں؟ مقدر میں فاقے ہیں، پھر کیا کریں؟ اور ایک مسئلہ تھا کہ اللہ رزق کا ضامن ہے تو بہر حال وہ رزق تو ہمیں ملے گا۔ پھر محنت مزدوری کر کے کیا کریں؟ ایک تصور یہ اللہ کی رزاقیت کا تھا۔ ایک تصور وہی عزت و شرافت کا تھا کہ ابھی میر صاحب کہلاتے ہیں، اگر تجارت شروع کر دی تو اس چیز کا نام لے کر کہا جائے گا کہ پان والے بسکٹ والے اور مختلف چیزوں والے۔ تو گویا عزتِ خاندانی ختم ہو جائے گی۔ غرض یہ سب تصورات تھے جن کی بناء پر بھوکے مرتے تھے اور تجارت نہیں کرتے تھے۔

میرے جو بیانات ہوئے، تو جناب! اب ایک لہر جیسے دوڑی کہ نئی ایک بات سامنے آئی۔ لوگوں نے دوکانیں کھولنا شروع کیں، تجارت شروع کی اور اس کے اشتہار میں لکھا کہ انہوں نے یعنی میں نے ایسے بیانات دیئے تھے، لہٰذا اس پر عمل کرنے کیلئے ہم نے یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ تب میں نے ایک بیان میں کہا کہ اگر آپ تجارت کرنے کا ذوق ہوا ہے، توفیق ملی ہے تو اسے آپ ایک مصلحانہ شان سے کیوں کرتے ہیں؟ آپ کہئے کہ ہماری قومی ضرورت ہے۔ میرے بیان کا حوالہ دے کر گویا ایک خدمتِ قومی کے طور پر اُسے کرنا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جگہ اُسے ذلیل کام سمجھ رہے ہیں۔

اب اس تقدیر والی بات کو اس بیان میں مَیں نے کہا کہ جناب اگر آپ اس اصول کے زندگی کے تمام شعبوں میں قائل ہوں، تو میں چاہے اس اصول کو غلط سمجھتا ہوں، لیکن آپ کو بے اصول نہیں سمجھوں گا۔ یعنی وہی کہ بیمار ہو بچہ لیکن آپ نہ جائیں ڈاکٹر کے ہاں، اس لئے کہ مقدرات میں اگر ہے اچھا ہونا تو ہو جائے گا اور اس سے آگے یہ ہے کہ مقدمہ عدالت میں ہو لیکن پیروی نہ کیجئے۔ کہئے کہ جائیداد اگر ملتی ہے تو مل ہی جائے گی۔ پیروی سے کیا فائدہ؟

ایک معمولی سی بات ہے کہ میرا یہ بیان آپ کو سننا تھا تو آپ اپنے گھر میں بیٹھے رہتے کہ مقدر میں سننا ہے تو سن ہی لیں گے مگر آپ نے کب سے اپنے پروگراموں کو تبدیل کیا اس مجلس کی خاطر؟ اور کس طرح سے وقتِ مقررہ پر تیار ہوئے اور پھر ایک ایک قدم کی صورت میں کتنے مراحل طے کر کے اس بیان میں شرکت کی؟ تو اگر یہ سب باتیں آپ نے خلافِ عقل نہیں کیں تو طلبِ رزق کی کوشش کیلئے تقدیر کی سپر استعمال کرنا کہاں تک معقولیت ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کے آپ قائل نہیں ہیں بلکہ تقدیر کو اپنے بے عملی کا بہانہ بنا رہے ہیں۔ وہی صورت یہاں ہے کہ جناب دوا کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ بیکار ہے تو دعا کرتے وقت کیوں سوچتے ہیں کہ یہ بیکار ہے؟ ہونے والا ہے تو ہو گا۔

اب میں مختصر الفاظ میں عرض کردوں کہ فلسفۂ دعا کیا ہے؟ فلسفہ اس کا یہ ہے کہ خالق کی مشیت صرف ایک حاکم کی تو ہے نہیں کہ اس کو غرض تعلیم احکام سے ہو، اس لئے وہ ایک فہرستِ احکام سنا دے اور اس کے بعد مخالفت کرو گے تو سزا دی جائے گی۔ اس کی حیثیت وہ بھی ہے جو ناقص درجہ پر ایک باپ کی اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو باپ کی یہ شان نہیں ہوگی کہ وہ بس آرڈر دے دے اور پھر بے فکر ہو جائے کہ اگر خلاف کرے گا تو سزا دیں گے۔ جی نہیں! وہ حکم بھی دیتا ہے اور جیسے اس کے دل کو لگی ہوتی ہے کہ یہ اس پر عمل کرے۔ لہٰذا وہ محرکاتِ عمل مہیا کرتا ہے اپنی طرف سے۔ ورنہ اگر یہ نہ ہوتا تو ثواب اور عذاب کے اعلانات بھی نہ ہوتے۔ خصوصاً ثواب کے

اعلانات تو ہوتے ہی نہیں۔

لیکن وہ تو چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ اطاعت گزار ہیں کیونکہ اولاد میں بھی طبیعت الگ الگ ہوتی ہے۔کوئی بچہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس کو کہا جائے کہ یہ چیز تم کو دیں گے تو وہ چڑ جائے گا، اُس کی خودداری کے خلاف ہوگا۔کوئی ایسا ہوگا کہ اس سے سزا کا ذکر کیجئے تو وہ برا مانے گا۔اسے کد ہو جائے گی۔تو باپ اگر دانش مند ہے تو بچوں کی طبیعت کے لحاظ سے جسے دیکھے گا کہ کڑے تیوروں سے متاثر ہوگا، اُس کیلئے سزا کا اعلان کرے گا کہ اگر تم نے یہ کیا تو مار کھاؤ گے۔جسے بلند نظر پائے گا، اس کیلئے نہ ثواب کہے گا، نہ عذاب کہے گا۔کہے گا کہ ہم تم سے خوش ہوں گے۔تو وہ محرکات عمل بھی پیدا کرتا ہے۔یہ یادِ الٰہی اس کی اپنی غرض کیلئے تو ہے نہیں۔ہم یاد کریں گے تو اس کا کیا فائدہ؟ اگر ہم بھولے رہیں گے تو اس کا کیا نقصان؟ یہ یادِ الٰہی ہماری تعمیر حال و مستقبل کیلئے اکسیر ہے کہ اس کی وجہ سے ہم ہیں۔احساسِ فرض پیدا ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے ہم برائیوں سے بچتے ہیں۔تو یادِ الٰہی کا اس نے حکم اپنے فائدہ کیلئے نہیں دیا ہے، ہماری تعمیر حیات کیلئے دیا ہے۔

کسی شاعر نے طنزیہ طور پر یہ کہا ہے۔جناب اُمید لکھنوی کا شعر ہے، ایک طنز ہے عبادت گزاروں پر، اپنے اوپر رکھ کر کہا ہے:

گر پڑھی بھی کبھی ہم نے تو نمازِ حاجت
اپنے مطلب کیلئے یاد خدا بھی آئی

ایک اور شعر یاد آ گیا:

گلشن دہر کی ہر شے سبب حسرت ہے
ہاتھ ملوانے کو دنیا میں حنا بھی آئی
دردِ عصیاں جو تھا عارض تو دوا بھی آئی
قبر میں ساتھ میرے خاکِ شفا بھی آئی

انہوں نے تو طنزیہ طور پر یہ تحریر فرمائے مگر میں کہتا ہوں کہ درحقیقت اسی لئے تو دعا کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مطلب کیلئے ہی سہی، ہماری یاد تو آئے۔وہ تو ہمارے آئمہؑ نے تمثیلی طور پر اس کیلئے ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ ایک بندہ کبھی سجدہ ہی نہیں کرتا تھا۔ملائکہ اس کی بداعمالی پر گویا بارگاہِ الٰہی میں فریادی ہوئے کہ خداوندا! یہ تیرا بندہ، تیری طرف سے برابر اس کو رزق مل رہا ہے اور یہ کبھی تجھے یاد نہیں کرتا تو ارشادِ قدرت ہوا کہ ہاں ٹھیک ہے، مگر ایک جز و ذرا اس کے نظامِ حیات کا بدل دو، ایک رگ کا نظام بدل دو۔اب جو تکلیف ہوئی تو سر سجدہ میں رکھ کر اس نے کہا یارب! تو صدائے قدرت آئی کہ ارے میں تو مدت سے منتظر تھا کہ تو مجھے پکارے۔

تو دعا کا فلسفہ یہ ہے اور مقصدِ دعا ایسا عظیم ہے کہ جس میں ذرا سا بھی کلام، دو حرفی کلام بھی ہو تو وہ مبطل نماز ہو جائے اور دعا ہر محل پر ہو سکتی ہے۔ایک تو جگہ مقرر کر دی گئی قنوت میں جو جمہورِ اُمت کے ہاں نہیں ہے۔ہمارے ہاں ہے تو وہ قنوت، دعا کا محل خاص ہے اور اس کے بعد کلیۃً کسی مقام پر بھی کلام کرنا ناجائز مگر یہ کہ دعا ہر محل پر جائز ہے۔ہر جگہ پر دعا صحیح ہے۔نہ ... انہ کرنے والوں کی مذمت

میں قرآن میں کہا گیا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ"

جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں گھمنڈ سے کام لیتے ہیں، میری عبادت کے مقابلہ میں، تو معصومینؑ نے اس کی تفسیر میں کہا۔ ہے کہ یہاں عبادت سے مراد وہ دعا ہے کہ جسے اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں، اللہ کی بارگاہ میں التجا کرنے کو، تو ان کیلئے کہا گیا کہ ان کیلئے جہنم ہے جو تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے۔ معصومؑ نے فرمایا ہے۔

"اَلدُّعَا اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ"

دعا عبادات میں سب سے افضل ہے۔ اور ایک حاضر نے معصومؑ سے سوال کیا کہ دو شخص مسجد میں داخل ہوئے، ایک شخص نے کثرت کے ساتھ نمازیں پڑھیں، ایک نے کثرت کے ساتھ دعائیں مانگیں تو اس میں سے کس کا عمل افضل ہے؟ حضرتؑ نے پہلے مجملاً فرمایا کہ اس کا عمل بھی ٹھیک ہے، اُس کا عمل بھی ٹھیک ہے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہونے کو میں پہچانتا ہوں، میں تو افضل کو پوچھ رہا ہوں کہ ان میں افضل کون ہے؟ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ جس نے دعائیں مانگیں، وہ خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ نماز بقدرِ ضرورت پڑھ لی، واجب ادا کرنا تھا، کرلیا، پھر دعائیں مانگیں۔ تو اس کی فضلیت زیادہ ہے۔

تو اب جب دعا کرنا ہی ہے بارگاہِ الٰہی میں تو اگر وہ ہستیاں کسی دوسرے کی مغفرت کیلئے دعا مانگیں تو اسی کا نام شفاعت ہے۔

تو آپ کسی دعا میں نہیں سوچتے کہ دعا میں کیا فائدہ اور وہاں شفاعت میں سوچ رہے ہیں کہ شفاعت کرنے سے کیا فائدہ؟ ایک صورت میں ضرورت کیا اور ایک صورت میں حاجت؟ وہ جو ایک تصور تھا جس کو عرض کیا، دوسری بات یہ کہ ایک تصور ہے کہ شفیع کے معنی ہیں فرد ایک اور شفیع دو۔ اسی وجہ سے نمازِ شب میں آٹھ رکعات تو نمازِ شب کہلاتی ہے اور دو رکعات جو ہوتی ہیں، وہ شفع نماز کہلاتی ہیں تو شفع کے معنی دو۔ جیسے طاق اور جفت اور ایک وتر ہے یعنی اکیلی نماز۔ اس کے بعد قرآن مجید میں، "وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ" میں قسم دو کی اور ایک کی۔ اب ایسی ہی چیزیں ہیں جہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافی ہے قرآن، تو سمجھئے کہ دو کون ہے اور ایک کون ہے؟

غرض اب تصور یہ ہے کہ اسے آپ کہہ رہے ہیں شفیع، اور شفع کے معنی وہ جو دوسرا ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے مقابلہ میں وہ گویا مد مقابل ہے، اس لئے شرک ہے۔ اس میں تصور شرک یوں پیدا ہوا کہ یہ خدا کا دوسرا ہے۔ تو جو اصل بنیاد ہے، لغوی مفہوم کی، وہ مسلم۔ بے شک شفع کے معنی دو ہوئے ہیں اور شفیع یعنی دوسرا۔ مگر ذرا عقل سے کام لیجئے، کس کا دوسرا ہے، حقیقت میں اس صاحب حاجت کا دوسرا ہے کہ ابھی تک وہ ایک کی حاجت تھی، اب دو کی ہوگئی۔ اس لئے شفاعت شرک نہیں بلکہ شرک شکن ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر شفاعت کا انکار غلط۔ قرآن میں صراحتاً شفاعت ہے اور "شَفِیْعُ الْمُذْنِبِیْنَ" آپ کا ایک لقب ہے مستند احادیث کی رو سے۔ لہٰذا کسی کے بارے میں وہ شفاعت کا انکار کریں گے مگر بربنائے حدیثِ صحاح پیغمبر کو شفیع مانیں۔ پھر یہ بھی ایک صورت ہے کہ وہ شفاعت کو شرک قرار نہیں دیتے بلکہ توسل کو شرک قرار دیتے ہیں۔ وہاں بھی ذرا لفظی بحث کرتے ہیں کہ ان سے نہ کہو کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے بلکہ اللہ سے کہو کہ ان کو ہمارا شفیع بنادے۔ یعنی یوں ناک نہ پکڑو، یوں پکڑو۔ ان سے نہ کہو کہ آپ شفاعت

کیجئے، اللہ سے کہو کہ ان کو ہمارا شفیع بنا دے۔ تو اگر شفاعت کرنا ان کا شرک ہے تو خدا سے کہنا کہ اپنا تو شریک قرار دے۔ یعنی اگر وہ غلط ہے تو یہ تمنا بھی غلط ہے۔ غرض یہ کہ شفاعت کے متعلق وہ منکر نہیں ہو سکتے۔ مجبوری ہے، قرآن میں ہے۔ احادیث صحاح میں بھی ہے۔ قرآن میں کچھ ترکیب ہو جاتی ہے لیکن صحاح کو کیا کیا جائے کہ بخاری اور مسلم میں شفاعت کا ذکر موجود ہے۔

"اُوْتِيْتُ الشَّفَاعَةَ"۔

مجھ کو شفاعت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

قرآن مجید کی آیت ہے، اس کی بھی تفسیر شفاعت کے ساتھ ہے کہ وہ مقام محمود جس پر اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے آپ کو فائز کیا ہے، وہ شفاعت کا درجہ ہے۔ تو اب یہ تو مجبوری ہے، شفاعت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن توسل کا انکار ہے یعنی ان کے ذریعہ سے دعا مانگنا اور ان کو واسطہ قرار دینا کہ تجھے واسطہ ہے محمد آل محمد کا۔ اس طرح سے توسل کرنا یا ان کے روضوں پر جا کر دعا مانگنا۔ یہ سب جو ہے، وہ شرک ہے۔

تمام دنیا کے مسلمان واجب القتل ہیں ان باتوں کی وجہ سے۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ آپ کہتے ہیں کہ رسولؐ کے پاس جا کر یا کسی روضہ پر جا کر دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دعا مانگنی ہے تو اللہ سے مانگ لو۔ تو اب قرآن مجید کی آیت پڑھتا ہوں۔ قرآن مجید کی آیت ہے جس میں راوی کا کوئی سوال نہیں ہے، قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ:

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

جبکہ انہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا۔

اصطلاحِ قرآنی میں اپنے نفس پر ظلم کرنا گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے۔ یعنی گناہ کر کے وہ کسی اور کا نقصان نہیں کرتا، اپنا نقصان کرتا ہے تو "اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ"، یعنی جنہوں نے گناہ کئے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ:

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

اگر ایسا ہوتا کہ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا یعنی گناہوں کے مرتکب ہوئے تو آپ کے پاس آتے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ "جَآءُوْكَ"، آپ کے پاس آتے۔ ف۔ ف ہوتا ہے ترتیب کیلئے۔ پرانے زمانہ میں اس "ف" کا ترجمہ پس ہوتا تھا۔ آپ کے پاس آتے، پس اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے۔ اب ہماری اُردو پس والی نہیں رہی۔ اب ہم ترجمے میں اس کا مفہوم یوں ادا کرتے ہیں کہ آپ کے پاس آ کر اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے یعنی اپنی جگہ پر مغفرت کے طلبگار ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کے پاس آتے، آ کر اللہ سے طالب مغفرت ہوتے، پھر پیغمبرؐ ان کیلئے استغفار کرتے "لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا" تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحیم پاتے۔

یعنی بجائے خود تو ہے ہی تواب۔ بجائے خود وہ ہے ہی رحیم۔ مگر ان کیلئے اُس صفتِ توابیت ورحیمیت کا مظاہرہ موقوف ہے کہ وہ پیغمبر محمدا کی خدمت میں آ کر ان سے توسل کریں۔ صرف اللہ کی طرف رجوع کر کے آپ کے سامنے کہنا کافی نہیں ہوگا بلکہ خود رسولؐ سے بھی کہیں کہ آپ ہمارے واسطے استغفار کیجئے۔ تو اللہ کو تَوَّابٍ وَرَحِیْمٍ پائیں گے۔ ہے تو وہ مگر یہ اس وقت پائیں گے تواب بھی اور رحیم بھی۔ تو اگر توسل کوئی چیز نہ ہوتا تو رسولؐ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ توسل کوئی نئی چیز نہ تھا جو قرآن نے کہا ہو۔ اس توسل کا انبیائے سلف کے دور میں بھی تصور موجود تھا۔ قرآن کو دیکھئے، سورۂ یوسف میں کہ فرزندانِ یعقوب کیوں ان سے آ کر کہتے:

"یَا اَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا"۔

اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کیلئے، جرائم کیلئے استغفار کر دیجئے۔ اور وہ اس پر بجائے اس کے کہ تنبیہ کریں کہ استغفار کرنا ہے تو خود کرو۔ میں کیوں کروں؟ وہ وعدہ کیے لیتے ہیں کہ:

"سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ"۔

میں اپنے پروردگار سے عنقریب تمہارے لئے استغفار کروں گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ توسل پر انبیائے سلف کا اجماع قائم تھا۔

- قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ کے پاس جاتے اور آپ ان کیلئے طالبِ مغفرت ہوتے، تب وہ اللہ کو تواب اور رحیم پاتے۔ یعنی رحمتِ الٰہی کی توجہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ آپ ان کیلئے استغفار کریں۔ اب جو توسل کے شواہد ہیں، وہ انشاء اللہ کل عرض کروں۔

بس ایک آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد اس کے معیار پر حدیثیں منتخب کر کے، حاکم ایک اپنے وقت کے امام فنِ حدیث تھے۔ انہوں نے مستدرک لکھی۔ وہ مستدرک حاکم کہلاتی ہے۔ اس میں ایک حدیث ہے کہ جب جناب آدمؑ سے ترکِ اولیٰ ہوا، کوئی مجرم کیا روئے گا اپنے جرم پر جیسے انبیاء ترکِ اولیٰ پر روتے تھے اور گڑگڑاتے تھے اور بارگاہِ الٰہی میں مثل بید کانپتے تھے۔

تو وہ گناہ ہوتا تو نظرِ رحمت پھر جاتی مگر وہ گناہ تو ہوتا نہیں، وہ ان کی بلندیٔ منزل کے لحاظ سے ہوتا تھا جس پر خدا تنبیہ کرتا تھا کہ تم نے بہت برا کیا اور اس پر یہ ایسے لرزتے تھے جیسے کوئی ملزم بھی نہ لرزے گا۔ تو نظرِ توجہ سلب نہیں ہوتی ہے۔ اب اس کیلئے میں نے کہا کہ دلیل اس کی کہ وہ گناہ نہیں تھا۔ جو بھی ہوا، آدمؑ سے، نوحؑ سے، ابراہیمؑ سے، کسی سے بھی، کوئی اس قسم کا فعل جس کو ہم ترکِ اولیٰ کہتے ہیں اور دنیا اس کو خلافِ عصمت کہتی ہے، ہم عجیب ہیں کہ ہمیں اللہ کی طرف سے صفائی پیش کرنا اور انبیاء کی طرف سے، آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک سب کی وکالت بھی ہمیں کرنا ہے۔

تو جناب! اب ہم کہتے ہیں کہ ترکِ اولیٰ گناہ نہیں ہے۔ میں بس ایک مختصر سا معیار پیش کرتا ہوں کہ اگر اس عمل پر جس پر سخت سے سخت تنبیہ ہوئی ہے، عہدہ سلب ہو گیا ہو تو گناہ ہے اور اگر عہدہ برقرار رہا تو سمجھئے کہ یہ سب ان کے مزید کمالِ نفس کیلئے محرک کے طور پر

تھا۔ یہ سب عتاب جو تھا، وہ محرک کے طور پر تھا ورنہ سزا یافتہ کو پھر بھی عہدہ نہیں دیا جاتا۔ اسی معیار پر آدمؑ کو دیکھئے کہ ترکِ اولیٰ تھا یا نہیں، انہیں پھر زمین پر بھیجا گیا۔ آپ اسے کہتے ہیں کہ جنت سے نکالا جانا سزا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ سزا اس وقت مانوں گا کہ جب زمین پر بھیجے گئے تو وہ منصب سلب کر لیا جاتا۔ زمین پر آئے تو اسی منصب پر آئے۔ تو اس لئے اسے سزا تو نہیں کہا جا سکتا۔ خاصیت اُس عمل کی کہا جا سکتا ہے کہ مزید شاید جنت میں رہتے، اس عمل کی وجہ سے، جلدی جانا پڑا۔ مگر آئے وہ جہاں کیلئے تھے، جہاں کے صاحب منصب تھے۔ اعلان یہی ہوا تھا کہ:

"اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَه"۔

جنت کیلئے پیدا ہی نہیں تھے، زمین کیلئے پیدا ہوئے تھے۔

اب حدیث جو پڑھوں گا، وہ در حقیقت تفسیر قرآن ہے کہ اب اس منزل پر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر گناہ ہوتا اور یہ سب بطورِ سزا ہو رہا ہوتا تو خالق کو کیا ضرورت کہ ترکیب بتائے معافی کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ نظرِ رحمت مڑی نہیں ہے۔ یہ تڑپ رہے ہیں، اس تجیہ کی بناء پر رو رہے ہیں کہ میری خطا معاف کر دے۔ قرآن کہہ رہا ہے:

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡهِ ؕ

آدمؑ نے اپنے ربّ سے کچھ کلمات سیکھے یعنی خدا نے سکھایا کہ یوں کہو تو تمہاری توبہ قبول ہوگی۔ ارے تم بے چین ہو کہ تم مجرم ہو تو میں تمہیں ترکیب بتائے دیتا ہوں تاکہ تمہاری خطا معاف ہو جائے۔ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔ ارے معاف کرنا تھا تو یونہی معاف کر دیتا۔ مگر نہیں۔ ان کے دل کے زخم پر مرہم رکھنے کیلئے خود ترکیب بتاتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ کچھ کلمات اللہ نے سکھائے، جب ہی تو انہوں نے سیکھے۔ وہ نہ سکھاتا تو کیونکر سیکھتے؟ "تَلَقّٰۤی اٰدَمُ" آدمؑ نے سیکھے۔ "مِنۡ رَّبِّهٖ"، اپنے رب سے کچھ کلمات یعنی اُستاد نے ابھی تو نظر توجہ ہٹائی نہیں ہے۔

انہوں نے سیکھے اپنے رب سے، اپنے معلم سے، اپنے مرکزِ فیض سے کچھ کلمات۔ "فَتَابَ عَلَیۡهِ" وہ کلمات سیکھے تو اللہ نے توبہ قبول کی۔

یعنی کلمات اپنی زبان پر جاری نہ رکھتے تو وہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا۔ یہ کلمات اسی نے سکھائے، پھر یہ کلمات زبان پر جاری ہوئے تو اس نے توبہ قبول کی۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾

"وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے"۔

توبہ قبول کرنے والا تو اس نے بتائی یہ ترکیب۔ خود ہی ترکیب بتائی۔ اب وہ ترکیب کیا تھی؟ قرآن کو کافی کہنے والے وہ ترکیب بتائیں کہ کیا تھی؟

اور جب نہیں بتا سکے تو کہیں کہ نہیں بتا سکتے۔ پھر ہم بتائیں گے کہ وہ کلمات کیا تھے۔ تو اس مستدرک حاکم کی حدیث میں ہے جو معیار صحیحین پر پوری اترتی ہے کہ جناب وہ کلمات جو تھے، وہ یہ تھے کہ بارگاہِ الٰہی میں انہوں نے عرض کیا:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ ذَنْبِیْ"۔

"اے میرے پروردگار! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں محمدؐ کے حق کا واسطہ، میری توبہ قبول فرما"۔

یہ الفاظ تھے جو جاری کئے۔ میں کہتا ہوں کہ ان الفاظ کو توبہ کا ذریعہ قبول کیوں قرار دیا؟ میں کہتا ہوں کہ جس کا واسطہ دلوانا تھا، اس کے درجہ کو نمایاں کرنے کیلئے۔ تو آدم ابوالبشر کے وقت سے سنتِ توسل قائم ہوئی اور انہوں نے ان کے وسیلہ سے دعا کی۔

اب ایک بہت ہی نازک بات عرض کر رہا ہوں جسے کوئی بہت ہی حد سے بڑھا ہوا سمجھ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ براہِ راست خدا ہدایت نہیں کر سکتا، اپنے کمالِ ذات کی وجہ سے۔ لہٰذا رسولؐ کی ضرورت ہوئی۔ حضور! کوئی کام براہِ راست ہم نہ کر سکیں، اس میں کسی سے ذریعہ طلب کرنا ہوتا ہے۔ ذریعہ کے معنی وسیلہ کے ہیں۔ خالق نے ان کو اپنے اور ہمارے درمیان واسطہ بنایا۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا تھا۔ بس میں ایک دم کہہ دوں جو کہنا ہے کہ جب اللہ نے ان کو اپنے مطلب کا وسیلہ بنایا تو ہم انہیں اپنے مطلب کا وسیلہ کیوں نہ بنائیں؟

بس ایک جملہ کہہ دوں کہ وہ اپنے کمال کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم اپنے نقص کی وجہ سے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا اُسے بتقاضائے کمال وسیلہ کی ضرورت ہوئی اور ہمیں بتقاضائے نقص وسیلہ کی ضرورت ہے۔ اور پھر انہوں نے ہمیں دوسرے وسیلے بتائے۔ اگر دوسرے وسیلے نہ بتانا ہوتے تو کیوں کہتے:

"اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ"۔

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک کتاب اللہ اور ایک میری عترت جو میرے اہلِ بیتؑ ہیں۔

"مَااِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ"۔

جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

"وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ"۔

یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ دنیا کے سامنے دو چیزیں چھوڑتا ہوں اور ان کیلئے کہا کہ ان سے تمسک رکھو۔ مگر اب میں کیا کہوں اُمتِ مسلمہ کے کردار کو کہ مقامِ ہدایت میں جیسے ایک دوسرے سے جدا نہ تھے، اسی طرح مقامِ مظالم میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں رہے اور یہ مظالم کرنے کیلئے دنیا کی کوئی غیر قوم نہیں آئی۔ میں نے کہا تھا کہ انہی کے ہاتھوں قرآن بھی موردِ مظالم بنا اور اہل بیتؑ بھی موردِ مظالم بنے۔ ایک ظلم تو واقعی حقیقتاً دونوں پر ہے کہ جس میں بناو بقدر ہم بھی داخل ہیں۔ ایک تو قرآن پر ظلم یہ ہے کہ اس کو اپنی کتاب کہنے والے

اس پر عمل نہ کریں تو اس ظلم میں کہیں ہم نہ شریک ہوں کہ ان کو اپنا امام کہنے والے ان کی تعلیمات پر عمل نہ کریں۔ تو وہ اگر قرآن پر ظلم ہے تو یہ اہل بیتؑ پر ظلم ہے۔ اس کے بعد جو ظاہری مظالم ہوتے ہیں، ان میں بھی قرآن اہل بیتؑ کے ساتھ ہے اور اہل بیت قرآن کے ساتھ شریک ہیں۔

اب دو تین باتیں مسلمات تاریخی ہیں کہ قرآن جلایا گیا، نیت سے بحث نہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ قرآن جلایا گیا۔ تو اب جو قرآن کے ساتھ تھے، اس میں خانہ سیدہؑ پر جمع شدہ لکڑیاں دیکھئے، خواہ کربلا میں بلند ہوتے ہوئے شعلے دیکھئے۔ ہاں ارباب عزا! قرآن پر بھی تیر برسائے گئے ہیں۔ سلسلہ بنی امیہ کا ایک حکمران ولید ابن عبدالمالک۔ اس نے قرآن سے فال دیکھی اور فال میں یہ آیت نکلی:

"وَيْلٌ لِّكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ

"وائے ہو ہر جبار سرکش کیلئے"۔

تو بس قرآن پر غصہ آ گیا۔ قرآن کو سامنے رکھ کر اپنے ہاتھ میں تیر کمان لے کر تیر چلائے گئے جس سے اوراق قرآن پارہ پارہ ہو کر منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ اشعار کہے۔ یہ مسلمان صاحب اقتدار ہے جو ایک مقدس نام کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔ پیغمبرؐ خدا کی طرف نسبت دے کر حکومت کر رہا ہے اور یہ اشعار پڑھتا ہے جس میں خدا پر بھی طنز ہے اور قیامت پر طنز ہے۔ سب کا انکار ان میں مضمر ہے۔

وہ قرآن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

أَتُوعِدُ كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ فَهَا أَنَا ذَاكَ جَبَّارٌ عَنِيدُ إِذَا مَا جِئْتَ رَبَّكَ يَوْمَ حَشْرٍ فَقُلْ يَا رَبِّ مَزَّقَنِي الْوَلِيدُ

نام بھی اپنا درج ہے کہ سند رہے۔ تو دھمکایا کرتا ہے ہر جبار و سرکش کو تو لے یہ میں جبار و سرکش ہوں۔ جب اپنے پروردگار کے پاس حشر کے دن آنا تو کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پارہ پارہ کیا تھا۔

دیدہ دلیری دیکھ رہیں مسلمان مجرم کی۔ تو معلوم ہوا کہ تیر باراں ہوا قرآن پر۔ اب میں کہتا ہوں کہ جو قرآن کے ساتھی تھے، ان کیلئے تیروں کو تلاش کرنا ہے۔ چاہے جنازہ حسنؑ پر تیروں کی بارش دیکھ لیجئے اور چاہے کربلا میں تیروں کو دیکھ لیجئے۔ مجھے مصائب میں آگے بڑھنا ہے ورنہ وہ تیر یاد دلاتا جو عاشور کے دن کے تھے۔ وہ سب آپ کے پیش نظر ہیں۔

اب تیسرا پہلو پیش کرتا ہوں کہ قرآن نیزوں پر بھی بلند کیا گیا اور ہر غیر جانبدار صاحب نظر منصف مؤرخ سے میرا یہ سوال ہے کہ کیا یہ ہنگامی ایک ترکیب تھی؟ وقتی جو اس وقت سوجھ گئی؟

جناب! پہلے سے منصوبہ بنا ہوا تھا ورنہ مسجد جامع دمشق کا وہ قرآن جس کو ایک آدمی اکیلا اٹھا نہیں سکتا تھا، اس کو میدان جنگ میں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے یہ روز بد پیش نظر تھا کہ جب ہماری جنگ کی تمام ترکیبیں ختم ہو جائیگی تو آخر

میں قرآن سے کام لیں گے ورنہ اس کو ساتھ لینا خلافِ فطرت ہے۔ کہاں شام اور کہاں میدانِ صفین جو عراق کی حدود میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا۔ اس کے لئے بڑا قرآن ساتھ لایا گیا تھا۔ تو اب میدانِ صفین کا ایک منظر ہے اور شاید مستقبل کا ایک منظر بھی بغیر میرے بیان کیے ہوئے آپ کے ذہن میں آجائے۔ دھندلکا تھا، اس وقت پوری روشنی نہیں ہوئی تھی۔ اس دن یقین تھا کہ آج میدان میں ہماری فوج نہیں رک سکتی، شکست ہوگی۔ ایسا وقت کہ ابھی چیزیں صاف طور پر نظر بھی نہیں آرہی تھیں۔ پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی۔ اندھیرا تھا کہ اس اندھیرے میں یہ منظر نظر آیا کہ بہت سے قرآن مختلف قد و قامت کے نیزوں پر بلند ہیں اور سب سے آگے ایک قرآنِ اعظم جس کو ایک آدمی اٹھا نہیں سکتا تھا، وہ جامع دمشق کا قرآن تھا۔ اُسے کئی آدمی مل کر اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ سب سے آگے ہے۔

میں کہتا ہوں کوئی منظر آپ کے سامنے آیا کہ کوفہ و دمشق کا راستہ ہے اور مختلف نیزوں پر، میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ مختلف قد و قامت کے قرآن ہیں۔ کوئی جوان کا سر ہے، کوئی نوجوان کا سر ہے اور کوئی بچے کا سر ہے۔ مختلف قد و قامت کے قرآن نیزوں پر بلند ہیں ایک ایک طویل نیزہ پر قرآنِ اعظم وہ ہے جس کو سب سے آگے رکھا ہے۔ بالکل صفین کا مرقع ہے جو آج کھنچا ہوا ہے۔

اربابِ عزا! انہوں نے کوفہ کے بازاروں میں نیزے پر بھی ثابت کردیا کہ نانا کے ارشاد کی سچائی کو کہ دیکھو ہم سے قرآن کبھی جدا نہیں ہوتا۔ سر اور گردن الگ الگ ہوگئے لیکن ہم سے قرآن الگ نہیں ہوا۔ اس کے گواہ ہیں صحابیِ رسولؐ زید بن ارقم جنہوں نے اپنے بالا خانے پر سے جو سرِ راہ تھا، یہ سنا کہ قرآن مجید کی آواز آرہی ہے اور یہ آیت ہے:

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ ۙ كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

تم سمجھتے ہو کہ اصحابِ کہف کا واقعہ کوئی عجیب ہے تو فوراً ان کی زبان پر آیا کہ نہیں، آپ کا واقعہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔ تو یہ نیزہ پر سر ہے اور زبان پر تلاوتِ قرآن ہے۔ دیکھے دنیا کہ قرآن جدا نہیں ہوا۔ سر و گردن علیحدہ علیحدہ ہوگئے۔

اب میں کہتا ہوں کہ وہ سجدۂ آخر تھا جو عصر کو ہوا تھا اور یہ اس کے تعقیبات ہیں جو نیزے پر ادا ہو رہے ہیں۔ بہرحال انہوں نے ثابت کردیا کہ قرآن ہم سے جدا نہیں ہوتا۔

32

وسیلہ

اگر دلائل سے کوئی لاجواب ہو جایا کرتا اور قائل ہو جایا کرتا تو مباہلے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔ نہ ماننے والے کو خدا اور سول بھی نہیں منوا سکتے۔

یہ تصور کہ میرا جھنڈا تمام دنیا پر لہرائے گا، ابھی تک انتظار کا مستحق ہے۔ اب جسے توفیق ہو، وہ انتظار کرے۔

جناب ابوطالبؑ نے جعفر سے فرمایا کہ اپنے چچازاد بھائی کے دوسرے پہلو میں تم جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھئے! جو مبلغ اسلام ہے، دنیا اُس کے اسلام کے بارے میں بحث کر رہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جس کا خواب مثل بیدار ہوگا، اُس کی موت مثل حیات ہوگی۔

جب واقعہ کربلا یاد آئے تو تم یہ کہو کہ کاش! ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتے۔

وسیلہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ

کل سے توسل کا بیان ہو رہا ہے۔ جس کا ایک طبقہ منکر ہے بلکہ اُسے شرک قرار دیتا ہے۔ جب اصول طے ہو جائے تو اس کے متعلقہ تمام اُمور طے ہو جاتے ہیں۔ توسل کو پیغمبر خدا کے ساتھ مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جب آپ کے ساتھ توسل کے شواہد سے ثابت ہو جائے گا تو جتنے بھی توسل ہوں، ان ہستیوں سے جو ہمارے نزدیک آپ کے اجزاء ہیں، وہ خود بخود ثابت ہو جائیں گے۔ لہٰذا بس آج بھی دو چار شواہد گنجائش کے مطابق پیغمبر خدا کے ساتھ توسل کے سلسلہ میں عرض کئے جائیں گے۔

میں نے کل ابوالبشر کے توسل کو بیان کیا کہ حضرت آدمؑ نے ہمارے پیغمبرؐ سے توسل کیا۔ یہ مستدرک حاکم میں درج ہے جو صحیحین کے معیار پر احادیث کا صحیح مجموعہ ہے۔ کل تھا ابوالبشر کا توسل اور آج میں اپنی زبان میں یہ کہتا ہوں کہ میں ابوالائمہ کا توسل پیش کر رہا ہوں۔

آپ حضرات کے ذہن میں ابوالائمہ کے لفظ سے امیرالمومنینؑ کی ذات آئی ہوگی اور عموماً ابوالائمہ کا لفظ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کیلئے ہی بولا جاتا ہے۔ مگر آپ تو خود آئمہ میں داخل ہیں، تو ابوالائمہ کون ہوا؟ جناب ابو طالبؑ۔ اس واقعہ کے پیش کرنے سے قبل ایک غلط آماجگاہ بحث جو ان کے ایمان کے بارے میں مدتوں سے قائم ہے، اس کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ جب ماننا نہ ہو تو چاہے کتنے ہی دلائل پیش ہوں، مرکز بحث ٹوٹتا تو ہے نہیں۔ اگر دلائل سے کوئی لاجواب ہو جایا کرتا اور قائل ہو جایا کرتا تو مباہلے کی ضرورت کیوں پڑتی؟ یہ ماننے والے کو خدا اور رسول بھی نہیں منوا سکتے۔

میں کہتا ہوں کہ مباہلے کے بعد بھی باوجودیکہ احساس حقانیت کی وجہ سے مقابلہ نہیں کیا مگر پھر بھی مانا نہیں، ہتھیار ڈال دیے۔

یہ الفاظ جو میں نے ان کے بارے میں کہے، یہ امیرالمومنینؑ علیہ السلام نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کیلئے ارشاد فرماتے جو آپؑ سے برسرپیکار تھے کہ:

"مَا اَسۡلَمُوۡا وَلٰکِنِ اسۡتَسۡلَمُوۡا"۔

یہ کوئی اسلام لائے تھے؟ انہوں نے تو اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ یہ اتنا خطرناک نہیں تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی رہے کافر ہی۔ یہ ہتھیار ڈالنا زیادہ خطرناک تھا کہ ہتھیار ڈال کر منافقت کا لباس اختیار کیا۔ بنامِ اسلام استسلام ہوا۔ غرض یہ کہ مرکز بحث تو رہے گا قائم لیکن اس پر روشنی ڈالنا تو ضروری ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اس ذات سے مخصوص نہیں جس کے بارے میں ذکر ہو رہا ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں بھی یہی سوال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے لئے بھی دیکھئے کہ جس وقت ابرہہ آیا ہے جس

کا تذکرہ سورۂ فیل میں بطور یادگار موجود ہے، وہ کعبہ کو ڈھانے کیلئے آیا تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگوں نے مقابلہ کیا۔ یہ نہیں ہے کہ لاوارث چھوڑ دیا ہو کعبے کو۔ مگر ہر ایک شکست کھا رہا تھا۔ اُس کے پاس سامانِ حرب اتنا تھا۔ کہ یہ عرب اس سے مقابلہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ لڑتا ہوا مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گیا تھا، شکست دیتا ہوا۔ بہت جگہ مزاحمت ہوئی مگر کوئی مزاحمت کامیاب نہیں ہو سکی۔

وہ پہنچ گیا کعبے کے قریب تک اور یہاں سردارِ مکہ حضرت ابو طالبؑ کے والد بزرگوار سید البطحا حضرت عبد المطلبؑ تھے جن سے سیادت کا سلسلہ چلا اور انہی کے اولاد سادات کہلائی۔ جناب عبد المطلبؑ میں اس وقت کوئی اضطراب نہیں تھا، کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ کوئی مجلس شوریٰ بھی مرتب نہیں کرتے کہ یہ سخت وقت پڑا ہے تو کیا کیا جائے۔ گویا تدبیر سوچ ہوئے ہیں، کسی دوسرے سے رائے نہیں لے رہے ہیں۔ مادی مقابلہ کرنا ہو تو رائے لیں، جب روحانی مقابلہ ہے تو جس سے لو لگانا ہے، اہل شوریٰ اُس سے بیگانہ ہیں تو پھر مشورہ کس سے کریں۔ لہٰذا چپکے بیٹھے ہیں۔ لوگ آ آ کر فریاد کر رہے ہوں گے اور آپس میں چہ چا۔ کر رہے ہوں گے کہ دیکھئے صاحب! ان کو کوئی فکر ہی نہیں ہے، یہ مطمئن بیٹھے ہیں۔ یہاں تک کہ گردو پیش میں جب فوج آتی ہے تو لوٹ مار بھی کرتی ہے۔ کوئی جنگ بھی نہیں کر رہے ہیں مگر مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا۔ اسی میں ان کے گوسفند جو چرتے تھے، وہ اس کی فوج والے لے گئے۔ انہیں خبر ہوئی اور یہ گئے اس کے پاس۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ مجھ سے کعبہ کی خاطر التجا کرنے آئے ہیں۔ مقابلہ تو کر نہیں سکتے، میرے پاس گویا التجا لے کر آئے ہیں۔

وہ ان کے نام سے واقف تھا، ان کے منصب سے واقف تھا کہ سردار قریش ہیں اور مکہ کے سردار ہیں۔ اس نے حاجب اور دربان سے کہا کہ آنے کی اجازت دو۔ وہ آئے تو اعزاز کیا، احترام کیا۔ کافر تھا لیکن شرافت رکھتا تھا۔ دربار میں بلاتا تھا تو صاحب عزت کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے؟ ان کی جلالت اور وجاہت سے وہ متاثر بھی ہوا۔ ان کی شکل و شمائل اور نورانیت کا کچھ اثر اس کے دل پر پڑا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے؟ کہا کہ تمہاری فوج والے میرے مویشی لے آئے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟ میری تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آخر میرے مویشی تم نے کیوں لے لئے؟ اس نے کہا کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو میرے دل پر آپ کی بزرگی کا بہت اثر قائم ہوا تھا لیکن یہ جو آپ نے مجھ سے بات کہی، اس کی وجہ سے تو آپ کی وقعت میری نظر میں کم ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ وہ کیوں؟ اُس نے کہا کہ اتنے سے مویشیوں کیلئے آپ میرے پاس آئے ہیں اور یہ آپ کے آباؤ اجداد کی عزت کا باعث ہے اور آپ کی قومی عزت جس سے وابستہ ہے، اُس کیلئے آپ ایک حرف نہیں کہہ رہے۔

بس اب جو جواب دیا ہے انہوں نے، اس سے ان کے ایمان بالغیب کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا، آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر کہ مویشی میرے ہیں، اس لئے مجھے ان کی فکر ہوئی۔ کعبہ کا بھی ایک مالک ہے، اُسے بچانا ہو گا تو بچالے گا۔

اب دنیا دیکھے کہ مشرکین کے معبود کعبہ میں موجود تھے۔ یہ نہیں ہے کہ بعد میں لا کر رکھے گئے ہوں۔ مگر عبد المطلب نے کسی طرف جا کر التجا نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن سب کے معبود تھے مگر ان کا معبود وہی تھا جو پردۂ غیب میں ہے۔

جو دنیا جناب عبد المطلب کے ایمان کو تسلیم نہیں کرتی، وہ بیٹے کے ایمان کو بھی تسلیم نہیں کرتی یعنی جناب ابو طالبؑ کے ایمان کو۔

اس کیلئے اپنی کتب سے جن کو انتہائی مستند تسلیم کر رکھا ہے، حکایتیں پیش کردیتے ہیں کہ ان سے رسولؐ نے مرض الموت کے وقت کہا تھا کہ کلمہ پڑھیے لیکن انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا۔ اس پر میں نے تاریخ اسلام میں بھی تبصرہ کیا ہے کہ بعثت سے لے کر وفاتِ ابوطالبؑ تک گیارہ بارہ برس ہیں۔ اس عرصہ میں رسولؐ نے کبھی ان کو دعوتِ حق نہیں دی۔ کوئی انہی صحاح میں سے غلط روایت پیش کردی جائے جو خود ان لوگوں کی نگاہ میں غلط ہو اور صحاح میں اس کا وجود دلیل صحت بنایا جائے۔ کوئی کسی کارخانے کی گھڑی ہوئی روایت پیش کردی جائے کہ اس گیارہ بارہ برس کے طویل عرصہ میں کبھی پیغمبرؐ نے ان سے عرض کیا ہو، کہا ہو۔ چونکہ چچا تھے، اس لئے بطورِ عرض ان سے کہا ہو کہ چچا! کلمہ پڑھ لیجئے۔ گیارہ بارہ برس تک میدانِ حدیث ویران ہے۔ دنیا اخبار سنسان ہے۔ کوئی روایت نہیں بتاتی کہ کس وقت رسولؐ نے یہ کہا ہو۔ کیا ہمارے پیغمبرؐ دنیا کے غلط معیار والے سیاست دان قسم کے آدمی تھے اور کمزور قوتِ ارادی والے کہ گیارہ بارہ برس دھڑکا رہا کہ کہوں گا کہ کلمہ پڑھ لیجئے تو کہیں بگڑ نہ جائیں تو جو مدد مل رہی ہے، وہ موقوف ہو جائے۔

یعنی اس مدد کے خیال سے بارہ برس دعوتِ حق کا فرض انجام نہیں دیا جاتا۔ دنیا بتائے کہ کیا یہ رسولؐ کی شان ہے؟ گویا سوچ رکھا ہے کہ ابھی جتنا مشکل کام نکل سکتا ہو، اتنا تو نکالا جائے، کہیں بھڑک نہ جائیں، پریشان نہ ہو جائیں، خفا نہ ہو جائیں۔ لہٰذا کام جو نکل رہا ہے، وہ بند نہ ہو جائے۔ رہی سہی جو جائے پناہ ہے، کہیں وہ قابو سے نہ چلی جائے۔ لہٰذا کام چلاتے رہو، جب آخری وقت ہوگا، اس وقت پیشکش کروں گا جبکہ معلوم ہوگا کہ اب کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اب اس کے بعد خفا بھی ہوں گے تو کیا کریں گے! وہ تو دنیا سے جا رہے ہوں گے، اس وقت کلمہ پڑھنے کی خواہش کروں گا اور ایک طبقہ کے ہاتھ میں ان کے عدم اسلام کی سند دے دوں گا۔ یہ صلہ ہوگا ان کی سب خدمات کا۔ کیا کسی مسلمان کا ضمیر اپنے پیغمبر کے لئے ایسے کردار کو قبول کرنے کیلئے تیار ہے؟ اب یا کردارِ رسولؐ کو بچائیے یا صحاح کی صحت کو بچائیے۔

اب بات آگئی کلمہ پڑھوانے کی، تو دو چار جملے اصولی اور عرض کروں کہ جناب! یہ تمام مسلمانوں کا مجمع ہے، کیا آپ سب کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں؟ میں عرض کرتا ہوں کہ کتنی تقاریب ہیں جو مسلمانوں کے رواج میں داخل ہیں۔ جس وقت سے بچہ آتا ہے، اس وقت سے قیدِ رسوم میں گرفتار ہوتا اور پھر قیدِ ہستی سے رہا ہو جاتا ہے مگر قیدِ رسوم سے پھر بھی رہا نہیں ہوتا۔ نہ جانے کتنی رسمیں مجھے معلوم ہیں۔ یہ شریعت ایسی ہے کہ ملکوں کے اختلاف سے کیا، شہروں کے اختلاف سے بدلتی ہے کہ کسی گھر میں کوئی رسم ہے، کسی گھر میں نہیں ہے۔ جو نام مجھے معلوم ہیں، وہ عرض کرتا ہوں۔ جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے، چھٹی ہے، چلہ ہے، عقیقہ، ختنہ، اس کے بعد کھیر چٹائی ہے اور نہ جانے کیا کیا؟ مگر مجھے کسی مسلمان کے ہاں علم نہیں ہے کہ کلمہ پڑھوائی کی رسم ہوتی ہو۔ اگر کلمہ پڑھنا اسلام کیلئے ایسی ضروری چیز ہے تو یہ مہمل رسمیں آپ اختیار کئے ہوئے ہیں اور جو جزوِ دین ہونا چاہئے، بنائے دین ہونا چاہئے، وہ بالکل نہیں ہے۔ حالانکہ ایک اور تقریب جو مذہبی حیثیت رکھتی ہے، اس کا نام رکھ دیا ہے مسلمان ہونا۔ مگر واقعی جس کا نام ہونا چاہئے مسلمان ہونا، اس کا تصور ہی نہیں ہے۔

اب ایک بڑی نازک بات کہتا ہوں، اپنے نقطۂ نظر سے بھی، گویا اپنے قلبِ ایمانی پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ آخر باپ کے بارے میں یہ بحث ہے، کوئی روایت بتائیے کہ کبھی بیٹے سے کلمہ پڑھوایا ہو۔ جتنے بیٹے ہیں، سب بے کلمہ پڑھے ہوئے مسلمان ہوئے

ہیں۔ جعفر بھی سابقین اسلام میں سے ہیں۔ سابق علی الاسلام نہ سہی لیکن سابقین علی الاسلام میں سے ہیں۔ جناب جعفر طیارؑ کیلئے بھی یہ نہیں کہ کلمہ پڑھا ہو بلکہ ان کے اسلام کی ابتداء مجھے معلوم ہے، بے کلمہ پڑھے ہوئے۔

واقعہ سے ثابت کہ حضورؐ نے نماز پڑھنا شروع کی۔ عالم ظاہر میں جیسے رسالت ظاہر ہوئی، ویسے ہی نماز بے نقاب ہوئی۔ سب سے پہلا شعائر دینی بعدِ اسلام۔ رسالت مآب مبعوث ہوئے اور بس۔ کعبہ کے پاس آ کر پہلی تبلیغ اسلام گویا یہی تھی۔ جیسے کہ مامور ہیں کہ زبان خاموش رہے، کوئی تبلیغ نہ کریں مگر کعبہ کے سامنے آ کر نماز شروع کر دی۔ چنانچہ جتنی حالاتِ صحابہ میں کتابیں ہیں، علامہ عبدالبر، حافظ ابن حجر وغیرہ کی کئی کئی ہزار صفحات کی کتابیں جو حالاتِ صحابہ میں ہیں، ان سب میں یہ واقعہ درج ہے کہ عبداللہ ابن عفیف ایک شخص ہے جو تجارت کیلئے مکہ معظمہ میں آیا کرتا تھا اور جناب عباس، عمِ رسول بھی تجارت پیشہ تھے۔ وہ بسلسلہ تجارت جناب عباس کے پاس آیا ہے اور اس نے خود بھی بعد میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور چونکہ اس نے بعد میں خود اسلام قبول کیا تو صحابہ کا جزو بنا۔ اسی لئے صحابہ کے حالات کی کتاب میں اس کا تذکرہ ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں عباس کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک جوان آیا۔ چالیس برس کی عمر کا آدمی جوان ہی ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کو جوان ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک جوان آیا، کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر ایک عمل میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد ایک بچہ آیا، بچے کو بوڑھا تو نہیں بتایا جا سکتا۔ بچہ جو بھی ہے، وہ بچہ ہی ہے۔ وہ بچہ آیا اور وہ اس جوان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ بالکل ملا ہوا تقریباً۔ کیونکہ جب ایک ماموم ہو تو وہ بالکل عقب میں نہیں ہوتا۔ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ وہ داہنی طرف کھڑا ہوتا ہے۔ جماعت ہو تو وہ پیچھے ہوتی ہے۔ ابھی جماعت نہیں ہے، فرد ہے۔ ہم تو فرد کے ماننے والے ہیں۔ تو جناب وہ بچہ آ کر تقریباً پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون آئی اور وہ ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس وقت یہ ترقی یافتہ دور نہیں تھا کہ وہ پہلو میں کھڑی ہوتی۔ اس وقت کی خواتین اپنی توہین سمجھتی ہیں کہ پیچھے کھڑی ہوں۔ تو وہ خاتونِ معظمہ پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ وہ کبھی جھکے اور کبھی زمین پر متصل ہو گئے۔ میں غور سے دیکھتا رہا اور میں نے عباس سے کہا کہ میں اس وقت یہ عجیب منظر دیکھ رہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جناب عباس نے کہا کہ وہ میرا بھتیجا ہے جو پہلے آیا اور وہ بچہ میرا دوسرا بھتیجا ہے جو اس کے بعد آیا اور وہ میرے بھتیجے کی، اب میں اپنے ہاں کے محاورے کے حساب سے کہتا ہوں کہ، دلہن ہے۔ چونکہ چچا کہہ رہا ہے تو ہمارے ہاں کے محاورہ کے مطابق وہ یونہی کہے گا۔ عربی میں تو یہ محاورے نہیں ہیں۔ تو یہ اس کی زوجہ ہے جو عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ میرے اس بھتیجے کا دعویٰ ہے کہ میں خدا کی طرف سے اس منصب پر فائز ہوا ہوں جس کا نام نبوت ہے اور ابھی تک ان دو کے سوا کسی نے اس کے پیغام کو قبول نہیں کیا ہے۔

اب جو جو نام آئیں، وہ سابقین میں سے نہیں ہو سکتے۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے جو عرض کر رہا ہوں کہ سوائے ان دو کے کسی نے اس پیغام کو ابھی تک قبول نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ شرق و غرب عالم پر میرا پھریرا لہرائے گا اور تمام دنیا اس نقشِ قدم پر آنے کیلئے تیار ہو گی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تصور کہ میرا جھنڈا تمام دنیا پر لہرائے گا، ابھی تک انتظار کا مستحق ہے۔ اب جسے توفیق ہو، وہ انتظار کرے۔

ایکدوسری روایت تاریخ کی یہ ہے کہ چند روز گزرے اس پر، ادھر سے جناب ابوطالب کا گزر ہوا۔ ان کے ساتھ جعفر تھے۔ دوسرے بیٹے جناب امیرؑ سے 20 برس بڑے تھے۔ جناب جعفران کے ساتھ تھے۔ جناب طالبؑ نے اس کو اجنبیت سے نہیں دیکھا۔ یعنی ان کو تو وہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی تھی لیکن جناب ابوطالبؑ نے اس کو اجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ یہ جملہ ہے تاریخ کا کہ جعفر سے فرمایا کہ اپنے چچازاد بھائی کے دوسرے پہلو میں تم جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھئے! جو مبلغ اسلام ہے، دنیا اس کے اسلام میں بحث کر رہی ہے۔

چنانچہ ان کے کہنے سے جعفرآ کر شریک ہو گئے۔ حالاتِ صحابہ کی کتابوں میں جعفر کے حال میں دیکھیے کہ سابقین علی الایمان میں تھے۔ یہ وہی ایمان ہے جو بغیر کلمہ پڑھے ہوئے تھے اور متفق علیہ پر اسلام شرطِ صحتِ نماز ہے اور وہ بغیر کلمہ پڑھے ہوئے نماز میں شریک ہوئے۔ پھر رسولؐ نے نہیں کہا کہ کلمہ تو تم نے پڑھا نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بے نیاز کلمہ تھے۔ ان کا اسلام کلمہ پڑھ کر نہیں ہوا تھا، وہ ان کا اسلام ہو گا جو رسمی طور پر اسلام لانے والے تھے۔

بس اب ان کا توسل، اس واقعہ کو پیش کر دوں جیسے میں نے وہاں کہا کہ عبدالمطلب لات وہبل کے پاس نہیں گئے اور کسی دوسری طرف رُخ نہیں کیا۔ ویسے ہی اس واقعہ میں دیکھ لیجئے کہ مکہ معظمہ میں قحط پڑا، ایسا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے اور غلہ کی نایابی ہو گئی۔ بزرگ ہونا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ سب سمٹ کر جناب ابوطالبؑ کے پاس آئے کہ لوگ مر رہے ہیں، کچھ کیجئے۔ تو جناب طالبؑ نے کہا کہ اچھا، گویا کہ تدبیر کرتا ہوں۔ تدبیر کیا تھی؟ معاذ اللہ، لات وہبل کے پاس یہ بھی نہیں گئے۔ اُدھر رُخ کر کے کوئی التجا نہیں کی بلکہ پیغمبر کا ہاتھ پکڑا اور ان کا ہاتھ پکڑ کے جو طریقہ استسقاء اسلام کی شریعت میں ہے کہ صحرا میں نکلو۔ نمازِ استسقاء کی ترکیب یہی ہے کہ صحرا میں نکلو۔ تو اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑ کر صحرا لے جاتے ہیں۔ یہاں روایت کی کوتاہی ہے کہ ان کے الفاظ نقل نہیں کئے کہ انہوں نے الفاظ کیا کہے؟ مگر یہ کہ اُدھر رخ کر کے یعنی غیبی معبود کو پکارا ہے۔ عالم مشاہدہ کے بنائے معبودوں کو نہیں پکارا ہے ورنہ جنگل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں جا کر التجا کی۔ یقیناً واسطہ دیا لیکن چونکہ روایت میں نہیں ہے۔ لہٰذا میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ واسطہ دیا۔ ساتھ کیوں لے گئے تھے؟ اپنے ساتھ لے گئے، اس کے بعد ابر آیا۔ ابھی واپس نہیں آئے تھے کہ بادل سمٹ سمٹ کر آنے لگے اور بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ روایت میں یہ ہے کہ سبزہ لہلہانے لگا اور اونٹ جو دبلے ہو گئے تھے، وہ فربہ ہو گئے، اتنا کافی غلہ پیدا ہوا۔ اب اس کے بعد جو انہوں نے اشعار نظم کیے ہیں، وہ جزوِ تاریخ ہیں بلکہ جزوِ حدیث ہیں۔

ان سے پتہ چلتا ہے کہ کیا کہا ہوگا۔ وہ اشعار یہ ہیں:

وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ
ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ
يَلُوْذُ بِهِ الْهُلَّاكُ مِنْ اٰلِ هَاشِمٍ
فَهُمْ عِنْدَهٗ فِيْ نِعْمَةٍ وَّفَوَاضِلِ

پہلی لفظ جو ہے اس کو میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس رشتہ کا ترجمان ہے جو نہیں حاصل ہے۔ یعنی یہ چچا ہیں اور وہ بھتیجے۔ یہ لفظ شاید کوئی دوسرا نہ کہتا کہ "وَاَبْيَضُ" ارے وہ گوراچٹا۔ یہ چچا نے اپنی نگاہ سے دیکھا اور اس کو اپنی زبان میں کہا ہے کہ وہ گوراچٹا "يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ" "بِوَجْهِهِ"، جس کے چہرے کے ذریعہ سے ابر سے پانی لیا جاسکے۔ "وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ" ۔ وہ گورا بچہ حسین کہ ابر سے طلب باراں کیا جائے۔ لفظوں میں یہ نہیں کہہ رہے کہ خدا سے طلب باراں کیا جائے۔ ابر سے طلب باراں کیا جائے جس کے چہرے کے ذریعہ سے "ثمال الیتامیٰ"، وہ یتیموں کی جائے پناہ ہے، بیواؤں کی حفاظت کا قلعہ ہے۔ "يَلُوْذُبِهِ الحلاة مِنْ اٰلِ هَاشِم"، نبی ہاشم کے وہ لوگ جو جاں کنی میں ہیں، جب وقت پڑتا ہے تو اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اسی سے پناہ لیتے ہیں۔

تو جب اس کے پاس جاتے ہیں تو نعمتوں میں ہوجاتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ یہ ابو طالبؑ ہیں۔ انہوں نے توسّل کیا ہے یا نہیں رسولؐ کے ساتھ؟ اور نتیجہ کو ان کے چہرہ سے وابستہ کیا ہے کہ ان کے چہرے کے ذریعہ سے طلب باراں ہوتا ہے۔ ابھی کوئی گستاخ جو ان کے ایمان میں بحث کرے، اس کو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ ان کی کیا بات؟ ہم جسے شرک کہتے ہیں، وہ معاذ اللہ تھے ہی مشرک تو انہوں نے کہہ دیا کہ رسولؐ کے ذریعہ طلب باراں ہوتا ہے۔ یہ بھی ہمارے نقطہ نظر سے شرک ہی ہے مگر میں نے ایک لفظ بدلا تھا کہ جزو تاریخ نہیں، جزو حدیث بھی ہے کہ اب ابو طالب دنیا سے اٹھ چکے ہیں اور پھر اتفاق سے مدینہ میں قحط پڑا اور مسلمان آئے اور انہوں نے عرض کیا کہ طلب باراں کیجئے۔ اب رسولؐ استسقاء کیلئے، جو شریعت کا جزو ہے، میدان میں گئے اور وہاں جا کر نماز کا جو طریقہ ہے، اس طرح دعا کی اور پھر اسی طرح سے بادل آئے اور پھر اسی طرح سے بارش ہوئی۔

اب لوگ آ آ کر رسولؐ کی خدمت میں مبارکبادیں دینے لگے۔ ان کو کیوں مبارکبادیں دے رہے ہیں؟ کیا یہ مبارکبادیں دینے والے سب مشرک ہیں؟ خدا کا کام ہے بارش بھیجنا۔ یہ رسولؐ کو مبارکبادیں کیوں مل رہی ہیں؟

کہتے ہیں کہ رسولؐ آپ کی بدولت جاتی ہوئی جان واپس آئی۔ آپ کی بدولت سب زندہ ہوگئے۔ یہ سب رسولؐ کے سر سہرا باندھ رہے ہیں۔ ہم کوئی چیز ان سے طلب کریں، تو دنیا کہے شرک اور وہ سب اس نتیجہ کو رسولؐ سے وابستہ کر رہے ہیں اور آپ کو مبارکباد دے رہے ہیں اور رسولؐ توحید، پیغمبرِ اسلام ان کی مبارکبادوں کو قبول کر رہے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر سے وہ شرک کی تائید کر رہے ہیں۔ اب میں کہتا ہوں کہ پیغمبرِ خدا فرماتے ہیں کہ ارے تم سب مبارکباد دے رہے ہو، کسی کو میرے چچا ابو طالبؑ کے وہ شعر بھی یاد ہیں؟ چونکہ خدا نے کہہ دیا تھا کہ ہم نے ان کو شعر گوئی نہیں سکھائی، اس لئے وہ شعر آپ کو یاد تھے مگر اسے نبھانا تھا کہ پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ شعر گوئی سے الگ رکھنے میں شعر گوئی کی توہین نہیں تھی ورنہ آپ کے سامنے اشعار پڑھے جاتے تو آپ اس کی تائید کیوں کرتے؟ اور شعراء کو انعامات کیوں دیتے؟ وہ شعر گوئی سے الگ رکھنا اس حکمت سے تھا جس کی وجہ سے خط و کتابت سے الگ رکھے گئے تھے۔ نہ اس سے خط و کتابت کی توہین ہوتی ہے نہ اس سے شعر گوئی کی توہین ہوتی ہے۔

تو غرض یہ کہ اشعار عموماً آپ نہیں پڑھتے تھے۔ فرمایا کوئی ہے جو وہ شعر پڑھے؟ جیسے مشتاق ہیں ان [illegible] کے۔ ایک فرد

نے وہ اشعار پڑھے۔ یعنی اس وقت کے شعراء کے کلام سے اتنے مطمئن نہیں ہیں جتنے ابوطالبؑ کے کلام سے مطمئن ہیں۔ اب کسی میں ہمت ہے کہ وہ کہے کہ چونکہ وہ مشرک تھے، اب یہ رسولؐ جو پڑھوا رہے ہیں، یہ کیا ہیں؟ پیغمبر توحید۔ ان اشعار کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ اب اسی کے بعد قبیلہ کنعانہ کا ایک شاعر کھڑا ہوتا ہے، اُس نے دیکھ لیا کہ رسولؐ کو وہ اشعار بہت پسند ہیں تو اب وہ جو اشعار نظم کرتا ہے، اس موقعہ پر، اس میں حوالہ دیتا ہے ابوطالبؑ کا۔

یہ رکے، قافیہ میں اشعار تھے۔ درحقیقت پس منظر میں ابوطالبؑ کا شعر ہے۔ بعض وقت شعر بتا دیتا ہے کہ کونسا شعر اس کے ذہن میں ہے اور کس کے تتبع میں اس نے کہا ہے۔ انہوں نے چونکہ یہ شعر کہا تھا:

وَاَبْيَضَ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ۔

"وہ گورا جس کے چہرے کی بدولت ابر سے بارش آتی ہے"۔

تو جو یہ شعر کہتا ہے، مطلع ہی میں کہتا ہے:

بِوَجْهِهِ النَّبِي سُقِيْنَا الْمَطَرَ۔

"نبی کے چہرے کی بدولت ہمیں بارش نصیب ہوئی"۔

معلوم ہوا کہ سبق لے لیا ہے ابوطالبؑ سے۔

اب یہ بات سن کر رسولؐ کو فوراً تو کہنا چاہیے تھا کہ یہ میرے چہرے کو کیوں کہہ رہے ہو؟ مگر نہیں، رسولؐ خاموش ہو گئے۔ بعد میں اسے داد دی کہ بہت اچھے شعر تم نے کہے ہیں اور اس کے بعد تو وہ شاعر کھل گیا۔ اس نے کہا:

وَكَانَ كَمَا قَالَ لَهُ عَمُّهُ۔

اور وہ ویسے ہی ثابت ہوا جیسا ان کے چچا نے کہا تھا۔

چچا کی تصریح کر دی۔ دوسرے مصرع ہیں "ابوطالب"، جو ان کے چچا ابوطالبؑ نے کہا تھا، ویسے ہی ثابت ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ ان کا عمل پیغمبر خدا کے دل میں گھر کیے ہوئے تھا اور ان کے اشعار آج تک آپ خود یاد کرتے تھے اور روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نہیں، متعدد مرتبہ آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ پڑھو، میرے چچا ابوطالبؑ کے اشعار پڑھو کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟

تو اب کون ہے صحیح مسلمان کہ جو توسل کا منکر ہو اور اُسے شرک قرار دے۔ اب آخر کلام میں میں خود رسولؐ کا توسل پیش کرتا ہوں۔ رسولؐ کس سے توسل کریں؟ جیسے خدا کس کی تسبیح کرے؟ تو خدا جب تسبیح کرے گا تو:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ۔

کہہ کر خود اپنی ہی تسبیح کرے گا۔ ویسے ہی اب پیغمبرؐ دنیا کو یہ اصول بتانے کیلئے کہ توسل شرک نہیں ہوتا، خود توسل فرما رہے ہیں۔ مگر یہ کس سے توسل کریں؟ آدمؑ سے توسل کریں، یہ کس سے توسل کریں؟ تو جیسے اللہ تسبیح پڑھتا ہے مگر اپنی، ویسے ہی یہ توسل کرتے ہیں۔ پہلے اپنا نام لیتے ہیں، پھر سب انبیاء کا اپنے ساتھ شریک کر کے نام لیتے ہیں۔ وہ کب کا واقعہ ہے؟ میں نے جب ابوطالبؑ کو

ابوالآئمہ کہہ دیا تو بالکل آسان ہے میرے لئے کہ ام الآئمہ کی وفات کا وقت آیا یعنی جناب فاطمہ بنت اسد۔ ان کا سابق الاسلام ہونا دنیائے اسلام میں مرکز اجماع کہ یہ سابقین اسلام میں سے ہیں۔ ابوطالبؑ کے ایمان میں تو شک کرتے ہیں لیکن ان کے ایمان میں کوئی شک نہیں۔ حالانکہ رسولؐ نے اسلام کے بعد اپنی بیٹیوں کے نکاح تڑوا دیے جو کافروں کے ساتھ تھے۔ مگر ایک ہستی ہے کہ جو سابق الاسلام ہے اور وہ آخر حیات تک ابوطالبؑ کے حبالۂ عقد میں ہے۔ ان پر بس نہ تھا تو جی سے کہہ سکتے تھے کہ اب آپ کیلئے الگ ہو جانا واجب ہے۔ مگر جس ڈر سے کلمہ نہ پڑھوایا (معاذ اللہ) اسی ڈر سے ہمت نہ ہوئی کہ گھر کے اندر تفرقہ ڈال دیں۔ وہ آخر تک ابوطالبؑ کے حبالۂ عقد میں رہیں۔ وہ مہاجرات میں سے بھی ہیں۔ یعنی ہجرت تک وہ زندہ تھیں۔ یعنی ابوطالب کی تو وفات ہو گئی تھی دو برس پہلے مگر وہ ہجرت کے وقت زندہ تھیں اور حضرت علیؑ جب مکے سے روانہ ہوئے، رسولؐ کی حفاظت کا فرض ادا کر کے اور مشرکین کی امانتیں واپس کر کے جب آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو روایت میں یہ ہے کہ فواطم کو اپنے ساتھ لے لیا۔

ہمارے پنجتنؑ پاک میں چار وہ ہیں کہ جن کے نام عرب میں اس سے پہلے نہیں ہوتے تھے۔ وہ صرف اللہ کے رکھے ہوئے نام تھے مگر فاطمہ اس سے پہلے بھی خواتین کا نام ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ لفظ ہے وہاں کہ فواطم کو لے کر روانہ ہوئے۔ فاطماؤں کو لے کر روانہ ہوئے۔ تو فاطمائیں کون ہیں؟ فاطمہ بنت اسد ہیں، فاطمہ بنت رسولؐ ہیں، فاطمہ بنت زبیر ہیں۔ ان فواطم کو لے کر روانہ ہوئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں آ کر فاطمہ بنت اسد کی وفات ہوئی۔ امیر المومنینؑ نے آ کر عرض کیا کہ میری ماں فوت ہو گئی ہیں۔ روایت میں ہے کہ رسولؐ نے اسی وقت فرمایا کہ یہ نہ کہو کہ میری ماں، تم کیوں کہتے ہو میری ماں؟ مجھ سے کہو کہ آپ کی ماں۔ اس کے بعد جب لاش پر آئے تو اس وقت بھی آپؐ نے فرمایا، یہ جملہ، یہ الفاظ متفق علیہ ہیں "یَا اُمِّیْ بَعْدَ اُمِّیْ"، "اے میری ماں کے بعد میری ماں"۔

ایک اور بحث ہے یہاں، اس کیلئے کہہ رہا ہوں کہ دیکھئے! مردے سے خطاب کر رہے ہیں رسولؐ، اے میری ماں کے بعد میری ماں۔ اب کچھ آنسو بھی نکلے۔ تجہیز و تکفین کا جو سامان فرمایا تو روایت میں ہے کہ قبر کھودنے میں خود شریک تھے۔ مٹی نکال نکال کر خود الگ رکھ رہے تھے۔ جب قبر تیار ہو گئی تو قبر کے اندر تشریف لے گئے، خود لیٹے اس قبر کے اندر۔ اس کے بعد ان کو قبر میں لٹایا گیا اور دفن کیا گیا تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ۔

"اے اللہ! جو زندہ کرتا ہے اور موت عطا کرتا ہے۔"

وَهُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔

اور زندہ کرتا ہے جس کو موت نہیں ہے۔

پھر اللہ کی طرف رخ کر کے کہا:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمِّیْ فَاطِمَةَ بِنْتِ اَسَدٍ۔

اے پروردگار! میری ماں۔

اب ان کے کردار کا خدا کو گواہ بنا رہے ہیں کہ میری ماں فاطمہ بنت اسد کو بخش دے۔ اس پر اپنی رحمتیں نازل فرما بحق نبی۔

دیکھئے! خدا اپنی تسبیح پڑھتا ہے اور یہ اپنا واسطہ دے رہے ہیں۔ صرف ہمیں یہ اصول بتانے کیلئے کہ واسطہ دینا شرک نہیں ہے۔ توسل شرک نہیں ہے۔

"بِحَقِّ نَبِيِّ وَالْاَنْبِيَائِكَ"۔

نبی کے حق سے۔ یہ خود ہیں اور تمام انبیاء کے حق سے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبر توحید خود توسل کر کے اصول قائم کر رہے ہیں کہ اگر مرکز توجہ اللہ ہو تو پھر واسطہ دینے میں، توسل کرنے میں شرک نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو سب زندگی میں توسل ہے رسولؐ سے۔ اس سے ہمیں اختلاف نہیں مگر بعدِ رسول قبرِ رسولؐ پر آ کر توسل شرک ہے۔ یہ جتنے شواہد ہیں، سب حیاتِ رسولؐ سے متعلق ہیں۔

سوال جو ہے ہمارا، وہ بعدِ حیاتِ رسولؐ ہے۔ مجملاً چند اصولی باتیں عرض کرتا ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو بات شرک ہے، وہ زندہ کے ساتھ ہو تو بھی شرک، مردہ کے ساتھ ہو تو بھی شرک۔ کیا زندہ کو شریک خدا کرنا جائز ہے؟ اور مردہ کو شریکِ خدا کرنا ناجائز ہے؟ جو شرک ہے، وہ زندہ کیلئے ہو تو شرک، مردہ کیلئے ہو تو شرک۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ مردہ مانتے ہیں تو اگر کوئی مردہ کو پکار رہا ہے تو مہمل ہوگا، فضول ہوگا، مگر شرک کیونکر ہوگا؟

یہ ایک اصولی بات کہ شرک میں زندہ اور مردہ کا کوئی فرق نہیں کیونکہ شرک شانِ خدا کے لحاظ سے ہے۔ بندے میں حیات وموت کا فرق ہوتا ہے، شانِ خدا میں حیات وموت کا فرق نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب اصول ثابت ہو گیا کہ توسل شرک نہیں ہے، تو بحالتِ حیات توسل ہوگا تو شرک نہیں ہوگا، بعدِ وفات زیادہ سے زیادہ بیکار ہوگا مگر شرک نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ایک اصولی بات ہوئی۔ دوسرے ایک شاہد پیش کر دوں بعدِ وفات کا بھی۔ اس کے بعد تیسری اصولی بات کروں۔ بعدِ وفاتِ رسول قحط پڑا۔ اب کیا کریں؟ لوگ اس وقت تو رسولؐ کے پاس آئے تھے۔ بعدِ وفاتِ رسولؐ جو قحط پڑا تو جہاں آئے، اس سے ظاہر ہے کہ آنے والے کس مسلک کے ہیں۔ پہلے رسولؐ کے پاس آئے تھے، اب جنابِ اُم المومنین کے پاس آئے۔ کسی اور کو نہیں مان رہے تھے، جنابِ ام المومنین کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ مر رہے ہیں۔ رسول تو اب رہے نہیں، کیا کریں؟ جنابِ ام المومنین نے ترکیب بتائی۔ قرآن کی زبان میں تو جتنے افراد ہیں، سب اُم المومنین ہیں۔ مگر اس لفظ سے ذہن ایک ہی قابلِ احترام فرد کی طرف جاتا ہے۔ یہ آئے کہ کیا کیا جئے؟ تو چونکہ فقیہ اُمت بھی وہی تھیں، مرتبہ اجتہاد پر فائز بھی وہی تھیں۔ اس لئے ان کے پاس آئے کہ کیا ترکیب ہے۔ تو انہوں نے ترکیب یہ بتائی کہ مجھ سے ترکیب سنو۔

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عمارت بن گئی تھی قبرِ رسولؐ بے حجاب نہ تھی۔ حجرے میں تھی۔ کہا کہ ایک روشن دان بناؤ کہ آسمان اور قبرِ رسولؐ کے درمیان کوئی چیز حائل نہ رہے۔ یہ ترکیب ہے۔

دیکھا آپ نے کہ جس طرح رسولؐ مرکزِ رحمت ہیں، اسی طرح ان کے نزدیک قبرِ رسولؐ بھی رحمت کا مقناطیس ہے۔ ابھی وہاں فقط رسولؐ ہیں، کوئی شریک نہیں ہے۔ کہا کہ بس ایک روشن دان بنادو کہ قبرِ رسولؐ بے نقاب ہوجائے، آسمان کے نیچے۔

ظاہر ہے کہ نیت تو اللہ جانتا ہے کہ یہ عمل کیوں ہورہا ہے؟ جو ترکیب بتائی، اس پر عمل کیا اور ترکیب کامیاب ہوئی، بارش ہوئی اور خوب ہوئی۔ جو مقصد یا طلب تھی، وہ حاصل ہوگئی۔ جناب! یہ توسل قبر کے ساتھ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اب کسی میں ہمت ہو تو وہ جنابِ اُم المومنین پر فتویٰ صادر کرے۔ یہ پہلے دور کی بات ہے۔ دوسرا دور آگیا اور قحط پڑا۔ خالق کو بھی اُصولِ توسل کو ہر نقطہ نظر کے آدمی کو دکھانا ہے کہ پہلے دور میں قحط پڑا تو اس ترکیب سے دور ہوا، دوسرے دور میں پھر قحط پڑا، اس وقت لوگ اُم المومنین کے پاس آئے۔ اب خود زمامِ اُمور جن کے ہاتھ میں ہے، ان کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ مر رہے ہیں، کچھ کیجئے، کوئی تدبیر کیجئے۔ رسولؐ ہیں نہیں تو ان سے توسل کیونکر کیا جائے؟ بغیر کسی اس طرح کی نسبت کے کوئی لائق توسل نظر نہیں آتا۔ جن افراد کو ہم پہچانتے ہیں، انہیں مرکزِ توسل بنانا خلافِ سیاست ہے۔

اس لئے بہت غور کرنا پڑا، اس کے بعد سیاست دانی تو مسلم ہے کہ ترکیب میں سمجھ میں آگئی کہ جنابِ عباسؓ عمِ نبی کو ساتھ لیا اور ان کو لے کر میدان میں نکل گئے۔ کبھی مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی، مگر خدا کے ہاں کی بات تھی تو بغیر ان کی مدد کے کام نہیں چل سکتا۔ جنابِ عباسؓ کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ نمازِ استسقاء پڑھی اور ان الفاظ کے ساتھ دعا کی کہ پروردگار! اس وقت ہم تیرے نبیؐ کے ساتھ توسل کیا کرتے تھے، مگر اب رسولؐ تو دنیا میں نہیں ہیں، ہم تیرے رسولؐ کے چچا کے ساتھ، ان کا نام نہیں لیا ورنہ مرکز تو جب نہ بنتا۔ رسولؐ کی طرف نسبت دے کر دعا کی۔ حقیقت میں توسل رسولؐ ہی کے ساتھ تھا۔

"نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا"۔

اپنے پیغمبر کے چچا کے ساتھ ہم توسل کرتے ہیں تیرے بارگاہ میں"۔

بس اس رشتہ کو کہہ کر جب رسولؐ کا قدم بیچ میں لے آیا گیا تو پھر بادل جھوم کے اٹھا اور پھر بارش ہوئی اور دنیا نے مبارکبادیں دیں۔ مابدولت کو نہیں دیں۔ جتنے آئے، وہ سب جنابِ عباسؓ کو مبارکبادیں دیتے ہوئے ان الفاظ میں کہ مبارک ہو ایک حرمین کو سیراب کرنے والے۔

"هَنِيْئًا لَكَ يَا سَاقِيَ الْحَرَمَيْنِ"

ان سے کہہ رہے ہیں سیراب کرنے والے۔ تو کیا سب مشرک؟ کسی کا ضمیر گوارہ کرے ان سب کو مشرک قرار دینا تو اس عمل کو شرک قرار دے ورنہ پھر ماننا پڑے گا کہ اگر دل و دماغ کے اندر خدا کا تصور ہے تو کسی کو کہئے کہ اس نے اولاد ہمیں دی۔ کسی کو کہئے کہ اس نے وسعتِ رزق ہمیں دی۔ کوئی بھی عمل بحیثیت وسیلہ منسوب کر دیجئے تو شرک نہیں ہوگا۔

تیسرا اُصولی سوال ہے۔ یہ سوال اس وقت ہے جب ہم پیغمبرِ خدا کو مردہ مانیں۔ یہ ایک طبقہ میں بہت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے،

حیات النبیؐ اور موت النبیؐ ۔ یہ رسالے کی شکل میں امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالے کا نام یہ ہے کہ واقعہ وفات رسولؐ اور عقیدۂ حیاۃ النبیؐ ۔ اگر ہم مردہ مان لیں، تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے مگر ہم اس معنی سے مردہ مانتے نہیں۔ وہ طبعی موت ہے، جس کا نام ہمارے نزدیک وفات ہے۔ جس معنی میں ڈاکٹر اور حکیم تشخیص کرتے ہیں کہ یہ زندہ ہے یا مردہ ہے۔ وہ وفات سب کے نزدیک مسلم ہے۔ جو حیاۃ النبی کا قائل ہے، وہ بھی کیا اس موت کا منکر ہے؟ اگر اس موت کا منکر ہوتا تو جانشینی کا مسئلہ ہی کیوں پیدا ہوتا؟ اگر کوئی اس موت کا منکر ہوتا تو میراث کا مسئلہ ہی کیوں پیدا ہوتا؟ اس موت کا منکر کوئی نہیں ہے جو تاریخ کی زبان میں موت ہے۔ ان معنی سے کیا موت شہداء کیلئے نہیں ہے؟ جو رسولؐ کو مردہ سمجھتے ہیں، وہ بھی قرآن کی مجبوری سے شہداء کو زندہ سمجھتے ہیں۔

تو کیا ویسی موت شہداء کیلئے نہیں ہے؟ اگر شہداء کیلئے ویسی موت نہ ہو تو کسی شہید کی بیوہ کو عقدِ ثانی کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ اگر اس معنی کی موت نہ ہو تو شہید کی میراث تقسیم نہیں ہونی چاہئے۔ اس معنی کی موت شہید کیلئے بھی یقینی مگر قرآن کہہ رہا ہے کہ زندہ ہیں۔ لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والے ہوں، کسی بھی نقطہ نظر کے افراد ہوں، وہ شہداء کو زندہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔ شہداء کی حیات کی دو آیتیں ہیں قرآن میں۔ کسی میں کلمہ حصر نہیں ہے۔ آیۂ تطہیر کی بدولت آپ کو کلمہ حصر معلوم ہو گیا ہے۔ "اِنَّمَا" یعنی کلمہ حصر نہیں ہے کہ شہید بس زندہ ہیں۔ نہ "لَا تَقُوْلُوْا" والی آیت میں نہ "لَا تَحْسَبَنَّ" والی آیت میں کسی جگہ کلمہ حصر نہیں ہے۔ ثبوتِ حیاتِ شہداء قرآن سے حاصل ہے لیکن شہداء کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا، یہ کسی ایک آیتِ قرآن سے ثابت نہیں ثابت ہو سکتا۔ انحصارِ حیات شہداء کے بارے میں کسی قرآن کی آیت سے اظہار نہیں ہوتا۔

اور میں ایک سوال ضمیرِ ایمانی سے کرتا ہوں کہ شہادت ہے کیا چیز؟ بڑا بلند مرتبہ ہے شہادت کا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ شہادت رسولؐ کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ جس ہستی کی ایک تعلیم پر عمل کرنے سے حیاتِ جاودانی ملتی ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہوں کہ جس کے دروازے سے حیاتِ جاودانی کی بھیک تقسیم ہو رہی ہو، اس کو میں مردہ مان لوں؟ ایک حقیقتِ قرآنی اور ایک اصولِ عقلی۔ وہ یہ ہے کہ ہماری نیند بھی ایک قسم کی وفات ہے از روئے قرآن۔ قرآن میں ہے:

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا"۔

خدا توفی کرتا ہے نفوس کا ان کی موت کے وقت اور جو نہیں مرے ہیں، ان کی نیند کے وقت۔ یعنی اس معنی سے ہم روز مرتے ہیں، روز جیتے ہیں۔ قبض روح دونوں کا ہوتا ہے، ایک مفہوم کے لحاظ سے۔ جس کو ختم موت دیتا ہے، اس کی روح کو روک لیا جاتا ہے اور جسے ابھی زندہ رکھنا ہے، اس کی روح کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نام بیداری ہے۔

تو ہر آدمی کی روز وفات ہوتی ہے۔ یہ حقیقتِ قرآنی ہے۔ اب ایک متفق علیہ حدیث، معجزۂ رسول بھی اس کے ضمن میں ہے۔ پیغمبر خدا نے ارشاد فرمایا کہ میں سوتے میں بھی اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح بیداری میں دیکھتا ہوں اور سوتے میں بھی اس طرح صدا سنتا ہوں جس طرح بیداری میں سنتا ہوں۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ بس ایک عقلی اصول۔ میں کہتا ہوں کہ جس کا خواب مثل بیداری ہوگا، اس کی موت مثلِ حیات ہوگی۔

اب کچھ اور حدیثیں عدمِ انحصار کے بارے میں کہ انحصار نہیں ہے شہداء میں۔ یہ قرآن سے ثابت ہے۔ متفق علیہ حدیث ہے۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں ڈیڑھ صفحے پر لکھا ہے۔ جملوں کا وہ پورا سلسلہ۔ اس میں ایک جزو آپ سنتے ہیں، وہ ڈیڑھ صفحے کی حدیث کا جزو ہے کہ:

"مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا"

''جو محبتِ آلِ رسولؐ میں دنیا سے گیا، وہ شہید گیا''۔

اب یہ ہر صاحبِ فہم سے سوال ہے کہ کیا پیغمبرِ خدا یہاں کوئی تاریخی واقعہ بیان فرما رہے ہیں کہ جو محبِ اہل بیتؑ ہے تو سمجھو کہ ضرور کوئی معرکہ ہوگا اور اس معرکہ میں ضرور وہ دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہوگا؟ تو یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ یہ واقعہ تاریخی مستقبل کا بیان نہیں ہے۔ جب یہ نہیں ہے تو یقیناً یہ استعارہ ہے۔ استعارے کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں ایک شبہ ہوتا ہے، ایک مشبہ بہ ہوتا ہے۔ ایک وجہ شبہ ہوتی ہے۔ جب حرفِ تشبیہ ہو تو اس کو تشبیہ کہتے ہیں اور جب تشبیہ کی بنیاد پر وہی لفظ صرف کر دیا جائے تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ وہاں مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ تشبیہ کہلاتا ہے۔ یہاں مستعار اور مستعار منہ کہلاتا ہے۔ آدمی بہادر ہے، اس کی تشبیہ دے دی شیر کے ساتھ۔ مثل شیر کے۔ مثل بیچ سے نکال دیا۔ شیر کہہ دیا۔ ''نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے'' یہ نہیں کہا کہ آدمی جو مثل ضیغم ہے، اب وہ مثل وِثل کا جھگڑا جاتا رہا۔ ضیغم کہہ دیا تو یہ استعارہ ہو گیا۔ رسول بھی اگر کہتے کہ مثل شہداء ہے تو تشبیہ ہوتی۔ چونکہ رسولؐ نے بغیر حرفِ تشبیہ کے کہہ دیا کہ جو محبت آلِ رسولؐ میں گیا، وہ شہید ہے تو یہ استعارہ ہے۔ جب استعارہ ہے تو اس میں کوئی بات جو اس میں ہو، وہ ہونا چاہئے، تب استعارہ درست ہوگا۔

اب وہ خصوصیت شہداء کی جواز روئے قرآن ہے، وہ حیاتِ جاودانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آلِ رسولؐ کی محبت میں گیا، اُسے بھی مردہ نہ سمجھو۔ جس طرح شہداء زندۂ جاوید ہیں، اسی طرح یہ بھی زندۂ جاوید ہیں۔ اگر صحیح محبت ہے تو یہ زندگی جاوید بھی ایک اصولِ شرعی و عقلی کے مطابق ہے اور وہ رسول کا ارشاد ہے کہ:

"اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"

اعمال نیتوں کے ساتھ ہیں۔

اگر محبتِ آلِ رسول صحیح رکھے گا تو نیت ہوگی کہ جب وقت پڑے گا تو اس راہ میں جان بھی دے دوں گا۔ اس کے معنی ہیں کہ ہر وقت شہادت کیلئے تیار بھی رہے گا۔ اب قسمت سے شہید نہ ہوا تو اجر شہادت نہ ملنا ظلم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اصول جو میں نے عقلاً رسول کی حدیث کی بنیاد پر عرض کیا اور میں نے کہا کہ عقلاً یہی ہے مقتضائے عدلِ الٰہی بھی یہی ہے، امیر المومنین علیؑ کا ارشاد بھی ہے نہج البلاغہ میں، جب جنگِ جمل ختم ہوئی تو آپ کے گرد و پیش جو اصحاب تھے، ان میں سے ایک دوست کا نام لے کر کسی نے کہا کہ کاش! وہ بھائی ہمارا اس معرکہ میں ہمارے ساتھ ہوتا اور اس فتح کی مسرت میں وہ بھی شریک ہوتا۔ تو بظاہر حضرت امیر المومنینؑ اس شخص سے متعارف نہیں تھے

جس کا نام اُس نے لیا کہ کاش! ہمارا وہ بھائی بھی ہوتا۔ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ جس بھائی کا تم نام لے رہے ہو، کیا اس کی محبت ہمارے ساتھ ہے؟ اُس نے کہا: بے شک، وہ بھی آپؑ کے دوستوں میں سے ہے۔ جب یہ پوچھ لیا کہ اس کو واقعی محبت ہمارے ساتھ ہے تو ارشاد فرمایا کہ یقین جانو کہ ہمارے ساتھ وہ اس معرکہ میں شریک ہے۔ وہ غائب نہیں ہے، وہ حاضر ہے۔ ارے وہ تو اس وقت موجود ہے، اگر اس کے جذبات محبت ہمارے ساتھ ہیں تو وہ ہمارے ساتھ شریک ہے اس معرکہ میں اور اس کا کیا ذکر، ہمارے ساتھ اس معرکہ میں بہت مردانِ روزگار ہیں کہ جو ابھی اپنے آباؤ اجداد کے صلب میں ہیں اور اپنی ماؤں کے شکم میں ہیں جن کو زمانہ بعد میں نمایاں کرے گا اور ان کے ذریعہ سے ان سے ایمان کو قوت حاصل ہوگی۔

یہی ہم کو اصول بتایا گیا تھا۔ اسی مقصد کا حاصل کرنا تھا کہ کہا گیا ہے کہ کہو:

"يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا"۔

جب واقعہ کربلا یاد آئے تو تم یہ کہو کہ کاش ہم ہوتے۔ اس کے معنی ہیں مقصد میں اظہارِ وحدت کہ جو شہدائے کربلا کا مقصد تھا، اس مقصد میں ہم شریک ہیں۔ اس کے معنی ہیں اظہارِ عزم کہ ہم تھے نہیں اس وقت، اگر ہوتے تو وہی کرتے جو مجاہدین کربلا نے کیا۔

تو اب ہمارے مولا علی ابن ابی طالبؑ نے جنگِ جمل کے موقع پر اصول بتا دیا۔ اس اصول کے تحت کربلا میں وہی فقط بہتر 72 نہیں تھے بلکہ جو جو بعد میں جذبات نصرتِ دین میں شریک ہوں، ان کے ساتھ، قیامت تک جو بھی گویا صدائے "هَلْ مِنْ نَاصِرٍ" پر اپنے اپنے طرز پر لبیک کہتے رہے، وہ سب اجر شہادت میں ان کے ساتھ شریک تھے جو کربلا والے تھے اور یہی تمنائے بیقرار ہے جس کی بنیاد پر ہم اور آپ روتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ رونا تو بزدلی ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ سمجھ کر بات کہئے، کسی معرکہ میں شریک ہونے پر وہاں موجود رہ کر رونا خلافِ شجاعت ہے اور وہ بزدلی ہے لیکن کسی معرکے میں شریک نہ ہونے پر رونا عین شجاعت ہے۔ ہم زیر رایت ابوالفضل العباسؑ ہوتے تو نہ روتے۔ اگر کربلا میں ہوتے تو نہ روتے۔ کربلا کے مجاہدین رو نہیں رہے تھے۔ ہمیں جو وہ دن نصیب نہیں ہوا تو یہ رونا ہے۔ یہ رونا اس تمنا کا اظہار ہے کہ آج ہم آنسو بہا رہے ہیں، اُس وقت ہوتے تو اپنا خون بہاتے۔ اپنا خون اس راہ میں نثار کرتے۔

اب وہ سوال کہ اتنی مدت تک، چودہ سو برس گزر گئے، کہاں تک روؤ گے؟ میں کہتا ہوں کہ اس سوال سے تو میری رگِ دل کٹ جاتی ہے۔ اتنی مدت کے بعد اب تک کیوں رو رہے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ جنہیں بروقت رونے کا حق تھا، انہیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید گریہ اب تک قائم نہ رہتا۔ لیکن جنہیں رونے کا حق تھا، انہیں رونے کب دیا؟

33

دین اسلام

قرآن کہہ رہا ہے کہ پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا ان کو۔ میں اپنی اُردو زبان میں یوں کہوں گا کہ بشر ہوتے ہوئے یہ نہیں گئے، خدا ہوتے ہوئے وہ لے گیا۔

آپ کو یہ حیرت ہے کہ وہاں کیونکر گئے؟ جس کا مرکز یہاں ہو، اُس کا وہاں جانا تعجب ہے اور جس کا مرکز وہاں ہو، اُس کا تو یہاں رہنا تعجب ہے۔

یہ مطلق آزادی تو اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتی جب تک انسان قیدِ زندگی سے رہا نہ ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وجود خود پابندیوں کا متقاضی ہے اور جتنا وجود کا درجہ اونچا ہوگا، اتنا پابندیوں میں اضافہ ہوگا۔

اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو زندگی کے کام جاری رکھئے۔ اب اسے چاہئے آزادی کہیے، چاہے پابندی کہیے۔

یاد رکھو! ظلم کی یاد سے ظالموں کی توہین ہوتی ہے اور مظلوم سے ہمدردی اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"۔

یقیناً دین حقیقی اللہ کے نزدیک بس اسلام ہے۔ دین کے متعلق جومختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، اُن میں سے ایک یہ چیز ہے کہ کہا جاتا ہے کہ دین ہماری آزادی کو سلب کرتا ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اُسے آزاد رہنا چاہئے اور دین پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس لئے دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ آزادی کی قدر و منزلت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بس سوال یہ ہے کہ کیا ہر قسم کی آزادی اور ہر قید سے آزادی؟ میں جہاں تک غور کرتا ہوں، یہ مطلق آزادی تو اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتی جب تک انسان قیدِ زندگی سے رہا نہ ہو اور یہ کوئی شاعرانہ جملہ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے وجود خود پابندیوں کا متقاضی ہے اور جتنا وجود کا درجہ اونچا ہوگا، اتنا پابندیوں میں اضافہ ہوگا۔ ہمارے سامنے جو چیزیں ہیں، جہاں سے درجہ بندی شروع کی گئی ہے، سب سے نیچے جمادات مانے جاتے ہیں۔ اس سے اوپر نباتات، اس کے اوپر حیوانات، اس کے اوپر انسان۔ تو جمادات، یہ گویا ادنیٰ درجہ ہے۔ ان کا کمال محدود ہے۔ بس اپنے سرمایہ وجود کو انکھار کھتے ہیں۔ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تو اب ان کا کمال مختصر ہے۔ تو ان کی پابندیاں بھی مختصر ہیں۔ بس ایک جگہ ہو جس پر ٹھہریں۔ ایک فضا ہو، جس میں سمائیں۔ بس اس کے آگے ان کی ضرورتیں کچھ نہیں ہیں۔ پتھر بھی آپ سے پانی کے طلبگار نہیں ہوتے، آپ سے غذا نہیں مانگتے۔ سرمایۂ کمال مختصر ہے تو پابندیاں بھی مختصر۔

اب اس کے بعد ایک درجہ اونچا ہوا، نباتات کی منزل آئی۔ تو اب اس اونچے درجے پر پہنچ کر کچھ آزادی نصیب ہوتی مگر نہیں۔ جو پابندی پتھروں پر تھی، وہ بھی قائم رہی۔ اس کیلئے بھی جگہ کی ضرورت رہی، اس کے لئے بھی فضا کی ضرورت اور مزید اپنے کمال نباتی کے قائم رکھنے کیلئے مزید پابندیاں عائد ہوگئیں۔ اب جناب جس پودے کی جو غذا ہو، وہ اس کو ملے، پانی ملے۔ چاہے زراعت ہو، چاہے درخت ہو، اُسے پانی چاہئے، روشنی چاہئے، ہوا چاہئے۔ جب یہ سب باتیں ہوں، تب وہ پودا یا کھیتی برقرار رہے گی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ضرورت پوری نہ کی جائے، تو وہ فنا ہو جائے گی۔ اب یہیں فنا کے معنی سمجھ لیجئے کیونکہ مادہ، اہل مادہ کہتے ہیں کہ فنا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مادہ جتنا تھا، اتنا ہی رہتا ہے۔ اس میں نہ رتی بھر زیادتی ہوتی ہے۔ حالانکہ معلوم ہوا کہ اب تحقیق بدل گئی ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ ایک منزل ایسی ہوتی ہے کہ مادہ بھی لہروں کی شکل میں آ کر فنا ہو جاتا ہے۔ مگر ابھی تک یہی کہا جاتا تھا کہ مادہ فنا نہیں ہوتا۔

تو اب یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ اگر پانی نہ دیا جائے، اگر ہوا نہ ہو، اگر فضا نہ ہو تو وہ پودا فنا ہو جائے گا۔ یہیں سمجھ لیجئے کہ اس فنا کے معنی کیا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خاک ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔ وہ اس کا ارتقائی درجہ جو پودے کی حیثیت سے تھا، وہ برقرار نہیں رہے

گا اور اصل شے کی بقا اس کے اسی امتیاز نوعی کی بقا سے ہے۔

اب جناب نباتات سے آگے بات بڑھی، منزلِ حیوانات آئی۔ اب دو درجہ ترقی ہو گئی تو اب کچھ آزادی نصیب ہو۔ جی نہیں۔ جو جمادات پر پابندی تھی، وہ بھی رہی۔ جو نباتات پر پابندی تھی، وہ بھی برقرار رہی، اسے بھی غذا کی ضرورت، اسے بھی پانی کی ضرورت، اسے بھی ہوا کی ضرورت اور مزید برآں کمالِ حیوانی کے برقرار رکھنے کیلئے مزید پابندیاں عائد ہو گئیں۔ اب حیوانانیت وابستہ ہے احساسات کے ساتھ۔ جتنے احساسات ہیں، ہر ایک کی کچھ شرائط ہیں۔ آنکھ ہے اور اس کا کام دیکھنا ہے۔ مگر شکل ہو، رنگ ہو اور نہ حد سے زیادہ قرب ہو اور نہ حد سے زیادہ بُعد ہو۔ جب ایسا ہو تب آنکھ اپنا کام کرے۔ کانوں کا کام سننا۔ اس کیلئے بھی شرائط۔ آواز ہو، درمیان میں ایک فضا ہو کہ ہوا سفارت کا کام انجام دے کر صدا کو پردۂ گوش پر ٹکرائے۔ اگر فاصلہ اتنا کم ہو کہ ہوا کو تموج کا موقع ہی نہ ملا تو سنائی نہیں دے گا۔ اگر اتنی دور ہو گئی کہ پہنچتے پہنچتے ہوا کی لہریں کمزور پڑ گئیں تو سنائی نہ دے گا۔ تو جو حاسہ ہے، وہ اپنے ساتھ شرائط کی دنیا رکھتا ہے کہ اگر وہ ضروریات پوری نہ ہو تو کمالِ حیوانی بروئے کار نہ آئے گا۔

پھر ایک بہت بڑی شرط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو زندگی کے کام جاری رہنا چاہئیں۔ آپ کے ہاں شاید یہ نمونہ ہو مگر پاس کے ملک میں کبھی آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک شخص نے اپنا ہاتھ خشک کر لیا تو اپنے نقطۂ نظر سے بہت بڑی عبادت کی۔ اپنا ایک ہاتھ خشک کر لیا۔ یہ ہاتھ خشک کیسے ہو گیا؟ جب ایک عرصہ تک اس ہاتھ سے کام نہ لیا گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ کُل نے برکاتِ حیات کو سلب کر لیا۔

اب خون اپنے مرکز سے چلتا ہے، تمام جسم میں گردش کرتا ہے مگر یہاں آ کر اپنا راستہ بدل دیتا ہے۔ حرارتِ حیات تمام جسم میں پھیلتی ہے مگر اس جزو کو محروم کر دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر زندگی قائم رکھنا ہے تو زندگی کے کام جاری رکھئے۔ اب اسے چاہے آزادی کہئے، چاہے پابندی کہئے۔ جن لوگوں کے ہاتھ کو ڈاکٹر باندھ دیتے ہیں کسی وجہ سے، وہ کہتے ہیں کہ انگلیوں کو ذرا ہلاتے رہو۔ گردش دیتے رہو۔ ظاہر میں تو بیکار یہ حرکت دے رہا ہے مگر معلوم ہوا کہ تعطل دشمنِ حیات ہے۔ تو ہم نے سنتِ کائنات یہ دیکھی کہ ہر ترقی کا قدم اپنے ساتھ کچھ پابندیاں لایا۔ آزادی مطلق کسی منزل پر حاصل نہیں ہوئی۔

اب حیوان سے بالاتر کون ہے؟ انسان۔ اور ماشاء اللہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم تو انسان کو ایک الگ چیز ہی سمجھتے ہیں مگر وہ سات سمندر پار کا فلسفہ جو انسان کو اسی نسلِ حیوان کا ترقی یافتہ ایک نقطہ سمجھتا ہے، میں اس کو اپنی خالص اردو زبان میں یوں کہوں گا کہ کائنات کے جوڑ توڑ میں بس ایک جھول جو پیدا ہوا، وہ انسان تھا۔ وہ نظریہ بھی جو ہمارے نزدیک قابلِ قبول ہے مگر وہ بھی انسان کو نقطۂ ارتقاء مانتا ہے، نقطۂ تنزل نہیں مانتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حیوان سے انسان کو بالاتر تو بھی مانتے ہیں۔ اب جب انسان حیوان سے بالاتر ہے تو ہم نے دیکھا کہ ہر ترقی کا قدم اپنے ساتھ آزادی نہیں لایا بلکہ پابندی لایا۔

اب انسان کے درجہ پر پہنچ کر آزادی کا مطالبہ کامل کیوں ہوا ہے؟ اُمید یہی کرنا چاہئے کہ جو ترقیاں، جو پابندیاں پتھروں میں تھیں، وہ بھی برقرار رہیں گی یعنی انسان جگہ کا محتاج، انسان بھی فضا کا محتاج۔ جو پابندیاں نباتات میں تھیں، وہ بھی برقرار

رہیں گی۔ انسان بھی غذا کا محتاج، انسان بھی ہوا کا محتاج، انسان بھی روشنی کا محتاج۔ جو پابندیاں حیوان پر تھیں، وہ بھی برقرار رہیں گی۔ انسان بھی اپنی زندگی کی بقاء کیلئے، احساسات کے قائم رکھنے کیلئے اسی طرح محتاج عمل ہے جس طرح حیوان محتاج عمل ہے۔ وہ تمام پابندیاں جو اس کی آنکھ پر ہیں، کان پر ہیں، ناک پر ہیں، تمام احساسات پر ہیں، وہی پابندیاں سب اس پر بھی ہیں۔ تو جتنی پابندیاں پہلے تھیں وہ سب برقرار رہیں گی۔

اب اُمید یہ رکھنا چاہئے کہ کمال انسانی کی بقاء کیلئے کچھ مزید پابندیاں عائد ہوں گی کہ اگر اس کے تقاضے نہ پورے ہوں گے تو شاید بحیثیت جسم باقی رہے، شاید بحیثیت نشوونما باقی رہے، چاہے بحیثیت جوان باقی رہے مگر انسانیت کا شرف ختم ہو جائے گا اور یاد رکھنا چاہئے کہ انہی پابندیوں کا، جو انسان پر اس کی انسانیت کی بقاء کیلئے عائد ہیں، اسی کا نام مذہب ہے۔ اب یہ کتنی غیر منطقی بات ہے کہ انسان ان پابندیوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا جو جسمانی حیثیت سے عائد تھیں۔

ارے اس میں احتجاج کرنا کیسا؟ پرانے زمانہ کے انسان کیلئے چھوٹا سا مکان کافی ہو جاتا تھا۔ اب ماشاءاللہ جتنا بڑا مکان چاہئے، وہ سب کو معلوم ہے۔ تو ان میں تو اور مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ جو پابندیاں بحیثیت نباتات عائد تھیں، اس پر احتجاج نہیں کرتا۔ یہ کیا مجبوری ہے کہ وہ دوپہر کو بھی کھائیں اور شام کو بھی کھائیں۔ کم سے کم ایک ہی وقت آزاد ہو کر دیکھ لیں۔ مگر ماشاءاللہ مغربی تہذیب کے دلدادہ جانتے ہیں کہ پہلے کھانے کے دو وقت تھے، اب تو ماشاءاللہ پانچ وقت ہو گئے ہیں۔

تو جو نباتاتی حیثیت سے پابندیاں ہیں، اس پر احتجاج نہیں ہے، مزید اضافہ ہے۔ جو حیوانات کے لحاظ سے پابندیاں تھیں، اس پر کوئی بندش نہیں ہے۔ کوئی احتجاج نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شادی بیاہ جو ہے، یہ ضرورت حیوانی کے پورا کرنے کی صورت ہے۔ یہ وہ ضرورت ہے جو حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ مگر ان باتوں پر جو حیوانات کیلئے ہیں، ان پر کوئی احتجاج نہیں، جتنا احتجاج ہے وہ اس پر جو بحیثیت انسان پابندیاں عائد ہیں اس پر فریاد و واویلا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ انسان سابق کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہوتا، اس میں اور اُلجھتا جاتا ہے۔ لیکن میرے سامنے ایسی روایات ہیں اور آپ نے بھی برابر مجالس کے فیض سے سنی ہوں گی کہ جو آخری خصوصیت کو، ضرورت کو یعنی انسانی تقاضے کو بحدِ کمال پورا کرتے ہیں، وہ قبل کی پابندیوں سے بہت حد تک آزاد ہو جاتے ہیں۔ ہم جب تک آنکھ نہ کھولیں، دیکھ نہیں سکتے۔ مگر رسولؐ کی حدیث ہے کہ میں خواب میں بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح بیداری میں دیکھتا ہوں۔ ہم سامنے کی چیز کو دیکھتے ہیں۔ پس پشت کی چیز کو نہیں دیکھتے۔ لیکن پیغمبرِ خُدا کی فریقین میں متفق علیہ حدیث ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: میں تمہیں پس پشت سے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے دیکھتا ہوں۔

تو معلوم ہوا کہ آخری تقاضے کو جو پورا کرے، وہ پھر قبل کی پابندیوں سے بہت حد تک آزاد ہو جاتا ہے۔ ہمارا جسم فضا میں معلق نہیں ہو سکتا لیکن جو اس ضرورت کو پورا کئے ہوئے ہیں، وہ فضائے ہوا میں سفر کرتے ہیں۔ وہ پانی کے اوپر سفر کرتے ہیں اور فضائے ہوا میں سفر کر کے کہاں تک جاتے ہیں، وہ تو آپ کو معلوم ہے۔

"دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی"

اور وہ لوگ جو اس عزت انسانی کی بلندی کا اندازہ ہی نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں بشر ہوتے ہوئے کیونکر گئے؟ میں کہتا ہوں کہ قرآن نے یہ کہا کہ یہ گئے؟ قرآن تو کہہ رہا ہے کہ وہ لے گیا۔ وہی سائنسدان لوگ جن کی سمجھ میں مذہب نہیں آیا، انہوں نے ہی طرح طرح کے اعتراضات کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ سابق زمانہ کا فلسفہ، اُس زمانہ میں سائنس بھی فلسفے کا جزو ہوتی تھی۔ تو اس وقت اعتراضات اور تھے، وہ بھی مجھے معلوم ہیں۔ اس وقت یہ اعتراضات تھے کہ کیونکر مانیں۔ اس لئے کہ اگر مان لیں عالم بالا کی معراج تو فلک میں خرق والتیام لازم آئے گا۔ یعنی آسمان ایک دفعہ جانے سے پھٹنے اور پھر دوبارہ آنے سے پھٹنے۔

تو کہتے ہیں کہ خرق والتیام فلک میں محال ہے، اس لئے معراج کیونکر ہو سکتی ہے؟ اب ماشاء اللہ تعلیم یافتہ افراد ہیں، میں کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں آسمان ہو گیا حدِ نظر کا نام۔ تو اس حیثیت سے تو معراج کا راستہ صاف ہو گیا مگر اب اور طرح کے اعتراضات ہیں۔ کہتے ہیں کہ اتنی دور پر درجہ حرارت اتنا ہوتا ہے، اس میں کوئی ذی روح بسر نہیں کر سکتا اور اتنی دور درجہ حرارت اتنا ہوتا ہے اور اتنی دور ہوا کا دباؤ یوں ہوتا ہے اور وہ آکسیجن ایسی ہو جاتی ہے، غرض چکر وہی رہا کہ کیونکر گئے؟

میں کہتا ہوں کہ قدیم سائنس اور جدید سائنس کے اعتراضات سے گھبرا کر ایک جماعتِ اسلام نے کہا کہ معراج روحانی تھی۔ ارے بھئی بخشو! جسم گیا ہی کب تھا؟ وہ تو روح گئی تھی۔ اب نہ آسمان پھٹے گا، نہ جڑے گا۔ نہ سانس لینے میں دشواری ہوگی، کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے ایک طبقہ معراجِ روحانی کا قائل ہو گیا۔ مگر یہ طبقہ تو ماشاء اللہ علمائے اسلام کا ہے۔ تو اس طبقے سے میں کہتا ہوں کہ آخر معراج کے ماننے کی ضرورت کیا ہے؟ جو آپ اس جھگڑے میں پڑتے ہیں۔ ضرور یہی ہے نا کہ قرآن میں ہے تو کیونکر نہ مانیں؟ ورنہ کون آپ کا گلا گھونٹ رہا ہے کہ مانئے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب مجبوری یہ ہے کہ چونکہ قرآن میں ہے، اس لئے ماننا ہے تو جو قرآن میں ہو اُسے مانئے۔ اب دیکھئے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا۔ کسے؟ جو لے گیا اپنے بندے کو اب بندہ بحالتِ حیات نام فقط روح کا ہوتا ہے تو معراج روحانی مانئے اور اگر بندہ روح وجسد کے مجموعے کا نام ہو تو معراج روحانی مان کر کام نہیں چلے گا۔ اب یہ کہ کیونکر گئے؟ وہ مسئلہ پہلے بھی تھا، اب بھی ہے تو اس کیلئے میں ابھی کہا کہ قرآن کب کہہ رہا ہے کہ یہ گئے۔ قرآن کہہ رہا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی

پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا۔ اس میں اپنی اُردو زبان میں یوں کہوں گا کہ بشر ہوتے ہوئے یہ نہیں گئے، خدا ہوتے ہوئے وہ لے گیا۔

اور اس لئے یہ گئے ہوتے تو ان کی تعریف ہوتی کہ کتنا بڑا وہ بندہ ہے جو گیا۔ تعریف بھی ان کی نہیں ہو رہی۔ وہ اپنی تعریف

کررہا ہے کہ "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی" پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا۔

بس اب میرا ایک مختصر سوال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اللہ کے سب کاموں کو آپ نے سمجھا ہو کہ کیونکر ہوتے ہیں تو اسے بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جتنی بھی سائنس نے ترقی کی ہے، بس اب تک یہ معلوم کررہے ہیں کہ یہ ہے اور یہ ہوتا ہے یہ ایک بات انہیں بھی معلوم نہیں کہ کیوں ہے اور کیوں ہوتا ہے؟ یہاں تک کہ جو روز کی باتیں ہیں، ہمیں یہ معلوم ہے کہ پانی سے پیاس بجھتی ہے، لیکن یہ پیاس کیوں لگتی ہے اور پانی سے کیوں بجھتی ہے، اسے نہ پیاسا جانتا ہے اور نہ سیراب۔ مگر انسان کی کچھ طبیعت یہ ہے کہ جو بات روز مرہ سنتا ہے، اس میں غور نہیں کرتا۔ مگر جو کبھی کبھار سن لیتا ہے، تو لڑنے کیلئے تیار ہوتا ہے کہ یہ کیونکر آفتاب مشرق سے روز نکلتا ہے۔ کوئی صاحب نہیں سوچتے کہ کیونکر نکلا؟ ایک دفعہ سن لیا کہ رسولؐ کی دعا سے اُن کے وصی کیلئے مغرب سے نکلا تھا تو لڑنے کیلئے تیار کہ یہ کیونکر میں کہتا ہوں جو روز کی بات ہے، وہ آپ بتا دیجئے کہ کیونکر ہوتی ہے؟ تو ایک دفعہ کی بات میں بتا دوں گا۔

تو بس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا کہ حضور! یہ تو اپنا اپنا زاویہ نظر ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ یہاں کیونکر رہے اور جا کر پھر کیونکر ہو آئے؟ آپ کو یہ حیرت ہے کہ وہاں کیونکر گئے؟ جس کا مرکز یہاں ہو، اُس کا وہاں جانا تعجب ہے اور جس کا مرکز وہاں ہو، اس کا تو یہاں رہنا تعجب ہے۔ غرض یہ کہ یہ آزادی کا تصور میں کہتا ہوں کہ آزادی بڑی اچھی چیز ہے۔ کسی ایک دن تو آزاد ہو کر دکھایئے۔ میں سیاست کی دنیا کا آدمی نہیں ہوں، سیاسی زبان یہ ہے کہ اس وقت کا ذکر نہیں جب غلام تھے۔ اب تو ماشاء اللہ آزاد ہو گئے ہیں۔ تو اب اس آزادی کے دور میں دیکھوں کہ آپ کتنے آزاد ہیں۔

حضور! اب تو بڑے راستوں کے اوپر خود کار روشنیاں ہو گئی ہیں لیکن ابھی تھوڑے عرصہ پہلے خود کار روشنیاں چوراہوں کیلئے ایجاد نہیں ہوئی تھیں اور اب بھی میں سمجھتا ہوں کہ بعض راستے ایسے ہوں گے کہ جہاں یہ نہ ہوں۔ تو جہاں یہ نہیں ہوتے اور جب تک یہ نہیں تھے، اس وقت تک چوراہوں کے اوپر چبوترے بنے ہوئے تھے۔ اس چبوترے پر ایک ستون ہوتا تھا۔ اس ستون کے پاس ایک آدمی کھڑا ہوتا تھا اور وہ آنے جانے والوں کو اشارے کرتا رہتا تھا۔ کبھی یوں ہاتھ کر دیا، کبھی یوں ہاتھ کر دیا۔ اس کا مطلب سب سمجھتے تھے کہ آگے بڑھ جاؤ، رُک جاؤ۔ وہ سب اشارے کرتا رہتا تھا۔ اب بھی ہمارے ہاں بعض شہروں میں، یہاں بھی بعض ترقی یافتہ جو شہر ہیں، وہاں ہوگا۔ یہاں بھی بعض محلوں میں شاید۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ ارے صاحب! اپنے ملک کی سڑک اور آزادی سے نہیں طے کر سکتے۔

ارے صاحب! ہمارا ملک آزاد ہو گیا۔ بحمد اللہ! ہم بھی آزاد ہیں تو ایک سڑک تو آزادی سے چلنے دیجئے۔ مگر نہیں، کیوں آزاد نہیں دی جا سکتی؟ اس لئے کہ سڑک ہے ایک، رہرو بہت ہیں اور وہ راستہ چلنے والے ہر ایک کو اپنی فکر ہے، اپنی فکر ہے، اپنی دھن ہے۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ مجھ ہی کو سب سے پہلے پہنچنا ہے اور ذرائع مختلف ہیں۔ کوئی موٹر نشین ہے، کوئی تانگہ نشین ہے، کوئی سائیکل نشین ہے، کوئی بیچارہ اپنے پیروں پر ہی چل رہا ہے۔ طاقتیں بھی مختلف ہیں۔ کوئی بوڑھا ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی جوان ہے۔ تو اگر ان کو آزادی سے چلنے کیلئے چھوڑ دیا جائے تو موٹر نشین پیادوں کو پامال کر دیں گے، کچل دیں گے اور جوان ضعیف العمر افراد کو دھکے دیں گے۔ خواتین کی بے

حرمتی ہوگی۔ بچے پیروں کے نیچے آجائیں گے۔ حالانکہ یہ ایک سڑک ہے۔ اس کا وہ سرا بھی آنکھوں کے سامنے ہے، یہ سرا بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ راستہ چلنے والے بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس کے باوجود ایک سڑک آزادی سے نہیں طے ہوتی۔ قانون ہے ہر ایک جو آئے، سواریاں اگر ہوں، مجھے معلوم ہے کہیں بائیں جانب کا قانون ہوتا ہے، کہیں دائیں جانب کا۔ وہ جدھر بھی ہے، پابندی ہے۔ وہ دائیں بائیں سے کوئی فرق نہیں ہوگا۔

تو وہ قانون مقرر ہیں اور اس قانون کی پابندی کے بغیر وہ سڑک طے نہیں ہوسکتی۔ اب میں کہتا ہوں کہ ایک سڑک جس کا وہ سرا بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، یہ سرا بھی آنکھوں کے سامنے اور وہ بغیر قانون طے نہیں ہوتی تو یہ عظیم شاہراہ حیات جس پر چلنے والے افراد نہیں، اقوام، اس کیلئے مطالبہ ہے کہ یہ بغیر قانون کے طے ہو جائے؟

اور یہیں ایک پہلو پر غور کیجئے کہ اچھا صاحب! کوئی کہے کہ قانون تو ٹھیک ہے، قانون ہونا چاہئے مگر وہ قانون لکھ کر اس کھمبے پر چسپاں کر دیا جاتا۔ آنے جانے والے اسے پڑھ لیتے۔ یہ سپاہی کھڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

معلوم ہوتا ہے کہ ایک سڑک بھی فقط تحریری قانون سے طے نہیں ہوتی۔ جب تک عمل کروانے والے نہ ہوں تو ایک سڑک کیلئے قانون کافی نہ ہو اور عظیم شاہراہ حیات کے قانون کیلئے کتاب کافی ہو جائے؟ اور اب یہیں ایک اور پہلو پر غور کر لیجئے کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ اُس سپاہی نے کہا ہو یوں اور آپ نے پوچھا ہو کیوں؟ آجکل تو ماشاء اللہ نئی روشنی والے حضرات کہتے ہیں کوئی بات، ہم سمجھے بغیر نہیں مانتے تو وہ جب کہے یوں تو آپ کہئے کیوں؟

مجھے معلوم ہے کہ آپ نے کبھی نہیں پوچھا اور دل چاہے تو کچھ پوچھ کے دیکھ لیجئے کہ وہ بتاتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ بتانے لگے گا تو اتنی دیر میں موٹر آجائے گی اور وہ کچل دے گی اور وہ اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔ بس ایک بات کہتا ہوں کہ یہ دیکھ لیجئے کہ جو اس کھمبے کے پاس کھڑا ہے، وہ اس حکومت کا نمائندہ ہے یا نہیں؟ صاف الفاظ میں کہوں کہ یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی وردی پہن کر خود سے یا راستہ چلنے والوں کے اجماع سے کوئی کھڑا تو نہیں ہو گیا۔ اگر پتہ چلے کہ ایسا کوئی کھڑا ہو گیا ہے تو ہرگز تسلیم نہ کیجئے بلکہ رپورٹ کر کے خود اُسے گرفتار کروا دیجئے۔ لیکن جب سمجھ میں آجائے کہ اُدھر کا نمائندہ ہے، اس کیلئے جو علامتیں ہوتی ہوں، نمبر دیکھ لیجئے، تمغے جو خاص ہوتے ہیں، وہ دیکھ لیجئے۔ جب پتہ چل جائے تو اب آپ کا کام عمل کرنا ہے۔ اب آپ کا کام سمجھنا نہیں ہے۔ سمجھنا یہاں تک ہے کہ یہ ہے صحیح آدمی اور جب صحیح آدمی سمجھ لیا!

اسی لئے دین کے معاملہ میں انبیاء و مرسلین کے صرف دعویٰ پر ماننے کی پابندی نہیں ہے، ماننے کا حکم نہیں ہے، جو علامات ہوں سچائی کی، معجزے کی ضرورت اسی لئے ہوئی کہ دیکھ لیجئے کہ نشان کیا ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ اس کے دعویٰ پر حقانیت کی دلیلیں کیا ہیں اور جب ثابت ہو جائے ان دلائل سے کہ یہ بے شک ادھر کا نمائندہ ہے، ادھر کا رہنما ہے، تو اب اس کے احکام میں یہ بحثیں کہ صبح کی دو رکعت کیوں ہیں اور مغرب کی تین رکعتیں کیوں ہیں اور عشاء کی چار رکعات کیوں ہیں؟ یہ درحقیقت خود خلاف عقل بات ہے۔ بے شک بے سمجھے نہ مانئے۔

اب وہ چیز ہے جو گزشتہ مجالس میں اس موضوع کے تحت میں عرض کر چکا ہوں کہ اسی لئے دعوائے رسالت چالیس برس کی عمر میں کیا۔ لیکن قوم کو اپنی سچائی کا تجربہ دعوائے رسالت سے پہلے کروایا تا کہ جب دعوائے رسالت ہو تو بلا دلیل نہ ہو۔ چالیس برس کا کردار، اس کی سچائی کیلئے ثبوت ہوا اور وہ چالیس برس میں کیا اثر تھا کہ لوگ نام کی بجائے صادق کہنے لگے۔ نام کی بجائے امین کہنے لگے، حالانکہ میرے نزدیک اخلاقِ رسالت کا ہر پہلو بے مثال تھا۔ جتنی صفات حمیدہ ہیں، آپؐ سے بڑھ کر حلیم بھی کوئی نہ تھا، جتنی اوصاف حمیدہ ہیں، سب میں آپ بے مثال تھے۔ مگر یہ سب وصف رہے، لقب نہیں بنے۔ صابر تھے مگر نام کی بجائے صابر نہیں کہے جانے لگے۔ حلیم تھے مگر نام کی بجائے حلیم کے لفظ سے یاد نہیں کیا جانے لگا لیکن دو صفات اتنی نمایاں ہوئیں کہ انہوں نے نام کی جگہ حاصل کر لی۔ لقب بن گئیں، ایک صادق اور ایک امین۔

یہ ان دو صفات کی کیا خصوصیت ہے، میری سمجھ میں تو بس یہی آتا ہے کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے لشکر آ رہا ہے تو مانو گے یا نہیں؟ حدِ نظر کے سامنے جتنا مجمع تھا، اُس نے کہا کہ کیوں نہ مانیں گے کہ اس زبان سے سوائے سچ کے ہم نے کچھ نہیں سنا۔ اب اس کے بعد پیغام پہنچایا تو ظاہر ہے کہ اس وقت تو نہیں مانا اور نہ سبھی مسلم ہو جاتے مگر وہ خود ان کا جملہ کہ کیوں نہیں مانیں گے، وہ ضمیر کے اندر نشتر بن کر چبھتا تو رہے گا۔ اس وقت یہ تھا کہ کیوں نہیں مانیں گے اور اب اندر سے کوئی کہہ رہا ہے کیوں نہیں مانتے؟

اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں کہ جب نہیں مانا تو کیا کیا کہا انہوں نے؟ قرآن مجید نے سب بتا دیا ہے کہ کیا کیا کہا؟ شاعر کہا، کاہن کہا اور سب سے زیادہ سخت بات یہ کہ مجنون کہا۔ اب ایک پہلو پر توجہ دلاتا ہوں کہ کم بخت وہ کہنے والے ہمیں نہیں معلوم مگر قرآن نے ان تمام گستاخیوں کو محفوظ کر دیا۔ مجھے راستے میں کوئی گالی دے تو میں آ کر بیان نہیں کروں گا کہ مجمعِ عام میں مجھے فلاں نے یہ گالی دی ہے۔ مگر قرآن ان کی ان سب غلط باتوں کو محفوظ کر رہا ہے کہ کیا کہا۔ یہ کہا، یہ کہا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قرآن کیوں محفوظ کر رہا ہے؟ جو میری سمجھ میں آیا، وہ عرض کرتا ہوں۔ یاد رکھئے کہ یہ سب جو وہ کہہ رہے تھے، یہ ظلم ہی تو تھا، ایک معلمِ عقل کو دیوانہ کہہ رہے تھے۔ ظلم ہی تو تھا۔ ایک سنجیدہ انسان کو شاعر کہہ رہے تھے، ظلم ہی تو تھا۔ تو قرآن نے ان تمام الفاظ کو محفوظ کر کے یہ اصول قائم کر دیا کہ مظالم کے ذکر سے مظلوموں کی توہین نہیں ہوتی۔ چونکہ ہم پر زمانہ عزا میں طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں، روتے ہم ہیں۔ دل دوسروں کا دکھتا ہے۔ ماتم ہم کرتے ہیں، دل دوسروں کا دکھتا ہے۔ تو جتنے منطق وفلسفے کے اوزار ہیں، وہ سب کہیں نہیں آتے، اسی غمِ حسینؑ کے سامنے وہ تمام لائے جاتے ہیں۔ تو انہی میں سے ایک یہ ہے کہ یہ سب ہوا تھا، جانے دو کہ ہوا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ جانے دو۔ یعنی آپ محفوظ رہیں، ارے جانے دو، ذکر کرنے سے، یہ تو ان کی شان کے خلاف ہے۔ (معاذ اللہ) ان کی ہستی ہو، طوق پہنایا گیا ہو، بیڑیاں پہنائی گئی ہوں۔ یہ تو اعتراض کا ڈھب ہے۔ کبھی ہمدرد بن کر دشمنی کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ وہ سب ظلم تھا تو ظاہر ہے کہ ظلم کی یاد سے ظالموں کی توہین ہوتی ہے۔ مظلوموں کی توہین نہیں ہوتی۔ طرح طرح کی باتیں ہیں۔ ان سے عرض کرتا ہوں، مصائب اسی میں آ جائیں گے۔ کہتے ہیں کہ زندۂ جاوید ہیں وہ شہید۔ وہ مردہ ہیں کہیں؟ لہٰذا

انہیں کیوں روتے ہو؟

میں کہتا ہوں کہ متفق علیہ کتابوں میں جو روایات ہیں، انہیں دیکھو کہ حسین پیدا ہوئے ہیں، رسولؐ کی گود میں لا کر دیے گئے ہیں اور پیغمبر خدا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ ہم سے بعد میں پوچھنا، رسولؐ سے پوچھ لو کہ زندہ کو کیوں روتے ہیں؟ ارے یہ زندگی شہداء کی تو عالم معنی کی زندگی ہے، وہ تو اس وقت جیتی جاگتی شکل سے سانس لیتی ہوئی زندگی کے ساتھ نانا کی گود میں موجود تھے اور رسولؐ گریہ فرما رہے تھے۔ تو اب تو تمہاری سمجھ میں آنا چاہئے کہ مرنے پر گریہ نہیں ہوتا، مصائب پر گریہ ہوتا ہے۔ اگر رسولؐ کو اس زندگی میں رونے کا حق تھا تو ہمیں اس زندگی میں رونے کا حق ہے۔

34

دین اسلام

ایک دور ایسا تھا کہ مجلس کے شرکاء میں سن رسیدہ افراد زیادہ ہوتے تھے۔ بوڑھے لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ نوجوانوں اور جوانوں کو دوسرے مراسمِ عزا سے زیادہ دلچسپی ہوتی تھی، مثلاً سینہ زنی، نوحہ خوانی اور اس طرح کی باتیں۔

مگر اب مجمع میں نوجوان اور تعلیم یافتہ افراد کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کے کام کی باتیں نہ کریں تو روزِ قیامت ہم سے باز پرس ہوگی۔

مولائے کائنات فرماتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین اس لئے آئے ہیں کہ دنیا کیلئے عقل کے دفینوں کو برآمد کریں۔

ایک بڑھیا سے پوچھا گیا کہ اللہ کو تو نے کیسے پہچانا؟ اُس نے کہا: اپنے اس چرخے سے۔ میں جب تک اس چرخے کو چلاتی ہوں، چلتا ہے، جب ہاتھ روک دیتی ہوں، رُک جاتا ہے۔ تو ایک چرخہ بغیر کسی کے چلائے نہیں چلتا ما تنا بڑا کارخانہ بغیر کسی کے چلائے کیسے چل سکتا ہے!

اس پردہ صد رنگِ کائنات کے پیچھے اک باشعور ذہن ہے، ایک کارساز ذات۔ ان کے قدموں کے ثبات کو دیکھ کر وہ خدا کے وجود کا پتہ لگا رہے ہیں۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"۔

میں نے کل یہ عرض کیا تھا کہ اصل دین کچھ حقیقتوں کا نام ہے جنہیں جانا اور مانا جاتا ہے۔ حقیقتوں میں فائدے کا سوال ہی نہیں۔ حقیقیت اس لئے مانی جاتی ہے کہ حقیقت ہونا متقاضی ہے کہ اُسے مانا جائے۔ اب اس کے بعد یہ کہ کیا فائدہ؟ تو اس کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ پھر اس پر سوچنے ہی سے کیا فائدہ؟ یعنی ان چیزوں کو کہ جنہیں دین پیش کرتا ہے، سوچیں ہی کیوں کہ کچھ سمجھ میں آئے۔

تو میں کہتا ہوں سوچنے کا ڈر کس چیز کا ہے؟ گھبرا کیوں رہے ہیں؟ کیا اس لئے کہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر سوچیں تو سمجھ میں نہ آجائے کہ یہ حق ہے۔ تو بس ادھر یہ ندیشہ ذہن میں پیدا ہوا، اُدھر اب سوچنے یا نہ سوچنے، حجت آپ پر تمام ہوگئی۔ اب یہ نہ سوچنا خود جرم ہے۔ لہٰذا نہ سوچنے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سوچ لیجئے تو بہتر ہے کہ سوچ لینے میں تو یہ امکان ہے کہ سمجھ میں یہی آئے کہ کچھ نہیں ہے اور اگر اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ دوسرے حضرات مجھ سے اس جملہ میں متفق ہوں گے یا نہیں مگر میں چونکہ اپنے اللہ کو عادل جانتا ہوں، اس لئے میں کہتا ہوں اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر صدق دل سے سوچنے پر ذہن کی کوتاہی سے واقعی یہی سمجھ میں آئے کہ کچھ نہیں ہے تو ہمارا خدا سزا نہیں دے گا جبکہ دیوانے کو اس نے بری کر دیا۔

دیوانہ کچھ مانتا ہے؟ کچھ بھی نہیں مانتا۔ مگر اُسے کچھ سزا نہیں۔ تو اگر قصورِ عقل سے واقعی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، علمِ الٰہی میں یہ کوتاہی کا مرتکب نہ ہوا۔ اس کے معیارنگاہ میں اس نے خود اختیاری، کوئی کمی نہیں کی ہے۔ جو کچھ کوتاہی ہے، وہ غیر ارادی طور پر، تو پھر اس کو سزا دینا عدلِ الٰہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا اب تو عقل کا تقاضا سوچنا ہی ہے کہ نہ سوچنے میں سزا یقینی ہے اور سوچنے میں کچھ امکان ہے بری ہو جانے کا۔ لہٰذا سوچ ہی لیجئے اور پوری کوشش کر لیجئے تو بہتر ہے۔

ماشاءاللہ مجالس میں نوجوان اور جوان کثرت سے ہوتے ہیں۔ ایک بڑی خوشگوار تبدیلی ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ہوئی ہے کہ ایک دور ایسا آیا تھا کہ مجلس کے شرکاء میں سن رسیدہ افراد زیادہ ہوتے تھے، بوڑھے لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ نوجوانوں اور جوانوں کو دوسرے مراسمِ عزا سے زیادہ دلچسپی ہوتی تھی، مثلاً سینہ زنی، نوحہ خوانی اور اس طرح کی باتیں۔ مگر مجالس میں خصوصاً علماء کا بیان، جس میں نہ کوئی نغمہ ہو نہ کوئی لے ہو، تو یہ بوڑھے بنظرِ ثواب مجلسوں میں زیادہ تر شریک ہوتے تھے اور دوسرے افراد بھی آتے تھے تو دور دور بیٹھ جاتے تھے اور اس انتظار میں کہ بس ختم ہو اور ہمارے مشغلہ کا وقت آئے۔ لہٰذا اگر اتفاق وقت سے یہ منبر کے قریب ہو گئے تو پھر مجلس ناکام ہو جائے گی کیونکہ وہ توجہ سے سنیں گے ہی نہیں۔ انہیں تو جلدی ہوگی۔ تو یہ تھا۔ مگر اب مجھے وہاں بھی اور

یہاں بھی یہ انقلاب آنکھوں سے بحمد للہ نظر آرہا ہے کہ مجمع میں ماشاءاللہ نوجوان اور جوان اور تعلیم یافتہ افراد کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور اب میں کہتا ہوں کہ اب اگر ہم ان کے کام کی باتیں نہ کریں تو روزِ قیامت ہم سے باز پرس ہوگی۔

تو اب اس طبقہ کیلئے میں عرض کرتا ہوں اور انہیں توجہ دلاتا ہوں۔ تو غور فرمایئے کہ یہ تصور، ان حقیقتوں پر جو مذہب کی ہیں کہ ہم سوچیں کیوں؟ یہ کہاں تک خاص اس دور کے تقاضے کے مطابق ہے؟ ہماری یونیورسٹیوں کے موضوع دیکھئے جن پر ریسرچ ہوتی ہے، جن پر سندیں ملتی ہیں، جن پر کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔ فلاں سمندر کی گہرائی کتنی ہے؟ جس میں ہمیں کبھی نہیں اترنا ہے۔ یہ ہمارے امتحانوں کے سوالات ہوتے ہیں۔ فلاں پہاڑ کی بلندی کتنی ہے؟ جس پر ہمیں کبھی نہیں چڑھنا ہے۔ ملک روم میں اتنے ہزار برس قبل تہذیب کیا تھی؟ جبکہ نہ وہ برس اب واپس آنے والا ہے، نہ اس تہذیب سے ہمارا واسطہ بھی پڑنے والا ہے۔ اہرام مصر سے متعلق یہ تحقیق کر لیجئے کہ وہاں کے پتھر کہاں کہاں سے آئے تھے اور اتنی اونچائی پر کس طرح پہنچائے گئے تھے؟

جس نے کسی نئی بات کو معلوم کر لیا تو وہ بہت بڑے محقق اور بہت بڑے انعام کے مستحق ہو گئے۔ یہ ہیں ہمارے علوم کے موضوعات۔ اس میں کبھی کوئی نہیں سوچتا کہ اس سے کیا فائدہ ہے؟ اور اب یہ ملاحظہ کیجئے کہ اس پہاڑ کی کتنی بلندی ہے کہ جس پر ہمیں چڑھنا نہیں ہے۔ اس دریا کی گہرائی کتنی ہے جس میں ہمیں اترنا نہیں، اُس براعظم کی پیمائی کتنی ہے جسے ہمیں کبھی طے نہیں کرنا۔ یہ سب تو گویا کارآمد علوم ہیں۔ ہم یہ سوچیں کہ ہمارا خالق کون ہے تو یہ دقیانوسی سی بات ہو گئی اور کہا جائے کہ اس کے جاننے سے کیا فائدہ؟ اہرامِ مصر کا بنانے والا کون؟ فرعون تھا۔ وہ آپ کا علمی مسئلہ ہے اور اس کائنات کا خالق کون ہے؟ یہ آپ کے نزدیک بیکار بات ہے۔ اُس ملک کی پیداوار کیا کیا ہے؟ جہاں ہمیں نہیں جانا ہے۔ بظاہر اسباب مگر وہ سوال ہے کہ وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں؟ وہ ہمارے علم کا ایک مسئلہ ہے لیکن خود ہمارا انجام کار کیا ہوگا، ہمیں آئندہ کہاں جانا ہے اور وہاں کی کیا ضروریات ہیں؟ یہ ہم کہیں تو دنیا کہے کہ بیکار بات ہے۔

تو یہ تو وہی بات ہوگی کہ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ اب یہاں ذرا تبدیلی کر دوں کہ جو چاہے آپ کی عقلِ کرشمہ ساز کرے۔ تو اب وہ سوال شروع کر رہا ہوں کہ دین ایک ہوتا تو مان بھی لیتے لیکن یہ اتنے دین ہیں، اس جھمیلے میں کون پڑے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ اصل میں دین تو ایک ہی ہے۔ وہ آیت ہی یہی ہے:

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"۔

میرے نزدیک دین تو ایک ہی ہے۔ جب میرے اللہ کے نزدیک ایک ہی ہے تو دین تو اصل میں ایک ہی ہے۔ بنام دین بہت سے ہیں۔ اب جو نام اس کا پرانا لے لیجئے، مذہب مسلک، طریقے چاہے نیا نام رکھ لیجئے۔ ازم، تو بنام دین بہت سے چل رہے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں کہ اتنے دین ہیں تو خواہ مخواہ اس جھگڑے میں کون پڑے۔ اس کے لئے مجھے کچھ زیادہ عقلی بحث نہیں کرنا ہے۔ صرف آپ کی فطرت، آپ کی عادات، آپ کے دستور کو میں پیش کروں گا کہ جو صاحب بھی کہہ رہے ہیں، اگر ان کا اصول یہ ہو کہ جب بھی راستہ میں چوراہہ پڑے تو وہ گھر واپس آجایا کریں، پھر آگے نہ جائیں کہ ایک راستہ ہوتا تو چلے بھی جاتے۔ اب یہ اتنے ہیں تو کیا کریں، جا کر گھر ہی واپس آجائیں۔ کہیں جانا ہو، سٹیشن جائیں، ادھر ادھر پلیٹ فارم پر دو گاڑیاں کھڑی ہوں تو فوراً اسٹیشن سے

واپس آجائیں کہ ایک گاڑی ہوتی تو چلے بھی جاتے۔ اب یہ دوگاڑیاں کھڑی ہیں تو کیا کریں جا کر؟ کوئی مقدمہ عدالت میں ہو۔ کہئے شہر میں ایک وکیل ہوتا تو کر لیتے، یہ اتنے وکیل ہیں تو کون اس جھمیلے میں پڑے، بلا سے ہار جائیں مگر اس جھگڑے میں نہیں پڑیں گے۔

کوئی بیمار ہو تو کہئے کہ ایک ڈاکٹر ہوتا علاج کر بھی لیتے، اتنے ڈاکٹر ہیں اور پھر اتنے ڈاکٹر ہی نہیں ہیں اتنے طریقے ہیں علاج کے تو اس جھگڑے میں کون پڑے۔ لہٰذا مر جائیں، علاج نہ کریں گے اور یہی اختلاف کی چیز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ضروریاتِ حیات ایک ہی غذا دنیا میں ہوتی تو کھا بھی لیتے، اب اتنی قسم کی غذائیں ہیں اور پھر جب کبھی مہمان ہوں تو مصیبت ہے تو اب کچھ بھی نہ کھائیں گے۔ اس جھگڑے میں کون پڑے کہ کیا کھائیں اور پھر غذاؤں میں وہ چاہے آپ کے ملک میں نہ ہو، آپ کے ہاں بھی عادتوں میں تو ہوگا ہی فرق لیکن ہمارے پاس کے ملک کو ہی لے لیجئے، ایک وقت میں تو جزو ہی تھا ایک دوسرے کا۔ یہ تو اب سیاسی کرتبوں نے حد بندی کر دی ہے تو جناب وہ غذا میں فقط غذاؤں کا فرق نہیں ہے، طریقوں کا بھی فرق ہے۔ کوئی سبزی خور کوئی گوشت خور۔

تو اب ایک غذا سب کھاتے تو خیر کھا بھی لیتے، اب جب کوئی سبزی کھا رہا ہے، کوئی گوشت کھا رہا ہے، تو ہم اچھے ہیں کہ ہوا ہی کھائیں گے۔ اب کچھ بھی نہیں کھائیں گے۔ لباس ایک ہی طرح کا ہوتا تو پہن بھی لیتے۔ وہ جناب مصیبت ہے کوئی۔ وہ تنگ موری والا پہنتا ہے، کوئی ڈھیلی شلوار پہنتا ہے، کوئی کچھ پہنتا ہے۔ لہٰذا کون اس جھمیلے میں پھنسے۔ تو اگر کوئی اپنے تمام نظامِ حیات میں اس کا پابند ہو تو میں اُسے کتنا ہی غیر معتدل ذہن والا سمجھوں مگر مذہب میں بھی معاف کر دوں گا کہ بھئی اس کا طریقہ ہی یہی ہے۔ یہ غیر متوازن انسان ہے۔ تو اب یہ سوچ کر کہ مذہب اتنے ہیں، میں کیا کروں۔ اس نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔ تو اس بیچارے نے تو لباس بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس بیچارے نے تو کھانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ او وہ رہے ہی گا کیوں جو میں اس پر فتویٰ لگاؤں، وہ تو چند دن میں ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ تمام ضروریاتِ حیات اس نے چھوڑ دیئے، اس لئے کہ وہ ایک طریقہ نہیں، بہت سے طریقے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی بھی عقل کے مطابق نہیں سمجھتا۔ جب عقل کے مطابق نہیں سمجھتا تو کرتا کیا ہے؟ جہاں صرف عادتوں کا فرق ہے، وہاں فقط اپنے ذوق کو دیکھتا ہے۔ ارے بہت سے کھانے ہیں، ہوا کریں، میں دیکھوں کہ مجھے کیا پسند ہے؟ جہاں مسلک کا فرق ہے، وہاں تو بہر حال اپنے ذہن سے سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ سبزی کھانا اچھا ہے یا گوشت کھانا بہتر ہے۔ گوشت خوری پر جو جو اعتراضات ہیں، انہیں جانچے گا کہ یہ اعتراضات درست ہیں یا نہیں۔ وہاں سٹیشن پر جائے گا، دوگاڑیاں کھڑی ہیں تو جو واقفانِ راہ ہیں، اُن سے پوچھے گا۔ جو ریلوے کے کارگزار ہیں ان سے دریافت کرے گا۔ ان سے پوچھنے پر اگر غلطی ہو جائے تو قسمت کی بات ہے۔ پھر یہ موردِ الزام نہ بنے گا۔ لیکن اگر پوچھا ہی نہ ہو، اندھا دھند سوار ہو گیا یا بے پوچھے گھر واپس آ گیا تو ہر صاحبِ عقل اُسے دیوانہ سمجھے گا۔ مریض ہے تو تحقیق کرے لوگوں سے جنہوں نے علاج کئے ہیں کہ کون ڈاکٹر ایسا ہے کہ جس کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

بہر حال کچھ نہ کچھ ہر شعبہ میں تحقیق کرے گا تو پھر سب جگہ یہی اصول ہے تو یہ دین بہت سے ہیں تو اس کی وجہ سے وہ دینِ حق کے اختیار کرنے کی ذمہ داری سے تو نہیں بچے گا۔ لہٰذا اس کا فریضہ یہ ہے کہ بہت سے دین ہیں تو اس میں تحقیق کرے۔ اللہ نے عقل اسی لئے دی ہے۔ وہ سوچنا اسی کی خاطر ہے۔ اگر دین بہت سے نہ ہوتے تو بھی پھر آگے سوچنے کی ضرورت نہ ہوتی جیسے شروع میں اصل

ضرورت دین کیلئے سوچنے کی ضرورت، ویسے ہی اب انتخاب دین کیلئے سوچنے کی ضرورت اور عقل سوچنے کی خاطر دی ہے۔ اب عقل جن افراد کی طرف بتائے کہ ان سے پوچھو تو پتہ چلے گا، ان افراد کی طرف رجوع کرنا، وہ عقل کے فیصلہ سے ہے، مثلاً کوئی بیمار ہوا اور عقل نے کہا کہ کسی حکیم کا علاج کرو، ڈاکٹر کا علاج کرو۔ اب ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے نسخہ لکھا تو اس کے پاس عقل ہی کے کہنے سے تو آیا تھا۔ اب اس کے نسخے میں چون چرا کرنا بے عقلی ہوگی۔ ویسے عقل اگر کسی رہنما کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے کہ یہ سچا رہنما ہے، اس کے پیچھے چلو اب اس رہنما کی ہدایات میں ہر منزل پر عقل سے کام لینا، یہ خود عقل کے تقاضے کے خلاف ہے۔ تحقیق اتنی ضروری چیز ہے کہ اصولِ دین میں تقلید حرام ہے۔ یعنی دین کو اس لئے اختیار کرنا کہ ہم اسی مذہب والوں کے ہاں پیدا ہوئے ہیں، یہ اللہ کے ہاں بری الذمہ نہیں بنائے گا۔ دین کو اس لئے اختیار کرنا کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی بتایا ہے، یہ دیندار نہیں بنائے گا۔ دین کے معاملہ میں خود سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ حق ہے، تحقیق واجب ہے، تقلید حرام ہے اصولِ دین میں۔

اسلام نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کو مانتے کیوں نہیں؟ اس نے شکایت یہ کی کہ:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا".

ارے یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟ ہاں وہ دوسرے مذاہب ہیں۔ مجھے معلوم ہے جنہوں نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ خبردار! عقل سے کام نہ لینا۔ مجھے یہ جملے یاد ہیں ایک رہنمائے مذہب کے، بنامِ مذہب جو تحریکیں چلی ہیں کہ اندھے بنو تو میرا جلوہ دیکھو، بہرے بنو تو میری آواز سنو۔ تو یہ کوئی کہے اسلام کو تو شکایت یہ ہے کہ آنکھیں ہیں اور یہ دیکھتے نہیں، کان ہیں اور یہ سنتے نہیں، عقل ہے اور یہ غور نہیں کرتے۔

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ".

یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں اور دلوں پر کیا مطلب؟ یہ وہ دل نہیں ہے جو ڈاکٹری میں فیل ہو جاتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں دل ذریعہ شعور کا نام ہے۔ ذریعہ تعقل کا نام ہے۔ تو وہ ان کے پاس طاقتیں ہیں سمجھنے کی اور پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے، سوچتے نہیں ہیں اور اسلام کی راہ میں تقلید آباؤ اجداد سنگِ گراں بنی ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہی عذر کرتے تھے، کہتے تھے:

"وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ".

ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستہ پر چلتے دیکھا ہے، لہٰذا ہم بھی اسی راستہ پر چلے جائیں گے۔

وہ یہی عذر پیش کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کیا کہا ہے:

"اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ".

گویا خود ان کے خوابیدہ ضمیر کو بیدار کر کے یہ سوال کیا ہے کہ کیا اپنے بزرگوں کے آباؤ اجداد کے راستے پر چلے جاؤ گے، چاہے

انہوں نے خود عقل سے کام نہ لیا ہو؟ مطلب یہ کہ آباؤ اجداد کا کہنا ضمانت نہیں ہے، مطابق عقل ہونے کی۔

ہو سکتا ہے کہ اللہ نے ان کو عقل دی ہو اور انہوں نے سوچا نہ ہو۔ لہٰذا تم کو خود کس لئے عقل دی ہے، تم کو خود سوچنا چاہئے کہ تمہارے آباؤ اجداد صحیح راستے پر تھے یا غلط راستے پر تھے اور چونکہ دعوتِ دین تحقیق کی متقاضی ہے، لہٰذا قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کیلئے اپنی جماعت کیلئے یہ نہیں کہا کہ اِدھر اُدھر کی صدائیں نہ سنو۔ یہ جنہیں کمزوری محسوس ہوتی ہے، وہ ہدایت کرتے ہیں کہ دوسرے کے مجمع میں نہ جاؤ، دوسروں کی باتیں نہ سنو۔

قرآن مجید کی آیت پڑھ رہا ہوں، مدح کر رہا ہے صاحبانِ ایمان کی:

الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتے ہیں۔ "یَسْمَعُوْنَ" کے معنی ہیں سنتے ہیں اور "یَسْتَمِعُوْنَ" کے معنی ہیں توجہ سے سنتے ہیں۔ "اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ"، وہ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتے ہیں۔ پھر اس میں جو بہتر ہوتا ہے، اُسے اختیار کرتے ہیں۔

تو حضور والا! دین آپ سے اس کا متقاضی نہیں ہے کہ بے سمجھے مان لیجئے، اس لئے کہ راستے الگ الگ ہیں۔ بنام دین اسی لئے تحقیق واجب ہے، اسی لئے تقلید حرام ہے، اسی لئے سوچنے اور سمجھنے کی طاقتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے اور انبیاء و مرسلین آئے ہیں اسی لئے کہ، وہ شریعت میں تو احکام بتانے کیلئے آئے ہیں اور اصولِ دین میں عقل کے چھپے ہوئے فیصلوں کو سامنے لانے کیلئے آئے ہیں۔ چھپے ہوئے کیا مطلب؟ یعنی عقل کے وہ بے لوث فیصلے جس پر روایات کی خاکستر جم گئی ہے، جس پر تقلیدِ آباؤ اجداد کا انبار لگ گیا ہے، اس کو اُبھار کر سامنے لانے کیلئے۔

ایک جملہ میں اس حقیقت کو حضرت امیرالمومنینؑ نے ظاہر فرمایا ہے۔ بڑا بلیغ جملہ ہے۔ انبیاء مرسلین کا مقصدِ بعثت کیا ہوتا ہے؟ حضرتؑ نے اسے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے:

"لِیُثِیْرُوْا دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ"

دفینہ کون ہوتا ہے؟ جو اوپر سے نہیں دکھائی دیتا۔ اس پر مٹی کے انبار ہوتے ہیں۔ لیکن جب کھودا جاتا ہے تو برآمد ہوتا ہے۔ تو یہی الفاظ امیرالمومنینؑ نے اپنے اس معیارِ بلاغت پر جو تحت کلام الخالق اور فوق کلام المخلوق ہے، اس کو پیش فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ انبیاء و مرسلین اس لئے آئے ہیں کہ دنیا کیلئے عقل کے دفینوں کو برآمد کریں۔ یہاں نہج البلاغہ کا ایک جملہ میں نے پڑھا ہے اور میں نے عرض کیا کہ تحت کلامِ الخالق اور فوق کلامِ المخلوق، یہاں پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ "جناب سید ھبۃ الدین شہرستانی" ان کا قیام کاظمین میں تھا اور وہ بہر حال علوم دنیا میں بھی عالم کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر اس کے علاوہ انہوں نے جدید ریاضی اور جدید فلسفہ پر معلومات حاصل فرما کر ایک کتاب "وَالْهَیْئَةُ وَالْاِسْلَامُ" لکھی جس کا ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب مرحوم نے اس دور میں البدر التمام کیا تھا اور جو

آپ ہی کے ہاں اب اس وقت کے لحاظ سے آپ ہی کے ہاں یعنی پنجاب ہی میں البرہان سے شائع ہوئی تھی۔ البدر التمام۔ تو وہ بڑے جامع العلوم وفنون آدمی تھے اور حکومتِ عراق میں وزیر معارف بھی رہے تھے۔ اب چونکہ وزیر معارف تھے، تو جو مستشرقین آتے تھے باہر سے، وہ ان سے ملاقات کیلئے آیا کرتے تھے۔ تو ایک بڑا مستشرق آیا۔ انہوں نے یہ واقعہ مجھ سے بیان فرمایا تھا کہ ایک مستشرق آیا اور وہ ان کی ملاقات کو آیا۔ عراق وایران میں جو کوئی آتا ہے، تو اس کو دید کہتے ہیں، پھر جاتے ہیں تو بازدید اُسے کہا جاتا ہے۔

وہاں اصول یہ ہے کہ جو مسافر ہو، اس کی دید کو لوگ آئیں اور وہ بازدید کے لئے جائے:

"اَلْقَادِمُ يُزَارُ وَلَا يَزُوْرُ"۔

جو کہیں وارد ہوا ہو، اس کے پاس لوگ آئے پہلے۔ وہ پہلے نہیں جائے گا۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی تہذیب یہ ہے کہ جو آتا ہے، وہی دید کرے اور پھر اس کی بازدید ہو۔ غرض وہ اپنے طریقہ پر پہلے آیا اور یہ بازدید کیلئے اس کے ہاں تشریف لے گئے۔ تو اس نے کہا کہ میرا کتب خانہ چل کر دیکھئے۔ عیسائی مستشرق تھا۔ انہوں نے جا کے اس کے کتب خانہ دیکھتے دیکھتے دیکھا کہ ایک جگہ، بہت جلی حروف میں، سنہری حروف کے ساتھ نہج البلاغہ لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بھی آپ کے ہاں ہے؟ نہج البلاغہ بھی ہے؟ خوش ہو کر، اُسے جیسے جوش آ گیا، اُس نے کہا: جی ہاں، یہ میرے ہاں نہ ہوتی؟

اس کے بعد اُس نے یہ کہا کہ یہ تو ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے کہ جب لوگ ان کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اگر اس دَور میں ہوتے تو مسجد کوفہ میں خطبہ پڑھتے ہوتے تو:

"كَانَ يَمُوْدُ الْمَسْجِدَ بِشَبْقَاتٍ"۔

شبقیہ کہتے ہیں ہیٹ کو، انگریزی ٹوپی، تو اس کا مطلب یہ تھا کہ پھر زیر منبر یہ عمامے نہ ہوتے، ہیٹ ہی ہیٹ ہوتے۔ یعنی دنیا بھر کے پروفیسر، تمام دنیا کے اساتذہ، علماء، وہ سب ان کے زیر منبر ہوتے۔ فرماتے تھے کہ اس پر تو میں خوش ہوا۔ اس نے تعریف کی، مجھ میں بالیدگی پیدا ہوئی۔ مگر اب اس نے ایک بات ایسی کہہ دی جو مجھ کو بہت بار ہو گئی اور اب مجھ پر ذمہ داری ہو گئی اس پر کچھ کہنے کی۔ اس نے کہا کہ یہ آپ لوگ مسلمان جو تھے، آپ لوگوں نے قرآن مجید کو بطور معجزہ پیش کیا۔ قرآن میں ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ

تم پر روزہ فرض ہے، تمہارے لئے قصاص کا قانون ہے تو یہ سب اس میں ہے تو اسے آپ نے بطور معجزہ پیش کیا ہے۔ اگر نہج البلاغہ کو آپ بطور معجزہ پیش کرتے تو دنیا مان لیتی۔ تمام دنیائے علم جدید، تمام دنیائے تمدن اس کو مان لیتی۔ انہوں نے کہا: اب وہ میری بالیدگی ختم ہو گئی۔ اس سے اسلام پر ضرب ہو گئی۔ میں نے ذہن میں سوچا کہ اب اس سے کیا کہوں؟ اس ظالم نے قرآن مجید میں سے تو "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" منتخب کیا، نہج البلاغہ کو اس کے بعد زبانی اس نے، خطبہ اشباح ایک بڑا معرکۃ الآرا خطبہ ہے، اس کی کئی سطریں زبانی سنا دیں، تو وہ کہتے تھے کہ اس نے قرآن مجید میں سے تو "يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" منتخب کیا اور نہج

البلاغہ میں سے اس نے خطبہ اشباح پیش کیا۔ اب میں اس سے کیا کہوں؟ وہ تو بہت طویل گفتگو کا میدان ہو جائے گا۔ تو اب میں گویا میدان میں کترا گیا۔ میں نے کچھ اور گفتگو شروع کر دی۔ اس کے بعد پھر برسر مطلب آ کر میں نے پوچھا، جن کی اتنی تعریف کی ہے، وہ آپ کے نزدیک صاحب عقل تو تھے۔ کچھ اب اُسے ناگوار ہوا اور اب اُس نے اور جوش و خروش کے ساتھ کلمات حمد و ثناء۔ یہ کیا سوال کیا؟ عجیب؟ صاحب عقل؟ ارے وہ تو ایسے تھے، ایسے تھے کہ انہوں نے ہی قرآن کو معجزہ مانا ہے۔ وہ کہنے لگا، اس وقت اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اس کو نہج البلاغہ پوری یاد تھی تو وہ خطبے یاد ہوں گے جہاں قرآن مجید کی حضرتؑ نے اپنے اُسی جوش و خروش کے ساتھ تعریف و توصیف فرمائی ہے۔

وہ سب بھی اسے یاد تھا تو انکار کیسے کرتا! اُس نے کہا کہ اب یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اب اس پر پھر غور کروں گا۔ اب وہ عمر بھر غور ہی کرتا رہے گا۔ غرض یہ کہ اصولِ دین بے سمجھے ماننا اُس کا مطالبہ نہیں ہے۔ صرف اس لئے کہ ہم ایسے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں، یہ کوئی حجت نہیں ہے، خود سمجھنا چاہئے۔ ہاں! اپنے معیارِ عقل کے مطابق جس زبان میں دلیل اپنے کو مطمئن کر سکے، چاہے وہ بحث دوسرے سے نہ کر سکے۔ بہت سی باتیں آدمی خود محسوس کرتا ہے لیکن دوسرے کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے اور خصوصاً بحث تو ایک فن ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے صاحبانِ علم بحث میں بند ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ سمجھے ہوئے ہیں مذہب کو مگر دوسرے کو سمجھا نہیں سکتے۔ تو وہ تو ایک فن ہے مگر اپنی جگہ۔ پر اس کے پاس کوئی دلیل ہونی چاہئے۔

چنانچہ ہمارے پاس ہمارے آئمہؑ ہی نے مختلف انداز سے دلائل پیش کر کے اس حقیقت کو بتایا ہے کہ دلیل کی نوعیتیں کتنی مختلف ہوتی ہیں۔ اب یہاں تو میں نے کہا کہ خود سمجھنے والا معیارِ فکر کے مطابق وہ دلیل اپنے لئے کوئی نہ کوئی رکھتا ہو، لیکن اس کا انداز ان کیلئے ظاہر ہے۔ دلیل کی ضرورت نہیں چونکہ دلیل وہاں ہوتی ہے جہاں پردہ ہو۔ ان کیلئے دلیل و مدلول سب بے پردہ تھا۔ لہٰذا ان کا علم دلیل سے نہیں ہوتا تھا مگر دلیل سے وہ اس علم کو حاصل کرنا سکھا دیتے تھے۔ تو جن کو سکھاتے تھے، ان کا تو پیمانہ نظر مختلف ہے۔ ان کی توسیعِ ذہن الگ ہے۔ لہٰذا جتنے طریقے کے سائل جس جس معیار کے آئے، ویسا ویسا راستہ انہوں نے اختیار کیا۔

اب ایک آیا عام صحرائی عرب، عربوں کی زندگی آپ جانتے ہیں، سفر اور وہ بھی پشتِ شتر کے اوپر۔ اب ایک صحرائی عرب امامؑ کے پاس آیا اور امامؑ سے پوچھتا ہے کہ مجھ کو اللہ کا وجود سمجھا دیجئے۔ تو اب اس کے سامنے گہری باتیں پیش کی جائیں تو وہ بیچارہ بجائے سمجھنے کے سمجھنے سے توبہ کر لے گا۔ وہ پھر اُسی نقطہ پر آ جائے گا کہ کون اس جھمیلے میں پڑے۔ لہٰذا اب وہ صحرائی عرب ہے اور اس کی زندگی اسی میں گزر رہی ہے۔ تو جو اس کی زندگی ہے، اسی کے ماحول سے دلیل۔ ان میں بعض علوم بھی تھے جواب نہیں ہیں۔ حالانکہ دورِ جاہلیت تھا مگر بعض اس وقت کے علوم اس وقت اس نقطہ پر نہیں مثلاً فن قیافہ، آج کل لوگ قیافہ سمجھتے ہیں ناک نقشہ سے کچھ سمجھنا؟ ذہن ہے یا کند ذہن ہے، اب ایک ہو گیا ہے۔ ہاتھ دیکھنا، اس سے حکم لگائے جاتے ہیں، وہاں قیافہ۔ نقشِ قدم کو دیکھ کر یہ بتا دیتے تھے کہ یہ کس قبیلہ کا آدمی ہے، کس عمر کا آدمی ہو گیا ہے۔ کس سن کا آدمی ہے۔ جو کسی شے سے ناواقف ہو، وہ پھر سمجھ ہی نہیں سکتا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ مگر یہ ہوتا تھا اور ہماری تاریخ اسلام میں ہوا ہے۔ شب ہجرت جب پیغمبرِ خدا تشریف لے گئے تو

انہوں نے قیافہ شناسوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اب اس پورے واقعہ کو تو عرض نہیں کرتا، کچھ عرض کر چکا ہوں، کسی مجلس میں کہ رات بھر تو پھنسے رہے اُلجھن میں، سمجھتے رہے کہ رسولؐ ہیں۔ اب صبح کو جب راز کھلا تو چلے تعاقب کیلئے کہ جلدی چلو، معلوم نہیں کہ کدھر گئے ہیں؟ تو قیافہ شناسوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان کو اپنے ساتھ لے کر چلے اور انہوں نے خانۂ پیغمبرِ خدا سے نقش قدم دیکھنا شروع کئے اور صحیح رہنمائی کرتے رہے کہ یہاں تک گئے، یہاں تک گئے، اِدھر گئے، اُدھر گئے۔ بالکل صحیح لے جا کر منزل پر انہوں نے کہہ دیا کہ اب رسول تنہا نہیں ہیں، کوئی ہمراہ بھی ہے۔

مجھے اس وقت اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے اور میری عادت بھی نہیں ہے کہ ایسی باتوں پر تبصرہ کروں۔ تو جناب! وہ دیکھتے ہوئے نقش قدم پر چلے گئے غار کے دروازے تک اور بالکل صحیح حکم لگا دیا کہ یہاں سے آگے نہیں گئے ہیں۔ دیکھا آپ نے ان کے فن کا کمال! تو یہ تھی ان کی زندگی!

تو جناب والا! یہ ہے ان کا ماحول، یہ ہیں ان کے علوم۔ تو اب امامؑ اس سے دلیل وجودِ خدا کی فرماتے ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْبِعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالرَّوْثَةُ تَدُلُّ عَلَى الْحَمِيْرِ وَآثَارُ الْقَدَمِ تَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ"۔

فرماتے ہیں کہ ارے بھئی جس قسم کا جانور گیا ہو، جانور تو تمہارے سامنے نہیں ہے لیکن اگر راستے میں مینگنیاں کسی جانور کی مل جاتی ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ وہ جانور گیا ہے۔ "آثَارُ الْقَدَمِ تَدُلُّ الْمَسِيْرِ"، نقش قدم خبر دیتا ہے کہ ادھر سے کون گیا ہے۔ اب اس کو میں علمی زبان میں کہتا ہوں، تم روز اثر سے مؤثر کا پتہ لگایا کرتے ہو مگر یہ اثر اور مؤثر کہا جاتا تو وہ نہ سمجھتا۔ فرمایا کہ وہ مینگنیاں اس جانور کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ نقش قدم راستہ چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں۔ تو یہ اتنا بڑا آسمان، اتنی بڑی زمین اپنے بنانے والے کا پتہ کیوں نہیں دیں گے۔ سطحی ذہن کا آدمی تھا، اس کو اس طرح سمجھایا اور ہمارے آئمہؑ نے اسی سطحِ زمین کی مثال دے کر فرمایا:

"عَلَيْكُمْ بِدِيْنِ الْعَجَائِزِ"

تمہارا فریضہ اتنا ہی دین ہے جتنا بوڑھوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ بڑھیا عورتیں جاہل، ظاہر ہے جن کے مرد ایسے جاہل ہوں، ان کی خواتین کیسی ہوں گی۔ مگر وہ بھی اپنے لئے دلیل رکھتی ہیں۔ ایک بڑھیا سے پوچھا گیا کہ اللہ کو تو نے کیسے پہچانا؟ اس نے کہا: اپنے اس چرخہ سے۔ میں جب تک اس چرخے کو چلاتی ہوں، چلتا ہے، جب ہاتھ روک دیتی ہوں تو رُک جاتا ہے۔ تو ایک چرخہ بغیر کسی کے چلائے نہیں چلتا، اتنا بڑا کارخانہ بغیر کسی کے چلائے کیسے چل سکتا ہے؟

ذہین طالب علم یا اُستاد جس سے پوچھو: صاحب! ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ہم اتنی دلیلوں میں پڑیں۔ تو میں تو کہوں گا کیا آپ اس چرخہ چلانے والی بڑھیا سے بھی گئے گزرے ہیں کہ وہ تو اپنے ہی ماحول کی دلیل سے سمجھ لے اور آپ جس کو دیکھتے ہیں، اس سے کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ایک وقت تھا کہ فلسفی قائل ہوتے تھے اللہ کے اور سائنس دان منکر ہوتے تھے اور یہ دور ایسا ہو گیا ہے کہ بات اُلٹ

گئی ہے۔ سائنس دان قائل ہوتے جاتے ہیں، کتابیں لکھ رہے ہیں وجودِ خدا پر۔

ایک صاحب تھے شمس آباد کے، بہت صاحب مطالعہ تھے۔ نواب محمد عباس صاحب سالک، انہوں نے مجھے پروفیسر جوگ کی کتاب دی تھی، ثبوت خدا کی، کوئی پانچ سو صفحات کی اور وہ سائنس دان آدمی ہے۔ تو ایک وقت میں فلسفی مقرر تھے جو بے دیکھے کلیوں پر حکم لگاتے تھے۔ یہ مشاہدہ پرست تھے۔ سائنس دان تو یہ غیب کے منکر تھے اور اب یہ مشاہدہ پرست جو ہیں، وہ غیب پر ایمان لانے لگے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے سوچنے والے، وہ منکر ہو رہے ہیں، میں کہتا ہوں کہ توفیق ربانی کے پلٹنے ہیں۔ فلسفی جو تھے، وہ سائنس دانوں کے انکار سے مرعوب ہو گئے تو منکر ہونے لگے یعنی انہوں نے تحقیق کی بجائے تقلید اختیار کر لی اور سائنس دانوں کو سائنس نے تحقیق پر مائل کر دیا۔

اپنے مشاہدہ کی ناکامی کا احساس انہیں کسی کارساز کے تصور کی طرف لے گیا۔ تو حضور! اس بڑھیا کا معیارِ نظر جو تھا، اس کے پاس بھی دلیل تھی۔ اب ایک فلسفی آ گیا، اُس نے کہا کہ اللہ کا ثبوت بتایئے کہ کیا ہے؟ اب اس سے اس کی زبان میں بات کرنا ہے۔ اس کے معیارِ نظر کے مطابق بڑے دعویٰ سے آیا تھا کہ میں آج انہیں قائل کر دوں گا۔ اب جو آیا، پوچھا کہ بتایئے وجودِ خدا کی دلیل؟ آپ نے فرمایا: بس ایک سوال ہے میرا، اس کا جواب دے دو، اس کے بعد گفتگو آگے بڑھے گی کہ تم موجود ہو یا معدوم؟ یعنی ہو یا نہیں ہو؟ اگر ہو تو بتا دو کہ خود تم نے اپنے کو بنایا یا کسی اور نے؟ اگر تم کہو کہ خود میں نے تو بتا دیا کہ جب تم نے اپنے کو بنایا تو اس بناتے وقت تم تھے یا نہیں تھے؟ بس یہ سوالات جو اس پر وارد ہوئے تو دیر کچھ دیر سوچ میں رہا اور بغیر کچھ کہے، اُٹھ کر چلا گیا۔

حضرت کے اصحاب میں سے، جو ان کو اپنے ساتھ لائے تھے، انہوں نے اس سے پوچھا کہ ارے بھئی کہاں؟ تم نے کوئی بات ہی نہیں کی؟ اس نے کہا کہ کیا بتاؤں، وہ سوالات ہی ایسے تھے۔ ہو، نہیں ہو، اگر "نہیں ہو" کہوں تو غلط ہے کہ ہوں۔ اب انہوں نے کہا کہ کوئی اور ہے جس نے تم کو بنایا۔ اب اگر کہہ دوں کہ ہے تو ان کا مطلب حاصل ہو گیا۔ تو جسکے پوچھنے کو آیا تھا، وہ ثابت ہو گیا۔ اور اگر کہوں کہ میں نے خود، تو پھر دوسرا سوال جو میرے سر پر ہے کہ جب تم نے اپنے آپ کو بنایا تو تم تھے یا نہیں تھے۔ تو میں یہاں جو بھی کہتا، غلط ہوتا۔ یہ کہوں کہ تھا، میں موجود پہلے بھی تھا تو پھر بعد میں بنایا۔ کہئے قطعی ناممکن ہے۔ اگر میں کہوں کہ نہیں تھا، تو معدوم عطائے وجود کیونکر ہو سکتا ہے؟

یہ بات غلط ہوتی۔ لہٰذا اب ماننے کے سوا چارہ ہی نہیں تھا تو اب بات کر کے کیا کرتا۔

دیکھا آپ نے اب یہاں نہ نقش قدم ہے، نہ جانور ہے۔ اب آجکل تو علم النفس یونیورسٹیوں کا مستقل موضوع ہو گیا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، علم کوئی نیا نہیں ہوتا، وہ داخلِ فطرت ہوتا ہے، اگر کوئی علم ہے، جس وقت سے کتابیں لکھی جانے لگی ہیں، کتابیں مدون ہو جاتی ہیں، علم ہو جاتا ہے۔ ورنہ اصول علم ہمیشہ سے ہوتے ہیں۔

اب ایک ماہر نفسیات آیا۔ اس نے پوچھا کہ اللہ کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ آپ نے فرمایا: بس میرے کچھ سوالوں کا جواب دے دو۔ کبھی سمندر کا سفر تم نے کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جی ہاں، سفر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: کبھی ایسا ہوا ہے کہ دریا میں طوفان آیا ہو؟ کہا:

جی ہاں، ایسا بھی ہوا۔ کہا: کبھی ایسا بھی ہوا کہ کشتی شکستہ ہوگئی ہو، تختے الگ ہو گئے ہوں؟ اس نے کہا: جی ہاں، ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تختے پر تم بیٹھے ہوئے چلے، اب نہ کوئی ساحل ہے، نہ سامنے کوئی دوسری کشتی ہے، کوئی نہیں ہے سامنے؟ کہا: جی ہاں، ایسا بھی ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: بس سچ سچ بتاؤ، اس وقت بھی دل کہتا تھا کہ اب بھی بچ سکتا ہوں؟ اُس نے کہا: ہاں، کچھ تو تھی اُمید کی کرن۔ آپ نے فرمایا: بس اس وقت بھی سہارا دیتا ہے، اسی کو خدا کہتے ہیں۔

بس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں، آپ نے دیکھا امام۔ آپ نے دیکھا رہنما۔ ایک سوال کیا، ہر ایک نے جیسا اُس کا ذہن ہے، اس کے معیارِ ذہن کے مطابق جواب۔ میں کہتا ہوں کہ بس یہی بات قرآن سے نہیں ہوسکتی۔ بتا دیا کہ دلیل مختلف ذہن کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اب اگر کچھ شخصیات ہوں جو وجودِ باری کی دلیل ہیں تو ان شخصیات کا ذکر عبادت نہ ہوگا؟ ارے اب ایک شخصیت جو بحمد للہ باوجود اختلاف فرقہ تمام مسلمانوں میں سرتسلیم خم کروانے کیلئے کافی ہے۔ وہ ہستی، اس کیلئے قرآن کی مثال پیش کردوں، سورۂ جمعہ، ماشاء اللہ یہاں نمازِ جمعہ مختلف مقامات پر ہوتی ہوگی اور حضرات شرکت کرتے ہوں گے۔ سورۂ جمعہ میں تقریباً دوسری آیت ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

ذرا آیت کا محل دیکھئے۔ سورہ شروع ہوا ہے اللہ کے تعارف سے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①

اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر شے جو آسمان پر ہے اور زمین پر ہے۔ کون؟ جو سلطنت کا حقیقی مالک، کون اللہ؟ جو تمام نقائص و عیوب سے بری، کون اللہ؟ جو عزت و حکمت کا مالک۔

اب اس سلسلہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ وہ ہے جس نے اُمیین میں ایسا رسول بھیجا، اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول کا تعارف کروایا جا رہا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے ایسا رسول بھیجا۔ یہ وہ تھیں کہ جن کی پہلی کڑی یہ ہے کہ ان کا وجود دلیل وجودِ خدا تھا۔ انہیں دیکھ کر خالق کی ہستی کا پتہ چلتا تھا۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، وہ چاہے ہوائے سیاست ان کے خلاف ہی ہو لیکن یہ کہ متعارف تو ان سے بھی ہیں، سب جانتے ہیں اور وہ مشہور بھی ہیں۔ ان کا کلام بہت سا ایسا ہے جس میں انکارِ خدا ہے۔ میرے سامنے ایسے جملے انہوں نے کہے ہیں کہ جن کی وجہ سے میں انہیں مسلمان سمجھتا ہوں۔ مجھے انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا گواہ بنالیا ہے۔ لیکن یہ کہ ان کا کلام بہت سا ایسا ہے۔ اس میں مضحکہ ہے، تمسخر ہے، گستاخیاں ہیں۔ سب کچھ ہے۔ بحیثیت منکرِ خدا وہ مشہور و معروف ہیں۔ کیا کہتے ہیں؟ وہ ان کا معرکۃ الآرا مسدسِ حسینؑ اور انقلاب دیکھئے، تو وہ اس میں کیا کہہ رہے ہیں؟

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات

کہتاہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صدرنگِ کائنات

یہ کہہ رہاہے ان کا ابدآشنا ثبات یعنی اس صدرنگ پردۂ کائنات کے پیچھے دیکھئے، غیب پرایمان ہوگیا۔ اس پردۂ صدرنگ کائنات کے پیچھے ایک باشعور ذہن ہے، ایک کارساز ذات۔ ان کے قدموں کے ثبات کو دیکھ کروہ خدا کے وجود کا پتہ لگا رہے ہیں۔

ارے غور سے ان کے چہرے کو دیکھتے تو بہت پہلے قائل ہوجاتے۔ یعنی ورائے پردۂ صدرنگ کائنات، اِک باشعور ذہن ہے۔ علم اور قدرت دونوں پر ایمان ہے۔ ایک باشعور ذہن، یہ علم ہوگیا۔ ایک کارساز ذات، یہ قدرت ہوگئی۔ یہی صفاتِ ثبوتیہ کے دو افراد ہیں۔ ایک باشعور ذہن ہے، ایک کارساز ذات۔ اور بیت اس کے بعد کہی ہے:

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

اب آگے نہیں بڑھوں گا۔ بس! بخدا نماز بھی جیسی تاریخ کربلا میں ہوئی ہے، ایسی تاریخ عالم میں کبھی نہیں ہوئی۔ جو نمازی ہیں، وہ بھی جب پریشانی کا ہنگام ہوتو کچھ شرع کی رعایتوں کا فائدہ اٹھالیتے ہیں، مثلاً کوئی ہے جو اول وقت نماز کا پابند ہے، کسی دن خدانخواستہ کسی کی حالت خراب ہوگئی، حالت، احتزار ہے، آج واجبی نماز بھی ذرا دیر میں پڑھی اور نوافل بھی نہیں پڑھے اور بعد میں خود افسوس بھی کیا کہ دیکھو! اتنی مدت سے پابند تھا نماز کا اور نوافل کا، آج ایسا بدحواس ہوا۔ ایسا وقت تھا، کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ کیسا ہی پابندِ شرعِ عالمِ دین ہو، اعتراض نہیں کرے گا۔ ہمدردی محسوس کرے گا کہ وقت کا تقاضا ہی یہی تھا۔ مگر کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے مثال پیش کی کہ جتنا وقت سخت ہو، عبادت میں کمی نہ کرو۔ کوئی اضافہ، کوئی خصوصیت رکھ دو، خصوصیت بڑھادو۔ روزِ عاشورہ کی صبح کی نماز کی خاص اہمیت ہے کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو مولاؑ نے سب جماعت کے ساتھ پڑھی۔ بہت سے اصحاب کی زندگی کی آخری نماز صبح کی نماز۔ تو آج کیا خصوصیت برتی کہ روز کے مؤذن حجاج ابن مسروق جعفی اور یہ آج کی نماز؟ فرماتے ہیں: بیٹا علی اکبرؑ! آج اذان تم دے دو۔ یہ کیا ہے؟ مولاؑ جانتے ہیں کہ میرا علی اکبر بھلانے کی چیز نہیں ہے، وہ چاہتے ہیں کہ جب تک میرے علی اکبرؑ کی یاد قائم رہے، تب تک اس نماز کی یاد قائم رہے۔

ماشاءاللہ جو نمازی ہیں، ان کیلئے بھی بارصبح ہی کی نماز ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو سب نمازیں وقت پر پڑھتے ہیں لیکن صبح کو آنکھ نہیں کھلی۔ قضا پڑھتے ہیں۔ تو مولاؑ نے صبح کی اذان علی اکبرؑ سے دلوائی کہ اس وقت کوئی علی اکبرؑ ہی کا ماتم کرنے والا جوان، اس کی بستر پر آنکھ کھل جائے تو اس وقت اُسے یاد آجائے کہ اس وقت میرا شہزادہ کہہ رہا ہے: ''حی علی الصلوٰۃ'' تو اب یہ دیکھنا ہے کہ علی اکبرؑ کی آواز پر کون کون آتا ہے؟

35

دین اسلام

یاد رکھئے کہ اسلامی کلچر شکل وصورت سے نہیں ہوتا۔ اصل اسلامی کلچر اہلیت سے ہوتا ہے۔ گنبد لے جا کر آپ بت کدے میں بنا دیجئے تو وہ گنبد بھی اسلامی کلچر ہے؟ ہر گز نہیں۔ اسی طرح اگر بے گناہوں کے گھر جلانے میں اللہ اکبر کا نعرہ بھی اسلامک کلچر نہیں ہوگا تو مقصد کا صحیح ہونا شرط ہے۔

ارے! مسجد کو یاد نہیں رکھتے اور قصر حمرا و قصر خضراء پر فخر کرتے ہو؟

حضرت امام حسین نے کہا: میں اسلام کا صحیح نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دوں اور آفتاب کی روشنی میں ان کو سچے مسلمانوں کا ایک گروہ دکھا دوں اور اپنے کردار کو اتنا اونچا لے جاؤں کہ دمشق کے مینارے دب جائیں اور میری اللہ اکبر کی صدا دنیا کے دل میں گھر کرے۔

امام علیہ السلام کربلا میں اپنے ساتھ ہر نمونہ لائے تھے کہ اگر ان میں انسانیت کا کوئی شائبہ ہوگا تو کبھی جوان، جوان کے مقابلہ میں ہاتھ روکے گا، کبھی بچے کے مقابلہ میں، کبھی کسی خاتون پر رحم آئے گا۔

جب یہ نہیں ہوا تو دنیا سمجھ لے کہ اس برقع کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ اس نقاب کے پیچھے کون سے مسلمان ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ کربلا کے جہد کی نوعیت بالکل مختلف ہوگئی۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"۔

دین کے بارے میں جو طرح طرح کے عذر کئے جاتے ہیں، ان کی پہلی بات کل عرض ہوئی کہ اگر ایک دین ہوتا تو مان بھی لیتے۔ جب بہت سے دین ہیں تو اس جھگڑے میں کون پڑے۔ اس کے بارے میں مَیں نے عرض کیا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں بہت سی شکلیں ہوتی ہیں تو یہ تو نہیں انسان کرتا کہ چونکہ شکلیں بہت ہیں، لہٰذا اس چیز ہی کو چھوڑ دیں بلکہ کبھی اپنے ذوق کی مناسبت کو دیکھتا ہے، کبھی جو واقف کار ہیں، ان سے دریافت کرتا ہے، ان سے پتہ لگاتا ہے کہ کونسا راستہ ہے جو منزل تک جائے گا۔ سٹیشن پر پوچھتا ہے کہ کونسی گاڑی ہے جو اُس جگہ جارہی ہے جہاں مجھے جانا ہے۔ تو جب ہر شعبہ حیات میں انسان ایسا ہی کرتا ہے تو دین کے بہت ہونے سے اصل دین کو چھوڑنا، یہ کہاں کی معقولیت ہے؟ بلکہ انسان تحقیق کرے، غور کرے اور سمجھنے کی کوشش کرے کہ کونسا دین درست ہے۔

اب اس بات کا دوسرا پہلو پیش کرتے ہوئے یوں کہا جاتا ہے کہ دینوں کی وجہ سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ جب بہت دین ہوئے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی کسی دین کا پیرو ہے، کوئی کسی دن کا۔ لہٰذا ایسی چیز سے کیا فائدہ جو لوگوں میں تفرقہ پیدا کرے۔ تو اس کے جواب میں مَیں یہ کہوں گا کہ اس کا حل آپ نے جو تجویز کیا ہے کہ لادینیت اختیار کریں تو اس لادینیت سے تفرقہ کیونکر ختم ہوگا؟ بلکہ آپ کی لادینیت نے ایک فرقہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ آپ کے ابھی تک دین کی وجہ سے فرقے تھے۔ ایک ایک دین کا ایک دوسرے دین کا۔ اب وہ فرض کیجئے پچاس تھے، اکیاونواں گروہ پیدا ہو گیا لادینیت کا۔ تو اس سے تفرقہ میں کمی تو نہیں ہوئی اور زیادتی ہو گئی۔ جب سب بے دین ہوجائیں گے تو تفرقہ مٹ جائے گا۔

تو میں کہتا ہوں کہ یہ خواب جو آپ دیکھ رہے ہیں، اگر شرمندۂ تعبیر بھی ہوا اور اس ترکیب سے آپ تفرقہ مٹائیں کہ سب بے دین ہوجائیں تو میں یہ کہتا ہوں کہ ہر دین تفرقہ مٹا سکتا ہے، اس طرح کہ سب اُس دین کو اختیار کرلیں۔ اس لئے تفرقہ ہوتا ہے تو اب آپ کا نسخہ ہے، وہ بھی مرض کو بڑھانے والا ہے۔ اس میں تفرقہ میں اور اضافہ ہوگا، کمی تو نہیں ہوگی۔ اب اسی کا اور جدید تر پہلو یہ ہے کہ دین دنیا میں جنگیں کرواتا ہے، لڑائیاں کرواتا ہے اور دین کی وجہ سے کتنے خون گزشتہ دور میں بہہ چکے ہیں اور اب بھی کبھی کبھی بہتے ہیں۔ تو ایسی چیز سے کیا فائدہ جو خونریزی کروائے، جنگیں کروائے۔ تو میں کہتا ہوں کہ وہ دین تو دین تو کوئی سا بھی نہیں ہے جنگ کی دعوت دے خود سے۔ یہ جنگیں جو ہوتی ہیں، یہ اس لئے کہ دین کے نام پر تحریکیں اٹھائی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ شاطر سیاست دان جانتا ہے کہ دین میں جتنی جاذبیت ہے، اتنی کسی اور چیز میں نہیں ہے۔ تو اس بناء پر اپنی تحریکوں پر دین کا غلاف چڑھایا جاتا ہے اور جھنڈے پر دین کا نام لکھ دیا جاتا ہے اور دین کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ بات کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ ملمع اس چیز کا کیا جاتا ہے۔ جو قیمتی ہو، لوہے کا ملمع نہیں کیا جاتا۔ چونکہ سونے چاندی کی قیمت ہے، اس لئے اس کا ملمع چڑھائیں گے۔ شیشے کا مصنوعی تیار نہیں کریں گے، لعل و یاقوت چونکہ قیمت رکھتے ہیں، لہٰذا ان کا مصنوعی تیار کیا جاتا ہے۔ تو اب جو عرض کرتا ہوں، اس کو عقل کی بارگاہ میں پیش کر کے دیکھئے کہ چونکہ سونے چاندی کا ملمع چڑھا کر بہت سے لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے، لہٰذا دنیا سے سونے چاندی کو ختم کر دیا جائے۔ چونکہ لعل و یاقوت کا مصنوعی تیار کیا جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو ٹھگ لیا جاتا ہے، لہٰذا لعل و یاقوت کو دنیا سے نابود کر دیا جائے تا کہ لوگوں کو دھوکا نہ ہو۔ چونکہ اصلی گھی کے نام پر لوگوں کے ہاتھ بناسپتی گھی فروخت کیا جاتا ہے، لہٰذا یہ ہے کہ اصلی گھی کو دنیا سے ختم ہی کر دیا جائے۔ تو یاد رکھئے کہ ان ملمعوں کی وجہ سے جو کسی کا نقصان ہوتا ہے، تو اس میں قصور اُس اصل چیز کا نہیں ہے۔ ریگستانوں میں بالو پانی کی طرح چمکتی ہے، اُسے سراب کہتے ہیں۔ بہت سے پیاسے دھوکہ کھا کر دوڑتے ہیں تو پیاس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ قریب پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ پانی تھا ہی نہیں۔ تو کیا دنیا سے پانی فنا کر دینے کے قابل ہے؟ اس لئے کہ سراب بہت سوں کو دھوکہ دیتا ہے؟

اب میں ایک عام بات کہوں، یاد رکھئے کہ جھوٹ جھوٹ ہے ہی نہیں جب تک سچ کا لباس نہ پہنے۔ اگر جھوٹ کہہ کر بولا جائے تو جھوٹ ہو گا ہی کہاں؟ تو جھوٹ اس وقت تک جھوٹ ہے جب تک سچ کا لباس نہ پہنے۔ تو کیا دنیا سے سچائی ختم کر دینے کے قابل ہے؟ اس لئے کہ جھوٹ بہت سوں کو دھوکہ دیتا ہے۔ تو اگر یہ سب باتیں غیر معقول ہیں تو اسی طرح اگر مذہب کے نام پر بہت سے لوگ دھوکہ کھاتے ہیں تو اس میں اصل دین کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اب ان سب کا کیا علاج ہے؟ ان سب کا علاج یہ ہے کہ نگاہِ امتیاز پیدا کیجئے جو اصل اور نقل کا فرق محسوس کر سکے۔ علامتوں پر نظر کیجئے جو سراب اور آب میں فرق محسوس کر سکے۔ عقل و شعور سے کام لیجئے کہ سچ اور جھوٹ کا امتیاز کر سکے۔ تو اسی طرح اگر دنیا میں بنامِ مذہب فساد ہوتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ دین کو فنا کر دیجئے بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ قوتِ امتیاز پیدا کیجئے۔ دین کی معرفت زیادہ حاصل کیجئے تا کہ کسی غلط نعرے سے دھوکہ میں نہ آ جائیں اور یوں تو انسان کا یہ ذوق خوں آشامی۔

جب تک دنیا مذہب کے نام پر قبضے میں آتی تھی، تب تک مذہب کے نام پر تحریکیں چلیں، لڑائیاں ہوئیں لیکن جب سے گویا دین کا تصور فیشن کے خلاف ہو گیا، جب سے موجودہ دور کی ہوا چلی کہ لوگوں کی نگاہ میں دین کی وہ جاذبیت باقی نہ رہی، تو اب دین نہ رہے "ازم" ہو گئے۔ مختلف نظام ہائے حیات ہو گئے۔ اب جو لوگ زیادہ معلومات رکھتے ہیں، وہ اعداد و شمار سے ثابت کر سکتے ہیں جو عرض کر رہا ہوں، میری عمر کے آدمیوں کے سامنے تو دو عظیم جنگیں ہوئیں جس کو ہم لوگ جنگِ ہفت اقلیم کہتے تھے۔ ایک 14ء کی جنگ جس میں ایک طرف حریف قیصر ولیم تھا۔ اس وقت تک ہٹلر کا وجود نہیں تھا۔ ایک جنگ وہ۔ ایک جنگ جو بہت سے مجھ سے کم عمر والوں کے سامنے کی بات ہے، ہٹلر جس میں فریق تھا۔ ہٹلر کا نام جس میں آیا تو یہ جنگِ عظیم۔ تو اب اعداد و شمار دیکھئے کہ شروع سے بنامِ مذہب جو جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان سب کو ملا کر مقتولین زیادہ ہیں یا ان عظیم جنگوں میں؟ طرفین کے جتنے مقتول ہو گئے، تو یہ خونریزی مذہب کے نام پر ہو رہی ہے؟ دونوں طرف ایک ہی مذہب کے لوگ اور ان میں جنگ ہو رہی ہے۔

شعائرِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ

جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا ایک جزو ہے۔ دو دن اس سلسلہ بیان کے گزر گئے اور شعائر کے معنی میں نے بیان نہیں کیے۔ میں نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ چاہے شعائر کے معنی ہمیں معلوم نہ ہوں، تب بھی الفاظ سے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو، یہ پتہ چل گیا کہ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ عبادت اور چیز ہے اور تعظیم دوسری چیز ہے۔ دو دن یہی بیان رہا۔ اب آیئے شعائر کے معنی دیکھیں۔ اب شعائر کی تشریح میں یہ کہنا لازمی ہے کہ شعائر جمع ہے شعیرہ کی۔ لیجئے اب اُردو دان طبقے کیلئے اور مشکل ہوگی۔ مجلسوں میں شعائر کا لفظ تو سنا ہوگا کہ کچھ نہ کچھ ذہن میں اس کا مفہوم آجاتا تھا مگر یہ واحد جو اس کا معلوم ہوا شعیرہ۔ تو یہ ذہن کیلئے بالکل اجنبی چیز ہے۔ مگر میں عرض کروں کہ ابھی پتہ چلے گا کہ یہ ذہن سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ شعیرہ کے معنی لغت میں علامت کے ہیں جیسے نقش قدم کسی جانے والے کی علامت ہے۔ جیسے دھواں آگ کی علامت ہے۔ تو ویسے ہی شعیرہ کے معنی علامت کے ہیں۔ اب علامت کیوں کہتے ہیں؟ علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ علم ہوتی ہے۔ اب علم کے معنی سب کو معلوم ہیں جاننا۔

تو چونکہ علامت ذریعہ علم ہوتی ہے، اس لئے اُسے علامت کہتے ہیں۔ تو جس طرح علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ علم ہے۔ اسی طرح علامت کے معنی ہیں شعیرہ۔ لغت میں آیا ہے کیونکہ یہ ذریعہ شعور ہے کیونکہ شعور کے معنی علم کے ہیں۔ علامت کی جمع ہیں علائم۔ شعیرہ کی جمع ہے شعائر۔ اب علامت کون ہوتی ہے؟ جو جانا پہنچانا لفظ ہے، اُسے دیکھیں۔ شعیرہ ہوتی ہے علامت۔ شعائر یعنی علائم۔ اب علامت کون ہوتی ہے؟ علامت وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے ذہن کسی اور کی طرف جائے۔

اب نئے دور کی مثال دے دوں۔ تھرمامیٹر میں پارے کو دیکھا کس نقطے پر ہے؟ کہا کہ اسے اتنا بخار ہے۔ تو اس کا بخار اس تھرمامیٹر میں نہیں آیا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے، پارے کا وہاں پہنچنا، یہ علامت ہے اس بخار کی۔ پرانے زمانے میں حکما نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اتنا بخار ہے۔ تو نبض میں بھی اس کا بخار نہیں آتا تھا۔ جیسے پارے کے چڑھنے میں ذہن منتقل ہوا بخار کی طرف، اسی طرح نبض کی تیزی نے بخار کا پتہ دیا۔ وہ اسے سمجھتے تھے نبض سے۔ یہ اس کو دیکھتے ہیں تھرمامیٹر میں پارے کی رفتار سے۔ اب رفتار کی یہاں ایک اور بات یاد آئی ہے۔ دنیا والے کہتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو بغیر دیکھے نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ کس چیز کو آپ دیکھ کر مانتے ہیں؟ بخار کو آپ دیکھتے ہیں جو مانتے ہیں؟ دیکھتے تو پارے کو ہیں اور رائے قائم کرتے ہیں بخار کی۔ اسی طرح دنیا میں آجکل جتنے ذرائع ہیں کسی چیز کو سمجھنے کے۔ تو علامت کو دیکھتے ہیں۔ اب میں تو اس چیز کی حقیقت سے واقف نہیں ہوں۔ مگر اخباروں سے کچھ نہ کچھ ذہن میں آیا کہ وہ ہوائی جہاز جو بھیجے گئے ہیں، جن پر بہت سی دنیا احتجاج کر رہی ہے تو دشمن کا ہوائی جہاز دکھائی تو نہیں دیتا۔ اس کے اڑنے کی کچھ علامت

وانتقال ممکن نہیں، جو جسم وجسمانیات سے بری، تو وہاں جانشینی کے کیا معنی؟ تو میں تو پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اصل میں اس آیت کو تو بیان نہیں کر رہا ہوں لیکن مجمل طور پر اس کے دو پہلو عرض کرونگا۔

ایک بات مخفی ہے جسے ہر ایک آدمی بہت زیادہ غور کے بغیر سمجھ سکتا ہے۔ دوسرا نکتہ گہرا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بے شک اللہ لامکان ہے لیکن عالم اعلیٰ کا جو اس کی ذات کے ساتھ تعلق مانا جاتا ہے، وہ عالم ادنیٰ یعنی زمین کا نہیں مانا جاتا۔ اسی لئے دعا میں ہاتھ اٹھاتے ہیں، جھکاتے نہیں ہیں۔ موسیٰ ؑ بھی کلام کیلئے طور کی بلندی ڈھونڈتے تھے اور قرآن مجید کے محاوروں پر نظر کر لیجئے، وہ آیتیں نہیں پڑھوں گا کیونکہ موضوع مستقل نہیں ہے کہ جو جو چیز اُدھر کی ہیں، ان کیلئے آتا ہے اُتارنا۔ بارش اُتاری، لوہا اُتارا۔ تو جو چیز اُدھر سے آتی ہے، اس کیلئے آتا ہے اُتارنا۔ جو اِدھر سے چیز جاتی ہے، اس کیلئے ہے چڑھنا۔ عملِ صالح بلند ہوتا ہے، دعائے مؤمن بلند ہوتی ہے۔ نمازی کی پُرخلوص نماز بلند ہوتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بلند حصہ کو جو تعلق مقام نسبت میں ہے، یعنی عرش جو پایہ تخت ہے، اس کو اَسْفَلَ السَّافِلِيْنَ میں نہیں مانا گیا ہے۔ اعلیٰ علیین میں مانا گیا ہے حالانکہ میں نہیں مانتا کہ وہاں اللہ سبحانہ، بیٹھتا ہے۔ یہ تو اس وقت ہو کہ جب مکان کا محتاج ہو اور اس کو ایک روزمرہ کی مثال میں کہ یہاں بھی تو بیت اللہ ہے، خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے جس کے حج کیلئے جاتے ہیں۔ تو اس کا گھر ہے مگر کیا وہ بھی رہا ہے؟ تو جس کو رہنے کیلئے جگہ کی ضرورت نہیں، اس کو بیٹھنے کیلئے بھی جگہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی مقامِ شرف میں ایک نسبت ہے، وہ بھی مقامِ اعزاز میں ایک نسبت ہے۔ مگر جیسی نسبت ہوتی ہے، اس کو اپنے عمل سے نبھایا جاتا ہے۔ وہ ہے اللہ کا تختِ سلطنت، گھر کی نسبت کسی شخص کی طرف انفرادی وذاتی یعنی نجی ہے اور تختِ سلطنت کی حیثیت منصبی ہوتی ہے۔ تو جب گھریلو کام لینا ہو، زچہ خانہ بنانا تو اُسے منتخب کیا، کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہو تو وہاں بلایا گیا۔ وہ کیوں؟ کہ جس حیثیت سے عرش اس کا پایہ تخت ہے، اس حیثیت سے زمین اس شرف سے محروم ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں "اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ" ہے۔ اب اس کو میں اپنے الفاظ میں کہتا ہوں، گویا خالق فرشتوں سے کہہ رہا ہے کہ اے فرشتو! یہاں تو میں ہوں، مگر جس حیثیت سے عرش میرا پایہ تخت ہے، زمین اس شرف سے محروم ہے۔ لہٰذا ایک ایسے کو میں پیدا کرتا ہوں کہ زمین سے اس کو وہی نسبت ہو جو عرش کو مجھ سے ہے۔ جیسے یہ میرا پایہ تخت ہے، ویسے زمین اس کا پایہ تخت ہو۔

اب جو دوسرا پہلو جسے میں نے کہا تھا کہ ذرا تھوڑے سے غور کی بات ہے، تو میں کہتا ہوں کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ جانشین وہ مقرر ہوتا ہے جس سے جگہ خالی ہو یا زمانہ۔ نہیں! ایک اور صورت ہے جانشین مقرر کرنے کی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی معزز مہمان کسی جگہ جاتا ہے تو اس کے اعزاز میں جلسہ ہوتا ہے۔ اس میں سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس مہمان کیلئے اخلاقی طور اور آئینی حیثیت سے اس سپاسنامہ کا جواب دینا خود اسی کا کام ہے۔ کوئی خود سے کھڑا ہو جائے جواب دے تو اس کا فریضہ نہیں پورا ہوگا۔ مگر مشکل یہ ہے یہ وہاں کے لوگوں کی زبان اور ہے اور یہ جو مہمان آیا ہے، اس کی زبان دوسری ہے۔ اگر یہ اپنی زبان میں پڑھے تو وہ نہیں سمجھیں گے۔ ان کی زبان سے یہ واقف نہیں ہے۔ ان کی زبان میں یہ پیش نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جواب باوجودیکہ جلسہ میں وہ موجود ہے، اپنی جانب سے کسی کو اپنا نائب مقرر کرے گا۔ لیکن وہ بیچ والا ایسا ہو جو اُس کی زبان سے بھی واقف ہو اور ان کی زبان سے بھی۔ ان کی زبان میں ان تک پہنچائے۔ تو

بس یہاں جانشین کی ضرورت ہے کہ اس کا کمال براہِ راست ہم تک پہنچنے میں سدِ راہ ہے، ہمارا نقص اس تک پہنچنے سے مانع ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ کوئی بیچ والا جو کچھ اس سے ملتا ہوا اور کچھ ان سے ملتا ہو۔

تو جنابِ والا! اب یہ ہے اتنا بڑا منصب کہ ملک کی نگاہِ طلب جاتی ہے کہ منصب سے محروم رہ کر پاس رہنا وہ بلندی نہیں رکھتا جو منصب پا کر دور چلا جانا بلندی رکھتا ہے۔ تو کیا کہتے ہیں:

اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے اعتراض کیا۔ مگر یہ بے سمجھی ہوا لفظ ہے۔ یاد رکھئے کہ فرشتہ ہے جس کیلئے خالق نے کہہ دیا ہے:

لَا یَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ یَعۡمَلُوۡنَ

وہ اللہ پر بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے۔ وہ اس کے حکم پر عامل ہیں۔ عصمتِ فطری کی منزل پر فائز۔

تو یہ جو کہہ دیا کہ اعتراض کیا، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملک نے سوال کیا ہے اور ملائکہ بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں اور طالب علم کو اپنی تسلی کیلئے سوال کا حق ہے اور میرے نزدیک تو سوالِ ملک کسی مقصدِ الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے ان کے دل میں یہ تصور پیدا کیا کہ ہمیں سوال کرنا چاہئے۔ کوئی اللہ کا مطلب ان کے سوال میں مضمر ہے تو ابھی تو یہی سمجھ لیجئے جو میں نے عرض کیا کہ منصب کی بلندی کا اظہار ہے کہ دیکھو! منصب اتنا بلند ہے کہ فرشتے کے بھی دل میں اس کی آرزو ہوتی ہے۔ اب اسے کبھی ارزاں نہ بنالینا اور اب فرشتہ کیا کرتا ہے؟ انسان کی زندگی کا ایک تاریک پہلو جو ہے، وہ بھی اُسے اللہ کے دیئے ہوئے علم سے معلوم ہے۔ وہ خود کیا جانے، اللہ جو بتا رہا ہے انہیں، وہ ان کو معلوم ہے۔ تو وہ کہہ رہا ہے کہ اُسے پیدا کیا جائے گا جو خونریزی کرے اور فساد کرے۔ تو اسی لئے میں نے اس موضوع میں سے عرض کیا کہ یہ خونریزی تو گویا فطرتِ انسانی کا ایک تقاضا تھا جسے فرشتے نے اس وقت محسوس کیا اور اس کو پیش کیا سوال کے محل پر۔

تو انسان کی زندگی کا یہ پہلو لیا اور اپنی زندگی کا روشن پہلو کہ:

نَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ

ہم تیری بارگاہ میں تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔

اس میں کونسا جزو غلط ہے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انسان خونریزی نہیں کرتا؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ملک تسبیح و تقدیس نہیں کرتے؟ کونسا جزو غلط ہے؟ بس ملا کے پوچھ لیا کہ ہمیں نہیں مقرر کیا جاتا اور اس نوع میں سے مقرر کیا جاتا ہے؟ تو ارشاد ہوتا ہے جواب میں:

إِنِّىٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ

''میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

تو میں کہتا ہوں: بارِالٰہا! جب جواب آپ کو دینا ہی ہے تو اسی وقت فرشتے کے سوال کا جواب کیوں نہیں دے دیا؟ مگر جو میری سمجھ میں آیا، وہ عرض کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ابھی خالق سمجھانے لگتا کہ یہ مصلحت ہے، یہ مصلحت ہے، یہ مصلحت ہے تو ایک صورت شوریٰ قائم ہو جاتی۔ سوال کے جواب میں یہ کہا کہ جو میں جانتا ہوں، تو نہیں جانتے۔ اب اس کا مطلب میرے الفاظ میں یہ ہے کہ منصب میرا، مقرر کرنا میرا کام، تم کون؟ تو اب سوالِ ملک میں ایک دوسرا راز سمجھ میں آیا کہ خالق نے دکھا دیا کہ دیکھو! یہ منصب وہ ہے جس میں ملک کے معصوم مشورہ کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جو اصول اس وقت واضح ہو گیا، تو اب طالب علموں کی تسلی کیلئے جو فریضہ تعلیمی ہے، اُسے بعد میں انجام دے دیا جائے گا۔ جلدی اسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو۔ لہٰذا وہ تعلیم اسماء، وہ سب امتحان ہوا اور ملک نے کہا کہ ہمیں تو اتنا معلوم ہے جتنا تو نے بتا دیا ہے۔ اس کے آگے نہیں معلوم۔

اب اس سے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ پھر انشاء اللہ جب اس کا بیان ہو گا۔ اب خالق نے اس دن کے سوال کا حوالہ دے کر گویا اپنی فتح کا اعلان کر دیا کہ ''اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ''، کہ اب کہو میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟ مگر ظاہر ہے کہ وہ خود اس نے کہا کہ جتنا تو نے ہمیں علم عطا کیا، اتنا ہمیں حاصل ہے۔ جتنے جتنے اس کے سامنے نمونے زیادہ آتے گئے اور اللہ علم دیتا گیا، اتنا اس کے علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب کہاں تو خونریزی کو کہا تھا، ایسے کو جو خونریزی کرے گا، کہاں ایک ایسی منزل آگئی کہ بدر میں خود سپاہی بن کر آگیا۔

اب کہاں وہ ملائکہ کہ معترض ہوتے تھے عرش پر، کہاں میدان میں ملائکہ کی فوجیں تھیں (قرآن)۔ فوجیں ان کی مدد کیلئے آگئیں بدر میں اور فقط نمائشی طور پر نہیں آئے تھے۔ قرآن مجید میں ہے کہ انہیں اصولِ جنگ بتائے گئے۔ ارے وہ اسی مدرسہ کے طالب علم ہیں تو انہوں نے سپہ گری کہاں سیکھی تھی؟ لہٰذا خالق نے انہیں اصول بتائے (آیت) دیکھو! ہم بتاتے ہیں کہ گردنوں پر تلوار لگانا۔ قرآن مجید کی آیت ہے کہ انگلیوں پر ضرب لگانا۔ فنونِ جنگ سکھائے جا رہے ہیں۔

ماشاء اللہ یہاں ایسے افراد ہوں گے جو فنِ سپہ گری کے قدیم طور پر یا جدید طور پر واقف ہونگے۔ تو میں کہتا ہوں کہ سر کے وار سکھائے گئے ہیں اور انگلیوں کو کاٹنا سکھایا گیا ہے۔ اب یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ سب آئے تھے، بھیجے گئے تھے اور جنگ بھی انہوں نے کی، کمزور دل والے مسلمانوں کی ڈھارس کیلئے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ دیکھو! اپنی قلتِ تعداد سے نہ گھبرانا۔ کبھی ہماری مصلحت ہوگی تو ہم فرشتے بھی بھیج سکتے ہیں۔ یہ نمونہ پیش کر کے دلوں کو ڈھارس دی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ دوسروں کے دلوں کو تو ڈھارس ہوئی اور جو حقیقی مجاہد تھا، اس کے ذوقِ شجاعت پر بار ہو گیا کہ میرے ہوتے ہوئے فرشتے آئے۔ میری موجودگی میں فرشتے آئے؟ اس کی طبیعت پر جیسے بار سا ہو گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اب یہ آیتیں جو آئی ہیں کہ ہم نے یہ بھیجے ہیں، ایسے لوگوں کی وجہ سے جو کمزور دل والے ہیں۔ سب تو تمہارے جیسے نہیں ہیں۔ ان کے دلوں کی تسلی کیلئے ہم نے بھیجے ورنہ ضرورت نہیں تھی۔ اس میں یہ مضمر

ہے کہ ضرورت تھی نہیں، ہم نے ان کے دل کی تسلی کیلئے، ڈھارس دینے کیلئے بھیج دیئے ہیں۔ لیکن اچھا! تمہاری طبیعت پر بار ہے تو اب اس کے بعد جو جنگ ہوگی، تو چاہے جو ہوجائے، اب نہیں بھیجیں گے اور اُس نے جس نے بار محسوس کیا تھا، اُس نے جنگ سر کر کے دکھادی۔ بگڑی ہوئی جنگ بنا کر دکھادی اور اب اس وقت تو ملک نہیں آیا۔

اب جب، اپنی زبان میں کہتا ہوں، محاورہ ہے یوپی کا، وارے نیارے ہو گئے تو اب جناب جبرئیلؑ امین تشریف لائے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تحریر فرمایا ہے، فارسی زبان کی کتاب ہے، بڑے جلیل القدر عالم ہیں اہل سنت والجماعت کے، محدث محقق انہوں نے مدارج النبوۃ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس فوج کو بھگایا اور آپؑ نے آ کر رسولؐ کے زخموں کو دھلوایا اور آپ کو کھڑا کیا۔ اتنی دیر میں اِدھر اُدھر سے فوج آنا شروع ہوگئی۔ مختلف دستوں کی شکل میں، گروہ در گروہ، ادھر سے، اُدھر سے۔ پیغمبرؐ اشارہ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! یہ آرہے ہیں۔ دیکھو یہ آرہے ہیں۔ دیکھو یہ آرہے ہیں اور علیؑ بن ابی طالبؑ چاروں طرف گھوم کر اُن کو دفع کر رہے ہیں۔ تو اب جناب جبرائیلؑ تعریف کر رہے ہیں:

"اِنَّ ذِیْ لَہِیَ الْمُوَاسَاتُ"۔

یہی جملہ ہے تاریخ کا، یارسولؐ اللہ! ہمدردی تو اسے کہتے ہیں، غمخواری تو اسے کہتے ہیں اور رسولؐ کہتے ہیں:

"کَیْفَ لَا ھُوَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ"۔

''کیونکر نہ ہو کہ وہ مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں''۔

حضرت جبرئیلؑ تو عجب دلچسپ ہیں، وہ کہہ دیتے ہیں ''انا منکما'' میں آپ دونوں سے ہوں۔

ایک دن راولپنڈی میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے فرشتوں سے باتیں کرنا تو آتی نہیں، وہ الفاظ بھی نہیں آتے لیکن اپنی زبان میں جناب جبرئیلؑ سے یہ کہوں گا کہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ جب دو کی بات ہو رہی ہے تو آپ کہیں میں دونوں سے ہوں اور جب پانچوں آجائیں تو آپ کہیں کہ میں چھٹا کیوں نہ ہو جاؤں!

مگر اس میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے کہ یہ انسان وہ ہیں کہ انہوں نے فرشتہ ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی ہے مگر یہ اتنے اونچے ہیں کہ فرشتے ان میں شامل ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔ اور یہ تو بدر کی باتیں ہیں، آپس کی گفتگو تھی۔ یہی جبرئیلؑ امین یا کوئی اور فرشتہ، وہ ایک دفعہ میں کہتا ہوں کہ منبر ہوا پر مابین زمین و آسمان بلندی پر جا کر اُس نے قصیدۂ منقبت پڑھا اور کہا:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیْ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"۔

کوئی جوان نہیں سوائے علی ع اور کوئی تلوار نہیں سوائے ذوالفقار کے''۔

میں کہتا ہوں کہ اب وہاں کی بات مجھے یاد آئی کہ حضرت! آپ کو تو خونریزی سے نفرت ہے۔ انیس اہل اللہ مقام تلوار کی تعریف کریں تو ٹھیک، ہمارے سعر زابیر صاحب مرحوم تلوار کی تعریف کریں تو ٹھیک، لیکن یہ آپ اور تلوار کی تعریف؟ ارے سپر کی تعریف

کرتے کہ اس کا کام روکنا ہوتا ہے، تلوار کا تو کام ہی خون بہانا ہے۔ یہ آپ تلوار کی تعریف کر رہے ہیں؟ تو شاید جبرئیلؑ امین یا فرشتہ یہ صدا بلند کر رہا ہو، وہ مجھ سے کہے کہ خاموش، نا سمجھی کا سوال نہیں۔ تلوار خطاکاروں کے ہاتھ میں آ کر خطاکار ہوتی ہے، معصومؑ کے ہاتھ میں آ کر معصوم ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آنکھ بند کر کے نہ خونریزی کو اچھا سمجھا جا سکتا ہے، نہ خونریزی کو برا سمجھا جا سکتا ہے۔

چند مہینے پہلے کی بات ہے، الہٰ آباد گیا۔ اکثر لوگ موضوع کا اعلان میرے پہنچنے سے پہلے کر دیتے ہیں جیسے آپ کے ہاں اعلان ہو گیا تھا۔ جب آیا تو پتہ چلا کہ پہلی مجلس کا اعلان تھا "اسلام خونریزی کا حامی نہیں ہے"۔ میرے ذہن میں یہ سوال تھا کہ یہ موضوع رکھا کیوں گیا ہے؟ پہلے تو میں نے ان سے جنہوں نے موضوع رکھا تھا، کہا کہ یہ موضوع غلط عنوان سے ہے۔ ماشاء اللہ یہاں تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ایک ہوتا ہے ڈیبیٹ (debate)۔ مکالمہ، اس میں اس طرح کا موضوع ہوتا ہے۔ ایک رُخ اس میں ہوتا ہے اور پھر کوئی موافق تقریر ہوتی ہے، کوئی مخالف تقریر ہوتی ہے۔ لیکن کسی جلسہ میں کسی مقرر کو جو موضوع دیا جائے، وہ جملہ ناتمام ہونا چاہئے، مثلاً اسلام اور خونریزی۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ کہے کہ اسلام حامی ہے یا مخالف ہے۔

میں نے کہا کہ جن صاحب نے یہ موضوع رکھا ہے، وہ خود ہی تقریر بھی کر لیں۔ بہر حال وہ پورا بیان میں نے کیا۔ اس میں مَیں نے یہ کہا کہ اگر ذرا سی اصلاح اس موضوع میں دی جائے تو وہ صحیح ہو جائے کہ اسلام ناحق خونریزی کا حامی نہیں ہے۔ تو یہ انسان کا ذوقِ خوں آشامی ہے۔ کبھی غلط راستوں سے خونریزی ہوتی ہے، کبھی حق کی حفاظت کیلئے خونریزی ہوتی ہے۔ وہ وہاں اس موضوع میں جہاد پیش کر چکا، قتال کیلئے شرائط کیا ہیں؟ ابتدائے جنگ ہے۔ اُس کے بعد اجازت دی گئی ہے قتال کرنے کی۔ تو اب دوسرا خونریزی کیلئے جاتا ہے تو اب ادھر والا خونریزی نہ کرے تو کیا کرے؟ یا یہ فرض کیجئے کہ کوئی ہزاروں کی جانیں لے چکا ہے، اب اس کی جان چلی جائے اور آپ کو رحم آئے تو ان ہزاروں پر رحم نہ آیا۔ اس ایک پر رحم آ رہا ہے۔ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے، کلیہ کوئی نہیں ہو سکتا خونریزی کے بارے میں۔

تو یہ انسان مذہب کے نام کو لے کر اگر خونریزی کرے تو اصل دین پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا اور کتنی چیزیں ہیں جن کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ کتنے مقدس نعرے ہیں جو آپ لوگ لگاتے ہیں لیکن یہ نعرے کیا ہمیشہ مقدس رہتے ہیں؟ 25 برس قبل کی بات ہے جب وہ کلوکیم ہوا تھا۔ لاہور میں، دنیا بھر کے پروفیسر آئے تھے تو اس میں مَیں بحیثیت شرکاء کے مدعو تھا۔ تقریر میری نہیں تھی اس میں۔ وہاں کا ایک موضوع تھا "تمدنِ اسلام"۔

ماشاء اللہ بڑے بڑے پروفیسر وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جو جو کہا کہ وہ محرابیں جو ہیں، وہ اسلامک کلچر ہیں اور یہ گنبد جو ہیں، یہ اسلامی کلچر ہیں۔ وہاں کی چیزیں سن کر میرا دل پک گیا تھا۔ یہاں ایک تقریر برکت علی ہال میں ہوئی تو میں نے اسی موضوع پر وہاں تقریر کی۔ وہ تقریر امامیہ مشن پاکستان سے چھپ بھی گئی ہے۔ تو ایک جزو اس کا میں کہتا ہوں کہ یاد رکھئے کہ اسلامی کلچر شکل و صورت سے نہیں ہوتا۔ اصل اسلامی کلچر اہلیت سے ہوتا ہے۔ گنبد لے جا کر آپ بت کدے میں بنا دیجئے تو وہ گنبد بھی اسلامی کلچر ہے؟ نہیں، جو مسجد کا گنبد ہو، وہ ہوگا اسلامک کلچر۔ اس کے محل استعمال سے ہوتا ہے۔ یہ اللہ اکبر کا نعرہ بھی صحیح محل پر لگے تو اسلامی کلچر ہوگا۔ اگر بے

گناہوں کے گھر جلانے میں اللہ اکبر کے نعرے لگیں تو وہ اللہ اکبر کا نعرہ بھی اسلامی کلچر نہیں ہوگا۔ تو مقصد کا صحیح ہونا شرط ہے۔ ظاہری شکل سے نہیں ہوتا۔ بس اب باب مصائب ہے کہ کہاں کہاں ہم نے اللہ اکبر کے نعرے سنے ہیں۔ بس ایک عرب شاعر کا شعر پڑھتا ہوں۔ حضرت امام حسینؑ کو مخاطب کر کے اُس نے شعر کہا ہے:

وَيُكَبِّرُوْنَ بِاَنْ قُتِلْتَ وَاِنَّمَا
قَتَلُوْابِكَ التَّكْبِيْرَا وَالتَّهْلِيْلَا

ارے یہ آپ کو شہید کر کے تکبیر کے نعرے لگا رہے ہیں، حالانکہ آپؑ کے ساتھ انہوں نے تکبیر و تحلیل کے گلے پر چھری چلائی ہے۔

اور یاد رکھئے کہ یہی کام امام حسینؑ نے کربلا کے جہاد میں سب سے بڑا کیا اور اس کو مختصر طور پر یوں عرض کروں گا کہ بدنصیبی سے ادھر کی جماعت بھی اپنے کو مسلمان کہتی تھی اور جس جس چیز کو سمجھ لیجئے اسلامک کلچر۔ ظاہری طور پر اس سب کو وہ اختیار کئے ہوئے تھی۔ اتنی بڑی جماعت جہاں کی نمائندہ تھی، وہاں اونچے اونچے محل تھے۔ اونچے اونچے عالیشان مینارے تھے۔ قصر ابیض و قصر حمرا و قصر خضرا، وہ سب وہاں تھے۔ مجھے بہت باتیں ڈاکٹر اقبال کی پسند ہیں مگر جہاں انہوں نے ان قصروں کو یاد کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہاں وہ جاہ وجلال دنیا سے مرعوب ہیں۔

ارے مسجد مدینہ کو نہیں یاد رکھتے اور قصر حمرا و قصر خضرا پر فخر کرتے ہو۔ مگر جو عرض کر رہا ہوں اس پر غور کیجئے کہ اگر کوئی غیر مسلم واقعی تحقیق کی غرض سے بھی تاریخ کی دوربین لگا کر اسلامی تہذیب کا پتا لگانا چاہتا تو ہو قصر خضراء جاتا، قصر حمرا جاتا، دمشق کے عالیشان محل میں جاتا اور جب وہاں جاتا تو حریر و دیبا کے پردے نظر آتے۔ سونے چاندی کے برتن کھنکتے ہوئے نظر آتے۔ غلام سنہری ڈاہیں، کلائی پٹکے کمر پر باندھے ہوئے نظر آتے اور پھر اور آگے بڑھتا تو شراب کے جام کھنکتے ہوئے نظر آتے۔ تو وہ اسلامک کلچر اسی کو سمجھتا۔

وہ کہاں جاتا محلہ بنی ہاشم میں اُس نیچی دیواروں والے مکان میں جس کے دروازے پر ثابت پردہ بھی نہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں یہ کہا کہ میں ان کے اسلام کے مقابلہ میں ایک اسلام کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردوں اور آفتاب کی روشنی میں ان کو سچے مسلمانوں کا ایک گروہ دکھادوں اور اپنے کردار کو اتنا اونچا لے جاؤں کہ دمشق کے مینارے دب جائیں اور میرے اللہ اکبر کی صدا دنیا کے دل میں گھر کرے۔ اس کیلئے حضرت امام حسینؑ نے اسلحہ جنگ لئے۔ اگر فوجی عسکری فتح حاصل کرنا ہوتی تو قد آور جوان ساتھ لیتے، بلند و بالا قامت والے سورما ساتھ لیتے۔ مگر ان کو اس طرح کی جنگ نہیں لڑنا تھی۔

جنگ کے کتنے نمونے آپ کے سامنے ہوں گے۔ فوج میں عمر کی حدیث مقرر ہیں، اس سے کم عمر کا نہیں لیا جائے گا۔ اس سے زیادہ عمر کا نہیں لیا جائے گا۔ قد ناپا جاتا ہے، سینہ ناپا جاتا ہے۔ تب فوج میں لیا جاتا ہے۔ مگر امام حسینؑ کے سپاہیوں میں نہ کم عمر کی قید نہ زیادہ عمر کی قید۔ یہاں 70 برس کے حبیب ابن مظاہر بھی فوج کے سپاہی ہیں اور نابالغ بچہ قاسم بھی فوج کا سپاہی ہے۔

اور کہنے دیجئے کہ 6 مہینے کا بچہ بھی ان کے مقصد کا بہت بڑا سپاہی ہے۔ تو اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جنگ انہیں نہیں لڑنا

ہے۔ اب ان کی فتح وشکست کو اس پیمانہ پر نہ ناپئے۔ انہوں نے بھی انتخاب کیا سپاہیوں کا۔ اب زیادہ تفصیل سے نہیں عرض کرنا ہے کہ سپاہی وہ لئے جو انسانیت اور اسلام کی کسوٹی بن سکیں۔ انہیں قد آور نہیں سپاہی نہیں چاہئیں۔ انہیں ایسے سپاہی چاہئیں کہ کوئی حافظِ قرآن ہے، کوئی عابدِ سب زندہ دار ہے، حبیب ابن مظاہر وہ ہیں کہ جن کے بارے میں روایت ہے کہ ایک سجدہ میں قرآن ختم کرتے تھے۔ بریر ہمدانی وہ ہیں جو کوفے کے بچوں کو حفظِ قرآن کرواتے تھے۔ سید القراء ان کا خطاب تھا۔ ایسے ایسے سپاہی لائے ہیں۔ کیوں؟ تاکہ مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں کہ اسلام پر کیسا وقت پڑ گیا ہے کہ ایسے لوگ تلواریں لے کر میدان میں آ گئے ہیں۔

اس کے بعد اربابِ عزا! خاندانِ رسالت کا پورا سرمایہ ہے۔ میں نے دو الفاظ کہے تھے، انسانیت اور اسلام کی کسوٹی۔ میں کہتا ہوں کہ انسان مختلف ہیں، کسی کو جوان پر رحم آتا ہے، کسی کو بچے پر رحم آتا ہے، کسی کو کسی خاتون پر رحم آتا ہے۔ امامؑ اپنے ساتھ ہر نمونہ لائے تھے کہ اگر ان میں انسانیت کا کوئی شائبہ ہوگا تو کبھی جوان کے مقابلہ میں ہاتھ رُکے گا، کبھی بچے کے مقابلہ میں ہاتھ رُکے گا، کبھی کسی خاتون پر رحم آئے گا۔ جب یہ نہیں ہوا تو دنیا سمجھ لے کہ اس اسلام کے برقع کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں؟ اس اسلام کی نقاب کے پیچھے کون سے مسلمان ہیں؟ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا کے جہاد کی نوعیت بالکل مختلف ہوگئی۔

36

دین اسلام

یاد رکھئے کہ بے چینیاں سب ضمیر کے عدمِ اطمینان سے پیدا ہوتی ہیں۔ گھر والوں میں ہر ایک کو اطمینان ہو کہ ہمارے ساتھ انصاف ہوگا تو آپس میں کوئی رنجش نہیں ہوگی۔

حقیقتِ اسلام ہر ایک نبی کے دور میں تھی۔ شریعت بدلتی رہی، دین تبدیل نہیں ہوتا، دین سب کے دور میں ایک ہی تھا اور وہ اسلام تھا۔

ذہنیت کی تعمیر کرو کہ ایک بازوؤں کی طاقت والا اپنے بازوؤں کی طاقت کو دوسروں کو دبانے میں صرف نہ کرے بلکہ کمزوروں کا محافظ بن جائے۔

میں کہتا ہوں کہ ایک خدا کے ماننے میں عذر نہ تھا بلکہ خدا کو ایک ماننے میں عذر تھا۔

جب دنیا پتھر کے بتوں کو پوج رہی تھی، اب گوشت پوست سے بنا ہوا یزید حکمِ الٰہی کے خلاف لوگوں سے اپنی اطاعت لے رہا تھا۔ حقیقت میں وہی لا إلٰہ خطرہ میں تھا۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"۔

کل اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ کہا جاتا ہے کہ دین آزادی سلب کرتا ہے۔ اب میں اس وقت ایک پہلو کی طرف اس سلسلہ میں توجہ دلاتا ہوں کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آزادی انسان کا حق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسان ایک آدمی کا تو نام نہیں ہے۔ انسان ایک پوری نوع ہے جس میں ہر فرد آدمی ہے، ہر فرد انسان ہے اور آزادی کا مطلب آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جو چاہیں، وہ کر لیں۔ جو دل چاہے، وہ عمل میں لے آئیں۔ یہ ہیں آپ کے نزدیک آزادی کے معنی جس کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ تو یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی خواہشیں ہیں لامحدود۔ کسی نقطہ کے اوپر انسان کی خواہش نہیں ٹھہرتی۔ اسے میں روزمرہ کی دو تین مثالوں سے واضح کروں گا جو ماشاء اللہ سن رسیدہ افراد ہیں، میں خود الحمد للہ اسی جماعت میں داخل ہوں تو اس جماعت پر طنز و تعریض میرا نصب العین تو ہو نہیں سکتا، مگر یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کچھ دن بڑے بوڑھوں کے پاس رہئے اور ان کی بات چیت سنئے تو اکثر یہ کہتے ہوئے وہ آپ کو ملیں گے کہ خدا نے سب حسرتیں پوری کر دیں، بس یہ ایک حسرت اور ہے۔ اب مثلاً کوئی صاحبزادے ابھی کمسن ہیں، آخری عمر کی اولاد تھی، اس لئے ابھی وہ چھوٹے ہی ہیں۔ کہتے یہ سنا کہ الحمد للہ سب حسرتیں پوری ہو گئیں، بس اس بچے کو، اب یہ ہمارے ہاں کی اردو ہے، کہ ہاتھ منہ کا دیکھ لیں یعنی خود مکتفی ہو جائے۔ اچھا! خدا کا شکر اللہ نے عمر میں برکت عطا کی۔ یہ حسرت پوری ہو گئی مگر اب ہم نے سنا کہ سب حسرتیں پوری ہو گئیں۔ بس اب اس کے سر پر سہرا بھی دیکھ لیں۔ الحمد للہ تھوڑے دنوں میں سہرا بھی بندھ گیا۔ تو اب یہ کہتے سنا کہ الحمد للہ، اللہ نے ساری حسرتیں پوری کر دیں، بس اب سہرا تو بندھ ہی چکا ہے، شادی ہو چکی ہے بس اللہ اس کا ہنستا کھیلتا بچہ دکھا دے۔

اب یاد رکھئے کہ یہ حسرت اگر پوری ہو گئی تو اس بچے میں وہی سلسلہ شروع ہو گا۔ غرض پوری عمر گزر جائے گی اور یہ ایک عدد حسرت رہ جائے گی۔ اسی کو معاشیات کے دائرے میں لے جائیں تو وہ کلرک جس کو کسی زمانہ میں 50 روپے تنخواہ ملتی تھی اور زمانہ میں 50 روپے اچھی تنخواہ ہوتی تھی، تو اس کو ہم نے کہتے سنا کہ خدا کا شکر ہے گزر بسر ہو جاتی ہے مگر ایک دس روپے اور بڑھ جائیں تو آرام سے گزر ہونے لگے۔ اب ظاہر ہے دفتروں میں ترقیاں ہوتی ہیں۔ کچھ دن میں وہ دس روپے بڑھ گئے تو پھر یہی سنا کہ خدا کا شکر ہے، گزر بسر ہو جاتی ہے، بس ایک دس روپے اور بڑھ جائیں غرض کتنی دفعہ 10 روپے بڑھے مگر وہ دس روپے کی کمی باقی رہی۔ اب جن کی مدنی دسوں کے لحاظ سے ہے، ان کو دس کی کمی محسوس ہوتی ہے اور جن کی آمدنی سینکڑوں کے لحاظ سے ہے، ان کو پورے سو کی کمی محسوس ہوتی ہے اور جہاں بحمد للہ ہزاروں کے وارے نیارے ہیں، وہاں پورے ایک ہزار کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

غرض یہ وہ پیاس ہے جو جتنی بجھتی ہے، اتنی بھڑکتی ہے۔ یہی چیز جب اونچے حلقوں میں جاتی ہے تو فتح ممالک کے جذبہ کے

تخت اُبھرتی ہے۔ جس کے پاس ایک ملک ہے، اب وہ یہ کیا کہے کہ میری ضروریات کیلئے ناکافی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری رعایا کیلئے یہ ناکافی ہے۔ خواہ خود کتنا رعایا کا خون چوس لے۔ اس وقت رعایا کی ہمدردی پر زور ہوتا ہے۔ تو اس لئے اب وہ اپنی رعایا کی خاطر پاس والے ملک پر حملہ کرتا ہے۔ پھر جب ایک حصہ لے لیتا ہے تو اتنی ہی کمی اور محسوس ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تک جگہ پایئے، عمارت بناتے چلے جایئے اور وہ بڑی طاقتیں جن کا اس دنیا میں کسی نہ کسی طرح سے اثر ہر طرف چھا گیا، معاہدوں سے سہی، میثاقوں سے سہی، کسی صورت سے یہاں ہر طرف اثر چھا گیا تو اب نگاہ گئی کہ چاند میں بھی آبادی ہے یا نہیں۔ مریخ میں بھی آبادی ہے یا نہیں۔ کوئی کہے کہ یہ تو بیچارے تحقیقات کیلئے جارہے ہیں، اس میں فتح کے جذبے کا سوال ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ تو سابق زمانہ کا غیر سیاست دان حملہ آور ہوتا تھا جو حملہ حملے کے نام سے کرتا تھا۔ فتح فتح کے نام سے کرتا تھا۔ آج کی سیاست تو کسی نہ کسی بھیس میں اپنے اقتدار کو بڑھاتی ہے۔

ہمیں اور اس ہم میں دونوں ملکوں کے عوام داخل ہیں کیونکہ اس وقت تو سب ہی ایک تھا۔ ہمیں اس کا پورا تجربہ ہے۔ صاحب بہادر آئے تھے تجارت کرنے مگر تجارت کرنے آئے اور یہاں کی مخلوق نابالغ نظر آئی۔ ولی بننے کا شوق ہوا اور یہ لاکھ کہیں ہمیں ضرورت نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تمہیں ہماری ضرورت ہے۔ جب اس لائق ہو جاؤ گے تو چلے جائیں گے۔ حالانکہ جب تک رہے، ممکن ہے یہ کام کیا ہو کہ چلے بھی جائیں تو بغیر ہمارے یہ حکومت نہ کر سکیں۔ ہمارے ہمیشہ محتاج رہیں۔ یہ ہے اس دنیا کا سیاست دان کہ اگر عالم بالا پر گیا تو میں کہتا ہوں کہ جیسے شاعر نے اسی دن کیلئے یہ شعر کہا تھا:

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

اس دنیا میں میں آپ نے امن کے بادل خوب برسائے ہیں، جواب عالم بالا پر جایئے اور وہاں سے خیر و برکت کی بارش کی اُمید کریں۔ تو غرض یہ کہ انسانی خواہشات لامحدود ہیں اور آزادی کے معنی یہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی خواہش پوری ہو تو اب یا تو ایک کو آزاد کر دیا جائے اور باقی سب کو قید تو یہ تو وہ کرے گا جس کی اس ایک سے کوئی رشتہ داری ہو اور یا پھر یہی صورت ہے کہ آزادی کے حق کو تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی ہر ایک اس حد تک آزاد و جہاں تک دوسروں کے حقوق کو صدمہ نہ پہنچے اور جہاں سے دوسروں کے حقوق کو صدمہ پہنچے، وہیں سے مقید۔ یہ قید فرد کیلئے قید ہے مگر تمام نوع کیلئے آزادی ہے۔ یہ تمام نوع کو جنس آزادی سے بہرہ ور بنانے کا ذریعہ ہے۔

مگر یہ حقوقِ آزادی کو تقسیم کون کرے؟ یاد رکھئے کہ اگر اس تقسیم کا مرکز کوئی مادی ہوا، یعنی کسی خاندان کا آدمی، کسی نسل کا آدمی، کسی ملک کا آدمی تو ایک تو جو اس سے قریب ہیں، اُن کی ضرورتوں کا احساس زیادہ ہوگا، دوسروں کی ضروریات کی اس کو خبر نہ ہوگی۔ دوسرے اس کو ہمدردی بھی ایک سے زیادہ ہوگی۔ دوسروں سے وہ ہمدردی نہ ہوگی۔ لہٰذا عدلِ کلی قائم نہیں ہو سکتا۔

تو ضرورت ہے کہ مرکز تقسیم آزادی ایک ایسی ذات ہو جو خود کسی ملک کا نہیں، جو خود کسی خاندان کا نہیں ہے، جو خود کسی نسل کا نہیں ہے۔ جب اس کی طرف سے حقوقِ آزادی کا قانون بنے گا تو ہر ایک کا ضمیر مطمئن ہو سکے گا کہ میرے ساتھ انصاف ہوا ہے۔ اور یاد رکھئے کہ مذہب وہی قانون پیش کرتا ہے کہ جس سے تمام نوعِ انسانی کو اطمینان پیدا ہو کہ یہ اس کی طرف سے ہے، جو ہم سب کا خالق

ہے، ہم سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے اس میں کسی کے ساتھ ناانصافی کا سوال نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع ایسا ہے جو مشترک مجمعوں میں بیان ہوتا ہے کیونکہ مذہب وملت کا سوال نہیں ہے۔ مذہب کی جنگ ہر طبقے میں ہیں تو وہاں میں یہ چیز پیش کرتا ہوں۔

غور کیجئے، میں کہتا ہوں کہ تمام دنیا کی قوموں کو مسلمانوں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہئے کہ جس جس چیز کو خدا کی طرف سے مان لیا، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ قبلہ کو خدا کی طرف سے مان لیا تو دو کعبے نہیں ہوئے۔ کتاب کو خدا کی طرف سے مان لیا تو دو قرآن نہیں ہوئے۔ رسولؐ کو خدا کی طرف سے مان لیا تو دو پیغمبر نہیں ہوئے۔ جس جس چیز کو خدا کی طرف سے مان لیا، اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ جہاں سے انسانوں نے اپنا اختیار صرف کر دیا۔

اس کی طرف سے جو قانون پیش ہوتا ہے، اسی کا نام شریعتِ اسلام ہے۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ کچھ دن دین اور کچھ دن اسلام۔ اب حساب سے تقریباً برابر کی تقسیم۔ آج پانچویں مجلس ہے تو پانچ دن تک دین ہی دین رہا اور آج پانچویں دن سے اسلام شروع ہوا۔ تو جب اس کی طرف سے کوئی قانون ہوگا تو ہر ایک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے اور یاد رکھئے کہ بے چینی سب ضمیر کے عدم اطمینان سے پیدا ہوتی ہے۔ گھر والوں میں ہر ایک کو اطمینان ہو کہ ہمارے ساتھ انصاف ہوگا تو آپس میں کوئی رنجش نہیں ہوگی۔ محلے والوں کو سب کو اطمینان ہو کہ ہمارے ساتھ انصاف ہوگا کہ محلے کے اندر کوئی کشمکش نہیں ہو سکتی۔ اب قرآن مجید کو دیکھیں، وہ کیا کہہ رہا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

یاد رکھو کہ اللہ کو یاد رکھنے سے دلوں میں سکون ہوتا ہے۔

جب تک اس ایک کو یہ نہ مانیں گے، اس وقت تک اس مرکز کا تصور نہیں ہوگا جس سے سب کو رشتہ ہے۔ میں نے کہا کہ مرکز اگر کوئی محدود ہوا، کسی ایک سے قریب، ایک سے دور تو عدلِ کلی قائم نہیں ہو سکتا۔ آجکل تو سکول اور کالج میں ابتدائی درجوں میں بھی کچھ نہ کچھ ریاضی پڑھائی جاتی ہے۔ ریاضی کے بہت سے شعبے ہیں۔ کچھ گنتی سے متعلق ہیں، کچھ مقدار سے متعلق ہیں۔ ہر ایک کے الگ الگ نام ہیں۔ تو ریاضی کا ابتدائی مسئلہ کہ مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کوئی مثلث، کوئی مربع، کوئی مسدس، جتنی بھی شکلیں ہوتی ہیں ان میں جو نکتہ مانئے گا، وہ کسی طرف سے قریب ہوگا، ایک طرف سے دور ہوگا۔ بس ایک شکل ہے دنیا میں کہ جس میں ایک نکتہ ایسا مانا جا سکتا ہے کہ جتنے خطوط کھینچے جائیں، وہ سب برابر ہوں۔ اس میں کوئی فرق نہ ہو۔ وہ شکل دائرہ کی ہے۔ اس جسم کو کرہ کہتے ہیں اور اس نقطہ کو جس سے سب خط برابر ہوں، مرکز کہتے ہیں۔

اب یہاں بچے بھی جتنی تھوڑی سی ریاضی پڑھے ہوئے ہیں اور بڑے بھی اپنے معیار پر، جنہوں نے ریاضی پڑھی ہے، سمجھ سکتے ہیں کہ یاد رکھئے کہ مرکز سے بنے ہوئے نقطے بے شمار ہو سکتے ہیں مگر مرکز دائرہ کا ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اگر مرکز کئی ہوں تو دائرے کئی ہوں گے۔ ایک دائرہ کا مرکز ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اب یہیں سے ایک اور حقیقت پر توجہ کیجئے اور وہ کیا ہے کہ مرکز ایک اور صرف ایک ہوتا ہے اور ایسا ایک جو نا قابل تقسیم ہو۔ واحد غیر منقسم، اس لئے کہ اگر اس کے اجزاء ہوئے تو کوئی جزو کسی طرف سے قریب ہوگا، کسی طرف سے دور ہوگا تو وہ مرکز نہ بن سکے گا۔ لہٰذا مرکز ہوتا ہے وہ نقطہ جو واحد غیر منقسم ہو۔ اب اسی کا ایک اور نتیجہ اور وہ یہ کہ مرکز

آنکھ سے نہیں دکھائی دیتا، اس لئے میری اور آپ کی باریک سے باریک نب سے جو نقطہ بنے، وہ نقطہ نہیں ہوتا۔ اس میں اجزاء ہوتے ہیں اور مرکز وہ نقطہ ہے جس میں اجزاء نہ ہوں۔ لہٰذا یہ نقطہ مرکزی کبھی آنکھ سے نہیں دکھائی دیتا۔ مگر دائرہ کا وجود بے دیکھے مرکز کو منواتا ہے۔

اب میں یہ کہتا ہوں کہ یہ چھوٹا سا دائرہ جو میرے یا آپ کے پرکار سے بن جائے، اس کا مرکز بھی دکھائی نہ دے مگر بے دیکھے اُسے ماننا پڑے اور اس دائرہ کائنات کیلئے مطالبہ ہے کہ مرکز کو آنکھ سے دیکھیں گے تو مانیں گے۔ دنیا میں امن کے جھنڈے بلند رہتے ہیں اور ہر ایک امن عالم کا علم بلند کئے رہتا ہے۔ آج دنیا میں کوئی ایک نہیں جو بدامنی کا داعی ہو، جتنے ہیں سب امن کے علمبردار اور امن کے داعی۔ اس کیلئے امن کانفرنس ہوتی ہے۔ اس کیلئے بڑے بڑے افراد کی گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ مجھے بھی دیکھتے دیکھتے اخباروں سے بہت سے الفاظ یاد ہو گئے ہیں۔ دو طاقتی کانفرنس، سہ طاقتی کانفرنس، چار طاقتی کانفرنس اور ایک محاورہ یہ کچھ عرصہ سے نکلا کہ چوٹی کانفرنس اور اس کے بعد گول میز کانفرنس۔ کوئی کہے بھلا یہ گول میز کیا ہوتی ہے؟ یہ بھی اسی لئے ہوتی ہے کہ اگر میز گول نہ ہوتی تو سوال اول و آخر کا پیدا ہوگا کہ کون پہلے بیٹھا ہے، کون بعد میں؟

جب گول میز ہوگی تو ہر اول و آخر ہے۔ جہاں سے خط چلے گا، وہیں گھوم کر آئے گا۔ اس کے معنی ہیں کہ ضرورت مرکز کی سب کے ذہن میں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جسمانی طور پر میز گول بنائی مگر ذہن میں مرکز کا تصور نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ تر گفتگوئیں ناکام ہوتی ہیں بلکہ میں تو دیکھتا ہوں، جہاں تک میرے تجربے ہیں، ایسی کانفرنسوں کے زمانے کے، کہ ہر امن کی ہر کوشش تمہید جنگ ہوتی ہے۔ یہ کیوں جنگ کی تمہید بنتی ہے؟ اس صرف اس لئے کہ جو لوگ گفتگو میں شریک ہوتے ہیں، وہ چاہے گول میز پر بیٹھے ہوں ان کے پہلو سے پہلوں ملے ہوئے ہوں، کاندھے سے کاندھا جڑا ہوا ہے، مگر دل و دماغ سب کے الگ ہیں۔ کاغذ پر امن ہے۔

ماشاء اللہ اُردو زبان ہے، میں تجربہ کرلیا کرتا ہوں، یہاں کا مجمع واقف ہے کہ زبان پر امن ہے، کاغذ پر امن ہے، تقریر میں امن ہے، تحریر میں امن ہے اور دل میں ہر ایک کے امن ہے۔ یہ جو امن کی کوشش ہوتی ہے، امن کی گفتگو ہوتی ہے، عموماً یہ بھی ایک نوعیت کی جنگ ہوتی ہے۔ کوئی کہے کہ یہ جنگ کس طرح ہے؟ یہ جنگ اس طرح ہے کہ کون اتنا بڑا سیاست دان ہے کہ اپنی ذاتی قومی، اپنی پارٹی کے مفاد پر اتنا گہرا ملمع چڑھا سکے کہ دوسرے بیوقوف بن کر مان لیں اور جناب جب تک گفتگوئیں ہوتی رہیں، تو اتنے الفاظ اخباروں میں دیکھے ہیں کہ مجھے حفظ ہو گئے ہیں۔

یہ اطلاع آتی رہی کہ معاملات ترقی پذیر ہیں۔ فلاں صاحب نکلے تو مسکرا رہے تھے، فلاں صاحب نکلے تو ہنس رہے تھے۔ اخبار نویسوں کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ارے ابھی جلدی کیا ہے؟ بتائیں گے۔ انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔ یہ سب قرائن ہیں اور کچھ عرصہ میں یہ آیا کہ اب ایک فریق نے دوسرے کے معاملے کو، باتوں کو سمجھ لیا ہے۔ غنیمت ہوئی کہ اتنی دیر میں بھی سمجھا۔ جب تک کانفرنس ہوتی رہی، یہ خبریں آتی رہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی ایسا شاطر سیاست دان ثابت ہوا کہ اُس نے بڑا گہرا ملمع چڑھا دیا تو یہ ہوا کہ ہو گیا، ہو گیا، ہو گیا۔ مگر ملمع کتنے دن رہے گا؟ تھوڑے عرصہ میں دوسرے کو محسوس ہوا کہ ارے اس سے تو ایک زیادہ فائدہ اٹھالے گا۔ بس اب وہیں سے معاہدہ شکنی کی فکر ہوئی مگر اس طرح کہ الزام دوسرے پر آئے، ہمارے الزام نہ آئے اور اگر فرض کیجئے کہ دونوں شاطر سیاست

دان ہوئے، برابر کی جوڑی ہوئی تو اعلان ہوا کہ کچھ طے نہیں پایا۔ پھر ملیں گے، گفتگو ہوگی۔

اب یہ سنی سنائی کشتی کا ایک لفظ مجھے یاد ہے حالانکہ میں نے تمام عمر دنگل ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا کہ یہ اعلان ہو گیا کہ کچھ نہیں طے ہوا، اس کے معنی یہ ہیں کہ کشتی برابر ہوئی۔ کوئی ایک دوسرے کو مغلوب نہیں کر سکا۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ کوئی مشترک مقصد سامنے نہیں ہے۔ بہبودیٔ خلق کا کوئی نقطۂ نظر سامنے ہو تو سب اس نقطہ پر جمع ہو سکیں۔ ہر ایک کو اپنے مقاصد کی فکر ہے۔ لہٰذا کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ لہٰذا امن عالم کا پیغام لے کر جو اسلام آیا تھا اور ہمارے نزدیک تو اسلام شروع ہی سے تھا، آدم بھی جسے لے کر آئے تھے، وہ اسلام ہی تھا۔ نوحؑ بھی جسے لے کر آئے تھے، وہ اسلام ہی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور تمام انبیاء اسلام ہی کی دعوت دیتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ نام اسلام تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شروع ہوا۔

"هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ"۔

مگر یہ کہ حقیقتِ اسلام ہر ایک نبی کے دور میں تھی۔ شریعت بدلتی رہی، دین تبدیل نہیں ہوتا۔ دین سب کے دور میں ایک ہی تھا اور وہ اسلام تھا۔ سب سے آخر میں اس کی تکمیل کیلئے اس کو پورے طور پر قوت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کیلئے حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ تشریف لائے۔ اب آپؐ نے دنیا کے سامنے آ کر یہ پیغام جو پہنچایا تو اس کے بنیادی اصول کیا تھے؟ ہر ایک مسلمان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ آپ نے کھڑے ہو کر جو کلمہ پڑھوایا، وہ محمد رسول اللہ نہیں تھا۔ یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ:

"قُوْلُوْا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔

وہ تو ان کے کہنے سے جب اسے پڑھ لیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مان لیا۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کیا۔ ان کی آواز تو یہ تھی:

"قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا"۔

بالکل جیسے ایک نصیحت کرنے والے کی صدا ہوتی ہے کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہو تمہارا بھلا ہوگا اور کہو کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ زبان سے کسی وقت کھڑے ہو کر نعرہ لگا لو، نہیں۔ یہ کہو وہ ہے کہ جیسے آپ کہتے ہیں کہ میرا قول یہ ہے۔ میں تو اس کا قائل ہوں یعنی تمہارا نقطہ نظر یہ ہونا چاہئے کہ کوئی خدا نہیں ہے، سوائے اللہ کے۔

اگر عرب سے یہ کلمہ پڑھواتے کہ "اللّٰہ اِلٰہ"، اللہ خدا ہے تو پورا عرب کلمہ پڑھ لیتا، اس لئے کہ اللہ کو تو وہ مانتے تھے۔ خود قرآن کہہ رہا ہے مگر اللہ کے سوا بھی بہت سوں کو مانتے تھے۔ تو یہاں یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ کلمہ پڑھ اللہ الٰہ ہے۔ یعنی فقط اللہ کی دعوت نہیں دی جا رہی ہے، یہ نہیں کہا جا رہا کہ کہو اللہ خدا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کوئی خدا نہیں ہے سوائے اللہ کے، "تُفْلِحُوْا" تمہارا بھلا ہوگا۔ اب اس وقت کے جاہل عرب کیا سمجھتے کہ بھلا ہوگا تو اس کا ہوگا جس کے رقیبوں کا خاتمہ کریں گے۔ مگر رسول فرما رہے تھے کہ اللہ کو ایک کہو تو تمہارا بھلا ہوگا۔ تو اس وقت کے جاہل عرب نہ سمجھے۔ اب نئی روشنی والے تو سمجھیں، اب بجلی کی روشنی والے تو

سمجھیں کہ نوعِ انسانی کا کیا بھلا ہے؟ یاد رکھئے کہ اس وقت دنیا تڑپ رہی ہے دو چیزوں کیلئے، ایک اخوت اور ایک مساوات۔ اخوت کے معنی برادری اور مساوات کے معنی برابری۔ تمام دنیا ان دو چیزوں کیلئے تڑپ رہی ہے اور اس لئے مختلف ''ازم'' چل رہے ہیں۔ یہ دولت کی برابر تقسیم کس لئے ہے؟ اسی لئے کہ دولت مند غریب کو دباتا ہے۔ لہٰذا برابر سے تقسیم کر دو کہ نہ غریب رہے، نہ فقیر۔ نہ دولت مند رہے، نہ غریب۔ تو سب ایک ہو جائیں۔ سب برابر ہو جائیں۔

مگر ماشاءاللہ صاحبان فہم ہیں، تعلیم یافتہ ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے، کیا یہ واقع مرض کا صحیح علاج ہے؟ یاد رکھئے کہ نوعِ انسانی میں تفرقہ اگر دولت اور غریب کا ہوتا تو آپ دولت کو برابر تقسیم کر کے سمجھ لیتے کہ مساوات قائم ہو گئی۔ مگر نوعِ انسانی میں تفرقہ فقط دولت کا تو نہیں ہے، بازوؤں کی طاقت میں بھی فرق ہے۔ ایک قوی ہیکل ہوتا ہے، دوسرے لوگ ناتواں ہوتے ہیں۔ وجاہت اور اثر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک بااثر ہوتا ہے، دوسرے لوگ بے اثر ہوتے ہیں۔ قوم و قبیلے کی کثرت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک کا خاندان بڑا ہے، اس کی آواز پر بہت لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک بیچارہ یوسفِ بے کارواں ہے، اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ دماغی فوقیت میں فرق ہوتا ہے۔ ایک آدمی ذہین ہوتا ہے، باقی لوگ کند ذہن ہوتے ہیں۔ جس طرح دولت مند اپنی دولت سے غریبوں کو دباتا ہے، اسی طرح سے صاحبِ طاقت اپنے بازوؤں کی قوت سے دوسرے کمزوروں کو دباتا ہے۔ کسی محلہ میں اگر کوئی پہلوان صاحب ہوں تو دیکھئے کہ سب ان کے رحم و کرم پر ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب قوم و قبیلے کی کثرت سے دوسروں کو دباتا ہے۔

ارے کسی زمانہ میں خاندان و قبیلہ ہوتا تھا، اب پارٹی سہی۔ جس کی پارٹی بڑی ہوتی ہے، وہ ان کو دباتا ہے جن کی پارٹی چھوٹی ہوتی ہے اور دماغی فوقیت! ذہین افراد ایسی سکیمیں بناتے ہیں کہ دوسرے لوگ بیوقوف بن کر ان کے قبضہ میں آ جائیں گے۔ وہ اپنا مطلب پورا کریں۔

تو حضور! دولت تو ہے باہر کی چیز۔ اسے آپ چھین کر برابر تقسیم کر دیں۔ وہ تو دولت کی تصویر حضرت امیرالمومنینؑ فرما چکے ہیں:

''اِنْ كَانَ بَقِيَ لَكَ فَلَا تَبْقَىٰ لَهَا''۔

اگر یہ تمہارے لئے رہ بھی جائے تو تم اس کیلئے نہیں رہو گے''۔

یہ دولت تو چور لے جاتے ہیں، ڈاکو لے جاتے ہیں۔ ہم آپ اگر قانون بنا کر چھین لیں گے تو کارنامہ کیا ہو گا؟ لیکن بازوؤں کی طاقت کا کیا کیجئے گا، اسے بھی کیا طاقتوروں کے بازوؤں سے کھینچ کر کمزوروں کے جسم پر تقسیم کیجئے گا اور خاندان اور قبیلے کا کیا کیجئے گا؟ کیا افراد و خاندان کو تقسیم کیجئے گا کہ کسی کے حصہ میں باپ چلا جائے، کسی کے حصہ میں بیٹا چلا جائے۔ دماغی فوقیت کا کیا کیجئے گا؟ کیا اُسے بھی ذہین افراد کے دماغوں سے نکال کر سادہ لوحوں پر، بھولے بھالوں پر تقسیم کیجئے گا۔ آپ سمجھئے گا کہ برابر سے سب عقلمند ہو گئے اور سمجھوں گا کہ سب برابر کے بیوقوف ہو گئے۔ جب یہ سب نہیں ہو سکتا تو دولت کو برابر تقسیم کر کے یہ سمجھ لینا کہ مساوات ہو گئی اور عدالت قائم ہو گئی۔ یہ طفل تسلی نہیں تو کیا ہے؟ اسلام جو نباضِ فطرت بشر تھا اور کیوں نہ ہوتا جبکہ خالقِ بشر کی طرف کا پیغام تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بیرونی مساوات تو قائم نہیں ہو سکتی، ارے زمینیں سب برابر نہیں ہو سکتیں، کوئی سخت ہے، کوئی نرم۔ پہاڑ سب برابر نہیں ہو سکتے۔ کوئی اونچا

ہے، کوئی نیچا۔ درخت سب برابر نہیں ہیں، دریا سب برابر نہیں ہیں۔ کوئی گہرا ہے، کوئی اتھلا۔ تو اسی طرح سے انسانوں میں صلاحیتیں مختلف ہیں، قابلیت مختلف ہے اور انہی صلاحیتوں کا اختلاف ہے جو دولت و غربت کی شکل میں ابھرا ہے۔

تو خارجی مساوات تو قائم نہیں ہو سکتی لیکن ذہنیت کی تعمیر ایسی کرو کہ ایک بازوؤں کی طاقت والا اپنے بازوؤں کی طاقت کو دوسروں کو دبانے میں صرف نہ کرے بلکہ کمزوروں کا محافظ بن جائے۔ ایک صاحب قوم و قبیلہ اپنے قبیلے کی کثرت یا پارٹی کی کثرت سے دوسرے بے نوا افراد کو دبانے کا کام نہ لے بلکہ ان کا پاسبان بن جائے، ان کا حامی بن جائے اور ایک ذہین فرد اپنے ذہن کو تعمیری کاموں میں صرف کرے، تخریبی کاموں میں صرف نہ کرے۔

اگر یہ بات ہو جائے تو ایک فرد کو دی ہوئی اللہ کی نعمت پوری قوم کا سرمایہ بن جائے اور پھر دولت مندی بھی لعنت نہ رہے اور اگر اس ذہنیت کی تعمیر نہیں ہوتی تو لاکھ دفعہ دولت کو برابر سے تقسیم کر دیجئے، عدلِ کلی قائم نہیں ہوگا اور ظلم کا خاتمہ نہیں ہوگا۔

لہٰذا یہ ذہنیت بننے کی ضرورت ہے۔ اب یہ ذہنیت کیونکر بنے۔ اس ذہنیت کو بنانے کی صورت اخوت ہے۔ دنیا مساوات قائم کر کے اخوت لانا چاہتی ہے۔ ذہن میں اخوت پیدا کرو۔ احساس اخوت، پھر مساوات کیلئے قانون کے دباؤ کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود ذہنیت تعمیر پسند ہو جائے گی۔ تو اب اخوت کیونکر ہو؟ اب جناب یہ اخوت عربی کا لفظ ہے۔ ماشاء اللہ آپ اتنی عربی جانتے ہیں مگر اب اس کو اردو میں کہیں تو بھائی چارہ، فارسی میں لے جائیں تو برادری۔ کتنی دفعہ یہ زبانوں سے آپ کہیں یہ زبانوں پر آپ کی آئے۔ تقریر کیلئے کھڑے ہوئے۔ ارے روزمرہ کی گفتگو میں بھیا، بھائی صاحب اور پھر تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو وہاں بھی کہا کرتا ہوں کہ بھائیو، بہنو۔ آجکل کے دستور کے مطابق بہنو، بھائیو، چاہے وہ ہو، چاہے یہ، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ تو یہ بھائی کا لفظ اتنی دفعہ زبان پر آتا ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ یہ بھائی ہوتا کیونکر ہے؟

جو میں کہتا ہوں، دیکھئے اور فرصت کے لمحات میں غور کیجئے۔ مجلس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بس خوش ہوئے، چلے گئے۔ اپنی جگہ بھی سوچئے، دیکھئے کہ بھائی آخر کیونکر ہوتے ہیں؟ ایک کلیہ میں کہتا ہوں کہ ابھی شاید عربی کے الفاظ اکثریت نہ سمجھیں۔ لیکن جب تشریح کروں گا تو سمجھیں گے کہ جب کوئی کثرتِ وحدت سے منسوب ہو تو اس کے اجزاء میں برادری بھی پیدا ہو جائے گی، برابری بھی پیدا ہو جائے گی۔ کثرت کے معنی ایک سے زیادہ ہونا۔ وحدت کے معنی ایک ہونا۔ جب کوئی کثرت کسی وحدت سے منسوب ہو، اب مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ یہ سگے بھائی بہن کیوں بھائی بہن ہیں؟ کیونکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں تو ایک ماں باپ کی اولاد دس ہوئی تو دس بھائی بہن، پچاس ہوئی تو پچاس بھائی بہن۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ دیکھئے کہ کثرت کتنی بڑی ہے۔ یہ دیکھئے کہ وحدت نے کتنوں کو سمو دیا ہے۔

اب ہمارے ہندوستان کے دیہاتوں میں یہ محاورہ ہے کہ شاید یہاں بھی ہو کہ کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری برادری کے ہیں۔ تو برادری کا کیا مطلب ہے؟ یعنی اپنا۔ اپنا باپ تو الگ مگر پانچ پشت پر، چھ پشت جا کر کوئی ایک مورثِ اعلیٰ ہے جس کی اولاد میں ہم بھی ہیں اور آپ بھی۔ مثلاً ماشاء اللہ خوجگان نارووالی سب ایک برادری۔ تو اب محسوس کیجئے کہ کتنی ہی دور جا کر ایک کا تصور

پیدا ہو، وہیں سے برادری قائم ہوتی ہے۔

اب جناب! دنیا نے اور ترقی کی، اب یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ ہم وطن کے کیا معنی؟ ایک دیس کے باشندے۔ اس میں کتنا جذب ہوتا ہے کہ پردیس میں کبھی اپنے ہم وطن کو دیکھ لیا تو جب وہاں تھے تو کبھی صاحب سلامت نہ تھی۔ اب دوسرے ملک میں دیکھا تو دل چاہا کہ جائیں اور کچھ اپنی کہیں، کچھ اُن کی سنیں۔ یہ ہوتا ہے جذب ہم وطن ہونے کا۔ ہم وطن ایک معلوم ہوا، ایک کا قدم آیا اور الفت پیدا ہوئی۔ اب دنیا نے اور ترقی کی۔ احساس ہوا سمتوں کا، یہ ایشیا ہے، وہ یورپ ہے۔ یہ مشرق ہے، وہ مغرب ہے۔ اب مسائل پر غور ہونے لگا کہ کون مغرب کیلئے زیادہ مفید اور کون مشرق کیلئے زیادہ مفید۔ حالانکہ ملک اپنے الگ الگ، لیکن چونکہ سمتِ آفتاب کے لحاظ سے ایک، لہٰذا سب کے مفادات ایک۔ معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا تڑپ رہی ہے اُس ایک کیلئے جو زیادہ سے زیادہ افراد کو ایک بنا سکے۔

مگر یاد رکھئے کہ ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ ہوتا ہے کیونکہ جب ایک باپ کی اولاد میں ایکا ہوگا تو دوسرے باپ کی اولاد کے مقابلہ میں محاذ ہوگا۔ جب ایک برادری کا ایکا ہوگا تو دوسری برادری کے مقابلہ میں ایکا ہوگا۔ جب ایک ملک والوں میں ایکا ہوگا تو دوسرے ملک والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوگا۔ جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوگا تو دوسری سمت والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں سے کوئی اٹھائی جا رہی ہیں۔ لہٰذا ہر دیوار اِدھر والوں کو ایک کرتی ہے، اُدھر والوں سے جدا کرتی ہے۔

اسلام جو کہ ایک عالمگیر برادری کا پیغام لے کر آیا تھا، اس نے یہ کام کیا کہ درمیان کی اتحاد کی دیواروں کو ڈھا کر اور ڈھا کر نہیں تو بلند مقاصد کیلئے نظر انداز کر کے ایک ایسا احاطہ اتحاد قائم کیا جائے جس میں نہ نسل کی تفریق ہو، نہ رنگ کی تفریق ہو۔ نہ ملک کی تفریق ہو اور آخر میں جس میں سمت کی تفریق بھی نہ ہو اور وہ خدائے واحد کا ایکا ہے۔ اب کسی بھی مذہب وملت کا آدمی ہو، میں اس کے سامنے کہتا ہوں کہ کونسی منطق ہے کہ ایک باپ کی اولاد بھائی بھائی ہو گئے تو ایک خدا کے پیدا کئے ہوئے بھائی بھائی کیوں نہ ہوئے؟

مگر یاد رکھئے کہ بھائی کے حقوق فقط وہی سمجھے گا جو باپ کو یاد رکھے۔ جو باپ کو بھول جائے تو بھائی کے حقوق کیسے؟ اب سمجھ میں آیا کہ اسلام نے پوری طاقت اس پر کیوں صرف کر دی کہ اللہ کو ایک مانو اور یاد رکھئے کہ یہ مقصد صرف اللہ کے ماننے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ اسے ایک ہی نہ مانا جائے، اس لئے یہ کہا:

"قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ"۔

کہو کہ کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے۔

پس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا، صرف اس جملے کو یاد رکھئے تو پورا بیان یاد رہے گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ توحید خالق کا پیغام، اتحادِ خلائق کا سنگِ بنیاد ہے اور اب اس کے ذیل میں اشارتاً کہہ چکا کہ اگر کلمہ پڑھوایا جاتا "اللہ اِلٰہ"، اللہ خدا ہے تو پورا عرب کلمہ پڑھ لیتا مگر یہاں اللہ کو اِلٰہ کہنے سے مسلمان نہیں ہوتا۔ یہاں تو یہ ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"۔

وہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن میں ہے اور ان سے عام طور پر میں کہہ دوں جو تین سو ساٹھ کو مانتے تھے، ان کیلئے تین سو اکسٹھ کو ماننے میں کیا عذر تھا؟ یہاں ایک سادہ سا اُردو کا جملہ کہتا ہوں، الٹ پھیر سے مطلب میں فرق ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک خدا کے ماننے میں عذر نہ تھا، خدا کو ایک ماننے میں عذر تھا۔ یہی قرآن کہہ رہا ہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ

انہوں نے بہت سے خداؤں کو ایک کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے"۔

بس وہ نفی ان کیلئے بہت دشوار تھی۔ تو اب میں ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ قربانیاں جو رسولؐ نے اتنی پیش کیں، وہ "اِلّا" کے بعد جو اللہ ہے، اس کی راہ میں نہیں ہیں بلکہ "اِلّا" سے پہلے جو اِلٰہ ہے، اس کی راہ میں تمام قربانیاں ہیں۔ پورا جہادِ پیغمبرؐ اس کے لئے ہے اور اب خواجہ غریب نواز کے ایک شعر کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

حقا کہ بنائے لا اِلٰہ است حسینؑ

آجکل لوگ ہر ایک پر اعتراض کر دیتے ہیں کہ انہوں نے لا اِلٰہ کیا کہا؟ لا اِلٰہ اکیلا تو کلمہ کفر ہے۔ لا اِلٰہ کی بنیاد بنا دیا حالانکہ فقط ان بیچارے نے تو نہیں کہا تھا۔ ڈاکٹر اقبالؒ صاحب نے بھی تو کہا:

پس بنائے لا اِلٰہ گردیدہ است

انہوں نے بھی تو آدھا لیا۔ پس بنائے لا اِلٰہ گردیدہ است تو وہ تو چھ صدی پہلے تھے۔ یہ تو ابھی کل تھے اور زندہ۔ گویا اپنی نیک نامی کے لحاظ سے زندہ شاعر ہیں۔ تو جناب! ان کے ہاں ہیں یہ الفاظ "پس بنائے لا اِلٰہ گردیدہ است"۔ تو لوگ یوں بھی کہہ دیتے ہیں کہ صاحب وہ تو شعر کی مجبوری تھی کہ پورا کلمہ موزوں نہیں ہوتا تھا۔ تو کسی صاحب نے کہا ضرورتِ شعری سے میں نے کہا ہے۔ کسی نے کہا کہ شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تو میں نہیں مانتا۔ ہاں! ضرورتِ شعر بھی ہے لیکن ضرورتِ شعر کفر کو ایمان نہیں بنا سکتی۔ ایک کلمہ کفر کو کلمہ ہدایت نہیں بنا سکتی۔ تو یہ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ 60ھ میں بھی لا اِلٰہ خطرہ میں نہیں تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسجدیں تو آباد تھیں، اذانیں ہو رہی تھیں۔ خانہ کعبہ میں حج تو ہو رہے تھے۔ وہی لا اِلٰہ جس کیلئے رسولؐ نے قربانیاں پیش کیں، وہی لا اِلٰہ خطرہ میں تھا۔ جب دنیا پتھر کے بتوں کو پوج رہی تھی، اب گوشت پوست سے بنا ہوا یزید حکمِ الٰہی کے خلاف لوگوں سے اپنی اطاعت لے رہا تھا۔ حقیقت میں وہی لا اِلٰہ خطرہ میں تھا اور حضرت امام حسینؑ نے بھی جو اتنی قربانیاں پیش کیں، وہ اسی لا اِلٰہ کی خاطر تھیں۔

اب کوئی کہتا ہے کہ قربانیوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میں آنکھوں سے دکھا سکتا ہوں اور آپ کے موچی دروازے کے باہر وہ شاندار حسینؑ ڈے ہوا تھا جو دونوں حکومتوں کے اہتمام سے ہوا تھا۔ حکومتِ ہند نے بھی اس میں حصہ لیا تھا اور حکومتِ پاکستان نے بھی۔ ان دونوں ملکوں کے تعلقات قریب لانے کیلئے ہوا تھا۔ کاش! اس نسخے کو چھوڑا نہ گیا ہوتا تو مستقل طور پر تعلقات خوشگوار ہو جاتے۔ تو اس میں بعض حضرات ایسے ہوں گے جو اس میں موجود تھے، اس میں ہر مکتبِ خیال کے علماء موجود تھے اور آپ کو

تو یاد ہوگا کہ سٹیج اس کا اتنا بڑا تھا جتنا یہ ہمارا حال ہے۔ اس میں تمام مذاہب کے علماء موجود تھے اور جب علماء ہر مذہب کے موجود تھے تو ہر نقطۂ نظر کے مسلمان موجود تھے۔

تو میں نے اس پورے مجمع سے پوچھا تھا کہ بتاؤ آج یزید جیسا کوئی شخص رسول کا جانشین ہونے کا دعویٰ کرے تو مانو گے؟ اور حدِ نظر کے سامنے جتنا مجمع تھا، سب چیخ اٹھا تھا کہ ہرگز نہیں مانیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ 60ھ میں مان رہے تھے۔ اگر نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کر کے کیوں بتاتی کہ کس کس نے نہیں مانا؟ یہ تاریخ کا شمار کر لینا بتاتا ہے، رسولؐ کے اتنے بعد 60ھ میں صرف پچاس برس بعد سب مان رہے تھے یزید جیسے شخص کو اور آج تیرہ چودہ سو برس گزرنے کے بعد آپ نہیں مان رہے۔

تو ماننا پڑے گا کہ حسینؑ نے اپنے خونِ ناحق سے بیہوش احساساتِ اسلامی پر جو چھینٹا ڈالا تھا، وہ مٹنے پر بھی آج تک اس طرح باقی ہے اور طرح، بس ایک جملہ کہوں، وہ بھی یاد رکھنے کا ہے اور اس کے بعد آگے بڑھوں گا مصائب کی طرف آؤں گا کہ حضور والا! حضرت امام حسینؑ نے صرف اس یزید کے مقابلہ میں فتح حاصل نہیں کی جو ایک خاص باپ کا بیٹا تھا، جو ایک خاص شہر کے تخت پر متمکن تھا، اس یزید کے مقابلہ میں فتح حاصل نہیں کی ہے بلکہ قیامت تک ہر یزید کے مقابلہ میں فتح حاصل کی ہے۔

37

دین اسلام

علیؑ کی ماں نے اپنے بچوں کی نسبت حضرت محمدؐ کی تربیت وخدمت کو ترجیح دی تھی۔ ابوطالبؑ اور فاطمہ بنت اسد نے حضورؐ کو احساسِ یتیمی نہیں ہونے دیا، اسی لئے تو ارشادِ قدرت ہے کہ ہم نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ کا انتظام کردیا۔

دیکھ لیجئے کہ جناب ابوطالب نے حضورؐ کو پناہ دی لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے پناہ دی۔

انجیل میں مَیں نے پڑھا کہ انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کا نسب نامہ حضرت آدمؑ تک پہنچایا ہے۔ یہاں پر میں ایک بات اُن سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ حضرت عیسٰیؑ کا صرف باپ نہیں ہے مگر حضرت آدمؑ کے تو ماں بھی نہیں تھی، باپ بھی نہیں۔ پھر انہیں تم اللہ کا بیٹا کیوں نہیں مانتے؟

اسلام کا مکمل اظہارِ عمل سجدہ سے ہے۔ اللہ کیلئے سجدہ ریز ہے ہر چیز جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

ہمارے ہاں ہر جگہ عزاداری ایک ہی عنوان سے ہوتی ہے۔ وہ تو فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، نالہ پابند نہیں ہے، جس کی جو سمجھ میں آیا ہے، جذبہ ہے اظہارِ سوگواری کا۔

دین اسلام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"

میں نے عرض کیا کہ آزادی کا جو مطالبہ ہو رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوئے، لہٰذا آزاد رہنا چاہتا ہے اور اسے آزاد رہنا چاہئے۔ تو انسان کسی ایک فرد کا نام تو نہیں ہے۔ انسان ایک پوری نوع ہے جس میں سے ہر ایک انسان ہے اور آزادی کا مطلب یہ سمجھا جا رہا ہے کہ جو دل چاہے، وہ کر سکیں۔ تو یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی خواہشات لامحدود ہیں۔ اسے میں نے مثالوں سے عرض کیا۔ اب آزادی کسے دی جائے؟ یا تو ایک کو آزاد کر دیا جائے بس اور سب کو مقید، تو یہ اُس ایک کے ساتھ جس کی رشتہ داری ہو، وہ کرے گا یا پھر یہی شکل ہے کہ آزادی کی جنس کو حصہ رسدی تقسیم کیا جائے۔ یعنی ہر ایک اس حد تک آزاد ہو جس حد تک دوسروں کے حقوق کو صدمہ نہ پہنچے اور جہاں سے دوسروں کے حقوق کو صدمہ پہنچے، وہاں سے مقید۔ یہ قید ہر فرد کیلئے قید ہے مگر تمام نوعِ انسانی کو آزادی کے حقوق سے بہرہ ور کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر ان حقوق آزادی کو تقسیم کون کرے؟ اگر مرکز اس تقسیم کا کوئی مادی ہوا تو وہ کسی نسل کا ہوگا، کسی ملک کا ہوگا، کسی زبان کا بولنے والا ہوگا تو سب کی ضرورتوں کا اُسے احساس بھی نہیں ہوگا اور اس کو اس پر اعتماد بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا اطمینانِ قلب ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتا اور بے اطمینانی ہی تصادم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا مرکز تقسیم حقوق ایسی ذات ہونی چاہئے جو خود کسی ملک کی نہیں، خود کسی نسل کی نہیں، خود کسی رنگ کی نہیں، کسی سمت کی نہیں۔ جب اس کی طرف سے تقسیم ہوگی، تو ہر ایک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے کہ میرے ساتھ انصاف ہوا ہے، میرے ساتھ عدل ہوا ہے۔

یہ اُن لوگوں کیلئے جو اتفاق سے کل نہ شریک ہوئے ہوں، مختصر خلاصہ ربط کیلئے بیان کیا جاتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ اس کا تجربہ خود مسلمانوں کو ہے اور وہ مشاہدہ جو دنیا کیلئے مثال ہے کہ جس جس چیز کو مسلمانوں نے خدا کی طرف سے مان لیا، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ کعبہ کو خدا کی طرف سے مان لیا تو دو قبلے نہیں ہوئے۔ جس جس چیز کو خدا کی طرف سے سب نے مان لیا، اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ جہاں سے ایک طبقہ نے اپنے اختیار کو صرف کر دیا، وہیں سے اختلاف ہو گیا۔ اب اس کی طرف جو حقوق تقسیم ہوتے ہیں، اس میں پھر کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی، مثلاً پابندِ شرع گھرانوں میں جہاں شرع کے اعتبار سے میراثیں تقسیم ہوتی ہیں وہاں کبھی کسی لڑکی کو شکایت نہیں ہوتی کہ ہمیں آدھا ملا اور ہمارے بھائی کو دوگنا ملا۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ میرا حصہ اللہ کی طرف سے یہی ہے۔ لہٰذا اُسے کوئی ناانصافی کا شکوہ نہیں ہوگا۔ ہاں! جو حصہ مقرر ہے اللہ کی طرف سے، وہ نہ دیا جائے تو پھر وہ ظلم ہوگا۔ جیسے ایک وقت کا حال مجھے معلوم ہے کہ پنجاب میں لڑکی کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا، عدالتوں میں پوچھا جاتا تھا کہ تم شریعت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہو یا رواج کے مطابق؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ شریعت الگ ہے اور رواج الگ ہے۔ بہت سے ایسے ہوتے تھے جو یہ کہہ دیتے تھے کہ ہمیں رواج کے مطابق فیصلہ چاہئے۔ تو میں کہتا ہوں کہ گو وسعتِ شرع میں کفر کا فتویٰ جاری نہ ہو مگر حقیقت کے لحاظ سے جب شریعت کے مقابلہ میں آپ نے اعلان کر دیا کہ ہم رواج کے پابند ہیں تو اس شعبہ میں غیر مسلم ہونے کا اعلان کر دیا۔ تو کبھی جہاں شریعت کے مطابق فیصلہ ہو، اس میں لڑکی کو یہ شکوہ نہیں ہوگا کہ مجھے آدھا حصہ کیوں ملا۔

ہاں! آجکل کے نئی روشنی والے، وہ بلاوجہ عورت کے ہمدرد بن کے کہتے ہیں کہ اسلام نے دیکھو مرد اور عورت میں کتنی تفریق کر دی ہے؟ لڑکے کو دُہرا دیا ہے اور لڑکی کو آدھا دیا ہے۔ میں اس وقت اصولی طور پر اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر میں ایک نئے رُخ سے دنیا کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے جو عرض کر رہا ہوں کہ اسلام اور کفر میں فرق کیا ہے؟ یہ ہے کہ اسلام قانون کو اللہ کی طرف سے مانتا ہے، کفر جو ہے، وہ پیغمبر کا ساختہ مانتا ہے۔ جو شخص پیغمبر کا ساختہ مانتا ہے، ارے یہی قرآن میں فرق ہے۔ جو کلام خدا مانتا ہے، وہ مسلمان ہے اور جو کلامِ بشر مانتا ہے، رسول کا کلام مانتا ہے، وہ کافر ہے۔ تو ویسے ہی جو مسلمان ہے، وہ مانے گا کہ اصل قانون بنایا ہوا صرف اللہ کا ہے۔ یہ صرف اس کے مبلغ تھے اور جو اللہ کی طرف کا نہیں مانتا، وہ یہ کہتا ہے کہ یہ قانون آپ نے بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ جو کافر ہے، وہ مجھ سے پہلے اپنے ہی مسلکے کو سامنے رکھ کر بات کرے کہ اس میں اصول کے سوا کیا کسی جذبہ کا دخل ہے؟ قانون وہ نافذ کر رہا ہے جسے خدا نے بیٹی ہی دی ہے۔ ارے کوئی ایسا نبی ہوتا جسے اللہ نے بیٹا دیا کرامت فرمایا ہوتا اور بیٹی اس کے ہاں نہ ہوتی تو کہنے کو ہوتا کہ انہیں بیٹی کی قدر کیا تھی؟

ارے جناب! وہ رسول جس کا اللہ نے بیٹا آخر حیات تک زندہ رکھا ہی نہیں، بیٹے تھے جناب خدیجہؑ کے لیکن یہ کہ پھر بیٹا آپ کے ہاں نہیں تھا۔ ایک بیٹا آخر میں ہوا جناب ماریہ کے بطن سے، وہ بھی باقی نہیں رہا۔ بیٹی ہی کرامت فرمائی تھی۔ ہاں! بیٹے بھی پھر اسی کے ذریعہ سے عطا کر دیئے۔ تو اللہ نے اسے بیٹی ہی عطا فرمائی۔ تو اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ انہیں بیٹی کی کیا قدر؟ میں کہتا ہوں کہ بیٹی کی قدر تو ایسی کی کہ دنیا میں کسی باپ نے نہیں کی۔ کوئی باپ بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑا نہیں ہوا۔ لیکن پیغمبر خدا بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ تعظیم میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ کہنا کہ وہ بیٹی ہونے کی وجہ سے تھی، بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ تعظیم نہیں تھی، وہ بیٹی کچھ ایسی تھی اور اس کا میرے پاس ثبوت ہے۔

یہ مسلمہ اصولِ اسلامی ہے کہ جو عملِ رسولؐ ہے، اس کی پیروی یا واجب ہوگی یا مستحب ہوگی۔ بہر حال جزوِ سنت ہوگی۔ یہ عملِ رسولؐ تمام کتابوں میں موجود ہے۔ صحاح ستہ کا جزو ہے۔ صحیح ترمذی اور اس میں یہ حدیث موجود ہے کہ کوئی فرقہ اسلامی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ ایک عملِ رسولؐ متفقہ موجود ہے لیکن کسی مکتبِ اسلامی کی فقہ میں میں نے نہیں دیکھا کہ باپ کیلئے سنت ہے کہ بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑا ہو۔ ایک عملِ رسول مسلمہ موجود ہے اور چودہ سو برس کے علماء میں کوئی نہیں لکھ رہا ہے کہ یہ سنت ہے۔ کسی تحفۃ العوام میں آپ نے نہیں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا۔ اچھا آجکل تو ریسرچ کا دور ہے۔ ریسرچ کے معنی ہیں ایک نئی بات کوئی کہے کہ ان علماء نے نہیں لکھا، بھول گئے۔ ہم اب سے لکھیں گے۔ میں کہتا ہوں اچھا قلم آپ کے ہاتھ میں ہے، جب چاہے لکھ دیجئے گا۔ لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں

کہ صحابہ رسولؐ میں اسے کسی نے اس سنت پر عمل کیوں نہ کیا؟ کئی کئی ہزار صفحات کی کتابیں حالاتِ صحابہ میں موجود ہیں لیکن کسی نے کسی صحابی کے حالات میں نہیں لکھا کہ وہ اپنی صاحبزادی کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوجاتے ہوں۔ یہاں تک کہ ایسی صاحبزادیاں جو کسی حیثیت سے واجب التعظیم بھی ہوگئی ہوں، ان کی تعظیم کو کھڑے نہیں ہوتے۔ اچھا اب کوئی کہہ دے ہم میں سے تو ہر فرد بے تکلف کہہ دے گا کہ صحابہ معصوم نہیں تھے۔

اب دنیا چاہے یوں نہ کہے لیکن پھنسنے پر تو کہے گا کیونکہ مانتا کوئی نہیں معصوم۔ تو یہاں کہہ دے کہ معصوم نہیں تھے۔ اچھا مان لیجئے مگر اب ہم تو بحمد اللہ رسولؐ کے بعد بھی بقائے رسالت کے قائل نہیں۔ بقائے عصمت کے قائل ہیں۔ نبوت ورسالت ختم ہوگئی، عصمت ختم نہیں ہوئی۔ تو اب ہمارے ہاں جو معصومینؑ ہیں اور جن کے گھر کی روایت تھی، جن کے گھر کی بات تھی، ان میں سے کسی کے حال میں نہیں ملتا کہ کوئی اپنی بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑا ہوتا ہو۔ کیسی کیسی صاحب صفات بیٹیاں، حضرت زینبؑ کیلئے ممکن ہے کہ بعض ذاکرین سے آپ نے سنا ہو، میں سمجھتا ہوں کہ کبھی آپ نے سنا ہوگا، اگرچہ دیکھا میں نے بھی اسے کسی کتاب میں نہیں ہے لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ امام حسینؑ تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ یہ ہو تو بڑی بات ہے مگر وہ بات تو نہ ہوئی۔ بہن بھائی کا رشتہ تو برابر کا ہوتا ہے، خواہ عمر کا فرق ہو۔ حضرت امیر المومنینؑ کیوں نہیں کھڑے ہوتے تھے۔ یہ ہو تو بڑی بات ہے مگر وہ بات تو نہ ہوئی۔ بہن بھائی کا رشتہ تو برابر کا ہوتا ہے، خواہ عمر کا فرق ہو۔ حضرت امیر المومنینؑ کیوں نہیں کھڑے ہوتے تھے؟ جنکی سیرت ہمارے نزدیک جزوِ سیرتِ رسولؐ تھی۔ تو وہ تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے۔

تو اب تو یہ ماننا پڑے گا کہ چودہ برس کے علماء میں سے کوئی یہ نہیں لکھتا کہ یہ سنت ہے۔ صحابہ میں سے کوئی اس کی پیروی نہیں کرتا۔ ان کی اولادِ طاہرہ میں سے کوئی ان کی پیروی اس بارے میں کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تو بس اس معمہ کا حل میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ چودہ سو برس کے علماء صرف یہی سمجھے، صحابہ یہی سمجھے، آئمہ معصومینؑ یہی جانتے تھے کہ یہ تعظیم بیٹی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، شخصیتِ فاطمہؑ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اصول اپنی جگہ قائم۔ بحیثیت بیٹی ہونے کے ہوتی تو مجھے بھی وہ تعظیم مستحب ہوتی اپنی بیٹی کیلئے کم سے کم۔ لیکن وہ تعظیم تو خصوصی حیثیت سے شخصیتِ فاطمہ زہراؑ کیلئے تھی۔ لہٰذا وہ پیروی واجب اور اس کے نتیجہ میں قیامت تک کیلئے فاطمہؑ کی تعظیم واجب ہوگی۔ اپنی بیٹی کی تعظیم کر کے اتباعِ رسولؐ نہیں ہوگا۔ تو ایسی بیٹی جس کی ہو، وہ یہ حکم نافذ کررہا ہے کہ بیٹی کا حصہ آدھا اور بیٹے کا حصہ دوہرا۔ تو اب غیر مسلم بھی ماننے پر مجبور ہے کہ اس میں صرف کوئی اصول ہے، جذبات کا دخل نہیں ہے۔

ایک بہت بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ جو اس زمانہ میں ہوتا ہے، فرمائشیں ہوتی ہیں کہ رسالہ اس موضوع پر لکھئے، حالانکہ میں نے اسی لئے ایک رسالہ اسلامی قانونِ وراثت میں لکھا ہے جو امامیہ مشن پاکستان سے بھی کبھی شائع ہوا ہے۔ تو وہ کیا ہے؟ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کا محروم ہونا اس قدر واویلا ہے، بڑی بے چینی ہے۔ ارے صاحب! پوتا بیچارہ، ایک تو اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور اس کے بعد اپنی خاندانی جائیداد سے بھی محروم ہوجائے۔ تو (معاذ اللہ) یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے۔ ہمارے ہاں جو آجکل صدرِ جمہوریہ صاحب ہیں، صدر نہیں، نائب صدر جمہوریہ جسٹس عبید اللہ، انہوں نے ایک دفعہ کھل کر، ایک سوال کیا پرسنل لاء کی ترمیم کا، میری ایک

کتاب کئی سوصفحات کی چھپ چکی ہے کہ اسلامی پرسنل لاء قابل تبدیلی نہیں۔اس موضوع پر دس دن کا بیان ہے۔وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔تو اس میں اس سے متعلق جتنے موضوعات ہیں، تفصیل سے آئے ہیں اور یہ بھی جزو آیا ہے اس میں تفصیل سے اور اسلامی قانون وراثت میں اس کا اصول درج ہے۔

تو کہتے ہیں بیچارہ۔ میں کہتا ہوں ادھر بیچارہ آپ نے کہا اور جذبات کا دخل ہو گیا اور اب ظاہر ہے کہ اس کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے۔اس وقت اس تفصیل سے عرض نہیں کرنا ہے۔ادھر آپ نے بیچارہ کہا اور اس بیچارے کے لفظ سے جذبات کا تعلق ہو گیا۔ قانون میراث بیچارے پن سے نہیں ہے، بے چارہ پن سے زکوۃ ملتی ہے، خمس ملتا ہے۔بے چارہ پن سے میراث نہیں ملتی۔اگر بیچارہ بھائی فاقہ کش ہو اور بیٹا لکھ پتی ہو تو یہ نہیں ہوگا کہ میراث بھائی کو دے دی جائے۔اس لئے کہ بیچارہ مفلوک الحال ہے اور لڑکے کو نہ دی جائے، اس لئے کہ لکھ پتی ہے۔تو میراث میں معلوم ہوا کہ بیچارے کا دخل نہیں ہے۔قرابت کی قربت کا دخل ہے۔اگر بیچارے پن کو دخل دیجئے تو یہیں پر کیوں بالکل برابر کا رشتہ ہے، بیٹا اور پوتا اور باپ اور دادا۔یہ ادھر سے بلا واسطہ اور بیک واسطہ، وہ اُدھر سے بلا واسطہ اور بیک واسطہ۔تو اگر آپ کی منطق بیچارے پن کی یہاں درست ہو تو یہاں بھی کہئے کہ باپ تو بہر حال ممکن ہے کہ ابھی برسر کار ہو اور دادا تو بیچارہ ریٹائر ہوگا۔لہٰذا یہ کیا کہ باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو نہ ملے۔اگر آپ وہاں بیچارے کے فلسفہ کے قائل نہیں ہیں تو وہی نسبت بیٹے اور پوتے کی یہاں ہے۔آپ کیوں بیچارے پن کو دخل دیتے ہیں۔

تو یہ اصل اصول تھے جو میں نے ایک لوح فکر یہ پیدا کر دیا۔آپ اپنی جگہ چاہے جتنا غور کیجئے، اتنے سمجھ میں آتے جائیں گے تمام اصول میراث۔قانون وراثت رسالہ بھی ہے جس میں قرابتوں کی گویا پیمائش کی گئی ہے کہ کون کتنا قریب ہے اور کون کتنا دور ہے اور کس طرح سے جو قریب ہے، اس کے ہوتے ہوئے بعید کو محروم کیا گیا ہے۔تو اصول اس قرب وبعد کا رشتہ داری پر ہے۔اس کی بنیاد بیچارہ پن پر ہے ہی نہیں۔لہٰذا آپ بیچارہ پن کو دخل دے کر بے اصولی کر رہے ہیں اور اس کے بعد جو میں نے بیٹی کے بارے میں کہا تھا کہ ابھی میں ایک غیر مسلم کے سامنے کہوں گا کیونکہ جس رسولؐ نے یہ قانون نافذ کیا ہے، وہ خود اس قسم میں داخل رہا ہے کہ اس کے باپ کا انتقال دادا کے سامنے ہو گیا تو اس سے بڑھ کر کون اس بیچارے کی مجبوریوں سے واقف ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اصول میراث میں حق نہ قائم کیجئے۔ہاں اباپ نہیں رہا تو دادا پوتے کے ساتھ وہ کرے جو جناب عبدالمطلب نے جناب رسول اکرمؐ کے ساتھ کیا اور اسی طرح سے ہر ایک چچا اپنے بھتیجے کے ساتھ وہ کرے جو جناب ابوطالبؑ نے اپنے فرزند برادر کے ساتھ کیا اور کس شان سے پرورش کی، یہ روزمرہ کی باتیں ہیں مگر جب تک کوئی غیر معمولی کیفیت نہ ہو، اس وقت تک تاریخ کا جز نہیں بنتی۔

اور اب میں کہتا ہوں کہ جو چیز ہے، ابھی عرض کروں گا۔جناب ابوطالبؑ سے زیادہ اس میں جناب فاطمہ بنت اسد کا دخل ہے۔یہ معاملے عورتوں سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔طبری سے زیادہ مقدم تاریخ ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔طبقات ابن سعد، وہ تقریباً طبری سے ایک صدی مقدم ہے اور ہمارے اپنے مسلمان مطابع نے اسے چھاپا ہے، ہالینڈ کے شہر لیڈن میں اور جرمنی میں شائع ہوئی ہے۔تو اسی طبقات ابن سعد میں دیکھئے۔میں نے کہا کہ روزمرہ کی باتیں ہیں۔مگر انوکھا پن پیدا نہ ہو تو جزو تاریخ نہیں بنتی۔اس

میں ہے (ترجمہ عربی) ابوطالبؑ کے بچے نظر آتے ہیں کہ بال بکھرے ہوئے ہیں، چہرہ گرد آلود ہے جیسے بچے گھر کے اندر کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابوطالبؑ کے بچے تو اس شان سے کبھی کبھی نظر آئے ہیں مگر محمدؐ کو جب دیکھا تو آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا اور بال آراستہ کئے ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ایسی ہی شکلیں ہوتی ہیں۔ خود ابوطالبؑ کی اولاد اگر بال پریشاں ہوتی تو کوئی نہ کہتا کہ بیچارے کی صورت سے یتیمی ٹپک رہی ہے لیکن یہ ایک دفعہ بھی اس طرح نظر آتے تو دنیا کہتی کہ بیچارہ یتیم ہے۔ ابوطالبؑ اور فاطمہ بنت اسد نے دنیا کو احساس یتیمی نہیں ہونے دیا۔ مگر خالق یتیم کے درجہ کو اتنا اونچا جانتا تھا کہ اُس نے قرآن جیسی ادبی کتاب میں اُس یتیمی کو یاد کیا۔

اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی

اپنے احساسات میں کہا جا رہا ہے کہ کیا ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ کا انتظام کر دیا۔ یہاں ہر نقطہ نظر کا مفسر لکھنے کو تیار ہے، مجبور ہے، تیار چاہے دل سے نہ ہو۔ آیت کے تحت میں کوئی مفسر ماں کا نام نہیں لیتا۔ ارے خالق کی طرف کا انتظام جسے احسان میں پیش کرے اور چھ برس کی عمر میں اٹھ جائے اُس کا سایہ، کوئی نہیں لکھتا ماں کا نام۔ چھ برس تک تو ماں بھی موجود تھیں۔ کوئی نہیں لکھتا دادا کا نام۔ دادا ابھی تو آٹھویں برس دنیا سے اٹھ گئے۔ ہر مفسر یہاں مجبور ہے اور لکھتا ہے:

"بِعَمِّهٖ اَبِیۡ طَالِب"

اللہ نے پناہ کا انتظام کیا ان کے چچا ابوطالبؑ کے ذریعے۔ اب جناب! میں نے بہت ہی توقف کر کے ترجمہ کیا اور پھر بھی ترجمہ پورا نہیں کیا۔ لفظی معنی ہیں "آوا" کے پناہ دی۔ لوگ ترجمہ کرتے ہیں "پناہ دلوائی"۔ میں کہتا ہوں کہ پناہ دلوائی لفظی معنی نہیں ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ آپ کو یتیم پایا تو پناہ دی۔ لفظی معنی یہی ہیں۔ اب میں ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا کہ یہ بڑی بلند منزل ہے کہ کسی کے کام کو اللہ اپنا کام کہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی ۚ

وہ آپؐ نے سنگریزے نہیں پھینکے، اللہ نے پھینکے۔ یعنی رسولؐ کے کام کو اپنا کام کہا تو یہ ایسی منقبت ہے جو رسولؐ کی شان کے لائق ہے اور اب آپ یہاں دیکھ لیجئے کہ پناہ دینا کس کا کام ہے؟ ابوطالبؑ نے پناہ دی۔ اللہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے پناہ دی۔ تو بہرحال اصل محلِ گفتگو یہ ہے کہ جب خدا کی طرف سے کوئی قانون ہو جائے تو پھر اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پھر وہ حق ماننا پڑتا ہے۔ غیر مسلم معترض ہوں پوتے کی میراث پر یا فرض کیجئے کہ آجکل کی نئی روشنی والے اعتراض کریں۔ وہ بہت سے حقائق اسلام پر معترض ہیں لیکن کوئی پابندِ شریعت پوتا ہو تو وہ احساس نہیں کرے گا کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ کوئی لڑکی یہ احساس نہیں کرے گی کہ مجھے آدھا ملا تو مجھ پر ظلم ہوا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کا قانون ہے اور یہ خصوصیت اسلام کی یعنی اس کا اللہ کی طرف کا دین ہونا، یہ ایسی خصوصیت ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دنیا کے مذاہب کا نام دیکھئے، کوئی دین کسی کی شخصیت کی طرف منسوب کوئی دین کسی قطعہ ارض کی طرف زمین کے حصے کی طرف منسوب مثلاً جو بڑے بڑے آجکل ادیان ہیں غیر اسلام، انہیں دیکھئے کہ خود اپنے کو مثلاً عیسائی کہیں مسیحی،

کہیں یعنی شخصیت کی طرف نسبت، حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت۔ ارے وہ نصرانی کہیں جو قسیم اصطلاح تھی تو ناصریہ ایک مقام تھا وہاں پیدائش ہوئی تھی۔ ناصرہ، اس جگہ کی طرف نسبت کرسچین یعنی کرسٹ مسیح کی طرف نسبت۔

توغرض جس زبان میں بھی اس دین کا نام پوچھئے، کسی آدمی کا تعلق نمایاں ہوگا۔ تو اب جیسے اس آدمی سے کوئی خاص تعلق نہ ہو، وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ میں اس دین سے منحرف ہوں۔ مجھ کو اس سے کیا مطلب؟ اب وہ قرآن نے ان کی سچائی مان لی ورنہ عیسائی اپنی پوری طاقت صرف کردیتے۔ تب بھی مسلمانوں سے حضرت عیسیٰ کی رسالت نہیں منوا سکتے تھے اور جتنے معجزات کہیں گے، وہ سب ہمارے سامنے کہاں ہیں؟ اسی کے بیان کئے ہوئے ہیں۔ مردے اس وقت وہ کب زندہ کررہے ہیں؟ کورمادرزاد کو اس وقت وہ شفا دے رہے ہیں؟ معجزات سب وقتی تھے جو وقت کے ساتھ چلے گئے۔ دیکھنے والوں کیلئے وہ قطعی تھے۔ وہ بعد والوں کیلئے روایت بن گئے۔ دین کی بناء روایات پر نہیں ہوتی، قطعی باتوں پر ہوتی ہے۔ وہ تو ہمارے قرآن نے تصدیق کردی ان کی رسالت کی اور ان کے معجزات کو محفوظ کردیا تو ہم بربنائے ایمان بالقرآن مجبور ہوگئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے پر اور ان کے معجزات کو بھی ماننے پر مجبور ہوگئے۔ یہود کی جماعت پوری طاقت اگر صرف کردے تو وہ حضرت عیسیٰ کی رسالت ہم سے نہیں منوا سکتی۔ عیسائی یہودیوں سے کب منوا سکے؟ آج تک جو ہم سے منوالیتے، اب عیسیٰؑ نے بھی چونکہ توریت کی تصدیق کردی، اس لئے بیچارے عیسائی بھی حضرت موسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ تو ہم سے یہودی نہیں منوا سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی رسالت قرآن نے منوائی۔

مجھے یاد ہے جس کسی کی کوئی بات ہو، اس کا نام لے کر میں پابند ہوں۔ وہ صاحب یادگار حسینی میں میرے ساتھ اکثر جلسوں میں ہوتے تھے۔ کلیوگا نند اچھوت، لیڈر، بڑی پرزور تقریر کرتے تھے اور یادگار حسینی کے جلسوں میں بڑی پرزور تقریریں انہوں نے کیں۔ وہ اچھوت لیڈر تھے۔ سال گزشتہ کراچی میں مجھے ملے تھے۔ بہت ہی ضعیف ہوگئے تھے۔ اب کے نہیں ملے تو معلوم ہوا کہ وہ رخصت ہوگئے۔ تو وہ اچھوت لیڈر پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ پاکستان میں بھی وہ اچھوت لیڈر ہی رہے۔ مگر ایک جملہ انہوں نے کہا جو اُن سے پہلے تقریروں میں نہیں سنا تھا۔ پہلے تو اس ضعیف العمری میں اپنا ایک پمفلٹ مجھے دیا۔ پھر زبانی مجھ سے کہا کہ یہودیوں کا آج تک اعتراض ہے پاکدامنی حضرت مریمؑ پر اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ انتہائی گستاخی وہ کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سیاست کی ستم ظریفی ہے کہ اب عیسائیت ان کی ناز بردار بن گئی ہے۔ وہ جناب عیسیٰؑ کے ساتھ شدید ترین گستاخی روا رکھتے ہیں۔ ان کے فرزند جائز ہونے کو معرض بحث میں لاتے ہیں۔ اس کا جواب دنیائے عیسائیت کے پاس نہیں ہے۔ وہ انجیل، جو ان کی کتاب ہے، میں نے دیکھی ہے، انہوں نے نسب نامہ حضرت عیسیٰؑ کا حضرت آدمؑ تک پہنچایا ہے۔ یوسف نجار کے ذریعہ سے، جن سے منگنی ہوئی تھی، شادی نہیں ہوئی تھی، یوسف نجار کی ولدیت قرار دے کر رشتہ پہنچایا ہے۔ جناب آدمؑ تک پورا شجرہ لکھ دیا ہے۔ اب جو انہوں نے کہا کہ وہ بعد میں کہوں گا۔ اب اپنی طرف سے یہ میں بیان کردیتا ہوں۔

جب نصارائے نجران آئے ہیں پیغمبرؐ سے بحث کیلئے، سب باتوں کے قائل ہوگئے۔ آخر میں انہوں نے کہا آپ اللہ کا بیٹا مانتے ہیں یا نہیں؟ تو مجبوراً رسولؐ نے یہی فرمایا، اصول کی بات تھی کہ نہیں مانتے۔ بڑے درجہ کا رسول مانتے ہیں، بہت بڑا نبی مانتے

ہیں، صاحبِ معجزات مانتے ہیں۔ یہ نہیں مانتے تو انہوں نے فوراً کہا کہ جب اللہ کا بیٹا نہیں مانتے تو پھر وہ کس کے بیٹے تھے؟ اب جو جواب قرآن میں آیا ہے، وہ آپ میں سے کچھ حضرات تو جانتے ہی ہیں۔ پھر میں بھی بیان کروں گا وہ۔ تو جواب ہے قرآن کا اور اب حضرت عیسیٰ کی بات جان لیجئے کہ اس سوال کی غیر منطقیت کا ذرا اندازہ کیجئے کہ اللہ کے بیٹے نہیں ہیں تو پھر کس کے بیٹے ہیں؟ یعنی جس کے باپ کا پتہ نہ ہو، اُسے اللہ کا بیٹا مان لو۔

تو اگر رسول کو انہیں مناظرانہ طور پر چپ کروانا ہوتا تو صرف لاجواب کرنا ہوتا تو مجھے معلوم ہے کہ رسولؐ بائبل کو پیش کرتے۔ کہتے کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ شجرہ تمہارے ہاں موجود ہے۔ تو ان کے پاس کچھ جواب تھا؟ مگر یاد رکھئے کہ داعیِ حق کا کام نہیں ہے کہ وہ غیر کی باطل بات کو فائدہ اٹھانے کیلئے استعمال کرے۔ وہ خاموش رہتے مگر اصل حقیقت تو چھپی رہتی اور ایک رسولِ الٰہی کا دامن مجروح رہتا۔ لہٰذا ان کے جواب میں یہ نہیں کہا گیا۔ جو اصل بات تھی، وہ کہہ کر انہیں سمجھایا گیا۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ

ان کے باپ فقط نہیں ہے مگر آدم کی تو ماں بھی نہیں۔ پھر انہیں تم اللہ کا بیٹا کیوں نہیں مانتے؟ یہ تو اللہ کی قدرت ہے جسے چاہتا ہے، بغیر ماں باپ کے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بغیر باپ کے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عام نظامِ فطرت کے ماتحت پیدا کرتا ہے۔ یہ تو اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ اب وہ آیت اس وقت عرض نہیں کرتا ہے۔ وہ جملہ جو بھول نہیں گیا ہوں، وہ کہتا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پہلے زبانی کہا، پھر مختصر پمفلٹ بھی دیا جس میں انہوں نے اسے چھاپا ہے کہ یورپ کا ایک قومی کردار ہے کہ رومال گر گیا، آپ نے اٹھایا، انہوں نے کہا "تھینک یو"۔ شکریہ۔ بہت ارزاں ہے یہ جملہ۔ بس ذرا سی بات کر دیجئے، چاہے آپ کی نظر میں کوئی قیمت اس کی نہ ہو لیکن وہ فوراً کہیں گے "شکریہ"۔ رومال اٹھا دیں آپ تو تھینک یو کہنا ضروری سمجھیں اور قرآن نے اور اسلام نے ان کے نبی کے دامن کو اتنے بڑے الزام سے بچا دیا، انہوں نے کہا کہ چودہ سو برس سے عیسائیوں نے تھینک یو نہیں کہا۔

تو غرض یہ کہ جتنے دین ہیں دنیا میں، عیسائیت تو میں نے بتایا، یہودیت۔ یہودا جناب یعقوب کے ایک بیٹے تھے۔ ان کی طرف نسبت ہے یہودیت کی۔ اسرائیلی کہہ لیجئے جناب یعقوب کا لقب تھا۔ اس کی طرف نسبت ہے۔ جیسے قرآن میں بنی اسرائیل ہے۔ وہ اسرائیلی کہے جانے لگے اور ان کا کیا نام ہے؟ آخر کوئی بتائے کہ نام کیا ہے ان کا؟ شخصیت کی طرف نسبت ہے۔

ارے ہمارے ملک کا اکثریتی کیش جو ہے، حالانکہ حقیقت ہے، سیاست کی بات تو ہے نہیں، جو اس کے کہنے میں کوئی عذر کروں کہ قرآن مجید نے بت پرستی کو کوئی دین تسلیم نہیں کیا ہے۔ لیکن خیر دین کے طور پر مانا جا رہا ہے کہ اور پھر یہ کہ کسی حیثیت سے کتاب کا بھی دعویٰ ہے اور وہ کتاب، جو کتابیں ہم مانتے ہیں، وہ کب اصلی حالت میں ہیں جو ہم سمجھیں کہ وہ کتابیں نہیں ہیں کیونکہ ان میں ایسا ایسا ہے۔ ان کتابوں میں کیسا کیسا ہے، پھر بھی ہم مانتے ہیں کہ اصل میں تھی، بعد میں تبدیلی ہو گئی۔ تو پھر ہو سکتا ہے کہ جو نام لئے جاتے ہیں، وہ واقعی اللہ کی طرف سے رسول ہوں۔ جب ہمارے قرآن نے کہہ دیا کہ ہر ملک میں، ہر قوم میں ایک رہنما ہم نے بھیجا ہے تو

ہمیں نفی کا حق اپنے پیغمبرؐ سے پہلے نہیں ہے۔ اگر پیغمبرؐ کے بعد کوئی دعویٰ کرے تو دعویٰ ہی خود جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ ختم نبوت کا اعلان ہو چکا ہے لیکن اس سے پہلے کسی ملک والا، کسی پرانے کا نام لے تو ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہو۔ اس لئے کہ ایک مسلمان کی شان نہیں ہے کہ ان کا نام سن کر کوئی گستاخی کرے۔ بس کہہ دے گا کہ ہم پر نبوت ثابت نہیں۔ ہم پر رسالت ثابت نہیں ورنہ اس کے آگے ہم نفی نہیں کر سکتے۔

تو اب بہر حال اس کا مذہب جو اس دیس کا، اس دھرم کا جو نام ہے، ہندو، تو وہ بھی ایک ملک کی طرف نسبت رکھتا ہے یا کسی مکان کی طرف یا کسی مکین کی طرف اور جب شخصیت محدود ہو گئی تو دین لامحدود نہیں ہو سکتا۔ جو شخصیت سے تعلق نہ رکھے، وہ بلا تکلف کہنے کا حق رکھتا ہے کہ ہم اس دین کو نہیں مانتے جو اس سرزمین سے کوئی دلچسپی نہ رکھے۔ وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اس دین سے کوئی دلچسپی نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کا ہر دین کسی شخصیت سے منسوب ہے۔

ایک غلط فہمی دور کر دوں کہ اب ہمارے اسلام کو بھی غیروں نے اپنے دین کے ردیف قافیے پر لا کر دین محمدی کہنا شروع کیا جس سے دھوکے میں آ کر کچھ مغرب زدہ مسلمان بھی اس لفظ کو استعمال کرنے لگے۔ یہ غیروں کا طلسم تھا ورنہ رسولؐ نے کبھی اس دین کا بحیثیت دین محمدی تعارف نہیں کروایا یا آل رسولؐ نے کبھی اس دین کا بحیثیت دین محمدی تعارف نہیں کروایا۔ یہ دین کیا ہے؟ اسلام اور اسلام کس کیلئے؟ اللہ کیلئے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دین محدود شخصیت سے جس ذات کی طرف منسوب ہے جو میں نے کہا تھا کہ مرکز تقسیم حقوق لامحدود ذات ہونی چاہئے۔ تو یہ نام بھی اسی لامحدود ذات کی طرف نسبت رکھتا ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ کسی خطہ ارض میں اتنی وسعت سمجھئے کہ وہاں ایک پورا مجمع ہو جو صرف خدا کی مخلوق کا ہے اور ہزاروں مذاہب وملت پر تقسیم ہو اور اس کے سامنے میں کہوں کہ تم میں سے کونسی جماعت ہے جو اللہ کے قانون کو نہ مانے؟ تو اس مجمع میں سے کسی میں دم ہے، اگر اللہ کو مانتا ہے کہ وہ کہے کہ ہم نہیں مانتے کیونکہ ذات وہ پیش ہو گئی جو کسی ایک جماعت سے تعلق نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس کی طرف جس دین کی نسبت ہو، اُس سے انحراف صرف وہی کرے گا جو اس حقیقت سے واقف نہ ہو۔ میں نے ان الفاظ میں کہا تھا کہ کون ہے تم میں سے جو اس قانون کو نہ مانے؟ ارے چاہے عمل نہ کرتا ہو لیکن کہے گا کہ کوئی نہیں کہ ہم اس قانون کو نہیں مانتے۔

معلوم ہوا کہ اسلام کی جو حقیقت ہے، اس کی سرتابی کی ہمت کوئی خدا کا ماننے والا نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق اُس اللہ کے ساتھ ہے اور اسلام کے معنی ہی ہیں اللہ کے قانون کے سامنے سر جھکانا۔ اسلام کے لغت میں دو معنی ہیں، ایک سرنہادن بہ طاعت اور دوسرے سپردن، اطاعت کیلئے سر جھکانا اور اپنے کو سپرد کر دینا۔ اسلام خواہ اس معنی سے اصطلاح ہو، خواہ اُس معنی سے۔ اگر وہ معنی ہیں تو سر اطاعت جھکانا مکمل اطاعت اور اگر یہ معنی ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ سپرد کر دینے کے معنی ہیں کہ اپنی مرضی کچھ رہی نہیں۔ یہ خود اقرار اطاعت کا اور اونچا درجہ ہے کہ اپنی مرضی کچھ نہیں رہی، دوسرے کے حوالے ہو گئی۔ اسی لئے قرآن کہہ رہا ہے کہ اسلام دین کائنات:

لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''اس کیلئے اسلام لاتے ہیں جتنے آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں۔''

یعنی ہر مخلوق کا عالم اعلیٰ اور ہر مخلوق کا عالم اسفل۔ عالم بالا سے لے کر عالم پست تک سب اسلام لائے ہوئے ہیں اور اسلام کا مکمل اظہار عمل سے سجدہ ہے۔ ''یَسْجُدُ لِلّٰہِ''، اللہ کیلئے سجدہ ریز ہے ہر چیز جو آسمان ہیں اور جو زمین ہے۔ یہ کیا اطاعت ہے؟ اس کے قانون کی پابندی۔ دنیا کی ہر گاڑی لیٹ ہوتی ہے لیکن کبھی سورج اور چاند کی گاڑیوں کو دیکھا کہ لیٹ ہو جائیں۔ جس وقت انہیں جس نقطہ پر پہنچا ہے، اسی نقطہ پر جائیں گی۔ ستاروں کا طلوع و غروب کبھی اپنے نقطہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ یہ کیا ہے؟ یہ سب اطاعت کی زنجیروں میں مسخر ہیں۔ انسان بھی جب پیدا ہوتا ہے تو اسی کی اطاعت کرتا ہوا۔ ورنہ دنیا کی تمام طاقتیں صرف ہو جاتیں اور ایک بچے کو غذا حاصل کرنا نہ سکھاتیں۔ اسلئے کہ سکھایا جاتا ہے یا لفظوں میں یا اشاروں میں۔ لفظوں کے معنی وہی سمجھتا ہے جو موضوع ''لہٗ'' سے واقف ہو۔ یعنی یہ لفظ کس کیلئے ہے؟ اشاروں کو وہ سمجھتا ہے جو قرار داد سے واقف ہو۔

وہ بچہ جس نے مکتب وجود میں پہلی دفعہ قدم رکھا ہو، وہ نہ کسی لفظ کے معنی سے واقف، نہ کسی اشارہ سے واقف۔ تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی اور دنیا کی طاقتیں ختم ہو جاتیں مگر غذا حاصل کرنا اُسے نہ سکھا سکتی تھیں۔ اس کیلئے اس حاکم کی ضرورت تھی جو براہ راست دل و دماغ سے رابطہ قائم کرے۔ جس کیلئے کسی زبان کی ضرورت نہ ہو اور وہ اس کی طرف کا الہام ہے، اس کی طرف کا القا ہے، اس کی طرف کی تعلیم ہے جس کی بناء پر بچہ اپنی غذائے فطری حاصل کرتا ہے۔ تو یہ کیا ہے؟ یہ اس کے قانون پر چلنا ہے اور اسی لئے ابھی تک اس قانون پر چلنے میں کسی گھرانے، کسی جماعت، کسی گروہ کا دخل نہیں ہے۔ عیسائی کا بچہ ہو تو اسی طرح غذا حاصل کرے گا۔ یہودی کا بچہ ہو، ایک ہی طرح غذا حاصل کرے گا۔ مسلمان کا بچہ ہو تو اسی طرح غذا حاصل کرے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تفرقے بعد میں قائم ہوئے ہیں۔ شروع میں سب کا دین ایک ہے۔ اب آپ سمجھے۔ ''**کل مولودٍ یولد علی فطرۃ الاسلام**''، ہر مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پتھر اسی کی اطاعت کر رہے ہیں۔ درخت اسی کی اطاعت کر رہے ہیں، حیوان اسی کی اطاعت کر رہے ہیں۔ انسان بھی جس وقت پیدا ہوتا ہے، اسی کی اطاعت کرتا ہے۔ اب اگر اسے صرف پتھروں، درختوں اور حیوانوں ہی کے درجہ پر رکھنا ہو تو بس یہی اطاعت عمر بھر کی جاتی رہتی۔ یہ اطاعت ہے تسخیری یعنی اللہ کی قوتِ قاہرہ خود اطاعت کرواتی ہے۔ ایسی عمر بھر یہ اطاعت کرتا رہتا تو بس درختوں کے برابر ہوتا، پتھروں کے برابر ہوتا، اشرف المخلوقات نہ ہوتا۔ مگر پھر اس کے پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس کو تو پیدا ہی اس لئے کیا تھا کہ ایک مخلوق تو ایسی بھی ہو جو جہادِ نفس کے ساتھ اطاعت کرے۔

اب پھیلا کے عرض کرنے کا وقت نہیں ہے۔ پوری مجلس ہو چکی ہے وقت کے لحاظ سے، لہٰذا بس مجمل تشریح انشاء اللہ پھر کل۔ اب یہ خود سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا ہے۔ تو اب سوال اس کے خود اپنے اختیار کا ہوتا ہے کہ ہم ادھر چلیں یا اُدھر چلیں اور اس وقت ان چیزوں میں، اس شعبہ میں جس حد تک اختیار دیا ہے، اب اللہ مجبور نہیں کرتا۔ اب یہ اپنے اختیار سے راستہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی لے اب کہ صاحب! اطاعت کرتا ہوا آیا ہی ہے اور جس وقت آ کر میں نے کہا کہ اللہ نے دستِ جبر و قہر کھینچ لیا، جب بھی کہا یہ آزاد ہو گیا بالکل،

میں اس وقت کہ جب یہ کافر ہے، تب بھی جتنی اطاعت اسے لینا ہے، جبری طور پر وہ لے رہا ہے۔ دل کی دھڑکن اس کی تابع ہے، ہاتھ کی جنبش اس کی تابع ہے، نبض کی رفتار اس کی تابع ہے۔ ایک زبان اس کے اپنے قبضہ میں ہے چاہے حق کہے، چاہے باطل۔ ایک ہاتھ اپنے قبضہ میں ہے۔ جب تک اس نے اپنے قبضہ میں دے رکھا ہے، چاہے عدل کرے، چاہے ظلم۔ لیکن وہ شل کردے تو یہ حرکت دے لے۔ معلوم ہوا جس وقت انکار کر رہا ہے، جب بھی اطاعت کر رہا ہو، زبان انکار کر رہی ہے۔ اندرونِ جسم اس کے سب اجزاء اور طاقتیں اس کی اطاعت کر رہی ہیں۔ یعنی کافر زبانی ہے اور اندرونی حصہ جو ہے، وہ ہمہ تن اسلام ہے۔ پھر کوئی کہے کہ جب اسلام ایسا ہے تو پھر مطالبہ کس چیز کا ہے؟

بس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا، تشریح انشاء اللہ کل کروں گا۔ میں کہوں گا کہ یہ بس شرافتِ انسانی کا امتحان ہے کہ جس کی اطاعت جبراً کرنی ہی ہے، اُس کی اطاعت اختیار بھی کرلو ورنہ اطاعت اختیار نہ کروگے۔ اختیاراً اطاعت کروگے تو جس سے لینی ہے اطاعت، وہ تو لے ہی لی جائے گی اور جتنی مخالفت کروگے، اس کی سزا ملے گی اور جبری جتنی اطاعت کروگے، اس کی جزا نہیں ملے گی۔

اگر اپنے اختیار سے اطاعت کرلو تو پھر اس کا ثواب بھی ملے گا۔ لہٰذا اسی لئے علماء کہتے ہیں یعنی علمِ کلام میں ہے کہ یہ جو احکامِ شریعہ ہیں، یہ ہم پر مہربانی ہے تاکہ ہم مستحقِ جزاء بنیں اور جتنا اختیاری عمل ہے، وہ اگر غلط ہوا تو قہری کیفیات اگر اچھی نمودار ہوں تو کوئی فائدہ نہیں۔ اختیار طور پر ظلم کر رہا ہے اور مصائب کو دیکھ کر آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ ظلم اختیار ہے، یہ کیفیت قہری ہے۔ وہ اختیاری عمل ہے، یہ مصیبت کا اثر ہے اور اب آپ کے سامنے واقعات مجالس میں سے آہی گئے ہوں گے کہ کن محل پر ظالم روئے ہیں۔ مگر وہ رونا کیا قیمت رکھتا ہے جو ظلم سے باز نہ رکھے۔ ظلم کر رہے ہیں، مظلومہ کے زیور اُتار بھی رہا ہے اور رو بھی رہا ہے۔ کہا: کیوں روتے ہو؟ کہا: آپ کی مظلومی پر۔ کہا: زیور کیوں اتار رہے ہو؟ کہا: اس لئے کہ میں نہ اُتاروں گا تو کوئی اور اُتار لے گا۔ میں ہی فائدہ اُٹھالوں۔

تو بتایئے اس رونے کی کیا قیمت ہے؟ بس یاد رکھئے کہ وہ مصیبت تو ایسی ہے کہ ظالم روئے۔ اب اگر ہم مصیبت کے اثر سے روئے تو اس رونے کی کیا قیمت ہوگی۔ اگر ہمارے اختیار میں جو چیز ہے یعنی اطاعت، وہ نہ کریں۔ صاحب! یہ مستقل موضوع ہے۔ چند جملے کہہ رہا ہوں، حالانکہ آپ کیلئے ناخوشگوار ہیں یہ باتیں۔ آپ کیلئے تو بہت خوش آئند اس کے مخالف پہلو ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ ناز ہے ہمیں، بڑا کارنامہ محبت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت ہمارا کارنامہ ہے؟ جو قابلِ محبت ہے، اس کا حسن ہے جو متقاضیٔ محبت ہوتا ہے۔ محبت کرنے والے کا کوئی کارنامہ نہیں ہوتا۔ محبت کرنا، جو ہستیاں محبت کے قابل ہیں، ان سے ہم محبت کرتے ہیں تو احسان کیا ہے؟ بس محبت کرتے ہیں قابلِ محبت سے۔ تو اس شعبہ میں ظلم کے مرتکب نہیں ہیں۔ اس کے آگے یہ کارنامہ کیا ہے کہ ہم محبت کرتے ہیں؟

اسی طرح سے ہم ان کے مصائب پر روتے ہیں۔ مصائب ہیں ہی ایسے کہ ان پر پتھر روے، ہم روئے تو کیا کمال؟ بس اب یہ بابِ مصائب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم تو آنسوؤں سے روتے ہیں۔ کائنات نے تو شاعروں کے مجاز کو حقیقت بنادیا۔ خون کے آنسوؤں سے روئی محمد ابن طلحہ شافعی کی کتاب ''مطالب السئول'' ہے، علامہ سبط ابن جوزی کی کتاب ''تذکرۃ خواص الائمہ'' ہے اور علامہ ابن حجر مکی کی کتاب ''صواعق محرقہ'' ہے۔ ہر ایک لکھ رہا ہے کہ واقعہ کربلا کے چالیس دن تک جو کپڑا زیرِ آسمان پھیلایا جاتا تھا، اس پر خون کے

نشان ہو جاتے تھے کیونکہ آپ کا عشرہ اسی زمانے میں ہو رہا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس رعایت سے میں سمجھا، میں نے محسوس کیا کہ عشرہ کا دن ہی روزِ مصیبت اس کی طرف کا مقرر کردہ نہیں ہے بلکہ اربعین تک کا زمانہ عزا، یہ بھی اُدھر کا مقرر کردہ ہے کیونکہ چالیس دن پورے ہوتے ہیں بیس صفر کو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چہلم کی تاریخ بھی اُدھر سے مقرر ہوئی ہے۔ دنیا ہم سے کہتی ہے کہ تم روتے کیوں ہو؟ میں کہتا ہوں کہ آسمان سے جا کر پوچھو کہ کیوں روتا ہے؟ زمین سے پوچھو کہ کیوں روتی ہے؟

ایک عجیب سوال کرتے ہیں کہ رسول کا ماتم کیوں نہیں کرتے؟ حسین کا ماتم کیوں کرتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ خیر اگر ہم رسول کا ماتم نہیں کرتے تو ہم تھوڑی دیر کیلئے مان لیتے ہیں کہ یہ ہماری کوتاہی ہے۔ مگر آپ کو احساس ہے تو آپ ہی کیجئے ان کا ماتم۔ یہ ہمارے رونے کیلئے آپ کو رسولؐ یاد آتے ہیں۔ آپ رسول کا ماتم کیجئے، ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے ساتھ آ کر شریک ہوں گے۔ تقسیم عمل ہو جائے آپ رسول کا ماتم کیجئے، ہم فرزندِ رسول کا ماتم کریں۔

یونہی سہی۔ یہ آپ ماتمی ہونے سے گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ بھی غم کیجئے۔ ماتم کے معنی ایک خاص طرز نہیں ہے۔ جس طرز سے آپ چاہیں، ہمارے ہاں ہر جگہ عزاداری ایک ہی عنوان سے ہوتی ہے۔ وہ تو فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ نالہ پابندِ لے نہیں ہے۔ جس کی سمجھ میں جو آیا ہے، جذبہ ہے اظہارِ سوگواری کا۔

38

دین اسلام

اگر فطری غذا کی طرف بچہ رُخ کرے تو قانونِ عام کے ماتحت ہے اور اگر نانا کی زبان کو لے کر چوسنے لگے تو یہ قانونِ خاص کے ماتحت ہے۔

خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں تو اب جو جو اطاعتیں ہم کر رہے ہیں، وہ سب مشروط ہیں کہ اللہ کے احکام سے نہ ٹکرائیں۔

ادھر سے کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ ان کو بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا، ادھر سے کیوں نہیں سوچتے کہ یزید کو بیعت پر اتنا اصرار کیوں تھا؟

یزید سمجھتا تھا کہ جب تک حسینؑ نے بیعت نہیں کی، تب تک حکومت کے مقابلہ میں شریعت کا محاذ قائم ہے اور اگر یہ بیعت کرلیں تو ہمیشہ کیلئے حکومت کے راستہ سے شریعت ہٹ جائے گی۔

بیعت کے معنی ہیں جھک جانے کے، صاحب شریعت کا جھک جانا۔ تو میں کہتا ہوں اگر اللہ کی شریعت دوسرے کے سامنے جھک جائے تو اس کے معنی ہیں کہ اس کا قانون دنیا کے قانون کے سامنے جھک جائے۔ تو اب حسینؑ کے لباس میں فقط حسینؑ کی عزت نہیں ہے، اللہ کی عظمت کا سوال ہے۔

دین اسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ"

میں نے عرض کیا کہ اسلام کے معنی دو ہیں، سر جھکانا اطاعت کے ساتھ اور اپنے کو سپرد کر دینا۔ اب یہ دونوں باتیں کس ذات سے متعلق ہیں؟ وہ ذات خالق کائنات کی ہے۔ اس لئے قرآن میں جہاں جہاں اسلام کے ساتھ "مُتَعَلِّق" "" کا ذکر ہے "وَلَهُ أَسْلَمَ" "اللہ کیلئے اسلام لائے ہیں۔ بعض جگہ الفاظ قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے معنی زیادہ اس میں ملحوظ ہیں یعنی سپرد کر دینا۔ یہود و نصاریٰ کا مقولہ تھا:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں، چہیتے ہیں۔

اب قرآن مجید نے اُن کے اسی مقولے کو نقل کیا کہ یہود و نصاریٰ کا یہ قول ہے۔ پہلے تو طنزیہ انداز میں اُن کے اس تصور کی خامی کا اظہار کیا۔ ارشاد کیا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۔

"کہیے کہ پھر بھلا وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دینے لگا؟"

مطلب یہ کہ جس جماعت کو یہ تصور ہو جائے کہ ہمارا اللہ کے ساتھ کوئی خاص رشتہ ہے، وہ اصلاحِ عمل کا جذبہ ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد جو اصل بات تھی، وہ کہی:

اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۔

بلکہ تم بھی آدمی ہو اُن میں سے جو اُس نے پیدا کیے جیسے سب اس کی مخلوق ہیں، ویسے ہی تم بھی اُس کی مخلوق ہو۔ جیسے یہ ان کا مقولہ ہے اور قرآن مجید نے اس کو درج کر کے رد کیا، اسی طرح ایک مقولہ ان کا اور تھا:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۔

"وہ کہتے ہیں کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے اُس کے جو یہودی و نصاریٰ ہو"۔

یہ "یا" کہہ کر اُن سے کوئی نہیں کہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ وہی داخل ہوگا جو یہودی ہو۔ عیسائی کہتے ہیں کہ وہی داخل ہوگا جو عیسائی ہو کیونکہ قرآن نے ان دونوں کے مقولے کو سمو کر بیان کر دیا ہے۔ اس لئے پایا ہو گیا کہ ان دونوں کا نتیجہ یہ

ہے،وہ یا یہودی ہو یا نصرانی ہو۔

اُن کے قول کے مطابق یہودی ہو، ان کے قول کے مطابق نصرانی ہو۔ اب اہل اسلام غور کریں، کسی بھی فرقے کے ہوں کہ اس کے مقابل میں قرآن ہمارے مذاق کے مطابق اُسے کیا کہنا چاہئے تھا جو ہم یہ سمجھتے ہیں، یہ کہا جاتا کہ نہیں، سوا اس کے جو مسلمان ہو، کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ مگر صرف مسلمان کہا جاتا تو مسلمان لقب ہو جاتا جیسے مردم شماری کے رجسٹر میں مذہب کے خانے میں مسلمان لکھا جاتا ہے کہ اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے جو حقیقت پیش کی جا رہی ہے، اس میں مسلمین یہاں نہیں کہا جاتا ورنہ جماعتی نظام بن جائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ایک فرقے کا نام ہے۔ جیسے یہودی ہونا۔ بس ضمانت ہے چاہے کردار جیسا بھی ہو۔ جیسے نصرانی ہونا ضمانت ہے، چاہے کردار جیسا بھی ہو۔ ویسا ہی مسلمانوں کا تصور ہوگا کہ بس مسلمین جائیں گے۔ جواب ترکی بہ ترکی کا تقاضا تو یہی تھا لیکن قرآن نے اُس کے جواب میں کیا کہا ہے؟ قرآن نے یہ کہا کہ وہاں جو کہا تھا انہوں نے، کہ اللہ ہمارا رب ہے یعنی دنیا اسلام کی فراخی وحوصلگی کو دیکھے اور بات یہ ہے کہ تنگ نظری آتی کہاں سے جبکہ وہ پیغام اُس کا ہے جو سب کا ہے۔ وہ اگر کسی محدود ذات کا ہوتا تو وہاں تنگ نظر ہوتی۔ تو وہ وہاں کہہ رہے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے چہیتے ہیں۔ اس کے جواب میں مسلمانوں سے یہ کہلوا دیا جاتا۔ جواب ترکی بہ ترکی کا تقاضا یہ تھا کہ نہیں، ہم خاص اُس کے، ارے بیانہ کہتے، محبوب کہہ لیتے۔ ہم خاص اُس کے پیارے ہیں۔ یہ کہا جاتا مگر مسلمانوں کی زبان سے یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ وہ ہمارا ہی ہے بس۔ مسلمانوں کی زبان سے اللہ نے اعلان کروایا:

وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ

''وہ ہمارا بھی مالک ہے، تمہارا بھی مالک''۔

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ

''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں''۔

اور وہ جو وہ کہہ رہے تھے کہ سوائے یہود ونصاریٰ کے کوئی نہیں جائے گا۔ اُس کے جواب میں بھی جماعتی نام لے کر نہیں کہا جائے گا کہ نہیں، بس مسلمان جائیں گے۔ نہیں! اُس کے جواب میں کہا جا رہا ہے، اس کو میں نے پیش کرنے کیلئے منتخب کیا ہے۔ اب مسلمین نہیں کہا جاتا:

بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

کہاں ان کا وہ زور شور کہ سوائے یہودی ونصاریٰ کے کوئی نہیں جائے گا اور کہاں اس کتاب میں جو گویا مسلمانوں کی طرف سے وکالت کا ذمہ دار ہونا چاہئے۔ تو میں کہتا ہوں کہ بڑے دھیمے انداز میں کہا جا رہا ہے: بھئی یہ کیوں کہتے ہو کہ کوئی نہیں جائے گا۔ بھلا کوئی نہیں۔

مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ

اب یہاں وہ ''سرنہادن بطاعت'' بنتا ہی نہیں۔ اس لئے میں نے یہ آیت پیش کی۔ یہاں وہی معنی بنتے ہیں جو اپنی شخصیت کو اللہ کے سپرد کردے ''مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ'' اس سے پتہ یہ دے دیا خود مسلمانوں کو کہ مسلم کہنے سے مسلم نہیں ہوتا، صفت کے ہونے سے مسلم ہوتا ہے۔ جو اپنی شخصیت کو اللہ کے سپرد کردے، درآنحالیکہ حسن عمل بھی رکھتا ہو، فقط دعویٰ سے کام نہیں چلتا۔ فقط نامِ اسلام ہو، اس میں ایمان سے کام نہیں چلتا، اس کے ساتھ حسن عمل رکھتا ہو تو پھر بھی آنکھ بند کر کے نہیں کہا جارہا ہے کہ بس اُس کیلئے جنت ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اس کیلئے جو اس کا اجر یعنی جتنی محبت کی ہو، جتنا کام کیا ہو، جتنا حسن عمل کیا ہو، اس کیلئے اس کا اجر ہے جو ہوتا جو اُس کا اللہ کے یہاں۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

''تو نہ اُن کیلئے کوئی خوف ہوگا، نہ حزن و ملال ہوگا''۔

تو اب آپ نے دیکھا کہ اسلام کے یہاں وہی معنی ہیں ''سپرد کرنا''۔ اب یہ چیز جو ہے اصل دین اسلام اور اسلام ''سرنہادن بطاعت''، ''اپنے کو سپرد کردینا''۔ اور میں نے کہا زیادہ یہی پہلو ملحوظ ہے مگر کس کے؟ اللہ کے۔

اور میں نے یہ کہا کہ انسان جب سے پیدا ہوا، یہ صفات لئے ہوئے آیا۔ اس کی اطاعت کرتا ہوا آیا۔ یہ جو اپنی ضروریاتِ حیات پوری کررہا ہے، اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ میری ضرورت حیات ہیں۔ یہ تو بس کسی مالک کی اطاعت کررہا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد ضروریاتِ حیات پوری کیجئے مگر اس لئے نہیں کہ میری ضروریاتِ حیات ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی مرضی ہے۔ کھانا بھی کھایئے تو یہ سمجھ کر مجھے حکم ہے۔ پانی بھی پیجئے تو یہ سمجھ کر مجھے حکم ہے۔ تمام نظام زندگی کے کام کیجئے مگر یہ سمجھ کر کہ اس کا حکم ہے۔

تو یہ یاد رکھئے کہ دنیا کا ہر کام عبادت ہوجائے گا۔ تو جنابِ والا! یہ دونوں صورتیں تو لئے ہوئے انسان پیدا ہوتا ہے مگر بس فرق اتنا ہے کہ اس وقت یہ دونوں صفات جبر قدرت سے، اللہ کے ارادۂ تکمیل ہی کے ماتحت ہیں۔ تکمیل کیا مطلب؟ کہ وہ ''کُن''، ''ولا''، ''ہوجا''، ہوگیا۔ یعنی وہ اُس کے ارادے کا ظہور، ورنہ کیا وہ لفظ ''کُن'' بولتا ہے، یہ تعلق ارادہ کی ایک لفظی تعبیر ہے اور اسی لئے یہ لفظ ''کُن'' ہے جو ایک منزل پر آکر اتنا لمبا جملہ بنا:

يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

تو کیا جتنی دیر میں میں نے کہا، کیا اتنی دیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا۔ یہ وہی حکم ''کُن'' ہے جو یہاں، کیونکہ متعلق اس کا یہ ہے کہ آگ نقطۂ اعتدال برودت پر آئے یعنی سردی بھی اتنی نہ ہو جو حیاتِ انسانی کیلئے خطرناک ہے، تو جب وہ الفاظ کے قالب میں آیا تو اتنا بڑا جملہ بنایا کہ:

يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

تو اب یہ اللہ کا حکم جو ہوتا ہے، تو پھر کائنات کی ہر شے اس کی اطاعت کرتی ہے۔ جو اطاعتِ عمومی ہیں، وہ روزمرہ ہو رہی ہیں اور جو خصوصی حکم ہو جاتا ہے، تو وہ خصوصی ہو جاتا ہے۔ یہ آگ اپنی فطرت دکھاتی ہے جلانے کی۔ یہ بھی اطاعت ہے۔ یہ اس کے حکمِ عام کی تعمیل ہے اور ایک موقع پر نہیں جلایا، یہ اُس کے حکمِ خاص کی تعمیل ہے۔ دوا جو اثر کر رہی ہے، وہ بھی اُس کے حکم کی اطاعت کرتی ہوئی اور جو بے اثر ہو جاتی ہے، وہ بھی اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہوئی۔ یہ معنی ہیں اس کے کہ:

"لَا یَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ"

"کوئی ذرہ حرکت نہیں کرتا مگر اللہ کے ارادے سے"۔

دنیا نے لا کر اس مقولے کو منطبق کیا وہاں جہاں انسان مجبور بننا چاہے۔ بس یہ جس بات میں اپنا مطلب نکلے، اگر جبر ثابت ہو جائے تو پھر کسی کو برا کہنے کی ضرورت نہ ہو۔ یہ بڑا خطرناک ہے اختیار کہ یہاں بہت سی شخصیات معرضِ بحث میں آجاتی ہیں اور اگر جبر کا عقیدہ عام ہو جائے تو ہر شخص سمجھے، وہ بیچارہ کیا کرے؟ وہ تو اللہ نے جو کروایا، وہ اُس نے کیا۔

تو اس کیلئے روایات گھڑی کارخانوں میں۔ عقائد بھی ڈھلے ہیں کارخانوں میں۔ عوام کے ذہنوں کو معطل کرنے کیلئے کہ غور کرنا چھوڑ دیں کہ یہ اچھا ہے یا برا ہے۔ جب سب اللہ کرتا ہے تو سوچنا کیا کہ کون اچھا کر رہا ہے، کون برا کر رہا ہے اور فعل اللہ کے قرار دیئے اور اللہ کے فعل میں یہ اصول بنا نا کہ نہ اچھا ہوتا ہے، نہ برا ہوتا ہے۔ اللہ کرتا ہے، لہٰذا اچھا ہی ہے، برے کا سوال ہی نہیں۔ تو پورا قلعہ علم کلام کا تعمیر ہو گیا۔

نظامِ سیاست کے اوپر تو حضور والا! "ولا تحرک ذرہ" بالکل صحیح، وہ ہوا سے پتہ ٹوٹ کر گرا تو ہوا نے اطاعت کس کی کی؟ اُس کی۔ اگر کسی وقت ہوا چلتی رہے اور پتہ نہ گرے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ پتے کو کوئی خاص حکم اب آیا ہے تو اس حکمِ خصوصی کی پیروی کر رہا ہے۔ یاد رکھئے کہ یہی احکام خاص اللہ کے جب کچھ انبیاء و اولیاء کے ذریعے سے ہو جاتے ہیں تو اُن کا معجزہ قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ فعل و عمل ایک نبی کے ہاتھ پر اُس کے دعوے کی تصدیق کیلئے ہوا، اس لئے معجزہ اسی رسول کا ہے مگر فعل اللہ کا ہے۔ یعنی اللہ نے اس کے ہاتھ پر اس معجزے کو ظاہر کیا۔ تو معجزے کی نسبت اسی کی طرف درست ہے جس کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ مگر فعل وہ اللہ کا ماننا پڑے گا۔ ہاں! اس کے اذن سے اس کا فعل بھی مانا جاتا ہے۔ ورنہ قرآن میں یہ ہوتا عیسیٰؑ کیلئے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہی کہہ دیا ہوتا کہ تمہارے ہاتھ سے مردوں کو زندہ کرتا تھا۔ مگر اُسے اندازِ تکلم ہمیں طرح طرح کے سکھانا بھی تھے کہ وہ بھی کہہ سکتے ہو، یہ بھی کہہ سکتے ہو۔ تم مردوں کو زندہ کرتے تھے میرے حکم سے۔

بس یاد رکھئے یہ باذن اللہ۔ ذہن میں رہے کہ اللہ کے اذن سے ہے۔ تو جس فعل کی نسبت دیجئے، وہ شرک نہیں ہوگا کیونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے، کم سے کم دو برس سے ایک گروہ ہے کہ جس کو ہر چیز میں شرک نظر آتا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ یہ نہ کرو، نہیں تو شرک ہو جائے گا، یہ نہ کرو نہیں تو شرک ہو جائے گا۔ تو اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ ہم نہیں کریں گے تو شرک کیونکر ہوگا؟

تو حضور والا! اللہ کا تصور ذہن میں ہو، اس کے حکم کی اطاعت کائنات کی ہر شے کر رہی ہے۔ یہ انسان بھی پیدا ہوتا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرتا ہوا اور ابھی جو میں نے کہا کہ کبھی قانونِ عام کی اطاعت ہوتی ہے، کبھی قانونِ خاص کی۔ وہ اس منزل پر بھی میں دکھا دوں کہ ہر بچہ جب اُسے فطری غذا ملے تو وہ رُخ کر دے گا۔ یہ رُخ جو کیا تو یہ قانونِ عام کے ماتحت ہے اور موسیٰ جو رُخ نہیں کر رہے ہیں، وہ قانون خاص کے ماتحت ہے اور خالق نے کہا ہے کہ اپنے قانون کے اجر کو:

حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ

ارے وہ رُخ کرتے کیونکر، ہم نے ان پر تمام دودھ پلانے والیوں کا دودھ حرام کر دیا تھا بہت پہلے۔

اور ابھی تو میں نے دُور کی مثال دی اور بحمد اللہ دُور کی مثال سے بھی آپ محظوظ ہوئے۔ مگر اب میں قریب کی مثال بھی دے دوں کہ اگر فطری غذا کی طرف بچہ رُخ کرے تو قانونِ عام کے ماتحت ہے اور اگر نانا کی زبان کو لے کر منہ میں چوسنے لگے تو قانونِ خاص کے ماتحت ہے۔

تو حضور! جیسے آیاتِ قرآن مجید متشابہ ہیں، اس میں بہت سے معنی ہیں۔ کہیں تو خود سمجھ میں نہیں آتے اور معنی پیدا ہی نہیں ہوتے۔ کہیں سوچنے پر کچھ معنی کسی دوسرے کے سوچنے پر کچھ اور معنی۔ اسی طرح بعض آیات میں تیس اقوال، چالیس اقوال مفسرین کے ہو جاتے ہیں۔ تو وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ اسی طرح احادیث میں بھی بعض متشابہات ہوتی ہیں کہ اس میں بھی سوچنے والے طرح طرح کے معنی پیدا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث جو ہے کہ:

"كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ"۔

"ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے"۔

اس کی بھی تشریح ہر ایک، ایک ہی طرح نہیں کرتا اور لوگ سوالات کرتے ہیں کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ تو اس میں بھی ممکن ہے کوئی کچھ جواب دے، کوئی کچھ دے۔ جو جس کے ذہن میں جس کا مفہوم۔ میرے ذہن میں جو مفہوم اس کا ہے، وہ اجمالاً عرض کر چکا یعنی اسلام وہی مطالبہ کرتا ہے جو از روئے فطرت ہے۔ فطرت کے ماورا کوئی مطالبہ اسلام کا نہیں ہے۔ وہ کام جو انسان کرتا ہوا دنیا میں آتا ہی ہے، اُسی کا پھر انسان سے اسلام کا مطالبہ کرتا ہے۔ کوئی بھی اپنی اطاعت کا مطالبہ کرے، وہ غیر فطری ہوگا، اس لئے کہ فطرت کے اوپر ایک بار ہے، کوئی حاکم کہے کہ میری اطاعت کرو، فطرت کے ماوراء مطالبہ ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا، آ کے کہتا کوئی کہ اطاعت کرو۔ دیکھوں کہ یہ اطاعت کرتا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے اوپر الگ سے ایک بوجھ ہے جو رکھا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہر غیر خدا کی اطاعت غیر فطری ہے کیونکہ پیدائش کے بعد سے ان میں سے کوئی قادر نہیں تھا اس سے اطاعت کروانے پر۔ اس وقت اس پر کوئی حکم نہیں چلا سکتا تھا۔ اب جو بعد میں آیا ہے حکم چلانے تو یہ اس کی فطرت سے ماوراء ایک بوجھ ہے جو اس پر لادا ہے۔ لہٰذا غیر فطری۔

اسلام کسی اور کی اطاعت نہیں کرواتا سوائے اس کے۔ ہاں! ذہن میں آ سکتا ہے کہ اسلام میں یہ جو بعض اطاعتوں کا ذکر ہے،

میں کہتا ہوں کہ جس کی بھی اطاعت ہے، وہ اس کے حکم سے ہے۔ لہٰذا اس کی اطاعت ہے اور اسی لئے کوئی بھی اطاعت ہو، جو اُس کی اطاعت سے ٹکرا جائے تو اطاعت حرام۔ ہے تو وہی حکم دینے والا مگر اب وہ نہیں اطاعت کر رہا ہے۔ اگر قانون کا پابند ہے، اگر واقعی عملاً مسلم ہے تو اب نہیں اطاعت کر رہا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس وقت جو اطاعت کر رہا تھا، یہ سمجھ رہا تھا کہ میری اطاعت کر رہا ہے مگر اصل میں ایک اور بالادست طاقت کی اطاعت کر رہا تھا کیونکہ اس کا حکم سے ٹکرا نہیں رہا تھا۔ اب جو ٹکرا گیا اور اس کے حکم کی مرضی کچھ اور ہو گئی تو پتہ چل گیا کہ یہ ظاہر میں اس کو حاکم مان رہا تھا، اصل میں حاکم کسی اور کو مان رہا تھا۔

تو جو اطاعت ہے، ماں باپ کی اطاعت، اولاد پر بے شک واجب ہے۔ ارے بڑی عظیم الشان، قرآن میں خدا نے ماں باپ کا نام اپنے نام کے ساتھ لیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ

تمہارے پروردگار کا قطعی فیصلہ ہے کہ عبادت تو سوائے اس کے کسی اور کی نہ کرو مگر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔

مطلب کیا ہوا؟ آئمہ معصومینؑ نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ والدین کی اہمیت اتنی ہے کہ اپنے نام کے بعد بلا فاصلہ ماں باپ کا نام لیا ہے۔ یعنی بس میرا حق یاد کرو اور پھر کوئی حق ہے، بلا فصل، تو وہ والدین کا۔

تو جناب! والدین کی اطاعت میں بڑا زور ہے۔ اتنی طاقت ہے کہ اللہ کے کسی حکم غیر الزامی سے اگر کوئی متصادم ہو تو اطاعت واجب رہے گی یعنی کسی مستحب کو منع کر دیں تو حرام ہو جائے، کسی مکروہ کا حکم کریں تو واجب ہو جائے۔ ارے کوئی بڑے سے بڑا کارِ خیر، فرض کیجئے کسی وقت نمازِ جماعت کیلئے آپ مسجد میں جانا چاہتے ہوں اور کسی وجہ سے ماں یا باپ حکم دے کر منع کر دے تو جانا حرام ہو جائے گا، نماز باطل ہو جائے گی۔ گھر میں ہی پڑھ لیجئے، کوئی وجہ ہی ہوگی جس کی وجہ سے ماں باپ یہ حکم دیں گے تو تعمیل واجب ہو جائے گی اور اسی طرح بڑے سے بڑا کوئی عملِ صالح، نیک مستحب کاموں میں سے لیجئے تو اگر منع کر دیں تو حرام ہو جائے گا۔ مگر بس اتنی طاقت ہے۔ لیکن اگر کسی واجب کے ترک کو کہیں تو اب اطاعت حرام۔ مگر بعض بخیالِ خود بڑے چاہنے والے ماں باپ ہیں کہ بچہ ہو گیا ہے بالغ اور شرعاً پندرہ برس کی عمر میں لڑکا بالغ ہو جاتا ہے، نو برس میں لڑکی بالغ ہو جاتی ہے۔ مگر ہمارے عرف عام میں تو بہت دن بچے رہتے ہیں۔ سولہ برس کا لڑکا بچے کے سوا کہلاتا ہے کچھ اور؟ کونسی دس برس کی لڑکی بچی کے سوا کچھ اور کہلاتی ہے؟ بس جب شرعاً وہ بالغ ہو گیا، اب اس پر قلم تکلیفِ شرعی رواں ہو گیا۔ کاتبانِ اعمال اب اعمال لکھنے لگے۔ اب آیا ماہِ رمضان۔ ماں باپ بنظرِ محبت فرماتے ہیں: بیٹا! تم روزہ نہ رکھو۔ ارے تم؟ تمہاری بساط کیا ہے؟ یہ عام باتیں ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں۔ اپنے نزدیک محبت کر رہے ہیں بچے کو۔

فرض کیجئے، اتفاق سے، اُسے شرعی مسئلہ معلوم ہو گیا، وہ کہتا ہے کہ مجھ پر واجب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں، تم ابھی بچے ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محبت کر رہے ہیں۔ وہ درحقیقت عداوت ہے کیونکہ روزِ قیامت سوال تو اس سے کیا جائے گا: تم نے روزہ کیوں نہیں رکھا؟ اس دن یہ ماں باپ شفاعت کیلئے نہیں جا سکیں گے۔ خود ان کو سزا ملے گی کہ تم نے کیوں روکا تھا ایک عملِ خیر سے۔ تو یہاں حکم عدو اللہ کی ہے جس سے ٹکرا رہی ہے ان کی ہدایت۔ اب یہاں حکم کی تعمیل حرام ہے۔

دوسرے شعبوں میں بھی اس کی مثالیں ہوا کرتی ہیں کہ جناب خوش دامن صاحبہ بہو سے خفا ہوئیں۔ یہ تو نہیں کہتیں صاحبزادے سے کہ طلاق دے دو کیونکہ طلاق ہے شرافتِ خاندانی کے خلاف، مگر یہ حکم چلاتی ہیں کہ خبردار! اس کے پاس نہیں جانا۔ اب حکم کی تعمیل حرام ہے کیونکہ بیوی ہوتے ہوئے اس کے حقوق اللہ کی طرف سے عائد کئے ہوئے ہیں۔ اب یہ والدہ صاحبہ اس کے حکم کے مقابلہ میں اپنا حکم چلانا چاہتی ہیں۔ تو غرض اصول یہ ہوگا کہ:

''خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں''۔

تو اب جو جو اطاعتیں ہم کر رہے ہیں، وہ سب مشروط ہیں کہ اللہ کے احکام سے نہ ٹکرائیں۔ اب اگر قرآن مجید نے کسی کی اطاعت کا غیر مشروط طور پر حکم دیا ہو تو ماننا پڑے گا کہ اس کا حکم خدا کے حکم سے نہیں ٹکراتا۔ تو اب قرآن میں دیکھ لیجئے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

''اللہ کی اطاعت کرو''۔

آیت ختم ہوگئی؟ جی نہیں، اور ''أَطِيعُوا الرَّسُولَ'' رسول کی اطاعت کرو۔ کوئی قید ہے اس میں؟ جیسے اللہ کی اطاعت کا حکم مطلق، ویسے ہی رسولؐ کی اطاعت کا حکم مطلق۔ کہا جا رہا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کرو۔ مطلق اطاعت کا حکم ہے۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسولؐ کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا۔ ہر مکتبِ خیال کے تصورات بھی کچھ نہ کچھ آپ کے ذہن میں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا، نہ بھولے نہ چوکے۔ اب اگر کوئی حافظِ قرآن ہو تو اُسے تو زبانی یاد ہوگا اور اگر کوئی حافظِ قرآن نہیں، ناظرہ خواں ہو تو وہ قرآن سے نکال سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بحمد اللہ مجالس ہیں۔

یاد رکھئے کہ مجالس لاشعوری طور پر درسِ قرآن بھی ہیں اور حدیث بھی ہیں۔ یہ سب مفادات اس سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ضمناً بشرطیکہ صحیح کام لیا جائے مجالس سے۔ تو جناب والا! بہر حال یہ آیت تو آتی ہے سامنے کہ اگر اب اللہ اور رسولؐ کے ساتھ بھی کوئی نام لیا گیا ہے؟ ارے کسی ایک جگہ لیا گیا ہو، اس لئے کہ قرآن مجید کے حکم میں یہ قید نہیں ہے کہ چار دفعہ ہو تو تعمیل واجب۔ کسی ایک جگہ بھی اگر نام لیا گیا ہے اور اب جسے یاد نہ ہو، وہ یاد کرے اور جسے یاد ہے، وہ دہرائے کہ:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی جو تم سے ہے''۔

اب اللہ ہے، رسولؐ ہے اور اولی الامر ہے۔ مستقل طور پر یہ آیت پڑھنا مقصود نہیں۔ انشاء اللہ کبھی یہ آیت مستقل سرنامہ کلام ہوگی تو اب اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اولی الامر کون ہیں۔ ہاں! ترجمہ کر دوں جو میرے نزدیک صحیح ہے۔ خالق نے ''آمرین'' نہیں کہا ہے اتنی عربی میں جانتا ہوں۔ اگر کہا جاتا کہ:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

"اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو حکمران ہوں، جو حکم چلانے والے ہوں"۔

جو چاہے ترجمہ کر لیجئے۔ ہمارے ہندوستان میں آجکل جو اُردو ہے، اس کے لحاظ سے جو اپنا حکم لاگو کریں، تو جناب یہ نہیں ہے، آمرین نہیں کہا جا رہا۔ حالانکہ وہ لفظ مختصر تھا۔ بلاغتِ قرآنی بلا وجہ الفاظ کا اضافہ نہیں کرتی۔ اگر اس لفظ سے مطلب حاصل ہو جاتا تو اضافے کی کیا ضرورت تھی؟ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی۔

اب جو میں ترجمہ کروں، اُس کام میں ذمہ دار ہوں اور ان لوگوں کی جو حکم چلانے کے حقدار ہیں۔ کوئی "مِنْكُمْ" کا لفظ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ کہا جا رہا ہے کہ اولی الامر جو تم ہی میں سے ہیں یعنی ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قرآن ہے۔ آپ کو جانے نہیں دے گا۔ یہ قرآن ہے، کوئی اور کلام نہیں ہے۔ ارے یہی "مِنْكُمْ" اور "مِنْهُمْ" ضمیروں کا اختلاف ہے۔ ترتیب تو ایک ہی ہے۔ ارے یہی "منھم" تو رسولؐ کے لئے کہا گیا ہے۔

بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ

"امین رسول بھیجا انہی میں سے"۔

ولی الامر کو کہا جا رہا ہے کہ ولی الامر جو تم ہی میں سے ہیں۔ رسول تم ہی میں سے تھے۔ مگر ان کے منتخب کردہ نہیں تھے۔ ولی الامر بھی انہی میں سے ہیں۔ مگر تمہارے منتخب کردہ نہیں ہیں۔ بس مختصر یہ کہ جس کا منتخب کردہ رسولؐ ہے، اسی کے منتخب کردہ یہ ہیں۔

اب نقطہ حقیقت واضح تو ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ آیت جب مستقل عنوانِ کلام ہو تو اس میں تفصیلات آسکتی ہیں بہت زیادہ۔ بس اب ایک اُردو زبان میں جملہ کہہ دوں کہ اللہ کی اطاعت غیر مشروط، رسولؐ کی اطاعت غیر مشروط اور میں نے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ کہ رسول کا حکم اللہ کے حکم سے کبھی نہیں ٹکراتا۔ اب میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ اولی الامر کون ہیں؟ کون ہیں نہیں، ایک منفی تصور تو مسلماً پیش کیے جاتا ہوں۔ اولی الامر کوئی بھی ہوں، مگر وہ نہیں ہیں جن کے احکام کو ہم نے دیکھا ہے۔ خدا کے احکام سے ٹکراتے ہوں۔

تو معلوم ہوا کہ غیر مشروط اطاعت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ سوائے ایسے شخص کے جس کے حکم، حکمِ خدا اور رسولؐ سے کبھی نہ ٹکرائے۔ یاد رکھئے کہ اسی کو سمیٹ کر ہم اصطلاحی لفظ میں جب کہتے ہیں کہ تو یہ ہے کہ معصوم ہو۔ اب ایک پہلو پر غور کیجئے۔ ماشاء اللہ قانون دان حضرات بھی ہوں گے اور اتنا قانون ہر ایک اپنی عقل سے سمجھ سکتا ہے کہ حضور! جو چیز اپنی جگہ غلط ہو تو کیا اُس کا معاہدہ صحیح ہوگا؟ جب کوئی چیز غلط ہے تو اُس کا معاہدہ بھی غلط ہوگا۔ چوری غلط ہے، چند آدمی مل کر معاہدہ کریں چوری کا تو وہ معاہدہ بھی غلط ہوگا۔ تو جو چیز خود غلط ہے، اس کا عہد بھی غلط ہے۔ اب میں نے کہا کہ غیر اللہ کی اطاعت، کسی دوسرے کی غلط، سوائے اس کے کہ جس کی اطاعت عین مطابق حکمِ خدا ہو۔ جب حکم کبھی نہیں ٹکراتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت۔

تو بس ایسے کی اطاعت یعنی معصوم کی اطاعت صرف غیر مشروط طریقے پر ہو سکتی ہے اور کسی کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ غلط ہے، جب غلط ہے تو عہد اس کا کہ میں اطاعت کروں گا، یہ عہد بھی غلط اور یاد رکھئے کہ اسی عہد کا نام ہے بیعت۔ تو جس طرح اطاعتِ غیر خدا کسی کی نہیں ہو سکتی، ویسے ہی بیعت بھی کسی ایسے کی نہیں ہو سکتی جس کا حکم اللہ کے احکام سے الگ ہو اور اسی لئے میں جو قرآن مجید کی آیت کی

طرف توجہ دلاؤں گا کہ یہ تاریخ حقیقت ہے کہ مسلمان رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید میں بھی ذکر ہے اور تاریخ میں بھی مسلّم ہے۔

ہاں! یہاں ایک چیز جو ہوائے زمانہ کے کتنی ہی خلاف ہو، وہ میں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اب ذہن میں بھی توجہ ہوگی کہ حضور! مرد بھی بیعت کرتے تھے، عورتیں بھی بیعت کرتی تھیں۔ مگر طریقہ دونوں کی بیعت کا مختلف تھا۔ حالانکہ پیغمبر خدا معصوم ہیں۔ ہوا و ہوس کا غیر محل پر صرف ہونا غیر ممکن لیکن پھر بھی مردوں سے اطاعت کا طریقہ یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھیں۔ لیکن عورتوں کی بیعت کیلئے گوشۂ عبا کو بڑھا دیا جاتا تھا تاکہ جسم رسولؐ سے کسی نامحرم کا جسم مس نہ ہو۔

اب احکام اسلام یہی ہیں۔ ترقی یافتہ دور کے تقاضے جو بھی ہوں، گوشۂ عبا بڑھا دیا جاتا تھا کیونکہ گوشۂ عبا کو تھام لیں۔ بس یہی اُن کی بیعت کی علامت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عمل جس مقصد کیلئے تھا، وقار خواتین کے تحفظ کیلئے۔ اس کے ساتھ ضمناً میں یہ کہتا ہوں کہ ان کا طریق بیعت زیادہ شاندار ہو گیا یعنی تمسک کے معنی ہیں دامن تھامنا۔ تو یہ بات تو ضمناً یاد آ گئی تھی۔ بہر حال بیعت تھی۔ رسولؐ سے مسلمان کرتے تھے۔ مگر قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ

''یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، یہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے''۔

آخر اس کہنے کی ضرورت کیا ہوئی؟ یہ صرف مسلمان کے دماغ سے کھرچ کر نکالنا تھا غیر اللہ کی بیعت کا کہ رسولؐ کی بھی بیعت کر دیں، یہ سمجھ کر کہ اللہ کی بیعت ہے۔ اور اب جب یہ بات غلط ہے تو کسی بھی معصوم کیلئے یہ تصور کہ وہ کسی غیر کی بیعت کرے گا، یہ غلط ہے۔

چنانچہ سب مسلمانوں سے جو ہستی بحمد للہ سب کے نزدیک معصوم ہے، ارے وہ تفصیلات میں فرق ہو، وہ اس وقت خارج از بحث ہے مگر آنکھ بند کر کے کسی مسلمان سے پوچھیے، کہیں گے ہاں۔ رسول اللہ نے کبھی کسی کی بیعت کی تو ہر مسلمان کہے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک مجمع ایسا ہو ہمارے وہی بیرون موچی دروازہ والے حسینؑ ڈے کی طرح کا۔ تمام فرق اسلامیہ کا اجتماع ہو اور اس میں میں پوچھوں کہ رسولؐ نے کسی کی بیعت کی تو پورا مجمع چیخ اُٹھے گا کہ نہیں نہیں۔ کبھی رسولؐ نے بیعت نہیں کی۔ میں کہوں گا تقریر کرتا ہوا کہ پھر سوچ لیجئے، غور کر لیجئے۔ زندگی کے کسی دور میں کبھی کسی دوسرے کی بیعت کی؟ اب زیادہ زور سے کہیں گے، غصہ آئے گا سب کو۔ کہیں گے صاحب! کہہ تو دیا بیعت لیتے تھے، بیعت کرتے نہیں تھے۔ نہیں! عمر میں کبھی کسی سے بیعت نہیں کی۔

اب میں مجمع سے کہوں گا کہ پیغمبرؐ نے حدیبیہ میں صلح فرمائی تھی مشرکین سے۔ اب وہ مجمع چونک کر کہے گا، ہاں! صلح تو کی تھی۔ میں کہوں گا کہ صاحبو! آپ سب نے میرے پہلے سوال پر کہہ دیا کہ رسولؐ نے کبھی بیعت نہیں کی اور اب آپ سب مل کر کہہ رہے ہیں میرے یاد دلوانے پر کہ رسولؐ نے صلح فرمائی تھی۔ تو اب مان لیجئے کہ بیعت اور ہوتی ہے، صلح اور ہوتی ہے۔ میں فرق بتادوں، یہ بھی مستقل موضوع ہے۔ کبھی انشاء اللہ ''صلح اور بیعت''۔ تو میں فرق بتادوں کہ بیعت تو وہی غیر مشروط اطاعت کا عہد۔ ارے وہ کسی خصوصی طور پر قید کے ساتھ بیعت ہو جیسے وہاں خرید و فروخت میں بھی، وہ بیع اسی بیعت سے ہے یعنی ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ہم تمہیں دیتے ہیں۔

وہاں بھی ہاتھ پر ہاتھ مارا جاتا تھا عرب میں۔ اسی لئے فقہ کی کتابوں میں صفق کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب تالی بجانا ہے کیونکہ اس میں بھی ہاتھ پر ہاتھ مارا جاتا تھا۔ آجکل بھی ہمارے عوام میں ہے "ہاتھ لاؤ"۔

یہ تو ہے بیعت اور صلح ایک درمیانی راستہ دو فریق میں ایسا پیدا ہونا جس میں تصادم ختم ہو جائے اور کسی کے اصول کو صدمہ نہ پہنچے۔ اس کا نام صلح ہے۔ اس کیلئے عمومی حکم قرآن میں دیا ہے رسول کو:

"اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ"۔

"جب بھی یہ جھکیں صلح کی طرف تو فوراً آپ بھی جھک جائیے"۔

اور توکل علی اللہ۔ پھر اس سے بحث نہ رکھئے کہ یہ عمل کریں گے یا نہیں۔ اس کو اللہ کے سپرد رکھئے تو رسولؐ اللہ نے صلح فرمائی۔ حضرت امام حسنؑ نے بھی صلح فرمائی۔ امام حسینؑ کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ یہ تو بنی اُمیہ کا پروپیگنڈہ تھا کہ بھائیوں کے مزاج ہی میں فرق ہے۔ وہ حسن صلح پسند ہیں اور یہ حسین شروع ہی سے جنگ پسند ہیں۔ یہ تو دشمنوں کا پروپیگنڈہ تھا مگر حقیقت کے لحاظ سے 60ھ میں حسن مجتبیٰ ہوتے تو وہ یہی کرتے جو حضرت امام حسینؑ نے کیا۔ اگر 40ھ میں حسین برسر اقتدار امامت ہوتے تو وہ وہی کرتے جو حسنؑ مجتبیٰ نے کیا اور 60ھ میں وہ ہوتے تو وہ یہی کرتے جو حضرت امام حسینؑ نے کیا۔ ذات کا اختلاف کیسا؟ وقت کا اختلاف ہے، فرض کا اختلاف ہے۔ اب بیعت بھی کس سے؟ یزید ایسے شخص سے۔ ان کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔

اب دنیا والے آج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ارے یہ سب کچھ برداشت کیا اور بیعت نہیں کی۔ یہ بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا؟ تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ آپ ادھر سے سوچتے ہیں کہ انؑ کو بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا؟ ادھر سے کیوں نہیں سوچتے کہ یزید کو بیعت پر اتنا اصرار کیوں تھا؟ ارے جب پورا عالم اسلام بیعت کر چکا تھا، سب مان چکے تھے تو اگر ایک فرد بیعت نہ کرتا تو یزید کا کیا بگڑتا؟ کیا نقصان ہوتا؟ جبکہ آپ کا نظامِ جمہوریت یہی ہے کہ اکثریت مان لے تو اقلیت کی بات غیر معتبر۔ پوری طاقتِ سلطنت صرف کر دی جائے ان سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید سمجھتا تھا کہ یہ ایک فرد کا معاملہ نہیں ہے، فرد اہمیت حاصل کرتا ہے کسی اصول کا نمائندہ بنکر۔ مختصر طور پر اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں۔

وہ سمجھتا تھا کہ جب تک حسینؑ نے بیعت نہیں کی، تب تک حکومت کے مقابلہ میں شریعت کا محاذ قائم ہے اور اگر یہ بیعت کرلیں تو ہمیشہ کیلئے حکومت کے راستے سے شریعت ہٹ جائے گی۔ اب حسینؑ کی بیعت کا سوال نہیں تھا۔ شریعت کی بیعت کا سوال تھا اور بیعت کے معنی ہیں جھک جانے کے۔ صاحب شریعت کا جھک جانا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اللہ کو، اگر اس کی شریعت دوسرے کے سامنے جھک جائے تو اس کے معنی ہیں کہ اس کا قانون دنیا کے قانون کے سامنے جھک جائے۔

تو اب حسینؑ کے لباس کی عزت نہیں ہے، اللہ کی عظمت کا سوال ہے۔ ارے کہہ رہا ہوں زبان سے نہیں ہے۔ یعنی عمل سے ثبوت دے دیا کہ بیعت نہیں کروں گا۔ اب بیعت نہیں کروں گا تو کیا کروں گا؟

خدا کی قسم! عمل سے حسینؑ کر کے نہ دکھاتے تو ہمیں تصور نہیں ہوتا۔ ہاں! جس دن کہا، جس وقت کہا کہ بیعت نہیں کروں گا۔

اسی وقت تمام امکانات کا جائزہ لے کر، سامنے رکھ کر انہیں واقعی مان کر کہا کہ بیعت نہیں کروں گا۔ دنیا کو اُن تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ان کے اس اجمال میں پوری تفصیل مضمر تھی۔ اب مجھے تو علم ہو گیا کچھ تفصیلات کا۔ مطلب یہ ہے کہ بیعت نہیں کرونگا۔ چاہے وطن چھوڑنا پڑے، بیعت نہیں کروں گا۔ چاہے دربدر پھرنا پڑے۔ بیعت نہیں کرونگا چاہے خانۂ خدا میں پناہ بھی نہ ملے، بیعت نہیں کرونگا۔ چاہے ہزاروں کا لشکر چاروں طرف سے گھیر لے، بیعت نہیں کرونگا۔

اور ہاں اہل عزا! بیعت نہیں کرونگا چاہے پانی بند ہو جائے۔ چاہے چھوٹے چھوٹے بچے صدائے العطش بلند کرتے ہوں، چاہے سکینہؑ پیاس سے تڑپ رہی ہو اور پھر روزِ عاشور اور بعدِ عاشور جو ہوا، وہ سب سامنے تھا۔ اب یہ کہہ دیا کہ بیعت نہیں کرونگا۔

39

دین اسلام

یاد رکھو! اسلام دین مساوات نہیں ہے بلکہ دین عدل ہے۔ جہاں مساوات تقاضائے عدل ہو، وہاں مساوات ضروری ہے، ترک مساوات ظلم ہوگا اور جہاں مساوات ظلم ہو، پھر عدم مساوات میں عدل مضمر ہوگا۔

جناب فاطمہ زہراؑ جب اپنے والد گرامی کے پاس آتیں تو آنحضورؐ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاتے اور سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی پیاری بیٹی سے پیار کرتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ سجدہ میں رضائے الٰہی کے ترازو پر تول رہے ہیں، ایک پلڑے میں عام رفتار نماز کو اور ایک پلڑے میں حسینؑ کی شخصیت کو اور اس ترازو پر حسینؑ کی شخصیت کا وزن زیادہ نمایاں ہو رہا ہے کہ سجدے سے سر نہیں اٹھاتے۔

امام حسینؑ کی اہمیت پیغمبر اکرمؐ کے پیش نظر ہے، اللہ کے دیئے ہوئے علم سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تو میری ایک وقت کی نماز ہے اور اس کا سجدہ ہے اور یہ بچہ وہ ہے جس کی بدولت قیامت تک نماز قائم رہے گی۔

کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ جو سلوک میرے ساتھ بچپن میں نانا نے کیا تھا، وہ بلاوجہ نہیں تھا۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"

یقیناً دین حقیقی اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ اسلام سر جھکانا ہے، اپنے کو سپرد کر دینا کسی ذات کیلئے۔ ذاتِ الٰہی کیلئے۔ میں نے عرض کیا کہ ذاتِ الٰہی سب کے ساتھ یکساں تعلق رکھتی ہے۔ کسی سے اس کا کم اور کسی سے زیادہ رشتہ نہیں ہے۔ بحیثیت خالق سب اس کی مخلوق ہیں۔ یہی بناء قرار پائی اسلام کے اس فلسفہ کی جس کو ان الفاظ میں کہا جاتا ہے کہ اسلام دین مساوات ہے اور یہ جملہ بطور نعرہ بھی آتا ہے زبانوں پر اور سنجیدگی کے ساتھ آپس کی گفتگو اور تحریروں میں بھی آتا ہے۔ لیکن میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نعرہ لگانے والے کچھ بے سمجھے یہ نعرہ لگاتے ہیں۔ اسلام دین مساوات، اس کو کل انشاء اللہ میں بیان کروں گا مگر یہ بغیر اس کے حدود و قیود پر نظر کیے ہوئے مطلق طور پر یہ کہہ دینا کہ اسلام دین مساوات ہے، یہ از روئے قرآن درست نہیں ہے۔

اس اندھا دھند کہہ دینے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ سب کو ایک لکڑی سے ہانک دو۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو، سب کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھو۔ یہ ہے کلیتہً اسلام کو دین مساوات کہنے کا تقاضا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ لہٰذا قرآن کتاب فطرت۔ پہلے عرض ہوا، فطرت پر غور کیجئے کہ یہ مطلق مساوات کہنے کا تقاضا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ لہٰذا قرآن کتاب فطرت۔ پہلے عرض ہوا، فطرت پر غور کیجئے کہ یہ مطلق مساوات کا نعرہ درست ہے بھی یا نہیں۔ مساوات یعنی سب کے ساتھ یکساں، کسی کے ساتھ کسی خصوصیت کا لحاظ نہیں۔ تو اب میں چند مثالیں عوامی، عموماً میں پہلے عوامی مثالیں پیش کیا کرتا ہوں۔ تو روزمرہ کی زندگی کی مثالیں۔

حضور! اگر مساوات کا نعرہ صحیح ہے تو آجکل مسلمانوں کے علاوہ اور دنیا میں بھی یہ نعرے لگا کر مختلف "ازم" کا بنیادی مرکز اسے بنائے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ نعرہ مطلق مساوات کا صحیح ہے تو ایک ملک میں کسی ادارے کی تنخواہوں میں مختلف کارگزاروں کی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ جو ایک چپڑاسی کی تنخواہ ہو، وہی پروفیسر کی تنخواہ ہو۔ سٹیشن پر جو ایک قلی کا معاوضہ ہو، وہی سٹیشن ماسٹر کا معاوضہ ہو۔ تعلیم گاہوں میں جو ایک پرائمری کے مدرس کا معاوضہ ہو، وہی اعلیٰ درجہ کے پروفیسر کا معاوضہ ہو۔ مساوات تو جبھی ہوگی۔ تو اب دنیا کے کسی ملک میں کوئی دکھائے، چاہے وہ مسلم ملک ہو جہاں نعرہ ہے کہ اسلام دین مساوات ہے اور خواہ غیر مسلم ملک ہو جہاں اسلام سے الگ ہو کر مساوات کا نعرہ لگتا ہو۔ کسی بھی ملک میں دکھائے کہ یہ اصول برتا گیا ہو حالانکہ میں اب آپ کی توجہ دلاؤں کہ وہ معاوضے، وہ معاملات، وہ کام جن کے معاوضے کم ہیں، ان میں مشقت زیادہ ہے اور جو زیادہ قدر و قیمت والے کام ہیں، ان میں مشقت کم ہے۔ اس کو چاہے بازار میں جا کر دیکھئے۔ لوہار سے زیادہ بلند مرتبہ ہے سنار کا۔ کام دونوں کا ایک، وہ بھی ایک دھات کو مختلف شکلیں دیتا ہے، یہ بھی

ایک دھات کو مختلف شکلیں دیتا ہے۔ جا کر تھوڑی دیر بیٹھ کر دیکھئے کہ لوہار کا کام کتنی محنت کا ہوتا ہے اور پھر تھوڑی دیر جا کر سنار کے ہاں بیٹھئے، اس میں کتنی نزاکت ہوتی ہے۔ کیا اسے بھی اس طرح سے اُسے موڑنے میں دقت ہوتی ہے، اسے گردش دینے میں اتنی زحمت ہوتی ہے جتنی لوہار کو ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محنت اُس کی زیادہ ہے، اس کی کم اور معاوضہ اُس کا کم، اِس کا زیادہ۔

کسی عمارت میں آپ جائیے، ذرا مزدور کے کام کو دیکھئے۔ دھوپ میں، بارش میں بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے کتنے پھیرے لگا رہا ہے اور واقعی سر کا پسینہ ایڑی تک پہنچ رہا ہے اور مستری صاحب جو ہیں، وہ ایک جگہ بیٹھے ہوئے کھٹ کھٹ کر رہے ہیں۔ لیکن جب مزدوری کا وقت آیا تو اُس بیچارے کو اتنے پیسے مل گئے اور یہ اتنا سا لے کر چلے گئے۔ محنت اس کی زیادہ، مزدوری اس کی کم۔ مزدوری اس کی زیادہ اور جناب وہ جو ایک انجینئر صاحب آئے تھے جنھوں نے کاغذ پر چند ٹیڑھی سیدھی لکیریں بنادی تھیں، وہ ان کا تھوڑی دیر کا کام تھا، وہ جناب ان سب سے زیادہ معاوضہ لے کر چلے گئے تھے۔ تو اب میں نے دو ایک مثالیں کاروباری زندگی کی آپ کے سامنے پیش کر دیں۔

اسی طرح اب اپنا شعبہ تو جو ہے تعلیم کا، تو بیچارے مکتب کے اُستاد کی محنت، ہم ایک گھنٹہ وہاں بیٹھتے ہیں تو وہاں سر میں درد ہوجاتا ہے، چہ جائیکہ وہ دن بھر سر مغزی کرتے ہیں۔ ان اطفال خام کے پختہ بنانے میں اور ہر روز ان کو اپنے وقتِ مقررہ پر آنا ضروری اور اپنے مقررہ وقت پر ڈیوٹی دے کر جانا ضروری۔ اب وہ جو ہیں ماسٹر صاحب، وہ ان سے ذرا اونچے درجہ والے۔ ان کو جا کر دیکھئے تو ساتھ آٹھ گھنٹے وہ کام کرتے ہیں، ان کو نہ اتنی ڈانٹ ڈپٹ کرنا پڑتی ہے، نہ ان کو ہر وقت چھڑی ہاتھ میں رکھنا پڑتی ہے۔ نہ ان کو اتنا چیخنا پڑتا ہے۔ اب اس سے آگے بڑھئے، یہاں تک کہ پروفیسر صاحب تک پہنچ جائیے تو وہاں معلوم ہوا کہ یہاں تو پورا دن ہوتا تھا، وہاں ہفتہ میں چند گھنٹے۔ دن کا حساب ہی نہیں کہ ہر دن کتنا۔ جی! ان کے ہفتہ میں نو پیریڈ ہیں، ان کے آٹھ پیریڈ ہیں۔ جتنا درجہ اونچا ہو، اتنی تنخواہ زیادہ۔ جتنی تنخواہ کم، اُتنا کام زیادہ اور جتنا کام زیادہ، اتنی تنخواہ کم اور جتنا کام کم، اتنی تنخواہ زیادہ۔ ہر شعبہ میں ایسا ہی ہے۔ وہ بیچارہ چپڑاسی دوڑتا ہے، اس کو اتنا سا ملتا ہے۔ وہ پروفیسر صاحب اس سے کم وقت صرف کرتے ہیں، انہیں اتنا ملتا ہے۔

تو اب حضور! اس میں کسی ملک کا استثنیٰ نہیں، ہوسکتا ہے کہ تنخواہوں کے فرق میں فرق ہو۔ کہیں زیادہ فرق ہوتا ہو، کسی ملک میں کم فرق ہوتا ہو۔ لیکن یہ بات کسی ایک جگہ بھی نہیں کہ بالکل مساوات ہو۔ تو یہ تو تسلیم کر لیجئے کہ تمام دنیا نے اجماع کر لیا ہے حماقت پر یا پھر مانئے کہ مطلق مساوات ہی غلط ہے اور پھر معیار بھی فرق کا وہ نہیں ہے کہ زیادہ کام اور کم کام بلکہ کچھ متعلق ہے اس سے کہ وہ کام متعلق ایسی چیز سے ہے جو کم قیمت ہے۔ تو وہ کام بھی کم قیمت اور متعلق ایسی چیز سے ہے جو اصل چیز بیش قیمت ہو تو وہ کام بھی بیش قیمت کیونکہ لوہے کی قیمت سونے سے کم ہے، لہٰذا لوہار کی اُجرت سنار سے کم ہے۔ تو ایک یہ بنیادی فرق ہوسکتا ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ جہاں جسم کی محنت زیادہ ہے، دماغ کی شرکت کم ہے، اس کی قیمت کم ہے اور جہاں جسم کی محنت نہیں ہے مگر دماغ کا کام زیادہ ہے، اس کی قیمت زیادہ ہے۔ اگر یہی اصول مانئے، تب جا کر امتیاز صحیح ہوگا ورنہ اس امتیاز کی کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی۔ بہر حال امتیاز صحیح ہوگیا تو مساوات تو ختم ہوگئی اور اب جب یہ اصول ہوا کہ کام کی کمی و زیادتی پر قیمت کا معیار نہیں ہے، کچھ نتائج کے لحاظ

سے ہے، کچھ ذہنی کیفیات کے اعتبار سے ہے تو اب کوئی تعجب نہ کیجئے۔ اگر ایک وقت میں رسولؐ ایک ضربت کو تول کر۔۔۔۔۔۔۔

اب جناب! یہ تو ایک روزمرہ کی زندگی کی کاروباری شعبہ کی مثالیں ہیں، اب ایک دوسری، وہ بھی تعلیم گاہ ہی سے متعلق کیونکہ میرا ماحول تعلیمی رہا ہے تو وہی پہلی مثال ذہن میں آتی ہے کہ جناب کوئی درس گاہ ہے۔ ایک ہی تاریخ دو طالب علموں نے نام لکھوایا۔ عمر بھی تقریباً دونوں کی یکساں ہے۔ ایک تھا آرام طلب۔ اُس نے کئی کئی برس میں ایک ایک کلاس پاس کی۔ ایک تھا محنتی، اس نے اپنے ذوق وشوق کی بناء پر جلدی جلدی کلاسیں پاس کیں بلکہ اگر ممکن ہوا تو کئی کئی امتحان ایک ایک سال میں اُس نے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رہ گیا ساتویں میں اور یہ پہنچ گیا نہ معلوم کہاں؟

اب ایک مفکر صاحب آئے، مساوات پسند، انہوں نے طلاب کا انٹرویو لیا۔ اس سے پوچھا: تم کب داخل ہوئے تھے؟ اُس نے تاریخ بتائی۔ اب تم کس کلاس میں ہو؟ اُس نے جو تھا واقعہ، بتا دیا۔ ساتویں میں۔ دوسرے کو بلایا کہ تم کس سال میں داخل ہوئے تھے؟ اُس نے بھی وہی تاریخ بتائی۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟ وہی عمر بتائی جو اس کی عمر ہے۔ تم کس کلاس میں ہو؟ اس نے کہا مثلاً بی اے یا ایم اے۔ اب وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک ہی تاریخ میں دو طالب علم داخل ہوئے ہیں۔ دونوں کی عمریں یکساں ہیں اور ایک رہ جائے ساتویں میں ایک پہنچ جائے بی اے میں۔ لہٰذا ساتویں والے کو تو بی اے میں پہنچا کر داخل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ وہاں چلے گا نہیں۔ لہٰذا بی اے والے کو کھینچ کر پھر ساتویں میں داخل کر دو تا کہ مساوات ہو جائے۔

تو کوئی صاحب عقل بتائے کہ کیا یہ انصاف ہوا؟ یہ اس کے ساتھ ہو گیا ظلم جو اپنی محنت سے اس ترقی کے زینہ پر پہنچا تھا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جو روٹی والے نظام کے لوگ ہیں، ان کو میں ابھی تک کئی ناموں سے یاد کرتا رہا۔ اب آج میں نے یہ لقب اختیار کیا ''روٹی والا''۔ تو جناب روٹی کے نظام والے حضرات میں کہتا ہوں کہ کیا آپ نے کائنات کی فضا میں اس وقت آنکھ کھولی ہے جب سے قافلہ انسانی رواں دواں ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ کون مفلوک الحال رہ گیا اپنے بزرگوں کی تن آسانی راحت طلبی سے اور کون اس منزل پر پہنچ گیا مسلسل محنتوں سے، مسلسل زحمتوں سے؟ اب آپ مفکر صاحب کی طرح یہ تو نہیں کر سکتے کہ ان غریبوں کو بھی دولت مند بنا دیجئے۔ بس وہ کر سکتے ہیں جو انہوں نے کیا کہ جو لکھ پتی ہے، اُسے بھی کھینچ کر لے آؤ اسی سطح پر جس سطح پر یہ ہے۔ تو اگر وہ ظلم تھا تو یہ بھی ظلم ہے۔

کہتے ہیں کہ وہ دولت اس نے نوچ کھسوٹ کر بڑھائی ہوگی۔ کہئے بڑھائی، یعنی علم کا دعویٰ کیجئے۔ جس کے متعلق علم ہو جائے کہ اس نے غصب حقوق کر کے، دوروں کے گلے کاٹ کر اپنی دولت بڑھائی ہے۔ اس سے ضرور چھین لیجئے مگر چھین کر کیا کیجئے گا؟ پتہ لگایئے کہ کن سے چھینی تھی، انہیں تک پہنچایئے۔ یہ نہیں کہ چھینی کسی سے اور اپنے منظور نظر افراد میں بانٹ دی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک غاصب کا خاتمہ کر کے دوسرے بہت سے غاصبوں کو وجود میں نہ لایئے۔ تو اب اگر یہ مثال بھی سب کے ذہن میں آگئی یعنی وہی طالب علم والی کہ ساتویں جماعت والے کو بی اے میں نہیں پہنچا سکتے تو بی اے والے کو ساتویں میں لے آئیں۔ یہ خلاف عقل ہے۔ مساوات تو ختم ہو گئی مگر ظلم ہو گیا۔ اور اب آخر نتیجہ ہے، وہی کہہ دوں کہ اسلام ایسی مساوات کا حامی نہیں ہے۔ اس

لئے میں کہتا ہوں کہ اسلام دین مساوات نہیں ہے بلکہ دین عدل ہے۔ جہاں مساوات تقاضائے عدل ہو، وہاں مساوات ضروری ہے۔ ترکِ مساوات ظلم ہوگا اور جہاں مساوات ظلم ہو، وہاں پھر عدم مساوات ضروری ہے۔ ترکِ مساوات ظلم ہوگا اور جہاں مساوات ظلم ہو، وہاں پھر عدم مساوات میں عدل مضمر ہوگا۔

اب گھریلو زندگی کی مثال بھی دے سکتا ہوں کہ ایک گھر ہے جس میں ایک صاحب خانہ ہے اور اس کے متعلقین ہیں۔ ایک ہے بوڑھی ماں جو ستر برس کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب بوڑھی ماں ستر برس کی ہے تو یہ خود پچاس پچپن برس کا ہوسکتا ہے۔ جب یہ پچاس پچپن برس کا ہے تو ہمارے ہاں جو تناسب ہے، عموماً شادی کی عمروں کا تو بیوی پینتیس سال کی ہوگی۔ اب ان کا ایک فرزند ہوگا جو ہوسکتا ہے کہ بیس بائیس برس کا ہو۔ مکمل جوان ہو اور کچھ بچے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو پانچ چھ برس کے ہیں۔ افرادِ خانہ آپس میں اتنا فرق رکھتے ہیں اور صاحب خانہ پر ذمہ داری ہے ان سب کو غذا پہنچانے کی۔ صاحب خانہ ہونے کی بنا پر، بزرگِ خاندان ہونے کی وجہ سے اور یہ ہوئے مساوات پسند۔ تو انہوں نے باورچی خانہ میں ہدایت کردی کہ دیکھو! ہر آدمی کو تین چپاتیاں ملیں، کم اور زیادہ نہ ہوں ورنہ مساوات نہیں رہے گی۔

تو وہ تین چپاتیاں بوڑھی والدہ کیلئے تو ہوگئیں کافی، اس لئے کہ وہ بیچاری سنِ انحطاط میں تھیں۔ ان کی غذا گھٹ ہی چکی تھی۔ لہٰذا ان کیلئے وہ تین چپاتیاں کافی تھیں۔ وہ پانچ چھ برس کے یا ان سے بھی چھوٹے بچے جو ہوں، ان کیلئے خیر سمجھئے کہ ہوگئیں کافی کیونکہ ابھی ان کی غذا اتنی ہی ہے۔ لیکن اب یہ خود تو چونکہ خود ہیں مساوات قائم کرنے والے، لہٰذا محسوس کریں یا نہ کریں لیکن اس شریکِ حیات پر کیا گزری جس کی غذا ابھی اپنے پورے کمال پر ہے، اس میں کمی پیدا نہیں ہوئی ہے اور جوان لڑکے پر کیا گزری جو ابھی نشوونما کی عمر کو طے کر رہا ہے اور شباب کی منزل پر ہے۔ تو اب مساوات تو ہوگئی مگر بہت سوں پر ظلم ہوگیا۔

عدل کس چیز میں تھا کہ ہر ایک کو بقدرِ صلاحیت دینا، بقدرِ ظرف دینا۔ تو اب معلوم ہوا کہ مساوات میں بھی ظلم ہوتا ہے اور ترکِ مساوات میں بھی عدل ہوتا ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر میں نے کہا کہ فطرۃً جب مساوات کلیۃً کہنا بلاقید یعنی عدل وظلم کی قید سے الگ کر کے تو وہ غلط ہے اور اسلام کو ایک غلط بات کا حامی ثابت کرنا اسلام کی کوئی صحیح خدمت نہیں ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ اسلام کی سب سے زیادہ متفق علیہ دستاویز کیا ہے؟ متفق علیہ دستاویز قرآن مجید ہے۔ حدیثوں میں قوی اور ضعیف کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کے سامنے ہر فرقہ کو سر جھکا دینا ضروری ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جسے حفظ ہو، وہ حافظہ کی مدد سے اور جو ناظرہ خواں ہو، وہ ورق گردان کے پورے قرآن مجید میں تلاش کرے۔ یہ اتنی نمایاں بات ہے، اسلام دین مساوات ہے یعنی خاص خصوصیت اسلام کی مساوات ہے۔ تو زیادہ آیتیں وہ ہونی چاہئیں جو ''یَسْتَوِیْ'' سے شروع ہوں۔ یعنی برابر ہے، برابر ہے۔ جو بات ذہن نشین کرنا ہوتی ہے، اسے بار بار کہا جاتا ہے۔ زیادہ آیتیں ہونی چاہئیں جو کہیں کہ برابر ہے، برابر ہے۔ اور میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں، شروع سے آخر تک، تو قدم قدم پر ''لَا یَسْتَوِیْ لَا یَسْتَوِیْ مَا یَسْتَوِیْ''، الفاظ بدل بدل کر، برابر نہیں ہے، برابر نہیں، جیسے دماغ سے نکالنا ہے برابری کو۔

چونکہ آج میرا بیان جو میں کر رہا ہوں، وہ اب تک کے مسلمات عامہ کے خلاف ہے، دنیا کہہ رہی ہے کہ دین مساوات، میں کہہ رہا ہوں جی نہیں اسلام نہیں دین مساوات۔ مگر کیا کروں، میں کس طرح قرآن سے نکال دوں؟ ارشاد ہو رہا ہے، ایک دو آیتیں پڑھتا ہوں:

لَا يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ

دیکھو! بہشت والے اور دوزخ والے یکساں نہیں ہیں۔ جو بہشت والے ہیں، وہی کامیاب ہیں۔ "لایستوی"۔ اب میں اسے کیونکر "یستوی" بناؤں؟ برابر نہیں ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ

"کیا وہ جو صاحب علم ہیں اور جو غیر صاحب علم ہیں، برابر ہیں؟"

یعنی برابر نہیں ہیں۔ مثالیں دے دے کر (آیت) دیکھو! وہ دریا برابر نہیں ہیں۔ ایک جو میٹھا ہو، بہت خوشگوار ہو اور ایک جو کھاری ہو، جو ضرر رساں ہو، کیا دونوں برابر ہیں؟ جیسے ایک عام حماقت کو دور کرتا ہے، کیا یہ برابر ہیں؟

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

دیکھو! اللہ تمہارے لئے ایک کہاوت کہتا ہے۔ کسی حقیقت کو نمایاں کرنے کیلئے کہاوت دیکھو، تمہارے فائدہ کیلئے، تمہاری غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اللہ ایک کہاوت کہتا ہے کہ کوئی غلام ہو جو کسی کام کا نہیں اور وہ اپنے مالک پر بار ہو، جدھر اُسے بھیجے، وہ کوئی بھلائی کر کے بھی نہ آئے تو کیا وہ برابر ہے (اس کے) جو دوسروں کو بھی عدالت کا حکم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستہ پر قائم ہو؟"

یعنی تمہاری عقل خود فیصلہ کرے گی کہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ طرح طرح کی مثالیں دیکھ کر، کیا برابر ہیں؟ "الاحیاء" نہیں برابر ہیں "الاحیاء والاموات"۔ ارے زندہ اور مردے جب برابر نہیں ہیں تو کہا جا رہا ہے:

هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ

"کیا تاریکیاں اور اندھیرے برابر ہیں؟"

یہ آخر بار بار تازیانے لگانے کی ضرورت کیا ہے؟ معلوم ہوا غلط رجحان ہے جس کی اصلاح کرنا منظور ہے جو قدم قدم پر کہا جا رہا ہے کہ برابر نہیں ہے، برابر نہیں ہے۔ اچھا یہاں برابر نہیں ہیں۔ ہم کیا برابر سلوک کریں سب کے ساتھ؟

هَلْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ

نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ

''کیا ہم ان لوگوں کو جو پرہیزگار ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، ان کو مثل ان لوگوں کے کردیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو مثل فاسق و فاجر لوگوں کے کردیں؟ کیا ہم ایسا کردیں یعنی تمہارا ضمیر خود گواہی دے گا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے''۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

''پرہیزگاروں کیلئے اللہ کے ہاں نعمت کے باغ ہیں''۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ

''کیا ہم اسلام لانے والوں کو ہمہ تن سر تسلیم خم کئے ہوؤں کو مثل مجرموں کے قرار دے دیں؟''

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ

''تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے فیصلے کرتے ہو؟''

"اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ"۔

''کیوں ہماری باتوں کا اثر نہیں لیتے ہو''۔

یہ کونسی عام غلطی ہے کہ قرآن بار بار تازیانے لگا رہا ہے؟ یہ گویا سمجھاتا ہے کہ کسی جماعت میں یہ نہ سمجھو کہ سب ہی اچھے ہیں۔ سب ہی رضی اللہ ہیں۔ سب ہی ٹھیک ہیں۔ تو میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ جتنی آیتیں ہیں، سب کو میں پیش کر سکتا۔ اتنی مثالیں دی ہیں اور کسی کو تلاش ہو تو وہ قرآن مجید میں نوٹ کرتا جائے جہاں جہاں یہ مضمون آئے۔

ارے ترجمہ دیکھ کر کیونکر میں نے آیتیں بلا تبصرہ پڑھی ہیں۔ کوئی خاص تبصرہ میں نے ان کے متعلق نہیں کیا۔ خود آیت کا مضمون اپنا پورا ماحصل دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ الگ سے اس میں نوٹ لگانے کی؟

تو کوئی ترجمہ کی مدد سے ان آیتوں کو اکٹھا کرتا ہے تو دیکھئے کہ کتنی بڑی کاپی ہو جاتی ہے۔ اب میری خاطر سے ایک دفعہ اور سر مغزی و محنت کیجئے، چاہے لاحاصل ہو اور وہ آیتیں ڈھونڈئیے جن میں کہا گیا ہو، برابر ہیں، برابر ہیں تو وہ انشاء اللہ نہیں ملیں گی۔

تو میں کہتا ہوں کہ اتنی دفعہ آیات قرآن نے جس حقیقت پر زور دیا ہو اس کی بجائے اگر مسلمان صرف قرآن کو کافی سمجھتے اپنے لئے تو یہ نعرہ لگاتے کہ اسلام عدم مساوات کا حامل ہے۔ یہ کیا ہے؟ بار بار قرآن کہہ رہا ہے، اس کے خلاف نعرہ بن گیا اور جو قرآن میں ہے، وہ زبان پر کسی کی نہیں آتا۔ اب میں کہتا ہوں کہ خدا اور رسولؐ کی عملی سیرت دیکھئے اور میں تو اس کا قائل ہوں کہ جو رسولؐ کی سیرت ہے، وہ خدا اور رسولؐ دونوں کی ہے کیونکہ ان کا کوئی عمل بغیر مرضی الٰہی نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب یہ بھی کہہ دیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تو پھر تو بشر والے مسلمان کو بھی ماننا پڑے گا۔ اگر رسالت کو ماننا ہے تو پھر تو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا کہ اب یہ ارشاد

توکم از کم بشریت کی بناء پر نہیں ہے۔

تواب میں یاد دلاتا ہوں آپ کے جانے پہچانے واقعات۔ اگر اسلام دین مساوات ہوتا تو جب دروازے بند ہوئے تھے تو سب کے بند ہو جاتے، کسی کا نہ کھلا رہتا۔ جناب! اس عدم مساوات پر احتجاج بھی ہو رہا ہے۔ دوسرے لوگ طلب مساوات میں کہتے ہیں: جناب! جو سب کے ساتھ ہوا، وہ ایک کے ساتھ کیوں نہ ہوا؟ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہمارا دروازہ کیوں بند ہوا؟ یہ کہتا ہے کہ یہ کیوں کھلا ہے؟ ذرا اس نوعیتِ احتجاج سے خلوص دیکھئے۔ یعنی دلچسپی فائدہ اٹھانے سے نہیں ہے، ضرر رسانی سے دلچسپی ہے۔ جی! کوئی اپنے دروازے کو نہیں کہتا۔ اس کے معنی ہیں ہر ایک جو اُن کے ساتھ ہو، اس کا تو اپنے کو مستحق سمجھتا ہے۔ جو ہے، اس کی نظر اس دروازے پر ہے کہ یہ دروازہ کیوں کھلا ہے؟ اب اگر یہ دروازہ کھلا رہا تو میں کہتا ہوں کہ یہی سب کیلئے وجہ عداوت اس دروازے سے ہو جائے گی۔ اب کوئی مخاصمت الگ سے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ اب کسی اور کو تو ہمت نہیں ہوتی۔ وہ جناب پیغمبرِ خدا کے عم بزرگوار کو منتخب کرتے ہیں۔ جی ہاں! انہیں کہ ان سے کہلوائیں۔

جی ہاں! بڈھے ہی فقط نہیں ہیں، وہ تو رسولؐ کی ہر بات کو قرابت پر محمول کر رہے ہیں، اس لئے کہ قرابت رکھتے ہیں اور ذرا اونچی قرابت۔ ارے یہ تو چچازاد بھائی ہیں۔ وہ تو چچا ہیں۔ عم بزرگوار ہیں۔ مگر میں اب ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں اہل مجمع کو یہاں قرابتوں کا اثر الٹا ہوتا ہے۔ کتنے ہی شدید دشمن رسولؐ کے تھے غیر مگر کسی کا نام قرآن میں نہیں آیا اور جو رشتہ دار تھا، اس کا نام آیا۔

اب آپ نے دیکھا کہ یہاں اصولِ عدل برائی میں رعایت نہ کرنا ہے۔ تو بہر حال وہ دنیا اس کو سمجھتی ہوتی تو آج تک بشریت بشریت کی رٹ کیوں لگاتی؟ تو جناب! انہوں نے سب کے دروازے بند کر دیئے۔ میرا بھی دروازہ بند کر دیا اور یہ ان کا دروازہ؟ اب وہ ممکن ہے چچا ہونے کی عظمت کے لحاظ سے، بزرگی کے لحاظ سے انہوں نے کہا ہو کہ اس کا دروازہ، بچے کا آپ نے کھلا رکھا۔ اب رسولؐ کہاں تک بحث کریں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"مَا فَتَحْتُ بَابًا وَلَا سَدَدْتُ"۔

میں نے نہ کوئی دروازہ کھلا رکھا، نہ کوئی دروازہ بند کیا۔ جس کا دروازہ بند ہوا اللہ نے بند کیا، جس کا دروازہ کھلا رکھا، اللہ نے رکھا۔

ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ رسولؐ فرماتے ہیں کہ نہ میں نے کسی کا دروازہ کھلا رکھا، نہ میں نے کسی کا دروازہ بند کیا۔ جس کا دروازہ کھلا رکھا، اللہ نے، جس کا دروازہ بند کیا، اللہ نے۔ یہی میں کہتا ہوں کہ اب 14 سو برس سے دنیا جو رسولؐ سے قرابتیں گن رہی ہے، تو اس سے کام نہیں چلے گا۔ اب خدا سے کوئی قرابت ڈھونڈنا چاہئے اور اب یہ جملہ میں ابھی بار بار دہراؤں گا، پھر اس کی تشریح کروں گا، دو ایک مثالیں اور عملِ خدا و رسولؐ سے۔

ارے جب رسولؐ نے کہہ دیا کہ میرا کام نہیں ہے، اُس کا ہے تو اب کسی کو اس میں تامل نہیں ہو سکتا۔ اگر رسالتؐ پر ایمان رکھتا ہے تو عملِ خدا اور رسولؐ۔ معلوم ہوا کہ جس وقت جو امتیاز کا حقدار ہے، اس کے امتیاز کا حامی ہے، میرا ... نہیں اور اس کے

بعد اب جتنی خصوصیات کسی کے نزدیک رسولؐ نے برتی ہے اور رسولؐ نے خصوصیات نہیں برتیں تو دنیا بار بار قرابت یاد کیوں کر رہی ہے؟ خصوصیات برتیں، جبھی تو بار بار قرابت یاد آتی ہے دنیا کو اور مساوات ہوتی تو یا سب خواتین کی تعظیم کو کھڑے ہوتے یا کسی کی تعظیم کو نہ کھڑے ہوتے۔ مساوات یا ثبوت میں ہوتی یا نفی میں ہوتی۔ اور ایک مکتب خیال کے نقطۂ نظر سے تو نفی ہی میں ٹھیک تھا کہ کسی کیلئے نہ اٹھتے کیونکہ دنیا کہتی ہے کہ تعظیم کیلئے اٹھنا شرک ہے اور نامِ رسولؐ پر جو مجمعوں میں، میلاد میں، جو لوگ اٹھتے ہیں، اس پر دنیا معترض ہے کہ کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟

تو دنیا تو تعظیم میں کھڑی ہونے کی مخالف ہے، لہٰذا مساوات میں وہی پہلو زیادہ اچھا تھا کہ کسی کیلئے نہ اٹھتے مگر جناب صحاح ستہ کی حدیث کو کیا کیا جائے کہ:

"اِذَا دَخَلَتْ فَاطِمَةُ"۔

"جب حضرت فاطمہ زہراؑ آتی تھیں"۔

ایک دفعہ کی بات نہیں کہ آئیں اور رسول کھڑے ہو گئے، نہیں۔ جب آتی تھیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، کبھی انشاءاللہ اس حدیث کی تشریح پیش کروں گا۔ جب حضرت فاطمہ آتی تھیں تو رسولؐ اللہ:

"قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْھَا"۔

رسول خدا کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ پہلا ہی جملہ اتنا اونچا تھا کہ ہماری تقریر و تحریر نے جذب کر لیا۔ اسی پر زور دیتے رہے حالانکہ حدیث اس پر ختم نہیں ہوئی ہے۔ تیسرا جملہ بھی ایک ایسا آئے گا جو میرے نزدیک اس سے بالاتر نہیں ہے تو اس سے کم تر بھی نہیں ہے۔ وہ عموماً آپ کے سامنے نہیں پیش ہوتا۔ بس یہی پہلا جملہ اسی پر زور ہوتا ہے، مگر حدیث اتنی نہیں ہے۔ کھڑے ہو جاتے تھے:

"وَرَحَّبَ ھَا"۔

اور مرحبا فرماتے تھے۔ خیر مقدم، خوش آمدید۔ خیر یہ بھی دوسری بات ہے، تیسرا جملہ جو ہے، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں:

"وَاَجْلَسَ ھَا فِیْ مَقَامِہ"۔

اور ان کو اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔

اب اس جملے کا عقلی طور پر تجزیہ کیجئے۔ اس کے معنی ہیں کہ جب تک فاطمہ بیٹھی ہیں، رسولؐ اپنی جگہ نہیں بیٹھے ہیں۔ جب فاطمہ اٹھ کر چلی جائیں گی، تب پیغمبر خدا پھر اپنی جگہ پر بیٹھیں گے۔

تو اب امتیاز ہوا یا نہیں؟ ہوا، سب کے ساتھ تو یکساں عمل ہوا۔ ایسے کے ساتھ یکساں عمل ہوا جس کا رشتہ ایسا ہے کہ تقاضا ہی نہیں ہے کھڑے ہونے کا۔ یہ عمل یہ بتاتا ہے کہ فاطمہ زہرا فقط بیٹی نہیں ہیں، کچھ اور بھی ہیں۔ اور اب پیغمبر خدا کا مسلسل عمل ہے۔ حدیث

کے الفاظ ہی سے میں سمجھا چکا کہ مسلسل۔ وہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ بعض کام بر بنائے بشریت ہوتے تھے، وہ بھی کہتے ہیں کہ بر بنائے، بشریت (معاذ اللہ) کوئی بے محل بات ہوتی تھی تو اللہ اس پر قائم نہیں رہنے دیتا تھا۔ تو پہلی دفعہ کیا تو اسے بشریت کہہ لیجئے، جب برابر قائم رہے تو اب تو فعلِ الٰہی ماننا پڑے گا۔ اللہ سے قرابت کچھ پیدا کیجئے۔ کچھ تصور کیجئے۔ بغیر اس کے بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس یہیں تشریح بھی کر دوں، جس کا وعدہ کیا تھا کہ قرابت کے لفظ سے گھبرایئے گا نہیں۔ قرابتیں اصل قرب۔ تو آپ ہر نماز میں کہیں قربۃً الی اللہ۔ وہ آپ کیلئے روا ہو اور کچھ شخصیات کیلئے کہہ دوں اللہ سے قرابت تو وہ کسی کے مزاج پر بار ہو جائے۔ جیسی جس سے قرابت ہو سکتی ہو، اس کی بات جب خود بے لوث ہو تو اس کی قرابت قربت ہی سے ہوگی۔

جو زیادہ قربۃً الی اللہ کی حقیقت کا حامل ہوگا، اتنا ہی اسے اس سے قرب حاصل ہوگا۔ اتنا ہی اسے امتیاز عطا کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ بس اب یہ تمہ ہے ورنہ بہت ہی بسیط اس کو عرض کیا جا سکتا ہے۔ اب کل دوسرے جزو کو عرض کرنا ہے، مساوات والا رُخ کہ حضور والا! معلوم ہوا یہ یہاں تک میں پہنچا کہ ان ہستیوں کے دو رشتے ہیں، ایک رشتہ ہے رسولؐ کے ساتھ قرابت کا اور ایک رشتہ ہے اللہ کی طرف۔ میں کہتا ہوں کہ رسول کا عمل بھی دو طرح کا ہوتا تھا، ایک اپنے رشتے سے، ایک اللہ کے رشتے سے۔ وہ جو بیٹی کو گلے لگاتے تھے، وہ اپنے رشتے سے اور یہ جو تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے، یہ اُس کے رشتے سے۔ بعض وقت مصلحتِ الٰہی اس کی متقاضی ہوئی ہے کہ یہ عمل اپنی قرابت کے لحاظ سے کریں اور میں اپنی قربت کے لحاظ سے اسے قبول نہ کروں۔ یہ بھی ہوا ہے۔ یہاں یہ دو رنگی بھی منشائے الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

آپ کیلئے مختصر جملے کافی ہیں پورا واقعہ ذہن میں لانے کیلئے۔ اگر اپنے سے قرابت کا دخل نہ ہوتا تو کبھی تبلیغ میں اتنی دیر نہ کرتے کہ خدا کو یہ تیور بدل کر کہنا پڑتا۔ یہ جو رکاوٹ ہو رہی ہے، وہ اپنی قرابت کی بناء پر ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ خالق کو کہنا پڑا:

"وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ"۔

"اگر اب نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں"۔

تو اب جو کر رہے ہیں، وہ اللہ کی قرابت کی بناء پر۔ یہ چیزیں اکثر لوگوں کو اُلجھن میں ڈالتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حکمتِ الٰہی متقاضی ہے کہ بعض اوقات ان کے عمل کو الگ کر کے اپنے عمل سے دکھائے۔ اگر اپنی قرابت نہ ہوتی تو پہلے ہی سورۂ برأت انہی کو دے کر بھیجتے مگر چونکہ لوگ کہتے تھے کہ ہر منزل پر آگے بڑھاتے ہیں تو میدانِ جنگ میں اس بات کا اثر لینا تو خطرناک تھا۔ اسلام کے دامن پر داغِ شکست آتا۔ لہٰذا وہاں تو کہا کریں، بہر حال تقاضا اپنے رشتے کا ہے۔ پھر بھی کریں گے جو کرنا ہے، جو اسلام کی فتح کا ذریعہ ہے۔ لیکن اب یہ بے ضرر بات تھی، آیت سپرد کر دی۔ یہ اپنے رشتے کی بناء پر نہیں سپرد کیا تھا۔ دوسرے کے سپرد کر دیا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے فرشتے کو بھیج دیا کہ نہیں، کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ یا خود تم یا جو تم میں سے ہے، تمہارا جزو ہے۔

اب کیا کریں؟ تو آیت نہیں دی اپنی قرابت کی بناء پر اور پھر دینا پڑی اللہ کی قرابت کی بناء پر۔ بچوں کو کاندھے پر چڑھانا اپنی قرابت سے، سینے پر سلانا اپنی قرابت سے مگر سجدۂ خالق میں طول دینا، یہ اللہ کے رشتے کا تقاضا ہے ورنہ شانِ رسالت کے خلاف

ہے کہ اپنے بچوں کیلئے اللہ کی نماز کی رفتار میں فرق کریں۔ مگر نہیں! اپنے بچے کا سوال نہیں تھا، جس کی نماز ہے، اُسی کے یہ بچے ہیں۔

اور میں اب اسی حقیقت کو انہی الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ پیغمبرؐ عالم سجدہ میں رضائے الٰہی کو ترازو پر تول رہے ہیں، ایک پلڑے میں عام رفتار نماز کو اور ایک پلڑے میں حسینؑ کی شخصیت کو اور اس ترازو پر حسینؑ کی شخصیت کا وزن زیادہ نمایاں ہو رہا ہے کہ سجدے سے سر نہیں اٹھاتے۔ اب اُردو زبان کا ایک جملہ کہتا ہوں۔ اس میں محاورہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حسینؑ کا وزن ہے کہ رسول کا سر نہیں اٹھتا۔ ان کا وزن کس اعتبار سے زیادہ ہے؟ اس کو بابِ عقائد میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بابِ فضائل میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بابِ مصائب میں دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھئے! عبادات میں نماز سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔

"اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَاسِوَا اِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَاسِوَاهَا"۔

"اگر یہ قبول تو سب قبول، اگر یہ رد تو سب رد"۔

تو عبادات میں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اب اگر حسینؑ کا وزن پیشِ خدا زیادہ ہے تو وہ اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ فرعِ دین ہے۔ یہ بچہ اصولِ دین میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اصلِ دین ہی کمالِ نماز کا باعث بنے گا۔ لہٰذا نماز کی اہمیت کی خاطر ہی ان کی معرفت کو جزو نماز بنا دیا گیا۔ پھر نماز سے ٹکراؤ نہیں ہے۔ اس لئے میں نے کہا "عام رفتار نماز"۔ میں کہتا ہوں بچے بھی تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جن کی ضد سے عبادات میں کمی نہ ہو، مزید زیادتی ہو جائے۔

اب بابِ مصائب پیش کروں کہ امام حسینؑ کی اہمیت رسولؐ کے پیشِ نظر ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے یہ دے رہے ہیں کہ یہ میری ایک وقت کی نماز ہے اور اُس کا سجدہ ہے۔ یہ بچہ وہ ہے جس کی بدولت قیامت تک نماز قائم رہے گی اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، معصومؑ نے زیارتِ حضرت امام حسینؑ میں کہا ہے:

"اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ"۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز کو قائم رکھا"۔

تو شہادتِ حسینؑ شریعتِ اسلام کی بقا کی خاطر اور میں کہتا ہوں کہ کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ جو میرے ساتھ بچپن میں رسولؐ نے کیا تھا، وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ گویا زیرِ خنجر رسول کا عمل اُن کے سامنے تھا۔ یہ مصائب ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اُن کے پیشِ نظر ہے کہ میرے لئے بچپن میں رسولؐ نے سجدے کو طول دیا تھا تو کیسی، جو سجدہ ہی ہو اور گلے پر خنجر ہو؟

اب بڑی سخت بات ہے، میں نے کراچی میں بھی کہی تھی اور جو حقیقت ہے، بہرحال کہتا ہوں کہ یہ ہمارے عزاداروں کے یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس کے بعد انقلاب زمانہ نہیں ہے تو کیا ہے کہ ہمیں خنجر تو یاد رہا ہے اور سجدہ نہ یاد رہا۔ انہوں نے تو اپنی شہادت کا جزو بنا دیا نماز کو۔

ایک دن کہہ چکا ہوں کہ یہ ہر نمازی سر رکھتا ہے تو سر اٹھاتا بھی ہے۔ مگر ذرا باریک بات لیکن ماشاء اللہ آپ حضرات ہر باریک

بات کو سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سجدہ طولانی کتنا ہوتا ہے؟ رکوع اس وقت تک طولانی ہوگا جب تک سر نہ اٹھائے۔ سجدہ اس وقت تک طولانی ہوگا جب تک سر نہ اٹھائے۔ تو پیغمبر خدا نے بچپن میں سجدے کو کتنا طول دیا؟ وہ ہم بتا سکتے ہیں اور حسینؑ نے سجدے کو کتنا طول دیا؟ حیرت وہی ہے کہ ایسا سجدہ اور حضرت علیؑ کا سجدہ اور مسلسل زندگی کے سجدے، مگر سید الساجدینؑ نہ علیؑ کا لقب ہے، نہ حسینؑ کا لقب ہے، اُنؑ کے بے شمار القاب ہیں، امام المتقینؑ ہے، سید الوصیینؑ ہے۔ مگر کیا کروں کہ سید الساجدین نہیں ہے انؑ کے القاب میں۔

حضرت امام حسینؑ کے القاب میں سید الصابرینؑ ہے، سیدؑ الشہداء ہے، مگر کیا کروں کہ سید الساجدین آپؑ کے القاب میں بھی نہیں ہے۔ مگر یہ ہمارے چوتھے امامؑ نے کس عالم میں سجدے کئے کہ ان کا لقب ہوگیا "سید الساجدینؑ"۔

40

دین اسلام

ایمان کے برابر کے دو ٹکڑے ہیں، خوف اور اُمید۔ یقین کامل کرنا کہ بس ہم نجات پا ئیں گے، یہ بھی خدا کو ناپسند ہے، بالکل نا اُمید ہو جانا کہ ہم سوائے دوزخ کے کہیں جا ہی نہیں سکتے، یہ بھی خدا کو ناپسند ہے۔

لوگوں نے آ کر کہا: یارسول اللہ! آپؐ نے بلال کو مؤذن بنا دیا؟ فرمایا: ہاں، پھر کیا ہوا؟ کیا برا ہوا؟ انہوں نے کہا: حضورؐ! وہ تو شین کو سین کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: بلال کا سین اللہ کے ہاں شین ہے۔

یاد رکھئے کہ امامِ مسجد کو ہی دیکھے گا جو مسجد کے اندر جائے گا اور مؤذن کی اذان وہ بھی سنے گا جو رہگور سے جائے گا۔ تو یہ بلال کو مؤذن قرار دینا نہیں ہے، یہ مساوات اسلامی کا ایک عَلَم ہے جو نصب کیا جا رہا ہے۔

خاتونِ جنت، وہ ملکہ دین و دنیا اپنے گھر میں خود جھاڑو دیتیں، خود کھانا پکاتیں، خود چکی پیستیں، سب کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں۔ کیا رسولؐ کے پہلو میں وہ دل نہ تھا جو ہر باپ کے دل میں ہوتا ہے؟ مگر آپؐ نے فرمایا: بیٹی! از نانِ عالم کی سردار بننے کیلئے تمہیں امتحان کی تمام منزلوں کو طے کرنا ہوگا، سو! اب صبر کرو۔

جب فضہ کو اپنی بیٹی کی کنیزی میں دیا تو فرمایا: بیٹی! ایک دن گھر کا کام تم کرنا، ایک دن فضہ سے لینا۔

دین اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ"

میں نے عرض کیا کہ مطلق مساوات کا نعرہ غلط ہے۔ آنکھ بند کر کے یہ کہنا کہ اسلام مساوات کا علمبردار ہے، یہ درست نہیں ہے۔ نہ از روئے عقل، نہ از روئے قرآن، نہ از روئے سیرتِ رسولؐ و آلِ رسولؐ۔ مگر کوئی کہے کہ پھر کیا یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام دین مساوات ہے؟ ایک معنی سے اسلام دین مساوات ہے، جس معنی سے اسلام دین مساوات ہے، وہ یہ ہے کہ جو غلط اقدار امتیاز قرار دی گئی تھیں، نوعِ انسانی میں بلندی و پستی کی، جو غلط معیار مقرر کر لئے گئے تھے، ان اقدار کو اور ان معیاروں کو جو دنیا نے مقرر کئے تھے، اسلام نے مٹایا، انہیں ختم کیا اور ان کے مقابلہ میں مساوات کا علم بلند کیا۔ اُن کے مقابلہ میں مساوات کا علم بلند کر کے پھر اپنی جانب سے وجوہِ امتیاز مقرر کیں۔ اب جو اسلام کے مقرر کردہ وجوہِ امتیاز ہیں، اُن کے مقابلہ میں مساوات کا نعرہ غلط اور جو جاہلیت کے وجوہِ امتیاز تھے، ان کے مقابلہ میں مساوات کا نعرہ صحیح۔

اب دنیا والوں نے کس کس حیثیت سے امتیازات مقرر کئے تھے، اونچ نیچ کے، درجے مقرر کیے تھے، وہ فقط افسانہ ماضی نہیں ہیں بلکہ حال میں بھی اُس کے بقایا آثار زندہ موجود ہیں جن کا ہر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے۔ ایک دولت کے لحاظ سے بلندی اور غربت کے لحاظ سے پستی۔ جو صاحبِ دولت ہے، وہ بلند اور جو تہی دست ہے، وہ پست۔ یہاں تک کہ اُس کے لئے اس وقت محاورہ تھا اور نہ جانے چودہ سو برس کے انقلابات کے بعد بھی وہ کس چور دروازے سے ہمارے ہاں بھی چھپا رہا ہے آج تک ہے۔ وہ یہ کہ بڑے آدمی جب کہتے ہیں کہ تو مراد اس سے دولت مند ہوتے ہیں۔ فلاں صاحب بڑے آدمی ہیں یعنی دولت مند ہیں۔ تو یہ محاورہ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پیغمبرؐ کے مقابلہ میں مشرکین جاہلیت کی آواز تھی۔ بالکل یہی محاورہ استعمال کرتے تھے۔ قرآن کی آیت ہے:

لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ

"یہ قرآن مکہ یا مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُترا؟"

یہ مکہ اور مدینہ میں نے رواداری میں غلط کہہ دیا۔ دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُترا؟ یہاں مکہ اور مدینہ نہیں ہیں، مکہ اور طائف کا علاقہ کے کے قریب بڑا زرخیز تھا، اس لئے وہاں لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ کثرت سے موجود تھے۔ تو یہ لوگ کہتے تھے کہ آخر یہ قرآن یعنی قرآن کے معنی میں تو نہیں ہوتا، لیکن جس پر اُتارا جاتا، وہ کوئی بڑا آدمی ہوتا۔ اس میں کیا مضر ہے؟ یعنی اگر کسی بڑے آدمی پر قرآن اُترتا، وہ دعوائے رسالت کرتا۔ تو ہماری عادت ہی ہے بڑے بڑے آدمیوں کے سامنے سر جھکانا۔ ہمیں ماننا آسان ہو جاتا۔ لیکن خالق نے بھی قرآن اُتارا تو قبیلہ بنی ہاشم کے ایک یتیم پر جس کے باپ کا انتقال دادا کے سامنے ہو گیا تو وہ خاندانی وراثت

سے بھی محروم ہوگیا۔ ایسے کو منتخب کیا قرآن اُتارنے کیلئے۔

بس اب یہاں قرآن مجید کی ایک اور آیت آپ کو یاد دلاؤں کہ اُس کے مقابلہ میں اللہ کو کہنا تھا کہ اے پیغمبرؐ آپ بڑے آدمی ہیں، یہ کیا کہتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی پر کیوں ہے اُتارا؟ نہیں، بڑے آدمی آپ ہیں۔ ہم نے بڑے ہی آدمی پر اُتارا ہے۔ لیکن رسولؐ کو بھی اگر یہ کہا جاتا کہ آپ بڑے آدمی ہیں تو یہ ذہنیت درست نہ ہوتی کہ آدمی بڑا ہوتا ہے یا کردار؟

تو یہ جناب دولت غربت ایک معیار بلندی اور پستی کا دوسرا معیار ذات اور نسل۔ اونچی نسل میں جو پیدا ہوا، وہ اونچا ہے اور نیچی نسل میں جو پیدا ہوا، وہ نیچا ہے۔ یہ آپ کے پاس کے ملک میں جاہ و جلال کے ساتھ ہمیشہ رہا ہے کہ چار طبقے مستقل بلندی و پستی میں تقسیم شدہ ہوگئے کہ جو برہمن ہے، وہ اونچا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ ہے سپہ گری فن جو جانتا ہے، جس کے ہاں سپہ گری ہوتی رہی ہے، وہ دوسرے درجے پر ہے۔ پھر تیسرے درجے پر وہ ہے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے ہیں۔ چوتھے درجے پر بیچارے کاشتکار، وہ مزدور، یہ سب اور مختلف پیشے کرنے والے۔ تو ذات کے اعتبار سے بلندی و پستی دو چیزیں۔ تیسری چیز رنگت کے لحاظ سے۔

یہ متمدن دنیا یورپ کی، وہاں گورے اونچے ہیں اور کالے نیچے ہیں اور وہ بھی ایک محاورہ ہے گورے کالے کا جوان کے ہاں ہے۔ وہ گورا ہے۔ ہمارے ہاں کا گورا بھی ہو تو کالا ہے۔ تو جناب! وہ گورے اور کالے، وہ دنیا کی لاکھ کانفرنسوں کے باوجود بھی موجود ہے دنیا میں۔ یہاں تک کہ ایک ہوٹل میں گورے اور کالے کھانا نہیں کھا سکتے۔ ایک سکول میں کالے اور گورے پڑھ نہیں سکتے، یہاں تک کہ وہ جو آجکل تمدنی تہذیب کا گویا مرکز مانا جاتا ہے، امریکہ، اور وہاں تھوڑے ہی عرصہ کی بات ہے کہ ایک سکول کو جلا دیا گیا، اس لئے کہ وہاں کالے طالب علم داخل ہوگئے تھے۔ تو وہ سکول کو ہی آگ لگا دی گئی۔ وہ ایک صدر بیچارہ حامی حقوق ہوگیا تھا، اُسے گولی ماردی گئی۔ تو معلوم یہ ہوا کہ یہ رنگت کے لحاظ سے بلندی پستی، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔

کسی ملک والوں نے بڑے نسلی افتخار سے اپنے کو کہہ دیا کہ ہم سورج کی اولاد ہیں۔ وہ سورج کی اولاد ہوگئے۔ ہٹلر کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ جرمن قوم دنیا میں حکومت کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے اور ہیں، وہ محکوم بننے کیلئے پیدا ہوئے ہیں، خلق ہوئے ہیں۔ تو یہ رنگت کے، نسل کے اعتبار سے بھی، کوئی نسل کے اعتبار سے بھی، تو کہیں وہ ایک ہوجاتا ہے، کہیں دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ تو وہ بلندی و پستی تقسیم ہوگئی ان چیزوں میں۔ اب ان سب میں جو مشترک خرابی ہے، وہ میں عرض کردوں۔ مشترک خرابی ان سب میں یہ ہے کہ بلندی و پستی کے معیار انسانی ارادہ و اختیار کی حدود سے باہر مقرر کئے گئے ہیں۔ یعنی جو ان کی ذات میں پیدا ہوا، وہ اپنے اختیار سے کسی ذات کو منتخب نہیں کرسکتا تھا۔ اس ذات میں پیدا ہونا غیر اختیاری بات تھی۔ جس کی رنگت ہے، وہ اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ گورا اپنے اختیار سے اپنے کو کالا نہیں کرسکتا۔ کالا اپنے اختیار سے اپنے کو گورا نہیں کرسکتا۔ دولت غربت بھی نظام دنیا کے ماتحت، تہی دست ہر ایک قادر نہیں ہے کہ دولت مند بن جائے۔ تو معیار بلندی و پستی کے حدود اختیار سے باہر قرار دیئے جاتے ہیں یا اس کو میں ایک عام فہم لفظ میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ گویا بلندی و پستی فطرت کے جوئے سے ہوتی ہے۔ جس نصیبوں سے جو پیدا ہوگیا، اونچے خاندان میں تو گویا قرعۂ فال بلند پڑ گیا اور جو پست خاندان میں پیدا ہوا تو قرعۂ فال پستی اُس کے اوپر پڑ گیا۔ تو اختیاری چیز نہیں ہے۔ اب جب بلندی و پستی

اختیاری نہ رہی تو ایک عقلی چیز یہ ہے کہ اصلاحِ عمل کیلئے دونوں چیزیں زہر ہیں۔ایک پورا بھروسہ کامیابی پر اور ایک پوری مایوسی۔

کامیابی سے مثال کے طور پر طالب علموں کی زندگی ہے کہ ایک لڑکا ہے بہت اچھا، محنتی، صاحب صلاحیت ہے مگر کسی وجہ سے اس کو یقین ہو گیا ہے کہ میں بہر حال فیل ہو جاؤں گا۔ کسی تعصب کی وجہ سے کچھ ماسٹر صاحب کی ناراضگی کی وجہ سے، کچھ وہاں کے ماحول کے ناساز گار ہو جانے سے، بہر حال اُسے یقین ہو گیا ہے کہ میں فیل ہو جاؤں گا۔ تو اب وہ کیوں محنت کرے؟ وہ سمجھتا ہے کہ محنت کروں گا، تب بھی فیل ہو جاؤں گا، محنت نہ کروں گا، تب بھی فیل ہو جاؤں گا۔ تو اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ راتوں کی نیند بے چین کرے؟ اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ زحمت و مشقت سے کتابوں کو تیار کرے؟ وہ سمجھتا ہے کہ میری قسمت میں تو ناکام ہی ہونا ہے۔

ایک وہ ہے جسے کسی وجہ سے یقین ہو گیا کہ میں تو کامیاب ہو کر رہوں گا۔ وہ بھی کچھ ماحول وغیرہ سے اس کا تعلق ہے، کچھ اس کی خصوصیت ایسی ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ فیل ہو جائے۔ یہ بھی محنت کیوں کرے؟ ارے یہ تو اطمینان کی نیند سوئے، تب بھی پاس ہو گا تو کیوں بے چین کرے اپنی نیند؟

ایک محنت نہ کرے گا بے ضرورت سمجھ کر، ایک محنت نہ کرے گا بیکار سمجھ کر۔ بس یونہی اگر بلندی و پستی کا بٹوارہ غیر اختیاری اعتبار سے ہوا تو پھر جو بلند خاندان میں پیدا ہوا یا اُس رنگت والا ہے جو اونچا ہے، وہ اپنے کو سدھارنے کی کوشش کیوں کرے؟ وہ تو سمجھتا ہے کہ میں چاہے جیسا ہوں، مگر اونچا ہوں۔ اور جو نیچی ذات میں پیدا ہوا ہے، یا اس رنگت کا ہے، کالا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں تو بہر حال ناکام ہوں۔ لہٰذا وہ اصلاحِ عمل کی فکر کیوں کرے؟ پڑھے لکھے کیوں؟ ضبطِ نفس کیوں کرے؟ اپنے کو اچھے اخلاق سے آراستہ کیوں کرے؟ وہ تو کہتا ہے کہ جتنے بھی جتن کروں، نیچے ہی رہوں گا، اونچا نہیں ہو سکتا۔ اسے اطمینان ہے کہ میں اونچا ہوں، نیچا نہیں ہو سکتا۔ اسے مایوسی کامل ہے کہ میں نیچا ہوں، اونچا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اصلاحِ عمل کے جذبے دونوں کے ختم ہو گئے۔ اسلام نے کہا:

"اَلْاِیْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفُ خَوْفٍ وَنِصْفُ رَجَاءٍ"۔

"ایمان کے برابر کے دو ٹکڑے ہیں، خوف اور اُمید"۔

یقین کامل کرنا کہ بس ہم نجات پا جائیں گے، یہ بھی خدا کو ناپسند ہے۔ بالکل نا اُمید ہو جانا کہ ہم سوائے دوزخ کے کہیں جا ہی نہیں سکتے، یہ بھی خدا کو ناپسند ہے۔ اگر سمجھ لیا کہ بہر حال جنت ہمارے دم قدم سے لگی ہوئی ہے تو کیوں اعمالِ صالحہ میں محنت کرے گا؟ کیوں نیند بے چین کر کے صبح کی نماز پڑھے گا؟ کیوں خواہشات نفس کو روکے اور لذائذ کو مطلق العنانی کے ساتھ حاصل نہ کرے؟ اُسے یقین ہے کہ چاہے میں جو کروں، جنت میرے دم قدم کو لگی ہوئی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ یہ تصور کرنا یا کسی شخص کا یہ تصور پیدا کروانا کہ تم بہر حال جنت میں جاؤ گے، یہ مقصدِ الٰہی کی دشمنی ہے اور وعظ کے معنی عموماً لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس نے کہنا شروع کیا، ارے بھئی! دوزخ ہے۔ یہ تمہاری بداعمالیاں دوزخ کے سوا کہیں نہیں لے جاسکتیں۔ تو اگر اُس نے روز روز یہ ہی کہا اور مجمع کو دوزخ کا یقین دلا دیا تو جو نماز پڑھتا تھا، وہ بھی چھوڑ دے گا کہ پڑھوں تب بھی دوزخ میں جاؤں گا، نہ پڑھوں تب بھی دوزخ میں جاؤں گا۔ جتنا کارِ خیر جو کر بھی رہا تھا، وہ چھوڑ دے گا کہ فائدہ ہی

کیا ہے، جب دوزخ یقینی ہوگئی؟

معلوم ہوا کہ وہ بھی دشمنی، یہ بھی دشمنی۔ دورِ سابق کے انبیاء میں بعض میں ایک نمایاں پہلو تھا کیونکہ عبوری دور ہوتا ہے، اس کو میں روزمرہ کی مثال میں یوں پیش کرتا ہوں کہ جب بچے لکھنا شروع کرتے ہیں تو ان کو تختی لکھ دی جاتی ہے کہ ایسا لکھو۔ اس میں خوشخطی کے اصول ہیں۔ کسی خوشنویس سے تختی لکھوائی جاتی ہے۔ اس کو سرمشق کہتے ہیں جس کو دیکھ دیکھ کر وہ مشق کریں۔ تو اس میں اُصول ہے کہ الف اتنے نقطوں کا اور ب اتنے قد وقامت کی اور جیم کا حلقہ ایسا ہونا چاہئے۔ تو ہر حرف اپنے پورے کمال پر ہے۔ لیکن جس وقت پر کہ مشق ہوگئی، اب آگے بڑھا، اب ملا ملا کر حرف لکھوانا شروع کئے کہ لکھو، اب دو حرف مل گئے تو کیا ہوا کہ جیم کا سرہ گیا، دھڑ غائب ہوگیا۔ ب کا قد رہ گیا، سر غائب ہوگیا۔ اس طرح فرض کیجئے کہ ق کو الف سے ملا دیا تو ق کا سر رہ گیا، پیٹ چلا گیا تو ہر حرف کٹ گیا۔ مگر معیارِ تعلیم اونچا ہوگیا۔

بس یہیں گزشتہ دور کے انبیاء تھے کہ عبوری دور کیلئے آئے تھے۔ اسلئے کسی نے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دیکھو، عمر بھر شادی نہیں کرتے یعنی ضبطِ نفس کی ایک مثال کامل پیش کر دی۔ مگر وہ تعلیم خود بتا رہی ہے کہ یہ ابتدائی دور کی تعلیم ہے۔ یہ دائمی نہیں ہے۔ تو عبوری دور کے جو انبیاء تھے، ان انبیاء میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی پر وہ پہلو غالب ہے، کسی پر یہ۔

حضرت یحییٰؑ رات دن رو رہے ہیں، انہیں خوف الٰہی کا احساس پیدا کرواتا ہے۔ جنابِ عیسیٰؑ بشارت دے رہے ہیں۔ روایت میں ہے کہ دونوں حقیقی خالہ زاد بھائی تھے ہی۔ تو جنابِ یحییٰؑ سے ملاقات ہوئی جنابِ عیسیٰؑ کی تو جنابِ یحییٰؑ نے ان سے کہا کہ واہ واہ! آپ کو تو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے دوزخ پیدا ہی نہیں کی۔ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ آپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بہشت نہیں پیدا کی۔

آپ نے دیکھا کہ وہ بھی ایک جزو کی مشق کروا رہے ہیں، یہ بھی ایک جزو کی مشق کروا رہے ہیں۔ اب جو آیا نظامِ تعلیم کو اونچا بنانے کیلئے، اس کے برابر کے دو لقب ہو گئے "بَشِيرًا وَنَذِيرًا"، بشارت دینے والا اور انذار کرنے والا۔ بشارت ہے اُمید کا سرمایہ فراہم کرنے کیلئے، انذار ہے خوف کا محرک پیدا کرنے کیلئے۔ تب ایمان کے دونوں جزو حاصل ہوں گے، نصف خوف و نصف رجا۔ آدھا ایمان خوف ہے اور آدھا ایمان اُمید ہے۔ یہ اُمید و بیم، یہی کامل ایمان ہے۔ اب کوئی تعلیم ایسی جو اعتمادِ کامل پیدا کر دے یا مایوسی کامل پیدا کر دے، غلط ہوگی۔ تو اس سب میں یہ خرابی ہے اور پھر عقلی طور پر بھی دیکھئے کہ دولت کو معیار سمجھا بلندی کا۔ تو سببِ بلندی جو شے ہوتی ہے، وہ خود آدمی سے اونچی ہوتی ہے۔ کسی بڑے باپ کا بیٹا ہونے کا فخر وہی کرتا ہے جو خود اس منزل پر نہ ہو۔ وہ یونہی تعارف کرواتا ہے کہ فلاں صاحب کا میں بیٹا ہوں۔ اگر وہ خود کچھ ہو تو یہ تعارف نہ کرواتا۔

اب جو شخص اپنے آپ پر فخر کرتا ہے کہ میں صاحبِ دولت ہوں یا دوسرے اُسے اونچا کہتے ہیں، تو یہ بڑا ہے، اس لئے کہ صاحبِ دولت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانیت سے اونچی شے سمجھتے ہیں۔ تو اگر دولت کو سببِ فخر سمجھیں تو اصل دولت تو جمادات ہیں۔ ارے وہ ٹھوکروں میں آنے والے پتھر، سنگِ خارا ہیں، وہی حقیقت کے لحاظ سے سونا چاندی اور یاقوت ہیں۔ یہ تو

رنگ ساز کی بات ہے کہ جیسا رنگ جسے دے دیا، ویسی اُس کی قیمت ہوگئی۔ تو اگر دولت کی فراوانی پر کسی نے اپنے آپ کو بلند سمجھا تو اس کے معنی ہیں کہ پتھروں کے ڈھیر کے جمع ہو جانے کو اپنے لئے سبب فضیلت سمجھا۔ تو اسے اسلام نے مٹایا ہے۔ دولت چھنی نہیں مگر دولت کی قدر گھٹا دی۔

اس کیلئے بس سیرت رسولؐ کا ایک واقعہ پیش کر کے آگے بڑھوں گا کیونکہ ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے کہ حضور! جو رسولؐ کا دربار تھا، جہاں خاص جو بھی آیا بیٹھ گیا۔ اب رئیسوں کی ذہنیت جو ہوتی ہے، وہ ہر دور کے رئیسوں کی ہوتی ہے۔ تو مجد میں بہت رئیس ہوتے تھے۔ تو یہ جب آتے تھے تو اب کئی کئی دفعہ آ کے دیکھتے تھے کہ محفل ہمارے بیٹھنے کے لائق کس وقت ہے؟ اور زیادہ تر پیغمبرؐ کے قریب پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے لوگ۔ تو اب وہ کہتے ہیں، اس وقت محل نہیں ہے ہمارے جانے کا۔ اب ایک وقت اتفاق سے موقع مل گیا، دیکھا کہ رسولؐ کا پہلو خالی ہے۔ کوئی وہاں ایسا آدمی نہیں دیکھا تو وہ سمجھے کہ ہاں! یہ وقت بہت اچھا ہے۔ اب پیغمبر خداؐ کی خدمت میں آ کر باتیں کرنے لگے۔ بہت چپکے چپکے، جیسے ہم بڑے مقربین میں ہیں۔ اتنی دیر میں ایک اور صحابی آ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان کے بیٹھنے سے وہ جگہ بھر تو نہیں گئی تھی۔ وہ اس دربار کا عادی ہے۔ لہٰذا وہ آ کر بلاتکلف اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اب زبان سے تو کچھ نہیں کہا، اب نفسیاتی طور پر دیکھئے گا کہ یہ عمل ہوا ہوگا، لاشعوری طور پر یا نہیں کہ زبان سے کہا تو کچھ نہیں لیکن اپنے دامنِ قبا کو ذرا سا سمیٹ لیا اور رسولؐ کی نگاہِ مواخذہ نے اس خفیف عمل کی گرفت کی۔ ارشاد فرمایا:

''یہ تم نے کیا کیا؟''

اب ہاتھ جوڑ کر: جی میں نے کیا ہی کیا ہے؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں نے کیا؟

فرمایا: نہیں، میں نے محسوس کیا، میں نے دیکھا کہ تم نے کیا کیا؟ یہ تم نے اپنا دامن کیوں سمیٹا؟ کیا اس دامن کے ذریعے سے اس کی غربت تم میں آ جاتی اور تمہاری دولت کچھ اس کے پاس چلی جاتی؟

اب ظاہر ہے کہ اس کا جواب کوئی نہیں تھا۔ تو ممکن ہے واقعی ضمیر شرمندہ ہوا ہو۔ کہا: حضورؐ! خطا ہوئی۔ اب اس کے کفارے میں میں اپنی آدھی دولت اپنے اس بھائی کو دیتا ہوں۔ اب رسولؐ کے چہرے پر آثارِ غضب تھے۔ ایک دم سے لبوں پر تبسم آ گیا۔ اب نتیجہ بعد میں بتاؤں گا۔ میں کہتا ہوں کہ دیکھئے یہ ہے خود اختیاری اشتراکیت۔ ضمیر کی تحریک سے شریک بناؤ دوسرے کو۔

اُس نے کہا کہ میں اپنی آدھی دولت اسے دیتا ہوں۔ رسولؐ کے لبوں پر تبسم آیا اور اب اس صحابی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بھئی! انہوں نے ذرا سا ایک عمل کر دیا تھا تو وہ شرمندہ ہیں اس پر۔ گویا رسولؐ ان کی طرف سے معذرت کر رہے ہیں۔ یہ اس پر شرمندہ ہیں اور اس کے کفارے میں یہ اپنی آدھی دولت تمہیں دے رہے ہیں۔ اُس نے کہا: حضور! شکریے کے ساتھ واپس۔ پھر حضرتؐ مسکرائے اور ارشاد فرمایا: کیوں؟ میں نے جبر نہیں کیا ہے۔ میں نے تو تحریک بھی زبانی نہیں کی ہے۔ وہ خود سے دے رہے ہیں تو انکار کیوں کر رہے ہو؟ کہا: حضورؐ! اندیشہ ہے کہ یہی ذہنیت پیدا نہ ہو جائے۔

اس کے بعد ذات کے سوال۔ وہ بھی میں نے کہا کہ عقلی طور پر ذات میں پیدا ہونا کوئی اختیاری چیز نہیں ہے۔ لہٰذا وہ بلندی

وپستی کا پیش خدا معیار نہیں ہو سکتا۔ اونچی ذات والے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے کردار کے لحاظ سے بھی اونچا کرے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا خاندانی فخر جو ہے، وہ پستی سے بدل جائے گا اور رنگت، وہ بھی غیر اختیاری چیز ہے، وہ اللہ نے جو رنگ عطا کر دیا۔ پیغمبر اسلام نے دونوں کو سمو کر ملک اور قوم و نسل کو سمو کر اعلان فرمایا اور اب اس کی تمہید میں ذرا سا عرض کرتا ہے کہ آجکل تو سربراہانِ مملکت خیر سگالی کے دورے بہت کرتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ میں جو صاحب اقتدار ہوتا تھا، وہ قطب کی طرح ایک جگہ بیٹھتا تھا اور اب نہیں۔

وضع یہی ہے، بلندی یہی ہے۔ ادھر گئے وہ، ادھر آئے وہ۔ یہ سب ہوتا رہتا ہے داخل خارج۔ تو جو بھی سربراہ مملکت جہاں جائے گا، وہ وہاں یہ کہے گا کہ ہمارے اس ملک سے اتنے قدیم تعلقات ہیں، اتنے روابط ہیں۔ اب اس ملک میں کیا ضرورت ہے کہ دوسرے ملک کا بھی ذکر کیا جائے۔ جب اُس ملک میں جائیں گے تو وہاں بھی یہی کہیں گے۔ اُس دن اس ملک کا خیال نہیں آئے گا۔ عام طور پر تقاضائے بلاغت کہہ سکتے ہیں کہ یہی ہے کہ محل کے اعتبار سے آدمی بات کرے۔ جہاں گئے، ویسی بات کرے۔ اب میں آپ کو سیرت محمد مصطفیٰ ؐ کی رفعت و بلندی کھاؤں کہ اگر حضرت ملک ایران کا کوئی دورہ فرماتے، وہی جیسے بڑے آدمی دورہ کیا کرتے تھے، کوئی حضرت تشریف لے گئے ہوتے کسی دفعہ ایران میں اور ایران کی سرزمین پر پہنچ کر یہ اعلان فرماتے، تو جو معنوی بلندی اس کی ہے، جو عقلی بلندی ہے، وہ اپنی جگہ پر رہتی مگر محل کے اعتبار سے اس میں یہ بلندی پیدا نہ ہوتی کہ ملک عرب میں بیٹھ کر، مسجد نبوی میں تشریف فرما ہو کر، خاندانی عربوں کے احاطے میں رہ کر اور بنی ہاشم اور قریش، وہ بھی گرد و پیش میں موجود اس مجمع میں اور پھر ایک جز و تمہیدی طور پر عرض کرتا ہوں کہ اقلیت کا کوئی تصور ہوتا ہے؟

ارے جناب! ہمارے ہاں ایک وقت میں مسلمانوں کا تناسب کہا جاتا تھا 14 فیصد۔ یوپی میں خصوصیت سے 14 فیصد۔ ارے فیصد 14 ہے تو کچھ تو ہے۔ لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ تمام ملک عرب میں ایران کا ایک عدد سلمان فارسیؓ، تمام صحابہ کرام میں روم کا نمائندہ ایک عدد سہیل رومی، حبش کا نمائندہ مثلاً ایک بلال حبشی۔ یہ کوئی اقلیت ہوتی ہے؟ پورے ملک میں ایک آدمی کو کہیں اقلیت کہتے ہیں؟ وہ شمار ہی میں نہیں آتا۔ اب اتنی بڑی اکثریت یعنی کل جمہور عرب اور قریش اور ان میں بھی بنی ہاشم، ان سب کے مجمع میں بیٹھ کر اور منبر سے اعلان ہو رہا ہے:

"لَا فَخْرَ الْعَرَبِيِّ عَلَى غَيْرِ الْعَرَبِيِّ وَلَا لِلْقُرَشِيِّ كُلُّكُمْ أَوْلَادُ آدَمَ"۔

"کوئی فخر نہیں ہے عرب کو غیر عرب پر"۔

ارے دنیا بھول جاتی عرب تو یاد رکھتے اسے۔ کہا جا رہا ہے کہ "کوئی فخر نہیں ہے عرب کو غیر عرب پر اور نہ قریشی کو غیر قریشی پر۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو۔"

اور دوسری جگہ کہا، اب رنگت کیلئے:

"بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ"۔

میرے ہاں یہ تفریق نہیں ہے گورے کولال کہتے تھے، اُس سفیدی میں سرخی ہوتی ہے غالب۔ میں لال اور کالے سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ یعنی یہ رنگت میرے لئے کوئی چیز نہیں۔ تو اب آپ نے دیکھا کہ جو غلط اقدار مساوات تھیں، اُن کو مٹا کر مساوات قائم کی۔ اب ان سب کی دوڑ ہے ایمان اور عملِ صالح میں۔ اگر کالا بڑھ جائے تو وہ افضل ہو جائے گا۔ اگر گورا بڑھ جائے تو وہ افضل ہو جائے گا۔ اگر غیر قریشی بڑھ جائے تو وہ افضل ہو جائے گا۔ ان سب کو دعوت دی گئی ہے۔ مساوات یہ ہے کہ امتحانِ داخلہ میں کوئی رنگ وغیرہ کی قید نہیں ہے۔ اب بلندی ہوگی تو امتحان کے بعد ہوگی۔

اس کو اپنے عمل سے نبھایا اور دوسروں کے اوپر کیا یہ چیز بار نہیں تھی؟ بار تو تھی کہ کیا کریں؟ اب ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' پڑھ دیا ہے۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ سب سہنا پڑے گا؟ بار ہو رہا ہے قدم قدم پر۔ بلالِ حبشیؓ کو مؤذن بنا دیتے ہیں۔ خاندانی عربوں پر بہت گراں ہے۔ اب چونکہ بہت دفعہ سن چکے ہیں اس زبان سے کہ گورا کالا کچھ نہیں ہے، تو یہ کہہ سکتے نہیں کہ یہ حبشی ہے، یہ کالا ہے، سوچ کر گویا رسولؐ کے معیارِ ذہن کے مطابق (سیاست دانی اسی کا نام ہے) ایک وجہ تراشتے ہیں۔ گویا صرف کی پہلو رسولؐ کو بتاتے ہیں (اسی سے معرفتِ رسولؐ ظاہر ہے) کہتے ہیں:

یارسولؐ اللہ! آپؐ نے بلال کو مؤذن بنا دیا؟

ہاں! پھر کیا ہوا؟

حضور! وہ تو شین صاف نہیں کہہ سکتے۔ ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' کو ''اَسْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' کہتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں، ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کیونکہ ہمارے ہاں لکھنؤ میں کم سے کم یہ محاورہ ہے کہ فلاں شخص کا ''شین'' اور ''ق'' صحیح ہے یعنی یہ گویا تمدن اور تہذیب کی بڑی نشانی ہے شہریت کی۔ دیہاتوں میں مومنین ہیں، سادات ہیں مگر وہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاہد علی کو ساہد علی کہیں گے اور ایسے ہی قاسم کو کاسم کہیں گے۔ تو بڑی مشکل سے شین اور قاف صحیح ہوتا ہے۔ تو جو ڈھونڈ کے نکالا تھا، کوئی غلط بات نہیں تھی اور پیغمبرؐ نے بھی جھٹلایا نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ نہیں، تم غلط کہتے ہو۔ یہ نہیں فرمایا، مگر اب کیا کیا جائے کہ یہ فرما دیا:

''سِیْنُ بِلَالٍ شِیْنٌ عِنْدَ اللهِ''۔

''بلال کا سین اللہ کے ہاں شین ہے''۔

بات یہ ہے کہ ہم ان کانوں سے سنتے ہیں تو جو اس زبان سے لفظ نکلتا ہے، وہ سمجھتے ہیں اور جس کو سننے کیلئے کانوں کی ضرورت نہیں، وہ دل کی صدا سے سنتا ہے۔ اب فلسفہ مؤذن بنانے کا بھی عرض کر دوں، بیچ میں ایک پہلو کہ طرف مجمع کی توجہ دلاؤں، میں کہتا ہوں، ذرا دیکھئے کہ ایک مؤذن کے انتخاب میں رائے عامہ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ اب اصل موضوع کے لحاظ سے پیغمبرؐ کے عمل کا فلسفہ عرض کروں، جتنا میں سمجھا ہوں، یاد رکھئے کہ امامِ مسجد کو ہی دیکھے گا جو مسجد کے اندر جائے گا اور مؤذن کی صدا وہ بھی سنے گا جو راہ گزر سے جائے گا۔ تو یہ بلال کو مؤذن قرار دینا نہیں ہے، یہ مساوات اسلامی کا ایک علم ہے جو نصب کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد سب سے زیادہ پست جماعت اس وقت سمجھی جاتی تھی غلام اور کنیزوں کی۔ ان کو تو اَثاثُ البَیت میں داخل

سمجھا جاتا تھا۔ حقوقِ انسانیت اُن کیلئے کچھ تھے ہی نہیں۔ تو جیسے وہاں دولت کو چھینا نہیں مگر دولت کی قدر گھٹا کر ذہنیت بدلی۔ اسی طرح اس وقت کے حالات ایسے نہیں تھے، غلامی اور کنیزی کو ختم نہیں کیا، اسباب فراہم کئے کہ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہوتی جائے اور اس کے ساتھ ذہنیت کی تعمیر کی۔ وہ بیٹی جس کی تعظیم کو کھڑے ہوتے ہیں، پہلے جو اس کو شوہر کے گھر بھیجا تو کوئی خادمہ بھی ساتھ نہیں تھی۔ لہٰذا وہ خاتونِ جنت، وہ ملکہ دین و دنیا، وہ اپنے گھر میں خود جھاڑو دیتیں، خود کھانا پکاتیں خود چکی پیستیں، سب کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتیں۔ کیا رسولؐ کے پہلو میں وہ دل نہ تھا جو ہر باپ کے دل میں ہوتا ہے؟

ارے اصحاب کبھی ضرورت کے تحت گھر کے اندر آئے ہیں اور سیدہؑ ضرورت کے تحت وہ چکی کو چھوڑ کر ہٹ گئی ہیں تو انہوں نے اس چکی کی لکڑی کو، جس کو پکڑ کر گردش دی جاتی ہے، اس کا نام مجھے معلوم نہیں ہے، اس لکڑی میں خون کے قطرے دیکھے ہیں۔ جابر بن عبداللہ انصاری جو روتے ہوئے رسولؐ کے پاس گئے کہا: کیوں روئے رہے ہو؟ کہا کہ میں نے لکڑی میں لہو دیکھا ہے۔ تو وہ ایک دفعہ آئے تو لکڑی میں انہوں نے دیکھ لیا اور پیغمبر خدا جو آتے تھے تو کبھی وہ ہاتھ انہوں نے نہیں دیکھے اور اگر جابر کی آنکھوں سے آنسو بہے، اس خون کو دیکھ کر تو رسولؐ جو روز اس خون کو ہاتھوں پر دیکھتے تھے، تو کیا ان کے دل سے اتنے ہی قطرے لہو کے نہیں ٹپکتے تھے۔ مگر نہیں، جذبات کے تقاضے اور ہیں، فرائض کے تقاضے اور ہیں۔ جانتے ہیں میری بیٹی! میں اس کو سن جناب اللہ سند دوں گا "خاتونِ جنت"۔

تو قیامت تک تو میری ماننے والی ہر خاتون تو ایسی نہیں ہے کہ اُسے خادمہ مل سکے۔ لہٰذا اگر کوئی فاطمہ کو اپنی بی بی سمجھنے والی، فاطمہ کو اپنی شہزادی ماننے والی، وہ اپنے گھر میں جھاڑو دے تو ذلت محسوس نہ کرے، فخر محسوس کرے کہ ہم وہ خدمت انجام دے رہے ہیں جو ہماری بی بی پاک انجام دیتی تھیں۔ اگر چکی بھی پسے تو اس سے احساس حقارت نہ کرے۔ سمجھے کہ یہ تو نمونہ ہے ہماری بی بی نے چھوڑا ہے۔ بہت عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ مقصد حاصل ہو گیا کہ گھر کا کام ان کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن اب کہیں سے مالِ غنیمت میں کچھ کنیزیں بھی آئیں اور وہ اصحاب میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ یہاں کنیزوں کی تقسیم کے مستحق ہوتے تھے ذمہ دار پرورش قرار دینا۔ تو روایت بتاتی ہے کہ حضرت امیرؑ نے گھر میں آکر فرمایا حضرت فاطمہ زہراؑ سے کہ تمہارے والد بزرگوار کے پاس کنیزیں آئی ہیں اور مختلف صحابہ کو دے رہے ہیں۔ تو جتنا سب کو حق ہے، اُتنا تو تمہیں بھی ہے۔ لہٰذا اپنے والد بزرگوار کے پاس جا کر خواہش کرو کہ ایک کنیز تمہارے سپرد کریں۔ شوہر کے کہنے سے گئیں اور اب جن الفاظ میں کہا ہو، وہ روایت نے نہیں بتایا۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے ہاتھ دکھا دیئے ہوں گے۔ یہی کافی ہے۔ بہر حال خواہش پیش کی۔ خواہش ناروا نہیں تھی مگر پیغمبر خدا کو پھر اپنی بیٹی کے ذہن کو بلند سے بلند معیار پر لے جانا تھا۔ تو جب بیٹی نے خواہش کی تو تب فرمایا: بیٹی! ہاں ٹھیک ہے۔ مطالبہ صحیح ہے مگر تم خود بتاؤ کہ کنیز لوگی یا ایک تسبیح ایسی سکھا دوں جو آسمان کے ملائکہ کو بہت پسند ہے۔ لیجئے! فاطمہؑ سمجھیں کہ میں معرضِ امتحان میں آ گئی۔ کہنے لگیں کہ بابا! تسبیح سکھا دیجئے۔ اب وہ تسبیح، وہ تمہید کے بعد بتائی ہوگی۔ بہت طولانی دعا ہوگی۔ وہ دعا اب بحمد اللہ اکثر افراد ہر نماز کی تعقیبات میں پڑھتے ہیں۔ چونتیس (34) مرتبہ اللہ اکبر، تینتیس (33) مرتبہ الحمد للہ اور تینتیس (33) سبحان اللہ۔ اس لئے شیعہ سنی سب کے ہاں اس کا نام تسبیح فاطمہ زہراؑ ہے۔

اب آئیں گھر پر خوش خوش۔ شوہرؑ نے پوچھا: کنیز لے آئیں؟ ارے کہا: کنیز تو نہیں، اس سے بہتر ایک چیز لے آئی۔ کہا: مجھے رسولؐ نے یہ تعلیم کیا ہے۔ حضرت علیؑ بھی جیسے خوش ہو گئے۔ مگر پھر کچھ دن کے بعد اب بلا طلب فاطمہؑ زہرا کو ایک کنیز عطا فرمائی اور وہ کنیز ہے کہ دنیا کی صاحب اقتدار خواتین کا نام ہمیں یاد نہیں مگر اس کنیز کا نام ہمارے لوحِ دل پر نقش ہے۔ وہ کون؟ جناب یہ فضہؓ۔

اور اپنے الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ جب فضہ کا ہاتھ دیا سیدہؑ عالم کے ہاتھ میں تو اس کے ساتھ ہدایت فرمائی: دیکھو یہ کنیز تو تمہارے سپرد کر رہا ہوں مگر گھر کا پورا کام فضہؓ پر نہ ڈال دینا۔ اب بھی جب کنیز مل گئی ہے تو گھر کے کام سے تم بے تعلق نہ ہونا۔ گھر کا پورا کام فضہؓ پر نہ ڈالنا۔ اب جو اصل واقعہ ہے، وہ مجالس کے فیض سے آپ کو معلوم ہی ہے۔ ذہن میں آ گیا ہوگا۔ لیکن فرض کیجئے کہ معلوم نہ ہوتا۔ اب یہ ہمارے سامنے چند برس اُدھر کی بات ہے جو یہ قانون ہوا کہ ہفتے میں ایک دن دو کانیں بند ہوں۔ ہفتے میں ایک دن کارخانے بند ہوں۔ جب پوچھا کہ کیوں ہے؟ کوئی گہرا فلسفہ کسی نے نہیں بیان کیا۔ یہ کہ نوکروں کو ایک دن آرام کا وقت ملے۔

اب بالکل کوئی غیر ہو اگر، وہ جو واقعہ سے ناواقف ہو، وہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر میں اس انقلاب کے اس اصلاح ہونے کے بعد، کسی سٹیج سے یہ کہتا کہ دنیا کو چودہ سو برس کے بعد آج یہ احساس ہوا اور ہمارے رسولؐ نے جب کنیز دی ہے، فاطمہؑ کے سپرد کی ہے، تو اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ دیکھو! ہفتے میں کم از کم ایک دن ضرور فضہؓ کو آرام دینا۔ اگر ہفتے کے ایک دن کی بات ہوتی تو میں فخریہ پیش کر سکتا تھا، چہ جائیکہ ہفتے میں ایک دن کیسا برابر کی تقسیم۔

فرماتے ہیں: دیکھو! ایک دن گھر کا کام تم کرنا، ایک دن فضہؓ سے لینا۔ اس کے معنی ہیں کہ چودہ سو برس کی ترقی کے بعد بھی دنیائے تہذیب ابھی پیغمبر خدا کی تعلیم سے بہت درجہ پیچھے ہے اور اب سیدہؑ عالم فضہؓ کو لئے ہوئے گھر پر آئیں اور جو رسولؐ نے بتایا، اُس کے مطابق عمل کیا۔ اب خانۂ عرب میں پلنگ نہیں ہوتے تھے۔ مگر محاورے کے طور پر کہتا ہوں کہ ایک فضہؓ اطمینان سے پلنگ پر بیٹھتیں اور مخدومۂ عالم کھانا تیار کر کے لا کے کنیز کے آگے پیش کرتیں۔ ایک دن فاطمہ زہراؑ مصروف عبادت رہتیں اور اس دن فضہؓ کھانا پکا کے رکھتیں۔

اب ایک جانے پہچانے واقعے کی طرف آپ کا ذہن منتقل کروں۔ میں کہتا ہوں کہ اُدھر سے اس اصول کے ٹوٹنے کا مجھے علم نہیں۔ یعنی کئی دن مسلسل فضہؓ نے کھانا پکایا ہو۔ اس کا ضعیف سے ضعیف روایت میں کوئی ثبوت نہیں لیکن اُس طرف سے اس اصول کے ٹوٹنے کا مجھے علم ہے۔ وہ ھل اتیٰ والے تینوں دن فضہؓ گھر میں موجود ہیں۔ یہ جز وروایت ہے، جن لوگوں نے روٹیاں دی تھیں، ان میں فضہؓ بھی ہیں جن کی شان میں سورۂ ھل اتیٰ اُتری ہے، ان میں فضہؓ بھی ہیں۔ تو فضہؓ گھر میں موجود ہیں لیکن روٹیاں تینوں دن حضرت فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ کی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ وہ بھی روزوں میں شریک ہوئی تھیں، تو سیدۂ عالم نے کہہ دیا کہ فضہؓ تم روزے سے ہو، لہٰذا تمہارے حصے کے دن میں بھی ہم ہی پکا دیں گے۔ میں نے کہا: اِدھر سے کہیں نہیں، غلط روایت بھی نہیں اور اُدھر سے ہمارے سامنے روایت موجود، ثبوت موجود۔ بس اب اصول عرض کروں عقلی طور پر کہ جب یہ برابر کی تقسیم ہے تو جس دن کام اُن کے ذمہ ہے، اُس دن آرام ان کا حق

ہے۔جس دن کام ان کے ذمہ ہے، اُس دن آرام اُن کا حق ہے۔

یاد رکھئے کہ اگر فضہؓ سے کئی دن لے لئے جائیں تو یہ دوسرے کے حق پر قبضہ ہے۔وہ ظلم ہوتا ہے اور خود کئی دن کام کر دیا، یہ اپنے حق کا دے دینا ہے۔وہ عین ایثار ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ اپنے غلام قنبرؓ کو ساتھ لئے ہوئے بازار میں جاتے ہیں۔دو پیرہن خریدتے ہیں ایک سات درہم کا، ایک پانچ درہم کا۔فرق ہی کیا تھا؟ دو درہم۔پھر بھی کچھ فرق تو ہے۔جو سات درہم کا پیرہن ہے، وہ قنبرؓ کو دیتے ہیں اور جو پانچ درہم کا ہے، وہ خود زیب جسم فرماتے ہیں۔قنبرؓ عرض کرتے ہیں: مولاؑ! وہ ذرا بہتر ہے، وہ آپؑ اپنے لئے رکھئے۔

تو میں مشترک جلسوں میں کہا کرتا ہوں، جس میں غیر مسلم بھی ہوں کہ ہم میں سے کوئی آدمی ایک تو ایسا کرتا ہی کیوں اور اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کرتا بھی تو جونہی قنبرؓ نے سوال کیا تھا، وہ اپنی مصلحانہ حیثیت پر لیکچر دے دیتا۔وہ کہتا: اے قنبرؓ! میں چاہتا ہوں کہ غلامی کے معیار کو اونچا کروں۔میں چاہتا ہوں کہ تفریق کو ختم کروں۔حالانکہ مقصود امیرالمومنین کا یہی تھا لیکن قنبرؓ کے جواب میں یہ تقریر کر دی جاتی تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی۔قنبرؓ کو احساسِ غلامی ہو جاتا۔اس لئے قنبرؓ کے جواب میں یہ نہیں کہا۔ویسا کہا جو اپنے بچوں سے کہا جاتا ہے:

''ارے! تم نوعمر ہو، تمہیں وہ اچھا معلوم ہوگا۔میرا کیا ہے؟ میں یہ پہن لوں گا''۔

41

دین اسلام

میں نے کہا اسلام کا مطلب ہے اللہ کی مرکزیت اور اسی مرکزیت کے ماتحت توحید ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی آواز اس توحید کی مظہر ہے۔ صحیح طور پر ایک مسلمان کا نظامِ تمدن بھی اسی لا اِلٰہ اِلا اللہ کے ماتحت ہے اور نظامِ سیاست بھی۔ جو صحیح نظامِ سیاست ہے، وہ اسی لا اِلٰہ اِلا اللہ کے ماتحت ہے۔

تمدن کے معنی ہیں آپس میں مل جل کر رہنا اور تعلقاتِ انسانی کو نبھانا۔ عقلی طور پر انسان سے سب سے زیادہ نزدیک اس کی ذات ہے۔ لہٰذا اصل مرکزِ محبت تو خود اپنی ذات ہوگی۔ پھر اپنی ذات سے رشتے چلیں گے۔

سب اللہ کی مخلوق ہے اور جب سب اس کی مخلوق ہے تو اس کے سائے میں جو تمدن پرورش پائے گا، اس میں پھر اپنی بیٹی اور کنیز میں فرق نہیں ہوگا۔

اگر انسان واقعی مسلم ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کو سپرد کیے ہوئے اللہ کے، تو اب اللہ کے مقابلہ میں نہ اس کی انفرادی رائے کچھ ہوگی، نہ اجتماعی۔

بابِ فضائل میں رسولؐ نے ایک علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا اور کربلا میں حسینؑ نے ایک علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا۔

دین اسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ"

حقیقی دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔ میں نے کہا اسلام کا مطلب ہے اللہ کی مرکزیت اور اسی مرکزیت کے ماتحت توحید ہے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی آواز میں اس توحید کی مظہر ہے۔ صحیح طور پر ایک مسلمان کا نظامِ تمدن بھی اسی "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے ماتحت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صرف آج کی ایک مجلس باقی ہے اس سلسلہ بیان کی اور یہ باتیں میں نے جو پیش کیں، اُن کیلئے ہر ایک کے واسطے ایک مجلس درکار تھی۔ مگر اس کی تو گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا مختصر طور پر نظامِ تمدن۔ تمدن کے معنی ہیں آپس میں مل جل کر رہنا اور تعلقات انسانی کو نبھانا۔ عقلی طور پر انسان سے سب سے زیادہ نزدیک اس کی ذات ہے۔ لہٰذا اصل مرکز محبت تو خود اپنی ہی ذات ہوگی۔ پھر اپنی ذات سے رشتے چلیں گے تو قریب کے جو رشتے قائم ہوئے، وہ یہ کہ یہ ہماری ماں، یہ ہمارا باپ۔ اس میں بیچ میں کوئی فاصلہ نہیں آیا۔ بس اپنی ذات سے جو خط کھنچا تو دوسری ذات تک جو پہنچا، وہ باپ ہے اور ماں ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ مرکز اُلفت وہ دونوں ہستیاں ہوئیں ابتدائے عمر سے۔

اب اس کے بعد مثلاً چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ۔ یہاں دو واسطے بیچ میں ہو گئے یعنی میرا باپ، میری ماں اور پھر میرے باپ کا بھائی تو وہ چچا ہوا۔ میری ماں کا بھائی تو وہ ماموں ہوا۔ میرے باپ کی بہن، وہ پھوپھی ہوئی۔ میری ماں کی بہن، وہ خالہ ہوئی۔ تو اس کا قرابت میں رشتہ ذرا سا دور رہا۔ تو اتنا ہی فرق محبت والفت میں پیدا ہو گیا۔ جتنا انسان ماں باپ سے محبت کرے گا، اُتنا چچا اور پھوپھی اور ماموں اور خالہ سے محبت نہیں کرے گا۔ انہی ماں باپ سے یہ خط جو پہلو میں کھنچا تھا، اس سے چچا اور پھوپھی وغیرہ ہوئے اور اسی سے جو خط اوپر گیا، اس سے دادا ہوا، باپ کا باپ۔ تو وہ ادھر جو کھنچا تو چچا ہوا، اُدھر جو کھنچا تو دادا ہوا۔ اب اس کے بعد وہ دادا کا باپ، وہ پردادا ہو گیا۔ اب واسطے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب سکڑ دادا تک تو کوئی عام نظام جو ہے، یعنی عمر کا معیار اس کے لحاظ سے، وہ جزوِ تاریخ بن جاتا ہے، سابقہ نہیں پڑتا سکڑ دادا سے۔

پردادا تک تو واسطہ پڑ جاتا ہے لیکن سکڑ دادا سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اب جتنا جتنا خط بڑھ رہا ہے، اتنی محبت کی لہریں کمزور پڑ رہی ہیں باپ کا ذکر آئے گا تو بہت سے سعادت مند بیٹوں کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے مگر دادا کا ذکر ہوگا تو اتنی بات نہیں پیدا ہوگی۔ پھر پردادا کا ذکر ہوگا تو جیسے پہلے ہنس رہے تھے، ویسے ہی اس کے بعد بھی ہنستے رہیں گے۔ کوئی فرق ہی نہیں پیدا ہوگا۔ جتنا دور ہو رہے ہیں، محبت کی لہریں گھٹ رہی ہیں۔ اب اس کے بعد جناب آٹھ پشتوں پر جا کر کوئی ہیں سلسلہ اجداد میں، وہ بھی۔ لیکن پوچھا آپ کے دادا؟ کہ جی نہیں، وہ دادا نہیں تھے، وہ ہم سب کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ لیجئے اب وہ دادا ہونے کا بھی انکار ہو گیا۔ اب وہ مورث

اعلیٰ باپ کے باپ کے باپ کے، جتنے واسطے درمیان میں آئے، لہریں ایسی کمزور ہوئیں کہ احساسِ قرابت ہی نہ رہا۔ تو معلوم ہوا کہ اپنے سے خط کھنچا تو جتنا قریب تھا، اُتنا طاقتور رہا، جتنا دور ہوا، اُتنا کمزور ہوا۔ اسی طرح سے جب اِدھر اُدھر خط کھینچے تو یہ تو احساس ہوا کہ یہ ہمارے چچا ہیں، یہ ہمارے باپ کے بھائی۔ جب اِدھر خط آیا تو ہوا کہ بھائی ہیں یعنی باپ کا بیٹا۔ وہ بھی ایک واسطے سے ہے قرابت بھائی سے کہ باپ کا بیٹا یا ماں کا بیٹا۔ تو وہ ہو گیا بھائی۔ اب اس کے بعد وہ کہے گا بھائی کا بھتیجا۔ پھر دور ہوتا چلا گیا تو اب کچھ نہیں، چچا کا بھائی۔ دادا کا بھائی۔ سکڑ دادا کا بھائی۔

اب وہاں پوچھا کہ ان کی آپ کے ساتھ کیا قرابت داری تھی؟ کہا: کچھ نہیں، میرے سکڑ دادا کے بھائی ہوتے تھے۔ ان کی قرابت ہو گئی۔ یہ ہوا اپنی ذات کو بیچ میں رکھ کر جو خطوط کھینچے۔ اب اسی کی بناء پر حقوق کی تقسیم ہونے لگی۔ جب خود کسی فوائد کا مرکز بن گئے تو باپ کو زیادہ فوائد پہنچے۔ بیٹے کو فائدہ زیادہ پہنچے۔ بھائی کو فائدہ زیادہ پہنچے۔ اب اور جتنی اپنے ساتھ شراکت زیادہ ہو، پڑوسی کو فائدہ پہنچے۔ ہم قبیلہ کو فائدہ زیادہ پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نظامِ تمدن ایسا بنا جس میں کچھ کے حقوق رہ گئے، کچھ کے حقوق ختم ہو گئے۔ اسلام بھی اس فطرت کے تقاضے کو الگ نہیں کرتا۔ اپنے سے ذات کو نہیں الگ کر سکتا۔ وہ عقلاً قریب ہے اپنے سے۔ تو اسلام خلاف عقل کوئی عمل نہیں کرتا۔ مگر اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ جب تم اپنے سے خط آگے بڑھاتے ہو تو نیچی سطح پر اِدھر اُدھر کیوں لے جاتے ہو؟ یہ خط جو تمہاری ذات سے نکلے، اس کو ایک دفعہ اوپر کی طرف لے جاؤ۔ تو اب میں ہوں اور اب تصور جب عالمِ بالا کی طرف گیا تو وہاں تھا میرا باپ، وہاں تھی میری ماں، وہاں تھا میرا بھائی۔ اب ہو گیا میں اور مَیں سے تصور آگے بڑھا تو میرا خدا، میرا پیدا کرنے والا کیونکہ باپ خود محدود شخصیت تھی، اس لئے باپ کا خط گیا تو قرابت محدود ہوئی اور یہ نقطہ جب پہنچ گیا عالمِ بالا میں تو اب لامحدود ذات بیچ میں آگئی۔

لہٰذا اب جو محبت کا مرکز تقسیم کرے گا، اپنے حقوق کو تو اس میں نہ نسل کی تفریق ہو گی، نہ رنگ کی تفریق ہو گی، نہ ملک کی تفریق ہو گی۔ تو دیکھئے نظامِ تمدن میں کتنا فرق پیدا ہو گیا۔ اب اس کی ذات کو درمیان میں لا کر رشتہ لگائے جا رہے ہیں۔ تو اُس کی سب مخلوق ہیں اور اب جب اس کی سب مخلوق ہیں تو اس کے سائے میں جو تمدن پرورش پائے گا، اس میں پھر اپنی بیٹی اور کنیز میں فرق نہیں ہو گا۔

جب اپنی ذات سے خط کھینچ کر اس ذات کی طرف چلا گیا تو اب رشتے سب اُس کے لحاظ سے قائم ہو رہے ہیں۔ تو اب اپنے دوست کی بھی کوئی تفریق نہ ہو گی، حقوقِ انسانی میں، کیونکہ وہ میرا دشمن سہی مگر میرے خدا کی مخلوق ہے۔ لہٰذا انسان حقوقِ عامہ میں دوست اور دشمن کی بھی کوئی تفریق نہ کرے گا اور ابھی تو ابتدائے بیان ہے۔ مصائب نہیں پڑھنا ہیں۔ مگر یہ کہ یاد دلاؤں آپ کو کہ دشمن کہتا ہو تو یہی کہیں گے کہ ارے وہ تو میرا قاتل ہے۔ اب جہاں یہ مجاز حقیقت بنا ہوا ہو، واقعی قاتل ہے مگر فوراً اس کا دل اپنے قاتل کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جیسا دودھ میرے لئے لائے ہو، ویسا ہی میرے قاتل کیلئے لاؤ۔

بس اب اس سے زیادہ نہیں، امامیہ مشن لکھنؤ سے ایک رسالہ چھپ گیا ہے اسلامی تمدن، تو اس میں تفصیل سے اس کو درج کیا گیا ہے۔ اب آگے میں نے کہا کہ اسی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ... اسی اللہ کی مرکزیت نے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اسلام کے جو لفظی مفہوم ہیں، اس کے تحت میں اسلامی صحیح سیاست ہے۔ میں نے کہا تھا اسلام کے دو معنی ہیں: ایک سر نہادن بطاعت، اطاعت کے لئے سر جھکا دینا اور

دوسرے اسی کا کامل درجہ ہے، اپنے کو بالکل سپرد کر دینا۔ اب انسان اگر واقعی مسلم ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ سر جھکائے ہوئے ہے اللہ کے سامنے اور دوسرے معنی سے اپنے کو سپرد کئے ہوئے ہے اللہ کے۔

تو اب اللہ کے مقابلہ میں نہ اُس کی انفرادی رائے کچھ ہوگی نہ اجتماعی۔ جب یہ اس بالادست طاقت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے تو اب اُس کے احکام کے مقابلہ میں یہ اپنی رائے سے کام نہیں لے گا کہ میری رائے تو یہ ہے، اس کے معنی ہیں کہ اس نے اپنے کو سپرد نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی اطاعت کیلئے سر نہیں جھکایا۔ اب اگر ایک فرد ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک فرد حقیقت اسلام سے دور ہے یعنی ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ'' کا لفظ زبان پر ہے مگر ذہن کے اندر نہیں ہے۔ اب پیغمبر خدا نے جو کہا تھا ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ'' کہو، اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ تم کسی وقت کھڑے ہو کر یہ نعرہ لگا لیا کرو۔ تم کسی خاص وقت کے ورد کر لیا کرو ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ'' کا۔ نماز کی تعقیبات نہیں سکھائے جا رہے تھے کہ تم ہر نماز کے بعد ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ'' کا وظیفہ پڑھو۔ نہیں، یہ جو کہا جا رہا تھا: کہو ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ'' یہ ''کہو'' نہیں تھا۔ یہ ویسے ہے جیسے آپ کہتے ہیں ''میرا قول تو یہ ہے'' یعنی یہ نصب العین ہے۔ یہ لائحہ عمل ہے۔ یہ ہدف نگاہ کہ کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے۔ تو جب کوئی خدا نہیں ہے سوائے اللہ کے تو اس کے احکام کے سوا کوئی حکم نہیں اور قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا کہ:

''کسی صاحب ایمان مرد اور کسی صاحب ایمان عورت کو یہ حق نہیں ہے، جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کوئی فیصلہ کر دے تو خود اس کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار رہے''۔

معاملہ اپنا ہے مگر یہ اختیار ان کو نہیں ہے۔ جب اللہ و رسول کا فیصلہ ہو گیا تو اب اس کے بعد ان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اب اکیلے اکیلے بھی اختیار نہیں، مل جل کے بھی اختیار نہیں۔ اس کو ابتدائی حساب کے طالب علموں کی زبان میں کہہ سکتا ہوں کہ میں کہتا ہوں یہ نفی ہے، اپنا اختیار کچھ نہیں۔ اختیار کچھ نہیں تو میں کہتا ہوں کہ جتنے ہزار جمع ہو جائیں، جتنے لاکھ جمع ہو جائیں، صفر جتنے بھی جمع ہوں، اس سے کوئی عدد نہیں بنتا۔ تو مجمع کی کثرت دیکھنا کیا ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ جو جمع ہوئے ہیں، چاہے کتنے لاکھ ہوں، ان میں سے ہر ایک صاحب اختیار ہے کہ نہیں۔ اگر ہر ایک غیر صاحب اختیار ہے تو بے اختیار آدمیوں کے جمع سے اختیار کہاں سے بنے گا؟ اور اس کی بناء پر چونکہ اللہ کے احکام رسولؐ کی زبانی دنیا تک پہنچے ہیں، اس لئے قرآن مجید نے اعلان کیا:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

''نبی کو مومنین پر خود ان کے نفوس سے زیادہ اختیار حاصل ہے''۔

یہ اعلان عام کر دیا اور اسی سے رسولؐ نے شروع ہی سے کام لینا بھی شروع کر دیا۔ ارے ابھی تو بعثت ہوئی ہے۔ اعلان عام ہوا بھی نہیں ہے۔ حکم آیا:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ

اب اپنے قریبی رشتہ داروں کو پیغامِ حق پہنچایئے۔

اس کیلئے وہ دعوتِ عشیرہ ہوئی، جمع کیے گئے۔ کہتے کہ اعلانِ رسالت کیلئے میں تمہیں بلاتا ہوں تو کون آتا؟ نہیں، کھانے کیلئے بلایا۔ اب دنیا کو اختیار ہے، تقیہ کہہ لے۔ کارڈ میں یہی ہے کہ مثلاً عشائیہ ہے، تشریف لایئے۔ اب جتنے ہیں، سب کھانے کی دعوت پر آ گئے۔ مگر کسی دعوت میں یہ شرط نہیں ہوتی کہ سوائے کھانے کے کوئی اور بات نہیں ہوگی۔ ارے کھانا نہ کھلاتے تو وعدہ خلافی تھی۔ لیکن جب کھانا کھلا دیا تو اب بلانے والا جو اُسے کہتا ہے، اگر کچھ تو وہ کہتا بھی ہے، گفتگو بھی کرتا ہے وہ تو انگریزی میں بھی میز پر کی گفتگو۔ اس کا ایک نام ہے تو وہ جناب! اب جب کھانا کھا چکے تو اب ان کو جس مقصد کیلئے واقعی آپؐ نے بلایا تھا، وہ پیغام پہنچایا۔ مگر اس وقت پوری بات نہیں سنی، کھانا تو کھا ہی چکے تھے۔ مطلب نکل گیا تھا۔ لہٰذا بغیر پوری بات سنے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن پھر آپؐ نے دعوت کی، مقصد تو آج پورا نہیں ہوا تھا مگر معلوم تھا کہ کھانے کا ذوق ایسا تھا کہ پھر بھی آئے اور اب تو تجربہ کر کے آئے تھے، لہٰذا اپنے دل کو تول کر آئے تھے کہ بھئی! آج سننا بھی ہے۔ اب تو دو دفعہ کا حق نمک ہے۔ لہٰذا سنیں گے آج کہ پوری بات کیا کہتے ہیں؟ لہٰذا آج منتشر نہیں ہوئے، بیٹھے رہے۔ اب وہی کھانا ہو چکا جب تو پھر وہی بات شروع کی گئی:

''مجھے اللہ نے رسولؐ بنایا ہے اور تمہاری ہدایت کیلئے بھیجا ہے۔ میرے پیش نظر ایک مہم ہے، اُس کی طرف سے''۔

اب یہاں کیونکہ یہ واقعات اسلامی کا ایک جزو ہے، لہٰذا جزو تاریخ ہے۔ چونکہ ایک آیت قرآن کی تعمیل میں ہوا ہے، لہٰذا جزو تفسیر ہے۔ مفسر بھی لکھتے ہیں، محدث بھی لکھتے ہیں، مورخ بھی لکھتے ہیں اور اب جو لفظ کہوں گا، وہ پورے مطالعہ کی ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہر جگہ وہی الفاظ ہوں گے، نہ اس میں ایک لفظ کی کمی ہوگی نہ ایک لفظ کی زیادتی ہوگی۔ وہ کیا؟ کہ آپؐ نے فرمایا، جب اپنے عہدے کا اعلان فرما چکے اور جو اصل پیغام تھا، وہ پہنچا چکے اور اب یہ دیکھ لیا کہ وہاں مجمع میں اتنا سہارا ہو گیا کہ وہ بہرحال اتنا اُس نے صبر کیا۔ تو اب یہ سوال کہ:

"اَيُّكُمْ يُوَازِرُنِي هٰذَا الْاَمْرِ"۔

''تم میں سے کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے؟''

سوال اتنے پر ختم نہیں ہوا۔ نتیجہ اس کے ساتھ ساتھ موجود ہے۔ تم میں سے کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے؟

"حَتّٰى يَكُوْنَ وَصِيِّىْ وَوَزِيْرِىْ وَخَلِيْفَتِىْ"۔

''تاکہ میرا وصی ہو، میرا وزیر ہو، میرا خلیفہ ہو''۔

تابڑتوڑ تین الفاظ ہیں مسلسل۔ اب آج کے ہر روشن خیال، ہر قانون دان، کسی بھی مکتب فکر کا مسلمان ہو، اُس سے میں پوچھوں کہ جس بات کا حق جمہور کو ہو، اُس کے متعلق رسولؐ کو معاہدے کا حق کیا ہے؟ پیغمبرؐ خدا اعلان فرما رہے ہیں اور مجمع میں سے ایک بھی بیوقوف سیاست دان نہیں ہے جو یہ کہے کہ جناب والا! یہ آپؐ کے بعد کی بات ہے۔ اس وقت کیوں؟ جب وہ منزل آئے گی تو

پنچایت کریں گے۔ جو پنچ تجویز کردیں تو وہ ہو جائے گا۔ یہ آپ اس وقت یہ معاہدہ کیوں کر رہے ہیں؟

مگر نہیں، کوئی نہیں بولتا۔ اس کے معنی ہیں کہ کافر ہیں مگر نبوت کا نام تو سنتے رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں، مانتے نہ ہوں چاہے مگر جانتے ہیں کہ نبی کا وصی بھی ہمیشہ وہی مقرر کرتا ہے جو نبی کو مقرر کرے۔

تو حضور والا! فرما رہے ہیں کون میرا ساتھ دے گا؟ اب یہاں ماشاءاللہ انگریزی دان طالب علم تو خود ان کتابوں کو براہِ راست دیکھے ہوئے ہوں گے۔ انگریز مؤرخین نے یہ موقعہ درج کیا ہے، بڑی مصوری کے ساتھ اپنے اندازِ تحریر میں کہ وہ ایک تیرہ برس کا بچہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا: اگرچہ میری عمر کم ہے، میرا قد چھوٹا ہے، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

اب ماشاءاللہ قانون دان حضرات ایک پہلو پر غور کریں اور غیر قانون دان بھی اپنی عقل سے کہ رسولؐ نے تیجہ کا اعلان تو پہلے فرما چکے کہ کون میرا ساتھ دے گا۔ اب ایک نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ میں ساتھ دوں گا۔ تو اگر رسولؐ خاموش بھی رہیں تو معاہدہ۔ دھندلی نگاہوں والوں کیلئے ذرا صاف کرنا ہوتا ہے۔ خاموش بھی رہتے تو کام چل جاتا مگر نہیں، اب کہاں تو کلیہ تھا کہ جو میرا ساتھ دے، اب انہوں نے کھڑے ہو کر کہا: میں۔ تو اب کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"هٰذَا وَصِيِّ وَوَزِيْرِيْ وَخَلِيْفَتِيْ".

اچھا! اب تم سب کو معلوم ہو کہ یہ میرا وصی ہے، یہ میرا وزیر ہے، یہ میرا خلیفہ ہے۔

سب وہی الفاظ یہاں طے کر دیئے۔ میں کہتا ہوں کہ رسولؐ سب الفاظ کہہ چکے ہیں۔ اب کوئی الیکشن کرواتا ہو تو کوئی نئے الفاظ تلاش کیجئے گا ورنہ جتنے عہدے تھے، وہ سب تو ایک کو مل گئے، جگہ ہی خالی نہیں ہے تو الیکشن کس چیز کا ہوگا؟ خدا اور رسولؐ نے اپنا اختیار صرف کر دیا۔ اب قرآن کہتا ہے: جب اللہ اور رسول کسی امر کا اختیار صرف کر دیں تو پھر نہ کسی مومن کو حق رہ جاتا ہے، نہ کسی مومنہ کو۔ اب ایسی کانفرنس کیجئے جس میں نہ کوئی مومن ہو، نہ کوئی مومنہ۔

میں کہتا ہوں مجمع میں سے سب ہیں، جتنے عَشِيْرَةُ الْاَقْرَبِيْنَ ہیں، سب ہیں۔ رسولؐ یہ اعلان فرماتے ہیں اور یہ ہوتا ہے معاملہ۔ علیؑ اقرار کرتے ہیں اور رسولؐ اعلان کر دیتے ہیں کہ علیؑ میرا وصی، میرا وزیر، میرا خلیفہ۔ یہ ہو گئی بات۔ اب ایک جزو تاریخ میں اور ملتا ہے اور وہ یہ کہ مجمع اب اٹھا، ہنستا ہوا اور جناب ابوطالب سے مذاق کرنے کی گنجائش پیدا کی۔ کہنے لگے کہ لیجئے! اپنے صاحبزادے کی اطاعت کیجئے۔

میں کہتا ہوں کہ کافر سہی مگر یہ سمجھتے ہیں، نکتہ رس ہیں کہ یہ آج کے اعلان میں مُفْتَرَضُ الطَّاعَةِ ہونا مضمر ہے کہ یہ اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد ایک تاریخی اور حدیثی، تاریخ زیادہ تر تو حدیث کے اوپر بنیاد قائم کرتے ہیں کہ حضور والا! میں کہتا ہوں کہ آخر مجمع میں تو ابولہب بھی تھا۔ اب عباس بھی تھا۔ تھے، اب وہ بعد میں "تھے" ہو گئے ہیں۔ تو ابولہب بھی تھا، عباس بھی تھے اور جتنے رشتہ دار ہیں، سب تھے۔ یہ آخر جناب ابوطالبؑ ہی سے کیوں مذاق کیا اور جناب ابوطالب نے بھی مذاق کو سہہ لیا۔ بگڑ کے یہ نہیں بولے کہ مجھ سے کیوں کہتے ہو؟ یہ نہیں کہا کہ مجھ سے کیوں کہتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ کافر سہی مگر ان سے مذاق نہیں

کرتے کہ وہ تو ہم ہی میں سے ہیں۔ مذاق ان سے کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ یہ تو شامل ہو چکے ہیں اس جماعت میں۔

اب جناب! یہ اعلان ہوا محدود مجمع میں۔ عشیرۃ الاقربین تھے۔ بعد میں کچھ ان میں سے مر گئے، کچھ سن رسیدہ لوگ موجود تھے، وہ بعد میں نہیں رہے۔ دوسرے لوگ، وہ کسی کو یاد رہا ہو یا نہ یاد رہا ہو۔ اب بار بار پیغمبرؐ اسلام مختلف انداز میں اسی کی تجدید کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں کبھی یہ، کہ دیکھو رکوع میں کس نے انگوٹھی دی ہے؟ مگر وہ بھی ایک محدود افراد نے دیکھا کہ کس نے انگوٹھی دی ہے؟ انہوں نے کچھ دوسرے لوگوں سے بیان کر دیا لیکن اب وہ وقت آیا کہ جب رسولؐ حج آخر کر کے مدینہ جا رہے ہیں اور علم الٰہی میں یہ ہے کہ اب پیغمبرؐ دنیا میں دو تین مہینے سے زیادہ تشریف فرما نہیں رہیں گے اور یہ تو علم الٰہی میں ہے اور یہ حقیقت تاریخی ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اتنا بڑا مجمع رسولؐ کو نہ اس سے پہلے کبھی ملا ہے، نہ اس کے بعد کبھی مل سکتا ہے۔ کئی لاکھ مسلمانوں کا مجمع جو اس حج میں شریک ہوا تھا، حضرتؐ کے ساتھ، اب وہ نکل کے آ رہے ہیں۔ باہر خالق بھی انتظار کر رہا ہے کہ حج کے تمام مناسک ختم ہو جائیں۔ اگر ابھی تبلیغ کا حکم آئے تو لوگوں کے اشغال الگ الگ ہیں، کوئی کہے گا ہم منیٰ میں تھے، کوئی کہے گا کہ ہم مقام ابراہیمؑ میں تھے۔ غرض بہانے بہت ہیں بھولنے کے۔ لہٰذا خالق نے انتظار کیا کہ حج تمام کر کے فرصت کے ساتھ نکل آؤ۔

اب گھروں تک پہنچنے کی جلدی ہو، اب جس مقصد کیلئے سفر کھوٹا کیا جائے اور لوگوں کو روکا جائے، وہ بھول نہیں سکتے۔ اب جلدی ایسی ہے کہ قافلے کے کچھ لوگ آگے جا چکے ہیں، کچھ پیچھے ہیں اور اب حکمِ الٰہی آتا ہے کہ ذرا ٹھہریئے اور جو حکم ہو رہا ہے، پہلے سے آیا ہے، اس کی تبلیغ فرما دیجئے۔ اب اگر ایسا نہ کیا تو کچھ کیا ہی نہیں۔ اس کو تفصیل سے نہیں عرض کرنا ہے ورنہ جو مستقل بیان ہے، کبھی انشاء اللہ عیدِ غدیر قریب ہوئی اور اُس زمانے میں آنا ہوا تو تفصیل سے عرض کیا جائے گا۔

تو جو حضور والا! اب اعلان ہوتا ہے، رسولؐ اتر پڑتے ہیں، اعلان ہوتا ہے کہ جو آگے بڑھ گئے ہیں، وہ پیچھے آئیں۔ جو پیچھے رہ گئے ہیں، وہ آگے بڑھیں۔ یہ ضرورت کے تحت اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ مگر اس اعلان میں بڑی حقیقت مضمر ہے کہ یہ وہ نقطۂ حق ہے جس سے آگے بڑھ کر بھی گمراہ ہوتا ہے، پیچھے رہ کر بھی گمراہ۔ اب جناب سب رک گئے۔ سب اکٹھے ہو گئے۔ گرمی کا وقت دوپہر۔

تاریخ طبری میں ہے کہ زمین اتنی گرم کہ عبائیں لپیٹ لپیٹ کر پیروں میں لوگ بیٹھے، اوپر سے عرب کا سورج، وہ تپ رہا ہے اور یہاں، اب وہاں کوہِ صفا تھا۔ یہاں صفا تو ہے نہیں۔ لہٰذا پالانِ شتر کا منبر بنایا جاتا ہے اور اب خطبے کیلئے جاتے ہیں۔ وہ چند الفاظ نہیں ہیں وہ بڑا بسیط خطبہ تھا مگر لوگوں نے اس کے کچھ اجزاء نقل کئے، کچھ اجزاء درج کئے۔ تو بس اصل جملہ جو ہے، وہ تو متفق علیہ ہے۔ لیکن اور باقی اجزاء، کیا کیا فرمایا؟ آپؐ نے خدمات بیان کیں اور بہت طولانی بسیط خطبہ تھا مگر وہ خطبہ جو پڑھ رہے ہیں، آج ایک نئی بات کی کہ ایک ہستی کو اپنے منبر پر بٹھا لیا ہے۔ اب آپ تو خطبہ پڑھ رہے ہیں اور لوگ بار بار اس صورت کو دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا بات ہے، یہ کیا بات ہے اور دل میں آ رہا ہے کہ ہو نہ ہو، آخر میں کچھ ان کی نسبت۔ اب سب اجزائے خطبہ چاہے نہ سنے ہوں یہ جملہ تو ضرور سنیں گے۔

صورت خود بتا رہی ہے، بار بار ادھر دیکھ رہے ہیں۔ یہ آج ان کو کیوں لا کر بٹھایا ہے منبر کے نیچے؟ بار بار اُدھر دیکھ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بڑے خلوص دل سے آج یہ عبادت ہو رہی ہے۔ اب وہ محل آیا جو اصل میں رسولؐ کو کہنا تھا۔ تو ابھی کچھ کہتے نہیں۔ جیسے جب اعلانِ عام رسالت کا کیا تو پہلے کچھ نہیں کہا، پہلے سوال کیا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے لشکر آ رہا ہے تو مانو گے یا نہیں؟ انداز بتا رہا ہے کہ اگر مجمع کہہ دے کہ نہیں مانیں گے تو آگے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ مگر مجمع نے جب اقرار کر لیا کہ ہم ضرور مانیں گے، تب جو کہنا تھا، کہا۔ ویسے ہی آج ابھی کچھ نہیں کہتے۔ بس یہ پوچھتے ہیں:

"اَلَسْتُ اَوْلٰى بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ"۔

"کیا میں تم سب سے تمہارے نفوس پر زیادہ حقوق نہیں رکھتا؟"

تم سب سے زیادہ اختیار کے میں تمہارے نفوس پر نہیں رکھتا ہوں؟ دیکھئے! رسالت نے سیاست کو کیسے شکنجہ پر کسا ہے۔ قرآن نے پہلے ہی صاف کہہ دیا کہ نبی مؤمنین پر اُن کے نفوس سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔ اب اس اصول کو توڑ کرو انا نہیں ہے۔ کام بس یہ کیا کہ رسولؐ کی جگہ مَیں کہہ دیا ہے اور مومنین کی جگہ تم کہہ دیا۔ قرآن نے کہا: رسولؐ مومنین پر اُن کے نفوس سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

پیغمبرؐ پوچھ رہے ہیں کہ کیا میں تم پر تمہارے نفوس سے زیادہ حقوق رکھتا ہوں یا نہیں؟ مطلب کیا ہوا؟ کہ بتاؤ میں رسولؐ اور تم مومن ہو یا نہیں؟

اب بڑے سے بڑے دین میں جمہوریت کو صرف کرنے والے افراد مگر کریں کیا، کیا کہیں کہ آپ رسول نہیں، تو اسلام جائے، کہیں کہ ہم مومن نہیں تو اقرار کفر ہو۔ لہٰذا پورا مجمع چیخ اٹھا "بلیٰ"، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ یعنی یقیناً آپ کو ہم پر، ہمارے نفوس سے زیادہ اختیار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس پورے مجمع نے بالا جماع طے کر دیا کہ رسولؐ کا اختیار ہے، ہمیں نہیں ہے۔ اب اصولی جمہوریت کے مطابق بھی جب تک اتنا ہی بڑا مجمع کیوں نہ ہو، وہ آج کا فیصلہ مسترد نہیں کر سکتا۔

بس ماشاء اللہ اب تو آپ کے دل ایسے لگے ہوئے ہیں کہ رات گزر جائے، حالانکہ دن بھر کے آج آپ تھکے ہوئے تھے مگر یہ آپ کا ذوقِ ایمانی ہے کہ بحمد للہ، تو ایک پہلو کی طرف اور ایک جزو اور آپ کے سامنے پیش کروں گا، اس کے بعد آگے بڑھوں گا کہ حضور والا! بس جب اصل جملہ آیا جو کہنا ہے، مجمع نے کہہ دیا کہ ضرور آپ کو ہم پر ہم سے زیادہ اختیار ہے۔ اب جب یہ اقرار لے لیا تو وہ جس لئے بٹھایا تھا پہلو میں، اس کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اب اونچا کیا۔ بحمد للہ فرزندانِ اسلام ہیں، مَیں کہتا ہوں کہ یہ پیغمبرِ اسلامؐ کی طاقت ہے کہ جس نے خیبر کو ہاتھ پر اٹھایا، یہ اُسے اٹھائے ہوئے ہیں۔

اب میں کہتا ہوں کہ ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے اور عقل سے تصور کیجئے کہ ایک بچے کو آدمی اپنے سامنے لے تو بچے کا قد چھوٹا، انسان کا جسم بڑا، لہٰذا بس تھوڑا سا جسم چھپے گا۔ لیکن ایک پورا انسان، پورے انسان کو اپنے سامنے ہاتھوں پر لے لے تو اب وہ ذات جس نے اٹھایا ہے، وہ نظر آئے گی؟ میں کہتا ہوں رسولؐ الفاظ الگ کہیں گے، اپنے عمل سے الگ ثابت کر رہے ہیں کہ جب میں چھپ جاؤں تو یہ ہیں۔

بظاہر تو میں فضائل کی اس منزل پر ہوں جہاں مصائب بہت دور ہیں مگر ان کے فضائل ومصائب ایسے دست وگریباں ہیں کہ مجھے کبھی فاصلہ نظر نہیں آتا کہ آج بابِ فضائل میں رسولؐ نے ایک علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا اور کربلا میں حسینؑ نے ایک علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کیا۔ اب عشرۂ محرم کی مجلس ہوتی تو میں مصائب عرض کر دیتا مگر یہ کہ ابھی تو آخری تاریخ ہے چہلم کی تو اس لئے میں کہتا ہوں کہ ایک علیؑ غدیر میں رسولؐ کے ہاتھوں کے اوپر، ایک علیؑ کربلا میں حسینؑ کے ہاتھوں کے اوپر اور ایک علیؑ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار اس عالم میں جا رہا ہے اور اہلِ عزا! عطش میں ایک بیان کر چکا کہ جو ساتویں سے پیاس شروع ہوئی تھی، وہ ختم نہیں ہوئی۔

یہ اطمینان آیا ہی نہیں پانی جو پیاس بجھے۔ ملتا رہا پانی مگر پیاس جاتی نہیں اور میرے سامنے اب ایک منزل ہے کہ زندانِ شام میں ایک دن حضرت سیدؑ الساجدین نے حضرت زینبؑ کبریٰ کو دیکھا کہ بیٹھ کر نمازِ شب پڑھ رہی ہیں تو پوچھا کہ پھوپھی اماں آج آپ نمازِ شب بیٹھ کر کیوں پڑھ رہی ہیں؟ فرمایا: جانے دو، کیا کرو گے پوچھ کر۔ عرض کیا: نہیں، میں سمجھنا چاہتا ہوں، جاننا چاہتا ہوں۔ ویسے وہ علمِ امامت الگ ہوتا ہے مگر ہمیشہ سوالات ہوتے ہیں، دریافت کیا جاتا ہے، بتائیے۔

پر کہتی ہیں: پوچھتے ہو تو سنو کہ یزید کے ہاں سے کھانا پانی اتنا کم آتا ہے کہ وہ میرے بھائی کے بچوں کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اکثر میں اپنے حصے کا بھی بچوں کو کھلا دیتی ہوں تو اب اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہر نماز کھڑے ہو کر ادا کروں۔

42

شعائرِ الٰہیہ

جوذات اتنی محبوب ہو کہ عارضی تعلق اُس کے جسم کے ساتھ جو ہو، وہ مرکز نظر پروردگار ہو جائے تو قبر مطہر جس سے جسم کا مقام تصور میں دائمی ہوتا ہے، وہ قبر مطہر مرکز نظر پروردگار نہیں ہوگی؟ اور کیا اس کے تعظیم وتکریم شرک ہوجائے گی؟

حضورؐ پاک کا اسم شریف سن کر کھڑا ہونا، ہم اس جذبۂ تعظیم کو باآواز بلند درود کے وسیلہ سے انجام دیتے ہیں۔

بے شک حضور کا نام سن کر ہر وقت کھڑا ہوا کریں تو بہت اچھا، مگر یہ اپنے امکان کی کمی ہے کہ ہر دفعہ کھڑے ہوں۔

میں کہتا ہوں یہ تعظیم نہیں ہے، علامتِ تعظیم ہے۔ اگر ہر مرتبہ آنجناب کا نام آنے پر کھڑے ہوں، تب بھی حقِ تعظیم کہاں ادا ہوگا۔

پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے دنیا کی کسی فقہ کی کتاب میں نہیں دیکھا کہ باپ کیلئے سنت ہو کہ بیٹی کی تعظیم کرے۔

میرے نزدیک تو جناب رسولؐ خدا اسی لئے بیٹی کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے، وہ فاطمہؑ کی تعظیم نہ تھی بلکہ اس منصب کی تعظیم تھی جو فاطمہؑ کے سپرد تھا۔

شعائرِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ

ارشادِ حضرت احدیت ہے، سورۂ حج میں ارشاد ہوا کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ عمل دلوں کی پرہیزگاری کا ایک جزو ہے۔ ابھی فرض کیجئے کہ اللہ کے شعائر کے معنی معلوم نہ ہوں کیونکہ شعائر کا لفظ ان عربی الفاظ میں سے نہیں ہے جو اُردو کا جزو بن گئے ہیں۔ بہت سے عربی کے الفاظ اُردو میں اس طرح استعمال ہوتے ہیں جیسے اصلاً وہ اُردو ہوں مگر شعائر کا لفظ ایسا ہے جو بس مجالس وغیرہ میں اور اہل علم سے سنا ہوگا۔ عام طور پر اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی اس ترجمہ سے شعائر کے معنی نہ سمجھے۔ میں بھی اسے شاید آج بیان نہیں کرونگا، کل اس کی نوبت آئے گی کہ میں شعائر کے مفہوم کی تشریح کروں۔ مگر جب یہ الفاظ سنے کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو یہ عمل تقویٰ و پرہیزگاری کا جزو ہے، تو اسی سے ہر صاحب فہم مسلمان کو یہ نتیجہ نکال لینا چاہئے کہ تعظیم میں عبادت نہیں ہے، اس لئے کہ عبادت کیلئے کہا گیا ہے:

اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ

''سوا اللہ کے کسی اور کی عبادت کبھی نہ کرنا''۔

اور تعظیم کیلئے کہا جارہا ہے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم تقویٰ کا جزو ہے۔ اور یہ ہر زبان کے لحاظ سے صاف ظاہر ہے کہ اضافت جس سے اردو میں ''کا، کے اور کی'' پیدا ہوتے ہیں، یہ اضافت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ تو وہ اضافت خود پتہ دیتی ہے کہ مضاف اور ہے اور مضاف علیہ اور ہے۔ میں کہوں میرا لباس تو میں اور ہوں، لباس اور ہے۔ میرا مکان تو میں اور ہوں، مکان اور ہے۔ میرا عزیز، میں اور ہوں، عزیز اور ہے۔ اور یہاں میرے بھی نہیں۔ میرے یعنی اللہ کے شعائر تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے، شعائر اس کے ایک سے زیادہ ہیں۔ بہر حال وہ چاہے دو چار ہوں، چاہے دس بیس ہوں، چاہے سو پچاس ہوں، لیکن ایک سے بہر حال زیادہ ہیں جبھی تو جمع ہیں۔

تو جب یہ کہا گیا کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے، تو اسکا مطلب یہ ہے تعظیم اللہ سے مخصوص نہیں ہے، عبادت اللہ سے مخصوص ہے۔ تو جو مخصوص ہو اللہ سے، وہ اور چیز ہے، جو عام چیز ہے۔ اللہ کے سوا بھی ہوسکتی ہے اور اس سے الگ چیز ہے تو عبادت کیلئے قرآن میں نہیں آسکتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرو کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور شرک کیلئے کہا گیا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ تو اللہ شرک کا نہ حکم دے گا، نہ شرک کی اجازت دے گا۔ اللہ اپنے بندوں کے کفر سے راضی نہیں ہے تو شرک سے کہاں راضی ہوگا؟ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت کی دعوت تو دی ہی نہیں جاسکتی۔ مگر اللہ کے سوا اور کچھ ہے۔

میں نے ابھی کہا کہ شعائر کے معنی نہیں معلوم، تو اللہ کے سوا کچھ چیزیں ہیں کہ جن کی تعظیم کو اس نے جزو تقویٰ کہا ہے۔ تو اس

سے صاف ظاہر ہے کہ ہر قسم کی تعظیم کو شرک سمجھنا غلط ہے۔ ادھر کسی چیز کی تعظیم ہوئی اور کہا کہ یہ شرک ہے۔ اسے میں فطرت کے تقاضے پر بھی جانچنا چاہتا ہوں۔ فطرت کسی مذہب کی بھی ملک نہیں ہے۔ پھر قرآن کے معیار پر جانچنا چاہتا ہوں جو تمام مسلمانوں کی مشترک ہے، ایک مرکز ہے۔ پھر حدیث کے معیار پر جانچنا چاہتا ہوں۔ حدیث میں کچھ متفق علیہ ہیں، کچھ مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر قرآن کا تو کوئی جزو ایسا نہیں جس میں اختلاف ہو۔ مفہوم میں اختلاف ہو وہ اور بات ہے۔ اصل قرآن کی آیت میں کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ وہ اُسے (معاذ اللہ) غیر معتبر کہے۔

تو اب پہلے فطرت کے تقاضے پر غور کیجئے گا کہ کیا تعظیم شرک ہے؟ تعظیم کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے لیکن کسی ایک کے ساتھ ایسا برتاؤ کہ جو اس کے امتیاز کا، بلندی کا، بزرگی کا پتہ دے تو وہ تعظیم ہے۔ اب کوئی ادنیٰ درجہ کی تعظیم ہوگی، کوئی اعلیٰ درجہ کی تعظیم ہوگی۔ ادنیٰ درجہ کی تعظیم ہے تو چھوٹا شرک ہوگا۔ اونچے درجہ کی تعظیم ہے تو بڑا شرک ہوگا۔ لیکن شرک تو پھر ہر ایک کا ہوگا۔ تو اب یہ اصول کہ ادھر اپنے عمل سے کسی کے ساتھ امتیاز نمایاں کیا اور بس شرک ہو گیا۔

تو اب جناب! جو صاحب جس نقطۂ نظر کے حامی، جس مکتبِ خیال کے آدمی یہ کہتے ہیں کہ تعظیم مطلق تعظیم شرک، میں کہتا ہوں کہ خود ان کے گھر پر جا کر پہلے ان سے تعلقات قائم کیجئے، بلاوجہ کے مہمان ہو جائیے گا۔ ان سے پہلے کچھ دوستانہ بڑھائیے، پھر جا کر ان کے ہاں مہمان ہو جائیے۔ کسی بات کے غلط ہونے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ جو اس کا علمبردار ہے، وہ خود اس پر عمل نہ کر سکے۔ جو خلافِ فطرت بات ہوگی، اس پر کوئی عمل نہیں کر سکے گا۔

تو کسی بھی شرک شرک کی آواز بلند کرنے والے کے ہاں جا کر مہمان ہو جائیے، دو چار دن اور یہ اندازہ لگائیے کہ جس انداز سے وہ اپنے نوکر سے بات کرتا ہے، اسی انداز سے اپنے والد ماجد سے بھی بات کرتا ہے۔ اگر ذرا بھی اس نے فرق کیا تو وہیں سے پھر شرک شروع ہوا کیونکہ وہ فرق ظاہر ہے اظہارِ بزرگی کیلئے ہی ہوگا۔ وہ فرق احساسِ عظمت کیلئے ہی ہوگا۔ لہٰذا وہ تعظیم ہوگا اور جب تعظیم ہوگا تو شرک ہو جائے گا۔ اب یہ چیز رواج کے لحاظ سے بدل سکتی ہے۔ میں یوپی کا ہوں، وہ بھی لکھنؤ کا رہنے والا۔ یہاں مجمع میں بہر حال، وہ ہجرت کی جو ہوا چلی تھی، اُس کے لحاظ سے بہت سے یوپی کے بھی حضرات ہوں گے اور ممکن ہے لکھنؤ کے بھی ہوں۔ ممکن ہے کچھ باتیں وہاں رائج ہوں، پنجاب میں ان پر عمل نہ ہوتا ہو مگر کچھ باتیں تو ضرور مشترک ہوں گی دونوں جگہ۔

تو حضور! میں اپنے ہاں کے جو محاورات ہیں، ان کے لحاظ سے پہلے کہوں، جس پر بہت سے یہاں کے بھی حضرات عامل ہو گئے کہ جناب کوئی چھوٹا بچہ آیا، اس سے تُو کہہ کر بات کی، اب اپنے برابر کے ساتھ کے رفیق آئے، سکول کالج کے، ان سے تم کہہ کر بات کی۔ بس ادھر تو سے تم کی تبدیلی ہوئی اور شرک شروع ہوا۔ جب تم سے آپ ہوا تو شرک میں اضافہ ہوا اور جب جناب، قبلہ و حضرت و سرکار ہو گیا تو لیجئے شرک عظیم ہو گیا۔

بچہ اپنا آیا، پیر پھیلائے ہوئے لیٹے تھے، لیٹے رہے۔ اب آ گئے اپنے بزرگوار کوئی اُستاد، ارے اُستاد نہ سہی، حاکم ضلع آ گیا، کمشنر صاحب آ گئے۔ تو اب اسی طرح لیٹے رہیں گے؟ اب اگر ان کو آتے ہوئے دیکھ کر ذرا بھی اپنی جگہ سے جنبش کی تو شرک ہو گیا۔ یہ

اٹھ کے بیٹھ گئے یا کھڑے ہو گئے تو بہت بڑا شرک ہو گیا۔

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی بھی نقطہ نظر کا آدمی، کسی بھی متمدن ماحول میں، کسی بھی مہذب فضا میں اس اصول کا پابند ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ ذرا بھی امتیاز کسی کے ساتھ، اپنے قول وعمل میں، انداز گفتگو میں، طریق معاشرت میں ظاہر نہ ہونے دے تو یہ ایسی چیز ہو گی جس پر اس مہذب دنیا کا کوئی فرد عامل نہیں ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں، ہم ان میں رہے سہے نہ ہوں، اس لئے نہیں بتا سکتے کہ شاید جنگلوں میں، پہاڑوں کے رہنے والوں میں بھی اپنے انداز معاشرت کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہو، چھوٹے اور بڑے کا۔ کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہوا یسے کا جس کی نظروں میں عزت زیادہ ہو۔

اب چونکہ ہم اس معاشرت سے واقف نہیں ہیں، ہم نہیں بتا سکتے ورنہ جہاں سے شعور کی ابتداء ہوئی، وہیں سے یہ فرق مراتب لازمی طور پر پیدا ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ مطلق تعظیم شرک ہو کہ جو دور وحشت کے ساتھ شاید سازگار ہو لیکن دور تہذیب وتمدن کے ساتھ یہ سازگار نہیں۔ فطرت بشری اور شعور انسانی کے تقاضوں کے خلاف ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ اب آئے قرآن مجید میں دیکھیں کہ قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے ماں باپ کیلئے دیکھئے۔ آغاز وہی ہے جو خود اس اصول کو تقویت پہنچاتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

''تمہارے لئے اللہ کا یہی فیصلہ ہے عبادت تو سوا اس کے کسی اور کی نہ کرو''۔

تو اب جو جو کہا گیا ہے، وہ عبادت تو ہے نہیں، اب اسے سمیٹ کریوں کہا کہ تمہارے رب کا فیصلہ ہے کہ عبادت سوا اس کے کسی کی نہ کرو مگر ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ احسان کے معنی وہ نہیں ہیں کہ کسی کو اپنا ممنون کرم بنا کر اس کی گردن کو جھکائیں۔ احسان کے معنی ہیں اچھا سلوک، حسن عمل۔

تو والدین کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو اب یہ ان کے حسن سلوک کی اہمیت ہے کہ عبادت الٰہی کے بعد بلا فاصلہ اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ یعنی اب حقیقی کے بعد ذہن کو مجازی کی طرف موڑا جاتا ہے۔ دیکھو! عبادت تو بس اس کی ہے جو حقیقی ہے۔ مگر یہ ماں باپ ،ان کے ساتھ حسن سلوک، مگر حسن سلوک کو مبہم نہیں چھوڑا جاتا۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا

دیکھو! ان میں سے دونوں یا ایک کبرسنی کی منزل تک پہنچ جائیں تو ان سے اُف بھی نہ کرو۔ اب ماشاء اللہ صاحبانِ عمل ہیں اور اہل فہم ہیں۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی کبرسنی کی منزل تک پہنچ جائے، یہ درحقیقت قید حکم نہیں ہے یعنی کوئی صاحب ہوں کہ ان کے والد صاحب ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہوں، بعض ہوتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں صاحبزادے متولد ہوئے تھے، اب بعد میں اتنا فرق

نمایاں نہیں ہوتا دیکھنے والے کو کہ وہ رشتہ بھی محسوس کرے کہ وہ باپ ہیں، یہ بیٹے ہیں۔ بعض جگہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بڑے بھائی ہیں۔ اسی طرح یہ خواتین میں زیادہ ہوتا ہے، بعض اوقات ان میں فرق اتنا کم محسوس ہوتا ہے کہ ماں بیٹی معلوم نہیں ہوتیں۔ ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ وہ بڑی بہن ہیں، یہ چھوٹی بہن ہیں۔ تو اب اگر ایسے صاحبان ہیں جن کے ماں باپ میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا ہے تو وہ کہیں کہ جناب قرآن مجید میں جو کلیہ ہے، وہ تو انہیں یاد تھا کہ جو ماں باپ سن رسیدہ ہو جائیں۔ ہمارے ماں باپ یا مادرِ محترمہ تو ابھی کبرسنی کی منزل تک نہیں پہنچے ہیں تو اس لئے ہم جو چاہیں کریں۔

تو حقیقت میں یہ قید شرط نہیں ہے۔ نفسیاتی طور پر غور کیجئے کیونکہ کبرسنی میں یہ زیادہ ہوا کرتا ہے کہ ان کی باتیں تکلیف دہ ہو جائیں۔ ضعیف العمری کی وجہ سے بے جا خفا بھی ہونے لگتے ہیں۔ کبرسنی کی وجہ سے بے بات کے غصہ بھی کرنے لگتے ہیں۔ یہ چونکہ انسان میں کبرسنی کی وجہ سے ہوتا ہے، تو اس لئے کہا گیا کہ اگر کبرسنی کی وجہ سے یعنی ایسی باتیں ہونے لگی ہیں کہ تمہیں ناگوار گزرتی ہیں تو دیکھو، ہم جانتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ تمہیں اذیت ہوتی ہے مگر چونکہ ماں کے ہاتھ سے ہے، باپ کے ہاتھ سے ہے، لہٰذا خبردار! اُف بھی نہ کرو۔

اب اہل فہم غور کریں کہ اُف کہنا کوئی اذیت پہنچانا نہیں ہے۔ اپنی اذیت کا اظہار ہے مگر چونکہ ماں باپ کے ہاتھ سے وہ سلوک ہو رہا ہے تو اپنی اذیت کا اظہار بھی نہ کرو۔ اب اس دَور کے تعلیم یافتہ اور ترقی پسند جوانانِ روزگار غور کریں کہ وہ ماں باپ سے کس کس طرح بات کرتے ہیں۔ ایک ادنیٰ انداز تو یہ ہے، مشاہدات میں ہر ایک کے، ایک ادنیٰ انداز یہ ہے کہ آپ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ ہمارے معاملات میں آپ دخل نہ دیا کیجئے۔ یہ والد ماجد سے بہت ہلکی بات ہے جو کہہ دی جائے اور اس سے آگے آپ جس زمانہ کے آدمی ہیں، آپ کیا جانیں ہمارے معاملات کو؟ لہٰذا آپ جو ہر چیز میں دخل دیا کرتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اور دَور وہ آگیا ہے کہ صاحبزادیوں کو، اگر فرض کیجئے کہ کسی کے آنے جانے کو وہ روکیں تو وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہمارے نجی معاملات میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ تو یہ دنیا کا تقاضا جو ہے، مجھے اس سے بحث نہیں مگر قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ ماں باپ سے اذیت بھی پہنچ رہی ہے، کبرسنی کی وجہ سے تو خبردار! اُف نہ کرو اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرو۔

اب یہ جھڑکنا کیا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ سخت نہیں ہیں، بس کہنے کا انداز سخت ہے۔ کاغذ پر وہ الفاظ آئیں تو ان میں کوئی برائی نہیں ہے۔ مگر اندازِ گفتگو میں درشتگی ہے اور سختی ہے۔ اسے منع کیا جا رہا ہے۔

لَا تَنْهَرْهُمَا

''انہیں جھڑکو نہیں''۔

وَقُلْ لَّهُمَا

یہ تو منفی احکام تھے اور اب اس کے مقابل میں ''قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا'' ان سے بات کرو اس طرح جس سے ان کی بزرگی

نمایاں ہوتی ہو اور دیکھو، ان کے ساتھ عاجزی کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکائے رکھو۔ یعنی بیٹھو تو اس انداز سے کہ تمہارے بیٹھنے سے ظاہر ہو کہ چھوٹا بڑے کے سامنے بیٹھا ہے۔ ان کے ساتھ کھڑے ہو تو اس طریقہ سے کہ تمہارے کھڑے ہونے کے انداز سے پتہ چلے کہ تم اپنے کو چھوٹا سمجھتے ہو۔ ان کے ساتھ راستہ چلو تو اس طرح کہ معلوم ہو کہ چھوٹا بڑے کے ساتھ راستہ چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی نہ سمجھو کہ حق ادا ہوا، تو اب ہم سے کہو "وَقُلْ"، اور یہ کہو کہ:

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

اور اب یہ قرآن مجید کے الفاظ کے وہ پہلو ہیں جن پر بغیر تدبر کے انسان کی توجہ نہیں ہو سکتی۔ آغاز ہوا ہے آیت کا "قضی ربك"، "قضی اللہ" نہیں کہا گیا ہے، "قَضٰی رَبُّكَ"۔ رب کے معنی ہیں تربیت کرنے والا۔ تمہارے پروردگار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عبادت بس اسی کی کرو مگر ماں باپ کے ساتھ یہ سلوک کرو اور جب مناجات بتائی تو کہا: اب ہم سے کہو کہ "رَّبِّ"، اے ہمارے حقیقی رب۔

بھئی یہ رب یہاں کیوں آیا؟ "وَارْحَمْهُمَا"، ان پر رحمت شامل حال فرما۔ "كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا"۔ جیسا کہ انہوں نے بچپن میں ہماری تربیت کی، اس کا مطلب یہ ہے مناجات کا کہ پروردگار! یہ تربیت کرنا اصل میں تیرا کام تھا جو ان کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ لہٰذا ہم انہیں کہاں صلہ دے سکتے ہیں تو تو ہی ہے جو انہیں صلہ عطا فرمائے گا۔

تو خیر جھڑ کو نہیں، اُف نہ کہو اور قول میں بھی ان کی بزرگی مد نظر رکھو۔ عملاً بھی ان کے سامنے جھکے رہو۔ یہ تعظیم کی دعوت نہیں ہے اور کیا ہے؟ اور شروع میں کہہ دیا کہ عبادت سوائے اس کے کسی اور کی نہ کرو۔ تو اسی سے صاف ظاہر ہے کہ عبادت اور ہے اور تعظیم اور ہے۔ عبادت اس سے مخصوص ہے اور تعظیم ہر ایک کی ہے جس کو وہ کہے۔

اس کے بعد یہ عجیب بات ہے کہ کوئی کسی گورنر کی تعظیم کو کھڑا ہو جائے تو کوئی شرک کی آواز نہیں کرے گا اور دوسرے جو حکام ہوں، کوئی ان کے لئے کھڑا ہو تو کوئی شرک کی آواز بلند نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بات زیادہ تر رسولؐ اور آل رسولؐ ہی کے بارے میں صرف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو زیادہ رواج نہیں ہے۔ مگر ہمارے مسلمانوں کی اکثریت میں میلاد شریف اور سیرت کے جلسوں میں ایک بڑا مسئلہ قیام کا ہو گیا ہے۔ یہ ایک رواج بن گیا ہے کہ ایک خاص محل پر جب حضرت کا نام آتا ہے، سلام کے موقع پر تو تہذیب قرار دی گئی ہے کہ مجمع کھڑا ہو جائے۔ اب وہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے کہ ایک پورا گروہ اسے بہت بڑی اور عظیم معصیت قرار دیتا ہے اور معصیت نہیں بلکہ وہی شرک۔ وہاں کوئی معصیت نہ شرک سے ادھر ادھر تو رہتی ہی نہیں۔

تو جناب! یہ شرک پیغمبر خدا کا نام سن کر کھڑا ہونا، یہ تعظیم ہے اور اگر تعظیم جائز نہیں ہے، یہ شرک ہے۔ تو حضور! تعظیم کا ہر درجہ واجب تو نہیں؛ اکرتا۔ اس لئے ہم اس پر عامل نہیں ہیں مگر میں یہاں وکالت کرتا ہوں اس جماعت کی جو اس پر عامل ہے کہ وہ جو یہ کر رہے ہیں، وہ عبادت ہے یا تعظیم ہے۔ عبادت ہے تو شرک ہے۔ لیکن اگر تعظیم ہے تو شرک نہیں ہے۔ تو آپ یہ رسولؐ ہی کے بارے میں سب سے زیادہ جو شرک کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو سب کے ساتھ

ہوتا ہے۔ یعنی حضورؐ کی بزرگی کے اظہار کیلئے جو طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رسولؐ کے ساتھ وہی برتاؤ ہو جو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔

- میں کہتا ہوں کہ یہ توحید آپ نے کس سے سیکھی ہے؟ قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب سے؟ توحید کا ذکر آپ نے قرآن وحدیث ہی سے سنا۔ انہی کے خلاف انہیں صرف کر رہے ہیں۔ تو جناب! یہ کھڑا ہونا توحید کے خلاف ہے، شرک ہے۔ یعنی رسولؐ کے ساتھ کوئی برتاؤ ایسا نہیں کرنا چاہئے جو دوسروں کے علاوہ ہو۔ جو سب کے ساتھ برتاؤ ہو، وہی رسولؐ کے ساتھ۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بات مانیں یا قرآن کی؟

آپ کہتے ہیں وہی برتاؤ کرو جیسا سب کے ساتھ اور قرآن کہہ رہا ہے: دیکھو! ہمارے پیغمبر کو اس طرح نہ پکارا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ وہ کہتا ہے جیسا دوسروں کے ساتھ سلوک کرتے ہو، ویسا پیغمبرؐ کے ساتھ سلوک نہ کرو۔ آپ کہتے ہیں جو سب کے ساتھ سلوک کرو، وہی رسولؐ کے ساتھ سلوک کرو۔ تو اب قرآن کی بات مانیں یا آپ کی بات مانیں؟ صاف کہہ رہا ہے قرآن۔ نہ قرار دو ہمارے رسولؐ کے پکارنے کا طریقہ وہ جو آپس میں ایک دوسرے کا طریقہ قرار دو۔

اور جناب! ہم سے یہ کہا کہ اس طرح نہ پکارو جیسے سب کو پکارتے ہو۔ تو خود بھی اس طرح کبھی نہیں پکارا جس طرح اوروں کو پکارتا ہے۔ ارے وہ ہر کس و ناکس کو پکارنے ہی کیوں لگا؟ وہ انبیاء کو پکارتا ہے، مرسلین کو پکارتا ہے۔ ماشاءاللہ مجمع میں ممکن ہے کہ حافظِ قرآن بھی ہوں، جو حافظِ قرآن ہو، وہ حافظہ کی مدد سے دیکھ لیں، جو ناظرہ خواں ہوں، وہ ورق گردانی کر کے تلاش کر لیں، جو عرض کر رہا ہوں، اس کی تصدیق جتنی تلاش کریں گے، مکمل ہی ہوگی۔ اس کے خلاف ثابت نہیں ہوگا کہ وہ بس انبیاء کو پکارتا ہے مگر جس نبی کو پکارا، بلا استثنیٰ نام لے کر پکارا اور جب بلا استثنیٰ میں نے کہہ دیا کہ تو مجھے آیتیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر جتنی روا روی میں یاد ہیں، اتنی پڑھ بھی دوں گا۔

یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

''ارے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو''۔ نام لے کر پکارا۔

''یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ''۔

''اے نوحؑ! چلو سلامتی کے ساتھ''۔ نام لے کر پکارا۔

''یٰاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا''۔

''اے ابراہیمؑ! تم نے خواب سچ کر دکھایا''۔ نام لے کر پکارا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ

''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں حاکم بنایا''۔ نام لے کر پکارا۔

جس نبی کو پکارا، نام لے کر پکارا اور ہمارے رسولؐ کو بلا استثنٰی کبھی نام لے کر نہیں پکارا۔ جتنی طاقت سے وہاں بلا استثنٰی کہہ سکتا تھا، اتنی ہی طاقت سے یہاں بلا استثنٰی کہہ سکتا ہوں کہ انکو بلا استثنٰی کبھی نام لے کر نہیں پکارا بلکہ کبھی تو صفات کو مرکز خطاب قرار دیا ہے۔ ''اے طیب وطاہر''، ''اے یٰسین''، ''اے سید وسردار''۔ کبھی جو عہدہ تھا، اسی کو مرکز خطاب بنالیا، ''یَاَیُّھَا النَّبِیُّ''، ''یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ''، نبی اور رسول ان کا عہدہ ہے۔ اسی عہدے کو عنوانِ خطاب بنا کر جب ایک تبلیغ خاص کا حکم آیا تو پھر وہاں نہ طٰہٰ کہا گیا، نہ یٰسین کہا گیا۔ وہاں کہا گیا۔ ''یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ''، ''اے رسولؐ!''

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ

''جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس کی تبلیغ کر دیجئے۔''

یہاں ''یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ'' ہے اور اس خطاب ہی سے نمایاں ہے کہ سرکاری فرمان ہے۔ لہٰذا ضابطہ کا انداز خطاب، جو عہدہ ہے ان کا، اسی عہدے کو سرنامہ کلام قرار دے دیا اور کبھی تقاضائے محبوبی، جو لباس پہنے ہوئے ہیں، اسی انداز کو عنوانِ خطاب بنالیا۔ ''یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ''، ''یَآاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ''، اے چادر میں لپٹے ہوئے، اے عبا اوڑھے ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ذات اتنی محبوب ہے کہ اس کے لباس پر بھی نظر محبت پڑ رہی ہے۔

صاحبانِ فہم محسوس کریں گے کہ لباس کا تعلق جسم کے ساتھ عارضی ہوتا ہے۔ خصوصاً اوپر کا لباس جیسے عبا، جیسے چادر۔ یہ تعلق تو بالکل وقتی ہوتا ہے۔ لباس تو ہو سکتا ہے کہ چند دن جسم پر رہے یا ہر روز بدلتا ہو آدمی، تو ایک دن تو رہے گا لیکن یہ اوپر کا لباس جیسے ہماری عبا وغیرہ، تو وہ تو بس تھوڑی دیر کیلئے زیب جسم ہے اور اس کے بعد اُتار دی۔ تو جسم کے ساتھ عارضی تعلق ہوتا ہے۔ تو جو ذات اتنی محبوب ہو کہ عارضی تعلق اس کے جسم کے ساتھ جو ہو، وہ مرکز نظر پروردگار ہو جائے تو قبر مطہر جس سے جسم کا مقام تصور میں دائمی تعلق ہوتا ہے، وہ قبر طاہر مرکز نظر پروردگار نہیں ہوگی اور کیا اس کی ذرا سی بھی تعظیم وتکریم شرک ہو جائے گی؟

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ

دیکھو رسولؐ کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کیا کرو۔ یہ تعظیم سکھانا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ہاں! میں نے کہا یہ میں دوسرے حضرات کی وکالت کر رہا ہوں۔ میں تو عادی نہیں ہوں اور ہمارے مجمع میں اکثر وہ طریقہ نہیں ہے۔ یعنی ایک خاص محل پر اسم شریف سن کر کھڑا ہونا، ہم اس جذبۂ تعظیم کو بآواز بلند درود کے وسیلہ سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن میں تو اس وقت وکالت کر رہا ہوں اس طبقہ کی جو اس پر عمل کرتا ہے۔ تو جسے وہ بات ناگوار گزرتی ہے، وہ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے تو وہاں یہ کہا جاتا ہے۔ یہ کیا کہ ایک خاص محل پر حضرتؐ کا نام آئے تو وہاں کھڑے ہو یعنی ایسا ہی ہے تو پھر جب بھی آپ کا نام آئے تو کھڑے ہو جایا کرو۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ پرانے زمانہ میں اس کا نمونہ یا مثال دوسرے کے سمجھانے کو ہم بھی پیش کر سکتے تھے مگر جو جدید مشاہدات ہیں، اس سے بہت سی چیزوں کا سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے ہاں کا جانتا ہوں، وہاں میں نے دیکھا ہے مگر ظاہر ہے

جو ایک جگہ ہوتا ہے، وہ دوسری جگہ بھی ہوتا ہے۔ ایک دن ہم بینک گئے۔ وہ دن ہمارے علم میں ایسا نہیں تھا کہ بینک بند ہو، کام نہ ہو رہا ہو۔ وہاں جا کر دیکھا، مثلاً کہ سب اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کام نہیں ہو رہا۔ ہم نے کہا: ارے صاحب! کیا آج کوئی چھٹی ہے؟ کہا: نہیں چھٹی تو نہیں ہے۔ ہم نے کہا: پھر کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آج علامتی ہڑتال ہے۔ علامتی ہڑتال کیا ہے؟ کہا کہ اصل ہڑتال تو بعد میں ہوگی، اگر مطالبات پورے نہ ہوئے۔ یہ آج تھوڑی دیر کیلئے علامتی ہڑتال ہے یعنی اپنی ناراضگی کا ثبوت دینے کیلئے، مثلاً دوپہر تک کام نہیں کریں گے۔ یہ ابھی ہڑتال مکمل نہیں ہے۔ یہ علامتی ہڑتال ہے۔

اب میں نے وہاں سے یہ لفظ یاد کر لیا۔ ایک دفعہ یہ لفظ سنا تو مجھے اپنے مطلب کا معلوم ہوا۔ میں نے اُسے یاد کر لیا۔ اب جناب! یہ سوال جو قیام کا ہے، قیام بوقت سلام، انہوں نے یہ کہا کہ یہی کیا خصوصیت ہے؟ جس وقت بھی حضرتؐ کا نام آیا کرے تو کھڑے ہو جایا کرو۔ تو میں کہتا ہوں کہ بے شک اگر ہر وقت کھڑے ہوا کریں تو بہت اچھا مگر یہ اپنے امکان کی کمی ہے کہ ہر دفعہ کھڑے ہوا کریں۔ میں کہتا ہوں یہ تعظیم نہیں ہے، علامتی تعظیم ہے۔ (اگر ہر مرتبہ ان کا نام آنے پر کھڑے ہوں) تب بھی حقِ تعظیم کہاں ادا ہوگا؟

معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ خدا کیلئے قرآن دعوتِ تعظیم دے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جو ان کی عظمتِ شان کے لائق ہے۔ ان کو اس طرح پکارا نہ کرو۔ اپنی آواز کو ان کی آواز پر بلند نہ کیا کرو۔ یہ سب تعظیم کی دعوت ہے۔ اب کچھ ان کا عمل، میں نے عرض کیا تھا کہ فطرت پھر قرآن، پھر سنت۔

تو حضور والا! متفق علیہ تاریخ ہے اور تاریخ کے ذیل میں جو ارشاد رسولؐ آئے، وہ حدیث ہے، اس لئے جو عرض کرتا ہوں، وہ تاریخ بھی ہے اور حدیث بھی ہے۔ جنگ خندق کے بعد پیغمبرؐ واپس ہوئے، جناب سعد ابن معاذ، وہ انصارِ مدینہ میں سے بڑے سابق الایمان تھے، یعنی جبکہ ابھی ہجرت نہیں فرمائی تھی، جو لوگ مکہ معظمہ گئے تھے اور حضرتؐ کی خدمت میں شرفیاب ہو چکے تھے، ان میں سے یہ سعد بن معاذ تھے اور وہ جو ان کے ہاں دو قبیلے تھے اوس اور خزرج، ان میں سے یہ ایک کے سردار تھے۔ وہاں سے دو قبیلے نکالے جا چکے تھے، بنی قریظہ وہاں رہ گئے تھے مدینہ میں تو یہودیوں نے بڑے بڑے قلعے اپنے بنا لئے تھے، نیت تو ان کی اچھی نہیں تھی۔ جنگ کا ارادہ پہلے ہی سے تھا۔ کچھ دن محصور رہے قلعوں میں اور اس کے بعد اب کچھ انہوں نے کہا کہ اب ہم قلعہ سے باہر آئیں گے، ہمیں اطمینان دلایا جائے کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟

تو جناب! سعد ابن معاذ کے ان سے زمانہ قبل اسلام سے بڑے اچھے تعلقات تھے، بہت روابط تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ تم کسی کو ثالث بنا دو۔ وہ طے کر دے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے!؟ آپؐ نے سعد ابن معاذ سے فرمایا کہ تم طے کر دو۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ یہ تو ہمارے بڑے پرانے دوست ہیں۔ وہ اپنی حماقت سے یہ نہیں سمجھے کہ ایمان میں پرانی اور نئی دوستی کچھ نہیں ہوتی، ایمان کے تقاضے جو ہیں، وہ تو پورے ہوں گے اور تھے وہ بڑے جلیل المرتبہ صحابی۔ انہوں نے کہا کہ سعد ابن معاذ جو فیصلہ کریں، ہمیں وہ منظور ہے۔

آپؐ نے سعد کے بلوانے کیلئے آدمی بھیج دیا۔ وہ ایک مرکب پر سوار ہو کر آئے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں، وہ جو آئے تو یہ ایک

جملہ ہے، پورا واقعہ نہیں عرض کرنا ہے، جسے دیکھنا ہے تاریخ اسلام میں دیکھ لے کروہ جو آئے تو حضرتؐ نے انصار کے اس قبیلے سے فرمایا کہ دیکھو! تمہارا سردار آیا ہے، کھڑے ہو جاؤ۔ یہ دعوتِ تعظیم نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ تمہارا سردار آیا ہے، کھڑے ہو جاؤ۔ تو معلوم ہوا کہ رسولؐ کی تعظیم یہ نہیں ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو۔ بس اب ایک جزء عرض کروں گا۔ آج تو اس سلسلہ کی پہلی مجلس ہے۔ پھر انشاء اللہ اور اجزاء تفصیل کے ساتھ بیان ہوں گے کہ یہ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم کھڑے ہو جاؤ، اور اب فوراً آپ کا عمل۔ حضور معتبر ترین کتابیں صحاح ستہ مانی جاتی ہیں۔ اس صحاح ستہ میں ایک صحیح ترمذی ہے، چونکہ صحاح میں ہے، اس لئے ترمذی شریف کہلاتی ہے۔ جیسے بخاری شریف، مسلم شریف، ویسے ترمذی شریف۔ تو وہ بھی ادنیٰ درجہ کی روایت نہیں ہے۔ صحیح ترمذی میں ہے تو صحاح ستہ میں ہے۔ اس میں دیکھئے کہ صحیح ترمذی میں رسول کا عمل کیا ہے۔

"اِذَا دَخَلَتْ فَاطِمَةُ"۔

''جب بھی فاطمہ زہراؑ آتی تھیں''۔

ایک دفعہ کی بات نہیں ہے کہ راوی نے دیکھا ہو کہ فاطمہ زہراؑ آئیں اور پیغمبرِ خدا کھڑے ہو گئے۔ ایک دفعہ کھڑے ہوں تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں، خلافِ توقع کوئی آجائے تو آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ آئیں اور پیغمبرِ خدا کھڑے ہو گئے۔ جب بھی آتی تھیں فاطمہ زہراؑ تو۔

"قَامَ اِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ"۔

''حضرت پیغمبرِ خدا ان کی تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے''۔

یہی جملہ ایسا اونچا تھا کہ ہماری تحریر و تقریر کی ساری قوتوں کو اس نے جذب کر لیا۔ ہم ہمیشہ اتنا ہی بیان کرتے رہے کہ حضورؐ حضرت فاطمہ زہراؑ کی تعظیم فرماتے تھے۔ مگر ارشادِ رسولؐ اور آگے بڑھتا ہے۔ جو تیسرا جملہ آئے گا، وہ اگر پہلے جملے سے بالاتر نہیں ہے تو اس سے کمتر بھی نہیں ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے یعنی راوی کہہ رہا ہے، "قَامَ اِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ"، حضرت رسولِ خدا کھڑے ہو جاتے تھے۔ "رَحَّبَهَا"، مرحبا فرماتے تھے یعنی خوش آمدید کہتے تھے۔

"وَاَجْلَسَهَا فِيْ مَكَانِهٖ"۔

''اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے تھے''۔

اب اس عظمت کا میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تجزیہ اگر کریں تو اس جملے کے مفہوم کے سوا اس کے اور کوئی معنی ثابت ہی نہیں ہوں گے کہ جب تک فاطمہ زہراؑ بیٹھی ہیں، پیغمبرِ خدا نہیں بیٹھیں گے۔ جب فاطمہ زہراؑ اٹھ کر جائیں گی، تب اپنی جگہ حضرت تشریف فرما ہوں گے۔ تو یہ فاطمہ زہراؑ کی تعظیم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور میں کہتا ہوں کہ اس عملِ رسولؐ سے ثابت ہے کہ فاطمہؑ فقط بیٹی نہیں ہیں، کچھ اور بھی ہیں۔ فاطمہ علاوہ بیٹی کے کچھ اور بھی ہیں ورنہ بیٹی ہونے کا تقاضا ہی نہیں ہے کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو اور ماشاء اللہ صاحبان

علم ہیں آپ حضرات میں اور ممکن ہے ہر نقطۂ نظر کے کچھ اصحاب ہوں۔ غور فرمائیے کہ اصول یہ ہے کہ جو عملِ رسولؐ ہے، وہ جزوِ سنت ہے۔ جو تقریرِ رسولؐ ہے، وہ بھی جزوِ سنت ہے۔ تقریر کے معنی عام لوگ نہیں سمجھیں گے یعنی کوئی دوسرا رسولؐ کے سامنے کوئی عمل کرے، رسولؐ اس کو منع کر دیں، وہ بھی جزوِ سنت اور یہ اصول ہے کہ سنتِ رسولؐ کی پیروی یا واجب ہو گی یا مستحب۔

ہو سکتا ہے کہ واجب ہو اور ہو سکتا ہے کہ مستحب ہو۔ ہم جسے واجب کے مقابلہ میں سنت کہتے ہیں، وہ واجب نہ ہو، سنت ہو یعنی مستحب ہو۔ یہ ایک عملِ رسولؐ ہے جو بالاتفاق موجود ہے اور اصول ہے کہ عملِ رسولؐ کی پیروی سنت۔ مگر مجھے کسی فقہ میں نظر نہیں آیا کہ باپ کیلئے سنت ہو کہ وہ بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑا ہوا کرے۔ کسی کتاب میں آپ نے دیکھا، کسی عالم سے سنا کہ باپ کے لئے مستحب ہو۔ واجب نہ ہو، مستحب ہو کہ اپنی بیٹی کی تعظیم کرے۔ تحفۃ العوام وغیرہ ہی نہیں، دنیا کی کسی کتاب فقہ میں۔ مطالعہ کی پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے دنیا کی کسی فقہ کی کتاب میں نہیں دیکھا کہ باپ کیلئے سنت ہو کہ بیٹی کی تعظیم کرے۔

آجکل آسان ہے یہ کہہ دینا۔ کوئی کہے کہ ان سب علماء نے غلطی کی۔ ارے صاحب! ریسرچ کا تقاضا یہ ہے کہ ایک بات آج سمجھ میں آئی۔ تو چاہے ہم سے کسی نے پہلے نہیں کہا ہو، ابھی تک کسی نے نہیں لکھا۔ اب ہم جو کتاب لکھیں گے، کیونکہ دلیل ہمارے سامنے موجود ہے۔ صحیح ترمذی کی حدیث شریف ہے۔ اب سے ہم لکھا کریں گے اور خصوصاً ہمارے طبقہ کے لوگ، فضیلت کا ایک پہلو بھی ہے تو ہم کہاں بھول سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ واقعی ہم نے اس طرح ابھی تک توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اب سے ضرور ہم اپنی بیٹی کی تعظیم کیا کریں گے۔

تو صاحب! اب تک تو یہ علماء کا عمل ہے کہ کتابوں میں نہیں لکھا۔ بیچارے علماء غیر معصوم ہیں، کہہ دیجئے کہ غلطی کی سب نے۔ لیکن اب اس سے بالاتر ہے، مشترک اسلامی نقطۂ نظر سے۔ اور خود ہمارے معتقدات کی روشنی میں کسی نے بھی، جو سنت رسولؐ کی پیروی کرنے کا دعویدار تھا۔ کبھی اس سنت رسولؐ پر عمل نہیں کیا۔ حضورؐ کے صحابہ کرام میں کیسے کیسے لوگ تھے جو سنتِ پیغمبرؐ ایک ایک یاد رکھتے تھے۔ خود حالات صحابہ کی کتابوں میں یہ بھی ہے کہ عبداللہ ابن عمر، انہیں کسی نے دیکھا کہ اس درخت کے نیچے جا کر نماز پڑھی۔ اس درخت کے نیچے نماز پڑھ رہے ہیں، ادھر اُدھر پھر کر نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہا: جہاں جہاں بھی رسولؐ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، وہاں نماز پڑھ رہا ہوں۔ یہ اتباعِ سنت کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ تو اتباعِ سنت کا اتنا ذوق وشوق۔ یہ ویسے بڑی اچھی بات ہے۔ ایک ایک ہزار صفحہ کی کتابیں حالات صحابہ میں ہیں لیکن کسی صحابی کے حالات میں نظر نہیں آتا کہ وہ اپنی صاحبزادی کی تعظیم کرتے ہوں اور کھڑے ہو جاتے ہوں۔

ماشاء اللہ صاحبانِ فہم ہیں۔ ارے ایسی ایسی صاحبزادیاں جو کسی حیثیت سے واجب التعظیم ہو چکی ہیں مگر ان کے پدارانِ نامداران کی تعظیم کیلئے نہیں کھڑے ہوتے۔ تو یہ کیا معاملہ ہے؟ حالانکہ صحاحِ ستہ، صحیح ترمذی میں حدیث موجود اور برابر نقل بھی ہوتی رہی۔ یہ نہیں کہ اسے بھول گئے ہوں۔ اچھا صحابہ تو غیر معصوم تھے۔ کوئی مسلمان نہیں مانتا کہ اصحاب معصوم تھے۔ عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جیسے رسالت ختم ہو گئی، عصمت بھی ختم ہو گئی۔ یا یوں کہئے کہ جتنی حد تک رسولؐ کے لئے عصمت مانی، اتنی رسولؐ کے بعد ختم ہو گئی۔ مگر ہمارے ہاں نبوت ختم ہو گئی، رسالت ختم ہو گئی، عصمت ختم نہیں ہوئی۔ اب جو خدا کی طرف کا رہنما ہو، چاہے بنام امام ہو، وہ امامت جو

اصولِ دین میں ہے، اس امامت کا حامل ہو جو بھی ہو، وہ معصوم ہے۔ عصمت ختم نہیں ہوئی، وہ تا قیامِ قیامت قائم ہے، تو صحابہ کے بارے میں تو ہمارے افراد بے جھجک کہہ دیں گے کہ ان کا عمل ہمارے لئے سند نہیں ہے۔ لیکن بحمد للہ! آپ اور ہم معصوم مانتے ہیں۔ جن کی سیرت ہمارے نزدیک جزوِ سیرت رسولؐ ہے۔ اُن میں سے کوئی اپنی صاحبزادی کی تعظیم کو کیوں نہیں کھڑا ہوتا۔ حالانکہ کیسی کیسی صاحبِ صفات صاحبزادیاں، میں کہتا ہوں کہ امیر المومنینؑ حضرت زینبؑ کی تعظیم کیوں نہیں فرماتے؟

کوئی روایت آپ نے سنی ہے، مجھے معلوم ہے کبھی یہ سنا ہوگا کہ امام حسینؑ بہن کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ اگر ایسا ہے تو ہے اونچی بات یہ بھی۔ مگر وہ بات تو نہ ہوئی، بھائی بہن تو ایک برابر کا رشتہ ہے۔ باپ بیٹی کی تعظیم کیلئے کھڑا ہو جاتا ہو، وہ نظیر نہیں ملتی۔ امیر المومنینؑ تعظیم کیلئے کیوں نہیں کھڑے ہوتے؟ امام حسینؑ نے جناب سکینہؑ کیلئے اظہارِ محبت میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں، وہ ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن یہ بات ہم تک نہیں پہنچی کہ حضرت امام حسینؑ جناب سکینہؑ و فاطمہؑ کی تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے اور جنابِ معصومہ قمؑ، باوجودیکہ فہرست معصومینؑ میں ہیں لیکن جلالتِ قدر وہ ہے کہ آپ معصومہؑ کہنے لگے۔ معصومہ قمؑ کا محاورہ آپ کے درمیان رائج ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ معصومہ کہہ دینے سے فہرستِ معصومین میں داخلہ نہیں ہو جاتا۔ تو معصومہ قمؑ کہنے لگے، وہ الگ بات ہے۔ لیکن چودہ معصومؑ وہ ہیں کہ دلیلِ عصمت جن پر قائم ہے۔

بہرکیف کچھ ایسا جذبۂ احترام پیش نظر ہے کہ امام رضاؑ کی بہن کو معصومہ قمؑ کہا جانے لگا۔ میں کہتا ہوں کہ امام رضاؑ کی بہن ہیں تو امام موسیٰ کاظمؑ ان کی تعظیم کو کھڑے ہوں۔ جنابِ حکیمہؑ خاتون جو اتنی محل اعتماد تھیں کہ رازِ منتظر کی امانت دار قرار پائیں مگر امام محمد تقیؑ کی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے۔ تو اب یہ معمہ ہو گیا کہ ایک عملِ رسول مسلمہ موجود اور چودہ سو برس کا کوئی عالم نہیں لکھ رہا کہ یہ مستحب ہے۔ صحابہ عمل نہیں کر رہے۔ جن کے گھر کی بات ہے، ان میں سے بھی کوئی عمل نہیں کر رہا۔ تو کیا وہ اصول ٹوٹ گیا؟ عملِ رسولؐ کی پیروی میں فضیلت نہیں رہی۔

تو بس جو میں جواب دوں، اسے دنیا قبول کرے ورنہ جو حل اس کے سامنے ہو، وہ پیش کر دے۔ میں کہتا ہوں کہ چودہ سو برس کے علمانے یہی سمجھا، صحابہ رسولؐ یہی سمجھے۔ جن کے گھر کی بات تھی، ان آئمہ معصومینؑ نے یہی جانا کہ فاطمہؑ کی یہ تعظیم بحیثیت بیٹی کے نہیں ہے۔ یہ شخصیت فاطمہؑ کے لحاظ سے ہے، عظمتِ فاطمہؑ کے لحاظ سے ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ اصول قائم ہے۔ سنتِ رسولؐ کی پیروی لازم ہے مگر قیامت تک کے مسلمان کیلئے فاطمہؑ کی تعظیم واجب ہے۔ اپنی بیٹی کی تعظیم سے سنت ادا نہیں ہوگی۔

اب سیدۂ عالم کی اتنی تعظیم کس حیثیت سے ہے؟ وہ بہت تشریح طلب ہے اور آفتاب کی کرنیں مجھ کو پیغامِ الوداع دے رہی ہیں۔ لہٰذا میں آگے نہیں بڑھوں گا۔ سیدۂ عالم کہ تعظیم پیغمبرِ خدا فرما رہے ہیں۔ سیدۂ عالم کی منزل کیا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي"۔

"فاطمہؑ میرا ایک جزو ہے"۔

یہ جزو جسم کا جزو نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض ذاکر یہ ترجمہ کر دیتے ہیں لختِ دل، پارۂ جگر۔ اس سے بات محبت پر ڈھل جاتی ہے۔ رسولؐ نے جو فرمایا ہے، اس میں نہ دل ہے، نہ جگر۔ پیغمبرِ خدا نے فرمایا: "میرا ٹکڑا"، تو "میرا ٹکڑا ہے"، اس کے معنی یہ ہیں کہ

میرے فرائض کی تکمیل نہ ہوتی بغیر فاطمہؑ کے۔ اور پھیلا کے عرض کرنے کا موقع نہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ فرمانِ رسولؐ جو زبانی ہے، وہ توہدایت خلق کر سکتے تھے۔ اقوال سے۔ سیرتِ رسولؐ مقامِ اتباع میں کافی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ رسولؐ مردوں کیلئے نمونہ بن سکتے تھے، خواتین کے لئے نمونہ عمل نہیں بن سکتے تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ خزانۂ رسالت میں ایک گہر بے بہا ہو جس کا کردار خواتین کیلئے ویسا ہی معصوم نمونہ ہو جیسا رسولؐ کا کردار مردوں کیلئے معصوم نمونہ ہے۔ اس کیلئے خالق نے فاطمہ زہراؑ جیسی بیٹی کرامت فرمائی اور میرے نزدیک تو رسولؐ اسی لئے تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ وہ فاطمہؑ کی تعظیم نہیں تھی، اس منصب کی تعظیم تھی جو فاطمہؑ کے سپرد تھا اور میں نے عرض کیا کہ تفصیل سے عرض کرنا کا موقع نہیں ہے۔ مگر ایک خیال میرے ذہن میں مدتوں رہا ہے، میں انکار نہیں کرتا۔ اپنی کوتاہی علم کا اقرار کرتا ہوں کہ حضرت امیرالمومنینؑ کے فضائل بے شمار مگر مجھے کہیں نہیں ملا کہ رسول اللہؐ حضرت علیؑ کی تعظیم کو کھڑے ہوئے ہوں۔ کسی اور کا کیا ذکر علیؑ کیلئے نہیں ملا کہ رسولِ خداؐ تعظیم کو کھڑے ہوتے ہوں۔ مگر فاطمہؑ کیلئے مل رہا ہے۔

میں نے اس پر غور کیا ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے؟ نہیں، فضائل کا زیادہ ہونا اور چیز ہے، اوصاف کا بلند تر ہونا اور چیز ہے۔ تو یقیناً امیرالمومنینؑ کی جو منزل ہے، وہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر جو عرض کر رہا ہوں، اُس پر غور کیجئے۔ خود اپنے معتقدات کی روشنی میں۔ بھئی اوصاف اور چیز کمالات اور چیز، مگر علیؑ کا جو منصب ہے، وہ بعدِ رسولؐ ہوگا اور فاطمہؑ کا جو منصب ہے، وہ رسولؐ ہوگا اور فاطمہؑ کا جو منصب ہے، وہ رسولؐ کی موجودگی میں ہے۔

گزشتہ دور میں ہمیں ایک معصومہ معلوم ہیں حضرتِ مریم۔ مگر حضرتِ مریم کی زندگی رہنماءِ خلق کیلئے کافی نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کی شریک نہیں۔ عورتوں کیلئے جو اصل زندگی ہے، اُس کیلئے مثال نہیں بن سکتیں۔ تو مریم کے بعد فاطمہؑ کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ طبقے میں بہت مقبول ہے ڈاکٹر اقبالؒ کا کلام۔ تو انہوں نے کہا:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

تو انہوں نے تو عزت کے اعتبار سے کہا، میں دوسری حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ بحیثیت نمونۂ عمل کے حضرت مریم بیٹی ہونے کا نمونہ بن سکتی ہیں، ماں ہونے کا نمونہ بن سکتی ہیں مگر شریکِ حیات کی حیثیت سے جو فرائض ہیں، اس کا نمونہ نہیں بن سکتیں۔ اس کیلئے ضرورت تھی حضرتِ فاطمہ زہراؑ کی۔ یہاں تینوں پہلو مکمل۔ بحیثیت بیٹی باپ کے ساتھ شریک، عملِ مباہلہ میں بحیثیت زوجہ کے امیرالمومنینؑ کی شریکِ حیات عمر بھر اور بحیثیت ماں کے چاہے حسنؑ و حسینؑ کا نام لیجئے، زینبؑ و اُم کلثومؑ کا۔ یہاں تینوں شعبے مکمل مگر اب مصائب عرض کرتا ہوں۔ میں خود بارگاہِ سیدۂ عالم میں عرض کرونگا کہ بے شک آپؑ کی زندگی مکمل (معاذ اللہ) آپؑ کی سیرت میں کوئی نقص نہیں۔ مگر قدرت نے آپ کو بھائی عنایت نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس رشتے کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ وہ آپ نہیں ظاہر فرما سکتیں۔ جس طرح مریم کے بعد آپؑ کی ضرورت تھی، وہاں آپؑ کے بعد مخدومۂ عالم، آپؑ کی بیٹی کی ضرورت تھی۔ آپؑ شریکِ حیات جہاد و مباہلہ، یہ شریک جہاد کربلا۔

43

شعائرالٰہیہ

خانہ کعبہ کا طواف ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کوئی بنظر عقیدت کسی ضریح کا طواف کرے تو بڑی شدت سے آواز آئے گی کہ "شرک"۔ اسی طرح حجر اسود کا بوسہ متفق علیہ ہے لیکن کسی علَم کو کوئی بوسہ دے تو آواز آئے گی "شرک"۔

ہم نے سجدہ گاہ پر سجدہ کرلیا تو کہا گیا کہ یہ شرک ہے۔

اگر ہم کسی کی ولادت کو کتنا ہی فضیلت کے ساتھ بیان کریں تو یہ ثبوت ہے اس کا کہ ہم نے انہیں خدا نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شرک کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے انتظار کرنے والوں سے ہمدردی ہوا کرتی ہے اور اس سے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ قسمتِ مسلم میں انتظار لکھا ہوا ہے۔ ہر ایک منتظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی منتظر ہے ناممکن بات کا اور کوئی ممکن بات کا منتظر ہے۔

دنیا کہتی ہے کہ یہ قبر پرستی ہے۔ ارے قبر پرستی ہوتی تو ہمارے ملک میں قبروں کی کوئی کمی تھی؟ یہ ہم اتنی مسافت طے کرکے وہاں کیوں جاتے؟ معلوم ہوا کہ کسی قبر کی پرستش نہیں ہے، صاحبِ قبر کا رشتہ ہے جو لے آیا۔

امام حسینؑ نے اپنی پوری زندگی میں جب بھی بیٹے کو دیکھا ہے تو بنظرِ عبادتِ خدا دیکھا ہے، ہمیشہ شبیہ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

شعائرِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ

جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا ایک جزو ہے۔ میں نے عرض کیا کہ عبادت اللہ کے ساتھ ہے۔ کسی اور چیز یا کسی اور شخص کیلئے عبادت نہیں ہو سکتی۔ مگر جہاں تک تعظیم کا تعلق ہے، تو اس کیلئے کہا جا رہا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم پرہیز گاری کا ایک جزو ہے۔ تو اس سے یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اور چیز ہے اور تعظیم اور چیز ہے۔ پیغمبر خدا کی تعظیم کی دعوت جس طرح دی گئی ہے، اس کیلئے میں نے دو آیتیں پڑھی تھیں:

لَا تَجۡعَلُوۡا دُعَآءَ الرَّسُوۡلِ بَيۡنَكُمۡ كَدُعَآءِ

''اس طرح نہ پکارا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔''

لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِىِّ

''اپنی آوازوں کو رسول کی آواز سے اونچا نہ کیا کرو''۔

اب ایک اور آیت:

اَلَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِىَّ الۡاُمِّىَّ الَّذِىۡ يَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰٮهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ

ارشاد ہو رہا ہے، تائید کی جا رہی ہے کہ وہ جو پیروی کرتے ہیں اس نبی اُمی کی۔ اس وقت ہر ہر لفظ کی تشریح منظور نہیں ہے جسے لکھا ہوا دیکھتے ہیں خود اپنے پاس۔ یعنی اہل کتاب خود اپنے پاس لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ توریت اور انجیل میں اور یہ انہیں نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے اور ان کیلئے اچھی صاف ستھری پاک غذاؤں کو حلال قرار دیتا ہے اور جو خبیث چیزیں ہیں، انہیں منع کرتا ہے، انہیں حرام قرار دیتا ہے اور جو بوجھ ان پر تھے، ان کو دور کرتا ہے اور جو زنجیریں ان کے پیروں میں پڑی ہوئی تھیں، ان کو دور کرتا ہے۔

ایک طویل آیت ہے۔ اس کے ہر جزو کی تشریح نہیں کرتا ہے۔ تو جن لوگوں نے اس پر ایمان اختیار کیا، "اٰمَنُوۡا بِهٖ" کے معنی

ہیں، اس کے بعد ہے "عَزَّرُوْہُ"۔ اس کے بعد ہے "نَصَرُوْہُ"۔ اب "عَزَّرُوْہُ" کے معنی لغت میں دیکھئے کیا ہیں؟ "آمَنُوْا بِہٖ" کے معنی ہیں ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ جو لوگ ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ آیا ہے۔ یہی لوگ دین و دنیا کی بہتری حاصل کرتے ہیں۔ تو وہ تو خصوصی انداز سے جن کو میں کہتا ہوں کہ ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ تعظیم ہو، وہ مطلوبِ خالق ہوگی۔ جب تک کہ استثنیٰ نہ ہو، کسی ایک طریقہ تعظیم کو خاص طور پر منع کر دیا جائے تو وہ اور بات ہے لیکن جب تک کہ استثنیٰ نہ کیا جائے، اس وقت تک جو بھی طریق تعظیم ہوگا، وہ اس حکمِ الٰہی میں داخل ہوگا اور یاد رکھنا چاہئے کہ تعظیم ایک عنوان ہے جس کے تحت میں جو جو طریقے ہیں، وہ باختلاف زمانہ باختلاف ملک بدلتے رہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں کوئی طریقہ تعظیم نہ ہو اور دوسرے وقت میں وہ طریقہ تعظیم رواج پا جائے جس طرح توہین۔ وہ جو اس کا مقابل رُخ ہے، وہ بھی ملک، آب و ہوا اور زمانہ کے اعتبار سے بدلتی ہے۔ ایک جگہ ایک بات توہین نہیں ہوتی، دوسری جگہ وہ توہین ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اگر شہروں میں نہیں تو دیہاتوں میں پنجاب کے۔ تو اور تم کہہ کر بات کرنا خاص طور پر کوئی توہین نہیں ہے۔ بعض جگہ گفتگو کا انداز ہی یہی ہے۔ لیکن مثلاً ہمارے ہاں ہندوستان میں اور خصوصاً یو پی میں تم یا تو کہنا یہ تذلیل اور توہین قرار پاتا ہے۔ ویسے بھی تعظیم کے انداز مختلف ملکوں میں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں۔

تو جو حکم خالق کی طرف سے سب کیلئے آئے، وہ ہر ملک کے لحاظ سے اس کی تہذیب کے اعتبار سے اس کے تمدن کے اعتبار سے جو طریقہ تعظیم ہو، اس پر حاوی ہوتا ہے اور ہر ملک کے لحاظ سے جو طریقہ توہین ہو جو طریقہ اہانت ہو، وہ حرام ہو جائے گا بلکہ کفر ہو جائے گا۔ تو اس مصداق کے طریقے بدلتے رہ سکتے ہیں مگر اصل حقیقت اپنے حال پر قائم رہے گی کہ خالق کی طرف سے تعظیم کا حکم ہے۔ جیسے میں نے کہا کہ ذکرِ رسولؐ کے دوران قیام بعض جماعتوں میں رائج نہیں ہے۔ بعض جماعتوں میں رائج ہے لیکن رائج جن جماعتوں میں ہے، وہ کس بناء پر؟ تعظیم کی بنا پر۔ لہٰذا وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اسی تعظیم و احترام میں داخل ہوگا۔ جس کا خالق نے حکم دیا ہے۔

اب ایک اور بات۔ کل کا بیان تھا جس کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے ابتداء ہی میں۔ میں نے کہا کہ تعظیم اور ہوتی ہے، عبادت اور ہوتی ہے۔ یعنی تعظیم اور عبادت ایک چیز نہیں ہے مگر اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی تعظیم جو حکمِ الٰہی سے ہو، وہ یقیناً عبادت ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ تعظیم کسی کی ہے، عبادت کسی کی ہے۔ تعظیم شعائر اللہ کی ہے اور عبادت اللہ کی ہے، تعظیم رسولؐ کی ہے اور عبادت اللہ کی ہے کیونکہ عبادت اس کی ہے جس کے حکم سے تعظیم اسی کی ہے جس کی تعظیم کا اس نے حکم دیا ہے تو متعلق تعظیم اور ہے، متعلق عبادت اور ہے۔ تو تعظیم بہر حال شرک نہیں ہو سکتی۔۔ اگر حکمِ خدا سے ہو تو عبادت ہوگی۔ اگر از خود ہے یا کسی محرکِ دنیاوی کے لحاظ سے تو وہ عبادت نہیں ہوگی۔ جیسے بہت سے کام ہمارے جو اس کے حکم کی بناء پر نہ ہوں، خود سے ہوں۔ فرض کیجئے کہ کسی حاکمِ ضلع کی تعظیم کر رہے ہیں یا اپنے کسی بزرگ کی تعظیم کر رہے ہیں۔ ماں باپ کی تعظیم کر رہے ہیں۔ تو اگر اس وقت تصور ہو حکمِ خدا کا تو عبادت ہے کیونکہ اس نے حکم دیا ہے تعظیم کا۔

اسی طرح فرض کیجئے اپنے اُستاد کی تعظیم کر رہے ہیں تو وہ بھی اس نے کہا ہے کہ جو تمہیں تعلیم دے، وہ ایسا ہے جیسے تمہارا

آقا و مولا عالم دین کی تعظیم کریں کہ وہ اس دین کا عالم ہے۔ تو یہ سب تعظیم عبادت ہوگی۔ اگر کسی امیر کبیر کی اس کی دولت کی وجہ سے تعظیم کریں تو وہ بس تعظیم ہوگی، عبادت نہیں ہوگی۔ اگر کسی بوڑھے کی اس کے بزرگ ہونے کی وجہ سے بہ اعتبار سن تعظیم کی تو وہ بھی حکم خدا سے ہے۔ کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو سن رسیدہ بڑے لوگ ہیں، ان کی توقیر کرو۔ تو اگر اس کا حکم پیش نظر ہے تو وہ بھی عبادت ہوگی۔

غرض یہ کہ اگر اس کے حکم کے ماتحت تعظیم ہے تو وہ تعظیم بھی ہے اور عبادت بھی ہے۔ مگر تعظیم کسی کی ہے، عبادت کسی کی ہے۔ عبادت ہے خالق کی۔ اب جو طریقے تعظیم کے ہوں، اکثر نام لے لے کر ان کو شرک کہا جاتا ہے، مثلاً جا کر روضہ نبویؐ کی ضریح کو بوسہ دیا تو بہت زیادہ زبان ہی سے شرک شرک نہیں ہوا بلکہ پشت پر تازیانہ بھی پڑ گیا۔ گویا پاداش شرک یہیں مل گئی۔ اسی طرح سے اور اسی طرح کے کاموں کو جو شرک کہا جاتا ہے، سجدہ گاہ پر ہم نے سجدہ کر لیا، آواز آئی شرک۔ جب ضریح نبوی کا بوسہ لینے پر شرک کا حکم لگ گیا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی علم کو، ضریح کو، تعزیہ کو، جو ایام عزا میں ہوتے ہیں، اس کا بوسہ لے لیں، تو وہ بھلا کہاں توحید کے دائرے میں ہوگا؟

تو یہ جو ان کاموں کو شرک کر دیا جاتا ہے، میری سمجھ میں تو اس کے معنی ہی نہیں آتے۔ رَد کرنا تو اور بات ہے، وہ تو اس وقت ہے جب مفہوم سمجھ میں آئے اور جب کسی چیز کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں تو اس کی رَد کیا ہو؟ اب میں عرض کرتا ہوں، خانہ کعبہ کا طواف ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ کوئی بنظر عقیدت کسی ضریح کا طواف کرے تو بڑی شدت سے آواز آئے گی کہ "شرک"۔ اسی طرح حجر اسود کا بوسہ متفق علیہ ہے لیکن کسی علم کو کوئی بوسہ دے تو آواز آئے گی "شرک"۔ اور ایک چیز ابھی کہہ چکا کہ ہم نے سجدہ گاہ پر سجدہ کر لیا، کہا گیا کہ "شرک"۔ اول تو ایک اصولی بات عرض کروں، وہ خشک بات، یہ ہے اصولی کہ جو شرک ہو، اس میں استثنیٰ کی گنجائش نہیں۔ میری زبان سے لوگ خشک باتیں سن لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم کہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے تو کیا اس میں "إلّا" کی گنجائش ہے کہ سوائے اس کے شرک؟ جیسے اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اب اس میں سوا نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح شرک حرام یا کفر یا ظلم عظیم۔ اس میں "إلّا" کی گنجائش کوئی نہیں ہے کہ سوا اس کے۔

تو میں کہتا ہوں کہ جن جن کو میں نے متفق علیہ کہا۔ طواف خانہ کعبہ، جزو حج سب کے نزدیک۔ تو اگر کسی چیز کا طواف شرک ہے تو کیا خانہ کعبہ کو شریک بنانے پر وہ راضی ہو گیا؟ اسی طرح حجر اسود کو بوسہ دینا متفق علیہ ہے۔ وہ جہاں گویا کارخانہ ہے شرک سازی کا، وہ خود بھی اس پر عامل ہیں۔ حالانکہ ہر صاحب فہم غور کرے کہ شباہت بھی ڈرنے کی چیز ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ یہ چیز شرک نہیں ہے مگر تصور ہوتا ہے۔ یعنی ملتی جلتی ہے شرک سے۔ تو یہ ملتا جلتا ہوا ہونا بھی محرک ہو سکتا ہے ہولناک بنانے کا۔ تو اب میں ہر صاحب فہم کو دعوت دیتا ہوں کہ یہ حجر اسود کو بوسہ دینے کا جو حکم ہوا تو یہ تو پتھر ہے اور انہی پتھروں کو تو پوجتے تھے یعنی جنس اور نوع کے اعتبار سے اسی شرک کی قسم ہے جو مشرکین کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہ ہی نہیں کہ حرام نہیں بلکہ جزو حج۔ یعنی امکان ہو تو بوسہ دے، نہ امکان ہو تو استیلام کرے۔ مجمع کی کثرت کی وجہ سے رسائی نہ ہو تو استیلام کرے یعنی ہاتھ سے یوں کرے اور وہ پاس نہ جا سکے تو دور سے۔

ارے ہمیں لوگ کہتے ہیں کہ اتنی دور سے زیارت پڑھنے کا کیا فائدہ؟ وہاں نہیں سوچتے کہ دو گز سے یوں کیا اور پھر یوں کر لیا، اس سے کیا فائدہ؟ میں کہتا ہوں کہ یہ عمل جذبہ احترام کا مظہر ہے۔ اب یہ سب کے نزدیک عبادت حالانکہ جو واقعی شرک تھا، اس سے

صورت و شکل میں کتنا قریب ہے۔ اب وہاں ایک بام دور ہوا۔ حجر اسود کو جا کر بوسہ دیا تو دیکھتے رہے۔ وہاں بھی تو کوڑے چلتے ہیں مگر وہاں وہ روکنے کیلئے نہیں، اس لئے کہ دوسروں کو موقع دیں۔

بس! بعض ہیں کہ لپٹے ہوئے ہیں اور ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ تو ان کے لئے کوڑا چلتا ہے کہ بس تم بوسہ لے چکے، اب ہٹو۔ اب دوسروں کو موقع دو۔ تو وہاں یہ ترکیب و تحریص ہے۔ گویا اس کیلئے دوسروں کو موقع دینا، یہ امداد ہے، اس کی اعانت ہے۔ اس عمل خیر میں مگر اسی وقت رکن یمانی کو، جو اس کے مقابل میں رُخ ہے، گوشہ ہے خانہ کعبہ کا، اس کو اگر بوسہ دے لیا تو پھر چاروں طرف سے اعتراض کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اس گوشہ کا بوسہ لینا روا، اس گوشہ کا بوسہ لینا ناروا۔

یہاں فقہ کا اختلاف ہے، ہمارے ہاں مستحب ہے رکن یمانی کا بوسہ لینا۔ ان کے ہاں استیلام تو ہے اس کا بھی لیکن وہ جو بوسہ لینا ہے، وہ نہیں۔ میں نے کہا جو شرک ہے اس میں، استثنیٰ کی گنجائش نہیں۔ اگر شرک ہے تو پھر حجر اسود کا بوسہ لینا بھی ناروا ہونا چاہئے اور جب حجر اسود کا بوسہ لینے کی اجازت ہی نہیں ہے بلکہ حکم ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شرک تو نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس کا حکم نہیں ہے۔ تو جس بات کا حکم نہ ہو، وہ حرام تو نہیں ہو جاتی۔ اب جو جو غذائیں آپ کھاتے ہیں، ان کے کھانے کا کہاں حکم ہے؟ جو آپ پیتے ہیں، ان کے پینے کا کہاں حکم ہے؟ تو حکم ہونا اور بات ہے، ممانعت ہونا اور بات ہے۔ جب تک ممانعت نہ ہو، اس وقت تک جائز ہے۔ حجر اسود کا بوسہ لینے کا حکم ہے۔ اس کے غیر کے بوسہ لینے کا حکم نہیں ہے۔

تو اچھا صاحب! آپ عبادت نہ مانئے اس کو، عبادتِ خدا نہ مانئے لیکن وہ شرک کیونکر ہو جائے گا؟ جو شے شرک ہو، وہ کسی وقت میں بھی نہیں ہے۔ ہاں! میں نے کہا تھا کہ کسی طریقہ تعظیم کی کسی طور سے ممانعت ہو جائے، وہ بھی شرک نہیں ہوگا، گناہ ہوگا۔ شرک میں اور گناہ میں فرق ہے اور میں صاف طور پر کہوں کہ سجدہ طریقہ تعظیم، اسے ہمارے سوادِ اعظم کا ایک طبقہ یعنی صوفیاء کا ایک گروہ جائز سمجھتا ہے اور بڑا گروہ مخالف ہے۔ ہمارے ہاں بھی شرعاً سجدہ جائز نہیں ہے کسی کو۔ اس کیلئے احادیث ہیں پیغمبر خدا کی۔ دو قسم کی حدیثیں میری نظر میں سے گزریں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا، اب یہ بات آج کے ترقی پسند زمانہ کے تقاضوں کے خلاف ہے، مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے رسولؐ اتنے ترقی پسند نہیں تھے۔ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ اگر سجدہ جائز ہوتا۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ جائز نہیں ہے۔ اب یہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں شاگردوں کو حکم دیتا کہ وہ اُستاد کو سجدہ کریں۔ اب کوئی فقیہ اگر جرأت استنباط رکھتا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جب شاگرد کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے استاد کو سجدہ کرے تو پھر بیٹے کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اپنے باپ کو سجدہ کرے کیونکہ اُستاد کو بھی کہا گیا ہے کہ وہ آبائے ثلاثہ یعنی تین قسم کے باپوں میں سے ہیں۔ تو باپ ہونے کی حیثیت سے اس کی عزت ہے تو جب اس کیلئے سجدہ جائز ہوتا تو جو واقعی باپ ہے، اس کیلئے سجدہ کیوں نہ جائز ہوتا؟

لیکن اگر یہ ہوتا، اگر ہوتا، اسی نے بتا دیا کہ جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم سجدہ تعظیم کو جائز نہیں سمجھتے۔ مگر شرک کہنا غلط ہے۔ سجدہ بھی اگر بنظر تعظیم کرے تو وہ میرے نزدیک گناہ ہے، شرک نہیں ہے۔ اس کی دلیل، میں نے کہا کہ جو شرک ہے، اس میں استثنیٰ کی گنجائش نہیں،

تو جو شرک ہے، اس میں شریعت کی تبدیلی کا بھی اثر نہیں کیونکہ:

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام"۔

اصولِ دین تمام انبیاء میں ایک ہے۔ توحید اور شرک اصولِ دین سے متعلق۔ ثواب اور گناہ، یہ فروعِ دین سے متعلق۔ تو اگر شرک ہوتا تو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم نہ دیتا۔ اگر شرک ہوتا تو برادرانِ یوسفؑ اور یعقوبؑ، یعقوبؑ کی آنکھوں کے سامنے اور ان کی مرضی سے یوسفؑ کو سجدہ نہ کرتے اور یہ سب باتیں قرآن سے ثابت۔

ہمارے اوپر وہ سندیں پیش نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ہم کہیں گے کہ اب ہم شریعتِ اسلام کے پیرو ہیں۔ اس وقت سجدۂ تعظیمی جائز تھا اور اس وقت پیغمبرِ اسلام نے کہہ دیا ہے کہ جائز نہیں ہے۔ مگر شریعتوں میں تبدیلی ہوتی ہے، اصولِ دین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جب ناجائز ہو گیا ہے، تب بھی گناہ ہے، شرک ہو تو کسی دور میں بھی جائز نہ ہو سکتا۔

اب جو بات میں نے شروع کی تھی، بیچ میں اس کا دوسرا جزو آ گیا، میں نے کہا کہ میری سمجھ میں تو اس کے معنی ہی نہیں آتے۔ اب یہیں سے شروع کروں، کہتے ہیں کہ سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا شرک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سجدہ گاہ کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی پیشانی کے نیچے۔ اس کیلئے ایک تمہید کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ شرک ہوتا کیا ہے؟ جو بات خدا سے خاص ہو، اسے کسی دوسرے کیلئے صرف کرنا۔ مثلاً خداوندِ عالم خالقِ حقیقی ہے۔ اب کسی دوسرے کو خالق مانیں، اس کے ذاتی ارادہ و اختیار سے خود اس کی ذاتی طاقت سے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ اللہ بطور معجزہ کسی کے ہاتھ میں خلق کروا دے، وہ اور بات ہے۔ لیکن خالقِ حقیقی بس ایک رازقِ حقیقی، بس ایک ربِ حقیقی، بس ایک۔ یہ باتیں کسی دوسرے کیلئے ثابت کر دی جائیں تو وہ شرک ہو جائے گا۔ یا جیسے میں نے کہا کہ عبادت جس سے خاص ہے، عبادت کسی دوسرے کی کرے۔ اب عبادت کے معنی کیا ہیں؟ اللہ ہونے کا تصور کر کے کوئی عمل کرے۔ اس کا نام عبادت۔ کسی دوسرے کیلئے اسی تصور کے ساتھ کرے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ لیکن جو بات اللہ کیلئے ہو ہی نہ سکتی ہو، اُسے غیر اللہ کیلئے ثابت کریں تو وہ شرک کیونکر ہو گا؟

اللہ کیلئے کوئی بات ہوتی ہو اور اُسے غیر اللہ کیلئے ثابت کریں تو سمجھ میں آتا ہے کہ شرک ہے اور جو بات ہوتی ہو غیر اللہ کیلئے، اُسے غیر اللہ کیلئے ثابت کریں، مثلاً کسی باپ ماں سے پیدا ہونا، یہ غیر اللہ سے خاص ہے۔ تو اب ہم کسی کی ولادت، وہ چاہے کعبہ میں ہو، وہ ولادت بیان کریں یہ کہہ کر کہ خدا کے گھر میں ہوئی تو گھر خدا کا ہے مگر ولادت تو غیر اللہ ہی کی ہو گی۔ اسے کیونکر کہا جائے گا "شرک"۔

یہاں تیرہ رجب کی محفل تھی، ولادتِ جنابِ امیر علیہ السلام کا بیان تھا تو ایک صاحب نے پوچھ لیا کہ اگر یہ بہت بڑی فضیلت ہے تو آخر رسولؐ کیوں نہیں پیدا ہوئے کعبہ میں؟ اللہ نے یہ بات رسولؐ کے لئے کیوں نہیں رکھی؟ انہی کو کیوں کعبہ میں پیدا ہونے کا موقع دیا؟

بظاہر تو سوال مشکل تھا مگر میں نے جو عرض کیا کہ ہاں، یوں تو خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ بندہ ایک راز کی بات کو کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ مگر کچھ میری سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ رسولؐ کو بعد میں خدا کہنے والی کوئی جماعت پیدا ہونے والی نہیں تھی علمِ الٰہی میں مگر اس کے علم میں اس بندے کیلئے بعد میں خدا کہنے والے پیدا ہونے والے تھے۔ اس لئے اس کی ولادت کو نمایاں کرنے کی ضرورت تھی کہ

دیکھو! یہ خدا نہیں ہیں، یہ تو پیدا ہوئے ہیں۔

تو ولادت چونکہ غیر اللہ کیلئے خاص چیز ہے، تو اگر ہم کسی کی ولادت کو کتنا ہی فضیلت کے ساتھ بیان کریں تو یہ تو ثبوت ہے اس کا کہ ہم نے انہیں خدا نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شرک کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ جو بات غیر اللہ کیلئے خاص ہے، اس کو ثابت کریں غیر اللہ کیلئے تو شرک کیسے ہوگا؟

تو اب دیکھئے کہ سجدہ گاہ پیشانی کے نیچے ہے، کیا یہ بات اللہ کیلئے ہو سکتی ہے؟ کیا ہماری پیشانی کے نیچے اُس کا دستِ حق پرست آسکتا ہے؟ کبھی (معاذ اللہ) اس کا کوئی جسم کا حصہ۔ جسم ہی وہاں کہاں ہے جو ہماری پیشانی کے نیچے ہو۔ ہماری پیشانی کے نیچے جو ہوگا، کوئی جسم کا حصہ ہوگا۔ تو یہ بات تو غیر اللہ کیلئے خاص ہے تو کسی غیر اللہ کیلئے ہم وہ عمل کریں تو شرک کہاں سے ہوگا؟ یعنی اگر آپ اپنے کپڑے پر سجدہ کرلیں تو وہ شریکِ خدا نہ ہو، ماشاء اللہ قالین پر سجدہ کرلیں تو وہ شریکِ خدا ہو اور ہم خاکِ شفا پر، ارے مٹی کی جنس پر سجدہ کریں، جو خاکساری کا نشان ہے، قالین پر سجدہ میں تو پھر بھی امارت پسندی کا ایک پہلو ہے، خاک پر سجدہ بوریا نشینوں کی علامت ہے۔ جتنی قیمتی چیزیں بچھی ہوئی ہوں، چاہے وہ ریشم کا فرش ہو، چاہے وہ زرتار ہو، اس میں سونا لگا ہوا ہو، جواہر لگے ہوئے ہوں۔ مگر جب نماز پڑھیں گے تو خاک کی ٹکیہ لائیں گے۔ دنیا اسے خاک کی ٹکیہ ہی کہے گی۔ بہر حال ہم اُسے پیشانی کے نیچے رکھیں گے۔ یعنی یہ ایک اظہار ہوگا کہ ہم ان تمام اسبابِ ثروت کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اس کی ہمارے نزدیک کوئی عزت نہیں۔ اُسے بوسہ نہیں دیتے، اسے بوسہ دیتے ہیں، اسے قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔

اب تو بنظرِ شرف کربلا کی خاک کہتے ہیں ورنہ مسئلہ حقیقی کے لحاظ سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ وہ تو ایک اصول ہے۔ درخت کا پتہ لے لیتے ہیں۔ پنکھا ہوتا ہے، وہ رکھ لیتے ہیں، چٹائی ہوتی ہے، اس پر سجدہ کر لیتے ہیں۔ اگر خاکِ شفا ہے تو اُسے ترجیح دے دیتے ہیں۔ اسے شرک کہنے کے کیا معنی ہیں؟ کس چیز کا شرک؟ یعنی بوسہ دیا ضریح کو، وہ بہت بڑا شرک۔ میں کہتا ہوں بوسہ دینے کی کیا حقیقت ہے؟ ہمارے لب کسی جسم سے متصل ہوں، یہی معنی تو بوسے کے ہیں۔ تو وہی بات کہ کیا ہمارے لب اللہ سبحانہ کے کسی جزو سے متصل ہو سکتے ہیں؟ یہ جب بھی ہوگا کسی جسم کے ساتھ ہوگا۔ کسی مخلوق کے ساتھ ہوگا۔ اب میری عمر ایسی نہیں، ان باتوں کو پیش کرنا اور پھر جلالتِ منبر مانع ہے، اگر منبر کا حق کوئی سمجھتا ہو تو بڑی نازک منزل ہے۔ عرفی نے اس قصیدہ میں، جو نعتِ رسولؐ میں کہا تھا، بڑا معرکہ آرا قصیدہ، اس میں کہا تھا:

ھشدار کہ پا بر سرِ تیغ است قلم را

''ہوش رکھو کہ قلم کا پیر تلوار پر ہے''۔

بادشاہوں کی تعریف کر لینا آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کی تعریف کرنا جو شایانِ شان ہو، وہ بڑی نازک منزل ہے۔ قلم کا پاؤں تلوار پر ہے۔ تو اب اس میں ذرا سے تصرف کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ اگر منبر کے محل کی عظمت کا احساس ہو تو ہر خطیب اپنے دل سے کہے ''ھشدار کہ پا بر سرِ تیغ است زبان را''۔ ہوش رکھو کہ زبان کا پاؤں تلوار کی دھار پر ہے''۔ یہ مقامِ منبر نہ

مذاق کا متقاضی ہے، نہ بے فائدہ باتوں کا متقاضی ہے۔ اس میں حقیقت ہونی چاہئے۔ اس میں وہ ہونا چاہئے جو منبر کے شایانِ شان ہو۔ مگر اپنی غیر شاعرانہ زبان میں کہوں گا کہ جناب! بوسہ لینا جذباتِ نفس کی تحریک سے ہو تو شرک نہ ہو اور از روئے عقیدت ہو تو شرک ہو جائے۔ اب طواف کرنا، میں نے کہا کہ خانۂ کعبہ میں متفق علیہ، کوئی امام بارگاہ کا طواف کرے، کوئی ضریح کا طواف کرے، کوئی روضۂ حسینؑ کا طواف کرے، کوئی کہے غضب کیا، غضب کیا۔ میں کہتا ہوں کہ غضب کیا کیا؟ طواف کیا ہوتا ہے؟ بیچ میں کوئی شخص یا کوئی چیز اور اس کے گرد چکر لگانا۔ تو کیا کبھی آپ کو اللہ سبحانہ ملے گا کہ اس کے گرد چکر لگایئے۔ کوئی زبان سے کہے یا نہ کہے مگر جسمانیت کے تقاضے ثابت کرتا ہے۔ تو وہ بھی اس کی عظمت کا تصور یہ رکھتا ہے کہ عرش پر نہیں سماتا۔ تو پھر آپ کیا چکر لگائیں گے؟ مگر ہم تو کہتے ہیں کہ جسمانیت سے بری ہے۔ تو وہاں تو چکر لگانے کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی عمارت کے گرد، کسی شے کے گرد چکر لگائے جائے گا تو کوئی معنی ہی نہیں طواف کو عبادت سمجھنے کے۔

ہاں! ہر چیز میں معنی پیدا ہو جائیں گے اگر جس کا چکر لگا رہے ہیں، اسے خدا سمجھ لیں۔ اگر جس کا بوسہ لے رہے ہیں، اُسے خدا سمجھ لیں تو شرک ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ شرک بوسہ لینے سے نہیں ہوا ہے، خدا سمجھنے سے ہوا ہے اور ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ خدا سمجھ کر آنکھ سے ایک اشارہ ہو گا تو شرک ہو گا اور بغیر خدا سمجھے ہوئے سجدہ بھی ہو گا تو شرک نہیں ہو گا۔

جناب! تعظیم کے تقاضے سب جانتے ہیں۔ تعظیم کبھی راہِ راست ہوتی ہے اور کبھی اضافتوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو اب میں مثالوں سے ثابت کروں گا کہ اضافتوں کے ساتھ جو تعظیم ہے، وہ بڑے درجہ کی تعظیم ہوتی ہے۔

ایک صاحب، کوئی عالمِ دین، کوئی صاحب، دولت آئے، حاکمِ ضلع آئے، آپ کھڑے ہو گئے تعظیم کیلئے، مگر اب وہ نہیں آئے، ان کا چھوٹا بچہ آ گیا مگر اب اس بچے کو دیکھ کر آپ تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا یہ آپ اس بچے کی تعظیم کر رہے ہیں؟ آپ نے کہا: جانتے نہیں کس کا بچہ ہے؟ تو بتایئے جب خود ان کیلئے آپ کھڑے ہوئے تھے، وہ بڑے درجہ کی تعظیم تھی یا یہ بڑے درجہ کی تعظیم ہوئی؟

جناب! وہ خود بھی نہیں آئے، نہ بچے کو بھیجا۔ ارے ان کا نوکر آ گیا۔ نوکر صورت شکل سے کوئی دیہاتی آدمی ہے۔ آپ اس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا: ارے آپ اس دہقانی کی تعظیم کرتے ہیں؟ آپ نے کہا: اسے نہ دیکھو، یہ دیکھو کہ کس کا نوکر ہے۔

اب دیکھئے! بیٹے کی تعظیم کو جو کھڑے ہوئے تھے، اس سے بھی یہ تعظیم بڑھ گئی۔ اور اب جناب! وہ ان کا بھیجا ہوا کوئی بھی نہیں۔ ڈاکیے نے لا کر ان کا خط دیا۔ روز ڈاکیے سے خط لیتے تھے، چپکے بیٹھے رہتے تھے۔ آج ڈاکیے نے خط دیا اور آپ سرو قد کھڑے ہو گئے دیکھتے ہی۔ کسی نے کہا: ارے بھئی کیا ہوا؟ کہا: یہ فلاں قبلہ کا خط ہے۔ تم جانتے ہو یہ کس کا خط ہے؟ حالانکہ یہ تو بے جان ہے۔ مگر یہ تعظیم اُن سب تعظیموں سے بڑھی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ جتنا رشتہ دور کا ہو، اور پھر بھی جذبۂ تعظیم باقی رہے، وہ اس مرکز کی سب سے بڑی تعظیم ہو گی۔

میری عادت نہیں کہ کسی کی نسبت بدگمانی سے کام لوں۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی جماعت ہے جس میں جذبہ ہے اللہ کی تعظیم کا۔ مگر اقبال کی زبان میں کہوں کہ ہزاروں سجدے جبینوں میں تڑپتے رہے اس انتظار میں کہ وہ ملے تو سجدے کریں۔ نہ وہ ملے گا، نہ سجدے ہوں گے۔ ارے ایک طبقہ کو اُمید ہے کہ اس دارِ دنیا میں نہ سہی، وہاں سہی۔ ایک طبقے کو اُمید ہے کہ ملے گا۔ مجھے ہمدردی ہے کہ وہ اس دن کے منتظر ہیں کیونکہ مجھے انتظار کرنے والوں سے ہمدردی ہوا کرتی ہے اور اس سے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ قسمتِ مسلم میں انتظار لکھا ہوا ہے۔ ہر ایک منتظر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی منتظر ہے ناممکن بات کا اور کوئی منتظر ہے ممکن بات کا۔

تو جناب! یہ بس انتظار میں ہے کہ وہ ملے۔ اب ایک جماعت ہے بیچاری جسے وہ نہیں ملتا اور جذباتِ تعظیم ہیں۔ اب اس تک نہیں پہنچتے۔ اتفاق سے چودہ سو برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت رسولؐ خدا کے سامنے حاضر ہو گئے۔ آپؐ کے دستِ حق پرست کو بوسہ دیا۔ اب وہ جو پنجاب کا طریقہ ہے، مثلاً پائے مبارک کو بوسہ دیا۔ جو کچھ ممکن تھا، فرض کیجئے طواف بھی کر لیا۔ اب آپ نے کہا "شرک"۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے پوچھئے کس کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہے؟ اگر وہ کہے کہ خاندانِ بنی ہاشم کے تاجدار کے ہاتھ پر بوسہ دے رہا ہوں تو دنیادار ہے، اگر کہے کہ حاکمِ عرب کو بوسہ دے رہا ہوں تو میں سمجھوں گا کہ دنیا پرست ہے۔ لیکن اگر وہ کہے کہ اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ کو تو سمجھ لیجئے کہ وہ عظمتِ خدا ہے جو اس عمل کو اُس سے کروا رہی ہے۔

تو ایک درجہ اونچا ہے اس کی تعظیم کا۔ اور اب کوئی شخص ہے جو بعد میں پیدا ہوا اور پیغمبرؐ خدا اس کے سامنے نہیں ہیں۔ ایک آلِ رسولؐ ہے، اولادِ رسولؐ۔ اب اس نے جو جذباتِ محبت، وعقیدت تھے، ان کو صرف کیا ان کی خدمت میں۔ کیوں؟ اس لئے کہ رسولؐ خدا کے یہ نور سے ہیں۔ یہ بیٹے ہیں، رسولؐ خدا کی اولاد ہیں۔ تو دیکھئے! وہ جذبۂ عقیدت اور جذبۂ تعظیم خدا کا ہے جو وہاں تک پہنچ رہا ہے۔ اور اب بدنصیبی سے اس دور میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اب ان کی ضریحِ مطہر سامنے ہے اور ضریحِ مطہر کو جا کر بوسہ دیتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جاہل سے جاہل دیہات کا رہنے والا آج کا مسلمان، اس سے پوچھئے کہ کس کی زیارت کو آئے ہو؟ کیا وہ کہے گا کہ خاندانِ بنی ہاشم کے ایک بڑے آدمی کی زیارت کو آیا ہوں؟ کیا وہ کہے گا کہ تاجدارِ مدینہ؟ مجازاً کہ تاجدارِ مدینہ؟ مجازاً آپ کہہ لیں مدینہ کے بادشاہ کی زیارت کو آیا ہوں۔ کیا وہ کہے گا کہ قومِ عرب کے سردار کی زیارت کو آیا ہوں؟ جاہل سے جاہل آدمی بھی کہے گا کہ رسولؐ اللہ کی قبر کی زیارت کو آیا ہوں۔

دنیا کہتی ہے کہ قبر پرستی ہے، قبر پرستی ہے۔ ارے قبر پرستی ہوتی تو ہمارے ملک میں قبروں کی کوئی کمی تھی؟ یہ ہم اتنی مسافت طے کر کے وہاں کیوں جاتے؟ معلوم ہوا کسی قبر کی پرستش نہیں ہے، صاحبِ قبر کا رشتہ ہے جو لے آیا ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ہم دور افتادہ ہیں، ہماری رسائی کربلا تک نہیں ہے۔ رکاوٹیں ایسی ہو گئی ہیں کہ پہنچنا اب اس دَور میں تو آسان نہیں رہا ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں کہ آپ سب بھی دعا کریں کہ سب رکاوٹیں پروردگارِ عالم دور کرے تو یہ ہماری تمنا ہے کہ وہاں پہنچیں۔ اب وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ویسے بھی ہر دور میں ہر ایک کے حالات تو نہیں ہوتے کہ وہاں ہر وقت پہنچ سکے۔ لہٰذا اس نے قبر کی شبیہ تیار کی، ضریح کی شبیہ تیار کی۔ اب وہ اس کا احترام کر رہا ہے، اس کا طواف کر رہا ہے، اس کو بوسہ دے رہا ہے۔

آپ کہتے ہیں: اوہ! شرک ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہی اجزائے ضریح دوکان پر بھی تو تھے۔ ہم نے وہاں جا کر ان کی تعظیم کیوں نہ کی؟ جب ان میں ایک شکل پیدا ہوئی کہ کسی خاص ضریح کی شبیہ بن گئے تو معلوم ہوا کہ وہی جذبہ ہے۔ اب یہ جذبہ کی قوت پر انحصار ہے کہ کتنی دور تک لہریں جاتی ہیں جن کا جذبۂ محبت قوی ہے۔ ان کیلئے رسول کا حکم رہنمائی کیلئے ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں، ان میں یہ حدیث ہے کہ ایک شخص پیغمبرِ خدا کی خدمت میں آیا اور اُس نے یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے نذر کی ہے کہ میں پیشانی حورعین اور جنت کی چوکھٹ پر بوسہ دے رہا ہوں۔ چوکھٹ پر جنت کی اور پیشانی پر حورعین کی۔ اول تو ماشاء اللہ آپ ہر موقع پر نکتہ رس ثابت ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے رسولؐ کو یہ کہنا چاہئے کہ یہ تمہارا خواب شیطان کا دکھایا ہوا ہے۔ بھلا بوسہ بھی کہیں ہوتا ہے؟ یعنی گویا خواب میں بھی یا اس نے نذر کی شرک کی۔ تو پیغمبرؐ کا کام ہی ہے توحید کی طرف بلانا۔ تو آپ کو پہلے ہی اس کی زبان پکڑنا چاہئے کہ ارے یہ کیا؟ یہ شرک تم نے خواب میں دیکھا یا شرک کی تم نے نذر کی؟

تو جناب! اُس نے یہ کہا کہ پیشانی حورعین اور جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دے رہا ہوں۔ ارشاد فرمایا کہ تمہیں یہ کرنا چاہئے کہ باپ کی پیشانی اور ماں کے قدموں کو بوسہ دے لو۔ اُس نے کہا کہ حضورؐ! میرے ماں باپ زندہ نہیں ہیں، وفات پا چکے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ: ان کی قبریں ہیں؟ دونوں کی قبروں کو جا کر بوسہ دے لو۔

دیکھئے! کیا رسول اللہ قبر پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں؟ فرمایا: اگر دونوں کی قبریں ہیں تو دونوں کی قبروں کا جا کر بوسہ لے لو۔ اُس نے کہا: حضورؐ! قبروں کا پتہ نہیں ہے۔ میں کم سن تھا، دونوں اس وقت دنیا سے اٹھ گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ قبریں کہاں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: دو لکیریں کھینچو، ایک پر اس کا نام لکھو، ایک پر اُس کا نام لکھوا او ران کو بوسہ دے لو۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہمارے مولاؐ نے نہیں لکھوایا کہ کسی زیارت کے مشتاق ہو تو شبیہ کو دیکھ کر زیارت کا شوق پورا کر لو۔ کچھ حضرات کا ذہن منتقل ہو گیا ہوگا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ہمارے امامؑ کو اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کی ایک زندہ شبیہ عطا کی تھی۔ وہ کون؟ شہزادہ علی اکبرؑ۔ اسی وجہ سے یہ علی اکبرؑ کی خصوصیت ہے کربلا میں، کسی کے جاتے وقت حسینؑ نے اللہ کو گواہ نہیں بنایا۔ مگر جب علی اکبرؑ جا رہے ہیں تو ہاتھ اٹھا دیتے ہیں دربارِ الٰہی میں:

"اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَيْهِمْ غُلَامٌ وَّاَشْبَهُ النَّاسِ خَلْقًا وَّخُلُقًا وَّمَنْطِقًا بِنَبِيِّكَ وَكُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰى نَبِيِّكَ نَظَرْنَا اِلٰى وَجْهِهٖ".

"خداوندا! تو گواہ رہنا اس قوم کے ظلم پر کہ اب وہ جا رہا ہے"۔

ماشاء اللہ آپ غور سے سن رہے ہیں۔ امامؑ کیا کیا کہہ سکتے تھے۔ کون جارہا ہے؟ یہ کہہ سکتے تھے کہ میری ضعیفی کا سہارا جارہا ہے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ بھرے گھر کی رونق جارہا ہے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ پھوپھی کا اٹھارہ برس کا ریاض جارہا ہے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ ماں کے دل کی ڈھارس جارہی ہے۔ ارے! کہہ سکتے تھے کہ میرا کڑیل جوان جارہا ہے۔ مگر مولاؑ نے یہ نہیں کہا۔ کہتے ہیں:

''پروردگار! گواہ رہنا کہ وہ جارہا ہے جو صورت وسیرت، گفتار ورفتار میں تیرے رسولؐ سے دنیا میں سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ پروردگار! جب ہم تیرے نبی کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اپنے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے''۔

میں کہتا ہوں کہ جب سے علی اکبرؑ پیدا ہوئے، امامؑ نے کتنی مرتبہ علی اکبرؑ کو دیکھا ہوگا۔ مگر آج امامؑ نے اپنی پوری عمر کی سیرت کی تفسیر کردی۔ اس پوری عمر میں جب بھی بیٹے کو دیکھا تو بنظرِ عبادت خدا دیکھا ہے۔ ہمیشہ رسولؐ کی شبیہ ہونے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

44

شعائرِ الٰہیہ

ایک مرتبہ خانہ خدا کے بارے میں فلم دکھائی گئی تو اس کے خلاف کافی تعداد میں مولوی صاحبان اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب میں نے لوگوں سے اس فلم کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں آلِ رسول کا ذکر ذرا زیادہ ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ میں رہتا ہے، وہ اس میں سکونت تونہیں رکھتا۔ کوئی قائل نہیں کہ اللہ اس میں سکونت رکھتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اسے "بیت اللہ" کہا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہم چاہے کتنے ہی سادہ لوح ہوں، ہم اپنے ان شعائر کی افادیت کو نہ سمجھیں مگر کچھ لوگوں کی مخالفت سے ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہماری زندگی کیلئے کوئی ضروری چیز ہے۔

ارے! میں تو کہتا ہوں کہ ایک ہی مہینے کا فرق ہے، وہ قربانی دس ذی الحجہ کو، یہ قربانی دس محرم کو۔ اس قربانی کی یادگار پر اتنا زور دیتا ہے اور اس قربانی کے خلاف فتویٰ دیتا ہے؟

اب انسان اگر آلِ رسولؐ کے کام نہ آئے ہوں تو ہم ان انسانوں کو بھول جائیں گے۔ مگر اس جانور کو یاد رکھیں گے جو آلِ رسولؐ کے کام آیا۔ ذوالجناح نے کس نازک وقت پر امام حسینؑ کا ساتھ دیا۔

شعائرِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ

جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ کا ایک جزو ہے۔ دو دن اس سلسلہ بیان کے گزر گئے اور شعائر کے معنی میں نے بیان نہیں کیے۔ میں نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ چاہے شعائر کے معنی ہمیں معلوم نہ ہوں، تب بھی الفاظ سے کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو، یہ پتہ چل گیا کہ ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ عبادت اور چیز ہے اور تعظیم دوسری چیز ہے۔ دو دن یہی بیان رہا۔ اب آیئے شعائر کے معنی دیکھیں۔ اب شعائر کی تشریح میں یہ کہنا لازمی ہے کہ شعائر جمع ہے شعیرہ کی۔ لیجئے اب اُردو ان طبقے کیلئے اور مشکل ہوگی۔ مجلسوں میں شعائر کا لفظ تو سنا ہوگا کہ کچھ نہ کچھ ذہن میں اس کا مفہوم آجاتا تھا مگر یہ واحد جو اس کا معلوم ہوا شعیرہ۔ تو یہ ذہن کیلئے بالکل اجنبی چیز ہے۔ مگر میں عرض کروں کہ ابھی پتہ چلے گا کہ یہ ذہن سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ شعیرہ کے معنی لغت میں علامت کے ہیں جیسے نقش قدم کسی جانے والے کی علامت ہے۔ جیسے دھواں آگ کی علامت ہے۔ تو ویسے ہی شعیرہ کے معنی علامت کے ہیں۔ اب علامت کیوں کہتے ہیں؟ علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ علم ہوتی ہے۔ اب علم کے معنی سب کو معلوم ہیں جاننا۔

تو چونکہ علامت ذریعہ علم ہوتی ہے، اس لئے اُسے علامت کہتے ہیں۔ تو جس طرح علامت کو علامت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ذریعہ علم ہے۔ اسی طرح علامت کے معنی ہیں شعیرہ۔ لغت میں آیا ہے کیونکہ یہ ذریعہ شعور ہے کیونکہ شعور کے معنی علم کے ہیں۔ علامت کی جمع ہیں علائم۔ شعیرہ کی جمع ہے شعائر۔ اب علامت کون ہوتی ہے؟ جو جانا پہچانا لفظ ہے، اُسے دیکھیں۔ شعیرہ ہوتی ہے علامت۔ شعائر یعنی علائم۔ اب علامت کون ہوتی ہے؟ علامت وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے ذہن کسی اور کی طرف جائے۔

اب نئے دور کی مثال دے دوں۔ تھرمامیٹر میں پارے کو دیکھا کس نقطے پر ہے؟ کہا کہ اسے اتنا بخار ہے۔ تو اس کا بخار اس تھرمامیٹر میں نہیں آیا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے، پارے کا وہاں پہنچنا، یہ علامت ہے اس بخار کی۔ پرانے زمانے میں حکما نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اتنا بخار ہے۔ تو نبض میں بھی اس کا بخار نہیں آتا تھا۔ جیسے پارے کے چڑھنے میں ذہن منتقل ہوا بخار کی طرف، اسی طرح نبض کی تیزی نے بخار کا پتہ دیا۔ وہ اسے سمجھتے تھے نبض سے۔ یہ اس کو دیکھتے ہیں تھرمامیٹر میں پارے کی رفتار سے۔ اب رفتار کی یہاں ایک اور بات یاد آئی ہے۔ دنیا والے کہتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو بغیر دیکھے نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ کس چیز کو آپ دیکھ کر مانتے ہیں؟ بخار کو آپ دیکھتے ہیں جو مانتے ہیں؟ دیکھتے تو پارے کو ہیں اور رائے قائم کرتے ہیں بخار کی۔ اسی طرح دنیا میں آجکل جتنے ذرائع ہیں کسی چیز کو سمجھنے کے۔ تو علامت کو دیکھتے ہیں۔ اب میں تو اس چیز کی حقیقت سے واقف نہیں ہوں۔ مگر اخباروں سے کچھ نہ کچھ ذہن میں آیا کہ وہ ہوائی جہاز جو بھیجے گئے ہیں، جن پر بہت سی دنیا احتجاج کر رہی ہے تو دشمن کا ہوائی جہاز دکھائی تو نہیں دیتا۔ اس کے اڑنے کی کچھ علامت

ہے جو اس میں نمودار ہوتی ہے۔ اس علامت کو دیکھ کر جو چیز نہیں دیکھی، اس کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں کہ دشمن کا جہاز اڑا۔ تو دیکھتے نہیں ہیں، بے دیکھے علامات کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ خدا کو بے دیکھے مانئے۔ آفتاب کو دیکھئے، اُسے مانئے۔ چاند کو دیکھئے، اُسے مانئے۔ کائنات کو دیکھئے اُسے مانئے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ اثر کو دیکھئے، مؤثر کو مانئے اور اس کے بعد اب ایک اور منزل ہے۔ میں یہیں سے اس کو عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں ہے:

"مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ"۔

رسولؐ سے کہا گیا، قرآن کی آیت ہے کہ "اللہ ان پر عذاب عام نہیں کرے گا"۔

یعنی جیسے دنیا کی قومیں تہس نہس ہوئیں، برباد ہوئیں، اس طرح یہ قوم برباد نہیں ہوگی، درآں حالیکہ آپ اس میں ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ آپ کے وجود کا اثر ہے کہ یہ قوم قائم ہے۔ اب اگر دکھائی دیتا ہو کہ آج بھی قائم ہے تو سمجھ لیجئے کہ رسول کا کوئی جز و قرار ہے۔

تو حضور والا! علامت، جس کو دیکھ کر کسی طرف ذہن جائے تو وہ اس شے کی علامت۔ تو اب اللہ کے شعائر کون ہوں گے جن کو دیکھ کر ذہن اس کی طرف جائے۔ وہ اس کی علامت ہوں گے تو جن جن چیزوں کی نسبت اس کی طرف قائم ہے، اس نسبت کی وجہ سے۔ ان کو دیکھنے سے ذہن اس کی طرف جاتا ہے۔ مثلاً اپنے گھر کو دیکھیں گے تو خدا یاد نہیں آئے گا۔ لیکن اگر خانہ کعبہ جائیں گے۔ کہا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: خانہ خدا۔ اللہ کا گھر۔ قرآن نے کہا: بیت اللہ۔ تو اللہ کا گھر۔ جب کہا خانہ خدا، بیت اللہ، تو ذہن کس کی طرف گیا؟ خدا کی طرف۔

لہٰذا کعبہ ہوا شعائر اللہ میں۔ یہ ان علامتوں میں سے ہوا جو ذہن کو اللہ کی طرف لے جاتی ہیں۔ اب اسی بیت اللہ کا ترجمہ ہے خانہ خدا اور اس میں تو اس دنیا کا آدمی نہیں ہوں۔ مگر اخباروں میں بہت شور تھا کہ ایک فلم آئی ہے خانہ کعبہ۔ ہندوستان میں آئی تھی۔ یہاں بھی آئی ہوگی۔ وہ خانہ خدا فلم تھی۔ اس میں جناب حج کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ بیت اللہ کا ترجمہ خانہ خدا کیا اور فلم کا نام رکھ دیا۔ تو اب کسی فلم کے دیکھنے پر کبھی علماء کا جلسہ نہیں ہوا۔ مگر وہ فلم جو آئی تو بڑی بڑی کانفرنسیں علماء کی ہمارے ہوئیں۔ اب مجھے ذرا تعجب ہوا کہ صاحب! کبھی کسی فلم پر تو احتجاج نہیں ہوا۔ شرعاً علماء کسی فلم سے راضی نہیں تھے۔ تو اس سے پہلے کبھی کسی فلم پر اعتراض نہیں ہوا۔ یہ آخر اس کے خلاف کیوں احتجاج ہو رہا ہے۔ تو میں نے دریافت کیا لوگوں سے کہ اس فلم میں کیا بات ہے؟ تو معلوم ہوا کہ اس میں آلِ رسول کا ذکر ذرا زیادہ ہے اور ہماری نماز، ہماری جماعت اور ہمارے بہت سے طریقے اس میں نظر آتے ہیں۔

تو اب پتہ چلا کہ یہ احتجاج ہو رہا ہے کہ جنہیں ہم دنیا کے ذہنوں سے بھلا دینا چاہتے تھے، یہ فلم انہیں یاد دلاتی ہے۔ یہ احتجاج اس پر ہو رہا ہے۔ اب میں نے لوگوں سے اس فلم کی اور خصوصیات دریافت کیں تو لوگوں نے کہا کہ نہیں، اس میں تو گانا بجانا بھی بہت کم ہے۔ مہملات جو فلموں میں ہوا کرتے ہیں وہ تو اس میں تقریباً بالکل نہیں ہیں اور بس یہی ہیں۔ تو میں سمجھ گیا کہ بس اسی سے ناراضگی ہے۔

اب جناب! چونکہ بات بہت چل گئی ہے۔ ہمارے پاس بھی سوالات آنے لگے استفتاء کے کہ صاحب! فلم خانہ خدا کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اب ان سوال کرنے والوں پر بھی ہنسی آئی کہ کسی اور فلم کے دیکھنے کو کبھی نہیں پوچھا۔ ہمیشہ شوقیہ جاتے اور دیکھتے۔ مگر اس

فلم کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں۔ تو میں آزادی سے یہ لکھ کر دیتا کہ فلم جائز ہے، جایئے دیکھئے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے فلم دیکھنے کی اجازت دے دی۔ تو اس سے فائدہ پھر اور بھی اٹھاتے کہ صاحب فلم دیکھنا جائز ہے۔ ان کا فتویٰ موجود ہے۔

غلط فائدے بھی تو اٹھائے جاتے ہیں۔ غلط استعمال ہوتا ہے فتوے کا۔ تو میں نے یہ لکھا جواب میں کہ جو شخص فلم دیکھنے کا عادی نہیں ہے، اس کیلئے بہتر ہے کہ اسے بھی نہ دیکھئے اور جو فلم دیکھنے کا عادی ہے، اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ اس کو بھی دیکھے۔

تو اب خانہ خدا جب کہا تو خدا کا تصور لازماً ہوا یا نہیں ہوا؟ اور بیت اللہ تو وہی ہے بنص قرآن۔ مگر ہم اپنے ہاں کی مسجد کو بھی خانہ خدا کہتے ہیں۔ خانہ خدا کا جو محاورہ ہے، وہ مکہ والے کعبہ کیلئے نہیں ہے بلکہ اپنے ہاں کی مسجد کو بھی خانہ خدا کہتے ہیں۔

اب میں ایک طبقہ سے پوچھوں گا کہ وہ ہے بیت اللہ اور یہ بھی ہے خانہ خدا تو اس میں کونسی بات درست ہے؟ وہ بیت اللہ ہے، یہ خانہ خدا ہے اور اسی بیت اللہ کا ترجمہ خانہ خدا ہے۔ اسی خانہ خدا کی عربی بنایئے تو بیت اللہ ہے۔ تو اب میں لفظ بدل کر کہتا ہوں کہ یہ مسجد بیت اللہ ہے یا نہیں؟ تو وہ کہیں گے کہ عربی کے لحاظ سے تو بیت اللہ ہے۔ اگر ذرا سی بھی عربی جانتے ہوئے تو کہیں گے کہ ہاں خانہ خدا ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ بیت اللہ۔ تو میں کہوں گا کہ پھر اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی کا حج کر لیجئے۔ تو وہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! حج تو وہیں ہوگا، یہاں نہیں ہوگا۔ میں کہوں گا، پھر نہیں ہے بیت اللہ۔ کھل کر کہہ دیجئے کہ جیسے ہمارا گھر، ویسے وہ بھی ہم نے بنوایا۔ یہ بھی ہم نے بنوایا تو یہ بیت اللہ نہیں ہے۔ آپ نے کہہ دیا کہ نہیں ہے۔ تو جب نہیں ہے تو نجاست اس کے اندر لے جایئے۔ ارے وہ کسی ایک میں اختلاف ہے کہ نجس ہے کہ نہیں۔ اُسے لے گئے ہوں کبھی معلوم ہے لیکن یہ کہ جسے سب نجس سمجھتے ہیں، اُسے تو کوئی نہیں لے جائے گا ورنہ یہ ہمارے ہاں ہندوستان میں ابھی ابھی فساد ہوا تھا، وہ کس چیز پر ہوا تھا۔ ارے ایک جانور ہے جسے سب نجس سمجھتے ہیں، وہ آ گیا تھا مسجد میں۔

تو ایک جانور کے چلے جانے سے کتنے آدمیوں کی جان چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ جو نجاست ہے، وہ مسجد میں نہیں آسکتی۔ تو یہ کیوں؟ اگر یہ نہیں ہے بیت اللہ، عام گھر ہے تو پھر یہ کیوں؟ آپ کے گھر میں آجاتا تو خونریزی نہ ہوتی اور مسجد کے اندر آ گیا تو خون بہہ گئے۔ یہ آخر کیا ہے؟ تو اب اگر ذرا بھی سمجھ ہے تو میری بات کا صرف ایک جواب ہو سکتا ہے کہ اصل بیت اللہ تو وہی ہے، خانہ کعبہ، مگر یہ بھی گویا اس کی نقلیں ہیں، اس کی شبیہات ہیں جو ہر جگہ ہیں۔ وہ اصل ہے، لہٰذا یہ نقل۔ اس لئے پورے احکام تو اس کے اس پر جاری نہیں ہیں۔ حج تو اس کا نہیں ہو سکتا لیکن طہارت کی ضرورت یہاں بھی ہے۔ نجاست کا لانا بھی ناجائز ہے۔

بس میں کہوں گا کہ اسے یاد رکھئے کہ اصل ہوتی ہے، کچھ نقلیں ہوتی ہیں۔ اصل احکام جو ہیں، وہ اصل ہی پر جاری ہوتے ہیں مگر وہ نقل بھی قابل احترام ہوتی ہے۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ کربلا سرزمین عراق پر ہی ہے، اس لئے زیارت کا ثواب ہمیں وہاں جا کر ملے گا لیکن کوئی بھی عمارت بنام کربلا بن گئی ہے تو احترام اس کا بھی ہے اور جو شبیہات ہم بناتے ہیں، اس میں اب یہ نہ کہئے گا کہ ارے خود ہی تو بنائی ہیں۔ کاغذ ہیں اور کھپچیاں ہیں اور یہ ہے اور وہ ہے۔ اس کا نام رکھ لیا تعزیہ اور اس کا نام ضریح رکھ لیا۔ تو خود ہی تو ابھی بنایا ہے اور خود ہی اُسے مرکز تعظیم سمجھنے لگے کہ اس کا احترام کرنا چاہئے۔ خلاف احترام کوئی بات نہیں ہونی چاہیے، اب ہمارے چڑانے کو اس کو

پوجنا کہنے لگے۔ ورنہ کون جاہل ہے جو کہے کہ میں تعزیے کو پوجتا ہوں۔ جو کہے گا، وہ کہے گا کہ احترام کرتا ہوں، تعظیم وتکریم کرتا ہوں۔ عبادت کوئی نہیں کہے گا کہ میں عبادت کرتا ہوں۔ عبادت کرے تو کافر۔ وہ چاہے اپنے بنائے ہوئے نہیں، خدا کے بنائے ہوئے کسی آدمی کی عبادت کرے تو کافر۔ عبادت تو خالق سے خاص ہے۔ مخلوق جو بھی ہو، چاہے اُسی کی مخلوق ہو، عبادت اس کی بھی نہیں ہے۔ تو اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کی عبادت کیا ہوگی؟

عبادت کسی کیلئے نہیں ہے۔ مگر یہ کہنے سے احترام ختم نہیں ہوگا کہ ہم ہی نے تو بنایا ہے۔ قرآن بھی تو ہم لکھتے ہیں۔ مسجد بھی تو ہم بناتے ہیں۔ ہمارے بنانے سے اس کا احترام ختم نہیں ہوگا۔ یہ دیکھئے کہ ہم نے کس نیت سے بنایا ہے۔ ایک لفظ بھی اگر ہم نے اپنی تقریر کی روانی میں کہا جو قرآن میں بھی ہے اتفاق سے، تو وہ لکھا جائے تو وہ قرآن نہیں ہوگا۔ اس کا چھونا بلا وضو جائز ہوگا لیکن وہی لفظ اگر قرآن کے قصد سے لکھ دیا گیا تو پھر بغیر وضو چھونا حرام۔

تو معلوم ہوا کہ حقیقت ایک ہے مگر قصد کے بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔ تو اسی طرح سے یہ بھی بات ہے کہ گھر بھی میں بناتا ہوں مگر اس نیت سے کہ میرا گھر ہے۔ مسجد بھی میں بناتا ہوں مگر اس نیت سے یہ خانۂ خدا ہے۔ اب اس کا احترام ہے۔ فقہ اسلام کی رو سے اس کا احترام واجب ہے۔ اس لئے نہیں واجب کہ میں نے بنایا ہے، اس لئے واجب ہے کہ خانۂ خدا ہے، چونکہ میں نے خانۂ خدا کے قصد سے بنایا ہے۔ تو اسی طرح سے یہ کہنا بے معنی ہے کہ تعزیہ تم ہی تو بناتے ہو، ضریح تم ہی تو بناتے ہو، تابوت تم ہی تو بناتے ہو، خود ہی بناتے ہو اور خود ہی تعظیم کرتے ہو۔ تو ہاں! چونکہ بنایا ہے، روضۂ مقدس کی شبیہ کے قصد سے، عَلَم اسلام کے قصد سے بنایا ہے، اس لئے اس کا احترام۔ تو ہمارے بنانے سے یہ نہیں ہوگا کہ اس کا احترام ختم ہو جائے۔ تو اب کعبہ بیت اللہ، اس کی تعظیم، اس کا احترام بلکہ اس کی طرف رُخ کر کے نماز بنصِ قرآن اور بہ اجماعِ اہل اسلام جزوِ شریعت۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہ ایک دن کسی مجلس میں کہہ چکا ہوں کہ کیا اللہ اس گھر میں رہتا ہے؟ سکونت تو کوئی نہیں رکھتا۔ کوئی قائل نہیں کہ اللہ اس میں سکونت رکھتا ہے۔ تو پھر کیا نسبت ہے؟ جیسے مہینے سب اس کے ہیں مگر ایک مہینے کو کہہ دیا "شہر اللہ"، اللہ کا مہینہ۔ وہ ہے ماہِ رمضان۔

اسی طرح گھر بھی اس کا ہے۔ جب ہم اس کے ہیں تو کیا ہمارا گھر اس کا نہیں ہے؟ اور پھر ہم گھر کہاں بنائیں گے؟ گھر کے اجزاء سب اس کے ہیں۔ زمین اس کی ہے، چاہے ملک ظاہر میں اس کے قانون کے مطابق کسی کا کہلائے مگر اصل میں تو سب اسی کا ہے۔ پوری زمین اللہ کی ہے۔ تو جناب! ہر چیز اسی کی ہے۔ میرا گھر بھی اس کا ہے مگر یہ کہ جسے اس نے نسبت دے دی کہ یہ میرا گھر ہے۔

طَهِّرَ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ

ابراہیم واسماعیلؑ سے کہا کہ میرے گھر کو پاک۔ بس وہ موضوع عرض نہیں کرتا ہے۔ کبھی انشاء اللہ وعدہ ہے۔ اس سفر میں نہیں کرنا ہے۔ مگر ایک جزو اس کا۔ تو میں نے آیت پڑھ دی تو ترجمہ اس کا کرتا ہے۔ تو اب علمائے اسلام سے پوچھوں گا کہ "طَهِّرَ بَيْتِيَ"۔

ابراہیم واسماعیلؑ سے کہا جا رہا ہے کہ میرے گھر کو "طَهِّرَ بَيْتِيَ"، مصدر اس کا تطہیر۔ اب ان سب سے پوچھوں گا کہ "طَهِّرَ بَيْتِيَ" کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہیں گے میرے گھر کو پاک کرو۔ تو کیا نجاست تھی اس میں؟ ارے جس گھر کا معمار خلیل ہو اور بحیثیت مزدور

ذبیح نے کام کیا ہو، بت بھی کبھی اور لاکر رکھے گئے، ابھی تو بتوں کا پتہ نہیں تو وہاں نجاست کہاں سے آئی؟ تو ماننا پڑے گا کہ "طَهِّرَ بَيْتِيَ" اس کا ترجمہ کرنا پڑے گا کہ میرے گھر کو پاک رکھو۔ پاک کرو نہیں، پاک رکھو۔ میں کہوں گا کہ بس جو معنی بیت میں آیۂ تطہیر کے لیجئے، وہی معنی اہل بیتؑ میں آیۂ تطہیر کے لیجئے۔

"طَهِّرَ بَيْتِيَ" تم نے معنی کیے کہ میرے گھر کو پاک رکھو تو پھر "يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" ۔ وہاں بھی معنی یہ رکھئے کہ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم کو اے اہل بیتؑ پاک رکھے۔ یہ کیوں کہتے ہو کہ پاک کرے۔ یہ کہو کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ تم کو اے اہل بیتؑ پاک رکھے۔ وہ آیۂ تطہیر ہے بیت کیلئے، یہ آیۂ تطہیر ہے اہل بیتؑ کیلئے۔

بس ایک فرق مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بیت کی تطہیر انبیاء کے ذمہ کر دی اور اہل بیتؑ کی تطہیر اپنے ذمہ رکھی۔ بس اسی وجہ سے نتیجہ مختلف ہو گیا۔ اس کی تطہیر انبیاء کے ذمہ کر دی تھی اور انبیاء اس کی تطہیر کے ذمہ دار ہوئے اور دنیا اس میں نجاست لانے پر قادر ہوئی۔ لیکن جن کی تطہیر اپنے ذمہ رکھی تھی، سلطنتوں کی طاقت ختم ہو گئی مگر ان کے دامن پر کسی قسم کا داغ نہ لگایا جا سکا۔

تو یہ میرا گھر، جس کی بناء پر آپ کہتے ہیں بیت اللہ۔ یہ فقط نسبت ہی تو ہے۔ وہ جا کر وہاں رہتا نہیں ہے۔ بود و باش نہیں رکھتا اور دنیا کے ہر حصے سے دنیا کھنچ کھنچ کر آتی ہے اور یہ خدا کا وعدہ ہے کہ جو پورا ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے جس طرح قرآن زندہ معجزہ ہے، ویسے ہی خانۂ کعبہ کی مرجعیت بھی، مرکزیت بھی، یہ زندہ معجزہ ہے۔ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے کہہ دیا گیا تھا، جناب ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر:

"وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ"

"لوگوں میں حج کا اعلان کرو"۔

"اَذِّنْ" کے معنی ہیں اعلان کرنا۔ اسی سے اذان ہے۔ اذان بھی ایک اعلان ہے۔ "اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ" "لوگوں میں حج کا اعلان کرو۔ اور لوگوں میں کہاں، مکہ کی سرزمین پر جو بے آب و گیاہ میدان۔ تو وہاں لوگ کہاں رہے؟ اعلان کرو لوگوں کیلئے۔ مجازی جملہ ہوگا، کنایہ مگر مجھے تو اس وقت حقیقت نظر آ رہا ہے۔ صدا بصحرا پر محمول کر رہا ہے مگر خود وعدہ کرتا ہے کہ تم صدا بلند کرو، پہنچانے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اس صدا کو پہنچاؤں گا اور اپنی توحید کیلئے ذمہ داری نہیں لی ہے کہ ہر ایک مان بھی لے گا یا کسی دور میں ہر ایک مان لے گا یا اکثریت مان لے گی۔ مگر یہ جو حکم دیا تھا، اس کی ذمہ داری لے لی۔

میں سوچ رہا ہوں وہ صدا بصحرا۔ حضرت ابراہیمؑ کو تصور نہ ہوتا کہ کیا فائدہ یہاں اذانِ حج دینے سے، اعلانِ حج کرنے سے؟ تو ضمانت دے رہا ہے۔ "یَاْتُوْکَ"، میں کہتا ہوں کہ آئیں گے اس آواز پر اور حال کیلئے وعدہ نہیں ہے۔ مستقبل کیلئے "یَاْتُوْکَ"، آئیں گے تمہاری آواز پر۔ "رِجَالًا"، پا پیادہ بھی آئیں گے۔ "وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ" اور ہر دبلے پتلے جانور پر آئیں گے۔ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ افراد ہیں، صاحبانِ فہم ہیں، صاحبانِ علم ہیں، تو وہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دبلے پتلے سے کوئی محبت ہے۔ عرب میں دبلا پتلا ہونا گھوڑے کی تیز رفتاری کی علامت تھا۔ جب گھڑ دوڑ ہوتی تھی تو بھوکا رکھا جاتا تھا گھوڑوں کو اور جہاں مشق کروائی جاتی تھی، اس میدان کا نام

تھا "مسلمار" یعنی دبلا کرنے کی جگہ۔ تو یہ دبلا ہونا تیز رفتاری کا کنایہ ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ اجمالِ قرآنی کہ ہر تیز رفتار سواری پر۔ اب جتنا ارتقائے زمانی کے ساتھ تیز رفتاری کی منازل بڑھتی جائیں گی، وہ سب قرآن کی آواز کی تصدیق ہے۔ ہر تیز رفتار سواری پر۔ اب موٹر پر سوار ہوئے تو وہ عدۂ قرآنی کی تکمیل کا ایک درجہ۔ ریل پر سوار ہوئے تو وہ اس کے وعدہ کا ایک درجہ۔ اب دنیا سوچتی رہے، یہ سواریاں نئی ہیں تو بدعت۔ میں کہوں گا کہ اعلانِ قرآنی کی تصدیق ہے تو عبادت۔ شکل نہ دیکھئے کہ نئی ہے۔ یہ دیکھئے کہ کام وہ ہے یا نہیں؟ تو کہا تھا کہ ہر تیز رفتار مرکب پر آئیں گے۔ اب یہ تیز رفتاری میں جتنی زیادتی ہو، اتنا ہی سمجھئے کہ اعلانِ قرآنی کی تصدیق ہے۔

ہمارے ہاں تو مجاز تھا، اس وقت تو یہ حقیقت ہے کہ دنیا اُڑ اُڑ کر جارہی ہے۔ پرواز کر کے جارہی ہے تو یہ کہہ دیا گیا تھا کہ یہ سب آئیں گے۔ بحمد للہ حجاج کی تعداد جو اخبار میں آتی ہے۔ وہ لاکھوں پر مشتمل ہوتی ہے تو یہ سب جو جاتے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ کیوں جارہے ہیں کس لئے جارہے ہیں؟ وہاں جاکر کسی کی زیارت ہوگی، وہاں جاکر کسی کی قدم بوسی ہوگی، وہاں جاکر کسی کے دستِ حق پر بوسہ دیں گے۔ ایک مکانِ بے مکیں۔ ایسا گھر جس میں رہنے والا کوئی نہیں۔ یہ تمام دنیا جاتی ہے اس مکان کیلئے۔ تو کیا ہوتا ہے؟ صرف ایک شب کا اعزاز، صرف ایک شب کا احترام۔ ہمارا ہمدرد بن کر بھی ہمیں بہت سمجھایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں دیکھو! یہ جو سب کچھ تم کرتے ہو تو بہت دولت تمہاری جیبوں سے خرچ ہوجاتی ہے، بیکار، یہ اتنی دولت تم تعمیری کاموں میں لگاؤ۔ ادارے قائم کرو اور جو کام کی باتیں ہیں، وہ کرو۔ یہ بیکار اتنی دولت تمہاری جیب سے چلی جاتی ہے۔

میں اس دنیا سے کہتا ہوں کہ یہ جتنی دولت ہمارے ہاں ہر جگہ صرف ہوتی ہے، کیا وہ اس کے برابر جتنی تمام مسلمانوں کی جیبوں سے دولت صرف ہوجاتی ہے، ہر سال حج کو جاتے ہیں اور وہاں جاکر کیا ملتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ نسبتوں کے اعزاز میں معاشی پہلوؤں پر نظر نہیں کرنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ کچھ نہیں ملتا۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ ہم وفادار بندے ثابت ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ جس جس چیز پر ہم پیسہ صرف کرتے ہیں، آپ کا دل دکھتا ہے، آپ ہمارے بڑے خیر خواہ ہیں۔ ہمیں خیر خواہی کا پتہ تاریخ سے معلوم ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہم چاہے کتنے ہی سادہ لوح ہوں، کند ذہن ہوں، ہم افادیت اپنے ان شعائر کی نہ سمجھیں مگر آپ کی مخالفت سے ہم سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہماری زندگی کیلئے کوئی ضروری چیز ہے۔

تو جناب! یہ تمام دولت جو صرف ہوتی ہے، ایک ایسے گھر کو دیکھنے پر جہاں رہتا کوئی نہیں۔ اس کے ! مگر خیر یہیں تک غنیمت۔ لیکن یہ دسویں ذی الحجہ کو عوام منیٰ میں قربانی بھی کرتے ہیں۔ ارے صاحب! حج تو کرلیا، اتنا روپیہ آپ نے صرف کردیا۔ اب یہ ایک بیچارے کی جان بھی لیں اور اپنا پیسہ بھی صرف کریں۔ آجکل تو حقوقِ حیوانات کیلئے ادارے قائم ہیں، وہ بھی فریاد کریں اور آپ بھی مل کر فریاد کریں کہ یہ ایک جانور کی جان بھی جاتی ہے اور ہماری جیب سے روپیہ بھی جاتا ہے۔ تو یہ کتنا پیسہ اس کے خون کے ساتھ زمین پر بہہ جاتا ہے۔

مگر کیا کیا جائے کہ کسی فقہ اسلام کی رو سے اگر حج کرنا ہے تو پھر یہ قربانی بھی کرنا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے کہ یہ

قربانی ہے کیا؟ وہاں تو میں نے کہا تھا کہ ایک نسبت کا احترام ہے، وہ خدا کی طرف کی نص ہے مگر یہ قربانی آخر کیا ہے؟ اور پھر وہ بھی منیٰ میں ہو اور پھر دس ذی الحجہ کو ہو۔

پتہ چلتا ہے کہ یہ اس کے خلیل کی جو قربانی تھی، اُس کی یاد ہے۔ اب یہ اللہ کی یاد نہیں۔ خاص براہِ راست اس کے خلیل کی یاد ہے۔ چونکہ دس ذی الحجہ کو انہوں نے اپنے فرزند کو حکم الٰہی سے ذبح کرنا چاہا تھا تو اب قیامت تک کے مسلمانوں کو حکم ہو گیا اور وہاں تو حج میں واجب ہے۔ لیکن جو حج کو نہیں گئے، تو اپنے گھروں پر۔ وہ بھی سنت۔ اور پھر اس کے مسلمان ایسے پابند کہ بہت سے واجبات چھوڑ دیئے مگر اس قربانی کو ضرور کریں گے۔

تو صاحب! اب دیکھئے کہ کتنی دولت جیب سے جا رہی ہے اس قربانی کے حکم کی بدولت۔ وہ حج کا جزو، جو قربانی ہے، وہ بھی اور یہ جو بقرہ عید پر اپنے اپنے گھر میں قربانی کرتے ہیں، وہ بھی۔ اس میں کتنی دولت چلی جاتی ہے اور یہ قربانی ہے کیا؟ چونکہ خلیل اللہ نے قربانی کی تھی، تو اب نہ خلیل اللہ ہیں، نہ وہ قربانی اس وقت ہے۔ یہ یادگار ہی تو ہے۔ یہ خلیل اللہ کی یادگار میں اتنی قربانیاں اسی تاریخ میں ہو جاتی ہیں۔ اور اب میں آپ سے پوچھوں گا کہ ذرا غور کیجئے۔ ہر نقطہ نظر کے مسلمان کی متفقہ روایت کہ کیا واقعہ وہ قربانی عمل میں آ گئی تھی؟ ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ قربانی عمل میں نہیں آئی۔ بعد میں فدیہ آ گیا تو بس ٹھنڈے دل سے غور کیجئے، ہر مسلمان جو رسولؐ کو مانتا ہے، وہ غور کرے کہ سابق دَور کے رسول کی ملتوی شدہ قربانی تو یاد رکھنے کے قابل ہو اور اپنے رسولؐ کے گھر کی وقوع میں آئی ہوئی قربانی، وہ فراموش کرنے کے قابل ہو۔

ارے میں کہتا ہوں کہ ایک ہی مہینے کا فرق ہے۔ وہ قربانی دس ذی الحجہ کو، یہ قربانی دس محرم کو۔ اس قربانی کی یادگار پر اتنا زور دیتا ہے اور اس قربانی کے خلاف فتوے دیتا ہے۔ آخر اس کی یادگار نے کیا قصور کیا؟ اب یہ دیکھئے کہ حسینؑ کی قربانی اور ابراہیمؑ کی قربانی۔ اُدھر سے ابراہیمؑ کی قربانی پہلے اور حسینؑ کی قربانی بعد میں۔ یوں کہہ دیجئے، ان میں اتنا بڑا فرق ہے، وہاں ابراہیم کا کردار اور ہے، اسماعیل کا کردار اور ہے۔ ابراہیم کا کردار ہے قربانی کرنا اور اسماعیل کا کردار ہے قربان ہونا۔ اور کربلا میں حسینؑ بیک وقت واحد خلیل بھی ہیں اور ذبیح بھی۔

یہ ذبیح ہیں رسولؐ اللہ کی نسبت سے اور خلیل ہیں علی اکبرؑ، علی اصغرؑ اور سب قربانیوں کے لحاظ سے جو انہوں نے پیش کیں۔ تو یہ اہمیت ہے اس قربانی کی۔

اب یہاں سے ایک سوال کا میں جواب دوں، دنیا کہتی ہے کہ ہاں صاحب! یادگار قائم کی جائے مگر غم کیوں کیا جائے؟ ارے اونچے درجہ پر فائز ہوئے شہادت کے تو اس پر خوش ہونا چاہئے۔ یہ غم کیوں کیا جائے؟ میں کہتا ہوں اصول بدلتا نہیں ہے۔ نتیجہ دیکھئے، اسماعیلؑ کی قربانی اور حسینؑ کی قربانی میں فرق ہے۔ پہلے جو منطقی صورت ہے، وہ عرض کروں، پھر تشریح کروں گا۔ ماشاءاللہ ارباب فہم تو اُسی سے سمجھ جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر روزِ عید قربان غم کیا جاتا، مسلمانوں میں تو پھر ہم عاشور کے دن خوشی کرتے۔ مگر روز قربانی اسماعیلؑ عید ہے۔ نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں، عیدیں ملی جاتی ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ عید کس چیز کی ہے؟ اب مصائب کے انداز

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عید کس چیز کی ہے؟ اس کی ہے کہ نبی زادہ بچ گیا۔ تو عاشور کے دن غم کیجئے کہ رسولؐ زادہ قتل ہو گیا۔ اور رسولؐ زادہ نہیں، ارے پیغمبرؐ کا پورا گھر لوٹ لیا گیا۔ پورا باغ قطع کر لیا گیا۔

بس ہو سکتا تھا کہ میں یہیں مصائب عرض کروں مگر ایک ضروری پہلو اور عرض کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ روز عیدِ قرباں یاد رکھتا ہے تو مسلمان جمع ہوتے، تذکرۂ قربانی اسماعیلؑ ہو جاتا۔ جن قرآنی آیت میں یہ ذکر ہے، ان کی تلاوت ہو جاتی۔ خطبہ عید الاضحیٰ میں وہ آیتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں ذکر قربانی ہے۔ یہ کافی تھا کہ لیکن آخر یہ اتنے جانور کیوں ذبح کیے جاتے ہیں؟ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ لفظی تذکرہ کا ذہن پر اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا اثر عملی شبیہ کا پڑتا ہے۔ تو جس شرع نے یہ حکم دیا ہے، اُسی اصول پر آپ قائم رہتے۔ پھر ہم سے نہ کہتے کہ تذکرۂ حسینؑ میں بس مجالس کافی ہیں۔ یہ سب مظاہرات کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سب شبیہات کیوں بنائی جاتی ہیں؟ عیدِ قربان کے دن جس لئے جتنی قربانیاں کی جاتی ہیں، وہ منیٰ میں جزو حج کی حیثیت سے۔

بس اسی لئے شبیہات بنائی جاتی ہیں کہ لفظی بیان میں وہ طاقت نہیں ہے جتنی کہ شبیہ میں ہوتی ہے۔ اب ماشاءاللہ اس سوال کا جواب تو ہو گیا۔ آپ حضرات مطمئن ہو گئے۔ اب آخر میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ یہ شبیہ کس چیز کی ہے؟ کس کی شبیہ ہے؟ یہ روا روی میں کہہ دیجئے گا کہ جنابِ اسماعیلؑ کی ہے؟ وہ ذبح نہیں ہوئے، پھر یہ شبیہ کس کی ہے؟ اگر غور کیجئے تو یہ جنابِ اسماعیلؑ کی شبیہ نہیں ہے، یہ اس گوسفند کی شبیہ ہے جو جنابِ اسماعیلؑ کے بدلہ میں آیا۔ وہی تو ذبح ہوا تھا۔

تو بس ایک اصول یاد رکھئے کہ اگر جانور بھی نبی زادے کے کام آئے تو وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اب اگر ہم ذوالجناح نکالیں تو نہ کہئے گا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ ہم وفادار ہیں، ہم اُس جانور کو بھی یاد رکھتے ہیں جو آلِ رسولؐ کے کام آیا۔ اب انسان اگر نہ کام آئے ہوں اس وقت پر تو ہم انسانوں کو بھول جائیں گے مگر اس جانور کو یاد رکھیں گے جو آلِ رسولؐ کے کام آیا۔ ذوالجناح نے کس نازک وقت پر حسینؑ کا ساتھ دیا۔

45

شعائر الٰہیہ

جب تبلیغ عام کیلئے جنابِ رسولِ خدا کوہِ صفا پر تشریف لے گئے تو یہ کوہِ صفا پر جانا نہ تھا، تبلیغ رسالت کیلئے ایک منبر کی تلاش تھی۔ جہاں صفا موجود تھا، وہاں اُسے منبر بنالیا، جہاں صفا نہ تھا، وہاں پالانِ شتر کو منبر بنالیا۔

جنابِ ہاجرہ پانی کی تلاش کیلئے صفا سے مروہ تک اور مروہ سے صفا تک سات مرتبہ گئیں۔ بی بی کا یہ عمل اللہ کو اتنا پسند آیا کہ قیامت تک کیلئے سعی (دوڑنے کو) جزوِ حج بنادیا۔

روایت بتاتی ہے کہ اگر زم زم نہ کہا جاتا تو نہ جانے کہاں تک نہریں بن کر جاتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خاص کنیز جو اس کے ہاں مقبول تھیں، اس نے زم زم کہہ دیا تو گویا اس کی اطاعت کر رہا ہے۔

قران مجید میں ہے وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا مِنْ شَعَائِرِ اللهِ" وہ جانور جو قربانی کیلئے رکھے گئے تھے، وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ ابھی وہ قربان نہیں ہوئے ہیں مگر چونکہ قربانی کی نیت سے وہ رکھے گئے ہیں، اس غرض سے وہ ساتھ رکھے گئے ہیں، لہٰذا بحالت حیات بھی وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔

شعائرِ الٰہیہ

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ؀

دو دن بغیر شعائر کے لفظ کے معنی سمجھائے ہوئے اور بتائے ہوئے اصولاً عبادت اور تعظیم کے فرق کا بیان ہوا۔ کل تیسرے دن شعائر کے لغوی مفہوم پر تبصرہ ہوا۔ اب آج یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید نے جو حکم دیا ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم کرو تو خود قرآن مجید سے بھی کچھ رہنمائی ہوتی ہے کہ آخر شعائر اللہ ہوتے کیا ہیں؟ تو یہاں یہ پہلے سے پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید نے کہیں کوئی جامع فہرست شعائر اللہ کی بیان نہیں کی ہے۔ اگر کوئی فہرست شعائر اللہ کی بیان کر دی جاتی تو پھر کوئی بھی کسی چیز کو شعائر اللہ میں سے کہتا یا بتاتا تو اُس سے اس مطالبے کا حق ہوتا ہر ایک کو کہ قرآن نے تو اس فہرست میں اس چیز کو بیان نہیں کیا ہے، یہ تم اسے کیونکر شعائر اللہ میں قرار دے رہے ہو؟ لیکن اگر قرآن مجید کے اندازِ بیان سے یہ ظاہر ہو کہ اسے شعائر اللہ کی کوئی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ انسانی ذہن کی رہنمائی کیلئے بطور مثال کچھ شعائر اللہ کا تذکرہ کرتا ہے جس سے تمہیں یہ مدد ملے، یہ سمجھنے میں کہ کس قسم کی چیزیں شعائر اللہ ہوا کرتی ہیں۔ تو اس کیلئے مجھے قرآن مجید میں دو آیتیں ملتی ہیں۔ دونوں جگہ ایک ہی جیسے الفاظ ہیں جن سے ہر ایک، اس کیلئے عربی دانی کی ضرورت نہیں۔ جب اس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو اسے ہر غیر عربی دان بھی اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح کہ میں نے عرض کیا۔ تو ایک آیت یہ ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔

"یقیناً صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں"۔

یہ "مِنْ" نہ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ یہ دونوں شعائر اللہ ہیں۔ مگر جیسے اُستاد شاگرد کو سمجھانے کیلئے دو ایک مثالیں دے دیتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں اور یہ جنس جمادات میں سے ایک چیز منتخب کی، جیسے حجر اسود کے بیان میں ایک دن کہہ چکا ہوں کہ یہ بت پرستی سے بہت مشابہ تھا۔ وہ بھی پتھروں کو پوجتے تھے اور یہ بھی پتھر تھا۔ مگر شباہتوں سے حقیقت کا تعلق نہیں ہوتا۔ یہ پہاڑ کیا ہوتا ہے؟ پتھروں کا مجموعہ، تو انہی جمادات میں سے ایک چیز منتخب کی اور اُسے بیان فرمایا کہ صفا اور مروہ یہ دو پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہیں۔

اب دونوں آیتیں ایک ساتھ پیش کئے دیتا ہوں۔ مگر تبصرہ الگ الگ ہوگا۔ یہ جمادات میں سے ایک قسم، نام دو لے دیئے۔ اس کے بعد نباتات کی صنف کو چھوڑ دیا۔ نباتات کی نوع میں سے کوئی چیز مجھے نہیں ملتی جسے کہا گیا ہو۔ اب حیوانات کو لیا تو حیوانات کیلئے کہا:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔

جو الفاظ وہاں، وہی الفاظ یہاں۔ "دیکھو! یہ قربانی کے جانور، یہ شعائر اللہ میں سے ہیں"۔

تو یہاں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قربانی کے جانور شعائر اللہ ہیں بلکہ وہی الفاظ استعمال کئے گئے کہ قربانی کے جانور شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اب ہمارے لئے دعوتِ فکر ہوگئی کہ ہم غور کریں کہ آخر صفا و مروہ میں کیا بات ہے کہ یہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہوگئے اور یہ جانور، ان میں کیا بات ہوگئی کہ یہ شعائر اللہ میں سے ہوگئے اور ان کی تعظیم کو کہا گیا کہ تقویٰ کا جزو ہے جیسے کہا گیا کہ:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔

"تم میں سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے پیشِ خدا جو سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہو"۔

تو میں کہتا ہوں کہ دونوں کو ملایئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پیشِ خدا اس کی عزت زیادہ ہے جو شعائر اللہ کی زیادہ تعظیم کرتا ہے۔

اب جناب! یہ صفا اور مروہ میں کیا خصوصیت ہے۔ ابتداء سے سنتے رہے کہ کوہِ صفا اور کوہِ مروہ، کوہ کے معنی پہاڑ۔ عربی میں جبل، فارسی میں کوہ، اُردو میں پہاڑ۔ پہاڑوں سے ہمارے ذہن میں تصور عظمتِ جسمانی کا آیا۔ پہاڑ تو پہاڑ ہی ہے۔ تو ہم سمجھے کہ کوئی اتنے اونچے پہاڑ ہوں گے کہ ان کی جسامت کے لحاظ سے اللہ نے ان کو شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ لیکن مجمع میں ماشاء اللہ بہت افراد ہوں گے جو فریضہ حج سے سبکدوش ہوئے ہوں یا جو عمرے کو گئے ہوں اور پھر سب نے برابر سنا ہے کہ یہ پہاڑیاں ہیں۔ تو پہاڑ ہیں۔ ورنہ ہم نے جیسے جیسے پہاڑ دیکھے ہیں، اس کے لحاظ سے وہ کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو بعض ٹیلے اس سے زیادہ اونچے ہیں، جتنے زیادہ اونچے وہ پہاڑ ہیں۔ لہٰذا اگر عظمتِ جسمانی کا معیار ہوتا شعائر اللہ میں سے ہونے کا تو میں تو ہندوستانی ہوں، ہمارا ہمالیہ زیادہ حقدار تھا جس کی بلندی حد معلوم کرنے کیلئے یا اس کی بلند چوٹی پر پہنچنے کیلئے آجکل دنیائے متمدن مشغول ہے اور اس کو معیار ارتقائے انسانی سمجھتی ہے۔

تو جناب! اب وہ پہاڑیاں کیا ہیں؟ جب گیا ہوں حج کیلئے تو اسی سال ڈائنامائٹ سے وہ پہاڑیاں اڑائی گئی تھیں کیونکہ میں پہلے بھی ہوائی جہاز سے گیا تو اتفاق سے سب سے پہلا جہاز جو جا رہا تھا، اسی سے میں گیا تو ڈیڑھ مہینہ پہلے پہنچ گیا۔ تو جب میں گیا ہوں تو اڑائی جا رہی تھیں۔ ایک طرف سے ایک حصہ باقی تھا۔ تو شاید میں یا میرے ساتھ کے چند آدمی آخری فرد ہوں گے جو پہاڑی کی شکل میں اس پر چڑھے ہوں گے اور ان کے بعد پھر میرے ہی سامنے پھر سیڑھیاں بن گئیں۔ اب سنا ہے کہ ڈھلان ہوگئی ہے۔ وہ سیڑھیاں بھی ختم ہوگئی ہیں۔ ایسی باتوں کو کوئی نہیں سوچتا کہ یہ بدعت ہے۔ وہ تو پہاڑ پر چڑھنے کا حکم تھا، اب وہ پہاڑ رہا ہی نہیں۔ اب ان سیڑھیوں پر چڑھ کر وہ چوٹی تصور کرلی کہ آگئی۔ اونچے زینے پر چڑھ کر۔ وہاں سے اس ڈھلان پر چڑھ کر وہ ہوگیا کہ جناب یہ بلندی ہے اس کی۔ ہمارے ہاں کا بڑا منبر سات زینوں کا ہوتا ہے۔ تو بس اتنی بلندی کوہِ صفا کی ہے اور اسی کیلئے بھی ممکن ہے، کہہ چکا ہوں کہ جب تبلیغ عام کیلئے رسول کوہِ صفا پر تشریف لے گئے تو یہ کوہِ صفا پر جانا نہ تھا تبلیغِ رسالت کیلئے ایک منبر کی تلاش تھی۔ جہاں صفا موجود تھا، وہاں اُسے منبر بنالیا۔ جہاں صفا نہ تھا، وہاں پالانِ شتر کو منبر بنالیا۔

تو اب جسامت کے لحاظ سے تو یہ ہے کہ وہ پہاڑ مجھے تو معلوم نہ ہوتا کہ پہاڑ ہے۔ پہلے سے معلوم تھا کہ پہاڑ ہے تو سمجھا کہ پہاڑ ہے۔ اس کے بعد پھر وہ کیوں ہے شعائر اللہ میں سے؟ کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے جلوہ کا ظہور کبھی اس پر ہوا ہے؟

تو حضور والا! ہم اُسے لامکان سمجھتے ہیں، جسم و جسمانیت سے بری۔ کسی کو اوتار ماننا بھی شرک سمجھتے ہیں، کسی جگہ اس کے جلوۂ ذات کا ظہور بھی ناممکن سمجھتے ہیں۔ تو یہ بات نہیں ہوسکتی کہ وہاں کبھی اس کا جلوہ نمودار ہوا ہو۔ تو پھر آخر کیا بات ہے کہ یہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہوگئیں۔ اس کا جواب مجھے مذہب کی تاریخ سے ملا اور وہ تاریخ مذہب جو حدیث سے مرتب ہوئی کیونکہ اس دور کی باتیں تاریخ نویسوں کے حدودِ علم سے باہر ہوتی ہیں۔ ماوراء التاریخ کا دور ہے تو اس لئے دنیا کو جو حدیثوں سے ثابت ہوتا ہو، اسی کو تاریخ ماننا پڑے گا۔

تو جناب! تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ پر توکل کرنے والی ایک بی بی، وہ کون؟ جناب ہاجرہ، خلیل اللہ کی شریکِ حیات، جناب اسماعیل ان کے فرزند۔ ابھی صغر سنی کی منزل میں، دودھ پیتا ہوا بچہ اور اب یہاں دنیا کے عام الفاظ یا عام تصور یہ کہ پہلی بیوی جو تھیں، جناب سارہ، انہوں نے کہا کہ میں یہاں ان کا رہنا گوارہ نہیں کرتی، ان کو لے جایئے۔ تو گویا بیوی کی فرمائش سے مجبور ہو کر دوسری بیوی کو لے کر نکل آئے اور ہوسکتا ہے کہ اس بیوی کی فرمائش بہانہ بن گئی ہو کسی مقصدِ الٰہی کی تکمیل کا کیونکہ وہ بیوی کوئی معمولی بیوی نہیں تھی۔ خاندانِ رسالت سے تھی وہ بیوی اور ایسی بیوی تھی، قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں نے اُسے اہل البیت کہہ کر خطاب کیا۔ بیوی اہل البیت میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ اُمِ سلمہ جیسی بیوی اہل البیت میں داخل نہیں کی جاتی مگر اُسے ملائکہ نے اہل البیت کہہ کر خطاب کیا تو وہ اس لئے نہیں کہ رسول کی بیوی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بیتِ رسالت سے ہے اور کچھ خاص صفات کی حامل ہے۔ میرے پاس ان کی جلالتِ قدر کے شواہد احادیث سے موجود ہیں کہ جس منزل پر مثلاً جناب سیدہ عالم کی ولادت میں روایت ہے کہ جناب خدیجہ سے پیغمبر اسلام کی شریکِ حیات ہونے کی وجہ سے تمام خواتین مکہ نے قطع تعلق کر لیا تھا۔ تو اب ان کے ہاں ولادت ہونے والی تھی تو کوئی مکہ کی عورت تیار نہیں تھی کہ وہ مدد کو آئے۔

تو قدرت کی طرف سے کچھ خواتین بھیجی گئیں۔ ان خواتین میں سارہ کا بھی نام ہے اور اسی طرح سے اور مواقع پر خاندانِ رسالت کے، مثلاً حورانِ جناں آئی ہیں۔ یا وہاں حوا ہیں اور ان کے ساتھ سارہ کا نام بھی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سارہ کوئی معمولی عورت نہیں تھیں۔ بلند مرتبہ خاتون تھیں۔ اسی طرح اس بلند مرتبہ فہرست میں کلثوم، خواہر موسیٰ کا نام آیا۔ یہ بھی عام طور پر معلوم نہیں عام لوگوں کو کہ کلثوم نام تھا جناب موسیٰ کی بہن کا تو وہ بھی ایسی ہی خواتین میں سے ہیں جو ایسے محل پر آئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ خواتین بھی وہ ہیں جو ایک طرح کی زندگی کی مالک ہیں۔ زندہ نہیں ہیں تو وہ کیونکر آئیں مدد کو۔ وہ آرہی ہیں، مدد کر رہی ہیں خالق کے حکم سے۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواتین بھی بلند پایہ خواتین ہیں۔ ان میں سے ہیں جناب سارہ۔ تو بہر حال انہوں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہر حال ہے یہی کہ ان کے کہنے سے یہ گئے۔ اب یہ لے جاتے کسی شہر میں، لے جا کر پہنچاتے، مگر یہ انہیں ایک بے آب و گیاہ میدان میں لے آئے، وہ کونسا؟ جہاں کعبہ ہے اور وہاں لا کر انہیں رکھ دیا۔ ایک خاتونِ محترمہ اور ان کا ایک بچہ صغیر، ایک کوزۂ آب اور دو تین روٹیاں پاس رکھ گئے۔ وہ کہاں تک فاقہ کرتیں؟ اب یہاں ایک جملہ جو عرض کروں گا، اُس سے پتہ چلے گا کہ کیا بیوی کے کہنے سے لائے؟ جب چلنے لگے، ہاجرہ نے پوچھا: یا خلیل اللہ! کس پر چھوڑا؟ کہا: جس کے حکم سے لایا ہوں۔

چلے گئے، اب وہ روٹی ختم ہوگئی، پانی ختم ہوگیا۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ پہلے ماں پر پیاس کا غلبہ ہوا، بھوک اور پیاس کا اور وہ غلبہ اتنا ہوا کہ بچے کا جو فطری ذخیرۂ غذا ہے، وہ ختم ہوگیا۔ شروع میں بچے کی غذا روٹی نہیں ہوتی۔ تو اب جب یہ منزل پہنچی تو بچے پر پیاس کا غلبہ ہوا، بھوک کا غلبہ ہوا۔ جب تک اپنی بھوک اور پیاس رہی، برداشت کیا لیکن جب بچہ تڑپنے لگا تو اب اپنی جگہ سے اٹھیں، ممکن ذریعہ کیا تھا؟ چاروں طرف دیکھا تو کہیں پانی کا نشان نہیں۔ ایک طرف کوہِ صفا نظر آیا اور دوسری طرف کوہِ مروہ نظر آیا۔ چونکہ بلندی پر جانے سے حدِ نظر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا پہاڑ پر گئیں کہ کہیں تو چشمہ ہوگا ادھر تو نظر آئے گا۔ اُدھر گئیں کہ کہیں اِدھر ہوگا تو نظر آئے گا۔ مگر وہاں ہوتا تو نظر آتا۔ کہیں دور دور تک پانی نہیں۔ اب صورتِ واقعہ یہ بتاتی ہے کہ پانی تلاش کرنے کیلئے جاتی ہیں۔ مگر پھر تصور یہ ہوتا ہے کہ بچہ اکیلا ہے تو اُتر کر آجاتی ہیں بچے کے پاس۔ پھر اس کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔ تو گویا اپنی نگاہ کو جھٹلاتی ہیں کہ پھر جاؤں، پھر دیکھوں تو چشمہ نظر آئے یا کوئی قافلہ آتا ہوا نظر آئے اتفاق سے تو اس سے پانی دستیاب ہو۔

غرض سات مرتبہ گئیں صفا سے مروہ تک اور مروہ سے صفا تک۔ تو جناب! وہ عمل ان کا اللہ کو اتنا پسند آیا کہ قیامت تک کیلئے جزوِ حج بنادیا۔ وہی سعی، سعی کے معنی ہیں دوڑنا۔ ظاہر ہے کہ صورتِ حال یہ ہے کہ اپنی ممکن تیز رفتاری سے چل رہی ہوں گی۔ تو وہ جزوِ حج بنادیا۔ سعی کے نام سے۔ ہر حاجی کسی بھی نقطہ نظر کا ہو لیکن حج اگر کرے گا تو وہ سعی بھی کرے گا۔ تو اب ان حاجی صاحب سے پوچھئے کہ کیا یہ بھی پیاسے ہیں؟ ان سے پوچھئے کہ کیا یہ بھی تلاشِ آب کر رہے ہیں؟ تو نہ یہ پیاسے ہیں، نہ یہ تلاشِ آب کر رہے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ اصل مقصد کا تعلق پہلے صاحبِ عمل سے ہوتا ہے۔ دوسرے احکام جو ہیں وہ اس کی یاد کو قائم رکھتے ہیں اور اگر شعوری طور پر ذہن میں اس کی یاد رہے گی تو پھر اس مقصد کی اہمیت بھی ذہن میں ضرور رہے گی جس کیلئے اس نے وہ کارنامہ انجام دیا۔ تو اس کو جزوِ حج بنادیا۔

اب ایک اور پہلو کی طرف بافہم مجمع کو مخاطب کروں، متوجہ کروں کہ وہ قادرِ مطلق جس نے بعد میں انتظام کیا، جو ابھی عرض کروں گا، وہ کیا اس پر قادر نہیں تھا کہ پہلے ہی وہ انتظام کردیتا سیرابیِ اسماعیل کا؟ کیا اسے اچھا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فاقہ زدہ خاتون اتنی تگ ودو کرے، اتنی جدوجہد کرے مگر اسے تو قیامت تک کے افراد کو یہ سبق دینا تھا کہ جب تک سعی نہیں کروگے، نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ اگر دنیا چاہتے ہو تو بغیر سعی کے نہیں ملے گی اور اگر آخرت چاہتے ہو تو بغیر سعی کے نہیں ملے گی۔ صرف نعرے لگادینے سے، صرف کچھ نام لے لینے سے یہ اُمید نہ کرو کہ بہتر سے بہتر نتیجہ مل جائے گا۔ اس کی راہ میں جدوجہد بھی کرنا ہوگی۔

صورتِ واقعہ یہ بتاتی ہے کہ یہ ہم تر و تازہ جاتے ہیں، سات دفعہ چکر لگاتے ہیں۔ تھوڑا سا تھک جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ بی بی جو نہ جانے کتنے دن سے بھوکی تھی اور کتنے دن سے پیاسی تھی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ امکانی طاقت اتنی ہی تھی۔ اب جیسے تھکن سے چور ہوگئی تھیں اور اب جیسے کچھ نا اُمیدی ہوگئی تھیں۔ تو بس جہاں انسانی طاقت ختم ہوئی، وہاں سے خدا کی قدرت شروع ہوئی۔ بس اب ساتویں دفعہ کے بعد جو پلٹیں تو دیکھا کہ جہاں بچہ ریت پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے، وہیں سے پانی اُبل رہا ہے۔ اب یہ تفصیل تو قرآن مجید میں نہیں ہے، روایتوں میں ہے۔ اب خلافِ توقع، خلافِ اُمید ایسی مایوسی کے عالم میں پانی نظر آرہا ہے تو اب یہ انسانی تصور کی کمزوری ہے۔ اضطراب ہے کہ پانی چلا نہ جائے تو اپنی زبان سے کہا کہ "زم زم" یعنی تھم تھم۔ روایت بتاتی ہے کہ اگر زم زم نہ کہا ہوتا تو نہ جانے کہاں تک

نہر بن کر جاتا کیونکہ اللہ کی

خاص خاتون جو اس کے ہاں مقبول تھی، اس نے زم زم کہہ دیا تو گویا پانی اس کی اطاعت کر رہا ہے۔ اب وہ وہیں رُک گیا۔ کنواں کہا جانے لگا۔ چاہِ زمزم ہو گیا ورنہ وہ چشمہ زمزم ہوتا یا نہر زم زم ہوتی۔ خصوصیت زمزم کی کیا ہے؟ ماشاء اللہ حجاج کرام اندازہ کر سکتے ہیں، جو نہیں گئے ہیں، انہوں نے سنا ہوگا۔ اب تو سنا ہے کہ کچھ ایسا کر دیا ہے کہ بند ہو گیا ہے، وہاں تک رسائی ہی نہیں ہے۔ لیکن جب تک رسائی تھی، اس وقت تک وہ لاکھوں آدمی، لاکھوں سے کم تو بحمد اللہ مردم شماری ہوتی ہی نہیں حاجیوں کی۔ تو وہ لاکھوں آدمی پیتے ہیں ہر وقت، سقّے مشکیں بھرے ہوئے زمزم کا پانی پلاتے پھرتے ہیں جس کے پیسے وہ وصول کرتے ہیں اور لوگ اس زمانہ میں اب نہیں کر سکتے ہوں گے۔ اپنے کپڑے دھوتے ہیں، چادریں دھو دھو کر لے جاتے ہیں اس سے۔ کفن اس سے دھوتے ہیں۔ دنیا والی چادریں بھی اور عقبیٰ والی چادریں بھی اور ڈبوں میں، مشکوں میں جتنا ظرف ہو جس کے پاس، اتنا پانی ہر ایک بھر لیتا ہے۔ لیکن کبھی سننے میں نہیں آیا کہ زمزم نے بخل کیا ہو۔ کسی وقت سنا ہو کہ زمزم خشک ہو گیا۔

اب وہ پانی اس میں سے نہیں نکل رہا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ عالم امکان میں اللہ تعالیٰ نے نقشہ پیش کر دیا ہے اپنے خزانہ عطا کا کہ یہ میرا مخلوق ایک چشمہ فیض ہے کہ اس میں سے جتنا لو گے، وہ دے گا۔ اس میں کمی نہیں ہوگی۔ تو میرا خزانہ عطا کہاں ختم ہوتا ہے۔ تو یہ ہے بس جو تاریخ مذہب سے ہمیں ملی۔

اب ہر صاحبِ فہم غور کرے کہ کوئی روایت نہیں بتاتی کہ جناب ہاجرہ کے پیر سے خون کا کوئی قطرہ اس زمین پر گر گیا ہو مگر اللہ کی راہ میں جو چلی بھی تو اس بی بی کے قدم سے تھوڑی دیر کیلئے جو پہاڑیاں مس ہو گئیں، وہ شعائر اللہ میں داخل ہو گئیں بس قرآن۔ تو برائے خدا بتایئے کہ وہ زمین جہاں شہیدوں کا خون جذب ہو جائے، ہم اگر اُسے خاکِ پاک کہیں اور اس کا احترام کریں تو اُسے شرک کہا جائے؟ اگر وہ پہاڑیاں شعائر اللہ میں ہو سکتی ہیں تو پھر کربلا کی زمین بھی شعائر اللہ میں سے ہم کہیں تو اُسے قبول کیجئے۔

اس کے بعد وہ دوسری آیت میں نے پڑھی تھی:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ۔

"وہ جانور کون جو قربانی کیلئے رکھے گئے ہیں، وہ شعائر اللہ میں سے ہیں"۔

اب اسی ترجمہ سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ابھی وہ قربان ہوئے نہیں ہیں مگر چونکہ قربانی کی نیت سے وہ رکھے گئے ہیں، اسی غرض سے وہ ساتھ رکھے گئے ہیں، لہٰذا بحالتِ حیات بھی وہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ بس اب عقل سے کام لیجئے اور یاد رکھئے کہ دین انہی کے لئے ہے جن کے پاس عقل ہو۔ وہ کوئی اور مذاہب ہوں گے جو عقل کے اوپر پہرے لگاتے ہیں۔ قرآن تو ہر جگہ صاحب عقل کو پکارتا ہے۔ ارے بے عقلوں کو تو اس نے تکلیف شرعی سے ہی بری کر دیا ہے۔ مگر فطری طور پر بے عقل ہو، جان بوجھ کر بے عقل نہ ہو۔ ان کے خلاف وہ عقل ہی حجت ہوگی۔ عقل رکھتے تھے مگر تم نے عقل سے کام نہ لیا۔ تو اب دیکھئے کہ حیوان جو راہ خدا میں خدا کے حکم سے یعنی حج کی راہ میں ہیں، لہٰذا راہ خدا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا قربانی کا حکم ہے، لہٰذا حکمِ خدا ہی ہوا۔ حکمِ خدا سے قربان

کرنے کیلئے ساتھ رکھے گئے ہوں تو وہ اپنی حیات میں بھی شعائر اللہ ہیں اور اسی سے سمجھ میں آئے گا کہ جب قربانی ہو جائے، تب بھی وہ قابلِ احترام ہیں، شعائر اللہ ہیں۔

تو بتایئے حیوان راہِ خدا میں، بحالتِ حیات شعائر اللہ ہوں تو وہ انسان جو راہِ خدا میں قربان ہو جائیں، وہ انسان شعائر اللہ میں نہ ہوں گے؟ ان کی تعظیم کیجئے تو شرک ہو جائے، جانوروں کی تعظیم خدا کا حکم ہے اور انسانوں کی تعظیم شرک قرار پائے، جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں راہِ خدا میں قربان کر دی ہوں۔

ماشاءاللہ صاحبانِ فہم ہیں، ذرا غور کیجئے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ شہید ہونا اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ شہید ہونا قسمت سے وابستہ ہے۔ اپنے اختیار کی بات تو میدانِ جنگ میں جمے رہنا ہے۔ تو حضور! وہ جانور شعائر اللہ ہوں اور انسان شعائر اللہ نہ ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ جانور ابھی ذبح نہ ہوئے ہوں، بحالتِ حیات شعائر اللہ، تو اب نتیجہ نکالئے، اگر عقل ہو تو پھر وہ انسان جو راہِ خدا میں قربان ہونے والے ہوں، وہ بعدِ شہادت ہی شعائر اللہ نہیں ہیں بلکہ وقتِ ولادت ہی سے شعائر اللہ ہیں اور اس کے بعد آپ کے جانے پہچانے ہوئے واقعات سب کے ہاں ہیں کہ رسول اللہ بچوں کے بوسے لیتے تھے۔

بلاشبہ ہے، روایت، وہ میں اب نہیں سمجھ سکتا اور فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ بچوں سے محبت تھی یا شعائر اللہ کا احترام تھا۔ فیصلہ یہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ دینِ اسلام دینِ فطرت ہے۔ لہٰذا بچوں سے محبت بھی کوئی خلافِ شان بات نہیں ہے۔ بچوں سے محبت کرنا بھی منظورِ قدرت ہے۔ ہمیں بھی اپنے بچوں سے محبت ہونی چاہئے۔ تو خلافِ شان ہوتا تو میں شک کا اظہار نہ کرتا، یقین کے ساتھ تو میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ بچوں کی محبت ہے یا شعائر اللہ کا احترام، مگر اب جو روایتیں گوش زد ہیں اور آپ کے بھی گوش زد ہیں اور میری نظر سے بھی کتابوں میں گزری ہیں، ان کے پیشِ نظر ابھی تک تو میں شک کا اظہار کر رہا تھا لیکن اب میں اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ نہیں، بچوں کی محبت محرکِ بوسہ نہ تھی بلکہ شعائر اللہ کا احترام ہی مدِ نظر تھا۔

اس کا ثبوت کیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر بچوں کی محبت ہو تو پیشانی بھی اپنے بچے کی ہے، رخسارے بھی اپنے بچے کے ہیں، ہاتھ بھی اپنے بچے کے ہیں، سینہ بھی اپنے بچے کا ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ جب بوسے لیتے ہیں تو ایک کے دہن کے بوسے لیتے ہیں اور ایک کے گلے کے بوسے لیتے ہیں؟ میں پوری ضمانت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ سند کیسی ہے، کس درجہ کی روایت ہے مگر بہر حال یہ روایت آپ نے سنی ہو گی کہ بعض وقت بچے کو ذرا یہ بات محسوس ہوئی۔ یہ آپ نے سنا ہو گا۔ ایک دفعہ سیدہ عالم کے پاس گئے اور یہ کہا کہ مادرِ گرامی! ذرا دیکھئے ہمارے منہ سے کیا بد بو آتی ہے؟

سیدہ عالم نے کہا کہ تمہیں یہ تصور کیوں ہوا؟ تمہارے دہن سے تو مشک و عنبر سے بہتر خوشبو آتی ہے۔ یہ تم پوچھ ہی کیوں رہے ہو؟ تو کہا: بس اس لئے پوچھ رہے ہیں کہ ہم بھی نانا کی گود میں ہوتے ہیں اور جب ہماری باری آتی ہے تو ہم اپنا دہن بڑھاتے بھی ہیں تو نانا ہمارے منہ کو ہٹا کر گلے کے بوسے لے لیتے ہیں۔

سیدہ عالم حقیقت سے تو واقف تھیں مگر فرمایا کہ چلو، تمہیں تمہارے نانا جان سے ابھی پوچھ دیتی ہوں۔ حسین کو ساتھ لیا

اور آئیں بابا کی خدمت میں اور ممکن ہے بالکل الفاظ نہ ہوں۔ اُس دن نقل بالمعنی کے متعلق عرض کر چکا ہوں۔ حقیقت حال وہی ہو اور ممکن ہے کہ الفاظ ہمارے ہوں کہ وہ سیدہ عالم نے جیسے فرمایا کہ بابا جان! آپ ہی تو کہتے ہیں کہ حسین کے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، مگر کیا بات ہے کہ

آپ ہی کے عمل سے کوئی بات ایسی ہو جائے کہ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو جائیں؟

فرمایا: کیوں، کیا ہوا؟ کہا: اس نے ابھی جا کر مجھ سے یہ کہا ہے۔

تو میں تو محسوس کرتا ہوں کہ رسول نے فرمایا ہو کہ ارے فاطمہ! جانے دو، سن کر کیا کرو گی؟ انہوں نے کہا ہو کہ نہیں، میں تو چاہتی ہوں اس کو اطمینان دلانا۔ فرمایا: تو پھر سنو کہ حسن کے لب کے بوسے لیتا ہوں، اس لئے کہ زہر دغا متصل ہے اس کے لبوں سے۔ اس کے گلے کے بوسے لیتا ہوں، اس لئے کہ خنجر جفا متصل ہے اس کے گلے سے۔

بس! اس روایت سے مجھ میں یہی آتا ہے کہ وہی قربانی پیش نظر ہے جس کی بناء پر بوسے لے رہے ہیں۔ اور اب یہ سلسلہ برابر قائم ہے۔ یہ بھی روایت میں ہے کہ حسین آتے ہیں اور رسول فرماتے ہیں کہ یا علی! ذرا پیراہن اٹھاؤ، حسین کے جسم سے۔

جناب شیخ جعفر شستری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے "خصائص حسینیہ" میں، پیراہن اٹھاتے ہیں، اب جا بجا رسول بوسے لیتے ہیں اور علی بھی کہتے ہیں: یا رسول اللہ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرماتے ہیں:

اُقَبِّلُ مَوَاضِعَ السُّيُوْفِ وَاَبْكِيْ۔

"جہاں جہاں تلواریں پڑیں گی، وہاں وہاں بوسے لے رہا ہوں"۔

اب وہ تو ہر دن کچھ نہ کچھ اس سلسلہ میں عرض کرتا ہے کہ ہمارے گروہ پر مختلف سوالات ہوتے رہتے ہیں تو ان میں سے ایک یہ سوال بہت بڑا ہے جسے ایک شاعر نے کہا کہ زندہ کو رویا جاتا ہے۔

روئیں وہ جو قائل ہوں ممات شہداء کے

ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

یہ گویا بہت مشہور شعر ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہم سے تو بعد میں پوچھنا چاہئے۔ وہ بچہ جب پیدا ہوا اور رسول کی گود میں لا کر دیا گیا، اسی وقت پیغمبر اسلام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گریہ فرمانے لگے۔ تو کسی نے کہا کہ رسول اللہ! یہ تو خوش ہونے کا موقع ہے، آپ رو کیوں رہے ہیں؟ آپ فرماتے ہیں: تمہیں نہیں معلوم اس پر مصائب کیا پڑیں گے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ہم سے آپ پوچھ رہے ہیں کہ زندہ کو کیوں روتے ہو؟ اسی وقت رسول اللہ سے یہ پوچھتے کہ زندہ کو کیوں رو رہے ہیں؟ ارے یہ زندگی تو عالم معنی کی ہے، آنکھوں کے سامنے والی زندگی نہیں ہے اور وہ تو اس وقت حیات عنصری کے ساتھ، سانس لیتی ہوئی زندگی کے ساتھ رسول کی گود میں تھے اور اس کے باوجود رسول گریہ فرما رہے تھے۔

تو اب تو سمجھے کہ گریہ موت پر نہیں ہوتا، مصائب پر ہوتا ہے۔ اگر پیغمبر خدا کو اس کی زندگی میں رونے کا حق تھا تو ہمیں اس

نوع زندگی میں رونے کا حق ہے۔ یہ کیا کہ زندہ کا ماتم نہیں ہوتا، زندہ کو رویا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ جناب یوسف بھی تو زندہ تھے اور روایت کی بات نہیں ہے، نص قرآن کی بات ہے۔ قرآن سے ثابت ہے کہ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ زندہ ہیں، بعد میں کہا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ تو بتایا جا چکا تھا انہیں کہ زندہ ہیں اور اس کے بعد کتنا روئے ہیں۔

"اَبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ"۔

"آنکھیں سفید ہو گئیں روتے روتے"۔

اب وہ ہر وقت رنج وغم سے خاموش رہتے تھے۔ معلوم ہے کہ زندہ ہیں۔ تو یہ نہیں کہ مرنے کا غم ہوتا، جدائی کا بھی غم ہوتا ہے۔ مصائب پر بھی رونا ہوتا ہے۔ مختلف صورتیں ہیں گریہ کی۔ اب جو چیز عرض کر رہا ہوں، وہ چاہے مختصر ہو مگر آپ کیلئے بڑے مرحلے کے برابر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عقلی اصول کے لحاظ سے (میں کہیں عقل کا دامن نہیں چھوڑتا)، کہ اگر ایک بھائی کے لب شعائر اللہ ہیں، ایک بھائی کی گردن شعائر اللہ میں داخل ہے تو ماننا پڑے گا کہ ایک بہن کے بازو بھی شعائر اللہ میں سے ہیں اور وہ بھی باب مصائب میں جو روایات بیان ہوتی ہیں، اس میں ضمانت نہیں ہوتی صحت سند کی۔ بس کتاب میں ہوں۔ ہاں! وہ چیز روا نہیں ہے کہ منبر پر جا کر بروقت تصنیف ہو۔

گویا ایک چیز جس کا کہیں وجود نہ ہو اور میں نے تو دیکھا کہ زیادہ تر یہی ہوتا ہے، اس کیلئے کوئی وجہ جواز نہیں بلکہ وہ "اِفْتَرَا عَلَى اللهِ وَالرَّسُوْل" میں داخل ہے، جو اگر حالت روزہ ہو تو روزے کو باطل کر دیتی ہے۔ تو وہ حدیث کربلا میں بیان ہوئی ہے اور بڑے سخت وقت میں بیان ہوئی ہے۔

46

شعائر الٰہیہ

قرآن مجید کی اس آیت "أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ" "کہ جب رات آئے تو روزہ ختم کرو، سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی حد ہے کہ رات آئے۔ اگر صرف سورج کے نظر سے اوجھل ہونے سے رات ہو جایا کرتی ہو تو افطار تو وہ ہے اور اگر کچھ تاریکی کی ضرورت ہے تو پھر افطار کا وقت یہ سمجھئے

خدا نے دعا کا کیوں حکم دیا؟ کیا وہ خوشامد پسند نہیں کہ خوشامد کرو؟ معاذ اللہ یہ اس کی شان کے خلاف ہے نہیں، چونکہ یاد الٰہی ہماری تعمیر زندگی کا سبب ہے، اسلئے اس نے اس دعا کا حکم دے کر کہا کہ اپنی غرض سے ہی سہی، مجھے یاد کرو۔

میلاد کے جلسوں میں یہ قمقمے اور اتنی روشنی کا انتظام، یہ جھالریں۔ کچھ مولوی صاحبان ان سب چیزوں کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ کیا ہے؟ ذکر رسولؐ ہے یا کچھ اور ہے؟ اگر ذکر رسولؐ ہے تو وہ اندھیرے میں ہوتا، تب بھی عبادت، روشنی میں ہے، تب بھی عبادت۔

یہ ذہنیت میرے نزدیک قابل افسوس ہے کہ اپنے گھر میں روشنی ہو تو بدعت نہیں ہے، رسولؐ کے ذکر میں روشنی ہو تو بدعت ہے۔

ہماری مجلسوں کے دو ہی کردار ہوتے ہیں، ایک کردار ذاکر کا ہوتا ہے، ایک کردار سامعین کا ہوتا ہے۔ جو ذاکر کا کردار ہے، وہ بھی عمل رسولؐ ہے اور جو سامعین کا کردار ہے، وہ بھی عمل رسولؐ ہے۔

شعائر الٰہیہ

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۝

جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقوئی کا جزو ہے۔ تعظیم شعائر پر جو الزام شرک لگتا ہے، اس پر چار دن تک گفتگو کر چکا۔ اب جس طبقہ کو شرک کا لفظ بہت حفظ ہے، اسی کو ایک دوسرے لفظ بدعت کی بہت یاد ہے۔ زیادہ تر تو شرک شرک کی آواز بلند ہوتی ہے اور جہاں ذرا رعایت سے کام لے کر شرک نہیں کہا، وہاں بدعت کہہ دیا جاتا ہے۔ تو اس لئے آج بدعت کے متعلق عرض کروں گا۔ بدعت کے لفظ کا ہمارے ہاں مفہوم الگ ہے اور مسلمانوں کی اکثریت میں اس کا مفہوم الگ ہے۔ میں دونوں مفہوم پیش کروں گا اور زیادہ تفصیل سے دوسرے مفہوم کو کیوں کہ اس کی بنیاد پر بدعت کی آوازیں زیادہ سننے میں آتی ہیں۔ اس سے پہلے اپنے نقطہ نظر کو عرض کروں گا۔ بدعت کے معنی، جو بہت ہی سطحی نگاہ والے سمجھتے ہیں کہ ہر نئی بات، تو مطلق طور پر، آنکھ بند کر کے ہر نئی بات کو کوئی بدعت نہیں سمجھتا۔ اس میں ہمارے ہاں بھی ایک اصطلاح ہے اور ان کے ہاں بھی ایک اصطلاح ہے۔ ہمارے ہاں بدعت کی تعریف ہے:

اِدْخَالُ مَا لَيْسَ مِنَ الدِّيْنِ فِي الدِّيْنِ وَاِخْرَاجُ مَا هُوَ فِي الدِّيْنِ مِنَ الدِّيْنِ

جو چیز دین میں نہیں ہے، اس کو دین میں داخل کرنا اور جو چیز دین میں داخل ہے، اس کو دین سے خارج کرنا۔

یہ ہمارے نزدیک بدعت کی تعریف ہے۔ کوئی بھی کام کریں اور اس کو یہ سمجھ کر نہ کریں کہ یہ دین کا جزو ہے تو اسے بس یہ دیکھنا ہوگا کہ شرع میں اس کی ممانعت تو نہیں ہے۔ اگر شرع میں ممانعت ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ بدعت ہے، یہ کہیں گے کہ حرام ہے۔ یعنی شرع نے ناجائز قرار دیا ہے۔ یعنی ممانعت شرعی کی بناء پر اسے حرام کہیں گے۔ فرض کیجئے کہ ممانعت اس حد پر نہیں ہے، کم درجہ پر ہے تو اسے مکروہ کہیں گے۔ غرض یہ جو شرع کے احکام ہیں، دو مثبت، دو منفی، مثبت حکم واجب اور مستحب، منفی حکم حرام اور مکروہ۔

پانچواں حکم ہے بین بین یعنی مباح جائز۔ یعنی نہ اس کے کرنے کا حکم، نہ اس کے نہ کرنے کا حکم۔ تو اب اگر کسی چیز کی ممانعت ہوئی ہے تو وہ کچھ ممانعت کا لب ولہجہ، کچھ انداز اس سب سے علماء یہ اندازہ کرتے ہیں کہ یہ ممانعت حرمت کی حد تک ہے تو اس کو کہتے ہیں حرام۔ اور اگر سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بس گویا اولیٰ یہ ہے کہ نہ کریں، بہتر یہ ہے کہ نہ کریں تو اسے کہتے ہیں مکروہ۔ اسی طرح جس کا حکم ہوا ہے، اگر لزومی حکم ہوا ہے تو واجب کہتے ہیں، غیر لزومی حکم ہے یعنی بہتر ہے کہ کریں تو اسے مستحب کہتے ہیں۔ جہاں حکم نہ ادھر کا ہے، نہ ادھر کا ہے اسے مباح کہتے ہیں۔ تو یہاں بدعت کا لفظ کہیں پر نہیں آئے گا۔ نہ فعل میں آئے گی، نہ ترک میں آئے گا۔ اگر فعل ہو جزو دین سمجھ کر اور وہ دین کا جزو نہیں ہے تو وہ فعل بدعت اور ترک ہو، جزو دین سمجھ کر حالانکہ وہ جزو دین نہیں ہے۔ تو وہ ترک بدعت اور جہاں فعل یا ترک جزو دین ہے، وہاں اس کو خارج کرنا، وہ فعل جو جزو دین ہے، اسے خارج کرنا، وہ بھی بدعت اور وہ ترک جو جزو دین ہے، اسے خارج کرنا، وہ بھی بدعت۔ اب جزو دین کیونکر ہوتا ہے فعل؟ ایک تو اعتقادات کا باب ہے کہ کون جزو دین ہیں یعنی کن کا ماننا ضروری

ہے۔وہ اعتقادات کا باب ہے۔ افعال میں کون جزو دین ہیں یعنی قربۃ الی اللہ بجالایا گیا۔ یعنی نیت اس میں ہو کہ خدا کے حکم کی وجہ سے جیسے نماز قربۃً الی اللہ بجالائی جاتی ہے۔ روزہ قربۃً الی اللہ ہوتا ہے۔ تو یہ قربۃً الی اللہ، یعنی اللہ کی رضا کیلئے، اللہ کی خوشنودی کیلئے۔ اس سے تقرب کیلئے ہم اس کام کو کرتے ہیں۔

تو اس میں فرض کیجئے اللہ کی طرف سے کوئی ثبوت نہیں اس کا کہ اللہ کو یہ کام پسند ہے اور ہم پھر یہ نیت کر کے اسے انجام دیں کہ اللہ کی رضا کیلئے کرتے ہیں تو یہ اللہ پر گویا بہتان ہے، اللہ پر افترا ہے، جھوٹ ہے۔ یہی مشرکین سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ کیا اللہ نے تم سے کہا ہے کہ ان بتوں کی پرستش کرو؟ تم اللہ پر افتراء کرتے ہو، تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو، تو اس چیز کو جس کا حکم اس کی طرف سے نہیں ہے، یہ سمجھ کر کرنا کہ اس کا حکم ہے قربۃً الی اللہ انجام دینا، یہ بدعت ہوگا۔

اب اس میں ہم اپنے عقل آرائی سے کام لیں کہ نہیں، یہ اللہ کو ضرور پسند ہوگا، اب اس کی مثالیں۔ نماز پنجگانہ کا حکم ہے۔ اب یہ دور تو ریسرچ کا ہے کہ نئی بات کوئی کہے کہ صاحب! جب پانچ نمازیں اسے پسند ہیں تو ہم دس نمازیں اگر واجب کی نیت سے پڑھیں تو کیا حرج ہے؟ حرج یہی ہے کہ اس نے پانچ واجب کی ہیں، آپ دس کئے دیتے ہیں۔ کوئی اس کی حمایت کرنے والا کہے کہ صاحب! کمی تو نہیں کی اور زیادتی ہی کردی تو وہ زیادتی ناجائز ہوگی، حرام ہوگی۔ ایک بدعت کی ایجاد ہوگی۔ اب اس میں کہ جو نماز پنجگانہ ہے، اس کی رکعات جتنی مقرر ہیں، صبح کی نماز دو رکعت، مغرب کی نماز تین رکعت، باقی سب چار چار رکعت۔ اب کوئی عقل آرائی کرے کہ صاحب! وہ ہماری آسانی کیلئے ہے کہ ابھی سو کر اٹھے ہو، نیند کا اثر ہے تو دو ہی رکعات پڑھ لو۔ تو کہئے کہ ہماری آسانی کیلئے تھا، ہم رضا کارانہ طور پر چار پڑھتے ہیں تو کیا مضائقہ؟

تو یہاں عقلی بحث سے کام نہیں چلے گا۔ ہاں اطاعت مولا ہے۔ اس نے دو رکعت کا حکم دیا تھا کیونکہ یہ تصور پہلی صدی سے شروع ہو گیا کہ جو حکمران ہے، وہ نماز پڑھائے، اسے نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق ہے۔ لوگ فخریہ کہیں گے کہ ہم نے فلاں کے پیچھے آج نماز پڑھی۔ تو جناب! جو کہیں گورنر ہوتا تھا، اس کا کام ہوتا تھا نماز پڑھانا۔ اب دور بنی امیہ میں ایک گورنر صاحب تھے جو شراب کے نشے میں چور محراب عبادت میں آئے صبح کی نماز پڑھانے اور شروع شروع کے گورنر تھے۔ جب صحابہ بھی دنیا میں موجود تھے اور بیچارے صحابہ اس نماز کی صف جماعت میں تھے۔ یہ روایت سے ثابت ہے، تاریخی روایت ہے۔ اب یہ سوچتے رہئے گا کہ یہ جماعت میں شامل تھے تو تقیہ تھا یا نہیں تھا۔ تو جناب! جماعت میں صحابہ بھی شامل تھے۔ اب انہوں نے آج یوں کہوں کہ ذوق عبادت تھا، تو دو رکعت کی بجائے چار رکعات صبح کی نماز کی پڑھادیں اور اس کے بعد مڑ کر پوچھا: اور کچھ اضافہ کردوں؟ کہو تو دو چار رکعات اور؟ تو دو ایک آوازیں وہاں، نام ہیں صحابہ میں سے بعض کے، جو وہاں تھے کہ (معاذ اللہ) "مَعَكَ فِي زِيَادَةٍ"۔

آپ کے ساتھ تو ہم زیادتی ہی میں رہے ہیں تو اس وقت بس کافی ہے۔ اتنا ہی احسان آپ کا بہت ہے چار رکعات پڑھا دینا یا اجزائے نماز میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا کہ جناب سورہ حمد ایک دفعہ کا حکم ہے۔ ہم ایسی نماز پڑھیں جس میں سورہ حمد دو دفعہ پڑھا کریں۔ پانچ سورتیں پڑھا کریں۔ اب کوئی کہے کہ یہ کیا؟ ارے صاحب! ہم نے کوئی کمی کی ہے؟ ہم نے تو زیادتی کی ہے۔ ہماری

تعریف کیجئے کہ ہم اتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں۔ تو یہی بدعت ہوگی کہ آپ نے چھوٹی نماز کو لمبا کر دیا۔ آپ کو کیا حق تھا؟ جتنا مقرر تھا، آپ کو پڑھنا چاہئے تھا۔

اسی وجہ سے علماء کہتے ہیں کہ قرآن دوسوروں میں حرام ہے۔ قرآن کے معنی ہیں دو سورے، بجائے ایک سورے کے۔ سورہ الحمد کے بعد ایک سورہ پڑھنا چاہئے۔ دوسرے پڑھیں تو وہ قرآن ہے۔ یا ماہ رمضان میں ہم دو دن کا روزہ رکھیں۔ رات کو بھی افطار نہ کریں۔ شروع ہی سے اگر نیت یہ کریں کہ ہم دو دن کا روزہ رکھیں۔ اگر نیت ایک ہی دن کے روزہ کی ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ رات کو آپ کچھ کھائیے بھی۔ وہ تو وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا، کھانا آپ کا فعل ہے۔ وہ وقت ہی نہیں رہا تو روزہ کہاں رہے گا؟ نیت بھی ایک ہی کی تھی۔ اس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ تو اس سے لازم نہیں آئے گا کہ وہ صوم وصال ہو جائے۔ صوم وصال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دو دن مسلسل روزہ۔ اسی طرح گھٹا کر کوئی روزہ ایجاد کیا جائے۔ عوام میں کچھ مشہور ہے بعض جگہ کہ ڈھائی پہر کا روزہ اور دو پہر کا روزہ۔ تو وہ فاقہ کیجئے، آپ کو اختیار ہے۔ چاہے جتنی دیر کا کیجئے لیکن روزہ رکھنا ہے تو وہ جتنا حکم ہوا ہے۔

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ

پس جب رات آئے تو روزہ ختم کرو۔

اور قرآن کا ایک یہی لفظ بہت سی بحثوں کا فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ روزہ کی حد ہے کہ رات آئے، اگر صرف سورج کے نظر سے اوجھل ہونے سے رات ہو جایا کرتی ہو تو افطار کا وقت وہ ہے اور اگر کچھ تاریکی کی ضرورت ہے، تو پھر افطار کا وقت یہ سمجھئے کہ ذرا تو تاریکی پیدا ہو جائے۔ بہر حال قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ

رات کے آنے تک تم روزہ کو پورا کرو۔ تو یہ سب جو ہے، اسی بناء پر بعض لوگ عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ واقعی ہمیں ہمدردی ہوتی ہے کہ اتنی محنت، اتنی زحمت، وہ کوئی آسان تو نہیں ہوتا، افطار کے بعد کھڑا رہنا۔ مگر اب ہم کیا کریں کہ ہمیں اصول شرع یہ معلوم ہو گیا ہے کہ واجب نماز میں جماعت درست ہے اور نفل میں جماعت نہیں ہو سکتی۔ اب اگر کسی قسم کے بھی نفل، چاہے غیر ماہ رمضان، چاہے ماہ رمضان، چاہے دن کو، چاہے رات کو، کسی قسم کے نفل با جماعت ادا کئے جائیں گے تو اسے ہم کہیں گے کہ یہ بدعت ہے۔

اور یاد رکھئے کہ ہمارے ہاں جو چیز بدعت ہو، وہ پھر حسنہ نہیں ہو سکتی۔ بدعت کی دو اقسام نہیں اچھی اور بری۔ بدعت ہے تو بس بری چیز ہے۔ وہ اچھی چیز نہیں ہے اور متفق علیہ حدیث ہے:

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

وہاں اس میں کوئی قید نہیں لگائی ہے۔

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ

عربی دان افراد جانتے ہیں کہ شکل اولی رسولؐ نے بتائی ہے جس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی کا نتیجہ دوزخ ہے۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ اس میں سوال اچھے اور برے کا پیدا نہیں ہوا۔ بدعت جو ہے وہ بری ہی ہے۔ ان میں کوئی اچھی نہیں ہوسکتی۔ تو اب کوئی بھی اس طرح کی ایجاد، نئی قسم کی نماز، نئی قسم کا روزہ، نئی قسم کا حج، ان میں سے کوئی چیز بھی نئی قسم کی، اور ظاہر ہے کہ روزہ ہے تو قربۃً الی اللہ رکھا جائے گا۔ نماز ہے تو وہ قربۃً الی اللہ۔ تو وہ بدعت ہوگی یعنی نئی قسم کی نماز وغیرہ۔

اب فرض کیجئے کہ عید کی سویاں، اس کا شرع میں کہاں حکم ہے کہ عید کے دن سویاں کھاؤ؟ مگر وہ ہمارے ہاں تو ہر جگہ ہے۔ میرے خیال میں تو جو ناواقف مسلمان بھی ہیں، وہ بھی یہ نہیں سمجھتے کہ سویاں کھانا خدا کا حکم ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آج سویوں کا کھانا کوئی عبادت ہے۔ تو جناب! یہ دعوتوں میں اکثر سویاں ہوتی ہیں، شیرینی کی بجائے۔ ان کا کھانا جائز ہے۔ ایک دن کی قید کرکے بھی اس کا کھانا جائز ہے۔ یعنی جو چیز جائز ہے، وہ بلا قید جائز ہے۔ تو قید کے ساتھ کیوں جائز نہ ہوگی؟ بس یہ تصور نہ ہو کہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ تصور ہو کہ شرعاً آج سویاں کھانا واجب ہے یا باعث ثواب ہے۔

تو ہمارا کوئی عالم سویاں کھانے میں عذر نہ کرے گا۔ علماء کے گھر میں بھی پکائی جاتی ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لطف یہ ہے کہ اکثر ایسی باتیں ہندوستان ہی میں رائج ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ ٹکڑا تو یہ ہندوستان ہی کا ہے۔ اب بس یہ سمجھ کے نہ ہو کہ یہ آج کے دن خدا کا حکم ہے۔ وہ تو ایک دن میں شرک کے موضوع پر بھی کہہ چکا کہ شرک کا سوال، ہزار کام ہوں، ان میں یہ لوگ پیدا نہیں کرتے، کسی حاکم کی تعظیم میں یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ کسی اور بڑے ایماندار آدمی کی تعظیم ہو یہ سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب رسول کی تعظیم ہو تو یہ لوگ فوراً وہاں یہ سوال اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ بدعت کا سوال بھی ہے۔ سویاں کھائیں گے تو بدعت ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں مَیں نے تو بدعت کا فتویٰ نہیں دیکھا۔ کسی مکتب خیال نے یہ فتویٰ دیا ہو کہ یہ بدعت ہے، اس سے پرہیز واجب ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ اگر عید کی قید سے سویاں پکتی ہیں، ہر جگہ عید کے دن اور بدعت نہیں ہوتیں تو اگر ۲۲ رجب کو کونڈے کی طرف نسبت ہے اور وہ نسبت بھی جو امام جعفر صادقؑ علیہ السلام کی طرف نسبت ہے، وہ اس معنی سے نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نذر دینے والا یہ نہیں سمجھتا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی کوئی حدیث ہے یا انہوں نے کوئی حکم دیا ہے۔ وہ تو ہم اسے نسبت دے دیتے ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف۔ یہ نہیں سمجھتے کہ آج کے دن خاص طور پر سے شرع میں وارد ہوا ہے۔ ایک دن جیسے اس کیلئے مقرر خود کرلیا ہے، ویسے ایک دن اس کیلئے مقرر ہوگیا ہے۔ ہمارے ہاں تو کثرت سے اہل سنت کے گھروں میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کے کونڈے ہوتے ہیں۔

تو اب یہ کہئے کہ پھر یہ ہوا کیوں؟ ممکن ہے ہمارے جو سابق لیڈر تھے قوم کے ان کا مقصد یہی ہو کہ ہم اس ذریعہ سے کم سے کم ایک امام کے نام کو دوسرے حلقوں میں بھی پہنچا دیں۔ ارے پورے سلسلہ کے نام یاد نہ ہوں، ایک تو یاد ہو جائے گا، اپنے مطلب کیلئے ہی سہی۔ تو ایک حکیمانہ مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ اب اس کے آغاز کے وقت ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ ہم نے تو اب دیکھا ہے کہ یہ ہے۔ اس

کا نتیجہ دیکھتے ہیں کہ وہ عام ہے۔ مجھے تو کانپور کا حال معلوم ہے کہ فتوے آنے لگے کونڈوں کے خلاف۔ چونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف نسبت ہے، اس لئے بڑے زور سے فتوے آنے لگے۔ بڑے بڑے پوسٹر لگ گئے۔ مگر حضرات اہل سنت ہی کا وہ طبقہ جو اس پر عامل ہے، اسے کد ہوگئی۔ کبھی تو مکانوں کے اندر ہوتے تھے، اب شاہراہِ عام پر شامیانے لگا کر صلائے عام۔ شاید پہلے بھی اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا بلانے میں جتنا اب ہونے لگا کہ لوگ اس میں شرکت کریں۔

اب یہ بھی صاحب! شیرینی تو بہر حال شیرینی ہے۔ کچھ لوگ ذوق کام و دہن کیلئے اس میں شریک ہو گئے۔ جو لوگ عامل تھے، انہوں نے اپنے تجربے بتائے کہ ہماری یہ حاجت پوری ہوئی، ہمارا یہ کام پورا ہوا۔ اور میں کہتا ہوں کہ خدا نے دعا کا کیوں حکم دیا؟ کیا وہ خوشامد پسند ہے کہ خوشامد کرو (معاذ اللہ)۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ نہیں، چونکہ یادِ الٰہی ہماری تعمیر زندگی کا سبب ہے، اس لئے اس نے دعا کا حکم دے کر کہا کہ اپنی غرض سے ہی سہی، مجھے یاد کیا کرو۔

اسی طرح جن ہستیوں کو اسے مرکز ہدایت بنانا تھا، ان کو مرجع خلائق بنانا تھا، طرح طرح سے ان کی طرف بلایا۔ دعوت کی کہ ارے! نہ اس سے اللہ کا فائدہ ہے، نہ اس سے ان کا فائدہ ہے۔ جو ان کے وجود کا فائدہ تھا، جو ان کی ہدایت کا فائدہ تھا، اس فائدہ کو اس تصور سے تقویت ہوتی ہے اور اب یہ شرک ہی کے باب کا جزو پھر آ گیا بدعت میں کہ وہ قوم جو شرک شرک کی آواز بلند کرتی ہے، وہ تو وسیلہ کی بھی منکر ہے اور توسل کو بھی کہتے ہیں کہ شرک ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میں قرآن کی آیت پڑھتا ہوں، اس کا صرف ترجمہ آپ دیکھئے گا، ضروری نہیں ہے کہ کوئی تفسیر بھی آپ دیکھیں ارشاد ہو رہا ہے:

لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا یعنی گناہ کئے تو "جَآءُوْكَ" وہ آپ کے پاس آتے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ مسجد میں جاتے؟ گناہ کئے ہیں خدا کے اور بھیجا جاتا ہے رسولؐ کے پاس۔

یہ کیوں نہیں ہوا کہ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے یعنی گناہوں کا ارتکاب کیا تو "جَآءُوْكَ"، آپ کے پاس آتے۔ عربی سے واقف افراد جانتے ہیں "ف" بلا تاخیر کیلئے آتی ہے۔ پرانے زمانہ میں ترجمہ اس کا ہوتا تھا "پس"، اب وہ ہماری اردو پس والی نہیں رہی۔ تو اب وہ مفہوم یوں ادا ہوتا ہے کہ

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا

یعنی آپ کے پاس آتے اور اللہ سے مغفرت کے طلبگار ہوتے۔

اتنا بھی نہیں کیجئے رسولؐ کے پاس آئے، ان کے سامنے ان کی بارگاہ میں اللہ سے مغفرت طلب کی۔

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ

اور پھر رسول بھی ان کیلئے شفارش کرتے اس سے۔ رسولؐ ان کیلئے استغفار کرتے۔

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا

"پھر پاتے اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا"۔

تواب اللہ تو ہے اپنی جگہ تواب۔ اب اگر یہ بات نہ ہو تو کیا وہ تواب نہیں ہے؟ وہ ہے اپنی جگہ رحیم۔ اگر یہ نہ ہو تو کیا وہ (معاذ اللہ) اپنی جگہ رحیم نہیں ہے؟ نہیں، یہ اگر نہ ہو تو اس کی وہ توابیت تمہارے شامل حال نہ ہوگی۔ یہ نہ ہو تو اس کی رحمت تمہاری شامل حال نہ ہوگی۔ لیکن اگر ایسا کرو کہ رسولؐ کے پاس آؤ اور رسولؐ کے پاس آکر آپؐ کے سامنے خود استغفار کرو اور پھر رسول تمہارے لئے استغفار کریں تو اللہ کو پاؤ گے توبہ قبول کرنے والا۔ یہ اس وقت پاؤ گے۔ ہے تو وہ یوں اپنی جگہ لیکن ان پر فیضانِ رحمت اس وقت ہوگا۔

تو اب یہ کیا ہے؟ یہ ایسے ہے کہ مرکز بنانا تھا ان کو خلائق کا۔ تو اب جب رسولؐ کے لئے قرآن مجید نے کہا تو دنیا، چاہے رسولؐ ہی کو اس نے دیکھا ہو، لیکن ہمیں اگر کچھ اور ہستیاں معلوم ہیں جنہیں اللہ کو منظور تھا مرکز بنانا اور اگر منظور نہیں تھا تو محبت کیوں جزو دین بنائی؟

اور یہ بات بلا تفریق فرقہ سب کے نزدیک مسلّم کہ محبت ان کی جزو دین جن کو ہم نہ مانتے ہوں محبت کرنے والا، وہ بھی محبت کو جزو دین مانتے ہیں۔ کہیں گے کہ محبت ان کی ہر مومن کا فریضہ ہے۔ بس نتیجہ میں نکالتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ ایسے افراد جن کیلئے خالق کو منظور ہو کہ گوشہ نشین رہیں، خلق خدا کو ان سے کوئی تعلق نہ رہے، یہ ان کی محبت کی دعوت دینا جو متفق علیہ ہے عالم اسلام میں، میرے نزدیک تو اس لئے ہے کہ ان کو مرکز اطاعت بنانا تھا اور ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اطاعت محبت کے واسطے سے نہ ہو تو ناخوشگوار اور محبت کے ذریعہ سے ہو تو لذیذ ہو جاتی ہے۔

کسی راستے پر آپ روز جاتے ہوں لیکن کسی دن پابندی عائد کر دی جائے کہ تم کو ضرور جانا ہوگا تو اس دن تکلیف دے گا جانا تو پابندی ناخوشگوار ہوتی ہے۔ اطاعت لذیذ نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی ایسا جس کی محبت کا آپ دم بھرتے ہوں، وہ کوئی فرمائش کرے تو آپ اس میں روز سے زیادہ زحمت بھی ہو تو ایک قسم کی بالیدگی محسوس ہوتی ہے کہ ہم نے بہر حال یہ کام انجام دے لیا، چاہے کتنی ہی مشقت کیوں نہ ہوئی ہو!

معلوم ہوا کہ وہ زحمت، زحمت معلوم نہیں ہوتی جو برائے محبت ہو۔ اس لئے جن افراد کو مرکز اطاعت بنانا تھا، ان کو پہلے مرکز محبت بنا دیا۔ مثال کے طور پر یہ ہے کہ کوئی وہاں معلوم تھا رسولؐ کو کہ میرے امت کا ہر فرد ایسا نہیں ہے کہ وہ گھر میں خادمہ رکھ سکے تو بعد میں ایک کنیز سپرد کی۔ پہلے ہی دن کنیز نہیں دے سکتے تھے؟ مگر نہیں، رسول تو یہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی خاتون اپنے گھر میں بھی پیسے تو وہ فخر محسوس کرے کہ میں وہ خدمت انجام دے سکتی ہوں جو مخدومۂ عالم انجام دیتی تھی۔ اگر اپنے گھر میں جھاڑو دے تو وہ ذلت محسوس نہ کرے بلکہ عزت محسوس کرے کہ شہزادی کائنات اور خاتونِ جنت اپنے گھر میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتی تھیں۔

تو وہاں جو محبت کا قدم بیچ میں آجائے گا تو پھر ہر مشقت خوشگوار ہو جائے گی۔ تو معلوم ہوا کہ انہیں مرکز اطاعت بنانا تھا، لہٰذا ان کی طرف ہر حیثیت سے نگاہوں کو موڑنا تھا۔ ارے دنیاوی حاجتوں میں کسی کو شک ہو کہ ان کے ذریعے کام نکلتے ہیں یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ جنت کی فکر تو ہر ایک کو ہے۔ کوثر کا شوق تو ہر ایک کو ہے۔ تو اگر کوثر کا شوق ہے تو یاد رکھو کہ ساقی یہ ہے۔ لہٰذا کوثر کے شوق میں ہی اس کی طرف آئے، اس کا دامن نہ چھوڑو۔ ارے ہر مسلمان کو جنت میں تو جانا ہے۔ تو یاد رکھو کہ جنت و نار کی تقسیم کرنے والا یہ ہے۔ لہٰذا اس کی طرف آؤ۔ یہ حدیث وہ ہے کہ مامون عباسی نے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا کہ آپؑ کے جد بزرگوار کی فضیلت میں ایک حدیث سننے میں آئی ہے۔ وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آپؑ نے فرمایا: کیا؟ کہا کہتے ہیں کہ رسولؐ کی حدیث ہے کہ اے علیؑ! تم جنت و نار کے تقسیم کرنے والے ہو۔ جنت و نار اللہ کی چیز ہے۔ اسے دوسرا کون تقسیم کرے گا؟ تو یا دہی تصور شرک تھا۔ اللہ کو نہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے حکم سے تقسیم کرے گا، ان کو کہہ رہے ہیں کہ یہ جنت و نار کے تقسیم کرنے والے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آپؑ نے فرمایا: ایک اور حدیث آپ نے سنی ہے، وہ سمجھ میں آتی ہے یا نہیں؟ وہ جو رسولؐ نے فرمایا:

يَا عَلِيُّ حُبُّكَ إِيمَانٌ وَبُغْضُكَ نِفَاقٌ

اب یہ بھی صحاح میں موجود ہے۔ ''اے علیؑ! تمہاری محبت ایمان ہے اور تمہارا بغض کفر و نفاق ہے۔''

مامون عباسی نے کہا کہ یہ تو بالکل صحیح ہے۔ یہ تو بالکل مسلم ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ پھر جنت و نار تقسیم تو ہو گئے۔ تو بس یہی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے یاد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نذر کو یہ سمجھ کر نہ کیا جائے کہ یہ حکم شرع ہے۔ ایک چیز کو ہمارے ہاں علماء نے روک دیا۔ یہاں معلوم نہیں۔ ایک وقت میں بائیس رجب کے کونڈوں کے ساتھ ایک لکڑہارے کی روایت پڑھی جاتی تھی۔ اسے علماء نے منع کر دیا کہ اس میں نسبت ہے امامؑ کی طرف۔ ایک تو جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ امام کا قول ہے یا فعل ہے، تو اس وقت تک یہ افترا و بہتان ہو جائے گا۔ اس لئے ہمارے ہاں کے علماء نے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں سب کے جہاں جہاں میرے علم میں بائیس رجب کے کونڈے ہوتے ہیں وہ روایت نہیں پڑھی جاتی ہے۔

تو زیادہ سے زیادہ کوئی فضول کہہ دے۔ لیکن اسے بدعت کہہ دینا، شرک کہہ دینا، یہ بیکار کی بات ہے اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ زیادہ وقت دوسرے جزو پر صرف کروں گا یعنی یہ تو ہمارے ہاں کی تعریف تھی۔ اب دوسرے حضرات، اکثریت والوں کے ہاں بدعت مقابلہ سنت ہے۔ یعنی ہمارے ہاں سنت تو واجب کے مقابلہ میں ہے۔ یہ واجب ہے، یہ سنت ہے۔ وہاں سنت ایک قرآن کے ساتھ ساتھ بولی جاتی ہے، قرآن اور سنت اور ایک پھر بدعت کے مقابلہ میں کہ یہ سنت ہے اور یہ بدعت ہے۔ اس سنت کے معنی طریق رسولؐ اور طریق رسولؐ سے مراد قول رسولؐ، فعل رسولؐ، تقریر رسولؐ، تقریر ہمارے ہاں یہ ہونے لگی کہ منبر پر یا سٹیج پر ہوتی ہے تو وہ تو قول رسولؐ میں داخل ہو گئی اور وہ منبر پر بھی اگر ہے تو قول رسولؐ میں داخل ہے۔

وہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا کوئی کام کرے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہیں، منع نہ کریں، اس کا نام ہے تقریر رسولؐ۔ تقریر کے کیا معنی؟ یعنی برقرار رکھنا جب اس کی رد نہیں کی، اس کو منع نہیں کیا تو یعنی برقرار رکھا۔ تو یہ ہے معیار سنت اور جو سنت قول رسولؐ میں ہو، نہ

فعل رسولؐ میں، نہ تقریر رسولؐ میں اور وہ انجام دی جائے تو اسے کہتے ہیں بدعت۔ سنت کے مقابلہ میں بدعت۔

اسے میں بھی مان لوں گا کہ ٹھیک ہے۔ سنت سے مطلب قول رسولؐ، فعل رسولؐ، تقریر رسولؐ۔ کیا مطلب؟ یہ شکل جو اس وقت آرہی ہے تو اگر یہ معیار ہو جائے سنت و بدعت کا تو پھر ہمارا حج بھی بدعت، ہماری مسجدیں بھی بدعت، ہماری نمازیں بھی بدعت۔ ہماری سب باتیں بدعت۔ ہماری زندگی بدعت بلکہ ایک دفعہ، ہنڈرسن اسلامیات کے پروفیسر ہیں لندن میں، ان کا خاص موضوع ہے "شریعت اسلام میں ترمیم کی جائے"۔ اس موضوع پر وہ ہر جگہ بولتے ہیں۔ یہ ہے ان کا خاص موضوع۔ وہ ہندوستان میں آئے تھے تو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس وقت صدر ہند تھے۔ انہوں نے ان کو کہہ دیا علی گڑھ جایئے گا۔ تو میرا نام لے دیا کہ ان سے ضرور ملئے گا۔ تو اب وہ پہلے ہی دن جو آئے تو مجھے تلاش کرنے لگے۔ پوچھنے لگے ایک ایک سے۔ خیر وہ اسلامی قانون کے پروفیسر ہیں وہاں۔ تو ہمارے ہاں قانون کے شعبہ میں ان کے لیکچر کا انتظام ہوا۔ گویا وہ ہم جنس جو تھے تو قانون کے شعبے میں۔ چیئرمین نے مجھے کہلوایا کہ وہ جب سے آئے ہیں، آپ کو پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا عصرانے میں آپ آیئے تو وہاں آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔

میں وہاں چلا گیا۔ تو اس وقت سے متعلق جو بات ہے، وہ یہ کہ فوٹو کھنچنے لگا۔ تو اس میں انہوں نے مجھ بھی بلوایا۔ تو صاحب! میں بیٹھ گیا تو انہوں نے گویا مجھ پر چوٹ کی، میری مولویت سے فائدہ اٹھا کر کہ یہ بدعت تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ جی، بدعت ہے تو پھر میں خود ہی بدعت ہوں۔

تو اگر وہی شکل، تو آج ہمارا کونسا عمل اسی شکل میں آج ہے۔ رسولؐ کی مسجد ایسی تھی جیسی ہماری جامع مسجد ہوتی ہے؟ رسولؐ کے زمانہ میں جو حج ہوتا تھا، وہ کیا ان سواریوں پر ہوتا تھا جن پر اب ہوتا ہے اور رسولؐ کے ساتھ نماز جماعت میں کیا اتنا مجمع ہوتا تھا جتنا مجمع ہمارے ہاں ہوتا ہے؟ تو صاحب! اگر یہ معیار ہے تو ہمارا لباس بھی بدعت، ہماری غذائیں بھی بدعت، ہماری سواریاں بھی بدعت، ہماری عبادتیں بھی بدعت۔ تمام زندگی بدعت میں گزر رہی ہے، دو چار بدعتیں اور سہی۔ تو یہ معیار نہیں ہے۔ معیار یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ دیکھئے کہ کام وہی ہے یا کام کچھ اور ہے۔ یہ اونٹوں پر جو ہوتا تھا، اس کا نام کیا تھا؟ حج۔ اور یہ جو موٹروں پر جا کر کام ہوتا ہے، وہ حج کے سوا کچھ اور ہے؟ اگر حج ہی ہے یہ بھی تو وہ اونٹ پر حج تھا، اب یہ سواری پر حج ہے۔ موٹروں پر اور ہوائی جہاز پر۔ تو یہ بھی حج ہے جس طرح وہ واجب تھا اس طرح یہ واجب۔

ارے جو ایک دفعہ ہو چکا ہے اس پر وہ بھی سنت تھا یعنی مستحب اسی طرح یہ بھی سنت ہے یعنی مستحب۔ جو حکم اس کا تھا، وہی حکم اس کا ہوگا۔ اگر شکل نئی ہے اور بات وہی ہے، کام وہی ہے، تو ٹھیک ہے۔ میں نے خود تقریریں سنی ہیں کہ میلاد کے جلسوں میں یہ قمقمے اور یہ اتنی روشنی کا انتظام، یہ جھالریں اور مقررین کرام آ کر سب کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو ہو رہا ہے، یہ کیا ہے؟ ذکر رسولؐ ہے یا کچھ اور ہے؟ اگر ذکر رسولؐ ہے تو وہ اندھیرے میں ہوتا، تب بھی عبادت، روشنی میں ہوتا، تب بھی عبادت۔ یہ ذہنیت میرے نزدیک قابل افسوس ہے کہ اپنے گھر میں روشنی ہو تو بدعت نہیں ہے، رسولؐ کے ذکر میں روشنی ہو تو بدعت ہو گئی۔ اب قرآن میں دیکھئے، قرآن کیا کہہ رہا ہے، انہیں ان کا ذکر منظور ہے یا نہیں؟ تو قرآن کہہ رہا ہے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

اے رسولؐ! ہم نے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا ہے۔

ماشاء اللہ صاحبان نظر ہیں، میں کہتا ہوں کہ قرآن نے جہاں اپنی وحدت پر زور دینا ہو، وہاں مَیں کہا ہے۔ موسیٰؑ سے کہا تھا "اَنَا رَبُّكَ" میں تمہارا پروردگار ہوں۔ "اِنَّمَا اَنَا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں ایک اکیلا خدا ہوں۔ جہاں وحدت پر زور دینا ہوا ہے، وہاں مَیں کہا ہے۔ جہاں طاقت عمل دکھانا ہے وہاں ہم کہا ہے۔ ابھی چند مثالیں عرض کروں گا۔ میں کہتا ہوں طاقت عمل دکھانا ہے، اس "ہم" میں مخالف طاقتوں کیلئے چیلنج ہوا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

دوسری مثال

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

اے رسولؐ! ہم نے آپ کو کثرتِ نسل عطا کی ہے۔

اب بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتیں ختم ہو جائیں گی مگر آپ کی نسل ختم نہیں کر سکتیں۔ بس یونہی کہا گیا۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

ہم نے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا ہے۔

یعنی لاکھ بدعت کے فتوے لگتے رہیں مگر آپؐ کے ذکر کو کوئی نیچا نہیں کر سکتا۔ تو کام دیکھیے کہ وہی کام ہوتا ہے یا نہیں؟ اب جناب! یہ میلاد رسولؐ، اس پر جہاں جہاں بدعت کے فتوے لگتے ہوں، سب میں بس اتنا غور کیجئے، آپ کہتے ہیں کہ ہماری مجلس بدعت، بس اسی معیار پر لے لیجئے، مجلس میں دیکھیے کام کیا ہوتا ہے؟ آلِ رسولؐ کا ذکر۔ حالانکہ آلِ رسولؐ ہی کا نہیں، خدا کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ رسولؐ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حسینؑ کی مجلس کی بدولت انبیاء کا ذکر بھی ہوتا ہے، مرسلین کا ذکر بھی ہوتا ہے، جتنے مقاصد الٰہی ہیں، سب پورے ہوتے ہیں۔ اگر مجلس کا صحیح مقصد قائم رہے تو بنیادی طور پر بہر حال وہ ہمارا محاورہ ہے، ہمارے ہاں یونہی ہے کہ جب فضائل بیان ہوں تو انہیں محفل کہتے ہیں، جب مصائب بیان ہوں تو انہیں مجلس کہتے ہیں۔

اب یوں دنیا والے ریڈیو کی تقریر کو بھی مجلس کہنے لگے اور ہماری مجلس کیلئے بدعت کے فتوے ہیں، اس کیلئے نہیں ہیں۔ تو بہر حال میں تو اپنی زبان جو ہے، مجلس کا محاورہ اسی کا ذمہ دار ہوں۔ تو جناب! یہ محفل ہو یا مجلس ہو، اس میں کیا ہوتا ہے؟ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کا ذکر۔ تو اب دیکھیے پیغمبر نے کیا ہے ان کا ذکر یا نہیں؟ مجمع کے بدلنے سے کہ اس وقت دو آدمی تھے، اس وقت دو ہزار ہیں، اس سے تو کوئی کام بدعت نہیں ہو جاتا ہے۔ ورنہ پھر حج کی تعداد دیکھیے کہ رسولؐ کی زندگی میں حج کرنے والے کتنے تھے، اب جب لاکھوں

تک تعداد پہنچے تو سمجھئے کہ بدعت ہوگیا، تو بھئی کام اگر وہی ہے، کرنے والوں کی تعداد بڑھے یا گھٹے، کبھی مجلس میں دو آدمی ہوتے تھے، اس وقت دو ہزار ہوں۔ اصل نوعیت عمل نہیں بدلتی۔ جیسے نماز جماعت اگر ایک امام اور ایک ماموم ہو، تب بھی نماز جماعت اور اگر دس ہزار ماموم ہوں، امام کے ساتھ، تو نماز جماعت۔ فرق نہیں ہوتا تعداد کے بدلنے سے۔ تو اب جس کا نام مجلس ہے، اسے دیکھ لیجئے کہ رسولؐ کے ہاں اس کا نمونہ ہے یا نہیں؟

بس ایک روایت جناب ام سلمہؓ کی۔ پیغمبر خدا آئے جناب ام سلمہؓ کے ہاں اور حجرے میں تشریف لے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ وحی نازل ہونے والی ہے، کوئی میرے پاس نہ آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں حسینؑ آئے، ادھر اُدھر دیکھا، پوچھا: نانا ؐ جان کہاں ہیں؟ جو واقعہ تھا وہ انہوں نے بیان کیا کہ آپ حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ کوئی نہ آئے۔ اب اصل واقعہ جو ہے۔ جو الفاظ میری سمجھ میں آئے ہیں، وہ یہ کہ حسینؑ نے یہ پوچھا کہ کیا ہمیں بھی منع کیا ہے؟ بس یہ آواز حسین علیہ السلام کی پیغمبر خدا نے سنی۔ پھر کیا ہوا؟ حسینؑ داخل ہو گئے۔

کوئی بتائے، میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جیسے انہوں نے پوچھا کہ کیا ہمیں بھی منع کیا ہے؟ پیغمبرؐ نے آواز سنی، فرمایا: ام سلمہؓ! میرے حسینؑ کو آنے دو۔ حسینؑ داخل ہو گئے۔ پھر دروازہ بند کر لیا گیا۔ اب تھوڑی دیر میں جناب ام سلمہؓ کہتی ہیں، میں نے محسوس کیا کہ رسولؐ خدا گریہ فرما رہے ہیں۔ اب ہر صاحب عقل محسوس کرے کہ جو حجرے سے باہر ہو اور حجرے کا دروازہ بند ہو، وہ فقط آنسوؤں کا گریہ محسوس نہیں کر سکتا۔ ماننا پڑے گا کہ صدائے گریہ تھی جو جناب ام سلمہؓ نے محسوس کی۔ اب یہ دروازے کے قریب آئیں، کہا: یا رسولؐ اللہ! کیا میں آسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، آسکتی ہو۔

یہ جو گئیں تو ان کا بیان ہے کہ پیغمبر خدا کے سینہ مبارک پر شہزادہؑ ہے اور زار زار گریہ فرما رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! یہ گریہ کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: میرا بچہ جو آیا میرے سینے سے لگا تو ایک فرشتہ نے کہا: یا رسولؐ اللہ! آپ اس بچے کو چاہتے ہیں؟ ذرا غور فرمایئے کہ یہ فرشتہ کس واقعہ کی خبر دینے آیا ہے۔ ارے وہ تو وقت ولادت حسینؑ خبر دی جا چکی تھی۔ اس دن میں بیان کر چکا کہ شہزادے کو گود میں لا کر دیا گیا اور رسولؐ اللہ نے گریہ فرمایا۔ تو پھر یہ اطلاع دینے کو آیا ہے؟ نہیں، اطلاع دینے نہیں آیا۔ کہی ہوئی بات کو دہرانے آیا ہے۔ یعنی اس ذکر کو تازہ کرنے آیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مجلس اسی کو کہتے ہیں۔ مجھے حق ہے کہنے کا کہ یہ فرشتہ آیا ہے مجلس حسینؑ کرنے کیلئے۔ اب یہ جو پوچھ رہا ہے، یہ سوال ہے۔ واقعی کیا کہا؟ وہ نہیں جانتا کہ محبت کرتے ہیں؟ یہ پوچھنا کیا ہے؟ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تمہید ذاکری مرتب کر رہا ہے۔ کہ آپؐ اس سے محبت فرماتے ہیں؟ فرماتے ہیں: خدا گواہ ہے کہ کتنی محبت کرتا ہوں! اب فرشتہ کہتا ہے: اچھا پھر یاد رکھئے کہ یہی وہ بچہ ہے جو آپؐ کے دین کی خاطر شہید ہوگا۔ مصائب کافی تفصیل سے ان سے بیان کر دیئے۔ اب جس وقت رسولؐ بیان ملک سے سن رہے تھے تو ملک ذاکر اور خود رسولؐ سامع۔ جب رسولؐ ام سلمہؓ سے بیان کر رہے ہیں تو اب رسولؐ ذاکر اور ام سلمہؓ اور خود حسینؑ سامعین ہیں۔

بس دو الفاظ میں حقیقت عرض کرتا ہوں کہ ہماری مجالس کے دو ہی کردار ہوتے ہیں، ایک کردار ذاکر کا ہوتا ہے، ایک کردار

سامعین کا ہوتا ہے۔ جو ذاکر کا کردار ہوتا ہے، وہ بھی عمل رسولؐ اور جو سامعین کا کردار ہوتا ہے، وہ بھی عمل رسولؐ۔ تو مجلس کا تو ہر جز و سنت ہے۔ بدعت کہاں قدم رکھے گی؟ اور بس یہیں سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ رسولؐ نے جب سنا تو وہ روئے تھے یا نہیں؟ رو رہے تھے نا اور آواز کے ساتھ رو رہے تھے۔

تو اب یاد رکھئے کہ اب گریہ بدعت نہیں ہے، نہ رونا بدعت ہے۔ رونا بدعت نہیں ہے اور یہ حدیث ایسی ہے کہ بڑی مشہور شخصیت ہے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ ایک دن سِرُّالشَّهادتین کا مضمون پڑھ چکا ہوں کہ حسینؑ کی شہادت رسولؐ کی شہادت ہے۔ ان کی دوسری کتاب ہے "فتاویٰ عزیزیہ"۔ وہ لوگوں کے سوالات ہیں اور ان کے جوابات، وہ بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ چھپی ہوئی موجود ہے "فتاویٰ عزیزیہ"۔ اس میں کسی نے کہا کہ آپ کا عمل روز عاشور کیا ہوتا ہے؟

انہوں نے لکھا ہے کہ جو میرا عمل ہے، وہ میں درج کرتا ہوں کہ عصر کے وقت میرے پاس میرے احباب، معتقدین، مخلص لوگ عاشور کے دن جمع ہوتے ہیں اور فقیر خود منبر پر جاتا ہے اور کچھ احادیث رسول فضائل حسینؑ میں اور کچھ احادیث جو شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق وارد ہوئی ہیں، جیسے حدیث ام سلمہؓ، تو یہ اتنے پائے کی حدیث ہے، اس کے بعد کچھ شہادت امامؑ کے حالات بیان کرتا ہوں۔ واقعہ کربلا کے حالات اور کچھ جو خواتین بنی ہاشم نے بعد واقعہ کربلا راتوں کو جنات کی مرثیہ کی آوازیں سنی ہیں وہ اشعار بھی درج ہیں۔ راتوں کو، آدمی آدمی پہر رات گزرے ہوئے مابین فضا و آسمان۔ مرثیے کے اشعار جو پڑھے جاتے تھے، وہ اشعار لوگوں نے درج کر دیئے ہیں۔ کتابوں میں درج ہیں۔ وہ بیان کرتا ہوں اور اس وقت مجھ فقیر پر بھی گریہ طاری ہوتا ہے اور جو حاضرین ہوتے ہیں، ان پر بھی گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

تو یہ جناب ام سلمہؓ کی روایت ہے۔ اس کے ساتھ صحیح ترمذی کی روایت ہے۔ بس اسی پر ختم کر دوں گا کہ جناب ام سلمہؓ نے یہ سنا حضرتؐ نے فرمایا کہ فرشتہ نے کہا کہ آپ وہ زمین دیکھنا چاہتے ہیں جہاں یہ واقعہ پیش آئے گا؟ میں کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کہ زیارت کربلا کی سنت قائم ہو رہی ہے۔ رسولؐ فرماتے ہیں: ہاں! دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو رسولؐ مشتاق زیارت ہوں، ہم نہ ہوں۔ یاد رکھئے کہ حالت گریہ میں جو دعا ہو، وہ امید ہے کہ مستجاب ہو۔ یاد رکھئے کہ جو رکاوٹیں زیارت کی راہ میں ہیں اور جو اشخاص حائل ہیں، خداوند عالم ان حالات میں انقلاب پیدا کرے۔

تو ملک نے اشارہ کیا، زمین کربلا سامنے نمودار ہوئی۔ اب مجلس تفصیل کے ساتھ ہو رہی ہے جیسے مجلس ہو رہی ہو زبانی اور پھر مرقع سامنے آ جائے تو اثر مجلس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب ملک تفصیل سے کہہ رہا ہے۔ دیکھئے! وہ جگہ ہے جہاں خیمے نصب ہوں گے۔ اب جو جو اس نے کہا، اپنے وقت میں کہا ہو، وہ جگہ ہے جہاں عباسؑ کے شانے قلم ہوں گے۔ وہ جگہ ہے جہاں علی اکبرؑ کے نیزہ لگے گا۔ جو جو کہا ہو، اس سب کی تفصیل مجھے کیا معلوم کہ کیا کیا اس نے کہا۔ ایسا تھا کہ رسولؐ پر اتنی دیر سے گریہ طاری تھا اور اب آپؐ نے فرمایا کہ ملک نے یہ کہا ہے کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر خاک کی مٹھی لی اور مجھے دی ہے کہ یہ خاک ہے اس زمین کی۔ جب یہ خاک خون ہو جائے تو سمجھے گا کہ آپ کا فرزند شہید ہو گیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مٹھی میں خاک تھی۔ وہ آپؐ نے جناب ام سلمہؓ کے سپرد فرمائی۔

یہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بتاتا تھا کہ تم اس وقت زندہ ہو گی۔ جناب ام سلمہؓ نے وہ خاک حفاظت سے شیشی میں رکھ دی۔

47

شہید کی جو موت ہے

قرآن مجید کی رو سے یہ زندہ اور مردہ وہ نہیں ہیں جو یہاں زندہ ہیں اور مردہ قبرستانوں میں ہیں بلکہ انہی افراد میں جو سامنے نظر آتے ہیں، کچھ زندہ ہیں اور کچھ مُردہ ہیں۔

یہ زندگی اور موت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تمام اشیائے کائنات میں یہ زندگی اور موت کارفرما ہے

غور فرمایئے یہ نرم اور ملائم کونپلیں اور زمین کا سخت جگر! ایسی ملائم کونپل جو قطرۂ شبنم کا بار برداشت نہ کرسکے، جو ہوا کی ذرا سی جنبش سے متاثر ہو جائے، اتنی سخت زمین میں اس نے شگاف ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک کونپل میں اللہ کی طاقت کارفرما ہو جائے تو وہ پتھر میں شگاف ڈال دے تو اگر کسی کامل و اکمل انسان کی انگلیوں میں اس کی طاقت کارفرما ہو جائے اور وہ لوہے کے در میں درآئیں تو حیرت کی کیا بات ہے!

اب ظلم کا معیار مجھ سے سنئے کہ ظلم کی بنیاد احساس اذیت پر نہیں ہے، ظلم کی بنیاد اقدام ناحق پر ہے یہ اقدام ناحق ذی شعور کے ساتھ ہوگا تو ظلم ہوگا اور غیر ذی شعور کے ساتھ ہوگا تو بھی ظلم ہوگا۔

شہید کی جو موت ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

ارشادِ الٰہی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی بارگاہ میں رزق پاتے ہیں۔

عام طور پر جسے سب زندگی سمجھتے ہیں، وہ اس جسم سے روح کے ظاہری تعلق کا قائم ہونا ہے اور موت اس تعلق کا قطع ہو جانا ہے اور چونکہ موت طبعاً ناپسند ہے اور زندگی پسندیدہ چیز ہے، اس لئے خطروں سے قدم پیچھے ہٹائے جاتے ہیں۔ جب جان جانے کا اندیشہ ہو تو خطرہ سے دامن بچانے کیلئے پیچھے ہٹ جایا جاتا ہے۔ مگر اسلام نے زندگی اور موت کے مفہوم کو بدل دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ جسے تم زندگی سمجھتے ہو، ضروری نہیں کہ وہ زندگی ہو اور جسے تم موت سمجھتے ہو، ضروری نہیں ہے کہ وہ موت ہو۔ بہت ممکن ہے کہ جسے تم زندگی سمجھتے ہو، وہ موت ہو اور جسے تم موت سمجھتے ہو، حقیقت میں وہ زندگی ہو۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں زندگی میں موت کے نقشے بھی نظر آتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہوئے انسان، ہنستے بولتے ہوئے انسان، سانس لیتے ہوئے انسان۔ مگر قرآن مجید انہیں زندہ تسلیم نہیں کرتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَ لَا الۡاَمۡوَاتُ۔

"جو مردہ ہیں اور جو زندہ ہیں، دونوں برابر نہیں ہیں"۔

یہ زندہ اور مردہ وہ نہیں ہیں جو زندہ یہاں ہیں اور مردہ قبرستانوں میں ہیں بلکہ انہی افراد میں جو سامنے نظر آتے ہیں، کچھ زندہ ہیں اور کچھ مردہ ہیں۔ ایک آیت ہے، ارشاد ہو رہا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ۔

"اے صاحبانِ ایمان! لبیک کہو اللہ اور رسول کی آواز پر جب وہ تمہیں دعوت دیں اس شے کیلئے جو تمہیں زندہ کر دے گی"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی مردہ ہیں۔ جب اس پیغام کو سنیں گے، سمجھیں گے تو زندہ ہو جائیں گے۔

اِنۡ ہُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا۔

مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ اس سے بدتر ہیں۔ چوپائے تو پھر بھی ایک طرح کی زندگی رکھتے ہیں، جیسا کہ لفظ حیوان سے ظاہر

ہے مگر سورۂ منافقون میں زندہ انسانوں کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے:

كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔

"یہ لکڑیاں ہیں جو ہوا میں لگا کر کھڑی کر دی گئی ہیں"۔

یہاں زندگی کا نام ونشان بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ زندگی جو حیات نباتی کہلاتی ہے، جو پودوں میں ہوتی ہے، وہ بھی نہیں ہے کیونکہ وہ زندگی شاخ میں اس وقت ہوتی ہے جب تک اصل سے متصل ہو۔ جب اصل سے جدا ہو گئی اور خشک لکڑی کی صورت میں وہ کھڑی کر دی گئی تو اس میں اس زندگی کا پتہ بھی نہیں ہے۔ یہ تو زندگی میں موت ہے۔

شہدائے راہ خدا، ان کی روح اور جسم میں تعلق کیسا؟ سر اور گردن میں بھی ارتباط نہ رہا مگر قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو۔ دوسرے پارے میں سورۂ بقرہ میں یہی الفاظ ہیں:

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، تمہیں شعور نہیں ہے"۔

یہاں جو الفاظ ہیں ان سے سطحی نظر رکھنے والا دھوکہ کھا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ مردہ نہ کہو تو اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ہیں تو مردہ مگر مردہ کہنا ادب کے خلاف ہے۔ یعنی جیسے تہذیب لفظی سکھائی جا رہی ہے۔ بہت سے الفاظ کے معنی درست ہوتے ہیں لیکن محاورہ کے لحاظ سے ان کا استعمال غلط ہوتا ہے۔ تمیز کے خلاف ہوتا ہے۔ جیسے کوئی چھوٹا بڑے کو یہ لکھ دے "سَلَّمَكَ اللّٰهُ"۔ معنی کے لحاظ سے درست ہے۔ کیا بڑوں کو سلامتی کی ضرورت نہیں ہے؟ لیکن کسی بڑے کو لکھ کر دیکھئے، ناراض ہو جائے گا کہ یہ صاحبزادے مجھ کو "سَلَّمَكَ اللّٰهُ" لکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معانی کے لحاظ سے درست ہے لیکن محاورہ کے لحاظ سے ان کی شانِ بزرگی کے خلاف ہے کہ ان کو "سَلَّمَكَ اللّٰهُ" لکھا جائے۔

کراچی میں ایک مجلس میں ایک صاحب مجھ سے بہت کم عمر تھے، انہوں نے مجھ سے کہا: اللہ عمر دراز کرے۔ اب الفاظ چاہے درست ہوں، بڑا چھوٹے کیلئے کہے گا کہ عمر دراز ہو۔ چھوٹا بڑے کیلئے یہ نہیں کہے گا۔ اسی طرح خیال آتا ہے کہ شاید یہی قرآن مجید نے سکھایا ہو ہم کو کہ شہدائے راہ خدا کو مردہ نہ کہو۔ حالانکہ اسی میں آخر میں ایک لفظ ہے جو اس غلط فہمی کو دور کرتا ہے کہ زندہ ہیں، تمہیں شعور نہیں ہے۔ تو شعور کا تعلق کسی حقیقت سے ہوتا ہے، لفظی تہذیب سے نہیں ہوتا۔ مگر جس آیت کو میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا رہا کہ انہیں مردہ نہ کہو بلکہ یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جو راہ خدا میں قتل ہو گئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو۔

یہ سمجھنا اور نہ سمجھنا الفاظ سے متعلق نہیں ہے۔ کتاب حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر حقیقت کو حقیقت سمجھنے کی دعوت دے۔ جب اس نے مردہ سمجھنے سے منع کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت میں وہ مردہ نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ زندگی کیا ہے اور یہ موت کیا چیز ہے؟ یہ زندگی اور موت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تمام اشیائے کائنات میں یہ زندگی اور موت کارفرما ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جمادات ہیں، اس کے

بعد نباتات ہیں، اس کے بعد حیوانات ہیں، اس کے بعد انسان ہے۔ زمین تو جمادات میں داخل ہے۔ مگر قرآن مجید میں دیکھئے تو زمین کی بھی دو حالتیں ہیں، ایک وہ حالت جب وہ مردہ ہے اور دوسری وہ حالت جبکہ وہ زندہ ہو گئی۔ ایک آیت میں نہیں، بہت سی آیتوں میں ایک ساتھ یہ الفاظ ہیں:

يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔

"اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے"۔

تو ایک وقت میں وہ عالم موت میں ہوتی ہے اور دوسرے وقت میں اللہ اس کو زندہ کرتا ہے تو اس کو حیات مل جاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ، وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔

بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْهِ رَحْمَتِهِ۔

"اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری دیتا ہوا وہ ہواؤں کو چلاتا ہے"۔

ہوائیں بادلوں کو لاتی ہیں۔ ان بادلوں کو ہم لے جاتے ہیں ایک زمین مردہ کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں تو وہ زمین نباتات کو روئیدہ کرتی ہے۔ دیکھو! یوں ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔

تو زمین ایک وقت میں مردہ۔ تو زمین مردہ کون؟ وہ بنجر زمین جس میں نباتات کے روئیدہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جس میں زراعت نہ ہو سکے۔ وہ زمین مردہ اور زمین زندہ کون؟ جس میں نشوونما پیدا ہو جائے۔ قوت نامیہ کارفرما ہو جائے۔ سادہ زبان میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ذرا دیکھئے یہ نشوونما کیا چیز ہے؟ یہ دانے اور بیج آپ کے ہاتھ میں رہتے تو جتنے تھے، اُتنے ہی رہتے۔ ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی صندوق میں رکھ دیتے، صندوق کو مقفل کر دیتے، صندوق کو کمرے میں رکھ دیتے۔ بہت سے قفل کمرے پر ڈال دیتے، پہرے لگا دیتے، یہ سب حفاظت کا سامان کرتے مگر جتنے تھے، اُتنے ہی رہتے۔ مگر یہی دانے اور بیج، زمین کی تھوڑی سی مٹی نکال کر اگر زمین کو تہوں میں ان کو چھپا دیا جائے اور پانی سے تر کر دیا جائے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جسے دنیا کے ہاتھ دباتے ہیں، اُسے اللہ اُبھارتا ہے۔ جسے دنیا خاک میں ملاتی ہے، اُسے اللہ پروان چڑھاتا ہے۔ تھوڑے ہی دن میں وہ بیج کونپلوں کی شکل میں زمین سے برآمد ہوتا ہے۔

غور فرمایئے، یہ نرم و ملائم کونپلیں اور زمین کا سخت جگر۔ ایسی ملائم کونپل جو قطرۂ شبنم کا بار برداشت نہ کر سکے، جو ہوا کی ذرا سی جنبش سے متاثر ہو جائے۔ اتنی سخت زمین میں اس نے شگاف ڈال دیا۔ تو یہ زبانِ بے زبانی میں جواب دے گی۔ اگر میرے سامعہ فہم میں طاقت ہو تو میں سنوں کہ وہ یہ کہے گی کہ یہ میری ذاتی طاقت نہیں ہے۔ یہ کسی اور طرف کی طاقت ہے جس سے میں نے یہ شگاف ڈال دیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک کونپل میں اللہ کی طاقت کارفرما ہو جائے تو وہ پتھر میں شگاف ڈال دے تو اگر کسی کامل و اکمل و مکمل

انسان کی انگلیوں میں اس کی طاقت کارفرما ہو جائے اور وہ لوہے کے در میں در آئیں تو حیرت کی کیا بات ہے؟

غرض وہ دانے اور بیج تھوڑے عرصہ میں اتنے بڑھے کہ ممکن ہے کہ ایسا سایہ دار درخت ہو گیا کہ قافلے اس کے سائے میں پناہ لیں۔ ممکن ہے ایسی وافر زراعت ہو جائے جو پورے خاندان کی پرورش کر سکے۔ تو سب سے پہلے قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اجزاء کہاں سے آئے؟ کہاں یہ اتنی پھیلی ہوئی زراعت اور کہاں وہ بیج! دوسری بات یہ کہ جب ہم نے وہ دانے اور بیج زمین میں ڈالے تھے تو زمین خاک کے ذروں سے پٹی ہوئی تھی۔ اس دانے اور بیج کی خاطر کچھ مٹی ہمیں نکالنا پڑی، تب اس کی جگہ ہوئی۔ تو بعد میں اس کو گنجائش کیونکر ملی؟ یہ جگہ کیونکر ملی کہ اندر ہی اندر اتنے پاؤں پھیلا لیے۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام اجزاء الگ سے نہیں آئے ہیں۔ زمین ہی میں قدرت نے کچھ ایسے اجزاء ودیعت کیے ہیں جو اپنے سے مافوق یعنی نباتات کے کام آنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زمین امانت داری کے ساتھ خدا کے ودیعت کیے ہوئے ان ذرات کو محفوظ رکھتی ہے، ایک حقدار کے آنے کے انتظار میں۔ جب وہ حقدار آجاتا ہے تو زمین اللہ کی ودیعت کی ہوئی اس امانت کو، ان اجزاء کو پیش کر دیتی ہے اپنے سے بالاتر مخلوق کیلئے۔ بنیادی اجزاء وہی ہیں۔ پھر مجھ کو معلوم ہے کہ کچھ فیض آفتاب سے کچھ فیض ہوا، کچھ فیض آب سے اور ذرات آ آ کر شریک ہوتے جاتے ہیں۔ مگر بنیادی اجزاء وہی ہیں جو خود زمین پیش کرتی ہے اس پودے کیلئے۔

اب ہر صاحب فہم غور کرے کہ یہ زمین کے اجزاء جو اس پودے میں شامل ہو گئے، یہ اپنی حدود وجود میں فنا ہوئے۔ یعنی اب وہ خاک میں نہیں رہے۔ اب وہ مٹی میں نہیں رہے۔ جو ان کے وجود کا ذریعہ تھا، اس کے لحاظ سے وہ فنا ہو گئے۔ لیکن یہ فنا بلندتر بقا کا ذریعہ بنی۔ پہلے وہ خالی زمین تھی، اب جو ذرات خاک کے اس نبات کی ہستی میں شامل ہو گئے تو اب رزق میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اب جو اس پودے کی غذا ہوگی، وہ اس تک آپ پہنچائے گا۔

تو معلوم ہوا کہ یہ فنا تمہید بقا بن گئی اور بقا فقط بقا نہیں بلکہ بلندتر بقا۔ یعنی جب تک فنا نہیں ہوئے تھے، تب تک وہ جمادات میں داخل تھے اور جب فنا ہو گئے اس بلندتر کی خاطر تو انہوں نے ایک نوع کی سرحد کو طے کر کے دوسری نوع میں قدم رکھ دیا۔ یعنی اب وہ نباتات میں داخل ہو گئے۔ جمادات کی منزل سے آگے بڑھ گئے۔ اب یہ درخت کے پتے، یہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے تو کیا یہ باقی رہیں گی؟ نہیں، تمازت آفتاب سے خشک ہو جائیں گی اور اگر ان صورتوں سے ختم ہو گئیں تو ہو گئیں لیکن اگر یہ کسی ذی روح کی غذا بن گئیں، کسی حیوان یا انسان کے کام آگئیں تو فنا تو اب بھی ہوئیں لیکن یہ فنا بلندتر بقا کا ذریعہ بنی۔ یعنی وہ ایک حیوان کے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگیں۔

معلوم ہوا کہ جب اپنے بالاتر کیلئے فنا ہو تو وہ فنا اپنے سے ترقی یافتہ بقا کی شکل حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک تو عقلائے زمانہ متفق ہیں۔ زمین نباتات کے کام آئے تو کسی کو اعتراض نہیں، نباتات حیوان کے کام آئیں تو کسی کو اعتراض نہیں۔ اب ہے حیوان اور انسان کی منزل۔ یہاں بعض رحم دل جماعتوں کو رحم آتا ہے کہ حیوان کی قربانی انسان کیلئے کیوں ہو؟ یعنی زمین نباتات کے کام آئی، کسی کو رحم نہ آیا۔ نباتات حیوانات کے کام آئے تو کسی کو رحم نہ آیا۔ اب یہ حیوان کی قربانی انسان کی خاطر ہو رہی ہے تو اب رحم آنے لگا کہ اس کی

یہاں زیادہ ضرورت نہیں ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ جذبہ ترحم قابل قدر ہے، بحیثیت جذبہ کے رحم یقینا قابل قدر چیز ہے بشرطیکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو جانور کی جان نہ لینا چاہے گا، وہ بھلا انسان کی جان کیوں لینا چاہے گا! بلاشبہ جذبہ ترحم قابل قدر ہے لیکن اصول جذبات کے پابند نہیں ہوتے۔ اصولاً میرا سوال یہ ہے کہ زمین نباتات کے کام آئی تو ظلم نہ ہوا اور نباتات حیوان کے کام آئے اور انسان کے کام آئے تو ظلم نہ ہوا۔ حیوان انسان کے کام

آجائے گا تو ظلم ہو جائے گا، کیوں؟ وہ سب کیوں ظلم نہیں ہے اور یہ کیوں ظلم ہے؟ اس کا جو جواب ملے گا، وہ مجھے معلوم ہے کہ پتھروں اور زمین میں اذیت کا احساس نہیں ہے، انہیں درد اور دکھ سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ ظلم نہیں ہے اور نباتات کو تکلیف اور درد کا شعور نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ظلم نہیں ہے اور یہ حیوان بلبلاتا ہے، تڑپتا ہے، بے چین ہوتا ہے، لہٰذا یہ ظلم ہے۔

تو پہلے میں اصولاً یہ دریافت کروں گا کہ کیا ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت پر ہے؟ ایک اصولی سوال ہے کہ کیا ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت اور شعورِ تکلیف پر ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی ڈاکٹر ہوش وحواس کے عالم میں آپریشن کر دے تو ظلم ہوگا اور کوئی قاتل بیہوش کر کے قتل کر دے تو ظلم نہیں ہوگا۔ تو دنیا کے قانونِ تعزیرات میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر قاتل ہوش وحواس کی حالت میں کسی کو قتل کرے تو ظلم ہے اور قابل سزا جرم ہے لیکن اگر کسی کو غشی کی حالت میں بیہوش کر کے قتل کر دے تو ظلم نہ ہوگا، جرم نہ ہوگا۔ جب ظلم نہیں تو جرم کیوں؟ لیکن دنیا کے قانونِ تعزیرات میں یہ شرط نہیں ہے۔ ہاں! مجھے معلوم ہے کہ ہوش وحواس کی ضرورت ہے جرم کیلئے مگر قاتل کے ہوش وحواس کی ضرورت ہے، مقتول کے ہوش وحواس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ سہی زمین کو احساسِ اذیت، نہ سہی نباتات کو شعورِ اذیت، آپ کو تو شعور ہے، آپ کو کیا حق ہے کہ پھولوں کو جلاوطن کیجئے؟ آپ کیا حق ہے کہ شاخوں کو قلم کیجئے؟ آپ کو کیا حق ہے کہ زمین کے سینے پر ہل چلایئے؟ آپ کو کیا حق ہے کہ اس کے اجزائے وجود کو منتشر اور تہہ وبالا کیجئے؟ اُسے اذیت کا احساس نہ ہو، آپ کو تو ہے۔ آپ کیوں ایسا کرتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ کسی وقت میں یہ کہا جاتا تھا کہ پودوں میں احساسِ اذیت نہیں ہے، تو قابل قبول تھا۔ جب ہمارے ہندوستان کے سائنس دان نے یہ انکشاف کر دیا کہ پودوں میں احساسِ اذیت ہے، احساسِ تکلیف ہے، پودوں سے بھی رونے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ہاں! ہنسنے کی آواز کسی نے کبھی نہیں سنی، رونے کی آواز پودوں سے بھی سنائی دی اور پودے کو سانس لیتے ہوئے تو میں نے خود ایک نمائش میں دیکھا۔ اب جب ان سے ثابت ہو گیا کہ احساسِ اذیت ہے تو جب تک تو اطلاع نہیں تھی، تب تک تو خیر، مگر اس کے بعد سے تو نباتات سے بھی غذا حاصل کرنا موقوف ہونا چاہئے۔ اب معلوم ہو گیا کہ انہیں بھی اذیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جیسی نمایاں اذیت حیوان کو ہوتی ہے، ویسی تو نباتات کو نہیں ہوتی۔ تو جب معلوم ہو گیا کہ ہوتی ہے تو چاہے نمایاں ہو، چاہے غیر نمایاں، اصولاً بات ایک ہی ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک کوئی یہ کہہ لیتا کہ ہمارا اصول ہے کہ کسی ذی روح کو

صدمہ نہ پہنچائیں۔ خوردبین ایجاد ہوئی تو پتہ چل گیا کہ ایک پانی کے قطرے میں کتنے ذی روح ہیں جو ہم پی لیتے ہیں تو اس کے نظامِ حیات میں خلل پڑتا ہے۔ ایک سانس جو ہم لیتے ہیں، اس سے فضائے ہوا میں جو ذی روح مخلوق ہے، وہ کس قدر ہمارے ایک سانس کا شکار ہو جاتی ہے۔ تو اس کے بعد تو اپنی زندگی تج دینا پڑے گی یا میرے ساتھ مل کر اس اصول کا قائل ہونا پڑے گا کہ اس نظامِ کائنات کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہر ناقص کامل کے کام آئے اور یہ ناقص کی فنا نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کے مقصدِ وجود کی تکمیل ہے۔

اب ظلم کا معیار مجھ سے سنئے کہ ظلم کی بنیاد احساسِ اذیت پر نہیں ہے، ظلم کی بنیاد اقدامِ ناحق پر ہے۔ یہ اقدامِ ناحق ذی شعور کے ساتھ ہو گا تو ظلم ہو گا اور غیر ذی شعور کے ساتھ ہو گا تو بھی ظلم ہو گا۔ اب دنیا کو یہ حقیقت خود معلوم نہ ہو تو ہمارے بتانے سے معلوم ہو جانی چاہئے کہ ہمارے نزدیک وہ حیوات ذلیل ہیں جو انسان کی غذا نہیں بنتے اور وہ حیوان عزت دار ہیں، شریف ہیں، اپنی نوع میں، جو انسان کے کام آتے ہیں۔ یہ تفریق آخر کیوں ہے؟ طبِ یونانی میں اور روزمرہ کی زندگی میں کہ ہر زمین اس لائق نہیں ہوتی کہ اس میں نباتات روئیدہ ہو سکیں۔ کچھ شورہ دار زمینیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں بیج ڈال دیئے جائیں تو جل کر خاک ہو جائیں۔ ہر پودا اس لائق نہیں کہ اس سے حیوان کا تغذیہ ہو۔ بعض پودے ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر حیوان اور انسان کھا لے تو زندہ نہ رہ سکے۔ وہ کسی اور حیثیت سے انسان کے کام آئیں، دوا وغیرہ میں، یہ اور بات ہے۔ خدا نے بیکار پیدا نہیں کئے ہیں۔

اسی طرح ہر حیوان کو نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ ضرور انسان کی غذا بن سکتا ہے۔ انسان کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، ان سب میں جسمانی پہلو ہے۔ لہٰذا ان میں سے کون مفید ہے، کون مضر، یہ تجربہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ حیوانات کچھ زہریلے ہیں کہ انسان کی زندگی کیلئے مضر ہیں لیکن انسان میں ایک مزاج روحانی بھی ہے۔ روحانی حیثیت سے کون اس کیلئے مفید ہے اور کون مضر، اسے یہ جسمانی اطباء و حکیم اور ڈاکٹر نہیں بتا سکتے۔ جنہوں نے روح ہی کو نہ سمجھا ہو، وہ مزاج روح کو کیا سمجھیں گے؟ لہٰذا اس کیلئے طبِ روحانی کی ضرورت ہے۔ جس کا نام شریعت ہے۔ اس شریعت نے بتایا ہے کہ کون حیوان اس کے مزاج اخلاقی کیلئے سازگار ہیں، کون حیوان اس کے مزاج روحانی کیلئے مناسب ہیں، کون نامناسب۔ اس لئے حیوانوں میں تفریق ہو گئی، کچھ حرام جانور ہوئے، کچھ حلال جانور۔ اس کو فقہ کی زبان میں کہتے ہیں کچھ ماکول اللحم ہوئے، کچھ غیر ماکول اللحم ہوئے۔ اس کے بعد وہی دوا اور کیفیتِ استعمال کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ بادام مسلّم کھایا جائے تو اور اثر اور اگر پیس کر کھایا جائے تو اور اثر۔ جتنا باریک پیسا جائے، اُتنا زیادہ مقوی، کوئی جز گھٹا بڑھا نہیں، وہی ایک چیز ہے، کیفیتِ استعمال کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے۔ اس طرح کوئی تعجب نہ کیجئے کہ حیوان جو ذاتی طور پر حلال لیکن ایک خاص طرح سے اس کے رگ ہائے گردن قطع ہوں، تب وہ حلال رہے گا اور اگر کسی اور طرح چوٹ کھا کر مر جائے تو زندگی میں حلال تھا مگر اب وہ حرام ہو گیا۔ یعنی کیفیت کے بدلنے سے اثر بدل گیا۔

ایک تجربہ مجھے ہندوستان میں ہوا۔ کانپور چمڑے کے کاروبار کا مرکز ہے۔ وہاں چمڑے کا کاروبار کرنے والوں نے ایک بات مجھے بتائی کہ ہم تو چمڑے کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ذبح کا ہے یا نہیں۔ اب ہر صاحبِ فہم غور کرے کہ خون کا تعلق کھال سے اتنا نہیں ہے جتنا گوشت سے ہے۔ جب ذبح کرنے سے کھال کی کیفیت میں فرق آ جاتا ہو تو گوشت کی خاصیت میں فرق ہو جائے تو حیرت کی کیا بات

ہے۔ تو جو روح سے واقف تھے، انہوں نے بتایا کہ اس طرح سے ذبح ہو تو حلال ہو گا اور اس طرح سے ذبح ہو تو پھر حرام ہو گا۔ اب اگر وہ ذاتی طور پر بڑا معزز حیوان تھا لیکن چونکہ اس کی موت اس طرح سے نہیں ہوئی کہ وہ اپنے سے مافوق یعنی انسان کے کام آسکے تو اب وہ ذلیل ہو گیا، پھینکنے کے اہل ہو گیا۔

اب ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر دوں کہ اگر وہ اس طرح گیا کہ غذائے انسان بن سکے تو وہ میت نہیں ہے، اس کا نام ہے ذبیحہ۔ موت سے تو میتہ کا لفظ ہے مگر میتہ کہنا اس کو غلط۔ میتہ وہی جس کی خرید و فروخت ناجائز ہو۔ اس کا نام ہے ذبیحہ اور فقط نام کا فرق نہیں ہے، احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر ذبیحہ ہے تو طاہر ہے اور حلال۔ اگر میتہ ہے تو جونہی جسم سرد ہوا، نجس ہو گیا۔ چاہے کتنا ہی صاحب اوصاف انسان ہو۔ زندگی میں تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہوں لیکن جونہی جسم سرد ہوا، نجس ہو گیا اور فقہ جعفریہ کی رُو سے اور نجاستوں سے بڑی نجاست۔ کسی دوسری نجاست کو اگر چھو لیجئے تو صرف ہاتھ پاک کرنا ہو گا۔ وہ بھی تری کی صورت میں، لیکن میتہ کو اگر چھو لیں تو تری کی شرط نہیں ہے، ہاتھ بھی خشک ہے، جسم بھی خشک ہے لیکن پھر بھی وہی حکم اور فقط ہاتھ کا پاک کرنا نہیں بلکہ غسل واجب ہو گا۔

یہ شرفِ انسانی کا رخنہ ہے کہ وہاں بھی نجاست تھی اور یہاں سخت تر نجاست آئی۔ لیکن اس نجاست کے دفع کرنے کی کوئی ترکیب نہیں تھی لیکن یہاں پر قربۃً الی اللہ ایک عبادت کر دو یعنی غسل دے دو۔ دس دفعہ سمندر میں غوطے دے دیجئے تو پاک نہیں ہو گا، جب تک قربۃً الی اللہ کی نیت نہ ہو۔ نہلانا نہیں ہے، غسل دینا ہے۔ وہ نہلانا جو قربۃً الی اللہ ہو اور اسی ترکیب سے ہو جو اُدھر سے مقرر ہوئی ہے، اس طرح سے ہو تو پھر پاک ہو گا۔ پس یہ غسل اس نجاست کو دفع کرتا ہے جو موت کی وجہ سے آئی ہو۔ لیکن اگر شہید ہے تو غسل کی ضرورت نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دم نکلنے کے ساتھ نجاست نے قدم ہی نہیں رکھا۔ جیسے وہ زندگی میں طاہر تھا، ویسے ہی روح نکلنے کے بعد طاہر رہا اور اتنا ہی نہیں کہ غسل ضروری نہیں، کفن بھی ضروری نہیں۔ اسی لباس میں اُسے دفن کر دو بلکہ لباس سے اس خون کے چھڑانے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو میدانِ جنگ میں بہا تھا کیونکہ یہ خونِ شہیدانِ راہِ خدا کی زینت ہے۔

اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جن کے سامنے راہِ خدا میں موت کا یہ انجام ہو، کیا وہ موت سے ڈریں گے؟ اسی کا نتیجہ یہ کہ جوانی کا زمانہ، تئیس (۲۳) سال کی عمر۔ یہ عنفوانِ شباب کہلاتا ہے۔ جب زندگی بہت مرادوں والی ہوتی ہے۔ دل تمناؤں کا مرکز ہوتا ہے۔ مگر اس ۲۳ برس کی عمر میں پیغام ملتا ہے کہ بستر پر سو رہو، نیزوں کے حصار میں اور تلواروں کے محاصرہ میں، تو فوراً سجدۂ شکر ادا کیا جاتا ہے یعنی وہ موت جیسے حاصلِ حیات ہو۔ تو جو اس موت کو موت سمجھے گا، وہ رنجیدہ ہو گا اور جو اس موت کی حقیقت سے واقف ہے کہ یہ موت بلند تر زندگی ہے تو وہ تو اسے اپنے لئے ایک نعمت سمجھتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو صحیح سلامت اٹھنے پر سجدۂ شکر کرتا مگر انہوں نے بڑے بڑے معرکوں سے واپس آنے پر بھی سجدۂ شکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس زندگی کو اصل زندگی سمجھتے ہی نہ تھے۔ اصل زندگی وہی تھی جو مقصدِ زندگی بن سکے۔

یہ زندگی ذریعہ ہے اُس زندگی کا۔ تو جو اُس زندگی کو اصل زندگی سمجھتا ہو، وہ بھلا اس زندگی کی بقا پر کیوں سجدۂ شکر کرے گا! پیغمبرِ خدا نے ماہِ رمضان کی آمد کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا:

"قَدْ اَقْبَلَ اِلَيْكُمْ شَهْرُ اللهِ بِبَرَكَتِهِ وَرَحْمَتِهِ وَمَغْفِرَتِهِ".

"تمہاری طرف اللہ کا مہینہ آرہا ہے، رحمت کے ساتھ، مغفرت کے ساتھ، مرضیِ الٰہی کے ساتھ"۔

آپ نے ماہِ رمضان کے بارے میں سنا ہوگا:

"شَهْرٌ هُوَ عِنْدَ اللهِ اَفْضَلُ الشُّهُوْرِ".

"وہ مہینہ جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے"۔

تو اسی طرح بہت سے فضائل ماہِ رمضان کے بارے میں بیان کئے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی خطبہ میں موجود تھے۔ انہوں نے ایک سوال کیا تو رسول نے اس کا جواب دیا۔ اس سوال و جواب کی وجہ سے رسولِ خدا حضرت علی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو فرمایا:

"كَيْفَ صَبْرُكَ يَا عَلِيُّ".

یا علی! تمہارے صبر کا عالم کیا ہوگا، جب اس مہینے میں تمہارے سر کو زخمی کر کے تمہاری ریش کو خضاب کیا جائے گا؟

یہ متفق علیہ ہے، آپ نے قاتل کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "اَشْقَى الْاُمَّةِ"، اُمت میں سے شقی ترین انسان اٹھے گا اور تمہارے سر کو زخمی کر کے خون سے خضاب کر دے گا۔ رسول نے گویا آزمائشی سوال کیا تھا کہ تمہارا صبر کیسا ہوگا؟ علی جواب نہیں دیتے بلکہ ایک سوال کرتے ہیں:

"اِذَالِكَ فِيْ سَلَامَةٍ مِنْ دِيْنِيْ".

کیوں یا رسول اللہ! یہ میرے دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا نا؟

اب ہمیں محسوس کرنا چاہئے سلامتیِ دین کی نزاکت کہ علی پوچھ رہے ہیں "اذالک"۔ یہ اصول کا اعلان ہے کہ ہر موت پسندیدہ نہیں ہے۔ جو موت محبوب ہے، اس کا معیار ظاہر کرتا ہے کہ "اذالک فی سلامۃ من دینی"۔ یہ میرے دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا نا؟ اور رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں ہاں یا علی! اس میں کیا شک؟ دین کی سلامتی کے عالم میں ہوگا۔

تو اب علی علیہ السلام جواب دیتے ہیں۔ سوال یہی تھا کہ صبر کیسا ہوگا؟ علی جواب دیتے ہیں:

"اَذَلَيْسَ هُوَ مِنْ مَوَاقِعِ الصَّبْرِ بَلْ هُوَ مِنْ مَوَاقِعِ الشُّكْرِ".

پھر وہ وقت صبر کا نہیں ہوگا بلکہ وہ وقت شکر کا ہوگا۔

دیکھئے! جب قاتل کی تلوار لگی تو

"فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ".

شکر کا انداز ہے، قسم کے ساتھ کہا: پروردگارِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوا۔

48

شہید کی جو موت ہے

یہ شعراء حضرات نے قاتل اور مقتول کو بڑے بڑے انداز سے نظم کیا ہے۔ میری غیر شاعرانہ زبان یہ ہے کہ کسی جمالِ فانی کی خاطر جان دی۔ میں کہتا ہوں کہ جب مرکز قربانی فانی ہے تو فانی سے بقاء کیا ملے گی؟ یہ تو فنا در فنا ہو گی۔ بلندی تو جب ہے جب فنافی البقاء ہو۔

یہ دیکھو کہ مرضی الٰہی میں جان اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اہمیت یہ مقصد رکھتا ہے۔ تب وہ قدم اختیار سے منزل قربانی کی طرف جاتا ہے۔ پھر وہ کارنامہ ہوتا ہے۔ کارنامہ بھی زندۂ جاوید اور انسان بھی زندۂ جاوید۔

دنیا کے ہر متمدن قانون میں خودکشی جرم ہے لیکن دنیا کی کوئی عدالت خودکشی کی سزا نہیں دے سکتی۔ لیکن صرف خدائے حکیم کی عدالت ایسی ہے جو اس جرم کے بارے میں بھی بازپرس کرے گی۔

لق و دق صحرا ہو، ریگستان کا سفر ہو، جواہرات کا ذخیرہ پاس موجود ہو، پیاس کا غلبہ ہو، جب ایک مشکیزہ پانی کے بدلے جواہرات کا ذخیرہ مانگا جائے، تب میں سمجھوں گا کہ موتیوں کی قیمت زیادہ ہے یا پانی کی قیمت زیادہ ہے نظام فطرت اس پر ہے کہ جو شے بیکار ہے، نظام حیات میں وکمیاب و نایاب ہے۔ ہوا اور پانی آپ کیلئے اس لئے بے قیمت ہو گئے کہ خالق نے زیادہ پیدا کر دیئے۔

شہید کی جو موت ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

''جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں''۔

جمادات، نباتات، حیوانات، سب میں یہ اصول کارفرما ہے کہ اپنے بالاتر کی خاطر زندہ کا خاتمہ ہو تو فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک بلند تر بقا حاصل ہوتی ہے۔ جمادات نباتات کے کام آتے ہیں۔ نباتات حیوانات کے کام آتے ہیں۔ حیوانات انسان کے کام آتے ہیں۔ اب انسان اگر قربانی پیش کرے گا تو اس کیلئے جو اس سے بالاتر ہو، اس سے اونچا ہو۔ لیکن اہل دنیا جس جس چیز کی خاطر جان دیتے ہیں، وہ سب انسان سے پست ہیں۔ تو جو انسان سے پست تر چیز کیلئے قربانی دے رہا ہے، اسے بقا کیونکر مل سکتی ہے؟ اس کے مرتبہ میں بلندی کہاں آسکتی ہے۔

ذرا دیکھئے! عام انسان کن کن چیزوں کی خاطر جان دیتے ہیں۔ کتنے ہیں جو دولت کی خاطر جان دیتے ہیں۔ تو دولت کیا چیز ہے؟ انسان سے تین درجہ پست۔ یعنی انسان کے نیچے حیوانات، حیوانات کے نیچے نباتات، نباتات کے نیچے جمادات اور دولت کی جتنی اقسام ہیں، وہ سب جمادات میں داخل ہیں۔ اصل دولت تو حضور سونا ہے۔ اسے اس وقت کے لوگ بھی جانتے تھے جب معاشیات نے فن کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اصل دولت کو کہتے ہیں اصل زر اور زر کے معنی سونا ہیں۔ آپ کے ہاں محاورہ ہے کہ یہ بات حروف زریں سے لکھنے کے قابل ہے۔ حروف زریں کون؟ یعنی سونے کے حروف سے۔ زر کے معنی سونا اور اصل دولت اصل زر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات پرانے زمانہ کے لوگ جانتے تھے کہ اصل دولت سونا ہے۔ موجودہ دور میں بھی اصول معاشیات میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے۔ کاغذ کا اطلاق تو سونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کاغذ چل رہا ہے اور سونے کا ذخیرہ موجود نہیں ہے تو اس حکومت کا کوئی معاشی بھرم نہیں ہے۔۔۔۔۔لیا ہے۔

نظام تخلیق الٰہی یہ ہے کہ جتنی زیادہ کوئی چیز حیات کیلئے ضروری ہے، وہ اتنی ہی زیادہ پیدا کی گئی ہے اور جو چیزیں روزمرہ کام میں آنے والی نہیں ہیں، انہیں ذرا دور رس اور کمیاب بنا دیا ہے۔ مثلاً سب سے زیادہ زندگی کیلئے ہوا ضروری ہے تو ہوا ہر جگہ موجود ہے۔ آپ ہوا سے بھاگیں گے بھی تو ہوا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے اور چونکہ زندگی اس پر موقوف ہے، لہٰذا ہوا کو محتاج ذرائع بھی نہیں بنایا۔

ہوا کو حاصل کرنے کیلئے نہ ڈول کی ضرورت، نہ رسی کی، سانس کی آمد وشد۔ یہی صالح ہوا کے جذب کرنے کیلئے، یہی فاسد ہوا کے اخراج کیلئے۔ ضرورت کو جزو حیات بنا دیا۔

دوسرے درجہ پر پانی ہے جتنی دیر ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اتنی دیر پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ تو پانی کو مقدار میں دوسرے ہی درجہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ ہر جگہ موجود لیکن زمین کی تہوں کے نیچے کہیں قریب ہے کہیں دور ہے اور پھر ذرائع کا محتاج۔ پانی کے لئے مشہور ہے کہ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔ یہ خدائے حکیم کا عمل ہے کہ زندگی قائم رہے مگر بیکاری کی عادت نہ پڑے۔ جس کے بغیر زندگی وفا نہیں کر سکتی، اس کو کوشش کا محتاج قرار نہیں دیا اور وہ ہوا ہے۔ جس چیز کے بغیر زندگی وفا کر سکتی ہے، سعی وعمل کے سبب، وہ بغیر انسانی کارگزاری اور سعی وعمل کے حاصل نہیں ہوگی۔ جب انسان اس کیلئے کوشش کرے گا، تب وہ نتیجہ اس کیلئے حاصل ہوگا۔ لہٰذا اس کیلئے ذرائع قرار دیئے۔ لیکن وہ اتنے طویل المیعاد نہیں ہیں۔

تیسرے نمبر پر غذا ہے، وہ طویل المیعاد کوششوں سے وابستہ کی گئی ہے۔ زراعت کرو، بوؤ، جوتو، محنت کرو، اس کے بعد غذا حاصل ہوگی۔ پس! اسے محتاج ذرائع بنایا۔ یہ ہماری ضرورتوں کا لحاظ وہ کر رہا ہے جسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو عام نظام حیات کے لحاظ سے اس نے بیکار جانا تھا، ان کو سمندر کی تہوں میں چھپا دیا۔ پہاڑوں کے جگر کے اندر پوشیدہ کر دیا۔ انسانوں نے کوہ کنی کی، غوطہ زنی کی، سونا اور موتی حاصل کئے، خالق نے اپنے لئے تو کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی، سوائے انسان کے کہ ساری چیزیں انسانوں کیلئے اور انسان اس کیلئے۔

اس بناء پر تم جا کر جتنے موتی نکالو، پہاڑوں سے کھود کر جتنے ذخیرے برآمد کرو، تو وہ سب تمہارے۔ تمہارے دامن میں جتنی گنجائش ہو، کوئی دنیا کا ملک کہتا ہے وہ میرے۔ اللہ کہتا ہے کہ جو جا کر لائے، اس کے۔ جو محنت کرے، اس کے۔ جتنا سونا چاندی پہاڑوں میں سے نکال لو، جو نکال کر لائے، اس کا۔ بس شرط یہ ہے کہ سرکاری حق یعنی خمس ادا کر دے تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ باغی سلطنت الٰہی نہیں ہے۔

اسی سے اس بحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اشتراکیت اور اسلام یا کمیونزم اور اسلام۔ ایک بہت بڑا سوال جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ دولت منداور غریب کا فرق کیونکر پیدا ہوا؟؟ ضرور کچھ لوگوں نے دوسروں سے چھین کر قبضہ کیا، لہٰذا وہ دولت مند ہو گئے اور کچھ لوگ بیچارے تھے، انہوں نے قبضہ نہیں کیا یا ان کی دولت کو دوسروں نے چھین لیا، لہٰذا وہ غریب ہو گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس فرق کی بنیاد غصب پر قائم ہے، لہٰذا دولت مندوں سے چھین لو اور غریبوں میں تقسیم کر دو کیونکہ شروع میں نہ کوئی امیر تھا، نہ کوئی غریب تھا سبھی برابر تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس فرق کا کوئی جائز سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا کہ ایک لکھ پتی ہے اور دوسرا مفلوک الحال ہے اگر اسلام اس کا جائز ابتدائی سبب بتا دے تو یہ سوال ختم ہو جائے گا۔ جب ایک جائز ذریعہ موجود ہو تو یہ فرض کرنا کہ ضرور غصب کیا گیا ہوگا، یہ پوری نوع انسانی کے ساتھ بدگمانی ہے۔

حضور والا! اسلام میں جائز ذریعہ یہ ہے کہ جتنا جا کر لے آئے گا، وہ اس کا۔ فرض کیجئے کہ جنگل ہیں، میدان ہیں، ابھی کسی کی ملکیت نہیں، جتنا کوئی جا کر اپنے قبضہ میں لا کر تصرف کرے گا، وہ اس کا ہو جائے گا۔ جو جتنے موتی لے آئے گا، وہ اس کے ہو جائیں گے۔ جو محنت کر کے برآمد کرے گا، جتنا سونا چاندی لے آئے گا، وہ اس کا ہو جائے گا۔ یہ اصل مالک نے اعلان کر دیا۔ اب اس کے بعد کچھ تھے کام چور، کچھ تھے محنت سے گھبرانے والے۔ انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ یہ دیکھتے رہے کہ کون یہ سب محنت کرتا ہے؟ پھر کسی صورت سے ان سے حاصل کرلیں گے۔ کچھ محنت سے نہ گھبرانے والے تھے، انہوں نے کوشش کی۔ اب یہ دوسرا گروہ جو ہے، اس نے دیکھا کہ یہ اتنا لے آئے ہیں، اب ان کو ضرورت ہوگی کام کاج کی، ہم جا کر مزدوری کرلیں اور اپنا پیٹ پال لیں۔ اس طرح سرمایہ دار اور مزدور کا فرق بغیر غصب کے پیدا ہو گیا۔ یعنی ان کی بلند ہمتی اور ان کی پست نگاہی سے۔ ان کی جدوجہد اور ان کی کاہلی سے۔ محنتی لوگوں کی نسلیں بھی محنت کرتی رہیں۔ مزدوروں کی اولاد بھی مزدوری پر قناعت کرتی رہی۔ لہٰذا فرق بڑھتا گیا۔

تو جب ایک معقول ذریعہ موجود ہے تو آپ یہ کیوں فرض کرتے ہیں کہ یہ تمام دولت مند غاصب ہیں؟ آپ اس قافلے میں بہت مدت کے بعد شامل ہوئے ہیں۔ ماضی کی جدوجہد کا آپ کو پتہ نہیں ہے۔ حال کو آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک دولت مند ہے اور ایک غریب ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ انصاف کے خلاف ہے۔ برابر سے تقسیم کر دیں۔ مثال لیجئے کہ ایک درس گاہ میں دو طالب علم ایک ہی عمر کے داخل ہوئے، ایک ہی تاریخ کو۔ ایک محنتی تھا۔ وہ کسی سال فیل نہیں ہوا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ ایک تھا کام چور۔ اس نے ایک ایک درجہ کئی کئی برس میں طے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہنچ گیا وہاں، یہ رہ گیا یہاں۔ یہ چھٹے ساتویں درجہ میں رہ گیا، وہ ایم اے میں پہنچ گیا۔ اب کوئی انسپکٹر صاحب آئے۔ انہوں نے دونوں طالب علم دیکھے۔ ایک ہی قد و قامت کے، ایک ہی عمر کے۔ دونوں کے درجے پوچھے۔ انہوں نے پوچھا کب داخل ہوئے تھے؟ دونوں نے تاریخ بتائی۔ منتظمین سے تصدیق کیلئے رجسٹر منگوایا۔ واقعی دونوں ایک ہی تاریخ میں داخل ہوئے تھے۔ انسپکٹر صاحب مساوات پسند تھے۔ انہوں نے یہ کہا کہ ایک ہی تاریخ کو دونوں داخل ہوئے تھے۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک ایم اے کی کلاس میں پہنچ جائے اور ایک ساتویں آٹھویں درجہ میں رہ جائے۔ کہا: آٹھویں والے کو ایم اے میں لے جائیں گے تو چلے گا نہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایم اے والے کو کھینچ کر آٹھویں میں داخل کر دو۔ تو مساوات تو ہوگی مگر کیا مساوات کے ساتھ انصاف بھی ہوا؟

تو یاد رکھئے کہ اسلام عدل کا دین ہے، مساوات کا دین ہی ہے۔ ہر ایک نے محسوس کر لیا کہ یہ مساوات ظلم ہے۔ یہ عدالت کا تقاضا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی محنت سے وہاں پہنچا ہے اور یہ اپنی بے عملی سے یہاں رہ گیا ہے۔ اب ان کو برابر کر دینا انتہائی ظلم ہے۔ یہ اس دور کے مساوات پسند ہیں۔ انہوں نے مدرسۂ کائنات میں آنکھ کھولی ہے۔ اس وقت جب ایک عرصہ سے یہ عمل کے درجے طے ہو رہے ہیں۔ یہ حال کو دیکھ رہے ہیں کہ ایک وہاں ہے اور ایک یہاں ہے۔ ایک فقیر ہے اور ایک لکھ پتی ہے۔ ان کے بس میں یہ تو ہے نہیں کہ غریب کو امیر بنا دیں۔ بس یہی کر سکتے ہیں کہ امیر کو کھینچ کر غریب بنا دیں۔ تو اگر وہ ظلم ہے تو یہ بھی ظلم ہے۔ ہاں! جس کے بارے میں پتہ چل جائے، آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے غصب کے ذریعہ سے دولت حاصل کی ہے، بے شک اس سے چھین لیجئے مگر چھین

کر کیا کیجئے؟ پتہ لگائیے کہ کن کن کا مال ہے، ان تک پہنچائیے۔ یہ نہیں کہ چھین کر اپنے منظور نظر افراد میں تقسیم کردیں۔ اس طرح سے تقسیم کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک غاصب ختم کر کے آپ نے اپنے پاس سے بہت سے غاصب پیدا کر دیئے۔

تو یہ دنیا کی نادانی ہے۔ اسلام نے پہلے ہی اعلان کر دیا کہ جو جتنا عمل کرے گا، اس کا اتنا ہو جائے گا۔ جب محنت کی اور پہاڑ میں سے سونا نکالا تو کہا کہ اس کی اتنی قیمت۔ دریا میں سے جو کچھ نکالا، کہا کہ اس کی اتنی قیمت۔ تو قیمت کا معیار کارآمد ہونا نہیں ہے، کامیاب ہونا ہے۔ نظام فطرت اس پر ہے کہ جو شے بیکار ہے، نظام حیات میں وہ کامیاب ہے، وہ نایاب ہے۔ ہوا اور پانی آپ کیلئے اس لئے بے قیمت ہوگئے کہ خالق نے زیادہ پیدا کر دیئے۔ اصل قیمت کا پتہ تو اس وقت چلے جب زندگی کیلئے ناگزیر چیز نایاب ہو۔ لق ودق صحرا ہو، ریگستان کا سفر ہو، جواہرات کا بڑا ذخیرہ پاس موجود ہو، پیاس کا غلبہ ہو، جب ایک مشکیزہ پانی کے بدلے جواہرات کا یہ ذخیرہ مانگا جائے، تب میں سمجھوں گا کہ موتیوں کی قیمت زیادہ ہے یا پانی کی قیمت زیادہ ہے۔

تو اب جس نے جمادات کی خاطر جان دے دی، اس نے اپنے مرتبہ سے کتنا گر کر قربانی پیش کی۔ یعنی جوہر حیات انسانی کو پتھروں کی خاطر قربان کیا۔ تو جب پست پر اپنے کو قربان کیا تو یہ سنت کائنات کی مخالفت ہے۔ لہٰذا اس قربانی سے بلندی حاصل نہیں ہوگی۔

کس لئے دنیا قربانیاں پیش کرتی ہے؟ سلطنت کیلئے۔ سلطنت کیا ہے؟ سلطنت دنیا کے چند ملکوں میں ہے۔ باقی ملکوں میں سلطنت نہیں ہے۔ اب سلطنت کوئی نام سے نہیں ہوتی۔ جو چیز بھی اقتدار کا ذریعہ ہو، سلطنت نہ سہی، وزارت سہی۔ ارے کوئی سا اقتدار جتنے دائرے میں ہو، چیئرمین سہی، چیئرمین نہ سہی، ممبری سہی۔ کتنے لوگ ہیں کہ جن کی عمر اس میں صرف ہوتی ہے؟ ہر دفعہ کھڑے ضرور ہوں گے۔ وہی کامیابی اور ناکامی تو ایک شاعر کا شعر یاد کر لیا ہے کہ:

مقدر سے ہے شکست وفتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

تو گویا پیشہ ہو گیا ممبری کیلئے کھڑا ہونا۔ ضرور کھڑے ہوں گے۔ یہی ہوس بڑھ کر بادشاہت تک پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ امر اعتباری۔ امر اعتباری کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ بس ایک قرار داد ہوگئی ہے، لوگوں نے سمجھنا شروع کر دیا ہے تو بس ہو گئے۔ جب سے کچھ احباب نے سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ یہ ممبر ہے تو ممبر ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے مل کر کہا کہ یہ چیئرمین ہے تو چیئرمین ہو گیا۔ جب لوگوں نے مل کر کہا کہ یہ بادشاہ ہے تو بادشاہ ہو گیا۔ اس کا لوگوں کے ماننے، سمجھنے اور تسلیم کرنے سے تعلق ہے۔ اپنے اندر کوئی بات نہیں ہوتی۔ جب سے لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا، اس وقت سے ممبر نہیں رہا، چیئرمین نہیں رہا، بادشاہ نہیں رہا، وزیر نہیں رہا۔ بس آدمی رہ گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب عہدے جانے کے بعد آدمی رہ گیا، بشرطیکہ یہ سب عہدے ملنے کے بعد یہ آدمی رہا ہو اور اگر جب تک عہدہ نہیں ملا تھا، تب تک تو آدمی تھا اور ادھر عہدہ ملا اور آدمیت کو سلام رخصت کر دیا، اس لئے کہ عہدہ ہے۔ تو پھر جب عہدہ چلا گیا تو پھر نہ عہدہ رہا اور نہ یہ آدمی رہا۔

تو ان دنیاوی عہدوں کی حیثیت امر اعتباری کی ہے۔ جب امر اعتباری کی حیثیت ہے اور انسان نے اس کو مرکز قربانی بنایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جوہر حیات انسانی کو ایک عرضِ غیر حقیقی پر قربان کیا۔ ایک وصف پر، جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ امر اعتباری تھا۔ اور کس چیز کیلئے دنیا جان دیتی ہے؟ غور کیجئے، یہ وہ منزل ہے جہاں عرف عام میں محاورہ ہی قرار دے دیا ہے مرنے کا۔ اور شعراء حضرات نے قاتل اور مقتول کو بڑے بڑے انداز سے نظم فرمایا ہے۔ میری غیر شاعرانہ زبان یہ ہے کہ کسی جمال فانی کی خاطر جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ جب مرکز قربانی فانی ہے تو فانی سے بقا کیا ملے گی؟ یہ تو فنا در فنا ہو گئی۔ بلندی تو جب ملے، جب فنا فی البقا ہو۔

لہٰذا یہ جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ درجہ میں انسان سے پست ہیں۔ اس لئے جب ان میں سے کسی کیلئے جان دے گا تو اس کا نام قرآن میں ہلاکت ہے۔ شہادت اس وقت ہو گی، جب بلند تر کی خاطر جان دے۔ ہاں! ایک قسم جان دینے کی اور ہے اور یہ قسم وہ ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جان نہیں دی، خدانخواستہ امتحان میں فیل ہو گئے، جان دے دی۔ تجارت میں دیوالیہ نکل گیا، جان دے دی۔ کسی اور طرح کے مقصد میں ناکام ہوئے، جان دے دی۔ یہ جان دینا، اسے میں کیا عرض کروں؟ اس کارنامہ کے بارے میں جو میری سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے میدان حیات میں فرار کہتے ہیں۔ اب آپ اگر دنیا کے فراروں کو قابل تعریف سمجھتے ہوں تو اسے بھی قابل تعریف سمجھ لیجئے۔

ہاں! از روئے قرآں ایک فرار کو قابل تعریف جانتا ہوں اور قرآن نے بھی اس کی تعریف کی ہے اور وہ ہے معصیت الٰہی سے فرار۔ گناہ سے فرار۔ جو فرار حضرت نے کیا تھا۔ اس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہ

''بھاگو اللہ کی طرف''۔

یعنی دنیا کے جو معاصی کے سانپ ہیں، ان سے ڈر کر تم خدا کے ساتھ لو لگاؤ۔ بھاگو اللہ کی طرف۔ بس یہ ایک فرار ہے دنیا میں جو بے شک قابل تعریف ہے اور دنیا کے دوسرے کسی فرار کو آپ قابل تعریف نہیں سمجھتے ہیں تو اس فرار کو کیوں قابل تعریف سمجھیں گے؟ اس لئے کہ یہ شریعت میں بھی جرم اور قانونِ دنیاوی میں بھی جرم۔ دنیا کے متمدن قانون میں بھی جرم اور شریعت میں بھی گناہ اور گناہ اتنا عظیم کہ ہر گناہ سے توبہ ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری ہی مجرمانہ ہوئی تو اس گناہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے! جو ناکامیاں ہوں، انہیں برداشت کرے۔ جو شدائد ہوں، انہیں سہے۔ بہادری کا تقاضا یہ ہے، جان دے دینا تو بزدلی ہے۔

تو یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قانون میں بھی جرم اور شریعت میں بھی گناہ۔ دنیا کے ہر متمدن قانون میں جرم تو ہے لیکن دنیا کی کوئی عدالت خودکشی کی سزا نہیں دے سکتی۔ یہ تو خودکشی کی ناکام کوشش کی سزا دیا کرتے ہیں اب جبکہ جرم کیا ہے اور سزا نہیں دی جا سکتی، اس لئے عقلی طور پر ضرورت ہے ایسی عدالت کے ماننے کی کہ جس جرم کی سزا کوئی نہ دے سکے، اس کی سزا وہ دے سکے۔ وہ خدائے حکیم کی عدالت ہے جو قیامت کے دن قائم ہو گی۔ جس طرح حیات میں اس کی سلطنت کی حدود سے نہیں

نکل سکتا، اسی طرح مر کر بھی اس کی حدود سلطنت سے نہیں نکل سکتا۔ اگر اس طرح جان دی تو وہ ایسی ہلاکت ہے جو تمام ہلاکتوں میں بدتر ہے۔ معلوم ہوا کہ جس جس چیز کی خاطر لوگ جان دیا کرتے ہیں وہ پست ہیں اور اگر خودکشی ہے تو بے مقصد ہے۔ وہ بھی پست ہے اور اس کا نام بھی ہلاکت ہے۔ شہادت اس وقت ہوگی جب بلند مقصد کی خاطر جان دے دی جائے اور اگر تجزیہ کیا جائے تو ہلاکت اور شہادت میں دو درجوں کا فرق ہے۔ دو درجے یوں ہیں کہ ریاضی کے اصول سے ہمیشہ ترقی اور تنزل میں ایک درمیانی نقطے کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس نقطے سے بڑھے تو ترقی اور اس سے گھٹے تو تنزل۔ ایک تنزل کا نقطہ ہوتا ہے۔ ایک درمیان کا نقطہ ہوتا ہے اور ایک اس کے اوپر ترقی کا نقطہ ہوتا ہے۔

اب یہاں ہلاکت اور شہادت کے بیچ میں ایک درجہ ہے، وہ ہے طبعی موت جسے آپ کہتے ہیں اپنی موت مر جاؤ۔ یعنی ارادے سے جان دی ہی نہیں، نہ بلند مقصد کی خاطر، نہ پست مقصد کی خاطر، بے مقصد۔ از خود جان ارادے سے نہیں دی۔ بیمار ہوئے، مر گئے۔ کسی حادثہ ارض وسماوی کا شکار ہو گئے، مر گئے اور سب سے زیادہ اس دور کا رائج الوقت طریقہ کہ ایک دم ہارٹ فیل ہو گیا۔ اصل میں ڈاکٹر صاحبان معاف کریں۔ یہ ہارٹ فیل ہونا سبب موت نہ معلوم ہونے کا نام ہوا۔ ورنہ وہ دق میں بھی مرے گا تو ہارٹ فیل ہوگا۔ تو یہاں جو کہ ہارٹ فیل ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھے نہیں کہ کیا ہوا؟ کیوں مر گیا؟ بہر حال مر گیا۔

تو جب سمجھ میں نہ آئے کہ کیوں مر گیا تو اس کا نام ہے ہارٹ فیل۔ تو طبعی موت درمیان کا نقطہ ہے۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ نہ اس میں ترقی، نہ اس میں تنزل۔ نہ اس میں ثواب نہ عذاب۔ غلط فہمی نہ ہو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اعمال کا بھی حساب یا ثواب نہیں۔ نہیں، اس مرنے کا نہ ثواب نہ عذاب۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں مر گئے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بڑا کام کیا کہ مر گئے۔ نہ مدح نہ مذمت نہ ہلاکت نہ شکر۔ یہ تو ہے درمیان کا نقطہ۔ اب اس کے ادھر ہے ہلاکت یعنی پست مقصد کی خاطر یا بلا مقصد جان دی۔ اس میں ہے عذاب اور دوسری طرف ہے شہادت یعنی بلند مقصد کی خاطر جان دی۔ اس میں ثواب ہے اور حیات ابدی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہلاکت اور شہادت میں جب اتنا فرق ہے تو جو شخص شہادت کیلئے جا رہا ہو، اس کے خلاف قرآن کی یہ آیت پیش نہ کی جائے:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ

"اپنے آپ کو خود سے ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

یہ نہ کہے کہ علیؑ جانتے تھے کہ مسجد میں قاتل ہے تو کیوں گئے؟ حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا میں یہ ہوگا تو کیوں آئے؟ جانتے تھے میدان میں تیر برس رہے ہیں تو بچے کو کیوں لائے؟ میں کہتا ہوں کہ قرآن نے ہلاکت کی طرف جانے سے منع کیا ہے، شہادت کی طرف جانے سے منع نہیں کیا۔۔ منزل شہادت کی طرف جانے والا خطرہ کو محسوس کرتا ہے میں کہتا ہے کہ اگر خطرہ محسوس نہیں کرتا تو قربانی کونسا کارنامہ ہے؟ وہ تو اتفاقی سانحہ ہے۔ خطرہ کو محسوس کرتا ہے لیکن دیکھتا ہے کہ انحصار ہے کہ یا جان رہے یا مقصد رہے۔ تو مقصد کی [illegible] مرضی الٰہی کی ترازو میں تول کر، جان کو اور مقصد کو، یہ دیکھ کر کہ مرضی الٰہی میں جان اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اہمیت یہ مقصد رکھتا ہے، تب وہ

قدم اختیار سے منزل قربانی کی طرف جاتا ہے، پھر وہ کارنامہ ہوتا ہے۔ کارنامہ بھی زندہ جاوید اور انسان بھی زندہ جاوید۔

بس جناب! یہ اپنے اپنے مقصد کی اہمیت ہے اور اپنے اپنے دل کی ہمت ہے کہ کوئی اپنی جان دے سکے اور کوئی اپنی جان سے زیادہ عزیز افراد کو میدان قربانی میں لے آئے۔ اب یہ ایک وسیع موضوع ہے۔ دو طریقے ہیں نتیجہ نکالنے کے۔ ایک یہ کہ سبب کو دیکھو اور اثر کو سمجھو اور دوسرا یہ کہ اثر کو دیکھو اور سبب کو سمجھو۔ منطق میں یہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ دھواں دیکھا تو سمجھے کہ آگ لگی ہے اور معلوم ہوا کہ آگ لگی ہے تو سمجھے کہ دھواں بھی ضروری ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بہت ذہین افراد کا کام ہے کہ وہ مقصد حسینؑ کو سمجھیں۔ اپنے جیسے آدمیوں کے مقصد کو سمجھنا تو آسان نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اپنے سے بلند تر افراد کے مقاصد کو سمجھا جائے۔ بہت مشکل ہے کہ آدمی مقصدِ حسینؑ کو سمجھے اور پھر اس کی اہمیت پر غور کرے۔

49

شہید کی جو موت ہے

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، وہ حواس سے متعلق ہیں، مثلاً سورج چمک رہا ہے، اس کا تعلق آنکھ سے ہے۔ نغمے خوش آئند ہیں، اس کا تعلق کان سے ہے۔ پھول کی خوشبو بھینی بھینی ہے، اس کا تعلق مشام سے ہے۔ غرض جتنی آیات الٰہی آفاق میں ہیں ان سب کا تعلق احساسات سے ہے۔

حدیث کا خلاصہ، مَیں اپنے الفاظ میں یوں کرتا ہوں کہ رہنما اگر سامنے آجائے تو رسول یا امام ہے اور پردہ میں چلا جائے تو عقل ہے۔

دیوانے پر نہ فعل حرام کا گناہ، نہ اس کیلئے آخرت کی سزائیں۔ بتایئے کیوں بری کر دیا؟ اس لئے کہ عقل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ دین کیلئے عقل کی ضرورت ہے۔

دروانہ نیچا تھا، سر میں ٹکر لگی، آپ کو خبر ہوئی۔ سینے پرونے میں سوئی انگلی میں چبھی، اسے خبر ہوئی۔ پیر میں ٹھوکر لگی یا کانٹا چبھا، فوراً اسے خبر ملی۔ کیا کوئی مخبر گیا جس نے اطلاع دی؟ اچھا! کہیں جلدی خبر ہوئی، کہیں دیر میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ عالم امکان میں یہ حاضر و ناظر ہونے کا نقشہ ہے۔

شہادت کیا چیز ہے؟ شہادت پیغمبر اسلام کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ تو جس کی ایک تعلیم سے حیات جاودانی ملتی ہو تو جو خود مرکز فیض ہو، اس کیلئے فنا ہو سکتی ہے؟

شہید کی جو موت ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"۔

انسان اگر پست مقاصد کیلئے جان دے گا تو یہ سنتِ کائنات کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا اس کا نام ہلاکت ہوگا۔ اُسے شہادت نہیں کہیں گے۔ شہادت اسی وقت ہے جب بلند تر مقاصد کیلئے جان دی جائے اور انسان سے بلند عالم کائنات میں کوئی نہیں ہے۔ مگر یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ دنیا انسان کو نہیں سمجھی کہ انسان کیا ہے؟ حقیقت میں شرک کی جتنی اقسام ہیں، سب انسان کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ یعنی دنیا کی باتیں انسان نے سمجھ لیں لیکن اپنے آپ کو نہ سمجھ سکا۔ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو پتھروں کے سامنے کیوں جھکتا؟ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو نباتات کے سامنے کیوں جھکتا؟ اگر یہ سمجھتا کہ انسان کیا ہے تو حیوانات کے سامنے نہ جھکتا۔ اور حقیقت میں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنے کا مطلب انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے، یہ نام کو انسان کے سامنے جھکتا ہے لیکن یہ دراصل اُس دولت کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کے پاس ہے۔ اس شہرت کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کو حاصل ہے۔ اس عہدہ و منصب کے سامنے جھکتا ہے جو دوسرے انسان کے پاس ہے۔ یہ سب چیزیں انسان سے پست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان چیزوں کی وجہ سے کسی کی عزت کی تو یہ دولت کو اپنے سے زیادہ معزز سمجھا۔ یعنی پتھروں سے خود کو نیچا سمجھا۔ اُس نے سلطنت کو اپنے سے اونچا سمجھا۔ تو حقیقت میں یہ جو شرک کی سب اقسام ہیں، وہ انسان ناشناسی کی وجہ سے ہیں۔ اگر انسان اپنے آپ کو سمجھتا تو اپنے سے بالاتر کے آگے جھکتا اور اپنے سے بالا اس کو خالق کے سوا کوئی اور نہ ملتا۔ تو چاہے نام نہ لے سکتا مگر مانتا اسی کو۔ کہتا کہ میں بس اسی کو مانتا ہوں جو سب سے اونچا ہے، اسی کو مانتا ہوں جو سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ جتنا سمجھتا، اپنے الفاظ میں کہہ دیتا۔

یاد رکھئے کہ حقیقت الفاظ سے وابستہ نہیں ہے تو نجات بھی الفاظ سے وابستہ نہیں ہے۔ مگر اس نے سمجھا ہی نہیں کہ میں کیا ہوں؟ تو نتیجہ یہ ہے کہ ہر چیز کے سامنے جھکنے لگا۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

مَنۡ عَرَفَ نَفۡسَہٗ فَقَدۡ عَرَفَ رَبَّہٗ۔

"جس نے اپنے آپ کو پہچانا، وہ اپنے پروردگار کو بھی پہچان لے گا"۔

اس کے بہت سے رُخ ہیں، بہت سے پہلو ہیں۔ کلام رسولؐ کی جامعیت یہ تھی کہ الفاظ مختصر ہوتے تھے لیکن ان کے دامن

میں معنی کا سمندر ہوتا تھا۔ کوزہ میں سمندر سمایا ہوا ہوتا تھا۔ اس وقت جو مفہوم میرے بیان سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر سمجھ لے کہ میں کون ہوں تو یہ سمجھ لے گا کہ میرا مالک کون ہونا چاہئے۔ میرا پروردگار کون ہونا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں دیکھئے کہ اس نے جو اپنے وجود کی نشانیوں کا پتہ دیا تو ارشاد کیا کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ ۔

"ہم اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے نفوس میں دکھاتے ہیں"۔

یعنی ایک پلڑے میں تمام آفاق جس میں آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، ثوابت و سیار سب شامل ہیں اور ایک پلڑے میں انسان۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جو مقصد پوری کائنات سے پورا ہوتا ہے، وہ انسان کیلئے (خداشناسی کی منزل میں) انسان سے پورا ہوتا ہے۔

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، وہ حواس سے متعلق ہیں، مثلاً سورج چمک رہا ہے، اس کا تعلق آنکھ سے ہے۔ نغمے خوش آہنگ ہیں، اس کا تعلق کان سے ہے۔ پھول کی خوشبو بھینی بھینی ہے، اس کا تعلق مشام سے ہے۔ غرض جتنی آیات الٰہی آفاق میں ہیں، ان سب کا تعلق احساسات سے ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کال کوٹھڑی میں پیدا ہوا اور اسی میں عمر بھر رہا تو اگر اللہ کی نشانیاں آفاق ہی میں منضبر ہوتیں تو اس پر حجت خدا تمام نہ ہوتی۔ سورج اور چاند اگر خدا کی نشانیاں ہیں تو اسے تو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر پھولوں کی خوشبو میں اس کی قدرت کے نمونے ہیں تو نہ پھول اس کو نظر آئے نہ ان کی خوشبو سونگھنے کا موقع ملا۔ اس طرح اس کے تمام حواس میں سے کسی کو کام کرنے کا موقع ملا ہی نہیں۔ لہٰذا حجت خدا اس پر تمام نہیں ہوتی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی ایک ایسی دلیل ہو جس کیلئے نہ دیکھنے کی ضرورت، نہ کانوں سے سننے کی ضرورت، نہ ہاتھ سے چھونے کی ضرورت۔ اور وہ انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو کیا آئینے میں دیکھ کر جانا کہ میں ہوں؟ کیا اپنی آواز سن کر سمجھا کہ میں ہوں؟ کیا اپنے آپ کو چھو کر سمجھا کہ میں ہوں؟ آپ نے اپنے کو احساسات سے نہیں سمجھا ہے بلکہ وجود نے اپنی پہچان کروائی ہے۔ اس کیلئے الگ سے کسی احساس کی ضرورت نہیں تھی۔

اب جس وقت نہ آنکھوں کو دیکھنے کا موقع ملے، نہ کانوں کو سننے کا موقع ملے، تمام آیات الٰہی اس سے پردے میں ہیں لیکن سب سے بڑی آیت جو خود اس کا نفس ہے، وہ تو اس کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اس کیلئے بھی حجت خدا تمام ہوئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری ہدایت نہیں ہوئی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس اندر والی رہنمائی کا تعارف صرف اُدھر والے رہنماؤں نے کروایا ہے ورنہ دنیا، جس نے عقل اور قسمی کو سمجھا ہی نہیں، جس نے دین سے عقل کو بے دخل کر دیا، وہ اس باطنی رہنما کی قدر کیا جانیں؟ یہ اُدھر والے رہنما ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ:

اَلرَّسُوْلُ عَقْلٌ مِنْ ظَاهِرٍ وَالْعَقْلُ مِنْ بَاطِنٍ ۔

"رسول جو ہوتا ہے، وہ عقل ہے جو سامنے دکھائی دیتا ہے اور عقل وہ رسول ہے جو اندر سے رہنمائی کرتی ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا خلاصہ میں اپنے الفاظ میں یوں کرتا ہوں کہ رہنما اگر سامنے آجائے تو رسول یا امام ہے اور پردہ

میں چلا جائے تو عقل ہے۔

اسی لئے جو ہماری سب سے بڑی کتاب ہے، اس کا نام کافی ہے۔اس کا پہلا باب عقل وعلم ہے۔اس لئے کہ جو دین کی پہلی منزل ہے یعنی اللہ، اسکو اس وقت تک نہیں پہچانا جاسکتا جب تک عقل کو بروئے کار نہ لایا جائے، اس لئے کہ آنکھوں سے نہیں دکھائی دیتا، غیب الغیوب ہستی۔اور یہی بات ہے جو دین سے عقل کو بے دخل کردیں گے، وہ بھی غیب پر ایمان نہیں لائیں گے۔اس لئے کہ غیب کا تعلق مشاہدات سے ہے اور غیب پر وہی ایمان لائیں گے جو عقل کی رہنمائی کے قائل ہوں گے اور اللہ کی معرفت انہی کو ہوسکتی ہے جو غیب پر ایمان لانے کیلئے تیار ہوں کیونکہ اگر کوئی غیب پر ایمان نہیں لائے تو وہ اس ذات کو کیا سمجھے گا جو مکمل غیب ہے۔یعنی کوئی غیب وہ ہوگا جس کو ہماری آنکھوں نے نہ دیکھا ہو لیکن ہمارے بزرگوں نے دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔آدم سے لے کر خاتم تک کسی نے نہیں کہا کہ میں نے اُسے دیکھا ہے۔کسی کو آنکھ سے نہ دیکھیں، خواب میں دیکھیں۔لیکن یہ وہ ذات ہے جو خواب میں بھی کبھی نہیں دکھائی دی۔

میں کہتا ہوں کہ خواب میں دکھائی بھی نہیں دے سکتا۔ایک اصول عقلی یہ ہے کہ خواب میں وہی چیز دیکھی جاسکتی ہے جو بیداری میں دیکھی جاسکے۔خوشبو خواب میں بھی سونگھی جائے گی، دیکھی نہیں جائے گی۔نغمہ خواب میں بھی سنا جائے گا، دیکھا نہیں جائے گا۔جو چیز چھونے سے متعلق ہے، وہ خواب میں بھی چھونے سے سمجھ میں آئے گی۔تو نوعیت احساس خواب میں نہیں بدلتی۔خواب میں بھی دیکھنے کی چیز دیکھی جاتی ہے، سننے کی چیز سنی جاتی ہے۔جو ذات بیداری میں نہ دیکھنے کے قابل ہو، نہ سننے کے قابل ہو، نہ چکھنے کے قابل ہو، نہ چھونے کے قابل ہو، وہ خواب میں احساسات کی اسیر کیونکر ہوگی؟ اگر خواب میں کسی نے دیکھا ہے تو وہ نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے علاقہ میں پیدا ہونے والے نبی کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔فرماتے ہیں کہ جب میں نے خواب میں دیکھا تو قلم بڑھا دیا کہ سند دے دیجئے، ثبوت کا پروانہ دے دیجئے۔خیر اس وقت قلم دوات دے دیا اپنے مطلب کیلئے۔اُس کا کوئی مطلب ہوتا تو نہ دیتے۔

خیر! قلم دوات دے دیئے۔اس نے شکریہ ادا کیا۔اس زمانہ میں فاؤنٹین پین تو ہوتا نہیں تھا، قلم سیاہی میں ڈبویا۔روشنائی نب میں زیادہ آگئی، اسے قلم کی زبان کہا کرتے تھے تو زبانِ قلم میں سیاہی زیادہ ہوگئی۔انہوں نے قلم کو جھٹک دیا تو اتنی تیز رفتاری سے جھٹکا کہ چھینٹے اُن کے کرتہ پر آ کر گرے۔الفاظ میرے ہیں، مطلب ان کا ہے۔تو چھینٹے ان کے دامن پر پڑے۔ان کی قمیص پر پڑے۔اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔پروانہ تو کوئی نہ تھا، دامن پر داغ موجود تھا۔ہر سال ایک دن مقرر تھا جب اس کی زیارت کروائی جاتی تھی۔بعض صوفیاء اور مشائخ کے ہاں بھی یہ موجود ہے کہ میں نے ستر مرتبہ خدا کی زیارت کی لیکن میں کسی طرح بھی اس کو ممکن نہیں سمجھتا۔وہ ذات ایسی غیب الغیوب لیکن اس کو جب تک نہ مانیں، اس وقت تک دین کی ابتدائی سطر بھی طے نہیں ہوتی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُه۔

"دین کی پہلی منزل اس کو سمجھنا ہے۔"

غیب کا اگر کوئی منکر ہو تو اس کو نہ مانے گا۔ جتنی منزلیں اس کے بعد دین کی ہیں، چلئے جو سب کے نزدیک مسلّم ہیں، توحید کے بعد رسالت۔ میں کہتا ہوں کہ نبوت کو کیا آنکھوں سے دیکھ کر مانا ہے؟ کوئی کہے گا کہ ہم نے نہ سہی، جو حضرات تھے اس وقت موجود، انہوں نے دیکھ کر مانا ہے؟ میں نے کہا جو حضرات اس وقت تھے اور جنہوں نے مانا، کیا انہوں نے بھی نبوت کو دیکھا؟ روئے مبارک سامنے تھا، زلف مبارک سامنے تھی، دندان مبارک سامنے تھے۔ یہ سب چیزیں سامنے تھیں مگر رسالت سامنے نہیں تھی۔ نبوت سامنے نہ تھی۔[

اور یاد رکھئے ذکر رسول یوں تو ہر طرح عبادت ہے مگر ایمان جو لاتا ہے، وہ گیسوئے مبارک پر نہیں ہے، روئے مبارک پر نہیں ہے، دندان مبارک پر نہیں ہے، ایمان لاتا ہے رسالت پر اور رسالت کے معنی بھیجا ہوا ہونا۔

تو جب بھیجنے والے کو نہیں دیکھا تو بھیجنا کہاں دیکھا؟ پھر جبرئیل امین کو نہیں دیکھا جو وحی لائے۔ ان کو قرآن سناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ سب باتیں رسول کی زبان کے اعتبار پر مانیں۔ انہوں نے کہا کہ جبرئیل آتے ہیں، اس لئے مانا۔ انہوں نے کہا کہ وحی اُترتی ہے، اس لئے مانا۔ آنکھوں سے دیکھ کر منوانا ہوتا تو چالیس برس کے انتظار کی ضرورت نہ تھی۔ یہ چالیس برس کے انتظار کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ پہلے زبان کا اعتبار قائم کر دیا جائے تاکہ پھر جب غیب کی خبریں دوں تو دنیا ماننے کیلئے تیار ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ رسالت جس کا نام ہے، وہ بھی بغیر دیکھے مانی۔

اس کے بعد مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ تیسری چیز قیامت ہے۔ تو قیامت کو کیا آنکھوں سے دیکھ کر مانا؟ اگر آنکھوں سے دیکھ لیتے تو قیامت ہوئی نہ جاتی۔ قیامت کو بھی بغیر دیکھے مانا اور قیامت کو ماننے کے ساتھ کیا کیا مانا؟ ایک پورے کارخانہ قدرت کو مانا۔ صراط مانا، میزان مانا، نامہ اعمال کو مانا اور سب سے زیادہ دل پسند چیز بہشت کو مانا اور سب سے زیادہ خوفناک چیز دوزخ کو مانا۔ یہ سب بغیر دیکھے ہوئے مانا۔ تو میں تو بڑے دردمندانہ طور پر مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اتنی باتیں جس کے کہنے سے مان کر مسلمان ہوئے، اب ایک کو نہ مان کر اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالتے ہو؟ غیب کے ماننے کا ذریعہ صرف عقل ہے اور عقل کو اگر کوئی نہ مانے تو غیب کو ماننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دین میں اگر عقل کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو جس کو اس نے عقل نہیں دی، اس کو تکلیف شرعی سے بری کیوں کر دیتا؟ دیوانے پر حرام فعل کا گناہ، نہ اس کیلئے آخرت کی سزائیں۔ بتایئے کیوں بری کر دیا، اس لئے کہ عقل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ دین کیلئے عقل کی ضرورت ہے۔

اس لئے جو باہر سے حقیقت میں عقل تھے، اس لئے انہوں نے ارشاد فرمایا:

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَقْلَ لَہٗ۔

"اس کیلئے دین نہیں ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے"۔

کافی میں ایک حدیث ہے، بطور تمثیل بیان کیا ہے کہ ایک عابد ایک جزیرہ میں رہتا تھا۔ جزیرہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ دن رات عبادت کرتا تھا۔ ایک فرشتے کا اُدھر سے گزر ہوا۔ فرشتے نے جب اس کی عبادت کو دیکھا تو اس کو بہت بڑی چیز سمجھا کہ دن رات

عبادت کرتا ہے۔ اسے اشتیاق ہوا کہ اس کے ثواب کو میں دیکھوں کہ اسے کتنا ثواب ملے گا۔ خالق سے دعا کی، دعا مستجاب ہوئی اور اس عابد کا ثواب فرشتے کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ فرشتے نے اس کے عمل کی کثرت کا توازن کیا اور اس ثواب کو اُس کیلئے کم سمجھا۔ یہ اتنی عبادت کرتا ہے اور اسے اتنا ثواب ملے گا؟ اس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی: پروردگار! (ملائکہ عالم قدس کے طالب علم ہیں، طالب علم کی سمجھ میں جو کچھ نہ آئے، اُسے اُستاد سے پوچھنے کا حق ہے) تو اُس نے عرض کی کہ پروردگار! اس کی عبادت تو اتنی عظیم ہے اور اس کا ثواب اتنا کم؟ آخر یہ کیا راز ہے؟

تو ارشادِ قدرت ہوا کہ تھوڑے دن اس کے پاس رہو، تمہیں اس کا راز معلوم ہو جائے گا۔ وہ فرشتہ بصورتِ انسان اس کے پاس گیا اور اس کے برابر مصلیٰ بچھا دیا۔ اس عابد کو بُرا معلوم ہوا کہ میری عبادت میں خلل اندازی ہوگی۔ اُس نے جب ان کی شانِ عبادت دیکھی، جب استغراق دیکھا تو جانا کہ یہ مجھ سے بالاتر عبادت کرتے ہیں۔ انہیں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اپنا رفیق سمجھنے لگے کہ یہ عبادتِ خدا میں میرا معاون ہے، مددگار ہے۔ مجھے اپنے عمل سے شوق دلاتا ہے۔ جب مانوس ہو گیا تو گفتگو شروع کی کہ تمہارے لئے یہ عبادت کا کتنا موزوں مقام ہے۔ اس کی سرسبزی و شادابی کی انہوں نے تعریف کی۔

ہمارے ہاں یہ روایت ہے کہ بعض جانوروں کے نام کو ہم غیر شائستہ سمجھتے ہیں حالانکہ جانور سب مخلوقِ الٰہی ہیں۔ انہوں نے کہا: بے شک، بہت اچھا مقام ہے مگر یہاں ایک خرابی ہے کہ اتنی گھاس اور سبزہ بے وجہ برباد ہو رہا ہے۔ ہمارے خدا کے پاس اتنے درخت ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو اس سب کو چر جائے۔ انہوں نے یہ سن لیا۔ وہاں تو لا سکتی ہے۔ بات چیت کیلئے توقف کی ضرورت نہیں۔ اُدھر سے خطاب ہوا کہ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اس عبادت کا ثواب کیوں کم ہے؟

اب جس اصول کیلئے یہ واقعہ پیش کیا گیا کہ میں بقدرِ عقل ثواب دیتا ہوں۔ بس ایک اصول قائم ہو گیا۔ یہ بقدرِ عقل کیا؟ عقل اصل میں سرمایہ معرفت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت بے معرفت کتنی زیادہ ہو لیکن اس میں وہ قدر و قیمت نہیں جتنی عبادت بہ معرفت میں ہے۔ یعنی مقدارِ عبادت دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، مقدارِ عبادت معیار نہیں ہے بلکہ وہ محرکاتِ عبادت جو ذہن میں پس منظر ہے عبادت کا، وہ عبادت میں وزن پیدا کرتا ہے۔ اب کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے اگر رسول ایک پلڑے میں تول کر عبادتِ ثقلین کو رکھ دیں اور ایک پلڑے میں ایک ضربت کو۔

تو جو سلسلہ کلام تھا کہ ایک پلڑے میں تمام آفاق اور ایک پلڑے میں صرف انسان کا نفس، اسی طرح ایک پلڑے میں ان کی ضربت اور ایک پلڑے میں ثقلین کی عبادت۔ ویسے ہی ایک پلڑے میں تمام کائنات اور ایک پلڑے میں انسان کا نفس۔ یعنی جس کیلئے تمام کائنات دلیلِ معرفت بننے سے قاصر ہو، اس کیلئے یہ نفسِ انسانی دلیلِ معرفت بنتا ہے۔ وہ ان سب کی جانشینی کرتا ہے، ان سب کی قائم مقامی کرتا ہے۔

اب ایک دوسرا پہلو عرض کرتا ہوں اور وہ پہلو یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے جاننا اور ایک ہوتا ہے پہچاننا۔ میری کتابیں آپ نے دیکھی ہیں، مگر اتفاق سے آپ نے کبھی میری تصویر نہیں دیکھی، نہ مجھے دیکھا تو اگر کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ فلاں شخص کو آپ جانتے ہیں؟

آپ کہیں گے کہ جی ہاں، جانتا ہوں۔ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے، یہ کتاب پڑھی ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ آپ پہچانتے ہیں تو فرمائیں گے کہ نہیں، مجھے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ میں نے کبھی کوئی تصویر دیکھی ہے۔ لیکن اگر مجھے دیکھا ہے یا میری کوئی تصویر کبھی دیکھی ہے، اب پوچھا جائے کہ جانتے ہیں؟ جی ہاں۔ پھر تصانیف کا نام لیں گے۔ پہچانتے بھی ہیں؟ ہاں ہاں، میں نے ٹی وی پر تصویر دیکھی تھی۔ فلاں جگہ مجلس پڑھتے دیکھا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ جاننا اور ہوتا ہے جبکہ پہچاننا اور ہوتا ہے۔ کائنات میں نفس انسانی کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ جاننے کا ذریعہ ہیں۔ جس طرح نقش نقاش کو بتاتا ہے، جس طرح تصویر مصور کو بتاتی ہے، جس طرح تصنیف مصنف کو بتاتی ہے، اسی طرح کائنات کی ہر چیز خدا کو جاننے کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسان اپنے جسم کے ساتھ تو جاننے کا ذریعہ ہے مگر اپنے نفس کے ساتھ یہ اس کے پہچاننے کا بھی ذریعہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اُس نے عالم امکان میں اپنی بہت سی صفات کی اس کو جلوہ گاہ بنایا ہے۔ مثلاً آپ سے میں پوچھوں کہ آپ کے اس جسم میں نفس ہے؟ آپ کہیں گے، یقیناً۔ میں آپ کا ہاتھ اٹھا کر کہوں کہ اس میں ہے؟ آپ کہیں گے، نہیں۔ یعنی خالی ہاتھ ہیں۔ آپ سے کہوں پیر میں ہے؟ آپ کہیں گے، نہیں۔ اور اسی طرح جتنے اجزائے جسم ہیں، ایک ایک حصہ پر ہاتھ رکھ کر میں کہوں، یہاں ہے؟ آپ کہیں گے نہیں۔ اچھا تو وہ پورے جسم میں تقسیم ہے یعنی تھوڑا ہاتھ میں ہے، تھوڑا پیر میں ہے، تھوڑا آنکھوں میں ہے، تھوڑا سر میں ہے، پورے جسم میں تقسیم ہے یعنی ہاتھ کٹ گیا تو اتنا حصہ اس کا کم ہو گیا۔ اگر پیٹ کٹ گیا تو ایک حصہ اس کا کم ہو گیا۔ کہیں گے، نہیں۔ تقسیم بھی نہیں۔ تو اسی جسم میں ہے اور آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہے، نہ پورے جسم میں بتا سکتے ہیں کہ تقسیم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ امکانی دائرہ میں لامکان ہونے کا نقشہ ہے۔ یونہی آپ اس ممکن نمونہ سے واجب نمونہ کو سمجھ لیجئے کہ وہ حجاز میں ہے، عراق میں نہیں ہے۔ مشرق میں ہے، مغرب میں نہیں ہے۔ وہ دائیں طرف ہے، بائیں طرف نہیں ہے۔ تو وہ غلط۔ یہ کہئے کہ وہ سب میں تقسیم ہے، کچھ وہاں ہے، کچھ وہاں ہے، وہ بھی غلط۔ تو آپ نے دیکھا کہ یہ عالم امکان میں وجوب لامکانی کا نقشہ کھنچ گیا۔ راستہ چلتے میں سر میں ٹکر لگی۔ دروازہ نیچا تھا، فوراً آپ کو خبر ہوئی۔ سیتے ہوئے سوئی انگلی میں چبھی، اُسے خبر ہوئی۔ پیر میں ٹھوکر لگی یا کانٹا چبھا، فوراً اُسے خبر ملی۔ کیا کوئی مخبر گیا جس نے اطلاع دی ہو؟ اچھا کہیں جلدی خبر ہوئی ہو، کہیں دیر میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ عالم امکان میں یہ حاضر و ناظر ہونے کا نقشہ ہے۔

جس طرح تمہارے نفس کو تعلق ہے، تمہارے چھوٹے سے جسم سے، ویسے ہی خالق کا تعلق تمام کائنات سے ہے۔ لہٰذا اُسے مغرب کی بھی خبر، مشرق کی بھی خبر۔ تہہ زمین کی بھی خبر، بالائے آسمان کی بھی خبر۔ کائنات میں جتنے اجزاء ہیں انہیں جا کر خبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمام کائنات پر اس کا علم محیط ہے۔

"وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا۔"

"ہر شے پر اس کا علم محیط ہے۔"

آپ کے جسم کے اندر اس کا نمونہ پیش کر دیا۔ اِسے دنیا سمجھ لیتی ہے، اُسے نہیں سمجھتی۔ یہ دنیا کی ستم ظریفی ہے کیونکہ نفس

انسانی کو امکانی حد تک اپنی صفات کی جلوہ گاہ بنایا، اس لئے کائنات جاننے کا ذریعہ اور نفس پہچاننے کا ذریعہ۔ فرق کو محسوس کیجئے۔ وہ عطا کرنے والا ہے، اس سے فیض حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ بذاتِ خود کامل ہے، یہ اس کے کامل بنائے ہوئے ہیں۔

کوئی درجہ ہوگا کہ نفس بس آپ کا نفس رہے اور کوئی مرتبہ کمال اسی نفس انسانی اور انسان کا ہوگا کہ وہ اپنا نفس کہہ دے۔

انسان اگر انسان کی منزل کو سمجھ لے تو پھر خدا کو سمجھ لے گا۔ اور اس کو یوں کہا جائے کہ جتنا اپنے کو سمجھے گا، اُتنا خدا کو سمجھے گا اور جتنا اپنے نفس کو سمجھے گا، اُتنا خدا کو سمجھے گا۔ تو وہ بلند تر نفوس جن کو اس نے اپنا نفس قرار دیا ہے، اس کی معرفت ان کی معرفت کے بغیر کیونکر ہوگی؟

اسی لئے انداز مختلف ہے، الفاظ مختلف ہیں۔ کسی اعتبار سے نفس کہہ دیا، کسی اعتبار سے وجہ یعنی چہرہ کہہ دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ چہرہ پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے، کوئی چادر اوڑھے ہوئے ہوں، صرف ہاتھ باہر ہوں تو شاید نہ پہچان سکیں۔ پیر باہر ہوں تو شاید نہ پہچانیں۔ لیکن اگر چہرہ باہر ہے تو فوراً پہچانیں گے کہ کون ہے؟ تو چہرہ پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو اس لئے ان حضرات کو بھی وجہ اللہ کہہ دیا گیا کہ یہ اللہ کا چہرہ ہیں اور ارشاد ہوا:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔

"ہر شے ہلاک ہونی ہے، فانی ہے سوائے اُس کے چہرہ کے"۔

تو اب دنیا والوں نے چہرہ کے معنی وہی کیجھے۔ جب قرآن کو لغت سے حل کیا جائے تو یہی ہوگا۔ لغت میں دیکھ کر جو معنی سمجھے تو سمجھ لیا کہ یہ چہرہ ہے۔ اور جب چہرہ ہے تو ہاتھ بھی ہیں، پیر بھی ہیں، سب کچھ ہے۔ اب کیا ہوا؟ زیر سایہ اسلام جو تصور آیا ہے، قرآن کو کافی سمجھنے کا نتیجہ، قرنِ اول کا تصور، کسی امام کے سامنے، معصوم کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی کہ سوائے اس کے چہرے کے ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ امام سے معنی پوچھے۔ امام نے فرمایا: لوگ کیا معنی سمجھتے ہیں؟

لوگ سے مراد اس زمانہ کے علماء تھے۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ وہ تو ایسی باتیں کرتے ہیں، میری ہمت نہیں ہوتی کہ آپ کے سامنے نقل کرسکوں۔ آپ نے جب کہا کہ بتاؤ۔ اس پر صحابی یہ کہنے لگے کہ وہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ قیامت مدت دراز کے بعد آئے گی اور اتنا زمانہ گزر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ازلی سرمدی، جس کی ابتداء کو ہم نہیں جانتے، جان ہی نہیں سکتے۔ تو امتدادِ زمانہ سے بس اللہ کا چہرہ ہی رہ جائے گا۔

اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ ایک صاحب اپنے مقتداء کی فضیلت میں بیان کررہے تھے کہ کھڑے ہوکر جو عبادت شروع کی تو دن رات میں کبھی بھی نقل و حرکت نہیں کرتے تھے۔ برسوں گزر گئے، یہاں تک کہ پینے سے اوپر تک دیمک نے کھا لیا۔ جب فضیلتیں بنائی جاتی ہیں تو ان میں ایسی ہی بدسلیقگی ہوتی ہے۔ یہ میں نے خود ایک عقیدت مند کی زبان سے سنا۔ اس بزرگ کا نام تو یاد نہیں رہا جو دیمک کے کھائے ہوئے تھے۔ یہ مشرکانہ تصور تھا۔ آپ نے ابھی دیکھا کہ قرآن کو کافی سمجھنے کا نتیجہ۔ دیمک نہ سہی، کسی طرح گھس کر سب ختم ہو جائے گا اور صرف چہرہ باقی رہ جائے گا۔ بالکل لفظی معنی کے مطابق ہے:

-كُلُّ شَیْءٍ ھَالِكٌ اِلَّا وَجْھَه-۔

"ہر شے فنا ہونے والی، سوائے اس کے چہرہ کے"۔

سب ختم ہوجائے گا سوائے چہرہ کے۔ اور چہرہ ٹھہرا ہوا کس پر ہے؟ اس کا تعلق عقل سے ہے اور عقل سے کام لینا نہیں ہے۔ یعنی سوائے قرآن کے سب چیزوں کے چھوڑنے کا جو شوق ہوا، اس میں بیچاری عقل بھی گئی۔ قرآن کافی ہے، لہذا عقل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن نے ہر جگہ اپنا مفہوم سمجھنے کیلئے کہا کہ صاحبانِ عقل سمجھیں گے۔ تو جب عقل سے کام نہ لیا جائے گا تو جس کا دامن تھاما تھا، وہی دامن چھڑوا کر چلا جائے گا کیونکہ خود کہہ چکا کہ یہ قرآن ان کیلئے ہے جو عقل سے کام لیں۔ اس کو شکایت یہی ہے کہ:

-اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا-۔

جیسے غصہ میں کوئی کہتا ہے، اس طرح ارشاد ہورہا ہے، جھلائے ہوئے انداز میں۔ "یہ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟"

تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اسے شکایت یہ نہیں ہے کہ حفظ کیوں نہیں کرتے، شکایت یہ ہے کہ عقلوں سے کام کیوں نہیں لیتے؟ غور کیوں نہیں کرتے؟

حضورِ والا! امام کو اس سے اتنی تکلیف ہوئی کہ جہاں لگے ہوئے بیٹھے تھے، تشریف فرما تھے، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اللہ بالاتر ہے، اس سے جو یہ ظالم لوگ کہتے ہیں، بہت اونچا ہے، برتر ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا جو اصل حقیقت تھی، سننے والا اس لائق تھا کہ اسے بتایا جائے:

-نَحْنُ وَجْهُ اللهِ الْبَاقِیَه-۔

"ہم وہ چہرے ہیں جو باقی رہنے والے ہیں"۔

اب یہ ذکر آگیا ہے تو قرآن مجید کی دو آیتیں یاد آتی ہیں، دو جگہ صور پھونکنے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ ہے:

-یَوْمَ یُنْفَخُ-۔

صور پھونکا جائے گا زمین و آسمان میں جتنے ہیں سب گھبرا جائیں گے۔ خوف و دہشت طاری ہوجائے گا۔ اس صور سے جو آدمیوں کے دھماکے سے خوف و دہشت طاری ہوتا ہے۔ یہ خوف اس سے مختلف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا دھماکہ ہوگا۔ خوف و دہشت طاری ہوجائے گا۔

-اِلَّا مَنْ شَاءَ اللهُ-۔

"سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے"۔

معلوم ہوا کہ عام طور پر گھبراہٹ مگر اس میں استثنیٰ ہے کہ سوائے ان کے جنہیں اللہ چاہے۔ دوسرے صور کا ذکر وہ ہے، سورۂ فنا

جسے کہنا چاہیے۔ صور پھونکا جائے گا تو جتنے آسمان اور زمین میں ہیں، سب بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے۔ یہ معنی صور کے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی موجود "اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ"۔ سوا ان کے جنہیں اللہ چاہے۔ پہلا صور وہ تھا جس سے عالم گھبراہٹ طاری ہو جائے گی مگر نفوسِ مطمئنہ ہیں کہ ان پر اس صور کا اثر نہیں۔ دوسرا صور وہ ہے جس سے سب ختم ہو جائیں گے مگر کچھ نفوسِ باقیہ ہیں، ان پر اس صور کا بھی اثر نہیں ہوگا۔ اب وہی ہستیاں ہیں جو وجہ اللہ کی مصداق ہیں۔ وہی "اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ" کے استثنیٰ کا مصداق ہیں جو ہر صور کے اثر سے مستثنیٰ ہیں۔

اب اس کے سوا تیسرے صور کا مجھے پتہ نہیں۔ تیسرا صور وہ ہے کہ جو مر گئے تھے، اُس سے وہ جی اٹھیں گے۔ تو جی کر اٹھیں گے وہی جو مرے ہوں گے۔ یہی نفس ہیں بلند انسان کے جن کو اُس نے اپنی دلیل قرار دیا۔ اس میں جتنا درجہ بلند ہے، جتنا نفس کامل تر ہے، اتنا ہی اس کو اپنا نفس کہہ دیا کہ یہ ہمارا نفس ہے۔ اس کے ذریعہ ہمیں پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شہداء کیلئے جو زندگانیِ جاوید کی بشارت دی گئی ہے، اس کا انحصار صرف تلوار سے شہید ہونے والوں پر نہیں ہے، اس کیلئے ایک لفظی دلیل کہ دو آیتیں ہیں حیاتِ شہداء کی "لَا تَقُوْلُوْا"

اور ایک "لَا تَحْسَبَنَّ" جو میں پیش کر چکا ہوں۔ دونوں جگہ کلمہ حصر یعنی "اِنَّمَا" نہیں ہے۔ "اِنَّمَا" کلمہ حصر ہوتا ہے جو قرآن مجید میں ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ۔

"اِنَّمَا" سے انحصار ہوتا ہے کہ ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ لیکن یہاں بس یہ کہا گیا کہ ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں۔ مگر یہ نہیں کہا گیا کہ بس یہی زندہ ہیں۔ کلمہ حصر "اِنَّمَا" ان میں کہیں نہیں ہیں۔ دنیا حیاتِ نبی میں اُلجھ رہی ہے کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ قرآن مجید سے ان تمام نفوس کا زندہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ رسول سے کیا مخصوص ہے؟ وہ تمام افراد زندہ ہیں۔ ان میں تلوار والی شہادت ایک ہی ذات کیلئے ہے۔ مگر ذاتِ جاودانی میں کم سے کم میرا ایمان یہی ہے کہ سب شریک ہیں۔ کوئی ایک نہیں جو اس حیاتِ جاودانی سے محروم ہو۔ رسول کے بارے میں دنیا بحث کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شہادت ہے کیا چیز؟ شہادت پیغمبر اسلام کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ تو جس کی ایک تعلیم سے حیاتِ جاودانی ملتی ہو، تو جو خود مرکزِ فیض ہو، اُس کیلئے فنا ہوگی؟ میں کہتا ہوں کہ بے شک شہادت بہت بڑا مرتبہ سہی مگر جب رسول کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے تو میں یوں کہوں گا، یہ کوئی نہ کہے کہ شہیدوں کی شان کے خلاف، ان کی شان رسول کی شان کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں کہتا ہوں کہ جس کے دروازہ سے زندگانیِ جاوید کی بھیک تقسیم ہو رہی ہو، وہ خود محرومِ زندگیِ جاوید کس طرح ہو سکتا ہے؟

میں تصور نہیں کر سکتا کہ پیغمبر اسلام اس حیات سے محروم ہوں جو شہداء کیلئے بنصِ قرآن ثابت ہے اور جس کے وہ بھی قائل ہیں جو حضور کی حیات کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ حضور کی حیات معرضِ بحث میں لیکن شہیدوں کی حیات کے سب قائل۔

ایک سوال جو خواہ مخواہ کیا جاتا ہے، وہ بھی غلط کہ جو زندۂ جاوید ہو، اس کا ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ مجھ جیسا جاہل آدمی رسول کو زندہ سمجھ رہا ہے تو کیا رسول کی بیٹی اس حقیقت سے واقف نہیں تھیں کہ میرے بابا زندۂ جاوید ہیں؟ لیکن واقعہ ہے کہ دنیا میں کوئی بیٹی باپ کو اتنا

نہیں روئی ہوگی جتنا سیدہ عالم اپنے بابا کو روئی ہیں۔ اور عالم یہ کہ نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام۔ گریہ سے روکنے کی ابتداء اسی وقت ہوگئی تھی مگر ذرا تمیز و بدتمیزی کا فرق تھا۔ لیکن ابتداء اسی وقت ہوگئی تھی۔ اگر محلہ کے کسی گھر میں کوئی مصیبت ہوجائے تو کہرام سے نیند تو بے چین ہوگی۔ کھانا تو خوشگوار نہیں ہوگا۔ چاہے شناسائی نہ ہو، غم وہ ہے جو غیر متعلق کو متعلق بنا دیتا ہے۔ خوشی میں وہی شرکت کرتا ہے جو پہلے سے شناسائی رکھتا ہو لیکن غم میں فطری طور پر وہ بھی شریک ہوجاتا ہے جس کی شناسائی نہ ہو۔

تو اگر کسی غیر کے ہاں بھی گریہ ہو رہا ہو تو آپ کو ہنسنے میں دلچسپی نہیں ہوگی، قہقہے لگانے کو دل نہیں کرے گا۔ باوجود اجنبی ہونے کے ایک ملال کی فضا تو آپ کے گھر میں بھی ہوجائے گی۔ نہ کھانے میں مزا ہوگا، نہ سونے میں۔ لیکن چودہ سو برس کے اخلاق کی پستی کے باوجود آج کسی کی انسانیت یہ اجازت نہیں دے گی کہ وہ گھر پر جائے اور جا کر یہ کہلوائے کہ تم لوگوں کے رونے سے ہماری نیند بے چین ہوتی ہے۔ تمہارے رونے سے ہمیں کھانے میں مزا نہیں آتا۔ آج اخلاق کی انتہائی پستی کے باوجود انسانیت ہرگز اجازت نہیں دیتی۔

لیکن میں کیا کروں کہ اس خلق عظیم اور انسانیت کے معلم کے دنیا سے اٹھنے کے ساتھ ہی آس پاس والوں نے، جو فاطمہ زہرا کے ہمسائے تھے تو کیا وہ رسول کے ہمسائے نہیں تھے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ پاس رہنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا جب تک صلاحیت ظرف نہ ہو۔ اس وقت یہ مثال سامنے آتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس پورا وفد آتا ہے اور کہتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سے کہئے کہ دن رات وہ گریہ کرتی ہیں تو نہ ہمیں رات کو نیند آتی ہے، نہ ہمیں کھانے پینے میں مزا ملتا ہے۔ ہماری طرف سے یہ کہئے کہ یا دن کو روئیں یا رات کو۔ یعنی ابھی تک کم از کم گریہ کے بدعت ہونے کا تصور نہیں ہوا تھا ورنہ یہی کہہ دینا کافی تھا۔ مگر یہ اپنی زحمتوں کا ذکر کر رہے ہیں کہ یا دن کو گریہ کریں، رات کو خاموش رہیں یا رات کو گریہ کریں، دن کو خاموش رہیں۔ مجھے اور آپ میں سے ہر ایک کو اس فرمائش کے سننے سے تکلیف ہوئی تو علی کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

مگر وہ اُس امین کے جانشین تھے کہ انہوں نے اس پیغام کو پہنچانا بھی ضروری سمجھا۔ گئے اور بتقاضائے احتیاط کتنا ہی ہلکا کر کے ارشاد فرمایا ہو لیکن جو اصل بات تھی، وہ تو کہنی ہی تھی۔ پہلے تو سیدہ عالم نے یہ جواب دیا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری زحمتوں کی عمر طولانی نہیں ہے، مجھے میرے بابا خبر دے چکے ہیں کہ میں بہت جلد اُن کے پاس چلی جاؤں گی۔ جواب تو یہ دے دیا اور کہا کہ میں کوشش بھی کروں گی ان کی شکایت کو دور کرنے کی۔ گریہ پر بس تو نہ تھا کہ اس کیلئے اوقات کا تعین کر سکتیں مگر صبح ہوئی تو حسنین کا ہاتھ پکڑ کر جنت البقیع میں چلی جاتی تھیں۔ جنت البقیع زیادہ دور نہیں ہے۔ صرف درمیان میں بنی ہاشم کا محلہ ہے۔ حسنین کا ہاتھ پکڑ لیتی تھیں اور جنت البقیع میں چلی جاتی تھیں۔ ہوتا یہ تھا کہ ادھر فاطمہ زہرا نے رونا شروع کیا، اُدھر بچے شریک گریہ ہوگئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر وقت مسلسل مجلس برپا رہتی تھی۔ تو اس لئے سیدہ عالم نے چاہا کہ جب میں جاؤں تو میرے ساتھ جو شریک غم ہیں، جو ہم نوائے نالہ و فریاد ہیں، انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اس لئے حسنین کو اپنے ساتھ لے کر جاتی تھیں اور دن بھر روتی رہتی تھیں۔ شروع میں کوئی سایہ نہ تھا، زیر سایہ آفتاب بیٹھی رہتی تھیں۔ تو امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حجرہ بنا دیا جس کا نام بیت الحزن تھا۔ جب تمام روضے جنت البقیع کے برباد ہوئے تو سیدہ عالم کی وہ یادگار بھی مسمار کر دی گئی۔

50

شہید کی جو موت ہے

قرآن بھیجنے والے کو تو معلوم تھا کہ شہادت کا لفظ اتنا ارزاں ہو جائے گا۔ جو بھی کسی بھی صورت میں قتل ہوا، اسے شہید ہی قرار دے دیا جائے گا۔

لہٰذا خالق نے دونوں آیتوں میں لفظ استعمال ہی نہیں کیا بلکہ معیار شہادت بتایا کہ ہم سے سنو کہ اصل شہادت کا نتیجہ زندگی جاوید کیونکر بنتا ہے؟ قتل ہو اللہ کی راہ میں!

جب شیطان لڑ رہا تھا، اس وقت بھی رب رب کہہ رہا تھا۔ میرے مالک، میرے پروردگار۔ یعنی اسے برابر مانے جا رہا تھا۔ اسی کی خدائی کا قائل تھا۔ فرعون و نمرود کی طرح انکار نہیں کر رہا تھا۔ مگر خدا نے کہا کہ مجھے ایسے سجدے نہیں چاہئیں۔ جن کے سامنے جھکنے کیلئے میں کہوں تو ان کے سامنے جھکنے سے انکار کرے۔ یعنی منظور نظر افراد سے سرتابی مجھ سے سرتابی۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ قرآن و حدیث کے مطالعہ کی بناء پر عرض کر رہا ہوں کہ اگر سزا کا علان ہے تو وہ ٹل سکتا ہے مگر جزا کا اعلان ٹلنے والا نہیں ہے۔

گھر کی نسبت کسی شخص کی طرف نجی اور ذاتی ہوتی ہے اور عرش کی نسبت تخت سلطنت، یہ منصبی ہوتی ہے۔ تو جسے گھر کہا تھا، جب نجی کام لینا ہوا، گھریلو، کسی کا زچہ خانہ بنانا، تو اسے منتخب کیا اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا، وہاں بلا لیا۔

شہید کی جو موت ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا‌ ؕ بَلۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ۝۱۶۹

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"۔

یہ آیت شہیدوں کے زندۂ جاوید ہونے کو بتاتی ہے۔ یعنی حیاتِ شہداء کا ثبوت دیتی ہے۔ مگر ایک پہلو غور طلب ہے کہ ہمیں ان ہستیوں کا نام معلوم ہے کہ انہیں شہید کہتے ہیں اور اس کی جمع شہداء ہے۔ اسی لئے ہم نے کہا کہ یہ حیاتِ شہداء سے متعلق ہے۔ لیکن اس آیت میں شہداء کا لفظ استعمال نہیں ہوا، حالانکہ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مختصر لفظ سے مفہوم ادا ہو جائے تو اُسے پھیلا کر کئی الفاظ میں ادا نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر یہ تھا کہ کہا جاتا کہ شہداء کو مردہ نہ سمجھو۔ کیا یہ ہماری بنائی ہوئی اصطلاح ہے کہ ہم ان لوگوں کو شہداء کہتے ہیں؟ یہ بات بھی از روئے قرآن غلط ثابت ہے۔ یہ اصطلاح علماء کی وضع کردہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں یہ لفظ ان معنی میں موجود ہے:

"مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ"۔

"جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن کو اس نے اپنی نعمتِ خاص سے نوازا ہے۔ وہ نبیین، صدیقین، شہداء، صالحین"۔

دیکھئے! یہاں شہداء کا لفظ موجود ہے۔ تو پھر یہ تصور تو غلط ثابت ہوا کہ یہ محاورہ علماء کا قرار دیا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاح موجود ہے تو پھر لفظ شہداء کیوں نہ کہا گیا؟ شہداء کے لفظ کی بجائے یہ اتنا جملہ کیوں لایا گیا:

"اَلَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ"۔

تو اس پر غور کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض الفاظ کو اگر اکیلا استعمال کیا جائے اور ان کی تشریح نہ کی جائے تو ان کی القاب کی سی حیثیت ہو جاتی ہے۔ اگر کہا جاتا کہ شہیدوں کو زندۂ جاوید سمجھو یا شہیدوں کو مردہ نہ سمجھو تو شہید کا لفظ ہمارے ذہن کی پیداوار کا پابند ہو جاتا کہ جسے ہم شہید سمجھ لیں، بس پھر وہ زندۂ جاوید ہے۔ یعنی شہداء کے لفظ کی تشخیص کرنا کہ کون کون شہداء ہیں؟ پھر وہ ہمارا کام ہو جاتا کہ ہم بتائیں کہ کون کون شہداء ہیں۔ قرآن بھیجنے والے کو تو معلوم تھا کہ شہادت کا لفظ اتنا ارزاں ہو جائے گا کہ جو بھی کسی بھی صورت میں

قتل ہو، اُسے شہید ہی قرار دے دیا جائے گا۔ اسے دیکھا ہی نہیں جائے گا کہ کس راہ میں شہید ہوا یعنی قتل کس راہ میں ہوا؟ بس ادھر قتل ہوا، اُدھر شہید ہو گیا۔ چاہے جس وجہ سے قتل ہو۔ بلکہ اکثر تو اس مشاہدہ کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ قتل ہوا، بس ایک قبر دیکھ لی اور اُسے مرجعیت دینا ہوئی تو کہہ دیا کہ شہید کی قبر ہے۔ نذرانے چڑھنے لگے، چڑھاوے آنے لگے۔ تو گویا لفظ شہید ہمارے محاورات کا پابند ہو جاتا۔ لہٰذا خالق نے دونوں آیتوں میں لفظ شہید استعمال ہی نہیں کیا بلکہ معیارِ شہادت بتایا کہ ہم سے سنو کہ اصل شہادت کا نتیجہ زندگیِ جاوید کیونکر بنتا ہے؟ قتل ہو اللہ کی راہ میں۔ اب قتل ہونا تو آنکھ دیکھ سکتی ہے مگر اللہ کی راہ کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم آپ تڑپتا ہوا لاشہ دیکھ سکتے ہیں، زخمی جسم دیکھ سکتے ہیں، زخموں کو شمار کر سکتے ہیں، گولیوں کے نشان دیکھ سکتے ہیں لیکن ہم آپ اللہ کی راہ کو نہیں دیکھ سکتے اور جب تک اللہ کی راہ کو نہیں سمجھیں گے، اس وقت تک شہید کہنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی شہید سمجھنے کا حق ہے اور جب شہید سمجھنے کا حق نہیں ہے تو زندۂ جاوید سمجھنے کا حق بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو اسی سے متعلق ہے جو اللہ کی راہ میں قتل ہو۔ بغیر مقصد کو دیکھے ہوئے ہم کسی مقتول کو شہادت کی سند نہیں دے سکتے۔

بات یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں جان کی کوئی قیمت نہ ہوتی تو ہماری جان تھی، جب چاہے دے دیتے اور جس صورت سے یہ جان جاتی، وصل جاتا۔ لیکن اس جان کی بھی پیشِ خدا قیمت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہماری جان ہے، لہٰذا جب چاہیں دے دیں۔ اس کیلئے ایک مختصر دلیل یہ ہے کہ اگر اپنی جان ہوتی تو خودکشی جرم ہی نہ ہوتی۔ خودکشی کا گناہ اور جرم ہونا ثبوت ہے اس کا کہ یہ جان اپنی نہیں ہے۔ متفق علیہ اسلامی قانون کی روشنی میں دیکھئے۔ اگر جان کی قیمت نہ ہوتی تو یہ حکم ہوتا کہ روزہ رکھو اور مکمل کرو۔ زیادہ سے زیادہ مر ہی تو جائیں گے۔ خدا کے ایک حکم کے سلسلہ میں جان جائے گی تو کیا کہنا۔ لیکن جی نہیں! جان کی قیمت اس کی نظر میں ہے کہ روزہ اگر مضر ہے تو ناجائز۔ اگر اندیشہ ہے کہ بیمار ہو جاؤ گے، تب بھی روزہ نہ رکھو۔ اگر بیمار ہو اور اندیشہ ہو کہ بیماری میں طول ہو جائے گا، تو بھی روزہ نہ رکھو۔ اگر روزہ رکھا تو وہ باطل ہوگا اور فاقہ ہوگا، روزہ نہیں ہوگا۔ ضعیفی ہے، اولاد منع کرتی ہے کہ روزہ نہ رکھئے، آپ کیلئے نقصان دہ ہے۔ ڈاکٹر بھی بتاتے ہیں کہ روزہ رکھنا صحت کیلئے مضر ہے۔ عالمِ دین سے پوچھا تو انہوں نے بھی روزہ نہ رکھنے کیلئے کہا تو روزہ نہیں رکھنا چاہئے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ عمر بھر تو روزے رکھتے رہے، اب جب دنیا سے چل چلاؤ ہے، تو روزہ نہ رکھیں؟ یعنی اس عبادت کو آخر وقت میں ترک کریں؟ ہماری طبیعت اس کیلئے آمادہ نہیں ہے۔

احکامِ شرع کی روشنی میں مَیں تو یہ کہوں گا کہ عمر بھر تو عبادت کرتے رہے اور اب چلتے وقت بھی گناہ نہ کریں۔ وضو مضر ہے، نہیں وضو نہ کرو، شرع کا حکم ہے تیمم کرلو۔ جیسے روزہ ساقط تھا، یہاں وضا کا نائب رکھ دیا گیا کہ اگر وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کرلو۔ نماز وہی مرتبہ رکھے گی جو وضو کے ساتھ ہوتی۔ نمازی حضرات کہتے ہیں کہ تیمم سے نماز دل کو نہیں لگتی۔ بعد میں قضا کر کے پڑھ لیں گے۔ تو بعد میں پڑھ لیں گے تو یہ ترکِ نماز گناہ ہوگا۔ وہ جو آپ کے دل کو نہیں لگتی، وہ خدا کو قبول ہے۔ تو اگر آپ دل کی خاطر نماز پڑھا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، تیمم کر کے نماز نہ پڑھئے اور اگر خدا کے حکم سے نماز پڑھتے ہیں تو جب اس کا حکم وضو کا تھا، وضو کیجئے اور جب اس کا حکم تیمم کا ہے تو تیمم کیجئے۔ آپ کا دل کیا چیز ہے؟ عبادت کا تعلق اللہ کے حکم سے ہے، آپ کے دل سے نہیں ہے۔ اگر غسل کی ضرورت ہے اور غسل نہیں

ہوسکتا تو غسل کا بدل وہی تیمم۔ حالانکہ اگر یہاں دنیاوی عقل سے کام لیا تو پھر دل یہ کہے گا کہ صاحب! غسل میں تو تمام جسم صاف ہوتا، اگر غسل نہیں ممکن ہے تو وضو ہی اس کا قائم مقام ہو جاتا، کم از کم اتنا حصہ تو صاف ہو جاتا لیکن شریعت کیا کہتی ہے کہ اگر دس دفعہ وضو کر لو گے غسل کے بدلے تو کام نہیں چلے گا، ایک دفعہ تیمم کر لو۔

یہاں دیکھئے کہ طبیعت پر کتنا بار ہے کہ بجائے صاف وضو کے میلے ہو جاؤ اور مٹی مل لو۔ مگر غسل ممکن نہیں ہے۔ تو ہم اپنی عقل سے وضو کو اس کا قائم مقام نہیں بنا سکتے جسے اس نے قائم مقام بنایا۔ ایک اپنا عمل اُس کا جانشین تو ہم نہیں بنا سکتے اور اس کے رسول کا جانشین ہم بنالیں!

اگر ہماری جان اس کی نظر میں کوئی قیمت نہ رکھتی تو کیوں یہ حکم ہوتا اور کہا جاتا کہ مرجاؤ مگر روزہ رکھو۔ چاہے مرجاؤ مگر غسل وضو ضرور کرو۔ معصومین کے زمانہ میں ایسے جاہل قسم کے بخیال خود عبادت گزار تھے۔ ایک شخص بیمار تھا۔ تیمارداروں کو معلوم ہوا کہ اسے غسل کی ضرورت ہے۔ وہ اتنا بیمار تھا کہ خود غسل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تیمارداروں نے اس کو غسل دے دیا، نہلا دیا۔ اُس سے اُس کی تکلیف بڑھ گئی۔ نہلانے سے بہت ہی مہلک مرض اسے ہو گیا۔ کسی نے جا کر امام سے بیان کیا کہ یہ ہوا ہے۔ آپ نے اس کے تیمارداروں کیلئے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

"قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللهُ"۔ "انہوں نے اس کو قتل کیا، اللہ انہیں قتل کرے گا"۔

یہ تہذیب معصومین میں سخت ترین جملہ ہے جو ارشاد فرمایا اس جاہلانہ ذوقِ عبادت پر۔ تو جان ہماری اس کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتی ہوتی تو یہ حکم کیوں ہوتا؟ اسی طرح حج۔ اگر راستہ غیر مامون ہے، خطرۂ جان ہے تو حج ضروری نہیں۔ شرائط استطاعت میں امنیت راہ داخل کہ راستہ پُرامن ہو، غیر معمولی خطرۂ جان نہ ہو۔ تو ان تمام احکامات میں جان کی حفاظت پیش نظر رکھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری جان اس کے نزدیک قیمت رکھتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اندھا دھند جان نہیں دینی کہ کیا ہوگا؟ گولی ہو تو کھالیں گے، لوگ کہیں گے کہ بہت بہادر ہیں۔

یاد رکھئے کہ دنیا کے مقابلہ میں بہادری بہت قابل تعریف ہے۔ اللہ کے مقابلہ میں بہادری قابل تعریف نہیں ہے۔ اگر موقع ایسا ہے کہ حفاظت جان واجب ہے تو یہ بہادری نہیں ہے۔ یہ در حقیقت احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں جرأت ہے۔ یوں تو بڑا بہادر شیطان تھا جس نے (معاذ اللہ) اس کے منہ پر کہہ دیا۔ آجکل اس کو اخلاقی جرأت کہا جاتا ہے۔ اس بے باکی کو اخلاقی جرأت کہتے ہیں۔ یقیناً شیطان بڑی اخلاقی جرأت رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ مٹی کے پتلے کے سامنے میں سر جھکاؤں۔ مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس کو سجدہ کروں جبکہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے، یہ خاک سے پیدا ہوا ہے۔ تو میں اس کے سامنے سر کیونکر جھکاؤں؟ تو کتنا عذابِ الٰہی نازل ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے راندۂ درگاہ ہو گیا حالانکہ بیچارہ اپنے خیال میں ایک طرح کے شرک سے بچ رہا تھا۔ اللہ کو بے شمار سجدے کر چکا تھا۔ غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے سے بچ رہا تھا تو خالق اتنا ناراض کیوں ہوا؟ سمجھتا کہ اس نے مجھ کو بہت سجدے کئے ہیں، خیر اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتا تو نہ سہی، اب بھی میرے سامنے سجدے کا وقت آئے گا تو ضرور

سجدہ کرے گا۔ واقعی کرتا۔

میں کہتا ہوں کہ جب لڑ رہا تھا، اس وقت بھی رب رب کہہ رہا تھا۔ میرے مالک! میرے پروردگار! یعنی اسے برابر مانے جا رہا تھا۔ اس کی خدائی کا قائل تھا۔ فرعون نہیں تھا کہ دعوائے خدائی کر دے۔ نمرود نہیں تھا کہ دعوائے اُلوہیت کر دے۔ برابر اس کی ربوبیت کو سرنامہ خطاب قرار دے رہا ہے۔ رب رب ہر قدم پر۔ ہر جملے میں رب کہہ رہا تھا۔ مگر خدا نے کہا کہ مجھے ایسے سجدے نہیں چاہئیں جن کے سامنے جھکنے کیلئے کہوں تو ان کے سامنے جھکنے سے انکار کرے۔ یعنی منظورِ نظر افراد سے سرتابی مجھ سے سرتابی ہے۔

انسان اس کے احکام سے سرتابی کرے، اپنے ذوق کی بناء پر، اپنے دل کی خاطر کہ میری طبیعت کو یہ نماز نہیں لگتی۔ میرے دل کو یہ وضو نہیں لگتا۔ یہ احکامِ خدا سے سرتابی ہے، انحراف ہے۔ معلوم ہوا کہ ہماری جان اس کی نظر میں قیمت رکھتی ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جان اندعادعند نہیں دیتا ہے۔ جب جان جانے کا خطرہ ہو تو یہ دیکھتا ہے کہ جان جائے گی تو سوارت ہوگی یا اکارت جائے گی۔ یہ سوارت اور اکارت ہونے کا تعلق مقصد سے ہے۔ اگر پست مقصد کیلئے یا بلا مقصد ہوگئی تو اکارت گئی اور بلند مقصد کی خاطر جان گئی تو سوارت ہوئی۔

میں نے کل عرض کیا تھا کہ انسان سے بالاتر بس خالق ہے۔ پس اگر اللہ کی راہ کے سوا کسی دوسرے مقصد کیلئے جان گئی تو وہ اکارت گئی اور ہلاکت ہوئی اور اگر اللہ کے مقصد کی خاطر جان گئی، وہ سوارت ہوئی۔ وہ سنتِ کائنات کے مطابق ہے۔ یعنی سنتِ کائنات یہ ہے کہ پست بلند پر قربان ہو۔ جمادات نباتات پر قربان ہوئے، نباتات حیوانات پر قربان ہوئے اور حیوانات انسان پر قربان ہوئے۔ تو اب اگر انسان قربانی پیش کرے تو اپنے سے بالاتر کی خاطر اور اسے بالاتر صرف اللہ ہے۔

مگر اب صاحبانِ فہم غور کریں کہ اب ایک مشکل ہے کہ اس سے پہلے ہر ایک شے جو اپنے سے بلند کی خاطر قربان ہوتی تھی، وہ بلند محتاج ہوتا تھا یعنی پودے غذا کے محتاج ہیں، اجزاء کے محتاج ہیں۔ زمین نے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ان اجزاء کو جو اس لائق تھے کہ پودے کا جزو بن سکیں، اس کی خاطر پیش کر دیا، یہ قربانی ہوئی۔ تو پودا محتاج تھا ان ذرات کا۔ اگر یہ ذرات اس میں شامل نہ ہوتے تو پودے کی ہستی قائم نہ ہوتی۔ اس ضرورت کو زمین نے پورا کیا تو قربانی ہوئی۔

اسی طرح نباتات انسان اور حیوان کے کام آئے۔ تو حیوان محتاج غذا تھا۔ اگر غذا نہ ملے تو یہ ہلاک ہو جائے۔ پودوں نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اپنی ہستی کو فنا کر دیا، اس کی غذا رسانی کیلئے۔ پھر بقا حاصل ہوئی اور ترقی کا درجہ ملا۔ حیوان میں شامل ہو گئے۔ پس حیوان محتاجِ غذا تھا لیکن انسان سے جو بلند تر ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، نہ اُسے کوئی ضرورت ہوتی ہے، نہ اس کے دامن پر گردِ تغیر و زوال و انتقال آسکتی ہے۔ تمام دنیا اس کے سامنے سربسجود ہو جائے، تو اس کے جاہ و جلال میں ذرہ بھر اضافہ نہیں اور سب مل کر منکر ہو جائیں تو اس کے جاہ و جلال و جبروتِ قدرت میں ذرہ بھر کمی نہیں۔ اس کیلئے فوج و لشکر کی ضرورت نہیں۔ فوج و لشکر سب مخلوق ہیں، وہ جب چاہے ان کو تباہ کر دے۔ اس کی ذات ان کی محتاج نہیں ہے۔ ایسی بے نیاز مطلق ہستی ہے کہ نہ انکار سے اس کا نقصان، نہ اقرار سے اس کا فائدہ۔

ہم نے ایک ملک کے متعلق سنا، صحیح وغلط کا پتہ نہیں۔ اس ملک والوں نے یہ کہا کہ ہم نے خدا کو اپنے ملک سے نکال دیا ہے۔ اب خبریں آنے لگیں کہ وہاں مدرسے اور مسجدیں کھل گئے یعنی ہوا اس عبادت کی آزادی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا آ گیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے خدا کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ زبان ان کے منہ میں ہے، جو مرضی کہہ دیں۔ لیکن ان کے کہنے سے کیا واقعی وہ نکل ہی گیا؟ یہ تو ان کا کہنا ہے کہ نکال دیا لیکن واقعی کیا وہ ان کے ملک سے نکل گیا، چلا گیا؟ یہ اُس ملک والوں نے کہا۔ جس شخص نے بھی سائنس پڑھ لی تو ترقی کی نشانی یہ سمجھ لی کہ میری سمجھ میں تو خدا کا وجود نہیں آیا، حالانکہ ذہن کے اندر نہ اقرار ہے، نہ انکار ہے۔ لیکن اس بات کا اظہار فیشن کی بناء پر ہے کہ میں فلسفی ہوں، میری سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آیا۔ باغی ہونا بہت ترقی کی نشانی ہے۔ سماج سے باغی، ماں باپ سے باغی، روایات خاندانی سے باغی اور سب سے بڑی اور اعلیٰ قسم یہ کہ خدا سے باغی۔

مجھے اس وقت فلسفے اور منطق کی کوئی بحث نہیں کرنی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ بڑے باغی ہیں تو جب جانوں کہ جب آپ پورے باغی ہوں، جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔ حالانکہ کتنے ہی بڑے بلند بانگ دعوے بغاوت کے کرنے کے عادی ہوں، جب اُس نے بھیجا، تب آئے اور جب وہ بلائے گا تو چلے جائیں گے۔ اس وقت بغاوت بھول جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ جس وقت آئے تھے تو کم از کم روئے تو تھے اور جب جانا ہوگا تو سانس تک نہ لیں گے، چپکے سے چلے جائیں گے۔ یہ ہے انسان، ضعیف البیان کی حقیقت بغاوت۔ یہ کیا بغاوت کر سکتا ہے؟ اگر وہ اپنے اختیار کو سلب کر لے، اس نے زبان اس کے دہن میں دے رکھی ہے تو اقرار کرے یا انکار کرے۔ لیکن وہ اس زبان کو خاموش کر دے تو یہ بات تو کرے؟ اُس نے ہاتھ دیئے ہیں اور اس کے ارادے کے تابع بنا رکھے ہیں تاکہ اس کا جوہر اختیار نمودار ہو۔ لیکن وہ اس ہاتھ کو بے حس و حرکت کر دے تو یہ جنبش تو کرے۔ اس نے پاؤں دیئے ہیں اور اس کے ارادے کے تابع بنا رکھا ہے کہ چاہے یہ ان پیروں سے صحیح راستہ پر چلے، چاہے غلط راستے پر چلے۔ لیکن وہ اس پیر کو معطل کر دے تو یہ ایک قدم چل کر تو دکھائے۔ عین اس وقت جب یہ کہہ رہا ہے کہ میں خدا کو نہیں مانتا، عین اسی وقت دل کی دھڑکن اطاعت کر رہی ہے، نبض کی جنبش اس کی اطاعت کر رہی ہے، خون کی روانی اس کی اطاعت کر رہی ہے۔ جتنی اطاعت اسے لینی ہے، وہ تو لے رہا ہے۔ ایک زبان اس کے قبضے میں ہے، زبان کے اس قبضہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اس کے خلاف استعمال کر کے انکار کر رہا ہے تو حقیقت میں اُس سے اسلام کا مطالبہ جو ہے، وہ صرف شرافت کا مطالبہ ہے کہ جس کی اطاعت جبری کرنی ہے، اس کی اطاعت اختیاری کر لو تو تمہارا جوہر انسانیت نمودار ہوگا ورنہ جو اطاعت اُسے لینا ہے، وہ تو وہ لے ہی لے گا مگر وہ اطاعت ایسی ہوگی جیسی پتھروں کی اطاعت ہے، جیسے درختوں کی اطاعت ہے، جیسے جانوروں کی اطاعت ہے۔ اگر انسانی اطاعت کرنا ہے تو اپنے ارادہ سے اطاعت کر لو۔ اس صورت میں اگر اطاعت کرو گے تو جزا کے مطالبہ کا تمہیں کوئی حق نہیں ہوگا اور ارادہ کے ساتھ اگر اطاعت کرو تو پھر جزا ہوگی۔ یہاں ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ دنیا کی حکومتوں میں مخالفت کی سزا ہے مگر موافقت کی جزا نہیں ہے۔ ایک دفعہ قانون کی خلاف ورزی کرے تو پکڑا جائے لیکن اگر عمر بھر قانون کے مطابق عمل کرے تو کوئی صلہ نہیں ملے گا۔ کہا جائے گا کہ تم رعایا ہو تمہارا لازمی تقاضا ہے اور وہ کہ جس کی ذاتی حکومت ہے، وہاں مخالفت کی سزا اور موافقت کی جزا ہے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ قرآن وحدیث کے مطالعہ کی بناء پر عرض کر رہا ہوں کہ اگر سزا کا اعلان ہے تو وہ ٹل بھی سکتا ہے مگر جزا کا اعلان ٹلنے والا نہیں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ سزا عمل سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جتنا گناہ، اُتنی سزا۔ جزا کیلئے کم از کم دس گنا کا اعلان کہ ایک نیک کام کرو گے تو دس گنا اس کی جزا ملے گی۔

کسی نے مجھے مدعو کیا، میں نے سوچا کہ پتہ نہیں مجھے کیوں مدعو کیا ہے؟ وہ وقت مقررہ پر آئے اور مجھے لے گئے۔ بعض لوگ بہت سے لوگوں کو مدعو کرتے ہیں تو جو بھی یاد آتا ہے، اُسے اپنے تعلقات کی وسعت کے مظاہرہ کے لئے بلا لیتے ہیں۔ آجکل جو احکامِ الٰہیہ پر عمل ہوتا ہے، اس میں بھی اپنے تعلقات کی نمائش ہوتی ہے، یہاں تک کہ افطارِ صوم کی دعوت ہے تو اس میں اکثر روزہ دار نہیں بلائے جائیں گے۔ جو بڑے لوگ ان سے متعلق ہیں، یعنی ان کے شایانِ شان ہیں، جن سے تعلقات قائم کرنا ہیں، انہیں مدعو کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ انہیں روزہ سے کوئی مطلب نہیں، اس کے معنی یہ کہ نام ہے افطارِ صوم کا اور مقصد اپنی دوستی اور تعلقات کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ایسے ہی اکثر نذر و نیاز وغیرہ کی جاتی ہے اور ان سے جو مقصد امدادِ غریباں کا ہے، وہ فوت ہو جاتا ہے۔ غریب آئیں تو ان کے کپڑوں کے میلے پن کو دیکھ کر رد کر دیا جاتا ہے اور جو ان کے حسبِ حیثیت ہیں، ان کو مدعو کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ نذر بارگاہِ معصومین میں قبول ہوگی یا نہیں اور خدا اسے قبول کرے گا یا نہیں کیونکہ اصل قبول کرنا تو اسی کو ہے۔ نذر اُن کیلئے ہوئی مگر قبول کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

پس انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، اس میں بہت زیادہ نمود و نمائش ہوتی ہے۔ جنابِ امیر علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں ایک گورنر کو بڑا سخت خط لکھا ہے کہ بصرہ میں ایک شخص نے تمہیں مدعو کیا، رؤسائے بصرہ میں سے ایک آدمی نے، اور تم وہاں بڑی تیزی سے گئے۔ یہ عتاب کا انداز ہے کہ بڑی تیزی سے، بڑے ذوق و شوق سے وہاں گئے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی کہ تم ایسے افراد کے ہاں دعوت میں جاؤ گے جہاں دولت مندوں کو بلایا جاتا ہے اور محتاجوں کو واپس بھیج دیا جاتا ہو۔ امیر المومنین علیہ السلام نے جس بات پر تنبیہ فرمائی تھی، وہ بات ہمارے ہاں ہو رہی ہے، اکثر عبادات کے انجام دینے میں۔ اس سے جو دینی فوائد ہیں، وہ مفقود ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں مادّی فوائد کا حصول ہی ساری اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ پس جو جان رضائے الٰہی کے سوا کسی اور مقصد میں صرف ہو تو وہ جان ضائع اور برباد ہوگی۔ پس جان دینے میں بہت سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوگی۔ جس کو خالق نے یوں کہا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو۔ مشکل یہ درپیش آئی کہ ہر چیز محتاج تھی۔ لہٰذا قربانی کا تصور تھا۔ لیکن انسان سے بالاتر جو ذات ہے، وہ کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی خاطر کیونکر قربان ہوں۔ اس کیلئے کس طرح جان دیں؟ اس مشکل کو آیہ قرآن نے ایک لفظ سے حل کیا اور وہ یہ کہ مقصدِ قربانی کو ان الفاظ میں ادا کیا:

"اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں"۔

ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ راہ عینِ منزل نہیں ہوتی۔ منزل اور ہوتی ہے، راہ اور ہوتی ہے۔ ہاں! راہ پر چل کر منزل ملا کرتی ہے۔ راہِ خدا کا مقصد یہ ہے کہ ان مقاصد کی خاطر جان دے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان مقاصد کی خاطر جان دینا فی سبیل اللہ جان دینا ہوا۔ مگر اللہ کی راہ کیونکر معلوم ہو؟ اگر منزل مادّی ہو یعنی جسمانی تو اشارہ سے بتائی جا سکتی ہے، مثلاً کوئی پوچھے کہ ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟ تو اگر وہیں جا رہا ہے تو کہہ سکتا ہے کہ میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ اور اگر اُدھر نہیں جا رہا تو اشارے سے بتا سکتا ہے کہ اُدھر چلے جاؤ۔ لیکن یہاں جس کا راستہ

ہے، وہ جسم و جسمانیت سے بری، آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا۔ کسی سمت خاص میں نہیں کہ اُدھر اشارہ کیا جائے، کسی مکان میں مقید نہیں کہ ادھر بتایا جائے۔ کوئی سمجھے کہ کعبہ ہے، اُدھر رُخ کر کے کہے کہ یہ ہے۔ تو ہر مسلمان جانتا ہے، جتنے لوگ خانہ خدا سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہاں اللہ رہتا ہے۔ بود و باش کا تصور کسی کو نہیں ہے۔ حالانکہ بیت اللہ کہتے ہیں اور بیت اللہ صرف نام کو نہیں کہتے۔ دور دراز سے وہاں حج کو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ اللہ وہاں رہتا ہے۔ تو جسے بیت اللہ کہا، اس کیلئے تو نہیں کہتے کہ اللہ یہاں رہتا ہے اور جسے اُس نے عرش کہہ دیا، اس کیلئے کہتے ہیں کہ اللہ وہاں بیٹھتا ہے۔ ایک عقلی بات کہتا ہوں، ہر ایک فیصلہ کرے کہ جسے بیٹھنے کیلئے جگہ کی ضرورت ہوگی، اُسے رہنے کیلئے مکان کی بھی ضرورت ہوگی اور جسے رہنے کیلئے مکان کی ضرورت نہیں، اُسے بیٹھنے کیلئے جگہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بھی نسبت ہے اللہ کا گھر اور وہ بھی نسبت ہے اللہ کا عرش۔ مگر جیسی نسبت ہوتی ہے، ویسا ہی اس کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے۔ یہ ہے اللہ کا گھر اور وہ ہے اللہ کا عرش۔ گھر کی نسبت کسی شخص کی طرف نجی اور ذاتی ہوتی ہے اور عرش کی نسبت تختِ سلطنت، یہ منصب کی ہوتی ہے۔ تو جسے گھر کہا تھا، جب نجی کام لینا ہوا، گھریلو، کسی کا زچہ خانہ بنانا تو اُسے منتخب کیا اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا، وہاں بلا لیا۔

کسی طرح معلوم ہو اللہ کا راستہ؟ اشارہ کر دیں تو کیا وہاں ہے؟ ادھر کہہ دیں تو کیا وہاں ہے؟ کون بتائے اللہ کا راستہ؟ اشارے سے بتایا نہیں جا سکتا۔ اب سادہ الفاظ میں ایک اصول بتاتا ہوں کہ جادہ شناس وہی ہوگا جو منزل شناس ہو۔ جو منزل کو جانتا ہوگا، وہی راستہ کو بھی جانتا ہوگا۔ اللہ کی راہ کو وہ جانے جو اللہ کی پوری معرفت رکھتا ہو۔ جب اللہ کی معرفتِ کامل رکھنے والا، جسے اُس نے رہنما بنایا ہے، وہ معرفت نہ رکھتا ہوتا تو رہنما کیوں بنایا جاتا؟ ہاں! ہم رہنما بناتے تو شاید وہ منزل سے واقف نہ ہوتا۔ جو اللہ کے بنائے ہوئے رہنما ہوتے ہیں وہ معرفتِ کامل رکھتے ہیں۔ وہی اس کی راہ کو بتا سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہ جعفریہ میں یہ اصول ہو گیا کہ بغیر اذنِ امام کے جہاد نہیں ہوتا۔ اب اگر امام سامنے ہیں، رسائی ہے ان تک، تو خاص انہی سے پوچھا جائے گا۔ پھر جتنے عالم ہیں جن کی امام تک رسائی ہے، جس طرح آپ عالم سے مسئلہ پوچھنے کے محتاج، اسی طرح عالم امام سے مسئلہ پوچھنے کے محتاج۔ لیکن غیبت کے زمانہ میں، اوصاف کے لحاظ سے جنہیں انہوں نے حقوق دیئے ہوں، جن کے بارے میں کہا ہو کہ جب ہم تک رسائی نہ ہو تو یہ اوصاف جن میں پائے جائیں، وہ ہماری طرف سے ہمارے نائب ہیں۔

اس لئے جب وہ حضرات سامنے تھے، پیغمبرِ خدا اپنے دَور میں اور ان کے بنائے ہوئے نامزد جانشین ہمارے آئمہ معصومین جب تک رہے، جب تک ان کے حکم سے جہاد نہ ہو، وہ جہاد نہیں ہوگا، جنگ نہیں ہوگی۔ وہ جنگ چاہے کسی مفادِ اسلامی کیلئے ہی ہو، جہاد اُسی وقت ہوگا جب ان کا اذن ثابت ہو۔ اس لئے بڑے بڑے صاحبِ اوصاف افراد نے بنی اُمیہ سے ٹکر لی اور شہید ہوئے۔

تو شہید اس معنی میں تو ہیں کہ مقتولِ ظلم ہیں لیکن وہ شہادت جو اصطلاحی شہادت ہے، جس میں غسل و کفن نہیں ہوتا، وہ صرف اسی وقت ہوگی جب میدانِ جنگ میں امام کی اجازت سے ہو۔ معصوم کی اجازت سے ہو۔ اسی لئے ان لڑائیوں کو، جو چاہے مظلوم حیثیت سے لڑی گئی ہوں، بنی اُمیہ کے مقابلہ میں، لیکن چونکہ ثابت نہیں ہے کہ ہمارے آئمہ کی تائید اس میں شامل ہے، اس لئے ہم نے ان لڑائیوں کو وہ درجہ نہیں دیا جو اُن لڑائیوں کو دیا ہے جن میں معصومین شریک تھے۔

51

شہید کی جو موت ہے

جو ایمان وعمل کے جتنے درجہ پر فائز ہے اتنے درجہ اس کو ولایت الٰہی حاصل ہے اور یوں بحیثیت منصب ولی وہ ہے جسے وہ خود مقرر کرے۔

میدان جنگ میں آ کر اختیاری بات تو ثابت قدم رہنا ہے۔ مسلمانوں میں دو معزز لقب ہیں، غازی اور شہید۔ یعنی زندہ رہے تو غازی، مر گئے تو شہید۔ اگر ہمارا وار چل گیا، دشمن کو ختم کر کے زندہ واپس آ گئے تو غازی ہو گئے۔ اگر اس کا وار چل گیا اور ہم گر گئے زخمی ہو کر تو شہید ہو گئے۔ نہ غازی ہونا اپنے اختیار میں، نہ شہید ہونا اپنے اختیار میں جما رہنا اپنے اختیار میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ملک (فرشتے) کو میں کیا کروں کہ اس نے شہید ہونے والوں کا کلمہ نہیں پڑھا۔ جو زندہ واپس آ گیا، اس کا کلمہ پڑھا "لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار"۔

جو آل رسولؐ کی محبت میں دنیا سے گیا، اس کی پیشانی پر آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا کہ یہ رحمت خدا کا حقدار ہے۔

ایک طبقہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ فاتحہ دلواتے ہو، اس میں غذا رکھتے ہو تو کیا مرنے والا غذا کھائے گا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر کھاتا نہیں ہے تو خدا نے کیوں کہا ہے کہ رزق حاصل کرتا ہے۔ جو کھاتا نہ ہو، اس کو رزق کی کیا ضرورت ہے؟

شہید کی جو موت ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۟

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"۔

میں نے عرض کیا تھا کہ شہید کیلئے غسل و کفن نہیں ہے۔ تو پوچھا یہ گیا ہے کہ جو نائب امام کے حکم سے جہاد شروع کیا جائے، کیا اس میں شہید ہونے والے کیلئے بھی غسل و کفن نہیں ہوگا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اس میں شرع کی تمام شرائط پوری ہو گئیں تو جہاد ہے اور اس میں شہید ہونے والے کیلئے غسل و کفن نہیں ہے۔ فقہی احکام اسی شہید کے ساتھ مخصوص ہیں جو اس قسم کے جہاد کے معرکہ جنگ میں شہید ہو۔ لیکن اگر کوئی ظالم خواہ خدمت دین کی بناء پر کسی کو قتل کر دے تو وہ مقتول ظلم کے معنی میں شہید ہے لیکن فقہ کے احکام اس آیت میں جو اعلان حیات جاودانی کیلئے کیا گیا ہے، وہ اس شہید کے ساتھ وابستہ ہیں جس پر فقہ کے اصول مرتب ہوں۔ اس حیات جاودانی کا معیار "قتلوا فی سبیل اللہ" ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو۔

فرض کیجئے کسی شخص کو نصرت دین کی وجہ سے کسی نے نشانہ ظلم بنا دیا۔ اگرچہ معرکہ جنگ میں شہید نہیں ہے لیکن قتل ہونا راہ خدا میں یقینی ہے، لہٰذا قرآن مجید کا اعلان اس کیلئے بھی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے راہ خدا میں جدوجہد اتنی کی کہ جس کی بناء پر اس کے قویٰ متحمل نہ ہو سکے اور وہ زیادہ زندہ نہ رہ سکا تو وہ قتل تو نہیں ہوا ہے مگر موت اس کی راہ خدا میں ہے۔ یہ حیات جاودانی کی جو آیات ہیں، ان میں "انما" کے معنی ہوتے ہیں ایک شے کا ثبوت اور اس کے غیر کی نفی۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ الخ۔

اس "اِنَّمَا" کے معنی یہ ہے کہ بس یہی ولی ہیں اور دوسرا کوئی ولی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کو ولی ماننا غلط ہے۔ ایک بہت بڑے ادیب تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں اولیا نہیں ہوتے؟ یعنی ہمارے گروہ میں اولیا نہیں ہوتے۔ یہ کیا بات ہے؟ میں کہا کہ اولیاء ہمارے ہاں کوئی الگ قوم نہیں ہے۔ جو ایمان و عمل کے جتنے درجہ پر فائز ہے، اتنے درجہ اس کو ولایت الٰہی حاصل ہے اور یوں بحیثیت منصب ولی وہ ہے جسے وہ خود مقرر کرے۔

آیہ تطہیر میں کلمہ حصر ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۟

اسی طرح یہ آیت جو میں نے سرنامہ کلام بنائی، چوتھے پارے میں ہے۔ اس میں "اِنَّمَا" کلمہ حصر نہیں ہے۔ اس آیت کا پس منظر کچھ یوں ہے، مختصراً عرض کرتا ہے۔ معرکہ احد کا نتیجہ کچھ یوں ہوا کہ کثرت سے لوگ شہید ہوئے اور جنہیں جان زیادہ عزیز تھی، انہوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ جان بچ جائے۔ بہت محتاط الفاظ میں بیان کروں تو بھی حقیقت تو سامنے آئے گی۔ قرآن مجید کی آیات ہیں، کوئی روایت تو نہیں ہے۔ ناموں کا سوال نہیں، قرآن مجید میں نام نہیں ہیں اور میں بھی نام کب لے رہا ہوں، اور جو ایک اجتماعی عمل ہو، اس میں نام کہاں کہاں تک لئے جائیں۔

جنگ ختم ہوگئی، بہت لوگ شہید ہو گئے۔ جو لوگ میدان سے ہٹے ہیں، ان کی آپس میں گفتگوئیں ہیں۔ یہ گفتگوئیں اس میدان سے ہٹنے کے عمل سے زیادہ خطرناک ہیں، دینی حیثیت سے، یعنی میدان جنگ سے جان بچانے کیلئے ہٹنے کو تو ایک بشری کمزوری کہا جاسکتا ہے لیکن اس گفتگو سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلوں میں ایمان ہے ہی نہیں۔ اس کو اس عمل سے چسپاں کیجئے تو اس عمل کا پس منظر ان لوگوں کی آپس کی گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہے جسے حضرت علی علیہ السلام نے ایک جملے سے تجزیہ کر کے بروقت بتا دیا تھا۔

وہ جملہ وہ ہے جسے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے، جو محقق ہند کہلاتے ہیں، مدارج النبوۃ میں تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ہندوستان میں منشی نولکشور نے چھاپی ہے جو ایک غیر جانبدار مطبع ہے۔ شاہ عبدالحق نے اس موقع پر لکھا ہے کہ میدان جنگ میں صرف ایک ذات رہ گئی تھی، حضرت علی علیہ السلام کی، آپ پیغمبر خدا کو تلاش کرتے ہوئے ایک گڑھے کے قریب پہنچے تو انہیں اس گڑھے میں زخمی حالت میں دیکھا۔ نفسیاتی طور پر چند جملے ہیں کہ اگر ان کا پس منظر سامنے نہ ہو تو وہ سمجھ میں نہیں آئیں گے کہ کیوں ارشاد فرمائے۔

میں کہتا ہوں کہ جماعت کے کردار پر پیغمبر کا غیظ وغضب اتنا تھا کہ اب علی جو سامنے نظر آئے تو فرماتے ہیں: "تم بھی کیوں نہیں چلے گئے؟" ہر شخص اس جملے کی روح کو دیکھ سکتا ہے۔ دل کی کس کیفیت کا مظہر ہے کہ "تم بھی کیوں نہیں چلے گئے؟" بس علی جیسا مزاج شناس رسول ہونا چاہئے کہ ایک جملے سے پیغمبر خدا کی کیفیت مزاج کو بدلا۔ علی نے جواب دیا:

اَاَكْفُرُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ۔

"کیا ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا؟"

میں کہتا ہوں کہ علی علیہ السلام کا یہ کہنا اور پیغمبر خدا کا تائیدی سکوت فرمانا بلکہ خوش ہو جانا، اس نے آج قرار و فرار کو معیار کفر و ایمان بنا دیا۔ اس سے قبل کی لوگوں کی جو آپس کی گفتگو ہے، قرآن میں درج ہے۔ کسی راوی کی بیان کردہ نہیں ہے۔ وہ عجیب وغریب ہے۔ طولانی گفتگو ہے۔ غور سے دیکھئے، میں خلاصہ سنا رہا ہوں۔

جن حضرات نے، جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ دو چار افراد نہیں ہیں کہ آپ کا ذہن خاص افراد کی طرف جائے، وہ کثرت جو میدان سے ہٹی تھی، بجائے اس کے کہ اپنے عمل پر شرمندہ ہو اور جو شہدائے احد ہیں، ان کی تعریفیں کریں، وہ آپس میں اپنے عمل پر گویا نازش کر رہے تھے کہ دیکھو! اگر یہ لوگ بھی ہماری طرح کرتے تو ما قُتِلُوا، پھر قتل نہ ہوتے۔ یعنی (معاذ اللہ) یہ سب احمق تھے جنہوں

نے جانیں دے دیں۔ ہماری طرح عقل سے کام لیتے اور دنیا نے تو عقل کا معیار یہی رکھا ہے۔ اگر ہماری طرح عقل سے کام لیتے تو "مَا قُتِلُوْا"، پھر قتل نہ ہوتے۔ پیغمبر خدا ہم سے کبھی رائے نہیں لیتے تھے۔ آجکل دنیا کہتی ہے کہ رسول ہر بات رائے سے کرتے تھے اور قرآن ان کی زبانی شکایت یہی کر رہا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سے تو رائے لی ہی نہیں جاتی۔ ہم سے تو کوئی مشورہ لیتا ہی نہیں۔ اگر ہم سے مشورہ لیا جائے تو ایسے روز ہائے بد کیوں دیکھنا پڑیں۔ آخر ہمیں بھی ان معاملات میں کوئی دخل ہے یا نہیں؟ آخر ہم جمہور ہیں تو ہمارا دخل ہونا چاہئے ان باتوں میں۔

لَوْ كَانَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا۔

"اگر ہمیں کوئی اس امر میں دخل ہوتا تو ہم کیوں قتل ہوتے؟"

اب ان قتل ہونے والوں میں اپنے کو بھی شامل کرلیا۔ وہ کبھی ان میں شامل نہیں ہوتے، یہ ان میں شامل ہوگئے۔ "مَا قُتِلْنَا" تو اس طرح سے ہم قتل نہ ہوتے۔ یہ ہے پس منظر جس میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ تم ہٹنے کے بعد کیا موت سے بچے رہو گے؟ اس سے قبل کی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ جب ہم جانیں جب تم اپنے گھروں میں رہ کر موت سے بچ جاؤ۔ کیا اگر تم گھروں کے اندر رہے تو تمہیں موت نہیں آئے گی؟ جب ہم جانیں کہ تم بچ جاؤ اور رہ گئے یہ کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو۔

بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔

"بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں"۔

تو اصل میں یہ لوگ جو تصور کر رہے تھے کہ شہداء نے بیکار جانیں دیں، ان کی جانیں فضول گئیں، اس کے مقابلہ میں قرآن مجید میں شہداء کیلئے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے علاوہ جو عمر صرف کرے، راہ خدا میں، وہ زندۂ جاوید نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جو راہ خدا سے جان بچائیں، اس خیال سے کہ اس طرح ہماری زندگی بچ گئی، ان کے مقابلہ میں کہا جا رہا ہے کہ تمہاری زندگیاں بچی ہوئی نہیں ہیں۔ تم تو جب مرنا ہوگا، مرو گے اور مرو گے تو ہلاکت ہی ہوگی۔ ہاں! یہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو۔ چونکہ اصل گفتگو انہی میں تھی، ان کیلئے ان کا تصور یہ تھا کہ بیکار مر گئے۔ اس لئے کہا گیا کہ ان کو مرا ہوا نہ سمجھو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو میدان جنگ میں اس طرح سے نہ جائے، وہ مردہ ہے۔ وہ تو جب کوئی دلیل حصر ہوتی، انحصار کا ثبوت ہوتا۔ یہاں نہ پس منظر ہے، نہ انحصار۔

اب میں عقلی طور پر پہلے آپ کے سامنے اس سوال کو پیش کرتا ہوں، ماشاء اللہ صاحبان عقل وفہم ہیں، دو آدمی میدان جنگ میں آئے، دونوں نے بھرپور جنگ کی۔ ایک پر مقابل کا وار کام کر گیا، ایک پر دشمن کا وار کام نہیں کر سکا۔ یاد رکھئے کہ جزائے اخروی اعمال اختیاری پر منحصر ہوتی ہے۔ جب اختیاری کارنامہ عمل میں دونوں یکساں ہیں تو وار کا چلنا یا نہ چلنا اتفاق ہے۔ اللہ کے ہاں جزا اتفاق سے وابستہ نہیں ہوتی۔

اب جو عرض کر رہا ہوں، فرصت کے لمحات میں اس پر غور کیجئے گا، میدان جنگ میں آکر اختیاری بات تو ثابت قدم رہنا ہے۔ مسلمانوں میں دو معزز لقب ہیں غازی اور شہید۔ یعنی زندہ رہے تو غازی، مر گئے تو شہید۔ اپنے بس میں قائم رہنا ہے، برقرار رہنا ہے، ثابت قدم رہنا ہے۔ غازی ہونا بھی اپنے بس کا نہیں اور شہید ہونا بھی اپنے بس کا نہیں۔ ثابت قدم رہے، اگر ہمارا وار چل گیا دشمن کو ختم کر کے زندہ واپس آگئے تو غازی ہو گئے۔ اگر اس کا وار چل گیا اور ہم گر گئے زخمی ہو کر تو شہید ہو گئے۔ نہ غازی ہونا اپنے اختیار میں، نہ شہید ہونا اپنے اختیار میں۔ جما رہنا اپنے اختیار میں ہے۔

ایک بڑی حقیقت ہے جسے صاحبان فہم اپنی فہم کے اعتبار سے جانچ لیں عقلی طور پر کہ صحیح ہے یا نہیں! وہ یہ عرض کر رہا ہوں دینی حقیقت کہ اگر شہادت کے شوق میں میدان جنگ میں کوئی کمی ہو گئی دشمن کے مقابلہ میں تو یاد رکھئے کہ شہادت کی منزل دور ہو جائے گی۔ یعنی میدان جنگ میں ہر مجاہد کو یہ طے کر کے آنا چاہئے کہ ہمیں قاتل ہونا ہے، حالانکہ لوگ خونریزی سے بہت گھبرانے لگے ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ بہت زور شور سے پیش کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں خونریزی جائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام میں خونریزی نہ ہوتی تو جہاد کا حکم ہی نہ ہوتا۔ میں ایک مرتبہ الہ آباد گیا۔ یہ قصے تازہ تازہ تھے۔ میری اطلاع کے بغیر موضوع کا اعلان کر دیا گیا۔ جب میں گیا تو معلوم یہ ہوا کہ اسلام میں خونریزی نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔ اسلام خونریزی کا حامی نہیں ہے۔ اعلان ہو گیا۔

تو مجھے اس پر تقریر تو کرنا تھی۔ پہلے تو ایک اصولی بات کہی کہ ایک (debate) ہوتی ہے۔ اس قسم کا ایک رکھا موضوع ڈیبیٹ کا ہوتا ہے کہ کوئی موافق تقریر کرے، کوئی مخالف تقریر کرے۔ اس کے بعد رائے شماری ہوتی ہے، ووٹ لئے جاتے ہیں۔ وہ ڈیبیٹ کا موضوع ہوتا ہے۔ لیکن ایک مقرر کو جو موضوع دیا جائے، اسے جملہ تمام ہونا چاہئے۔ مثلاً اسلام اور خونریزی۔ اب یہ اس مقرر کا کام ہے کہ اسلام حامی ہے یا نہیں ہے۔ جب آپ نے خود ہی طے کر لیا کہ اسلام خونریزی کا حامی نہیں ہے تو پھر تقریر بھی خود ہی کر لی ہوتی۔ میری کیا ضرورت تھی؟ میں نے کہا کہ اگر اس میں ایک لفظ اور بڑھا دیا جائے تو پھر میں اس موضوع کی موافقت میں تقریر کرنے کیلئے تیار ہوں اور وہ لفظ یہ ہے کہ اسلام ناحق خونریزی کا حامی نہیں ہے۔

اب میدان جنگ میں جو شخص آئے، اسے یہ طے کر کے آنا چاہئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دشمنوں کی جان لیں گے اور قتل کریں گے۔ پھر اتفاق سے اگر دشمن کا وار چل جائے اور قتل ہو جائیں تو شہید ہیں اور اگر دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اس شوق میں کچھ رعایت کر دی کہ شہید ہو جائیں تو یاد رکھئے کہ یہ شوق شہادت باعث ہلاکت ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل معیار ثابت قدم رہنا ہے اور میدان جنگ میں کوتاہی نہ ہونا ہے۔ اب اگر کوتاہی نہ ہو جانے کے باوجود دشمن کی تلوار کام کر جائے تو پھر شہید ہو گا۔

اگر آپ غور کریں تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو بات اپنے بس کی نہ ہو، اس پر احکام شرع مرتب نہیں ہو سکتے، نہ خالق کی جزا ایسے امر سے متعلق ہو سکتی ہے جو اپنے اختیار سے وابستہ نہ ہو۔ اب میں آپ کے بالکل جانے پہچانے واقعات کو پیش کر کے آپ سے فیصلہ کروانا چاہتا ہوں کہ کیا ہر میدان میں جو شہید ہو جائے، اس کا رتبہ اونچا ہے اور جو شہید نہ ہو، اس کا رتبہ نیچا ہے؟

سب سے پہلی لڑائی بدر ہے غزوات اسلامی میں۔ اس میں ادھر سے تین سورما آئے۔ عرب کے بڑے منجھے ہوئے بہادر۔

عتبہ، شیبہ اور ولید ادھر سے نکلے۔ تینوں کے تعارف کیلئے ایک ہی گھر کا حوالہ کافی ہے۔ وہ جو عتبہ ہے، وہ امیر شام کا نانا ہے۔ شیبہ عتبہ کا بھائی ہے اور ہمارے محاورات میں نانا کا بھائی بھی نانا اور ولید اسی عتبہ کا لڑکا ہے۔ جو نانا کا لڑکا ہے، وہ ماموں ہوتا ہے۔ ہو گیا تعارف!

ادھر سے تین انصاری آئے۔ وہ تو بیڑا اٹھا چکے تھے نصرت کا۔ انہوں نے اپنے عمل سے اس کو نبھایا کہ ادھر سے تین انصاری گئے، مدینہ کے باشندے۔ انہوں نے کہا تمہارا نام؟ انہوں نے کہا: معاذ، معوذ اور تیسرے نے نام بتایا۔ انہوں نے کہا: ہم تم سے جنگ نہیں کرنا چاہتے۔ جاہلیت میں نسب کا غرور ہوتا تھا۔ کہنے لگے کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے۔ تم ہمارے برابر والے نہیں ہو۔ پیغمبر اسلام سے کہو کہ ہمارے برابر والوں کو بھیجیں۔ وہ واپس آ گئے۔ یہاں سے جناب حمزہ، پیغمبر کے چچا، ایک عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب، تیسرے علی ابن ابی طالب علیہما السلام۔ رشتہ میں جناب حمزہ سب سے بڑے تھے۔ یہ دونوں چچازاد بھائی تھے، وہ چچا تھے۔ جناب عبیدہ عمر میں ان سب سے بڑے تھے۔ پیرانہ سالی کی عمر میں تھے۔ ان سے چھوٹے حمزہ تھے، پیغمبر خدا کے ہم عمر تھے۔ عمر میں سب سے چھوٹے حضرت علی علیہ السلام تھے جن کے بارے میں اس کے بعد بھی مدتوں کہا گیا کہ یہ تو بچے ہیں۔ بچے کو بوڑھا بنانے کا شوق مجھے نہیں ہے۔ جو جس کی عمر ہے، وہ تو ہے۔ دنیا عمر کو پیدائش کے لحاظ سے گنتی ہے۔ جب سے یہ خلق ہوئے ہیں، اس وقت سے عمر نہیں دیکھی جاتی، وہ تو اس پیدائش کے لحاظ سے دیکھتی ہے۔ لہٰذا بے شک بچے ہیں مگر بچے کے معنی یہ ہیں کہ چوبیس پچیس برس کے۔ ان لوگوں میں سب سے کم عمر ہیں۔

اس سے پہلے پیغمبر اسلام کے مکہ کے دور میں جنگ کا سوال ہی نہیں تھا۔ لہٰذا انہیں تلوار چلانے کا موقع کب ملا۔ مدینہ آ کر پہلی جنگ ہے۔ تو جناب حمزہ تو آزمودہ کار سپاہی ہوں گے۔ عبیدہ کی عمر حمزہ سے بھی زیادہ تھی تو وہ عرب کی اور لڑائیوں میں شریک ہوئے ہوں گے۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام تو بالکل نمایاں بات ہے کہ پہلی دفعہ میدان جنگ میں گئے ہیں۔ مگر ان دونوں کے ساتھ ساتھ رسول نے انہیں بھیجا ہے۔ یعنی رسول کے لئے ان کی صفات محتاج تجربہ نہیں ہیں۔

انہوں نے ان کا نسب پوچھا۔ انہوں نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، برابر کی لڑائی ہے۔ ایک ہی خاندان کے ہیں۔ یہ بے شک ہمارے مد مقابل صحیح بھیجے ہیں۔ ایک اصول ان کے ہاں تھا کہ مقابلہ میں عمر کا تناسب بھی کرتے تھے۔ لہٰذا عبیدہ کا مقابلہ ہوا ان میں سے سب سے سن رسیدہ پہلوان سے۔ مگر وہ فنون جنگ میں بھی سب سے زیادہ ماہر تھا۔ ان کا اس سے سخت مقابلہ ہوا۔ جناب حمزہ کا مقابلہ ہوا عتبہ سے اور جناب علی علیہ السلام کا اس سے مقابلہ ہوا جو امیر شام کا حقیقی ماموں تھا۔ اسی پس منظر میں بعد کے سب واقعات ہیں۔ جناب حمزہ نے اپنے مقابل کو تہ تیغ کیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو سب سے جوان تھا ولید، اس کو تہ تیغ کیا۔ جناب عبیدہ نے شیبہ کو زخمی کیا۔ وار چونکہ کاری نہیں تھا، اس لئے زخمی ہونے کے بعد وہ نہیں گرا۔ اس نے جو وار کیا، اس سے جناب عبیدہ گر گئے۔ اس طرح وہ بدر کے پہلے شہید ہو گئے۔ علی ابن ابی طالب علیہما السلام اپنے حریف سے فارغ ہو چکے تھے۔ آپ کی زبان میں کہوں کہ نمٹ چکے تھے۔ لہٰذا وہی تلوار لے کر، جو کھنچی ہوئی تھی، اس حریف کی طرف چلے گئے جو زندہ کھڑا تھا۔ اب اسے تہ تیغ کیا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پہلے ہی معرکہ میں حمزہ کا کردار اکہرا رہ گیا، ان کا کردار دوہرا ہو گیا۔

اب آپ سے سوال ہے، آپ کے ضمیر انسانی اور ضمیر ایمانی سے کہ نتیجہ آپ کے سامنے جو مسلما ہے، وہ میں نے پیش کر دیا۔
اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا عبیدہ کا مرتبہ اس لئے اونچا ہو گیا کہ وہ جنگ کو سر نہ کر سکے اور علی کا کردار (معاذ اللہ) اس تصور میں گھٹ گیا کہ انہوں نے اپنے دونوں حریفوں کو تہہ تیغ کر دیا اور صحیح سلامت واپس ہوئے فتح یاب ہو کر؟ کیا عدل الٰہی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ علی کے کارنامہ کو پست کرے اور عبیدہ کے کارنامے کو بڑھائے؟ کسی کا ضمیر انسانی اس کیلئے تیار نہیں ہوگا۔ تو کیا جو شہید ہو گیا، اس کا درجہ اونچا ہے؟ یا جو زندہ رہا، اس کا درجہ اونچا ہے؟

اب آیئے دوسری جنگ عظیم احد۔ کتنے شہید ہو گئے۔ میں نے ابھی کہا کہ کارواں ہے شہیدوں کا اس میں۔ صرف جناب حمزہ نہیں ہیں۔ وہ اتنے ہیں کہ ان کے نام بھی ہمیں نہیں معلوم۔ ناموں کا معلوم نہ ہونا دلیل کثرت ہوتا ہے۔ ان سے کم جو میدان سے ہٹے مگر پھر بھی اتنے ہیں کہ ایک جماعت ہے اور کافی اچھی بڑی ہے جو میدان جنگ میں شہید ہوئی۔ اب صفحۂ میدان کے سادہ ہونے کے بعد، دونوں طرح سادہ ہوا، جو بیچارے شہید ہو گئے، ان سے بھی خالی ہو گیا اور جنہوں نے نقل مکانی کر لی، ان سے بھی خالی ہو گیا۔ اب میدان جنگ سادہ ہے اور ایک فرد واحد ہے جس نے بگڑی ہوئی جنگ کو بنا دیا۔ جس نے بظاہر اس فتحیاب جماعت کو پھر ایسی مکمل شکست دی اور اتنی دور بھگا دیا کہ اطمینان کے ساتھ رسول کے پاس آئے۔ ان سے باتیں کیں، گفتگو کی۔

میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے، میں کہوں گا کہ معیار فہم انسانی پر غور کیجئے۔ معیار عقل ایمانی پر بھی غور کیجئے کہ کیا وہ سب شہدائے احد افضل ہیں اور علی جو جنگ کو سر کر کے واپس آئے (معاذ اللہ) ان کا اس لئے درجہ گھٹ گیا کہ اسلام کو فتحیاب کر کے واپس ہوئے؟ آپ کا عقل وضمیر کیا فیصلہ کرتا ہے؟ یقیناً ان کا کردار بلند تر ہے۔ ت و مرتبہ عمل بھی بلند تر ہے اس کے لحاظ سے جزا بھی بلند تر ہے۔ اب آپ فیصلہ کیجئے یا نہ کیجئے، میں کہتا ہوں کہ فرشتہ کو میں کیا کہوں کہ اس نے شہید ہونے والوں کا کلمہ نہیں پڑھا، جو زندہ واپس آ گیا، اس کا کلمہ پڑھا:

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفَقَار۔

اس کے بعد پھر بڑی لڑائی ہے، جنگ خندق، جنگ احزاب۔ ادھر وہ ہزار کے مقابل والا ایک آ گیا جس طرح عبیدہ وہاں زخمی ہوئے تھے، بے شک یہ ایک سورما ایسا ہے کہ جس نے حضرت علی علیہ السلام کو زخمی کر دیا۔ یقیناً جو وہاں اس کا رعب جمارہے تھے کہ ہزار کے مقابلہ میں ایک ہے، اس سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو اس نے اپنے فنون جنگ کا مظاہرہ کر کے ثابت کر دیا۔ یعنی معلوم ہوتا ہے دنیائے کفر میں اس کا جواب نہیں تھا۔ ایک بات تو یہ کہ علی علیہ السلام کا کوئی بھی مد مقابل ایک وار کی آمد ورفت سے زیادہ نہیں ٹک سکا ہے۔ بس ایک وار۔ مگر یہ شخص حضرت علی کے سامنے اتنا جما ہے کہ ستر ضربوں کے ردّ و بدل کی نوبت آئی۔ ارے اگر دنیائے کفر میں ممتاز نہ ہوتا تو رسول کل کفر کیوں کہتے! استر ضربوں کے ردوبدل کی نوبت آئی۔

تاریخ نے مرقع کشی کی ہے کہ دونوں طرف کے بہادر۔ دونوں طرف کے سورما۔ ایک جیسے الفاظ استعمال ہوں۔ تو دونوں ادھر ادھر کے گرد کے حصار میں چھپ گئے تھے۔ بس تلوار کی ایک چمک دکھائی دے رہی تھی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام بہادر ہکا بکا

باپردہ دیکھ رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ ہی نہیں رہے تھے، دیکھتے دیکھتے کچھ دہل بھی رہے تھے کہ اب وہ کہیں یہاں تک نہ آجائے اور کچھ یوں محبت میں بشری حیثیت سے، غرض یہ کہ سب کی نظریں لڑی ہوئی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی دلیل ہے کہ قوت امامت سے جنگ نہیں کی جاتی تھی، فنون جنگ سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ انسانی طاقت سے لڑا جاتا تھا۔ طاقت امامت اور علم وہبی کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی مجال تھی کہ اتنی دیر تک رک سکے۔ ستر مرتبہ ردو بدل کی نوبت آئی اور ستر مرتبہ کے بعد اس نے تلوار ماری تو سر مبارک تک پہنچ گئی۔ امیر المومنین کے وار ہمیں معلوم ہیں کہ ہمیشہ سر پر تلوار ماری ہے اور دو پارہ کر دیا ہے۔ مرحب کے سر پر تلوار ماری اور خود کو کاٹا، سینے تک پہنچی۔ حضور سر پر وار کرتے تھے، دو پارہ کرتے تھے۔ یہ ان کا خاص وار تھا مگر یہ بھی دلیل ہے اس کے امتیاز خاص کی، اپنے شعبے میں کہ علی کو وار بدلنا پڑا۔ یعنی جو اسے بھی معلوم تھا کہ خاص وار یہ ہے۔ وہ اس سے بچتا رہا اور اس وار کا اس نے موقع نہ دیا جو ان کا خاص وار تھا۔

لہٰذا علی علیہ السلام نے سر کو دکھا کر کمر پر تلوار ماری۔ یہ وہ واحد شخص ہے جسے کمر پر تلوار مار کر زخمی کیا اور اس کے زخمی ہو کر گرنے کے بعد حضرت کو ضرورت ہوئی کہ اس کے سر کو قلم کریں۔ ابھی اس میں اتنی جان تھی کہ لعاب دہن اس نے روئے مبارک پر پھینکا۔ یہ اس کی بہادری کی دلیل ہے کہ اتنی جنگ کرنے کے بعد اور ہلاکت کے قریب ہو جانے کے بعد خوف سے منہ خشک ہو جاتا ہے مگر لعاب دہن کا باقی ہونا اس کی انتہائی بے جگری کی دلیل ہے کہ اس نے لعاب دہن چہرۂ مبارک پر پھینکا۔ حضرت اتر گئے اور پھر اس کا سر قلم کیا تاکہ اس کا قتل کرنا بالکل اللہ کی راہ میں ہو۔

اب واپس ہوئے تو زندہ واپس ہوئے ہیں۔ اسے قتل کر کے واپس ہوئے ہیں۔ زخمی سہی مگر یہ کہ صحیح سلامت واپس ہوئے ہیں۔ تو کیا اس لئے یہ کارنامہ غیر وقیع ہو گیا کہ یہ شہید نہیں ہوئے، زندہ واپس ہوئے ہیں؟ معاذ اللہ، اس لئے کارنامہ ہلکا ہو گیا؟ کیا آپ کا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ اور میں کیا کروں کہ رسول اس ضربت کی تعریف کر رہے ہیں جس میں علی نے جان لی ہے، ان کی جان گئی نہیں ہے۔

ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ۔

"علی کی یہ ضربت جو روز خندق ہے، ثقلین کی عبادت سے قیامت تک کیلئے افضل ہے"۔

میں پوچھتا ہوں کہ شہیدوں کی عبادت، عبادت ثقلین میں شامل ہے یا نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ ثابت قدم رہنا معیار ہے، شہید ہو جانا معیار نہیں ہے۔ اگر کسی نے خطروں کا منتظر رہتے ہوئے زندگی گزاری، ہر وقت تیار رہا ہے کہ جان راہ خدا میں جائے لیکن کوئی قاتل نہیں آیا تو کیا ظالم کے عمل سے اس کی بلندی عمل وابستہ ہے کہ قاتل آتا تو اس کا درجہ اونچا ہو جاتا اور چونکہ قاتل نہیں آیا، اس لئے اس کا درجہ نیچا ہو گیا؟

اب سمجھ میں آجاتے ہیں پیغمبر خدا کے ارشاد کے معنی جو علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں، جو حدیث ڈیڑھ صفحے میں درج فرمائی ہے اور وہ بھی آیہ مودۃ کے تحت "قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"، جو حدیث تفسیر میں درج کی ہے، اس

کا ایک جملہ، ایک سلسلہ ہے:

مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ۔

"جو آل رسول کی محبت میں دنیا سے گیا"،

مَاتَ کَامِلَ الْاِیْمَانِ۔

اسلوب شاعری میں یہ ہوتا ہے کہ آدھا مصرعہ ہر شعر میں آتا ہے اور آدھا مصرعہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک صفحے کے قریب سلسلہ کلام یوں ہے کہ "من مات علی حب آل محمد"، اس کے ساتھ کا جز و بدلتا رہتا ہے:

مَنْ مَاتَ حب آل محمدٍ مَاتَ کَامِلَ الْاِیْمَانِ۔

"جو آل محمد کی محبت میں مرا، کامل الایمان مرا"۔

مَنْ مَاتَ عَلٰی حب آل محمدٍ مَاتَ مَغْفُوْرًا۔

"جو آل محمد کی محبت میں دنیا سے گیا، وہ بخشا ہوا گیا"۔

مَنْ مَاتَ عَلٰی حب آل محمدٍ کتب بَیْنَ عَیْنَیْه۔

"جو آل رسول کی محبت میں دنیا سے گیا، اس کی پیشانی پر آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا کہ یہ رحمت خدا کا حقدار ہے"۔

اس طرح کے فقروں کا صفحہ ہے اور پھر یوں صفحہ ہے:

مَنْ مَاتَ عَلٰی بغض آل محمدٍ۔

ارے ایک جماعت کے مذاق کے مطابق کہتا ہوں، یہ علامہ رازی کو کیا ہو گیا تھا؟ رسول کو کیا کہوں مگر نقل کرنا تو ان کا کام تھا۔ ایک رخ کہہ دیتے، دوسرا رخ کیوں کہہ رہے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ بس تولّا تک ٹھیک ہے۔

میں کیا کروں امام فخری الدین رازی نے پیغمبر خدا کی حدیث نقل کی ہے۔ جتنے فقرے پہلے اسلوب کے تھے، اتنے ہی فقرے بعد کے اسلوب کے ہیں۔

مَنْ مَاتَ عَلٰی بغض آل محمدٍ۔

"جو آل محمد کے بغض میں دنیا سے گیا"۔

جو بھی ہو، وہ:

مَاتَ یَائِس مِنْ رَحْمَةِ اللّٰه۔

"رحمت خدا سے مایوس ہو گیا"۔

ہر فقرہ کے مقابل میں فقرہ ہے۔ پہلے سلسلے کا ایک فقرہ عرض کرتا ہے۔

مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا۔

"جو محبت آل محمد میں دنیا سے گیا، وہ شہید گیا"۔

کیا پیغمبر خدا یہ کسی تاریخی واقفیت کا اظہار فرمار ہے ہیں کہ جو محبت آل محمد رکھتا ہے، وہ ضرور کسی نہ کسی معرکہ جنگ میں گیا ہوگا یا جائے گا؟ پیشین گوئی ہے اور ضرور وہ دشمن کے حربہ کا شکار ہوگا، شہید ہوگا۔ کیا رسول یہ اطلاع تاریخی دے رہے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو کیا مطلب کہ جو محبت آل محمد میں دنیا سے گیا، وہ شہید ہو گیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز ہوتی ہے کنایہ۔ "نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے"۔ کیا واقعی اس چیز سے دلچسپی ہے کہ انہیں شیر کہا جائے؟ یادر کھئے کہ شیر حیوانات میں داخل ہے۔ ایک عام انسان اس سے بالاتر ہے۔ تو کسی خاص انسان کو شیر کہنا اسے درجہ سے گراتا ہے۔ تو شیر کہنے سے حیوان کہنا منظور نہیں ہے۔ جو اس کے لوازم میں سے ہے ذہن انسانی میں، شجاعت، اس شجاعت کو پیش کرتا ہے۔ لازم سے ملزوم کی طرف اس کو ذہن میں لانا منظور ہے۔ ویسے ہی رسول نے فرمایا کہ جو محبت آل رسول میں دنیا سے گیا، وہ شہید ہو گیا۔ تو قرآن میں دیکھو کہ شہید کا لازمہ کیا بتایا ہے؟ شہید کا لازمہ یہ بتایا گیا ہے زندگی جاوید کہ انہیں مردہ نہ سمجھو۔ تو رسول فرمار ہے ہیں کہ جو آل محمد کی محبت میں دنیا سے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، نہ مردہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ جو لوازم قرآن نے شہادت کے بیان کئے ہیں، رسول فرمانا چاہتے ہیں کہ اس کیلئے معرکہ جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر محبت آل محمد میں آخر رمق حیات تک گیا، قائم رہا، برقرار رہا، تو قاتل آیا ہو یا نہ آیا ہو، معرکہ جنگ میں گیا ہو یا نہ گیا ہو، اسماعیل بھی ذبح نہیں ہوئے تھے مگر لقب مل گیا ذبیح اللہ۔ تو جس وقت میں محبت آل رسول قتل ہونے کی ضمانت تھی، جو محبت آل رسول پر قائم رہا، وہ ہر وقت خنجر کے نیچے رہا یا نہیں؟

اب کوئی حجاج بن یوسف ثقفی پیدا نہیں ہوا تو اس کی وجہ سے کیا اس کے صلہ میں کمی ہو جائے؟ جب یہ آخر دم تک خطروں کو محسوس کرتے ہوئے اسی راستہ پر رہا جس کا نتیجہ ہمیشہ شمشیر و دار رہے، عنوان شمشیر و دار کے بدلتے ہوں، محبت اہل بیت کب پھولوں کی سیج رہی ہے؟ اگر کوئی اس سب کے باوجود اس راستے پر قائم رہا تو عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ اس کو شہادت کا درجہ نہ دے۔

ایک طبقہ کی طرف سے کہا جاتا تھا کہ فاتحہ دلواتے ہو، اس میں غذا رکھتے ہو، تو کیا مرے والا غذا کھائے گا؟ میں کہتا ہوں کہ اگر کھاتا نہیں ہے تو خدا نے کیوں کہا ہے کہ رزق حاصل کرتا ہے؟ جو کھاتا نہ ہو تو رزق کی کیا ضرورت ہے؟ اعتراض کے الفاظ بدلیں گے کہ کھاتا تو ہے مگر یہ کھانے نہیں کھاتا جو تم اس کے سامنے پیش کرتے ہو۔ اس کیلئے ایک جدید دنیا کی بات کرتا ہے۔ بہت آسان ہو گیا ہے میرا سمجھانا کہ آجکل کی دنیا کے جو معاشی توانین ہیں، اس میں دو ملکوں کے درمیان انتقال زر ممنوع ہے۔ اکثر ملکوں میں ممنوع ہے۔ خاص طور پر وہاں جہاں افراط زر ہو۔ انتقال زر کا ایک قانون ذریعہ مجھے معلوم ہے ورنہ غیر قانونی تو بہت سے لوگوں کو معلوم ہوگا۔ قانونی ذریعہ یہ ہے کہ کوئی بینک ہے جس کا رابطہ یہاں سے بھی ہے اور وہاں سے بھی ہے یا یہاں سے ہے اور وہاں کے کسی بینک سے ہے۔ آپ یہاں

داخل کیجئے اور وہ اسے وہاں کے بینک سے مل جائے گا جو ان کا حساب ہے، اس کے حساب سے۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے، یہاں تو آپ وہی کرنسی داخل کریں گے جو آپ کے پاس ہے مگر وہ بینک اگر وہی کرنسی وہاں بھیج دے تو وہاں بیکار ہوگی۔ لہٰذا امانت داری کے ساتھ، عقل سے کام لیتے ہوئے اور وہ عقل عمومی ہے، وہ بینک اس کرنسی کو جو آپ نے داخل کی ہے، اس ملک کی کرنسی میں بدل کے اپنی امانت داری کے تقاضے سے پہنچا دے گا۔ اگر یہی کرنسی پہنچا دے تو امانت داری تو ہوگی مگر حماقت ہوگی۔ اگر نہ پہنچائے تو امانت داری نہیں ہوگی۔ اس کو امانت داری سے کام بھی لینا ہے اور عقل سے بھی کام لینا ہے۔

لہٰذا یہاں آپ سے آپ کی کرنسی لے گا اور وہاں اس کی کرنسی میں ادائیگی کرے گا۔ میں دنیا والوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا جتنی عقل آپ کے بینکوں کو ہے، (معاذ اللہ) اتنی عقل بھی اللہ کو نہیں ہے؟ ہم اپنے محبت کے جذبہ کے تحت اس کو تحفہ بھیجنا چاہتے ہیں مگر ہمارے پاس تو وہی کھانے ہیں جو ہمارے ہاں پکتے ہیں۔ ہم تو وہی دیں گے لیکن ہمارے ایمانی جذبہ کی قدر کرتے ہوئے، محبت کے جذبہ کی قدر کرتے ہوئے، اسے کسی کی محبت ناگوار نہیں ہے۔ ہماری محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کے کھانے اسے پیش کریں تو خدائے کریم کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ اس عالم کے کھانوں کی شکل میں منتقل کر کے ہمارے پیش کردہ ہدیہ کو اس تک پہنچا دے۔

یہ سمجھ کر نہ کیجئے کہ شرع نے یہ طریقہ بتایا ہے ورنہ وہ بدعت ہو جائے گی۔ شرک نہیں ہوگی، بدعت ہو جائے گی۔ کون ۲۲ / رجب کو پوریاں پکاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ شرع میں آئی ہیں؟ کون عید کے دن سویاں کھاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ شرع میں آئی ہیں؟ بس عید کے دن سے سویاں مخصوص ہو گئیں اور ۲۲ / رجب سے پوریاں مخصوص ہو گئیں۔ اس کو رواج کے ماتحت کیجئے تو بدعت نہیں ہوگا۔ حکم شرع سمجھ کر کیجئے تو بدعت ہوگا۔

تو بس یہ سمجھنا کہ زندگی جاوید اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم میدان جنگ میں جائیں، حالانکہ میدان جنگ میں جانا صدیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ حالات کئی کئی سو برس نہیں پیدا ہوتے جن میں میدان جنگ میں جانا ہو۔ تو کیا یہ ان جزاؤں سے محروم رہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اس کے دَور میں کوئی موقع ایسا نہیں آیا؟ موقع آنا نہ آنا تو اس کے بس میں نہیں تھا تو جو اس کے بس میں تھا، اس سے اس کا صلہ کیوں وابستہ ہو؟ میں اس کو آیہ قرآنی سے ثابت کر چکا اور حدیث سے ثابت کر چکا۔

امیر المومنین علیہ السلام، جمل کا معرکہ ہے، فتح حاصل ہوئی، اصحاب جمع ہیں۔ نہج البلاغہ میں ہے، اصحاب میں سے ایک شخص نے اپنے دوست کا نام لے کر کہا کہ کاش! وہ فلاں شخص بھی یہاں ہوتا اور جنگ میں شریک ہوتا اور اس فتح کو دیکھتا۔ اس کے نہ ہونے پر افسوس کیا تو امیر المومنین نے دریافت کیا: یہ بتاؤ کہ تمہارے اس بھائی کی محبت ہمارے ساتھ ہے؟ وہ ہمارے دوستوں میں سے ہے؟ اس نے کہا: بے شک وہ آپ کے دوستوں میں سے ہے۔ تو ارشاد فرمایا: جب وہ ہمارے دوستوں میں سے ہے تو یقین جانو کہ وہ ہمارے ساتھ شریک ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کا کیا ذکر، اس جنگ میں ہمارے ساتھ وہ بھی ہیں جو ابھی اپنے آباؤ اجداد کی پشت میں ہیں۔ جو ابھی شکم ہائے مادر میں ہیں۔ وقت آئے گا کہ زمانہ انہیں منے لائے گا اور ان کے ذریعہ سے اس دَور میں ایمان کو قوت ہوگی اور اس دَور سے اللہ حق کی نصرت کرے گا۔ تو جو جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں، صدیوں بعد میں، وہ بھی ہمارے ساتھ معرکہ میں شریک ہیں۔

52

ہو جاؤ سچوں کی ساتھ

جناب موسیٰ مناجات کیلئے کوہ طور پر گئے تو ایک دفعہ صدا دی، جواب نہیں آیا۔ دوسری مرتبہ پکارا، تیسری دفعہ تڑپ کر آواز دی کہ میں نے کیا قصور کیا؟ جواب آیا: موسیٰ! تمہیں قارون بار بار پکارتا رہا، اگر ایک مرتبہ مجھے پکار لیتا تو کبھی رد نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں کہ بے شک بڑی ہستیاں ہیں جو ہماری سفارش کرنے والی ہیں لیکن اپنے کردار کی وجہ سے منہ ایسا نہ رکھئے کہ ان سے کہہ سکیں۔

ہماری ہر سانس اس کی ممنون احسان ہے۔ ایک ذرا سی اس کی نگاہ توجہ سے ہٹیں تو ہم ہست سے نیست ہو جائیں، ہمارا وجود ختم ہو جائے۔ پس ربوبیت رشتہ حال ہے۔ اب جس کے گہوارہ تربیت میں سانس لے رہے ہیں۔ وہ کوئی اجنبی ذات ہے کہ اس سے ڈریں!

پھر بھی بندے کو اپنے پروردگار سے ڈرنا چاہئے۔ اس لئے جو بڑے سے بڑے مجرم اور گناہگار ہیں، وہ بالکل نہیں ڈرتے لیکن جن کے دامن عصمت پر کسی قسم کے گناہ کا داغ نہ تھا، وہ سب سے زیادہ ڈرتے تھے۔

تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو۔

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ۔

ارشاد حضرت اقدس ہے کہ اے صاحبان ایمان! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ "اتَّقُوا اللّٰهَ" کا عام ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ یعنی تقویٰ کا ترجمہ ڈرنے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مگر جب دوسرے محل پر ان الفاظ کو دیکھتے ہیں جو اس سے ملتے جلتے ہیں تو ترجمے مختلف سامنے آتے ہیں کہ ڈرنے کے ساتھ اس کا ترجمہ نہیں ہوتا، مثلاً "اتَّقُوا"، یہ فعل امر ہے جس کا ہم نے ترجمہ کیا کہ ڈرو، مگر اب اسی کے ہم معنی یعنی اسی لفظ کا اسم فاعل اور اس کی جمع "هُدًى لِّلۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ"، یہ قرآن ہدایت ہے ان متقین کیلئے جو، یہ متقین وہی چیز ہے، وہاں "اتَّقُوا" تھا، یہاں متقین کا لفظ ہے۔ اسم فاعل کی جمع ہے۔ اس کا ترجمہ یہ نہیں کیا جاتا کہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کیلئے۔

"اتَّقُوا" کا ترجمہ اگر تھا کہ اللہ سے ڈرو تو پھر "هُدًى لِّلۡمُتَّقِیۡنَ" کا ترجمہ ہونا چاہیے کہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کیلئے۔ مگر یہاں لفظ بدلا جاتا ہے۔ یہاں یہ آتا ہے کہ ہدایت ہے پرہیز گاروں کیلئے۔ اب متقین کا ترجمہ اگر پرہیز گار ہے تو پھر "اتَّقُوا" کے معنی ہیں پرہیز گاری اختیار کرو۔ مگر اس "اتَّقُوا" کے ساتھ اللہ کا لفظ جو ہے، تو اُردو نہیں بنتی، یعنی اللہ کا لفظ مفعول ہے۔ تو "پرہیز گاری اختیار کرو" کے ساتھ اللہ کا جوڑ کس طرح لگے؟ اللہ سے پرہیز گاری اختیار کرو۔ اس لئے وہاں پرہیز گاری نہیں لائی جاتی بلکہ "ڈرو" لایا جاتا ہے تاکہ اللہ کے ساتھ اس لفظ کا ربط قائم ہو سکے۔ وہاں پر چونکہ لفظ "متقین" تھا، اس کا کوئی متعلق نہیں تھا، اس لئے وہاں پرہیز گاری بن گیا۔

یہاں "اتَّقُوا" سے مطالبہ ہے کہ اللہ سے کرو، کیا کرو؟ پرہیز گاری اختیار کرو یا اللہ سے پرہیز کرو۔ کیا مطلب؟ پس وہاں پرہیز گار کے ساتھ ترجمہ تھا اور یہاں "اللہ سے ڈرو" ترجمہ ہو گیا۔ اب جن سے "اتَّقُوا" اور متقین کے الفاظ بنے ہیں، اسی سے تقویٰ ہے۔ اب تقویٰ کے معنی پرہیز گاری ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ۔

"تم میں سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو"۔

سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو۔ سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے جو سب سے زیادہ فرائض کا ادا کرنے والا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عربی لفظ ہے اور اس کا ترجمہ نہیں بنتا یعنی ترجمہ کا خواب پریشان ہو رہا ہے اور کوئی ایک متعین ترجمہ اس کا ہر محل پر نہیں ہوتا۔ ایک لفظ کا ترجمہ کرنا تو مشکل ہو رہا ہے اور پھر قرآن کا فی ہے۔

میں جب عرب کے محاورات دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ نہ ڈرنا اس کا صحیح ترجمہ ہے اور نہ پرہیز کرنا اس کا صحیح ترجمہ ہے۔ اس لفظ کے جو استعمال کے مقامات ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز سے بچنا۔ اس کیلئے عربی اشعار کے شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس سے "وَقَایَہ" کا لفظ بھی آتا ہے جو بچاؤ کا ذریعہ ہو، اُس کو کہتے ہیں۔ اس بناء پر میں نے کبھی کبھی متقین کا ترجمہ کیا ہے "فکر نجات رکھنے والے"۔ یعنی آخرت کے برے نتائج سے بچاؤ کی فکر تقویٰ ہے۔

اب معیارِ نظر کے اعتبار سے محل بدل جائے گا۔ جو سزا کے خوف سے متاثر ہوتا ہے، اس کیلئے سزا سے بچاؤ کی فکر اور جو اتنا بلند نظر ہے کہ اس کو سزا کی فکر نہیں ہے، ناراضگی کی فکر ہے، تو پھر معنی ہوں گے "اُس کی ناراضگی سے بچاؤ کی فکر"۔ اب "اتَّقُوا اللّٰہَ" کے معنی ہیں "اُس کی ناراضگی سے بچو"۔

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ" کے معنی ہوں گے: "اے صاحبانِ ایمان! اللہ کی ناراضگی سے بچو، اللہ کے غضب سے بچو"۔

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی سزا سے بچو اور اب جو یہ کہا گیا کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ"، ہدایت ہے متقین کیلئے، جس کا ترجمہ ہم کررہے ہیں "ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے"۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو آخرت کی فکر ہی نہیں ہے، وہ قرآن میں غور کیوں کریں گے؟ یہ اترا تو سب کیلئے ہے لیکن اس سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے وہی جو فکر نجات رکھتے ہیں۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ"، ہدایت ہے متقین کیلئے۔ قرآن مجید نے کہنا شروع کیا، کون متقین؟ "هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ"، سب سے پہلے "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ"، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، "وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ"، اور نماز کو قائم رکھتے ہیں، "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ"، اور جو ہم نے ان کو عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔

پھر ایک سلسلہ شروع ہوا اوصاف کا کہ:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

"اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوا اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں"۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

"وہ لوگ جو راہِ ہدایت پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اور یہ لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ہدایت ہے ان متقین کیلئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ان متقین کیلئے۔ صفت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک صفت ہوتی ہے جو دائرہ کو محدود بناتی ہے، مثلاً ایسے معالج کا علاج کرو جو تجربہ کار ہو، یہ وصف ہے کہ جو تجربہ کار ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو تجربہ کار نہیں ہے، اناڑی ہے، اس کا علاج نہ کرو۔ اسے قیدِ احترازی کہتے ہیں۔ یعنی ایک دوسری چیز کو الگ کرنے کیلئے یہ قید لگی

ہے، دائرہ کو محدود بنانے کیلئے۔ اسے قیدِ احترازی کہتے ہیں۔ پس یہاں جو صفات ہیں کہ ان متقین کیلئے ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اگر اس طرح کی قید ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متقین کچھ ایسے ہیں جو غیب پر ایمان نہیں رکھتے مگر ہیں متقین۔ متقین ایک وہ ہیں جو غیب پر ایمان نہیں رکھتے مگر ہیں متقین۔ وہ ہیں تو متقین مگر قرآن سے انہیں فائدہ نہیں پہنچتا۔

اسے کوئی اپنے مطلب کی بات سمجھے کہ ہاں! ہم ایسے ہی متقین ہیں جو غیب پر ایمان نہیں رکھتے۔ ہم سے غیب کا مطالبہ نہ کیجئے مگر ہیں ہم متقین۔ خیر! اگر اسے کوئی اپنے مطلب کی سمجھے۔ آپ آگے بڑھئے کہ ہدایت ہے ان متقین کیلئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ یعنی کچھ متقین ایسے ہیں جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے اور پھر بھی متقین ہیں۔ اب وہ غیب سے بے نیاز ہو کر متقین بننے والے سوچیں گے کہ پھر نماز کو بھی چھوڑیں کیونکہ متقین ہونے میں تو کوئی کمی نہیں ہوگی۔ ہم ویسے متقین بنیں جو نماز نہیں پڑھتے۔ اب اسے کوئی طبقہ اپنے مطلب کی بات سمجھے جو نماز سے بے توجہی اختیار کرنا چاہتا ہے، وہ کہے کہ ہمیں ویسے ہی متقین سمجھے کہ جو نماز نہیں پڑھتے۔ پھر بھی ہمارے تقویٰ میں تو کمی نہیں ہے۔ تو اب آگے بڑھئے:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

"جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں"۔

یہ محبت زر رکھنے والے اپنے مطلب کی بات سمجھیں کہ صاحب! ٹھیک ہے کچھ متقین ہیں جو خیرات کرتے ہیں۔ ہم وہ متقین ہیں جو پیسے کو عزیز رکھتے ہیں، لہٰذا خیرات کا ہم سے مطالبہ نہ کیجئے۔ آگے بڑھئے:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔

"وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر اترا اور اس پر بھی جو پہلے اترا ہے"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ متقین وہ ہیں جو نہ آپ پر نازل شدہ چیز پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اس پر جو آپ سے پہلے نازل ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم سے لے کر خاتم تک جتنے انبیاء کی تعلیمات ہیں، سب کے منکر ہیں، کسی پر ایمان نہیں رکھتے اور پھر بھی ہیں متقین۔ اس کے بعد:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔

"آخرت کا یقین رکھتے ہیں"۔

یعنی کچھ متقین وہ ہیں جو آخرت کا یقین بھی نہیں رکھتے اور پھر بھی متقین ہیں۔ تو اب اچھے متقین ہوئے کہ نہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نہ وہ نماز پڑھتے ہیں، نہ خیرات دیتے ہیں، نہ رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، پھر بھی متقین ہیں۔ تو اب کسی کا بھی ضمیر اس کو گوارہ نہیں کرے گا۔ ہر ایک سمجھے گا کہ نہیں، اس کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا۔

تو اب معلوم ہوا کہ یہ قید ویسی نہیں ہے، اور یہ وصف ایسا نہیں ہے جو احترازی ہو یعنی بچاؤ کا ہو۔

دوسری قید ہوتی ہے تشریحی۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو پہلے ایک مجمل لفظ ہے، اس کی تفصیلات بیان ہو رہی ہیں۔ اس کی تشریح کی جارہی ہے۔ اس کی علمی مثال یہ ہے کہ:

"اَلْجِسْمُ طَوِیْلٌ عَرِیْضٌ عَمِیْقٌ یَحْتَاجُ اِلَی الْمَکَانِ۔"

"جسم جو طول بھی رکھتا ہے، عرض بھی رکھتا ہے، گہرائی بھی رکھتا ہے، اُسے بہر حال ٹھہرنے کیلئے کسی جگہ کی ضرورت ہے۔"

اب جسم کہتے ہی اُسے ہیں جس میں طول بھی ہو، عرض بھی ہو، عمق بھی ہو۔ اگر طول ہی طول ہے، عرض نہیں ہے تو وہ خط ہے، جسم نہیں ہے۔ اگر طول اور عرض ہے لیکن موٹائی نہیں ہے، تو وہ سطح ہے، جسم نہیں ہے۔ اگر طول، عرض، عمق کچھ نہیں ہے، تو نہ وہ نقطہ ہے، نہ خط ہے، نہ سطح ہے، نہ وہ جسم ہے۔ جسم وہی ہے کہ جس میں طول بھی ہو، عرض بھی ہو، عمق بھی ہو۔ تو جسم ایک مجمل لفظ تھا، یہ طویل، عریض، عمیق۔ جو طویل، جو عریض، جو عمیق۔ یہ جو "جو" کا لفظ ہے، یہ اس جسم کے بیان کرنے کیلئے ہے کہ جسم یہ ہوتا ہے۔

اب دیکھئے کیا مطلب ہوتا ہے "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" یہ قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے۔ اب گویا متکلم قرآنی کہتا ہے کہ ہم سے پوچھو۔ متقین کون ہوتے ہیں، ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ متقین کون ہوتے ہیں؟ متقین وہ ہوتے ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہوں۔ تمام اوصاف کا سرنامہ سب سے پہلے غیب پر ایمان ہے۔ جو غیب پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ قرآن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ وہ متقین کا مصداق نہیں ہوتا۔ اس کے بعد متقین وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہوں۔ متقین وہ ہیں جو خیرات بھی کرتے ہوں۔ متقین وہ ہیں جو ازل سے لے کر رہنمایانِ دین پر جو نازل ہوا ہے، اس سب پر ایمان رکھتے ہوں اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہ ہیں متقین۔

معلوم ہوا کہ متقین کی تشریح ان الفاظ سے ہو رہی ہے۔ تو اب متقین کے معنی نہ تو ڈرنے والے ہوئے، نہ پرہیز کرنے والے ہوئے، متقین کے معنی ہوئے فکرِ نجات رکھنے والے۔

تو اب میری تشریح کے لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے ایمان لوانے والو! غضبِ الٰہی سے بچاؤ کی فکر رکھو۔ غضبِ الٰہی سے بچنے کا سامان کرو۔ وہ جو عام ترجمہ ہے، اللہ سے ڈرو، یہ ڈرنے کا لفظ ہزار طریقہ سے ہماری اور آپ کی زبانوں پر روزمرہ آتا ہے۔ کسی کو نصیحت کرتا ہو، کہا اللہ سے ڈرو۔ کسی کی مذمت کرنی ہوئی، کہا: اُسے خوفِ الٰہی بالکل نہیں ہے۔ اللہ سے بالکل نہیں ڈرتا۔ بہر حال لفظ بدل کر خوف کے لفظ کا استعمال بھی اللہ نسبت قرآن اور حدیث میں ہے۔ معصومین کے خوفِ الٰہی کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ یہ خوف کے لفظ کی نسبت اللہ کی طرف صرف "اِتَّقُوْا" کے ترجمہ کے سلسلہ میں تھی۔ یہ بات کہ اللہ سے ڈرو، بالکل قابلِ اعتراض نہیں ہے مگر اب سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ اللہ سے ڈرنے کا مطلب کیا ہے؟

حضور! یہ ڈر کا لفظ جس جس محل پر استعمال ہوتا ہے، وہ اس چیز کی کسی بلندی اور رفعت کا پتہ نہیں دیتا۔ دیکھئے کن کن چیزوں سے ڈرتے ہیں! ایک تو ڈرا جاتا ہے ان چیزوں سے جن کی طبیعت میں ایذا رسانی ہوتی ہے۔ مثلاً سانپ اور بچھو سے آدمی ڈرے گا۔ شیر اور بھیڑیئے سے ڈرے گا۔ ایسی چیز سے ڈرے گا جس کی فطرت میں ایذا رسانی ہو۔ ایک ڈر کا محل استعمال یہ ہے کہ جو اجنبی ہو، جس سے سابقہ نہ پڑا ہو، نیا حاکم آیا ہے، ڈر معلوم ہوتا ہے، نہ جانے کس بات پر خفا ہو جائے۔ معیارِ طبیعت نہیں معلوم۔ تو جس سے کوئی سابقہ نہ ہو،

اس سے آدمی ڈرتا ہے۔ تیسرا محل ڈر کے استعمال کا کیا ہے؟ مہیب اور کریہہ المنظر چیز سے ڈر لگتا ہے جس سے بنا "ڈراؤنی چیز"۔ یہ ڈراؤنا پن یا پہلے بیان کردہ چیزوں میں سے کوئی ایسی ہے جسے اللہ کی طرف نسبت دی جا سکے۔ کوئی معنی ڈر کے ایسے نہیں ہیں جن کو بغیر معاذ اللہ کے خدا کے ساتھ کہہ سکیں۔ ان چیزوں سے ڈرا جاتا ہے جو ایذا رساں ہوں اور وہ کہ:

سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ۔

"جس کی رحمت غضب کے آگے آگے ہے"۔

اس کے کہنے والے نے کہہ دیا کہ رحمتِ حق بہانہ می جوید۔ تو جو ایسی کریم ذات ہو، اُس سے ڈرنا کیسا۔ یا معاذ اللہ وہ عقرب صفت ہو کہ نیش زنی اس کا کام ہو یا وہ معاذ اللہ شیر اور بھیڑیئے کی طرح پھاڑ کھانے والا ہے؟ کیا وہ معاذ اللہ سانپ کی طرح سے ڈسنے والا ہے؟ یہ تو وہ مفہوم ہے جو کسی طرح سے خدا کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اس کی طرف ڈر کی نسبت دی جائے۔ وہ تو بارگاہِ الٰہی میں (رحمتِ حق سے) مایوس ہونے کو بھی کفر قرار دیتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ رحمتِ حق سے مایوس ہونا بھی کفر ہے۔ تو جو ایسی رحیم اور کریم ذات ہو اور جس کیلئے مذہبی روایات میں واقعات موجود ہیں۔

قارون نے سرکشی کی، جناب موسیٰ نے دعائے بد کی اور اس پر غضبِ الٰہی نازل ہوا اور وہ مع اپنے خزانوں کے، اپنی دولت سمیت، جس پر اُسے ناز تھا، زمین میں دھنسنے لگا تو اللہ نے اُسے عذاب لانے کے بعد بھی موقع دیا کہ اب بھی اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ پہلے گھٹنوں تک دھنسا۔ اُس نے کہا: ارے موسیٰ! رحم کرو۔ اب میں باز آیا۔ جناب موسیٰ نے کہا: اب جبکہ پوری عمر سرکشی میں گزار دی۔ خالق نے زمین کو جناب موسیٰ کے قبضہ میں دیا اور کہا کہ اس سے جو مرضی ہو، کام لو۔ انہوں نے پھر کہا: نگل لے۔ اب زمین نے کمر تک نگلا۔ اس نے پکار کر کہا: موسیٰ! رحم کرو۔ انہوں نے زمین سے کہا کہ نگلتی کیوں نہیں؟ آخر میں جا کر پورا غرق ہوا۔ یہی چیزیں ہیں جو گناہ نہیں ہیں مگر ترکِ اولیٰ انہی کا نام ہوتا ہے۔ جو گناہ نہ ہوں مگر کسی بلند شخصیت کے تقاضے کے خلاف ہوں۔

اب جب کوہِ طور پر مناجات کیلئے جاتے ہیں تو ایک دفعہ صدا دیتے ہیں، جواب نہیں آتا۔ دوسری دفعہ آواز دیتے ہیں، تیسری دفعہ تڑپ کر آواز دی کہ میں نے کیا قصور کیا؟ جواب آیا کہ موسیٰ! وہ ہر مرتبہ تمہیں پکارتا رہا، اگر ایک مرتبہ مجھے پکار لیتا تو کبھی رد نہ کرتا۔

معصومین نے یہ سب واقعات اُس کی رحمت کو نمایاں کرنے کیلئے ہمارے سامنے بیان کئے ہیں ورنہ ہمیں کیونکر معلوم ہوتے اور پھر آخرت کے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں کہ یوں ہوگا، یوں ہوگا۔ یہ صرف دلچسپی کیلئے نہیں بیان کئے گئے۔ ہمیں متاثر کرنے کیلئے بیان کئے ہیں کہ مایوس ہونا بھی آدمی کو بیباک بنا دیتا ہے کہ جب ہمیں دوزخ میں جانا ہی ہے تو اب جو چاہیں کریں۔ نا اُمیدی بھی اصلاح کیلئے مضر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

اَلْاِیْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفٌ خَوْفٌ وَنِصْفٌ رَجَاءٌ۔

"ایمان کے برابر کے دو ٹکڑے ہیں، آدھا خوف ہے، آدھا اُمید ہے"۔

اسے روزمرہ کی مثال سے واضح کرتا ہوں کہ کوئی طالب علم ہے اور اُسے یقین ہے کہ چاہے جتنی محنت کروں مگر میرا فیل ہونا ضروری ہے۔ تو وہ کیوں محنت کرے گا؟ سمجھتا ہے کہ محنت کرے گا، تب بھی فیل ہوگا۔ ایک ہے جسے کچھ اسباب سے یقین ہے کہ میں چاہے کچھ نہ کروں، لیکن میں فیل ہو ہی نہیں سکتا۔ تو بھی کیوں محنت کرے گا؟ وہ محنت نہ کرے گا بیکار سمجھ کر، یہ محنت نہ کرے گا، بے ضرورت سمجھ کر۔ یونہی سمجھ لیجئے کہ اگر کسی بندے نے اللہ کی رحمت کو سامنے رکھا اور یہ کہا کہ مجھے سزا ل ہی نہیں سکتی، بھلا وہ مجھے کہاں سزا دے گا؟ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر جو دل چاہے گا، کرے گا کہ مجھے سزا ل ہی نہیں سکتی۔ مجھے تو بہر حال جنت میں جانا ہے۔ ہمارے بہت سے عوام اسی خیال میں ہیں کہ جنت کے دروازے ہمارے منتظر ہیں۔ بس ادھر پہنچے، اُدھر دروازے خود بخود کھل گئے۔

تو جب اتنا اعتماد کرلیا کہ بہر حال ہماری بخشش ہونی ہے تو پھر کیوں ضبطِ نفس کریں؟ کیوں اپنے من مانے کام نہ کریں؟ کیوں اپنی نفسانی خواہشات کو پورا نہ کریں؟ یہ چیز بھی اصلاحِ نفس کیلئے سمِ قاتل ہے اور اگر کسی واعظ نے آ کر اتنے دوزخ کے عذاب دکھا دیئے اور اتنا نااُمید بنا دیا کہ سننے والے یہ سمجھے کہ ہمیں کو کسی طرح نجات مل ہی نہیں سکتی، لہٰذا کوئی نیک عمل کر کے کیا لیں گے۔

پہلے کی مثال اُس طالب علم کی ہوگئی جسے کامیابی کے یقین کی بناء پر محنت نہیں کرتا تھی، یہ اس طالب علم کی طرح ہوگیا جسے کامیابی سے نااُمیدی کی وجہ سے محنت بیکار معلوم ہوئی۔ لہٰذا وہ نہ اپنے کو اچھا آدمی بنا سکا، نہ یہ بنا سکا۔ تو اُس کی رحمت کا اُمیدوار رہنا چاہئے اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے کردار پر تھوڑا سا غور کرنا چاہئے۔ تھوڑا سا اندیشہ بھی ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ بے شک بڑی ہستیاں ہیں جو ہماری سفارش کرنے والی ہیں لیکن اپنے کردار کی وجہ سے منہ ایسا رکھئے کہ ان سے کہہ سکیں۔

بہر حال خوف کا لفظ اس کیلئے ناقابل انکار ہے مگر مطلب تو سمجھنا چاہئے۔ جس جس قسم کے ہم نے خوف دیکھے، سب اللہ کی شان کے خلاف ہیں۔ اُس چیز سے ڈرتے ہیں جو ایذا رساں ہو۔ تو میں نے کہا کہ اس کی رحمت اس کے غضب سے آگے ہے۔ اس سے ڈرنا کیسا؟ اُس سے ڈرتے تھے جس سے سابقہ نہ پڑا ہو، جیسے نیا حاکم آگیا۔ مگر جس کی آغوشِ رحمت میں آنکھ کھولی ہو، جس کے گہوارۂ تربیت میں پرورش پائی ہو، ارے ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت بھی اس نے پیدا کی، پرورش کا جذبہ بھی اُس نے پیدا کیا۔ لہٰذا اصل مربی تو وہ ہے۔

اسی لئے ایک فرق ہے مسلمانوں اور عیسائیوں کی اصطلاح میں کہ عیسائی اُسے اَب کہتے ہیں یعنی باپ اور مسلمان اُسے رَب کہتے ہیں یعنی پروردگار۔ یہ اَب یعنی باپ کہنا صرف سببِ وجود کو بتاتا ہے، سببِ بقا کو نہیں بتاتا۔ سببِ وجود رشتۂ ماضی ہے۔ بہت سے افراد وہیں جو پیدا ہوئے ہیں اور باپ ان کے بچپن میں دنیا سے اٹھ گئے۔ خود ہمارے پیغمبرؐ کے باپ کے اٹھنے کے بعد اس دنیا میں قدم رکھا۔ آپ کی ولادت باپ کی وفات کے بعد ہوئی۔ تو باپ صرف سببِ وجود ہوتا ہے، سببِ بقا نہیں ہوتا۔

لیکن رب کے معنی ہیں پرورش کرنے والا۔ اَب ماضی کا رشتہ تھا، رَب حال کا رشتہ ہے۔ یعنی ہر سانس اُس کی ممنونِ احسان ہے۔ ایک ذرا سی اس کی نگاہِ توجہ ہٹے تو ہم ہست سے نیست ہو جائیں۔ ہمارا وجود ختم ہو جائے۔ پس ربوبیت رشتۂ حال ہے۔ اب جس کے گہوارۂ تربیت میں سانس لے رہے ہیں، وہ کوئی اجنبی ذات ہے کہ اس سے ڈریں؟ ڈاور پھر اُس سے ڈرتے تھے

جو کریہہ المنظر ہو، ڈراؤنی شکل رکھتا ہو اور وہ جو کمالِ مطلق ہے، جمالِ محض ہے، جہاں حسن کے سوا قبح کا گزر نہیں، جہاں خیر کے سوا کسی شر کی آمیزش کا کوئی پہلو نہیں۔

حضور والا! ایسی ذات سے ڈرنا کیسا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ڈر کا لفظ ہم کہہ رہے ہیں مگر ڈر کے معنی نہیں سمجھتے۔ میں جو تلاش کیا تو صرف ایک محل استعمال ڈر کے لفظ کا مجھے ملا، اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں اس ڈر کے معنی جو اللہ کی ذات کے ساتھ ہے۔ یہ بھی ہماری زبان کا محاورہ ہے کہ فلاں بیٹا اپنے باپ سے بہت ڈرتا ہے۔ یہ بیٹا جو باپ سے ڈرتا ہے، یہ طبعاً ایذا رساں ہونے کی وجہ سے ڈرتا ہے، نہ اس لئے ڈرتا ہے کہ کبھی سابقہ نہیں پڑا، نہ اس لئے ڈرتا ہے کہ کریہہ المنظر ہے۔ اس ڈر کا سبب ہے احساسِ عظمت۔

بس جس مفہوم کے لحاظ سے سعادت مند بیٹا اپنے باپ سے ڈرتا ہے، جو نیک بیٹا ہو، وہ کس طرح اپنے باپ سے ڈرتا ہے، اس کی عظمت کے احساس کی وجہ سے۔ بس اس کا کمال ہے جس کی وجہ سے بندے کو اپنے پروردگار سے ڈرنا چاہئے۔ اسی لئے جو بڑے سے بڑے مجرم اور گناہگار ہیں، وہ بالکل نہیں ڈرتے لیکن جن کے دامن عصمت پر کسی قسم کے گناہ کا داغ نہ تھا، وہ سب سے زیادہ ڈرتے تھے۔

خوفِ الٰہی میں ان کے مظاہر ہیں جو آنکھوں کے سامنے آئے۔ خوفِ الٰہی کے واقعات ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائیں صحیفۂ سجادیہ میں، امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں دعائے کمیل کی نوعیت، الفاظ دیکھئے۔ صحیفۂ کاملہ کی دعائیں دیکھئے۔ یعنی مجھے تو اُردو زبان میں اس کیفیت کے بیان کرنے میں جو عربی الفاظ سے نمایاں ہوتی ہے، دقت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جبار و قہار حاکم کے سامنے کوئی مجرم کھڑا ہو، تھر تھر کانپ رہا ہو۔ وہ تضرع و زاری اور بارگاہِ الٰہی میں التجا اپنی خطاؤں کے معاف کرنے کیلئے۔ اس کی نوعیت بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتی، یہاں تک کہ لوگ سوال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سائل کی تسلی ہو جاتی ہو، ممکن ہے کہ تسلی نہیں بھی ہوئی اور وہ لاجواب ہو جاتا ہو، چپ ہو گیا ہو۔ مگر کیا واقعی جو ہم نے اسے سمجھایا ہے، تو ہم خود بھی اُسے سمجھے ہیں۔

میں کہتا ہوں اس کا تجزیہ کیجئے۔ اس جواب کا کہ ہمارے بتانے کیلئے، ہمارے سمجھانے کیلئے یہ باتیں ہیں۔ تو تجزیہ کیجئے۔

تجزیہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ کیفیات طاری نہیں ہوتی تھیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کیلئے ہے کہ مار گزیدہ کی طرح تڑپتے تھے اور نوحہ کرتے تھے اور اس طرح روتے تھے۔ تو اس جواب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ کیفیات واقعی نہیں پیدا ہوتی تھیں، یہ مصلحتاً ہمارے سکھانے کیلئے، ہمارے سمجھانے کیلئے اپنے میں پیدا کی جاتی تھیں۔ یہ تجزیہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ گویا مصنوعی کیفیات ہوتی تھیں، ہمیں سکھانے کیلئے، ہمیں بتانے کیلئے۔

ایک تو یہ پہلو اس وقت عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں سکھانے کیلئے (معاذ اللہ) یہ کیفیت انہوں نے پیدا کر لی اور وہاں ہمارے اصولِ دین میں شبہ پیدا ہو گیا جو آج بے چین ہو کر لوگ پوچھنے لگے کہ یہ کیا کہا؟ اس نفع کے ساتھ یہ نقصان بھی تو ہوا اس مصنوعی کیفیت کی وجہ سے۔

صاحب! میں کہتا ہوں کہ واقعات کا جائزہ لیجئے۔ ابودردا نے دیکھا کہ امیر المومنین سجدۂ خالق میں ہیں اور جسم مثل چوب خشک بے حس وحرکت ہے۔ وہ روتے ہوئے خانۂ سیدہ عالم پر آئے اور کہا کہ امیر المومنین نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ حضرت سیدہ عالم پریشان نہیں ہوئیں لیکن اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رسول کے ارشادات سے معلوم تھا کہ آپ کی شہادت کس طرح ہوگی! آپ نے یہ کہلوایا کہ یہ تو تم نے رائے قائم کی ہے، یہ اطلاع جو تم دے رہے ہو کہ وفات ہوگئی ہے، کیفیت جو دیکھی ہے، وہ بتاؤ۔ تب انہوں نے کہا کہ کیفیت یہ ہے کہ سجدۂ خالق میں ہیں، جسم مثل چوب خشک ہے، بے حس وحرکت، سانس بھی بالکل بند ہے۔

جب انہوں نے یہ کیفیت بتائی تو سیدہ عالم نے فرمایا کہ ابوالحسن کی محراب عبادت میں اکثر یہ حالت ہوجاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابودردا نے عمر میں ایک مرتبہ دیکھا اور سیدہ عالم جیسی صدیقہ نے گواہی دی کہ اکثر محراب عبادت میں یہ حالت ہوجاتی ہے۔ تو اب کیا حقیقت رہی اس جواب کی کہ ہمارے سکھانے کو، سمجھانے کیلئے ایسا تھا؟ دیکھنے والے نے تو عمر میں ایک مرتبہ دیکھا اور اکثر وہ حالت ہوجاتی ہے جس کی رازدار صرف سیدہ عالم ہیں۔ تو اب کیا حقیقت رہی اس جواب کی کہ یہ ہمارے سمجھانے کیلئے تھا؟ ہمارے بتانے کیلئے، ہمارے دکھانے کیلئے تھا؟

دوسرا واقعہ اس کا عکس ہے یعنی سیدہ عالم کا جب وقت رحلت قریب پہنچا اور امیر المومنین علیہ السلام تشریف لائے ہیں تو جو وصیتیں سیدہ عالم نے کی ہیں، ان میں سے ایک وصیت بیان نہیں ہوتی ہے کہ سیدہ عالم نے ایک بوتل امیر المومنین علیہ السلام کے سپرد کی اور یہ وصیت کی کہ اسے میرے ساتھ قبر میں رکھ دیجئے گا۔ دیکھئے! علم امامت الگ چیز ہے لیکن عام طور پر نظام حیات اسباب ظاہری والے علم پر مبنی تھا۔ اس لئے دریافت کی جاتی تھی، تحقیق کی جاتی تھی، گواہیاں لی جاتی تھیں۔ یہ سب آئین کے تحت میں تھا۔

تو امیر المومنین نے پوچھا کہ شیشے میں کیا ہے؟ تو سیدہ عالم نے فرمایا کہ میں نے اپنے پدر بزرگوار سے سنا تھا کہ آخرت میں ایک منزل ہے جس سے وہی لوگ گزریں گے جو خوف خدا میں روئے ہوں۔ تو اے ابوالحسن! یہ میرے وہ آنسو ہیں جو میں نے خوف خدا میں بہائے ہیں۔

اب ہر صاحب عقل غور کرے کہ فطری طور پر جو آنسو بہیں گے، وہ سب شیشی میں نہیں آسکتے۔ کچھ رواں ہوکر چلے جائیں گے اور شیشی میں، بہت تھوڑے آئیں گے۔ تو جو محفوظ ہوسکے، وہ اتنے ہیں کہ شیشی میں ان کا ذخیرہ ہے اور یہ آنسو اس طرح بہائے گئے تھے کہ اسباب ظاہری سے امیر المومنین تک سے راز تھے ورنہ آپ پوچھتے کیوں کہ اس میں کیا ہے!

تو اب میں کیونکر کہوں کہ یہ کیفیات فقط ہمارے دکھانے کیلئے ہوتی تھیں، یہ کیفیات ہمارے سمجھانے کیلئے ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح تجزیہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ عظمت الٰہی کا احساس ان میں تھا، تو اپنے تمام سرمایہ عصمت کے ساتھ جو اطاعت ہے، اس کو اس کی بارگاہ میں کم سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس طرح تڑپتے تھے جس طرح کوئی مجرم اپنی کوتاہیوں پر تڑپتا ہے۔ یہ احساس عظمت الٰہی ہے جس سے یہ کیفیات پیدا ہورہی ہیں۔

53

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

اگر وہ کسی جماعت کو صادقین کہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پوری جماعت ایسی ہوگی جن کے قول عمل اور تصور و خیال کی صحت کا وہ ضامن ہے۔ اب وہ جتنے ہوں، چاہے پانچ ہوں، چاہے بارہ، چاہے چودہ ہوں۔

وہ سب ایسے ہیں کہ ان کے قول میں اختلاف ہے نہ ان کے عمل میں اختلاف ہے۔ صورت عمل میں اختلاف ہو سکتا ہے، حقیقت عمل میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نیم روز کی روشنی میں ان افراد کے سامنے لا کر دکھا دیا اور قرآن کی آیت نے اور رسولؐ کے عمل نے مل کر بتا دیا کہ یہ افراد ہیں جو صادقین ہیں۔

ایک بڑے پادری نے کہا کہ میں وہ چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر خدا کی طرف رخ کر کے کہہ دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔ کوئی عیسائی روئے زمین پر باقی نہیں رہے گا۔

میدان مباہلہ میں پر امن مقابلہ تھا مگر پھر بھی لانے کیلئے کوئی غیر نہ ملا اور کربلا جہاں تباہی کا یقین، بربادی کا یقین، وہاں کم سے کم بہتر (۷۲) ساتھ آ گئے۔

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ۔

اے اہل ایمان! اللہ کی عظمت کے تقاضوں کو محسوس کرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ پہلے جزو کے متعلق عرض ہو چکا کہ سچوں کے ساتھ رہو، ایک ہی لفظ ہوتا ہے مگر متکلم بدلنے سے اس کی سطح مختلف ہو جاتی ہے۔ ہم جس وقت کسی آدمی کو کہیں کہ وہ سچا ہے تو ہمارا علم محدود، ہماری نگاہ محدود۔ لہٰذا بس اُس کی دو چار خبروں کو دیکھا کہ جو کچھ اُس نے بتایا تھا اور جو اُس نے اطلاع دی تھی، وہ صحیح نکلی۔ ہم نے کہہ دیا کہ آدمی سچا ہے۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ جو وعدہ وہ کرتا ہے، اُسے پورا بھی کرتا ہے یا نہیں۔ تو ہمیں صادق مخبر کہنے کا حق تھا، صادق القول کہنے کا حق نہیں، چہ جائیکہ پورے آدمی کو سچا کہہ دیں۔

فرض کیجئے کہ وعدوں کو بھی دو چار مرتبہ دیکھ لیا کہ جو وعدہ کیا، وہ ٹھیک نکلا۔ اب ہم نے کہا کہ سچا ہے مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس کے عمل میں ظاہر و باطن یکساں ہے یا نہیں۔ اگر ظاہر و باطن اس کے عمل میں یکساں نہیں ہیں تو کردار کی سچائی کہاں رہی اور یہ ہمارے بس کی بات بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہمارے حدودِ ادراک میں ہے اور باطن ہمارے حدودِ ادراک سے خارج ہے۔ تو ہم ظاہر و باطن میں کیونکر مطابقت کریں؟ مگر ہم اس پر غور ہی نہیں کرتے، ہم آدمی کو سچا کہہ دیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کے کردار میں ظاہر و باطن کی یک رنگی ہے یا نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ کچھ قرائن سے بھی محسوس کر لیا کہ یہ بے لوث آدمی ہے اور اس کے کردار میں دو رنگی نہیں ہے۔ لیکن ہمیں کیا معلوم کہ اس کے تصورات کیا ہیں؟ اس کے خیالات کیا ہیں؟ اس کے ذہن کی تمام گردشیں صحیح خطوط پر جاتی ہیں یا نہیں؟ جب تک ہم نے یہ محسوس نہیں کیا، اس وقت تک ہمارا یہ کہنا کہ یہ آدمی سچا ہے، کہاں قیمت رکھتا ہے؟ مگر یہ تو اس وقت ہے جب ہم کسی کو سچا کہیں اور وہ جو عالم الغیب ہے، وہ کسی کو سچا کہے تو اس کے معنی ہیں کہ اپنے علم غیب کے آئینہ میں اس نے اس کے قول کو بھی آزما لیا، اس کے عمل کو بھی دیکھ لیا اور اس کے ذہن کی گردشوں کو بھی اس نے پیش نظر رکھا۔ اس کے بعد اُس کو سچا کہا۔

اب جب اُس نے سچا کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی گفتار بھی بالکل صحیح، اس کا کردار بھی بالکل صحیح، اس کا پندار بھی بالکل صحیح۔ نہ اُس کو کوئی قول ایسا ہے جو حقیقت سے جدا ہو، نہ اس کا کوئی قول و عمل، نیت، تصور اور عقیدہ ایسا ہے جو نقطہ حقیقت سے جدا ہو۔ یہ صادق کہنا اس کے قول و عمل و تصورات سب کی صحت کا ضامن ہوگا۔ اب اگر وہ ایک کو کہے گا صادق تو وہ ایک ایسا ہوگا۔ اگر وہ کسی جماعت کو کہے صادقین تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پوری جماعت ایسی ہوگی جن کے قول و عمل اور تصور و خیال کی صحت کا وہ ضامن ہے۔ اب وہ جتنے ہوں، چاہے پانچ ہوں، چاہے بارہ ہوں، چودہ ہوں اور اس منزل میں اس سے زیادہ مجھے یاد نہیں ہے۔

اب عقلی حیثیت سے ایک پہلو پر غور کیجئے، وہ یہ کہ دو اشخاص ہوں اور ان میں اختلاف ہو۔ ایک کچھ کہتا ہو، دوسرا کچھ کہتا ہو۔

ایک کچھ سوچتا ہو، دوسرا کچھ سوچتا ہو۔ ان میں باہم قول وعمل وتصور میں اختلاف ہو تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں، نقطۂ صحت کچھ اور ہو مگر یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دونوں صحیح ہوں۔ یہاں پوری ایک جماعت ہے جسے وہ کہہ رہا ہے "صادقین"۔ تو ماننا پڑے گا کہ وہ جماعت جتنے آدمیوں کی ہے، جتنے افراد اس جماعت کی کڑی میں منسلک ہیں، وہ سب ایسے ہیں کہ نہ ان کے قول میں اختلاف ہے، نہ ان کے عمل میں اختلاف ہے۔ صورت حال میں اختلاف ہوسکتا ہے، حقیقت عمل میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔

حضور والا! جب ایسے چودہ ہوں گے کہ جن کے قول وعمل وفعل میں اختلاف نہ ہوا، اس کا مطلب یہ کہ آنکھیں چودہ ہوں گی مگر نگاہ ایک ہے۔ ہاتھ چودہ کے ہیں مگر کام ایک ہے۔ قدم چودہ کے ہیں مگر اقدام ایک ہے اور دل چودہ کا ہے مگر ارادہ ومقصد ایک ہے۔ اب ایسے چودہ جب ہوں گے تو چودہ ہونے کی وجہ سے ان میں کثرت ہے۔ لہٰذا رنگ بھی کچھ الگ الگ ان میں ہوسکتا ہے۔ مختلف رنگت میں بھی ہر ایک معیارِ حسن میں کامل ہوسکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ سب کی رنگت ایک ہو۔ قدوقامت بھی الگ ہوسکتا ہے۔ شکل وشمائل بھی اپنے معیار پر کمال کے ساتھ الگ ہوسکتے ہیں۔ جب شکلیں الگ الگ اور صورتیں الگ الگ ہیں، شخصیات جدا جدا ہیں تو نام بھی الگ الگ ہوں گے اور ذاتی وطبعی حیثیت سے کچھ مزاج بھی الگ الگ ہوسکتا ہے مگر کردار کا وہ سانچہ جسے صادق کہتے ہیں، سب کا ایک ہوگا۔

اب نام الگ الگ اور بہ اعتبار ظرف زمانہ جس کو جس صفت کے اظہار کا زیادہ موقع ملا، اس کے اعتبار سے لقب بھی الگ الگ۔ کسی کو علوم کے باطنی اسرار ورموز کے نمایاں کرنے کا موقع زیادہ ملا، اس کا لقب باقر ہوگیا۔ کسی کی سچائی کا دشمنوں کو بھی اعتراف ہوا، اس کا نام صادق ہوگیا۔ کسی کو عمر بھر غصے ہی کو ضبط کرنا ہوا، اس کا لقب کاظم ہوگیا۔ تو نام بھی الگ الگ، کنیت بھی الگ الگ اور لقب بھی الگ الگ۔ مگر وہ کردار کا ایک سانچہ، اس کے لحاظ سے جب رسول نام بتائیں گے تو کہیں گے:

اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَكُلُّنَا مُحَمَّدٌ۔

مگر یہ تو مجھے کہیں سے کچھ تعداد بھی معلوم ہے، کچھ نام بھی معلوم ہیں، کچھ کنیت بھی معلوم ہے جو میں نے اتنا آپ کے سامنے عرض کیا۔ مگر میں نے تو کہا کہ ایک صادق کی شناخت ہم نہیں کرسکتے کیونکہ عالم الغیب نہیں ہیں اور ظاہر وباطن میں مطابقت نہیں کرسکتے اور تصورات وخیالات کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ تو ایک صادق کو ہم نہیں پہچان سکتے، چہ جائیکہ ایک جماعتِ صادقین، تو اب جس نے کہا کہ سچوں کے ساتھ رہو، اسی کو بتانا چاہئے کہ وہ سچے کون ہیں؟ ورنہ کہہ دیا کہ سچوں کے ساتھ رہو اور ہم سچوں کی تشخیص نہیں کرسکتے۔ وہ بتاتا نہیں تو پھر تو آیت بس تلاوت وحفظ کیلئے رہ سکتی ہے، عمل کیلئے نہیں ہوسکتی۔

حکیم علی الاطلاق کہہ رہا ہے ہم سے، مخاطب ہم ہیں، یوں ہیں، ایسے اجزاء مقطعات قرآن ہیں، ہمارے نزدیک کچھ پیغام ہیں جو خاص رسول کے لئے تھے۔ ہم سے صیغۂ راز میں ہیں۔ پھر اس کے مخاطب بھی ہم نہیں ہیں۔ مگر ایک چیز ہے کہ مخاطب ہم کو کیا جارہا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ "اے صاحبانِ ایمان"۔

اب وہی ترجمہ کروں گا کہ اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ ہم سے کہہ رہا ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو اور بتاتا نہیں ہے کہ سچے کون ہیں؟ تو حکیم علی الاطلاق کے تقاضائے حکمت کے مطابق یہ نہیں ہے۔ پھر میں چودہ سو برس اور ساڑھے چودہ سو برس کے بعد یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اگر نہ بتائے تو ہم کیونکر عمل کریں گے۔ آخر دورِ رسالت کے مسلمان بھی تو سمجھدار تھے اور براہ راست انہی کو پکار کر کہا جا رہا تھا تو آخر انہوں نے کیوں نہیں پوچھا کہ یہ سچے کون ہیں جن کے ساتھ رہنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے؟ تو اگر پوچھا ہو تو کوئی روایت بتائے، کوئی دکھائے کہ کیا پوچھا؟ کب پوچھا؟ اور پھر رسول نے کیا کہا؟ ہماری بھی معلومات میں اضافہ ہو، کوئی ہمیں ایسی روایت بتائے اور اگر کوئی ایسی روایت نہ ملے کہ لوگوں نے پوچھا تو ماننا پڑے گا کہ بتایا لیکن عام لوگوں نے بھلا دیا۔

تو اب دنیا بھلا دے، بہر حال اگر ہمیں یاد ہے تو ہم دیکھیں کہ یہ بتایا۔ یاد رکھئے کہ بتانے کے دو طریقے ہیں۔ یہ دونوں طریقے مقصد کے حصول میں کارگر ہیں۔ پہلی صورت تو سیدھی سادی یہ ہے کہ جو صادقین ہیں، کہیں پر لا کر ان کی صورتیں دکھائی جائیں کہ دیکھو! یہ ہیں۔ یہ ایسا طریقہ ہے کہ کند ذہن آدمی بھی سمجھ لے گا۔ اس میں کوئی غور وفکر اور نکتہ رسی کی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل صاف، آنکھوں کے سامنے لا کر دکھایا جائے کہ یہ صادقین ہیں۔ کم سے کم اس سلسلہ کے جتنے افراد ہیں، اس وقت موجود ہیں، ان کو ایک جگہ پر دکھایا جائے۔ پھر ہر صادق اپنے بعد والے کا تعارف کرواتا رہے گا اور سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔

مجھے زیادہ کد وکاوش کے بغیر مل گیا ہے۔ رسول نے آفتاب نیم روز کی روشنی میں ان افراد کو سامنے لا کر دکھا دیا اور قرآن کی آیت نے اور رسول کے عمل نے مل کر بتا دیا کہ یہ افراد ہیں جو صادقین ہیں۔ نصاریٰ یمن کا نجران ایک مرکز تھا۔ وہاں جو پیغام اسلام پہنچا تو انہوں نے تحقیق کیلئے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا کہ ان کا پیغام کیا ہے۔ چنانچہ ستر آدمیوں کا وفد آیا جس میں تمام علمائے راہب شامل تھے اور میں ان کی معقولیت کی داد دوں گا کہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ دین کا معاملہ ہے، فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو اس میدان کے شہسوار ہیں، انہیں بھیجا جائے۔ جو مزاج دین سے واقف ہیں، جو کھوٹے اور کھرے اور سچے اور جھوٹے کا امتیاز نگاہ سے کر سکیں، ان کو بھیجا جائے۔ عام تصور تو یہ ہے کہ یہ لوگ تحقیق کیلئے بھیجے گئے تھے اور اس قوم کو تحقیق کا شوق ہے مگر صورت واقعہ پر غور کیجئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ صرف تحقیقاتی وفد ہوتا تو اُسے کوئی سمجھوتہ کرنے کا حق نہ ہوتا، کسی معاہدے کا حق نہ ہوتا۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا کہ جا کر رپورٹ دے دیں۔ لیکن صورت واقعہ بتاتی ہے کہ وہ معاہدہ کر کے واپس ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بااختیار وفد تھا کہ جو مناسب سمجھنا، وہ تم کرنا۔ صرف حالات کا جائزہ لینے کیلئے تم نہیں بھیجے گئے تھے مگر جو جائزہ لینے کے بعد ان کی رائے ہو، اس کے مطابق عمل بھی ان کے ذمہ تھا۔

وہ روانہ کئے گئے۔ میں نے ان کی معقولیت کی تعریف کی مگر میں اب اس قوم کو پکار کر کہتا ہوں کہ تم اتنے معقول تھے اور میں نے تمہاری معقولیت کی تعریف کی۔ لیکن اب اس معقولیت کا دامن کیوں چھوڑ دیا؟ تم ہی نے اس رسول کی تصویر کھینچی کہ ایک ہاتھ میں تلوار، ایک ہاتھ میں قرآن۔ میں کہتا ہوں یہ کیوں معقولیت کا دامن چھوڑا؟ اگر ان کا کام یہی ہوتا کہ یہ تلوار سے دین کو پھیلاتے تو تمہارے مقابلہ میں تلوار کیوں نہ کھینچی؟ تمہارے مقابلہ میں تلوار کا نہ آنا اس کا ثبوت ہے اور تمہاری معقولیت کا تقاضا ہے کہ تم اس کو مانو کہ

تلوار اُن کے مقابلہ میں کھینچی تھی جو تلواریں لے کر آئیں۔ تم تلواریں لے کر نہیں آئے تو تمہارے مقابلہ میں تلوار نہیں کھینچی۔

بہر حال وہ مدینہ آئے اور تمام تفصیلات اس کی آپ کی نظر میں ہیں۔ انہوں نے یہ سنا تھا کہ ہم تاجدار مدینہ کے پاس جارہے ہیں اور یہ ہزاروں برس کا محاورہ سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے اور گویا پیغمبر کے انقلاب میں یہ بڑی فضیلت والا لقب ہے "تاجدار مدینہ"۔ اسی سے مسلمانوں کی ذہنیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

جناب! یہ تصور اس وقت تھا اور وہ یہ تصور کیوں نہ کرتے جب تک مسلمانوں کے درمیان آج تک یہ تصور باقی ہے۔ تو انہوں نے ایسے لباس بنائے جو بادشاہوں کے دربار میں جانے کیلئے موزوں ہوں۔ حریر و دیبا کے کپڑے پہن کر آئے۔ وہ جو آئے تھے تو سن چکے تھے چرچے کہ رسول کے اخلاق ایسے ہیں۔ مگر پیغمبر خدا مصروف گفتگو رہے۔ آپ نے ادھر رُخ ہی نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ یہ خیال کر کے کہ شاید اتفاقاً نظر نہ پڑی ہو۔ جب اتفاق کی گنجائش نہ رہی، سمجھے کہ ارادی بات ہے تو واپس ہوئے۔ آپس میں یہ بات کرتے ہوئے کہ ہم نے تو ان کے اخلاق بہت بلند سنے تھے مگر ہمیں جو تلخ تجربہ ہوا ہے، اس کی تو ہمیں کسی بداخلاق سے بھی اُمید نہ تھی۔ مگر حسن اخلاق کے چرچوں کا تو اتراتنی قوت رکھتا تھا کہ مشاہدہ ان کے مقابلہ میں تک نہیں رہا تھا ور نہ رکنے کی ضرورت کیا تھی؟ اسی وقت واپس جاتے اور جا کر کہتے کہ اب کیا تحقیق کریں؟ یہی خبر غلط نکلی۔ ان کے تو اخلاق ایسے ہیں۔ مگر حسن اخلاق کے چرچوں کا دباؤ ذہن پر تھا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ نہیں، کوئی بات ہے۔ وہ بات کیونکر معلوم ہو؟ تو جو ان کے مزاج شناس ہو سکتے ہیں، ان کے دربار کے حاضر باش ہو سکتے ہیں، ان سے دریافت کیا جائے کہ اس میں راز کیا ہے؟

اب کئی اصحاب سے پوچھا اور آخر میں اس ذات کے پاس پہنچ گئے جس کیلئے دنیا کا گویا مقدر تھا کہ ہر طرف سے ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچے۔ جو لوگ جواب نہیں دے سکتے تھے، وہ بھی ساتھ ساتھ تھے کہ جب جواب نہیں ملے گا تو ہماری بھی سمجھ میں آجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ان سے پوچھو۔ یہ بچپن سے رسول کے ساتھ ہیں۔ آپ سے دریافت کیا۔ وہاں سے سیدھے آئے تھے۔ لباس کی تبدیلی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ آپ نے غور سے ان کے لباس کو دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ کیا یہی کپڑے پہن کر تم گئے تھے؟ انہوں نے کہا: جی، یہی تو کپڑے پہن کر ہم گئے تھے۔ یعنی کوئی خلاف شانِ دربار بات ہم نے نہیں کی، یہی کپڑے پہن کر گئے تھے۔

آپ نے ارشاد فرمایا: تم تو راہب ہو، تارک الدنیا ہو۔ یہ تم نے کیا سوانگ رچایا ہے؟ جو اصلی کپڑے ہیں، ان میں جاؤ اور دیکھو۔ اوّل تو ان کے ذہن نے قبول کر لیا کہ ہاں، یہ بات ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عقل نے کہا ہوگا کہ انہوں نے ایک نسخہ تو بتایا، اسے آزما کر دیکھو۔ چنانچہ گئے اور وہ کپڑے بیچاروں نے پھینکے اور وہیں سے اپنے کپڑے پہنے اور دوسرے دن پیغمبر خدا کے پاس آئے اور دیکھتے ہی رسولِ خدا تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔

ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں، دیکھئے قرآن کا کیا ذکر، عملِ رسول بھی کافی نہیں ہوتا، جب تک شرح کرنے والا نہ ہو۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیسے آپ لوگ آئے؟ انہوں نے بتایا کہ تحقیق کرنے کیلئے آئے ہیں اور آپ کے پیغام کو سننا چاہتے ہیں۔ جو جو آپ نے کہا، وہ ان کی عقل قبول کرتی گئی کہ ہاں! بالکل صحیح ہے۔ ہر چیز کو اُن کا ذہن مان رہا تھا لیکن آخر میں بات یہ آگئی کہ حضرت عیسیٰ کے

بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سورۂ آل عمران اس سلسلہ میں نازل ہوا۔ ان کی ولادت کا تذکرہ رفعت و بلندی وغیرہ اس میں تھی۔ انہوں نے کہا: صحیح ہے۔ آپ ان کو نبی مانتے ہیں، رسول مانتے ہیں۔ صاف صاف یہ بتایئے کہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب یہی تھا کہ نہیں، ہم نہیں مانتے۔ انہوں نے اپنے نزدیک یہ بہت بڑی دلیل پیش کردی کہ اگر آپ خدا کا بیٹا نہیں مانتے تو بتایئے کہ وہ کس کے بیٹے ہیں؟ گویا لاجواب کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر رسولِ خدا ہمارے اصول مناظرہ کے پابند ہوتے تو بائبل میں حضرت عیسیٰ کا پورا شجرہ موجود ہے۔ یوسف نجار کے ذریعہ سے حضرت آدم تک ان کے نسب کو پہنچا دیا گیا ہے۔ فرما دیتے کہ ہم سے کیا پوچھتے ہو، تمہاری کتابوں میں ان کا پورا شجرہ لکھا ہوا ہے۔ مگر حضور! یہ مناظرہ کا فن ہوتا ہے۔ حقیقت شناسی یہ نہیں ہوتی کہ باطل کو باطل سے رَدّ کیا جائے۔ جب ہم اُسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو اس کو ان کے مقابلہ میں سند میں کیوں پیش کریں۔ جو اصل واقعہ ہے، اس کو پیش کرنا ہے۔ اس پر یہ آیت اُتری:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ۔

ان سے کہہ دیجئے کہ مثال حضرت عیسیٰ کی مثل حضرت آدم کے ہے، یہاں تو کم از کم ایک فریق موجود ہے جس سے ولادت ہوئی ہے، وہاں تو نہ ماں اور نہ باپ۔ تو جو خدا اس پر قادر ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ بغیر باپ کے وہ پیدا کرے۔ جہاں تک دلیل کا تعلق ہے تو جواب تو کوئی نہیں تھا۔ اس کو وہ رَدّ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آدم کی خلقت مسلّم ہے۔ اُسے عیسائی بھی مانتے ہیں، اُسے یہودی بھی مانتے ہیں۔ ان کا طریقِ خلقت سب کے نزدیک ایک ہی ہے۔ اب جواب تو کوئی نہیں تھا، مگر جو نہ ماننا چاہتا ہو، اُسے خدا اور رسول بھی قائل نہیں کر سکتے۔ اب آیت تیور بدل کر اُتری۔ آیت کی اٹھان بڑی ہی ہولناک ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

اب اتنے علمی دلائل آنے کے بعد نہ مانے تو اب معلوم ہوتا ہے کہ "ہمیں گو ہمیں میدان"۔ مگر وہ میدان دوسرا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ پھر بھی نہ مانے تو آپ یہ کہہ دیجئے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ

ان سے کہہ دیجئے کہ پھر آجاؤ، ہم اپنے بیٹوں کو لائیں، تم اپنے بیٹوں کو لاؤ، ہم اپنی عورتوں کو لائیں، تم اپنی عورتوں کو لاؤ، ہم اپنے نفوس کو لائیں، تم اپنے نفوس کو لاؤ، پھر مباہلہ کرلیں۔ مباہلے کے معنی ہیں اللہ سے لَو لگانا، رجوع الی اللہ۔ اللہ کی طرف رجوع کریں اور پھر فیصلہ ہو جائے۔ یہ انداز اختیار کیا گیا کہ اگر یہ اب بھی نہ مانیں، علمی دلائل آنے کے بعد، یہ علمی دلائل کیا ہیں؟ یہ قرآن ہے۔ اگر مگر کا

سوال نہیں ہے۔ اب واقعہ قرآنی ہے کہ جب قرآن کافی نہیں ہوتا تو یہ لوگ لائے جاتے ہیں۔

آخر کا جملہ میں نے نہیں پڑھا کہ "نَبْتَهِل" ۔ اللہ سے لو لگائیں، رجوع کریں۔

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ

"پھر اللہ کی لعنت قرار دیں"۔

کن پر؟ یاد رکھئے، ضد سے ضد پہچانی جاتی ہے۔ اگر کہا جاتا "فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ" تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ جو ادھر سے لائے جا رہے ہیں، وہ مومنین ہیں۔ اگر کہا جاتا "فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِيْنَ" تو پتہ چلتا کہ ادھر سے جو آئے ہیں، وہ سب عادلین ہیں۔ حالانکہ قرآن میں لعنت ظالمین پر بھی ہے۔ قرآن میں لعنت کافرین پر بھی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے۔ یہ مسلمانوں کے سوچنے کی بات ہے کہ خدا سے بڑھ کر کس کی تہذیب ہوگی۔ خدا سے بڑھ کر کون مہذب ہے اور خدا سے بڑھ کر سنجیدہ کلام اور دشنام کے امتیازات کو جاننے والا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے؟

بہر حال قرآن میں کافرین پر لعنت ہے، ظالمین پر بھی لعنت ہے مگر یہاں نہ کافرین کہا جا رہا ہے، نہ ظالمین کہا جا رہا ہے۔ یہاں کہا جا رہا ہے:

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

"اللہ کی لعنت قرار دیں کاذبین پر"۔

میں کہتا ہوں کہ اب نظر جما دیجئے میدانِ مباہلہ پر کہ جو ادھر سے لائے جائیں گے، وہ صادقین ہوں گے۔ تو اب میرے بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہ منزل تعارف صادقین کی ہے۔ وہ آیت کہہ رہی ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو اور یہاں لا کر دکھا دیا گیا ہے کہ صادقین اس وقت یہ ہیں۔ اب منطق میں اس کی کیا تعریف ہے، جب یہ سوال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کیا شے ہے؟ تو اس کے جواب میں جو شے حقیقت ہو، بتانے کیلئے اُسے تعریف کہتے ہیں۔ تو تعریف کی شے کی جامع و مانع ہونی چاہئے۔ جامع کے معنی ہیں کہ کوئی فرد چھوٹ نہ جائے اور مانع کے معنی یہ ہیں کہ کوئی غیر مرد شامل نہ ہو جائے۔

مثلاً پوچھا جائے کہ انسان کون ہوتا ہے؟ اور کوئی کہے کہ جو گورا چٹا ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ بیچارے جتنے کالے، سانولے ہیں، وہ تو سب خارج ہو گئے اور یورپ کی زبان میں تو ہم سب خارج ہو گئے کیونکہ ہمارا گورا بھی ان کے نزدیک کالا ہے۔ تو وہ تو قوم کا نام گورا ہے اور ہمارا نام ہی کالا ہے۔ بہر حال اس کے معنی یہ ہیں کہ تعریف جامع نہیں ہے۔ یعنی سب انسان اس میں نہیں ہیں اور اگر کہا جائے کہ جو زمین پر چلتا پھرتا ہو، تو لیجئے جتنے کیڑے مکوڑے تھے، وہ سب داخل ہو گئے۔ زمین پر چلنے والے سب جانور داخل ہو گئے۔ تو تعریف مانع نہ رہی۔ تو تعریف غلط ہو جائے گی۔ تعریف کو جامع ہونا چاہئے اور مانع ہونا چاہئے۔

یہاں میں نے کہا کہ یہ درحقیقت صادقین کے تعارف کی منزل ہے۔ تو جامع ہونے کیلئے تو یہ اہتمام کیا گیا کہ کوئی فرد چھوٹ نہ

جائے۔ یہاں تک کہ جس کا گھر سے نکلنے کا دستور تک نہ ہو، وہ بھی اس منزل میں ضرور آئے اور بچے اگر ہیں تو انہیں بھی نہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ اس سلسلہ کے افراد ہیں تو وہ بھی لائے جائیں۔ یہ تو جامع ہونے کا اہتمام ہے اور مانع ہوتے ہیں۔ مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پتہ چلے کہ بس یہی ہیں، کوئی دوسرا نہیں ہے کہ جو یہاں آسکے۔ صرف یہی افراد ہیں جن کو پیغمبر خدا لائے۔ اس کیلئے خدا اور رسول دونوں نے اہتمام کیا، مانع ہونے کے ثبوت کیا۔ دونوں نے یوں کیا کہ اس کا قول اور ان کا عمل۔ دونوں نے مل کر اس مقصد کو پورا کیا کہ خالق نے ہر جگہ جمع کا لفظ استعمال کیا۔

ہمارے ہاں اُردو میں تو بس دو منزلیں ہیں، واحد اور جمع۔ فارسی میں بھی آمد اور آمدند۔ آیا اور آئے۔ مگر عربی میں تین منزلیں ہیں۔ سنسکرت میں بھی تین منزلیں ہیں۔ واحد، تثنیہ اور جمع واحد۔ ایک تثنیہ دو اور جب دو سے زیادہ ہوں تو جمع۔ یہاں جتنے الفاظ ہیں، ان کا واحد بھی مجھے معلوم ہے، تثنیہ بھی مجھے معلوم ہے کہ ایک ہو تو ابن، دو ہوں تو ابنان اور دو سے زیادہ ہوں تو "ابناء"۔ اس کے بعد ایک عورت ہو تو امراۃ، دو ہوں تو امراتان۔ یہاں تو لفظ وہی رہا۔ جب کئی ہوں تو نساء۔ سب حرف بدل گئے۔ جمع ہو، تب نساء ۔ اسی طرح ایک عدد ہو تو نفس، دو ہوں تو نفسان۔ جب دو سے زیادہ ہوں تو "انفس"۔ تو خالق نے ہر جگہ جمع کا لفظ استعمال کیا اور رسول کسی ایک جگہ بھی جمع نہ لے گئے۔ ابناء کی منزل میں دو عدد، تثنیہ کی حد تک پہنچے، جمع تو نہیں ہوئے اور نساء کی منزل میں بس ایک فردِ فرید اور انفس کی منزل میں بس ایک نفس نفیس۔ تو کیا مجھ ایسا جاہل تو عربی کے لفظ کے تقاضے جانتا ہے اور پیغمبر عرب، عربی کے لفظ کے تقاضوں کو نہیں جانتے۔ اب دوسرا رُخ کہ کیا خالق اپنے پیغمبر کے پیمانہ عمل کو نہیں جانتا تھا؟ اب یہ اس کے لفظوں کی حدود سے واقف، وہ ان کے عمل کی حدود سے واقف۔ تو پھر لازماً ماننا پڑے گا کہ کوئی اس میں حکمت ربانی ہے کہ وہ ہر جگہ جمع استعمال کرے۔ مگر یہ ایک جگہ بھی جمع نہ لیجائیں اور وہ حکمت جو میری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہی ہے کہ اگر وہ اس میں واحد کے الفاظ استعمال کرتا تو سوچنے والا سوچ سکتا تھا کہ لانے کے قابل اور بھی لوگ تھے۔

لہٰذا اتفاق سے جو پاس تھے، اور وہ تو رہے ہی تھے پاس، ان کو لے گئے۔ ضرورت کیا تھی کسی کو بلوا کر لے جانے کی؟ تو مانع ہونے کا یعنی انحصار کا مقصد واضح نہ ہوتا کہ بس یہی ہے۔ لہٰذا خالق نے جمع کے الفاظ صرف کئے جن کی تعمیل بشرطِ امکان دو ایک سے ہو ہی نہ سکے۔ اب اگر فرض شناس رسول جمع کہیں نہ لے گئے بلکہ دو اور ایک لے گئے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ظرف وجود کی کوتاہی تھی کہ ان سے بڑھ کر موجود ہی نہ تھے ورنہ فریضہ آئینی و قانونی ہوتا کہ یہ آدمی بھیج بھیج کر بلوائیں تا کہ تعمیل حکمِ الٰہی ہو۔

اب جو نہیں لے گئے تو ماننا پڑے گا کہ بس یہی تھے اور کوئی تھا ہی نہیں اس معیار پر۔ اسی کیلئے خالق نے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا کہ "ابناءنا"۔ یہ لفظ تو رشتہ کا نمائندہ ہے۔ بیٹا ایک رشتہ ہے مگر اس کے بعد معلوم ہے ہمیں کہ واحد کو اگر جمع بھی بنانا تھا تو سیدہ عالم بیٹی تھیں، "بَنَاتَنَا" کہہ دیا جاتا۔ مناسب مراۃ النظیر بھی تھی کہ "ابناءنا و بناتنا"۔ جوڑ تھا، مناسبت لفظی بھی تھی مگر "ابناء" لفظ رشتے کا نمائندہ۔ اس کے بعد لفظ بدل دیا "نِسَاءَنَا"۔ اب "نِسَاءَنَا" لفظ رشتہ کا نمائندہ نہیں ہے، صنف کا نمائندہ ہے۔ اس میں حکمت ربانی دیکھئے۔ اگر کہا جاتا "بَنَاتَنَا"۔ ایک مطلب تو ہمارا پھر بھی نکل ہی آتا کہ خالق نے بنات کہا ہے تو اگر ایک کے سوا کوئی اور بیٹی ہوتی تو

رسول کو لازم تھا کہ لے جائیں۔ یہاں اُس نے "نِسَاءَنَا" نہیں کہا، "نساء نا" کہا۔ عورتوں کی منزل میں اگر اُس نے "نِسَاءَنَا" کہا ہوتا تو دنیا سوچ سکتی تھی کہ خالق نے رشتہ مقرر کر دیا تھا۔ اس لئے دوسرے رشتہ کی خواتین میں لانے کے قابل افراد تھے۔ مگر کیا کیا جائے کہ جو رشتہ وہاں مقرر کر دیا گیا تھا، جو فرد اس رشتہ کا نمائندہ تھا، وہی لایا گیا۔ لہٰذا خالق نے یہاں ممکن بندوں کا منہ بند کرنے کیلئے قیامت تک لفظ بدل دیا۔ "نِسَاءَنَا" نہیں۔ یعنی

کوئی رشتہ یہاں پر نہیں چاہتا۔ "نساء نا" ہم اپنی عورتوں کو بلائیں۔ اب اگر ایک ہی آئے تو سمجھ لو کہ کسی رشتہ کا کوئی اس صنف کا فرد کہیں نہیں ہے جو اس منزل میں آنے کے قابل ہو۔

معلوم ہوا کہ اب یہ افراد لا کر بالکل صادقین کی تعریف مکمل کر دی گئی۔ جامع اور مانع کہ اس وقت ان کے علاوہ کوئی دوسرا فرد موجود نہیں ہے جو اس منزل پر آئے۔ جو آنے کے قابل تھے، ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں گیا اور جو نہیں لے گئے، بس سمجھو کہ اس منزل میں خدا اور رسول کی نگاہ میں وہ نہیں ہیں جو آسکیں۔ یوں تمہاری نگاہ میں صادق بنیں۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی لفظ ہو سکتا ہے؟ لیکن اللہ کی زبان میں جو اس کا معیار ہے، وہ بس انہی افراد میں ہے کہ جو منزلِ مباہلہ میں آئے ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی دوسرا اس منزل میں نہیں ہے۔

تو معلوم ہوا کہ صادقین کا تعارف اب مکمل ہو گیا۔ بس اس کے علاوہ ہر اقدام میں بہت سے مصالح ہوتے ہیں کہ خالق کا مقصد پورا ہو کہ ایک آیت اس کی جو ابھی تک تشنۂ تکمیل رہتی، اس کی تشخیص ہو گئی۔ ان افراد کا تعارف ہو گیا۔ تو ایک آیت کے ساتھ دوسری آیت بھی کار آمد ہو گئی۔ تو اس کا مطلب بھی پورا ہوا اور پھر پیغمبر خدا نے ان افراد کو اپنے ساتھ لا کر یہ دکھا دیا کہ دیکھو! جو میرا کارِ تبلیغ ہے، اس وقت تو میں ہوں، میں نے اپنے ساتھ شریک کر کے تمہیں دکھا دیا۔ جب میں نہ ہوں تو بس یہی افراد ہو سکتے ہیں جو میرے مشن کو آگے بڑھائیں۔ یہی افراد ہو سکتے ہیں جو میرے مقصد کی تکمیل کریں۔

دوسرے الفاظ میں کہوں کہ شریکِ منصب نہیں ہیں مگر شریکِ کار ہیں۔ بس اب چشمِ دل سے دیکھئے کہ میدانِ مباہلہ میں سب سے آگے کون ہے؟ اگر کہئے تو لفظ بدل دوں، یہ نہ کہوں کہ سب سے آگے کون ہے؟ یہ کہوں کہ یہ دیکھئے کہ سب سے آگے کس کا چہرہ ہے؟ روایت بتاتی ہے کہ یہی چہرے تھے جن کو دیکھ کر ادھر کے سردار نے کہا: ہرگز مباہلہ نہ کرنا:

اِنِّیْ اَرٰی وُجُوْهًا۔

میں وہ چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر خدا کی طرف رُخ کر کے کہہ دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ اگر ان سے مباہلہ کرو گے تو کوئی عیسائی روئے زمین پر باقی نہیں رہے گا۔ اسی وجہ سے مباہلہ نہیں ہوا۔ میں نے کہا کہ آگے کونسا چہرہ ہے؟ بے شک پیغمبر خدا، سیدہ عالم سلام اللہ علیہا بے شک ہیں، مگر یہی کیا کم ہے کہ تعمیل حکم الٰہی کیلئے کہ دولت الشرف سے باہر آئی ہیں؟ لیکن کوئی ضرورت نہیں کہ وہ برقعہ و چادر میں نہاں نہ ہوں۔ سر سے پیر تک برقعہ و چادر میں نہاں نہ ہوں۔ پھر آگے آگے حجابِ رسالت، پیچھے پیچھے حجابِ امامت۔ درمیان میں یہ عصمتِ کبریٰ، اس شان سے آئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا چہرہ کہاں سامنے ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پردہ کی ضرورت کے تحت

فاطمہ سب سے پیچھے، عقب میں امیر المومنین ہیں۔

تو اب آگے کونسا چہرہ ہے؟ ہاں! رسول اللہ آگے ہیں۔ ہاں! حسن مجتبیٰ بھی ہیں ان کے ساتھ ساتھ۔ مگر قد چھوٹا ہے، انگلی تھامے ہوئے نانا کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ وہی دیکھے گا جو قریب آئے لیکن ایک بچہ ہے جسے رسول گود میں لئے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اس ستارۂ سحری کی طرح جو آمدِ آفتاب کی خبر دیتا ہے، حسین کا چہرہ ہے جو دشمن کی نگاہ کے سامنے آگے ہے اور یہ حسین ہی کو سب سے آگے کیوں رکھا ہے؟ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ آج کی مثال کو دُہرانے کا وقت انہی پر آئے گا۔ یہ جب جارہے تھے تو لوگ کہہ رہے تھے کہ جب آپ جاتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جاتے ہیں؟ اس کیلئے جواب میں ان کے پاس بدر کی مثال نہ تھی، اُحد کی مثال نہ تھی، خندق وخیبر کی مثال نہ تھی۔ بس مباہلہ کی مثال تھی کہ نانا نے بھی اس جہاد میں کسی صنف کی نمائندگی نہیں چھوڑی تو میں بھی کسی صنف کی نمائندگی نہیں چھوڑوں گا۔

اگر نانا اپنے ساتھ میرے بابا علی علیہ السلام کو نہ لائے ہوتے تو میں اپنے بھائی ابوالفضل العباس کو نہ لاتا۔ اگر میرے نانا مجھے اور میرے بھائی حسن مجتبیٰ کو نہ لائے ہوتے تو میں علی اکبر و علی اصغر کو نہ لاتا۔ اگر میرے نانا میری والدہ فاطمہ زہرا کو نہ لائے ہوتے تو میں اپنی بہنوں زینب واُمِ کلثوم کو نہ لاتا۔ نہ وہاں کسی کی نمائندگی چھوڑی گئی، نہ یہاں کسی کی نمائندگی چھوٹے گی۔

مثال وہی تھی جسے دُہرایا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ وقت کے بدلنے سے بڑا ارتقاء ہو گیا۔ مباہلہ پُرامن مقابلہ تھا۔ ارے خطرہ انہیں ہوگا جنہیں حقانیت میں شک ہو۔ آنے والے ان افراد میں سے کسی کو خطرہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا تصور بھی کفر ہے کہ انہیں خطرہ ہو۔ تو پُرامن مقابلہ مگر پھر بھی لانے کیلئے کوئی غیر نہ ملا اور کربلا جہاں تباہی و بربادی کا یقین، وہاں کم سے کم بہتر (۷۲) ساتھ آگئے۔ ان میں انساب کی حقیقت ہے جو غیر کہتا ہوں ورنہ جہاں تک کربلا کا تعلق ہے، مجھے تو یگانہ و بیگانہ کا فرق نہیں معلوم ہوتا۔

بس ایک پہلو اور، میدانِ مباہلہ میں جو آئے تھے، کوئی روایت نہیں بتاتی کہ وہ سیر و سیراب نہ ہوں مگر کربلا کے میدان میں تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے۔

54

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جو اللہ کی اطاعت کرے، وہ ہمارا دوست ہے اور جو اللہ کی نافرمانی کرے، وہ ہمارا دشمن ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: دیکھو! ہمارے لئے باعث زینت بنو، ہمارے دامن کا داغ نہ بنو۔

جنہوں نے کہا کہ ہم بارہ کو بحمد للہ مانتے ہیں، اب ان پر ذمہ داری ہے کہ اپنے کردار سے ثابت کریں کہ اتنے رہنماؤں سے انہوں نے کیا حاصل کیا؟

ایک وقت میں کثرت نماز ہی ہماری پہچان تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کس وقت ہوئے انقلاب ایسی چلی کہ ہم ان صفات سے عاری ہو گئے۔

عزاداران حسینؑ سے کہتا ہوں کہ اگر مولاؑ کی دعائیں لیتا ہیں تو نماز کو نہ بھولے۔ کیا کہنا اس نماز کا کہ ادھر نماز ہو رہی ہے اور اُدھر دو صحابی تیر کھا رہے ہیں۔

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔

اے صاحبانِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ ہم ایک سچے کی شناخت نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ ایک جماعت کی شناخت کریں۔ لہٰذا جس نے کہا ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو، اسی کی طرف سے سچوں کا تعارف ہونا چاہئے۔ اس کے سمجھنے کے دو ذرائع ہیں۔ پہلا ذریعہ یہ ہے کہ ان اشخاص کو جو اس وقت صادقین کے مصداق ہیں، ہمارے سامنے لا کر دکھا دیا جائے کہ یہ صادقین ہیں۔ دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ جس میں ذہن کے صرف کرنے کی ضرورت ہے، غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ جس نے یہ کہا کہ صادقین کا ساتھ دو، اسی کے اور کلام اور اس کی طرف سے آئے ہوئے الفاظ کو ملا کر پتہ چلایا جائے کہ صادقین کون ہو سکتے ہیں۔

اس کیلئے ایک مختصر تمہید یہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں آپس میں تضاد نہیں ہو سکتا، ٹکراؤ نہیں ہو سکتا کہ ایک دفعہ کچھ کہے اور پھر اس کے خلاف کوئی بات کہے۔ کیا کلامِ الٰہی میں ایسا ہو سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہر صاحب عقل کہے گا کہ کلامِ الٰہی میں ایسا نہیں ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہو سکتا۔ ارے ہمارے اور آپ کے کلام میں بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ہم کہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں اور ہمیں یاد نہیں رہتا کہ پہلے کیا کہا تھا تو اس کے بعد دوسرے وقت ایسی بات کہہ دی جو اس سے مختلف ہو، اس سے ٹکرا جائے۔ یہ ہمارے ہاں امکان ہے۔ ایک اور قسم ہے سیاست دانوں کی کہ وہ جان بوجھ کر بھولتے ہیں۔ اکثر باتیں بھولنے کی خاطر ہی کہتے ہیں۔ جس وقت کہہ رہے ہوتے ہیں، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھول جائیں گے۔ ہمارا خدا نہ بھولنے والا ہے، نہ اس معنی کا سیاست دان ہے۔ جب میں خدا کیلئے یہ کہنے کو تیار ہوں کہ وہ اس معنی کا سیاست دان نہیں ہے تو اگر اس کے کسی مقرب بارگاہ و خاص بندے کیلئے دنیا کہے کہ سیاست نہیں جانتے تھے تو میں برا نہیں مانوں گا۔

اس قسم کی سیاست سچائی کے ساتھ جمع ہو ہی نہیں سکتی جو بھی صادقین کا فرد ہوگا، وہ ایسا سیاست دان نہیں ہوگا۔ صادقین کا کوئی فرد ایسا نہیں ہو سکتا تو اصدق الصادقین بھلا ایسا کیوں ہونے لگا؟ لہٰذا اس کے کلام میں تضاد نہیں ہو سکتا۔

اچھا! اب دوسرا جزو کہ کیا پیغمبر اسلام کے کلام میں تضاد ہو سکتا ہے کہ رسول ایک وقت میں کچھ کہیں اور دوسرے وقت میں کچھ؟ روایتوں میں یہ ہوتا ہے۔ رسول نے ان میں سے ایک ہی بات کہی ہے۔ راویوں نے حضرت کی طرف دوسری بات منسوب کر دی۔ لیکن واقعی جو حضرت کا کلام ہے، میرے نزدیک اس میں تضاد نہیں ہو سکتا۔

اب وہ ایک جماعت جو رسول کو کہتی ہے کہ چونکہ بشر تھے تو بھولنا چوکنا بشریت کا تقاضا ہے جبکہ بنص قرآن حضرت بشر تھے تو پھر بھولنے کا امکان بھی ہے، چوکنے کا امکان بھی ہے۔ تو حقیقت میں ان لوگوں نے منزلِ بشریت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ یہ بشر ناشناسی کی وجہ

سے کچھتے ہیں کہ بھولنا چوکنا بشریت اور انسانیت کا لازمہ ہے۔ یہ زیادہ تر اپنی بھول چوک کو حق بجانب بتانے کیلئے بیچاری انسانیت پر حرف لایا جاتا ہے کہ چونکہ انسان ہیں، لہٰذا بھولیں گے بھی۔ اپنی غلطیوں کو غیر اہم قرار دینے کیلئے کہ وہ زیادہ قابل اعتراض نہیں ہیں، اس استدلال کا استعمال ہے۔ ایسے افراد کو جنہیں خود کو گھٹانا منظور نہیں ہے، بڑھانا منظور ہے، لیکن ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غلطیاں کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ کیا واقعی بھول چوک انسانیت کا لازمی حصہ ہے کہ جو انسان ہو، اُسے بھولنا ضرور چاہئے؟ جو انسان ہو، اُسے غلطی ضرور کرنی چاہئے؟ جو چیز کسی چیز کا لازمہ ہو، تو جتنی وہ چیز زیادہ کامل ہو، اتنا اس لازمہ کو بڑھنا چاہئے۔ روشنی کا کام ہے تاریکی کو دور کرنا تو جتنی روشنی زیادہ کامل ہوگی، تاریکی اتنی ہی زیادہ دور ہوگی۔ تو اگر یہ تصور صحیح ہو کہ بھولنا چوکنا بشریت کا لازمہ ہے، لوازمِ انسانیت میں سے ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا کامل انسان ہو، اُتنا زیادہ بھولے گا، حالانکہ ہر بڑے آدمی کے حالات میں یہ لکھا جائے گا کہ حافظہ بہت قوی تھا، بھولتے بہت کم تھے۔ صاحب الرائے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانیت کی بڑائی ان چیزوں کے بڑھنے میں نہیں ہے، گھٹنے میں ہے۔

تو اب سمجھ میں آتا ہے کہ بھولنا چوکنا لوازمِ انسانیت میں سے نہیں ہے، ناقص انسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانیت کا نقص ہے۔ لہٰذا جتنی انسانیت نقطہ کمال پر ہوگی، اتنی ہی بھول بھی ختم ہوگی، چوک بھی ختم ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کا کامل نقطہ وہ ہوگا جہاں ایک شائبہ بھی بھول کا نہ ہو۔ اسی کو ہم معصوم کہتے ہیں۔

جناب پیغمبر اسلام کے کلام میں بھی بھول کا سوال نہیں۔ آپ کے کلام میں بھی تضاد نہیں ہوسکتا۔ ایک دوسری بات یہ کہ جو بھول کا تصور بھی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسالت کے کام میں بھول نہیں ہوتی۔ بشری باتیں جو ہیں، اس میں بھول ہوسکتی ہے، رسالت کے فرائض ادا کرنے میں بھول کا سوال نہیں ہے۔ اب جو بات خدا کی طرف سے کہی جائے، وہ تو رسالت کا کام ہے۔ لہٰذا اس میں تو کسی کے نزدیک بھی بھول نہیں ہونی چاہئے تو اس میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی الگ بات نہیں ہے۔ یہ پیغامبر ہیں تو جو اُن کی زبان پر آتا ہے، وہ خدا کا پیغام ہوتا ہے۔ جب خدا کے کلام میں تضاد نہیں ہوسکتا تو اس کے پیغمبر کے کلام میں تضاد کس طرح ہوگا!

تیسرا سوال یہ کہ کیا قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہوسکتا ہے؟ تضاد ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ قرآن اس کا کلام اور حدیث اس کا پیغام۔ جب اُس کے کلام میں تضاد نہیں، اُس کے پیغام میں تضاد نہیں تو اس کے کلام اور پیغام میں تضاد کیونکر ہوگا؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ نہ قرآن میں تضاد ہوسکتا ہے اور نہ حدیث رسول میں تضاد ہوسکتا ہے اور نہ قرآن اور حدیث میں آپس میں تضاد ہوسکتا ہے۔

دو آیتیں پڑھتا ہوں۔ شروع میں ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے ربط یا تعلق سمجھ میں نہ آئے تو سمجھئے کہ بنظر ثواب قرآن کا پڑھنا بھی ثواب اور حدیث رسول کا پڑھنا بھی باعث ثواب۔ تو دو آیات پڑھنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور دو حدیثیں پڑھنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ آیت ایک یہی ہے جو سرنامہ کلام ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔

"اے صاحبانِ ایمان! اللہ کی عظمت کے تقاضوں کو محسوس کرو اور سچوں کے ساتھ رہو"۔

یہ ایک آیت ہے، دوسری آیت:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔

"اے صاحبانِ ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر جو تم میں سے ہیں"۔

یہ دوسری آیت۔ حدیث ایک یہ ہے کہ:

اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ۔

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور ایک میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے، گمراہ نہیں ہو گے"۔

یہ ایک حدیث، دوسری حدیث:

مَثَلُ اَهْلَبَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰى وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰى

"میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے، جو اس پر سوار ہوا، اُس نے نجات پائی اور جس نے تخلّف کیا وہ ڈوبا اور گیا"۔

دو وہ آیتیں اور دو یہ حدیثیں ہیں۔ اب ذرا مضمون کو دیکھئے کہ وہ آیت کہتی ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو، بلا قید، کوئی اس میں شرط نہیں، کوئی قید نہیں۔ وہ آیت کہتی ہے کہ اللہ اور رسول کے بعد اولی الامر کی اطاعت کرو۔ یہ بھی بلا قید، بلا شرط۔ وہ حدیث کہتی ہے کہ میرے اہل بیت سے تمسک رکھو۔ قرآن کے ساتھ ساتھ میرے اہل بیت تمسک رکھو۔ اس میں بھی کوئی شرط، کوئی قید نہیں۔ یہ حدیث کہتی ہے کہ میرے اہل بیت، میری عترت کی کشتی پر سوار ہو اور اگر سوار نہ ہوئے تو ڈوب جاؤ گے۔ اس میں بھی کوئی قید نہیں، کوئی شرط نہیں کہ اگر ایسا ہو تو کشتی پر سوار اور اگر ایسا نہ ہو تو کشتی پر سوار نہ ہو۔ ایسی کوئی قید نہیں بلکہ یہ کہ جو کشتی پر سوار ہو گا، وہ نجات پائے گا۔

بس اب ہر صاحب عقل غور کرے اور مسلمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو عقل کو خیرباد کہہ دے۔ تو ہر صاحب عقل اس پر غور کرے بلکہ میں اس منزل میں غیر مسلم کے فیصلہ پر بھی عمل کرنے کیلئے تیار ہوں۔ میں اس سے بھی فیصلہ کروانے کیلئے تیار ہوں۔ کوئی کہے کہ قرآن وحدیث کا معاملہ ہے، کوئی غیر مسلم کیا فیصلہ دے گا؟ میں کہتا ہوں کہ مجھے تو الفاظ کا تقاضا پوچھنا ہے۔ جج وقف نامہ کے الفاظ کو دیکھتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ واقف کا ہم مذہب بھی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس وقف نامہ کے الفاظ کا نتیجہ یہ ہے۔ وصیت نامہ دیکھتا ہے، اُس کا مذہب کچھ اور، اس کا مذہب کچھ اور۔ یہ بھی اس کی وصیت کے لحاظ سے کہتا ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن اور

حدیث کو صحیح مانتا ہو یا نہیں، میں کہتا ہوں کسی نے اک دفعہ یہ کہا ہو، ایک دفعہ یہ پیغام دیا ہو تو آپ فیصلہ کردیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے۔ اس میں مذہب اور ملت کا سوال نہیں۔ میں اس کے سامنے بھی یہ مقدمہ پیش کرسکتا ہوں۔

تو اب ہر صاحب عقل غور کرے، چاہے مسلمان ہو، چاہے غیر مسلم کہ اگر صادقین کوئی اور ہوں اور اولی الامر کوئی اور ہوں، عترت کوئی اور ہو اور اہل بیت کوئی اور ہوں تو کیا عقلاً یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں؟ ان کی اطاعت کریں؟ ان سے تمسک رکھیں؟ ان کی کشتی پر سوار ہوں؟

اب دنیا میں لوگ اولی الامر کے کچھ بھی معنی سمجھیں، اس کے پیش نظر یہ کہہ رہا ہوں کہ یا تو "صادقین کے ساتھ رہو" میں کوئی قید ہوتی کہ صادقین کے ساتھ رہو، جب تک اولی الامر کے احکام کے خلاف نہ ہو اور جب اولی الامر کے احکام کے خلاف ہونے لگے تو صادقین کا ساتھ چھوڑ دو۔ وہاں قید ہوتی یا یہاں قید ہوتی کہ اولی الامر کی اطاعت کرو جب تک صادقین کا ساتھ نہ چھوٹے اور جب صادقین کا ساتھ چھوٹنے لگے تو اولی الامر کی پروا نہ کرو، وہ کچھ بھی کہتے ہیں، یہاں قید ہوتی۔ اب جس کو جو پسند ہو، صادقین کا ساتھ منظور ہے۔ تو اولی الامر کو بلا قید نہ رکھے اور اولی الامر کی اطاعت کرتا ہے تو پھر صادقین کا ساتھ چھوٹنے کی پروا نہ کرے، جسے جو پسند ہو۔ مگر وہاں تو نہ اُس میں قید ہے اور نہ اس میں قید ہے۔

اسی طرح یہ حکم کہ عترت کے ساتھ تمسک رکھو، جب تک اولی الامر کے احکام کے خلاف نہ ہو اور جب اولی الامر کے احکام کے خلاف ہونے لگے تو عترت کا ساتھ چھوڑ دو، چاہے گمراہ ہو جائے کیونکہ گمراہ ہونا تو پھر یقینی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب تک تمسک رکھو گے، گمراہ نہیں ہوگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمسک چھوڑا اور گمراہ ہوئے۔ مگر اولی الامر کی خاطر گمراہ ہونا پسند کرلیں۔ تو یہاں قید ہوتی، شرط ہوتی یا وہاں قید ہوتی کہ میرے اہل بیت کی کشتی میں سوار ہو، جب تک اولی الامر کے احکام کے خلاف نہ ہو اور جب اولی الامر کے احکام کے خلاف ہونے لگے تو کشتی سے اُتر جاؤ، چاہے ڈوب جاؤ کیونکہ ڈوبنا پھر یقینی ہے۔ مگر اولی الامر کی خاطر اگر ڈوب جائیں تو کیا بُرا ہے۔ لہٰذا ڈوب جاؤ۔ مگر نہ وہاں شرط نہ قید، نہ یہاں شرط نہ قید۔ چاروں حکم بلا قید۔ وہ آیت کہتی ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو۔ وہ آیت کہتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو۔ یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ عترت سے تمسک رکھو اور یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ اہل بیت کی کشتی پر سوار ہو۔

قرآن کی آیتوں میں تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ متفق علیہ لیکن حدیثوں کیلئے میں ضمانت دیتا ہوں کہ متفق علیہ یعنی ایک ہی فرقے کے علماء کی بیان کی ہوئی نہیں ہیں بلکہ فریقین کے علماء کی درج کردہ ہیں۔ تو اب یہ متفق علیہ حدیثیں اور بلا قید۔ یہ آیتیں اور حدیثیں ٹکراؤ سے بچ نہیں سکتیں۔ جب تک کہ یہ نہ مانئے کہ جو صادقین ہیں، وہی اولی الامر ہیں، وہی عترت ہیں، وہی اہل بیت ہیں۔

کہئے کہ الفاظ بدل بدل کر کیوں کہا جارہا ہے؟ میں اس کی مثال دوں کہ کسی وقت میں کہوں کہ سمیع و بصیر کی عبادت کرو، کسی وقت کہوں کہ رحمٰن و رحیم کی عبادت کرو، کسی وقت کہوں کہ خالق سماوات وارضین کی عبادت کرو، کسی وقت کہوں کہ رب العالمین کی عبادت کرو۔ تو کے میں نے شرک کی دعوت دی؟ کوئی نہیں کہے گا کہ یہ شرک ہوا۔ وہ ایک ہی ذات ہے جس کو اس کے کمالات اور کارناموں کے

مختلف رُخوں کے لحاظ سے مختلف الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ مختلف اسمائے حسنیٰ سے۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ بہت وسیع مفہوم کو سمیٹ کر دو چار الفاظ میں آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ایک ہی جماعت ہے جس کو اس کی صفات ذات کے لحاظ سے دیکھا گیا تو صادقین کہا۔ اللہ کے دیئے ہوئے منصب کے لحاظ سے دیکھا تو اولی الامر کہا، پیغمبر کے رشتے سے دیکھا تو ذریت وعترت کہا۔ اصل چیز وہی ہے کہ "كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ"۔ یعنی وہ ذاتیں کیسی ہیں، ان کو صادقین بتا رہا ہے۔ یہی کمالِ ذات جو معیار ہے صادقین کا، یہی سبب ہے اولی الامر ہونے کا اور اسی بناء پر ذریت اور اہل بیت کہہ کر سندیں دی گئی ہیں۔ یعنی ذریت ہونے کی وجہ سے انہیں یہ عہدے نہیں ملے، صادقین ہونے کی وجہ سے ملے ہیں۔

یہ آیتیں سب کے پیش نظر ہیں۔ سچوں کے ساتھ رہو، صاحبانِ ایمان سے کہا جا رہا ہے۔ تو اب کیا کیا جائے، الفاظ قرآن بدلے نہیں جا سکتے تو کہہ دیا کہ صادقین کے ساتھ رہو۔ تو کیا اجماع کے ساتھ رہو؟ میں صاحب عقل کو دعوت دیتا ہوں، ہر ذی فہم غور کرے کہ اہل ایمان سب ہیں جن سے الگ الگ کہا جا رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ غیر اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے۔ اہل ایمان ہی کو پکارا کر کہا گیا ہے کہ تم سچوں کے ساتھ رہو اور جن کے ساتھ رہو، وہ صادقین ہیں۔ تو کیا صادقین غیر اہل ایمان ہیں؟ اہل ایمان کا ہی مجموعہ ہے صادقین۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فرداً فرداً اہل ایمان تو مخاطب ہیں، ان میں سے ہر ایک بیچارہ غیر صادق ہے لیکن جو مجموعہ ان کا ہے جس کا نام ہے اجماع، وہ وہ ہے جس کو کہا گیا ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو۔ تو ہر صاحب فہم غور کرے کہ غیر صادق افراد کا مجموعہ۔ غیر صادق کے معنی ہیں صادق کی نفی۔ نفی کو ظاہر کرنے والی چیز ہے زیرو۔ تو جتنے افراد ہیں، ان میں سچائی کے لحاظ سے زیرو رکھا گیا ہے۔ اب ہر بچہ غور کرے کہ دس لاکھ زیرو بھی جمع ہوں تو کیا کوئی عدد بنے گا؟ اب فرض کیجئے کہ میں اس ریاضی کے مسئلہ کو بھول جاؤں۔ چاہے زیرو بہت سے ہوں، ان کے اجتماع سے کوئی عدد نہیں بنے گا۔ اچھا! بن جائے گا ایک عدد خواہ مخواہ۔ جب طے کرنا ہے، حدیثوں سے بن جائے گا۔

لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ۔

"میری اُمت ضلالت پر اکٹھی نہیں ہو سکتی"۔

الگ الگ تو گمراہ ہو سکتے ہیں مگر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ دوسرا پہلو ہے کہ یہ بھی سوچنے کی بات نہیں ہے۔ اس کا جواب بہت صاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب سب غیر صادق ہیں، ان سب کا مجموعہ بقول آپ کے صادق ہے۔ تو وہ سب کا مجموعہ ایک عدد صادق ہوا یا صادقین ہوئے؟ افراد صادقین ہوتے تب وہ صادقین ہو سکتے تھے۔ صادقین کے ساتھ رہو۔ معلوم ہوا کہ کسی مکسچر کو نہیں کہہ رہا ہے، وہ ہر ہر جز وکیلئے حکم دے رہا ہے۔ اب زورِ علم صرف ہوا یہاں تو انجام ظاہر ہو گیا۔ زورِ علم صرف ہوا۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔

"اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہیں"۔

یہ بڑے مطلب کی بات "منکم" تم میں سے ہیں۔ تم میں سے ہیں یعنی ہمارے بھائی بند ہیں۔ ٹھیک ہے، تم میں سے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ رسول کو بھی تو کہا گیا ہے "منھم"۔

بَعَثَ فِی الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ۔

اُمیین میں سے رسول بھیجا، انہی میں سے۔ وہی انہی میں سے۔ یہاں تم ہی میں سے۔ بس دونوں کا کم فرق ہے ورنہ "منّ" تو دونوں میں ہے۔ تو رسول انہی میں سے تھا مگر ان کا منتخب کیا ہوا نہیں تھا۔ اسی طرح میں بھی کہتا ہوں اولی الامر تم ہی میں سے ہیں مگر تمہارے چنے ہوئے نہیں ہیں۔

اب باری آئی "انی تارك فیكم الثقلین"، اس میں ان الفاظ کے ہوتے ہوئے کام نہیں چل رہا تھا، لہٰذا ڈھونڈ ڈھونڈ کر لفظ کو بدلا گیا۔

اِنِّی تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي۔

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک کتاب اللہ اور ایک میری سنت"۔

مجھے خیر سنت کے مضمون سے اختلاف تو نہیں ہے مگر جو روایتی حیثیت ہے، اُسے عرض کردوں کہ جتنے طرق ہیں اس کے، ان سب میں "عِتْرَتِی" ہے۔ صرف ایک راوی ہے، ایک طریقہ ہے جس میں "سُنَّتِی" درج ہے اور باقی جتنے ہیں، ان سب نے "عِتْرَتِی" لکھا ہے۔ بہت سے طرق ہیں اس کے، ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں، جو رد شیعہ میں لکھی گئی ہے، اس میں ان طرق کو اکھٹا کیا ہے اور مختلف مواقع پر، جن پر حضرت نے ارشاد فرمایا ہے، وہ مواقع درج کئے ہیں۔ اچھا! اگر کسی حدیث کا راوی صرف ایک ہو تو اُسے احاد کہا جاتا ہے۔ شہرت و تواتر اس کو مانا جاتا ہے جو کئی راویوں نے بیان کیا ہو اور ایک راوی نے کوئی لفظ کہا ہے تو اس کو شاذ مانا جاتا ہے، یہ اُس کے مقابلہ میں معتبر نہیں ہوتا۔

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اچھا صاحب! آپ کی خاطر میں کہتا ہوں "كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي"۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ تو یہ تو پھر بھی بات رہی کہ کتاب کافی نہیں ہوئی۔ کتاب اگر کافی ہوتی تو اس کے بعد "سُنَّتِي" کیوں آتا؟ "سُنَّتِي" کی ضرورت کیوں ہوتی؟ لہٰذا کتاب کافی تو پھر بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ذرا ہیر پھیر کر منزل کی طرف آنا پڑا کہ اگر "سُنَّتِي" ہے تو "سُنَّتِي" میں وہ اور سب حدیثیں بھی ہیں جو عترت اور اہل بیت کے بارے میں ہیں۔

ارے بھئی! "سُنَّتِي" ہے تو کیا اس میں "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" نہیں ہے؟ آپ نے ہماری ذرا سی مسافت بڑھا دی، نتیجہ تو پھر بھی وہی رہے گا۔

جناب! چوتھی چیز یعنی دوسری حدیث کہ میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے، جو اس پر سوار ہوا، اُس نے نجات پائی اور تخلف کا ترجمہ ہی نہیں ہوا۔ جس نے تخلف کیا۔ یہ تخلف کیا ترجمہ ہوا؟ یہ تو عربی ہی رہی۔ اس میں تھا "مَنْ تَخَلَّفَ"۔ آپ نے یہ کہہ دیا جس نے تخلف کیا۔ آپ نے یہ ترجمہ کر کے کونسا تیر مارا۔ یہ میری اُردو زبان کی کوتاہی ہے کہ میں ایک مفرد لفظ میں اس کا ترجمہ

نہیں کرسکتا۔"جو تخلف کرے"۔اس کے معنی میں لفظوں میں نہیں بلکہ جملوں میں بتا سکتا ہوں۔"جو تخلف کرے" یعنی یا تو کشتی پر بیٹھے نہیں یا بیٹھنے کے بعد کہیں اُتر جائے۔ کسی منزل پر اُتر جائے یعنی کہا گیا کہ تخلف کرے یعنی جو شروع سے نہ بیٹھے، اس کا بھی وہی انجام ہے کہ ڈوب گیا اور بیٹھا مگر چھٹی منزل پر اُتر گیا، ساتویں منزل پر اُتر گیا، کہیں بھی اُتر گیا تو سمجھئے کہ ڈوب گیا۔

اب تخلف کے معنی ہوئے جس کو میں نے دو جملوں میں کہا کہ جو بیٹھے ہی نہیں یا بیٹھ کر اُتر جائے۔ مگر اب یہ تشریح کردی تو ایک لفظ میں ذرا سے تصرف کے ساتھ کہ مثبت کو منفی بنا کر، ثبوت کو نفی بنا کر، میں ایک جملہ میں بھی ترجمہ کرسکتا ہوں کہ کیا معنی ہوئے: مَن تَخَلَّفَ، جو اس کشتی پر بیٹھا نہیں رہا، اب بیٹھا نہیں رہا۔ یا تو شروع ہی سے نہیں بیٹھا یا بیٹھا مگر بیچ میں اُتر گیا۔ یہ مطلب ہے کہ بیٹھا نہیں رہا، وہ ڈوبا اور گیا۔ یہ تو تشریح تھی۔ یہاں پر زورِ علم کیا صرف ہوا؟ زورِ علم یہ صرف ہوا کہ الفاظ بھی سب صحیح اور اس کا مطلب بھی یہی ہے لیکن یہ کہا ہے کہ میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے۔ بے شک کشتیِ نوح کی سی ہے۔ جو اس میں بیٹھا، اس نے نجات پائی لیکن کشتی ستاروں کے سہارے سے چلتی ہے۔ ایک معزز جماعت کو پیغمبر نے فرمایا ہے کہ ان کی مثال ستاروں کی سی ہے۔

لہٰذا بس کشتی ذریعہ ہدایت ہے۔ لیکن ستارے اس کے ساتھ ضروری ہیں۔ حدیث میں مانے لیتا ہوں، اس پر بحث نہیں کرتا ہے حالانکہ متفق علیہ نہیں ہے، ایک طبقہ میں ہے یہ حدیث، لیکن میں یہاں اس پر بحث نہیں کروں گا۔ کہا جاتا ہے کہ کشتی ستاروں کے سہارے سے چلتی ہے، لہٰذا یہ کشتی ہے، وہ ستارے ہیں۔ تو ستاروں کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میرا کلام ہوتا تو ٹھیک ہے مگر پیغمبرِ خدا نے یہ نہیں کہ کہ میرے اہل بیت کی مثال کشتی کی سی ہے، انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ میرے اہل بیت کی مثال کشتیِ نوح کی سی ہے۔ اب کشتیِ نوح کو یہ دیکھنا ہے کہ ستاروں کے سہارے چلی تھی یا نہیں؟

پہلے تو بالکل کھلا ہوا پہلو یہ ہے کہ یہ دیکھنا ہے کہ کشتیِ نوح دن کو چلی تھی یا رات کو۔ اگر رات کو چلی ہو تو ستاروں کا سوال ہے۔ اگر دن کو چلی ہو تو دن کو تارے کس کو نظر آئیں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ دن اور رات سے قطع نظر کیجئے۔ مگر کشتیِ نوح جب چلی ہے تو قرآن سے پوچھئے کہ آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گھٹا چھائی ہوتی تھی، ستارے تو خود غائب تھے۔ ستاروں کے سہارے کیونکر چلتی؟ پھر آیئے قرآن سے پوچھیں کہ کشتیِ نوح کس کے سہارے چلی تھی؟ قرآن نے کشتی بنانے کا ذکر بھی کیا ہے، کشتی کے چلنے کا ذکر بھی کیا ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔

"اے نوح! کشتی بناؤ ہماری نگاہوں کے اشارے پر اور ہماری وحی کے مطابق"۔

معلوم ہوا کہ جو کشتیِ نجات ہو، اسے پیغمبر اپنی رائے سے بھی نہیں بناتا۔ یہ تو کشتی کے بنانے کا حال ہو گیا اور کشتی کے چلنے کا حال بھی قرآن میں موجود ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے:

تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا۔

"وہ کشتی ہماری نگاہوں کے اشارے سے چلتی تھی"۔

تو اب جنہیں کشتی نوح کہا ہے، ایسی ہی ان کی کیفیت ہوگی۔ اب یہ کشتی دنیا کے علم میں بنائی جائے گی تو کہا جائے گا:

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔

وہ کشتی وہ تھی کہ "تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا" ہماری نگاہوں کے اشارے سے چلتی تھی۔ اب جنہیں کشتی نوح کہا جائے گا انہیں وہی کہے گا:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔

"تم تو چاہتے ہی نہیں ہو سوائے اس کے جسے اللہ چاہے"۔

جناب! لذیذ غذا کے ساتھ تلخ دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے، بقائے زندگی کیلئے۔ ہم سنا کرتے ہیں یہ سب چیزیں "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"، سچوں کے ساتھ رہو۔ پورا زور بیان ہمارا صرف ہو گیا اور آپ کا ذوق سماعت کہ سچے کون ہیں؟ مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ ہم سے کیا کہا گیا ہے۔ اسی طرح اولی الامر پر زور بیان صرف ہو گیا کہ اولی الامر کون ہے؟ لیکن یہ بھی دیکھئے کہ اولی الامر ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ ہیں۔ اب ہم سے کہا گیا ہے کہ عترت سے تمسک ضروری ہے، گمراہی سے بچانے والا ہے۔ تو ہم پر کیا ذمہ داری ہے؟ اور کشتی اہل بیت پر سوار ہونا چاہئے۔ اہل بیت یہ ہیں اور یہ ستاروں کے محتاج نہیں ہیں۔

یہ سب تو ٹھیک ہو گیا لیکن اب ہم سے کہا گیا ہے، جناب! اس پہلو سے ہم کتراتے ہیں، اس کو سوچنے کیلئے تیار ہی نہیں اور ہمارا خطیب، ہمارا مقرر بھی اس جزو سے نکل جاتا ہے کہ یہ بیان کروں گا تو نعرے موقوف ہو جائیں گے۔ پھر لوگ مراقبے میں چلے جائیں گے۔ میرے نزدیک یہ جزو نہ ہو تو بیان لاحاصل اور اصل میں اس آیت کا پیغام وہی ہے۔ یہ سچے ہیں مگر قرآن کیا کہہ رہا ہے "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ"، سچوں کے ساتھ رہو۔ اب ہر آدمی غور کرے کہ کیا جھوٹے ہو کر سچوں کے ساتھ ہوں گے؟ مانا کہ ہم اس معیار کے سچے نہ سہی، یہ اس میں بھی سوال ہوتا ہے کہ رسول کی زبانی یہ پیغام پہنچوایا گیا کہ میرے نقش قدم پر چلو تو ہم سوچتے ہیں کہ ہم ان کے نقش قدم پر کہاں چل سکتے ہیں۔ بھلا کہہ کر چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے بس چند جملے کافی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے! اگر رفتار ست ہو مگر سمت سفر صحیح ہو تو کبھی نہ کبھی منزل تک پہنچنے کی اُمید ہے۔ لیکن اگر سمت سفر غلط ہو گئی تو جتنا چلیں گے، اُتنا ہی منزل سے دور ہو جائیں گے۔ منزل سے قریب نہیں ہو سکتے۔ مانا کہ ہم ویسے سچے نہ سہی لیکن جھوٹ کو کارنامہ تو نہ سمجھیں۔ محفلوں میں بیٹھ کر فخریہ تو نہ کہیں کہ دیکھو فلاں کو کیسا چکمہ دیا اور اسے کیسی چوٹ دی۔ جب چوٹ دینے پر فخر کر رہے ہیں، چکمہ دینے پر ناز کر رہے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ان کے ساتھ ہیں جو ایسے سیاست دان تھے۔ ان کے ساتھ نہیں ہیں جو واقعی سچے تھے۔ اس کے بعد "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا" پورا بیان ہو گیا کہ اولی الامر یہ ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ نہ جانتے کہ اولی الامر کون ہیں تو شاید یہ کہہ کر چھوٹ بھی جاتے کہ ہمیں پتہ نہیں تھا۔ لیکن جتنا زیادہ سنتے رہے کہ اولی الامر کون ہیں یعنی خوب پہچان لیا کہ اولی الامر یہ ہیں اور پھر ہم سے کہا گیا تھا کہ اطاعت کرو۔ اطاعت میں رہ گئے صفر، تو

بتایئے کہ وہ جاننا ہمارے خلاف حجت بن گیا کہ تم جانتے تھے کہ یہ اولی الامر ہیں، پھر بھی تم نے اطاعت نہ کی اور وہاں کہا گیا تھا:

مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ۔

"جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے، گمراہ نہیں ہو گے"۔

میں کہتا ہوں کہ برابر کی دو چیزیں تھیں، قرآن اور اہل بیت۔ دونوں سے جب تمسک رکھو گے تو وہاں سوچ لیجئے، وہاں آزادی کے ساتھ فیصلہ کیجئے گا۔ میں کہتا ہوں قرآن حفظ کر لیا تو کیا تمسک ہو گیا؟ آپ کہیں گے کہ نہیں تمسک نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی کہتا رہے قرآن میری کتاب ہے۔ میں قرآن کو مانتا ہوں، تو یہ کہنے سے کیا تمسک ہو گیا؟ آپ کہیں گے کہ نہیں ہوا۔ قرآن دن رات روزانہ پابندی سے کوئی تلاوت کرتا ہے تو کیا تمسک ہو گیا؟ آپ کہیں گے کہ قرآن پر عمل بھی تو کرے۔

تو جناب! میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو۔ یہ تو نہیں ہونا چاہئے، اصول تو اصول ہے۔ جو غیر کے بارے میں فیصلہ سنایئے، وہی اپنے بارے میں سنئے۔ اگر قرآن کو کہنا کہ میری کتاب ہے، تمسک نہیں ہے تو ان کو کہنا کہ یہ ہمارے امام ہیں، یہ تمسک کب ہے؟ اگر قرآن کا حفظ کر لینا تمسک نہیں ہے تو اماموں کے ناموں کا یاد کرنا تمسک کب ہے؟ اگر صرف اس کی تلاوت کرنا تمسک نہیں ہے تو پھر ان کے فضائل کو سننا یا بیان کرنا، یہ کیسے تمسک ہو گیا؟ وہاں تو سب کو کہہ دیا کہ یہ نہیں تمسک، یہ نہیں تمسک، عمل کرنا چاہئے اور یہاں اصول بدل گیا۔ یہاں بھی کہئے کہ اس وقت تک تمسک نہیں ہے، جب تک ہم قرآن کی تعلیمات پر عمل نہ کریں۔

اب چوتھی منزل بیان کی کہ حدیث سفینہ۔ کہا گیا ہے کہ جو اس کشتی پر سوار ہوا؟ تو کیا یہاں اس قسم کی کشتی ہے اور اس قسم کا سوار ہوتا ہے؟ غور کیجئے یہ یہ استعارہ ہے۔ استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہے۔ جس سے تشبیہ دیں وہ مشبہ بہ کہلاتا ہے اور جسے اس کے مثل قرار دیں، وہ مشبہ کہلاتا ہے۔ وہ بات جو دونوں میں پائی جاتی ہو، وہ وجہ شبہ کہلاتی ہے۔ یہاں کوئی چیز ہے جسے کشتی پر بیٹھنا کہا گیا یعنی کشتی پر بیٹھنا مشبہ بہ ہے اور ہمارا کوئی عمل شبہ ہے اور کوئی چیز مشترک ہے دونوں میں، اس کی وجہ سے اسے کشتی پر بیٹھنا کہا گیا ہے۔ حضور! کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے؟ اس کا پتہ لگایئے کہ وہ چیز کیا ہے؟ کیونکہ وہی مشترک ہو گی دونوں میں۔ کہئے ہماری سمجھ میں جواب نہیں آتا۔ کشتی پر گئے اور بیٹھ گئے۔ میں کہوں گا کہ وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ بیٹھ گئے لیکن بیٹھنے سے بات کیا پیدا ہوئی؟

میں تجزیہ کرتا ہوں۔ ہم ساحل پر ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ ساحل ہی سے کھڑے کھڑے کہنے لگے کہ کتنی اچھی کشتی ہے! کتنی عمدہ کشتی ہے! کتنی حسین کشتی ہے، کتنی جمیل کشتی ہے! اگر واقعی حسین ہے تو یہ آپ کی تعریف اس لئے صحیح ہے کہ آپ اچھے کو اچھا کہہ رہے ہیں۔ اچھا نہ کہتے تو ظلم ہوتا۔ اس ظلم سے بحمد للہ بری ہیں۔ اچھے کو اچھا کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ تعریفیں کرنا کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ ساحل پر کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں۔ ہمیں اس سے بہت محبت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت نہ ہوتی تو آپ کی تعریف صحیح نہ ہوتی۔ محبت ہونا اس کا تقاضائے حسن ہے، آپ کا کمال نہیں ہے۔ اگر کشتی حسین ہے تو آپ کو محبت ہونی چاہئے۔ یہ محبت بھی بالکل صحیح ہے لیکن ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی سے محبت رکھنا بھی کشتی میں بیٹھنا تو نہیں ہے۔

تیسری نازک تر منزل آئی۔ وہ جز و تو محفوظ ہے کہ ہم ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ اب وہ کشتی باد مخالف کے

تھپیڑوں میں پڑی، وہیں ساحل پر کھڑے کھڑے ہم آنسو بہانے لگے کہ افسوس! ایسی حسین کشتی تباہ ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ آنسو قابلِ قدر ہیں، اس لئے کہ دردِ دل کی دلیل ہیں۔ یہ مقتضائے انسانیت ہیں۔ مگر ساحل پر کھڑے کھڑے یہ آنسو بھی کشتی پر بیٹھنا نہیں ہیں۔ وہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے۔ جو میری سمجھ میں آیا ہے، وہ یہ کہ جب جا کر کشتی پر بیٹھ گئے تو اپنی ذاتی حرکت کچھ نہ رہی اور اپنا

ذاتی سکون بھی کچھ نہ رہا۔ کشتی چلے تو ہم چلے، کشتی رُکی تو ہم رُکے۔ یہ معنی ہیں کشتیِ اہلِ بیت پر بیٹھنے کے کہ اپنے حرکت و سکون کو تابعِ اہلِ بیت بنا دیا۔ اگر اس معنی سے کشتیِ اہلِ بیت پر بیٹھنا ہے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کشتی منزل پر پہنچے اور یہ شخص نہ پہنچے، اگر کہیں اُتر نہیں گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نجات تو ایک عام چیز ہے، نجات تو ایک مبہم چیز ہے۔ اگر کشتی پر بیٹھا رہا تو جہاں کشتی پہنچے گی، وہاں یہ پہنچے گا۔ یہی کہا گیا ہے اپنے خاص ماننے والوں کو:

فِیْ دَرَجَتِنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

"ہمارے شیعہ یومِ قیامت ہمارے درجہ میں ہوں گے"۔

مگر بندہ پرور! پانی پیاس بجھاتا ہے، کاغذ پر لکھا ہوا پانی کا نام نہیں۔ غذا بھوک کو ختم کرتی ہے، غذا کا نام نہیں۔ اسی طرح سے بے شک محبتِ اہلِ بیت نجات کی ضامن ہے مگر محبت ہو بھی تو۔ جن سے ہمیں محبت ہے، وہ اصولِ کافی میں کہہ رہے ہیں:

مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا مُحِبٌّ وَمَنْ عَصَى اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا عَدُوٌّ۔

"جو اللہ کی اطاعت کرے، وہ ہمارا دوست ہے اور جو اللہ کی نافرمانی کرے، وہ ہمارا دشمن ہے"۔

جن سے محبت کا دعویٰ ہمیں ہے، وہ ہم کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

کُوْنُوْا لَنَا زَیْنًا وَلَا تَکُوْنُوْا لَنَا شَیْنًا۔

"دیکھو! ہمارے لئے سببِ آرائش بنو، ہمارے دامن کا داغ نہ بنو"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ذمہ داری ہماری ہے کردار کے لحاظ سے۔ اس کی ایک عام مثال دیتا ہوں کہ سکول کے مختلف درجے ہوتے ہیں اور درجوں میں ترقی کرتا ہوا آدمی بالآخر یونیورسٹی تک پہنچتا ہے۔ چھوٹے درجہ کا طالب علم کوئی غلطی کرے تو بڑے درجہ کے طالب علم کو ہنسنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اس کا معیارِ تعلیم ہی پست ہے۔ لیکن اگر اونچے درجہ کا طالب علم، بڑے اُستاد کا شاگرد اگر کوئی غلطی کرے تو بچے تک کو ہنسنے کا حق ہے۔ اسی طرح آدم کے وقت سے ایک درس گاہِ تعلیماتِ الٰہی قائم ہوئی تھی۔ آدم کے بعد نوح آئے۔ تو جس نے نوح کو نہ مانا یعنی کافر رہا، وہ گویا درسگاہ سے نام کٹوا کر نکل گیا۔ جس نے نوح کو بھی تسلیم کیا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا معیارِ تعلیم اونچا ہوا۔ اب اس پر آدم کی تعلیمات کی بھی ذمہ داری تھی اور نوح کی تعلیمات کی بھی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل

اللہ آئے، جنہوں نے ان کو تسلیم نہیں کیا، ایمان نہیں لائے، اس کے معنی ہیں کہ پھر درس گاہ سے وہ نکل گئے۔ ان پر ان کی تعلیمات کی ذمہ داری نہیں رہی۔ جو حضرت ابراہیم پر ایمان لائے، ان کا نصاب تعلیم اور اونچا ہوا، یہاں تک کہ جب حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفے تشریف لائے تو نصاب تعلیم کیا ہے کہ:

يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ۔

آدم سے لے کر خاتم تک جتنے انبیاء کی تعلیمات ہیں سب کے ورثہ دار یہ ہیں، ان تمام درجوں کو طے کر کے یہاں تک آئے ہیں۔ جب ایمان اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خاتم الانبیاء کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔ افضل المرسلین کے درس میں شامل ہوئے۔

تو اب اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی جتنی قومیں ہیں، جتنے مذاہب ہیں، وہ سب مسلمانوں کے نزدیک ناقص تعلیمات کو لئے ہوئے ہیں اور یہ ہیں جنہوں نے مکمل تعلیم حاصل کی اور افضل المرسلین کے نصاب میں داخل ہوئے ہیں۔ تو ان کو یہود کے کردار کا جائزہ لینے کا حق نہیں ہے، ان کو نصاریٰ پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو بت پرستوں پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔ مگر خود ان کے عمل پر اعتراض کرنے کا دنیا کو حق ہے۔

میں خاتم الانبیاء کے نظام تک پہنچ گیا تو کہتا ہوں کہ جب ایک طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ رسول کے بعد کوئی معصوم نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک تعلیمی کلاسیں ختم ہو گئیں۔ اب درسگاہ کا کوئی درجہ اس کے نزدیک ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اب اس کی ذمہ داری بس یہیں تک رہی لیکن اگر کوئی طبقہ اس کا قائل ہے کہ نظامِ ہدایت قیامت تک ہے اور ان کے بعد بھی ایک سلسلہ ہے معصوم رہنماؤں کا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کیلئے درسگاہ کے ابھی اور درجے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ علی سے کیا حاصل کیا، حسن سے کیا حاصل کیا، حسین سے کیا حاصل کیا؟ اگر کچھ لوگ ہیں جو چھ درجوں کے بعد چلے گئے تو پھر ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی اور جنہوں نے کہا کہ ہم بارہ کو الحمد للہ مانتے ہیں، اب ان پر پورے نظامِ تعلیم کی ذمہ داری ہے کہ اپنے کردار سے ثابت کریں کہ اتنے رہنماؤں سے انہوں نے کیا حاصل کیا!

میرے سامنے ایک روایت ہے، یہ شاہد ہے کہ جب جناب مسلم ہانی کے گھر میں تھے اور ابن زیاد آیا ہے، اس کو فکر تھی کہ جناب مسلم کہاں ہیں؟ اس نے اپنے غلام معقل کو چار ہزار دینار دیئے۔ یہ طبری سے بھی مقدم ایک تاریخ ہمارے ہاتھ میں ہے "الاخبار الطوال"، اس میں یہ واقعہ درج ہے کہ اس نے چار ہزار دینار دے کر کہا کہ جا کر پتہ لگاؤ کہ مسلم کہاں ہیں۔ اس دشمن اہل بیت معقل کا بیان ہے کہ میں مسجد میں آیا، اتفاق سے جناب مسلم ابن عوسجہ اس وقت مصروف نماز تھے تو اس نے ان کے شکل وشمائل کو دیکھا اور بیٹھ کر ان کی نماز کو دیکھا۔

نمازوں کا سلسلہ تھا جو جاری تھا۔ اس معقل کا بیان ہے کہ:

"قُلْتُ فِي نَفْسِي"۔ "میں نے اپنے دل میں کہا"۔

یہ غیر شیعہ کی کتاب میں ہے، جملہ دشمن اہل بیت کا کہ یہ شیعہ لوگ نمازیں بہت پڑھتے ہیں اور رکوع وسجود بہت طولانی کرتے

ہیں۔ لہٰذا ہوں نہ ہوں، یہ اس جماعت کے ہیں۔ اس بناء پر وہ آیا اور پہنچا جناب مسلم تک اسی ذریعہ سے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک وقت میں کثرتِ نماز ہماری پہچان تھی، اس کے بعد نہ جانے کس وقت ہوائے انقلاب ایسی چلی کہ ہم ان صفات سے عاری ہو گئے۔ ہر ایک کو فکر ہوتی ہے کہ جس سے ہمیں محبت ہے، سب سے آخری جملہ اس نے کیا کہا؟ اس کو یاد رکھنا چاہئے اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ اہل بیت ہیں جنہوں نے تعلیماتِ الٰہی کو اور شریعتِ اسلام کو اپنی زندگی کا جزو بنایا تھا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ جب آپ کا وقتِ وفات قریب پہنچا ہے اور اردگرد اصحاب خاص، اولاد اور عزیز تھے تو آخری لفظ جو مولا کی زبان سے نکلا ہے، جس کے بعد قرآنِ ناطق خاموش ہو گیا ہے، وہ یہ تھا کہ تین مرتبہ فرمایا:

"اَلصَّلٰوۃ، اَلصَّلٰوۃ، اَلصَّلٰوۃ"۔

دیکھو! نماز کو نہ بھولنا۔ جس سے محبت کا دعویٰ ہے، وہ آخری وقت تک نماز کو یاد رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم فراموش کر دیں۔ دیکھئے کربلا سے بڑھ کر مصائب اور پریشانیوں کا وقت کیا ہوگا؟ مگر کربلا میں کیا اہتمام کیا گیا کہ روز کے موذن حجاج ابن مسروق اور عاشور کی نمازِ صبح کے وقت مولا فرماتے ہیں: بیٹا علی اکبر! آج تم اذان دو۔ مولا جانتے ہیں کہ میرا علی اکبر بھولنے کی چیز نہیں ہے۔ جب تک دنیا علی اکبر کو یاد رکھے، تب تک اس نماز کو بھی یاد رکھے۔

میں کہتا ہوں کہ مولا نے بھی صبح کی اذان دلوائی ہے کیونکہ جو نمازی بھی ہیں، ان کیلئے سب سے زیادہ دشوار صبح کی نماز ہوتی ہے۔ اکثر پڑھتے بھی ہیں تو قضا کر کے پڑھتے ہیں۔ مولا نے صبح کی نماز کی اذان اس لئے دلوائی کہ کوئی جوان نوجوان علی اکبر کا ماتم کرنے والا، علی اکبر کا نوحہ پڑھنے والا اگر بستر پر یاد کرے کہ میرا شہزادہ کہتا ہے: "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ"، تو شاید علی اکبر کی آواز پر آجائے۔ یہ صبح کی نماز ہے۔ اور خدا کی قسم! کربلا میں نماز بھی جیسی ہوئی ہے، ویسی تاریخ عالم میں کبھی نہیں ہوئی۔ ظہر کی نماز میدانِ جنگ میں، تیر برس رہے ہیں اور گرمی ہے، آگ برس رہی ہے، خون کی بارش ہے۔ اس عالم میں ظہر کی نماز کس وقت آیا۔ اصحاب جو گرد و پیش ہیں، ان کی کوشش یہ ہے کہ مولا خود حکم نہ دینے پائیں کہ ہم اپنے ذوقِ عبادت کا نذرانہ پیش کر دیں۔

ابوثمامہ صائدی، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو ہم ان کا نام بھی نہ جانتے، یہ ویسے ممتاز صحابہ میں نہیں ہیں، ان کا نام صرف اس نماز کی بدولت ہم نے سنا، کہتے ہیں: مولا! دشمن بہت قریب آ گئے ہیں، تمنا ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ باجماعت ہو جائے۔ امام دعائیں دینے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"ذَکَرْتَ الصَّلٰوۃَ جَعَلَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ الذَّاکِرِیْنَ"۔

"تم نے خود سے نماز کو یاد کیا، اللہ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے"۔

عزادارانِ حسین! میں کہتا ہوں کہ اگر مولا کی دعائیں لینی ہیں تو نماز کو نہ بھولئے۔ کیا کہنا اس نماز کا کہ ادھر نماز ہو رہی ہے، اُدھر دو صحابی تیر کھا رہے ہیں۔ سعید ابن عبداللہ اور زہیر ابن قین۔ انہیں کھڑا کیا ہے کہ جو تیر آئے، اپنے اوپر روکو۔ یوں تو کربلا کا پورا جہاد

نماز کی خاطر ہے، عبادت کی خاطر ہے، شریعت کی خاطر ہے مگر یہ وہ قربانیاں ہیں جو بلا شائبہ مجاز، نماز کی خاطر ہوئی ہیں۔ اب جس نماز پر مولا اپنے دو جاں بازوں کو قربان کر دیں، اس نماز کو ہم اپنے عمل سے پامال کریں تو مولا ہمیں اپنا دوست سمجھ سکتے ہیں؟ اپنا صحیح عزادار سمجھ سکتے ہیں؟

ارباب عزا! عصر کی نماز کا وقت ہے۔ میری مجال نہیں ہے کہ میں اس نماز کی خصوصیات عرض کروں کہ کس عالم میں رکوع تھا، کس عالم میں سجود تھا، کس عالم میں قیام تھا؟ مگر سجدہ تو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے والے نے بھی کہہ دیا کہ:

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے

اک ضرب ید اللہ اک سجدۂ شبیری

تو سجدۂ شبیری تو یادگار ہے مگر بڑی تلخ حقیقت ہے، بڑی سخت بات ہے کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں خنجر یاد رہے اور سجدہ یاد نہ رہے۔ ارے خنجر تو شمر کا تھا، سجدہ ہمارے مولا حسین کا تھا۔

بس ایک پہلو کہ یہ سجدہ طولانی کتنا ہوا، ارے ان کی نظر میں تھا کہ میرے نانا نے میری خاطر سجدہ کو طول دیا تھا، تو میں اپنے عمل سے یہ ثابت کروں کہ میں آپ کے دین کی خاطر کب سجدہ کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں دیکھئے! نماز کا ہر عمل کب تک طولانی ہوگا؟ رکوع اس وقت تک طولانی ہوگا جب تک انسان کھڑا نہ ہو۔ اگر کھڑا نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی کہ رکوع باقی ہے۔ یہ قیام کب ختم ہوگا؟ جب سجدہ ہو جائے، اگر سجدہ نہیں ہوا تو قیام ہی قیام ہے۔ سجدہ کا اس وقت اختتام ہوگا جب سجدے سے سر اٹھایا جائے۔ اگر سر نہیں اٹھایا تو سجدہ قائم ہے۔ رسول نے اتنا طولانی سجدہ کیا کہ ستر مرتبہ ذکر سجود کی نوبت آئی۔ حسین نے کہا کہ میں ایسا سجدہ کروں گا کہ سر اٹھاؤں گا ہی نہیں۔ خدا کی قسم! حسین نے سجدہ سے سر نہیں اٹھایا، کوئی اور تھا جس نے سر جدا کر دیا۔

55

ہمارا مقصد حیات کیا ہے

اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کی قسم اٹھائی ہے۔ بے شک سورج اور چاند اپنی جنس میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں مگر کسی خاص خصوصیت کی بناء پر کبھی چھوٹا بھی اعزاز میں بڑوں کے برابر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ اَلنَّجۡمُ اِذَا ھَوٰیۙ۔ مگر جب وہ کسی آستانے کی طرف جھک رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا ہے۔ اگر معلوم نہ ہو کہ وہ آج کونسا دن ہے تو بتایئے قرآن سے کیا سمجھ میں آئے گا؟ میں کہتا ہوں کہ کاش! قرآن کے سمجھنے ہی کی خاطر اس دن کو یاد رکھتے!

دو اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے کہ میں نے ایک بچھو کو دیکھا کہ وہ پتھر پر ڈنک مار رہا ہے۔ میں نے کہا کہ تیرا ڈنک نرم اور پتھر سخت ہے۔ تیرے ڈنک کا اس پر کیا اثر ہوگا؟ اس نے مجھ سے کہا: اس سے کیا مطلب کہ اس پہ اثر ہوگا یا نہیں؟ میں تو یہ ثابت کر رہا ہوں کہ میں بچھو ہوں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کس کیلئے ہے؟ روٹی تو زندگی کیلئے ہے مگر زندگی کس کیلئے ہے؟

مقصدِ حیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۝۱ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝۳

قرآن مجید کا مختصر سورہ ہے۔ اس میں بسم اللہ کے بعد ارشاد ہو رہا ہے: قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دیں۔ عام طور پر ہم جب کسی بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو اس بات کو قسم کھا کر کہتے ہیں۔ مگر یہ کلام اس کا ہے کہ جو اُسے مانتا ہے، وہ سوائے سچائی کے کوئی دوسرا تصور اس کے بارے میں کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اُسے یقین دلانے کیلئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر قرآن مجید میں جابجا کیوں قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں اور آپ غور کیجئے تو یہی ذہن نشین پہلو ہے کہ اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے کہ جو کہنی ہے، قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ یعنی بات روا روی میں کہنے کی نہیں۔

مگر جنابِ والا! ایک مجبوری ہے اور مجبوری کبھی نقص کے سبب سے ہوتی ہے، کبھی کمال کے سبب سے ہوتی ہے۔ مثلاً خالق مجسم ہو کر کبھی سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ مجبوری کسی نقص کی بناء پر نہیں ہے بلکہ کمال کی بناء پر ہے۔ ویسے ہی یہ جو میں نے کہا کہ مجبوری ہے تو ایسی ہی مجبوری ہے، وہ مجبوری یہ ہے کہ عموماً جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے، وہ قسم کھانے سے کچھ اونچا درجہ رکھتی ہے۔ جیسے آپ معصومین کی قسم کھاتے ہیں۔ حضرت ابوالفضل العباس کی قسم کھاتے ہیں اور جو قسم شرعی ہے یعنی احکامی قسم۔ کفارہ وغیرہ جس پر جاری ہے، وہ اللہ کی قسم ہے۔ تو جو چیز اپنی نظر میں اپنے سے بالاتر ہوتی ہے، اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔

مگر یہاں متکلم وہ ہے جس سے بالاتر کوئی ہے ہی نہیں۔ تو وہ ایسے کو تو نہیں لا سکتا جو اس سے بالاتر ہو۔ وہی تو میں مجبوری کہی تھی۔ اس سے بالاتر عالم تصور میں کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ تو اب یہ جز و محفوظ نہیں رہ سکتا مگر جس چیز کی قسم کھائی جائے، وہ اپنی جنس میں امتیازی چیز ہونی چاہئے۔ یعنی جس طرح اُس بات کی اہمیت ثابت ہوتی ہے قسم کھانے سے، اسی طرح جس کی قسم کھائے، اس کی بھی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اب ان قسموں سے ایک اور تصور ختم ہوتا ہے۔ وہ ایک مکتبِ خیال کا تصور ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا بھی شرک ہے۔ جہاں بہت سی باتوں پر شرک کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، اسی طرح یہ بھی ہے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی قسم کھانا، یہ شرک ہے۔ لیکن اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانا اگر شرک ہو تو پھر اللہ کے کلام میں تو اللہ کے سوا کسی کی قسم نہیں ہونی چاہئے تھی۔ جو چیز ہمارے لئے شرک ہو، اللہ خود اس کو کیسے گوارہ کر سکتا ہے؟ تو قسمیں جو کھائی جاتی ہیں، وہ کبھی اس شے کی عظمت کے اظہار کیلئے اور کبھی بنظر محبوبیت بھی کھائی جاتی ہیں۔ جیسے تمہارے سر کی

قسم، یہ قسم آپ کی زبان پر جاری ہے یا نہیں؟ آپ کے سر کی قسم۔ تو مجھے قرآن مجید میں اس کی بھی نظیر ملتی ہے۔ خالق نے رسول سے خطاب کر کے کہا ہے، سورۂ حجر میں، چودھواں پارہ "لعمرک": "قسم آپ کی جان کی، یہ گمراہ لوگ اپنی گمراہی کے ایک عجیب نشے میں مبتلا ہیں"۔ یہ خالق نے قسم کیوں کھائی ہے؟ خود رسول سے خطاب کر کے بالکل محبت کا انداز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محب حبیب سے بات کر رہا ہے۔

تو اب اگر خالق ایسے کی قسم کھاتا ہے جو اُسے محبوب ہے تو ہم بھی ان کی قسم کھا سکتے ہیں جو ہمیں اس کے حکم سے محبوب ہیں۔ تو اب ایک قسم تو بنظرِ محبت قسم کی ہے جو "لعمرک" میں ہے، رسول سے خطاب۔ اس کے علاوہ وہی، جو شے اپنی جنس میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہو، مخلوقاتِ الٰہیہ میں آفتاب و ماہتاب کو قسم کھانے کیلئے منتخب کیا گیا۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔

بے شک سورج اور چاند اپنی جنس میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں مگر کبھی چھوٹا بھی اعزاز میں بڑوں کے برابر ہو جاتا ہے، کسی خاص خصوصیت کی بناء پر۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔

مگر کب؟ جب وہ کسی آستانے کی طرف جھک رہا تھا۔

تو جس طرح بہت سی چیزوں کو یہ شرف دیا گیا کہ ان کی قسم کھائی جائے، اسی طرح ظرفِ مکان کو اس شرف سے محروم نہیں کیا گیا۔ مگر ہر مکان نہیں۔ مکانِ خاص:

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ۔

"قسم ہے اس شہر کی جو محلِ امن و امان ہو"۔

یعنی امن اُسے اتنا پسند ہے کہ جو محلِ امن ہو، اس کی قسم کھاتا ہے۔ مگر دوسری جگہ بتا دیا کہ یہ مکان کو شرف بہ اعتبارِ مکین ملا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔

اس شہر کی یونہی قسم نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں۔

اب جس طرح ظرفِ مکان کو یہ عزت عطا ہوئی، اسی طرح ظرفِ زمان کو بھی اس شرف سے محروم نہیں رکھا گیا۔ مگر جیسے مکان ہر مکان نہیں بلکہ وہ مکان جو اس کے حبیبِ خاص سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عصر جس کے معنی زمانے کے بھی ہیں اور دن کے ایک خاص حصہ کا بھی نام عصر ہے۔ اب قرآن میں تو لفظ عصر ہے۔ اپنی طرف سے کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ ہے یا یہ ہے۔ بہر حال عصر جو بھی ہے، لیکن ہر عصر نہیں بلکہ عصرِ خاص۔ اسی لئے ترجمہ میں میں نے یہی کہا کہ قسم ہے عصرِ خاص کی۔ کوئی کہے یہ خاص کے معنی کس لفظ سے پیدا

ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ عصر پر جو یہ الف لام داخل ہے، عصر کوئی سا زمانہ اور العصر، عصرِ خاص۔ کوئی کہے اس کی نظیر؟ تو نظیر آپ کی جانی پہچانی ہوئی ہے۔ یوم، کوئی سا دن اور الیوم، کیا الیوم کیلئے یاد دلانے کی ضرورت ہے؟

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

تو یہ کیا ترجمہ ہوتا ہے کہ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا ہے۔

اب ہر مکتبِ خیال کا انسان غور کرے کہ کتنا ہی حفظ کر لیجئے ان الفاظ کو، آج "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ"۔ اس لفظ کو حفظ کر لیجئے، ترجمہ بھی حفظ کر لیجئے۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ لیکن اگر تاریخ نہ دیکھئے کہ وہ آج کونسا ہے؟ تو کیا قرآن سے سمجھ میں آئے گا؟ بتائے کوئی قرآن کو کافی سمجھنے والا۔

قرآن کہہ رہا ہے "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ"۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا ہے۔ اگر معلوم نہ ہو کہ وہ آج کونسا دن ہے؟ تو بتائیے قرآن سے کیا سمجھ میں آئے گا؟ میں کہتا ہوں کہ کاش! قرآن کے سمجھنے ہی کی خاطر اس دن کو یاد رکھتے۔ تو بس جیسے یوم کوئی سا دن، اور یہ الف لام اشارہ کیلئے ہوتا ہے۔ کسی فردِ خاص کی طرف۔ اسی سے معنی پیدا ہوئے کہ آج کا دن۔ اسی طرح عصر کوئی سا عصر اور جب کہا "وَالْعَصْرِ" تو وہ عصرِ خاص ہوا۔ تو اب یہ عصرِ خاص وہی ہو سکتا ہے جو اس کے حبیبِ خاص سے خاص تعلق رکھتا ہو۔ خواہ کوئی زمانہ ان سے خاص تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی وقتِ عصر خاص تعلق رکھتا ہو۔

اب میں نے کہا کہ قسم کھائی جاتی ہے، اس بات کی اہمیت ظاہر کرنے کیلئے جو کہی جا رہی ہے، تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ بات کیا ہے۔ وہ ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔

میں نے ترجمہ یہ کیا کہ انسان نقصان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ نقصان کونسا ہے؟ ایک نقص تو وہ ہے، جو ممکنات کی ہر شے میں ہے۔ سوائے اللہ کے باقی ہر چیز کمالِ ذاتی سے محروم ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب وجود اپنا نہیں ہے، تو یہ غیر ہے اور جب وجود ہی غیر ہے تو پھر کونسا کمال اپنا ہوگا؟ وجود کمال کا سرچشمہ ہے۔ جب وجود اللہ کا عطا کردہ ہے تو ہر کمال بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ تو اس بناء پر کائنات کی ہر شے میں یہ نقص ہے یعنی وہ کامل بالذات نہیں ہے۔ تو اگر یہ نقص ہے تو پھر انسان کی کیا خصوصیت ہوئی جو کہا گیا کہ:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔

"یقیناً انسان گھاٹے میں ہے"۔

پھر اگر یہ نقص ہوتا امکانی نقص تو استثنیٰ کی گنجائش نہیں تھی کہ:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

سوا ان کے، وہ ایمان بھی لے آئے، عملِ صالح بھی کئے۔ پھر خدا تو نہیں ہو جائیں گے، رہیں گے تو مخلوق ہی۔ تو اگر وہ نقص

امکانی ہوتا تو اس میں یہ استثنیٰ کیسا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقص امکانی نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟ حقیقت میں قرآن مجید میں تو نقص کا لفظ ہی نہیں ہے۔ ذرا غور فرمایئے، میں ترجمہ میں وہاں نقص کہا اور اب بھی بے جھجک قرآن مجید میں جو لفظ ہے، وہ نہیں کہوں گا کیونکہ وہ لفظ ہمارے ہاں تو ایک رشتہ کا نام ہے۔ "خ س ر"۔ اس کا جو مجموعہ ہوتا ہے، وہ ہمارے ہاں ایک خاص رشتہ کا نام ہے۔ تو اسی لئے جب آیت پڑھتا ہوں تو بھی وقف نہیں کرتا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔

کہہ رہا ہوں تاکہ ہمارے اُردو والے لفظ سے شباہت نہ ہو جائے۔ تو حقیقت میں وہاں نقص نہیں ہے۔ وہاں تو "خ س اور ر" ہے۔ اب اس لفظ کی جو خصوصیات ہوں، ان کو دیکھنا چاہئے۔ تو جب اس لفظ کی خصوصیت پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت میں کاروباری اصطلاح ہے تجارت کی۔ مجمع میں ضرور ماشاء اللہ تجارت کرنے والے افراد بھی ہیں۔ تو ایک حقیقت ہے، ان کو خوش کرنے کیلئے نہیں ہے کہ تجارت کچھ ایسی اللہ کو محبوب ہے کہ اس نے شروع سے آخر تک قرآن میں تجارتی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان کا پیام دیا تو یہ کہا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

کیوں صاحبانِ ایمان! کیا میں تمہیں بتاؤں ایسی تجارت جو تمہیں عذابِ الٰہی سے بچائے، وہ یہ ہے کہ ایمان لاؤ۔ یہ کیا ہے؟ یہ اس لئے ہے یعنی ان سے کہہ رہا ہے کہ تمہیں ایسی تجارت بتاؤں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قوم سے خطاب نہیں ہے جو بیکار رہنے کی عادی ہو بلکہ وہ قوم ہے جو ذوقِ تجارت رکھتی ہو۔ ان سے انہی کی زبان میں بات کی جا رہی ہے۔ تو اب یہ لفظ جو ہے، یہی "خ س اور ر"، جسے میں اُردو میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ لفظ حقیقت میں تجارت کی اصطلاح ہے۔ جب آپ تجارت کرتے ہیں تو شروع میں پیسہ ہوتا ہے جو تجارت میں لگاتے ہیں۔ اس کو عربی میں راس المال کہتے ہیں اور فارسی میں اُسے سرمایہ کہتے ہیں اور ہمارے ہاں اصل پونجی جس سے کہ تجارت شروع کی جاتی ہے۔ اب کچھ دن کے کاروبار کے بعد ایک صورت یہ کہ اس میں اضافہ ہو گیا۔ رقم بڑھ گئی۔ مثلاً ہزار روپے لگائے تھے۔ اب اس کی مالیت دس ہزار ہو گئی۔ اسے عربی میں کہتے ہیں ربح۔ بڑی ح سے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔

سب وہی تجارت کی زبان میں بات ہو رہی ہے۔ ان کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ تو عربی میں اسے ربح کہیں گے۔ فارسی میں اسے سود کہیں گے۔ ہم تو بیاج کو سود کہنے لگے اُردو میں۔ تو بیاج کو سود نہیں کہتے۔ اصل میں وہ تجارت کا نفع ہے جسے سود کہتے ہیں فارسی میں۔ ہم اسے تجارت کا نفع کہتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟ نفع تو دوا کا بھی ہوتا ہے۔ یہ کوئی مفرد لفظ ہوا۔ اس کے معنی ہیں کہ ہمارے پاس کوئی مفرد لفظ نہیں ہے اس معنی کو ادا کرنے کیلئے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب اضافہ ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ دن میں جتنا تھا، اس سے کم ہو گیا یا ختم ہی ہو گیا۔ تو اسے گھاٹا کہیں گے اور فارسی میں زیاں کہیں گے۔ "برتر از اندیشہ سود و زیاں

ہے زندگی۔ سود جب اضافہ ہو، زیاں جب نقصان ہو۔ اس نقصان کو عربی میں کہتے ہیں "خ س اور ر"۔ اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے کہتے ہوئے میں ڈر رہا ہوں۔ ایک ذرا سے فرق میں وہ ہمارا جانا پہچانا لفظ ہو جائے گا۔ یعنی اس کے بیچ میں ایک عدد الف لے آیئے اور آخر میں "ہ" لگا دیجئے تو ہو جائے گا خسارہ۔ اب یہ خسارہ ہم بھی سمجھ لیں گے، حالانکہ وہ "خ س اور ر" اس میں بھی ہے۔ اب راز یہ ہے، خسارہ وہی ہوگا جہاں کوئی چیز ایسی ہو جس میں اضافہ کا بھی امکان ہو، کمی کا بھی امکان ہو۔ وہ بجائے بڑھنے کے گھٹ جائے تو وہ خسارہ ہوگا۔

انسان کے علاوہ کائنات میں اور جتنی چیزیں ہیں، وہ یا اتنی پست ہیں کہ بلند نہیں ہو سکتیں یا اتنی بلند ہیں کہ پست نہیں ہو سکتیں۔ ایک طرف ہیں جمادات، نباتات، حیوانات۔ یہ سب نقص کے کچھ دائروں میں اسیر ہیں کہ اس سے ابھر نہیں سکتے بلکہ یہ نام ان کے اسی نقص کے پہلو کے ہیں یعنی جمادات کسے کہتے ہیں؟ ایک چیز ہے اس میں جسمیت ہے۔ اپنے اجزائے وجود کو سمیٹے رہنا۔ اگر اس کا نام جمادات ہوتا تو پودے بھی جمادات ہوتے کیونکہ ان میں بھی جسمیت ہے۔ پھر حیوان بھی جمادات میں ہے، ان میں بھی جسمیت ہے۔ انسان بھی جمادات ہے، اس میں بھی جسمیت ہے۔ پھر جمادات کون؟ جس میں بس جسمیت ہے اور کچھ نہیں۔ جسمیت ہے اور بس۔ یعنی نشوونما نہیں ہے، احساس اور ارادہ نہیں ہے۔ اس نقص کے پہلو کا نام ہے جمادات۔

اس کے بعد نباتات کون؟ جن میں نشوونما کی قوت ہو۔ جسم بھی ہیں اور نشوونما بھی رکھتے ہیں۔ جسمانی طور پر بڑھنے کی قوت۔ جسے پودے کا پھیلنا کہتے ہیں۔ اب اگر اس کا نام ہوتا نباتات تو حیوان بھی نباتات میں ہوتا، انسان بھی نباتات میں ہوتا لیکن یہ تو الگ بات ہے، دوسری نوع ہے۔ تو ماننا پڑے گا کہ نباتات اس کا نام نہیں ہے کہ نشوونما رکھتا ہو۔ اس کا نام ہے کہ نشوونما رکھتا ہو اور بس۔ بس کے معنی یہ ہیں کہ احساس و حرکت کا جوہر نہیں ہے۔ بس اس نقص کے پہلو کا نام نباتات ہے۔ یہ کمال کے پہلو کا نام نہیں ہے۔

نباتات کسے کہتے ہیں؟ جس میں نشوونما ہو۔ اگر نشوونما ہونے سے نباتات ہوتا ہے تو پھر حیوان بھی نباتات میں ہے اور انسان بھی نباتات میں ہے۔ پھر نباتات الگ کیوں ہیں؟ نباتات اس لئے الگ ہیں کہ نباتات میں بس نشوونما ہے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی احساس و حرکتِ ارادی نہیں ہے۔ اب حیوان، مگر وہ ارسطو والا حیوان نہیں، اس کے نزدیک انسان بھی حیوان ہے۔ میں عام اُردو میں یہ کہوں کہ حیوان جانور کے معنی میں، جاندار کے معنی میں نہیں۔ وہی تو ہے جو انسان سے پست ہے۔ جو انسان سے پست ہے، وہی حیوان۔ اس کا ذکر ہے۔ تو وہ حیوان ایک جوہر رکھتا ہے یعنی حیات۔ احساس و حرکتِ ارادی۔ لیکن احساس و حرکتِ ارادی کا نام حیوان ہوتا تو پھر وہی یعنی انسان بھی حیوان ہوتا۔ مگر حیوان انسان سے پست ہے تو کیا معنی؟ وہ حیوان کون ہے جو انسان سے پست ہے؟ یعنی احساس و حرکتِ ارادہ رکھتا ہے بس۔ بس کے معنی ہیں کہ وہ عقل و شعور خیر و شر نہیں رکھتا۔ اچھائی اور برائی کا احساس نہیں رکھتا۔ تو اس نقص کے پہلو کا نام حیوان ہے۔

تو یہ سب نقص کے دائروں میں گرفتار ہیں کہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکتے۔ تو کوئی سرمایہ ہی نہیں تو خسارہ کیا ہوگا؟ جب بڑھنے کی صلاحیت نہیں تو جتنے ہیں، وہی رہیں گے۔ خسارہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک طرف ہیں جمادات، نباتات، حیوانات۔ دوسری طرف ہیں فرشتے۔ ان کے بلند ہونے میں کوئی شک نہیں۔ جوارِ اقدس کے رہنے والے، عالمِ بالا کے مکین، معصوم،

بے ضرر ہستیاں، بے گناہ ہستیاں۔ تو ان کی بلندی میں کوئی شک نہیں مگر ان کی بلندی خود اختیاری نہیں ہے۔ پیدا کئے گئے ہیں بلند، لہٰذا بلند ہیں۔ ان کی صفاتی بلندی ایسی ہے جیسے جسمانی بلندی ہے آفتاب کی۔ جیسے جسمانی بلندی آفتاب کی کہ پیدا کیا ہی گیا ہے بلند۔ ویسے ہی ان کی بلندی اوصاف والی۔

بے شک بڑی اچھی مخلوق۔ بے گناہ ہے مگر بے گناہ ہے باایں معنی کہ وہ دل نہیں جس میں اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ جذبات نہیں۔ وہ تقاضے نہیں جو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہٰذا معصوم ہیں۔ ان کی عصمت قابل مدح صفت ہے، کارنامہ نہیں ہے، قابل شکریہ۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بڑی اچھی مخلوق ہے، کسی کو ستاتی نہیں، کسی کو آزار نہیں پہنچاتی، ہمہ تن اطاعت پروردگار ہے۔ بڑا کام کرتے ہیں جو گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔ یہ کارنامہ نہیں ہے۔

ماشاء اللہ ذوق ادب رکھنے والے تو یہ آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرے افراد بھی میرے بیان کے پس منظر سے سمجھ ہی لیں گے کہ اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے مگر کتنا ہے، اتنا ہی ہے، اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی مایہ دار ہیں، سرمایہ دار نہیں ہیں۔

تو جب بڑھنے کا امکان نہیں تو پھر خسارہ بھی کیا ہوگا۔ نہ گھٹنے کا تصور، نہ بڑھنے کا امکان۔ جتنا اللہ نے دیا، اُتنا ہی ہے۔ اس سے آگے نہیں ہے۔ اب انسان۔ انسان کی خاصیت ہے کہ یہ طاعت و معصیت کے دوراہے پر پیدا کیا گیا ہے۔ لچکدار مخلوق۔ یہ گھٹتا ہے تو بدبخت حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں کہا گیا:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔

"یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں"۔

میں اگر اس طرح کی بات کہوں، یہ جملہ اس طرح کا کہوں تو سمجھ میں آئے گا کہ میں نے پہلے کہہ دیا مثل چوپایوں کے اور پھر چونک کر کہا بلکہ بدتر۔ مگر یہ کلام اس کا ہے جس کے ہاں سہو و نسیان کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ سہو و نسیان بھی ایک طرح کا نقص ہے، وہ نقص عارضی سہی۔ جو عالم بالذات ہے، اس کے ہاں سہو و نسیان کا سوال نہیں۔ ارے ہم اُس کے اونچے بندوں کو سہو و نسیان سے بری جانتے ہیں تو اللہ کا کیا ذکر!

اس کے ہاں بدل الغلط کا امکان نہیں ہے۔ ماننا پڑے گا کہ حکمتِ کلام متقاضی ہے کہ یوں بات کہی جائے۔ تو اب میری نظر میں اور نظیریں بھی ہیں۔ اب آپ کا بہت دل پسند موضوع۔ مگر ابھی سے کہہ دوں کہ اس موضوع کو پیش نہیں کرنا ہے:

دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔

قریب ہوئے اور قریب ہوئے، یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے بھی کم۔

وہی بات کہ اگر میرا جملہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ابھی صحیح طور پر ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یعنی متکلم کو شک ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ دو کمان یا اس سے کچھ کم۔ ٹھیک ٹھیک ہم نہیں بتا سکتے۔ مگر وہ جو "مِثْقَالَ كُلِّ ذَرَّةٍ" سے واقف، اس کے ہاں (معاذ اللہ) اندازے کی

غلطی کا کیا سوال؟ تو وہی ماننا پڑے گا کہ حکمت کلام متقاضی ہے کہ یوں کہا جائے۔ اب وہ ایک ہی حکمت ہے دونوں میں اور وہ ایک ہی چیز ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ اگر "بل" کے معنوں میں ہے۔ دو کمان بلکہ اس سے کم تر، تو اب "اَوْ"، "بل" کے معنوں میں ہو گیا۔ تو بالکل نظیر اسی کی ہو گئی۔ مثل چوپایوں کے بلکہ اس سے بدتر۔

میں کہتا ہوں کہ وہ پستی کی تعبیر تھی، یہ بلندی کی تعبیر ہے۔ ایک ہی انداز میں ہے۔ وہ مثل چوپایوں کے بلکہ بدتر۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ اتنے قریب کہ دو کمان بلکہ اس سے کم تر۔ تو اب "اَوْ" اور "بل" ایک ہی قبیل کی چیزیں ہو گئیں۔ تو اب جو حکمت کلام ہے، اپنے فہم کے مطابق عرض کروں گا، وہ دونوں جگہ جاری ہو گی۔ کبھی متکلم کا حکیمانہ تصور یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک دم سے حقیقت کہی جائے تو ممکن ہے نذر تغافل ہو جائے۔ لہٰذا حقیقت کو ایک ایک گھونٹ کر کے پلاؤ۔ جرعہ بہ جرعہ، تدریجاً۔ تو اگر شروع میں، اگر ذرا متوجہ نہیں بھی ہے تو رفتار کلام کے آگے بڑھنے کے ساتھ متوجہ ہو جائے گا۔

مگر اب جب کلام اس کا ہے جو اصدق الصادقین ہیں تو جو پہلا جز و کہا، وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہونا چاہیے اور پھر اس پر مزید اضافہ جو ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہونا چاہیے۔ تو اب:

-أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ-

یہ چونکہ اصل موضوع سے متعلق ہے، لہٰذا اسے بعد میں عرض کروں گا۔ پہلے اسی کو جسے بطور نظیر پیش کیا تھا:

-قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ-

چونکہ رفعت کا اظہار الفاظ میں ہو نہیں سکتا، لہٰذا خالق محسوسات کی مدد دے کر ذہن کو اس درجہ تقرب تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لئے لفظوں کے سہارے سے ایک قریب ترین نکتے تک، پیمانے تک، جو دو کمانوں کا ہے۔ اس کو پہنچا دیا گیا۔ اب گویا خالق کہنا چاہتا ہے کہ دیکھو! اتنا ہی نہ سمجھنا یعنی اگر دو کمان کہہ کر خاموش ہو جائے تو رفعت محمدی پر حد قائم ہو جائے۔

تو حضور والا! اب الفاظ کا سہارا دے کر دو کمانوں تک پہنچایا گیا تو اس پر خاموش ہو جائے تو ان کی رفعت پر حد قائم ہو جائے۔ لہٰذا آگے بڑھتا ہے اور متکلم جسم و جسمانیت سے بری ہے۔ مگر یہ کہ جو حقیقت ہے، وہ بغیر جسم و جسمانیت کے لفظوں کے ادا کیونکر ہو کیونکہ الفاظ وہاں کیلئے بنے ہی نہیں ہیں۔ آپ دیکھ لیجئے قرآن میں کہ قاب قوسین کے اوپر کوئی وقف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ "ج" بھی نہیں ہے جس کے معنی ہیں وقف جائز۔ کسی طرح کا وقف نہیں ہے۔ وقف کا معیار یہ ہے کہ جہاں سانس لی جائے، وہاں وقف۔ جہاں سانس نہ لی جائے، آگے بڑھا جائے، وہ ہے غیر وقف۔ تو ہمیں وقف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی وہاں وقف نہیں ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متکلم نے بغیر سانس لئے ہوئے آگے بات بڑھائی ہے۔ اب ہمیں قبل والے جملے سے نتیجہ نکالنے کا حق نہیں ہے۔

-قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ-

جب بات مکمل نہیں ہوئی تو ہمیں رائے قائم کرنے کا کیا حق! اب کہہ دیا کہ "أَوْ أَدْنَىٰ"، یعنی اس سے کم تر۔

ماشاءاللہ صاحبانِ فہم ہیں، صاحبانِ نظر ہیں، میں کہتا ہوں کہ اب کم تر کی حد نہیں بتائی کہ کتنا کم۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جتنا وہم وفہم وتخیل میں گنجائش ہو، اتنا آگے بڑھ جاؤ تو خدا خدا رہے، بندہ بندہ رہے۔

یہ تو روشن پہلو ہے جسے میں نے نظیر میں پیش کیا۔ میرا اصل موضوع وہ ہے کہ انسان گرتا ہے تو:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔

یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ اس سے بدتر ہیں۔

تو جب کہا مثل چوپایوں کے، تو یہ بھی صحیح ہونا چاہئے۔ کسی حیثیت سے انہیں مثل چوپایوں کے ہونا چاہئے۔ جب کہا بدتر تو کسی حیثیت سے انہیں بدتر ہونا چاہئے۔ پھر نتیجہ کے طور پر بدتر ہی ہوں گے۔ تو میں جب غور کرتا ہوں کہ انسان کردار کے اعتبار سے جب گرتا ہے تو عملاً ہوتا ہے مثل چوپایوں کے۔

حضور! چوپائے دو قسم کے ہوتے ہیں، کچھ چرندے، کچھ درندے۔ چرندے کون؟ چرنے والے، گائے بھینس وغیرہ، جنہیں آپ مویشی کہتے ہیں۔ درندے کون؟ شیر، بھیڑیئے جن کا نام سن کر ہَول آئے۔ تو چرندے جو ہیں، ان بیچاروں کا مقصد پیٹ بھرنا ہے۔ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر جائے۔ جو سبزہ زار سامنے آئے، چر جائیں۔ اس سے بحث نہیں کہ مالک راضی ہے یا ناراض ہے۔ غذا جس طرح ملے، کھالیں۔ اس سے بحث نہیں کہ باعزت مل رہی ہے یا باذلت۔

اگر انسان ایسا ہی ہوگیا کہ اسے پیٹ بھرنے کے مقصد میں، شکم پری کی راہ میں حلال وحرام کا امتیاز نہ رہا، جائز و ناجائز کا امتیاز نہ ہو، صحیح وغلط کا امتیاز نہ ہو تو پھر اس میں اور چرندے میں کیا فرق ہوا؟ اب دیکھئے کہ ۹۰ فیصد اور ممکن ہے ۹۵ فیصد اور ممکن ہے ۹۸ فیصد، یہ سب اسی قسم میں داخل ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ مجمع میں ماشاءاللہ تاجر بھی ہوں گے۔ تجارت ایک پیشہ تو ہے ہی۔ حضور! پیشہ ور وہی ہوتے ہیں جو کاسب ہیں، تاجر ہیں۔ تو اس کیلئے ایک مقولہ تراش لیا، نظریہ، کہ یہ تو ہمارا پیشہ ہے یعنی جب یہ کہئے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے، جواب یہ ملے گا کہ ہمیں اس سے کیا مطلب؟ یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ گویا پروانہ صحت مل گیا۔

فرض کیجئے کہ ایک صاحب ہیں جو جھوٹا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ آپ انہیں جانتے ہیں۔ اتفاق سے آپ کو بھی کسی کام سے کچہری جانا پڑ گیا۔ آپ نے ایک ٹیکسی والے کو روکا، آپ نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والا آپ ہی کا محلہ دار ہے اور وہ انہیں کچہری لے جا رہا ہے۔ آپ نے ٹیکسی والے سے علیحدگی میں کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ صاحب جھوٹا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ تو تم انہیں اپنی ٹیکسی میں لئے جاتے ہو؟ وہ فوراً جواب میں کہے گا کہ جناب! مجھے اس سے کیا مطلب کہ سچا مقدمہ لڑنے جا رہے ہیں یا جھوٹا لڑ رہے ہیں، میرا تو پیشہ یہی ہے۔ اب چپکے سے آپ قائل ہو جایئے تو بہتر ہے ورنہ اگر راہگیر جمع ہو گئے تو سب اس ٹیکسی والے کی طرف ہوں گے۔ آپ کی طرف کوئی نہیں ہوگا بلکہ گھر پر جا کر وہ گھر والوں سے یا عزیزوں، دوستوں سے کہیں گے کہ آج ایک سنکی ملا تھا۔

ہمیشہ صاحبانِ عقل کو دیوانہ کہا گیا ہے۔ ایک سنکی ملا تھا، وہ ٹیکسی والے سے جھگڑ رہا تھا کہ تم جھوٹا مقدمہ لڑنے والی سواری کو کیوں کچہری لئے جا رہے ہو؟ سب ہنسیں گے کہ واقعی دیوانہ تھا، واقعی سنکی تھا۔ سب اس کی طرف ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج

انسانیت نے بیعت کرلی ہے حیوانیت کے ہاتھ پر۔ یہ میں نے ٹیکسی والے کی مثال دی، جتنی چاہیں مثالیں لے لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع کرنے کو دل چاہے تو میں چاہے جتنی مثالیں دے دوں۔ بہر حال ایک اور سہی۔

فرض کیجئے کسی کا پریس ہے اور وہاں سے ایک مخرب اخلاق پوسٹر شائع ہوا ہے۔ آپ نے جا کر اس پریس والے سے کہا کہ تم نے ایسا مخرب اخلاق پوسٹر کیوں اپنے ہاں سے شائع کیا ہے؟ وہ کہے گا کہ ہم کوئی دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ سائز کتنا ہے، عبارت کتنی ہے۔ اس کا ناپ جو مقرر ہے، وہ دیکھا، اُجرت بتائی کہ اتنے میں لکھا جائے گا، اتنے میں چھپے گا۔ اس نے وہ سب دینے کا اقرار کیا، ہم نے چھاپ دیا۔ ہمیں اس سے کیا مطلب کہ اس کے اندر کیا ہے؟ یہ مخرب اخلاق ہے یا مصلح اخلاق ہے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟ وہ یہی جواب دے گا اور ایسا ہی جس کا جو پیشہ ہے۔

علی گڑھ میں ایک صوفی صورت آدمی، معلوم ہوا کہ ان کے مرید بھی ہیں۔ ان کی پان کی دوکان ہے۔ ماہِ رمضان میں ایک نوجوان نے آکر ان سے پان مانگا، انہوں نے پان بنا کر اُسے دے دیا۔ چونکہ وہ صورت سے مجھے صوفی صافی نظر آرہے تھے، لہٰذا نوجوان کے جانے کے بعد میں نے کہا کہ ماہِ رمضان میں آپ پان بنا بنا کر نہ دیا کیجئے۔ وہ بڑے چیں بہ جبیں ہوئے۔ فرمانے لگے: صاحب! ہماری دوکان ہے، ہمیں اس سے کیا بحث؟ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم خود روزہ رکھیں لیکن اگر کوئی ہمارے ہاں سے پان خریدنا چاہے اور ہم اُسے پان نہ دیں تو پھر ہماری دوکان تو ختم ہی ہو جائے گی۔

تو یہ سب وہی ہے کہ پیشہ میں جائز و ناجائز کا سوال نہیں۔ اسی کو ایک جماعت نے پورا روٹی کا فلسفہ بنا دیا کہ گویا زمین و آسمان پیٹ بھرنے سے قائم نہیں۔ روٹی ہی سب کچھ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جیتے جی روٹی کی اہمیت سے انکار کیونکر سکتا ہوں، یقیناً روٹی کی اہمیت ہے مگر بس طے یہ کرنا ہے کہ روٹی کی اہمیت کس حد تک ہے۔ ذریعہ حیات کی حد تک یا مقصدِ حیات تک۔ اگر ذریعہ حیات کی حد تک آپ کہتے تو میں بھی آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ زندگی کیلئے روٹی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر زندگی کس چیز کیلئے ہے؟ روٹی تو برائے زندگی مگر زندگی برائے چہ؟

یاد رکھئے کہ ہر ذریعہ سے مقصد اہم ہوتا ہے، لہٰذا اب تین درجے قائم ہوں گے۔ جس طرح ریاضی میں سکھایا جاتا ہے "اب ج"، تو "الف" روٹی اور "ب" اس سے اوپر خود زندگی اور "ج" اس سے اوپر مقصدِ زندگی۔ تو جب زندگی کی خاطر روٹی ہے تو وہ روٹی جو زندگی کو نقصان پہنچائے، کیا وہ حاصل کرنے کے قابل ہے؟ اُردو زبان میں کہوں کہ جسے کھا کر ہیضہ ہو، کیا وہ بھی حاصل کرنے کے قابل ہے؟ یہاں سب عقلائے زمانہ روٹی کے نظام والے بھی، میرے ساتھ مل کر یہی کہیں گے کہ نہیں، اس روٹی کو چھوڑ دیجئے، پھینک دیجئے۔ کسی کو دے دیجئے۔ بہر حال اس روٹی کو استعمال نہ کیجئے۔ تو اب اگر وہ روٹی چھوڑنے کے قابل ہے جو زندگی کو نقصان پہنچائے تو وہ روٹی بھی چھوڑنے کے قابل ہے جو مقصدِ زندگی کو نقصان پہنچائے۔ وہ روٹی جسے کھا کر ہیضہ ہو، وہ اس لئے چھوڑنے کے قابل کہ زندگی کو نقصان پہنچاتی ہے اور وہ روٹی جو یتیم کا گلا کاٹ کر ملے اور وہ روٹی جو فساد کر کے ملے اور وہ روٹی جو خلقِ خدا کو گمراہ کر کے ملے، وہ روٹی جو خونریزی کر کے ملے، وہ اس لئے کھانے کے قابل نہیں کہ مقصدِ زندگی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

اب اگر یہاں تک کوئی روٹی کے نظام والا میرے ساتھ آ گیا تو اس کے معنی ہیں کہ یہیں سے رزق میں حلال وحرام کی تفریق ہوگی۔ یہیں سے دیکھنا پڑے گا کہ کون جائز ہے، کون ناجائز ہے؟ اگر یہ نہیں ہے تو وہی حیوانیت ہے جسے فلسفہ کا لباس پہنا دیا گیا ہے، جس کو ایک بڑا نظریہ بنا کر پیش کر دیا گیا ہے۔

اب دیکھ لیجئے کہ کتنے فیصد ہیں جن کا نصب العین صرف پیٹ بھرنا ہے۔ اب معاف کریں مجھ کو جوان اور نوجوان۔ ماشاءاللہ بہت بڑا انقلاب ہے کہ ایک وقت میں مجلس میں زیادہ تر بوڑھے ہوا کرتے تھے، تو جوان تو منتظر رہتے تھے کہ جب ماتم ہوگا، تب چلیں گے۔ مگر الحمدللہ! مجھے ہر جگہ یہ خوشگوار تبدیلی محسوس ہوئی ہے کہ جوان اور نوجوان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ غور سے سنتے ہیں اور اس سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اب اس وقت انہی کو، کیونکہ بوڑھے اس منزل سے گزر چکے ہیں، سابقہ نوجوان ہی سے ہے، تو جوانوں ہی سے گفتگو ہے۔ اب انہوں نے جس دن سے ڈگری لی ہے، جس دن سے تعلیم میں حدِ کمال تک پہنچے، اس وقت سے اخباروں پر نظر ہے کہ کونسی جگہ کہاں خالی ہے۔ کس جگہ کا اشتہار نکلا ہے۔ اشتہار پڑھا، تنخواہ کی مقدار دیکھی اور ترقی کا سکیل دیکھا کہ اس میں امکانات کہاں تک آگے جانے کے ہیں اور بس درخواست بھیج دی۔ اس سے مطلب نہیں کہ کام کیا کرنا ہے! وہ کام صحیح ہے یا غلط ہے۔ اس نقطہ نظر سے کبھی جانچ کی ہی نہیں جاتی۔ ادھر تصور جاتا ہی نہیں، اس لئے کہ یہ گویا خارج از بحث چیز ہے۔ ہمیں پیٹ بھرنا ہے۔ ہمیں یہ کیا دیکھنا ہے۔ ہمیں تو تنخواہ کی مقدار دیکھنی ہے۔

تو یہ جناب وہی حیوانی فلسفہ ہے۔ تو اگر انسان اسی راستہ پر گامزن ہو گیا تو اس میں اور چرندوں میں کیا فرق رہا؟ یہ تو ہیں چرندے، اس کے بعد ہیں درندے۔ درندے کون ہیں؟ درندے وہ ہیں جن کے افعال بتقاضائے غضب ہوں۔ جو ان کے غصہ کی زد پر آ جائے، شکار ہو جائے، اس سے مطلب نہیں کہ جوان ہے یا بوڑھا ہے یا بچہ ہے۔ اس سے مطلب نہیں کہ گناہگار ہے یا بے گناہ ہے۔ اگر انسان بھی ایسا ہی ہو جائے کہ جب جذبۂ انتقام پیدا ہو تو اس سے مطلب نہیں کہ فریق مخالف کا یہ بچہ ہے یا فریق مخالف کا یہ جوان ہے یا فریق مخالف کا بوڑھا ہے، قصوروار ہے یا بے قصور ہے۔ اس سے مطلب ہی نہ ہے، تو پھر انسان میں اور اس درندے میں کیا فرق ہوا؟

اب یہ دیکھ لیجئے کہ عام نوعِ انسانی تقسیم ہے انہی دو حصوں میں یا نہیں! کچھ چرندے اور کچھ درندے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بیچارے قسم کے جو لوگ ہیں، بقدرِ ہمت، وہ چرندے ہوتے ہیں اور جو اولوالعزم لوگ ہیں، وہ درندے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان گرتا ہے تو مثل چوپایوں کے ہوتا ہے اور نتیجہ کے طور پر چوپایوں سے بدتر ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ چوپائے اگر پستی کردار میں مبتلا تھے تو ان کے پاس وہ شعور نہیں ہے جو حق و باطل کا امتیاز کر سکے جس کا نام عقل ہے۔ وہ تمیز نہیں کہ جائز و ناجائز میں فرق محسوس کر سکے۔ اب انسان عقل رکھتے ہوئے، شعور رکھتے ہوئے، صحیح و غلط کے پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوئے، پھر بھی عملاً حیوان بنتا ہے تو یہ اس سے زیادہ موردِ سزا ہے۔ یعنی یہ حیوان بھی ہے اور مستحقِ ملامت بھی ہے۔ جیسے وہاں میں نے کہا تھا فرشتوں میں کہ ان کی عصمت قابلِ مدح ہے لیکن کارنامہ نہیں ہے قابلِ شکریہ، ویسے ہی یہاں ہے کہ جتنی برائیاں ہیں، وہ برائیاں صفات ہیں قابلِ مذمت۔ لیکن کردار قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اے بکری! تو نے یہ مالِ غیر کیوں کھا لیا؟ ان کو ملامت نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں کھانے کا یہی طریقہ

معلوم ہے۔ کہنے والے نے کہہ دیا۔

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

"بچھو کوڈنک مارنا کوئی عداوت کی وجہ نہیں ہے، یہ تو اس کی طبیعت کا تقاضا ہے"۔

عربی کورس میں ادب کی ایک کتاب تھی، بچوں کو پڑھائی جاتی تھی "سُلّم الادب"۔ اس میں شروع میں کچھ حکایتیں تھیں اور آخر میں کچھ مختصر سے قطعے تھے۔ اشعار نصیحت آمیز تھے۔ ان میں سے دو اشعار کا مضمون یہ ہے کہ میں نے ایک بچھو کو دیکھا کہ وہ پتھر پر ڈنک مار رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تیرا ڈنک ہے نرم اور یہ پتھر سخت ہے۔ تیرے ڈنک کا اس پر کیا اثر ہوگا؟ اس نے کہا: مجھے اس سے کیا مطلب کہ اس پر اثر ہوگا یا نہیں ہوگا۔ میں تو یہ ثابت کر رہا ہوں کہ میں بچھو ہوں۔ تو ان کے افعال بتقاضائے طبیعت ہوتے ہیں۔ لہٰذا مورد مذمت ہیں، مورد ملامت نہیں ہیں۔

لیکن یہ بدبخت انسان جب جرم کی طرف قدم بڑھاتا ہے کہ اندر سے کوئی کہتا ہوتا ہے کہ غلط ہے، ایسا نہ کرو۔ لیکن یہ اس کی آواز کو سنا اَن سنا کر دیتا ہے۔ ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہیں کرتا۔ دوسری دفعہ اُس کی آواز ذرا دھیمی ہو جاتی ہے کیونکہ پہلی مرتبہ اُس کی دل شکنی ہو گئی۔ اگر توجہ کر لی ہوتی تو پھر اور قوت اس میں پیدا ہو جاتی۔ لیکن جب توجہ نہیں کی تو دوسری مرتبہ اس کی آواز کمزور پڑ گئی۔ یہاں تک کہ تیسری منزل وہ آ گئی کہ جب پھر بھی توجہ نہیں کی تو اس نے صدا دینا چھوڑ دی۔ یہ وہ منزل ہے جسے قرآن نے کہا ہے:

"خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ"۔

اصلاح سے یہ نا اُمیدی اپنے ہاتھوں پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔

تو باوجود ضمیر کی طاقت رکھنے کے، باوجود بُرے اور اچھے کے احساس کے پھر بھی یہ عملاً چوپائے رہے تو نتیجہ کے طور پر چوپایوں سے بدتر ہیں۔ اسی لئے دوزخ ان چوپایوں کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، دوزخ انہی انسانوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے جو ان سے بدتر ہیں۔ یہ مورد سزا بھی ہیں، مورد ملامت بھی ہیں۔

یہ تو اس وقت ہے جب انسان گھٹتا ہے۔ جب بڑھتا ہے تو جو انسان بلندی پر ہوتا ہے، وہ عملاً تو فرشتے کا مثل ہوتا ہے، اس لئے کہ فرشتہ بھی بے گناہ، یہ انسان بھی بے گناہ۔ بے گناہ کے معنی ہیں زیرو۔ زیرو میں درجے نہیں ہوتے۔ یہاں بھی نفی گناہ، وہاں بھی نفی گناہ۔ یہ انسان جو ہے اس میں بھی گناہ نہیں۔ تو عملاً تو فرشتوں کی مثل ہوتا ہے مگر نتیجہ کے طور پر فرشتوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس دلیل سے جس دلیل سے گرنے میں مثل چوپایوں کے ہوا تھا اور نتیجہ کے طور پر چوپایوں سے بدتر ہوا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ عقل رکھتے ہوئے چوپایہ رہا۔ ویسے ہی بڑھنے میں اسی دلیل سے فرشتہ نہیں ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فرشتے اگر معصوم ہیں تو کمال کیا ہے؟ یہ جذبات رکھتے ہوئے، بھوک پیاس رکھتے ہوئے، تکلیف کا احساس رکھتے ہوئے، پھر بھی عملاً فرشتہ رہا تو یہ فرشتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی ملک عصمت جو فرشتوں کیلئے عطیہ خسروانہ تھا، وہ اس کا قوت بازو سے فتح کیا ہوا ملک ہے۔ اسی لئے جب یہ عصمت اختیاری کے قدموں سے بلند ہوتا ہے اور اب اس کا کردار اس منزل

پرآجاتا ہے کہ فرشتہ حیران ہوجاتا ہے۔

یادرکھئے! حیرت اسی چیز پر ہوتی ہے جس کی مثال پہلے سامنے نہ آئی ہو۔ عمر ملک دیکھئے یعنی اس کی خلقت ظاہری آدم ابوالبشر سے قبل، مدتوں پہلے۔ جس کی پیدائش ہم اپنے پیمانوں سے کربھی نہیں سکتے کہ کتنا پہلے۔ تو اس کی کتنی عمر ہے اور نوع انسانی کی ابتداء بھی مجھے نہیں معلوم۔ بعض تاریخوں میں آتا رہتا ہے کہ آدم سے اب تک اتنے ہزار برس۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تو عمر انسانی کی مدت بھی نہیں معلوم۔ مگر جتنے کردار ہیں، وہ سب ملک کی نگاہوں کے سامنے آئے ہیں۔ آدم سے لے کر خاتم تک۔ ہر ایک کا کردار اس کی نظروں کے سامنے آیا ہے۔ اب اس کے بعد اگر کبھی اس کو حیرت ہوجائے تو وہ مجموعی حیثیت سے افضل ہستیاں، یقیناً میں مانتا ہوں، عقیدت کے طور پر بالاتر ہستیوں کا ماننا جزودین ہے۔ لیکن یہ کہ کسی شعبہ کردار میں ایسا نمونہ سامنے آیا ہے جس کی مثال اس کو اس وقت تک نظر نہیں آئی تھی۔ آدم سے لے کر تا ایں دم۔ کوئی مثال اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔

اب مجھے معصوم کی زبان کا ایک جملہ یاد آرہا ہے، جو سیدالشہداء کو مخاطب کر کے آپ نے کہا ہے:

"عَجِبَتْ مِنْ صَبْرِكَ مَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبِيْنَ"۔

اے حسین! آپ کے صبر سے ملائکہ مقربین ششدر رہ گئے۔

یعنی ان کے تصور سے بالاتر نمونہ صبر کا ان کے سامنے آیا۔ اب صرف حدیث، جو زیارتیں معصومین نے بتائی ہیں، وہ بھی ایک قسم کی حدیث ہیں۔ تو وہ جملہ تو بس اتنا ہی ہے۔ مگر اب مجھے تلاش ہوئی ہے کہ وہ کربلا کے مرقع کا کونسا موقع ہوگا، وہ کونسا زاویہ ہوگا جہاں فرشتوں کو حیرت ہوئی ہوگی۔ میرے سامنے کردار کربلا کے جو مرقع آرہے ہیں، تو بخدا شاعر نے تو کسی اور مرقع کیلئے کہا تھا مگر میں اسے یہاں استعمال کررہا ہوں کہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است"۔ مرقع کا ہر گوشہ مجھے ایسا ہی نظر آرہا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ فرشتے کو یہیں حیرت ہوگئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس پر بھی حیرت ہوئی ہو۔ پھر حیرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہو۔

56

امر بالمعروف، نہی عن المنکر

یاد رکھئے کہ جو چیز بدلنے والی ہے، اس کا معیار وہ ہونا چاہئے جو برقرار ہو۔ جو برقرار چیز ہے، اس کا معیار بدلتی ہوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

قرآن وہ ثابت حقیقت ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے اور سائنس وہ چیز ہے جو بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا جو بدلنے والی چیز ہے، اس کو ثابت حق کی کسوٹی پر پرکھئے۔

یاد رکھیں کہ ثمر ان شاخوں سے نہیں ملتے جو بغیر اصول ہوں مگر اصل سے بھی ثمر ملے گا تو شاخوں کے ذریعہ ملے گا۔

دیکھئے! ہم محب اہل بیتؑ زیادہ یا سلمان فارسیؓ، ہم محب اہل بیتؑ زیادہ یا ابوذر غفاریؓ، ہم محبت اہل بیتؑ زیادہ یا حبیب ابن مظاہرؓ۔ خدا کی قسم! ہم میدان محبت میں ان کے قدموں کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔

ہم امام حسینؑ سے محبت کا دعویٰ کریں اور نماز سے محبت نہ ہو، اس کے معنی ہیں کہ ہمارا محبت کا دعویٰ بھی غلط ہے۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۝۱ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝۳

قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان خسارہ میں ہے۔ اگر بات اتنے پر ختم ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ سبھی خسارے میں ہیں۔ چاہے انبیاء ہوں، چاہے اصفیاء ہوں، چاہے اولیاء ہوں، معصومین ہوں، سبھی خسارے میں ہیں۔ لیکن کلامِ الٰہی اتنے پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے بڑھا:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝۳

سب خسارے میں ہیں مگر جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اب جب "اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ" کہنے کے بعد بلا فاصلہ یہ جملہ آ گیا "اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا۔" کا، تو ہمیں اس "اِلَّا" کی خصوصیت بہت شروع سے معلوم ہے کہ یہ "اِلَّا" کا لفظ عربی میں کیا کام کرتا ہے۔ وہ یہ کام کرتا ہے کہ زمین نفی و اثبات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ یعنی اگر قبل میں نفی ہے تو بعد میں ثبوت ہو جاتا ہے اور اگر قبل میں ثبوت ہے تو بعد میں نفی ہو جائے گی۔ شروع سے میں نے کہا، کیوں؟ دین کی پہلی منزل "لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ۔ اب اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے، مادیین کا کلمہ ہو، دہریوں کا کلمہ ہو تو خاص الخاص سات سمندر پار کے کیمونسٹوں کا کلمہ ہو اور یہ قیدیں اتنی کیوں لگائیں، اس لئے کہ وہ ہیں خاص الخاص کیمونسٹ اور باقی اور جگہ جو ہوتے ہیں، وہ بر بنائے فیشن ہوتے ہیں۔ یعنی ایک وضع اب چلی ہوئی ہے، گویا ترقی پسندی کی علامت ہے تو اس بناء پر اصل منکر خدا تو وہی ہوتے ہیں جو وہاں خاص الخاص ہیں۔ تو ان سب کا کلمہ یہ ہوتا۔ مگر جب اس کے ساتھ آ گیا "اِلَّا اللّٰہُ"، تو اب نفی ثبوت سے بدل گئی اور معنی یہ ہو گئے کہ خدا ہے اور وہ کون ہے؟ اللہ ہے۔ اور آگے بڑھئے:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ۔

اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے تو رسالت کی نفی ہو جائے۔ جس کا کام نبیوں کا بھیجنا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہی نہیں ہے لیکن جب اس کے ساتھ آ گیا "اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ" نہیں بھیجا ہے ہم نے آپ کو مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کیلئے۔ تو معلوم ہوا کہ بھیجا بھی ہے اور ہمہ گیر رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس کے بعد آگے بڑھے:

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا۔

"میں تم سے کوئی اجر چاہتا ہی نہیں"۔

تو اگر بات اتنے پر ختم ہو جائے تو بس کوئی اجر نہیں چاہیے۔ مگر جب "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" سوائے صاحبانِ قرابت کی محبت کے، تو معلوم ہوا کہ اجر چاہتے ہیں مگر خود نہیں، خدا کے حکم سے۔ مگر وہ ہے کیا؟ صاحبانِ قرابت کی محبت۔ تو اب ایک ہی ساخت کے تینوں جملے آپ کے سامنے آگئے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کلمہ توحید۔ اس میں بھی نفی کے بعد "اِلَّا" کے ساتھ ثبوت۔ "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کلمہ رسالت۔ اس میں بھی نفی کے بعد "اِلَّا" کے ساتھ ثبوت۔ "لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا" کلمہ ولایت۔ اس میں بھی نفی کے بعد "اِلَّا" کے ساتھ ثبوت۔

اب ان سب میں تو پہلے نفی تھی تو "اِلَّا" کے ساتھ ثبوت ہو گیا۔ یہاں پہلے ثبوت ہے:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔

بے شک انسان خسارہ میں ہے۔ تو اب "اِلَّا" آیا تو اگر آگے سنیں بھی نہیں تو پتہ چل گیا کہ کچھ تو ہیں جو خسارے میں نہیں ہیں ورنہ "اِلَّا" آتا ہی نہیں۔ اب وہ کون ہیں؟ وہ یہ ہیں۔ تو اس "اِلَّا" کا قاعدہ ہوتا ہے کہ یہ آجائے تو نتیجہ پورے جملے کا نکالا جائے تو ہدایت ہوتی ہے اور "اِلَّا" کے پہلے سے نکالا جائے تو ضلالت ہوتی ہے۔ "اِلَّا" کے پہلے بات ختم ہو جائے تو کفر ہوتا ہے۔ "اِلَّا" کے بعد والی بات ملائی جائے تو ایمان ہوتا ہے۔ تو اب یہاں نتیجہ قبل والے سے نہیں نکالا جا سکتا کہ انسان خسارے میں ہے جب تک اس کے ساتھ "اِلَّا" نہ رکھا جائے۔ تو اب "اِلَّا" کے بعد نتیجہ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ کچھ وہ ہیں جو خسارے میں ہیں، کچھ وہ ہیں جو خسارے میں نہیں ہیں۔ خسارے میں وہ ہیں جو "اِلَّا" کے بعد والے لوگوں کے علاوہ ہوں اور جو "اِلَّا" کے بعد ہیں، وہ خسارے میں نہیں ہیں۔

تو اب جب دو قسم کے لوگ ہیں تو ذہن یہ کہتا ہے کہ پھر یوں کیوں ہوا کہ خسارہ میں ہیں؟ مگر وہ جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں وغیرہ وغیرہ۔ یوں ہو جاتا کہ سب انسان نفع میں ہیں، سوائے ان کے جو کافر ہوں، جو بد اعمال ہوں، جو باطل کی طرف لے جائیں، جو بے صبری کی دعوت دیں۔ کوئی کہے جب بات ایک ہی ہے، دونوں کا مطلب ایک ہے تو دل یہ کیوں چاہ رہا ہے کہ یوں ہوتا۔ یعنی کچھ خواہش ہے کہ یوں ہوتا، جبھی تو یہ تصور پیدا ہوا۔ تو یہ آخر دل کیوں چاہ رہا ہے کہ یوں ہوتا؟

تو اب یاد رکھیے کہ ذرا سی تبدیلی میں کلام کا نفسیاتی اثر بہت بدل جاتا ہے۔ اگر اس طرح ہوتا کہ سب نفع میں ہیں سوائے ان کے جو باطل کی طرف لے جائیں اور بد اعمال ہوں، تو اصل کلام ہوتا بشارت۔ جونہی ہم سنتے کہ سب نفع میں ہیں، دل خوش ہو جاتا، طبیعت کھل جاتی اور بالیدہ ہو جاتے۔ اب آیا کرتا کہ وہ جو کافر ہیں اور بد اعمال ہیں تو ہم اسے غور سے سنتے بھی نہیں کہ دو، کوئی ہوں

گے۔ ہم سے کیا مطلب؟ لیکن جب یہ ہوا کہ سب انسان خسارے میں ہیں تو طبیعت بجھ گئی، دل افسردہ ہو گیا، ذہن پریشان ہو گیا۔ اب بعد میں آ رہا ہے کہ مگر جو ایمان لائیں، نیک اعمال کریں، جو حق کی ہدایت کریں، جو صبر کی تلقین کریں۔ وہ سب بعد میں آ گیا تو وہ جو افسردگی پیدا ہوئی، وہ جو پژمردگی چھا گئی، وہ جو غم کے بادل اُمڈ آئے، وہ ایک دم کہاں دور ہوئے۔ کہنے والے نے کہہ دیا۔ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔ رونا ہے، کوئی ہنسی نہیں ہے۔ ہنسی تو ایک دم سے ختم ہو جاتی ہے مگر رونا جو ہے، وہ ایک دم سے ختم نہیں ہوتا۔

تو اب جو غم طبیعت پر چھا گیا، تو بعد میں استثنیٰ ہوا بھی تو کیا؟ تو آخر وہ کیوں نہ ہوا؟ تو جو انسان کا دل چاہتا ہے، اس کیلئے دلائل بھی اس کے ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اب قرآن کی ایک آیت بھی جیسے ہمت بڑھا رہی ہے کہ ہاں! اگر یوں ہوتا تو جیسے زیادہ مناسب تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآن میں ہے:

سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ۔

"اس کی رحمت غضب سے آگے آگے ہے"۔

تو جو تقاضائے رحمت ہے، وہ پہلے بیان ہونا چاہئے اور جو تقاضائے غضب ہے، وہ بعد میں بیان ہونا چاہئے۔ مگر صاحب! اب کیا کیا جائے کہ یوں نہیں ہے۔ اسی طرح ہے۔ کلام اس کا ہے جس کے بارے میں یہ کہہ نہیں سکتے کہ (معاذ اللہ) غلط ہے۔ ارے بھئی! انبیاءؑ کی منزل تک ترکِ اولیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ خدا کے ہاں تو ترکِ اولیٰ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

تو جو ہے، وہی سب سے بہتر ہے۔ یہ سوچنا ہی غلط ہے اور یہ تو عرفِ عام میں کچھ جملے ہیں۔ تو یاد رکھئے وہ اگر سمجھ کر کہے جائیں، ارادتاً، تو وہ کفر بن جائیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بطور تکیہ کلام ہے۔ یہ جیسے ایک محاورے کے طور پر ہے۔ بے سمجھے ہے، اس لئے کوئی فتویٰ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً بہت سی باتوں کو کہہ دیتے ہیں کہ کیا بے وقت یہ چیز ہوئی ہے۔ کسی کی موت کو کہہ دیا، کیا بے وقت یہ موت ہوئی ہے۔ بارش کو کہہ دیا کہ یہ بے وقت بارش ہوئی ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ بے وقت اور باوقت کا جائزہ ہمارا کام نہیں ہے۔ جو فاعل حکیم ہے اور اُسے باوقت سمجھ رہا ہے، اُسے ہمیں بے وقت سمجھنے کا کیا حق ہے؟

تو اب یہ تصور نہیں ہو سکتا۔ کلامِ الٰہی سمجھنے کے بعد یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب یقیناً پھر کوئی بات ہے کہ اس طرح نہ کہنا اور اُس طرح کہنا۔ تو اب جو میں نے سوچا تو سمجھ میں آیا کہ جو کہا گیا ہے، وہ بالکل عام اصول کے مطابق ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ جو اکثریت کیلئے بات ہو، وہ بطورِ عموم بیان ہوتی ہے۔ جو اقلیت کیلئے ہو، وہ بطورِ استثنیٰ بیان ہوتی ہے۔ اگر یہ ہوتا کہ کفر کے مقابلہ میں ایمان زیادہ اور بداعمالی کے مقابلہ میں حسنِ عمل زیادہ اور باطل کے مقابلہ میں حق زیادہ اور بے صبری کے مقابلہ میں صبر کے نمونے زیادہ ہوتے تو اس طرح ہوتا۔ لیکن اس طرح اس لئے نہیں ہوا کہ کفر کے مقابلہ میں ایمان کم، بداعمالی کے مقابلہ میں حسنِ عمل کے نمونے کم، باطل کے مقابلہ میں حق کم اور بے صبری کے مقابلہ میں صبر کم۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اکثریت حقانیت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اگر اکثریت حقانیت کی دلیل ہو تو ایمان کے مقابلہ میں کفر حق، حسنِ عمل کے مقابلہ میں بداعمالی حق، حق کے مقابلہ میں باطل حق اور صبر کے مقابلہ میں بے صبری حق۔ ہاں غلط فہمی نہ

ہو۔ یہ میں نہیں کہنا چاہتا کہ اقلیت حقانیت کی دلیل ہے کہ کوئی ایسا باطل جسے اتفاق سے ماننے والے کم ملے، وہ اسے اپنی دلیل بنالے۔ میں کہتا ہوں کہ حق حق ہے، چاہے ماننے والے زیادہ ہوں، چاہے کم ہوں۔ یہ اکثریت اور اقلیت تو ہوا کے جھونکوں کی طرح بدلتی ہے۔ ایک دفعہ جسے زیادہ رائے ملتی ہے، دوسری دفعہ اسی کو کم ملتی ہے۔ یا اس دفعہ اکثریت غلطی پر تھی یا اس دفعہ غلطی پر ہے۔ تو یہ تو ہوا کے جھونکوں کی طرح بدلتی ہیں اور حق وہ شے ہے جس میں تبدیلی نہیں ہے۔ تو یاد رکھئے کہ جو بدلنے والی چیز ہے، اس کا معیار وہ ہونا چاہئے جو برقرار ہو۔ جو برقرار چیز ہے، اس کا معیار بدلتی ہوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

اسی لئے یہ تصور غلط ہوگا کہ بہت سے لوگ دینی تعلیمات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور بعض حامیانِ دین، دین کی خدمت یہی سمجھتے ہیں کہ جو سائنس کا نظریہ ہو، ثابت کرو کہ دین بھی یہی کہہ رہا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے، اس لئے کہ ہر سائنس دان کو معلوم ہے کہ سائنس کتنی کروٹیں بدلتی ہے۔ سائنس میں کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت اگر قرآن نے اس وقت کی سائنس کی تائید میں آپ کے ثابت کرنے سے سمجھا کہ وہ اس کے حق میں ہے تو جب وہ نظریہ بدل جائے گا تو اب آپ کو قرآن بدلنا پڑے گا اور قرآن وہ ثابت حقیقت ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں اور سائنس وہ چیز ہے جو بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا جو بدلنے والی چیز ہے، اس کو ثابت حق کی کسوٹی پر پرکھئے۔

یہ اندازِ بیانِ قرآنی خود بتا رہا تھا کہ یہ جماعت کتنی کم ہے کہ اس کا بیان بطور استثنیٰ ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد عربی میں دو حرف عطف ہیں۔ ہیں تو بہت سے مگر مجھے جن سے مطلب ہے، وہ دو ہیں۔ ایک "اَوْ" اور ایک "واؤ" بغیر الف کے۔ ان دونوں کے کیا معنی؟ "اَوْ" معنی یا۔ یا یہ یا یہ۔ واؤ کے معنی اور۔ آپ کے ہاں بھی بہت مثالیں ہیں۔ تو ان میں اگر کسی صورت سے یوں ہوتا۔ وہاں دل چاہ رہا تھا اس طرح۔ اب یہاں دل چاہ رہا ہے کہ اس طرح ہوتا:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَوْ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ اَوْ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

سب خسارے میں ہیں سوا ان کے جو ایمان لائیں یا نیک اعمال کریں یا حق کی ہدایت کریں یا صبر کی تلقین کریں۔

تو یوں ہوتا تو پھر بھی اتنی اقلیت نہ رہتی۔ دوسرے لفظوں میں کہوں کہ بہشت اتنی خالی نہ رہتی۔ اس کی آبادی میں کچھ تو اضافہ ہو جاتا، اس لئے کہ ہر جگہ ایمان لائیں یا نیک اعمال کریں یا حق کی ہدایت کریں۔ تو میری تو چونکہ عمر درسگاہ میں گزری ہے، ۲۷ برس لکھنؤ یونیورسٹی میں رہا، ۱۵ برس مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں رہا۔ تو میرا سابقہ طلباء ہی سے رہا ہے۔ ان کی مثالیں بھی یاد آتی ہیں۔ تو جناب بی اے وغیرہ کے امتحان میں بعض مضامین لازمی ہوتے ہیں، بعض اختیاری ہوتے ہیں اور وہ مضامین جو اختیاری ہوتے ہیں، ان میں ہر ایک کو لینے کا بھی حق ہے، ہر ایک کو چھوڑنے کا بھی حق ہے۔ اب ان اختیاری مضامین میں سے کسی نے اس کو لیا اور کسی نے اس کو نہیں لیا۔ تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں کہ تم نے اسے کیوں لیا اور کسی نے اس کو کیوں نہیں لیا۔ کہا کہ ہمیں یہی پسند ہے، یہی آسان ہے۔ کسی نے اس کو لیا، اس کو نہیں لیا تو کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے، اس کیلئے وہی آسان ہے، اس کو وہی پسند ہے۔

اس طرح سے پرچے جو دیئے جاتے ہیں، تو چونکہ مقصود تو اساتذہ کا یونیورسٹی کے کرتا دھرتا حضرات کا یہ نہیں ہے کہ زیادہ سے

زیادہ لوگ فیل ہوں، اس میں ادارہ کی بھی بدنامی ہے اور پھر طلباء کیلئے آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ دس سوال دیئے جاتے ہیں کہ ان میں سے کم سے کم پانچ سوالوں کے جواب مطلوب ہیں۔ اب وہ طالب علم اس وقت دیکھتا ہے کہ میرے لئے کون سے آسان ہیں یا مجھے کون سے یاد ہیں۔ اب جو آسان ہوئے یا جو یاد ہوئے، ان پر اس نے لال پنسل سے نشان بنا دیا کہ مجھے یہ کرنے ہیں۔ دوسرے طالب علم نے کسی دوسرے پر نشان بنا دیئے جو اُسے یاد ہیں۔ نہ اُسے اس سے جھگڑا کرنے کا حق، نہ اُسے اس پر اعتراض کرنے کا حق۔ اسے وہ پسند ہیں، اسے یہ پسند ہیں۔ اس کو اس میں آسانی ہے، اُسے اس میں آسانی ہے۔

تو اگر یہ ہوتا کہ ایمان لائیں یا نیک اعمال کریں یا حق کی دعوت دیں یا صبر کی تلقین کریں، تو جناب میں تو اپنی کہتا ہوں، اس میں غور آپ بھی کریں کہ آپ اس میں شریک ہیں یا نہیں۔ میں تو لال پنسل سے "اٰمَنُوْا" پر نشان بنا دیتا۔ یہی زیادہ آسان ہے کیونکہ دل کو شگافتہ کر کے کون دیکھے گا کہ ایمان ہے یا نہیں؟ تو ایمان کا مضمون لے لیتا۔ اب جب ایمان کا مضمون لے لیا تو اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ نماز کیوں نہیں پڑھتے کیونکہ وہ تو عملِ صالح کا جزو ہے۔ ہم نے وہ مضمون لیا ہی نہیں ہے۔ اب آپ ہم سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ نماز بھی پڑھو؟ آپ ہم سے نہ کہئے کہ روزہ کیوں نہیں رکھتے، اس لئے کہ وہ بھی عملِ صالح ہے۔ ہم نے عملِ صالح چھوا ہی نہیں ہے۔ ہم نے اس پر نشان ہی نہیں لگایا ہے اور اسی طرح اور منہیات۔ یہ نہ کہئے کہ دوسرے کا مال کیوں لیتے ہو؟ یہ تو سب عملِ صالح کا جزو ہیں۔ کچھ منفی ہیں، کچھ مثبت ہیں۔ کچھ اوامر ہیں، کچھ نواہی ہیں۔ ہم نے وہ شعبہ ہی نہیں لیا ہے جو اس مصیبت میں پھنسیں۔ لہٰذا بس یہ دیکھ لیجئے کہ "اٰمَنُوْا"۔

بحمد اللہ! ہماری پوری جماعت کا لقب ہے مومنین کرام۔ تو ادھر مردم شماری کے رجسٹر میں اس فرقہ میں نام آیا۔ خانۂ مذہب میں اپنا نام آیا۔ ادھر مومنین تو ہو گئے اور جب مومنین ہو گئے تو پھر عملِ صالح سے کیا واسطہ۔ لیکن اگر آپ نے یہ جزو پسند کر لیا اور اپنے ذمہ لے لیا تو پھر دوسرے کو حق ہے کہ وہ نشان عملِ صالح پر لگائے۔ پھر اب اس سے ایمان کا مطالبہ نہ کیجئے گا۔ یہ دیکھ لیجئے کہ مسجدیں تو خالی نہیں رہتیں۔ یہ دیکھئے کہ نماز کے وقت کیسی تیزی سے دوڑتے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ حج میں کتنے آدمی جاتے ہیں۔ اب یہ نہ کہئے گا کہ کیا فائدہ؟ ایمان تو ہے نہیں، جی! آپ کو ایمان سے فائدہ ہو گیا بغیر عملِ صالح کے اور کسی کو عملِ صالح سے فائدہ نہ ہوا بغیر ایمان کے۔ اصول تو ایک ہوتا ہے۔ آپ کو یہ مضمون پسند، کسی کو دوسرا مضمون پسند۔ اس نے عمل صالحات لے لیا ہے، ایمان سے بحث نہیں ہے۔ اگر بحث نہیں ہے تو آپ کو کیا ہے؟ اور ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔

اب ہمارے جیسے واعظانِ بے عمل کیلئے بڑی آسانی ہے جس کو اللہ نے قوتِ تقریر عطا کی، وہ گیا اور دعوتِ حق دینا شروع کر دی، اس لئے کہ اللہ نے زبان عطا کی ہے اور زبان میں قوتِ تقریر ہے اور دعوتِ حق تو زبان سے ہوتی ہے۔ دیکھ لو کہ ہماری زبان دعوتِ حق دینے سے رُکتی تو نہیں ہے۔ اب یہ نہ دیکھو کہ ہم بھی حق پر ہیں یا نہیں۔ اب ہم میں ایمان تلاش نہ کیجئے گا اور ہم میں عملِ صالح بھی تلاش نہ کیجئے گا کہ ہم نے تیسرے مضمون پر لکیر لگائی ہے۔ ہم نے اسے اپنایا ہے۔ اب جب "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" ہے اور اس پر ہمارا

عمل ہے تو ہمیں نہ "اٰمَنُوْا" سے مطلب نہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے غرض، نہ "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" سے مطلب۔
صرف "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" دیکھیے۔ کتنا عمدہ ہو جاتا ہے، کتنی عمدہ ہم تقریر کر لیتے ہیں، حق کی دعوت دیتے ہیں۔

اب اس کے بعد جانچ نہ کیجئے گا ہمارے کسی اعتقاد و عمل کی۔ اب اس کے بعد "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ اب جو مطلب صبر کا ہم سمجھیں۔ کسی کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھا، کہا: خبردار! صبر کرو، آنسو بہانا خلاف صبر ہے۔ زبان سے آہ سنی، انہوں نے کہا: ہائیں! خلاف صبر ہو گیا۔ اب عمر گزری دعوت صبر دیتے ہوئے۔ اب آپ ہم سے ایمان بھی چاہتے ہیں، عمل صالح بھی چاہتے ہیں، وصیت حق بھی چاہتے ہیں۔ اس سے ہمیں مطلب نہیں۔ ہم نے تو صبر کے شعبہ کو لیا ہے۔ وصیت صبر دوسروں کو کرتے ہیں، چاہے خود کتنے ہی بے صبرے کیوں نہ ہوں۔

تو اب جب یہ سب میں نے عرض کر دیا تو آپ میں سے کسی کا ضمیر یہ قبول نہیں کرتا کہ یہ ٹھیک ہے۔ "اَوْ"، "اَوْ" کہنے کے بعد تو یہ آسانیاں ہوتیں لیکن اب میں کیا کروں کہ وہاں تو ہے:

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

سب خسارہ میں ہیں سوا ان کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔

اب "اور" کے معنی ہوتے ہیں مطالبہ اجتماع۔ میں کہوں کہ آپ اور آپ کل تشریف لائیے گا تو میں آپ سے ایک خاص بات کہوں گا۔ اب دوسرے دن اکیلے آپ آئے ہیں۔ میں کہوں گا جناب! میں نے تو کہا تھا کہ آپ اور آپ۔ اب وہ شرط تو پوری نہیں ہوئی۔
وصیت حق بھی ہو بقدر ضرورت۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ وہ منبر پر جا کر ہی خطبہ پیش کر سکے، نہیں۔ جیسی زبان سے، جیسے انداز سے وہ حق کی طرف دعوت دے سکتا ہو، اس انداز سے وہ دعوت دے اور "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" دوسروں کو بھی صبر کی دعوت دے۔ اگر مزید کہیں بیان ہوا تو عرض کروں گا کہ صبر کی دنیا کتنی وسیع ہے۔ اس میں کتنی چیزیں داخل ہوتی ہیں۔ تو اب یہ تمام چیزیں ہوں تو خسارے سے بچاؤ اور اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو آئینی طور پر تو حکم سابق بحال۔ ہاں تفضل خالق پر مجھے پہرہ لگانے کا حق نہیں۔ خسارے سے بچنے کا استحقاق نہیں ہو سکتا۔

تو چاروں ہوں، ایمان بھی، عمل صالح بھی، ایک دوسرے کو حق کی ہدایت بھی اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین بھی، یہی "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" جو ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے کہ جس راستے کو تم صحیح سمجھتے ہو، تو دوسرے کو بھی اس کی دعوت دو۔ دوسرا کوئی غلط راستے پر جا رہا ہے تو اُس کو بتاؤ کہ یہ غلط راستہ ہے۔ اُسے روکنے کی کوشش کرو۔ یہ سب چیزیں "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کے تحت ہیں۔ تو یہ سب باتیں ہر آدمی کا فریضہ عینی ہیں کہ ایمان بھی شرط، عمل صالح بھی شرط، حق کی طرف ہدایت بھی شرط اور صبر کی تلقین بھی شرط۔ یہ تمام چیزیں بحیثیت مجموعی شرائط میں سے ہیں، خسارے سے بچنے کیلئے۔

جب میں غور کرتا ہوں تو یہ سب اوصاف آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح میں باہمی تعلق کیا

ہے؟ وہ تو وہ ہے کہ ہمارے علماء نے بچوں تک کو سکھانے کے واسطے محاورہ قائم کیا ہے، اصولِ دین اور فروعِ دین۔ کیا معنی؟ بچوں کو معنی بھی اس کے بتائے جاتے ہیں۔ اصولِ دین: دین کی جڑیں۔ فروعِ دین: دین کی شاخیں۔ اب جڑ اور شاخ میں جو باہمی تعلق ہے، وہ اصولِ دین اور فروعِ دین میں ہے۔ اصولِ دین کو دیکھئے تو وہ نمایاں طور پر عقائد کا مجموعہ ہے اور فروعِ دین کو دیکھئے تو وہ تمام اعمال کا مجموعہ ہے۔ گویا وہ "آمنوا" کے لفظ کی تشریح ہے اور یہ "عملوا الصلحت" کے لفظ کی تمثیل ہے۔ دونوں جیسے وہاں برابر کے جملے، ویسے ہی یہ دونوں برابر کے حکم، اصولِ دین اور فروعِ دین۔

تو اب یہ جڑیں اور شاخیں۔ ان کی خصوصیات دیکھئے۔ جڑیں عموماً پردۂ زمین میں تہہ خاک پھیلتی ہیں۔ اس کے رگ و ریشے زیرِ زمین پھیلتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے جو ہوتی ہیں، وہ شاخیں ہوتی ہیں۔ یونہی عقائدِ حقہ دل و دماغ کی اندرونی زمین میں، ان کے رگ و ریشہ میں پھیلتے ہیں اور اعمالِ صالحہ ہے جو شاخوں کی صورت میں اعضاء و جوارح سے نمودار ہوتے ہیں۔ تو اب صدقِ دل سے سوچئے کہ اگر شاخیں خشک ہیں یا وجود ہی نہیں رکھتیں تو کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جڑیں ہی کمزور ہیں یا وجود ہی نہیں رکھتیں۔

ارے جناب! آثار سے موثر پہچانا جاتا ہے۔ نتائج کو دیکھ کر اسباب کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ جب شاخیں نظر نہیں آ رہی ہیں تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ دل و دماغ کی زمین میں اصول نہیں ہیں۔ اب اگر عقائد حفظ ہیں تو یہ باپ دادا کے سکھائے ہوئے زبان پر ہیں اور اگر افعال اس کے مطابق ہیں، وہ رسم و رواج کے ماتحت ہیں۔ ورنہ اگر دل و دماغ کی تہوں میں وہ تصورات مضمر ہوں تو ممکن ہی کیونکر ہے کہ اعضاء و جوارح سے اس کی زندگی کا اثر نمودار نہ ہو۔

اب ہر ایک اندازہ کرے کہ جب شاخیں افسردہ ہوں، پژمردہ ہوں تو کیا پانی لا کر اس میں شاخوں کو ڈبویا جاتا ہے؟ کچھ نہیں ہوگا۔ شاخیں اگر کمزور ہیں تو جڑ کی خبر لیجئے۔ جو کچھ پانی دینا ہو تو جڑ کو دیجئے۔ جب اس میں زندگی ہوگی تو خود بخود شاخیں پیدا ہو جائیں گی۔ یاد رکھئے کہ اگر صحیح مصرف میں استعمال ہوں تو یہ ہماری مجالس جڑوں ہی میں پانی دینے کیلئے ہیں۔

مگر وہی بات ہے کہ اگر ہم مجالس بھی کر رہے ہیں اور پھر بھی شاخیں خشک ہی نظر آ رہی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مجالس رسمی طور پر ہیں۔ ہماری مجالس بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر رہی ہیں جو مقصد ان مجالس کا تھا۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ جب اصل پژمردہ ہے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ شاخوں کے پژمردہ ہونے سے یا شاخوں کے نہ ہونے سے اور اگر اصل نہیں ہے یعنی ایمان دل و دماغ کے اندر نہیں ہے اور شاخیں ہیں بڑی تر و تازہ، بڑی گھنی، تو یاد رکھئے کہ پھر یہ شاخیں نمائشی ہوں گی۔ وہ شاخیں جو اصل سے متصل نہیں ہیں، وہ شاخیں نمائشی ہوں گی اور نمائشی شاخوں کی خاصیت ہے کہ بیکار نہیں ہوتیں۔ وہ نمائشی شاخیں بھی زینتِ چمن کا کام دیتی ہیں۔ رونقِ گلزار ان سے ہو جاتی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ وہ حوادثِ زمانہ کے تیز و تند جھکڑ کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ متوازن حالات رہیں تو وہ شاخیں لگی رہیں گی، برقرار رہیں گی اور ذرا اگر کٹھن منزل ہوئی، کوئی انقلاب کا سخت جھونکا آیا تو وہ شاخیں تتر بتر ہو جائیں گی۔ کوئی کہیں، کوئی کہیں۔ معلوم ہو گیا کہ شاخیں تھیں مگر جڑیں نہیں تھیں۔

تو حضورِ والا! یہ ہوں گی وہ شاخیں جو بغیر اصول ہوں اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ چمن کی رونق ہو جائے گی، زینت کا شانہ ہو

جائے گی لیکن ان شاخوں سے ثمر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ثمر انہی شاخوں سے حاصل ہو سکتا ہے جن کا تعلق جڑوں سے ہو۔ پھر جیسی شاخیں ہوں، اگر پژمردہ ہیں تو ثمر بھی اس کے پژمردہ ہوں گے۔ اگر زندہ شاخیں ہیں تو ثمر بھی زندہ ہوں گے۔ تو ثمر ان شاخوں سے نہیں مل سکتے جو بغیر اصول ہوں۔ مگر اصل سے بھی ثمر ملے گا تو شاخوں کے ذریعہ ہی ملے گا۔

اسی بناء پر دیکھئے جو جو چیزیں ہیں۔ جنت ہے، ہر مسلمان کی تمنا اور نعمات جنت، وہ سب جنت کے ساتھ، حور و قصور، کوثر و تسنیم۔ جو کچھ بھی ہے، سب کچھ۔ جنت بھی ہری بھری چیز ہے اور تمناؤں کے سبز باغ بھی ہرے بھرے ہیں۔ تو کون مسلمان ہے جو ان سبز باغوں کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ جنت وہاں دیکھے گا، سبز باغ یہاں دیکھ رہا ہے۔ وہاں کی خبر خدا جانے، یہاں کی خبر خود اس کے ہاتھ میں ہے کہ تمنائیں ہیں، آرزوئیں ہیں، ہر ایک مسلمان کی۔ بہشت، عنبر، سرشت، کس مسلمان کی آرزو نہیں مگر میری ایک کتاب بھی نکلی ہے "وعدۂ جنت"۔ اس میں ۹۳ آیتیں قرآن مجید کی جمع کر کے میں نے پیش کی ہیں کہ ہر جگہ جنت کا وعدہ عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں اور کوئی ایک آیت مجھے نہیں ملی جس میں تنہا ایمان پر عمل صالح کے بغیر جنت کا وعدہ ہو۔

تو صاحب! جس کے ہاتھ میں جنت ہے، اُس نے وعدہ تو ان دو شرائط کے ساتھ کیا ہے۔ اب ہم کس دستاویز سے جنت کا مطالبہ کریں گے؟ تو ایمان اور عمل صالح دونوں درکار ہیں۔ اب مسلمان بہرحال سہولت پسند آدمی ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر اپنا لقب اُمتِ مرحومہ رکھ لیا ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا محاورہ ہے۔ بحمد للہ اُمتِ مرحومہ میں سے ہونے کا میں بھی دعویدار ہوں۔ تو سب اُمتِ مرحومہ۔ پوری اُمت، اُمتِ مرحومہ۔ تو دل کو لگتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین کی بدولت ہم سب اُمتِ مرحومہ قرار پاتے ہیں۔ تو یہ جبھی تو ہوگا کہ جب ہمارا اور رحمۃ للعالمین کا راستہ ایک ہو۔ یعنی جس طرح ان کا رُخ ہے، ہمارا رُخ بھی اسی طرف ہو۔ تب تو جو رحمت الٰہی کی گھٹا اُٹھے گی اور ان پر برسے گی، تو کچھ نہ کچھ ہم تک بھی آجائے گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمارا اور ان کا راستہ الگ ہو گیا، وہ اُدھر جا رہے ہیں اور ہم اِدھر جا رہے ہیں، تو اب بتایئے رحمتِ الٰہی آئے گی تو اُدھر جائے گی یا اِدھر آئے گی؟ پھر یہ کہ اُمت ہونا ایک رشتہ ہی تو ہے۔ تو اگر ہم خود کو رسول کی اُمت کہیں تو رسول بھی تو ہمیں اپنی اُمت مانیں ورنہ یک طرفہ دعویٰ ہوگا۔ ہم لاکھ کہہ رہے ہیں کہ ہم رسول کی اُمت ہیں اور پیغمبر ہمیں اپنی اُمت نہیں سمجھتے۔ رسول کی زبانی ایک اعلان ہے:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ۔

"جو میری پیروی کرے، وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو پیروی نہ کرے، وہ مجھ سے تعلق ہی نہیں رکھتا۔ تو اُمت ہونے کا کیا ذکر؟ اس کے بعد ایک سخت تر منزل ہے۔ نازک تر منزل۔ وہ یہ کہ پیغمبر خدا فرما بھی دیں "میری اُمت" تو اللہ بھی تو مانے پیغمبر کی اُمت۔ چونکہ نجات اُس کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی کہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ پیغمبر خدا فرمائیں میری اُمت اور اللہ اس کو نہ مانے۔ اُن کی اُمت نہ سمجھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو حضرت نوح بھی تو پیغمبر تھے اور اولوالعزم پیغمبر تھے۔ وہ بارگاہِ الٰہی میں کہہ رہے تھے:

"اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ"۔

"میرا بیٹا میرے اہل سے ہے"۔

دُہری دُہری نسبتیں اپنی طرف دے رہے تھے۔ بیٹا ہونے کی نسبت بھی، میرا بیٹا۔ دوسری نسبت اہل کی کہ میرا اہل۔ تو خالق نے پہلی نسبت کی نفی نہیں فرمائی، یہ نہیں فرمایا کہ:

"اِنَّہٗ لَیْسَ بِابْنِکَ"۔

"یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے"۔

وہ نسبت برقرار۔ یعنی بے شک ہے تمہارا بیٹا لیکن:

"اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ"۔

"یہ اعمال اچھے نہیں رکھتا"۔

معلوم ہوا کہ عمل غیر صالح ایسی چیز ہے جو بیٹے کو اہل سے خارج کر دیتا ہے۔ تو اُمت ہونا کیا چیز ہے؟ اب یوں ماشاء اللہ آپ کی محبت اور توجہات اور پھر احساس اور شعور بھی ایک حد تک بیدار ہو گیا ہے۔ کارآمد چیزیں بھی کبھی کبھی سن لینی چاہئیں اور آپ سن رہے ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ بہت تلخ باتیں ہیں جو ابھی تک کرتا رہا ہوں۔ اب ذرا ذہن آپ کا متوجہ کر دوں، آپ کے ایک مطلوبہ شیعہ بیان کی طرف، وہ بھی حقیقت ہے اور حق ہے۔ میں کہتا ہوں جس رسول کی زبانی یہ اعلان ہوا کہ بیٹا اس لئے اہل نہیں ہے کہ اس کے اعمال صحیح نہیں ہیں، تو اب رسول اگر سبز چادر کے نیچے لے کر کسی کو اگر کہے گا کہ پروردگار! یہ میرے اہل ہیں تو وہ صرف رشتہ داری کی بناء پر نہیں ہوگا۔ وہ ان کے عمل کے معیار کو دیکھ کر ہوگا۔

تو حضور والا! میں نے قرآن سے مثال پیش کر دی ہے اور ہم میں ہر فرد بحمد للہ مسلمان ہے اور قرآن کو مانتا ہے۔ لہٰذا شاید لاجواب تو ہو جائے، کہے کچھ نہیں۔ لیکن یہ بات حلق سے اُترے گی نہیں یعنی دین میں کچھ ایسے ہوگا کہ ہاں! حضرت نوح تک تو یہ ہو گیا۔ اب کیا کریں قرآن میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ ایسا ہو گیا۔ لیکن ہمارے رسول کہیں میری اُمت اور پھر اللہ نہ مانے ان کی اُمت۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ایک مسلمان کا دل شاید اب بھی قبول نہ کرے۔ مگر آیئے ہمارے اور آپ کے رسول، صحاح ستہ میں، یہ لفظ اعتماد کیلئے کافی ہے۔ اس کی وقعت جمہور اُمت میں مسلّم ہے۔ پھر صحیحین، اور مرتبہ اونچا ہوا اور ان میں بھی صحیح بخاری۔ یوں تو تمام صحاح کی متفقہ ہے مگر صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں، بمناسبت، تیرہ جگہ یہ حدیث موجود ہے۔ اب میں الفاظ حدیث پڑھ رہا ہوں، چونکہ تیرہ جگہ ہے یہ حدیث، لہٰذا کسی راوی نے کسی لفظ کو کسی طرح کہا ہے، کسی نے کسی طرح۔ مگر مضمون ایک ہی ہے اور جو الفاظ مجھے یاد ہے، وہ صحیح بخاری میں بھی ہیں۔ وہ پڑھ رہا ہوں کہ پیغمبر خدا ارشاد فرما رہے ہیں:

"یَرِدُ عَلَیَّ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ"۔

صحاحِ ستہ کا لفظ تو وقعت پیدا کرنے کیلئے ہے ورنہ شہرتِ عام کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں کہ مشکوٰۃ شریف میں بھی ہے جو نصاب میں بھی داخل ہے۔ اُمت کے کورس میں ہے۔

"میرے پاس روزِ قیامت میری اُمت کے کچھ افراد لائے جائیں گے"،

اُمتی کا لفظ سب کیلئے ہے۔ بلا استثنیٰ پوری جماعت کیلئے اُمتی کا لفظ ہوگیا۔ رسول کی طرف سے نسبت ہوگئی۔ مگر اب کیا ہوتا ہے؟

"میری اُمت میں سے کچھ لوگ میرے پاس لائے جائیں گے"۔

یاد رکھئے وہ عام برتاؤ جو ہے مسجد میں آنے دینا، اپنے پہلو میں بیٹھنے کی اجازت دینا، اپنے گرد و پیش انہیں وقت دینا، جتنا وقت چاہیں، صرف کریں، وہ سب رسالت کے فریضہ کا آئین ہے جس میں اسبابِ ظاہری پر حکم مبنی ہوتا ہے اور یہ قیامت کے سلسلہ میں جو بات ہے، وہ علم غیب پر مبنی ہے جو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ نکرائے گا کہ یہاں تو یہ کہہ رہے ہیں، وہاں اپنی جماعت میں شامل کئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے آئین کا تقاضا ہے، یہ ان کے علم کا تقاضا ہے۔ فرما رہے ہیں: "میرے پاس روزِ قیامت میری اُمت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے"، کہاں؟ حوضِ کوثر پر۔ جس اُمید سب کو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی کسی کو ساقی کہے، کوئی کسی کو کہے۔ مگر پیاس سب کو ہے، تشنگی بھی سب کو ہے۔ تو جناب! حوضِ کوثر پر میرے پاس میری اُمت میں سے کچھ لائے جائیں گے۔ آئیں گے یا آنا چاہیں گے؟ ظاہر ہے کہ حوضِ کوثر پر کیوں آئیں گے؟ اس لئے کہ پیاسے ہیں۔ اس لئے کہ پانی کے طلبگار ہیں۔

فَيُحَالُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ۔

"لیکن میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا"۔

یعنی کچھ رکاوٹیں بیچ میں ڈال دی جائیں گی۔ اب پردے پڑ جائیں۔ فرشتوں کی صفیں بیچ میں حائل ہو جائیں، کیا ہو؟ اللہ جانے۔ پیغمبر نے صیغہ مجہول استعمال فرمایا ہے۔ "فیحال" حائل سے۔ سدِ راہ۔ "بینی و بینھم" میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جایا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہنچنے نہ دیا جائے گا۔

فَاَقُوْلُ يَارَبِّ اَصْحَابِيْ۔

"میں کہوں گا: پروردگار! یہ تو میرے اصحاب ہیں، میرے اصحاب ہیں"۔

اور کہوں گا:

يَارَبِّ اَصْحَابِيْ ثَلَاثًا۔

تین مرتبہ کہوں گا "فَيُقَالُ" مگر کہا جائے گا:

"آپ تو آئین کے پابند رکھے گئے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا ہے؟ یہ لوگ پچھلے پیروں اپنے پرانے طریق پر پلٹ گئے تھے"۔ اب دیکھا آپ نے رسول دہری دہری نسبت دے رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں، یہ اس

لائق نہیں ہیں کہ آپ تک پہنچیں۔ تو اب رسول ہمیں اپنی اُمت کہہ دیں، اللہ اسے نہیں مانتا، کیا کیا جائے؟ تو یہ تو اُمتِ مرحومہ کے تصورات کا جائزہ تھا۔ اب اُمتِ مرحومہ میں سے ایک فرقہ نے اپنا لقب ناجیہ قرار دے لیا ہے۔ وہ فرقہ جو بحیثیت جماعت نجات کا حقدار ہے۔ تو میں نے اُمتِ مرحومہ سے جرح کی۔ فرقہ ناجیہ ہونے کا بھی بحمد للہ مجھے ادعا ہے۔ اس کو یونہی چھوڑ دوں، ان سے جرح نہ کروں کہ آپ کو کیا حق، صرف آپ فرقہ ناجیہ کیسے ہوگئے؟ جیسے اُمتِ مرحومہ کی نمائندگی میں مَیں نے اس کی وجہ بیان کی تھی۔ لہٰذا اس کی وجہ بیان کرنے کا بھی حق ہے اور یہ بہت طاقتور وجہ ہے۔ میرے سامنے پیغمبر خدا کی دو حدیثیں ہیں اور دونوں متفق علیہ۔ ایک حدیث میرے گزشتہ بیان کی بھی دلیل ہے اور وہ متواتر ہے:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلَاثٍ وَّسَبْعِیْنَ فِرْقَةٍ کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةٌ۔

"میری اُمت کے تہتر فرقے ہوں گے"،

دیکھئے! اُمتی کی نسبت سب کیلئے ہے۔ گزشتہ حصہ بیان سے بھی متعلق ہے۔ یہ نہیں ہے کہ آدمیوں کے تہتر گروہ ہوں گے۔ اُمتی۔

"میری اُمت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا وَاحِدَةٌ سب دوزخ میں ہوں گے سوائے ایک کے"۔

ایک کون؟ یعنی ایک فرقے کے۔ ۷۳ فرقے ہوں گے، سب آگ میں ہوں مگر بس ایک۔ اس حدیث سے بھی ہم سمجھے کہ صرف اُمت ہونا کافی نہیں ہے۔ اُمت کا وہ ایک فرقہ ہونا چاہئے۔ یہاں سے تو فرقہ کا لفظ آیا۔ خود ساختہ نہیں ہے۔

اب ہر صاحبِ عقل غور کرے کہ جس رسول نے یہ بتا دیا کہ ۷۳ فرقے ہیں اور سب دوزخ میں مگر ایک۔ اسی رسول کا تو یہ فرض بھی ہے کہ اس ایک کی کچھ پہچان بتائے۔ صدقِ دل سے ہر مسلمان۔ صبر و سکون کے لمحات میں غور کرے جو عرض کر رہا ہوں کہ اگر پیغمبر نہ بتائیں تو ہر مسلمان کو دامن تھام کر اس مطالبہ کا حق ہے کہ آپ نے یہ تو بتا دیا کہ ۷۳ فرقے ہیں، ڈرا تو دیا کہ بس ایک نجات کا حقدار ہے اور اس ایک کی پہچان اب بتا نہیں رہے۔ یہ کہہ دیا کہ چوراہا اور ایک راستہ کی پہچان نہ بتائی، چہ جائیکہ ہفتاد و سہ راہا۔ آپ وہاں ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں اور یہ بتا کر نہیں جاتے کہ وہ ایک آخر کون ہے؟ تو یہ ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ پیغمبر سے پوچھے اور اگر کوئی ضعیف روایت بھی نہ ملے کہ کسی نے پیغمبر سے نہ پوچھا ہو تو ماننا پڑے گا کہ پیغمبر نے بتایا۔

اب جو بحمد للہ مجھے معلوم ہے، وہ میں بتاؤں تو یا دنیا اُسے تسلیم کرے یا خود بتائے کہ کیا بتایا۔ مجھے جو معلوم ہے، وہ بھی متفق علیہ حدیث ہے کہ پیغمبر نے اس ایک کی پہچان بتائی:

مَثَلُ اَهْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَهَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَهَوٰی۔

"میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے، جو اس پر سوار ہوا، اُس نے نجات پائی اور جس نے تخلف کیا، وہ ڈوبا اور گیا"۔

کوئی کہے کہ یہ کیا ترجمہ ہوا؟ "تَخَلَّفَ" کا ترجمہ "تَخَلَّفَ" عربی سے عربی۔ میں عرض کروں گا کہ میں کیا کروں، مجھے اُردو میں لفظ نہیں ملا۔ لہٰذا جملوں سے سمجھاؤں گا کہ جو کشتی پر بیٹھا ہی نہیں یا بیٹھ کر کہیں اُتر گیا۔ اب میں "تَخَلَّفَ" کا معنی لفظوں میں اس تشریح کے بعد ترجمہ بھی کر سکتا ہوں کہ "مَن تَخَلَّفَ" جو اس کشتی پر بیٹھا نہ رہا، وہ غرق ہوا، وہ ڈوبا اور ختم ہوا۔ جو بھی تفسیر کر لیجئے۔

تو جناب! وہاں سے فرقہ کا لفظ آیا اور یہاں سے ناجیہ کا لفظ آیا۔ جو کشتی اہل بیت پر سوار ہوا، اس جماعت کو یقیناً فرقہ ناجیہ کہلانے کا حق حاصل ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ کشتی پر بیٹھنے کے کیا معنی ہیں؟ یہاں کوئی جسمانی کشتی تو ہے نہیں، نہ (معاذ اللہ) اس طرح کا بیٹھنا ہے۔ وہ تو مذمت کا پہلو ہے۔ یہ تو کوئی عمل ہے جس کو استعارہ کے طور پر کشتی میں بیٹھنا کہا گیا ہے۔ استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں ایک مشبہ ہوتا ہے۔ جس کو تشبیہ دی اور ایک مشبہ بہ ہوتا ہے جس سے تشبیہ دی اور ایک مشترک چیز ہوتی ہے دونوں میں کہ جو اس میں بھی ہے، اُس میں بھی ہے۔ وہ وجہ شبہ کہلاتی ہے۔ آدمی کو کہہ دیا شیر تو یہ آدمی حقیقت میں شیر تو ہے نہیں شیر کیوں کہا؟ استارہ کے طور پر کہا ہے۔ یعنی شجاعت ایک مشترک چیز ہے۔ جو شیر کی بھی نمایاں چیز ہے اور اس انسان میں بھی نمایاں چیز ہے۔ لہٰذا شیر کہہ دیا۔ تو مشترک جو چیز ہو، وہ وہ ہوتی ہے شبہ۔ تو اب کوئی بات ایسی ہے جو ہمارے کسی عمل اور کشتی پر بیٹھنے میں مشترک ہے۔۔

اب تلاش کرنا ہے۔ کشتی پر بیٹھنے میں کیا خاص بات ہوتی۔ تو کوئی کہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ جاتے ہیں، کشتی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ جہاز ہو، کچھ بھی ہو۔ بہ اختلاف زمانہ جو چیز بھی ہو، اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ یہ عجیب سوال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے اس تجزیہ سے شاید آپ محسوس کریں کہ میرا مطلب کیا ہے۔ کشتی پر بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں جارہی ہے۔ آپ ساحل ہی سے کھڑے کھڑے کہنے لگے کہ کتنی اچھی کشتی ہے! کتنی عمدہ کشتی ہے! اتنی حسین کشتی ہے، کتنی جمیل کشتی ہے! اگر واقعی حسین ہے تو یہ آپ کی تعریف اس لئے صحیح ہے کہ آپ اچھے کو اچھا کہہ رہے ہیں۔ اچھا نہ کہتے تو ظلم ہوتا۔ اس ظلم سے بحمد اللہ بری ہیں۔ اچھے کو اچھا کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہ تعریفیں کرنا کشتی پر بیٹھنا تو نہیں ہے۔ ساحل پر کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہم اس کشتی کو بہت چاہتے ہیں۔ ہمیں اس سے بہت محبت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت نہ ہوتی تو آپ کی تعریف صحیح نہ ہوتی۔ محبت ہونا اس کا تقاضائے حسن ہے، آپ کا کمال نہیں ہے۔ اگر کشتی حسین ہے تو آپ کو محبت ہونی چاہئے۔ یہ محبت بھی بالکل صحیح ہے لیکن ساحل پر کھڑے کھڑے کشتی سے محبت رکھنا بھی کشتی میں بیٹھنا تو نہیں ہے۔

تیسری نازل تر منزل آئی۔ وہ جز تو محفوظ ہے کہ ہم ساحل پر کھڑے ہیں اور کشتی دریا میں ہے۔ اب وہ کشتی باد مخالف کے تھپیڑوں میں پڑی، وہیں ساحل پر کھڑے کھڑے ہم آنسو بہانے لگے کہ افسوس! ایسی حسین کشتی تباہ ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ آنسو قابلقدر ہیں، اس لئے کہ درد دل کی دلیل ہیں۔ یہ مقتضائے انسانیت ہیں۔ مگر ساحل پر کھڑے کھڑے یہ آنسو بھی کشتی پر بیٹھنا نہیں ہیں۔ وہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ کشتی پر بیٹھنے میں کیا ہوتا ہے۔ جو میری سمجھ میں آیا ہے، وہ یہ کہ جب جا کر کشتی پر بیٹھ گئے تو اپنی ذاتی حرکت کچھ نہ رہی اور اپنا ذاتی سکون بھی کچھ نہ رہا۔ کشتی چلے تو ہم چلے، کشتی رُکی تو ہم رُکے۔ یہ معنی ہیں کشتی اہل بیت پر بیٹھنے کے کہ اپنے حرکت و سکون کو تابع اہل بیت بنا دیا۔ اگر اس معنی سے کشتی اہل بیت پر بیٹھنا ہے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کشتی منزل پر پہنچے اور یہ شخص نہ پہنچے،

اگر کہیں اُتر نہیں گیا ہے۔

میں کہتا ہوں نجات تو ایک عام لفظ ہے، نجات سے انسان کو پورا تصور کہاں ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کشتیٔ اہل بیت پر سوار ہیں تو جہاں کشتی پہنچے گی، وہاں ہم پہنچیں گے۔ یہ کہا ہے معصوم نے کہ:

شِيْعَتُنَا فِيْ دَرَجَتِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"ہمارے شیعہ یومِ قیامت ہمارے درجہ میں ہوں گے"۔

اب ظاہر ہے کہ کوئی عظیم آدمی کہیں جاتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سے اس کے تابعین ہوتے ہیں، اس کے ہمراہی کے طور پر۔ تو جس مکان میں اس کا قیام ہوگا، اسی مکان میں ان کا قیام کروایا جائے گا۔ یہ اس کے اعزاز کا تقاضا ہے۔ وہاں جاکر یہ اس کے برابر نہیں ہو جائیں گے۔ جب اس کی بدولت یہ ٹھہرائے جا رہے ہیں تو پھر بھی اصل تو وہی رہے گا۔ ان کا اعزاز تو تابع ہونے کا ہے۔ ان کا متوسل ہونے کا اعزاز ہے۔ شیعہ کے معنی ہی ہیں اتباع کرنے والے۔

تو جناب بس! ایک عام بات کہ پانی پیاس بجھاتا ہے، کاغذ پر پانی کا نقش نہیں۔ روٹی پیٹ بھرتی ہے، روٹی کا نام نہیں۔ اسی طرح بلاشبہ محبتِ اہل بیت نجات کی ضامن ہے۔ مگر محبتِ اہل بیت ہو تو۔ جس کا نام محبت ہے، حقیقت وہ ہے۔ اب دیکھئے کہ ہم محبِ اہل بیت زیادہ یا سلمان فارسی؟ ہم محبِ اہل بیت زیادہ یا ابوذر غفاری۔ ہم محبِ اہل بیت زیادہ یا حبیب ابن مظاہر۔ خدا کی قسم! ہم میدانِ محبت میں ان کے قدموں کی خاک تک بھی تو نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ دیکھئے کہ جتنا محبتِ اہل بیت کا دعویٰ زیادہ تھا، اتنا ہی انہماک عبادتِ الٰہی میں ان کا زیادہ تھا یا نہیں؟ اتنی ہی عبادتِ الٰہی میں ان کی سرگرمی زیادہ تھی یا نہیں؟ یہاں تک کہ وہ عام زندگی تو ایک طرف، نماز بھی جیسی کربلا میں ہوئی ہے، ایسی تاریخ عالم میں کہیں نہیں ہوئی۔

یوں تو ایک عام اصول یہ ہے کہ ذرا پریشانی کا وقت ہو تو آدمی کچھ شرع کی رعایتوں کا فائدہ اٹھائے گا۔ آدمی اوّل وقت نماز پڑھنے کا عادی ہے تو خدانخواستہ اگر کسی مریض کی طبیعت گھر میں خراب ہوئی، ابھی ڈاکٹر آیا ہے، آج اوّل وقت نماز نہیں ہوئی، قضا نہیں ہونے پائی۔ دیر سے ہوئی۔ بعد میں افسوس کیا کہ دیکھو! اتنے برس سے میں اوّل وقت نماز کا پابند تھا لیکن آج اس وقت پڑھ رہا ہوں۔ تو کوئی معترض نہیں ہوگا۔ ہر ایک ہمدردی ہوگا کہ بے شک ہنگامی حالات کا تقاضا یہی تھا۔ کوئی شخص ہے نوافل کا پابند ہے، خدانخواستہ کوئی جنازہ گھر سے نکل رہا ہے، اس دن واجب نماز ہی پر اکتفا ہوگئی۔ بعد میں افسوس کیا کہ دیکھو! آج نوافل نہیں پڑھ سکا۔ کوئی ہرگز معترض نہیں ہوگا۔ ہمدردی محسوس کرے گا۔

مگر امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں یہ مثال قائم کی کہ جتنا وقت سخت ہو، اُتنا عبادتِ الٰہی میں اضافہ کردو، کمی نہ ہونے پائے۔ یوں تو یہ آلِ رسول تھے۔ ہر ایک ان میں سے نمازِ تہجد کا پابند تھا مگر خود پیغمبر خدا کو خالق کی ہدایت یہ ہے کہ پوری رات جاگنے کی ضرورت نہیں:

"قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا"۔

نصف شب یا کم وبیش عبادت کیجئے، باقی آرام کیجئے۔ عموماً آلِ رسول کا بھی یہی عمل تھا۔ لیکن جو زندگی کی آخری رات ہے، اور ابھی اس رات کی مزید قدر بتاؤں کہ وہ رات جو مانگ کر حاصل کی گئی ہے۔ پہلے ہی امام نے اس رات کے مانگنے کا مقصد بتا دیا تھا۔ جب ابوالفضل العباس سے کہا کہ جاؤ، ان سے ایک رات کی مہلت لو۔ طبری کے صفحات پر بھی یہ الفاظ ہیں:

"اَللّٰهُ يَعْلَمُ اِنِّيْ اُحِبُّ الصَّلٰوةَ وَذِكْرَ اٰلِهٖ"۔

"خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی نماز اور عبادت سے مَیں کتنی محبت رکھتا ہوں"۔

یاد رکھئے کہ فطرت محبت ہے کہ اپنا محبوب جس شے سے محبت رکھتا ہو، اُس سے اس کو بھی محبت ہو۔ یہ تو نئی محبت ہماری ہوگی کہ ہم حسین سے محبت کا دعویٰ کریں اور نماز سے ہم کو محبت نہ ہو۔ نماز سے فرار ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ محبت کا بھی دعویٰ ہمارا غلط ہے۔ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اللہ گواہ ہے کہ اس کی نماز اور اس کی عبادت کو میں کتنا دوست رکھتا ہوں۔

اس کے بعد پوری رات یونہی گزری اور یہ خصوصیت ہے اور میرا مستقل موضوع ہے۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں تقریر ہوئی تھی کہ "واقعہ کربلا کی تاریخی اہمیت"۔ اس میں مَیں نے تفصیل سے اس کو کہا ہے۔ اب وقت نہیں ہے۔ واقعہ کربلا کی یہ خصوصیت ہے کہ جو چیز کبھی جزوِ تاریخ نہیں بنتی، اس نے اسے جزوِ تاریخ بنا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک دم کم ۵۷ برس کی عمر میں امام حسین علیہ السلام نے کتنی نمازیں پڑھی ہیں؟ مگر کوئی نماز جزوِ تاریخ نہیں بنی۔ مگر کربلا کی نمازیں جزوِ تاریخ ہیں۔ یعنی حسین نے رزمِ کربلا کو شریعت اسلام کی یادگار بنا دیا کہ جب تک میرا یہ معرکہ یاد ہے، تب تک خدا کی عبادتیں بھی یاد رہیں گی۔

اب یہ ہمارے ذہن کا تضاد ہوگا کہ ہم معرکہ کربلا کو یاد رکھیں اور وہ سجدے ہمیں یاد نہ رہیں، وہ نمازیں یاد نہ رہیں، وہ عبادتیں یاد نہ رہیں۔ تو یہ کچھ عجیب ذہنی تضاد ہوگا۔

اربابِ عزا! یہ پوری رات کس طرح گزاری جا رہی ہے، تاریخ کا جزو، کبھی تاریخ نے یہ صدائیں کیوں نہ سنیں؟ کبھی تاریخ نے یہ منظر کیوں نہ دیکھے اور محسوس نہ کئے؟ یہ کربلا کا صدقہ ہے جو یہ تمام مناظر جزوِ تاریخ بن رہے ہیں۔ طبری کا مؤرخ لکھتا ہے:

"بَاتُوْا بَيْنَ رَاكِعٍ وَقَائِمٍ وَسَاجِدٍ"۔

"پوری جماعت نے یوں رات گزاری کہ کوئی رکوع میں ہے، کوئی قیام میں ہے، کوئی سجدے میں ہے"۔

"لَهُمْ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ"۔

"اس رات کے سناٹے میں ان کی تسبیح وتہلیل ومناجات کی آوازیں یوں گونج رہی ہیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آوازیں آیا کرتی ہیں"۔

کبھی تاریخ نے نہ یہ آوازیں سنیں، نہ تاریخ نے یہ سجدے دیکھے، نہ یہ رکوع دیکھے۔ رکوع کرنے والے بھی یہی تھے، سجدے

کرنے والے بھی یہی تھے۔ کوئی بھی ان کا رکوع و سجود جزو تاریخ نہیں بنا۔ مگر آج کا سجدہ بھی، آج کا رکوع بھی جزو تاریخ بن گیا۔ پوری رات یوں گزاری جا رہی ہے۔ ذرا دلوں کے تقاضے دیکھ لیجئے۔ سب کو معلوم ہے کہ کل روز قربانی ہے تو بہنوں کی تمنا ہوگی کہ بھائی آج زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے پاس گزاریں۔ مائیں جن کے بچے کل تہہ تیغ ہو جائیں گے، ان کی آرزو ہوگی کہ ہمارے بیٹے آج رات بھر ہماری آنکھوں کے سامنے رہیں۔ وہ خواتین جو کل بیوہ ہو جائیں گی، اُن کی تمنا ہوگی کہ آج وارث ہمارے پاس بیٹھ کر بعد کیلئے ہمیں کچھ ہدایات کر جائیں۔

اور اہل دل! وہ بیٹی جو باپ کے سینے پر سونے کی عادی ہوگی، اس کا تو دل چاہ رہا ہوگا کہ آج پوری رات باپ کے سینے پر گزار دے۔ مگر ان تمام تمناؤں کے بالکل برخلاف یہاں پوری جماعت یوں رات گزار رہی ہے کہ رکوع و سجود میں مصروف ہے، نمازوں میں مصروف ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک روایت آپ سنتے رہے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ بے بنیاد ہے، بعض کتابوں میں بھی ہے لیکن میرے دل نے کبھی قبول نہیں کی ہے اور اس کیلئے قرائن بھی ابھی پیش کروں گا۔ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ لیلیٰ رات بھر انتظار میں رہیں کہ میرا علی اکبر آ جائے تو میں جی بھر کر صورت دیکھ لوں۔ مگر وہاں پوری جماعت اس طرح رکوع و سجود میں مصروف ہے تو ممکن کہاں تھا کہ علی اکبر تو سیرت میں بھی نبی کی تصویر ہیں۔ یہ کب ممکن تھا کہ وہ سب مصروف عبادت ہوں اور یہ مصروف خواب ہوں۔ ہرگز میرا دل قبول نہیں کرتا۔

اب اس کا قرینہ میرے پاس موجود ہے کہ جو رات بھر مصروف عبادت رہے ہوں، وہ نماز کو بالکل اوّل وقت میں پڑھیں گے۔ یعنی تہیہ نماز کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ کچھ وقت وضو میں صرف ہوتا ہے، اسباب نماز میں۔ نہیں نہیں، فوراً نماز پڑھیں گے اور آج کی صبح کی نماز میں مولا نے خصوصیت یہ برتی کہ روز کے موذن حجاج بن مسروق اور آپ آج کی نماز صبح کے وقت فرماتے ہیں: بیٹا علی اکبر! آج کیا اذان تم دو۔

دیکھا آپ نے، بیٹا باپ کے پاس موجود ہے۔ فرماتے ہیں: آج صبح کی اذان تم دے دو۔ اس میں نفسیاتی احترام بھی ہو سکتا ہے۔ خدا کی قسم! اسلام دین فطرت ہے۔ یہ اولاد کی محبت کو دل سے نکالنے کیلئے نہیں آیا۔ یہ بھائیوں کے دل سے بھائیوں کی محبت نکالنے کیلئے نہیں آیا ہے۔ حسین کو خبر ہے کہ لیلیٰ کے دل کی تمنائیں کیا ہوں گی۔ رات بھر صورت نہیں دیکھی تو اس وقت آواز ہی اپنے جوان کی سن لیں۔

ماشاء اللہ، اجرکم علی اللہ۔ میں کہتا ہوں ایک بڑی مصلحت ہے امام کی۔ اور وہ کیا ہے؟ امام جانتے ہیں کہ میرا علی اکبر بھولنے کی چیز نہیں ہے۔ دنیا علی اکبر کو یاد رکھے گی۔ امام عالم نفسیات بھی ہیں۔ جانتے ہیں کہ تمام نمازوں سے زیادہ امتحانی نماز صبح کی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ جو نمازوں کے عادی بھی ہیں، وہ اکثر صبح کی نماز، نماز ظہر کے ساتھ قضا پڑھتے ہیں۔ شرع کی رعایتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تو جناب والا! حسین نے صبح کی نماز کی اذان علی اکبر سے دلوائی ہے۔ دنیا میں جوانی کی نیند مشہور ہے۔ مولا کا یہ مقصد ہے کہ

اگر کسی نوجوان کی بستر پر آنکھ اس وقت کھل جائے اور اُسے تصور ہو جائے کہ میرا شہزادہ اس وقت کہہ رہا ہے حیّ علی الصّلوٰۃ" تو دیکھنا ہے کہ علی اکبر کی آواز پر کون کون آتا ہے! (ہاں جناب! یہ صبح کی نماز ہے) جس کی تعقیبات میں کربلا کا جہاد ہے۔

ادھر صفِ نماز منتشر ہوئی، اُدھر صفِ جہاد مرتب ہوگئی اور اب راہِ خدا میں جدال و قتال ہے۔ راہِ خدا میں قربانیاں پیش ہو رہی ہیں۔ اس عالم میں ظہر کی نماز کا وقت آتا ہے اور ظہر کی نماز کے وقت ابو ثمامہ ساعدی حاضر ہوتے ہیں، کوئی عزیز نہیں آیا ہے، ایک صحابی ہیں۔ محبتِ اہلبیت کے ایک دعویدار ہیں۔ وہ آئے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ، یہ ہے کہ جہاد ہو رہا ہے اور نگاہ آفتاب پر ہے۔ کوشش یہ ہے کہ مولا حکم نہ دینے پائیں کہ ہم اپنے ذوقِ عبادت کا نذرانہ پیش کر دیں۔ عرض کرتے ہیں: مولا! دشمن بہت قریب آگئے ہیں اور تمنا یہ ہے کہ یہ نماز آپ کے ساتھ باجماعت ادا ہو جائے۔ امام فرماتے ہیں:

ذَكَرْتَ الصَّلٰوةَ جَعَلَكَ اللّٰهُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۔

"تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا، اللہ تعالیٰ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے"۔

یہ اوّل وقت نماز ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پہلے تو وقت آیا ہی نہیں تھا۔ ادھر وقت آیا اور ادھر انہوں نے درخواست پیش کر دی۔ مولا نے فرمایا کہ یہ اوّل وقت نماز ہے۔ مولا دعائیں دے رہے ہیں کہ تم نے نماز کو خود سے یاد کیا، اللہ تعالیٰ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے۔

57

حقوق اللہ اور حقوق العباد

یہ آنکھ اور دل میں تصور کس نے قائم کیا ہے؟ کیا بات ہے کہ رنج ہوتا ہے تو ہاتھ نہیں پسیجتے، پیر میں کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، یہ آنکھ ہی سے آنسو کیوں نکلتے ہیں؟

ہر عبادت میں کسی ایک جذبہ نفس سے مقابلہ ہوتا ہے۔ روزے میں بہت سی نفسیاتی خواہشات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔

یہ نیت جو ہے، در حقیقت بہ تقاضائے ایمان ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھے گا، وہی قربۃً الی اللہ کی نیت کرے گا۔

جیسی نماز کربلا میں پڑھی گئی۔ ویسی نماز تاریخ عالم میں کبھی نہیں پڑھی گئی۔ اس کے بعد حقوق الناس، جس شہید نے بھی پکارا اور مولاؑ اس کی لاش پر ضرور گئے۔

مولاؑ کے دل پر داغ تھا کہ اسلام اور مسلمانوں میں دفن کرنا سب سے اہم بات ہے مگر میں اپنے ساتھیوں کے لاشے دفن نہیں کر سکا۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿٢﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾

"قسم ہے عصر خاص کی کہ یقیناً انسان خسارے میں ہے سوا اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دیں"۔

"اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے متعلق کل عرض کیا، ابھی دو چیزیں باقی "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ. وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چاروں جزو در حقیقت دست و گریباں ہیں۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا باہمی تعلق اصولِ دین اور فروعِ دین کی تشریح کے ماتحت بیان ہو چکا۔ اب یہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"، اِن دونوں کا باہمی تعلق قبل کی دو صفات کے ساتھ کیا ہے۔ اسلام کسی فیض، کسی نعمت، کسی عطائے پروردگار کیلئے یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ ایک ذات میں محدود رہے بلکہ اس فیض کو دوسروں تک پہنچنا چاہئے۔ یہ خود غرضی کہ ہم راہِ ہدایت پر ہیں تو اب ہمیں دوسروں سے کیا مطلب؟ ہم نیکوکار ہیں تو بس اب ہمیں کیا غرض کہ کون کیا کر رہا ہے؟ دینی حیثیت سے یہ خود غرضی روا نہیں ہے۔ تو وہاں جو دو وصف تھے، یعنی "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"، تو ایمان کے کیا معنی؟ دینِ حق پر قائم و برقرار رہنا۔ یہ صفت جب متعدی ہوئی غیر تک، یعنی بحمد اللہ ہم جب حق پر ہیں تو ہم نے بھی یہ کوشش کی کہ دوسرے بھی دینِ حق سے متعارف ہو جائیں۔ تو یہ "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" ہوا اور "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"، یہ گویا اپنے کو کردار کے ایک زیور سے آراستہ کرنا تھا۔ ہم نمازی ہیں، ہم روزہ دار ہیں۔ فرض کیجئے ہم راست باز ہیں، ہم امانت دار ہیں۔ سب صفات اپنے میں اختیار کر لیں تو ان سب کا مجموعہ تو ہوا "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"، اب اس عمل صالح کے وصف کو غیر کی طرف متعدی ہونا چاہئے۔ دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو وہ در حقیقت "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" ہے۔

اس کو معنی و بیان میں کہتے ہیں کہ ایک لف و نشر مرتب ہے۔ لف و نشر مرتب یہ ہوتا ہے کہ دو چیزیں ایک ساتھ بیان ہو گئیں اور پھر دونوں سے متعلق جو بات ہے، وہ اسی ترتیب سے پھر بیان ہوئی۔ مثلاً اس عالم کو کیا پوچھتے ہو، بادل تھا اور پانی شدت سے گرج رہا تھا اور شدت سے برس رہا تھا۔ تو وہاں بادل اور پانی دو چیزیں ایک ساتھ کہی تھیں۔ اب اسی ترتیب سے گرج رہا تھا، برس رہا تھا۔ ایک بادل سے متعلق، دوسرا پانی سے متعلق۔ جس ترتیب سے پہلے دو چیزیں تھیں، اسی ترتیب سے بعد میں دو چیزیں، جن میں سے پہلی چیز کا پہلے جملے کی پہلی چیز سے تعلق اور دوسری چیز کا پہلے جملے کی دوسری چیز سے تعلق۔ اسی طرح وہاں پہلے "اٰمَنُوْا" تھا۔ اس کے بعد "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" تھا۔ اسی ترتیب سے "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"۔ "اٰمَنُوْا" کا فیض جاری ہوا اور "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" صالحات

کاعمل متعدی ہوا۔

اب کوئی کہے کہ یہ صبر کے معنی جو ہم جانتے ہیں، وہ تو یہ ہیں کہ ایک مصیبت پڑی اور بس مصیبت کو برداشت کیا، اس کا نام صبر ہے۔ تو وہ پورے "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے مقابل میں کیونکر یہ "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" آ گیا؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ باوجودیکہ اتنا کثیر الاستعمال ہے کہ ہمیں اُردو زبان کا لفظ معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ غیر بھی جو اُردو بولتے ہیں، وہ بھی چاہے لفظ غلط کہیں "صَبُرْ" کہیں لیکن صبر وہ بھی کہتے ہیں۔ تو لفظ تو اتنا عام ہے مگر اس کے معنی میں دیکھتا ہوں کہ خوابِ پریشاں کی طرح مختلف ذہنوں میں الگ الگ ہیں۔ لفظ اتنا قریب اور معنی اتنی دور۔

چنانچہ اب جو مجھے معلوم ہے، ایک طبقہ ترقی یافتہ، ماشاء اللہ اس دَور کا ہے، وہ کہتا ہے کہ صبر بزدلی کی تعلیم ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے صبر کے معنی یہ سمجھ لئے ہیں کہ ہر حربے کے سامنے، ہر تشدد کے سامنے سر جھکا دو۔ جو بھی تمہارے ساتھ ہو چکا ہو، چپکے سے برداشت کرلو۔ یہ معنی چونکہ صبر کے انہوں نے سمجھے ہیں، لہٰذا وہ یہ کہتے ہیں کہ طاقتوروں نے پیشوایانِ دین کو آلۂ کار بنا کر صبر کی تلقین کروائی ہے تاکہ کمزوروں میں قوتِ مدافعت نہ پیدا ہو۔ تو جیسے مذہب کو ایک ملک میں کہا جاتا ہے کہ افیون ہے۔ ایسے اب کہا جاتا ہے کہ صبر بھی بے حس بنانے کیلئے ایک افیون ہے تاکہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے سامنے سر جھکا دیا جائے کہ ہم تو صابر ہیں۔

تو یہ ایک معنی صبر کے ہیں جو ترقی یافتہ ذہنوں میں ہیں۔ ایک معنی صبر کے بڑے مذہبی حلقہ میں ہیں کہ صبر یہ ہے کہ بس آنکھ سے آنسو نہ نکلیں۔ ادھر آنکھ سے آنسو نکلا اور انہوں نے کہا کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہو! صبر کرنا چاہئے۔ تو ان کے نزدیک صبر کا معیار یہ ہے کہ بس آنکھ سے آنسو نہ نکلے۔ پتھر بنے کھڑے رہو۔ اس کے علاوہ ایک اور معنی بھی صبر کے مراد لئے جاتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ مصیبت کا احساس ہی نہ ہوا، مصیبت کا اثر ہی نہ ہو۔ افسردگی بھی نہ ہو تو کیا کہنا، گویا ایسا شخص سب سے زیادہ صابر ہو۔ یہ بھی صبر کا ایک مفہوم ہے۔ معلوم ہوا کہ لفظ صبر زبان پر ہے لیکن صبر کے معنی ذہن میں نہیں ہیں۔

تو مجھے ابھی آگے ایک بہت وسیع بیان کرنا ہے، لہٰذا اس چیز کو بہت بسیط طور پر پیش نہیں کر سکتا۔ بس مختصر جائزہ پیش کر دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ صبر کا لفظ آپ کو یاد کہاں سے ہوا ہے؟ سب سے پہلے آپ نے یہ لفظ قرآن میں سنا، پھر تشریح کرنے والوں کی زبان سے یہ لفظ آپ کو معلوم ہوا۔ ورنہ یہ صبر کا لفظ آپ کو بولنا ہی نہ آتا۔ قرآن کی بدولت یہ صبر کا لفظ دنیا تک پہنچا ہے۔ تو جو قرآن نے صبر کی تشریح کی ہو، کسی کو حق نہیں کہ اس کو بدلے۔ نہ بیگانے کو نہ یگانے کو، نہ دور والے کو، نہ قریب والے کو، نہ روشنی والے کو، نہ تاریکی والے کو۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ قرآن کے خلاف صبر کے لفظ کی تشریح کرے۔

تو اب قرآن مجید میں جہاں جہاں صبر کا اطلاق ہے، اس میں ایک جگہ نہیں، بہت جگہ۔ میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہے تو وہ کیا ہے کہ نیزہ آتا ہو تو سینہ بڑھا دو؟ تلوار آتی ہو تو سر جھکا دو؟ کیا وہاں صبر کے یہ معنی ہیں؟ میدانِ جنگ میں صبر کے کیا معنی؟ اگر صبر کے یہ معنی ہوتے کہ عاجزی سے سر جھکا دو تو پھر جنگ کا تصور ہی کہاں ہوتا اور میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہی آخر کیوں ہوتا؟ اب صبر کا مطالبہ جو قرآن مجید کر رہا ہے، وہ کیا ہے؟

"اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ"۔

"اگر تم ۲۰ صبر کرنے والے ہو تو ۲۰۰ پر غالب آؤ"۔

"وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ"۔

"اگر تم سو (۱۰۰) صبر کرنے والے ہو تو

"يَغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا"۔

تو ایک ہزار پر غالب آؤ۔

قرآن کے سادہ لفظوں میں بڑے بڑے فلسفے مضمر ہیں۔

"ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ"۔

بات یہ ہے کہ تعداد میں دس گنا سہی لیکن ان کو ایمانی شعور نہیں ہے۔ لہٰذا تمہاری تعدادی کمزوری کا توازن تمہاری قوت ایمانی کے ساتھ قائم ہونا چاہئے۔ اب جناب دیکھئے! ۲۰ صبر کرنے والے ہوں، وہاں بھی صبر کی قید اور سو صبر کرنے والے ہوں تو یہاں بھی صبر کی قید۔ تو اب وہ ترقی پسند دنیا دیکھے کہ صبر وہ چیز ہے جو دس گنا مقابلہ کی دعوت دیتا ہے تو یہ بزدلی کی تعلیم کب ہوئی؟ اب چونکہ یہ آیت میں نے پڑھ دی، بلا فاصلہ اس کے بعد دوسری آیت ہے۔ ہم تو جتنا بھی زیادہ حفظ ہو، اتنی ہی تیزی سے ایک آیت کے بعد دوسری آیت پڑھ دیں گے مگر اب مضمونِ آیت دیکھئے کہ پہلی آیت نازل ہونے کے بعد کوئی سخت معرکہ ہوا جس میں مسلمان اس معیار پر پورے نہیں اُترے؟ یہ کوئی روایت نہیں ہے، یہ قرآن کی آیت ہے۔ اسی لئے میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کونسا معرکہ تھا۔ بہر حال مضمونِ آیت سے ظاہر ہے۔ میں وہ آیت ابھی پڑھوں گا۔ بیچ میں ایک معرکہ ہوا اور مسلمان اس معرکہ میں اس معیارِ قرآنی پر پورے نہیں اُترے۔

"اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ"۔

"اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے"۔

یعنی اس فریضہ کو ہلکا کرتا ہے۔

"عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا"۔

اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے، بس پتہ چل گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ تم کون؟ وہی معزز طبقہ جو مخاطب ہے۔ اب کمزوری کیا مادی کمزوری؟ وہ تو پہلے ہی ثابت تھا کہ مقابل کے دس گنا ہونے کی وجہ سے کمزور تھے۔ اب یہ کمزوری وہی ایمان والی کمزوری ہے۔ پھر کہئے کہ پہلا حکم کیوں آیا تھا؟ اس وقت کیا اللہ نہیں جانتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنی قوت ایمانی کا زعم زیادہ تھا۔ تو اس لئے خود پتہ چلانے کیلئے نہیں، ان کو پتہ بتانے کیلئے۔ پہلے وہ حکم آیا اور اب ارشاد ہو رہا ہے کہ دیکھو! پتہ چل گیا تم میں کمزوری ہے۔

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ۔

اب اس کے بعد:

إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوْنَ۔

اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں۔

إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ۔

اب دیکھئے اس معیار سے آٹھ درجہ قدم پیچھے ہٹایا گیا ہے کہ "ان یکن منکم الف"، اگر تم میں ہزار ہوں تو بس:

يَغْلِبُوْا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔

تو دو ہزار پر غالب آئیں۔ یعنی کم از دوگنا مقابلہ سے تو نہ گھبراؤ یعنی کچھ تو کفر و ایمان میں فرق ہو۔ پھر آخر میں:

وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔

"اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

یعنی تم صبر کرو گے تو اللہ کی مدد بھی شامل حال ہوگی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ صبر وہ چیز ہے جو مثالی مقابلہ تو دس گنا کے ساتھ کرتا ہے اور کم از کم دوگنا مقابلہ کی دعوت تو ضرور ہے کہ گھبراؤ نہیں، اگر مخالف فریق دوگنا ہے کیونکہ وہ اس بصیرت ایمانی سے محروم ہے جس کے تم دعویدار ہو۔ اب اگر تم اس سے بھی گھبرائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے اندر بصیرت ایمانی کسی درجہ پر ہے ہی نہیں۔ اب جو کچھ بھی ہے، وہ بقلم خود ہے۔ تو کیا اب وہ تصور صحیح رہا کہ صبر بزدلی کی تعلیم ہے۔

اب آیئے اس پر کہ احساسِ غم ہی نہ ہو۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ احساس شعور کا نتیجہ ہے۔ انسان کی کوئی صفت مدح وہ نہیں ہو سکتی جو شعور و علم سے ٹکرائے۔ آجکل ڈاکٹروں نے ایسی دوائیں ایجاد کر لی ہیں کہ وہ دوا لگا دی تو وہ حصہ بے حس ہو گیا۔ اب جو نشتر لگایا تو خبر ہی نہیں ہوئی۔ اب جس کے وہ دوا لگا دی اور اس کے نشتر لگا گیا تو خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس نے اُف نہ کی۔ تو یہ اُف نہ کرنا کونسا کارنامہ ہے؟ یہ تو دوا کا اثر ہے۔ اسی طرح اگر دل و دماغ ایسے ماؤف ہوئے کہ احساسِ رنج ہی نہ ہوا تو یہ کونسی قابل تعریف صفت ہوئی۔ یہ تو ایک کیفیت مزاج ہے کہ اثرِ غم ہوتا ہی نہیں۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں ہوگا بلکہ میں کہتا ہوں کہ جتنا ادراک قوی ہوگا، اُتنا ہی اثر مصیبت زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی احساسِ اذیت و الم زیادہ ہوگا۔ لہٰذا یہ کونسا کارنامہ ہوا؟

اب تیسری بات کہ آنسو نہ نکلیں۔ اب یہ تو بحمد اللہ بالکل پکے مسلمان ہیں۔ وہ ترقی یافتہ تو دعویدار اسلام تھے، یہ تو ذمہ دار اسلام ہیں۔ یہ تو اسلام کے ٹھیکیدار ہیں۔ تو صاحب! ان کی بات کو تو قرآن کے معیار پر جانچنا ہی ہے۔ تو جناب! آپ یہ کہتے ہیں کہ صبر یہ ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلیں۔ تو جناب وہ جو میدانِ جنگ میں صبر کا مطالبہ ہے، اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ روؤ نہیں، چاہے ہنستے ہوئے میدان سے نکل جاؤ؟ ایک بات اور کہہ دوں۔ یہ تو میں نے قرآن مجید کے معیار پر اس تصور کو جانچا ہے۔ اب کوئی ترقی یافتہ بھی اس تصور کو اختیار

کے کہ ہاں! آنسو نکلنا تو بالکل خلاف صبر ہے تو میں یہ کہوں گا کہ یہ آنکھ اور دل میں تصور کس نے قائم کیا ہے؟ کیا بات ہے کہ رنج ہوتا ہے تو ہاتھوں میں تو پسینہ نہیں آتا، پیر میں تو کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، یہ آنکھ ہی سے آنسو کیوں نکلتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ جو آنکھ اور دل کا خالق ہے، اُس نے کوئی باہمی ربط قائم کیا ہے کہ جب دل کو صدمہ پہنچے گا تو آنکھ سے آنسو نکلیں گے۔

تو بس ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں گا کہ اگر دل اور آنکھ دونوں بالکل مزاج معتدل پر ہیں تو اس کیفیت کا پیدا ہونا دین فطرت میں جرم نہیں ہوسکتا۔ مگر اب مجھ سے ہر ایک کو مطالبہ کا حق ہے کہ پھر آخر صبر کیا ہے؟ وہ صبر غلط ترقی یافتہ ذہنوں والا۔ یہ تصور صبر کا غلط پرانی درسگاہوں والا۔ تو پھر آخر صبر کیا ہے؟

تو صاحب! جب ہم دیکھتے ہیں تو پہلے اس کی جامعیت کو عرض کروں کہ یہی صبر ہے کہ بتقاضائے الٰہی جو مصائب آتے ہیں، اس میں اس کا مطالبہ ہے۔ مثلاً کسی کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، کسی کا بھائی جدا ہو گیا، کسی کو اولاد کا داغ لگا۔ وہاں بھی کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ تو وہاں کیا معنی ہیں؟ پھر یہ کہ حق کی راہ میں خود اختیاری طور پر جو مصائب آئیں، خود اختیاری یوں ہے کہ جو راستہ حق کا چھوڑ دے تو سب مصیبتیں ختم ہو جائیں۔ تو ان مصائب کو بھنا پڑے گا کہ خود اختیاری ہیں۔ تو اگر وہ معنی ہیں کہ روؤ نہیں تو وہ بھی نہیں بنتے۔ اگر وہ معنی ہیں کہ چپکے سے سر جھکاؤ تو وہ بھی نہیں بنتے۔ تو پھر آخر کیوں؟ کون سے معنی ہیں؟ تو اب یوں سمجھیں کہ صبر کے بہت سے معنی ہیں۔ ایک معنی سے وہ صبر ہے، ایک معنی سے یہ صبر ہے۔

یاد رکھئے کہ یہ کئی معنی بس مجبوری کی صورت میں مانے جاتے ہیں جبکہ کوئی ربط باہم نہ ہو۔ جیسے عین آنکھ بھی ہے اور عین آفتاب بھی ہے اور چشمہ بھی ہے عربی میں۔ تو ان میں کوئی مشترک چیز ہمیں نظر نہیں آئی کہ وہ آنکھ پر بھی صادق ہو، چشمے پر بھی صادق ہو۔ مجبوراً یوں کہہ دیتے ہیں کہ یہ لفظ سب میں مشترک ہے۔ اس کے سب معنی ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں کہ عین کے چالیس معنی ہیں۔ تو اس کے اتنے کثیر معنی ہیں۔ سب الگ الگ ہیں۔ تو اب اگر واقعی یہاں کوئی مشترک مفہوم سمجھ میں نہ آئے تو مجبوراً یہی کہیں گے جو آپ بتا رہے ہیں کہ الگ الگ معنی ہیں۔ اس صبر کے کچھ اور معنی ہیں جو مصائب آسمانی، قضائے الٰہی کے نتیجہ میں ہوتا ہے اور اس صبر کے معنی اور ہیں جو میدان جنگ میں ہوتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں جو ہے، وہ یہ ہے کہ صبر کے ایک معنی ہیں اور وہی ہر جگہ منطبق ہیں۔ وہ معنی صبر کے یہ ہیں کہ کوئی شدت وقت، کوئی مصائب کی آندھی، کوئی سخت سے سخت صورت حال تم کو اس فریضہ کے جادہ سے نہ ہٹائے جس پر تم کو قائم رہنا چاہئے۔

یہ میدان جنگ ہی میں ثبات قدم نہیں ہے تا کہ مصائب آسمانی میں کوئی کہے کہ وہاں تو میدان جنگ ہے ہی نہیں اور میدان جنگ کے ثبات قدم میں کوئی کہے کہ جنگ کا موقع نہیں۔ جی نہیں! میدان جنگ ہی میں ثبات قدم نہیں ہے، ثبات قدم ہے جادۂ فرائض پر۔ جادۂ فرائض علماء کی زبان ہے۔ عام الفاظ میں کہنا چاہئے، جو کرنا چاہئے، ہر صورت حال میں وہی کرے۔ کوئی سخت سے سخت موقع بھی اس راہ سے نہ ہٹائے جو صحیح ہو۔ یہ صبر کے معنی ہیں۔ اب ہر جگہ فرض کیا ہے، وہ فرض بتانے والوں سے پوچھئے جو اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ وہ فرائض بتائیں۔ اب ذرا صبر کی تھوڑی سی اور تشریح کر دوں۔ ہمارے لکھنؤ میں ایک سڑک کا نام ہے ٹھنڈی سڑک اور ایسے ہی

یہاں بھی سڑکیں ہوں گی کہ لوگ صبح کی ہوا خوری کیلئے وہاں جاتے ہوں گے تفریح ہوتی ہوگی۔ لیکن جس دن سے اس سڑک پر جانے میں کوئی کام سپرد ہو جائے گا تو اب اس سڑک پر جانا فریضہ ہو گیا۔

فرض کیجئے کہ والد صاحب نے حکماً کہہ دیا کہ دیکھو! تم کو اس سڑک پر روز جانا ہوگا یا کسی اور نے جس کے ہاں ملازم ہیں، اُس نے کہہ دیا یا اتفاق سے اس طرف کوئی دفتر کا کام ہوا، ڈیوٹی ہوگئی۔ تو بس جس دن سے پابندی عائد ہو جائے گی، اُس دن سے تفریح ختم ہو جائے گی اور ناگواری ہو جائے گی۔ حالانکہ وہی سڑک ہے، وہی ہوا ہے مگر احساسِ پابندی خود ناگواری کا پیمانہ ہے۔ اسی وجہ سے احکامِ شریعہ کو تکلیفات کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ اس کا مکلف نہیں ہے۔ تکلیف شرعی عائد نہیں ہے۔ یہ تکلیف شرعی اسی لئے ہے کہ پابندی کلفتِ طبع کا باعث ہوتی ہے۔ وہ خود ناگواری طبع کا سبب ہوتی ہے۔ تو اب اگر انسان نے اس پابندی کو قبول کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ناگوار بات کو اس نے حکم کے دباؤ سے برداشت کیا تو وہ ہوا "صَبْرٌ عَلَى الْمَكْرُوْه"۔

دوسری طرف جس چیز سے منع کر دیا جائے، اسی کو دل چاہنے لگتا ہے۔ کوئی غذا آپ کبھی نہ نوش فرماتے ہوں مگر جس دن سے حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب منع کر دیں، اسی دن سے اس کو دل چاہنے لگے گا۔ اس کیلئے مقولہ بھی ہو گیا ہے:

اَلْاِنْسَانُ حَرِيْصٌ عَلٰى مَا مُنِعَ۔

"انسان کو جس شے سے منع کیا جائے، اُس کا لالچ ہو جاتا ہے"۔

تو محرمات جتنے ہیں یعنی جو چیزیں حرام ہیں، ان میں چونکہ ممانعت ہے، لہٰذا ممانعت کے سبب کی وجہ سے وہی چیزیں مرغوبِ طبع ہو جاتی ہیں۔ اب انہی کی خواہش ہوتی ہے، اس لئے کہ ممانعت ہے۔ اب اگر انسان نے فرمانِ حاکم کے احترام میں اس ممانعت کو برداشت کیا اور دل کی خواہش کے مطابق عمل نہ کیا تو یہ صَبْرٌ عَنِ الْمَحْبُوْبِ ہے، پسندِ طبع چیز سے صبر، تو دنیائے شریعت پوری صبر میں داخل ہے۔

اب اس کے بعد خصوصی حیثیت سے کچھ ناگواریاں ہوتی ہیں، اس لئے اب ایک دوسرا وسیع لفظ استعمال کروں۔ پوری شریعت قربانیوں کا مطالبہ ہے۔ میدانِ جنگ ہی میں قربانی نہیں ہے۔ یہ نماز کے احکام کیا ہیں؟ کیا اللہ کو اس کی ضرورت ہے کہ آپ اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جایئے تو اس کے جاہ و جلال میں کچھ اضافہ ہو جائے گا؟ نہیں، یہ دیکھنا ہے کہ تم اپنے مشاغلِ حیات میں سے کتنا حصہ ہمارے لئے قربان کر سکتے ہو۔ اب اوقات کی پابندی سے دیکھئے کہ کتنا صبر آزما امتحان ہو گیا۔ مشاہدہ ہوگا آپ کا کہ بہت سے لوگ رمضان کے روزے کے پابند ہیں اور روز کی نماز کے پابند نہیں ہیں بلکہ روزوں کی بدولت پھر نماز کیلئے بھی ماہِ رمضان میں پابند ہو جاتے ہیں۔ تو کیا پتہ چلا؟ پتہ یہ چلا کہ وہ سال میں ایک مہینے کی بات ہے، لہٰذا وہ اتنی ناگوار نہیں ہے لیکن یہ روز کی پانچ وقت کی بات ہے تو بہت ناگوار ہے۔

وہ چاہے جتنے منٹ میں نماز ہو جاتی ہو، مگر وہ چند لمحوں کو صرف کرنا اس پابندیٔ وقت کے ساتھ، یہ انسان کی طبیعت پر ناگوار ہوتا ہے۔ اسی لئے بہت سے اس سے زیادہ سخت احکام بجا لے آئیں گے کہ جناب شب قدر کی مستحب نمازیں پڑھ لیں گے اور روز کی

واجب نمازیں نہیں پڑھیں گے کیونکہ وہ سال بھر میں ایک دفعہ کی بات ہے اور یہ ہر روز کی بات ہے۔

اب اس میں بعض وقت صبر آزما منزل بھی آجاتی ہے کہ کوئی دور سے بچھڑے ہوئے عزیز آئے ہیں، اب وہ زمانہ سفر کی روداد سنا رہے ہیں اور نماز کا وقت جا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عزیز کی محبت زیادہ ہے یا اللہ کا حکم زیادہ ہے۔ اور جناب! اس کے بعد صبح کی نماز، وہ خواب استراحت اور اب میری عمر کا تقاضا نہیں، مقامِ منبر کا تقاضا بھی نہیں، اور بھی جو جاذب نظر چیزیں ہوتی ہیں، ان سب کو پیش کروں۔ ان سب کے باوجود اگر بندۂ خدا نے احساسِ وقتِ نماز رکھا اور صبح کی نماز کیلئے اٹھ کھڑا ہوا تو بلاشبہ صبر کا مصداق ہونے میں شبہ ہی کیا ہے۔ اس نے ان تمام چیزوں کو ٹھکرا دیا اور میدانِ عمل میں آگیا۔ پھر خالق نے آپ کی فطرت کے احساس سے گویا تھوڑے سے احترام کی خاطر فریضہ صبح کی رکعات سب سے کم رکھی ہیں۔ ارے ابھی تو نیند سے بیدار ہوئے ہو تو چلو دو رکعت ہی پڑھ لو۔ یعنی بستر سے اٹھ کر بارگاہِ الٰہی میں ایک سلام کرلو تاکہ پتہ چل جائے کہ تم باغی حکومت نہیں ہو۔

یہ بھی دینِ فطرت ہے کہ واقعی اگر تمہاری آنکھ نہیں کھلی تو سوتے رہنے کی وجہ سے قضا کا گناہ نہیں ہوگا۔ اس پر نامہ عمل میں کوئی گناہ نہیں لکھا جائے گا۔ قضا پڑھ لینا لیکن اب خواب راحت کے عادی دیکھیں کہ ایسا تو نہیں ہوتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت دفعہ بہت سوں کے ساتھ ہوتا ہوگا کہ جناب! آنکھ کھلی مگر اٹھا نہیں جاتا۔

تو اب عمداً ترک نماز کا گناہ نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ دنیا سمجھ رہی ہے کہ سو رہے ہیں مگر یہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس دوران وقت میں آنکھ کھلی تھی یا نہیں۔ اسی لئے اس نے حساب اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ہم تو گواہی دے دیں گے کہ یہ سوتا ہوا ہوتا تھا تو اس کی نماز رہ جاتی تھی۔ ورنہ یہ نماز کا پابند تھا۔ ہم نماز کے پابند ہونے کی گواہی دے دیں گے مگر جو جانتا ہے کہ یہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے، اس کا علم کسی دوسرے دیکھنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ دوسرا تو بس لیٹنا دیکھ سکتا ہے، سونا اور جاگنا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ آدمی خود دیکھ سکتا ہے یا وہ دیکھ سکتا ہے جو سوتا ہی نہیں۔ اس میں دوسرے لوگوں کو معتبر نہیں ماننا پڑے گا کہ وہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ اب اگر کسی نے خود کہا ہو کہ میں جیسی میٹھی نیند اس رات کو سویا، کبھی نہیں سویا تو دنیا کو گواہ طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ گواہی وہیں ہوتی ہے جہاں دوسرے دیکھنے والے ہوں۔ جہاں آدمی خود ہی واقف ہو، وہاں گواہ باہر سے کہاں آئیں گے؟ اسی لئے اس بات کو جسے گھر والے ہی دیکھ سکتے ہوں، اس کے بارے میں گھر والوں ہی کی گواہی قبول کرنا ہوگی۔ اب ایک باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دیتا ہے تو باہر والے کہاں سے آئیں گے دیکھنے کو۔ گھر والے ہی گواہ ہوں گے۔

تو اب پوری دنیائے شریعت صبر میں داخل ہے۔ اسی لئے ایک عبادت ایسی کہ جس میں بہت سی خواہشوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ روزہ ہے۔ ہر عبادت میں ایک نفسی جذبہ سے مقابلہ ہوتا ہے۔ روزے میں بہت سے نفسیاتی خواہشات سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ پانی جیسی ضرورت اور پرکشش چیز سے ایک معینہ وقت تک احتراز کرنا پڑتا ہے۔ یہ پینا اتنا پرکشش ہے کہ ایک نامعقول مشروب کو بعض افراد کا دل نہ بھی چاہتا ہو تو چاہنے لگتا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود بحمد اللہ اس اتنے بڑے مجمع میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کا دل چاہا ہو، یہاں تک کہ وہ شاعر صاحب بھی جنہوں نے تقلیدِ شاعری کے طور پر خود بھی تعریفیں کی ہوں، ان کا بھی دل نہ چاہا ہوگا۔

درحقیقت اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں کیلئے دعائے خیر کرنی چاہئے کہ ہمیں ماحول ایسا ملا کہ ہم ایک گناہ کے خوگر نہیں ہوئے۔ اس لئے کبھی دل نہیں چاہا۔ کسی شاعر نے ہم پر طنز بھی کی تھی۔ "تو نے پی ہی نہیں"۔ اس کا طنز اس کے نزدیک چاہے کتنا ہی چبھتا ہوا ہو مگر ہم نے کہا: "الحمدللہ"۔ ہم کو اس پر خوشی ہوئی کہ اس نے ہم کو یہ سند عطا کی۔

تو صاحب! بہر حال ہمارے لئے یہ نہ پینا کوئی بڑا جہاد ہی نہیں، اس لئے کہ جب ہمارا دل ہی نہیں چاہا تو کوئی بڑا جہاد ہم نے نہیں کیا جو ادھر ہم نہیں گئے۔ ہم کو تو اس کی بو سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس سڑک سے گزرے ہیں تو ہمیں ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ مگر اب میں کہتا ہوں کہ ماشاءاللہ مجمع میں سب روزہ دار ہوں گے مگر روزہ دار پر کون طنز کر سکتا ہے۔ پانی کے بارے میں کون کہے کہ تو نے پیا ہی نہیں۔ یہ ہے روزہ میں عظیم امتحان کہ جن چیزوں کے ذائقہ سے واقف ہے، حکمِ الٰہی کے دباؤ سے ان سے باز رہتا ہے۔ اسی لئے صوم کا ایک نام صبر ہو گیا۔ قرآن کی جو آیت ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

"مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے"۔

تو بظاہر ربط نظر نہیں آتا کہ صبر اور صلوٰۃ میں باہمی ربط کیا ہے۔ تو علماء نے کہا کہ یہاں صبر کے معنی صوم کے ہیں۔ تو بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ اس میں ناگواری ہوتی ہے۔ تو اگر حکمِ الٰہی کے ماتحت منہیات سے پرہیز رکھا اور واجبات کی پابندی کی تو پوری زندگی صبر ہو جائے گی۔ پوری زندگی معیارِ صبر پر پوری اُترے گی۔ اب پھر وہ بات آگئی کہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"، وہی بات جب متعدی ہوئی تو "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" ہوگئی کہ خود تو ہے ہی پابند، دوسروں کو بھی پابندی کی دعوت دیتا ہے۔ اب یہ الگ سے سمجھنے کی بات ہے کہ کس جگہ معیارِ صبر کیا ہے! ہو سکتا ہے کہ ہمارے رہنمایانِ دین جو تھے، ان کی زندگی میں بھی بظاہر نمونہ الگ الگ نظر آئے لیکن درحقیقت وہ ان کا صبر ہوگا۔ یہ ان کا صبر ہوگا۔ ایک حسن مجتبیٰ کا صبر ہوگا اور دوسرا حسین مظلوم کا صبر ہوگا۔ کردار دونوں کا ایک ہے۔ وہ بھی صابرین میں ہیں، یہ بھی صابرین میں سے ہیں۔

یہ چار وصف ہیں۔ ہمارے جتنے رہنمایانِ دین ہیں، ان میں سے سب میں ہر ایک وصف اپنے کمال پر ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ مثال میں پیش کرنے کیلئے کوئی نمایاں تاریخی واقعہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا میں عام رہنمایانِ دین کی زندگی کو سامنے رکھ کر ان اوصاف کا عملی مرقع پیش کروں تو مجھے شاید "اٰمَنُوْا" کی مثالِ عمل دکھانے کیلئے زندگی کے ایک ورق کو پیش کرنا ہو اور "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کیلئے بہت سے اوراق کو پیش کرنا ہو کیونکہ عمل صالح کے شعبے بھی تو بہت سے ہیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ بہت سے اوراق کو پیش کرنا پڑے۔ "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" میں کوئی کہیں کی مثال پیش کروں اور "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" میں کہیں کی مثال پیش کروں۔ لیکن ہمارا رہنما ایک ایسا ہے کہ اس نے ایک ظرفِ مکان اور ایک ظرفِ زمان میں تمام اوصاف کو سمیٹ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ اگر "اٰمَنُوْا" کا مظاہرۂ عمل مجھے دکھانا ہو تو کربلا جاؤں اور "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے شعبوں کی مثالیں دکھانا ہوں تو کربلا جاؤں۔ اگر "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" کی مثالِ عمل دکھانا ہو تو کربلا جاؤں اور اگر "تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" کی مثالیں دکھانا چاہوں تو کربلا جاؤں۔

اب اس سے آپ یہ محسوس فرما رہے ہوں گے کہ یہ مصائب ہیں لیکن یہ کہ یہ باب کتنا وسیع ہے کہ اگر اس کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو کئی مجلسوں کا وقت اس کیلئے درکار ہے۔ میں مجمل طریقہ پر ہر ہر وصف کو آپ کے سامنے پیش کر کے مجلس ختم کردوں گا۔ یہی اوّل ہے، یہی آخر ہے۔ یہی آغاز ہے، یہی انجام ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ جو آیت کے الفاظ ہیں، "امنوا"، ایمان ہے دل کے اندر کی چیز۔ دل کو شگافتہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا مگر اس کا عملی مظاہرہ وہ ہوگا جو آنکھوں کے سامنے آئے اور مثال کیلئے پیش کیا جاسکے۔ بدبختی سے اُدھر والے بھی دعویدارانِ ایمان تھے۔

یاد رکھئے کہ جب تک دعویدارانِ ایمان نہ ہوں، مسلمان ہی نہیں ہوسکتے۔ مسلمان کے معنی ہیں اقرار ایمان کرنے والا۔ اگر دل سے ہے تو واقعی ایمان ہے، ورنہ کچھ اور ہے۔ لیکن ایمان کا دعویٰ تو اسلام کیلئے ضروری ہے۔ بغیر اس کے اسلام ہوگا ہی نہیں۔ تو اُدھر والے بھی چونکہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں، لہٰذا دعویدارانِ ایمان ہیں۔ اب مجھے کوئی مظاہرۂ عمل چاہئے جسے میں پیش کرسکوں۔ پتہ چلے کہ ان کا ایمان کس پر ہے؟ تو یاد رکھئے کہ اعمال میں یہ بھی ایک شریعتِ اسلام کا حکیمانہ باب ہے کہ عبادات میں نیت کو رکھ کر ایمان کو عمل صالح میں سمویا ہے۔ وہ ایمان نیت کرواتا ہے، وہ عمل صالح کے راستے پر اعضاء و جوارح کو گامزن کرتا ہے۔ تو یہ نیت جو ہے، درحقیقت بتقاضائے ایمان ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھے گا، وہی قربۃً الی اللہ کی نیت کرے گا ورنہ جس چیز کو مانتا ہے، اُسی کیلئے عمل کرے گا۔ جو اللہ کو مانتا ہے، وہ اللہ کیلئے عمل کرے گا۔ جو دنیاوی طاقت کو مانتا ہے، وہ دنیاوی طاقت پر عمل کرے گا۔

اب نیت ہوتی ہے آغازِ عمل میں۔ اب مجھے دیکھنا ہے، ادھر والے کا آغازِ عمل جب ہوتا ہے تو وہ تیر جوڑتا ہے چلہ کمان میں۔ فوج والوں سے کہتا ہے کہ گواہ رہنا، یہ کہاں کیلئے گواہیاں ہیں؟ دربار حاکم کیلئے۔ پس معلوم ہوگیا کہ مقصدِ عمل حاکمِ وقت کی خوشنودی ہے، طاغوتِ باطل پر ایمان ہے۔ اب مجھے تلاش ہوئی کہ ادھر والے نے بھی کسی کو گواہ کیا؟ تو اُدھر والے کا مقصدِ عمل وہ حاضر و ناظر ہے۔ اس لئے اس نے گواہ کیا مگر خود اسی کو گواہ کیا، وہ کب گواہ کیا؟ جب جوان بیٹا جانے لگا۔ ہاتھ اٹھا دیئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

-اَللّٰهُمَّ اَشْهَدْ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ قَدْ بَرَزَ اِلَيْهِمْ غُلَامٌ اَشْبَهُ النَّاسِ بِرَسُوْلِكَ مَنْطِقًا وَخَلْقًا وَخُلُقًا كُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰى زِيَارَةِ نَبِيِّكَ فَنَظَرْنَا اِلٰى وَجْهِهٖ-

"پروردگار! گواہ رہنا کہ جو صورت و سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے مشابہ ہے۔ خداوندا! جب ہم مشتاقِ زیارتِ رسول ہوتے تھے تو اپنے اس جوان کو دیکھ لیتے تھے"۔

یہ اصول بھی ہمیں ہمارے مولا نے سکھایا ہے کہ کسی زیارت کے مشتاق ہو اور وہاں نہ پہنچ سکو تو شبیہ کو دیکھ کر دل کی تسلی کرلو۔ حسین کو اللہ نے ایک جیتی جاگتی رسول کی شبیہ عطا کی تھی۔ جملہ دیکھئے۔ ایک دفعہ کی بات نہیں ہے۔ "کُنَّا اِذَا"، ماضی استمراری، "کُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا"، ہم جب تیرے رسول کے مشتاقِ زیارت ہوتے تھے۔ اب اس سے علی اکبر کی جلالتِ قدر دیکھئے کہ علی اکبر کی

ولادت کے وقت مولا نے جب بھی دیکھا، رسول کی زیارت کی نیت سے دیکھا۔ اسی لئے اب علی اکبر کی یہ خصوصیت ہوگئی کہ جب علی اکبر چلے تو مولا اپنی جگہ کھڑے نہ رہ سکے۔ کسی کو یہ سمجھنے کا حق نہیں کہ یہ صرف بیٹے کی محبت تھی۔ نہیں، یہ رسول کی شبیہ کا احترام تھا اور یہ جو پکار رہے ہیں کہ جہاں تک سامنے رہے، اس وقت تک مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتے جاؤ۔ یہ کیا ہے؟ جانتے ہیں کہ یہ تصویر اب کہاں ملے گی؟ لہٰذا جتنا زیادہ ممکن ہو، اتنا رسول کی زیارت کرلوں۔

بس اربابِ عزا! اب دوسرا شعبہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔ اس ایک لفظ کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ عمل صالح میں حقوق اللہ بھی ہیں، حقوق الناس بھی ہیں۔ حقوق الناس میں زندوں کے بھی حق ہیں، مُردوں کے بھی حق ہیں۔ دوستوں کے بھی حق ہیں، دشمنوں کے بھی حق ہیں۔ یعنی حقوقِ ایمانی بھی ہیں اور حقوقِ انسانی بھی۔ ہر طرح کے حق ہیں۔ یہ کربلا کا کارنامہ ہے اور مولا کا کارنامہ ہے کہ یہ فقط مرقعِ مصیبت ہی نہیں ہے جو ہمیں صرف اشک افشانی ہی کی دعوت دے سکے بلکہ یہ شریعتِ اسلام کا پورا مدرسہ ہے۔ ایسے سخت ماحول میں حسین نے جتنی تعلیمات دینا ہیں، ان میں سے کسی کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا۔ ہر ایک کی کوئی مثال پیش کی۔ اب "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کی دنیا کتنی وسیع! تو حقوق اللہ میں کل عرض چکا کہ نماز جیسی کربلا میں پڑھی گئی، ویسی نماز تاریخ عالم میں کبھی نہیں پڑھی گئی۔ اس کے بعد حقوق الناس۔ کس نے پکارا اور مولا اُس کی لاش پر نہیں گئے ہیں؟ حالانکہ مقتل سے خیمہ گاہ کتنی دور ہے۔ مجاہد ہوتا تھا وہاں اور مولا ہوتے تھے یہاں۔ خیمہ گاہ جہاں ہے، وہاں سے وہ پکارتا تھا اور امام یہاں سے اُس کی لاش پر جاتے تھے۔ یہ کب ہو رہا تھا، تین دن کی بھوک و پیاس میں، عرب کی دھوپ میں، عراق کی گرمی میں۔

ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ ہوسکتا تھا کہ کسی آواز پر عباس سے کہیں کہ تم چلے جاؤ۔ کسی کی آواز پر علی اکبر سے کہیں کہ تم چلے جاؤ۔ خدا کی قسم! غلاموں کی صدا پر عباس چلے جاتے تو بھی اسے فخر ہو جاتا۔ علی اکبر چلے جاتے تو بھی اسے فخر ہو جاتا۔ مگر مولا سے کیونکر ممکن تھا کہ حبیب کی لاش پر خود جائیں اور جون، غلام ابوذر کی لاش پر کسی اور کو بھیج دیں؟ نہیں، جو بچپن کے دوست کی لاش پر گیا ہے، وہی غلام ترکی کی لاش پر بھی جائے گا، وہی غلامِ ابوذر کی لاش پر بھی جائے گا۔ اور جو علی اکبر کی لاش پر گیا ہے، وہی حُر کے لاشے پر بھی جائے گا۔ اب کتنی پیاس مولا کی بڑھ گئی، کتنی مشقت بڑھ گئی۔ مگر حقوق الناس میں یہ تفریق نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد بڑے سے سخت ماحول میں حقوق الناس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ہمارے ہاں تو سلام کے معاملہ میں ہر چھوٹے اور بڑے کی تفریق ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ بڑا مستثنیٰ ہے۔ خیمے میں کون تھا جو مولا سے چھوٹا نہ ہو؟ مگر جب رخصتِ آخر کیلئے، کیا رخصتِ آخر زندگی کے وقت کو اتنا بتا سکتی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جب ابھی ایک چھوٹی سی قبر بنا کر آ رہے ہیں اور اس عالم میں حقوق الناس کا یہ خیال کہ در خیمہ پر کھڑے ہو کر صدا دے رہے ہیں: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا زَيْنَبُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا اُمِّ كُلْثُوْمَ"۔ یہ تو بہنوں کو سلام ہوگیا، اور "اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا سَكِيْنَه، اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا فَاطِمَة"۔ یہ بیٹیوں کو سلام ہوگیا۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا لَيْلٰى، اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا رُبَابُ"۔ یہ بیویوں کو سلام ہوگیا۔

اَلسَّلَامُ عَلَى اللَّوَاتِيْ قُتِلَ اَزْوَاجُهُنَّ وَاَوْلَادُهُنَّ فِيْ نُصْرَتِيْ۔

"سلام ہو اُن خواتین پر جن کے شوہر اور جن کے عزیز میری نصرت میں جان نثار کر گئے"۔

لیجئے! اُم وہب کو سلام ہو گیا اور زوجہ مسلم ابن عوسجہ کو سلام ہو گیا۔ اب کیا فرماتے ہیں:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکِ یَافِضَّۃ"۔

"ارے فضہ! تمہیں بھی میرا سلام ہو"۔

یہ حضرت فاطمہ زہرا کی کنیز ہیں۔ فضہ کو سلام ہو گیا۔ یہ ہیں حقوق الناس۔ مگر بڑا سخت موقع ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ مجھے اسی پر مجلس ختم کر دینی چاہیے مگر ابھی تھوڑا آگے بڑھنا ہے کہ مولا کے دل پر داغ تھا کہ اسلام میں اور مسلمانوں میں دفن کرنا سب سے اہم بات ہے مگر میں اپنے ساتھیوں کے لاشے دفن نہیں کر سکا ہوں۔ ہاں! احترامِ میت جتنا ممکن تھا، جہاں تک ممکن ہوا، کسی لاش کو میدان میں نہیں رہنے دیا۔ یہاں پر ذرا سی تفریق ہے۔ جب تک اصحاب رہے، لاشے اٹھوائے اور جب دل کے ٹکڑوں کی باری آئی تو خود اٹھائے، خود لاشے اٹھائے۔ کسی کو رہنے نہ دیا۔ سوائے اس کے جس کی لاش نہ اٹھ سکتی ہو۔ ورنہ بھلا مولا، جو غلامِ ابوذر تک کی لاش کو اٹھوائیں، وہ عباس کے لاشے کو رہنے دیں؟

ماشاء اللہ، اجر کم علی اللہ، مجلس ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند لفظوں میں سورہ کی عملی تفسیر کو پورا کر دوں۔ اربابِ عزا! احترامِ میت جتنا ممکن تھا، اتنا کیا مگر مولا کو یہ صدمہ رہ گیا کہ دفن نہیں کر سکا۔ مگر دنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو! یہ وقت کی مجبوری ہے مگر میں اس فرض کو بھولا نہیں ہوں۔ اس لئے ایک چھوٹی سی لاش کو دفن کر کے میں فریضہ اسلامی کو بھی ادا کر دوں گا۔ علی اصغر کی لاش کو بے دفن نہیں رہنے دوں گا۔

اب آگے بڑھتی ہے آیت کہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"، ایک دوسرے کو حق کی ہدایت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! مولا نے جتنے خطبے پڑھے ہیں، اس میں اپنا تعارف کروایا ہے کہ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ یہ ہرگز اُمید نہیں تھی کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں گے مگر یہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"، کو ادا کرنا تھا۔

58

منزل امتحان

جیسا پرچہ امتحان کا جس طالب علم کو دینا ہو، اس کے حسب حال، اس کی ضرورت کے مطابق اسباب فراہم کرنا ممتحن کا فریضہ ہے۔

اگر کسی کے صبر کا امتحان ہے تو مصیبتوں کا آنا ضروری ہے، فقر و فاقہ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ فقر و فاقہ میں مبتلا رکھنا ناراضگی کی دلیل نہیں ہے رضا و ناراضگی امتحان کے نتیجہ سے وابستہ ہے۔ یہ فقر و فاقہ، یہ مصائب تو ضرورت امتحان ہیں۔

اگر کسی شکر کا امتحان لینا ہے اور یہ امتحان کا پرچہ ہے تو نعمتوں کی بارش کا ہونا ضروری ہے اور یہ نعمتوں کی بارش مہربانی کی دلیل نہیں ہے۔ مہربانی و نامہربانی امتحان کے نتیجہ سے وابستہ ہے۔ یہ نعمتوں کی بارش تو ضرورت امتحان ہے۔

یک حسنی نیست کہ کرد و شہید

ورنہ بسیار اندر دنیا یزید

یہ حق کی امانت جو دست بدست ہم تک پہنچی ہے، یہ انہی ثابت قدم افراد کی بدولت ہم تک پہنچی

منزل امتحان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَۙ‏ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَؕ‏ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓـئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ‏ ﴿۱۵۷﴾

ارشاد ہو رہا ہے کہ ”ضرور بالضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے، کسی نہ کسی چیز کے ساتھ یعنی ڈر اور بھوک، اموال کی کمی اور جانوں کی کمی اور ثمرات یعنی میوہ ہائے زندگانی کی کمی اور خوشخبری دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو ان کا قول یہ ہو کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے درود ہے اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں“۔

”وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ“ کا لفظ جس سے یہ آیت شروع ہوئی ہے، یہ بلا سے ہے۔

ابتلا ایک مصدر ہے۔ اس سے فعل بنتا تو ”لَیَبۡتَلِیَنَّكُمۡ“ ہوتا مگر وہاں ہے ”وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ“ تو یہ بلا سے ہے۔ ابتلا سے نہیں ہے۔ بعض الفاظ عرب کے ایسے ہیں کہ ہماری اردو میں آکر وہ اپنے اصل محل سے ہٹ گئے ہیں۔ لفظ عرب کا ہے اور معنی اردو کے ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر حالات میں غلطی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث منبروں سے اکثر آپ نے سنی ہوگی کہ:

مَنۡ بَکٰی عَلَی الۡحُسَیۡنِ فَقَدۡ اَحۡسَنَ بِالنَّبِیِّ وَفَاطِمَه

اب اس کا ترجمہ اردو میں احسان کے لفظ کو دہرا کر جو کیا جائے گا تو اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی ترجمہ وہی احسان کا لفظ لے آیا جاتا ہے جو اصل حدیث میں ہے۔

جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام پر گریہ کیا، اس نے پیغمبر خدا اور فاطمہ زہراؑ پر احسان کیا (معاذ اللہ)۔ احسان کا لفظ اردو میں اس معنی میں آگیا ہے کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے۔ گویا ہم اپنے لطف و کرم سے اس کو کچھ عطا کرتے ہیں تو وہ احسان ہے۔ آپ اپنے ہاں اس لفظ کے استعمال کے محل کو دیکھ لیجئے۔ کسی شخص نے آپ کو کچھ قرض دیا ہو اور اس کو اب ضرورت بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ اس کو ضرورت ہے، آپ نے لے جا کر اس کا قرضہ برمحل ادا کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ آپ نے بڑا احسان کیا کہ اس وقت یہ دے دیا۔ تو فوراً جواب دیں گے کہ احسان کیسا؟ وہ تو میرے ذمہ تھا، آپ کا قرض تھا، لہٰذا میں نے قرض ادا کیا اور خود سبکدوشی حاصل کی، اب احسان کیسا؟

تو احسان کا مفہوم بالکل نمایاں ہو گیا۔ اب وہ جملہ کہیے کہ جس نے گریہ کیا، اس نے رسولؐ اور فاطمہؑ پر احسان کیا۔ یہ تصور ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم نے عبادت کی تو اللہ پر احسان کیا۔ جس کے ہم پر اتنے حقوق ہیں کہ عمر بھر عبادتیں کریں تو اس کی نعمتوں کا حق ادا نہ ہو تو اس کی عبادت کرنا اس پر احسان کیسے ہوگا؟ اس معنی کے اعتبار سے عربی میں لفظ "مَنّ" ہے۔ منت کے معنی ہیں احسان کرنا۔ چنانچہ قرآن مجید میں احسان کیلئے ہے:

لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ

یہاں وہ معنی ہیں کہ تم مجھ پر اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے ایمان کی تم کو ہدایت کی۔

تو اب احسان کا محل آپ نے دیکھ لیا۔ قرآن مجید میں جو اس کیلئے لفظ آیا، اس کے ترجمہ میں، مَیں نے کہا احسان، اب بات سمجھ میں آ گئی۔ تو وہاں غلطی کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ ہم نے عربی کے لفظ احسان کو ترجمہ میں صرف کر لیا اور ترجمہ اردو میں ہے۔ لہٰذا جو احسان کے اردو کے معنی تھے، وہ ہمارے ذہن میں آئے۔ اسی لئے ہم احسان کے ساتھ "پر" کہتے ہیں۔ یہ "پر" خود ایک بار کا پتہ دیتا ہے۔ جیسے عربی میں مَنّ کے ساتھ عَلٰی آیا۔ "لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ"۔ ویسے ہی ہم کہتے ہیں "اس پر احسان"۔ "پر" کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا بار ہے اس کے کاندھے پر۔ عربی میں احسان کے ساتھ عَلٰی نہیں آتا "ب" آتا ہے۔ فَقَدْ اَحْسَنَ بِالنَّبِیِّ، اس جملہ میں بھی اَحْسَنَ کے ساتھ "ب" ہے تو اس میں وہ بار احسان نہیں ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسن عمل۔ اسی لئے قرآن مجید میں کہیں کہیں "اٰمَنُوْا" کے ساتھ زیادہ تر "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ہے تو "اٰمَنُوْا وَ اَحْسَنُوْا" بھی ہے۔ تو "اَحْسَنُوْا" کے معنی وہ ہیں جو "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے ہیں۔ تو اب کیا معنی ہوئے؟ معنی یہ ہوئے کہ جس نے حسینؑ پر گریہ کیا، اس نے پیغمبر خدا اور فاطمہؑ کا ایسا حق ادا کیا جو ادا کرنا چاہئے تھا۔

ایک ایسا عمل کیا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی یہ ایک حسن عمل ہے۔ اس میں تصور احسان نہیں ہے۔ تو لفظ عربی، معنی اردو۔ ایسے ہی بہت سے الفاظ ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ "بلا" بھی ہے کہ تمہارے نزدیک "بلا" تو "بلا" ہی ہے یعنی بہت ہی خراب۔ "رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت"۔ تو "بلا" کے معنی ایک بڑی چیز۔ ایسے ہی ایک اور لفظ ہے فتنہ۔ اردو میں فتنہ، ہنگامہ بے محل کو کہتے ہیں۔ اب چونکہ اردو میں فتنہ کے معنی یہ ہیں تو جب عربی میں ہم یہ لفظ سنیں گے تو وہی مفہوم ذہن میں آئے گا جو اردو میں ہمارے ذہن نشین ہے۔ تو اب دیکھئے کہ "بلا" کا وہ مفہوم جو آپ کے ہاں ہے، اور خالق نے اپنے حکم کو جو قربانی اسماعیلؑ کیلئے تھا، ارشاد ہوا:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْعَظِيْمُ

اب آپ کہئے، یہ بہت ہی بری بلا تھی۔ معاذ اللہ، خدا کے خلیل پر کوئی بلا نازل ہوئی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ "بلا" کے لفظ سے "بلا" کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور اب جتنے فتنے کے معنی جو ہماری نظر میں برے ہیں، فلاں آدمی کیا ہے، وہ تو فتنہ ہے۔ وہ بھی ایک

مذمت ہی ہے اور فتنہ برپا کردیا، وہ بھی ایک غلط اقدام ہی کو کہتے ہیں۔ اب جو قرآن مجید کی یہ آیت سنتے ہیں:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

تمہارے مال اور اولاد، اب اگر وہی لفظ دہرایئے تو معنی ہوں گے کہ یہ دونوں بڑے فتنے ہیں۔ اب کوئی زاہد خشک کہہ دے کہ ہاں! اموال تو واقعی فتنہ ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مال اگر ایسی بری چیز ہوتا تو قرآن مجید میں ہر جگہ ''يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ'' کے ساتھ ''يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ'' کیوں ہوتا؟ زکوٰۃ بغیر مال کے ہوتی ہی نہیں۔ تو کیا خدا چاہتا ہے کہ ہر آدمی فتنہ میں مبتلا رہے' ہر آدمی فتنہ پرداز رہے؟ مگر اموال کو کوئی زاہد کہہ دے تو کیا اولاد کو بھی فتنہ ہی سمجھیں؟ کیا اولاد بری چیز ہے؟ یہ کوئی رہبانیت والا نظام کہتا تو خیر! لیکن قرآن نے جہاں اعلان کردیا کہ:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے''۔

جہاں پیغمبر کثرت اولاد کی ترغیب دیں کہ میں ناز کروں گا اپنی امت کی کثرت پر، تو وہاں تو تصور کیونکر ہوگا کہ اولاد فتنہ ہے۔ تو ترجمہ کی وجہ سے یہ ''بلا'' میں بھی غلطی ہوئی، فتنے میں بھی غلطی ہوئی ترجمہ کی وجہ سے۔ نہ ''بلا'' کے معنی اس بلا کے ہیں اور نہ فتنے کے معنی اس فتنے کے ہیں ''بلا'' کے معنی بھی ہیں امتحان اور فتنے کے معنی بھی امتحان۔

ارشاد ہوتا ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ''

یقیناً ضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ ہم تمہارا امتحان لیں گے۔ یہ تو بحمد للہ پانچ مجلسوں کا سلسلہ ہے تو کل فلسفہ امتحان عرض کروں گا کہ آخر اللہ اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے۔ مگر بہر حال قرآن مجید میں جا بجا مختلف الفاظ میں امتحان کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وجہ تخلیق کو بھی امتحان اقرار دیا گیا ہے:

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا نَّبْتَلِيهِ

کیا انسان پر ایسا بھی وقت آیا ہے کہ جب وہ بالکل ہی قابل ذکر نہ تھا؟ ہم نے پیدا کیا، انسان کو، ملے جلے ہوئے نطفہ سے ''نبتليه''، اس کو محل آزمائش میں جانے کیلئے۔ اور اسی کیلئے اسے چشم بینا اور گوش شنوا عطا ہوئے ہیں۔ اس کو سَمِيعًا بَصِيرًا بنایا۔ قوت سماعت عطا کی اور قوت بصارت عطا کی۔ تو اصل تخلیق انسان کا مقصد نَبْتَلِيهِ ہم اس کو محل آزمائش میں لائے۔ آج جو کرنا ہے، وہ یہ کہ آخر انسان ہی کیوں اس لائق تھا کہ اسے محل آزمائش میں لایا جائے۔ اگر پتھروں کی بھی آزمائش ہوتی، جمادات کی نباتات کی بھی آزمائش ہوتی اور حیوانات کی بھی آزمائش ہوتی تو پھر انسان کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اسے خلق کیا جائے تا کہ محل آزمائش میں لائیں۔

یہ انسان ہی کو کہنا کہ ہم نے اس کو خلق کیا تا کہ اس کو محل آزمائش میں لائیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ آزمائش کا مقصد ان

میں سے کسی سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ وہ آزمائش کا مقصد اسی سے پورا ہو سکتا ہے جس کا نام انسان ہے۔

تو اب اس کیلئے جو حضرات ان مجالس میں شریک تھے جو سورۂ والعصر پر ہوئیں، تو وہ تمہید آج کے بیان کی ان کے ذہن میں تو بالکل آسکتی ہے، یعنی میں نے عرض کیا کہ انسان کے علاوہ جتنی بھی مخلوق ہے، وہ یک رخی ہے یعنی بس جو خاصیت ان میں طبیعتاً پائی جاتی ہے، اسی کے تحت میں اس کے افعال ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف جمادات، نباتات، حیوانات۔ ان کیلئے تو دہرانا ہو جائے گا جو ماشاء اللہ مجالس میں شریک تھے، تو میں نے کہا تھا کہ ان میں مذمت کے قابل بھی کام ہیں حیوانات میں، اچھے کام بھی ہیں۔ کچھ ایسے اوصاف ہیں کہ تعریف ہوئی ہے۔ کسی جانور کی وفا مشہور ہے اور اسی طرح شجاعت۔ شجاعت اگر اچھی صفت نہ ہوتی تو شیر کے ساتھ بڑی ہستیوں کو کیوں تشبیہ دی جاتی؟ معلوم ہوا کہ شجاعت اچھی صفت ہے۔ تب تو بلند ہستیوں کو بھی مجازاً شیر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جانوروں کی اچھی صفات بھی ہیں، بری صفات بھی ہیں۔ اس صورت سے ان مجالس میں عرض نہیں کیا تھا۔ بہر حال مطلب یہی تھا ان میں۔ لیکن انداز دوسرا تھا۔ تو ان میں اچھی صفات بھی ہیں، بری بھی۔ مگر جو اچھی صفات ہیں، وہ بھی مقتضائے طبیعت ہیں اور جو بری صفات ہیں وہ بھی مقتضائے طبیعت ہیں۔ لہٰذا جو اچھی صفات ہیں، ان پر مدح ہوگی، شکریہ نہ ہوگا اور جو بری صفات ہیں ان کی مذمت ہوگی، ملامت نہیں ہوگی۔ لیکن یہ انسان، اس میں دوطرفہ صلاحیتیں ہیں۔ یعنی میں نے وہاں یہ تعبیر کی تھی کہ لچکدار مخلوق۔ گھٹنے کی بھی صلاحیت، بڑھنے کا بھی امکان۔ پستی میں آنے کی بھی صلاحیت، بلندی پر بھی جانے کا امکان۔ یہ تو دونوں طرح کی صلاحیتیں اس میں ہیں۔ جب دونوں طرح کی صلاحیتیں اس میں ہیں تو جس طرح وہاں میں نے کہا تھا کہ اور کہیں خسارہ کا سوال نہیں، ویسے ہی اور کسی میں آزمائش کا سوال نہیں۔ بچھو کا تو کام ہی ڈنک مارنا ہے۔ اب اس کا ہاتھ پر بٹھا کر امتحان لیجئے گا کہ ڈنک مارتا ہے یا نہیں۔ شیر کا تو کام ہے پھاڑ کھانا۔ تو کیا اس کے سامنے جایئے گا کہ پھاڑ کھاتا ہے یا نہیں؟ آگ کا کام ہے جلا دینا تو کیا آگ میں جایئے گا، اس میں داخل ہوں گے کہ یہ جلاتی ہے یا نہیں؟ دریا کا کام ڈبو دینا ہے تو آپ بغیر پیراکی کا فن جانتے ہوئے اس میں کودیں گے کہ ڈبوتا ہے یا نہیں؟ صرف یہ دیکھنے کو کہ ہم ڈوبتے ہیں یا نہیں یا یہ ڈبوتا ہے یا نہیں؟ جناب! دونوں خاصیتیں۔ اس میں خاصیت ہے ڈبو دینے کی، آپ میں صلاحیت ہے بچنے کی۔ اگر آپ اس صلاحیت کی وجہ سے نہ بچیں گے تو آپ بھی خاصیت کی وجہ سے ڈوبیں گے۔ ڈوبنا خاصیت سے ہوگا، بچنا اپنی صلاحیت سے ہوگا۔

تو حضور والا! جب ان میں گھٹنے کے سوا بڑھنے کا امکان نہیں تو ان میں آزمائش کا سوال نہیں۔ اور ادھر ہیں فرشتے! ان کی بھی آزمائش نہیں کرتا کہ دیکھیں وہ عبادت کرتے ہیں یا نہیں؟ وہ تو عبادت کے خاص انداز ہی پر ان کی طبیعت ڈھلی ہوئی ہے۔ مگر ہاں! ان کے افعال بغیر ارادہ نہیں ہیں۔ یعنی رکوع ان کا بلا ارادہ نہیں ہے۔ اگر ان کا رکوع بلا ارادہ ہوتا پھر اس کے چھوڑنے پر قادر نہ ہوتے۔ اگر بلا ارادہ ہوتے وہ رکوع وسجود تو پھر انہوں نے محل پہچان لیا تو پھر رضوان درزی کیوں بن کر آتا اور فرشتے مدد کیلئے کیوں آتے؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ فاعل مختار وہ بھی ہیں مگر ان کا اختیار ہمیشہ نیکی کی طرف جاتا ہے کیونکہ محرکات بدی ان میں نہیں ہیں۔ انسان میں بھی اگر برائی کے محرکات نہ ہوں تو فطرۃً وہ بھی اچھائی کی طرف جاتا۔ یہ معنی ہیں اس کے کہ:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَام

''ہر مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے''۔

یعنی اگر دوسرے محرکات نہ ہوں تو وہ ہمیشہ اسی راستے پر جائے گا جو اللہ کو پسند ہے۔ تو یہ دوسرے محرکات ہیں جو اسے غلط راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ مگر اس میں ان محرکات کے اثر لینے کی بھی صلاحیت ہے اور محرکات سے اثر نہ لینے کی بھی صلاحیت ہے۔ جو اس صلاحیت کو بروئے کار لائے ہوئے ہیں، وہ معصوم ہیں۔ جو اس صلاحیت سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں جو برائی کی طرف لے جاتی ہے، وہ گناہگار ہیں۔ تو ملائکہ کی اطاعت بھی ارادی، انسان کی اطاعت بھی ارادی۔ ملائکہ فاعل مضطر نہیں ہیں، وہ بھی فاعل مختار ہیں مگر اختیار ان کا اطاعت کی طرف بغیر مزاحم کے ہیں۔ اس اختیار کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان کیلئے رکاوٹیں ہیں۔ تو اب انسان میں صلاحیت گھٹنے کی بھی ہے اور بڑھنے کی بھی ہے۔ انسان میں صلاحیت معصیت بھی ہے، اطاعت کی بھی ہے۔ چونکہ دو قسم کی صلاحیتیں ہیں، تو اب امتحان کے یہ معنی ہیں کہ اس کی صلاحیتوں کو عالم فعلیت میں لانے کیلئے مواقع فراہم کرنا یعنی اگر وہ مواقع نہ ملیں تو اس کا جوہر نہ کھلے کہ اس میں کونسی صلاحیت ایسی ہے جس کو بروئے کار لائے۔ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع دینے کا نام امتحان ہے۔

اگر مال و دولت ملتا ہی رہے تو پھر قناعت کے جوہر کا ظہور کیونکر ہو؟ اگر کبھی مصیبت آئے ہی نہیں تو صبر کے جوہر کا امتیاز کیونکر ہو؟ اگر کوئی سخت معرکہ آئے ہی نہیں تو ثابت قدم کی صفت کا مظاہرہ کیونکر ہو؟ اب اس کے برخلاف دیکھ لیجئے کہ اگر سخت موقع نہ آئے تو گریز پا افراد کے کردار کا ظہور کیونکر؟ تو یہ امتحان ہے صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کیلئے مواقع دینے کا نام۔

اگر حکم ہی نہ ہو کہ بیٹے کو ذبح کرو تو خلیل کا مقام اطاعت کیونکر سامنے آئے؟ اگر آتش نمرود مشتعل ہی نہ ہو تو خلیلؑ کے ثبات قدم کا جوہر کیونکر سامنے آئے؟ تو نام اس کا امتحان ہے مگر حقیقت میں وہ انسانی جوہروں کے نمایاں ہونے کیلئے مواقع فراہم کرنا ہیں۔

یہاں تک تو ایسا تھا کہ شاید کچھ افراد پورے طور پر ذہن نشین ہی نہ کر سکے ہوں۔ انشاء اللہ امید ہے کہ سب لوگوں کے ذہن میں مطلب تو آ ہی گیا ہوگا، چاہے کچھ الفاظ اِدھر اُدھر رہ گئے ہوں کیونکہ جو لفظ سمجھ میں نہیں بھی آتا، وہ سیاق و سباق سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔

اب جناب! ہر دفعہ میں کہہ چکا کہ مجھے طلباء ہی یاد آتے ہیں۔ زندگی جو گزری ہے، وہ انہی میں۔ لہٰذا ہمیشہ انہی سے سابقہ رہتا ہے تو انہی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ تو جناب! مجھ لکھنؤ یونیورسٹی میں امتحانات کے نگران ہونے کا بہت موقع ملا ہے۔ تو جو نگران ہوتا ہے، اسے تین گھنٹے کا وقت گزارنا بڑا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان تین گھنٹوں میں آئینی طور پر کوئی اور کام نہیں کر سکتے۔ کوئی اور مشغلہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ورنہ فرض میں کوتاہی ہے۔

بہر حال اب ظاہر ہے کہ جب آدمی کو فرصت ہو تو ہر چیز کو وہ غور سے دیکھے گا۔ ہر چیز پر اس کی توجہ ہوگی۔ تو اب امتحانات کی خصوصیات بھی مجھے یاد ہیں۔ ایک دفعہ ذہن نشین ہوئی تو وہ ہر مرتبہ مجھے یاد آتی ہیں۔ جناب! کسی کمرہ امتحان میں ایک مرتبہ گئے وہاں بس

میز تھی، کرسی تھی اور کاپیاں دی گئیں لکھنے کیلئے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ فرض کیجئے دوسرے دن گئے، کسی دوسرے کمرے میں امتحان لینے کیلئے تو وہاں جن سے مثلث وغیرہ بناتے ہیں پرکار وغیرہ، وہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے پوچھا: جناب! کل تو یہ سب کچھ نہیں تھا، آج کیوں ہے؟ انہوں نے کہا: جی! کل تھا آرٹ کا امتحان۔ ادب ہو یا کچھ ہو، بڑا وسیع دائرہ ہے۔ تو کل اس کا امتحان تھا، اس میں بس ذہن زاویے بناتا ہے، اس میں بس تصور کی لکیریں کھینچی جاتی ہیں۔ اس میں ان سب کی ضرورت نہیں تھی۔ آج مثلاً فن ہیئت۔ مجھے پرانے نام یاد ہیں۔ جدید نام تو مجھے یاد نہیں ہیں۔ اقلیدس، آج اس کا پرچہ ہے۔ تو اب اس میں دائرے بنانا ہیں۔ شکلیں بنانا ہیں اقلیدس کی اور لکیریں کھینچنا ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ رکھا گیا ہے۔

تو اب اس سے کیا نتیجہ نکلا؟ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس قسم کا امتحان لینا ہو، اس کے اسباب فراہم کرنے چاہئیں۔ بغیر اس کے اس شعبہ کا امتحان نہیں ہوگا۔ ایک دن گئے کلاس میں، دیکھا کہ خاک اڑ رہی ہے کلاس میں۔ طلباء ہیں ہی نہیں۔ ارے صاحب! کیا ہوا، امتحان نہیں ہے؟ جی نہیں۔ آج وہ سب سڑک پر ہیں کیونکہ امتحان پیمائشوں کا ہے۔ تو جناب! جب تک سڑک نہ ہو، وہ امتحان نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ تو یہ دیکھا کہ سب طلباء کسی پہاڑی پر لے جائے گئے، معلوم ہوا کہ اس فن کا امتحان ہے جس کا پہاڑوں سے تعلق ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جس قسم کا امتحان ہو، ویسے اسباب فراہم کرنا جزو امتحان ہے۔

اب یہاں سے انسانی کردار کے شعبوں کا امتحان اور انسانی کردار کے شعبے مختلف ہیں۔ جتنے قسم کے اخلاق ہیں، جتنی قسم کے احکام شریعہ ہیں، جتنی قسم کے انسان کے اچھے اور برے کام ہیں، وہ سب مختلف شعبوں سے انسانی کردار کے متعلق ہیں۔ تو یہاں امتحان جو ہے، وہ کردار کا ہے۔ جب کردار کا امتحان ہے تو جس قسم کا کردار نمایاں کرنا ہو، یعنی جیسا پرچہ امتحان کا جس طالب علم کو دینا ہو، اس کے حسب حال، اس کی ضرورت کے مطابق اسباب فراہم کرنا ممتحن کا فریضہ ہے۔

اگر کسی کے صبر کا امتحان ہے تو مصیبتوں کا آنا ضروری ہے۔ فقر و فاقہ میں مبتلا رکھنا ناراضگی کی دلیل نہیں ہے۔ رضا و ناراضگی امتحان کے نتیجہ سے وابستہ ہے۔ یہ فقر و فاقہ، یہ مصائب تو ضرورت امتحان ہیں اور اگر کسی کے شکر کا امتحان لینا ہے اور یہ پرچہ ہے امتحان کا تو نعمتوں کی بارش تو ضرورت امتحان ہے۔ اس طرح اگر حاکم کا رعایا کے ساتھ اچھا یا برا سلوک، یہ کردار انسانی ہے تو پھر ضرورت ہے کہ تخت و تاج ملے۔ ضرورت ہے کہ مسند حکومت ملے۔ اب وہ مسند حکومت رائے عامہ سے ملے یا باپ کی بچھائی ہوئی ملے۔ کسی بھی صورت میں وہ مسند، وہ تاج و تخت ملے ورنہ اس کردار کا امتحان ہی نہیں ہو سکتا۔ صاحب اختیار ہونے کے بعد اس کا کردار کیا ہو سکتا ہے؟ یہ عدل کرتا ہے یا ظلم کرتا ہے؟ یہ خلق خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے یا خلق خدا کی بربادی کا سامان کرتا ہے؟ تو جو کچھ ناراضگی و رضامندی ہوگی، وہ نتیجہ امتحان پر ہوگی۔ نہ وہ دولت نتیجہ رضائے پروردگار، نہ تخت و تاج۔ دلیل رضائے پروردگار بھی بطور امتحان، وہ بھی بطور امتحان۔

اسی طرح اگر کسی شخص کیلئے امتحان ہے اس بات کا وہ مرکز ظلم و تشدد ہونے کے بعد کیا کرتا ہے تو اس کو کسی جابر حکمران کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا موقع دینے کی ضرورت ہے تاکہ دیکھا جائے کہ وہ شدائد کے مقابلہ میں ہمت تو نہیں ہار جاتا اور وہ مصائب کے بعد کردار کی پستی میں تو مبتلا نہیں ہو جاتا؟ تو اب نہ وہ ظالم کے زیر تسلط آ جانا دلیل ناراضگی پروردگار، نہ اس کا حکمران بن جانا دلیل رضائے

پروردگار۔ یہ سب امتحان کے انداز ہیں۔ یہ سب امتحان کے طریقے ہیں۔ نتیجہ متعلق ہوتا ہے اس کردار سے جو عالم ظہور میں آئے۔

آپ حضرات کی بڑی محبت ہے کہ مجھ سے ایسا غیر دلچسپ بیان، ایسا خشک وعظ آپ سن لیتے ہیں اور پھر دوسرے دن سننے کیلئے آجاتے ہیں۔ امتحان کے معنی آپ کی سمجھ میں آئے اور یہ سمجھ میں آیا کہ امتحان جب لیا جائے تو اس کیلئے ویسے ہی اسباب فراہم کرنے چاہئیں جو امتحان کیلئے ضروری ہیں ورنہ پھر امتحان ہی نہیں ہو سکتا ہے اور ان اسباب کا فراہم کرنا، اگر وہ ناگوار طبع ہیں تو ناراضگی کی بناء پر نہیں ہے اور اگر وہ خوشگوار ہیں تو وہ رضامندی کی بناء پر نہیں ہے، وہ بھی امتحان کی ضرورت ہیں اور یہ بھی امتحان کی ضرورت ہیں۔ یہ ہے خلاصہ اپنے اس بیان کا جو آپ کے سامنے پیش کیا۔

اب میں عرض کرتا ہوں کہ ذرا غور فرمائیے کہ جس طرح کچھ حالات امتحان کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ شخصیات شخصیات کیلئے پرچہ امتحان بنتی ہیں۔ یعنی اگر فرعون نہ ہو تو موسویت پردہ میں رہ جائے اور اسی طرح ادھر سے۔ اگر ابراہیمؑ نہ ہوں تو نمرودیت پردہ میں رہ جائے۔ اگر موسیٰؑ نہ ہوں تو فرعونیت پردہ میں رہ جائے اور اگر حسینؑ نہ ہوں تو یزیدیت پردہ میں رہ جائے۔ اسی لئے ایک شاعر نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ یزید کوئی انوکھا برا نہیں تھا، ویسے بہت سے برے ہیں مگر کیا کیا جائے کہ ان کیلئے حسینؑ جیسا اچھا سامنے نہیں ہے۔ اس لئے ان کی برائی اس نقطہ پر نمودار نہیں ہوئی۔

یکے حسینؑ نیست کو گردد شہید
ورنہ بسیار اندرر دنیا یزید

جن جن کو ہم برا سمجھتے ہیں، یزید کی خصوصیت نہیں۔ جن جن کو ہم برا سمجھتے ہیں۔ ویسے برے بہت ہیں مگر ان کے مقابل میں ویسے اچھے نہیں ہیں جیسے ان بروں کے مقابلہ میں آ گئے تھے۔ لہٰذا ان کی برائی زیادہ نمایاں ہوگئی اور برائی کا چرچا بہت بڑھ گیا۔ تو ہر شخصیت دوسری شخصیت کیلئے باعث امتحان ہوتی ہے۔ ہاں! کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو اچھا ہے، وہ خود اپنی جگہ اچھا ہے اور جو برا ہے، وہ خود اپنی جگہ برا ہے۔ اب وہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟ اگر شیطان کو پیدا نہ کرتا تو معصومین کا درجہ امتیاز نمایاں کیونکر ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایک سلسلہ ہے جس میں فرعون، ابوجہل، ابولہب، اس وقت والا ابوسفیان، پھر آخری میں یزید، یہ سب ایک سلسلہ ہے اور دوسرا سلسلہ ہے جس میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، حضرت رسالت مآبؐ اور جس سلسلہ کو میں پیش کر رہا ہوں، اس کے آخر میں، جہاں تک میرا بیان ہے، آخر میں حسینؑ، تو اسی سلسلہ کو پیش نظر رکھ کر اقبال نے کہہ دیا ہے:

موسیٰؑ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

یعنی موسیٰؑ و فرعون و شبیر و یزید بظاہر آدمیوں کے نام ہیں لیکن حقیقت ہیں وہ خیر و شر کی دو قوتیں ہیں۔ یہ حق و باطل کی دو قوتیں ہیں جن کے مظاہر کا نام بہ اعتبار دور روز زمانہ بدلتا جاتا ہے۔ تو ایک وقت میں جو ایک قوت کا مظہر ہے، وہ ہے موسیٰؑ، جو دوسری قوت کا مظہر ہے، وہ ہے فرعون۔ ایک وقت میں جو ایک قوت کا مظہر ہے، وہ ہے ابراہیمؑ اور جو دوسری قوت کا مظہر ہے، وہ ہے نمرود۔ پھر آخر میں وہی۔

ایک قوت کا مظہر جو ہے، وہ حسینؑ ہیں اور دوسری قوت کا مظہر یزید ہے۔ اقبال کا تصور جو ہے، اسے سمجھئے کہ وہ ایک متن تھا جس کی میں نے شرح کی۔ اب ظاہر ہے کہ بہت سے افراد تھے لیکن ضرورت شاعری کی وجہ سے موسیٰؑ و فرعون آگئے، شبیر و یزید آگئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذہن میں سب ہیں، مصرعہ تقطیع کے ماتحت اور نہیں آئے، لیکن اقبال کے ذہن میں سب ہیں نمرود بھی ہے ابراہیم بھی ہیں اور سب بھی ہیں درمیان والے، شروع میں تو سب ہیں لیکن اس کے بعد دیکھ لیجئے کہ:

زندہ حق از قوت شبیری است

باطل آخر داغ حسرت میری است

اب موسیٰؑ کا نام نہیں ہے۔ قوت کلیمی اب نہیں ہے اب قوت شبیریؑ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اپنے وقت کے نام تو سب الگ ہیں لیکن اس قوت کا اصل نام قوت شبیریؑ ہے۔ اسی قوت شبیریؑ کے حامل اپنے وقت میں موسیٰؑ ہیں اور اسی قوت شبیریؑ کے اپنے وقت میں حامل ابراہیمؑ ہیں اور کیا کیا جائے، کوئی صفت چھوٹے کی ایسی نمایاں ہوتی ہے کہ بڑے بھی اسے اختیار کرتے ہیں، عذر نہیں کرتے۔ اسی قوت شبیریؑ کے حامل اپنے وقت میں محمد مصطفےٰؐ تھے۔ حق اسی قوت سے زندہ ہے یعنی اگر قوت شبیریؑ نہ ہوتی، جو ازل سے مختلف شکلوں میں آتی رہی تو حق مردہ ہو جاتا اور باقاعدہ تضاد اگر حق پرست افراد جو بھی تھے، ان کی طرف کا نام قوت شبیریؑ تھا تو ماننا پڑے گا کہ جو فرعون میں تھی، وہ بھی قوت یزیدی تھی اور جو نمرود میں تھی، وہ بھی قوت یزیدی تھی اور ابوجہل و ابولہب میں تھی، وہ بھی قوت یزیدی تھی۔ اس دور میں اس کا وہ نام تھا۔ اصل میں قوت یزیدی تھی جو ہر دور میں کار فرما تھی۔ یعنی قوت حسینیؑ ہمیشہ دوسری نقابوں میں تھی۔ 61ھ میں بے نقاب ہو کر آئی اور قوت یزیدی ہمیشہ روپوش تھی اور اب وہ بے حجاب ہو کر آئی۔

تو اب جو میں کہتا ہوں کہ اس پر غور کیجئے کہ کسی دور کے حسینؑ نے کسی دور کے یزید کی بیعت نہیں کی۔ ہاں! یہ بیعت نہ کرنا پھولوں کی سیج بھی نہیں رہا ہے۔ اس کے نتائج بہر حال ہر ایک کیلئے ناخوشگوار ہی ہیں۔ اگر موسیٰؑ فرعون کے سامنے سر جھکا دیتے تو در بدر کیوں پھرنا پڑتا؟ دشت نوردی کی مصیبت کیوں برداشت کرنا پڑتی کہ اسی جنگل میں ان کی وفات ہوئی۔ اگر جناب ابراہیم نمرود کی خدائی کو (معاذ اللہ) تسلیم کر لیتے تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے؟ اور پردیس میں انہیں کیوں جانا پڑتا؟ ان کا ملک تو نہیں تھا جہاں ان کی اولاد گئی؟ یہ سب عراق میں تھے، یہ شام کیوں جاتے، مصر کیوں جاتے؟ بنی اسرائیل بعد میں مصر گئے۔ یہ سب نمرود کے سامنے سر نہ جھکانے کے نتائج تھے۔ جو وہ چاہتے، یہ بھی ان کے ہم نوا ہو جاتے تو جسم مبارک پر پتھر کیوں کھانے پڑتے اور عزیزوں کے لاشے کیوں دیکھنے پڑتے اور تمام مصائب زندگی برداشت کیوں کرنے پڑتے؟ تو ہمیشہ یہ نتائج مرتب ہوئے اور پھر بھی نہیں مانے۔ پھر بھی ان کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا۔

اب جس جس کو جو سہنا پڑا، لیکن انہوں نے اپنی بات نہیں بدلی اب اسی کا نام ضد ہے تو کونسا نبی ضدی نہ تھا؟ خدا کی قسم! یہ ہم تک پیغام خدا کا پہنچنا ان سب کی ضدوں کا صدقہ ہے۔ اگر پہلے ہی علمبردار حق باطل کے سامنے سر جھکا دیتا تو حق آج ہم تک بطور امانت نہ پہنچتا۔ یہ حق کی امانت جو دست بدست ہم تک پہنچی ہے، یہ انہی ثابت قدم افراد کی بدولت ہم تک پہنچی ہے۔

اب لفظ بدلا ہوا ہے، میں اس کو ثبات قدم کہتا ہوں، کوئی اس کو ضد کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیشہ اہل باطل اس ثبات قدم سے اپنی شکست محسوس کر کے اسے جھنجھلا کے کہتے ہوں گے کہ موسیٰ بڑے ضدی ہیں۔ اتنا ہم نے کہا اور پھر بھی نہیں مانتے۔ نمرود والے یہی کہتے ہوں گے کہ ابراہیم بڑے ضدی ہیں کہ یہ سب کچھ ہو گیا، پھر بھی راہ حق سے نہیں ہٹتے۔ اب وہ سب ابوجہل وغیرہ یہی کہتے ہوں گے کہ بڑے ضدی ہیں۔ پتھر کھا رہے ہیں اور نہیں مانتے۔ تمام مصائب اٹھا رہے ہیں اور پھر بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اب ان سب کی باتیں ہم تک نہیں پہنچیں، اس لئے کہ فرعون والوں کی نسلیں ہم تک نہیں آئیں۔ حسینؑ نے جو نہیں مانا تو ہم تک پہنچ گئی کیونکہ اس وقت ضد کہا گیا اور ضدی کہنے والے آج تک رہ گئے۔ یہ تو غصہ میں آ کے ضد کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ پورا ہوا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے سامنے سر جھکا دیں۔ یہ باطل کا داغ دل ہے جو حق پرستوں کی طرف سے ہے اور یہ شکل اختیار کر رہا ہے۔ جب تک دنیا میں ایک بھی حق پرست باقی ہے وہ کسی بھی خطہ ارض پر ہو، اس وقت تک دنیا والوں کو اس پر غصہ رہے گا۔

اب جناب! اس کے معنی یہ ہیں کہ ابراہیم اس وقت مجازی طور پر حسینؑ، مقام حق پرستی میں یا باطل سے ٹکرانے میں وہ حسینؑ تھے موسیٰ بھی اپنے وقت میں (حقیقت کے لحاظ سے موسیٰ تھے) مجازاً اس صفت کی شرکت کی وجہ سے حسینؑ تھے۔ پھر دفع دخل کر چکا کہ اپنی جگہ فضائل کا اونچا ہونا اور بلند ہونا دوسری چیز ہے لیکن اسی صفت کا نمایاں ہونا اور بات ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ بھی، باوجود بلند تر ہونے کے فضائل میں، مقام مقاومت باطل میں اور ظلم کے سامنے ثابت قدم رہنے میں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ بھی اپنے وقت میں حسینؑ تھے۔ یہ بھی ایک مفہوم ہے "اَنَا مِنَ الْحُسَیْن" کا، حسینؑ کو دیکھو تو مجھے پہچانو گے کہ میرا ثبات قدم بھی حسینؑ میں آ کر ظاہر ہوا۔

دہرانے کی عادت نہیں ہے مگر سلسلہ کلام کیلئے نتیجہ کے چسپاں کرنے کیلئے ابراہیم اپنے وقت کے حسینؑ اور لازمی طور پر فرعون بھی اپنے وقت کے یزید، نمرود بھی اپنے وقت کے یزید اور ابوجہل اور ابوسفیان وغیرہ بھی اپنے وقت کے یزید۔ اس جملے کے کہنے کیلئے میں نے یہ دہرایا کہ جب مجازی حسینوں نے مجازی یزیدوں کی بیعت نہیں کی تو بھلا حقیقی حسینؑ حقیقی یزید کی بیعت کیسے کر لیتے؟

وہ جو میں نے کہا کہ بیعت نہ کرنے کبھی خوشگوار نتائج کا حامل نہیں رہا، ان الفاظ میں کہا تھا کہ پھولوں کی سیج نہیں رہا۔ اب ایک اور لفظ بولتا ہوں کہ جب وہ مجازی حسینؑ، وہ مجازی یزید، وہ مجازی حسینؑ، وہ مجازی یزید، وہ مجازی حسینؑ، وہ مجازی یزید۔ جب یہ سلسلہ ایک آ گیا تو یاد رکھئے کہ جہاں حسینؑ اور یزید کا مقابلہ ہوتا ہے اس کا نام کربلا ہے۔

تو اب مولانا محمد علی جوہر کا شعر بھی بامعنی ہو گیا، جہاں بھی حق اور باطل کا مقابلہ ہو وہ ایک کربلا ہے یعنی فرعون و موسیٰ کا مقابلہ ہو وہ ایک کربلا تھی۔ خلیل و نمرود کا مقابلہ ہو وہ بھی ایک کربلا تھی اور مدینہ میں آ کر پیغمبر اسلام کا اور ان سب کا مقابلہ ہو وہ بھی ایک کربلا تھی۔ مگر جب وہ سب مجازی حسینؑ تھے اور ان کے مقابلہ میں سب مجازی یزید تھے تو لازماً ماننا پڑے گا کہ وہ سب مجازی کربلا ئیں تھیں اور یہ حقیقی کربلا تھی جو کربلا میں ہوئی۔

تو جب وہ مجازی کربلائیں تھیں اور کربلا ہوئی ہے کرب و بلا سے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مصائب جو حقیقی کربلا کے ہوں

گے، وہ مصائب نہ موسیٰ کو برداشت کرنا پڑے، نہ ابراہیم کو برداشت کرنا پڑے، نہ ہمارے پیغمبر اسلام کو، ان جیسے مصائب برداشت کرنا پڑے حالانکہ پیغمبر خدا نے فرمایا:

مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَا اُوْذِیْتُ

"جیسی اذیتیں مجھے ملیں، اتنی کسی نبی کو نہیں ملیں"۔

تو میں کہتا ہوں کہ ہم تو بحمد للہ مسلمان ہیں اور آپ کا ارشاد ہمارے لئے آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کیلئے کافی ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان سے یہ پوچھ لے کہ تمہارے رسول کا ارشاد ہے: بربنائے واقعات ثابت کرو کہ تمہارے رسولؐ کو جو ایذائیں ملیں، وہ کسی پیغمبر کو نہیں ملیں اور پھر قرآن و حدیث میں آپ ہی کی کتابوں سے وہ ان ایذاؤں کی فہرست بھی دکھا دے جو دوسرے انبیاء و مرسلین کو پیش آئیں تو یاد رکھئے کہ ایک مسلمان کی شاید روانی کلام کم ہو جائے، زبان میں گرہ پڑ جائے۔ اگر حسینؑ کو رسولؐ سے الگ کرلیں۔ لیکن اگر مصائب حسینؑ مصائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فہرست میں داخل ہیں تو پیغمبرؐ نے یہ بات تو نہیں کی کہ میرے جسم پر زخم اتنے آئے ہیں کہ کسی نبی کے جسم پر نہیں آئے۔ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے ایذا اتنی پہنچی۔

اب پوچھ لیجئے کسی بھی حساس انسان سے کہ اولاد کی تکلیف سے اسے ایذا ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ فاطمہ زہراؑ کیلئے ہو، وہ بھی رسولؐ کی ایذا اور اب یہ تلخ بات ہے کہیں میں بھی اس کی زد میں نہ آ جاؤں کہ قیامت تک جو بھی اس کے دین کے خلاف ہوتا ہے، وہ پیغمبر خدا کی ایذاؤں کی فہرست میں داخل ہے۔ اگر ان کی رسالت قیامت تک کیلئے ہے، اگر ان کا دین قیامت تک کیلئے ہے تو اس دین پر جو مصائب آئیں، کسی بھی دور میں، وہ سب پیغمبر کے مصائب میں داخل ہیں۔ اب بتائیے کون نبی آتا ہے ہمارے پیغمبرؐ کے مقابل موقف امتحان میں اور کون پیغمبر آتا ہے موقف امتحان میں ہمارے رسولؐ کے سامنے۔

تو یہ کربلا ہے اور جب کربلا ہے تو یہاں مصائب بھی جو ہوں گے، وہ کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ اسی لئے وہ پہلا جزو کہ کسی نے بیعت نہیں کی، اس کے لحاظ سے میں کہا کرتا ہوں کہ امام حسینؑ نے کوئی نیا کام نہیں کیا، انہوں نے وہی کیا جو انؑ کے پیش رو ہمیشہ کرتے آئے تھے۔ کس کی بیعت کی؟ انہوں نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ اسی لئے امام عصرؑ نے فرمایا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ آدَمَ صَفْوَةِ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ مُوْسٰی كَلِیْمِ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ عِیْسٰی رُوْحِ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ نُوْحٍ نَبِیِّ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلِ اللهِ.

کیا یہ نسبی وراثت ہے اگر نسبی وراثت ہوتی تو اس میں یہ نہ آتا کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ مُوْسٰی كَلِیْمِ اللهِ. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَاوَارِثَ عِیْسٰی رُوْحِ اللهِ. کیونکہ وہ ان کے شجرہ نسب میں نہیں آتے ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ یہ نسبی وراثت نہیں ہے۔ یہ خالص حق کی وراثت ہے۔ وہی کام جو آدمؑ سے چلا تھا، وہی کام جو نوحؑ نے انجام دیا، وہی کام تھا جو اس وقت حسینؑ انجام

دے رہے تھے۔ انہوں نے کوئی نیا کام نہیں کیا، جو کسی نے نہ کیا ہو۔ مگر پھر بھی کہتا ہوں کہ ان کی قربانی کی مثال نہ اولین میں ہے نہ آخرین میں ہے۔ کوئی کہے کہ یہ متضاد باتیں ہو گئیں۔ ابھی تو کہا کہ یہ نئی بات نہ تھی اور ابھی کہا کہ اس کی مثال نہ اولین میں ہے نہ آخرین میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے دونوں باتیں سمجھ کر کہی ہیں۔ انہوں نے کیا وہی جو ہمیشہ کیا گیا مگر ہوا ان کے ساتھ وہ جو کسی کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔

اسے میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہمیشہ باطل کے دل میں کچھ حسرت رہ گئی۔ انہوں نے اتنا تو برداشت کرلیا، اتنا ہم نے اور کیوں نہ کیا، اگر اتنا اور کر لیتے تو یہ اس کو برداشت نہ کر سکتے، پھر ہمارا مقصد حاصل ہو جاتا۔ اس اعتبار سے صابر کے متعلق غلط فہمی رہ گئی کہ اتنا تو سہہ گئے، اتنا تو برداشت کر لیا، اس سے زیادہ ہوتا تو اس کو برداشت نہ کر سکتے۔ یہ بات کربلا میں ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئی۔ اب ظلم سوچ نہیں سکتا کہ اتنا اضافہ اور ہو جاتا تو شاید مقصد حاصل ہو جاتا اور اب صابرؑ کے متعلق سوچا نہیں جا سکتا کہ اسے تو نہ برداشت کر سکتے کیا رہ گیا جسے برداشت نہ کر سکتے؟ اور مصائب میں کیا چیز نئی آسکتی ہے؟

59

فلسفۂ قربانی

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک قوم کے پاس عظیم قربانی ہو اور وہ اس کے ذکر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔

اب گفتگو کے جو انداز ہوتے ہیں، اس کو ہر صاحب زبان سمجھ سکتا ہے کہ گھبراہٹ کے جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے اور اطمینانی جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے۔

جناب اسماعیلؑ کے جواب کا یہ ٹھہراؤ: ''اے بابا! جو حکم ہو رہا ہے، اس کی تعمیل کیجئے، اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے''۔ الفاظ کا یہ ٹھہراؤ سکون نفس کا پتہ دے رہا ہے، کوئی اضطراب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کردار ابراہیمؑ اور شاندار ہو گیا، اس لئے کہ انہوں نے تو آنکھ بند کر کے چھری چلائی ہے، اب کون ذبح ہوا، اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔

دنیا کردار کے ان پہلوؤں پر غور نہیں کرتی کہ علی اکبرؑ سا بیٹا چلا جائے، جس کیلئے سولہ اپنی جگہ کھڑے ہوں مگر جناب ام لیلیٰ نے قدم خیمے سے باہر نہیں نکالا

فلسفۂ قربانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ۔

تمام سلسلہ انبیاء میں ہمارے پیغمبر سے پہلے سب سے بالاتر ذات حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تھی۔ اس لیے ان کا امتحان دہرا ہوا۔ ذات کے بارے میں بھی امتحان اور اولاد کے بارے میں بھی امتحان۔ ذات کے بارے میں امتحان ہوا کہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈالے گئے۔ اس کا ذکر کل کر چکا۔ اب دوسرا امتحان اولاد کے بارے میں۔ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے ہمیں اس امتحان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا عظیم امتحان یعنی آگ میں پھینکا جانا اور اس کا گلزار ہو جانا۔ اس کا ذکر صرف دو جگہ ایک ایک اور دو دو آیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر اتنے اختصار کے ساتھ ہوا ہے اور یہ امتحان جو اولاد کے بارے میں تھا، اس کا ذکر کئی آیتوں میں مسلسل، شروع سے لے کر آخر تک کی ترتیب کے ساتھ اس کی کڑیاں موجود ہیں۔ یہ میں بتاؤں گا کہ درمیان کی کڑیاں اکثر سننے والے کی سمجھ پر چھوڑ دی بنظر اختصار ترک کی گئی ہیں ورنہ آغاز کار اور انجام کار اس سب کو قرآن مجید نے نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سلسلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے:

وَبَشَّرۡنٰہُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ۔

"ان کو ہم نے ایک متحمل بیٹے کی بشارت دی"۔

اب اس بشارت کے لفظ سے کچھ لوگوں کو دھوکہ ہو رہا ہے اور کچھ اس میں یہود و نصاریٰ کا نظریہ ہمارے نظریئے سے مختلف ہے۔ تو چونکہ دوسری جگہ، دو جگہ اس کے علاوہ، جناب اسحاق کی بشارت کا ذکر ہے اور تفصیل کے ساتھ ہے۔ تو اب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ قربانی کا واقعہ جناب اسحاق سے متعلق ہے۔ مسلمان بظاہر تو بھی مگر تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اسلام بھی، مگر شاذ و نادر غالباً اسی بشارت کے ذکر سے دھوکہ کھا کے، انہوں نے بھی ایسا قول اختیار کر لیا کہ یہ جناب اسحاق سے متعلق ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں ان علماء کا نام لے لے کر ذکر کیا ہے۔ ابتدائی صدیوں کے متعلق کہ وہ بھی ایسا ہی کہتے تھے کہ جناب اسحاق سے متعلق ہے۔ مگر زیادہ تر علمائے اسلام کا نظریہ اور عام اسلامی تصور یہ ہے کہ یہ جناب اسماعیل سے متعلق ہے۔ اب اگر انہی چند علمائے اسلام سے بحث کرتا ہوں جنہوں نے یہ قول اختیار کر لیا تو قرآن مجید کی آیتیں اور ہماری حدیثیں فیصلہ کن ہو سکتی ہیں لیکن یہاں چونکہ سامنے ایک جماعت غیر مسلمین کی ہے، لہٰذا فیصلہ قرآن مجید کی آیتوں سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ قرآن مجید کو مانتے ہی نہیں۔ تو اب ان سے گفتگو میں فیصلہ کن چیز کیا ہو؟ میرے خیال میں دو ذریعے ہیں، ایک انہی کی بائبل اور دوسرے عقلی روایت کیونکہ عقل کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں ہے۔ جو قرائن عقلی کا تقاضا ہو، اس میں مذہب و ملت کا سوال نہیں ہوتا۔

تو اب میں پہلے اس بحث کا فیصلہ بائبل سے چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کیلئے جو ناواقف ہیں، ان کی واقفیت کیلئے عرض کروں کہ جناب اسماعیل پہلے متولد ہوئے تھے اور جناب اسحاق بعد میں پیدا ہوئے۔ وہ بڑے بھائی تھے اور یہ چھوٹے بھائی تھے۔ پھر جب بائبل ہی میں دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے اور پورا اندازہ ہوتا ہے کہ جناب اسماعیل تیرہ برس بڑے تھے جناب اسحاق سے۔ اب جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب جس کا دل چاہے، وہ بائبل کو اٹھا کر دیکھ لے۔ وہ تو ہر زبان میں ہے۔ ہم تو جو اور زبان میں ہیں، ان کو ترجمہ قرآن کہتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں ہر زبان والی بائبل اصلی ہے کیونکہ ان کے پاس اصل کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آپ ان سے جا کر کہیے کہ بائبل دیجئے، وہ بھی دیں گے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو ترجمہ ہے۔ وہ کہیں گے: جی نہیں۔ یہی ہے اصل بائبل۔ تو وہ ہر ایک کیلئے وہی ہے اور دنیا کی سب سے زیادہ زبانوں میں جو ترجمہ ہوا ہے، وہ اسی بائبل کا ہے۔ اس لئے کسی زبان کی بائبل دیکھ لیجئے کہ جس وقت جناب ابراہیم نے فرزند کی قربانی کرنے کا تہیہ کیا، اس وقت کی ان کی ایک مناجات بارگاہ الٰہی میں بائبل میں درج ہے۔ اس کی مناجات میں وہ کہہ رہے ہیں:

"پروردگار! میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں نذر کر رہا ہوں"۔

اب ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ چھوٹا بھائی کبھی اکلوتا نہیں ہوتا۔ بڑا بھائی اس وقت تک اکلوتا رہتا ہے جب تک کہ چھوٹا بھائی پیدا نہ ہو۔ یہ اکلوتے کا لفظ قطعی طور پر اس کا ثبوت ہے کہ کہ جناب اسماعیل سے متعلق ہے اور جناب اسحاق سے متعلق نہیں ہے۔ مگر اب یہ تو ان کے مقابلہ میں فیصلہ بائبل سے ہو گیا۔ میں نے کہا تھا کہ عقلی قرائن۔ تو عقلی قرائن یہ ہیں کہ اگر یہ جناب اسحاق سے متعلق ہوتا تو اس کی یادگاریں سرزمین شام میں ہوتیں، اس لئے کہ جناب عیسیٰ اور جناب موسیٰ سے متعلق مقامات بیت اللحم وغیرہ، وہ سب موجود ہیں تو انہی میں اس قربانی سے متعلق مقامات ہوتے۔ تو ایک طرف ظرف مکاں سرزمین شام ہوتی، دوسرے ان کی دینی رسموں میں کوئی دن اس کی یادگار کا ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے متعلقہ مقامات جتنے ہیں، وہ سرزمین مکہ میں ہیں، منیٰ ہے۔ وہ کیا ہے اور وہ عرفات؟ وہ کیا ہے؟ اور وہ مزدلفہ، وہ کیا ہے؟ یہ تمام مقامات اسی قربانی سے متعلق ہیں اور اس لئے منیٰ ہی میں وہ قربانیاں کی جاتی ہیں جو روز عید قرباں وہاں ہوتی ہیں۔

عام طور پر ہمارے ہاں جو قربانیاں ہوتی ہیں، وہ مستحب ہیں مگر وہاں وہ جزو حج ہیں کیونکہ اصل قربانی کا مرکز وہی سرزمین منیٰ کی تھی۔ تو وہ تمام مقامات سرزمین مکہ میں ہے۔ ملک شام میں نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ اس سے متعلق جو دن ہیں، وہ اسلامی روایات میں ہیں۔ اگر ان کے ہاں کا یہ واقعہ ہے تو انہوں نے اس کی یادگار قائم کیوں نہ کی؟ ہمارے ہاں عید قرباں ہے تو وہ اس کی یادگار ہے۔ پورے حج کے جو مراسم ہیں، وہ اس کی یادگار ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی کیا ہے؟ یہ بھی اسی واقعہ کے متعلق یادگار ہے اور سال گزشتہ غالباً انہی مجالس میں:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔

یہ سرنامہ کلام تھا تو اس میں اس کو عرض کر چکا ہوں کہ یہ تمام چیزیں حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ سے نسبت رکھتی ہیں۔ سب اس واقعہ قربانی سے متعلق ہیں۔ اب یہ تو فیصلہ ان کے مقابلہ میں ہو گیا۔ یہ جو چند پرانے علمائے اسلام ہیں، وہ بھی اس کے قائل ہیں۔ تو

اب ان کیلئے قرآن مجید پیش کروں کہ یہ "بشرناہ بغلام حلیم"، یہ پورا سلسلہ چلا اور قربانی کا ذکر ہو گیا اور اس قربانی کے ذکر کے بعد ہے "وبشرناہ باسحٰق"، پھر ہم نے ان کو اسحاق کی بھی بشارت دی۔ تو اب تو پتہ چل گیا کہ وہ پہلی بشارت کسی اور فرزند کی تھی۔

مگر جناب! یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف سے میری نظر میں ایک بڑا نتیجہ حاصل ہوا اور وہ یہ کہ یہ قربانی ایسی عظیم شے ہے کہ اسے ہر ایک اپنانا چاہتا ہے۔ آخر یہ شوق کیوں ہے؟ اگر قربانی کوئی عظیم چیز نہیں ہے تو دوسری جماعت کیوں کہہ رہی ہے کہ ہمارے ہاں ہے، ہمارے مورث اعلیٰ کا واقعہ ہے؟ معلوم ہوا کہ قربانی اتنی عظیم شے ہے کہ جہاں نہیں ہے، وہ بھی اسے اپنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک قوم کے پاس عظیم قربانی ہو اور وہ اس کے ذکر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔

یہ تو پہلی آیت میں میں نے پیش کر دیا "بشرناہ بغلام حلیم"۔ یہ اختلاف اور اس کا فیصلہ۔ اب یہ تو تمہید تھی کہ ہم نے بشارت دی ایک متحمل فرزند کی۔ اب یہاں سے قربانی کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ بشارت یوں دی۔ اب ظاہر ہے کہ درمیان کی کتنی کڑیاں کہ وہ متولد ہوئے۔ اسے سننے والے کے ذہن پر چھوڑا:

"فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ"۔

اب نشوونما ہوئی اور بڑے ہوئے اور اب وہ لڑکا جو پیدا ہوا، اس عمر کو پہنچ گیا کہ دوڑ دھوپ کر سکے۔ سعی کے معنی دوڑنا۔ تو "فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ"۔ جب وہ اس حد تک پہنچ گیا کہ باپ کے ساتھ ذرا دوڑ دھوپ کر سکے۔ اس میں دو چیزیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ابھی جوانی کی منزل تک نہیں پہنچا ہے۔ بس اتنا ہی اور ایک یہ کہ بہت کمسن بھی نہیں کہ جو باپ کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ درمیانی عمر ہے۔ بچپن اور شباب کے درمیان کی۔ بس اتنی کہ ابھی تھوڑا سا وہ چل پھر کر باپ کی خدمت کر سکتا ہے۔ تو جب یہ ہوا تو اب ہمارے علم میں کیا ہے کہ انہوں نے خواب دیکھا۔ اب بنظر اختصار قرآن مجید خواب کا ذکر نہیں کرتا کہ انہوں خواب دیکھا اور وہ کیا دیکھا۔ نہیں، بلکہ جب وہ سعی کی منزل تک پہنچا تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ اب اسی سے سمجھ لیجئے کہ خواب دیکھا اور یہ بھی روایتیں بتاتی ہیں کہ تین روز مسلسل دیکھا۔ یہ قرآن کے الفاظ سے نمایاں ہے۔ صیغہ ماضی نہیں ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا۔ اس کیلئے ہوتا:

"رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ"۔

اس کے معنی ہوتے کہ میں نے خواب میں دیکھا۔ یہاں مضارع کا صیغہ ہے:

"إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ"۔

میں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔

دیکھ رہا ہوں کے معنی یہ ہیں کہ کئی دفعہ یہ دیکھا ہے۔ بس اب سمجھ لیجئے کہ خلیل کہہ رہے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا اور دیکھ رہا ہوں۔ تو اس واقعہ کو جو نہیں بیان ہوا، تو سمجھ لیجئے کہ انہوں نے خواب دیکھا، جبھی تو بیان کیا کہ "يَا بُنَيَّ"۔ اے میرے بچے، "إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ"، میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ "إِنِّي أَذْبَحُكَ"، کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ "فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ"، ذرا تم دیکھو کہ

تمہاری کیا رائے ہے؟

میں بارگاہِ جناب ابراہیم میں عرض کروں گا کہ اے خلیل اللہ! خواب دیکھا ہے آپ نے، حکم ہوا ہے آپ کو۔ اس کی تعمیل فرمائیے۔ یہ بیٹے سے رائے لینے کے کیا معنی کہ تم دیکھو کہ تمہاری رائے کیا ہے؟

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اگر بیٹے سے یوں ذکر نہ کرتے تو قربانی فقط کارنامہ ابراہیم ہوتی، کارنامہ اسماعیل نہ ہوتی اور جب بیٹے سے اس طرح ذکر کر لیا تو بیٹے نے وہ جواب دیا جو ابھی بیان ہوگا اور پھر قربانی ہوئی۔ تو اب وہ دونوں کا کارنامہ ہے۔ باپ کا بھی کارنامہ ہے اور بیٹے کا بھی کارنامہ ہے۔

اب جناب! ایک دوسرا سوال میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حکم اتنا شدید کہ طبیعت انسانی پر گراں ہے کہ اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ تو حکم اتنا شدید اور ذریعہ حکم اتنا خفیف یعنی خواب۔ ہمیں معلوم ہے کہ کس طرح احکام آتے ہیں، فرشتہ آتا، پیغامِ الٰہی پہنچاتا۔ یہ عام طریقہ ہے۔ خواب بھی ایک وحی کی قسم ہے۔ مگر عام طریقہ تو یہ ہے حکمِ الٰہی پہنچانے کا۔ جی نہیں، اتنا عظیم حکم اور وہ صرف خواب کے ذریعہ؟ تو یہی میرے موضوع کلام کا ایک اہم رکن ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ امتحان جب ہے تو اُسے ذریعہ ایسا رکھنا ہے جسے ناقص نفوس خواب کہہ کر ٹال سکتے ہوں۔ اب دنیا دیکھے کہ خلیلِ حق اس خواب کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اچھا! اس نے خواب دکھلایا، کیا ابراہیم نہیں جانتے کہ یہ حکم ہے۔ مگر وہ بھی بیٹے سے خواب ہی کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ مجھے حکم ہو رہا ہے۔ یہی بیان کر رہے ہیں کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر کہہ دیتے کہ حکم ہو رہا ہے تو یہ ٹکڑا بے جوڑ ہوا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ جب حکم ہو گیا تو رائے کا کیا سوال؟

پھر یہ کہ یہاں پر بڑا چھوٹے کا امتحان لیتا ہے۔ خالق اپنے خلیل کا امتحان لے رہا ہے اور اب خلیل اپنے فرزند اسماعیل کا امتحان لے رہے ہیں۔ یاد رکھئے کہ امتحان میں ایک پرچہ سوال کا ہوتا ہے۔ وہ پرچہ درسگاہ کے جو کرتا دھرتا ہیں، ان کے پاس آتا ہے اور وہ طالب علموں میں بانٹا جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے سوال کا پرچہ۔ اس کے بعد طالب علم جواب کی کاپی لکھتا ہے۔ وہ جواب کی کاپی طالب علم کے پاس سے جاتی ہے پہلے درسگاہ کے سربراہان کے پاس۔ وہاں سے ممتحن کے پاس۔ تو میں کہتا ہوں کہ اللہ نے خواب دکھا دیا، یہ تو سوال کا پرچہ ہے جو خالق نے اپنے خلیل کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے بیٹے سے مشورہ لیا، یہ ابھی سوال کا پرچہ ہی ہے جو باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب تک سوال کا پرچہ رہا، تب تک لفظ خواب رہا اور جہاں سے جواب کی کاپی شروع ہوئی، اسماعیل نے لفظ بدل دیا، اسماعیل نے یہ نہیں کہا کہ جو خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر آپ سامنے لائیے۔ وہ اب خواب کا لفظ نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔

"بابا! جو حکم ہو رہا ہے، اس کی تعمیل کیجئے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے"۔

اب گفتگو کے جو انداز ہوتے ہیں، اس کو ہر صاحب زبان سمجھ سکتا ہے کہ گھبراہٹ کے جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے اور اطمینانی جواب کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ جناب اسماعیل کے جواب کا یہ ٹھہراؤ کہ "اے بابا! جو حکم ہو رہا ہے، اس کی تعمیل کیجئے، اللہ نے چاہا تو آپ

مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ الفاظ کا یہ ٹھہراؤ سکونِ نفس کا پتہ دے رہا ہے۔ کوئی اضطراب نہیں ہے۔ نفس مطمئن ہے۔ بے شک بڑا عزم ثابت ہوتا ہے۔ الفاظ ہی سے ثابت قدمی ظاہر ہوتی ہے۔

مگر ایک حقیقت کی طرف توجہ دلاؤں کہ کہہ رہے ہیں: "اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ یعنی اتنے عظیم امتحان میں کامیابی کے بعد منفرد صابر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ کہتے ہیں کہ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی جماعت صابرین کی سامنے ہے جس سے ملحق ہو جانا اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اب عزم کی منزل میں بات طے ہوگئی کہ باپ بھی تیار، بیٹا بھی تیار۔ اب جب عمل کی منزل آئی تو اسے قرآن مجید نے کس طرح ادا کیا، کتنی تفصیل سے تذکرہ کیا مگر یہاں انتہائی اختصار سے "فَلَمَّا أَسْلَمَا"، یہ اس عظیم امتحان کی کامیابی کیلئے جب آئے ہیں باپ اور بیٹے دونوں، "اسلما" تثنیہ کا صیغہ ہے۔ اگر الف نہ ہوتا تو واحد کا صیغہ ہوتا اور جب "أَسْلَمَا" ہوگیا تو دو کا صیغہ ہوگیا۔

مطلب یہ ہے کہ دونوں حکم کی تعمیل کیلئے آگئے۔ مگر اسے کس لفظ سے قرآن مجید نے ادا کیا ہے، وہ قیامت تک کے ہر مسلمان کیلئے قابلِ لحاظ ہے۔ کتنا عظیم امتحان اور اس کی تیاری کیلئے آنا اور اس کی تعمیل کیلئے آنا اور اس کو ایک لفظ میں "فَلَمَّا أَسْلَمَا"، جب وہ دونوں عملاً مسلم ہو کر آگئے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قربانی اتنی اہم ہے کہ جزوِ اسلام ہے کہ ایسی عظیم قربانی کیلئے قرآن مجید لفظاً اسلام کو منتخب کرتا ہے۔

"لَمَّا أَسْلَمَا"، جبکہ بالکل مسلم ہو کر وہ آگئے۔ پھر اس کے بعد "وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ"، اس نے یعنی باپ نے اس کو یعنی بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔ خواب میں آپ سن ہی چکے ہیں کہ آپ کیا دیکھ رہے تھے؟ "إِنِّي أَذْبَحُكَ"، میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ اب یہاں قرآن مجید گویا سننے والوں کے آبگینۂ خاطر اتنے نازک دیکھ رہا ہے کہ اس منظر کا تذکرہ وہ لفظوں میں بھی نہیں سن سکتے، لہٰذا بس یہاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ "تَلَّهُ لِلْجَبِينِ"، پیشانی کے بل لٹایا۔ گویا خلاق یہ کہہ رہا ہے کہ اب ہم سے نہ سنو کہ کیا کیا؟ وہی کیا جو حکم ہوا تھا۔ اب اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بس تمہید اس کی جو ہے کہ پیشانی کے بل لٹایا، اسی کا ذکر ہے۔

"تَلَّهُ لِلْجَبِينِ وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ"۔

اور بس جو حکم ہوا تھا، اس کی تعمیل کی اور ہم نے آواز دی کہ بس! اے ابراہیم۔ کیا؟

"قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا"۔

"تم نے خواب سچ کر دکھایا"۔

بس بس۔ اب یہاں عام طور پر اکثر مقررین ممکن ہے کہ بعض واعظین سے بھی آپ نے سنا ہو، یہ کہہ دیتے ہیں کہ خالق نے اپنا حکم اٹھا لیا یعنی منسوخ کر دیا۔ حکم میں تبدیلی پیدا کر دی۔ مگر مجھے اس سے قطعاً تعلق نہیں ہے۔ یہ تصور غلط ہے، اس کو از روئے عقل بھی میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور قبل میں جو خطاب ہوا تھا، اس کی بناء پر بھی عقل و قرآن کی شرکت سے بھی پیش کروں گا اور پھر تنہا

قرآن سے بھی اس کو پیش کروں گا۔ عقلی بات تو یہ ہے، ذرا غور کیجئے کہ اکثر نتائج غیر اختیاری ہوتے ہیں کیونکہ اسباب کی آخری کڑی اپنے ارادہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا آخر تک نتیجہ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اس کی مثال دینے میں میں نے دوسرے کی جان لینے میں آسانی کبھی تھی جدید طریقے سے کیونکہ وہاں فاصلہ میں دکھا سکتا تھا کہ گولی بندوق سے رہا ہوگئی اور ابھی وہاں تک پہنچی نہیں۔ اب بیچ میں جتنا فاصلہ ہے، ابھی وہ شخص قتل نہیں ہوا مگر بے بس ہے۔

میں نے یہ طریقہ کیوں پسند کیا؟ اس لئے کہ چھری وغیرہ یا تلوار کے طریقہ میں فاصلہ میں نہیں دکھا سکتا تھا۔ وہاں خودکشی میں دریا والا طریقہ اپنے مطلب کا سمجھا کہ وہاں پل سے لے کر دریا تک ایک مسافت ہے اور یہاں میں نے یہ طریقہ اپنے مقصد کیلئے زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ مگر اب یہاں مجھے اس مشکل کو آسان کرنا ہے کہ میں ذبح کی منزل میں دکھاؤں کہ اختیار کہاں سلب ہوتا ہے اور بے اختیاری کی صورت میں نتیجہ کیونکر مرتب ہوتا ہے؟ وہاں میں اس مشکل میں نہیں پڑا مگر یہاں مجبوراً اس مشکل میں پڑتا ہے۔

تو اب میں آپ سے فیصلہ چاہتا ہوں۔ مگر ایک عقلی بات کہ ہمیشہ تکلیف شرع اختیاری فعل سے متعلق ہوتی ہے جو انسان کے ارادے سے متعلق ہو۔ تو دیکھئے کہ ذبح کی منزل میں جو افعال ارادے سے ہوں، وہ کیا کیا ہیں؟ جسے ذبح کرنا ہے، اُسے سامنے لٹایئے، ایک یہ کام۔ وہ کوئی دھاردار چیز ہاتھ میں لے جس سے رگ ہائے گردن قطع ہوں، یہ دوسرا کام جو ارادے سے متعلق ہے۔ تیسرا کام ہاتھ کو وہ جنبش دینا جس رگ ہائے گردن قطع ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب ہر صاحب عقل جائزہ لے کہ ان میں سے کونسی بات جناب ابراہیم نے نہیں کی۔ کیا بیٹے کو سامنے نہیں لٹایا؟ کسی اور کو لٹایا؟ تو قرآن کہہ رہا ہے کہ اسی کو "تلّهٗ لِلْجَبِیْنِ"۔ اسی کو سامنے لٹایا۔ کیا چھری ہاتھ میں نہیں لی؟ کوئی نمائشی چیز ہاتھ میں لی؟ نہیں یہ غلط۔ پھر چھری ہاتھ میں لی۔ اب زیادہ نازک مرحلہ تیسرا ہے۔ کیا ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی جس سے رگ ہائے گردن قطع ہوتے ہیں؟ اگر ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی تو وہ گوسفند بھی کیونکر ذبح ہوا جو فدیہ میں آیا تھا؟ اس لئے کہ اس گوسفند کے ذبح کی نیت تھی۔ اسی سے وہ گوسفند ذبح ہوا ہے۔

تو افعالِ ارادی تو سب عمل میں آگئے۔ اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا؟ تو یہ عقلی بات ہوگئی کہ یہ تصور غلط ہے کہ حکم منسوخ ہوگیا۔ حکم منسوخ کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں حکم لفظی تو نہیں تھا کہ فرشتے نے آکر پیغام زبانی لفظوں میں پہنچایا ہو۔ یہاں تو حکم بذریعہ خواب تھا۔ تو خواب دیکھئے کیا تھا؟ خواب یہ دیکھا ہوتا کہ میں بیٹے کو ذبح کر چکا ہوں تو عمل میں کچھ رہ گیا؟ اب خواب یہی دیکھا تھا کہ ذبح کر رہا ہوں تو جو خواب دیکھا تھا، وہ عمل میں پورے طور پر لے آئے۔ اب اور حکم کہاں تھا جو منسوخ ہوگا؟ اب تیسری بات صاف طور پر قرآن سے پوچھوں کہ صدا کیا آئی؟ تو قرآن یہ کہہ رہا ہے، یہ نہیں کہتا کہ ہم نے پکار کر کہا کہ بس بس۔ اب ہم اپنا حکم اٹھاتے ہیں۔ جی نہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ ادھر سے یہ آواز آئی کہ بس بس! تم نے خواب سچ کر دکھایا۔ یعنی جو حکم تمہیں ملا تھا، اس کی تعمیل تم نے کر دی۔

جناب! دلیل وہ ہوتی ہے جو قطعی ہو اور بہت مستحکم ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جناب ابراہیم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ اسے مصائب کربلا کے ساتھ موازنہ میں پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بے شک یہ قربانی پیش کی مگر محبت فرزند کی بناء پر آنکھوں پر پٹی باندلی

تھی۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے اس واقعہ سے انکار کی ضرورت نہیں ہے۔ پٹی باندھ لی ہو تو کیا ہے؟ جو حکم ہوا تھا، اس کی تعمیل کیلئے آئے ہیں۔ اسلام دلوں سے آل اولاد کی محبت نکالنے کیلئے نہیں آیا ہے۔ یہ محبت بھی جزو اسلام ہے۔ لہٰذا اگر بیٹے ہی کی محبت میں آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو تو حکم کی تعمیل میں اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال اگر یہ واقعہ صحیح ہے، اگرچہ مستند ماخذوں میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے، اس لئے یہ اگر تکرار کر رہا ہوں۔ بہر حال یہ چیز جو میں نے بھی سنی ہے اور آپ نے بھی سنی ہوگی، اگر یہ بالکل صحیح ہے تو میں کہتا ہوں، اب اس کو چاہے محاورہ کے طور پر دیکھ لیجئے، عقلی طور پر دیکھ لیجئے، اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نتیجہ کو دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ کردار ابراہیم اور شاندار ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے تو آنکھ بند کر کے چھری چلائی ہے۔ اب کون ذبح ہوا؟ اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے:

يَاإِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَاءَ۔

اصل بیانِ واقعہ میں تو اتنا اختصار ہوا تھا مگر اب یہاں قرآن مجید بسیط و تفصیل سے کام لے رہا ہے کہ ہم نے اس کا فدیہ دے دیا، ذبح عظیم کے ساتھ۔ ذبح عظیم کو ہم نے اس کا فدیہ قرار دے دیا۔ تو اب مشکل یہ ہے کہ فدیہ میں کیا آتا ہے؟ وہ ہمیں معلوم ہے کہ کیا تھا۔ وہ گوسفند تھا۔ تو اب علمائے جمہور، بڑے بڑے اکابر علماء خواہ علامہ فخر الدین رازی ہوں، حافظ طبری ہوں، علامہ نیشاپوری ہوں، خواہ کوئی ہوں، بڑے بڑے علماء۔ دل میں خلش ہے کہ ذبح ہوتا تو نبی زادہ اور آئندہ ہونے والا نبی۔ فقط نبی زادہ نہیں بلکہ وہ جو سلسلہ انبیاء میں ہے، وہ ذبح ہونے والا ہے اور جو چیز فدیہ میں آئی ہے، وہ۔ ہے گوسفند۔ تو گوسفند کو اللہ اس کے مقابلہ میں ذبح عظیم کہہ دے۔ ذہن میں آتا ہے کہ گویا اتنا عظیم نہیں تھا اور ہم نے اس کا فدیہ جو قرار دیا، وہ ذبح عظیم ہے۔ تو اب گوسفند کو ان کے مقابلہ میں عظیم کہا جا رہا ہے۔

اب اس کیلئے یہ بیچارے مفسرین اس گوسفند کی عظمت دکھاتے ہیں اور اس کی عظمت کے اظہار میں مصروف ہو گئے ہیں کہ وہ گوسفند جنت کا تھا اور وہ کوئی ہزار برس سبزہ زار جنت میں چرتا رہا تھا اور وہاں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کو غذا جنت کی دی گئی تھی۔ وہ ایسا تھا، اس لئے اس کو خالق نے ذبح عظیم کہہ دیا۔ مگر ان اکابرین مذہب اور علماء سے میرا یہ سوال ہے کہ جناب! وہ جنت کا تھا اور جنت کے میوے کھاتا رہا اور جنت کے سبزہ زار میں چرتا رہا، اس سب کے باوجود وہ گوسفند ہی رہا۔ تو پھر سوال تو باقی رہا کہ نبی زادے کے مقابل میں اسے ذبح عظیم کہہ دیا گیا؟ یہ ایک پریشانی ہے اور ان بیچاروں کی پریشانی کے دور ہونے کا کوئی سامان نہیں ہے کیونکہ ان کے جتنے داری ہیں، وہ اس سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ اب ہمیں بھی بہر حال پریشانی تو ہونی چاہئے تھی لیکن ہماری پریشانی اپنے ہاں کی تفسیر کو دیکھ کر دور ہو گئی جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے وارد ہوئی ہے کہ ذبح عظیم سے مراد قربانی کربلا ہے۔ اب وہ خلش تو دور ہو گئی۔

دوسرے مسلمان چاہے نہ چاہتے ہوں کہ انبیاء کے مقابلہ میں اور ہستیاں بھی افضل ہو سکتی ہیں مگر ہم تو بحمد للہ مانتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اور ہستیاں نہیں جو خاتم الانبیاء کے اجزاء ہیں، وہ گزشتہ انبیاء سے افضل ہونے چاہئیں۔ لہٰذا ہمارا دل بالکل قبول کر لیتا ہے کہ بے شک وہ نبی ہیں اور نبی زادے میں سب کچھ ہے۔ لیکن یہاں "سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ" میں اور ان کی قربانی ہے اور حدیث متفق علیہ ہے "سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ"۔ یہ بھی صحاح ستہ کی حدیث ہے۔ تو اب دبی زبان سے ان علماء سے جو اس میں تامل کرتے ہیں کہ انبیاء سے

کیونکر افضل ہو سکتے ہیں، ان سے میں بس ایک سوال کروں گا کہ انبیاء بھی اہل جنت میں ہیں یا نہیں؟ بس اس سرداری کے دائرے سے بلا ئدۂ عقل ایک تو متکلم خارج ہوگا جو اس سرداری کا تاج پہنا رہا ہے، وہ متکلم خارج ہوگا یا بس وہ جسے وہی اپنے الفاظ سے مستثنیٰ کردے کہ اس کے ساتھ ایک تتمہ بھی ہے کہ "اَبُوْهُمَا خَيْرٌ مِّنْهُمَا"، ان کا باپ ان دونوں سے بہتر ہے۔ باقی اور کوئی اب اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ جس کو ان کی سرداری کے دائرہ سے نکلنا ہو، وہ جنت سے استعفیٰ دے دے۔ یہ پریشانی تو بالکل دور ہو گئی۔ بے شک ان کو اُن کے مقابلہ میں ذبح عظیم کہنا درست ہے۔

مگر جناب! کیا کروں کہ میرے ذہن میں ایک اور پریشانی پیدا ہو گئی، ایک خلش اور پیدا ہو گئی، وہ یہ کہ جس کا فدیہ ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مقصود اصلی ہے اور جو فدیہ ہے، وہ ثانوی طور پر مقصود ہے۔ تو یہ پریشانی کسی اور کو نہ ہوتی، ہم ہی کو ہو سکتی ہے کہ جناب اسماعیل بڑے جلیل القدر سہی لیکن ان کا فدیہ سید الشہداء ہو جائیں، یہ کچھ ذہن میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اب یہ خلش بہت بڑی ہے۔ حقیقت میں یہ خلش ہے ترجمہ کی غلطی کی وجہ سے کہ "ب" کو صلہ اور تادیہ قرار دے لیا ہے کہ ذبح عظیم کو ہم نے فدیہ بنایا۔ اس سے یہ پریشانی پیدا ہوئی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ہے ہی نہیں۔ یہ "ب" تادیہ اور صلہ کا نہیں ہے۔ یہ "ب" بائے سبب ہے۔ "فَدَيْنَاهُ"، ہم نے فدیہ بھیج دیا۔ بات پوری ہو گئی۔ ہمیں معلوم ہے کیا ہے؟ وہ وہی گوسفند تھا۔ "فَدَيْنَاهُ"، یہ جملہ گویا مکمل ہو گیا کہ امتحان ہو گیا، کامیابی حاصل ہو گئی۔ ہم نے کہا کہ ہم نے فدیہ بھیج دیا اور وہ جو بھیجا، وہ ہمیں معلوم ہے کہ گوسفند ہے۔ اب وہ گویا کہتا ہے کہ ہم سے پوچھو کہ ہم نے کیوں وہ فدیہ بھیج دیا؟

چونکہ سنت الٰہیہ یہ نہیں رہی ہے کہ وہ اپنے انبیاء و اولیاء کو خطروں سے بچایا کرے، اگر وہ انبیاء و اولیاء کو خطروں سے بچایا کرتا تو مثال استقلال کیونکر قائم ہوتی؟ زکریا کو آرے سے چیر ڈالا گیا تو آرے کو ان کے چیرنے سے نہیں روکا گیا۔ اسی طرح یحییٰ کا سر قلم کیا گیا تو تلوار کو کند نہیں کیا گیا۔ تو سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ انبیاء پر اگر حربے ہوں تو وہ کارگر ہوں۔ بچانا اُس کا اصول نہیں ہے۔ تو یہ آخر کیوں بچایا؟ فدیہ کیوں بھیجا؟ وہ کہتا ہے: سنو! ہمارا مقصد تو ہے مثال قربانی پیش کرنا۔ یہ اس جملے کی شرح ہے جو میں کر رہا ہوں۔ مقصد خالق کا ہے قربانی کی عظیم سے عظیم مثال پیش کرنا۔ اگر یہ انتہائے نقطۂ قربانی ہوتا تو ہو جانے دیا ہوتا تاکہ قیامت تک کیلئے مثال رہے۔ فدیہ نہ بھیجا جاتا۔ لیکن چونکہ علم الٰہی میں ایک اس سے عظیم تر قربانی آنے والی تھی اور وہ عظیم تر قربانی اسی کی نسل میں آنے والی تھی، لہٰذا ضرورت تھی کہ اس وقت عبوری دور دنیا میں ایک مثال قربانی کی عزم و جزم کی حد تک لا کر چھوڑ دی جائے تاکہ پھر وہ نسل آئے جو اس سے زیادہ قربانیوں کی تاریخ مرتب کرے گی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی زادے کو عافیت پسندی کیلئے نہیں بچایا بلکہ قربانی کو بلند تر قربانی کی خاطر روکا گیا تاکہ وہ بلند تر قربانی آ جائے۔ اس وقت اس بیان سے "حُسَيْنٌ مِنِّي وَاَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ" کے ایک خاص معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ حسین مجھ سے ہے، وہ تو نسبی طور پر، اور میں حسین سے ہوں، اگر حسین نہ ہوتے تو اسماعیل ذبح ہو گئے ہوتے یہ نسل ہی کب ہوتی۔ تو اب میں "حُسَيْنٌ مِنِّي وَاَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ" کا اُردو زبان میں ترجمہ کروں گا کہ حسین مجھ سے ہے، یعنی میں نہ ہوتا تو حسین نہ ہوتے اور میں حسین سے ہوں یعنی حسین نہ

ہوتے تو میں بھی نہ ہوتا۔

بس اہل عزا! اب اس سے الگ ایک خلش جو میرے دل کی تھی، وہ بھی دور ہوگئی۔ وہ خلش کیا تھی کہ اقبال نے تو ہمت کی شکوہ کرنے کی، ہر ایک کی ہمت نہیں ہوتی۔ دل میں شکوے آتے ہیں، زبان سے کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تو میرے تو ذہن میں تھا ایک احساس شکوہ کا پیدا ہوتا تھا کہ پروردگار اخلیل کے فرزند کا فدیہ بھیج دیا اور حبیب کے فرزند کا فدیہ تو نے نہیں بھیجا۔

اگر آپ محسوس کریں تو آپ کے ذہن میں بھی، چاہے آپ اس کا اظہار نہ کریں۔ یہ خلش پیدا ہونی چاہئے تھی مگر میری گزشتہ تشریح کی بناء پر یہ خلش بھی ذہن سے دور ہوگئی۔ خلیل کے فرزند کا فدیہ آگیا، اس لئے کہ اس سے بالاتر درجہ قربانی اللہ کے علم میں تھا۔ حسین کا فدیہ نہ آیا، اس لئے کہ اس کے بعد اس سے اونچا درجہ قربانی اب علم الٰہی میں نہ تھا۔ بس اب باب مصائب ہے۔

ارباب عزا! وہ ہے قربانی اسماعیل اور یہ ہے قربانی حسین۔ دیکھئے! قربانی اسماعیل میں کس کا امتحان ہے؟ باپ کا امتحان ہے کہ وہ قربانی کر رہا ہے۔ بیٹے کا امتحان ہے کہ وہ قربان ہو رہا ہے۔ کربلا میں حسین بوقت واحد خلیل بھی ہیں اور ذبیح بھی ہیں۔ یہ ذبیح ہیں رسول اللہ کی نسبت سے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے یہ دین کی طرف سے قربان ہو رہے ہیں اور یہ خلیل ہیں اپنے علی اکبر اور اپنے علی اصغر کے لحاظ سے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ انہوں نے اٹھارہ اسماعیل راہ خدا میں نذر کر دیئے۔ کوئی کہے کہ کیا یہ سب اسماعیل تھے؟ میں کہتا ہوں کہ میں کیا کروں؟ سید الساجدین علیہ السلام کی معصوم زبان پر عجیب جملہ ہے۔ جب منہال نے پوچھا کہ مولا کب تک گریہ کیجئے گا۔ تو سید سجاد نے فرمایا کہ یعقوب کے بارہ فرزند تھے، ایک فرزند نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا تو اتنا روئے کہ آنکھوں کی بصارت ختم ہو گئی اور میرے سامنے

بس یہ جملہ ہے جو عرض کرنا ہے۔ پوری روایت اس وقت عرض نہیں کرنی ہے۔ فرماتے ہیں: میرے سامنے تو اٹھارہ جوانان ہاشمی و عقیلی و جعفری، جن کی مثل و نظیر روئے زمین پر نہ تھی، وہ سب قربان ہو گئے تو میں گریہ نہ کروں؟

تو اب آپ نے دیکھا کہ وہ اٹھارہ کیسے تھے؟ ایک اور پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں۔ وہاں دکھا چکا ہوں سعی کی منزل میں کہ جب بم "فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ"، جب وہ سعی کی منزل میں پہنچا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں دونوں پہلو ہیں۔ کمسنی کا پہلو بھی کہ ابھی وہ جوانی تک نہ پہنچا۔ ایک عمر کے بڑھنے کا بھی پہلو کہ ایسا چھوٹا نہ تھا۔ ایسا تھا کہ چل پھر سکے، باپ کا مددگار ہو سکے۔ یہ دو پہلو تھے اسماعیل میں جسے قرآن نے ایک لفظ میں جمع کیا تھا۔ میں دو جملوں میں مصیبت کے دو ٹکڑے کو لے رہا ہوں کہ وہ جو دو امر کے بڑھنے کا پہلو تھا، وہ ترقی کر کے علی اکبر تک پہنچا اور وہ جو کمسنی کا ہے وہ ترقی کر کے علی اصغر تک پہنچا۔ وہ دو باپ کے مددگار ہو سکتے تھے کہ چل پھر سکتے تھے اور وہ بیٹا اگر قربان ہو جو باپ کا دست و بازو بن چکا ہو، مکمل جوان ہو۔ مشہور روایت کے مطابق اٹھارہ برس اور کچھ علماء کے نزدیک پچیس برس اور عباس کی عمر چونتیس (۳۴) برس یعنی دونوں تقریباً برابر کے جوان۔

میں نے کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا، عراق کے منبروں پر سنا ہے، انہوں نے کہیں دیکھا ہوگا کہ یہ عباس و علی اکبر دونوں جوان اور نوجوان کیسے تھے کہ جب مدینے کے بازار میں نکلتے تھے تو جب تک سامنے رہتے تھے خرید و فروخت موقوف رہتی تھی۔ سب کاروبار بند ہو جاتا تھا۔ لوگ دونوں جوانوں کو دیکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ چچا بھتیجا ایسے برابر کے جوان تھے۔ اب حسین کے دل کی خبر لیجئے

کہ عباس جا چکے اور علی اکبر سامنے کھڑے ہیں۔

عموماً عشرۂ محرم کے بعد وہ اثر نہیں رہتا جو عشرۂ محرم کی مجالس میں رہتا ہے۔ مگر بحمد اللہ آپ ہر مجلس میں یہ ثبوت دیتے ہیں کہ آپ کیلئے وقت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر وقت آپ ویسا ہی اثر لے سکتے ہیں۔ ایک پہلو عرض کروں کہ خود کسی مصیبت کا ضبط کرنا اور اٹھا لینا آسان ہوتا ہے لیکن کسی تڑپتی ہوئی ماں کو دیکھنا، کسی بلکتی ہوئی بچی کو دیکھنا، کسی روتی ہوئی بہن کو دیکھنا، یہ وہ ہے کہ جب صبر و ضبط کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم نے ایسے متحمل دیکھے ہیں کہ قبرستان میں جنازہ لے گئے ہیں، نہیں روئے۔ دفن کر کے آئے، نہیں روئے۔ مگر جب گھر پر آ کر کسی بچی کو تڑپتا ہوا دیکھا، کسی ماں کو روتا ہوا دیکھ لیا تو اب گریہ طاری ہو گیا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ جناب ابراہیم بڑے صاحب عزم مگر جب جانے لگے تو ماں کو نہیں بتایا کہ کہاں لئے جا رہا ہوں۔ جناب ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ تو بالکل صحیح کہا کہ ایک دوست کے بلانے پر جا رہا ہوں۔ خلیل اللہ تھے، ان کو یہ کہنے کا حق تھا کہ دوست کی فرمائش پر جا رہا ہوں۔ اس کے بعد چھری اور رسی مانگی تو اب جناب ہاجرہ پریشان ہوئیں۔ کہا کہ یہ چھری اور رسی کیا کیجئے گا؟ کہا کہ دوست کے ہاں جا رہا ہوں، ممکن ہے قربانی کی ضرورت پڑے۔ پھر ہاجرہ خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد وہاں گئے، فدیہ آ گیا۔ واپس آئے تو خیال کیا کہ اب بیان کر کے کیا کروں؟ اب تو روزِ قربانیِ اسماعیل عید بن چکا، اب ذکر کر کے کیا کروں!

چند دن کے بعد جناب ہاجرہ نے لباس کی تبدیلی کیلئے جو پیرہن اسماعیل کے جسم سے جدا کیا تو گلے پر ایک خط نظر آیا، پوچھا: یا خلیل اللہ! یہ خط کیسا ہے؟ اب جناب ابراہیم نے خیال کیا کہ اب تو کئی دن گزر گئے، پورا واقعہ بیان کر دیا۔ صاحب عقل بی بی تھیں، متوکل علی اللہ بی بی تھیں، کہا تو کچھ نہیں مگر نفسیاتی اثر یہ پڑا کہ اسی دن بیمار ہو گئیں اور اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ تصور کہ اگر فدیہ نہ آتا تو میرا بچہ ذبح ہو گیا ہوتا۔

میں کہتا ہوں کہ خبر لیجئے لیلیٰ کے دل کی۔ کیا جب علی اکبر چلے تو لیلیٰ کو نہیں بتایا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ خدا کی قسم! جانتی تھیں کہ جہاں سب گئے ہیں اور واپس نہیں آئے، وہیں علی اکبر بھی جا رہے ہیں۔ مگر یہ کارنامہ ہے ان کا۔ ہوائے زمانہ کے خلاف باتیں ہیں۔ دنیا کردار کے ان پہلوؤں پر غور نہیں کرتی کہ علی اکبر سا بیٹا چلا جائے، جس کیلئے مولا اپنی جگہ کھڑے نہ رہ سکیں مگر لیلیٰ نے قدم خیمے سے باہر نہیں نکالا۔ ہاں! خیمے کے اندر بھی بیٹھا نہیں گیا، در خیمہ پر کھڑی رہیں۔

60

اسلام اور ادیانِ عالم

دائرے کے اندر جو مرکز کا نقطہ ہوتا ہے، وہ ایک کے سوا نہیں ہو سکتا ہے۔ مرکز سے ہٹے ہوئے نقطے بے شمار ہو سکتے ہیں۔ لیکن دئرہ کا مرکز ایک کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اس ایک کا اندازہ صرف عقل ہی کر سکتی ہے۔

ادیان دنیا میں بہت سے ہیں، مذاہب عالم میں بہت ہیں، لیکن معیار نجات صرف اسلام ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

اگر اصل نہیں ہے اور شاخیں ہیں تو وہ پھر نمائشی ہوں گی۔ نمائشی شاخوں سے زینت چمن ہو جائے گی مگر ثمر نہیں مل سکتا۔

جب پیغمبرؐ خدا خود اپنے خیال کے مطابق تبدیلی نہ کر سکیں تو پھر چودہ سو برس کے بعد کسے حق ہے کہ اس میں تبدیلی کر سکے۔

ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ جب دل چاہتا ہے، مجلس کر لیتے ہیں لیکن حسینؑ کو یاد کرنا جن کا حق تھا، ان کا دور ایسا تھا کہ وہ باپ کی مجلس نہیں کر سکتے تھے۔

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

تیسرے پارے کی آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ جو اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، سب سے پہلے صوفیاء کے ایک طبقہ میں یہ تصور نمایاں ہوا کہ ادیان و مذاہب بھی حق ہیں۔ صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ صوفیاء کا مقصد نوع انسانی کے افراد کو گلے ملانا ہو یا تفرقہ مٹانا ہو، جو بھی مقصد ان کا ہو، بہر حال یہ نعرہ ان کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے بعد جس مذہب نے اسے زور و شور سے اپنایا ہے، وہ بہائی مذہب ہے۔ ان کے ہاں سرخی ہوتی ہے۔ وحدت ادیان یعنی تمام ادیان و مذاہب ایک ہیں۔ صوفیاء کے ہاں تو مقصد گلے ملانا اور خلق خدا کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ ان کے نعرہ میں اچھائی یہ ہے کہ لوگوں کو اس مسلک کے اختیار کرنے میں آسانی ہوگئی۔ ایک عیسائی ہوتے ہوئے بس بہاء اللہ کو مان لے تو وہ بہائی ہو گیا اور کوئی مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے بظاہر بہاء اللہ کو مان لے تو وہ بہائی ہو گیا۔ اس طرح سے ان کو مردم شماری میں اضافہ کی زیادہ گنجائش مل گئی اور کسی سے کسی بحث کی صورت نہیں رہی کیونکہ کسی میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بس صرف بہاء اللہ سے انتساب حاصل کر لینا ہے اور وہ بہائی ہو جائے گا۔

چنانچہ ایک بڑے مبلغ تھے پریتم سنگھ۔ اسی طرح بہائیت کی ایک عیسائی خاتون بہت بڑی مبلغہ تھیں۔ ایک تو اس مذہب کا جز وحدت ادیان تھا، اسی طرح جتنے تمدن جدید کے تقاضے ہیں، سب جز و دین بنا لیے گئے۔ مثلاً جمہوری کا ماننے کا کہنا جز و دین ہے۔ جس طرف دنیا جا رہی ہو وہی رستہ ٹھیک ہے۔ ریفارمر اور لیڈر میں فرق بتاتا تھا۔ کہ ریفارمر اپنے پیچھے چلانا چاہتا ہے اور لیڈر قوم کے پیچھے چلتا ہے۔ یہ لیڈر اور ریفارمر میں فرق بتاتا تھا۔ گویا یہ مذہب وہ ہے جو عوام کے پیچھے چلتا ہے۔ عوام جس راستے پر جا رہے ہوں وہی مذہب ہے۔ اس وحدت میں ترقی پسند طبقہ جو مذہب میں اپنی روشن خیالی کی بنا پر یہ کہتا ہے کہ یہ عقائد کے جھگڑے بے کار ہیں، اسی کو بھی اس لباس میں پیش کیا جاتا ہے کہ بہت سے راستے ہیں اور منزل سب کی ایک ہے۔ خواہ ادھر سے پہنچ جاؤ منزل تک یا ادھر سے پہنچ جاؤ۔ گویا یہ بحث وحدت مذہب کے بارے میں غلط ہے۔ یعنی ترقی پسندی کے لباس میں یہ چیز آئی ہے کہ سب مذاہب ایک ہیں۔ ہمارے ہاں کی زبان میں گویا یہ عام تصور ہے کہ بین الاقوامی طور پر سب کو ایک راستے پر مان لینا ہے اور تمام لوگوں کو ایک دھارے پر بہا دینا ہے یہ کہہ کر کہ دین و مذاہب سب ایک ہیں منزل سب کی ایک ہے راستے الگ الگ ہیں۔

میں جب قرآن مجید پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وحدت دین ملتی ہے، وحدت ادیان نہیں ملتی۔ ادیان ادھر جمع ہوئی اس کے

معنی یہ ہوئے کہ جتنے راستے ہیں، آخر میں جا کر یہ سب منزل پر پہنچیں گے۔ اگر ایک مشرق کی طرف جا رہا ہو اور ایک مغرب کی طرف جا رہا ہو تو جتنا چلیں گے، اتنا ایک دوسرے سے دور ہوں گے، قریب کبھی نہیں ہوں گے۔ اگر منزل ایک اور فرض کیجئے کہ طریقہ پہنچنے کا مختلف ہو، کوئی سیدھا ہو اور کوئی ہیر پھیرے ہو، تو امید ہے کہ آخر میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اگر رخ ہی الگ الگ ہوئے تو کیونکر منزل ایک ہو جائے گی؟

عقلی طور پر جہاں وجود اور عدم میں بحث ہو، جہاں "ہے اور نہیں ہے" کا معاملہ درپیش ہو، وہاں یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے" ہے بھی صحیح ہو اور "نہیں بھی ہے" صحیح ہو۔ قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے:

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا، اس سے کچھ قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ یعنی ادیان عالم سب وہ نہیں ہو سکتے جو منزل نجات تک پہنچائیں بلکہ تمام ادیان میں اگر اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ کبھی منزل نجات تک نہیں پہنچ سکتا اور اسی نجات نہ ہونے کی تعبیر ہے آخر میں کہ:

وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ اسی گھاٹے سے بچنے کا نام نجات ہے۔

ایک تصور اسی طرح کا یہ ہو گیا ہے کہ اصل معیار نجات اعمال ہیں۔ اصل معیار نجات کردار ہے، اسی کیلئے کسی شاعر کا شعر مجھے یاد ہے کہ:

ہوگی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہیں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو

یعنی نجات میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کون کافر ہے، کون مومن ہے۔ نجات میں بس یہ دیکھا جائے گا کہ اعمال کس کے اچھے ہیں، اگر اعمال اچھے ہیں تو وہ نجات کا حقدار ہے اور اگر اعمال برے ہیں تو وہ نجات سے محروم ہے۔ یہ ایک تصور ہے جو دماغ انسانی کیلئے اختیار کیا گیا ہے کہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے کہ کون حق ہے اور کون باطل ہے، ایک محدود طبقے میں کسی چور دروازے سے اسلام میں تصور ہوا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہوں تو یہ نہ دیکھو کہ کون حق ہے اور کون باطل ہے، یہ بھی جنت میں جائے گا، وہ بھی جنت میں جائے گا۔ یہ تصور جو آیا اسلام میں، وہ صرف ذوق انتقاد کو گھٹانے کیلئے اور اشخاص میں امتیاز کا شعور کم کرنے کیلئے آیا۔ اس سلسلہ میں یہ کہا گیا کہ مختلف پردے رکھے گئے غلطی کو غلطی نہ سمجھنے کیلئے کہ جو چیز غلط ہے، اسے غلط نہ کہا جائے اور یہ کہا جائے کہ ہمیں اس سے مطلب ہی کیا کہ کون صحیح ہے، کون غلط ہے کون اچھا ہے، کون برا ہے؟ ہزار ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی شخصیات میں بحث سے فائدہ ہی کیا ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ بحث کوئی خطرناک چیز ہے، اس لئے یہ افیون کھلانا منظور ہے تاکہ یہ احساس کہیں بیدار نہ ہوجائے کہ کون اچھا ہے اور کون برا ہے۔ اس منزل میں یہ کہا جاتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ سب کو اچھا کہیں۔ برا کہنے کی ذمہ داری بہت ہے، لہٰذا سب کو اچھا ہی کہا جائے۔ اس سلسلہ میں مجھے ابوالکلام آزاد کا ایک بہت ہی حسین جملہ یاد آیا، انہوں نے یہ فرمایا کہ اگر ہم یہ اصول بنالیں کہ برے کو بھی اچھا کہیں تو خود واقعی اچھے ہیں، ان کیلئے ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟

جب میں قرآن مجید کو دیکھتا ہوں تو دین واقعی صرف ایک ہے کہ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔

"دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"۔

قرآن مجید کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ادیان تو ایک نہیں ہیں مگر دین واقعی ایک ہے اور بنام ادیان جو چیزیں ہوں، وہ اصطلاح قرآن میں اَهْوَاءُ ہیں۔ خواہشات نفسانی ہیں اور لوگوں کی اغراض کے سانچے ہیں جو بنام دین ڈھل گئے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ سب ادیان حق نہیں ہیں۔ اگر سب حق ہوتا تو مذاہب کی کثرت پیدا ہی نہ ہوتی کیونکہ حق ایک ہوتا ہے، اس میں کثرت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اور چونکہ حق ایک ہوتا ہے اور باطل راستے بہت ہوتے ہیں، اس لئے عقلی طور پر حق پرستوں کی تعداد کم ہوتی ہے، باطل پرستوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اس کیلئے ایک مثال ریاضی کی ہے، کہ دو نقطوں کے درمیان سید حاخط ایک ہی ہوسکتا ہے کیونکہ سید حاخط وہ ہے کہ جو سب سے چھوٹا ہو، جو دو نقطوں کو ملا سکے۔ وہ بس ایک ہی ہوسکتا ہے۔ کج راستے بہت ہوسکتے ہیں۔ غیر مستقیم راستے بہت ہوسکتے ہیں۔ لیکن سید حاخط ایک ہوگا۔ وہ سب سے نزدیک ہوگا اور سب سے چھوٹا ہوگا۔

شاعروں سے معذرت کے ساتھ، جناب! کہنے والے نے جو یہ کہہ دیا کہ "راہ راست برو گرچہ دور باشد" یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے جو راہ راست ہوگی، وہ قریب ترین ہوگی۔ وہ نگاہ کو دور معلوم ہوگی مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ قریب ترین ہوگی اور اگر وہ قریب نہیں ہے تو وہ نگاہ کو راست معلوم ہوگی مگر حقیقت میں کج ہوگی کیونکہ وہ ایک نقطہ ہوگا راہ راست کا۔ جہاں سے قدم ہٹا اور راہ غیر راست ہوئی۔ تو وہ جن کے قدم جمے رہیں راہ راست پر، وہ لوگ کم ہوں گے۔ جہاں سے جو بھٹکے گا، وہیں سے راستہ اس کا غیر راست ہوجائے گا۔ لہٰذا حق پرست کم ہوں گے، باطل پرست زیادہ ہوں گے اسی راہ راست کا نام صراط مستقیم ہے۔

یہ ایک ریاضی کی مثال تھی۔ دوسری مثال یہ ہے کہ دائرے کے اندر جو مرکز کا نقطہ ہوتا ہے، وہ ایک کے سوا نہیں ہوسکتا۔ مرکز سے بنے ہوئے نقطے بے شمار ہوسکتے ہیں لیکن دائرہ کا مرکز ایک کے سوا نہیں ہوسکتا۔ ایک کا اندازہ صرف عقل صحیح کرسکتی ہے۔ اتنی صحیح نظر رکھنے والے بہت کم ہیں، لہٰذا جہاں سے نظر چوکے گی، وہاں سے مرکز سے جدائی ہوگی اور ادھر مرکز سے جدائی ہوئی اُدھر کسی افراط کے نقطے تک پہنچ گیا یا تفریط کے نقطے تک پہنچ گیا یا ادھر چلا گیا یا اُدھر چلا گیا۔ حق جو ہوگا، وہ نقطہ وسط ہوگا۔

اس وجہ سے جو نقطہ وسط ہے اس کیلئے کہا گیا۔

لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ

وہ مشرق کی طرف ہٹا ہوا ہے نہ مغرب کی طرف ہٹا ہوا ہے۔

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

ہم نے تم کو ایک درمیانی قوم بنایا ہے۔ یہ درمیانی منزل میں ہے۔ جو نقطہ اعتدال ہے۔ اس نقطہ کا شناخت کرنا چونکہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، لہٰذا بھٹکنے والے زیادہ ہو سکتے ہیں اور صحیح نقطہ پر ٹھہرنے والے کم ہو سکتے ہیں۔ اس کیلئے عالم امثال میں شاید تمثیلی طور پر مجسم شکل میں اسے پیش کر دیا کہ جب حق کا اعلان ہوا تو جو آگے بڑھ گئے تھے، انہیں پیچھے ہٹایا گیا اور جو پیچھے رہ گئے تھے انہیں آگے بڑھایا گیا۔

تمام ادیان و مذاہب میں حقیقت دین ایک ہے۔ ہمارے نزدیک آدمؑ جو لائے، وہ بھی اسلام تھا حضرت نوحؑ جسے لائے، وہ بھی اسلام تھا، حضرت ابراہیمؑ جس راستہ پر قائم رہے، وہ بھی اسلام تھا، حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے جس کی تبلیغ کی، وہ بھی اسلام تھا۔ غرض ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں کون کہتا ہے کہ سب عرب میں ہوئے جبکہ قرآن نے کہا ہے کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ہدایت کرنے والا ہماری طرف سے نہ ہوا ہو۔ جن کے نام قرآن نے لئے ہیں، ان پر تفصیلاً ہمیں ایمان لانا ہے اور اس کے بعد آنکھیں بند کر کے کہنا ہے کہ جو جو اس کی طرف سے آئے ہیں، ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم کسی کی تصدیق نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن ہم برا بھی نہیں کہیں گے قبل والے کو جو ہمارے رسولؐ سے پہلے ہو، جب کہ ہمارے قرآن نے کہہ دیا ہے کہ ہر امت میں ہم نے رہنما بھیجا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں جن کے نام لئے جا رہے ہیں، وہ سچے نبی نہ ہوں؟ ہم اس بارے میں اتنے محتاط ہیں کہ ہم ان کے بارے میں کوئی ایسا جملہ نہیں کہتے کہ اگر وہ سچے نبی ہوں، تو وہ جملہ توہین قرار پائے۔ لیکن ہم تصدیق بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

ہاں! اگر ہمارے رسولؐ کے بعد کوئی اعلان کرے گا تو پھر ہم قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ غلط ہے، اس لئے کہ وہ کہہ گئے ہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

ادیان دنیا میں بہت ہیں، مذاہب دنیا میں بہت ہیں لیکن معیار نجات صرف اسلام ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں اور اسلام بھی وہ جو خدا کی نظر میں اسلام ہو۔ اسلام لقب ہو جانا اور بات ہے، قانونی حقوق مل جانا اور بات ہے لیکن اس نے وہاں کے نتائج کو اپنے علم غیب سے متعلق رکھا ہے تو وہاں اس کی نظر میں اسلام ہونا چاہئے۔ جب اس کی نگاہ میں اسلام ہو، تب وہاں کیلئے معیار نجات ہوگا اور جو اس کو اختیار نہ کرے "لَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" وہ قبول نہیں ہوگا۔

اب میں جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور اس کی بلند ترین شکل ایمان بھی نجات کا ذریعہ نہیں، بایں معنی کہ اب اس کے بعد اعمال کی جانچ ہوگی۔ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اصل جزا اعمال کی ہوتی ہے مگر ایمان شرط صحت اعمال ہے۔

اس کو عام مثال میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ جیسے کوئی داخلہ امتحان ہو، جس میں یہ شرط ہو کہ جو بی اے ہوگا، اس کو داخلہ کے امتحان میں لیا جائے گا۔ اب اگر کوئی بی اے نہیں ہے، اس نے پرچہ بہت اچھا بھی کیا ہو مگر اس پرچہ کو دیکھا ہی نہ جائے گا کیونکہ پہلی شرط ہی اس میں نہیں ہے۔ اسی طرح اعمال کے پرچوں میں جانچ پڑتال اس وقت ہوگی جب ایمان ہو۔

لہٰذا وہ شخص جو مدعی ایمان ہو اور اعمال سے غرض نہ رکھے، وہ اس بی اے کے مثل ہے جو کاپی سادہ بھیج دے، تو کیا وہ پاس ہو جائے گا؟ اور جو ایمان ہی سرے سے نہ رکھتا ہو، وہ چاہے پرچہ بہت اچھا کرے، وہ اس شخص کی مثل ہے جو پرچا اچھا کرے مگر بی اے نہ ہو اور بی اے بھی ہے اور پرچا اچھا کرے، چلئے اس قابل ہی سہی کہ 32 فیصد نمبر مل جائیں تو وہ کسی درجہ کی کامیابی کا امیدوار ہو سکتا ہے۔ یہ جو ہمارا محاورہ ہے اصول دین اور فروع دین، یہ فروع دین کہنا اہمیت گھٹانے کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت کے اظہار کیلئے ہے اور وہ یہ کہ جو تعلق شاخ کو اصل کے ساتھ ہوتا ہے، وہ تعلق ایمان کو عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح اصل یعنی جڑیں زمین کے اندر پھیلی ہیں مگر آثار شاخوں کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں، اس طرح عقائد صحیح جو معیار ایمان ہیں وہ دل و دماغ کی تہوں میں پھیلتے ہیں اور آثار کے اعضاء و جوارح سے اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو کیا ممکن ہے کہ اصل زندہ ہو، پائیدار ہو اور شاخیں نہ پائی جاتی ہوں۔ اگر شاخیں نہ ہوں تو اصل کی خبر لیجئے۔ پھر سینچنے کیلئے شاخوں کو پانی میں ڈبونا نہیں پڑے گا بلکہ اصل کو پانی دینا ہوگا تاکہ ان میں زندگی پیدا ہو۔ لیکن اگر اصل نہیں ہے اور شاخیں ہیں تو وہ پھر نمائشی ہوں گی۔ نمائشی شاخوں سے زینت چمن ہو جائے گی مگر ثمر نہیں مل سکتا۔

اصل موضوع پر آؤں کہ موضوع خصوصیات اسلام ہے۔ پہلی اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں، ان کی نسبت یا کسی شخص کی طرف ہے یا کسی سرزمین کی طرف ہے۔ مثلاً عیسائی مذہب، حضرت عیسیٰ سے اس کا تعلق ہے۔ ان کی طرف اس کی نسبت ہے۔ موسوی مذہب حضرت موسیٰ سے متعلق ہے۔ اس کی دوسری تعبیر یہودی کہہ دیا۔ تو یہودا جناب یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ ان کی طرف نسبت ہوگی۔ اسرائیلی کہہ دیا تو اسرائیل خود جناب یعقوبؑ کا لقب ہے، ان کی طرف نسبت ہوگئی۔ غرض کسی شخص کی طرف اس کی نسبت ہے۔ ہمارے پاس ہندوؤں کا رائج الوقت مذہب جو ہے، اس کی ایک سرزمین کی طرف نسبت ہے یعنی ہند کی طرف نسبت۔

جب شخصیت کی طرف نسبت ہو یا سرزمین کی طرف نسبت ہو تو چونکہ نسبت کا مرکز محدود ہے، لہٰذا دین لامحدود ہو ہی نہیں سکتا اور ہمہ گیر نہیں ہو سکتا۔ حضرت عیسیٰ کی طرف نسبت ہے تو جو عیسیٰ سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے ہوں، وہ بلا کسی تردد کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں مطلب نہیں۔ دنیا اسلام کا احسان مانے کہ اس نے ان انبیاء کی تصدیق کر کے ہمیں ایمان لانے پر مجبور کر دیا ورنہ جو قرآن کو نہ مانے، وہ حضرت موسیٰ کو کیوں کہے گا کہ ہم ان کو سچا نبی مانتے ہیں؟ تمام دنیا کے مذاہب میں اپنے نبی کی صداقت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ صرف ان کی صداقت کا ثبوت ہمارے لئے قرآن میں ہے۔ توریت میں دیکھ کر ہم حضرت موسیٰ کو سچا نبی مان ہی نہیں سکتے۔ قرآن کے صدقہ میں مانتے ہیں۔ انجیل کو دیکھ کر حضرت عیسیٰ کی صداقت کو ہم مان ہی نہیں سکتے۔ جب انجیل میں کردار ایسا پیش کیا جا رہا ہو جو ہمارے نزدیک ایک سچے نبی کی شان کے لائق نہیں ہے تو ہم انجیل کو دیکھ کر کیوں ایمان لائیں گے؟ قرآن میں دیکھ کر ایمان لا سکتے ہیں، مجبور ہیں۔

تو جو شخص حضرت موسیٰؑ سے لگاؤ نہ رکھتا ہو، وہ بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ مجھے موسوی دین سے کیا مطلب؟ فرض کیجئے کہ جسے ہند کی سرزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی طرف نسبت رکھنے والا مذہب ہندو ہے، تو وہ کہے گا کہ مجھے ہندو مذہب سے کیا مطلب؟ میں کوئی ہند کا رہنے والا ہوں؟ آریا ایک قوم ہے۔ مذہب کا نام آپ آریا رکھ لیں تو جس کا تعلق آریا قوم سے نہیں، وہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے آریا مذہب سے کیا تعلق؟ جب نسبت کا مرکز محدود ہو گیا تو وہ دین لامحدود کہاں رہ سکتا ہے؟ صرف ایک اسلام ہے کہ اس کی نسبت نہ کسی شخصیت کی طرف ہے نہ کسی خطہ ارض کی طرف ہے۔ یہ عربی دین نہیں ہے، یہ ہاشمی دین نہیں ہے، یہ حجازی دین نہیں ہے۔ دوسروں نے اپنے مذہب کی ردیف قافیے میں اس کو دین محمدؐ کہنا شروع کیا، جو ہم بھی بے سوچے سمجھے تقلید اغیار میں کہنے لگے ورنہ اس دین کو رسولؐ نے کب کہا کہ میرا دین؟ کب ان کے کسے پیرو خاص نے کہا کہ یہ دین محمدی ہے۔ یہ دین محمدی کہنا در حقیقت دوسرے نے اپنے مذاہب کے ردیف اور قافیے میں اس کا یہ نام تجویز کیا ہے۔ جیسے بے سمجھے ہم نے ان کا لباس اختیار کر لیا۔ جیسے ہم نے ان کی وضع قطع اختیار کر لی۔ ویسے ہی اپنے دین کیلئے یہ لفظ بھی اختیار کر لیا۔ لامحدود چیز کو ہم نے ایک شخصیت کی طرف نسبت دے کر محدود بنا دیا۔ جس طرح اس دین کو دین محمدی کہنا غیروں کی تقلید ہے، بالکل اسی طرح ایک فقہ کو جو در حقیقت محمدؐ کی فقہ تھی، اس کو درمیان کے ایک امام کی طرف منسوب کرنا، یہ بھی، جو اس دور کے دوسرے اماموں کی طرف نسبت دی گئی تھی کہ کوئی حنفی تھا، کوئی شافعی، تو ہم نے بھی اس کو فقہ جعفری کہنا شروع کر دیا۔ نہ دین، دین محمدی ہے، نہ فقہ، فقہ جعفری ہے۔ دین، دین خدا ہے اور فقہ، فقہ محمد مصطفےٰ ہے۔

اسلام جو آیا تھا، آدمؑ کے وقت، انہوں نے اس کو کچھ ایسے مکمل طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا کہ گویا اس پرانی چیز کو اپنا بنا لیا، اس لئے اسلام کے بانی کہلانے لگے ورنہ اسلام کے بانی کب ہیں، مبلغ اسلام ہیں۔ اسی طرح وہ احکام جو حضرت محمد مصطفےٰؐ لائے تھے، وہ بھی انہوں نے بنائے نہیں تھے، وہ اس شریعت کے لانے والے تھے۔ اس کی تشکیل کرنے والے نہیں تھے، اس کی تصنیف کرنے والے نہیں تھے۔ اس لئے کہ کہا گیا کہ ہم نے آپ کو شریعت کے ایک راستے پر چلایا ہے۔ دوسرے لوگ آپ سے کہتے تھے کہ ذرا اس کو بدل دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کو بدلنے کا حق نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے، یا قرآن کو کچھ تبدیل کر دیجئے یا کچھ اس کے علاوہ اور پیش کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں کچھ تبدیلی کروں میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو اللہ کی طرف سے مجھ پر وحی اتری ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول بھی شریعت کے معاملہ میں ''مُتَبِعْ'' ہیں، ''مُتَبَّعْ'' نہیں۔ ان کا کام اتباع کرنا ہے۔ یہی مطالبہ آج کل بڑے زور و شور سے چل رہا ہے، شریعت کی تبدیلی کا، ایسے لوگ جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ شریعت میں ترمیم کے مبلغ ہیں۔ چنانچہ ایک پروفیسر لندن کے ایڈرسن صاحب، وہ قانونِ اسلام کے معلم ہیں۔ باقاعدہ دورے کرتے ہیں۔ جگہ جگہ جا کر تقریریں کرتے ہیں اس موضوع پر کہ شریعت اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق بنایا جائے۔ علی گڑھ آئے، دہلی میں وہ ذاکر حسین صدر ہندوستان سے ملے تھے۔ انہوں نے کہا کہ علی گڑھ جائیے گا تو فلاں شخص سے ضرور ملئے گا۔ میرا نام لیا۔ وہ علی گڑھ آئے تو ہمارے ہاں کے لاء کے چیئرمین کے ہاں ٹھہرے۔ میرے پاس ان چیئرمین کا خط آیا کہ صاحب! جس دن سے وہ آئے ہیں، آپ کو پوچھ رہے

ہیں۔ لہٰذا پہلے تو عصرانے پر آجایئے، اس کے بعد ملاقات کر لیجئے۔ میں وہاں گیا تو انہیں معلوم تھا کہ میں شیعہ ہوں اور شیعوں میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میری صورت دیکھ ہی گویا انہوں ے مجھے یہ رشوت دی کہ ہمیں تو بس آپ لوگوں سے یہ امید ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیجئے گا۔

میں نے انہیں نقد مایوس کر دینا چاہا۔ اس زمانے میں معیار اخلاق یہ ہے کہ کوئی بات نہیں بھی کرنی ہے تو اس کو ذرا اس طرح سے کہو کہ وہ عرصہ میں سمجھیں کہ نہیں کریں گے۔ مگر میں اس اخلاق کا قائل نہیں ہوں۔ جونہی انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو آپ ہی لوگوں سے امید ہے کہ آپ ہمارا ساتھ دیں گے، اس لئے کہ آپ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تو میں نے فوراً کہہ دیا کہ جی ہاں! اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر ایجاد کا دروازہ بند ہے۔ وہ میرے جواب سے ذرا تپ تو اسی وقت گئے، تصور کھینچنے لگی تو میزبان نے مجھے ان کے ساتھ بٹھایا تو انہوں نے گویا مجھ پر چوٹ کی، مولوی ہونے کے رشتے سے۔ مجھ سے کہا کہ یہ بدعت تو نہیں ہے؟ میں نے کہا: جی! اگر یہ بدعت ہے تو میں خود ہی بدعت ہوں۔ ہر نئی بات بدعت ہے تو میں اس بناء پر قدیم کب ہوں؟

یہ تصور کہ دین اور شریعت میں وقت کے تقاضوں کے مطابق بتدیلی آنی چاہیے تو اس سلسلہ میں خود پیغمبر خدا نے فرمایا دیا کہ میرا اس میں بس نہیں۔ تو جب پیغمبر خود اپنے خیال کے مطابق تبدیلی نہ کر سکیں تو پھر چودہ سو برس کے بعد کسے حق ہے کہ اس میں تبدیلی کر سکے، اس کو بدل سکے۔ لہٰذا قانون بھی ہمارے ہاں خدا کی طرف سے اور نظام عمل بھی خدا کی طرف سے۔ جو جو چیز خدا کی طرف سے مان لی جاتی ہے، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوتا۔ خدا کی طرف سے مان لیا رسول کو تو پھر دو رسول نہیں ہوئے۔ قبلے کو خدا کی طرف سے مان لیا تو پھر دو قبلے نہیں ہوئے۔ کتاب کو خدا کی طرف سے مان لیا تو پھر دو قرآن نہیں ہوئے۔ جس جس چیز کو اس کی طرف مان لیا، پھر اس میں اختلاف نہیں ہوا۔ جہاں سے اپنا اختیار صرف ہو گیا، بس وہیں سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی لئے اگر قانون اس کی طرف سے ہو تو جسے کم ملا، وہ بھی سمجھے گا کہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی۔ مثلاً شریعت اسلام میں لڑکے کا دہرا حصہ، لڑکی کا اکہرا حصہ۔ تو کوئی اسی کو نہ مانتا ہو جس نے قانون بھیجا، اسی کو نہ مانتا ہو جس نے قانون پہنچایا، وہ کہے گا کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ لیکن جو قانون بھیجنے والے کو بھی جانتا ہے اور قانون پہنچانے والے پر بھی ایمان رکھتا ہے، اس نے یہ شکایت کبھی نہیں کی ہو گی کہ ہمیں اکہرا حصہ کیوں دیا جاتا ہے۔

شکوہ جب ہوتا ہے کہ جو خدا نے لڑکی کا حق مقرر کیا ہے، وہ بھی نہ دیا جائے۔ لڑکی کو اکہرا حصہ ملنے پر اگر کوئی کہے کہ یہ ناانصافی ہے تو اس کو میں سمجھا سکتا ہوں کہ یہ ناانصافی عورت کے ساتھ نہیں ہے۔ اس میں شخصیت کا سوال نہیں تھا۔ بلکہ کچھ حکیمانہ مصالح تھے، اس لئے کہ ان احکام کی تبلیغ خود اس نے کی ہے جسے خدا نے لڑکی ہی عطا کی تھی۔

جس طرح بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کی محرومی پر جو لوگ آنسو بہاتے ہیں کہ (معاذ اللہ) اسلام نے یہ کیسا بیدردی کا پیغام پہنچا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں اس میں بیدردی کے تصور کا کیا حق ہے جبکہ جس نے یہ حکم پہنچایا، وہ خود اس دور سے گزرا ہے کہ اس کے باپ کا اس کے دادا کے سامنے انتقال ہو گیا۔ چچا نے پرورش کی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ تو دلیل ہے اس کی کہ اس شریعت میں

جذبات کو دخل نہیں تھا، حقانیت کا معیار تھا۔

اس دین کا تعلق کسی شخصیت کے ساتھ نہیں ہے۔ دین محمدی بھی اس کو کہنا دوسروں کی تقلید ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟ دین اسلام ۔ اور اسلام کس کیلئے؟ اسلام کے دو معنی ہیں۔ ایک ''سر نہادن بہ طاعت'' اطاعت کیلئے سر جھکا دینا۔ دوسرے ''سپردن'' اپنے کو سپرد کر دینا۔ یہ دونوں چیزیں کس سے متعلق ہیں؟

لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

''اس کیلئے اسلام لائے ہوئے ہیں جتنے آسمان میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں''۔

کس کیلئے؟ خدا کیلئے۔ رسولؐ نے نہیں کہا کہ میرے لئے ایمان لاؤ، میرے سامنے سر جھکاؤ۔ رسول کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے سامنے سر جھکاؤ، اللہ کیلئے اسلام قبول کرو۔ تو اسلام اور حقیقت اللہ کے سامنے سر جھکانے کا نام ہے۔ اسلام اپنے کو خدا کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ سپرد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ بس اس کا اختیار ہم مانتے ہیں۔

سپردم به تو مایه خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

حضور والا! سپرد کر دینا، اس میں بھی بے اختیاری مضمر ہے۔ اسلام کا یہ تعلق براہ راست ہے۔ میں کہتا ہوں چونکہ اسلام ایک جماعتی لقب ہو گیا ہے، اس لئے دنیا ایک اجنبیت محسوس کرتی ہے ورنہ حقیقت اسلام پیش کیجئے۔ اسلام کے حقیقی معنی دنیا کے سامنے لایئے تو فرض کیجئے کہ میرے مدنظر نوع انسانی ہے۔ میں کہوں کہ موسوی دین اختیار کرو تو جو موسیٰؑ کو نہیں مانتا تو وہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نہیں مانتے۔ ہمیں موسیٰؑ سے تعلق نہیں ہے۔ میں کہوں کہ عیسوی دین اختیار کرو تو ایک بڑا طبقہ آواز بلند کر سکتا ہے کہ ہم نہیں مانتے، اس لئے کہ حضرت عیسیٰؑ سے ہم بیگانہ ہیں۔ میں کہوں کہ فلاں سرزمین کا دین اختیار کرو تو ایک بڑا مجمع کہہ سکتا ہے کہ ہمیں تعلق نہیں اس سرزمین سے۔ یہ آواز آسکتی ہے۔ لیکن اب اس مجمع کے سامنے میں کہوں کہ تم میں سے کون ہے جو خدا کے سامنے سر نہ جھکائے تو کسی بندے میں ہمت ہے کہ وہ کہے کہ میں ہوں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دین حقیقت کو پیش کیجئے تو کوئی خدا کا بندا اپنے کو بیگانہ محسوس نہ کرے گا۔

دین کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے ہر مسلم کون ہے؟ اللہ کا بندہ ہے۔ عبادت عبودیت سے مشتق ہے اور عبودیت بندگی ہے اور وہ بندگی خدا کی بندگی ہے اور یہ چیز اتنی بلند ہے کہ جو کائنات میں سے بلند ذات تھی، اس کو بھی رسالت سے پہلے عبودیت کا شرف عطا کیا گیا اور وہ جوان کا سب سے نمایاں معجزہ تھا، وہ کونسا ہے؟ ہر ایک کے ذہن میں ہوگا، چاہے زبان پر اس وقت نہ آسکے، معراج۔ تو معراج رسولؐ کی حیثیت سے نہیں تھی۔ بندہ کی حیثیت سے تھی۔ اس لئے یہ نہیں کہا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِرَسُوْلِهٖ

بلکہ یہ کہا:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ

"وہ اپنے بندہ کو لے گیا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رسالت کی معراج نہ تھی، ان کی بشریت کی معراج تھی۔ اب جب کشاں کشاں پہنچ گیا اس منزل معراج تک تو اب انہی الفاظ سے کہ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندہ کو۔ اپنے بندے کو لے گئی اور یہ بندہ ہونا اتنا بڑا اشرف تھا کہ ہر نماز میں کم از کم ایک دفعہ نہیں تو دو دفعہ۔ یعنی دو رکعتی نماز ہے تو تشہد ایک دفعہ ہوتا اور اگر سہ رکعتی نماز ہے یا چار رکعتی نماز ہے تو دو دفعہ ہوگا۔ تو ہر نماز میں ہم کہتے ہیں۔

اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیٰؐ اس کے بندہ خاص اور رسول ہیں"۔

وہ دنیا جو شرک سے بہت ڈرتی ہے، میں کہتا ہوں کہ نماز خالص اللہ کی عبادت ہے۔ یہ رسول کا نام نماز میں آیا تو شرک تو نہیں ہوا؟ اور جناب! یہی گواہی دیجئے گا اور یہ الفاظ زبان پر لایئے گا تو تصور رسولؐ ہوگا یا نہیں؟ تو تصور رسولؐ اخلاص عبادت کے خلاف تو نہیں ہے جب نماز ہر مسلمان کو پڑھنا ہے اور شرک سے بھی ہر مسلمان کو بچنا ہے۔ اب اس سوال کو حل کرے کوئی شرک کی آواز بلند کرنے والا۔ ہم اب ایک کشتی کے سوار ہیں۔ یا سب مشرک یا کوئی نہیں۔ اب دنیا حل کرے اس سوال کو کہ تصور رسول نماز کا جز اور ذکر رسول نماز کا جزو۔ تو پھر شرک نہیں ہوا؟ یا مشرک ہو جایئے، یا نماز نہ پڑھئے۔ گویا مسلمان ہو کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ یعنی اچھا ہو آپ کا معیار توحید کہ بغیر بے نمازی ہوئے وہ موحد ہو ہی نہیں سکتے۔

اب نماز بھی پڑھنا ہے، آپ کو، ہم کو، دونوں کو اور شرک سے بھی بچنا ہے ہم کو اور آپ کو، دونوں کو۔ تو جو حل میں بتاؤں، اس قبول کیجئے اور میں کہتا ہوں شکریہ کے ساتھ قبول کیجئے اور اگر قبول نہ کیجئے تو خود کوئی حل بتایئے۔ یا نماز چھوڑیئے یا شرک کی آواز۔ تو میری تو سمجھ میں جو آیا ہے، وہ یہ کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا ذکر کیا ہوا؟ اگر یہ ذکر ہوتا کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں تو وہ غیر اللہ کا ذکر ہوتا۔ اگر یہ ہوتا کہ کس خاندان کے فرد ہیں تو وہ شاید غیر اللہ کا ذکر ہوتا ہے اگر یہ ذکر ہوتا ہے کہ صورت مبارک ایسی تھی، اگر گیسوئے مبارک کا ذکر ہوتا، دندان مبارک کا ذکر ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اسے غیر اللہ کا ذکر مانیں۔ لیکن یہ ذکر! کہ یہ اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں تو یہ تو عین ذکر خدا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نماز میں اسے جزو یونہی رکھا گیا ہے کہ یہ سنت قدیمی تھی کہ ہر قوم اپنے رسول کو خدا بنا لیا کرتی تھی، لہٰذا نماز کا جزو بنا کر سد باب شرک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ کہہ رہا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ

لے گیا اپنے بندے کو۔ اب ہر دور کے سائنس دان کو تعجب رہا ہے کہ کیونکر لے گیا؟ اس زمانہ کے اعتراضات اور تھے۔ آسمان ٹھوس جسم ہے تو جاتے وقت آسمان پھٹے اور آتے آسمان پھٹے تو اس لئے کیونکر گئے؟ اب اس دور کے اعتراضات اور ہیں کہ اتنی

دور جا کر ہوا کا دباؤیوں ہوجاتا ہے اور ہوا غائب ہوجاتی ہے اور سانس لینا ممکن نہیں ہے۔ غرض چکروہی رہا ہے کہ کیونکر گئے؟ تو اس منزل پر میں یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کب کہہ رہا ہے کہ یہ گئے؟ تو آپ یہ نہ پوچھئے کہ کیونکر گئے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ لے گیا۔ اب اللہ کے سب کاموں کو آپ نے سمجھا کہ کیونکر ہوتے ہیں تو یہاں بھی بحث کا حق ہے۔ انہی سائنس کے اعتراضوں سے گھبرا کر کچھ خیر خواہوں نے اسلام کے یا اپنے علم کے بھرم کو رکھتے ہوئے جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ وہ تو روحانی معراج تھی۔ یعنی اب تو سائنس ہماری جان چھوڑے گی۔ وہ تو جسم کے ساتھ گئے ہوتے تو یہ سب آپ کہتے، ہم کب کہتے ہیں کہ جسم کے کے ساتھ گئے۔ وہ تو خواب دیکھا تھا وہ تو روح گئی تھی۔ اب نہ آسمان کا پھٹنا ہے نہ جڑنا ہے، نہ ہوا کا دباؤ ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔ تو اس آسانی کیلئے روحانی کہہ کر اعتراضات سے چھٹکارہ ہو گیا۔

تو میں اس جماعت سے کہا کرتا ہوں، چاہئے وہ علماء ہوں کہ آپ کو کون مجبور کر رہا ہے کہ معراج کو مانئے۔ بالکل چھٹکارہ ہو جائے گا، کہہ دیجئے کہ معراج ہوئی ہی نہیں۔ ہم کب کہتے ہیں؟ مجبوری آپ کو کیا ہے؟ آپ کہئے گا مجبوری یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ اب کیونکر نہ مانیں مسلمان رہتے ہوئے، تو میں کہتا ہوں کہ جب قرآن میں ہونے کہ مجبوری سے آپ مان رہے ہیں تو جو قرآن میں ہو، وہ مانئے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ پاک ہے پروردگار جو لے گیا اپنے بندے کو۔ اب بندہ بحالت حیات فقط روح کا نام ہوتا ہو تو روحانی معراج مانئے اور بندہ مجمہ روح وجسد کا نام ہوتا تو پھر معراج روحانی ماننے سے کام نہیں چلے گا۔

مگر شرک کے اعتراض کو جس جواب سے میں نے حل کیا تھا اور دنیا ماننے کیلئے مجبور ہے، اسی کو پھر اصول بنا لیجئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ذکر رسول، جو شخصی خصوصیات اور مادی تشخص کے ساتھ ہو، وہ غیر اللہ کا ذکر ہے مگر جو اللہ کے رشتہ سے ہو تو ان کا ذکر عین ذکر خدا ہے۔ تو بس یہ اصول بنا لیجئے کہ کسی کا بھی ذکر اس کے مادی تشخص کے ساتھ ہو تو عبادت نہیں ہو سکتا لیکن جب اللہ کی طرف نسبت سے ہو تو پھر وہ شرک نہیں ہے۔ اب اگر ہم کسی فدیہ راہ خدا کا ذکر کریں تو رشتہ مل گیا خدا سے۔ اب اگر ہم اس کا ذکر کریں تو اسے غیر ذکر خدا نہ کہو۔ اگر اس کی تعظیم کریں تو غیر تعظیم خدا نہ کہو۔ اب اس کا ذکر عین ذکر خدا ہے۔ اس کی تعظیم عین تعظیم خدا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ کن شخصیات کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ کیا خدا سے بے نیاز ہو کر ہم ذکر کرتے ہیں؟ شخصیات جب فنا ہو گئی ہوں اس کے ذکر میں اس طرح کہ ان کا ذکر بغیر اس کے ذکر کے ہو ہی نہ سکے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ذات کہ ولادت کا ذکر کیجئے تو خانہ خدا کا نام آئے، شہادت ذکر کیجئے تو خانہ خدا کا نام آئے، اس کا ذکر خدا کے ذکر سے الگ کیونکر ہو سکتا ہے؟ دنیا کہتی ہے کہ حدیثیں بیان کرتے ہیں کہ علی کا ذکر عبادت ہے، یہ بھی حدیث کہ چہرہ پر نظر کرنا بھی عبادت ہے، ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں ہی نہیں ہے، دوسروں کے ہاں بھی ہے اور بڑے معزز راویوں سے روایت ہے۔ ایک دفعہ پدر بزرگوار غور سے صورت دیکھ رہے تھے تو بزرگ مرتبہ دختر نے کہا کہ آج آپ بڑے غور سے علی کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ ایسا غیر معمولی استغراق تھا کہ دیکھنے والی خاتون کو تعجب ہوا کہ آج آپ بڑے غور سے علی کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ تو پدر بزرگوار نے یہ کہہ کر منہ بند کیا کہ تم نے رسول کا یہ قول نہیں سنا کہ:

اَلنَّظَرُ عَلٰی وَجْهِ عَلِیٍّ عِبَادَةٌ

"علیؑ کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے"۔

تو اب دنیا کی سمجھ میں نہ آئے کہ مخلوق کا ذکر کیونکر عبادت اور مخلوق کے چہرہ پر نظر کیونکر عبادت؟ میں کہتا ہوں قرآن بھی خدا تو نہیں ہے، کلام خدا ہے۔ مگر اس کے حرفوں پر نظر عبادت ہے یا نہیں؟ اس کا تلاوت کرنا عبادت ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ یہ لفظی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ تو جب اس کی تلاوت کریں گے تو تعلیمات الٰہی زبان پر آئیں گے۔ مقصد خدا پورا ہوگا۔ تو جو تعلیمات الٰہی مجموعہ ہو، اس کا پڑھنا عبادت ہو اس کا سننا عبادت ہو اور اس کے حروف پر نظر کرنا عبادت ہو۔ تو جو اس کی تعلیمات کا عملی مجسمہ ہو جائے، اس کا ذکر بھی عبادت ہوگا، ان کے ذکر کی مجلس میں بیٹھنا عبادت ہوگا، ذکر کو غور سے سننا عبادت ہوگا، اس کی سطور اور حروف پر نظر کرنا عبادت ہوگا، ان کے چہرہ کے خدوخال کو دیکھنا عبادت ہوگا کہ یہ اس کی تعلیمات کا مرقع ہیں۔

بحمد للہ! ہم اس حیثیت سے خوش نصیب ہیں کہ جب دل چاہتا ہے مجلس کر لیتے ہیں۔ لیکن حسینؑ کو یاد کرنا جن کا حق تھا، ان کا دور ایسا تھا کہ وہ باپ کی مجلس نہیں کر سکتے تھے۔ دیکھنے میں تو سید الساجدین علیہ السلام کا قید خانہ تھوڑی مدت کا تھا، زیادہ سے زیادہ ایک سال، اس میں اختلاف ہے کہ اس سال رہائی ہوئی یا دوسرے سال مگر بہر حال ایک سال کے بعد قید ختم ہوگئی۔ مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ آزادی قید کے بعد بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے تو پوری زندگی قید خانہ میں نظر آرہی ہے۔ مگر انہوں نے اپنی ذات کو ان مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بنالیا جن کو کھل کر انجام نہیں دے سکتے تھے۔

دور ایسا تھا کہ شاگرد جمع نہیں ہو سکتے۔ مجلس درس مرتب نہیں ہو سکتی تو اس کی تدبیر کیا کی کہ مناجات کو مدرسہ الٰہیات بنادیا، دعاؤں کے ذریعہ سے۔ ہم کسی آدمی کو مخاطب کر ہی نہیں رہے کہ سیاست کا کوئی شکنجہ ہمیں کسے۔ ہم تو اپنے خدا کو مخاطب کر کے بات کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی سیاست وقت اس پر پہرے نہیں لگا سکتی۔ یہ ہیں ان کے وارث جو سیاست نہیں جانتے تھے، سیاست نہیں برتتے تھے۔ سیاست شکنی کرتے تھے۔ اسی طرح اس سیاست کو شکست دے رہے ہیں مجلس بات کی نہیں کر سکتے تو اپنی ذات کو مجلس بنادیا ہے۔

آب وضو سامنے آیا، اب کوئی ذاکر منبر پر نہیں ہے۔ یہ پانی ذاکر ہے۔ چلو میں پانی جو آیا ہے، وہی حسینؑ کی یاد دلا رہا ہے، آنسو بہنے شروع ہوگئے۔ خاموش ذاکری اور اس کا اثر بھی خاموش۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اتنے آنسو کہ وہ پانی گویا آب مطلق کی بجائے آب مضاف ہوگیا۔ اب اس سے وضو صحیح نہیں رہا تو اسے پھینک دیا۔ دوسرا چلو لیا۔ یہ گویا دوسرا ذاکر ہوگیا۔ جب تک وضو نہ ہو جائے، حسینؑ کی مجلس برپا ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ یوں کہی جائیں تو لوگ نہیں سمجھیں گے کہ پرنالے سے پانی بہہ رہا ہے۔ اب دیکھئے کہ حسینؑ کا ذکر بازار تک پہنچ رہا ہے، گلی تک پہنچ رہا ہے کہ وہ پانی آرہا ہے۔ کوئی دامن بچا رہا ہے۔ کہنے والا کہتا ہے جو گھر سے نکلا ہے کہ ارے دامن نہ بچاؤ، یہ کوئی ویسا پانی نہیں ہے، یہ سید سجاد علیہ السلام کے آنسو ہیں۔ دیکھئے! ذکر متعدی ہوا، دوسرے تک پہنچا۔ اگر یہ بے جھجک کہہ دیا جائے تو لوگ کہیں گے کہ اتنے آنسو کہاں بہہ سکتے ہیں کہ وہ پرنالے سے بہیں۔ مگر اب آپ نے نوعیت سمجھی کہ وہ آب وضو ہوتا تھا جس کے ساتھ آنسو شریک ہو کر باہر جاتے تھے۔

تو وہ مبلغ بن گئے۔ وہ آنسو اب مبلغ بن گئے، چاہے آواز نہ جائے مگر خود آنسو دنیا تک پہنچ رہے ہیں۔ اب اسے اس مجبوری کا احساس ہوگا کہ اتنا اثر ہے اور پھر یہ مجلس نہیں کر سکتے۔ شہاب الدین زہری، یہ آئمہ حدیث میں ہیں اور عبدالملک بن مروان کے ہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ کثیر التعداد شاگردوں کے استاد ہیں۔ ان سے احادیث پوچھی جاتی تھیں اور یہ حق کی بہت سے حقیقتوں سے واقف تھے۔ مگر چونکہ بادشاہ تک پہنچ تھی، تو آزادی کے ساتھ ان مفادات کو نظر انداز تو نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا پھر بھی حسب مصلحت بیان کرتے تھے۔ بادشاہ نے ان سے پوچھا، اموی بادشاہ نے پوچھا کہ کیا آپ کے علم میں یہ ہے، سنا ہے کہ علی مرتضیٰؑ کے سر پر جب ضربت لگی ہے اور آپ کی وفات ہوئی ہے تو بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا گیا، اس کے نیچے سے خون ابلتا تھا؟ یہ روایت غالباً عام طور پر گوش زد نہیں ہوئی ہے کہ دمشق میں جہاں ناواقف رکھنے کی تربیت کی گئی تھی، وہاں یہ روایت پہنچ گئی تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت پر پتھروں کے نیچے سے خون ابل رہا تھا۔ اس نے کہا کہ کیا آپ نے یہ بات سنی ہے؟ یہ بے جھجک نہیں بیان کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے، آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بالکل صحیح ہے اور یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے اور میں اس کو معتبر سمجھتا ہوں۔ بے شک ایسا ہوا ہے۔

دیکھئے! اب کتنا ٹکراؤ ہے ضمیر میں اور سیاست میں کہ خود مشتاق ہو کر پوچھا اور تصدیق کروائی۔ جب انہوں نے تصدیق کردی تو کہا کہ اچھا! مجھے معلوم ہوگیا، اب اس کو لوگوں سے بیان نہ کیجئے گا۔

دیکھا آپ نے کہ فضائل آل محمدؐ کس طرح مصلحت بینی کے پردوں میں چھپ کر ہم تک پہنچے ہیں!

61

اسلام اور ادیان عالم

میں کہتا ہوں کہ میں اس وقت جانوں کہ آپ واقعی باغی ہیں کہ جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں قلتِ عمل کو نہ دیکھو، کیفیت عمل کو دیکھو۔ اب حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ ایک ضربت ہو اور اس کی عبادت ثقلین سے سے افضل قرار دے دیا جائے۔

اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل کو خیر باد کہہ دیا جائے بلکہ اسلام کی تعلیمات صاحبان عقل ہی کیلئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کتنی بڑی کم ظرفی ہے کہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کو اس کی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔

اس کے ہاں یہ اعلان کہ اگر اطاعت کرو گے تو جزا دوں گا اور اگر معصیت کرو گے تو سزا دوں گا، یہ اس کا فضل و کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

اسلام اور ادیان عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

خصوصیات اسلام موضوع بیان ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں ان کی نسبت کسی شخص کی طرف ہے یا کسی سرزمین کی طرف ہے۔ جب نسبت کا مرکز محدود ہے تو وہ دین لامحدود کیونکر ہو سکتا ہے؟ جو اس مرکز سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کی طرف اس کی نسبت ہے، وہ اس دین سے بے تعلقی کا بلا تکلف اعلان کر سکتا ہے۔ اسلام میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق کسی مخلوق کی ذات سے نہیں ہے۔ نہ کسی سرزمین سے اس کا تعلق ہے بلکہ اس کی اضافت اور اس کی نسبت خالق کائنات کی طرف ہے لہٰذا جو بھی خالق کی مخلوق ہو، اس کو دین سے لگاؤ ہونا چاہئے

میں نے کہا کہ اسلام کے معنی ہیں اطاعت اور سپردن، سر جھکا دینا اطاعت کیلئے اور اپنے کو حوالے کر دینا کسی کی اطاعت میں تو اسلام ہوا سر جھکانا اللہ کی بارگاہ میں اور خود کو اللہ کے سپرد کر دینا۔ اسلام کا براہ راست تعلق اللہ کے ساتھ ہے۔ اب اسی سے دوسری خصوصیت وابستہ ہے جو آج عرض کرنا ہے۔ وہ خصوصیت سمیٹ کر دو الفاظ میں یوں بیان ہو سکتی ہے کہ اسلام دین کائنات ہے جو معنی اسلام کے میں نے آپ کے سامنے عرض کئے تو عالم کائنات کا کونسا ذرہ ہے جو اس جوہر کا حامل نہ ہو۔ ثریٰ سے لے کر ثریا تک جو بھی چیز ہے، خواہ وہ زمین کے ذرے ہوں، خواہ وہ آسمان کے ستارے ہوں، سبھی خالق کی اطاعت میں سرگرم ہیں۔ اس حقیقت کو وہ جملہ نمایاں کرتا ہے جو نئے چاند کو مخاطب کر کے پڑھنا آپ کو سکھایا گیا ہے۔ دعائیں جو آئمہ معصومینؑ نے سکھائی ہیں، اس میں دین کے حقائق کو سمو دیا ہے۔ تو چاند کو مخاطب کر کے آپ کیا کہتے ہیں؟

اے وہ مخلوق! جو جان کھپائے ہوئے ہے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں۔ چاند کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں پہلا ہی جملہ کہنا اجرام سماویہ کی عبادت کرنے پر ایک ضرب تھی کیونکہ دنیا والے خود انہیں معبود بنائے ہوئے تھے۔ خود انہیں مدبر کائنات کہہ رہے تھے، لہٰذا ہم انہی کے ایک نمائندہ فرد کو جو سال میں بارہ مرتبہ ہمارے سامنے از سر نو آتا ہے، اس کو ہم مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں کہ تو خود کوئی چیز نہیں ہے، تو کسی حاکم اور مدبر کے زیر فرمان ہے اور اس کے فرمان کے پورا کرنے میں تیری ہر حرکت اور ہر سکون ہے۔ تیرا طلوع ہے، تیرا غروب ہے۔ یعنی جس حقیقت کا اظہار حضرت ابراہیمؑ نے پورے مباحثہ میں کیا تھا، جس کا قرآن مجید میں تقریباً ایک صفحے کی آیات میں ذکر ہے، وہ معصومؑ نے اس جملے سے سمجھا دیا۔

کئی جملے میں جو برابران کی زبان پر آئے۔ پہلے سوال کیا، پھر نفی کی۔ وہ تذکرہ پورا قرآن مجید میں ہے جسے نافہموں نے کہہ دیا کہ (معاذ اللہ) اتنی دفعہ جھوٹ بولے۔ جو بڑی سچائی کے دعویدار ہیں، وہ انبیاء پر بھی جھوٹ کا الزام لگاتے ہیں۔ تو ہم پر اگر تقیہ کے نام سے جھوٹ کا الزام لگائیں تو بڑی بات نہیں ہے۔ وہ طولانی مباحثہ ہے اور چونکہ بہت سے لوگوں نے اس پر اعتراضات کئے ہیں اور اس کا تذکرہ آ گیا ہے تو مختصر حل بھی پیش کر دوں۔ ذکر یوں کیا ہے کہ انہوں نے ستارے کو دیکھا تو کہا ھٰذا رَبِّیْ ''یہ پروردگار ہے''، جب غروب ہوا تو انہوں نے کہا کہ ایسا جو غروب ہو گیا، وہ خدا کہاں ہو سکتا ہے؟ پھر چاند کو دیکھا، اس کو کہا ''ھٰذا رَبِّیْ''، ''یہ میرا پروردگار ہے''، جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا کہ میں ہرگز غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھ سکتا۔

تیسری دفعہ سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا کہ میرا اصل پروردگار میری ہدایت نہ کرے، تو میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاؤں؟ اسی سے ظاہر ہے کہ پروردگار کا تصور تو پہلے سے دماغ میں موجود تھا۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ اصل واقعہ پر ہر صاحب عقل غور کرے کہ اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل کو خیر باد کہہ دے بلکہ اسلام کی تعلیمات صاحبان عقل کیلئے ہیں۔ اب ہر صاحب عقل غور کرے صورت واقعہ پر کہ ستارہ کو دیکھا اور کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے۔ اور جھوٹ تو جب ہوگا، جب یہ واقعہ کسی خاص موقعہ پر پیش آیا ہو جو انہوں نے یہ کہا اور پھر یہ ہوا اور پھر یہ کہا۔

ہر صاحب عقل غور کرے کہ یہ ستارہ پرست، یہ ماہتاب پرست، یہ آفتاب پرست۔ ان سب کی اس میں رد موجود ہے۔ کیا یہ بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ستارہ پرست بھی تھے، ماہتاب پرست بھی تھے، اور آفتاب پرست بھی تھے۔ انہوں نے پہلے ستارہ پرستوں کو مخاطب کر کے کہا، ستارہ کیلئے، کہ یہ میرا پروردگار ہے تاکہ اب وہ متوجہ ہو جائیں لیکن جب وہ غروب ہوا، ستارہ طلوع ہو کر فوراً غروب نہیں ہوا، اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری کانفرنس بیٹھی رہی کہ اب کیا کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ شروع شب میں کہا تھا کہ یہ مرا رب ہے اور جب پوری رات گزر گئی اور وہ ایسے تھے کہ اپنی رد سننے کیلئے بیٹھے رہے۔ تب انہوں نے پچھلے پہر جب وہ ڈوبا تو یہ کہا کہ یہ تو ڈوب گیا۔ میں اس کو کیونکر مانوں؟ پھر بھی مجمع منتشر نہیں ہوا۔ وہ جمارہا کہ ابھی تو چاند کے بارے میں ان کا تبصرہ سننا ہے۔ اب چاند تو نہ جانے کتنے گھنٹے کے بعد نکلے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ انہوں نے کھانا کھایا، نہ پانی پیا، نہ جا کر سوئے۔ صرف حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سننے کیلئے وہ پورا مجمع بیٹھا رہا اور جب چاند نکلا تو یہ بولے کہ یہ میرے پروردگار ہے اور مجمع اب بھی نہیں ہٹا۔ اس کے بعد بھی مشتاق رہا کہ یہ کیا کہتے ہیں؟ جب پوری رات گزر گئی یا آدھی رات، جتنی بھی گزری ہو، جس تاریخ کا چاند تھا، یہ کون جانے؟ لہٰذا جتنی دیر میں وہ ڈوبا ہو، اتنی دیر انتظار کیا اور ان سے سنا کہ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور پھر مجمع بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکلے اور جب سورج نکلا تو انہوں نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے، یہ سب میں بڑا ہے۔ تو اب وہ سب خوش ہو گئے جو آفتاب پرست تھے لیکن اب بھی نہیں اٹھے۔

انہیں شوق ہے کہ یہ اس کے بعد کیا کہتے ہیں؟ اور جب سورج ڈوبا تو انہوں نے تبصرہ کیا۔ تو تین دن وہ مجمع بغیر کھائے پئے ان کے الفاظ کو سننے کیلئے بیٹھا رہا۔ تو کیا عقل اسے مانتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت خاص طور پر، یہ زبان پر آئے ہوئے الفاظ ہیں ہی نہیں، پوری عمر کا جو سفر تحقیق تھا، جن جن صورتوں سے انہوں نے ہر معبود باطل کو باطل کیا تھا، اسے خالق نے سمو کر ایک واقعہ کی شکل میں

پیش کر دیا۔

یہ درحقیقت ان کے مباحثات عمر کا خلاصہ ہے جس کو قرآن مجید نے سمو کر ایک واقعہ شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کی نظیر میں پیش کردوں کہ آل محمدؐ نے روٹیاں یتیم، مسکین اور اسیر کو دیں اور اس کے بیان کرنے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے تم کو صرف اللہ کی رضا کیلئے دیا ہے۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

نہ ہم تم سے کوئی جزا چاہتے ہیں، نہ کوئی شکریہ چاہتے ہیں اور ''منکم'' جمع کا صیغہ ہے۔ یعنی تم لوگوں کو ہم نے صرف اللہ کی رضا کیلئے دیا ہے، جزا اور شکریہ کیلئے نہیں۔ تو کیا یہ واقعی ان لوگوں سے انہوں نے کہا تھا؟

حضور والا! وہ یتیم و مسکین و اسیر کب ایک وقت میں آئے تھے جو ان سے کہا جاتا کہ تم لوگوں کو ہم اللہ کی رضا کیلئے دے رہے ہیں۔ وہ تو یتیم ایک دن آیا تھا، مسکین ایک دن آیا تھا، اسیر ایک دن آیا تھا۔ وہ بحیثیت مجموعی کب تھے جو ان سے کہا گیا ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر دن کے دینے میں جو ان کی نیت تھی، اسے اللہ نے قرآن بنا کر اتارا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کافی نہیں ہوتا، کم از کم عقل کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو چاند سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے، یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تو خود مدبر عالم نہیں ہے، تو خود کوئی چیز نہیں ہے، درحقیقت کوئی حاکم ہے جس کے فرمان کے مطابق تو چل رہا ہے اور کائنات کی ہر شے یونہی اس کے فرمان کے مطابق چل رہی ہے۔ اس فرمان کی زنجیریں اتنی مستحکم ہیں کہ کبھی کوئی شے اس سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ دنیا والوں نے بھی گاڑیوں کے اوقات مقرر کئے ہیں مگر وہ کتنی لیٹ ہوتی ہیں۔ خدا کی چلائی ہوئی گاڑیاں کبھی لیٹ تو ہو جائیں جس تاریخ، جس لمحے پر انہیں طلوع ہونے کا حکم ہے، اس تاریخ، اس وقت پر طلوع ہوں گے، اسی وقت پر غروب ہوں گے۔ کبھی اس نظام میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہاں وہی کسی کی خاطر نظام میں فرق ڈال دے۔۔۔۔

بحمد اللہ منبر کے فیض سے آپ کو سب روایتیں یاد ہیں، لہٰذا مجھے صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ میں کہتا ہوں یہی دکھانے کیلئے یہ نظام اتفاقاً نہیں ٹوٹا ہے، جس کی خاطر نظام توڑا گیا، اس نے دو رکعت نماز پڑھی، بارگاہ الٰہی میں دکھانے کیلئے ہاتھ اٹھائے کہ دیکھو! جس کا قائم کردہ نظام تھا، وہ آج بطور مستثنیات اسے توڑ رہا ہے۔

اس دعا کے الفاظ بھی عجیب و غریب ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہتے، اپنی قرابت کا واسطہ دے کر کہ میرے بھائی کیلئے پلٹا دے۔ نہیں بارگاہ الٰہی میں عرض کر رہے ہیں کہ اگر یہ تیری اطاعت میں ہو۔ قرآن مجید کہہ رہا ہے

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَهَدٰى

''اللہ نے ہر چیز کو خلق کیا اور اس کی ہدایت کی''۔

یہ ہدایت کیا ہے؟ جتنی صلاحیت جس میں ہے، اس کو منزل کمال تک پہنچانا۔ اس کی منزل مقصود وہی ہے، اس کو اس منزل تک

پہنچانا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک قطرہ آب کو گہر ہونے کی منزل تک اور ایک ذرہ خاک کو ثمر ہونے کی منزل تک، ایک تخم کو شجر ہونے کی منزل تک۔ یہ تمام منزلیں ہدایت ربانی کے ماتحت طے کرتا ہیں۔ وہ ہے جو اس کو اس منزل سے لے جا کر اس منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس کا نام ہے ہدایت جسے کہا گیا ہے۔

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَهَدٰى

مگر یہ تمام منزلیں ہدایت کی جو اس طرف سے طے ہوتی ہیں، یہ سب نظام تسخیری کے ماتحت ہوتی ہیں۔ یعنی اس کا کام منزل تک پہنچانا ہے، منزل کا بتانا نہیں ہے۔ قطرہ گہر ہونے کی منزل تک اپنے ارادہ و اختیار سے نہیں پہنچتا بلکہ وہ پہنچا تا ہے۔ ذرہ ثمر اور بیج شجر کی منزل تک پہنچنے کا سفر خود سے طے نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی طرف سے یہ منزلیں طے کرواتا ہے۔ نظام جبر کے ماتحت ہر چیز اپنی منزل پر پہنچتی ہے۔ انسان کو بھی اگر فاعل مجبور بنایا ہوتا تو پھر وہ تمام کائنات کی لائن میں ہوتا، اشرف المخلوقات نہ ہوتا۔ پھر درخت کی رفتار میں ذرہ کی رفتار میں اور اس انسان کی رفتار میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس انسان کو اسے فاعل مختار بنانا تھا یعنی ایک دائرہ میں، جو اس کی حکمت کا تقاضا تھا، اتنا دائرہ جس کی وجہ سے اس کو کچھ فرائض کا ذمہ دار بنایا جا سکے، اتنے دائرہ میں اس کو خود اختیاری کا جوہر دیا گیا لیکن یہ خود اختیاری ایک دائرے میں اسیر ہے۔ جس وقت یہ اس خود اختیاری کا مالک بنا، تب بھی اس نظام ہدایت ربانی سے جو پتھروں پر جاری ہے، جو درختوں پر جاری ہے، جو جانوروں پر جاری ہے، اس سے پھر بھی آزاد نہیں ہو سکا۔ جس وقت سے دنیا میں آیا ہے، اس وقت سے اس نے اطاعت کرنا شروع کی۔ یہ اطاعت ویسی ہی ہے جیسی کائنات کی ہر شے اطاعت کر رہی ہے۔ اسی لئے اس وقت قلم احکام جاری نہیں ہوا یعنی ذمہ داریاں نہیں بنیں۔ اس بچے کو حکم نہیں ہے خالق کی طرف سے کہ تم غذا حاصل کرو۔ دوسرے جو اختیار کے مالک ہو چکے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اس تک غذا پہنچائیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ عادل خدا جبر کی صورت میں احکام جاری نہیں کیا کرتا۔ اس کے بعد تو دنیا کی آنکھیں کھلتیں کہ وہ جبر کی قائل نہ ہوتی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بچے کو احکام سے مستثنیٰ کر دیا ہے تو بڑوں کو بھی اگر مجبور بنایا ہوتا تو احکام کیوں جاری کرتا؟ یہ احکام کا جاری کرنا اختیار کی دلیل ہے اور پھر وہ بچہ تو نافرمانی نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ نظام تسخیری میں اسیر ہے اور یہ جو بڑا ہو کر کوئی حق پورا کرتا ہے اور کوئی حکم پورا نہیں کرتا، اگر نظام جبر ہوتا تو مخالفت ہو ہی کیونکر سکتی۔ یاد رکھئے کہ نافرمان کا وجود دلیل اختیار ہے۔

وہ ہدایت ربانی جو پہاڑوں سے متعلق تھی، وہ ہدایت ربانی جو آسمان کے ہر سیارے سے متعلق تھی، وہ ہدایت ربانی جس وقت بچہ پیدا ہوا ہے، اس وقت بھی شامل حال ہے۔ یہ ابھی جزو کائنات ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر وہ ہدایت شامل حال نہ ہوتی تو دنیا کی طاقتیں صرف ہو جاتیں اور ایک بچے کا غذا حاصل کرنا نہیں سکھا سکتی تھیں۔ اس لئے کہ سکھایا جاتا ہے دو طریقوں سے، ایک طریقہ لفظوں میں سکھانے کا ہے، ایک طریقہ اشاروں میں سکھانے کا ہے۔ لفظوں کے معنی وہی سمجھے گا جو اس کے معنی سے واقف ہو اور اشاروں کو وہی جانے گا جو قرارداد سے واقف ہو اور وہ جس نے مکتب وجود میں پہلا قدم رکھا ہو، جو نیا نیا کاشانہ امکان میں آیا ہو، وہ نہ کسی لفظ کے معنی سے واقف، نہ کسی اشارہ کی قرارداد سے واقف۔ اس لئے اسے غذا حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا کیونکر جا سکتا ہے۔ اس کیلئے ضرورت اس معلم

کی تھی جو سکھانے میں زبان ودہن کا محتاج نہ ہو، جو جسم اور جسمانیات سے بری ہو یعنی وہ جو کانوں سے اپنا ربط قائم نہ کرے بلکہ براہ راست دل ودماغ سے ربط قائم کرے۔اس کی طرف کی تعلیم ہو سکتی ہے جو اسے پہلی غذا حاصل کرنا سکھائے۔وہ جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے اور منزل شباب سے قریب آتا جاتا ہے، وہ سب منزلیں اس نظام ہدایت جبری سے طے ہو رہی ہیں۔بچہ بڑا خوش ہو اگر کسی صورت سے وہ بچہ ہی رہے مگر اس کا باہوش ہونا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔جب تک کوئی اور چاہے گا تب تک بیہوش رہے گا اور جب وہ چاہے گا تو اس کی ہوش کی آنکھیں کھل جائیں گی۔بچہ چاہے کہ میں قوت تمیز سے عاری رہوں تو قوت تمیز سے عاری نہیں رہ سکتا مگر گھر والوں یا ماحول کی بدتمیزی سے بدتمیز رہے، یہ اور بات ہے۔یہ تمیز اور معنی میں ہے۔اسی طرح سے وہ چاہے کہ میں ہمیشہ نابالغ رہوں یہ نہیں ہو سکتا۔جب منزل بلوغ آئے گی تو چاہے یا نہ چاہے، وہ بہر حال بلوغ کی منزل پر آنے کے بعد تو جوان ہوگا، پھر جوان ہوگا۔

سب منزلیں غیر اختیاری طور پر طے ہوں گی جس میں اس ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔جتنا جتنا ہوش بڑھتا جائے گا، جتنی جتنی صلاحیت صرف اختیار پیدا ہوتی جائے گی، اتنا اتنا اس کا دست جبر سمٹتا جائے گا اور اسے اختیار کے جوہر سے کام کرنے کیلئے موقع فراہم کیا جائے گا۔یہاں تک کہ جب اس کے نظام حکمت میں یہ اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنے شعور کا مالک بن جائے اور اپنے شعور سے کام لے سکے تو اس وقت نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب اس کیلئے خط تکلیف کھینچا گیا اور اب اس وقت سے حلال وحرم کی پابندیاں اس پر عائد ہو گئیں۔اس کے بعد سے نظام تکلیف میں وہ اب اسیر ہو گیا یعنی اب اللہ کی راہ راست ہدایات کے دائرے سے نکل کر انبیاء کی ہدایت کے دائرہ میں آ گیا۔جب تک اس کا نظام جبر کارفرما رہا، اس وقت تک کسی نبی کی ضرورت نہیں ہوئی، کسی رسول کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ نبی آکر اسے یہ بتائے کہ تم کو غذائیں حاصل کرنا چاہئے یا رسول آکر حکم دیتے کہ تم ایسا کرو۔اس وقت تک اسے اللہ کی ہدایت کا دل ودماغ سے رابطہ کافی تھا۔لیکن اس وقت جب ہوش آیا تو اس کا فرض اور اس کی ذمہ داری منزل تک پہنچانے کی نہیں رہی بلکہ منزل کے بتانے کی ہو گئی۔جب تک پہنچانا تھا، اس کا ارادہ ''کن'' کافی ہوا، جس وقت بتانے کی منزل آئی تو اب عاجزی کی وجہ سے عدم امکان نہیں بلکہ بتقاضائے کمال خود اس کیلئے آکر منزل بتانا ناممکن ہو گیا کیونکہ یہ جسمانی آلائشوں میں اسیر اور وہ جسم وجسمانیات سے بری۔اس لئے اب اس کو بتانے کیلئے خود آکر راستہ چلے، وہ خود آکر اشارے کرے کہ ادھر چلو، یہ ناممکن ہو گیا۔یہ اس کی ربوبیت کے خلاف ہو گیا۔

لہٰذا اب ضرورت ہوئی کسی بیچ میں آنے والے کی۔جب تک نظام جبر کارفرما رہا۔اب جو الفاظ کہہ رہا ہوں، چونکہ حقیقت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں، اس لئے الفاظ سے کوئی نہ گھبرائے۔ممکن ہے اس کیلئے غیر مانوس الفاظ ہوں۔میں کہتا ہوں کہ جب تک نظام جبر کارفرما رہا، تب تک وہ کافی رہا اور اب جس وقت سے مقام ہدایت میں قول وعمل کی ضرورت ہو گئی، نمونہ بننے کی ضرورت ہو گئی، مثال قائم کرنے کی ضرورت ہو گئی تو اب رسول کی ضرورت ہوئی۔تو اب کہئے، نہ گھبرائیے کہ وہ کافی نہیں ہوا اور جب وہ کافی نہیں ہوا تو اس کی کتاب کیا کافی ہوگی؟ اب جتنے دائرے میں اس نے اختیار دیا، اتنے دائرہ میں پابندیاں عائد ہوئیں اور ان پابندیوں کے بتانے کیلئے رسول کے اقوال ضروری ہوئے اور پابندیوں کے برتنے کیلئے نمونہ بن کر اس کے سامنے مثالیں قائم کرنے کی ضرورت ہوئی۔اس کیلئے معلموں کا سلسلہ جاری ہوا۔لیکن جس وقت اس کو قانون کا پابند بنا دیا گیا اور اب اس کو جسمانی کی زنجیروں میں اسیر کر دیا گیا تو اس وقت

بھی وہ بالکل خودمختار نہیں ہوا، اس وقت بھی یہ نہیں ہے کہ بالکل اس کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا کہ جو جی چاہے کرے۔ جی نہیں! جس دائرہ میں اسے اختیار دیا گیا ہے، اس دائرہ میں خودمختار ہے لیکن یہ کہ اپنے خون کی گردش پر اسے اختیار نہیں، اپنے دل کی دھڑکنوں پر اسے اختیار نہیں، اپنی نبض کی جنبشوں پر اسے اختیار نہیں۔

اب تو دنیا معنی سمجھی کہ نہ جبر ہے، نہ اختیار ہے۔ درمیان کی منزل ہے۔ یہ ہی تو معصوم نے بیان کیا تھا۔ چونکہ یہ اختیار کی منزل ہے، اس لئے مذہب کا نام آیا۔ دنیا والوں نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا، ہم نہیں مانتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہب جس کی طرف سے ہوتا ہے۔ یعنی خدا، اسی کو ہم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ زبان اس نے آپ کے منہ میں دے رکھی ہے، لہٰذا کہہ دیجئے کہ مانتا ہوں یا نہیں مانتا۔ آپ کی زبان ہے، آپ کو اختیار ہے۔ لیکن وہ اس زبان کو خاموش کردے تو بات تو کر لیجئے۔ ہاتھ آپ کے قبضے میں دے رکھے ہیں، چاہے اس سے ڈوبتے کو بچایئے اور گرتے کو سنبھالئے اور چاہے اس سے کسی یتیم کو طمانچہ مار دیجئے۔ وہ ہاتھ آپ کے اختیار میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن وہ اس ہاتھ کو شل کردے تو حرکت تو ذرا دیجئے۔ پیر آپ کے قبضہ میں دیئے گئے ہیں، آپ ان پیروں سے خواہ مسجد کی طرف آیئے، خواہ مے خانے کی طرف جایئے لیکن وہ اگر ان پیروں کو بے حس و حرکت کردے تو جنبش تو دے کر دیکھئے۔ جتنے دائرہ میں اس نے جتنے عرصہ تک اختیار دے رکھا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ کتنی بڑی کم ظرفی ہے کہ اس کے دیئے ہوئے اختیار کو کسی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔

انسان اگر اطاعت کرے تو ایک وفادار بندہ ہے، اطاعت نہ کرے تو نافرمان۔ لیکن جتنی اطاعت اسے لینی ہوگی، وہ تو لے ہی لے گا۔ ایک وقت تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے خدا کا ذکر آیا اور انہوں نے کہا کہ ہماری تو سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آتا حالانکہ دل کے اندر نہ اقرار ہے، نہ انکار ہے۔ مگر جیسے ایک فیشن ہے اور ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ میری سمجھ میں خدا کا وجود نہیں آیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بڑا فلسفی ہوں۔ یہ گویا فلسفی ہونے کا مظاہرہ ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا۔ یہ بھی ایک وضع ہے، ایک طبقے میں بغاوت بڑے فخر کی بات ہے سماج سے بغاوت، روایات خاندانی سے بغاوت۔ ایسے لوگوں کے حالات میں لکھا جاتا ہے جو ابتدائے عمر سے باغی پیدا ہوا تھا، گویا بڑے صف اول کے انسانوں میں تھا کہ وہ شروع سے باغی پیدا ہوا تھا۔

تو سماج سے بغاوت، روایات خاندانی سے بغاوت، ماں باپ تک سے بغاوت، سب سے اعلیٰ قسم، خدا سے بھی بغاوت کوئی ایسا باغی میرے سامنے آئے تو میں اس سے کہوں گا کہ مبارک ہو، آپ باغی ہیں اور اس پر سب سے بڑا فخر ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ میں اس وقت جانوں کہ آپ واقعی باغی ہیں کہ جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔ حالانکہ کتنے بڑے باغی ہوں، جب اس نے بھیجا، تب آئے اور جب وہ بلائے گا تو چلے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ کہیں جس وقت آئے تھے، اس وقت شعور بغاوت نہیں تھا مگر اب تو ماشاء اللہ پر واز پیدا ہو گئے۔ اب تو عالم بالا میں آپ کی ترقی پہنچ چکی ہے۔ صاحب! جب بلائے تو جایئے نہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب آئے تھے تو کم سے کم روئے تھے اور جب جائیں گے، تب سانس بھی نہیں لیں گے۔ چپکے سے چلے جائیں گے، یہ اس انسان ضعیف البنیان کا دعوائے بغاوت ہے جس سے وہ کلاہ فخر آسمان پر اچھال رہا ہے۔ ایک ملک والوں نے کہا کہ ہم نے خدا کو اپنے

ملک سے نکال دیا ہے۔ خوب! آپ کے منہ میں زبان اس نے دے رکھی ہے تو جتنے زور سے نعرہ لگا سکتے ہیں، لگائیے کہ ہم نے نکال دیا ہے۔ لیکن آپ نے نکالا تو وہ نکل بھی گیا؟ یہ تو آپ کہہ رہے ہیں کہ نکل گیا لیکن اب تقریباً ایک صدی ہونے کے بعد بھی اب نہیں احساس ہوا کہ واقعی نکلا نہیں تھا، لے جا کر مشاہدین کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھو! ہمارے ہاں مسجدیں آباد ہیں، دیکھو! ہمارے ہاں قرآن کے ایڈیشن چھپ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو اب معلوم ہوا کہ جو کارنامہ تھا، اس پر شرمانے لگے۔ اب اپنی صفائی پیش کرنے لگے کہ گویا وہ جرم تھا جو پہلے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ انسان خدا کے مقابلہ میں دعوائے بغاوت کیا کرے گا۔ مگر ایک سوال میرے سامنے تازہ پیش ہو سکتا ہے کہ جب آپ کہہ رہے ہیں کہ بہرحال اس کی اطاعت کرتا ہے اور بغاوت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر یہ اسلام کا مطالبہ کیوں ہے؟ پھر یہ انبیاء کیوں کہہ رہے ہیں کہ اسلام لاؤ، اسلام لاؤ، جب آپ کہتے ہیں کہ اسلام کائنات کا دین ہے، یعنی ہم سے مطالبہ وہی ہے جو کائنات کی ہر شے کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی یہ کہے کہ جب ایسا ہے تو پھر آپ تبلیغ کیا کر رہے ہیں؟ آپ دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ انبیاء کیوں آ رہے ہیں؟ وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ اسلام لاؤ۔

تو بس ایک جملہ کافی ہے، کسی بڑی منطقی تقریر کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ انبیاء صرف اس لئے آ رہے ہیں کہ جس کی اطاعت جبری طور پر کرتا ہی ہے، اس کی اطاعت اختیار سے بھی کر لو تا کہ تمہاری شرافت نمودار ہو۔ ورنہ اگر اختیاری اطاعت نہ کرو گے تو جتنی جبری اطاعت اسے لینا ہے، وہ تو وہ لے ہی لے گا۔ بس فرق یہ ہوگا کہ اگر اختیاری اطاعت کرو تو ثواب کا حق ہوگا اور اگر جبری اطاعت کرو گے تو ثواب کا حق نہیں ہوگا۔ پھر جزا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب میں کہتا ہوں کہ جزا کا اعلان بھی صرف اس کا کرم اور تفضل ہے، ورنہ یہ دنیا کی حکومتیں جنہیں ذاتی طور پر حکومت کا حق کوئی نہیں ہے، صرف آپس کے سمجھوتے سے حکومت ہے۔ صرف اپنی قراردادوں سے حکومت ہے، ذاتی حق حکومت دنیا کی کسی حکومت کو نہیں ہے جب تک کہ وہ حق حکومت نہ دے۔ تو یہ دنیا کی حکومتوں کے ہاں نافرمانی کی سزا تو ہے لیکن فرمانبرداری کی جزا کوئی نہیں ہے۔ ایک دفعہ قانون شکنی کریں تو جیل پہنچ جائیں لیکن عمر بھر اگر قانون پر عمل کریں تو اس کیلئے جزا کوئی نہیں۔ کہیں گے کہ وہ تو رعایا ہونے کا تقاضا ہی تھا۔ تو جنہیں ذاتاً حق حکومت ہی نہیں، وہاں تو فرمانبرداری کی کوئی جزا نہ ہو اور جو اپنے احسانات کے ذریعہ سے، اپنے خالق ہونے کی وجہ سے، اپنے مالک ہونے کی وجہ سے، اپنے رب ہونے کی وجہ سے، ہر حیثیت سے حق حکومت رکھتا ہے، اس کے ہاں یہ اعلان کہ اگر اطاعت کرو گے تو جزا دوں گا اور اگر معصیت کرو گے تو سزا دوں گا۔ یہ اس کا فضل و کرم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ وہ سزا کا جو اعلان ہے، نافرمانی کی صورت میں، وہ اعلان ٹل بھی سکتا ہے لیکن جزا کا اعلان ٹل نہیں سکتا۔ ایک اور فرق عرض کرتا ہوں قرآن مجید کی روشنی میں کہ سزا مقدار عمل سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن جزا کیلئے کم سے کم دس گنا کا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ؕ

کم سے کم دس گنا کا اعلان اور زیادہ کی کوئی حد نہیں، یہاں تک کہ جو خیر خیرات میں دیا جائے، اس کیلئے تو کہا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

مثال ان لوگوں کی جو اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، غلے کے ایک دانے کی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں۔

تو کیا ہوا؟ سات سو گنا کا اعلان، مگر ابھی عطا کرنے والے کا دل نہیں بھرا۔ وہ کہتا ہے:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

جس کیلئے چاہتا ہے، وہ اور اضافہ کرتا ہے۔ اب اور زیادہ کی حد نہیں بتائی۔

میں کہتا ہوں کہ جس کیلئے چاہتا ہے اور عطا کرتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اور عطا کرتا ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں بتائی۔ جس کیلئے چاہا، اتنا دیا اور جس کیلئے چاہا، اور زیادہ دے دیا۔ جی نہیں! وہ کیفیات عمل دیکھتا ہے۔ وہ ظرف مکان وزمان کی خصوصیات دیکھتا ہے۔ ایک کے پاس ایک لاکھ تھے، سائل آیا اور اس نے ایک ہزار دے دیئے۔ تو دیئے بہت لیکن ایک لاکھ میں سے ایک ہزار دیئے نا۔ کسی کے پاس ایک صرف ایک پیسہ ہو اور سائل کو وہ ایک پیسہ دے دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پورا سرمایہ اس نے دے دیا۔ تو قلتِ عمل کو نہ دیکھو، کیفیت عمل کو دیکھو۔ اب حیرت نہ ہونی چاہئے کہ ایک ضربت ہو اور اس کی عبادت ثقلین سے افضل قرار دے دیا جائے۔

یہ تقریر میں نے اپنے دل سے نہیں کی ہے۔ ایک لفظ قرآن مجید کا ہماری رہنمائی کر رہا ہے کہ یہ آخر کے جملے محض زینت آیت کیلئے نہیں آئے کہ کلام ناتمام رہا جاتا ہے، تو کچھ نہ کچھ آنا چاہئے۔ اس میں بڑی حقیقتیں مضمر ہوتی ہیں۔ ارشاد تھا:

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

"جس کیلئے چاہتا ہے اور دیتا ہے"۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

"اور اللہ سمائی والا ہے"۔ یعنی اس کا خزانہ کم ہونے والا نہیں، اس کے ہاں قدرت ختم ہونے والی نہیں۔ اور "علیم" وہ جانتا ہے کہ مقدار استحقاق اس کی کیا ہے۔

یہ تو اس کی نظر، پس منظر اور خصوصیات ہیں۔ تین روٹیاں دی گئی ہیں، روزے رکھ کے۔ کردار اتنا ہے، ہر روز دل میں یہ تھا۔ اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہر روز یہ تھا کہ نہ تم سے جزا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ چاہتے ہیں۔ وہ بھلا جزا کیا دیتے اور شکریہ کیا ادا کرتے۔ مگر جو نیت سے واقف تھے، اس میں دو جزو تھے، جزا بھی اور شکریہ بھی۔ لہٰذا جب کردار کا بیان ہو چکا تو جتنی نعیم جنت تھی، سب سمیٹ کر ایک ایک کر کے بیان کر دی گئی کہ ایسے قصر اور ایسے محل اور پینے کیلئے ایسے ساغر اور جام اور ایسے خادم، سب کائنات جنت سمیٹ کر پیش کر دی گئی۔ مگر نگاہ عادل نے ترازوئے عدل میں دیکھا کہ پلڑا عمل کا ابھی گراں ہے۔ مگر کائنات بہشت تو سب سمیٹ کر آ گئی۔ تو اب ارشاد ہوا:

إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً

اگر بالکل جزا ہوگئی ہوتی تو عربی کے لحاظ سے مجھے معلوم ہے کہ ہونا چاہئے تھا:

إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ

یہ تو تمہاری جزا ہے۔ ہم سمجھتے ہوگئی جزا، مگر وہ جملے کو بڑھاتا ہے۔ الفاظ زائد صرف کرنا بے ضرورت ہے خلاف بلاغت ہے۔ ''إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ'' نہیں کہتا جس کا مطلب ہے کہ یہ تمہاری جزا ہے۔ وہ کہتا ہے ''إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً''۔

ارے یہ سب تو میں نے دے دیا مگر یہ تو تمہاری کچھ جزا ہوئی۔ یہ تو تمہاری تھوڑی سی جزا ہوئی۔ تو اب کیا نگاہِ عادل عمل کو بے جزا رہنے دے؟ ادھر جزا تو ختم ہوگئی اور تھوڑی سی جزا ہوئی۔ تو اب پلڑے میں شکر کو رکھنا چاہتا ہے کہ:

كَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا

''تمہاری سعی شکر کے قابل ہے''۔

62

اسلام اور ادیانِ عالم

بشر وہ نہ سمجھو جس پر وحی نہ ہو سکتی ہو بلکہ تصور کرو کہ بشر ہو سکتا ہے جس پر وحی ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ انسان انہی کا صدقہ ہے کہ جو اس کو احسن ہونے کی سند ملی ہے ورنہ کیا ان آدمیوں کے لحاظ سے یہ سند ملی ہے جو کیڑوں مکوڑوں سے بدتر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی اس مخلوق پر اتنا ناز ہے کہ اس کے تذکرے میں گویا کہنے والے کو لذت محسوس ہو رہی ہے۔

خالق کو اپنی بہترین مخلوق پر ناز ہے کہ سب اجزا بتا رہا ہے کہ اب سب بتا دیا ہے، بنا سکو تو بنا لو۔

اب محسوس ہوتا ہے جیسے صنعت کا بنانے والا صناع اس تذکرہ سے جھوم گیا۔ اس نے کہا: ''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' ارے! کیا کہنا اس اللہ کا جو بہترین خالق ہے۔

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

خصوصیات اسلام میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی شخص یا جگہ سے نہیں ہے بلکہ خالق کائنات سے تعلق ہے۔ اس لئے اس کے نام میں بھی ہمہ گیری ہے اور کام میں بھی ہمہ گیری ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ دین کائنات ہے، دین فطرت ہے۔ فطرت کے علاوہ کوئی بار انسان پر ڈالنا مقصود نہیں ہے۔ جو کچھ وہ فطری طور پر، غیر اختیاری طور پر کر رہا ہے، اسی کو اختیاری طور پر کرنے کا مطالبہ ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو اسلام نے انسانیت شناسی کا تحفہ دیا۔ اسلام سے الگ ہٹ کر دنیا نے پہچانا ہی نہیں تھا کہ انسان کیا چیز ہے۔ اس کے نہ پہچاننے کی وجہ سے وہ طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہوا۔ عقیدہ کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی، ابتداء میں بھی، انتہا میں بھی۔ یعنی پرستش کا مرکز بھی پست قرار دیا اور قربانی کا مرکز بھی پست قرار دیا۔ یہ سب انسان ناشناسی کا نتیجہ تھا۔ انسان نے انسانیت کو بہت پست سمجھا اور انسان ہونا اپنے لئے گویا بڑی ذلیل بات سمجھا۔ لہٰذا انبیاء و مرسلین کیلئے یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک انسان کیونکر نبی اور رسول ہو سکتا ہے؟ قرآن مجید کا ہم شروع سے آخر تک مطالعہ کرتے ہیں تو کفار اور مشرکین کا سب سے بڑا استدلال انبیاء کے مقابلہ میں یہ رہا کہ آپ بشر ہیں تو ہم کیونکر مانیں کہ آپ نبی اور رسول ہیں۔ اسی کو وہ طرح طرح سے کہتے تھے۔ کبھی کہتے تھے:

مَا ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ یَاۡکُلُ مِمَّا تَاۡکُلُوۡنَ مِنۡہُ وَ یَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ۔

اس کو کیونکر مانیں، یہ تو تمہارا ایسا ایک آدمی ہے، جو غذائیں تم کھاتے ہو، وہ یہ بھی کھاتا ہے، جو پانی تم پیتے ہو، جس طرح پیتے ہو، اسی طرح وہی پانی بھی پیتا ہے۔ اس میں کیا خاص بات ہے جو اسے مانیں؟ کہیں کہ کہتے تھے:

وَ قَالُوۡا مَالِ ہٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ۔

ارے یہ رسول کیسا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح سڑکوں پر بازاروں میں پھرتا ہے۔

کہیں یوں کہا، جب موسیٰ وہارون آئے تو:

فَقَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔

ارے ہم دو ایسے بشروں کو، ایسے انسانوں کو مان لیں جو ہماری طرح کے بشر ہیں اور ان کی قوم تو ہمارے سامنے عبادت گزار ہے اور وہ ہمارے سامنے نبی ہو کر، رسول ہو کر آئے ہیں۔

اسی طرح قبیلہ ثمود و عاد کی آوازیں ہیں:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔

بھلا اس کی طرف خدا کی طرف سے کوئی پیغام آیا ہے اور اگر ہم ایک بشر کو مان لیں گے تو یہ بڑی گمراہی ہے ہماری کہ ایک بشر کو مان لیں۔

گویا ان کیلئے قبولِ حق میں بہت بڑی رکاوٹ تھی کہ ہم بشر کو کیونکر نبی اور رسول مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مقامِ بشریت کو اپنی سطح پر لا کر انہوں نے پست بنایا تھا کیونکہ خود انتہائی پستی میں گرفتار تھے۔ اس لئے سمجھے کہ بشر اتنا ہی پست ہوتا ہے۔ لہٰذا بشر میں بلندی کا تصور کر ہی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا گمراہی کا سرچشمہ بشر ناشناسی تھی۔ صرف انسان کی منزل کو نہ پہچاننا کہ انسان کیا ہے؟ لہٰذا انسان کو وہ بس اپنے جیسا سمجھتے تھے۔ اُن انسانوں کو دیکھ کر اپنے کو ان جیسا بنانے کی ہمت نہیں تھی۔ طرح طرح سے ہر پارے میں بعض جگہ تابڑ توڑ مسلسل سورتوں میں آپ کو یہ آوازیں ملیں گی۔ میں نے تو چند آیات پڑھ دی ہیں، وہ سب اکٹھی کی جائیں تو کافی تعداد میں ہوں گی کہ ہر دفعہ وہ یہی کہتے تھے کہ یہ کیا بات ہوئی! بہت آسان تھا ان کا جواب۔

اگر کسی رسول کی زبان سے کہلوایا جاتا اور جب ایک رسول کی زبان سے یہ کہلوایا جاتا تو ہر رسول یہی کہتا کہ بھئی! یہ تمہاری نظر کا دھوکہ ہے کہ ہمیں بشر یا انسان سمجھ رہے ہو۔ ہم لباسِ بشری میں آئے ہیں، واقعتاً بشر نہیں ہیں۔ تو اس طرح منکرین کی زبان بندی ہو جاتی اور پھر ان کے اعتراض کی کاٹ ہو جاتی۔ مگر خالق نے ایک دفعہ بھی کسی رسول کی زبانی یہ آسان طریقہ ان کی زبان بندی کا اختیار نہیں کیا بلکہ جو ان کے دل میں خلش تھی کہ یہ انسان ہیں، نبی کیونکر ہو سکتے ہیں، دور کرنے کی بجائے صرف انبیاء کی کوشش یہ تھی کہ جو ان کے ذہن میں نبوت اور انسانیت میں تضاد ہے، اس کو ختم کیا جائے۔

رسولوں کی وکالت میں میں مناظر ہوتا تو فنِ مناظرہ کے لحاظ سے یہ قاطع جواب تھا، ان کی زبان بندی کرنے کیلئے کافی تھا کہ کہا جائے کہ یہ تم سے کس نے کہا کہ یہ بشر ہیں؟ کون کہتا ہے کہ یہ حقیقت میں انسان ہیں؟ یہ انسان نہیں ہیں، یہ مصلحتاً انسان بن کر تمہارے سامنے آئے ہیں۔ اب دوسرے رُخ سے میں کہتا ہوں کہ جب یہی چیز ان کیلئے رکاوٹ تھی تو انسان کے لباس میں بھیجنے سے مصلحت کہاں ہوئی؟ مصلحت تو اس میں ہوتی ہے جس میں اچھا اثر پڑے اور جو اور مشکل بنا دے، اس سے کیا فائدہ؟ تو کسی نبی کی زبان سے آسان طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ واقعتاً آدمی نہیں ہیں، یہ واقعتاً انسان نہیں ہیں، یہ دراصل کچھ اور ہیں۔ بس لباسِ انسانی میں تمہیں سدھانے کیلئے آئے ہیں۔

آخر انبیاء کی زبانوں کو قدرت کی طرف سے کیوں خاموش کر دیا گیا کہ یہ جواب نہ دو؟ یہ ان سے نہ کہو؟ نہیں، ان کے حلق سے

یہی اُتارو کہ بشر ہیں اور پھر نبی بھی ہیں۔ انسان ہیں اور پھر رسول ہیں کیونکہ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ یہ حقیقتاً انسان نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی غلط فہمی جو مقام انسانیت کی پستی کے متعلق تھی، وہ تو قائم ہی رہتی اور یہ قدرت کے مقصد کے خلاف تھا کہ اپنے شاہکار عظیم کی توہین ہو رہی ہے اور اُسے وہ برداشت کرے۔ لہٰذا اس نے اپنی مہم یہ بنالی۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نبی اور رسول کیونکر ہو سکتے ہیں جبکہ بشر ہیں اور بشر کے ساتھ بھی وہ یہی کہتے تھے کہ ہمارا ایسا بشر۔ ان کے جواب میں یہ بجائے اس کے کہ نفی کریں، وہی کہتے ہیں کہ میں تو بس تمہارا جیسا بشر ہوں مگر مجھ پر وحی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بشر وہ نہ سمجھو جس پر وحی نہ ہوسکتی ہو بلکہ تصور کرو کہ بشر ہو سکتا ہے جس پر وحی ہوتی ہے۔

میں نے کہا کہ ایک سرچشمہ ان کی گمراہی کا یہ تھا کہ بشر اور انسان اتنا ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو رسالت ملے، اس کو نبوت ملے یا عام نبوت اور رسالت سے بالاتر درجہ ہمارے تصور میں ہے، دنیا کے تصور میں نہیں ہے یعنی امامت ملے۔ بشریت تو بہت نیچی سطح ہے۔ بیچارہ بشر نبی کہاں ہو سکتا ہے؟ رسول کہاں ہو سکتا ہے؟ امام کہاں ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس بنیادی غلطی کی وجہ سے انہوں نے رسالت کا انکار کیا۔ اب اگر ہم یہ کہہ دیں کہ نہیں، بشر نہیں تھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی میں ہم ان کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ بات کہ بشریت اور رسالت اور امامت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، اس غلط بنیاد کی وجہ سے انہوں نے رسالت کا انکار کیا۔ ہم بشریت کا انکار کر رہے ہیں تو بنیادی گمراہی میں، تو ہم ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اسلام کا بڑا تحفہ دنیا کیلئے یہ ہے کہ اگر اس کا انکار کریں تو بڑا جوہر انسانیت گم ہو جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ اسلام کا ایک بہت بڑا امتیاز گم ہو جائے گا اگر اس کے اس تحفہ کی قدر نہ کریں کہ اس نے انسان کی بلندی سمجھائی اس نے انسان کو سمجھایا کہ وہ کیا ہے اور جب سمجھے گا کہ کیا ہے تو سمجھے گا کہ اُسے کیا ہونا چاہئے۔

اس کیلئے طرح طرح سے، مختلف طریقوں سے اس نے انسان کی اہمیت انسان کو سمجھائی۔ کبھی یوں کہا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔

"ہم نے انسان کو بہترین نقطہ اعتدال پر بہترین درستگی پر پیدا کیا"۔

ہر زبان والے جانتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اچھے اور برے کے دو تین درجے ہیں۔ ایک اچھا اور ایک کسی سے اچھا اور ایک سب سے اچھا۔ ایک برا، ایک کسی سے برا اور ایک سب سے برا۔ یہ ابتدائی تعلیم میں سکھایا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ خالق نے تیسرا درجہ صرف کیا ہے یعنی انسان کو یہ نہیں کہا کہ وہ اچھا ہے، دوسرا درجہ بھی نہیں کہا کہ کس سے اچھا ہے، کس سے اچھا ہے، نہیں ہے، تیسرا درجہ بہترین کاریگری۔ یعنی جو اس کے ہم کہتے ہیں، اللہ اکبر۔ سب سے بڑا۔ یہ اس کیلئے کہا۔ اس نے کہا کہ سب سے اچھا۔

مجھے تفصیل سے عرض نہیں کرنا ہے، مجملاً عرض کرنا ہے، غور کیجئے جو عرض کر رہا ہوں کہ اس نے کہا ہے انسان کو کہ انسان بہترین اور بہترین کے آگے میں نے کہا کہ کوئی درجہ نہیں ہے۔ جس طرح اللہ اکبر میں اب عظمت سے استثنیٰ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مخلوق اس دائرہ

میں مستثنیٰ نہیں ہو سکتی "فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"، بہترین نقطہ پر۔ کچھ نہ کچھ منطق ہر ایک جانتا ہے۔ ایک کُلّی ہوتا ہے اور ایک فرد ہوتا ہے۔ جیسے یہ آدمی۔ تو فرد انسان ہے اور خود انسان ایک کُلّی ہے جس کے تحت یہ ہے۔ اس کو جُزی کہتے ہیں۔ جو شخص ہوتا ہے، وہ نوع یا جنس ہوتی ہے۔ اب خالق کہہ رہا ہے کہ انسان درستگی کے بہترین نقطہ پر ہے۔ اس نے کہا ہے، خالق نے، مخلوقات کا جائزہ لے کر اور جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب خلق کیا ہے تو جائزہ لئے ہوئے ہے یعنی ہم نے پیدا کیا اس نقطہ پر۔ ہوا نہیں ہے یہ اس نقطہ پر بلکہ پیدا ہی کیا گیا ہے۔ خلق کیا گیا ہے بہترین نقطہ پر۔

تو حضور والا! جب خالق اُس کُلّی کو بہترین کُلّی کہہ رہا ہے، بہترین کہہ رہا ہے تو جو فرد کائنات کا بہترین ہو، اس کو اسی کے تحت میں داخل ہونا چاہئے۔ اس نے تو اس کُلّی کو بہترین کہا اور مجھے معلوم ہیں وہ افراد کو بہترین ہیں اور وہ افراد جو بہترین ہیں، وہی مقصودِ کائنات ہیں۔ وہی حاصلِ کائنات ہیں۔ تو جو حاصلِ کائنات افراد ہیں، انہیں اس نوع میں درج ہونا چاہئے جس کا نام ہے انسان!

میں کہتا ہوں کہ یہ انہی کا صدقہ ہے جو اس کو احسن ہونے کی سند ملی ہے ورنہ کیا ان آدمیوں کے لحاظ سے یہ سند ملی ہے جو کیڑوں مکوڑوں سے بدتر ہیں۔ چونکہ وہ افراد اس کے اندر ہیں، اسی لئے اس کو سند ملی ہے۔ دوسری جگہ کہا: آسمان پیدا کر دیا، زمین پیدا کر دی، سورج پیدا کر دیا، چاند پیدا کر دیا۔ سب ایک ایک جملے ہیں۔ انسان کی خلقت کا جز و اکیلا بیان کیا کہ اس کو یوں بنایا، یوں بنایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ. ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

ارشاد فرمایا: ہم نے شروع میں تو مٹی سے پیدا کیا، وہ حضرت آدم ابوالبشر تھے جو الگ طرز پر پیدا ہوئے اور اس کے بعد ہم نے انسان کو یوں پیدا کیا کہ نطفہ، پھر علقہ، پھر مُضغہ ہے۔ حضور! اس کا کام کوئی تشریح الاجزاء ہے؟ اس کا کام کوئی طبی تحقیقات ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی اس مخلوق پر اتنا ناز ہے کہ اس کے تذکرہ میں گویا کہنے والے کو لذت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کیا اور یہ کیا، اس طرح بنایا اور اس طرح بنایا اور نطفہ تھا اور علقہ تھا۔ یہ سب ہم سمجھ لیتے، ڈاکٹر ہو کر یا بغیر ڈاکٹر ہوئے۔ یہ سب وہ بیان کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خالق کی نظرِ توجہ اس مخلوق کی طرف خاص ہے کہ اس کے ذکر کو وہ طول دے رہا ہے اور اب سب منزلیں طے کر لیں۔ کسی طبیب کو اپنے کسی نسخہ پر ناز ہوتا ہے تو وہ اس کے اجزاء اکثر صیغہ راز میں رکھتا ہے، بتایا نہیں کرتا مگر خالق کو اپنی تخلیق پر ناز ہے کہ سب اجزاء بتا رہا ہے کہ اب سب بتا دیا ہے، بنا سکو تو بنا لو۔

نسخہ تو میں نے پورا بتا دیا ہے۔ یوں ہوا، یوں ہوا اور ترکیب اجزا بھی بتا دی کہ پہلے یہ بات تھی، اس کے بعد یہ ہوا اور یہ ہوا۔ نسخے کی سب ترکیب بتا دی۔ مگر یہاں تک تو بتا دیا، اب آخر میں جا کر کچھ تھا جو پردہ میں رکھ دیا کہ وہ غلاف بھی چڑھ گیا اور گوشت

پوست بھی ہو گیا، سب کچھ ہو گیا۔

-ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ-

جیسے لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب ہم نے کچھ اور بنا دیا۔ اب یہ کچھ اور جو بنایا، یہ صیغہ راز میں رکھا۔ یہ کچھ اور کا، آخر کا ایک ایسا ارادہ تھا کہ ارادہ ایک تھا مگر آنکھوں میں نور آیا، پردۂ گوش میں سماعت آئی، زبان میں ذائقہ کی طاقت آئی، شامہ میں احساسِ قوت آئی۔ یہیں سے مادیت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جو مادّی سبب ہو سکتا ہے، اس کے نتیجہ میں نیرنگی نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جسم ہے مگر جہاں وہ چاہتا ہے، وہاں بصارت رکھتا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے، سماعت رکھتا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے، ذائقہ رکھتا ہے۔ یہ تقسیم رزقِ وجود بہ اعتبارِ حکمت و مصلحت ہو رہی ہے۔ یہ حکیم علی الاطلاق ہی کا کام ہے، کسی اور کا نہیں۔

اب یہاں پر پہنچا کہ "اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ"، پھر ہم نے اس کو کچھ اور ہی بنا دیا۔ اور کیا بتاؤں کہ کہنے والا جسم و جسمانیات سے بری ہے مگر یہ مصیبت ہے کہ الفاظ تو جسمانیات کیلئے ہیں۔ اب وہاں کسی حقیقت کا ادا کرنا ہو تو الفاظ کہاں سے آئیں؟ ارے پورا یہ کیا، یہ کیا اور یہ کیا۔ اب محسوس ہوتا ہے جیسے صفت کا بنانے والا صناع اس تذکرہ سے جھوم گیا، اس نے کہا:

-فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ-

ارے کیا کہنا اُس اللہ کا جو بہترین خالق ہے۔

اب خلقتِ انسان پر اپنے کو احسن الخالقین کہا۔ دور کی بات ہے مگر اب یہاں ذکر آ گیا ہے کہ کیسی کیسی روشن صنعتیں سورج، چاند، ستارے اور کیا کیا، کیسے کیسے حسین گلاب کے پھول اور وہ تمام چیزیں جن کے تذکرے میں شاعروں کو وجد آتا ہے، سب اس نے بنائیں مگر اس نے کبھی ان سب کا ذکر کر کے اپنی تعریف نہیں کی اور جب اس کا ذکر آیا، تفصیل کے ساتھ، تو آخر میں کہہ دیا کہ "فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ"، بابرکت ہے وہ ذات جو بہترین خالق ہے۔ انسان کی خلقت پر اپنے کو بہترین خالق کہنے نے بتایا کہ یہ بہترین مخلوق ہے۔

اس کی ایک نظیر ہے۔ اس کو تفصیل سے پیش نہیں کرنا ہے، صرف آپ کے ذہن کو متوجہ کروں گا اور صرف متوجہ کرنا نہیں ہے، اس توجہ دہانی میں ایک بڑے مسئلہ کا حل ہے۔ جو کہا جاتا ہے، اس کی رَد ہے کہ حضور رسولِ خدا کو اس نے کیسے کیسے حیرت انگیز معجزے عطا کئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ستاروں سے تسبیح کروا دی مگر اس نے اس کا ذکر کوئی نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ یہ سب معجزاتِ رسول میں درج ہیں، متفق علیہ ہیں کہ درختوں سے صدائے سلام بلند کروا دی۔ راستہ چلتے ہیں، دیواروں اور درختوں سے صدائے سلام آتی تھی اور اس کا ذکر نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ چاہِ شور کو لعابِ دہن سے شیریں کر دیا، اس کا تذکرہ نہیں کیا اور اس پر اپنی کوئی تعریف نہیں کی۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کو تلوار بنا دیا لیکن اس کا ذکر بھی قرآن میں نہیں کیا اور اپنی تعریف بھی نہیں کی۔ طعامِ قلیل سے مجمع کثیر کو سیر کروا دیا، تھوڑا سا کھانا اور ایک بڑی جماعت نے بڑے بڑے کھانے والوں نے کھا لیا اور وہ کھانا

ختم نہیں ہوا، مگر اس کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا اور اپنی تعریف نہیں کی۔ ان کی دعا سے ان کے وصی کیلئے سورج کو پلٹا دیا مگر اس کا ذکر قرآن میں نہیں کا اور اپنی تعریف نہیں کی۔

یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں، ولادت کے وقت بحیرۂ ساوہ کو خشک کر دیا، آتش کدۂ فارس کو گل کر دیا۔ چودہ کنگرے قصر کسریٰ کے گرا دیئے، یہ سب کچھ کر دیا۔ اپنے رسول کو ایسے ایسے معجزات دے دیئے اور اس کا یا تو ذکر ہی نہیں کیا یا ذکر کیا بھی تو اپنی کوئی تعریف نہیں کی۔ وہ پیغمبر کو ایک خواب دکھا دیتا اور اپنی تعریف کرنے لگتا۔ اگر اس احسن الخالقین سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہ بہترین شاہکار خلقت تھا جس کا ذکر خالق نے کیا تو اس انداز ذکر سے دنیا سمجھے کہ معراج رسول اس کی قدرت کا کوئی عظیم کارنامہ تھی، تبھی اپنا ذکر اس نے اس طرح کیا، تسبیح کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ

"پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو"۔

اس بندہ کے لفظ سے بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ آج اس انداز بیان سے کہتا ہوں کہ اب روحانی معراج مان کر قرآن کی بلاغت آسمان پر رہے گی یا زمین پر آجائے گی؟

میں کہتا ہوں وہ اپنی تسبیح کر رہا ہے۔ "پاک ہے وہ ذات"، اس میں سائنس والوں کے سب اعتراضات کا جواب ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ بشر ہوتے ہوئے یہ کیونکر گئے؟ میں کہتا ہوں بشر ہوتے ہوئے یہ گئے ہی نہیں، خدا ہوتے ہوئے وہ لے گیا۔

یہاں بھی وہ خصوصیت قائم ہے کہ اتنا بڑا معجزہ یا اتنی بلندی عطا فرمائی جس کا نام معراج ہے۔ یہ بھی بحیثیت رسول نہیں دی، بحیثیت بشر دی۔ اس لئے "برَسُوْلِهٖ" نہیں کہا، "بِعَبْدِهٖ" کہا ہے۔ رسالت سے وحی آتی ہے، بشریت سے عبدیت ہوتی ہے۔ اس سے بھی مقامِ بشریت نمایاں ہوتا ہے کہ انسانیت اتنی اونچی چیز ہے کہ عرش زیر نعلین آجاتا ہے۔

مقامِ بشر اتنا اونچا ہے کہ ملک کو اس عرض کے بعد ساتھ چھوڑنا پڑا تھا کہ اگر ذرا آگے بڑھوں تو نور جلال میرے پروں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بعد تو ملک کہنا ان کی توہین ہے۔ ارے خادم کو مخدوم بنا دیجئے تو یہ کوئی مخدوم کی عزت افزائی ہوئی؟ ملائکہ تو ان کے گھر کے خادم ہیں۔ ان کو ملک کہہ کر کیا تعریف ہو سکتی ہے؟ زنانِ مصر نے یوسف کو کہہ دیا تھا کہ بہت بڑا فرشتہ ہے۔ وہ ان کی نگاہ تھی، "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ وہ حسن صورت کو دیکھ رہی تھیں اور فرشتے اَن دیکھی چیز تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ لہٰذا انہوں نے ملک کہہ دیا۔ لیکن جو حقیقت شناس ہے، وہ ملک کہنا ان کی توہین سمجھے گا۔ ملک تو ان کے خدمت گار بن کر آتے ہیں۔ یہ ہے مقامِ انسانیت!

ایک اور پہلو عرض کرنا ہے تاکہ مقامِ بشریت سمجھ میں آئے کہ ان ہستیوں کو جو ہمارے نزدیک کائنات میں سب سے افضل تھیں، ان کی تعریفیں قرآن نے انسان کہہ کہہ کر کی ہیں۔ بس چند مواقع یاد دلاؤں گا۔ ایک خدا کا بندہ اس کی رضا کیلئے رسول کی چادر اوڑھ کر فدا کاری کی منزل طے کرتا ہے۔ فدا کاری کیلئے تو ذہن میں میدان ہے کہ میدان میں فدا کاری ہوتی ہے۔ مگر یہ تنگنائے

چادر کے اندر فداکاری؟ اور مجھے معلوم نہیں کہ بدر و اُحد کے میدان کی فداکاریوں پر کبھی خدا نے فخر کیا ہو مگر آج یہ فداکاری جو زیرِ چادر ہو رہی ہے، اس پر اللہ فخر کرتا ہے۔ اس فداکاری کی قیمت عام افراد کو سمجھاؤں جو عام اسباب کی بناء پر اتنی اونچی باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ علی کھلے ہوئے علی ہوتے تو اتنے خطرہ میں نہیں تھے جتنے رسول بن کر لیٹے ہیں۔ عموماً بھیس وہ بدلا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو، مثلاً مرد عورتوں کا لباس پہن کر مجمعوں سے نکلا کرتے ہیں۔ لیکن یہ نیا بھیس بدلنا دیکھا کہ جس کے قتل کا منصوبہ ہو، اس کی چادر اوڑھی جائے، اس کے بستر پر لیٹا جائے۔

اُس نے حکم دیا تھا کہ لیٹو اور کیوں لٹایا تھا؟ اس لئے کہ رسول کا جانا پردے میں رہے، یعنی دنیا یہ نہ سمجھے کہ رسول چلے گئے ہیں ورنہ اسی وقت چلے جائیں گے تلاش کرنے کیلئے۔ یہ انتظام کیا گیا تھا کہ رسول جب تک اس جگہ تک نہ پہنچ جائیں جہاں خدا نے حفاظت کا انتظام کر دیا ہے، اس وقت تک مشرکین اُلجھے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ پیغمبرِ خدا بستر پر ہیں۔

اس لئے رسول نے لٹایا تھا خدا کے حکم سے۔ تو جب خدا کے حکم سے تھے تو کہوں گا کہ خدا نے لٹایا تھا اور اس لئے بستر پر لٹایا تھا۔ مگر شعراء کی زبان میں دو ایک جملے کہنا چاہتا ہوں، کہ جو گھیرے ہوئے تھے، وہ اجنبی لوگ نہیں تھے، اسی قوم و قبیلہ کے لوگ تھے جس میں ۵۳ برس وہ زندگی گزار چکا، جو گیا ہے اور ۲۳ برس یہ زندگی گزار چکا جو لیٹا ہے۔ یعنی جو گھیرے ہوئے ہیں، وہ خوب اندازِ قد سے واقف اور پھر شمائل دونوں کے کتابوں میں موجود ہیں کہ دونوں بزرگوں کا قد یکساں نہیں تھا، قامتِ عصمت ایک تھا مگر قد و قامتِ جسمانی میں فرق تھا۔ تو یہ بیوقوف رات بھر سمجھتے رہے اور حقیقت نہیں سمجھے تو بیوقوف نہیں تھے تو اور کیا تھے؟ واقعتاً بیوقوف نہ ہوتے تو اسلام کیوں نہ لے آتے؟ تو بیوقوف رات بھر سمجھتے رہے کہ رسول لیٹے ہوئے ہیں۔ یہ کیا راز ہے؟

حضور! میری سمجھ میں تو دو باتیں آتی ہیں ورنہ اسی وقت چلے گئے ہوتے۔ یہ تو ہر ایک روایتاً، درایتاً اصول سے ماننے پر مجبور رہے۔ وہ کیوں نہیں سمجھے؟ دو وجوہات ذہن میں آتی ہیں۔ جو واقعہ کو سمجھے، وہ اگر یہ دو وجوہات نہ سمجھے تو تیسری سائنسی وجہ میرے سامنے پیش کر دے۔ میری سمجھ میں دو وجوہات آئی ہیں، دونوں بہرحال سائنس کی حدود سے آگے ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ بستر پر لیٹ جائیں۔ تو پھر رات بھر کیلئے اس نے ہوبہو رسول بنا بھی دیا ورنہ اس کے مقصد کو شکست نہ ہو جاتی؟ ہوبہو رسول بنا بھی دیا۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن کے ماننے والے کو اس میں عذر نہیں ہونا چاہئے۔ اگر عیسیٰ کی حفاظت کیلئے ایک دشمنِ خدا کو ایک دشمنِ عیسیٰ کی صورت دی جاسکتی ہے تو ان سے افضل ذات محمد مصطفیٰ کی حفاظت کیلئے غیر کو نہیں، ان کے نفس کو ان کی صورت کیوں نہیں دی جاسکتی؟

حضور والا! یہ ایک پہلو ہے جو میری سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ یہ اس چادر کی کرامت ہے، حضور کی طرف سے کرامت ہوگی، مگر یہ چادر کی کرامت ہے کہ جب پیغمبر اوڑھیں تو ان کے جسم پر بالکل صحیح اور جب علی اوڑھیں تو ان کے جسم پر بالکل راست اور جب پانچوں آجائیں اور پھر بھی گنجائش رہے اور نہ اُمِ سلمہ آنے کی کوشش ہی کیوں کرتیں اور جبرئیل امین کیوں داخل ہو جاتے؟ تو یہ چادر کی کرامت تھی اور دو جملے کہتا ہوں، یہ بہرحال چادر کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ

بہرحال چادر کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ چادر قدموں پر نہیں ناپی گئی تھی، یہ نورِ واحد پر بیونتی گئی تھی۔

تو اتنا بڑا فداکاری کا کارنامہ، اس پر سندِ قبولیت لے کر جو آیت اُتری، وہ آیت کیا ہے "من المومنین" نہیں،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

دیکھو! انسانوں میں ایک یہ بھی ہوتا ہے جو اپنی جان کو رضائے پروردگار کیلئے فروخت کر دیتا ہے۔ اصولِ قرآنی یہ ہے کہ فرد کی مدح کرنی ہوتی ہے مگر صیغے جمع کے صرف کئے جاتے ہیں۔ رکوع میں انگوٹھی دینے والا ایک فرد تھا مگر قرآن کی آیت کے صیغے سب جمع کے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔

سب جمع کے صیغے، اصولِ قرآنی یہی ہے واحد کی مدح ہوگی، جمع کے صیغے ہوں گے۔ مگر یہ خاص وہ محل ہے کہ خالق نے بھی انفرادیت نمایاں کی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ۔

انسانوں میں ایک وہ بھی ہے یعنی اس مقامِ فداکاری میں کہیں پر بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انسانوں میں ایک یہ بھی ہے۔ یہ ایک اتنی اونچی منزلِ کردار پر بھی جا کر کہتا ہے کہ انسانوں میں ایک یہ بھی ہے۔ اس کے بعد کون ہے جو مقامِ انسانیت کو پست سمجھے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ وحدت نمایاں ہوگئی کہ دیکھو! انسانوں میں ایک ایسا بھی ہے۔ میں کیا کروں کہ اس کے بعد وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں کوئی آیت اُترتی ہوئی دکھلا نہیں سکتا، مگر میرا تصور یہ ہے کہ اگر دس محرم ۶۱ھ کو کوئی آیت اُترتی تو شاید واحد کا صیغہ جمع کا لباس اختیار کرتا۔ اُس روز کہا جاتا کہ دیکھو! ایسے بھی انسان ہوتے ہیں۔ کچھ کی جبینِ عقیدت پر شاید شکن آجائے اور ذرا بار خاطر ہو جائے کہ کہاں امیر المومنین کی منزل اور کہاں کربلا میں جتنے ہیں، سب کو کہہ دیا کہ اگر آج آیت اُترتی تو سب کو کہتی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے بھی فرقِ مراتب معلوم ہے۔ ارے سب عرب بھی نہیں، غیر عرب بھی ہیں، سب قرشی نہیں، غیر قرشی بھی ہیں، سب آزاد بھی نہیں، غلام بھی ہیں۔ اتنا زمین و آسمان کا فرق بہ اعتبارِ صفات و افعال ہے، قومیت کے اعتبار سے فرق ہے۔

مگر جہاں تک کردارِ کربلا کا تعلق ہے، قرشی و غیر قرشی کا کیا ہاشمی و غیر ہاشمی کا کیا؟ میں تو کہتا ہوں کردارِ کربلا میں مجھے معصوم و غیر معصوم کا فرق نظر نہیں آتا۔ ایک بے داغ مرقعِ کردار ہے ورنہ معصوم اپنی پاک زبان سے سب کو یکساں طور پر کیوں کہتے:

بِاَبِىْ اَنْتَ وَاُمِّىْ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِىْ دُفِنْتُمْ فِيْهَا وَفُزْتُمْ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، تم بھی پاک ہوئے اور وہ سرزمین بھی پاک ہوئی جس میں تم دفن ہو گئے۔ اب معصوم اپنی

تمام کارنامہ ہائے عصمت والی زندگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں:

يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

کاش! میں تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہوتا اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتا۔

ہمیں بھی سکھایا یہی گیا ہے کہ تم جب واقعہ کربلا کو یاد کرو تو یہ کہو:

يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

"کاش! ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتے"۔

63

اسلام اور ادیانِ عالم

اب رسول نے فرمایا: قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ تو ہم نے رسول کے کہنے سے کہا۔ مگر چونکہ ان کے کہنے سے کہا، اس کے معنی ہیں کہ رسالت کو مانا۔ تو ہم نے خود کہہ دیا "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ الله" اور جب غدیر میں اعلان کیا "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ" تو ہم نے کہہ دیا "عَلِیٌّ وَّلِیُّ الله۔"

پیغمبر اسلامؐ نے توحید کی آواز اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کی کہ جہاں جہاں کسی میں شرک کی کوئی قسم تھی، وہ اپنے شرک سے شرمانے لگا۔

میں کہتا ہوں یہ کہنے کی چیز نہیں ہے، ماننے کی چیز ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ مانتے تھے یا نہیں۔ اگر نہ مانتے ہوتے تو بیٹے سے کیوں کہتے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔

فاطمہؑ کی منزل یہ ہے کہ رسول کا عمل مردوں کیلئے نمونہ عمل ہے اور فاطمہؑ کا عمل اور کردار خواتین کیلئے نمونہ عمل ہے۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾

اس موضوع سے متعلق جو میں عرض کر رہا ہوں، قرآن مجید کی ایک آیت ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔

یہ مضمون قرآن مجید میں دو مقامات پر ہے۔ ایک جگہ یہ ہے جو الفاظ میں نے پڑھے اور ایک جگہ اتنا فرق ہے کہ یہاں نصاریٰ پہلے اور صابئین بعد میں ہے اور وہاں صابئین پہلے ہے اور نصاریٰ بعد میں ہے۔ ذرا گرامر کا فرق ہے کہ یہاں صابئین منصوب ہے اور وہاں صابئون مرفوع ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہے۔ لفظی ترجمے کے لحاظ سے ایسا ذہن میں آتا ہے کہ نجات کیلئے اسلام کی خصوصیت نہیں ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ جو ایمان لائے اور عیسائی اور صابئی، یہ ستارہ پرست ہوتے تھے اور یہودی، یہ سب جو ایمان لائیں اللہ اور روزِ آخرت پر اور نیک اعمال کریں تو ان کیلئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے ہاں اور خوف اور حزن ان کو نہیں ہے۔

اب کوئی کہے کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں اور قرآن کی آیت یہ تھی کہ جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے، وہ قبول نہیں ہوگا اور گھاٹا اٹھائے گا اور یہاں دوسری جگہ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہودی اور نصرانی اور آتش پرست یہ سب۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نام بھی بطور مثال ہیں یعنی کسی بھی مذہب کا ہو اور نیک اعمال کرے تو وہ نجات پائے گا اور اُسے اجر و ثواب حاصل ہوگا۔ آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرواتا ہے کہ اگر ان سب ناموں کے بعد صرف "مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا" ہوتا، یہودی، نصرانی، صابئی اور مسلمان، جو نیک اعمال کرے، تب وہ مطلب نکلتا جس کی خاطر یہ آیت پیش کی جارہی ہے۔ مگر یہاں "مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا" نہیں ہے بلکہ مومن و یہودی و نصرانی و صابئی و مجوسی یا جو بھی نام آپ کو یاد آئیں مذاہب کے، وہ سب۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ سب اگر نیک اعمال کریں، کہا جاتا ہے کہ یہ سب جو ایمان لائیں اللہ اور روزِ آخرت پر اور پھر نیک اعمال کریں۔

جب قرآن کا مطالعہ کیجئے تو اللہ اور آخرت کے معنی ہیں اسلام یعنی یہ دوسرے ہیں عقائد کے ایک مبداء اور ایک معاد۔ ایک اللہ اور ایک آخرت۔ کہاں سے آئے؟ وجود کیونکر ہوا؟ یعنی آغازِ حیات اور انجامِ حیات۔ رسالت اور امامت سب اس کے درمیان میں

ہے جیسے سماوارض کے مابین تمام کائنات ہے، ایسے مبداء و معاد میں تمام اسلام ہے۔ اس لئے آپ قرآن میں اکثر دیکھیں گے کہ اظہارِ ایمان و اسلام کیلئے صرف ''یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ''، اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں۔ یہی ہے، یہ گویا محاورۂ قرآنی ہے ایمان مکمل کیلئے کہ

-اَلْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ -اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان۔

اب ایک اور موضوع کی بات آگئی ذہن میں کہ اگر قرآن سے کلمہ مرتب کرنا ہے تو اللہ اور قیامت کا کلمہ پڑھے۔ اس لئے کہ قرآن میں یہی دو چیزیں اکٹھی ہیں۔ قرآن میں شروع سے لے کر آخر تک کہیں بھی یکجا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ'' نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ کے ساتھ یومِ آخر ہے۔ تو اگر قرآن کو کافی بنا کر کلمہ پڑھنا ہے تو بس اللہ اور قیامت کو لیجئے۔ معلوم ہوا کہ کلمہ قرآن سے نہیں پڑھا گیا اور نہ قرآن نے کلمہ سکھایا ہے اور رسول بھی جب مسلمان بناتے تھے تو فقط ''قولو الآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کہتے تھے کہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کہو۔ تو اگر رسول کے کہنے سے کلمہ پڑھنا ہے تو عمر بھر یہی پڑھتے جایئے۔ رسول تو فقط ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' پڑھواتے تھے۔ آگے کوئی جملہ نہیں کہتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کلمہ نہ قرآن سے بحیثیت مجموعی مرتب ہوا ہے، نہ حدیث سے بحیثیت مجموعی مرتب ہوا ہے بلکہ اپنے خصوصیاتِ امتیازی، جو عقیدہ کے لحاظ سے ہیں، ان کے اظہار کا ذریعہ کلمہ ہے۔

اب رسول نے فرمایا ''قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ''۔ بس ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ''۔ تو ہم نے رسول کے کہنے سے کہا مگر چونکہ ان کے کہنے سے کہا، اس کے معنی ہیں رسالت کو مانا۔ تو ہم نے خود کہہ دیا ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ''، اور جب غدیر میں اعلان کیا ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ''، تو ہم نے کہہ دیا ''عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ''۔

تو جناب! یہ تو ہے نہیں کہ جو یہ سب کرے، وہ سب نیک اعمال کرے بلکہ اس کے بعد کہا گیا ''مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ'' اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے۔ یہ دو چیزیں ہیں یعنی صرف عملِ صالح پھر بھی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ عقیدہ کا ایک جزو ہے جس کا نام ''اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ'' ہے اور اس کے بعد پھر عملِ صالح ہے۔

اب جو شروع میں سب نام لئے تھے، اس کا کیا مطلب؟ جو مطلب میں سمجھا ہوں، اس کے سوا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا، وہ یہ ہے، شروع میں بھی تو ایک عدد ''الذین آمنوا'' موجود ہے کہ وہ جو ایمان لائے۔ جو ایمان لائے اور یہودی و نصرانی و صابی، جو ایمان لائے، اللہ اور روزِ آخرت پر، تو اس لائن میں بھی ایمان لائے ہے اور پھر معیارِ نجات میں بھی ایمان لائے اور نیک اعمال کرے۔ کیا مطلب؟ وہ ایمان کونسا ہے اور یہ ایمان کونسا ہے جو یہودی و نصرانی کے ساتھ ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کہا ہے، وہ پھر کیا ہے؟ اور بعد میں جو قید لگائی ہے کہ ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، یہ کیا ہے؟

تو اب جو میں کہتا ہوں ایمان کا مطلب، اس کے بعد دیکھئے کہ نتیجہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماضی کو نہیں دیکھا جائے گا۔ خواہ شروع سے مسلمان ہو، یہ شروع والا ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ پہلے یہودی تھا، یہ نہیں کہ پہلے نصرانی تھا، یہ نہیں کہ پہلے صابی تھا۔ جی نہیں! یعنی وہ جو پیدائشی مسلمان ہے۔ یہ پہلا ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' ہے جو شروع سے مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں، نصرانی ہیں، ہیں

اب نہیں، یعنی پہلے تھے ماضی میں، خواہ شروع سے مسلمان ہو، خواہ پہلے یہودی ہو، نصرانی ہو، صابی ہو، آتش پرست ہو یا ستارہ پرست ہو، جو بھی وہ پہلے تھا، اب معیار نجات سب کیلئے ایک ہے۔ وہ یہ کہ:

مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ۔

ماضی جس کا جو بھی ہو لیکن حال میں اگر دونوں شرطیں حاصل ہیں یعنی ایمان ہے اللہ اور روز آخرت پر، جس کے معنی ہیں اسلام اور نیک اعمال ہیں تو اس کیلئے اس کا اجر ہے یعنی نجات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حال میں معیار نجات سب کا ایک ہے اور وہ اسلام با عمل ہے۔

جناب! تین عدد حقائق بیان ہو چکے۔ ایک یہ کہ اسلام کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے، کسی محدود ذات سے یا محدود مکان سے تعلق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ دین فطرت ہے اور تیسرے جو آخر میں عرض کیا گیا۔ یہ تین خصوصیات بیان ہو چکیں۔ تیسری یہ تھی کہ انسان کو انسان کی معرفت کروائی۔ چوتھا تحفہ جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ وحدت الٰہ کا ہے۔ اللہ کے ایک ہونے کا تصور۔ جتنے بھی پیغمبر آئے، آدم سے لیکر خاتم تک، ایک لاکھ چوبیس ہزار، وہ سب یہی دعوت دیتے رہے کہ اللہ کو ایک مانو اور یہی امیر المومنین نے توحید کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ انبیاء کے پیغام کو توحید کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

منطقی طور پر یہ ذرا انوکھی بات ہے کہ رسالت تو توحید پر مبنی ہے تو رسالت سے توحید کیونکر ثابت ہو گی؟ مگر دیکھئے کہ کس رُخ سے امیر المومنین علیہ السلام ثابت فرما رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی آئے۔ جو نبی آتا ہے، اسی کی بات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو اس کی بھی تو کوئی بات کرتا۔ اگر کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے۔ یہ بیچارہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے جو بیٹھا ہے، تو گویا اعزازی خدا ہے، عملاً تو وہ ایک ہی ہے۔ وہ اگر کوئی ہیں جو اعزازی خدا بنے بیٹھے ہیں تو وہ تو بت ہیں، کام کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر نام کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔

حضور والا! یہ توحید الٰہی اسلام کی خصوصیت خاص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ توحید آئی تو آدم کے وقت سے تھی مگر پیغمبر اسلام نے اس توحید کو ایسے جاہ و جلال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کا لقب اگر ہم پیغمبر توحید کر دیں تو تاجدار مدینہ سے بہتر ہے۔ لہٰذا تاجدار مدینہ تو بہت ہی محدود نگاہ کا ترجمان ہے۔ تو یہ توحید کے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ نے اس شان و شوکت و جاہ و جلال و جبروت کے ساتھ پیغام توحید پیش کیا ہے کہ جہاں جہاں شرک کا شائبہ تھا، وہ اپنے اس شرک سے گویا شرمانے لگے اور کسی نہ کسی طور پر توحید کے پردہ میں چھپانے لگے۔

جہاں تثلیث تھی کہ تین ہیں، تو حید نے اتنا زبردست اثر ذہن پر ڈالا کہ انہوں نے نیا پہاڑہ ایجاد کر لیا کہ تین اکم تین۔ ایک تیا ایک۔ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید۔ جب آپ سے بحث ہو گی تو وہ یوں کہیں گے کہ ہم وحدت کے منکر نہیں ہیں۔ ہم بھی توحید کے قائل ہیں۔ مگر وہ توحید ہے تثلیث میں اور تثلیث ہے توحید میں۔ یہ کیونکر ہے؟ بس وہ اللہ جانے کہ کیونکر ہے۔

اینڈرسن صاحب سے تثلیث پر گفتگو ہوئی۔ وہ کہنے لگے کہ نجف میں گیا تھا اور علامہ شیخ محمد حسین الغطا سے ملنے گیا۔ انہوں

نے چائے کا انتظام کیا تھا مگر میں نے کچھ کھایا پیا نہیں، اس لئے کہ بغداد کے جو لوگ میرے ساتھ تھے، انہوں نے بتا دیا تھا کہ یہ تم کو نجس سمجھتے ہیں۔ یہ تمہیں چائے پلا رہے ہیں مگر تمہیں نجس سمجھتے ہیں۔ خیر! میں خاموشی سے سنتا رہا اگر وہ مجھ سے تبصرہ نہ چاہتے۔ بتائیے یہ کیا واقعہ ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کو چائے پینے میں کیا حرج تھا؟ زیادہ سے زیادہ وہ برتن پاک کروا لیتے؟ کوئی برتن بیکار تو نہیں ہو جاتے۔ ان کو کوئی نقصان نہ ہوتا۔ ان کا دل چاہتا، وہ پاک کروا لیتے۔ اس بات پر بات ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔ انہوں نے کہا: آخر ہم کیوں نجس ہیں؟ میں نے بہت آہستہ سے دھیمی آواز میں جتنا کہ تہذیب کے پردہ میں دھیما ہوا جا سکتا تھا، کہا کہ قرآن نے کہہ دیا ہے:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ۔

مشرکین نجس ہیں۔ یہ دشواری ہے۔ کہا: ہم کیوں مشرک ہیں؟ دیکھ لیجئے! شرک سے شرمانے لگے۔ میں نے پھر بہت ہی آہستہ سے، بہت ہی سست الفاظ میں کہا: بھئی تثلیث کی وجہ سے۔ تثلیث کی وجہ سے۔ فوراً جو چھوٹا سا جاہل بچہ کہے گا کہ وہی معلوم ہوا کہ پروفیسر کہتا ہے کہ وہ تو توحید ہے فی التثلیث اور تثلیث ہے فی التوحید۔

اب میں نے پھر رواداری برتی اور بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے صاف کیوں نہ کہا۔ میں نے کہا کہ یہ چیز ہماری عقل میں نہیں آتی "توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید"۔ یہ ہماری عقل میں نہیں آتی۔ میری اس تہذیب اور رواداری سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ بس! بات یہی ہے کہ یہ آپ کی عقل میں نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ کسی عاقل کی عقل میں نہیں آتی۔ مگر اب جو بات انہوں نے کہا اس کے بعد، اس کا جواب میں نے دے لیا۔ اگر کوئی اور مسلمان عالم ہوتا تو میں نہیں سمجھتا کہ اتنی آسانی سے نکلتا۔ انہوں نے کہا کہ جناب! ہم تو تین کا مجموعہ مانتے ہیں اور آپ کے ہاں تو ایک ذات اور نو صفات ہیں۔ صفات زائد بر ذات ہیں، دنیا کے نزدیک، یعنی مسلمان اکثریت کے نزدیک کہ خدا ہے اور پھر ایک چیز ہے علم اور ایک چیز ہے قدرت، ایک چیز ہے حیات۔ بچوں کو آٹھ صفات ثبوتیہ سکھائے جاتے ہیں۔ تو ایک خدا اور آٹھ عدد صفات۔

تو آپ تو نو کا مجموعہ مانتے ہیں۔ اب مجھے اس جملے کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا اور میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ آپ اسلامیات کے پروفیسر ہیں، اتنی بڑی جگہ اور آپ کو یہ نہیں معلوم کہ جس سے آپ بات کر رہے ہیں، وہ نہیں مانتا صفات کو زائد بر ذات۔ ہم تو صفات کو عین ذات مانتے ہیں، ہمارے نزدیک تو ذات کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ چند برس کے بعد دہلی میں ایک مجلس مکالمہ تھی جس میں تمام دنیا کے پروفیسر جمع تھے۔ اس میں وہ دور بیٹھے تھے، اٹھ کر آئے اور خلوص کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے اس ناگواری کو محسوس نہیں رکھا۔

تو حضور والا! غور فرمائیے کہ توحید الٰہی کو اس طرح پیش کیا کہ جہاں جہاں توحید نہیں ہے، یہ بعد میں نہیں ہوا، اسی وقت مشرک اپنے شرک کو سمجھانے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنی بت پرستی کی تاویل کیوں کرتے کہ:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ۔

ہم ان کی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کریں، ہمیں تقرب عطا کریں۔

ہم درحقیقت اللہ ہی کے طلبگار ہیں۔ ان کو گویا بالکل برابر برابر نہیں سمجھتے۔ ایک مسلمان میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ وہ جس چیز کی تعظیم کرتا ہے، اس سے اگر پوچھیئے کہ تم عبادت کرتے ہو تو وہ کہے گا: نہیں نہیں، ہم اس کی عبادت کرتے ہی نہیں، ہم اس کی تعظیم کرتے ہیں، عبادت خدا کی کرتے ہیں۔

بس! جب اس نے عبادت اور تعظیم میں فرق کیا، وہ شرک کے دائرے سے نکل گیا۔ وہ تاویل کر رہے ہیں مگر نسبت عبادت کی انہی کی طرف دے رہے ہیں کہ ان کی ہم عبادت کرتے ہیں، اس لئے کہ اللہ سے ہمیں قریب کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معبود وہ ان کو مانتے ہیں اور ایک مسلمان، اگر وہ صحیح مسلمان ہے، تو وہ کسی کی بھی تعظیم کرے مگر معبود اسے نہیں مانے گا۔ وہ عبادت ان کی کرنے سے انکار کرے گا۔ کسی سے کہیئے کہ علَم کو جو اس بوسہ دیا ہے، تو اس کی عبادت کی؟ وہ کہے گا: توبہ توبہ، میں علَم کی عبادت نہیں کرتا ہوں، میں احترام کرتا ہوں، تعظیم کرتا ہوں۔ بس اس کے ذہن میں احترام اور عبادت میں فرق ہے۔

یہ قضیہ عرض کردوں کہ عبادت کسی نوعیت عمل کا نام نہیں ہے۔ اگر ایک اشارہ کیا جائے خدا سمجھ کر تو وہ عبادت ہے اور شرک ہے اور اگر سجدہ بھی کرلیا جائے، بغیر نیتِ عبادت کے، تو وہ چاہے شرعِ اسلامی میں گناہ ہو مگر شرک نہیں ہوگا۔ اس لئے میں نے کہا کہ سجدہ غیر اللہ کیلئے اسلام میں ممنوع ہے۔ ممنوع ہونے کے یہ معنی ہیں کہ گناہ ہے لیکن عبادت نہیں ہے۔ عبادت اگر ہوتی تو پھر کسی دَورِ رسالت میں نہ ہوتی، اس لئے کہ شریعت بدلتی ہے، اصولِ دین نہیں بدلتے۔ اگر سجدہ غیر اللہ کو عبادت ہوتا تو آدم کو بھی سجدہ نہیں کروایا جاسکتا تھا۔ یوسف کے سامنے یعقوب اور ان کے بھائی بھی سجدہ نہیں کرسکتے تھے کیونکہ توحید کا اصول ازل سے ایک ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہے، عبادت نہیں ہے۔ شرک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سجدہ غیر اللہ کیلئے جائز نہیں ہے۔ اس کیلئے رسول کی حدیثیں ہیں کہ اگر سجدہ غیر اللہ کیلئے جائز ہوتا تو میں زوجہ کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔ (یہ حدیث آجکل کے ترقی یافتہ دَور کے تقاضوں کے خلاف ہے)۔ دوسری حدیث ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا تو میں شاگرد کو حکم دیتا کہ اُستاد کو سجدہ کرے۔ آجکل تو دورِ حاضر کے ترقی یافتہ طلباء اُستاد کے خلاف ہر قسم کی تشدد آمیز کارروائی کیلئے تیار رہتے ہیں، خصوصاً کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری وجہ سے اُستاد ہوا ہے۔ یعنی ہم اس کیلئے نہیں ہیں، یہ ہمارے لئے ہے۔ یہ ان کی منطق ہے۔ اگر یہ منطق صحیح ہو تو میں کہتا ہوں کہ اُمت کے افراد رسولوں کیلئے نہیں ہیں، رسول اُمت کے افراد کیلئے ہیں۔ وہ بھی تو سکھانے کیلئے ہوتے ہیں۔ تو اُمت کے افراد کہیں کہ وہ ہمارے لئے ہیں تو ہم اونچے ہیں اور (معاذ اللہ) وہ نیچے ہیں۔

حضور! یہ دیکھیئے کہ خالق نے اُستاد کو معلم کا درجہ دیا ہے جو خود خالق کا درجہ ہے، وہ معلم خلائق ہے اور اس نے شاگردوں کو وہ حیثیت دی ہے جو بندوں کو پروردگار کے ساتھ ہے۔ ملائکہ بھی بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں۔

میں کہہ رہا تھا کہ پیغمبر اسلام نے توحید کی آواز اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کی کہ جہاں جہاں کسی میں شرک کی کوئی قسم تھی، وہ اپنے شرک سے شرمانے لگا اور اس کو توحید کے پردوں میں چھپانے لگا۔ یہاں توحید ہی پر پورا زور تھا کیونکہ اگر یہ کہا جاتا کہ اللہ خدا ہے تو پورا عرب کلمہ پڑھ لیتا کیونکہ جو تین سو ساٹھ کو مان رہے تھے، ان کو اکسٹھویں (۶۱) کے ماننے میں کیا عذر ہوتا! مگر یہاں یہ کلمہ

نہیں سکھایا جا رہا تھا کہ کہو کہ اللہ خدا ہے۔ یہ کلمہ سکھایا جا رہا تھا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے۔ اللہ کو ماننا مشکل نہیں تھا، غیر اللہ کو نہ ماننا مشکل تھا۔

اُردو زبان میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو ایک خدا کے ماننے میں عذر نہ تھا، خدا کو ایک ماننے میں عذر تھا اور یہاں یہ تھا کہ ایک خدا کو ماننے سے بات نہیں بنے گی۔ خدا کو ایک مانو۔ بہت سے خداؤں کو انہوں نے ایک خدا بنا دیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ عجیب کے معنی روایاتِ قدیمہ کے خلاف۔ یعنی بڑی دلیل ان کی یہی تھی کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راستے پر دیکھا ہے تو ہم اسے مانتے چلے جائیں گے۔ بہت سی غلط باتوں کیلئے ہمارے عوام بھی اسی قسم کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ صاحب! ہم نے اپنے باپ کو یہی کرتے دیکھا، اپنے دادا کو یہی کرتے دیکھا۔ قرآن نے اس کے جواب میں یہی کہا ہے کہ باپ دادا کے حوالے دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر وہ بھی عقل نہ رکھتے ہوں تو؟ یعنی تمہیں خود اپنی عقل سے سوچنا چاہئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ باپ دادا کی عقل کی عینک لگا کر سوچنا غلط ہے۔ خود اپنی عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ ان کو بڑی مشکل یہی تھی۔ یہاں یہی کہنا تھا کہ کہو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"، اس وقت کے جاہل عرب نہ سمجھتے ہوں کہ اللہ کو ایک کہنے سے "تُفْلِحُوْا" "تمہارا فائدہ ہوگا"۔ اللہ کو کہیں ایک اور فائدہ ہوگا ہمارا۔ یہ اور بات ہے۔ فائدہ ہوگا اُس کا ہوگا، نہ ہوگا اُس کا نہ ہوگا جس کے رقیبوں کا خاتمہ کریں گے۔ اُسے ایک کہیں اور فائدہ ہو ہمارا!

مگر دیکھئے! اندازِ تبلیغ رسول کا تحکمانہ نہیں ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ یہ کہو۔ ناصح کے انداز میں کہہ رہے ہیں۔ دردمند کے انداز میں کہہ رہے ہیں کہ تمہارے فائدے کیلئے کہتا ہوں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو۔ مانو۔ کہو یہ کوئی وظیفہ نہیں ہے جو سکھایا جا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مانو۔ اس قول کو اختیار کرو۔ یہ کہنا وہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارا قول یہ ہے۔ یہ کوئی وقتِ خاص پر کہنے والی بات نہیں ہے۔ لوگ کلمے کو وقتِ خاص پر کہنے کی بات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے روایتیں وضع کی ہیں کہ اس وقت پر کہا کہ کہیں۔ انہوں نے نہیں کہا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنے کی چیز نہیں ہے، یہ ماننے کی چیز ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ مانتے تھے یا نہیں۔ اگر مانتے نہ ہوتے تو بیٹے سے کیوں کہتے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھو؟ اگر مانتے نہ ہوتے تو اس پیغام کی حمایت میں عمر بھر جان کیوں لڑائے رکھتے؟ جب ماننے کا سوال طے ہو گیا تو کہنے کی اہمیت کیا ہے؟ کہا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جس کا ایمان سب پر مسلّم ہے، چاہے جس عمر میں، آپ باپ کے بارے میں یہ حدیث سوچتے ہیں کہ کب کہا، کلمہ کب پڑھا؟

میں کہتا ہوں کہ بیٹے کیلئے ثابت کیجئے کہ علی نے کبھی کلمہ پڑھا؟ بس آئے اور نماز پڑھنے لگے۔ دوسرے بھائی جعفر آئے، کچھ دن کے بعد وہ نماز پڑھنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب وہ تھے جو بغیر کلمہ پڑھے پہلے سے مسلمان تھے کیونکہ نماز بغیر اسلام کے ہوتی ہی نہیں۔ جب نماز پڑھنے چلے تھے، اس وقت رسول کو کلمہ پڑھوانا چاہئے تھا۔ جب نہیں پڑھوایا تو سمجھے کہ یہ کلمہ پڑھنے سے مستغنی ہیں۔ میں کہوں گا کہ جب پہلی دفعہ وحی آئی اور جبرئیل امین آئے تو انہیں اقراء لے کر نہیں آنا چاہئے تھا، کلمہ لے کر آنا چاہئے تھا۔ تو جب رسول ہو جاتا ہے بغیر کلمہ پڑھے تو مومن بغیر کلمہ پڑھے کیوں نہ ہوگا؟

پس پورا پیغام یہ ہے:

قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ۔

اس وقت جاہل عرب یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ کو ایک ماننے سے کیا فائدہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آجکل جب ذہن کی بہت ترقی ہو چکی، اب دنیا سمجھے کہ اللہ کو ایک کہنے سے، ایک ماننے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟ یاد رکھئے کہ تمام دنیا تڑپ رہی ہے دو چیزوں کیلئے، ایک اخوت اور ایک مساوات۔ یعنی برابری اور برادری۔ ان دونوں چیزوں کیلئے پریشان ہے۔ اسی لئے یہ دولت کی برابر تقسیم کا نظریہ ہے۔ امیروں سے چھینو اور غریبوں کو دے دو۔ اس لئے کہ دولت مند اپنی دولت سے غریبوں کو پامال کرتا ہے۔ جب برابر سے تقسیم کر دیں گے، نہ امیر رہے گا، نہ غریب، سب یکساں ہو جائیں گے تو کون کس کو دبائے گا؟ مقصد تو ٹھیک ہے مگر علاج کا طریقہ درست نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نوع انسانی میں اگر تفرقہ فقط دولت و غربت کا ہوتا تو دولت کو برابر سے تقسیم کر کے آپ سمجھ لیتے کہ مساوات قائم ہو گئی مگر نوع انسانی میں تفرقہ فقط دولت و غربت کا نہیں ہے، بازوؤں کی طاقت میں بھی فرق ہے۔ ایک قوی ہیکل ہوتا ہے، دوسرے بیچارے دھان پان سے ہوتے ہیں۔ اور جناب! ایک چیز ہے وجاہت۔ ایک با اثر ہوتا ہے، دوسرے بے اثر ہوتے ہیں۔ ایک چیز ہے قوم و قبیلہ۔ ایک کا جتھا بڑا ہوتا ہے، خاندان بڑا ہوتا ہے، ایک بیچارہ یوسف بے کارواں ہوتا ہے۔ اس کے قبیلے اور خاندان کے افراد ہے ہی نہیں یا کم ہیں۔ ایک چیز ہے دماغی فوقیت۔ ایک ذہین ہے، دوسرے لوگ سادہ لوح ہیں، بھولے بھالے ہیں اور اکثریت انہی کی ہوتی ہے۔

جس طرح دولت مند اپنی دولت سے غریب کو دباتا ہے، اسی طرح بازوؤں کی طاقت والا اپنے بازوؤں کی طاقت سے کمزوروں کو دباتا ہے۔ کسی محلے میں کوئی پہلوان صاحب ہوں تو دیکھئے جتنے اہل محلہ ہیں، وہ ان سب کے رحم و کرم پر ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ وہ بحمد اللہ اتنے طاقت وقوت کے تیس مار خاں ہیں۔ وہ سب ان سے ڈریں گے۔ اسی طرح جو قوم و قبیلے والا ہے، وہ اپنے قوم و قبیلہ کی کثرت کے برتے پر دوسرے لوگوں کو دباتا ہے۔

ارے ایک زمانہ میں قوم و قبیلہ ہوتا تھا، اب پارٹی ہوتی ہے۔ جس کی پارٹی بڑی ہے، وہ اپنی پارٹی کی کثرت کی بناء پر دوسرے لوگوں کو دباتا ہے۔ ایک دماغی فوقیت والا اپنی ذہانیت سے ایسی ترکیبیں بنا لیتا ہے کہ دوسرے لوگ ہمدرد سمجھ کر اس کے قبضے میں چلے جاتے ہیں اور سب اس کو اپنا راس ورئیس مان لیتے ہیں۔ یہ سب ہوتا ہے۔ دولت تو باہر کی چیز ہے، وہ آدمی کا جز و نہیں ہوتی۔ اس کی تصویر کشی امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح کی ہے:

اَنْ یَبْقٰی لَکَ فَلَا تَبْقٰی لَهٗ

"یہ دولت تمہارے لئے رہ بھی جائے تو تم اس کیلئے نہیں رہو گے۔"

ہو تو سکتا ہے کہ یہ آدمی رہے اور دولت ہی کسی طرح چلی جائے اور ہو سکتا ہے کہ دولت رکھی رہے اور یہی چل بسیں۔ یا وہ وفا نہ کرے گی یا یہ وفا نہ کریں گے۔ تو جب بیرونی چیز ہے دولت، تو اس کا برابر سے تقسیم کرنا کونسا مشکل ہے۔ دولت کو آرام سے تقسیم کر سکتے ہیں لیکن بازوؤں کی طاقت کا کیا کیجئے گا۔ کیا طاقتوروں کے بزوؤں سے طاقت کو کھینچ کر کمزوروں میں تقسیم کیجئے گا؟ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی

غذائیں کھلایئے کہ سب کمزور ہو جائیں لیکن جس تناسب سے وہ طاقتور کمزور ہوگا، اسی تناسب سے وہ کمزور قبر کے کنارے پہنچے گا۔ تو اس تفرقہ کو آپ مٹا نہیں سکتے اور وجاہت کا کیا کیجئے گا؟ کیا اُسے بھی نمایاں افراد سے لے کر غیر نمایاں افراد میں تقسیم کیجئے گا؟ قوم وقبیلہ کا کیا کیجئے گا؟ کیا افرادِ خاندان کو بھی تقسیم کیجئے گا؟ دماغی فوقیت کو کیا کیجئے گا؟ کیا اُسے ذہین افراد کے دماغ سے لے کر کسی انجکشن کے ذریعہ سے سادہ لوحوں میں اور بیوقوفوں میں تقسیم کیجئے گا؟

آپ سمجھیں گے کہ سب برابر کے عقل مند ہو گئے اور میں سمجھوں گا کہ سب برابر کے بیوقوف ہو گئے۔ جب یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تو دولت کو برابر سے تقسیم کر کے یہ سمجھ لینا کہ مساوات ہو گئی، طفل تسلی نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ اسلام جو خالق کائنات کی طرف سے تھا، اس سے بڑھ کر مزاجِ بشر سے واقف کون ہے؟ اس نے محسوس کیا کہ عملی طور پر یکسانی کے ساتھ مساوات قائم کر دینا ناممکن ہے۔ ارے زمینیں یکساں نہیں ہیں، کوئی بلند ہے، کوئی پست، کوئی زرخیز، کوئی بنجر۔ پہاڑ سب یکساں نہیں ہیں، کوئی بلند ہے، کوئی پست۔ درخت سب یکساں نہیں ہیں، کوئی طویل کوئی قصیر۔ حیوان سب یکساں نہیں ہیں، کوئی طاقتور ہے، کوئی کمزور۔ تو جب کائنات میں مساوات یکسانی کے معاملہ میں مماثلت کے معنی میں نہیں ہے تو انسانوں میں کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ تو سنت تخلیق کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ فرقے تو نہیں مٹ سکتے مگر ذہنیت کی تعمیر ایسی ہونی چاہئے کہ ایک بازوؤں کی طاقت والا اپنی طاقت سے کمزوروں کو دبائے نہیں بلکہ ان کا محافظ ہو جائے اور ایک صاحب قوم وقبیلہ اپنے قبیلے کی کثرت سے یا پارٹی کی کثرت سے بے نوا اور بیکس افراد کو پامال نہ کرے بلکہ ان کا پاسبان بن جائے۔ ایک دماغی فوقیت والا اپنی ذہنیت کو دوسروں کی تخریب میں صرف نہ کرے بلکہ تعمیر میں صرف کرے۔

یہ بات ہو جائے تو ایک فرد کو اللہ کی دی ہوئی نعمت تمام نوع کا سرمایہ بن جائے اور اگر یہ ہو جائے تو دولت مندی بھی لعنت نہ رہے اور اگر ذہنیت کی تعمیر نہیں ہوتی ہے تو ہزار مرتبہ دولت کو برابر تقسیم کر دیجئے، عدل کُلی قائم نہیں ہوگا اور ظلم کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ تعمیر ذہنیت کیونکر ہو، اس کیلئے احساسِ اخوت کی ضرورت ہے۔ دنیا قانون کے دباؤ سے مساوات قائم کر کے بھائی بھائی بنانا چاہتی ہے، لہٰذا وہ عمارت بے بنیاد ہے۔ ذہنیت کی تشکیل اگر اس طرح ہو جائے کہ ہر انسان دوسرے انسان کو اپنا بھائی سمجھے تو یہ عمارت پائیدار ہوگی۔

اب یہ بات کہ اخوت کیونکر پیدا ہو، برابری کیونکر پیدا ہو، اس کیلئے ہر آدمی غور کر سکتا ہے کہ اس راز کو دیکھئے اور سمجھئے کہ بھائی ہوتا کیونکر ہے؟ یہ سگے بھائی کیوں بھائی ہیں؟ اس لئے کہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ تو ایک ماں باپ کی اولاد دس ہوئے تو دس بھائی بہن، اور پچاس ہوئے تو پچاس بھائی بہن۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ دیکھئے کہ کثرت کتنی بڑی ہے، یہ دیکھئے کہ وحدت نے کتنے افراد کو پرو دیا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ دیہاتوں میں یہ محاورہ ہے کہ یہ ہماری برادری کے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ باپ تو اپنا الگ ہے مگر پانچ چھ پشت پر کوئی مورثِ اعلیٰ ہے کہ اس کی اولاد میں دونوں ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جتنی بھی دور جا کر ایک کا احساس پیدا ہو، وہیں سے برادری قائم ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور کیجئے، یہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ یہ کیا ایک دیس کے باشندے، اور اگر کسی دوسرے وطن میں اپنے وطن کے آدمی کو دیکھ لیا تو چاہے وہاں کبھی شناسائی بھی نہ ہو لیکن دل چاہا کہ قریب آئیں، کچھ اپنی کہیں، کچھ ان کی سنیں۔ یہ وطن کا احساس ہے۔ دنیا نے اور ترقی کی تو یہ سمتوں کا احساس قائم

ہوا کہ یہ مغرب ہے اور یہ مشرق ہے۔ لہٰذا مسائل پر یوں غور ہونے لگا کہ کون یورپ کیلئے کارآمد و مفید ہے اور کون ایشیاء کیلئے مفید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تڑپ رہی ہے، اُس ایک کیلئے جو زیادہ سے زیادہ رقبہ کو ایک بنا سکے۔ مگر جتنی اکائیوں کا تصور ہوا، یہ سب تفریق کا پیش خیمہ ہے کہ جب ایک باپ کی اولاد میں ایکا ہوگا تو دوسرے باپ کی اولاد کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک برادری والوں میں ایکا ہوگا تو دوسری برادری والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک ملک والوں میں ایکا ہوگا تو دوسرے ملک والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوا۔ جب ایک سمت والوں میں ایکا ہوگا تو دوسری سمت والوں کے مقابلہ میں محاذ ہوگا۔ ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ ہے کیونکہ اتحاد کے مرکز عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائے جا رہے ہیں، لہٰذا ہر دیوار ادھر والوں کو ایک کرتی ہے، اُدھر والوں سے جدا کرتی ہے۔

اسلام جو ہمہ گیر برادری کا پیغام لے کر آیا تھا، اس نے یہ کام کیا کہ درمیان کی اتحاد کی دیواروں کو ڈھا کر نہیں بلکہ بلند مقاصد کیلئے نظر انداز کر کے ایک احاطہ اتحاد کا ایسا تعمیر کیا جس میں نہ زبان کی تفریق ہے، نہ ملک کی تفریق ہے، نہ رنگ کی تفریق ہے، نہ نسل کی تفریق ہے، نہ سمت کی تفریق ہے اور وہ خدائے واحد کا ایکا ہے۔ کوئی مجھے بتائے کہ ایک باپ کی اولاد بھائی بھائی ہے، ایک مورث اعلیٰ کی نسل کے لوگ بھائی بھائی ہیں۔ ایک ملک کے باشندے بھائی بھائی ہیں۔ ایک سمت کے رہنے والے بھائی بھائی ہیں۔ ایک خدا کی مخلوق کیوں بھائی بھائی نہیں ہیں؟ مگر اصول وہی ہے کہ بھائی کے حقوق کو وہی یاد رکھے گا جس نے باپ کو یاد رکھا ہوگا۔ اور جو باپ کو بھول جائے، تو پھر بھائی کے حقوق کیسے؟ یہ وجہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے پوری طاقت اس ایک کے یاد دلانے پر صرف کر دی۔ تمام عالم انسانیت بغیر تفریق اسلام و غیر اسلام غور کرے کہ یہ وحدت خالق کا پیغام اتحاد خلائق کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی بناء پر اسلام دین مساوات ہوا یعنی وہ تمدن جو زیر سایہ توحید قائم ہوتا ہے، اس کا نام ہے مساوات اور اس مساوات کی خصوصیت یہ ہے کہ گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں۔ ایک قوم اور دوسری قوم میں کوئی فرق نہیں۔ دیسی اور بدیسی میں کوئی فرق نہیں۔ سب خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا سب کے حقوق و فرائض برابر ہیں۔ یہ وحدت خالق کے زیر سایہ جس تمدن کی تشکیل ہوتی ہے، اس کا نام مساوات ہے۔ اس کے زیر سایہ جو تمدن ہوتا ہے، اس میں اور تفریقوں کا کیا ذکر، اپنے دوست اور دشمن کی بھی تفریق نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے کہا:

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَلَّا تَعْدِلُوْا۔

یہ اس وقت کیلئے ہدایت ہے جب مسلمان برسر اقتدار ہوں۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ دیکھو! کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ تم انصاف نہ کرو۔ عدل تمہارا فریضہ ہے، چاہے یگانے کے مقابلہ میں ہو چاہے بیگانے کے مقابلہ میں ہو۔ اب اس کے زیر سایہ جو اس تمدن کی تعمیر ہوتی ہے، اس میں پھر اپنا بھائی بھی اپنے حق سے زیادہ مانگتا ہے۔ تو اس کی فرمائش کی تعمیل نہیں ہوتی چاہے وہ خفا ہو کر غیر سے مل جائے۔ یعنی نظر ظاہر میں یہ سیاسی شکست برداشت کر لی جائے گی مگر مساوات اسلامی کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے سیاسی طور پر گویا یہ کتنی بڑی ادھر کی فتح ہے کہ سگا بھائی میری طرف آ گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔

مشہور روایت کے مطابق عرض کر رہا ہوں کہ جو گیا تھا، اس میں عملی کمزوری تھی، اعتقادی کمزوری نہیں تھی۔ فائدہ اٹھانے کی

کوشش کی گئی مگر اس نے اپنے اعتقادی استحکام سے اُسے ناکام بنا دیا۔ جناب عقیل سے کہا کہ منبر پر جاؤ اور بتاؤ کہ تمہارے بھائی نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ بلاتکلف اقرار کر لیتے ہیں۔ بے شک صاف صاف کہوں گا کہ میرے ساتھ کیا کیا۔ بہت خوشی ہوئی کہ دیکھو! سگا بھائی جب منبر پر جا کر کہے گا تو دنیا سمجھے گی، بڑی خوشی ہوئی، بلاتکلف منبر پر جانے دیا۔ انہوں نے جا کر کہا: اے لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے بہت کوشش کی کہ میرا بھائی اپنے دین پر مجھے ترجیح دے دے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اُس نے اپنے دینی تقاضے پر مجھے ترجیح نہیں دی۔ تم سب گواہ رہنا کہ انہوں نے مجھے اپنے دین پر ترجیح دے دی۔

یہ مساوات ہے کہ دشمن کیلئے ہماری لغت میں قاتل سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ہے۔ جب ہم کسی کو اپنا انتہائی دشمن کہیں گے تو کہیں گے: ارے وہ تو میرا قاتل ہے۔ لیکن اب دیکھئے کہ زیر سایہ توحید جو مساوات قائم ہوتی ہے، اس میں کیا ہوتا ہے؟ کبھی کی ضرب ہو، جس کا زخم بھر چکا ہو، وہ اور بات ہے لیکن جس نے ابھی ضرب لگائی ہے جس کے اثرات ابھی پورے جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہیں اور وہ گرفتار ہو کر سامنے آتا ہے، تو پہلے نگاہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ ان کی طرف کا آدمی تھا۔ لہٰذا اس نے رسیوں سے نہیں باندھا تھا، ہتھکڑیاں نہیں ڈالی تھیں، اپنے رومال سے دونوں ہاتھوں کو کس کر باندھ دیا تھا۔ فوراً کہا کہ اس کے ہاتھ کیوں بندھے ہیں؟ اس کے ہاتھ کھلوا دیئے۔ اس کے بعد اس کے ضمیر پر اتمامِ حجت کیلئے ایک سوال کیا کہ کیوں کیا؟ میں تمہارا اچھا امام نہیں تھا؟ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ بس بات ختم ہو گئی۔ اب حسن مجتبیٰ سے فرما رہے ہیں کہ جاؤ! یہ تمہارا قیدی ہے۔ یعنی شہنشاہِ ملتِ اسلامیہ اور ہمارے نزدیک دین و دنیا کا شہنشاہ۔ مگر ان کا قاتل جیل نہیں بھیجا جاتا۔ اپنے گھر کے ایک کمرہ میں رکھا جاتا ہے کہ اس کو رکھو، یہ نظر بندی ہے۔ علی کے دَور میں جیل خانہ نہیں تھا۔ فرماتے ہیں: لے جاؤ، یہ تمہارا قیدی ہے۔

مگر حسن سے کہہ رہے ہیں کہ جو خود کھانا، وہ اسے کھلانا۔ جو پانی خود پینا، وہ اس کو پلانا۔ یہ کوئی کر سکتا ہے سوائے اس کے جس کے پیشِ نظر اللہ کا رشتہ ہو، جو زیر سایہ توحید عمل کر رہا ہو۔ اس کے سوا کون کر سکتا ہے؟

تو حضورِ والا! یہ مساوات زیر سایہ توحید قائم ہوئی ہے۔ اس احساسِ مساوات کا راز وحدتِ خالق کا پیغام ہے۔ دنیا والے جو مساوات مساوات کا نعرہ لگاتے ہیں، وہ یہ سمجھے ہیں کہ یہ ضرب المثل ہے کہ اسلام دین مساوات ہے۔ مگر قرآن کو میں دیکھتا ہوں، شروع سے آخر تک، تو مجھے زیادہ آیتیں یہ ملتی ہیں کہ یہ برابر نہیں ہے، یہ برابر نہیں ہے، یہ برابر نہیں ہے۔ برابر ہونے پر اتنا زور نہیں جتنا برابر نہ ہونے پر زور ہے۔ اگر میں صرف دو آیتیں دیکھوں تو اسلام مجھے دین عدم مساوات نظر آتا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے۔ دھوپ اور سایہ برابر نہیں ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ آبِ شور اور آبِ شیریں برابر نہیں ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رو منظور ہے کہ کوئی کمالات کو نظر انداز کر کے سب کو ایک لکڑی ہنکائے۔ اس لئے قدم قدم پر عدم

مساوات کا اعلان ہو رہا ہے۔ لہٰذا مساوات کسی معنی سے ہے اور کس معنی سے نہیں ہے، دیکھئے کتنا بڑا موضوع ہے کہ اسلام دین مساوات ہے۔ ان غلط امتیازات کے اعتبار سے جو دنیا والوں نے قائم کئے ہیں، ان خطوطِ امتیاز کو اسلام نے مٹایا۔ غربت و دولت کو وجہ بلندی و پستی بنایا تھا، اُسے اسلام نے مٹایا۔ نسبت کو معیار بلندی و پستی بنایا تھا، اُسے مٹایا۔ ملک کو بلندی و پستی کا معیار بنایا تھا، اُسے مٹایا۔ رنگت کو معیار بلندی و پستی بنایا تھا، اُسے مٹایا۔ ان سب کے مقابلہ میں مساوات قائم کی اور پھر اپنی طرف سے خطوطِ امتیاز کھینچے جو کردار پر مبنی ہیں، عمل پر مبنی ہیں، جو تقویٰ پر مبنی ہیں۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ۔

"تم میں سب سے زیادہ عزت اُس کی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔

یہ مساوات ہے کہ مسجد کا موذن بلال حبشی کو بنا دیا جاتا ہے۔ یہ بات خاندانی عربوں پر گراں گزرتی ہے کیونکہ احساسات جاتے جاتے مٹتے مٹتے مٹیں گے۔ خو بو ایک دم سے نہیں بدلتی ہے۔ مگر اب رسول سے کیا کہیں کہ یہ تو حبشی ہے؟ کیونکہ ان کی زبان سے سنتے رہے ہیں کہ اسلام میں یہ تفرقے نہیں ہیں، لہٰذا اپنی ناگواری کا اظہار ایسے الفاظ میں ہو کہ ان کے مزاج کے مطابق ہو۔ تو اب دل میں تو یہ ہے کہ یہ حبشی ہے، رسول سے آ کر کہا کہ یہ تو "اَسْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله" کہتے ہیں، "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله" نہیں کہہ سکتے۔ شین صاف نہیں کہتے۔ مَیں کہتا ہوں یقیناً کہا ہوگا۔ ہمارے ہاں فصاحت کے اظہار کیلئے یہ محاورہ ہے کہ فلاں شخص کا شین قاف درست ہے، صاف ہے۔ وہ ضرور کہتے ہوں گے "اَسْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله"۔ سچی بات کہی مگر اپنے مطلب کے رنگ میں۔ یہ نہ سوچا کہ آخر پیغمبر نے بھی تو کبھی بولتے سنا ہوگا، یہ انکشاف ہم کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ دلیل ایسی ہے کہ رسول ضرور معزول کر دیں گے، اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کریں گے کیونکہ ان کے نزدیک تو فیصلہ بشر ہی کا ہے۔

اب رسول یہ نہیں کہتے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ تو "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله" صاف کہتے ہیں۔ واقعاً نہیں کہتے تھے۔ رسول کیا جواب دیتے ہیں؟ فرماتے ہیں کہ:

سِيْنُ بِلَالٍ شِيْنٌ عِنْدَ اللهِ۔

"بلال کا سین اللہ کے ہاں شین ہے"۔

فلسفہ کیا ہے؟ ہم تو ان کانوں سے سنتے ہیں، لہٰذا اس زبان سے جو لفظ نکلتا ہے، وہی ہماری سمجھ میں آتا ہے اور اللہ جو دل کی صدا سنتا ہے، لہٰذا ان کا سین وہاں شین ہو کر پہنچتا ہے۔ اب اس موذن بنانے کے فیصلے پر دنیا غور کرے۔ امام جماعت کو وہی دیکھے گا جو مسجد کے اندر جائے گا۔ مگر موذن کی صدا وہ بھی سنے گا جو رہگذر سے جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بلال کو موذن بنانا نہیں تھا، یہ مساوات اسلامی کا ایک علم تھا جو بلند کیا گیا تھا۔

یہ تو مساوات ہوئی۔ عدم مساوات یہ ہے کہ جب بیٹی آتی ہے تو تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہیں، حالانکہ دنیا میں کوئی باپ بیٹی کی

تعظیم نہیں کرتا۔ یہ تو عملِ رسول بتاتا ہے کہ فاطمہ فقط بیٹی نہیں ہیں، کچھ اور ہیں۔ کوئی اور منزل ہے۔ فاطمہ کی منزل یہ ہے کہ رسول کا عمل مردوں کیلئے نمونہ عمل ہے اور فاطمہ کا کردار خواتین کیلئے نمونہ عمل ہے۔ حضرت علی علیہ السلام تک کیلئے "فَاتَّبِعُوْنِیْ" کا پیغام ہے کہ میرے نقشِ قدم پر چلو۔ یعنی علی کیلئے بھی رسول کا نقش قدم نمونہ ہے۔ ان کا نقش قدم ان کے واسطے بھی اتباع کا مرکز ہے مگر فاطمہ کے نقش قدم کے آگے کسی کا نقش قدم نہیں۔

اس پہلو کی بناء پر ایک بڑی مشکل میرے ذہن کی حل ہوگئی کہ امیر المومنین علیہ السلام کے فضائل بے شمار مگر میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ پیغمبر خدا علی علیہ السلام کیلئے کھڑے ہوئے ہوں۔ لیکن فاطمہ زہرا کیلئے، صحاح ستہ کی حدیث ہے کہ پیغمبر خدا تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے۔ افضل شخص امیر المومنین، ان کیلئے یہ بات نظر نہیں آتی اور فاطمہ زہرا کی تعظیم کیلئے رسولِ خدا کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی خصوصیت نظر آتی ہے۔ میں نے اس پر غور کیا تو بس یہی کچھ سمجھ میں آیا کہ کثرتِ فضائل الگ چیز ہے مگر عہدہ کے لحاظ سے علی کا جو منصب ہے، وہ رسول کے بعد ہوگا اور فاطمہ کا جو منصب ہے، وہ رسول کے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ ان کا کردار ہے جو خواتین کے طبقہ کیلئے نمونہ عمل ہے، مثالِ عمل ہے۔

میں کہتا ہوں مقامِ اطاعت میں یہ رسولؐ کے پیچھے ہیں مگر مقامِ اتباع میں یہ رسول کے پیچھے نہیں ہیں، ان کی صف میں ہیں، ان کے ساتھ ساتھ ہیں اور اب کہتا ہوں کہ مقامِ عمل میں جو کام تیرہ معصومین نے مل کر کیا، وہ اپنے طبقہ کیلئے تنہا فاطمہ زہرا نے کیا۔

اب انہیں مثال پیش کرنا تھی تو جتنے بھی رشتے خواتین کے تقاضے کے ہوتے ہیں، ان سب کو انہیں نمونہ مثال پیش کرنا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے تو عظمت وعزت کے لحاظ سے کہا ہے۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز

وہ عزت کے لحاظ سے ہے۔ میں دوسرے رُخ سے ان کے اس تصور کو لیتا ہوں کہ حضرتِ مریم مثالِ عمل حضرت عیسیٰ کی نسبت سے ہیں اور حضرت زہرا تین نسبتوں سے تین رشتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

ماشاءاللہ صاحبانِ فہم ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا، عورت کی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ ایک بیٹی ہونے کا دور، دوسرے بیوی ہونے کا دَور، تیسرے ماں ہونے کا دَور۔ یہ تین دَور ہیں جو عورت پر گزرتے ہیں۔ عورت ہی بیٹی ہوتی ہے، عورت ہی زوجہ ہوتی ہے، شریکِ حیات ہوتی ہے، عورت ہی ماں ہوتی ہے۔ یہ ہیں تین دَور۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا دَور بیٹی ہونے والا تمہیدِ حیات ہے۔ وہ بچ کا دور ہے، وہ مقدمہ زندگی ہے، یہ نتیجہ زندگی ہے اور اصل زندگی کا درمیان کا دَور ہے اور وہی درمیان کا خانہ حضرت مریم کے ہاں خالی ہے۔ وہ بے شک ماں باپ کی بیٹی ہیں۔ بے شک عیسیٰ ایسے بیٹے کی ماں ہیں لیکن وہ اصل زندگی نہیں ہے۔ شریکِ حیات ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا اصل رہنمائی طبقہ خواتین کی نہیں کرسکتیں۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح عیسیٰ پر رسالت ختم نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ وہ انفرادی زندگی کے نمائندہ ہیں، اسی طرح مریم پر اس سلسلہ کی رہنمائی ختم نہیں ہوسکتی۔ جس طرح عیسیٰ کے بعد ہمارے پیغمبر کی ضرورت تھی، اسی طرح مریم

کے بعد فاطمہ زہرا کی ضرورت تھی ۔انہوں نے تینوں رشتوں کیلئے مکمل مثالیں چھوڑیں۔ باپ کی شریک کار ہو کر مباہلے میں آئیں، شریک منصب نہیں کہہ رہا، شریک کار ہو کر باپ کے ساتھ مباہلے میں آئیں اور شوہر کے ساتھ ساری زندگی شریک کار رہیں اور ایسے بچے چھوڑے، حسن وحسین جیسے بیٹے، زینب وام کلثوم جیسی بیٹیاں۔

میں بارگاہ سیدہ عالم میں خود دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ بے شک مکمل نمائندہ ہیں۔ بے شک آپ نے ہر شعبے میں مثال چھوڑی ہے مگر اے معصومہ عالم! اے خاتون جنت! اے مخدومہ دو جہاں! آپ کی سیرت کا نقص نہیں ہے مگر اللہ نے آپ کو کوئی بھائی نہیں عنایت کیا۔ اس رشتہ کے تقاضے آپ نہیں دکھا سکتی تھیں۔ لہٰذا جس طرح مریم کے بعد آپ کی ضرورت تھی، اسی طرح آپ کے بعد آپ کی بیٹی زینب کی ضرورت تھی۔ اس رشتہ کا مکمل نمونہ حضرت زینب کبریٰ، انہوں نے اس رشتہ کے تقاضے کربلا میں پیش کر دیئے۔

64

اسلام اور ادیانِ عالم

یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عصمت کردار کا نام عدالت ہے، انبیاء و آئمہ کے ہاں عصمت ہے۔

چونکہ انسان، انسان شناسی کی منزل سے دور تھا، اس لئے خدا شناسی سے دور تھا۔

بسمل کا تڑپتا لاشہ دیکھا جا سکتا ہے، جسم پر زخموں کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں، سر کا قلم ہونا دیکھا جا سکتا ہے، بہتا ہوا خون دیکھا جا سکتا ہے مگر کس راہ میں ہے، یہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

یاد رکھئے کہ ہر کمال کو کہہ دیا کہ ان کا ہے، ذاتی طور پر خدا سے بے نیاز ہو کر تو شرک ہے جب خدا کی طرف سے مان لیجئے تو عین توحید ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اسلام اور ادیانِ عالم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا، وہ اس سے قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

یہ اس کا ترجمہ ہے۔ کوئی مفہوم اس کا ایسا نہیں کہ ترجمہ کچھ اور ہو اور مطلب اس کا کچھ اور ہو۔ ایک سوال اسی موضوع سے متعلق مجھ سے کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوال کچھ اور ذہنوں میں بھی موجود ہو۔ لہٰذا اس کی مختصر تشریح کردوں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں ہوگا۔ بہت سے غیر مسلم ہیں جو ایسے گھرانوں میں پیدا ہوئے کہ انہوں نے اپنے دھرم کے سوا کسی مذہب کی تعلیم سنی ہی نہیں۔ اسلام کی تعلیمات ان کے گوش زد ہوئے ہی نہیں۔ تو چونکہ ایک ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے تھے اور چونکہ ایک خاندان میں نشو ونما پائی تھی، لہٰذا وہ اپنے اسی مذہب پر آخر تک قائم رہے۔ اس گھر میں پیدا ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس ماحول میں نشو ونما پانا ان کے اختیار کی بات نہیں تھی۔ یہ اسباب ہوئے کہ مذہب حق سے روشناس نہ ہو سکے اور اپنے غلط مذہب پر آخر دم تک قائم رہے۔ ایسے افراد کیوں گھاٹا اٹھائیں؟ ان کو آخرت میں خسارہ کیوں ہو؟

یہ بہر حال ایسا سوال ہے جو اس موضوع کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس بنا پر میں نے اس سوال کو موضوع بیان قرار دیا۔ اب اس سوال کے حل کرنے کیلئے تمہیداً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں دو نقطہ نظر ہیں: ایک نقطہ نظر تو ان افراد کا ہے جو اللہ کیلئے عدالت ضروری نہیں سمجھتے جنہوں نے اصول دین کو عدالت سے محروم کر دیا ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ اللہ قادر مطلق ہے۔ جب قادر مطلق ہے تو اس پر کسی کو پابندی عائد کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ ایسا ضرور کرے اور ایسا ہر گز نہ کرے۔ یہ پابندیاں عائد کرنا اس شخص کیلئے ہیں جو عاجز ہو، مجبور ہو اور کسی دوسرے کے زیر اختیار ہو۔ لیکن جو خود قادر مطلق ہے، اس پر یہ پابندیاں عائد کرنا کہ وہ ایسا ضرور کرے اور ایسا ہر گز نہ کرے، غلط ہے۔ لہٰذا چونکہ اس کی قدرت لامحدود ہے، اب جو شخص کوئی راستہ اختیار کرتا ہے تو اُسے قرآن سے بھی سند مل جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَ ہُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ۔

اس سے کوئی سوال نہیں ہو سکتا، جو وہ کرتا ہے کہ اس نے کیوں کیا۔ ہاں! دوسرے لوگوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ خدا کے ہاں جب یہ ہے تو اس کے ہاں عدالت کی پابندی عائد کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ان کا نقطہ نظر ہے جس کو میں نے پوری قوت سے بیان کیا۔ اب رد اس کی مفصل عرض نہیں کرتا ہے۔ مجملاً یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی قدرت کو سنِ ظلم ... اقتدار کی لاٹھی سمجھا ہے کہ

جس کے ہاتھ میں لاٹھی، اُس کی بھینس۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو طاقت کو حق سمجھتا ہو، یہ اس کا نظریہ ہے۔ چونکہ قادر مطلق ہے، لہٰذا جو چاہے کرے۔ تو سلاطین باقتدار کی طاقت کا جو تقاضا ہوا کرتا ہے، اُسے اللہ پر مسلط کر دیا ہے۔ اب میں اپنے الفاظ میں کہہ رہا ہوں۔ وہ ان کے الفاظ میں ترجمانی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ وہ قادر مطلق ہے، لہٰذا اس کی نہ داد نہ فریاد۔ وہ جو چاہے کرے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ ہے کہ اگر کوئی عمر بھر اطاعت کرے، بالکل ایک دفعہ بھی گناہ نہ کرے تو ممکن ہے کہ اللہ اُسے دوزخ میں ڈال دے اور جو عمر بھر نافرمانی کرتا رہے، اُسے جنت میں بھیج دے۔ اپنے منظورِ نظر افراد کو جنت میں بھیجنے کیلئے کیسے کیسے چور دروازے تلاش کئے ہیں۔

جناب! اتفاق سے اکثریت اس نظریہ کے حامی افراد کی ہے مگر اس نظریہ کی بنیاد پر تو اس سوال کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے تو وہ قبول نہیں ہوگا۔ چاہے بس ہو، چاہے بے بسی کے ساتھ ہو۔ جو اس نے کہہ دیا ہے، اُسے مانئے۔ اگر قرآن کو مانتے ہیں، اس نے چونکہ یہ کہہ دیا ہے، لہٰذا اس سوال کا محل ہی نہیں ہے۔ بالکل ٹھیک ہے، بالکل مجبور ہے، بالکل بے اختیار ہے، وہ بیچارہ ہے، اُس نے سنا ہی نہیں تھا مگر بہر حال اسلام کے علاوہ دوسرے راستہ پر ہے اور اُس کا کام ہے جنت اور دوزخ کو تقسیم کرنا اور اُس نے کہہ دیا ہے کہ ہم جنت میں اُسے بھیجیں گے جو مسلم ہو اور جو غیر مسلم ہوا، اُسے ہم ہرگز نجات نہیں دیں گے۔

تو اب چاہے وہ بے بس ہو، چاہے کچھ ہو، ہے تو غیر مسلم۔ تو اس کے فرمان کے مطابق اس کیلئے یہی انجام ہے جو قرآن نے کہہ دیا۔ یہ ان کے نقطۂ نظر سے ہے یعنی پھر کسی زحمتِ تفکر کے اٹھانے کی حاجت نہیں۔ سوچنے کی حاجت نہیں۔ بس کہہ دیا آپ کا کیا اجارہ ہے۔ وہ اُسے دوزخ میں بھیج رہا ہے۔ وہ جیتے یا آپ فریاد کیا کیجئے۔ نہ اُسے حق چیخنے کا ہے، نہ آپ کو فریاد کرنے کا۔ یہ تو ان کے نقطۂ نظر سے ہے اور اکثریت اسی نقطۂ نظر کی ہے۔ وہ آسودہ ہے یعنی اس کو اس سوال کے جواب کی کچھ زحمت نہیں اٹھانا مگر اس بارے میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ ہے کہ ہم اللہ کو عادل مانتے ہیں تو ہم لوگ عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہ کتنی کٹھن منزل ہے اور ہماری تو جتنی منزلیں ہیں، سب ہی کٹھن ہیں۔

صاحب! ہم ایسے ہیں کہ ہم کو اللہ کی وکالت بھی کرنا ہے، جب کوئی اس کی بات کرے اور ہمیں یہ محسوس ہو کہ یہ اللہ بلندی کے خلاف ہے تو ہمیں اللہ کی طرف سے بھی وکالت کرنا ہے۔ آدم سے لے کر نبی تک ہر نبی کی وکالت کرنا ہے۔ آدم کے دامن پر گناہ کا دھبہ آئے تو صفائی کیلئے ہم بڑھیں۔ یوسف کے دامن پر کوئی دھبہ آئے تو ہم بڑھیں۔ سب کے وکیل ہم ہیں۔ ہم پر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے ثبوت کا بار ہے۔

اپنے آئمہ کیلئے ظاہر ہے کہ ہمیں ہی آگے بڑھنا ہے۔ جی نہیں! گناہ نہیں ہے۔ کسی نہ کسی رُخ سے ہمیں ثابت کرنا ہے کہ یہ گناہ نہیں ہے۔ وہ بہر حال معصوم ہیں۔ دنیا یہاں بھی آسودہ ہے یعنی کسی مسئلہ میں بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ کہیں کسی نبی کے کردار پر اعتراض ہو تو کہیں گے کہ گناہ کیا تو کیا ہوا، آدمی ہی تو تھے! ہمارے لئے بڑی مصیبت ہے۔ ہمیں اس مصیبت میں اعتقاد نے ڈالا۔ انہیں مصیبت سے رہائی دی، اپنی طرف کمزوری کے احساس نے۔ ہمارے اعتقاد نے ہم کو مصیبت میں یوں ڈالا کہ ہم جنہیں مان رہے تھے، ان کے متعلق یہ بھروسہ تھا کہ ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم نے جب وصی نبی کو اس منزل پر مانا تو وہ رسول جس کے یہ

جانشین ہوں، اُسے کیونکر گناہگار مان سکتے تھے۔

دیکھئے! ہم ادھر سے چلے ہیں کہ جب یہ معصوم ہیں تو ناممکن ہے کہ انبیاء و مرسلین گناہگار ہوں۔ لہٰذا اس تصور نے کہ یہ معصوم ہیں، اس اعتقاد نے ہم پر ایک لاکھ چوبیس ہزار عصمتوں کا بوجھ ڈال دیا اور جب انبیاء معصوم ہیں، اللہ کے ہاں ایسی بات کیونکر ہو سکتی ہے کہ جو اس کے معیار عظمتِ کردار کے خلاف ہو۔ یاد رکھئے کہ اللہ کے ہاں عظمتِ کردار کا نام عدالت ہے، انبیاء و آئمہ کے ہاں عصمت ہے۔

پس ہم اللہ کیلئے بھی وکالت پر مجبور ہو گئے۔ یہاں سے ہم چلے تھے، وہاں پہنچے۔ وہ بھی یہیں سے چلے اور نہ جانے کہاں پہنچے؟ ایسے افراد سے مجھے ہمدردی ہے۔ انہیں ایسے اشخاص کو بلندی دینا ہوئی یا ماننا پڑی کہ جن میں داغ دھبے ہیں۔

اب نگاہ میں یہ ہے کہ رسول کا جانشین ہے اور یہ ایسا ہے۔ اس بات کی اہمیت کو نگاہ میں کم کرنے کیلئے یہ کہا کہ اس کا کیا ذکر ہے، اس کیلئے ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ معصوم ہو؟ گویا ضمیر گوارا نہیں کرتا مطلق طور پر کہنے کو کہ انبیاء معصوم نہیں ہیں۔ جی ضرور معصوم ہیں مگر اس میں ایک مگر آ جاتا ہے۔ معصوم ہیں مگر قبل بعثت نہیں ہیں یا یہ کہ وہ جو ارادۃً گناہ ہوتے ہیں، اس کے لحاظ سے معصوم ہیں۔ مگر ان سے سہو و نسیان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ ایک عدد "مگر" ضرور آ جاتا ہے۔ بس انسان کو یہ سہارا ہو جاتا ہے کہ جب رہنما میں یہ باتیں ہیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ لہٰذا جب نبی کی سطح یہ مان لیں گے تو ظاہر ہے کہ "وزیرے چنیں شہر یارے چنیں"۔ جب انبیاء کے ہاں عصمت پوری مکمل ضروری نہیں تو اللہ کے ہاں عدالت پوری مکمل کیوں ضرورت ہو؟ وہ جو چاہے کرے۔

مگر اب ہم ہیں سب کے وکیل۔ ہمیں سب کی نمائندگی کرنا ہے۔ ہم اللہ کو عادل سمجھتے ہیں تو عدالتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص جو اس ماحول میں پیدا ہو، اس ماں اور باپ کے ہاں پیدا ہو، اگر بالفرض ایسا ہو، حالانکہ اس دورِ تمدن و تہذیب اور کثرتِ روابط و تعلقات میں ایسا ممکن نہیں ہے لیکن بالفرض کوئی ایسا ہو کہ کچھ گوش زد ہی نہ ہوا ہو، اس کو اپنے مذہب کے سوا، اس کے ذہن میں کبھی آیا ہی نہ ہو کہ کوئی مسلم بھی قوم ہے، اُسے پتہ ہی نہ چلا ہو کہ اسلام بھی کوئی چیز ہے اور اس نے آنکھ کھول کر جیسے کال کوٹھڑی میں، بس تاریکی ہی تاریکی دیکھی۔ اس نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو بس اپنے مذہب کو پایا۔ اس تک صدائے حق پہنچی ہی نہیں۔ اس تک نامِ اسلام گیا ہی نہیں۔ اس نے رہنمایانِ اسلام کا نام کبھی سنا ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ شبہ پیدا ہوا ہی نہیں کہ شاید اسلام حق ہو۔ کبھی اس کے ذہن میں یہ تصور ہی نہیں ہوا کہ ممکن ہے کوئی دوسرا راستہ اسلام ہی نہیں، عیسائیت حق ہو، یہودیت حق ہو۔ ایسی کوئی بات اس کے ذہن میں آئی ہی نہیں۔

اگر بالفرض ایسی مخلوق پائی جاتی ہو، ایسا آدمی موجود ہو تو چونکہ خدا ہمارا عادل ہے، تو اس کو ہرگز سزا اس کے کفر کی نہیں ملے گی اگر وہ واقعی مجبور تھا۔ لیکن اگر اس نے سب نام دوسرے مذاہب کے سنے اور پھر بھی دماغی آسانی کی بناء پر، ذہنی کاہلی کی بناء پر اپنے سابق مذہب سے محبت کی بناء پر، اپنی آبائی روایات سے اُنس کی بناء پر، اس کی وجہ سے اس نے کبھی سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ کوئی دوسرا مذہب حق ہے، تو پھر ایسا منکر اپنی کسی اختیاری کوتاہی کی بناء پر قابلِ معافی نہیں ہے۔ جب بہت سے راستے اس کے گوش زد

ہوئے تو کیا رسول کی آواز سننے کی ضرورت نہیں تھی؟ قرآن کی آیتیں پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی اس تک کہ کوئی حافظِ قرآن جا کر اُسے قرآن سنائے یا کسی عالم کی ضرورت نہیں تھی کہ جا کر اُسے حدیثیں سنائے، جا کر اُسے رسول کا پیغام سنائے۔

اس کی جو عقل تھی، وہ اس کی طرف کا رہنما تھی جو اس پر یہ فریضہ عائد کرتی تھی کہ تم کو خود تحقیق کرنا چاہئے۔ جب بہت سے راستے ہیں تو تم کو تلاش کرنا چاہئے کہ کونسا راستہ صحیح ہے اور اگر ایسا نہیں کیا تو وہ اس رہنما کی نافرمانی کی وجہ سے ہے جسے خالق نے اسی لئے رکھا تھا۔

اس نے اس رہنما کو عقل کی صورت میں ہر ایک کے اندر رکھ دیا تھا۔ اس رہنما کی وجہ سے یہ اب موردِ عتاب ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ اُسے سزا دے کہ گوش زد تو ہوا اسلام کا نام تو پھر تم نے معلوم کیوں نہ کیا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ پھر تم نے دریافت کیوں نہ کیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ اور یہ وہ کافر ہی نہیں ہیں، بہت سے مسلمان ہیں جو عمر گزر جاتی ہے، نماز صحیح نہیں پڑھتے، اس لئے کہ بیچاروں کو مسئلے معلوم نہیں ہیں، اس لئے کہ مسئلے معلوم کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ عالم مل بھی گیا تو اس سے پوچھیں گے کہ فلاں امام کی کتنی لڑکیاں تھیں؟ اس سے یہ پوچھیں گے کہ فلاں شہزادے کی کتنی عمر تھی؟ یعنی سب کچھ وہ پوچھیں گے جس سے اپنے عمل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جو اپنا عمل ہے، اُسے کبھی نہیں پوچھیں گے کہ وضو کس طرح کریں تو صحیح ہوگا۔ غسل کس طرح کریں تو صحیح ہوگا۔ نماز کس طرح پڑھیں تو صحیح ہوگی۔

تو یہ ہے تو کسی کہ کہیں بیچارے جاہل ہیں، بیچارے ناواقف ہیں لیکن ان کیلئے تو معصوم نے صراحتاً کہا ہے کہ روزِ قیامت اُسے بلائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ تو نے صحیح عمل کیوں نہ کیا؟ وہ جواب میں کہے گا کہ مجھے علم نہیں ہوا۔ ارشاد ہوگا کہ تم نے علم حاصل کیوں نہ کیا؟ تم نے مسائل سے واقفیت حاصل کیوں نہ کی؟ اس کے بعد کوئی جواب نہیں۔ تو جو ذرائع کے نہ موجود ہونے کی وجہ سے مجبوراً غلطی پر رہے۔ اس کو جاہل قاصر کہتے ہیں۔ وہ جاہل قاصر ہے اور اسے جاہل مقصر کہتے ہیں۔ قصوروار۔ یعنی بہ اختیار خود تقصیر کرنے والا جاہل۔ یہ معاف نہیں ہے۔ تو کافر اگر قاصر میں داخل ہو تو اُسے سزا نہیں مل سکتی لیکن اگر وہ مقصر میں داخل ہے تو اس دورِ تمدن و تہذیب میں کوئی ایسا آدمی سوچنا مشکل ہے کہ جس تک آوازِ اسلام پہنچی ہی نہ ہو۔ جس نے نام اسلام سنا ہی نہ ہو۔ آجکل ذرائع کی اتنی وسعت ہے ،لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ اس میں نام آتے ہیں۔ ریڈیو سنتے ہیں، اس میں نام آتے ہیں۔ ٹی وی پر مختلف لوگوں کے جلوس تفریحاً دکھائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے اللہ کی حجت ہر ایک پر ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس دَور میں اس قسم کے کافر کا وجود نہیں ہے جس نے نامِ حق سنا ہی نہ ہو۔ اس صورت میں آجکل تو یہ کلیہ ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

جو اسلام کے علاوہ کسی دین کو اختیار کرے یا کسی دین پر قائم و برقرار رہے، وہ ہرگز قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا اور حق بجانب طور پر ہوگا کیونکہ اس نے عملی کوتاہی کی۔

ہاں! فرض کیجئے کہ ذوقِ تخلیق پیدا ہوا مگر مذاہب اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ تحقیق میں مصروف ہو گیا لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا تو اب فقط یہ کہ سزا سے بچے گا بلکہ اس کی جدوجہد کا اجر بھی ملے گا۔

اتنا بیان تو اس سوال کی خاطر ہوا۔ اب اسلام کی خصوصیات پر آئیں۔ پہلی خصوصیت یہ کہ اس کا تعلق کسی محدود فرد یا محدود جگہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ذاتِ الٰہی سے ہے۔ لامحدود پیغام ہے اور ایسی ذات کی طرف سے ہے جس سے کوئی بیگانگی کا اعلان نہیں کر سکتا کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں صلاحیت خود اس کے نام میں ہمہ گیر ہونے کی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ کہ اسلام دین کائنات ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ کوئی الگ سے بار نہیں ہے جو انسان پر عائد ہوتا ہو بلکہ وہی فطرت کا تقاضا جو ہے، اسی کا مطالبہ ہے یعنی جب پیدا ہوا تھا، جب بھی قانونِ الٰہی کی اطاعت کرتا ہوا آیا تھا اور اسی کی اطاعت کا نام اسلام ہے۔ یہ ایک مفہوم اس حدیث کا ہے۔ کلامِ رسول کی خصوصیت یہ ہے کہ کتنے ہی پہلو اس میں ہوتے ہیں اور کتنے ہی معنی اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ ارشادِ رسول ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ اِنَّمَا اَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اُسے یہودی بنا دیتے ہیں یا یہودی رکھتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا نصرانی رکھتے ہیں اور آتش پرست۔

یہ نام بھی بطورِ مثال ہیں کہ جو کوئی کسی غلط راستے پر قائم ہوتا ہے، سوائے اسلام کے، وہ درحقیقت ماحول کا دباؤ ہے جیسے یہودیت، نصرانیت بطورِ تمثیل نام ہیں۔ ویسے ہی ماں باپ کا نام بطورِ تمثیل ہے۔ ماں باپ کے معنی صرف ماں باپ ہی نہیں ہیں بلکہ جو ماحول، جو بزرگ جس کے زیرِ سایہ اس نے نشوونما پائی ہو، وہ اس میں مضمر ہیں۔ درحقیقت وہ اسے غلط راستوں پر لگا دیتے ہیں۔ یہ حدیث میں نے پڑھی کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور تربیت یا ماحول اُسے غلط راستے پر چلاتا ہے۔ تو جہاں تربیت فطرت سے ہم آہنگ ہو، اس کے متعلق اس سوال کی گنجائش کب ہوگی کہ کب اسلام لایا۔

وہ بچہ جس کے بچپن کی بناء پر سوال ہوتا ہے کہ چونکہ بچہ ہے، لہٰذا اس کے اسلام کی کیا اہمیت ہے۔ مگر اتفاق سے وہ بچپن ہی اس کا جوہر ہے۔ مجھے بھی بچے کو بوڑھا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ جو بچہ ہے، وہ تو بچہ ہی ہے لیکن یہ کہ وہ بچہ ایسا ہے کہ پیغمبر کے زیرِ تربیت ہے۔ اس سے اس کی قدرت ادراک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یعنی جو مربی عالم بننے والا ہے، اس کے آفتابِ تربیت کی تمام شعاعیں اس ایک شخص پر مرتکز ہیں۔

کس طرح وہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے اُردو ادیبوں کے ذہن پر یہ تشبیہ بار ہو سکتی ہے کہ اُردو میں اسے نظم کیا جائے تو وہ خوبصورت شعر نہیں ہوگا۔ لیکن کمالِ تشبیہ کا انحصار ماحول پر ہے۔ عرب کا ماحول، اس میں حضرت علی علیہ السلام، جن کی فصاحت

وبلاغت کیلئے اُدباء کا مقولہ یہ ہے کہ تحت کلام خالق وفوق کلام مخلوق۔ خالق کے کلام کے نیچے ہے اور تمام مخلوق کے کلام کے اوپر ہے۔

امیر المومنین یہ تشبیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"میں اس طرح پیغمبر کے پیچھے پیچھے رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اونٹنی کے پیچھے پیچھے رہتا ہے"۔

اب اس بچپن میں جبکہ ہر وقت مربی پیچھے پیچھے رہتے ہیں، قوت ادراک واحساس کیا ہے کہ فرما رہے ہیں:

"کُنۡتُ اَرَاُنُوۡرَ نُبُوَّةِ وَاَشَمُّ رِیۡحَ الرِّسَالَةِ"۔

"میں نبوت کی روشنی میں دیکھتا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا"۔

کوئی کہے کہ رسالت کی خوشبو ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن میں پڑھ کر آپ بتائیے کہ کیا قمیص یوسف کی کوئی خوشبو تھی؟ جیسی خوشبو ہوتی ہے، ویسا مشام چاہئے۔ پھولوں کی خوشبو جسمانی مشام والے سونگھیں گے اور نبوت کی خوشبو وہ ہے جو نبوت کے ہم جنس منصب کا کوئی آدمی سونگھے۔

میں نبوت کی روشنی دیکھ رہا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ نبی کی خوشبو نہیں کہہ رہے ہیں، رسول کی خوشبو نہیں کہہ رہے ہیں۔ جی نہیں! جو حراء میں ہے، نبوت کی روشنی اور رسالت کی خوشبو۔ تو جو قبل رسالت، قبل بعثت نبوت کی روشنی دیکھتا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا ہو، اس کیلئے پوچھئے گا کہ کب ایمان لایا اور اس نے کب اسلام اختیار کیا۔ رسول کی بعثت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چالیس برس کی عمر میں مامور ہوئے بلکہ چالیس سال کی عمر میں اعلانِ رسالت کا حکم ہوا۔ دعوائے رسالت پر مامور ہوئے ورنہ نبی تو پہلے سے تھے۔ میں اس کی روشنی میں کہوں گا کہ تاریخ کی نگاہ مشاہدات کو دیکھتی ہے۔ ایمان کا تعلق غیب سے ہوتا ہے۔

اس لئے تاریخ میں یہ ہے کہ ستائیس رجب کو ۴۰ عام الفیل میں رسول مبعوث بہ رسالت ہوئے۔ یہ تاریخ والی رسالت ہے اور حقیقت کے لحاظ سے رسالت:

"کُنۡتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیۡنَ الۡمَآءِ وَالطِّیۡنِ"۔

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم کا پتلا آب وگل میں تھا"۔

بس میں کہتا ہوں کہ جس نوعیت کی رسالت ان کی تھی، اس نوعیت کا علی کا ایمان تھا اور جس معنی سے یہ آج رسول ہوئے، اس معنی سے یہ آج ایمان لائے۔

فطرت آغاز عمر انسانی سے جو عمل کرواتی ہے، اس کا نام اسلام ہے۔ بعد میں الگ سے کوئی بوجھ نہیں پڑتا ہے، کوئی دباؤ نہیں پڑتا ہے۔ جو کام اب تک جبری طور پر کرتے رہے ہو، اب اختیاری طور پر کرو۔ اس کی اطاعت اب تک برابر کر رہے تھے مگر اپنے شعور ادراک سے نہیں کر رہے تھے۔ اب شعوری طور پر اپنے اختیار وادراک کے ساتھ اس کی اطاعت کو۔ اس کے پیغام کو قبول کرو تو اس کا نام بھی اسلام ہوگا۔ وہ حقیقی قدرتی اسلام تھا، یہ اختیاری اپنے عمل کا اسلام ہوگا جو اس وقت سے تم اختیار کرو گے۔ اس لئے اُس وقت کی

اطاعت کی کوئی جزا نہیں ہوگی۔ اس وقت جو اطاعت کرو گے، اس کی تمہیں جزا بھی ملے گی اور جزا کا دینا بھی فضل کرم ہے ورنہ مخالفت میں سزا ہے، موافقت میں جزا کا استحقاق دنیا میں نہیں ہوا کرتا۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے موافقت میں جزا کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ جو گناہوں سے توبہ کرے، توبہ کے معنی یہ ہیں کہ غلط راستے سے صحیح راستے پر آئے۔ تو یہ نہیں ہے کہ وہ سزا ختم ہو جائے گی جو گناہوں کی تھی بلکہ یہ توبہ کرنا بھی ایک حسنہ ہے، ایک نیکی ہے جس کی جزا ملے گی۔

تیسری خصوصیت اسلام کی یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو انسان سے متعارف کروایا۔ یعنی دنیا کے سامنے اس سے پہلے دور دور کی چیزیں تھیں مگر یہ نہ سمجھا تھا کہ انسان کیا چیز ہے۔ انسان شناسی کی منزل دور تھی۔ چونکہ انسان، انسان شناسی کی منزل سے دور تھا، اس لئے خداشناسی سے دور تھا۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ، جس نے اپنے کو پہچانا کہ میں کون ہوں۔ وہ اپنے پروردگار کو بھی پہچان لے گا کہ وہ کیا ہے۔ بعض جگہ ہے کہ یہ کلامِ رسول ہے۔ بعض جگہ یہ ہے کہ یہ کلامِ امیر المومنین ہے۔ بعض جگہ بلند حکماء کے نام ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جملے کے بلند قیمت ہونے کا ثبوت ہے کہ ہر بڑے آدمی پر پورا اترتا ہے۔ جناب امیر المومنین کا کلام ہو، تب بھی بالواسطہ رسول کا کلام ہے اور خود رسول کا ہے تو رسول کا ہے ہی۔ بہر حال جو اپنے کو پہچانے کہ میں کون ہوں، اس کے بہت سے رُخ ہیں اور کلامِ رسول کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک جملہ ہوتا ہے اور اس میں معنی کے دفتر پنہاں ہوتے ہیں۔

"مَنْ عَرَفَ"، جو اپنے کو پہچانے، اس کو میں اُردو کے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ خود شناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ یہ کیونکر ہے؟ انسان نے یہ نہ سمجھا کہ انسان کیا ہے؟ اس لئے پتھروں کے سامنے جھکا۔ انسان نے یہ نہ جانا کہ انسان کیا ہے، لہٰذا درختوں کے سامنے جھک گیا۔ انسان نے یہ نہ جانا کہ انسان کیا ہے، لہٰذا اپنے جیسے انسانوں کے آگے جھک گیا اور اپنے ایسے انسانوں کے آگے جھکا تو اگر جھکنا ہوتا تو گھر والوں کے سامنے کیوں نہ جھکا؟ اپنے محلے والوں کے سامنے کیوں نہ جھکا، خود اپنے سامنے کیوں نہ جھکا؟ جس انسان کے سامنے جھکا، اگر دولت مند کے سامنے جھکا تو انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے۔ اس دولت کے سامنے جھکنا ہے۔ اگر سلطان کے سامنے جھکا تو وہ انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے، سلطنت کے سامنے جھکنا ہے۔ اس نے کسی صاحب قوت کے سامنے جھکنا اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قوت بازو کے سامنے جھکا۔ وہ انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہے اور انسان کے سامنے نہ جھکنے کا نتیجہ ہی ہے کہ انسان مرکز قربانی میں دھوکہ کھانے لگا کہ کس کی راہ میں اپنے آپ کو صرف کرے۔ اس لئے عمر گزاری دولت کے حاصل کرنے میں تو دولت پر جان دینے لگا۔ عمر گزاری شہرت حاصل کرنے میں تو شہرت پر جان دینے لگا۔ عمر گزاری کسی منصب کے حاصل کرنے میں تو منصب پر جان دینے لگا۔ اصولِ دین میں خداشناسی کی منزل سے دور ہوا، انسان ناشناسی سے اور کردار کی منزل میں غلط مصارف حیات میں اپنے جوہر کو صرف کرتا رہا۔

یہ بھی انسان کے نہ پہچاننے کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سمجھتا کہ یہ انسان کیا ہے تو پہاڑوں کے سامنے نہ جھکتا، درختوں کے سامنے نہ جھکتا، حیوانوں کے سامنے نہ جھکتا، صاحب قوت، صاحب طاقت، صاحب زر کے سامنے نہ جھکتا۔ پھر ڈھونڈتا اُسے جو اس سے اونچا ہوتا تاکہ اس کے سامنے جھکے اور اپنے سے اونچا سوائے اپنے خالق کے کوئی اور نظر نہ آتا تو چاہے وہ نام نہ لے سکتا مگر اسی کے سامنے جھکتا اور

اس کے سوا جو سامنے آتا، اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا۔ یاد رکھئے غیروں کا انکار، یہ بھی مرکز توحید ہے ورنہ کلمے کی ابتدا نفی سے نہ ہوتی، مثبت سے ہوتی۔

اس لئے صرف انسان کو پہچاننے سے چاہے نام کے ساتھ اللہ تک نہ پہنچتا مگر لا إلہ کی منزل کو تو طے کر ہی لیتا۔ اگر الا کہہ کر چاہے چپ ہو جاتا مگر زبان بیان چپ ہوتی، دل کی آواز چپ نہ ہوتی۔ دل اسی کی طرف مڑتا جو ان سب سے بالاتر ہو اور وہ اللہ ہے اور اس کو ماننا کوئی کام کا محتاج نہیں ہے۔ ضمیر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ وہ کہوں تو قبل میں جب تک ذکر نہ ہو تو پتہ نہیں چلے گا کہ "وہ" کون ہے۔ لیکن صرف اللہ وہ ہے کہ جس کے ناموں میں "ھُو" ہے یا:

ھُوَیَامَنْ لَا یَعْرِفُ اِلَّا ھُوَ۔ یَامَنْ لَا یَعْلَمُ مَنْ ھُوَ اِلَّا ھُوَ۔

اے وہ۔ یہ ان کیلئے ہے جو نام نہ لے سکتے ہوں۔ صرف اشارہ ذہنی کر سکتے ہوں۔ اب یہاں ایک جملے میں شروع والے سائل کا جواب کہ میں کہتا ہوں کہ اسلام کا نام اس بیچارے تک نہیں پہنچا، اس لئے اللہ اسے نہ آیا۔ لیکن "وہ" کا اشارہ تو اندر سے بلند ہو گا تو "وہ" کو مانا اور مسلم ہوا:

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔

"جو اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں ہو گا"۔

اگر اپنے کو جان لیتا کہ میں کون ہوں تو منزلِ توحید تک پہنچ جاتا اور اگر اپنے کو جان لیتا کہ میں کیا ہوں تو مقصدِ قربانی میں غلطی نہ کرتا۔ ہر چیز اپنے سے بالاتر کی خاطر قربان ہوتی ہے۔ زر و جواہر کی خاطر اس نے جان دی تو زر و جواہر کیا ہیں؟ پتھروں کا ذخیرہ۔ اصل دولت سونا ہے اور سونا جمادات میں داخل ہے۔ یہ رنگساز کی بات ہے کہ سرخ رنگت اسے دی ہے تو اس کا نام سونا ہو گیا۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے جو ٹھوکروں میں آنے والے پتھر ہیں، وہی سونا، وہی چاندی، وہی لعل و جواہر ہیں۔ حقیقت کے لحاظ سے جمادات ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دولت کی خاطر جان دی تو اپنے سے تین زینے اُتر کر قربانی پیش کی۔ تو اگر شہرت کی خاطر جان دی تو شہرت ہے بے اصل چیز۔ وہ کوئی اصلیت رکھتی ہی نہیں۔ اور اگر عہدہ کی خاطر جان دی تو عہدہ امر اعتباری ہے۔ امر اعتباری کا مطلب یہ ہے کہ جب تک لوگ سمجھ رہے ہیں اور سمجھنا چھوڑ دیا تو نہ رہا۔ مثلاً ممبر ہے، منبر نہیں۔ یہ منبر وجودِ اصلی رکھتا ہے اور وہ ممبر وجودِ اختیاری رکھتا ہے۔ جب تک سمجھ رہے ہیں ممبر ہے اور جب سے سمجھنا چھوڑ دیا، تب سے آدمی رہ گیا، ممبر نہ رہا۔ جب سمجھ رہے ہیں چیئرمین ہے، جب سے لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا، آدمی رہ گیا، چیئرمین نہ رہا۔

اور حضور والا! وزیر ہے، جب تک سمجھا گیا کہ وزیر ہے، جب سے سمجھنا ختم ہو گیا، اس وقت سے وزیر نہ رہا۔ کوئی کہیں کا صدر ہے، جب تک لوگ سمجھ رہے تھے، تب تک قرارداد تھی، اس وقت تک صدر رہا اور جس وقت سے قرارداد بدل گئی، اس وقت سے صدارت ختم ہو گئی، آدمی رہ گیا اور صدر نہ رہا۔

سرکار والا! عہدہ چلا گیا تو پھر آدمی رہ گیا، عہدہ نہ رہا۔ یہ اس وقت ہے جب عہدہ ملنے کے بعد آدمی رہا ہو۔ اگر عہدہ ملتے ہی آدمی کو رخصت کر دیا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب عہدہ گیا تو نہ عہدہ رہا، نہ آدمی رہا۔ بس آدمی کا مجسمہ رہ گیا اور کچھ نہ رہا۔ سرکار! مرکز قربانی کا غلط استعمال انسان ناشناسی کا نتیجہ ہے۔ اگر سمجھتا کہ انسان کیا چیز ہے تو مرکز قربانی اسی کو بناتا جو اس سے بالاتر ہوتا اور اس سے بالاتر سوائے خالق کائنات کے کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا اسی کی راہ میں قربانی پیش کرتا۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہیں نہیں کہا کہ جو قتل ہوئے ہیں، انہیں زندۂ جاوید سمجھو۔ ہر جگہ کہا:

اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

جو قتل ہوئے اللہ کی راہ میں۔ قتل ہونا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، اللہ کی راہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ بسمل کا تڑپتا لاشہ دیکھا جا سکتا ہے، جسم پر زخموں کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں، سر کو قلم دیکھا جا سکتا ہے، بہتا ہوا خون دیکھا جا سکتا ہے مگر کس راہ میں ہے، یہ آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ جب آدمی جان دے تو کسی ایسے کی اجازت سے دے کہ حدِ امکان تک ضمانت ہو کہ یہ جان اکارت نہیں جائے گی، سوارت ہوگی۔ اسی لئے شریعتِ حقہ میں جہاد مشروط ہو گیا۔ یا امام ہو یا نائب امام ہو، ان کی اجازت جب تک نہ ہو، اس وقت تک جنگ ہوگی، جہاد نہیں ہو سکتا۔ کوئی ضمانت تو ہو کہ ہمارا خون رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ کسی محفوظ ذخیرے میں جا رہا ہے۔ جب اس طرح جائے تو جان گئی، نہیں رہی، حیاتِ فانی بدل گئی، حیاتِ باقی کے ساتھ اور یہ عمل مجازی نہیں ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ وہ شاعرانہ زندگی نہیں ہے بلکہ یہ وہ زندگی ہے کہ آثارِ زندگی قرآن نے مرتب کئے ہیں۔ اگر فقط اتنا ہوتا:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ۔

"وہ جو راہِ خدا میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ زندہ ہیں"۔

کوئی کہتا یہ وہی حیاتِ جاودانی ہے جو کارناموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ راہِ خدا میں جان دی تو حیاتِ جاودانی تو بے شک حاصل کی، ہمیشہ ان کا ذکر رہے گا، ہمیشہ ان کی یاد قائم رہے گی۔ یہ حیاتِ جاودانی بھی زندگی ہے مگر قرآن فقط اس زندگی کو نہیں کہہ رہا ہے جو مجازی زندگی ہے، وہ آثارِ زندگی مرتب کر رہا ہے۔ کہتا ہے:

اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ۔

وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے ہاں روزی حاصل کرتے ہیں۔ اب کھانا اور رزق تو زندہ سے متعلق ہے جو ویسی زندگی رکھتا ہو۔ اور اتنا ہی نہیں کہ وہ غذا حاصل کرتے ہیں، رزق حاصل کرتے ہیں:

فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔

وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کے اس فضل وکرم پر جو انہیں ملتا ہے۔

یہ احساس، شعور، زندگی جو خوشی اور انبساط کی صورت میں ہے، یہ دوسرا اثر زندگی ہے اور اتنا ہی نہیں کہ اپنے پس ماندگان سے بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ یہ روایت نہیں ہے جو ضعیف اور قوی کا خیال ہو۔ یہ قرآن کی آیت پڑھ رہا ہوں۔ اس کا صرف ترجمہ کر رہا ہوں، تبصرہ بھی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ خوش ہیں اس پر جو اللہ نے انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ یہ تو جو نعمتیں ان کو عطا ہوئی ہیں، اس پر خوش ہیں۔ اس کا ذکر ہے اس اپنے شعور حال کا ذکر ہے، لیکن اس کے بعد:

وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔

اور یہ حالات دیکھ کر جو ان کے بعد دنیا میں رہ گئے ہیں، جو پس ماندگان ہیں، ان کے حالات دیکھ کر اگر وہ قابل شکر یہ ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں "يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ"، اور ان کے حالات کو دیکھ کر جو ان کے بعد دنیا میں رہ گئے ہیں، پس ماندگان ہیں۔ ان تک نہیں پہنچے یعنی دار دنیا میں زندہ ہیں، انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان کو خوف ہے، نہ کوئی صدمہ ہے۔ یعنی بہ اطمینان زندگی ان کی بسر ہو رہی ہے۔ وہ شہید کہیں ہوئے ہیں اور یہ پس ماندگان کہیں پر ہوں لیکن روایت نہیں، آیت کہہ رہی ہے کہ وہ ان کے حالات کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ تو یہ شہید ہیں، انہیں قرآن نے حاضر و ناظر نہیں کہا تو اور کیا کہا ہے؟ اگر وہ دیکھتے نہیں ہیں تو خوش کیسے ہوتے ہیں؟

اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جہاں پس ماندگان میں سے ان کے ہے، ممکن ہے ایک کہیں ہو، دوسرا کہیں اور ہو۔ ایک کسی ملک میں ہو، دوسرا کسی اور ملک میں ہو۔ مگر ان سب کے حالات سے تعلق رکھتے ہیں، دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔

جناب والا! یہ شہید کیلئے قرآن کہہ رہا ہے تو رسول کے بارے میں یہ بحث کیسی کہ وہ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟ اسی سے حیات النبی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ غیروں میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ ایک حیات النبی ثابت کر رہا ہے اور ایک حیات النبی کا انکار کر رہا ہے۔ اس پر مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اس سب کو ہم باہر سے تماشائی کے طور پر دیکھا کرتے تھے کیونکہ ہمارے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہمارے اندر کوئی محاذ نہیں تھا۔ دوسروں کے حالات کو ہم دیکھتے تھے کہ ایک حیات النبی پر دلائل پیش کر رہا ہے اور ایک حیات النبی کے خلاف دلائل پیش کر رہا ہے۔ ہم چونکہ حیات النبی والوں کے ساتھ ہیں، اس بناء پر میں حیات النبی کے مسئلہ کو اسی سے طے کیا کرتا تھا کہ شہداء کیلئے قرآن نے کہا ہے۔

بعض قرآن جو حیات النبی کے منکر ہیں، وہ بھی حیات الشہداء کے قائل ہیں۔ تو شہداء کی زندگی کے وہ بھی قائل ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شہداء کی زندگی کے آپ سب قائل ہیں۔ شہادت ہے کیا چیز؟ یاد رکھئے کہ شہادت ان کی ایک تعلیم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ قرآن کے دباؤ سے شہید کی زندگی پر آپ مجبور ہیں اور جس کے گھر سے زندگی جاوید کی بھیک بٹ رہی ہو، اس کو کہا جائے کہ زندہ ہے تو آپ کہیں

کہ کوئی ثبوت اس کا نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہاں بھی کہتا ہوں کہ شہداء کیلئے قرآن سے ثابت ہے کہ جہاں جہاں اس کا عزیز ہو، اس کے حالات پر وہ نگران ہے، اس کا نام حاضر و ناظر ہے یا نہیں؟ جب حاضر و ناظر اس کا نام ہے تو شہید کیلئے یہ کہا گیا تو جو شہید ساز ہو، اس کے بارے میں یہ تصور، یہ بحث کیسی۔ ہاں! نہ وہ زندگی جاوید اپنی طرف سے ہے، نہ یہ حاضر و ناظر ہونا اپنی طرف سے ہے۔ اللہ کا دیا ہوا ہے، خدا کا عطا کردہ ہے۔ بس یاد رکھئے کہ ہر کمال کو کہہ دیا کہ ان کا ہے، ذاتی طور پر خدا سے بے نیاز ہو کر تو شرک ہے۔ جب خدا کی طرف سے مان لیجئے تو عین توحید ہے۔

جب خدا کی راہ میں جان دی جائے تو تہذیب جہاد ہوگئی کہ امام سے اذن لیا جائے اور تہذیب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سب اس مقصد سے جمع ہیں۔ اسی مقصد سے آئے ہیں مگر یہ کہ جب کوئی آگے بڑھتا ہے تو اجازت لے کر بڑھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرائن والی اجازت نہیں بلکہ باضابطہ اجازت کی ضرورت ہے اور اسے کیسے کیسے سخت مواقع پر نبھایا ہے کہ نابالغ بچہ ہے شہزادہ قاسم۔ چونکہ ہر جہاد میں اب تک بچے الگ رکھے گئے تھے، بدر میں، اُحد میں، خندق میں، خیبر میں، حالاتِ صحابہ میں کچھ صحابہ کے ذکر میں ملتا ہے کہ یہ جانا چاہتے تھے اُحد میں اور رسول نے کم عمر کہہ کر واپس کر دیا کہ ابھی ان کی عمر اتنی نہیں ہے۔

ایک صحابی زادہ کا حال بہت پُر مزاح ہے جو خود انہوں نے بعد میں بیان کیا کہ فلاں جہاد میں جو لوگ کھڑے ہوئے اور رسول گویا معائنہ کر رہے تھے بھیجنے سے پہلے، تو کہتے ہیں کہ میں تڑپ رہا تھا کہ جہاد میں جاؤں۔ میں رسول کے سامنے گیا تو اپنی انگلیوں پر زور دے کر کھڑا ہو رہا تھا کہ میرا قد جتنا ہے، اس سے زیادہ نظر آئے تاکہ رسول یہ نہ فرمائیں کہ یہ کم عمر ہے۔ رسول کو بھی اس کی تڑپ محسوس ہوئی۔ آپ نے اس کے کھڑے ہونے کا طریقہ دیکھا۔ آپ نے گویا استثناء کے طور پر ایک سنِ بلوغ کی حد تک پہنچے ہوئے ایک فرد سے کشتی لڑنے کیلئے کہا کہ میں تمہارا جذبہ و بیقراری دیکھ رہا ہوں، شوقِ شہادت دیکھ رہا ہوں۔ یہ بالغ ہے، اس سے کشتی لڑو، اگر اس کو تم نے پچھاڑ دیا تو میں تم کو اجازت دے دوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں رسول کے سامنے اس سے کشتی لڑا۔

دیکھئے! علماء کو شوق ہو کشتی کا تو شانِ مولویت کے خلاف سمجھا جائے اور یہ رسول ہیں جو اپنے سامنے کشتی لڑوا رہے ہیں۔ گویا ذوقِ جہاد کا امتحان بھی ہے اور طاقت و قوت کا اندازہ بھی ہے اور دوسرے بچوں کے شکایت کرنے کا سدباب بھی ہے۔ غرضیکہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے سے بڑے کو مغلوب کر دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اچھا! میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔

اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ روایتِ اسلام تھی کہ بچوں کو جہاد میں شریک نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے یہ روایت معلوم ہے، جس گھر کا یہ بچہ ہے اور جس گھر کی یہ روایت ہے، اس بچے کو سب کچھ معلوم تھا۔ ظاہر ہے خاندانِ رسالت میں کربلا کے دن کا چرچا تو رہتا ہی تھا۔ تو نہ جانے کب کب شہزادے نے سوچا ہے کہ کہیں میری کمسنی سنگِ راہ نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری کمسنی باعث بدنصیبی ہو جائے۔

جنابِ شہزادہ قاسم کے بارے میں باقی روایات ہماری کتاب "روایاتِ عزا" میں ملاحظہ فرمائیں۔

65

امامت وخلافت

میں کہتا ہوں کہ اتنا سمجھ لو کہ وہ بھی ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ان کی معرفت معیار فضیلت انسان ہوئی۔

وہ جورات کو کبھی سونے کا عادی نہ ہو، وہ کیونکر سویا؟ جس کی رات محراب عبادت میں گزرتی تھی، آج لٹا دیئے گئے میں کہتا ہوں کہ یہی راز ہے سونے کا، جس کیلئے روز جاگتا تھا، اسی لئے آج سو رہا ہے۔ بس یہ سو رہے تھے اور جاگنے والا دیکھ رہا تھا۔

میں کہوں گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ جو شے ادھر سے ادھر جاتی ہے، اس کی معراج ہوتی ہے۔ جب وہاں والوں کو معراج ہوتی ہے تو یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔

ایسی بات جو آدمی خود ہی جانتا ہو، دوسرے کو علم ہی نہ ہو سکے تو اس میں شرعاً بھی خود اس کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔

معصوم ابن معصوم، حجت ابن حجتِ خدا۔ وہ کہہ رہے ہیں میرے ماں باپ تم پر قربان اے مجاہدین کربلا! تم بھی پاک ہوئے اور وہ زمین بھی پاک ہوئی جہاں تم دفن ہوئے۔ کاش! تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔

امامت وخلافت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَہ۔

تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو اس میں فساد پیدا کریں اور خونریزی کریں، حالانکہ ہم تیری تسبیح وتہلیل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

میں نے عرض کیا کہ ملائکہ بارگاہ قدس کے طالب علم ہیں۔ طالب علم کو حق ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے، وہ معلم سے پوچھ لے۔ اب انہوں نے خالق کی بارگاہ میں سوال پیش کیا۔ خالق نے کیا جواب دیا؟ کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اب مجمع میں ماشاء اللہ طالب علم بھی ہیں اور اُستاد بھی ہیں اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد بھی ہیں طالب علمی اور معلمی کے جو تقاضے ہیں ان سے کون واقف نہیں ہے۔ کوئی طالب علم اُستاد سے کوئی سوال کرے، اُستاد کہے کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ تو کیا یہ اس سوال کا جواب ہوا؟ ارے جناب! طالب علم اگر جرأت رکھتا ہے تو وہ کہے گا کہ جناب والا! اسی لئے تو پوچھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اسی لئے تو ہم آپ سے دریافت کررہے ہیں۔ تو یقیناً کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس سوال کا یہ جواب ہے۔ ہاں! اسے ہم سوال کا ٹھکرا دینا کہہ سکتے ہیں یعنی جواب نہیں دیا گیا۔ مگر جواب یہ کسی رُخ سے نہیں ہے۔ اب آخر اُستاد ہے اور شاگرد سوال کررہا ہے تو وہ کیوں اس کے سوال کو ٹھکرائے؟ حالانکہ اب اس کے بعد کی آیت پڑھئے تو پتہ چلتا ہے کہ خالق اس سوال کا جواب دے گا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ جواب نہیں ہوا۔ اگر جانے کہ جواب ہو گیا تو بعد میں پھر کیوں جواب دے؟ تو آخر جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہیں جواب دے دیا گیا؟ وہ سوال کررہا ہے، اُسے جواب دے دیا جائے۔ پھر جواب بعد میں دیا گیا تو کب؟ تو ہم اس آیت کے بعد بلا فاصلہ دوسری آیت پڑھتے ہیں:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا ثُمَّ عَرَضَہُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ ہٰۤؤُلَآءِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اب پوری آیت فوراً، اس کے آیت کے بعد یہ دوسری آیت، جتنی زیادہ روانی کے ساتھ پڑھو، اتنی ہی جلدی اس آیت کے بعد یہ آیت آجائے گی۔ مگر کیا خود مضمونِ آیت کو دیکھئے؟ یہ واقعہ فوراً اس کے بعد ہوا؟ وہ اس وقت کی بات ہے جب آدم کا پتلا ابھی آب وگل میں بھی نہیں ہے۔ یہ خلقتِ آدم کا سوال ہے۔ تو یہ واقعہ جو بلا فاصلہ اس آیت میں نظر آرہا ہے، یہ جب آدم کا پتلا بصورتِ انسان ذی روح عالم ظہور میں آئے گا، انسانِ مکمل کی شکل میں، جب وہ جلوہ آرا ہو چکے، تب وہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔ تو میں کچھ اندازہ ہی نہیں کرسکتا کہ کتنے ہزار برس کا فاصلہ بیچ میں ہے۔ کتنی مدت درمیان میں گزری؟ اُس وقت پھر اس وقت والے سوال کا جواب خالق دے گا۔ تو جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہ جواب دے دیا جائے؟

مگر ماشاء اللہ اربابِ فہم ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر ابھی اللہ مصالح اور اسباب سمجھانے لگے تو ایک صورتِ شوریٰ قائم ہو جائے۔ تو جیسے اس موضوع پر تبادلہ خیالات ہونے لگا، انہوں نے سوال کیا، اللہ سمجھانے لگا۔ یہ وجہ ہے کہ صورتِ شوریٰ قائم ہو جئے۔ تو اس وقت جواب نہیں دیا گیا۔ میں تو اپنے انداز میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ جیسے خالق نے کہا: منصب میرا، مقرر کرنا میرا کام، تم کون؟

اب اگر خطا کا دانسان ہوتا تو جم جاتا کہ بغیر سمجھے نہیں ہٹوں گا۔ مگر یہ بیچارہ معصوم فرشتہ ہے۔ خالق نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا کہ ہاں! منصب اس کا ہے، مقرر وہ کررہا ہے، ہمیں نہیں بتانا چاہتا کہ اس کے کیا اسباب ہیں؟ تو اس میں دخل دینے کا ہمیں کیا حق؟ خاموش ہو گیا۔ مگر خالق کے ذمہ گویا فریضہ تعلیمی قرض رہا۔ یعنی بحیثیت معلم جو اس کو جواب دینا چاہئے تھا، وہ نہیں دیا گیا۔

چنانچہ اب جب آدم عالمِ وجود میں آچکے تو اب خالق نے اس دن کے سوال کا جواب دینا چاہا۔ بڑے انتظام واہتمام سے اور اس کیلئے گویا خاص انتظام کیا۔ وہ کیا؟

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ

قدم قدم پر مفسرین کو دقت پیش آتی ہے اور مجھے ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔

بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

وہ جیسے خلیفہ میں الجھن پیدا ہوئی تھی کہ کس کا خلیفہ؟ اب یہاں کہا اللہ نے کہ آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے۔ اب مفسرین نے اسماء دیکھا، "کلھا" دیکھا۔ اسماء پر جو الف لام ہے، اُسے نہیں دیکھا تو ترجمہ کر دیا کہ سب نام سکھا دیئے۔ اب سب کے نام سکھائے تو جناب! کیڑے مکوڑوں کے بھی نام، جڑی بوٹیوں کے بھی نام، ہر خار وگل کے نام، ہر کس وناکس کے نام۔ غرض ایک ذرہ سے لے کر ستارہ ہائے فلک تک جو کچھ کائنات میں ہے، سب کے نام سکھا دیئے۔ یعنی ایک فرہنگ اور لغت آدم کو بتا دی۔ کیونکہ سب نام، اسماء بھی اور پھر "کلھا" بھی۔ سب اور سب ہیں تو پھر سب۔ جو جو ذہن میں آئے، وہ سب اور جو ذہن میں نہ بھی آئے، وہ بھی سب۔ چونکہ بتانے والا خدا ہے، وہ ہمارے ذہن کا پابند نہیں ہے۔ لہٰذا جتنے نام ہم نہیں بھی جانتے، وہ بھی۔ پھر ازل سے لے کر ابد تک سب نام آدم کو سکھا دیئے۔ مگر اب بعد میں جو آئے گا، اس کے ساتھ یہ بات بالکل نہیں جچتی۔

اب یہیں سے بتادوں کہ غلطی کہاں ہوئی؟ وہ میں نے ابھی اشارہ کیا تھا کہ انہوں نے الف لام کو نہیں دیکھا۔اب دیکھئے، میں ترجمہ کرتا ہوں۔سب کے لفظ کو میں چھوڑوں گا نہیں۔اس سے ٹکراؤں گا بھی نہیں۔پھر بھی دیکھئے کہ وہ سب محدود ہو جاتے ہیں یا نہیں!

الف لام کی اقسام عربی میں بہت سی ہیں۔ایک ہوتا ہے استغراق کا خود، اس کے معنی سب کے ہوتے ہیں۔اگر یہ استغراق کا ہوتا تو "کلھا" کہا ہی نہ جاتا کیونکہ استغراق تو خود الف لام میں ہے۔خصوصاً جب جمع پر داخل ہو۔عربی دان حضرات جانتے ہیں۔تو وہ استغراق تو پھر از جاتا ہے۔پھر "کلھا" کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب اور جو قسمیں ہیں، اس سے بحث اس وقت نہیں۔ایک الف لام کی قسم ہے عہد۔عہد کے معنی ہوتے ہیں کچھ خاص اشیاء یا افراد کی طرف اشارہ۔اس کی ایک روزمرہ کی مثال آپ کو دے دوں۔یوم کے معنی کوئی سا دن اور الیوم کے معنی آج۔یہ الیوم تو آپ بہت سنتے رہتے ہیں۔ایک جانی پہچانی آیت میں، الیوم ہی سے شروع ہوتی ہے۔تو اس کا ترجمہ کیا "آج"۔یہ یوم کے معنی آج کہاں سے ہو گئے؟ یوم کے معنی آج کہیں نہیں ہیں۔کسی لغت میں یوم کے معنی آج کے آپ کو نہیں ملیں گے۔

تو یہ آج کے معنی پیدا ہوئے الف لام سے۔بالکل لفظی معنی ہیں الیوم یعنی یہ سا دن۔اب یہ سا دن فارسی میں ہو تو بالکل یہی ترجمہ ہے امروز۔ہمارے ہاں اس کیلئے مفرد لفظ موجود ہے۔یہ دن یعنی آج۔تو اسی طرح الیوم کے معنی ہوئے آج۔تو جب الف لام کے یہ بھی معنی ہیں، اشارے کے، تو اب جو ترجمہ میں کروں، اُسے دیکھئے۔آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔دیکھئے! سب گیا تو نہیں۔آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔وہ سب نام کیا؟ وہ نام جنہیں فرشتے لاکھوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔کیونکہ ابوابِ جنت پر لکھے ہوئے تھے۔عرش پر لکھے ہوئے تھے۔حورعین کی پیشانیوں پر اکثر لکھے ہوئے تھے۔تو ان ناموں کو تو فرشتے نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھے ہوئے تھے۔تو انہیں تو ملائکہ جانتے تھے۔ناموں سے خوب واقف تھے۔تو وہ نام تھے جو فرشتوں کو پہلے ہی سے معلوم تھے کیونکہ آدم مدرسہ قدرت میں آج طالب علم آیا ہے۔وہ پرانے طالب علم جو نام ان کے جانے پہچانے ہوئے تھے، وہ سب نام آدم کو بتائے۔وہ سب یعنی ان ناموں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

اور اسی سے اب بعد میں جنہوں نے شروع میں ٹھوکر کھائی اور بعد میں بھی ٹھوکر کھاتے چلے جائیں گے، تو اب جناب! انہوں نے کہا کہ سب نام۔اب اس کے بعد، بعد میں کچھ ہی میں نہیں آئے گا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ۔

"پھر ان لوگوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا"۔

اب یہاں "هُمْ" انہیں نظر ہی نہیں آیا۔"هُمْ" ذوی العقول کی ضمیر ہے۔چیزوں کو "هُمْ" نہیں کہتے، انسانوں کو "هُمْ" کہتے ہیں۔جو صاحبانِ عقل ہوں، جانوروں کو بھی "هُمْ" نہیں کہتے۔صاحبانِ عقل کیلئے ضمیر ہے جس کا ترجمہ ہمارے ہاں لوگ ہی ہوئے۔ان لوگوں کو پیش کیا۔اب یہ لوگ کہتے تو پھنستے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں۔لہٰذا مصلحت یہی دیکھی کہ اس مقام پر سب عالم جاہل بن جائیں۔جیسے "هُمْ" کے معنی ہی نہیں جانتے۔لہٰذا کہہ دیا کہ وہ سب نام ان کے سامنے پیش کر کے پوچھے کہ یہ نام بتاؤ۔اب یہاں جو

میں نے عرض کیا، اُس سے قطع نظر کیجئے تو بڑا سوال ہے۔ طالب علم کے ذہن میں، ہر صاحب عقل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر امتحان ایسا ہو کہ ایک طالب علم کو تو چپکے سے سب بتا دیا اور اس کے بعد سب طالب علموں کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ یہ سب۔ تو یہ امتحان سازشی ہوگا یا نہیں؟ میری تو زندگی یونیورسٹیوں میں گزری ہے۔ تو ایک لفظ کہوں کہ ایک طالب علم کو پرچہ آؤٹ کر دیا۔ مگر بس ایک کیلئے اور اسی کو بلا کر امتحان سب کا لے لیا کہ بتاؤ۔ تو اس طرح کا امتحان جائز ہوگا؟ تو جو ہم ایسے ناقص معلموں کیلئے جائز نہیں، وہ اس کامل معلم کیلئے جائز کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر آدم کی بلندی کیسے ثابت ہوگی؟ تو یہ سب غلطی ہوئی یہ جو الف لام کو نہ سمجھا۔ سب نام سکھائے۔ تو سب نہیں، بلکہ وہ نام جو ان کے دیکھے ہوئے تھے۔ کوئی ثبوت بھی نہیں ہے از روئے قرآن۔ اس کی ضرورت بھی نہیں کہ الگ ہٹا کر فرشتوں سے صیغہ راز میں وہ نام بتائے ہوں۔ اس لئے فرشتوں کے سامنے ان کو وہ نام جو نام ان کو معلوم تھے، وہ بتا دیئے آدم کو۔

اور میں کہتا ہوں کہ اسی طرح بتا کر معیار تعلیم برابر کیا تا کہ جو انہیں معلوم ہے، وہ ان کو بھی تو معلوم ہو جائے۔ اب اس کے بعد وہی نام نہیں پوچھے جا رہے ہیں جو نام ابھی بتائے تھے۔ وہ بتاؤ تو! ماشاء اللہ یہ کیا محل ہے؟ یہ تو حافظہ کا امتحان ہوا یعنی ابھی ابھی تو بتائے ہیں نام اور ابھی پوچھ رہا ہے کہ نام بتاؤ کہ بھولے تو نہیں۔ تو یہ تو حافظے کا امتحان ہوتا ہے۔ مگر حافظے کے امتحان کا یہ محل ہی نہیں ہے کیونکہ امتحان کا ایک فریق فرشتہ ہے۔ یعنی فرشتوں کی قوم ہے جن کے ہاں سہو و نسیان کو کوئی صحیح نہیں سمجھتا۔ ارے انبیاء میں سہو و نسیان کو کوئی تصور کرتا ہو، ہم تو وہاں بھی تصور نہیں کرتے۔ لیکن ملائکہ میں تو کوئی سہو و نسیان کو داخل نہیں سمجھتا۔ اب جب ایک فریق ایسا ہے جہاں بھولنے کا سوال ہی نہیں ہے تو اب حافظے کے امتحان کے کیا معنی؟ تو اب صورت واقعہ کیا ہے؟ اگر یہ صاحبان علم الفاظ قرآن پر غور کرتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ الگ سے کسی تفسیر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چاہے پھر پورے طور پر معمہ حل نہ ہوتا۔ مگر اصل مفہوم تو سمجھ میں آ ہی جاتا۔ آدم کو وہ سب نام سکھائے۔ اب وہ نام نہیں پوچھے جاتے "ثُمَّ عَرَضَهُمْ"۔ پھر ان اشخاص کو سامنے پیش کیا گیا "فَقَالَ أَنْبِئُونِي"، اگر فقط نام پوچھے جاتے تو "هٰذِهِ الْأَسْمَاءِ"

کہا جاتا۔ پھر یہ نام بتاؤ جو میں نے سکھائے ہیں۔ دیکھو! ان لوگوں کے نام مجھے بتاؤ۔ "إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ"، یہ قول والا صادق نہیں۔ یعنی اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم زیادہ مستحق ہو۔ انہوں نے کب کہا تھا کہ ہم زیادہ مستحق ہیں؟ مگر تمہارا تصور اگر یہ ہو، اپنی کم علمی سے، ان کی عصمت عمل خطا کو مانع ہے۔ مگر احاطہ علمی ان کیلئے نہیں ہے۔

لہٰذا علم کی کمی کی بناء پر اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ تمہیں حق ہے اس منصب کا تو ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ میں نے کہا کہ چاہے بعد میں مفسرین کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ لوگ کون تھے؟ مگر لفظی معنی تو ہر صاحب علم کو سمجھنے چاہئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون؟ کوئی تو تھے جن کو پیش کیا اور وہ جنہیں پیش کیا، آدم تو تھے نہیں۔ فرشتے بھی نہیں کیونکہ وہ معرض امتحان میں ہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ کسی نوع خلقت کے اعتبار سے آدم سے پہلے ملائکہ کے علاوہ کوئی صاحب عقل مخلوق موجود تھی۔ تو اب کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اتنا تو سمجھ لو کہ وہ جو بھی ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ان کی معرفت معیار فضیلت انسان ہوئی۔

اب امتحان بالکل بااُصول ہے۔ حافظہ کا امتحان نہیں ہے، ذہانت کا امتحان ہے۔ فرشتوں کو وہ نام پہلے سے معلوم ہیں۔ میں نے کہا کہ ابواب جنت پر دیکھ چکے، عرش پر دیکھ چکے۔ آدم کو ابھی بتائے ہیں۔ اس طرح نام تو سب سنایئے مگر صورتیں آدم کو نہیں دکھائی گئی ہیں۔ ارے کسی قدرتی انداز میں، کسی قدرتی انداز میں، وہ صلب آدم میں آئیں گے۔ مگر یہ کہ ان کی صورتیں دیکھی نہیں ہیں۔ کسی عالم میں کچھ نور دیکھتے ہیں۔ مگر نام دیکھے تو الگ، صورتیں دیکھیں تو الگ دیکھیں۔ یہ کبھی نہ انہوں نے پوچھا، نہ بتایا گیا کہ کون کس کا نام ہے۔

اور جناب! ہمارے لئے یوں بھی مشکل ہے کہ ہم جو نام رکھتے ہیں، اس میں تناسب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ مثل مشہو رہے "برعکس نہند نام زنگی کافور"۔ زنگی ہے، کالا کافور ہے، سفید مگر زنگی کا نام کافور رکھ دیا۔ دیوان متنبی جنہوں نے پڑھا ہے، غالباً وہیں سے لوگوں نے، کوئی متنبی کے دیوان کا حافظ تھا۔ وہیں سے لوگوں نے یہ مثل بنائی ہے نام زنگی کافور۔ اب میں یہاں جانے پہچانے دو نام بتاؤں۔ ہوسکتا ہے کہ مجمع میں کوئی اس نام کے ہوں مگر واقف نہیں ہوں۔ بطور مثال کہہ رہا ہوں، خدانخواستہ کسی پر چوٹ کرنا مقصود نہیں کہ پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام فداالدین رکھ دیا۔ اب کیا ضروری ہے کہ بہادر بھی ہوں۔ یہ بعد میں ثابت ہوگا کہ بہادر ہیں یا نہیں ہیں۔ ماں باپ نے بس نام رکھ دیا اور وہ عمر بھر فداالدین کہلائیں گے۔ چاہے کارنامے بھی سامنے آجائیں۔ یا مثلاً بدصورت بچے کا نام شمس الدین رکھ دیا۔ آفتاب رکھ دیا۔ ماہتاب رکھ دیا۔ یا کچھ رکھ دیا۔ نام میں تناسب سے کوئی بحث نہیں لیکن یہ جب ہے، جب ہم نام رکھیں۔ اور جن کے نام بھی خدا رکھتا ہو؟

تو اس کیلئے واقعات بھی ہمارے سامنے ہوں کہ بچہ پیدا ہوا ہے اور بزرگ خاندان نام نہیں رکھ رہے ہیں۔ وحی کا انتظار ہے۔ جو واقعی اس خاندان کا بزرگ ہے، وہ نام رکھے۔ تو جناب! نام اسی کے رکھے ہوئے اور یہ وہ نام ہیں جو عرب میں نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی نام کسی کا بعد میں صدیوں چلتا رہے تو کسی کو کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ جو نام عموماً عرب میں ہوا کرتے تھے، ان میں سوال کیا کہ کس کے نام پر رکھا؟ جو نام قدرت کی طرف سے کسی کو پہلے پہل دیئے گئے ہوں، وہ نام جب رکھے جائیں گے تو کہا جائے گا کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ لیکن جب خالق نام رکھے گا، وہ بے جوڑ نہیں ہوسکتے۔ بس قوت نظر کی ضرورت ہے۔ دیکھنے والی نگاہ ہونی چاہئے۔ امتحان یہی ہے کہ ایک طرف تو نام بتادیئے اور اب یہ صورتیں تمہارے سامنے پیش کررہا ہوں۔ تمہارا امتحان یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ کونسا کس کا نام ہے؟ یعنی اپنے ذہن سے اسم اور مسمّیٰ میں مطابقت کرو۔ یہ بات بتائے ہوئے سبق سے باہر تھی۔ جو بتایا تھا، اس سے باہر تھی۔

ہمارے ہاں کوئی سوال کورس سے باہر سے آجائے تو جا کر فریاد کرتے ہیں کہ جناب! یہ کورس کے اندر نہیں ہے۔ اب وہاں فرشتہ، ذہانت کا سوال! تو جناب! یہ سوال کیا گیا کہ ان کے نام بتاؤ۔ کونسا نام کس کا ہے؟ بتاؤ۔ بیچارے فرشتے نے کہا:

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

ہمیں کچھ نہیں معلوم سوائے اس کے جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔

اُسے بھولے ہوں تو مجرم! معلوم ہوا کہ سوال بتائے ہوئے سے باہر ہے۔ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ سوائے اس کے

جو تو نے ہمیں بتایا۔ تو بیچارہ فرشتہ ہماری عربی کی گرامر جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہ پڑھا ہوا نہیں ہے۔ اسے بس ایک ہی ترکیب معلوم ہے۔ ایک "لَا" اور ایک "اِلَّا"۔ وہ "لَا" اور "اِلَّا" کی ترکیب۔ بس ایک عدد "لَا" آیا، ایک عدد "اِلَّا" آیا، جملہ بن گیا۔ "لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"، ہم کو کوئی علم نہیں، ہم کو سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتایا۔ وہی جملہ اس نے اُحد میں کہہ دیا:

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار۔

لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

وہی معلوم ہے جو تو نے ہمیں بتایا۔

یہ ہمارے بس کی بات نہیں کہ ہم بتائے ہوئے سے زیادہ بتا سکیں۔ اب ارشادِ قدرت ہوا، للکارا فطرتِ انسانی کے نمائندہ کو۔ اے آدم! تو تو انسان ہے۔ تیری صفتِ خاص ہے، معلومات سے مجہولات کا پتہ چلانا، فکر و نظر کے معنی یہی ہیں کہ جو معلوم ہے، اس سے نامعلوم کا نتیجہ نکالنا۔ فرشتوں کو بتادے کہ کون کس کا نام ہے؟ بس آدم بڑھے اور انسانی ذہن سے فطرتِ انسانی سے انہوں نے اسماء اور مسمیات میں نسبت دیکھی، مناسبت دیکھی نام میں اور شخصیت میں اور فر فر بتا دیا کہ یہ اس کا نام، یہ اس کا نام۔ کہیں پر کوئی غلطی نہیں کی کہ نمبر کٹ جائیں۔ بالکل کوئی نمبر نہیں کٹا۔ سو میں سے سو کامیابی۔ سب ناموں کو مطابق کر کے بتا دیا۔

اب وہ جو میں کہہ رہا تھا، اس دن کے سوال کا جواب۔ خالق نے اب اس دن کے سوال کا جواب دیا۔ دیکھا تم نے "اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ"، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا؟ ماشاء اللہ! مجمع میں دو ایک کو تو پہنچانتا ہوں۔ ماشاء اللہ اہلِ منبر ہوں گے، مقررین ہوں گے، تو ان سب کو میں ایک حجت دے رہا ہوں۔ ہم اکثر حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملے کی حدیث ہے اور اگر حضور نے مثلاً بیان کی، ترجمہ کیا، تو بہت سے جملے اس کے ساتھ استعمال کئے جو اس حدیث سے سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ کوئی بحث کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ جزو کس چیز کا ترجمہ ہے؟ وہ ایک جملہ ہے۔ آپ نے دس جملوں میں اس کا ترجمہ بیان کیا۔ تو تحت اللفظی اعتبار سے کوئی ہم سے بحث کرے تو وہ ہماری زبان کیونکر پکڑ سکتا ہے کہ آپ نے کہا کہ ارشادِ رسول ہے۔ تو ارشادِ رسول تو بس اتنا ہے۔ تو آپ نے یہ سب کچھ جو کہہ دیا، یہ کہاں ارشادِ رسول ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہاں روایت نہیں، آیاتِ قرآن میں، جو اس دن کہا تھا، وہ بھی ہمیں معلوم ہے اور اس دن جو یہ مختصر جملہ کہا تھا کہ:

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"میں وہ جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے"۔

بس اتنا کہنا تھا، خود اس نے بتایا ہے۔ یہ کلام بھی اس نے نقل کیا اور آج فرشتوں سے کہہ رہا ہے کہ کیا میں نہیں کہا تھا:

اِنِّیْ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ۔

یعنی اب یہاں جواب میں زور جو لپٹا ہوا تھا، اُسے یہاں اجمال کو تفصیل سے بدل دیا۔ وہاں "وہ" کے لفظ میں جو لپٹا ہوا تھا، اُسے یہاں صاف کر کے کھول کر کہہ دیا۔ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس دن اتنا کہا تھا اور آج کہہ رہا ہے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان وزمین کے غیب بھی جانتا ہوں اور اسے بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اُسے بھی جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو۔

حضور والا! تمام اہل منبر یہ یاد رکھیں کہ ہمیں اور آپ کو نقل بالمعنی کا حق دے دیا گیا۔

مثال کے طور پر عرض کروں ایک جانی پہچانی حدیث قدسی، وہ یہ ہے کہ:

لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ۔

خالق کا خطاب ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے ہمارے رسول، تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرے۔

اب ہر صاحب فہم غور کرے کہ یہاں خاص آسمانوں کی کوئی خصوصیت بیان کرنا ہے کہ آسمان ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرتے۔ تو اب جدید فلسفہ سائنس میں اگر آسمان کچھ ہے نہیں، صرف حدِ نظر ہے تو پھر یہ افلاک ہی قابل بحث ہوگئے کہ "لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ" کیا معنی؟ مگر یاد رکھئے کہ تصورِ انسانی میں افلاک محیطِ کل ہیں۔ یعنی افلاک سب کو گھیرے ہوئے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہ کرتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی پیدا نہ ہوتا۔ جو شے سب پر حاوی ہے، اس کا نام لے کر سب کا مطلب ادا کیا۔ اب اصل حدیث اتنی ہے اور میں کسی دن اپنے زورِ بیان میں یہ کہہ دوں کہ خالق نے خطاب کیا کہ آپ نہ ہوتے تو زمین بھی نہ بنتی، کوہ نہ ہوتے، آفتاب نہ ہوتا۔ آپ نہ ہوتے تو ماہتاب بھی نہ ہوتا، ستارے بھی نہ ہوتے۔ اب کوئی میری زبان پکڑے، مجھ سے مطالبہ کرے کہ یہ کہاں ہے تو میں یہ کہوں گا کہ وہی ہیں جہاں "لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ" ہے۔ وہ اجمال ہے، میں نے اُسے تفصیل سے بدل دیا۔

اب آجایئے اس پر کہ "إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ" کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ یعنی میں آسمان وزمین کے غیب کو جانتا ہوں۔ جو تم چھپاتے ہو، وہ بھی جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی جانتا ہوں۔ فرشتہ بیچارہ، وہ معصوم تو خاموش ہی، ارے اس دن بھی خاموش رہا تھا۔ مگر اس دن خاموش رہا تھا ادب سے۔ آج خاموش ہوا ہے سمجھ کے۔ دل کی خلش دور ہوگئی۔ اس طرح سوال کا جواب آج دیا گیا۔ مگر فرشتے خاموش ہو گئے۔ میں ناقص انسان ہوں، میں نہیں خاموش ہوتا۔ میں اب فرشتوں کا وکیل ہو جاتا ہوں۔ فرشتوں کی طرف سے وکالت کرنے لگتا ہوں۔ وہ کیا؟ میرے ذہن میں ابھی خلش ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سوال ملک میں دونوں پہلو عمل سے متعلق تھے۔ خونریزی اور فساد بھی کردار سے متعلق چیز اور تسبیح و تقدیس بھی کردار سے متعلق چیز۔ یہ امتحانِ آدم میں علمی بلندی ثابت ہوئی تو پھر بالواسطہ نتیجہ نکالیں کہ جس کا علم بلند ہوگا، اس کا عمل بھی بلند ہوگا۔ یہ بہت منطقی ہیر پھیر کا راستہ ہے کہ یہ نتیجہ نکالیں۔ حالانکہ چاہے کتنے مشاہدے ہوں، علمائے بے عمل بھی پھر نظر آتے ہیں ورنہ مذمت کیوں ہوتی حدیثوں میں علمائے بے عمل کی؟

بہر حال میں کہتا ہوں کہ علمی بلندی ثابت ہوئی۔ عمل میں بلندی اب ثابت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اتنا جواب تھا، فوراً دے دیا گیا۔ جلدی اُسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا ڈر ہو اور وہ عالم الغیب، وہ قادرِ مطلق، جو امکانات کے تمام پہلوؤں پر حاوی

ہے۔ جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بھی جانتا ہے کہ پورا جواب نہیں ہوا۔ مگر اس میں بھی ہزاروں برس کا انتظار ہوا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے کہ ہم سے بھی اگر، ہم میں سمجھ ہو تو آج آدم کے ذریعہ سے ہم نے علم میں بلندی ثابت کر دی۔ اب آنے دو ایک فخر آدم کو۔ تو اس وقت، تو سہی جو ملک سے بھی عمل کی منزل میں اقرار لے لیا جائے کہ جو انسان کر سکتا ہے، وہ میں نہیں کر سکتا۔ وہاں تو ہزاروں برس، یہاں بھی ہزاروں برس سہی۔ آنے دو ایک ایسے کو۔ وقت آ گیا جب شبِ ہجرت۔ اب یہاں میں نام نہیں لوں گا۔ جو بحث ہے ملک اور انسان کی، وہی کہوں گا۔

وہ وقت آ گیا جب شبِ ہجرت ایک انسان، علی کہنے میں وہ لطافت نہیں ہے جو انسان کہنے میں ہے۔ جب شبِ ہجرت ایک انسان جس کا نام علی ہے، ایک انسان رسول بنا ہوا حکمِ خدا سے پیغمبر کے بستر پر لیٹا ہے اور حکم تو تھا لیٹنے کا مگر یہ سو بھی گیا ہے۔ حکم ادھر سے لیٹنے کا ہی ہو سکتا تھا۔ سونے کا حکم ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ شریعت افعالِ اختیاریہ سے ہی متعلق ہو سکتی ہے۔ لیٹنا اپنے بس کی بات ہے، سونا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ لیٹنا ارادی فعل ہے، سونا ارادی فعل نہیں ہے۔ لیٹ جانے کا حکم ہے مگر سو بھی جائے حکم سے، یہ ناممکن ہے۔ یہ سونا تو کیفیتِ نفس سے متعلق ہے۔ اگر نفس مضطرب ہو گا تو نہیں سوئے گا اور نفس اگر مطمئن ہو گا تو سو جائے گا۔

اب مجھ سے کوئی گواہ مانگے، تو میں کہتا ہوں کہ ایسی بات جو بس آدمی خود ہی جانتا ہو، دوسرے کو علم ہی نہ ہو سکے تو اس میں شرعاً بھی خود اس کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔ گواہوں کا مطالبہ اس میں غلط ہے۔ راوی لیٹنا دیکھ سکتا ہے، راوی سونا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جو لیٹتا ہے، وہ خود بتائے گا کہ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ تو خود اس نے بعد میں بتایا کہ جیسی نیند شبِ ہجرت آئی، ایسی کبھی نہیں آئی۔

ہمیں حیرت ہے کہ کیونکر سو رہے ہیں؟ ہمارے ہاں تو محلے میں کوئی کھٹکا ہو جائے تو نیند اُڑ جائے، چہ جائیکہ اپنے گھر کے اندر کھنچی ہوئی تلواریں اور لٹکتے ہوئے نیزے اور اس میں ایسی گہری نیند کہ کبھی نہیں سوئے تھے۔ اور وہ جو رات کو بھی سونے کا عادی نہ ہو، وہ کیونکر سویا؟ جس کی رات محرابِ عبادت میں گزرتی تھی، یہ آج لٹا دیئے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی تو راز ہے سونے کا کہ جس کیلئے روز جاگتا تھا، آج اُسی کیلئے سو رہا ہے۔ بس یہ سو رہے تھے اور جاگنے والا دیکھ رہا تھا۔ اُسے تو کبھی نیند آتی ہی نہیں:

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۔

وہ دیکھ رہا ہے اور اب دیکھا کہ رئیس الملائکہ، ان میں نسلیں بدلتی نہیں ہیں۔ جو اس وقت تھے، وہی اس وقت ہیں۔ تو ان میں منتخب کیا جو ممتاز ہیں، سید الملائکہ، جبرئیل اور ویسے ہی ممتاز جناب میکائیل۔ اب یہ جو عرض کر رہا ہوں، یہ اِدھر اُدھر کی کتابوں کی بات نہیں، حافظ ابو نعیم اصفہانی حلیۃ الاولیاء میں، یہ حافظ وہ حافظِ قرآن نہیں، یہ حافظ علمِ حدیث کی اصطلاح ہے، جو تیس ہزار، چالیس ہزار، ستر ہزار حدیثیں متن و سند کے ساتھ حفظ رکھتا ہو، اُسے حافظ کہتے ہیں۔

چنانچہ چودہ سو برس کے علماء میں بڑے بڑے علماء ہیں، مگر حفاظ چند ہیں۔ صحاح ستہ کے مصنفین حافظ نہیں کہلاتے، جو فقہ میں امام کہلاتے ہیں، وہ حافظ نہیں کہلاتے۔ حافظ صرف چند ہی ہیں۔ ابن حجر دو ہیں، ایک نویں صدی میں ہیں، دسویں صدی تک۔ وہ علامہ ابن حجر مکی، صواعق محرقہ کے مصنف اور ایک ان سے بھی پہلے ابن حجر عسقلانی۔ وہ ساتویں صدی کے آدمی ہیں، حافظ ابن حجر کہلاتے

ہیں۔لوگ دھوکہ کھاتے ہیں، ان کو حافظ ابن حجر کہہ دیتے ہیں۔تو وہ ناواقف ہیں تو حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جو اصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے مصنف ہیں اور شرح صحیح بخاری کے مصنف ہیں اور بہت کچھ ہیں۔

سب سے آخر میں سیوطی، حافظ جلال الدین سیوطی۔ یہ دسویں صدی کے آخر کے ہیں۔ان کے بعد سے کوئی حافظ نہیں ہے۔ حافظ سیوطی کو اپنے مطلب کی وجہ سے لوگ گھٹانے لگے ہیں کہ وہ رطب و یابس لکھ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے ہمارے مطلب کی باتیں زیادہ لکھی ہیں۔لہٰذا دنیا والے کہتے ہیں کہ سیوطی کا کوئی اعتبار نہیں، وہ تو سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔تو جو اپنے مطلب کی باتیں کم لکھے، کسی کے مطلب کی باتیں زیادہ لکھے، وہ گویا بس سب کچھ لکھنے لگا۔تو حافظ ان کا امتیاز خاص ہے۔

تو اب یہ حافظ نعیم اصفہانی اور دوسرے شیخ مشائخ صوفیاء بھی ہیں اور علماء میں بھی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔امام غزالی، ان کے نام کے ساتھ امام ہے، حافظ بھی ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ وسیع ہو گیا ہے۔مگر علمائے اسلام کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک ہیں غزالی جن کا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ابو حامد غزالی اور حافظ ابو نعیم کی لکھی ہوئی بات ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی بات بغیر پیغمبر کے بتائے ہوئے کسی تک نہیں پہنچ سکتی۔ چاہے بطور سند درج نہ کیا ہو مگر یقیناً وہیں سے چلی ہوئی بات ہے جو ان تک پہنچی۔

تو وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر جب علی رسول کے بستر پر آرام کر رہے تھے تو خالق مخاطب ہوا، جبرئیل و میکائیل کی طرف کہ جبرئیل و میکائیل! میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ قرار دی۔ ماشاء اللہ اہل فہم ہیں، میں کہتا ہوں، یہ بتا دیا بس کہ ایک کی عمر زیادہ۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کی عمر زیادہ؟ کیونکہ پھر پوچھ رہا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ دوسرے بھائی کو دے دے؟

اُس دن ملک نے سوال کیا تھا، خبر نہیں دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ خبر دیتا تو صحیح ہی بات ہوتی۔جھوٹی خبر ملک نہیں دے سکتا۔ سوال کیا تھا جس میں سچ اور جھوٹ کا سوال نہیں۔آج خالق حکم دے رہا ہے کہ دے دو۔ورنہ پھر عصمت ملک طاعت کروائے گی، حکم نہیں دیتا، سوال کرتا ہے کہ تم میں سے کی عمر زیادہ ہے، ایک کی کم ہے۔تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ اپنے دوسرے بھائی کو دے دے؟ اگر بتا دے کہ کس کی عمر زیادہ ہے تو امتحان ایک ہی کا ہو گا لیکن جب پردے میں رکھا تو اب جواب ہر ایک کو دینا چاہئے جس کی عمر زیادہ ہو، وہ کہے کہ ہاں۔تو ہر ایک کو بولنا چاہئے۔ یہ بھی کہے کہ ہاں، وہ بھی کہے کہ ہاں۔ ہر ایک کہے کہ جس کی عمر زیادہ ہے، وہ دینے کیلئے تیار ہے۔حکم نہیں دیا جا رہا۔فقط پوچھا جا رہا ہے۔تو ملک معصومانہ جواب دیتا ہے کہ بارالٰہا! ہماری تو اصل تمنا یہ ہے کہ پوری عمر تیری عبادت میں صرف ہو۔

اس میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے کہ ملک کا تصور عبادت انفرادی و شخصی ہے۔وہ بس نماز پڑھنے کو عبادت سمجھتا ہے۔اسی کو فخر میں بھی پیش کیا تھا کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔بس یاد الٰہی میں مصروف۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی تعریف کی ہے۔کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے، کچھ سجدے میں ہیں۔تو بس ان کی عبادت شخصی ہے، انفرادی ہے، اکیلی اکیلی عبادت ہے۔اجتماعی عبادت کہ دوسرے کے کام آنا بھی عبادت ہے، یہ حدود تصور ملک سے

بھی خارج ہے ورنہ اس سوال کا جواب سے جوڑ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی عمر کا فاضل حصہ دے دے؟ یہ کہتے ہیں کہ ہماری تمنا تو یہ ہے کہ ساری عمر تیری عبادت میں صرف کریں۔ یہ جواب سوال سے مرتبط اسی بناء پر ہے۔ اس میں یہ مضمر ہے کہ ہم تو پوری زندگی تیری عبادت میں صرف کرتے ہیں، اگر فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دے دیں تو اتنی سے محروم ہو جائیں۔ اب جس کی جتنی عمر ہے، وہ تیری عبادت میں صرف کرے اور اگر اپنی فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دے دیں تو اپنے حصہ کی عبادت اپنے ہاتھ سے کھوئیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ جواب ہو گیا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔

اب ارشاد ہوتا ہے کہ زمین کی طرف دیکھو۔ تبصرے میرے ہیں، اصل واقعہ پورا ان دونوں کتابوں میں ہے۔ زمین کی طرف دیکھو۔ میں کہتا ہوں کہ زمین کی طرف دیکھو تو وہی بہت دفعہ دیکھا ہوا انسان نظر آیا۔ مگر کبھی دیکھتے تھے، اس وقت کھڑے ہوئے مگر اس وقت دیکھا تو لیٹے ہوئے۔ کبھی دیکھتے تھے جاگتے ہوئے، آج دیکھا تو سوتے ہوئے دیکھ لیا۔ ارشادِ قدرت ہوا:

هَلْ لَا كُنْتُمْ مِثْلَ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَدْ فَدَا اَخَاهُ بِنَفْسِهٖ۔

کیوں نہ ہوئے تم مثل علی کے جس نے اپنی جان اپنے بھائی پر فدا کر دی ہے۔ ملک سمجھا کہ یہ عبادت ایسی ہے کہ میری عبادتوں کے معیار سے اونچی ہے۔ یہ نوع عبادت میری تمام عبادتوں سے بالاتر ہے۔ تو میں نے کہا کہ یہ کم عقلی کی تھی کہ تسبیح و تقدیس کو فخریہ پیش کیا تھا۔ دوسرا رُخ دیکھئے کہ اس نے پیش کیا تھا انسان کی زندگی کا تاریک رُخ کہ یہ انسان خونریزی کرتا ہے یعنی جانیں لیتا ہے۔ آج قدرت دکھا رہی ہے کہ تم نے جان کا لینا دیکھا، جان کا دینا نہیں دیکھا۔

معلوم ہو گیا اور واقعات آپ کے سامنے ہیں، صرف اشارہ کر دینا کافی ہے کہ آج سے مستقل طور پر تصورِ ملک میں ترمیم ہو گئی۔ یعنی ملک سمجھ گیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی، وہ اسی قابل ہوں کہ ان کے کام آیا جائے۔ ملک نے سمجھ لیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی عبادت ہے اور میری عبادتوں سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اب جو کہا جائے گا کہ درزی بن کر جاؤ تو چلا جائے گا۔ اب کوئی ایک ہی واقعہ نہیں ہے۔ درزی بن کر کہا تو چلا جائے گا۔ وضو کیلئے پانی لے کر چلا جائے گا اور لڑائی میں تلوار لے کر مدد کرنے چلا جائے گا۔ اب کبھی نہیں کہے گا کہ یہ سب کروں اور عبادت نہ کروں؟

تو مستقل طور پر تصورِ ملک میں ترمیم ہو گئی۔ اب معلوم ہو گیا کہ عمل میں بھی انسان وہ کر سکتا ہے جو میں نہیں کر سکتا۔ اب ارشادِ قدرت ہوا:

اچھا! تو اب جاؤ اور اس انسان کی حفاظت کرو۔ ارے فقط ان کی حفاظت نہیں ہے۔ اس کی سنت یہ نہیں ہے کہ انبیاء و معصومین کو حربوں کی زد سے پرے ہٹایا جائے۔ نہیں، گویا وہ کہہ رہا ہے کہ ابھی میرے کچھ کام اس کی اس زندگی سے، میرے ابھی بہت کام ہیں جو ابھی مجھے اس سے لینے ہیں۔ لہٰذا جاؤ اور اس کی حفاظت کرو۔ اب وہ دونوں فرشتے آئے اور اُترے۔ بس واقعہ بعد میں بیان کروں گا۔ بس ایک غلط فہمی کا دفعیہ۔ ان کو جو بھیجا جا رہا ہے، تو کیا (معاذ اللہ) سزا کے طور پر بھیجا جا رہا ہے؟ میں سزا کا محل اس لئے نہیں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مقامِ معرفت میں ملک کچھ اور اونچا ہو چکا ہے۔ مقامِ علم میں اس کی بلندی ہو گئی تو سزا کس چیز کی دی جائے؟ یہ سزا نہیں ہے۔

ایک بڑی حقیقت ہے جسے دو جملوں میں میں کہوں گا اور آگے بڑھوں گا۔ میں کہوں گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ جو شے اِدھر سے اُدھر جاتی ہے، اس کی معراج ہوتی ہے۔ جب وہاں والوں کو معراج ہوتی ہے تو یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔

اب ایک فرشتہ سرہانے اور ایک پائین پا۔ آج یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ان کا پیر بھی اتنا ہی اونچا ہے جتنا سر اونچا ہے۔ ایک ملک سرہانے اور ایک پائین پا۔ اب زبان پر کیا ہے؟ کئی الفاظ مجھے معلوم ہیں۔ "بخٍ بخٍ لک"۔ یاد رکھئے لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہنے والے کو دیکھنا ہے:

بَخٍّ بَخٍّ لَکَ۔ مَنْ مِثْلُکَ یَابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَدْ بَاهَی بِکَ اللّٰهُ مَلٰٓئِکَةَ السَّمَآءِ۔

مبارک ہو، مبارک ہو اے ابوطالب کے فرزند کہ آپ کے ذریعہ سے اللہ فرشتہ ہائے آسمان پر فخر کر رہا ہے۔

بس روایت یہاں ختم ہوئی۔ میں کہتا ہوں "من مثلک"، دیکھئے کون ہے آپ کی مثل کلام کے حدود، حدودِ متکلم سے بدلتے ہیں۔ اگر انسان کوئی کہے کہ کون آپ کی مثل ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسانوں ہی میں کوئی آپ کی مثل نہیں مگر غیر نوع کا ہر فرد یعنی ملک کہہ رہا ہے کون آپ کی مثل۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مخلوقِ الٰہی کی کسی نوع میں، نہ انسانوں میں، نہ جنات میں، نہ فرشتوں میں، کسی نوع میں ان کا مثل نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان سے بالاتر وہ ہے کہ جس پر فدا ہو کر یہ مرتبہ مل رہا ہے۔

اب ایک پہلو پر روشنی ڈالوں گا کہ اتنی بڑی تعریف کہ کسی نوع مخلوق میں آپ کا مثل نہیں۔ مگر اتنی بڑی تعریف میں، نہ ملک ان کا کوئی لقب کہہ سکتا ہے جو القاب ہمیں معلوم ہیں، تو کیا وہ ملائکہ کو نہیں معلوم؟ نہ ان کا کوئی وصف کہتا ہے، نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ بتاتا ہے؟ ارے نہ کہے کچھ اور ان کا نام ہی لے دے کہ ان کا نام علو کا پتہ دیتا ہے۔ بلندی تو ان کے نام میں مضمر ہے مگر ملک یہ کچھ نہیں کہتا۔ وہ تو کہتا ہے: یابن ابی طالب۔ کون آپ کا مثل ہے؟ اے ابوطالب کے بیٹے! قرآن میں کہا جا رہا ہے:

لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ۔

اور یہ قول ہی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتخاب بھی ملک کا طبع زاد نہیں ہے۔ وہ اُدھر سے ہی القاہے الفاظ کا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، تو یہ کیا بات؟ فصاحت و بلاغت کسی زبان کی ملک نہیں ہے۔ چاہے آپ پنجابی ہوں، چاہے ہندوستانی۔ زبان مادری ہو۔ مقامِ مدح میں کوئی نسبت ایسی جو ذم کا پہلو رکھتی ہو، یہ بلاغت کے خلاف ہے۔ تو اتنی اونچی تعریف اور اس میں یہ کہنا کہ اے ابوطالب کے بیٹے!

ماننا پڑے گا کہ ابوطالب کوئی ایسا بڑا باپ ہے جس کی طرف نسبت اس جلالتِ مدح کے خلاف نہیں ہے۔

میری عادت کچھ کچھ یہ ہے کہ میں اپنے لئے مشکلات پیدا کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں بھی ایک خلش ہے، وہ یہ کہ یہ ثابت ہوا کہ ہاں غلط نہیں، مگر ضرورت کیا تھی؟ ایک تو کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ غلط فہمی دور کرنے کا یہی ذریعہ تھا۔ ایک طبقے کی غلط فہمی دور کی جائے۔ مگر اس کے علاوہ؟ آخر ضرورت کیا تھی؟ تو جناب! جو اس کا جواب مجھے تاریخ سے ملا، وہ شعب ابی طالب کا چار برس کا محاصرہ تھا۔ اس میں ہر رات یہ خطرہ تھا کہ کہیں دشمن شب خون نہ مارے اور چراغ عمرِ رسالت کو خاموش نہ کر دے۔ تو ابوطالب نے حفاظتِ رسول کا

یہ انتظام کیا تھا کہ رسول کو ایک بستر پر نہیں رہنے دیتے تھے۔ کبھی طالب کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو طالب کے بستر پر۔ کبھی جعفر کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو جعفر کے بستر پر۔ کبھی عقیل کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو عقیل کے بستر پر اور کبھی علی کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو علی کے بستر پر۔

آپ اس قربانی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ چاہے جو بھی بیٹا میرا قتل ہو جائے، کسی ایک کو بھی تو مستثنیٰ نہیں کرتے۔ چاہے میرا جو بھی بیٹا قتل ہو جائے مگر رسول کی زندگی محفوظ رہے۔ اب میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ ابو طالب کا بیٹا کہنے میں کیا راز ہے! قربانی کا یہ طریقہ، یہ باپ کی ڈالی ہوئی عادت تھی۔ اس کے بعد یہ حق شناس ملک تھا جس نے اس محل پر ابو طالب کو یاد کرنا ضروری سمجھا اور یہ ناحق شناس انسان تھے کہ جنہوں نے اس کے بعد بھی ابو طالب کے ایمان میں شک کیا۔

اب جناب! پورا تبصرہ ہو گیا۔ مگر پھر میں نے اپنے لئے ایک مشکل پیدا کر لی۔ وہ یہ کہ میرا بیان بالکل بے قیمت، اگر کوئی ایک لفظ مجھے قرآن کا مجھے شاہد نہ ملا ہو۔ اسی لئے تو میں نے کہاں کا کہاں سے ربط ملایا ہے اور کہاں یہ بعثت خاتم الانبیاء کے بعد یہ ہجرت کی رات۔ تو یہ ربط کیا میں نے از خود ملا دیا؟ تو یہ تو بہت بڑی جرأت کی بات ہے۔ اس میں تو کوئی وزن نہیں ہے۔ جب تک کہ کوئی لفظ قرآن کا شاہد نہ ہو، وہ آیت جو اس کارنامہ علی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہوئی آئی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ ۢ بِالۡعِبَادِ۔

اس آیت میں بھی اللہ نے نہ ان کا کوئی لقب کہا ہے، نہ ان کا کوئی وصف کہا ہے، نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ کہا ہے، نہ ان کا نام لیا ہے بلکہ بس ان کے کردار کو پیش کر کے، سرنامہ خطاب یہ ہے، سرنامہ مدح یہ ہے "ومن الناس"، انسانوں میں دیکھو، یہ ایک شخص ہے جو اپنی جان کو رضائے الٰہی کیلئے دیتا ہے۔ یہ اس سند میں انسان کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہی ضرورت تھی کہ آج علی نوع انسان کا نمائندہ بنے ہوئے نوع ملک پر اس کی بلندی کو ثابت کر رہے ہیں۔ اس لئے اس دستاویز میں انسان کہا گیا۔ ہاں! اس کے بعد عام طریقہ قرآن کا یہ ہے کہ فرد کی مدح ہوتی ہے مگر جمع کے صیغہ میں یہاں تک کہ آیہ ولایت میں بھی سب جمع کے صیغے ہیں:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ رٰكِعُوۡنَ۔

مدح فرد کی اور الفاظ جمع کے۔ مگر یہاں خالق نے وحدت نمایاں کی ہے۔ "وَمِنَ النَّاسِ"، انسانوں میں ایسے بھی ہیں "مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ"، دیکھو! انسانوں میں یہ ایک ایسا ہے۔ اب اس منزل قربانی میں کوئی کہیں نہیں ہے۔ "مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ"، اہل علم جانتے ہیں "مَن" میں گنجائش واحد جمع دونوں کی ہے۔ مگر نہیں، فعل جو لائے گئے ہیں، وہ سب واحد "مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ"، انسانوں میں وہ ہے جو بیچ ڈالتا ہے۔ بیچ ڈالتے ہیں نہیں، "نَفۡسَهُ"، واحد کی ضمیر، نفس بھی واحد، "اَنۡفُسَهُمۡ" نہیں، اپنے نفوس کو۔ حالانکہ مباہلہ میں ایک نفس لایا جائے گا۔ مگر "اَنۡفُسَنَا" کہا گیا ہے۔ عام سنت الٰہی یہی ہے کہ واحد کی مدح جمع کے صیغے

سے کرتا ہے۔

مگر یہاں وحدت نمایاں ہے کہ دیکھو کہ یہ بھی ایک ہے جو اپنی جان کو بیچتا ہے۔ بس مدح میں کہتا ہوں، اب میں کیا کروں کہ اس کے بعد وحی کا دروازہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد کوئی قرآن کی آیت اُترتی ہوئی نہیں دکھا سکتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر دس محرم ۶۱ھ کو کوئی آیت اُترتی تو یہ وحدت جمع کی شکل اختیار کرتی اور آج فرشتے دیکھتے کہ ہاں! ایک جماعت ہے جو ایسا کچھ کرتی ہے کہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس وقت جمع کی شکل ہوتی کہ دیکھو! ایسے بھی انسان ہوتے ہیں۔ کوئی یہاں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بہت حد سے بڑھی ہوئی بات ہے۔ کہاں حضرت علی علیہ السلام اور کہاں یہ پورا مجمع؟ یہ پوری جمعیت۔ کہا جا رہا ہے کہ ان کیلئے کہا جاتا۔

مگر میں کہتا ہوں، وہ پوری جمعیت جس میں جتنا فرق ہے، وہ مجھے معلوم ہے۔ عصر تک کے جہاد میں اصطلاحی طور پر معصوم۔ تو بس ایک ذات ہے عصر تک کے جہاد میں۔ معصوم اصطلاحی ایک ذات، اس کے بعد سب عرب ہی نہیں، ان میں حبشی بھی ہیں، ترکی بھی ہیں۔ تو سب عرب بھی نہیں۔ ارے سب آزاد بھی نہیں، ان میں غلام بھی ہیں۔ تو اپنی جگہ تو جو فرق ہے، مجھے معلوم ہے اور زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر جہاں تک کردار کربلا کا تعلق ہے، مجھے کوئی اور فرق کیا، مجھے اس کردار میں معصوم اور غیر معصوم کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ اگر کردار کی منزل میں کوئی فرق ہوتا تو حجت خدا سب کو مخاطب کر کے نہ کہتے کہ:

بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا أَصْحَابَ الْحُسَيْنِ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْأَرْضُ الَّتِي دُفِنْتُمْ فِيهَا۔

معصوم ابن معصوم، حجت خدا ابن حجت خدا، وہ کہہ رہے ہیں میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، اے مجاہدین کربلا! تم بھی پاک ہوئے اور وہ زمین بھی پاک ہوئی جہاں تم دفن ہوئے اور کاش! میں تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔

66

امامت وخلافت

شہادت کی دواقسام ہیں ،ایک شہادت سرّی اورایک شہادت جہری۔ مخفی شہادت زہر سے ہوتی ہے اوراعلانیہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔دونوں شہادتیں دونوں نواسوں پر تقسیم ہوگئیں۔

دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، جھکائے نہیں جاتے۔ یہ کس لئے؟ حضرت موسیٰؑ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے،زمین کے کسی غار میں نہیں جاتے تھے۔کبھی آپ لوگوں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

عرش اُس کا پایہ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔اسی طرح زمین اس کا پایہ تخت ہے مگر عالم بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے۔لہٰذا جہاں بھی جائے گا،نمازیں پڑھتا ہوا جائے گا،اقتداء کرتا ہوا نہیں جائے گا،امامت کرتا ہوا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں ،یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے ہی جیسا ہوں ۔ یہ کہا تھا کہ تمہاری طرح بشر ہوں،یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری طرح خطا کار ہوں۔

جنابِ رسولؐ خدا جتنا حسینؑ کے غم میں روئے ،اتنا کبھی اور کسی کیلئے نہیں روئے ،یہاں تک کہ کربلا والوں کے غم میں جتنا آپؐ روئے ،اتنا کوئی نہیں رویا۔

امامت وخلافت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
"اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَه".

سورۂ الحمد کے بعد پہلے ہی سورہ میں اور قرآن مجید کے بڑے اور وسیع تر سورہ میں پہلے ہی رکوع میں یہ آیت ہے کہ وہ موقع آیا جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کیا اس زمین میں ان کو مقرر کیا جائے گا جو اس میں فساد کریں اور خونریزی کریں، حالانکہ ہم تیری تسبیح وتحلیل کرتے ہیں اور پاکیزگی کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں۔ ادھر سے ارشاد ہوا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ وہ موقع یاد رکھنے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے سابقہ واقعات صرف تفریحِ طبع کیلئے بیان نہیں کئے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں اُمت کیلئے کچھ بصیرتیں موجود ہیں اور ان کی کچھ اہمیت ہے۔

جو میں نے عرض کیا کہ یہ موقع یاد رکھئے گا۔ اب اس کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے یہ کہا۔ کیا کہا؟ اب آنے والا ابھی ہم بتا بھی نہیں سکتے کہ کتنی مدت کے بعد آئے گا۔ چاہے سو برس ہیں، چاہے ہزار برس ہیں، اس کا بیان قرآن مجید میں بھی نہیں ہے، احادیث میں بھی نہیں ہے۔ بہرحال بہت پہلے سے کہا جارہا ہے کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اب چونکہ قرآن مجید میں یہ ہے کہ جانشین، مگر کس سے تعلق ہے اس جانشینی کا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا عام مفسرین اس میں پریشان ہو گئے ہیں۔ اس میں کہ جانشین بنانے والا ہوں۔ تو کسی کا جانشین؟ اب میں کہتا ہوں کہ دشواری کیا ہے؟ قرآن تو سامنے ہے، کافی ہے۔ مگر ذرا سی بات کے سمجھانے کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ اب اُلجھے ہوئے ہیں کہ جانشین کس کا؟ تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت دور کی کوڑی لائے۔ اب وہی تاریخ وغیرہ سے، روایات سے۔ ورنہ اس وقت انہوں نے کہاں دیکھا تھا؟ تو یہ کہا کہ آدمی یعنی انسانی نسل سے پہلے اس زمین پر جنات وشیاطین آباد تھے جن کو عربی میں جنونسناس کہتے ہیں۔ آدمی ناس ہیں اور وہ نسناس۔ تو جنات ونسناس یعنی جنات وشیاطین۔ یہ قوم اس دنیا میں بسی ہوئی تھی۔

اس کے بعد بداعمالیوں سے وہ تباہ وبرباد کئے گئے۔ تو اب خالق کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی جگہ، ان شیطانوں کی جگہ پر، جنات کی جگہ پر ایک مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے بڑے علماء غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے۔ میں کہتا ہوں کہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ ارے صاحب! بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی، اس کے بعد فرشتے کہہ رہے ہیں کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں، یعنی کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟ ہم ہی کو کیوں نہیں مقرر کیا جاتا؟

تو سبحان اللہ! جنات وشیاطین کی جانشینی اور ملائکہ کا رشک کرنا۔ ملائکہ کو اس کی تمنا پیدا ہوئی کہ جنات وشیاطین کی جگہ پر ہم کو رکھ دیا جائے۔ تو ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ فرشتے، جوارِ قدس میں بسنے والے، عالم بالا کے رہنے والے اور وہ

اس کے قرب وجوار میں رہنے کی بجائے یہ طلب کریں کہ ہمیں شیطانوں کی جگہ اس دنیا میں بھیج دے۔ یہ خلاف عقل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہر زبان کے محاورے سے ہوسکتا ہے۔ کوئی صاحب آپ میں سے دوپہر کے وقت کہیں گئے ہوئے تھے، وہاں سے کسی دوست کے ہاں آئے اور کہا کہ ارے بھئی! بہت پیاس لگی ہے۔ تو وہ دوست پوچھے گا کہ کس کو پیاس لگی ہے؟ ارے صاحب! کسی اور کو پیاس ہوتی تو اُس کا نام لیا جاتا۔ جب اس کا نام نہیں لیا گیا تو سمجھ لیجئے کہ جو کہہ رہا ہے، اُسی کو پیاس لگی ہے۔

کوئی اور زیادہ بے تکلف دوست ہو اور کہے کہ بہت بھوک لگی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو بھوک لگی ہے اور مثلاً والد ماجد فرماتے تھے، کیا کوئی پوچھے گا، کس کے والد ماجد؟ کسی اور کے والد ماجد کا ذکر ہوتا تو اس کا نام ہوتا۔ جب کسی اور کی طرف اضافت نہیں دی تو سمجھئے کہ جو کہہ رہا ہے، وہ اپنے ہی والد کی بات کر رہا ہے۔ بھائی صاحب سفر سے آگئے ہیں، کہیں گئے ہوئے تھے۔ کس کے بھائی صاحب؟ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی اور کا ذکر ہو تو متعلق کیلئے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اور جب خود متکلم اپنی طرف اضافت دینا چاہے تو پھر کسی متعلق کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی کہے کہ پیاس لگی ہے، کوئی نہیں پوچھے گا کہ کس کو؟ کہے بھوک لگی ہے تو کوئی نہیں پوچھے گا، کس کو؟ کہے کہ والد صاحب نے کہا تھا، وہ نہیں پوچھے گا، کس کے؟ بھائی صاحب نے کہا ہے، نہیں پوچھے گا، کس کے؟

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ تو دنیا پوچھتی ہے کہ کس کا؟ ارے صاحب! جب نہیں بتایا کہ کس کا تو سمجھ لیجئے کہ جو کہہ رہا ہے، وہ اپنی ہی طرف اضافت دینا چاہتا ہے کہ میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ تو خدا اپنا جانشین کیوں بناتا ہے؟ ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے مکان یا زمان خالی ہو۔ مکان خالی ہو یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو جانشین بنائے۔ یا زمانہ اس سے خالی ہو تو جانشین بنائے اور ذاتِ الٰہی جو زوال وانتقال سے بری ہو تو اس کی طرف سے جانشین بنانے کے کیا معنی؟ اس کو میں دو رُخوں سے سمجھاؤں گا۔ ایک رُخ تو بہت کھلا ہوا ہے جس میں زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے، نہ علمیت کی اس میں کوئی ضرورت ہے۔ اس میں ایک ذرا سی گہرائی ہے۔ مگر ماشاء اللہ ہمارا مجمع بافہم ہے تو کوئی گہرائی محسوس نہیں ہوگی۔

تو پہلا حل یہ ہے کہ بے شک خالق کی طرف زمین وآسمان دونوں کی نسبت یکساں ہے، بایں معنی کہ دونوں مخلوق ہیں اس کی۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

وہ آسمان کا بھی پروردگار اور زمین کا بھی پروردگار۔

مگر پھر بھی بلندی کے رُخ کو جو اس سے تعلق محسوس ہوتا ہے، وہ زمین کا نہیں ہے۔ تو تعلق زمین میں نہیں ہے۔ دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، جھکائے نہیں جاتے۔ یہ کس کیلئے؟ حضرت موسیٰ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے۔ زمین کے کسی غار کے اندر نہیں جاتے تھے۔ قرآن کے محاورات دیکھ لیجئے۔ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو اتارنا کہا گیا ہے۔ قرآن اس کی طرف سے آیا تو اس کیلئے کہا گیا "اَنْزَلْنَا"، ہم نے اُتارا۔ وحی اس کی طرف آئی ہے تو اس کیلئے کہا جائے گا کہ وحی اُتاری۔ ملک اس کی طرف سے آتا ہے تو اس کیلئے کہا جائے گا کہ ملک کو ہم نے اُتارا۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ سب تو ہر ایک کی سمجھ میں آجاتا ہے مگر قرآن میں ایک جگہ لوہے کو بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے اُتارا۔ اب عرب کی زندگی کے اعتبار سے وہ لوہار تو نہیں تھے، شمشیر زن تھے تو وہاں فولادی چیز جو ہوتی

تھی، وہ تلوار ہوتی تھی۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے لوہا اُتارا جس میں لوگوں کیلئے خوف ودہشت ہے۔ تو یہ خوف اور دہشت ہتھوڑے سے نہیں ہوتی، آری سے نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی چیز، ایسا لوہا جس میں خوف ودہشت مضمر ہو، تو اب دنیا ڈھونڈے کہ کوئی تلوار جو اُدھر سے اُتری ہو۔

تو جو اُدھر سے چیزیں آتی ہیں، ان میں کہا جاتا ہے اُترنا اور جو چیزیں اِدھر سے جاتی ہیں، ان کیلئے کہا جاتا ہے بلند ہونا۔ دعا بندے کی چڑھتی ہے، بلند ہوتی ہے۔ عمل صالح انسان کا اگر مقبول ہے تو اوپر جاتا ہے، بلند ہوتا ہے۔ یہ ہمارا ہی محاورہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں ہے، جو نیک عمل ہے، وہ اسے اونچا کرتا ہے۔ نماز اگر مقبول ہے تو یہی آیا ہے کہ آسمانوں پر جاتی ہے۔ تو جو اُدھر سے چیز آتی ہے، اس کو اترنا اور جو چیز ادھر سے جاتی ہے، اس کو چڑھنا۔ یہ آخر محاورہ کیوں ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ عرش یعنی پایہ تخت کا تصور جس میں پیش کیا گیا ہے، تو یہ اس کا پایہ تخت ہے۔ اس کے لئے تصور یہ ہے کہ وہ عالمِ اعلیٰ کا بلند ترین نقطہ ہے۔ عرش زمین کے نیچے نہیں مانا جاتا۔ آسمانوں پر یہ تصور سے خارج بلندی ہے۔ اُسے عرش مانا جاتا ہے۔ اسے پایہ تخت مانا جاتا ہے۔ ہاں مگر پایہ تخت کہنے سے میں یہ نہیں مانوں گا کہ وہ اس پر بیٹھتا بھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ پایہ تخت ہے اور اگر اس پر وہ بیٹھتا بھی ہے تو ہماری زمین پر تو اس کا گھر ہے، تو کیا وہ اس گھر میں رہتا بھی ہے؟ مکہ معظمہ میں وہ مقدس گھر جس کا تمام دنیا جا کر طواف کرتی ہے، اس کیلئے کیا تصور ہے، بیت اللہ۔ تو وہ اللہ کا گھر ہے۔ تو کیا اس گھر میں وہ سکونت فرماتا ہے؟ وہ اس میں رہتا ہے؟ اس کا کسی فرقہ کے مسلمانوں کو تصور نہیں ہے۔ تو جب اس گھر میں رہنے کا تصور نہیں تو عرش کیلئے یہ تصور کیوں کہ وہ بیٹھتا ہے؟

اب ایک عقلی بات ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جسے بیٹھنے کیلئے تخت کی ضرورت ہو، اُسے رہنے کیلئے گھر کی بھی ضرورت ہوگی۔ جب اس کا گھر ہے مگر رہتا نہیں، تو آدمی غور کرے کہ تخت میں یہ تصور کیوں ہے کہ وہ اس پر بیٹھتا ہے؟ میرے نزدیک تو یہ گھر بھی ایک نسبت ہے شرف اور عزت کو بڑھانے کیلئے اور وہ عرش کہنا بھی ایک نسبت ہے شرف اور عزت کو بڑھانے کیلئے۔ مگر جیسی نسبت ہوتی ہے، عملاً اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی اس نسبت کو اپنے عمل سے نبھایا جاتا ہے۔

صاحبانِ فہم! صاحبانِ عقل! اب سمجھ سکتے ہیں کہ گھر کی نسبت شخص کی طرف نجی اور انفرادی ہوتی ہے۔ تخت وسلطنت کی نسبت بادشاہ کی طرف منصبی ہوتی ہے۔ تو اسے کہہ رہا تھا اپنا گھر۔ اسے کہہ رہا تھا اپنا عرش۔ یہ ہے گھر تو جب گھریلو کام لینا ہوا، کسی کا زچہ خانہ بنانا تو اسے منتخب کیا اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا تو وہاں بلالیا گیا۔

تو اب یہ دو الفاظ کہہ رہا ہوں، اسے محفوظ رکھئے گا، کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی کہ جس حیثیت سے عرش اس کا پایہ تخت ہے، اُس حیثیت سے گویا زمین اُس سے خالی ہے۔ تو یہی تو کہا جارہا ہے کہ میں زمین میں، جانشین مطلق نہیں کہا گیا، محض جانشین۔ زمین میں جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ تو اب اپنے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ ملائکہ سے کہا گیا کہ سنو ملائکہ! یہاں عالمِ بالا میں تو میں ہوں، میرا عرش ہے لیکن عالمِ ادنیٰ یعنی زمین اس شرف سے محروم ہے۔ لہٰذا میں ایک ایسے کو بنانا چاہتا ہوں جس کا دارالسلطنت زمین اسی طرح ہو جس طرح میرا دارالسلطنت عرش ہے۔ اور ذرا سے الفاظ بدل کر کہوں گا کہ ایسے کو مقرر کرنا چاہتا ہوں جسے زمین سے وہی نسبت ہو جو مجھے عرش سے ہے۔

اب یہ منزل اتنی پر کشش ہے کہ ملک کی نگاہ طلب پڑتی ہے کیونکہ صحبت میں رہے مگر منصب سے محروم رہے۔ تو یہ بلندی نہیں ہے۔ ظاہری طور پر دور بھی ہو جائے مگر منصب کا حامل ہو کر رہے تو اس میں بلندی ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی دور کردوں کہ عرش اس کا پایہ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔ اسی طرح زمین اس کا پایہ تخت ہے مگر عالم بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں بھی جائے گا، نمازیں پڑھاتا ہوا جائے گا۔ اقتداء کرتا ہوا نہیں جائے گا۔ امامت کرتا ہوا جائے گا۔ تو یہ تھا ایک پہلو جانشینی کا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے جگہ یا زمانہ خالی ہو۔ یہ بنیادی تصور ہی غلط ہے۔ ایک اور صورت ہے جانشین بنانے کی، وہ یہ ہے کہ کام کرنے کا کسی کے ہو، یعنی کسی طرح سے فریضہ اس کا ہو مگر کسی وجہ سے وہ خود آ کر انجام نہ دے سکتا ہو۔

اس کی مثال ایک میں یہ دے سکتا ہوں کہ کوئی معزز آدمی کہیں جائے تو اس کے اعزاز میں جلسہ ہوتا ہے۔ اس جلسہ میں اس کے اعزاز میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ آئینی طور پر سپاسنامہ کا جواب دینا اسی مہمان کے ذمہ ہے جس کے اعزاز میں وہ جلسہ ہے۔ وہ سپاسنامہ پڑھا گیا ہے مگر اتفاق سے جس جگہ وہ پڑھا گیا ہے اور مجمع میں جو لوگ ہیں، وہ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ان کی زبان سے واقف نہیں ہے۔ تو ناواقفیت بھی سدراہ ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری زبان سے واقف نہیں، میں ان کی زبان سے واقف نہیں۔ کوئی سپاسنامہ کا جواب دینے اگر خود سے کھڑا ہو جائے تو میرا فرض ادا نہیں ہوگا۔ غیر آئینی ہے۔ اس کے جواب سے میں سبکدوش نہیں ہوں گا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انہی میں سے کسی کو میں اپنا نائب بناؤں جو میری زبان سے بھی واقف ہو اور ان کی زبان سے بھی واقف ہوتا کہ وہ میرا جواب میری زبان میں مجھ سے سنے اور ان کی زبان میں ان تک پہنچائے۔ بس خالق کو خلیفہ بنانے کی اسی لئے ضرورت تھی۔ خلق خدا کی رہبری، سیدھے راستہ پر پہنچانا اس کا کام ہے بحیثیت رب۔ اگر وہ فقط خالق ہوتا تو خالق کے معنی ہیں پیدا کرنے والا۔ تو پیدا کیا اور بس چھوڑ دیا۔ لیکن وہ فقط خالق نہیں۔ یہی فرق ہے عیسائیوں کے محاورہ میں اور ہمارے محاورے میں۔ وہ خدا کو کہتے ہیں "اَب" یعنی باپ۔ ہم خدا کو کہتے ہیں رب یعنی پالنے والا۔ یہ باپ کا جو لفظ ہے، یہ سبب وجود کو بتاتا ہے۔ سبب بقا کو نہیں بتاتا۔

بہت سے بچے ہیں کہ باپ ان کے دنیا سے اٹھ گئے، تب وہ پروان چڑھے تو وجود میں باپ کا دخل ہے، بقا میں نہیں ہے۔ لیکن رب، رب کے معنی ہیں پروان چڑھانے والا۔ یہ بقا کے ہر لمحے میں اس کا رشتہ ہے۔ انہوں نے "اب" کہا ہے۔ یہ رشتہ ماضی ہے اور ہم رب کہتے ہیں، یہ رشتہ حال ہے۔ یعنی ہمارا ہر نفس اس کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کی نگاہ ہم سے ایک لمحے کیلئے ہٹے تو ہماری ہستی نیستی میں بدل جائے۔ یہ سب ہے رب میں مضمر۔ تو اگر فقط خالق ہوتا تو ہدایت اس پر فرض نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ وہ رب ہے، پروردگار ہے، اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے ممکن درجہ کمال تک پہنچانا۔ لہٰذا اب صحیح اور غلط کا بتانا، اب اچھے اور برے کی تعلیم دینا۔ اب صحیح راستے پر چلانا، یہ سب فرائض تربیت میں سے ہیں۔ اب قرآن مجید کا ایک ایک لفظ وہ ہے کہ غور کیا جائے تو پردہ ہٹتا ہے کہ اس اعلان میں "قَالَ اللّٰہُ" نہیں کہا گیا کہ اللہ نے یہ کہا بلکہ "قَالَ رَبُّکَ" تمہارے رب نے یہ کہا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو اعلان ہے، وہ تربیت کے ماتحت ہے۔ تربیت اس کا کام، لہٰذا ہدایت اس کا کام۔

قرآن مجید میں ہے: ہر چیز کو اُس نے پیدا کیا، پھر ہدایت کی، مگر انسان کے علاوہ جس جس چیز کی ہدایت ہے، وہ خلقی طور پر ارادۂ قاہرہ سے ہے۔ اس کا کام ہے اسے منزلِ ارتقاء تک پہنچانا۔ یعنی ایک قطرہ اس کی ہدایت سے گہر کی منزل تک پہنچتا ہے۔ ایک بیج اس کی ہدایت سے ثمر تک پہنچتا ہے۔ تو ہر چیز اپنے کمال کی منزل تک یہ ارادۂ الٰہی پہنچتی ہے۔ چیز کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہے۔ لیکن انسان کو اس طرح منزلِ کمال تک نہیں پہنچانا ہے ورنہ کوئی دنیا میں کافر ہی کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے ارادۂ قاہرہ سے ہر ایک کو مومن بنانا چاہتا ہوتو کافر دنیا میں رہتے ہی کیوں؟

اگر پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے ہیں، سب مومن ہی ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوتِ قاہرہ سے اس کو منزلِ کمال تک پہنچانا، یہ منظور نہیں ہے۔ اسے منزل تک پہنچانا تھا، اسے منزل بتا کر چلنے کی دعوت دینا ہے۔ اس کیلئے یہ تھا کہ وہ اسے صحیح راستے پر چلائے۔ اس کیلئے یہ ضروری ہوا کہ صحیح راستہ بتائے اور اس سے کہے کہ ادھر چلو۔ وہ آگے آگے چل کر کیسے بتائے کہ میرے پیچھے آؤ۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ جسم رکھنے والے، جسمانیات سے جو الگ نہیں ہیں، یعنی اسی خلقت میں سے کوئی ایسا ہو کہ جس میں ایسی صفائے جوہر ہوں کہ اُس سے فیض لے سکے اور جسمانی طور پر ان کا ہم جنس ہو کہ ان کو پہنچا سکے۔ ایسی دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جسے وہاں کہا گیا تھا کہ دونوں کی زبان جانتا ہو۔ تو ایسے دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جو گناہوں سے بری ہونے کی وجہ سے خود اس کا فیض حاصل کرنے کا مستحق ہو اور خلقِ خدا کو صحیح راستہ بتانے کیلئے ان کی ضروریات میں شریک ہو تاکہ ان پر حجت تمام کر سکے۔ اگر اُسے بھوک نہ لگتی ہو اور وہ کہے کہ روزہ رکھو تو خلقِ خدا کہے گی کہ جناب! آپ کو بھوک کا مزہ ہی نہیں معلوم۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا کوئی آسان ہے؟ آپ کیا جانیں کہ پیاس کیا چیز ہوتی ہے؟ تو دن بھر پیاسا رہنا کہیں ہو سکتا ہے؟ جو جو حکم وہ دے، دنیا کہے کہ جناب! ان تمام خواہشات سے آپ بری۔ آپ مثالِ عمل کہاں بن سکتے ہیں؟

تو خلقِ خدا پر حجت تمام نہ ہوتی۔ لہٰذا ایک ایسا ہونا چاہئے، اور میں ایک لفظ پر اس کو ختم کرتا ہوں، دنیا کہتی ہے کہ کہا گیا کہ تمہاری ہی طرح بشر ہوں، تو ہم ہی جیسے ہیں۔ بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں، یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے جیسا جاہل ہوں۔ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری طرح خطاکار ہوں۔ تو بشریت پر ایمان لانا تو میں جزوِ دین سمجھتا ہوں، بشریت کا انکار میں کفر سمجھتا ہوں۔ مگر بس دیکھنا یہ کہ کیسا بشر! میں کہتا ہوں کہ یہ بشر ایسے ہیں، دنیا ملک کہنا ان کی تعریف سمجھتی ہے، میں ملک کہنا ان کی توہین سمجھتا ہوں۔ یہ ملک اور انسان کی فضیلت کا جزو غالباً اسی سلسلہ بیان میں کل آپ کے سامنے عرض ہوگا۔

تو حضور والا! ایسا بشر ہو جو خالق سے اس کا فیض حاصل کر سکے اور ہم تک اس کے فیض کو اپنی زبان میں جو ہماری بھی زبان ہے، پہنچا سکے۔ تو اسے وہ اپنا جانشین بنائے، اپنا نائب بنائے کیونکہ نائب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا کام اُس کا کام ہو جائے۔ اب یہ جو ہدایت کرے گا، وہ اس کی ہدایت نہیں ہوگی بلکہ وہ اُس کی طرف کی ہدایت ہوگی جس نے نائب بنایا ہے۔ تو اب چاہے اس کو ہدایت کرنے والا کہئے، چاہے اُس کو ہدایت کرنے والا کہئے، اس لئے اس کو ہم کہیں گے ہادی اور قرآن کہے گا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔

کہ اے رسول! آپ منذر ہیں، نبی اور رسول بھی ہیں لیکن انذار یعنی رسالت کا دروازہ بند ہوا ہے، ہدایت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہر نسل، ہر طبقہ کیلئے ہادی ہیں، یعنی رسالت ختم ہوئی ہے، ہدایت ختم نہیں ہوئی۔ ناموں سے حقیقت نہیں بدلتی۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی ہدایت بنامِ رسالت ہوتی ہے، کبھی ہدایت بنامِ امامت ہوتی ہے۔ لیکن ہدایت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور بس۔ گزشتہ بیان کی روشنی میں ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ جنابِ والا! جب میں نے عرض کیا کہ ہدایت تقاضائے ربوبیت ہے تو بس ایک جملہ کافی ہے یعنی جب تک اس کی ربوبیت ہے، تب تک ہدایت ہے۔ اب یہ اتنا بلند منصب ہے کہ ملائکہ نے کہا:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔

کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو فساد کریں اور خونریزی کریں؟ بس بس۔ غیر متوازن الفاظ بھی کبھی نا سمجھی سے استعمال کر لئے جاتے ہیں۔ شاید آپ نے سنا ہو یا کسی نے کہا ہو کہ ملائکہ نے اعتراض کیا۔ یاد رکھئے ملائکہ جو ہیں، وہ عصمتِ فطری کی منزل پر فائز ہیں اور قرآن کہہ رہا ہے:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۔

وہ اللہ پر بات کرنے میں سبقت ہی نہیں کرتے۔ وہ وہی کرتے ہیں جو اس کا حکم ہوتا ہے۔ تو اب فرشتوں کیلئے یہ کہنا کہ انہوں نے اعتراض کیا۔ تو میں ہرگز نہیں کہوں گا کہ اعتراض کیا۔ میں بس یہی کہوں گا کہ تعجب سے سوال کیا اور اب ذرا سی علمی بات ہے کہ کوئی اطلاع دی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال ہے۔ کوئی بات پوچھی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال نہیں۔ فرشتہ خود کچھ نہیں کہہ رہا، وہ تو ایک بات پوچھ رہا ہے۔ تو پوچھنے میں جھوٹ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فرشتے نے کام کیا کیا ہے؟ فرشتے نے کام یہ کیا کہ نوعِ انسان کی زندگی کا ایک تاریک رُخ لیا جو بلاشبہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسان فساد نہیں کرتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسان خونریزی نہیں کرتا۔ تو ایک تاریک رُخ لیا انسان کا جو اس کی نظر میں بہت تاریک تھا۔ فساد تو بلاشبہ تاریک ہے ہی اور خونریزی بھی، جو بطور فساد ہو۔ اس کے تاریک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ تو اس رُخ کو لیا جو بے شک ہے اور اپنی زندگی کا روشن پہلو لیا جو حقیقتاً ہے۔ لیکن انسان کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ ملک تسبیح نہیں کرتا، تقدیس نہیں کرتا۔ جو اپنی صفت تسبیح و تحلیل کی بتائی، وہ حقیقتاً ہے۔ جو عام انسانوں کی صفت بتائی، فساد اور خونریزی، وہ بھی ہے۔ ہر جز و صحیح۔ بس کام یہ کیا کہ دونوں کو ملا کر پوچھ لیا۔ اپنی زندگی کا روشن رُخ، ان کی زندگی کا تاریک رُخ۔ ان دونوں کو ملا کر پوچھ لیا کہ کیا انہیں مقرر کیا جائے گا؟ ہمیں نہیں؟

نتیجہ پھر ملک نے نہیں نکالا کہ ہم زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہ نتیجہ جھوٹ ہوتا۔ یہ نتیجہ غلط ہوتا۔ یہ نتیجہ ملک نے نہیں نکالا۔ اسے سادہ لوح انسانوں پر چھوڑا کہ وہ یہ ہی نتیجہ نکالیں گے۔ مگر یہ پوچھا ہی کیوں؟ میں نے کہا کہ یہ سوال ہی کیوں کیا؟ تو یاد رکھئے کہ سوال کرنے کا حق تو بہرحال انہیں یوں تھا کہ وہ بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں اور طالب علم کی سمجھ میں جو بات نہ آئے، اسے اُستاد سے پوچھنے کا

حق ہے۔ متعلم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اجازت لازمی طور پر حاصل ہے ورنہ فریضہ تعلیمی ادا ہی نہیں ہوگا۔ معلم ہونے کا رشتہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ طالب علم کو حق دے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، اسے مجھ سے پوچھنا۔ اور یہاں وہ پوچھنا کسی مقصدِ الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک اگر وہ یہ نہ پوچھتے تو ایک مقصدِ الٰہی پورا ہونے سے رہ جاتا۔ وہ مقصدِ الٰہی کیا ہے؟ ایک تو جو میں پہلے کام لے چکا ان کے اس سوال سے، وہ یہ ہے کہ مقصد کی جلالت نمایاں ہوئی کہ یہ منصب ایسا بلند ہے کہ ملک کی نگاہِ طلب بھی پڑتی ہے۔ اب خلق خدا کیلئے انتباہ ہے کہ اسے کبھی ارزاں نہ بنالینا۔ اتنا اونچا ہے یہ منصب۔ اور وہ بھی اسی نام سے جسے تم نے ارزاں بنایا۔

یہاں اعلان جو کیا گیا، وہ اسی نام سے کہ اسے ارزاں نہ بنالینا۔ یہ ایک مقصد ہے جو میں پہلے یہ کام لے چکا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملک نے سوال کیا اور خالق نے وہ جواب دیا جو بعد میں دیا جائے گا۔ یہ تمام دنیا کو دکھانا ہے کہ دیکھو! اس منصب کا اختیار ایسا میری ذات سے خاص ہے کہ جس میں ملک کے معصوم مشورہ کو بھی دخل نہیں ہے، چہ جائیکہ خطا کاروں کا اجماع یا شوریٰ۔

بس اب آیت پوری پڑھ چکا ہوں، اس کے بعد اس کے اجزاء سے متعلق جو باتیں ہیں، وہ کل عرض ہوں گی، خالق نے جواب دیا:

-اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ-

میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس پر تبصرہ کل ہوگا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اصولِ نیابت شروع یہاں سے ہوا۔ نائب ابھی میں نے کہا کہ وہ کام کرے جو اس کا کام ہو۔ جس کے کام کو وہ اپنا کام کہہ سکے اور جس کے کام کو دنیا اس کا کام کہہ سکے، وہ نائب ہے۔ تو انبیاء اللہ کے نائب ہیں، مرسلین اللہ کے نائب ہیں۔ ہمارے نزدیک آئمہ حق اللہ کے نائب ہیں۔ آدم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ نوح اپنے دور میں خلیفۃ اللہ تھے۔ ابراہیم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ موسیٰ و عیسیٰ اپنے اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے اور ہمارے پیغمبر بلا قیدِ وقت خلیفۃ اللہ تھے۔

بہر حال عملی حیثیت سے اپنے دور میں جب اس دارِ دنیا میں تشریف رکھتے تھے تو جو جو ہدایات فرماتے تھے، وہ بحیثیت خلیفۃ اللہ کے تھیں اور جب دنیا سے تشریف لے گئے تو جو ان کی جگہ پر ہدایت خلق کے منصب پر ہو، وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اس طرح ایک بڑی مشکل جو اکثریت کو پیش آئی، وہ ہمارے ساتھ پیش نہیں آئی۔ یعنی اکثریت کو یہ مشکل پیش آئی، منقحہ بات ہے کہ جب پیغمبر خدا دنیا سے اٹھے اور دنیا نے اپنا نظام بنامِ خلافت چلایا، تو اب پہلا فرد، تو انہوں نے کہنا شروع کیا، خلیفۃ رسول اللہ۔ بہت کھلی ہوئی بات ہے، غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر دنیا سے گئے ہیں۔ ہم ان کا جانشین بنا رہے ہیں تو خلیفۃ رسول اللہ۔ تو اب جو آتا ہے، وہ کہتا ہے:

-اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ-

سلام ہو آپ پر اے خلیفہ نبی۔ سلام ہو آپ پر اے رسول اللہ کے خلیفہ۔

اب اس وقت وہ بعد کی مشکل ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔ کوئی وقت نہ ہوئی، عمر گزر گئی۔ مختصر تو ہوتی ہے

عمر۔ وہ اتنے دن تک کہتے رہے خلیفۃ رسول اللہ۔ اب نمبر بڑھا۔ نمبر جو بڑھا تو خود صاحبِ اقتدار جو موجود تھے، اب ان کے ذہن میں دشواری پیدا ہوئی۔ خود ان کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوئی کہ صاحب! اب میں کیا کہا جاؤں؟ اب وہ بیچ میں ایک کڑی آگئی۔ تو اب علم معنی و بیان کی ہمارے ہاں ایک اصطلاح ہے "تتابعِ اضافات"۔ یعنی پے در پے اضافت۔ تو اب رسول اللہ کا خلیفہ، تا کہ رسول پہنچایا جائے۔ بغیر اس کے تو تقدس نہیں پیدا ہوگا۔ تو رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔

خیر صاحب! تھوڑی سی تو زحمت ہوئی ہے۔ یونہی سہی۔ اب آگے بڑھے تو دو اضافتیں آئیں۔ رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب ذہن میں ہے کہ یہ تو سلسلہ رہے گا۔ اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا کی کسے خبر تھی کہ وہ آ کر اس سلسلہ کو ختم کر دے گا۔ حوصلہ تو یہ تھا کہ رہے۔ تو صاحب! یہ بڑی زحمت بے جا ہے۔ تو کیونکر حل ہو اس کا؟ مجمع کیا گیا۔ مجلس شوریٰ قائم ہوئی اور اس میں پیش کیا گیا کہ بھائیو! یہ بڑی مشکل ہے۔ تمہاری سمجھ میں اب تک نہ آئی۔ لیکن بحمد اللہ میری سمجھ میں یہ مشکل آئی کہ اب کیا ہو۔ تم بتاؤ کہ اس کا حل کیا ہو؟ یعنی مشکل سمجھ میں آگئی ہے، حل سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ مشکل کے حل کیلئے مدد کی ضرورت ہے۔ تو بتاؤ کہ کیا ہو؟ نکتہ رسی سے کام لے کر اُسے نہیں بلوایا گیا تھا کہ جس کا کام ہی مشکل کشائی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ احساس تھا کہ وہ جو بنیادی طور پر، بنیادِ مشکل سے الگ ہے، اس سے متفق نہیں ہیں۔ بہرحال موجود لوگوں میں سے کوئی لال بجھکڑ تھا، سمجھ دار آدمی، ذہین۔ تو اس نے یہ کہا کہ صاحب! اس جھگڑے ہی کو چھوڑیئے۔ ارے ہم مومنین ہیں، آپ ہمارے امیر ہیں۔

لہٰذا یہ خلیفہ کا جھگڑا ہی ختم کیجئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بعد میں ختم کیا۔ انہوں نے اسی وقت ختم کر دیا کہ صاحب! یہ جھگڑا نہیں۔ تو سن لے آپ نے کہ ہم مومنین اور آپ ہمارے امیر۔ کہا: کیا عمدہ رائے تم نے تجویز کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے ہی قدم میں رسول سے تو رشتہ منقطع ہو گیا۔ اب جمہور سے رشتہ رہ گیا۔ تو جناب! اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور نسل در نسل چلتا رہا اور ہر دور میں چلتا رہا۔ جب تک کہ وہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اور جناب! ہمارے لئے یہ مشکل نہ پہلے تھی، نہ بعد میں ہوئی۔ ہمارے نزدیک ﷺ میں کسی مخلوق کا قدم آتا ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک رسول اللہ بھی خلیفۃ اللہ، علی مرتضیٰ بھی خلیفۃ اللہ، حسن مجتبیٰ بھی خلیفۃ اللہ، حسین بھی خلیفۃ اللہ۔ پورا سلسلہ ہے خلفائے خدا کا۔ سب نائبِ خدا ہیں اور نائبِ رسول بھی ہیں۔ نائب کا نائب بھی نائب ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف بات نہیں ہے۔

تو وہ اصول کہ جو اس کا کام ہو، وہ اُس کا کام ہو۔ تو یہ نیابت کا تقاضا اور جو اس کے ساتھ عمل ہو، وہ اس کے ساتھ عمل۔ یہی نیابت کا تقاضا ہے۔ اب میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھتا ہوں۔

مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ‌ۚ

"جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

یعنی پہلی اضافت ان کی طرف اطاعت کی۔ پھر وہی اس کی طرف اضافت۔ کیا مطلب؟ چونکہ نائب ہیں، لہٰذا جو اُن کی اطاعت وہ اُس کی اطاعت۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ"۔

یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ بیعت ہے ان کے ہاتھ پر مگر وہ کہہ رہا ہے کہ میری بیعت ہے۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر ورنہ وہ جسم و جسمانیات سے بری، اس کے ہاتھ کہاں سے آئے؟ اسی دن کیلئے تو نائب بنایا ہے۔ تو جو اس کے ساتھ برتاؤ، وہ اس کے ساتھ برتاؤ۔ جو ان کی نافرمانی کرے، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ نیابت کا تقاضا یہاں نظر آ رہا ہے۔

جناب والا! بس، یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جو اس کے ساتھ ہے، وہ اُس کے ساتھ اور جو اس کا کام، وہ اُس کا کام۔ اب جہاں جہاں یہ بات نظر آئے، سمجھ لیجئے کہ یہ نیابت کی دوسری نظیر ہے یعنی نائب ہونے کا ثبوت ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ اب دیکھئے متفق علیہ حدیث، صحاح ستہ کی ہے کہ رسول نے کہہ دیا:

"یَا عَلِیُّ حَرْبُكَ حَرْبِیْ سِلْمُكَ سِلْمِیْ"۔

یا علی! تمہاری جنگ میری جنگ،

اس دوسرے لفظ کا ترجمہ ذرا مشکل سے ہوتا ہے۔ لوگ ترجمہ کرتے ہیں، تمہاری صلح مگر صلح کے لفظ سے ذہن میں آتا ہے، لڑنے کے بعد صلح کرنا تو اس کے معنی ہیں کہ پہلے لڑے۔ شاعر نے کہا ہے کہ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ اس سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوگا جو رسول نے کہا ہے۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑ کر آدمی پھر صلح کرے بلکہ حرب کے مقابلہ میں جو چیز ہوتی ہے، تم سے جنگ، مجھ سے جنگ۔ اور اب میں اُردو زبان میں کہنے کی کوشش کروں کہ تم سے ملاپ رکھنا، ملاپ کرنا نہیں، تم سے ملاپ رکھنا، مجھ سے ملاپ رکھنا ہے۔ اور بعض الفاظ ہیں جو ہمارے محاورہ میں نہیں تھیں۔ مگر اخباروں سے یاد آتی ہیں، وہ ادائے مطلب میں مجھے یہاں مدد پہنچائیں گی۔

تو جناب! یہ ہمارا محاورہ نہیں تھا مگر اخباروں میں بہت دیکھا ہے۔ وہ میرے مطلب کی بات ہے۔ وہ کیا؟ کہ ان سے جنگ، مجھ سے جنگ اور تم سے ناجنگی، مجھ سے ناجنگی۔ یہ حرب اور سلم دونوں مصدر ہیں۔ اُردو میں مصدر کے آخر میں "نا" ہوتا ہے۔ حرب کے معنی لڑنا اور سلم کے معنی نہ لڑنا۔ حرب اور سلم دونوں عربی زبان میں مصدر ہیں۔ ہر زبان میں مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مفعول کی طرف۔

کوئی دوست آپ کے ایسے تھے کہ بچہ پر غصہ آیا تو بیدردی سے مار رہے ہیں۔ آپ ملاقات کو گئے۔ وہ بچے کو ایسی شدت سے مار رہے تھے کہ آپ ٹھہرے نہیں، واپس آ گئے۔ دوسرے دن انہوں نے کہا: ارے بھئی! آپ آئے اور ٹھہرے ہی نہیں۔ تو ان کے جواب میں آپ کہئے گا کہ تمہاری مار سے مجھے ایسی اذیت ہوئی، ایسی تکلیف ہوئی، تمہاری مار سے کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا، میں چلا گیا۔ کیا مطلب؟ یہ اضافت فاعل کی طرف ہے۔ تمہاری مار سے۔ یعنی تم جو مار رہے تھے اپنے بچے کو، یہ ہوئی اضافت فاعل کی طرف۔ اب

خدانخواستہ کوئی آپ کے شناسا، انہیں راستے میں کسی نے زدوکوب کردیا۔ آپ کو خبر پہنچی۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے بطورِ ہمدردی کہا کہ بھئی! تمہاری مار سن کر مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ اب "تمہاری مار" کے کیا معنی ہوئے؟ یعنی تم پر جو مار پڑی۔ تو یہ اضافت مفعول کی طرف ہوئی۔ وہاں اضافت فاعل کی طرف تھی۔ یہاں تماری مار جو لفظ ہے، اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ اب رسول فرمارہے ہیں: "یا علی! حربک حربی"۔ حدیث ہے متفق علیہ۔ دونوں معنی ہیں۔ دنیا کو جو پسند ہوں۔ دونوں مفہوم پیش کئے دیتا ہوں۔ اگر اضافت فاعل کی طرف ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ یا علی! تمہارا جنگ کرنا میرا جنگ کرنا ہے۔ تو اب جس جس سے بھی علی نے جنگ کی ہو، اُسے سمجھئے کہ رسول اللہ نے جنگ کی۔ اگر اضافت مفعول کی طرف ہو تو معنی ہوگئے کہ تم سے جنگ کرنا مجھ سے جنگ کرنا ہے۔

تو اب تاریخ میں دیکھ لیجئے کہ جس جس نے ان سے جنگ کی ہو، اب نہ رشتہ دیکھے گا، نہ صنف دیکھے گا۔ اب ایک خاتونِ معظمہ، وہ بھی متفق علیہ حدیث ہے کہ فرمایا:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّیْ"۔

"فاطمہ میرا ایک جزو ہے"۔

"مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِیْ"۔

"جس نے اسے تکلیف دی، اس نے مجھے تکلیف دی"۔

"وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ"۔

"اور جس نے اسے غضبناک کیا، اُس نے مجھے غضبناک کیا"۔

میں نے ابھی کہا کہ یہ ترکیب کہ جو اس کے ساتھ ہو، وہ میرے ساتھ ہوا۔ یہ نیابت کا پتہ دیتا ہے۔ اب چاہے اس نیابت کی اس قسم کا مجھے نام نہ معلوم ہو، ناموں سے فرق نہیں پڑتا۔ کبھی وہ نیابت بصورتِ نبوت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورتِ رسالت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورتِ امامت ہوتی ہے۔ اب اس نیابت کا خواہ مجھے نام معلوم نہ ہو، مگر ان الفاظ کی رو سے ماننا پڑے گا کہ یہ بھی نائبِ رسول ہیں اور بچوں کیلئے کہا:

"مَنْ اَحَبَّهُمَا فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَغْضَبَهُمَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ"۔

"جس نے ان سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان کو غضبناک کیا، اس نے مجھ کو غضبناک کیا"۔

جو نیابت کے تقاضے ہیں، سب نظر آرہے ہیں یا نہیں! یہ سب احادیثِ پیغمبر ہیں۔ اس سے پہلے قرآن مجید کی آیتیں تھیں جو رسول کی نیابت کے بارے میں مَیں نے پیش کیں۔ اب بہت جانی پہچانی شخصیت، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، جن کی کتاب ردِ شیعہ میں تحفہ اثناء عشریہ، اپنے طبقہ کیلئے مایہ ناز کتاب ہے۔ اس کے مصنف، تو جناب ان کی کتاب ہے سر الشہادتین۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمارے رسول کو وہ سب فضیلتیں عطا کیں جو تمام انبیاء کو ملیں بلکہ اس سے بالاتر۔ لیکن ایک صفت انبیاء کو ملی تھی جو براہِ راست ہمیں

ان کے ہاں نظر نہیں آتا۔ وہ ہے شہادت۔ لہٰذا خالق کو یہ منظور ہوا کہ صفتِ شہادت ان کے فضائل میں رہ بھی نہ جائے اور براہِ راست ان پر کسی دشمن کا وار کام بھی نہ کرے۔ اس کیلئے اللہ نے ان کو ۲ نواسے عطا فرمائے اور شہادت کی دو اقسام ہیں۔ ایک شہادتِ سرّی اور ایک شہادتِ جہری۔

مخفی شہادت زہر سے ہوتی ہے اور اعلانیہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔ دونوں شہادتیں دونوں نواسوں پر تقسیم ہو گئیں۔ حسن کے حصہ میں شہادتِ سرّی آئی اور حسین کے حصہ میں شہادتِ جہری آئی۔ یعنی کھلم کھلا شہادت۔ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے صفت شہادت کو فضائل رسول میں شامل کر دیا۔

اس کا نتیجہ؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر وہ میرے سامنے ہوتے تو میں بڑے احترام سے عرض کرتا۔ بہت بڑے آدمی ہیں، میں بڑے احترام سے عرض کرتا ہوں کہ یہاں تک تو آپ نے فرما دیا، جو میں سوال کروں، اس کا جواب دیجئے کہ جب ان کی شہادت اُن کی شہادت، تو جو ان کا قاتل ہے، وہ اُن کا قاتل۔

اب جناب! نہ ہچکچایئے گا، جتنے زور سے آپ نے وہ بات کہی، اتنے ہی زور سے میری بات کا جواب دے دیجئے گا اور سوائے ایک جواب کے دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو منطقی طور پر قبول کرنا پڑے گا کہ جو ان کا قاتل، وہ اُن کا قاتل یعنی رسول کا قاتل۔ اب یہ جملہ ان کا ابھی تک ہے مگر کھول کر دونوں ٹکڑے کہہ دیجئے کہ جو حسن کا قاتل، وہ رسول کا قاتل اور جو حسین کا قاتل، وہ بھی رسول کا قاتل۔ اب کوئی بحث نہ کیجئے گا کہ حسین کے قاتل کو یہ کہا جائے یا نہیں۔ بس آپ جو جو رسول کے قاتل کو کہہ سکتے ہیں، وہ کہیے۔ ایک اور سوال کا جواب ہو جائے۔ ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے، طرح طرح کی منطقی باتیں سوچ سوچ کر ہماری عزاداری پر کہی جاتی ہیں۔ یعنی ہاتھ ہم اپنے سینوں پر مارتے ہیں، دل دوسروں کے دہلتے ہیں۔ روتے ہم ہیں، صدمہ دوسروں کو ہوتا ہے۔ طرح طرح کے منطقی سوال سامنے آتے ہیں کہ وفاتِ رسول پر اتنا غم و ماتم نہیں ہوتا جتنا امام حسین کی شہادت پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کو رسول سے بڑھاتے ہو۔

تو اب اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں یہ کہوں کہ اچھا صاحب! نواسے کو ہم نے حصہ میں لے لیا ہے، رسول کو آپ حصہ میں لے لیجئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس میں ہم آ کر آپ کے ساتھ شریک ہوں گے، آپ اس میں ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔

جناب شاہ عبدالعزیز کے مطابق سال میں دو تاریخیں ہیں، ایک وفاتِ رسول کی، ایک شہادتِ رسول کی۔ وہ ربیع الاوّل کی کسی تاریخ کو ہے اور یہ جو دس محرم کو ہے، یہ شہادتِ رسول کی تاریخ ہے۔ اب آپ بتائیے کہ وفات کی یادگار قائم کریں یا شہادت کی؟ اور اب مصائب میں مَیں کہتا ہوں کہ اسے ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟ آسمان سے پوچھیں کہ وفاتِ رسول پر خون کیوں نہیں برسا؟ حسین کی شہادت پر کیوں خون برسا؟

اسے سید کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کی "مطالب السئول" میں دیکھ لیجئے۔ علامہ ابن حجر مکی کی "صواعق محرقہ" میں دیکھ لیجئے، خواہ سبط ابن جوزی کی "تذکرہ خواص الائمہ" میں دیکھ لیجئے کہ دس محرم کے بعد چالیس دن تک جو کپڑا زیرِ آسمان پھیلایا جاتا تھا، اُس

خون کے دھبے نظر آتے تھے۔ اہلِ عزا دیکھیں کہ عاشورے ہی کی تاریخ اِدھر سے مقرر نہیں ہوئی بلکہ چہلم کی تاریخ بھی اُدھر سے مقرر کی ہوئی ہے۔ یعنی اس نے بیس صفر تک کائنات کو سوگوار رکھا ہے۔ چہلم کے دن تک، بیس صفر تک خون برس رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبرِ خدا کے غم میں سیدہ عالم رو رہی تھیں، علی رو رہے تھے، حسنین رو رہے تھے، ارے صحابہ میں بھی جن جن کو رونے کی فرصت تھی، وہ رو رہے تھے۔ سب ہی سیاست دان نہیں تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے "مدارج النبوۃ" میں کہا کہ بعض صحابہ گریبان پھاڑ پھاڑ کر جنگلوں میں نکل گئے اور مدینہ میں کہرام برپا تھا۔ یہ تاریخ سے ثابت ہے۔ تو یقیناً یہ سب رو رہے تھے۔ مگر حسین کے غم میں تو رسول اللہ رو رہے ہیں اور پھر دیکھئے کہ جنابِ اُم سلمہ نے خواب دیکھا اور وہ بھی متفق روایت ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا، اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان کی یہ مجال نہیں کہ میری صورت میں آئے۔ یہ صحیح مسلم و بخاری کی متفق حدیث ہے۔ اب دیکھئے صحیح ترمذی میں کہ جنابِ اُمِ سلمہ، اب کوئی اور خواب دیکھتا تو کوئی یہ بحث پیدا کر سکتا تھا کہ وہ رسول کی صورت کو کیا جانے؟ لیکن جنابِ اُمِ سلمہ کے بارے میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ رسول نے ایک خاک دی تھی کہ اسے رکھ چھوڑو۔

یہ بھی صحیح ترمذی میں ہے کہ جب یہ خون ہو جائے تو سمجھنا کہ میرا فرزند حسین شہید ہو گیا ہے۔ یہ خاک جب حسین کے سفر کے بعد دیکھتی تھیں تو دل کو ڈھارس ہو جاتی تھی کہ حسین زندہ ہیں۔